DUE DATE

Cl No. *Acc No.*

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day



جنوری

دنیائے اسلام کا ماضی و مستقبل

[illegible] کتابیں شائع ہو چکی ہیں [illegible] جس میں تاریخ [illegible]

[illegible] سوڈان [illegible]

[illegible] ماضی و مستقبل [illegible]

میں اسلامی ممالک [illegible]

مسلمان کس [illegible] آئینہ دار ہے [illegible]

انزاج سے پیدا ہوئی ہے اور [illegible] طاقت کے [illegible]

[illegible] سیاست، تاریخ، تنقید [illegible] مجموعہ آپ کی نظر سے گذرا نہ ہوگا

[illegible]

تاریخ اسلام

مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی

[illegible] ان محققہ [illegible] ہیں جو مشتمل [illegible] آپنے تاریخ [illegible] کی تاریخ

اسلام کی نہایت [illegible]

تاریخ غلط روایات اور بیہودہ افسانہ طرازی [illegible]

مسلمانوں کے عروج و زوال اور سیاست و [illegible]

کی روشنی میں بحث کی گئی ہے [illegible] تاریخ [illegible]

سے دیکھنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کا مطالعہ [illegible]

قیمت جلد اوّل [illegible]

[illegible]

لاہور

[illegible] بک ڈپو بازار [illegible]

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی و ادبی معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے!

جلد ۳۹ — فہرست مندرجات جنوری ۱۹۴۲ء — نمبر ۲

ملاحظات

کاغذ کی حوصلہ فرسا گرانی اور حیرت انگیز نایابی کے باوصف ہم نے خاص نمبر ۱۹۴۲ء کو بہر وجوہ کامیاب بنانے کی سعی کی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری محنت ٹھکانے لگی اور "خاص نمبر" اس درجہ مقبول ہوا کہ اس وقت دفتر میں نیوز ایجنٹوں کی مزید فرمائشوں کو پورا کرنے کے لئے اس کی ایک جلد بھی باقی نہیں ہے اس کے باوجود ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ چونکہ کاغذ در درجہ مہنگا ہو چکا ہے بلکہ بعض اوقات بازار میں ڈھونڈنے سے بھی دستیاب نہیں ہوتا اس لئے ہمارے مصارف میں پہلے سے کئی گنا اضافہ ہو رہا ہے۔ ملک کے دوسرے رسائل جرائد نے یا تو اپنی ضخامت کم کر دی ہے یا قیمت بڑھا دی ہے لیکن ہم نہیں چاہتے کہ عالمگیر کی ان خصوصیات میں کوئی فرق آئے جو گزشتہ اٹھارہ برس [illegible] سے اس مقبول ترین ماہنامے کا طرۂ امتیاز رہی ہیں۔ البتہ اپنے [illegible] کرام سے صرف اتنی درخواست کرتے ہیں کہ اگر انہیں عالمگیر کی [illegible] خدمات کا اعتراف ہے تو وہ اس نازک ترین دور میں اس کا عملی ثبوت پیش کریں اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ اپنے ادبی ذوق کو آسودہ کرنے کے لئے **عالمگیر بکڈپو** سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں علمی و ادبی مطبوعات منگائیں اور اپنے شہر کی لائبریریوں اور انجمنوں کو بھی اپنی فرمائش عالمگیر بکڈپو کو بھیجنے کی ترغیب دیں کیونکہ عالمگیر بکڈپو کی آمد بھی رسالہ عالمگیر کی بہتری و بہبودی پر صرف ہوتی ہے۔ امید ہے کہ ہمارے مستقل اور نئے کرمفرما اس گزارش پر ضرور توجہ فرمائیں گے۔

[illegible]

گزشتہ برس کی طرح امسال بھی یکم اپریل کو عالمگیر [illegible] **تاریخ نمبر** شائع ہوگا جس میں تاریخی حقائق کے دوش بدوش تاریخی افسانے، تاریخی ڈرامے اور تاریخی نظمیں پیش کی جائیں گی۔ [illegible] قلم حضرات اور مؤرخین کرام سے درخواست ہے کہ [illegible] پہنچا دیں **یکم فروری ۱۹۴۲ء** تک دفتر میں ضرور بھجوا دیں [illegible] و طباعت کے مراحل بہ اطمینان طے کئے جا سکیں۔ [illegible] کے لئے لکھا جاتا ہے کہ ذیل کے عنوانات پر تاریخی مقالات [illegible] ساتھ قبول کئے جائیں گے۔

۱۔ تاریخ اسلام یا تاریخ فرنگ یا تاریخ ہند کا کوئی پہلو۔

۲۔ تاریخ کی ترتیب و تدوین۔

۳۔ آثار قدیمہ یا تاریخی انکشافات۔

۴۔ ثقافتی، سیاسی یا معیشتی تاریخ کا کوئی پہلو۔ افسانے اور ڈرامے لکھنے والے حضرات تاریخ عالم کے کسی زمان پرور یا تحیر خیز یا شجاعت انگیز واقعے کو افسانوی یا تمثیلی لباس پہنا سکتے ہیں۔ اسی طرح نظم میں بھی کسی تاریخی واقعے یا حادثہ کی تصویر کشی کی جائے۔ مترجمین اصل مصنف یا کتاب کا حوالہ ضرور دیں۔ تاریخ نمبر میں چونکہ زیادہ سے زیادہ ریڈنگ میٹر شائع کرنے کا ارادہ ہے اس لئے معاونین کرام از راہ نوازش اختصار کا خاص طور پر خیال رکھیں۔ ایسے مضامین کو ترجیح دی جائے گی جو محققانہ اور دلچسپ ہونے کے باوجود فل سکیپ کے پانچ یا دس صفحات سے زیادہ طویل نہ ہوں۔

چار آنے کے ٹکٹ

کیا آپ کو خاص نمبر رجسٹری کے ذریعے سے نہیں پہنچا؟

خاص نمبر ۱۹۴۲ء بحفاظت حاصل کرنے کے لئے ہماری درخواست پر اکثر کرمفرماؤں نے چار آنے کے ٹکٹ دفتر میں بھیجے تھے چنانچہ خاص نمبر ان کی خدمت میں بذریعہ رجسٹری روانہ کر دیا گیا لیکن بعد کو پڑتال سے معلوم ہوا کہ دفتر کی غلطی سے بعض ایسے خریداروں کو جنہوں نے ٹکٹ ارسال فرمائے تھے خاص نمبر رجسٹری کی بجائے عام پیکٹ میں بھیج دیا گیا۔ اس کارکنانہ غلطی پر ہمیں سخت ندامت ہے اگر ایسے حضرات جن کو ہم نے ٹکٹ بھیجنے کے باوجود خاص نمبر بذریعہ رجسٹری نہیں پہنچا اپنے ٹکٹ واپس منگانا چاہیں تو وہ جلد سے جلد ہمیں تحریر فرمائیں۔

(ادارۂ عالمگیر)

اخبار و افکار

گاندھی جی اور اردو

از ——— ادارہ

مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو (ہند) کا بیان ہے کہ گاندھی جی نے آکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس ناگپور (منعقدہ ۱۹۳۵ء) میں کہا تھا کہ "اردو زبان مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی اور قرآن کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے مسلمان اسے چاہیں تو رکھیں" یہ آواز اٹھی اور بھاگتے چور کے کی طرح غائب ہو گئی۔ لیکن پورے چھ برس کے بعد ڈاکٹر جعفر حسن نے جب گاندھی جی کی توجہ اس جملے کی طرف مبذول کرائی تو انہوں نے لکھا کہ میں نے اس قسم کی بات کبھی نہیں کہی۔ بلکہ میں تو اردو میں خط و کتابت بھی کرتا ہوں اور اردو کی بعض کتابیں میرے زیر مطالعہ رہتی ہیں۔ لیکن مولوی عبدالحق اس تردید کو "کیلانہ عیاری" قرار دیتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ گاندھی جی چونکہ توجیہہ و تاویل کے فن کے ماہر ہیں۔ اس لئے وہ اخفائے حق سے کام لے رہے ہیں گاندھی جی کی ذمہ دارانہ شخصیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح مولوی عبدالحق کے قول و ارشاد کی اہمیت بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ اس لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں سے سچا کون ہے لیکن ہر شخص کی ذہنیت کا اندازہ اس کے طرز عمل سے لگایا جا سکتا ہے۔ اور یہی ایک معیار ہے جس پر مولوی عبدالحق کا الزام اور گاندھی جی کا تردیدی بیان پرکھا جا سکتا ہے۔ آج سے دس سال پہلے کے ماحول پر نظر ڈالئے اور اس ماضی کو موجودہ حالات سے ہمکنار کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ گاندھی جی نے ہندی اور اس کی نوزائیدہ بچی "ہندوستانی" کی حمایت میں تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے لیکن اردو کے لئے ایک جملہ تک نہیں کہا۔ اس امتیازی حمایت اور مخصوص معاندت سے ظاہر ہے کہ گاندھی جی واقعی اردو کی طرف سے آنکھیں بند کر چکے ہیں۔ لہٰذا مذکورہ بالا الزام سے وہ اگر اظہار برأت کرتے ہیں تو اپنی عملی سرگرمیوں کی کیوں کر تردید کر سکیں گے؟ رہا یہ سوال کہ گاندھی جی سچے ہیں تو اس بحث کو جس قدر چھیڑا جائیگا گاندھی جی کی کمزوریاں اسی قدر نمایاں ہوتی جائیں گی۔ چنانچہ گول میز کانفرنس کے موقعہ پر انہوں نے مسلمانوں کو "کورے چیک" کی پیش کش سے اپنا بنانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی عاید کر دی تھی کہ تمام مسلمان کسی ایک مطالبے پر متفق ہو جائیں مگر جب تمام اسلامی جماعتوں نے ہم آہنگی کا ثبوت دیا تو گاندھی جی کا "کورا چیک" "پروانہ پشیمانی" بن کر رہ گیا۔ وہ اپنی چال پر پردہ ڈالنے کے لئے کہنے لگے۔ "میں تو مانتا ہوں لیکن ہندو لیڈر نہیں مانتے اس لئے میں مجبور ہوں۔" جو شخص سیاسی طور پر اتنا بڑا طلسمی فریب بنا سکتا ہے۔ اگر وہ آج اردو کے متعلق اپنے قول کی تردید کرتا ہے تو اس تردید کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے؟ اگر گاندھی جی فی الواقع اردو کے حامی ہیں تو انہیں ہندی اور ہندوستانی کی حمایت کے ساتھ ساتھ اردو کی بہتری کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ لیکن وہ اس کام کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے گاندھی جی کی تردید خود انہی کے عمل سے غلط ثابت ہو رہی ہے۔

بقیہ حقائق و معارف

وجہ یہی ہے۔ دونوں کی طبیعت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی زمانہ میں رہنے والے افراد کی عظیم تعداد کبھی بھی جماعت کے تطور اور اس کے مظاہر پر متنبہ نہیں ہوتی۔ اور نہ اس تطور کو بھلائی اور راستی کی طرف لانے کی کوشش کرتی ہے۔ فرد جماعت کے تطور سے خود بھی تطور حاصل کرتا ہے۔ لیکن اس کے وقوع کی اسے ہرگز خبر نہیں ہوتی۔ پھر خود جماعت بھی اپنے تطور کا کوئی احساس نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ امتداد زمانہ جماعت کے تدریجی تطور کو نمایاں کر دیتا ہے اور آئندہ نسلیں اسے محسوس کرتی اور دیکھتی ہیں۔

فرد کا جماعت کے شعور کے ماتحت آجانا اسے اپنی مستقل عقلیت سے دور کر دیتا ہے۔ جماعتی شعور کا دھارا اسے جدھر چاہتا ہے بہا لے جاتا ہے۔ شر کی طرف یا خیر کی طرف جماعتی شعور اور انفرادی عقلیت کی جنگ نے پوری انسانی تاریخ بنائی ہے۔ تمام جنگی حوادث، اجتماعی انقلابات اور مختلف مدنیتوں کے قیام میں ہمیں ہر جگہ یہی حقیقت نمایاں نظر آتی ہے۔ یہی روح انسانیت کی گردن پکڑے ہمیشہ کھینچتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

حقائق و معارف

یہ عام طور پر مشہور رہا ہے کہ دین و علم میں نزاع قائم ہے اور یہ کہ علم اور دین دونوں کی فطرت میں اس عداوت و تنافر کی بنیادیں مخفی ہیں بلاشبہ یہ دعویٰ ایک مدت سے زبان زد خاص و عام ہے۔ مزید برآں تاریخ سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے۔ صرف تاریخ ہی نہیں خود ہمارا مشاہدہ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ بایں ہمہ کوئی قطعی ثبوت اس دعویٰ کی صحت کا نہیں ملتا تاریخی واقعات اور ہمارے مشاہدے کتنے ہی کثیر ہوں تاہم یقینی طور پر ثابت نہیں کر سکتے کہ دین اور علم کے طبائع فی الحقیقت باہم متضاد ہیں۔

موجودہ تمدنی حالات پر ایک سرسری نظر اس دعویٰ کے مشکوک کر دینے کے لئے کافی ہے۔ موجودہ عہد میں مادی علم کا دھارا اتنی شدت و قوت سے بہہ رہا ہے جس کی نظیر کسی پچھلے زمانہ میں نہیں مل سکتی لیکن باوجود اس کے ٹھیک علم کے پہلو بہ پہلو ہم دینی روح کو بھی پوری مضبوطی سے قائم پاتے ہیں۔ کسی عہد میں بھی دینی روح انسانی قلوب میں بہ حیثیت عمومی اس سے زیادہ راسخ نہیں ہوگی جتنی اس وقت ہے۔ بیشک ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا پر ایسے تمدنی دور گذرے ہیں جن میں وقتی طور پر دین کا دبدبہ گھٹ گیا ہے۔ اور مادیت کے غوغا پر اس کا نعرہ غالب نہ آ سکا۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ خارج میں دین کی آواز کتنی ہی پست کیوں نہ ہو گئی ہو روح کے اندر اس کی بنیادیں ہمیشہ یکساں طور پر استوار رہی ہیں۔ انسانیت کی پوری تاریخ میں ایک لمحہ بھی ایسا بتایا نہیں جا سکتا جس میں دینی یقین و ایمان کے ستون متزلزل ہو گئے ہوں۔

اگر واقعی دین اور علم میں معرکہ برپا ہوتا تو اب تک مدت کا فیصلہ بھی ہو چکا ہوتا۔ ۲۵ صدیوں سے یہ دونوں نام نہاد حریف پہلو بہ پہلو چل رہے ہیں مگر اب تک دنیا نے ان کا کوئی فیصلہ کن معرکہ نہیں دیکھا کیا یہ طویل و عریض مدت بھی فیصلہ کے لئے کافی نہیں ہے؟

لیکن فیصلہ ہوتا کیونکر؟ دونوں میں اگر فی الحقیقت کوئی نزاع ہوتی تو اس کا فیصلہ بھی وقوع میں آتا۔ یہاں سرے سے جنگ ہی نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں اپنے لئے فکر انسانی میں بالکل الگ الگ میدان رکھتے

معرکۂ علم و دین

از مولینا ابوالکلام آزاد

ہیں یہی سبب ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر باقی و قائم ہیں [illegible] حقیقی تصادم نہیں ہوتا دونوں فکر انسانی کے دو بلند و علیحدہ مظہر ہیں۔

لیکن اگر حقیقت یہ ہے تو پھر اس طویل اور خونیں تاریخ کی ہم کیا توجیہ کریں جبکہ دینی پیشواؤں نے علم کا گلا گھونٹنے کی کوششیں کیں [illegible] اس معاندت طلبی کی کیا تاویل کریں جو اصحاب علم کی طرف سے [illegible] تک دین کو دی جا رہی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ وہ دین جو [illegible] انسانی کا ثمرہ ہے اور وہ علم جو عقل انسانی کا نتیجہ ہے دونوں [illegible] تصادم نہیں ہوا۔ جو تصادم ہوا ہے وہ سراسر اس دین اور علم میں ہوا ہے جو لاہوتی پیشواؤں کا مبتدع دین ہے اور ناقص و خام مدعیان علم کا [illegible] علم ہے تو ہم بڑی آسانی سے نہ صرف پچھلی تاریخ کے تمام حوادث کی تحلیل کر سکیں گے بلکہ مستقبل کے واقعات پر بھی روشنی ڈال سکیں گے۔

(۲)

انسانی جماعتیں شعور رکھتی ہیں مگر فکر نہیں رکھتیں بلکہ کہا گیا ہے کہ جماعت کی شعوری ترقی کا پیمانہ اس کا وہ فرد ہے جو سب سے زیادہ مفکر و فکر سب سے زیادہ مضطرب شعور رکھتا ہے۔ جماعت جس طرح محض شعور رکھتی ہے اسی طرح سراسر جمود سے بھی لبریز ہوتی ہے اور یہ کہ اس کا یہ جمود ترقی کے گوناگوں میدانوں میں اس کے قدموں کے توازن کے لئے ضروری ہے۔ سالہا سال سے علماء اجتماع وہی کہہ رہے ہیں جو گستاؤ لیبان کا نظریہ ہے لیکن کبھی ان کے ذہن میں یہ حقیقت نہیں آئی کہ جماعت ایک جامد مخلوق ہے۔ تغیر و تجدید بہت دیر میں قبول کرتی ہے اس بارہ میں مجھے صرف ایک انگریز عالم کارل پیرسن کا قول ملا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"ڈارون اور اسپنسر کی تصانیف میں بڑا فرق یہ ہے کہ اسپنسر کی کتابیں باوجود اپنی تمام قوت و تاثیر کے جلد منسوخ ہو جائیں گی برخلاف اس کے ڈارون کی کتابیں باقی رہیں گی کیونکہ ان میں بے نظیر بصیرت اور قوت ادراک موجود ہے ان کتابوں نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے ایسے اصول و مبادی پیش کر دیئے جنہوں نے دنیا کو [illegible]

[illegible] فکر کو بھی اوجھل کرنا اور ہمارے سامنے میدان زیادہ وسیع کرنا شروع کر دیا ہے۔ بلاشبہ ان اصول و مبادی کا اثر بہت سست رفتار ہے لیکن یہ سست رفتاری ہمیں ناامید نہ کرے۔ سب سے قوی موثر [illegible] اجتماعی بقا کی علامت [illegible] رکھتا ہے وہ وہی صفت ہے جسے ہم سب سے زیادہ مکروہ رکھتے ہیں یعنی قدامت اور جمود کی صفت۔ اسی قدر نہیں بلکہ وہ دہشتناک مخالفانہ صدائیں جو ہر جدید فکر کے خلاف جماعت کی طرف سے بلند ہو جاتی ہے، ہماری اجتماعی زندگی کی حفاظت کے لئے قوی ترین موثر ہیں۔ جماعت کا یہ جمود اس جسم کی محافظت کرتا ہے اور نئے نئے تجربوں کا تختۂ مشق بننے نہیں دیتا نیز صالح کو غیر صالح اور اصلح کو غیر اصلح سے ممیز کرتا ہے۔"

عالم مادی اور جماعت انسانی کی تکوین میں بہت بڑی مشابہت موجود ہے۔ دونوں میں ایسے عناصر موجود ہیں جو ان کے نظام اور توازن کی حفاظت کرتے ہیں چنانچہ جس طرح جوہر فرد (ایٹم) میں دو متضاد کہربائی لہریں ایجابی اور سلبی جاری ہوتی ہیں یا جس طرح تمام مادی دقائق میں جذب و دفع کی دو مخالف تاثیریں جمع ہوتی ہیں ٹھیک اسی طرح اجتماع انسانی میں تقدم و جمود کے دو مخالف عناصر ہوتے ہیں۔ زندگی کے لئے موت لازمی ہوتی ہے اور موت کے بعد (دوبارہ زندگی) ضروری ہوتی ہے۔ اس طریقہ پر غور کرنے سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ جماعت کی سلبی صفات جنہیں ہم ناپسند کرتے ہیں درحقیقت اس کی بقا کے لئے ناگزیر ہیں۔

اس حقیقت کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے کوئی نرم مادہ لے لو اور اس پر دباؤ ڈالو۔ تم دیکھو گے کہ دباؤ کے ساتھ ہی اس کی شکل بدل جائیگی۔ پھر دوبارہ دباؤ فوراً دوسری شکل اختیار کرے گا اس طرح ہر دباؤ پر وہ ایک نئی صورت میں تبدیل ہوتا جائیگا۔ پس اگر انسانی جماعت کی طبیعت بھی اسی مادے کی طرح نرم ہوتی اور اس میں جمود و قدامت پرستی کی منحوس صفتیں نہ ہوتیں تو ظاہر ہے کیسی طوائف الملوکی اور انتشار پیدا ہو جاتا؛ روز روز اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتیں اور نظام انسانی تہ و بالا ہو کر رہ جاتا۔

تمام علمی فلسفے شمار کرو۔ سقراط کا مذہب دیکھو۔ کلبی، ابی کوری، رواقی، مشائی وغیرہم کے مذاہب پر نظر ڈالو۔ اس کے بعد غور کرو کہ اگر اجتماع انسانی کا مزاج نرم مادے کی طرح ہر وقت تبدیلی قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا تو ان بیشمار اور متضاد مذاہب کی موجودگی میں اس کی کیا گت ہو جاتا؟ یقیناً اس کا سارا نظام عقل و فکر زیر و زبر ہو جاتا۔

اور کوئی وسطی و صحیح رائے پیدا نہ ہوتی۔

یہی حال سیاست، دین، زبان اور ان تمام امور کا ہے جن پر تمدن کے ستون قائم ہیں۔

پس اب یہ واضح ہو گیا کہ تقدم و ارتقا ایک ایجابی قوت ہے جسے باوجود مقاومت کرنے کے سلبی قوت یعنی جمود کی صفت مدد دیتی ہے اور آگے بڑھاتی ہے۔ اگر اجتماع انسانی ایک سادہ دقیقہ ہوتا تو اس کے جواہر باہم جذب و دفع کے متضاد عملوں میں مصروف نظر آتے۔ کیونکہ یہ متضاد عمل اس کی ہستی قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے ٹھیک اسی طرح تقدم و جمود کی متضاد [illegible] اجتماع انسانی کے بقا و دوام کا نشو و ارتقا کے لئے لازمی ہیں۔

بنابریں ہمیں قدامت پرست جامدوں کو یکقلم برا نہیں سمجھنا چاہیے ان کا وجود بھی بقائے حیات کے لئے اسی طرح ضروری ہے جس طرح تجدد اور تقدم پر عمل کرنے والوں کا وجود ضروری ہے۔ جامدین اجتماع انسانی کیلئے ایک سلبی قوت ہیں جو جماعت کی رفتار میں اعتدال و توازن پیدا کرتے رہتے ہیں۔

[illegible]

ہربرٹ اسپنسر نے اپنی کتاب "مبادی معاشرت یا اجتماع مابعد الالہیات" کے تطور کی بحث شروع کی ہے۔ وہ کہتا ہے تطور کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) تطور غیر عضوی اور اس کا تعلق آسمان و زمین اور سیارگان کی بناوٹ سے ہے (۲) تطور عضوی اور اس کا تعلق طبیعی مظاہر سے ہے جنہیں ہم طبیعت حیہ اور مختلف درجوں کے نباتات و حیوان کی ترکیب میں مشاہدہ کرتے ہیں پھر وہ مظاہر ذہنی (سائیکالوجی) جو ان صور حیہ کا خاصہ ہیں جو ترقی کی اس حد کو پہنچ گئی ہیں جہاں طبیعت تطور نے انہیں ان مظاہر کا اہل بنا دیا ہے۔ (۳) تطور مابعد الالہیات یا مابعد العضویات یہ فی الحقیقت حالت [illegible] کا سن بلوغ اور جماعت کے افراد میں تقسیم عمل ہے۔

اگر ہم اس اصول کی تحلیل کریں اور اپنے موضوع سے تطبیق دیں تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ تطور مابعد الالہیات نشو کا وہ آخری درجہ ہے جس تک حیوانی جماعتوں کی ترقی پہنچی ہے انسان بھی ان سب میں حیوان کا شریک ہے بلکہ مابعد الالہیات میں اس زیادہ سے زیادہ ترقی تک پہنچ گیا ہے جہاں تک حیوان سے پہنچنا ممکن ہے۔ اگر یہی ہے تو پھر انسان کو باقی مخلوق پر کیا امتیاز حاصل ہے؟ انسان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے مابعد العقلیت سے ایک ایسی قوت حاصل کرتا ہے جس کے ذریعہ اپنی عقل کو اپنے مجموع کی بھلائی میں لگاتا ہے۔

فرد [illegible] کبھی متفق نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ دو متضاد [illegible]

تحقیق و تصحیح

از ——— ادارہ

مسلمان

مسلمان کی تحقیق بڑی دشوار تسلیم کی گئی ہے بعض کی رائے ہے کہ مسلمان دراصل مسلم آن تھا یعنی مسلم کی طرح ۔ فارسی میں قاعدہ ہے کہ جب دو لفظوں میں ایک کا آخری اور دوسرے کا پہلا حرف ایک جنس سے ہو تو ایک کو حذف کر دیتے ہیں اس لئے دو میموں میں سے ایک کو حذف کرکے مسلم آن (مسلمان) ہو گیا۔ بریں تقدیر یہ لفظ عربی اور فارسی الفاظ سے مرکب ہوا۔

بعض کہتے ہیں کہ مسلمان مسلم کی جمع ہے بطریق فارسی جیسے مومنان جمع مومن لیکن معنی واحد مشہور ہے۔ جیسے حور جو دراصل حوراء کی جمع ہے مگر فارسی والے حور کو واحد مان کر اس کی جمع حوران لاتے ہیں سعدی کہتے ہیں

حوران بہشتی را کہ دوزخ بود اعراف
از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

مگر یہ دونوں توجیہات قابل تسلیم نہیں کیونکہ کسی استاد نے مسلم کے میم کو سکون استعمال نہیں کیا بلکہ بفتح (زبر) یا مصلے ہے ۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربی لفظ مسلم ہے اور فارسی مسلمان ۔ اتفاقاً ان کے مادے متحد ہو گئے ہیں جیسے ملک اور ملکہ ۔ اول الذکر عربی ہے اور دوسرا فارسی کا یعنی دخل، کیچڑ۔ اور اشعار (عربی) اور موخر الذکر میں مسلمان خالص فارسی لفظ ہے ۔ اور ضروری نہیں کہ اسلام سے ماخوذ ہو ۔ یہ مفرد ہے مرکب نہیں ۔ واحد ہے جمع نہیں۔

آسمان

"آسمان" عربی اعتبار سے کوئی لفظ نہیں ۔ یہ آسیا مانند (چکی) کی طرح کا مخفف ہے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل تو مانند کی دال اور دوسری نون حذف کی گئی اور لفظ "آسیمان" رہ گیا لیکن رفتہ رفتہ عام بول چال میں آسیہ کی "ی" اور "ہ" بھی دب گئی ۔ اس کے بعد "آسمان" لفظ بن گیا ۔ حکمائے قدیم کا خیال تھا کہ آسمان پھرتا ہے اور اس کا دائرہ گول ہے ۔ اس لحاظ سے چکی کو آسمان سے تشبیہ دی جا سکتی ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زمانہ کے ماہرین ارضیات بھی زمین کو گول ہی سمجھتے تھے ۔ چنانچہ تمام علم ہیئت کو فارسی و عربی میں آسیہ (چکی) کہا جاتا ہے ۔ اس کی تعریف سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قدیم نقطۂ نگاہ بھی زمین کی گولائی کے بارے میں جدید نظریات سے متفق تھا ہے

طوفانِ نوح

نامہ مجھے لکھا ہے مگر نام نہیں ہے

(از ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی)

دل کچھ بھی سہی قابلِ الزام نہیں ہے — ناکامِ محبت ہے یہ خود کام نہیں ہے

اب دم نہیں اب کوئی دم آرام نہیں ہے — بیمار ترا صبح ہے تو شام نہیں ہے

کس پر اثرِ گردشِ ایام نہیں ہے — تکلیف کو بھی خلق میں آرام نہیں ہے

دل آپ نے لے کر جو دیا مجھکو دل اپنا — تو یہ کوئی انعام میں انعام نہیں ہے

ہاں آپ کی محفل میں ضرور آپکے گھر میں — آرام نہیں ہے مجھے آرام نہیں ہے

کیا خوگرِ بیداد ہوا اب دلِ مضطر — وہ شورِ فغاں کا سحر و شام نہیں ہے

مٹ جائے جو دل عشق و وفا میں تو بلا سے — یہ حسن کے نزدیک کوئی کام نہیں ہے

میں دردِ محبت میں ہوں کیا طالبِ آرام — آرام بھی کہتا ہے کہ آرام نہیں ہے

ہر وقت ترے حسنِ جہانتاب کا جلوہ — یہ صبح وہ ہے جس کے لئے شام نہیں ہے

تحریر میں بھی اپنے کو یوں اُس نے چھپایا — نامہ مجھے لکھا ہے مگر نام نہیں ہے

ساقی مجھے پینے میں تکلف سے غرض کیا — چلّو تو ہے موجود اگر جام نہیں ہے

اربابِ وفا آپ کو مشکل سے ملیں گے — یہ خاص صفت ہے صفتِ عام نہیں ہے

اقرارِ محبت سے سروکار انھیں کیا — ہر وقت وہی صبح وہی شام نہیں ہے

طوفان اٹھانے میں تامل ہو مجھے کیوں
فرمایئے کیا نوح مرا نام نہیں ہے

شعارِ کوکب

دل کی تمناؤں کا شمار نہیں ہے

از حضرت کوکب

کیسے کہوں دل اُمیدوار نہیں ہے
یاس پہ بھی تو اُسے قرار نہیں ہے

بازیٔ اُلفت ہے یہ قمار نہیں ہے
جان بھی جاتی رہے تو ہار نہیں ہے

شکوہ مرے شوق کا شعار نہیں ہے
دل پہ مگر مجھ کو اختیار نہیں ہے

اور وہ کیا چاہتے ہیں اہلِ وفا سے
زندگی سوگوار بار نہیں ہے

اُن کا پرستار ہے جو پہلی نظر سے
اُس کا انھیں اب تک اعتبار نہیں ہے

کہتے ہیں باطل ہے اُس کے عشق کا دعویٰ
عرضِ تمنا سے جس کو عار نہیں ہے

سچ تو ہے کیونکر یقیں ہو اُن کو وفا کا
جب دلِ وارفتہ اپنا یار نہیں ہے

فکر و نظر ذوق و شوق حسرت و ارماں
کون ہے جو اُن کا جاں نثار نہیں ہے

دل سے کچھ اُمید تھی سو وہ بھی ہے بیخود
اور کوئی اُن کا راز دار نہیں ہے

اب تو یہ آزارِ دل ہم رسانہ ہے دل کے
روگ محبت کا جانہار نہیں ہے

ہر نفس و ہر نظر ہے عالمِ ارماں
دل کی تمناؤں کا شمار نہیں ہے

پھولوں سے خوشتر ہیں راہِ عشق میں کانٹے
خلدِ محبت میں کوئی خار نہیں ہے

نظریں ہم آغوش ہوں جمال سے کیونکر
دل ہی اگر اپنا حسن کار نہیں ہے

پہلے ذرا خود تو اپنے آپ میں آلوں
مجھ کو ابھی ان کا انتظار نہیں ہے

نازِ ستم بھی تو ہے دلیلِ توجہ
لُطف پر اُلفت کا انحصار نہیں ہے

رنگ یہ ہے ایک ایک داغِ تمنا
باغِ محبت کی یہ بہار نہیں ہے

زیست کا حاصل ہی کیا؟ سچ تو ہے کوکب
درد اگر دل کو سازگار نہیں ہے

نل دمنتی

دلگداز رومان

جناب ممتاز حسین بسمل منشی فاضل ادیب فاضل

پرانے وقتوں میں اجین میں ایک راجہ حکومت کرتا تھا جس کا نام نل تھا۔ تاجدار فرض شناس اور رعیت خوش حال تھی۔ ملک لٹیروں اور ڈاکوؤں سے پاک تھا اور چاروں کھونٹ مسرت کا دریا لہریں لے رہا تھا۔ نل مردانہ حسن کی مکمل تصویر تھا۔ اس کے بازوؤں میں بے پناہ طاقت تھی اور ہندوستان کا کوئی شور بیر میدانِ جنگ میں اس کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ رعایا اس کے نام پر جان دیتی تھی اور اس کے جانباز سپاہی اس کے نقارے کی خاطر ہر وقت مر مٹنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ظالم اور سرکش راجاؤں نے کئی بار اس سے مقابلہ کیا مگر ہر بار منہ کی کھائی۔ جب وہ ظلم کو مٹانے اور انصاف کا بول بالا کرنے کے لئے ہتھیار سج کر گھوڑے پر سوار ہوتا تو اقبال راستہ میں آنکھیں بچھاتا اور فتح کی دیوی دائیں بائیں پھول برساتی۔ میدان میں پہنچ کر وہ دشمن کی صفوں میں گھس جاتا۔ اس وقت اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہوتیں اور تلوار سے شعلے جھڑتے۔ ایک بار وہ انہواڑہ کے راجہ کو نیچا دکھا کر اجین واپس آیا۔ راجدھانی کے چاروں طرف خوشی کے جھنڈے گڑے تھے۔ شہر دلہن کی طرح آراستہ تھا۔ دن کھیل تماشوں میں گذر گیا۔ رات پر جانے گھی کے چراغ جلائے۔ راج محل میں آدھی رات تک جشن ہوتا رہا۔ اس کے بعد راجہ آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا۔

دوسرے دن فوجی دربار تھا۔ اپنی آن پر مر مٹنے والے بہادروں نے رات آنکھوں میں کاٹی۔ دوسرے دن خلعت انعام اور جاگیریں کے پروانے ان کے منتظر تھے۔ منہ اندھیرے سپاہ محل کے سامنے میدان میں جمع ہو گئے۔ جب سورج کی پہلی کرن نے بندھیاچل کی بلند چوٹیوں کو چھوا تو نل محل سے نکل کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دربار کی طرف چلا۔ بانکے راجپوت دوہرے کھانڈے باندھے، برچھے سنبھالے قطاروں میں کھڑے تھے۔ نقارے پر چوٹ پڑی۔ جنگجو ٹھاکروں نے تلواروں کے قبضوں پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا لئے۔ راجہ چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کا رنگ زرد اور چہرہ اترا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر دربار میں سناٹا چھا گیا۔ مگر کسی کو کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ راجہ بظاہر دربار کی کارروائی میں حصہ لے رہا تھا مگر درحقیقت کسی اور ہی عالم میں تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے پریشانی ظاہر تھی۔ ہونٹ کانپ رہے تھے اور دل اچاٹ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد نل محل میں واپس چلا گیا اور ایک سرد آہ بھر کر پلنگ پر گر پڑا۔ وہ ایک رات میں برسوں کا مریض معلوم ہوتا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے تھے۔ امرا نے آپس میں مشورہ کیا اور نل کے ایک منہ چڑھے خادم (اصلیت دریافت کرنے) کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

ایک مہینہ گذر گیا۔ راجہ کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ ملک بھر میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ویدوں نے نبض دیکھی مگر نبض کا پتہ نہ چلا۔ آخر کار داناؤں کو یقین ہو گیا کہ کیوپڈ کے تیر نے نل کے دل کو نشانہ بنایا ہے۔ امرا نے کرید کرید کر حالات دریافت کئے مگر دُرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔

اجین میں ایک جہاندیدہ برہمن رہتا تھا جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے تھا۔ وہ نل کے پاس آیا اور عجائباتِ عالم کے ذکر سے اس کا دل بہلانے کی کوشش کی۔ باتوں باتوں میں وجیا نگر کے راجہ بھیم کی پری چہرہ لڑکی دمنتی کا ذکر آیا۔ اس کا نام سن کر نل تکیہ کے سہارے اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں چمک اٹھیں اور زرد چہرے پر کچھ رونق سی آ گئی۔ برہمن دمنتی کے حسن و جمال کی تعریف کر رہا تھا اور نل کے دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔ راجہ نل درحقیقت وجیا نگر کی راجکماری دمنتی کو خواب میں دیکھ کر والہ و شیدا ہو چکا تھا۔ دل میں محبت کی آگ بھڑک رہی تھی اور کسی پہلو کل نہیں پڑتی تھی۔

برہمن نے دانائی سے راجہ کے دل کا بھید پا لیا اور اس کی ایک تصویر لے کر وجیا نگر چلا گیا۔ وہاں راجہ کے پروہت سے دوستی پیدا کی اور اس کی بیوی کی معرفت نل کی تصویر راج محل میں پہنچا دی۔ دمنتی نے نل کی تصویر دیکھی تو صبر و قرار کھو بیٹھی۔ دیوانوں کی طرح ایک کونے میں تنہا بیٹھی رہتی اور اپنے دل سے باتیں کرتی رہتی۔ اس کے گلابی رخسار زرد پڑ گئے۔ پھول سا چہرہ مرجھا گیا۔ راجہ کو فکر لاحق ہوئی۔ بڑی محبت سے پریشانی کا سبب پوچھا۔ مگر دمنتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ہندوستان کی بائیا

زیر کمند تھی جو جان تک دے دیتی ہے مگر حیا اور ناموس پر حرف نہیں آنے دیتی۔

اِدھر نل کی حالت خراب تھی اُدھر دمنتی زندگی سے بیزار تھی۔ دونوں مجبور تھے مگر تقدیر کے گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ ایک دن نل پریشانی کے عالم میں باغ میں ٹہل رہا تھا۔ راج ہنسوں کا ایک جھنڈ فوارے کے پاس آ اترا۔ نل نے انہیں پکڑنے کے لئے جال بچھایا اور گھات میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد راج ہنس اڑ سے مگر اُن میں ایک جال میں پھنس گیا۔ نل نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا۔ بیچارہ پرندہ اس ناگہانی آفت کی وجہ سے خوف سے کانپ رہا تھا۔ نل نے اُسے پنجرے میں بند کرنا چاہا مگر اتفاق سے وہی برہمن وہاں آ گیا اور کہنے لگا: مہاراج یہ راج ہنس جنوب کی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے انہیں دمنتی کے باغ میں اترتے دیکھا ہے اور اب بھی حسب معمول وہاں اتریں گے۔ آپ اس پرندے کے گلے میں خط لکھ کر باندھ دیجئے اور چھوڑ دیجئے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کا نامۂ شوق دمنتی تک پہنچ جائیگا۔ دیکھئے بیچارہ ہنس اپنی مادہ سے جُدا ہو کر کتنا بیقرار ہے۔ آپ اسے دردِ جُدائی کے صدمہ سے رہائی بخشیں۔ خدا آپ کی مشکلات آسان کریگا۔"

نل نے حسب ہدایت اُسی وقت قلم دوات منگا کر نامۂ شوق لکھا اور راج ہنس کے گلے میں باندھ کر اُسے آزاد کر دیا۔ وہ تیر کی طرح اُڑا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ کچھ عرصہ کے بعد راج ہنس جیسا کہ دمنتی نے باغ میں اُترا۔ وہ اُس کے گلے میں رُقعہ بندھا دیکھ کر بیچین ہو گئی اور کوشش سے اُسے پکڑ کر رُقعہ لے لیا۔ وہ اُسی کے نام کا تھا۔ نل نے اپنے دل کی دھڑکنیں الفاظ کے پردے میں چھپا کر بھیجی تھیں۔ دمنتی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دل بیچین ہو گیا۔ نل کا رُقعہ کئی بار پڑھا، چُوما، آنکھوں سے لگایا اور دھڑکتے ہوئے دل کو تسکین دی۔

(۲)

اس کے بعد دمنتی زیادہ بیچین رہنے لگی۔ مہاراجہ وجیا نگر نے اس کا دل بہلانے کے لئے ہر قسم کی تدبیروں پر عمل کیا۔ راگ رنگ کے جلسے بلائے۔ محل میں کئی اُپدیشک آئے۔ باغ میں کھم گڑے جھولے پڑے گانا کھیلے گئے۔ محل میں نوبہار کا عالم تھا مگر دمنتی کے دل کی کلی نہ کھلی۔ آخرکار مہاراجہ نے دمنتی کے لئے شریک حیات تلاش کرنیکا ارادہ کیا اور اُس کا سوئمبر رچا دیا۔ دُور دراز کے راجے اُس میں شریک ہونے کے لئے بلائے گئے۔ مہاراجہ وجیا نگر نل کی جوانمردی اور شجاعت کے افسانے سُن چکا تھا اُسے بھی دعوت دی گئی۔ جب یہ خبر اجین میں پہنچی تو نل جامہ میں پھولا نہ سمایا فوراً دکھن کی جانب کوچ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔

شُبھ لگن دیکھ کر نل نے کوچ کیا۔ جلوس کی شان و شوکت قابل دید تھی۔ میلوں تک بھالوں اور سُورماؤں چھوت پرے باندھے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ سینکڑوں ہاتھی جلوس میں شامل تھے۔ بہار اور صحرا نقاروں کی آواز سے گونج اُٹھے اور نل منزل دو منزل کرتا ہوا تھوڑے عرصہ میں وجیا نگر پہنچ گیا۔ وہاں بیسیوں مہاراجے دمنتی کو بیاہنے کی آرزو میں آئے ہوئے تھے۔ خیموں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا۔ ہندوستان کی تمام شان و شوکت ایک شہر میں سمٹ آئی تھی۔ کوئی حکمران دوسرے سے ہیٹا بن کر رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ہر ایک راجہ دُوسرے سے بڑھ چڑھ کر قدم مارتا تھا۔ سوئمبر کا دن آیا، دمنتی سولہ سنگار کئے جے مالا ہاتھوں میں لئے سہیلیوں کے جُھرمٹ میں محل سے نکلی۔ اُس کا حُسن ستاروں سے زیادہ تابندہ اور جسم پھولوں سے زیادہ نازک تھا۔ دل سینوں میں دھڑکنے لگے۔ بڑا کڑا امتحان تھا۔ آخرکار کامیابی نے نل کے قدم چُومے اور دمنتی نے جے مالا اُس کے گلے میں ڈال دی۔ اُس روز سے وہ شاہی نعمان قرار پایا اور دوسرے راجے اپنے خیمے ڈیرے سمیٹنے لگے۔ چند روز کے بعد نل کی شادی دمنتی سے بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔

ایک دو ماہ وہاں قیام کرنے کے بعد نل دمنتی کو ہمراہ لے کر اجین آ گیا اور عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ کئی سال اس طرح گزرے کہ دن عید اور رات شبرات تھی مگر دُنیا ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ جوش نے کیا خوب کہا ہے ؎

گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے
آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کے لئے

اتفاق سے نل بیمار ہو گیا۔ روگ نے بڑھتے بڑھتے دیوانگی کی صُورت اختیار کر لی۔ ویدوں نے بہت دماغ لڑایا مگر تقدیر کے سامنے تدبیر بے بس ہے۔ نل کا چھوٹا بھائی پشکا حکومت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اُس نے نل کی دیوانگی کے قصے مُلک بھر میں پھیلا دیئے اور اس طرح رائے عامہ اُس کی حکومت کے خلاف ہو گئی۔ ایک دن پشکار نے نل کو جُوا کھیلنے کی دعوت دی۔ دیوانہ را ہوئے بس است نل فوراً تیار ہو گیا۔ مقابلہ ایک شاطر جواری سے تھا۔ پشکار پہلے جان بُوجھ کر چند بازیاں ہار گیا اور پھر نل کو اُلّو بنا کر ہاتھی گھوڑے خزانے

راج پاٹ سب کچھ چھین لیا۔ گدی پر قبضہ کرنے کے بعد پشکار نے نل کو دھکے دے کر محل سے باہر نکال دیا۔ دمنتی اُس کے ہمراہ تھی جنگل کا سناٹا، ہُو کا عالم، نازک تلوے کانٹوں سے چھلنی ہو گئے۔ جھاڑیوں سے اٹک اٹک کر کپڑے تار تار ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں اُفقِ مغرب سے سیاہی کالی کالی سیاہ پرچم لہراتا ہوا اُٹھا اور تمام عالم پر چھا گیا۔ نل اور دمنتی ایک درخت کے نیچے چُپ چاپ بیٹھے تھے۔ لبوں پر آہیں تھیں۔ آنکھوں میں آنسو تھے دل خون ہو رہا تھا۔ چاروں طرف سے جنگلی جانوروں کے غرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گھاس پر سانپ سرسرا رہے تھے۔ تیز ہوا سائیں سائیں کرتی درختوں کو جھکا رہی تھی۔ عجب یاس کا عالم تھا۔ محلوں میں پرورش پانے والے دشتِ غربت کی خاک چھان رہے تھے۔ پیٹ میں بھوک کی وجہ سے آگ سی لگی تھی مگر اُس جنگل میں کوئی چیز کھانے کے قابل نظر نہ آتی تھی۔ خدا خدا کر کے رات گزری۔ ستارے ماند پڑ گئے۔ مشرق سے آفتاب نے سر نکالا۔ اتفاق سے ایک پرندہ اُڑتا ہوا اُن کے قریب آ بیٹھا۔ نل بھوک سے بیتاب تھا۔ اُسے پکڑنے کے لئے اپنا کُرتہ اُتار کر اُس پر پھینکا۔ وہ پرندہ اُس کا کُرتہ لے کر اُڑ گیا اور دونوں میاں بیوی ہاتھ ملتے رہ گئے۔

اُس کے بعد دونوں اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے، چلتے چلتے دریا کے قریب پہنچے۔ ریتے میں چند مچھلیاں پڑی تھیں۔ نل کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں پکڑ کر دمنتی کے حوالے کیں۔ وہ اُنہیں بھوننے کے لئے سوکھی لکڑیاں جمع کرنے لگی اور نل نہانے کے لئے گھاٹ کی تلاش میں ذرا دُور نکل گیا۔ جب دمنتی واپس لوٹی تو مچھلیاں اُچھل کر دریا میں جا گریں۔ دمنتی صدمہ کی شدت سے بیہوش ہو گئی مگر صبر کا دامن ہاتھ سے نہ دیا۔ جب نل نہا کر واپس آیا تو اپنی بیوی کو دریا کے کنارے سر جھکائے حیران و پریشان دیکھا۔ مچھلیاں غائب تھیں۔ دمنتی نے آنسوؤں کی زبان سے اپنی بے کسی کی داستان سُنائی۔ نل کا دل بھر آیا۔ دونوں وہاں بیٹھ کر اپنی بدبختی پر آنسو بہاتے رہے اور پھر خوراک کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔

(۳)

نل سے دمنتی کی تکلیف دیکھی نہ گئی۔ بھوک کی وجہ سے اُسے چکر آ رہے تھے۔ آخر اُس نے دل کڑا کر کے اُس سے کہا۔

"جانِ من تو اس جنگل میں کیوں بھٹک رہی ہے اور میری وجہ سے اپنی زندگی برباد کر رہی ہے تو مجھے میرے حال پر چھوڑ اور چلی جا تاکہ تیری باقی زندگی آرام سے کٹے۔"

دمنتی نے جب اپنے محبوب کی زبان سے یہ الفاظ سُنے تو دُنیا اُس کی نگاہوں میں اندھیر ہو گئی۔ اُس نے جواب میں کہا۔

"سرتاج آپ نے میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ اب میں آپ کے قدموں میں جان دوں گی۔ آپ کی خدمت میرا دھرم ہے۔ آپ کے بغیر شاہی محل اُجاڑ بیابان سے زیادہ بھیانک ہے اور آپ کے ہمراہ کانٹوں بھرا ہوا جنگل گلزار سے زیادہ مرغوب ہے۔ میں آپ کی داسی ہوں مجھے اپنے چرنوں سے جُدا نہ کیجئے۔"

نل یہ جواب سُن کر خاموش ہو گیا اور اسی طرح پھرتے پھراتے رات ہو گئی۔ دونوں تھک کر لیٹ گئے جب رات بھیگی تو نل چُپکے سے اُٹھا اور دمنتی کو وہیں چھوڑ کر کہیں دُور چلا گیا۔

دوسرے دن صبح سویرے دمنتی خواب سے بیدار ہوئی اور نل کو موجود نہ پا کر اُس کے دل پر چھریاں چل گئیں۔ بال نوچتی تھی، خاک اُڑاتی تھی۔ دیوانوں کی مانند اِدھر اُدھر دوڑتی تھی مگر نل کا نشان نہیں ملتا تھا۔ تنگ آ کر اُس نے زندگی کے پھندے سے رہائی حاصل کرنے کی ٹھانی۔ وہاں بیسیوں شیر اور چیتے گھوم رہے تھے وہ اُن کے راستہ میں جا کھڑی ہوئی مگر اُسے دیکھ کر وحشی جانور کونوں کھدروں میں دبک جاتے۔ بھیڑیئے اُس کے سایہ سے ڈرتے تھے اور شیر اُس کے قدموں کی آہٹ سُن کر بھاگ جاتے تھے۔ دوپہر کے قریب دمنتی دریائے نربدا تک جا پہنچی اور خدا کا نام لے کر اُس میں کود پڑی۔ عین اُس وقت سواروں کا ایک دستہ وہاں آ گیا۔ ایک منچلے جوان نے اُسے دریا سے نکالا۔ وہ خود شرم و حیا سے زمین میں گڑی جاتی تھی۔ سواروں کے افسر نے اُسے تسلی دی سمجھایا بجھایا اور ساتھ لے کر اپنے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ چار میل کے فاصلے پر ایک گھنا جنگل تھا۔ وہاں مست ہاتھیوں کے ایک غول نے سواروں پر حملہ کر دیا اور وہ سب مارے گئے، دمنتی اور دو برہمنوں نے بھاگ کر جان بچائی باقی سب اُسی جگہ ہلاک ہو گئے۔ دمنتی برہمنوں کے ہمراہ رتلام جا پہنچی۔ وہاں کا راجہ بڑا نیک اور مہربان تھا اُس نے دمنتی کی کہانی سُنی اور اُسے اپنی مُنہ بولی بیٹی بنا کر محل میں بھجوا دیا۔ جہاں وہ دوسری راجکماریوں کے ہمراہ رہنے لگی۔

(۴)

نل دمنتی سے جُدا ہو کر اندھیرے میں کئی میل دُور چلا گیا۔ جب وہ

...ہوئی تو دل میں اُلجھن سی پیدا ہوئی۔ دمنتی کی جدائی دل اور دماغ پر اُسے چلانے لگی۔ دیوانہ وار اُس درخت کی طرف بھاگا جہاں دمنتی سے جُدا ہوا تھا مگر وہاں ہوا کی سائیں سائیں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ جوشِ جنوں میں اِدھر اُدھر دوڑا۔ دمنتی کو پکارا مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ اب اُس کا معمول تھا کہ دو چار گھنٹے اِدھر اُدھر دوڑتا پھرتا پھر واپس آکر اُس خاک کا طواف کرتا جہاں دمنتی رات بھر سوئی تھی اور وہ مٹی سر آنکھوں پر لگاتا۔

کئی روز کے بعد مایوس ہو کر وہاں سے چلا۔ راستہ میں ایک جگہ جنگل میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ایک سانپ اُس کے شعلوں میں گرفتار تھا نل زندگی سے بیزار تھا۔ سانپ کو ہاتھ سے پکڑ کر بھڑکتی ہوئی آگ سے باہر کھینچ لیا۔ سانپ نے اُس کے ہاتھ پر کاٹ کھایا۔ نل زہر کے اثر سے کئی روز بے ہوش رہا۔ آخر جب ہوش میں آیا تو تمام جسم توے کی طرح سیاہ ہو چکا تھا۔ سرد آہ بھر کر ایک پگڈنڈی پر ہو لیا اور کئی روز سفر کرنے کے بعد اجدھیا کے خوبصورت شہر میں پہنچ گیا۔ وہاں کے راجہ رتوپرن کو مخبروں نے اطلاع دی کہ ایک سیاہ فام اجنبی شہر کے دروازہ پر کھڑا ہے۔ راجہ نے نل کو بلایا اور نام و نشان پوچھا۔ نل نے جواب دیا۔

"مہاراج میرا نام باہک ہے۔ اس شہر میں پردیسی ہوں۔"

راجہ نے پوچھا "باہک فوج میں نوکری کرو گے؟"

نل کو گھوڑوں سے بڑی دلچسپی تھی اور رتھ چلانے میں ہندوستان کا کوئی رتھ بان اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اُس نے سوچ بچار کے بعد جواب دیا۔

"مہاراج برسوں مہاراجہ گندھارا کا رتھ بان رہا ہوں، خاص کے گھوڑے میری نگرانی میں تھے۔"

راجہ رتوپرن نے نل کو ملازم رکھ لیا اور وہ اُس کے رتھ بان کے فرائض ادا کرنے لگا۔ چار روز کے بعد ساتھیوں نے اطلاع دی کہ نیا ملازم تمام رات بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہتا ہے۔ دن بھر کام کرتا ہے اور رات کو جاگ کر سرد آہیں بھرتا ہے۔ راجہ نے حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کی مگر نل اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر ٹال گیا۔

(۵)

جب وِدربھ نگر کے راجہ بھیم نے نل کی تباہی کی داستان سُنی تو آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ محل میں کہرام مچ گیا راجہ نے کئی ہوشیار آدمی دمنتی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھیجے اُن میں ایک جس کا نام سُدیو تھا رتلام پہنچ گیا۔ اُس روز کوئی تہوار تھا۔ شہر کی خلقت ایک مندر میں جمع تھی۔ سُدیو وہاں چلا گیا اور دمنتی کو پہچان لیا۔ دمنتی اُس سے ملی اور اپنے والدین کی خیریت دریافت کی۔ جب رتلام کے راجہ کو سُدیو کی آمد کی اطلاع ہوئی تو اُس نے دمنتی کو قیمتی تحائف دیکر چند سواروں کی حفاظت میں وِدربھ نگر پہنچا دیا۔ دمنتی اپنے باپ کے محل میں رہنے لگی وہاں اُس کیلئے آرام و آسائش کے تمام اسباب مہیا تھے مگر دل بے چین تھا۔ وہ سارا دن مُنہ لپیٹ کر روتی رہتی۔ کھانے پینے سے اُسے چڑ تھی رنگین لباس سے نفرت تھی۔ وِدربھ نگر کا راجہ اُس کی یہ حالت دیکھ کر دل ہی دل میں کُڑھتا مگر مجبور تھا۔ اُس نے نل کی تلاش میں کئی آدمی اِدھر اُدھر روانہ کئے اُن میں ایک اجدھیا پہنچ گیا جو رتھ چلانے میں نل کی مہارت سے واقف تھا۔ جب اُس نے راجہ رتوپرن کے رتھ بان باہک کو دیکھا تو صورت آشنا دکھائی دی مگر رنگت سیاہ تھی اس لئے اُسے یقین نہ آیا۔ بعد میں جب اُس نے باہک کو رتھ چلاتے دیکھا تو شبہ یقین میں بدل گیا اور وِدربھ نگر پہنچ کر اُس نے راجہ بھیم کو تمام حالات سے اطلاع دے دی۔ نل کی صورت اور رتھ چلانے کا طریقہ اُس کے حق میں تھے مگر رنگت خلاف تھی۔ آخر راجہ بھیم نے اُس آدمی کو دوبارہ اجدھیا بھیجا۔ وہ راجہ رتوپرن سے ملا اور باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ وِدربھ نگر میں دمنتی کا دوبارہ سوئمبر ہونے والا ہے اور صرف پانچ دن رہ گئے ہیں۔

راجہ دمنتی کے حُسن کا شہرہ سُن چکا تھا فوراً چلنے کے لئے تیار ہو گیا مگر مشکل یہ تھی دُور دراز کا راستہ تھا اور صرف پانچ دن باقی تھے اس نے اپنے رتھ بان کو بلایا اور اُس سے مشورہ کیا۔ دمنتی کے سوئمبر کی خبر سُن کر نل سخت پریشان ہوا۔ چہرے پر زردی چھا گئی جسم کانپنے لگا مگر اپنے آپ کو سنبھالا اور راجہ رتوپرن کو اپنی مہارت کے بل پر پانچ دن میں وِدربھ نگر پہنچانے کا اقرار کیا۔ اُسی وقت رتھ تیار ہو گیا۔ نل نے اپنی مرضی کے مطابق گھوڑے چُنے۔ اُس وقت اُس کے خیالات آگ کی طرح بھڑک رہے تھے۔ ڈوب مرنے کو جی چاہتا تھا مگر اس ڈرامے کا آخری سین دیکھنے کی خواہش اُسے کشاں کشاں وِدربھ نگر لئے جا رہی تھی۔

پانچ دن کے بعد دونوں وِدھیا نگر پہنچ گئے۔ رتو پرن کا خیال تھا وہاں دیس دیس کے راجہ مہاراجہ موجود ہوں گے مگر وہاں ہُو کا عالم طاری تھا۔ جی کڑا کرکے راج محل کے دروازے تک گیا۔ بھیم نے اپنے مہمان سے بڑے تپاک سے ملاقات کی اور ایک محل میں ٹھہرایا۔ دمنتی کی ایک سہیلی حالات دریافت کرنے کے لئے وہاں آئی۔ راجہ کا رتھ بان باہک صورت شکل میں نل سے ملتا تھا مگر اُس کی رنگت توے کو شرماتی تھی۔ دمنتی نے نل کو اپنے محل میں بلا بھیجا وہاں اُس کی حقیقت ظاہر ہوتی مگر وہ اپنی سیاہ رنگت کی وجہ سے شش و پنج میں پڑا جاتا تھا۔ جب رتو پرن کو معلوم ہوا کہ اُس کا رتھ بان حقیقت میں اجین کا راجہ نل تھا تو وہ اُسے ملا کر بڑے تپاک سے ملا اور اُس سے پگڑی بدل کر اُس کا بھائی بن گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ نل نے اپنا راج جوئے میں ہرا دیا تھا۔ راجہ رتو پرن جوئے کے فن میں کامل تھا اُس نے نل کو بھی اس فن میں پورا ماہر بنا دیا تاکہ وہ اپنے بھائی سے اپنا علاقہ واپس لے سکے۔

چند روز کے بعد اتفاق سے ایک سادھو جو جڑی بوٹیوں کے متعلق غیر معمولی معلومات رکھتا تھا وہاں آ گیا اُس نے نل کو کھانے کی ایک دوا دی جس کے استعمال سے چند روز میں زہر کا اثر دُور ہو گیا اور نل کے جسم کی سیاہ رنگت غائب ہو گئی۔

کچھ عرصے کے بعد نل بہت بڑی فوج لے کر اجین کو سَر کرنے کیلئے وِدھیا نگر سے روانہ ہوا۔ جب اجین کے قریب پہنچا تو پشکار فوج لے کر سامنے آیا۔ اُمرا نے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کی پشکار نے نل کو دوبارہ جوئے کے میدان میں نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ اُسی جگہ پانسے منگوائے گئے مگر خلاف توقع نل جیت گیا اور پشکار نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے۔

نل نے حکومت کی باگ سنبھالی۔ اجین میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے اور رعیت نے گھی کے چراغ جلائے۔ کئی برس حکومت کرنے کے بعد نل کا دِل دُنیا سے اُچاٹ ہو گیا اور وہ خدا کی عبادت کرنے کے لئے جنگلوں میں چلا گیا۔ دمنتی اُس کے ہمراہ تھی۔

ایک دن اُس نے دمنتی کو بُلایا اور کہا۔

"اَب مجھے سفرِ آخرت درپیش ہے میرے غم میں اپنے آپ کو ہلکان نہ کرنا اور خدا کی عبادت میں مصروف رہنا"

اُسی روز شام کے قریب نل نے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ دوسرے دن اُسے صندلی چِتا پر حوالۂ آتش کیا گیا۔ جب شُعلے بھڑک اُٹھے تو دمنتی دُلہن بنی ہوئی آگے بڑھی اور شعلوں میں کُود کر اپنے محبوب پر فدا ہو گئی ؎

چوں زنِ ہندو کسے در عاشقی مردانہ نیست
سوختن بر شمعِ مُردہ کارِ ہر پروانہ نیست

آتشِ شوق

از:۔
حضرت سروش عسکری طباطبائیؒ

دل کی لگی یہ بھڑکی سوزِ غمِ نہاں سے
آنکھوں سے آگ برسی شعلے اُٹھے زباں سے
ترتیب آؤ دے لیں افسانۂ محبت
میں پھر وہاں سے چھیڑوں بھُولے ہو تم جہاں سے
آتی تو جذبِ اُلفت تاثیر کر چلا ہے
نامہربان کامل ہیں نیم مہرباں سے
اوجھل ہوا نظر سے جب کارواں کا سایہ
روئے لپٹ کے کیا کیا ہم گردِ کارواں سے
یارب یہ عاشقی میں کیا انقلاب آیا
ہم اور بدگماں ہے، وہ اور مہرباں سے
تھی ضامنِ حفاظت موجوں کی سر بلندی
ڈوبی وہیں یہ کشتی طوفاں گھٹا جہاں سے

فتح پور سیکری کے شاہی جشن

تاریخ مغلیہ کا ایک ورق

از جناب مولوی نور احمد خاں فریدی چشتی

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار
(اقبالؒ)

قارئین کرام! تھوڑی دیر کے لئے جسمانی آنکھیں بند کر کے تصور کی آنکھیں کھول لیجئے اور چار سو برس پیچھے پلٹ کر "فتح پور سیکری" کے منظرِ علم پر ایک نظر ڈالئے۔

— ایک خاموش — پُر امن گاؤں — سنگتراشوں کے چند جھونپڑے — پہاڑ کی تلہٹی میں ایک غار لو دیس —! باشندے نہایت غریب، پتھر تراش تراش کر پیٹ کے دوزخ کو بھرتے ہیں، اور پانچوں وقت پاس کی ایک مسجد میں نماز ادا کرتے ہیں۔ پاس ہی ایک غار ہے جس میں ایک مرد درویش — دُنیا سے مستغنی — اپنی دُنیا کا آپ بادشاہ گوشۂ فقر و غنا میں بیٹھا اللہ اللہ کر رہا ہے۔ اچانک ایک غلغلہ سا برپا ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان کا باجبروت سلطان — جلال الدین اکبر اپنے خدم و حشم کے ساتھ شیخ کی زیارت کے لئے حاضر ہو رہا ہے۔ فوجیں رک جاتی ہیں۔ شاہانہ سواری سے بتیس سال کا باوقار انسان نیچے اترتا ہے۔ شیخ محمد بخاری اور معین الملک کی رہنمائی میں، پیادہ پا چل کر غار تک پہنچتا ہے اور دُنیا کیا دیکھتی ہے۔ کہ وہی کوہ وقار شخصیت جس کے نام سے پیل پیکر پہلوان کانپ اُٹھتے تھے جس کی حکومت کا فرمان برما سے بلخ اور بخارا تک جاری تھا۔ شیخ کے قدموں میں گرا ہوا ہے اور بلک بلک کر بقائے نسل اور قیامِ سلطنت کے لئے ایک فرزند کی بھیک طلب کر رہا ہے۔ "فقر" کی بارگاہ میں "شاہی" سرنگوں ہے۔ طاغوتی قوتیں پامال ہو رہی ہیں۔ انکسار، فروتنی، رقت، سوز و گداز اور خاکساری کے پاکیزہ جذبات بیدار ہو رہے ہیں۔ اکبری عجز و انکسار کا یہ حسین منظر دیکھ کر رحمتِ کاملہ جوش میں آتی ہے۔ اور شیخ مراقبہ سے سر اُٹھا کر الہامی انداز میں ذیل کی خوشخبری دیتا ہے:—

"اکبر! تسلی رکھ۔ خدائے ذوالجلال عنقریب تیرے گھرانے کو فرزندِ دلبند کے نور سے روشن کرنے والا ہے"

اس خوشی سے بادشاہ کا چہرہ تمتما اُٹھتا ہے۔ اسی گاؤں میں بیگمات شاہی طلب کی جاتی ہیں۔ اور شیخ کے پاس ہی بادشاہ مستقل سکونت اختیار کرتا ہے۔ شیخ کے گھر کا نان و نمک کھا کر اور خدا کا شکرانہ پڑھ کر اپنی زندگی کے دن گزارنے لگتا ہے۔ ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ ہجری کو مشکوئے معلیٰ میں سلطان اکبر کا جگر گوشہ پیدا ہوتا ہے۔ ممالک محروسہ میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اور فالِ نیک کے لئے شیخ کے نام پر شہزادے کا نام "سلیم" رکھا جاتا ہے۔ اور شیخ کی خواہش پر اسی گاؤں کے قریب جہاں شہنشاہ بابر نے رانا سانگا پر فتح پائی تھی ایک شہر کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے جہاں چند سال پہلے چھ سات جھونپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سُرخ پتھروں کی عمارتوں کا لامتناہی سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ "یہاں ریگستانی گرمی، سموم اثر طوفان، گرد و غبار اور خوبصورت مناظر کا اس قدر فقدان درپیش تھا۔ کہ اگر انسان دیکھے تو دل بیٹھ جائے۔ اور ایسے بیابان میں گلستان کا خواب دیکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا مگر اکبری ذوق و ہمت نے وہ لالہ زار بنا دیا۔ کہ یہ مقام تمام عالم میں انتخاب ہو گیا" اور نصف صدی تک ہاں یہاں وہ گہما گہمی رہی۔ کہ لندن اور دہلی بھی اس کا لگانہ کھا سکتے تھے۔ لیکن دفعۃً جس سرعت کے ساتھ اس کی رونق بڑھی تھی۔ اسی سرعت سے شہر مسکنِ مار و مور بن کر رہ جاتا ہے۔

اب آپ اس سوال پر غور کیجئے۔ کہ فتح پور سیکری کا اس دلکش بنا پر ظلمت کیوں چھا گئی۔ اور اکبر کے اس گلشن پر دفعۃً خزاں کا گذر کیوں ہوا

تاریخ دان حضرات یہ کہتے ہیں۔ کہ بعض سیاسی مصالح ایسے پیدا ہو گئے تھے۔ جن کی بنا پر شہنشاہ کے لئے عنان توجہ کا لاہور اور پھر آگرہ کی طرف منعطف کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ متصوفین حضرات یہ سب کچھ تسلیم کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں۔ کہ فتحپور کی آبادی اور بربادی میں آغاز سے انجام تک شیخ سلیم رحمتہ اللہ علیہ کا روحانی تصرف کارفرما رہا۔ بہر حال یہ شہر اب کھنڈروں میں تبدیل ہو چکا ہے اور ہمارے پیش نظر اس کا لفظی تصویر پیش کرنا ہے۔

مغل آرٹ

فتحپور سیکری کے محلات و ایوان میں امتداد زمانہ کے باوجود کہنگی کے آثار دکھائی نہیں ملتے۔ معلوم یوں ہوتا ہے۔ کہ گویا مکین ابھی ابھی اُسے چھوڑ کر گئے ہیں۔ محلات کی خوبصورتی و نفاست اور مضبوطی و پختگی اب ضرب المثل بن چکی ہے۔ نگاہِ عبرت دیکھتی ہے۔ اور قدرت کی بے نیازی پر حیران رہ جاتی ہے۔ اگرچہ شہنشاہ اکبر اور شاہِ جہانگیر ان محلات میں نہیں ملتے۔ تاہم ان کے ذرہ ذرہ میں ان کے جبروت و جلال اور ان کی فیاضی و علو ہمتی کی چمک موجود ہے۔ باکمال سنگتراشوں اور عالی دماغ نقاشوں نے ان عمارات کو عجیب و غریب نقش و نگار اور انواع و اقسام کی زیبائشوں سے اس خوبی کے ساتھ مزین اور مرصع کیا ہے کہ پتھر کی مضبوطی اور نفاست کا تو کیا کہنا بلکہ جس گارے یا چونے سے پتھروں کو وصل کیا ہے۔ وہ بھی فولاد کو شرماتا اور مشت حات کو مات کرتا ہے۔ بڑے بڑے انجینئر اور کیمسٹ اس کے اجزا علیحدہ نہیں کر سکتے۔ اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ گارا کس ترکیب اور کن اجزا سے بنایا گیا ہے۔

محلات کے اندر مغل آرٹ کے وہ نادر خزانے جمع ہیں۔ کہ جنہیں دیکھ کر ہی ذوقِ سلیم کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اصل مغل آرٹ اکبر کے زمانے ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس نے مسلم آرٹ اور ہندو آرٹ کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ایک نئے آرٹ کی بنیاد ڈالی، جو بعد میں مغل آرٹ کہا جانے لگا۔ فتحپور میں اس نئے آرٹ کے ابتدائی شاہکار موجود ہیں۔ جو زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں۔ کہ یہ آرٹ ہندوستان کی عمارت سازی کے لئے بہترین ثابت ہوگا۔ اور واقعی یہ ہوا بھی۔ بابر اور ہمایوں کو جنگوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملی۔ کہ وہ کسی اور چیز کی طرف توجہ دے سکتے، اس لئے انہوں نے یہاں کم عمارتیں بنائی ہیں، اور جو بنائی ہیں، وہ مسلم طرز تعمیر کی حامل ہیں۔ لیکن اکبر اور اس کے بعد کی عمارتوں میں یہ نیا رنگ نمایاں ہے۔ اکبر کے خیالات بہت وسیع تھے۔ وہ ہر مذہب میں شوق لیتا تھا۔ کسی کے خیالات و احساسات کو مجروح کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے مل کر رہیں۔ باہم شادیاں کریں، اور اسی طرح زندگی کے ہر شعبے میں مل کر کام کریں۔ اُس نے خود اپنی اور اپنے لڑکوں کی ہندو عورتوں سے شادیاں کر کے اس کی مثال قائم کی۔ اور اس نئے آرٹ کے ظہور میں لانے کی بھی یہی وجہ تھی۔ کہ ان دونوں مذہبوں کی تہذیبوں کو باہم ملا دیا جائے۔

شہر کی تعمیر

اکبر اعظم نے بڑے شوق اور انتہائی محبت کے ساتھ اس شہر کی تعمیر کی تھی۔ اس کی رونق، آبادی، زیبائش اور اعزاز کا اُسے ہر وقت خیال رہتا تھا۔ وہ اسے اپنا دار الخلافہ بنانا چاہتا تھا۔ اور اسی مرکز سے چاروں طرف پیمائش شروع کرائی۔ پہلے موضع کا نام آدم پور دوسرے کا شیث پور اور تیسرا ایوب پور، غرضیکہ حکم ہوا۔ کہ تمام مواضعات پیغمبروں کے ناموں سے موسوم کئے جائیں۔ ۹۸۵ سنہ میں حکم دیا۔ کہ ٹکسال بھی یہیں جاری کی جائے۔ چنانچہ پہلے پہل چار گوشہ روپے بنائے گئے جب ایوان شاہی اور قصر ہائے عالی تعمیر ہو چکے۔ تو تمام اُمرائے دربار نے سنگین اور گچکاری کی عمارتیں بنا کر اپنے محلات کو آراستہ کیا۔ چوڑے چوپڑ کے بازار بنائے گئے۔ ہوادار بالاخانے، مدرسے، خانقاہیں، حمام، زنانے اور مردانے باغ بن کر تیار ہوئے۔ تو ادنیٰ درجے کے لوگوں نے بھی اپنی بساط کے مطابق مکان اور دوکان بنا کر رہائش اختیار کی۔ شہر کے گرد چونے کی فصیل بنائی گئی۔ چار کوس کے فاصلہ پر شہنشاہ اکبر کی والدہ ماجدہ کا محل تعمیر ہوا، اور ونکتا باغ لگا۔ اکناف و اطراف سے غرضمند لوگ اور سفیر آنے لگے۔ دیوان عام اور خاص میں اکبر اعظم کے دربار منعقد ہونے شروع ہوئے۔ داد و بخشش کے دروازے کھول دیئے گئے۔ آئے دن فتح و نصرت کی اطلاعیں پہنچتیں۔ دربار میں اکبری جشن ہوتے۔ تفریح و طرب کا انتظام ہوتا۔ بہادروں اور جاں سپاروں کی حوصلہ افزائی ہوتی۔ بڑے بڑے مہاراجے کوہ پیکر ہاتھیوں پر سوار ہو کر آتے۔ ان کے شایان شان استقبال ہوتا۔ بادشاہ بغلگیر ہو کر اپنے پہلو میں جگہ دیتا۔ اور عزت و احترام کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ ہونے پاتا۔ معزز مہمان خوشی کے مارے اپنے جامے میں

---

[1] از مسٹر محمد مختیار صاحب قریشی بی اے۔ (ضرورتاً تصرف)

...نے ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ اُمرائے دربار کو تو جیسے رشک و حسد لگا رہتا۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے علامہ روزگار، منعم خانخاناں۔ مرزا عزیز کوکلتاش، حسین خاں ٹکریہ۔ حبش دانش راجہ بیربر۔ ملا دو پیازہ۔ شیخ عبدالنبی صدر، شیخ عبدالقادر بدایونی، راجہ ٹوڈرمل۔ راجہ مان سنگھ۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں۔ حکیم ابوالفتح گیلانی۔ حکیم ہمام۔ حکیم نورالدین قراری۔ شاہ فتح اللہ شیرازی جیسے دانایانِ روزگار دربار میں ہر وقت حاضر رہتے۔ پہروں مذاکراتِ علمیہ سے دیوانِ عام گونجتا رہتا۔ رزم کے معاملات دیوانِ خاص میں طے ہوتے۔ بنگالہ، دکن، کابل اور قندھار کے خانزماں، علی قلی خاں شیبانی جیسے سرکشانِ کینہ توز کی سرکوبی کیلئے بڑے بڑے شجاع اور جان سپار افغان اور مہاراجے عزت کے ساتھ رخصت کئے جاتے۔ اکبرِ اعظم کے لشکرِ جرار مغلیہ پرچم لہراتے ہوئے روانہ ہوتے۔ شاہانِ ممالکِ غیر کے سفراء شرفِ باریابی حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے فرمانرواؤں کے ارشادات پیش کرتے۔ بڑے بڑے سوداگر ہزاروں کوسوں کے سفر طے کرتے ہوئے اکبری نام سُن کر یہاں حاضرِ دربار ہوتے۔ اور نادرۂ روزگار تحائف پیش کر کے منہ مانگا انعام پاتے۔ مرزا غیاث جیسے آشوبِ زمانہ کے شکار اور علی قلی خاں سے فلکِ جفا پیشہ کے ہاتھوں ظلم و ستم اٹھا کر یہاں پہنچتے۔ اور پانصدی پنجہزاری جیسے معزز منصب حاصل کر کے ہندوستان کی قسمتوں کے مالک بن بیٹھتے۔ انعام و اکرام کی غیر فانی بارشوں نے اور شاہ اکبر کی قدر شناسیوں نے فتحپور کو وہ شہرت بخشی۔ کہ اکناف و اطرافِ عالم میں دہلی و آگرہ اور طہران و قاہرہ کی طرح مشہور ہو گیا۔

جشنِ فتح

فتح پور سیکری نے ویسے تو اپنے شباب کے کئی دور دیکھے ہیں۔ لیکن کم از کم دو تقاریب ایسی ہیں۔ جنہیں جب تک اکبری عہد کے در و دیوار کے کنگرے اس شہر میں موجود رہیں گے، فراموش کرنا فتح پور کے بس میں بھی نہیں۔ ایک واقعہ تو یہ ہے۔ کہ ۹۸۰ھ میں اکبر دیوانِ عام میں دربار کر رہا تھا۔ اور اکبری نورتن سے سلطنت کا باز و آراستہ تھا۔ دفعتہً اطلاع پہنچی۔ کہ مرزا حسین چغتائی شہزادہ مالوہ کے ملک میں باغی ہو گیا۔ اختیار الملک دکنی بھی اس کے ساتھ مل گیا ہے۔ اُسی وقت بادشاہ نے چار پانچ سو جانثار جن میں تمام نامی سردار تھے۔ سانڈنیوں پر بیٹھ، دن کو دھوپ کھاتے نہ دن دیکھا نہ رات جنگل اور پہاڑ کاٹتا نویں دن گجرات جا پہنچا۔ جن سرداروں کو بادشاہ نے اپنے سے پہلے روانہ کیا تھا وہ رستے میں ملتے جاتے اور شرمندہ ہوتے۔ پھر بھی بادشاہ کے ہمرکاب چلنا دوبھر ہو گیا۔ اکثر ہانپتے کانپتے پیچھے دوڑے چلے آتے تھے جب میدان میں پہنچے۔ تو جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ اکبری علم کے نیچے لڑنے مرنے کو تین ہزار سردار تیار ہیں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ جوان پیچھے آ رہے ہیں، ان کی انتظار کر لینی چاہئے۔ کسی نے کہا۔ دشمن شبخون مارنا اچھا رہے گا۔ اکبر نے کہا۔ شبخون چوری اور انتظار بزدلی ہے۔ للکار آواز دی۔ ہاں زہمرن) سوو رن بیندا زید آپ اور سب سوار یا ہادی یا معین کے نعرے مارتے جا پڑے دشمن کو جب معلوم ہوا۔ کہ بادشاہ اسی گروہ میں ہے تو نام سنتے ہی ہوش اڑ گئے۔ فوج بکھر گئی۔ اور خود بھی سر دیا بھاگا۔ مگر بری طرح زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔ دو دن قیام کرنے کے بعد فتحمند لشکر دارالخلافہ کو واپس روانہ ہوا۔ قریب پہنچے۔ تو جو لوگ ہمراہ تھے، انہیں کچھ دور سے سجایا۔ چھوٹی چھوٹی برچھیاں ہاتھوں میں دیں اور خود بھی اسی لباس میں ملبوس ہوا امیر عسکر بن کر فتحپور میں داخل ہوئے۔ شہر بادشاہ کی آمد کی خوشی میں خوب سجایا گیا۔ اور اُمرائے حکومت و شرفائے ملت استقبال کو باہر نکل آئے۔ فیضی نے خوش آمدید کے طور پر ایک غزل سنائی جس کا مطلع تھا ؎

نسیم خوش دلی از فتح پور می آید
کہ بادشاہِ من از راہِ دور می آید

حاکمِ بدخشاں کی آمد

دوسری تقریب مرزا سلیمان حاکمِ بدخشاں کی آمد پر ہوئی۔ یہ شہزادہ تین واسطوں سے امیر تیمور کا پوتا تھا۔ ۹۸۳ھ میں میرزا سلیمان کو ان کے پوتے شاہرخ نے لڑ جھگڑ کر عالمِ پیری میں گھر سے نکال دیا یہ بدخشاں سے کابل پہنچے۔ مرزا حکیم فرمانروائے کابل سے استدعا کہ اس کس مپرسی کے عالم میں تم میری امداد کرو۔ مگر مرزا نے کچھ التفات نہ کیا۔ بدقسمت سلیمان نے عین مایوسی کے عالم میں دربارِ اکبری کا رخ کیا راستہ میں کئی جگہ پٹھانوں کے دیو زاد سلیمان پر گرے وہ بھی تھپر ہو کر گر گیا۔ خوب مردانگی سے مقابلے کئے۔ اور زخمی بھی ہوا۔ غرض لڑتا بھڑتا اٹک کے کنارہ تک آ پہنچا۔ اکبر کو عریضہ لکھا۔ اس میں ساری سرگذشت بیان کی۔ اور یہ بھی درج کیا۔ کہ اس وقت تحفہ یا پیشکش

ماخوذ از دربارِ اکبری۔ (مولانا محمد حسین آزاد)

کسی چیز تک ہاتھ نہیں پہنچا۔ دو گھوڑے ساتھ رہ گئے ہیں۔ کہ میرے خانہ زاد ہیں۔ یہی بھیجتا ہوں۔ تاکہ عریضہ خشک خالی نہ ہو۔

اگرچہ مرزا چند در چند ایسی حرکات کا موجب ہو چکا تھا کہ قابل عنایات شاہانہ نہ تھا۔ کوئی اور ہوتا۔ تو خدا معلوم کس طور طریق سے بدلے لیتا۔ مگر آخر اکبر تھا۔ مرزا کی اس قدر مہمان نوازی اور خاطر داری کی کہ نقاروں کی آواز بخارا اور سمرقند تک جا پہنچی۔ جب اس کا عریضہ پہنچا۔ تو کئی   گھوڑے اور بہت سے اجناسِ نفیس، خیمے اور بارگاہ اور حشمتِ شاہانہ کے سامان، پچاس ہزار روپیہ نقد اور آغا خان خزانچی وغیرہ اُمرا کو استقبال کیلئے بھیجا۔ راجہ مان سنگھ اُس وقت سرحد پشاور پر تھے۔ اور راجہ بھگوانداس پنجاب میں تھے۔ ان مزاج والوں نے اکبر کی مصالحِ ملکی اور اُس کی مرضی پر جان و مال کو قربان کر دیا تھا۔ بلکہ آئینِ اکبری کے اجزاء یہی لوگ تھے۔ مان سنگھ فوراً پہنچے۔ بڑی شان و شوکت سے استقبال کیا اور دُھوم دھام کی ضیافتیں کھلاتے لائے۔ راجہ بھگوانداس لاہور سے دریائے اٹک تک پہنچے۔ ضیافتیں کھلاتے لاتے تھے۔ اور جو جو اُمرا رستہ کے آس پاس تھے۔ پرگنوں اور شہروں سے نکل نکل کر مہمانداری کے لوازم ادا کرتے تھے۔ اسی طرح برابر لئے آئے۔ اکبر کو جب انتظاموں کے حالات معلوم ہوئے۔ تو بہت خوش ہوا۔ متھرا میں پہنچے۔ تو کئی امیر عالی رتبہ جن میں قاضی نظام بدخشی بھی شامل تھے۔ استقبال کو حاضر ہوئے۔ فتح پور کے پاس پہنچے تو اول علماء و شرفاء و اکابر و مفتی و صدر الصدور، پھر اُمراء ارکانِ دولت، پھر خود بادشاہ پانچ کوس تک پیشوائی کو بڑھے۔ پانچ ہزار ہاتھی جن پر مخمل فرنگی اور زربفت کی جھولیں جھول رہی تھیں۔ سونے چاندی کی زنجیریں سونڈوں میں ہلاتے، سراگائے کی کالی اور سفید دُمیں سر اور گردن پر لٹکاتے دو طرفہ برابر قطار باندھے تھے۔ ایرانی و عربی گھوڑے، طلائی و نقرئی زینوں سے سجے مرصع ساز لگے دو دو ہاتھیوں کے بیچ میں ایک ایک چیتا۔ گلے میں سونے کی زنجیر اور جھنور کلی، مخمل زرکار کی جھول، ایک ایک سپاہی رنگین چھکڑے پر بیٹھا، ہر چھکڑے میں ناگوری بیلوں کی جوڑی، بیلوں پر شالہائے کشمیری اور کمخواب کی جھولیں، سروں پر تاجِ زرکار، تین کوس تک تمام جنگل نگار خانۂ بہار ہو رہا تھا۔ دیکھنے والے حیران تھے۔ کہ یہ کیا طلسمات ہے، کیونکہ آج تک اس انتظام کے ساتھ یہ سامان کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ سپاہی قدم قدم پر تعینات تھے۔ کہ سلسلۂ راہ میں کہیں خلل راہ نہ پائے۔

شہر فتحپور کے بازار گلی کوچے صاف۔ ہر جگہ چھڑکاؤ، دوکانیں آئین بندی سے آراستہ تھیں، عید کا دن معلوم ہوتا تھا۔ شہر کے شرفا کی عورتوں نے بالاخانوں میں بن سنور کر بیٹھے تھے۔ تماشائیوں کے ہجوم سے بازاروں میں رستے بند تھے۔ جس وقت بادشاہ نظر آئے مرزا گھوڑے سے کود پڑا اور آگے دوڑا کر تسلیم بجا لائے۔ تورۂ ترکانہ اور آدابِ شاہانہ کا آئین یہی تھا۔ مگر اکبر نے قرابت اور بزرگی عمر کی رعایت رکھی، جھٹ اُتر پڑا۔ جُھک کر سلام کیا۔ اور عمو عمو کہہ کر بغلگیری کے ہاتھ بڑھائے۔ مرزا کو تسلیم و کورنش وغیرہ نہ کرنے دی، گلے ملے اور سوار ہو گئے۔ دولت خانۂ انوپ تلاؤ کے در و دیوار صحن۔ طاق۔ محرابوں میں پردے۔ سائبان زریں، گُل نبی گلدستے سونے روپے کے مرصّع۔ ایوان و مکانات فرش ہائے مخملی و قالین ابریشمی سے آراستہ تھے۔ وہاں آکر دربار کیا۔ مرزا کو اپنے پہلو میں جگہ دی۔ جہانگیر بچہ تھا اُسے بھی بُلا کر ملایا۔ اور ہتھیا پول دروازہ پر جہاں نقار خانہ تھا، انہیں اُتارا۔ اور جب تک مرزا فتحپور رہے دیوانِ عام میں دسترخوانِ عام لگتا رہا۔ اُمراء سے عام سپاہیوں تک شیلان ترکانہ پر کھانا کھاتے تھے۔ کچھ عرصہ ٹھہر کر مرزا حج کیلئے رخصت ہوئے۔ تو اکبر نے پچاس ہزار روپیہ خزانہ سے دیا۔ اور بیس ہزار کا فرمان خزانہ گجرات پر لکھ دیا۔

اکبر کے بعد

اسی طرح جب تک اکبر زندہ رہا فتحپور میں ہر روز روزِ عید و ہر شب شبِ قدر کا عالم طاری رہا۔ مگر افسوس بعد کے جانشینوں نے اپنی عنانِ توجہ آگرہ اور دہلی کی طرف پھیر دی، اور فتحپور طاقِ نسیاں بنکر رہ گیا۔ جن محلات میں آٹھوں پہر شادیانے بجا کرتے تھے۔ محض سرائے بنکر رہ گئے۔ اور جن ایوانوں میں افرادِ شاہی کے سوا کسی فرد بشر کو داخلہ کی اجازت نہ تھی۔ بندروں اور چمگادڑوں کا مسکن بنکر رہ گئے۔ تاہم جب کبھی سلطنتِ شاہی کا اس طرف نزول ہوتا تو جہانگیری شوکت و قبا اور شاہجہانی عظمت و جلال سے فتح پور کے در و دیوار گونج اُٹھتے گویا مُردہ تن میں جان پڑ جاتی۔ نیک نام بادشاہوں کے مقدم سے یہ شہر فرقہ وار فسادات سے محض ناآشنا رہا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اپنے دور میں دریائے محبت کا یہ ایک ایسا گھاٹ تھا جس پر ہندوستان کے رنگا رنگ کے فرقے باہم شیر و شکر ہو کر پانی پیتے اور آشتی کرتے تھے۔ مگر شاہ عالمگیر کے بعد کے سلاطین و اُمراء اپنی عیش پسندی کے سبب اپنے آبا و اجداد کی عظمت کھو بیٹھے اور خود بھی ذلیل و خوار ہو کر خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ آج فلک بوس قصر و ایوان

بادۂ عشق کی موجیں

دیکھو کسی دن ہاتھ سے گر کر دل کا کھلونا ٹوٹ نہ جائے

از حضرت نثار اٹاوی

نشہ بقدرِ ظرف عطا کر بن کر قسمت پھوٹ نہ جائے
تند ہیں بادۂ عشق کی موجیں شیشۂ ہستی ٹوٹ نہ جائے

دیکھ کے چل یہ راہ مسافر توشۂ آخر چھوٹ نہ جائے
دور ہے گھر تاریک ہیں راتیں موت کا رہزن لوٹ نہ جائے

اللہ رے حسنِ جلوۂ ساقی اللہ رے کیفِ بادۂ باقی
ہوش کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے ہاتھ سے ساغر چھوٹ نہ جائے

غم جو دیا ممنونِ کرم ہوں لیکن اتنی عرض ہے میری
کشمکش اندوہ و وفا میں سانس کا ڈورا ٹوٹ نہ جائے

ناؤ ہے کہنہ کبر و خودی کی پی کر گلابی مست ہے مانجھی
سخت ہے آندھی تیز ہے طوفاں ہاتھ سے لنگر چھوٹ نہ جائے

فرض ہے مجھ پر اس کی حفاظت ان کا عطیہ ان کی امانت
چارہ گرِ دل تیرِ محبت کھینچ نہ دل سے ٹوٹ نہ جائے

اس کی قدر نثار سے پوچھو مان بھی لو اس طرح نہ کھیلو
دیکھو کسی دن ہاتھ سے گر کر دل کا کھلونا ٹوٹ نہ جائے

چار ملاقاتیں

نوشتہ :- ہنری جیمس

مترجمہ :- جناب عزیز احمد (عثمانیہ)

میں اس سے چار مرتبہ مل چکا ہوں لیکن مجھے کچھ کچھ یاد ہے کہ اس نے مجھ پر ایک خاص اثر ڈالا تھا۔ میں اُسے ایک خوبصورت اور جاذب نظر عورت سمجھا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک عجیب اور پراسرار ہستی۔ میں اس کی موت کی خبر سن کر غمزدہ ہوگیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ مجھے رنجیدہ نہ ہونا چاہئے۔ آخری مرتبہ جب میں اس سے ملا تو وہ یقیناً ..... لیکن ٹھہریئے میں اپنی چاروں ملاقاتوں کو ترتیب سے بیان کرتا ہوں۔

پہلی ملاقات

پہلی ملاقات اُس سے شہر میں ہوئی۔ وہ ایک برفبار رات تھی۔ اس واقعہ کو سترہ برس کا عرصہ ہوتا ہے۔ میرا دوست لاثریج کرسمس کے دن اپنی ماں کے پاس گرم ونسٹر (انگلستان) میں گزارنے جارہا تھا۔ اور وہ اپنے ساتھ مجھے بھی لے جانے میں کامیاب ہوا۔ وہ نیک عورت میری آمد پر بہت خوش ہوئی اور اس نے ایک تفریحی پروگرام ترتیب دیا۔ ان دنوں مجھے انگلستان میں رہنے کا اس سے پہلے کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ دعوت کی محفل تھی۔ تمام دن برفباری ہوتی رہی اور اس وقت بھی ہوائیں قابل لحاظ طور پر سرد تھیں۔ مجھے خوف تھا کہ عورتیں کس طرح اس خراب موسم میں گھر پہنچیں گی؟ مسز لاثریج نے کھانے کے بعد مجھ سے پوچھا کیا تم یورپ کے مختلف مقامات کے فوٹوؤں کا البم جو تم اپنے ساتھ لائے ہو۔ عورتوں کو دکھاؤ گے؟"

میں نے جواب دینے کی بجائے چاروں طرف اپنی نظر دوڑائی ایک جگہ میری نظریں گڑ گئیں۔ جہاں درحقیقت ایک ایسا منظر تھا، جس کی حامل عام طور پر حسین عورتیں ہوتی ہیں۔ وہاں آتشدان کے پاس ایک عورت کھڑی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک ایسا دلنواز تبسم تھا جو بیک وقت تعجب انگیز اور بیباکانہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ایک لمحہ تک اسے دیکھا اور کہا۔ "اگر وہ نوجوان خاتون میری تصویریں دیکھنا پسند کرے۔"

"کیونکہ یہی مقام کشش ہے۔" مسز لاثریج نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لیکن وہ خوشامد پسند نہیں ہے۔ پھر بھی میں تمہارا پیغام اس تک پہنچاؤں گی۔"

میں یہ سن کر خوش ہوا کہ وہ خوشامد پسند عورت نہیں ہے تو ضرور وہ میری پسندیدہ عورت ہوگی۔ مسز لاثریج اس سے گفتگو کرنے جاچکی تھیں۔

"یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی۔" انھوں نے واپس آکر مجھ سے کہا۔ "وہ بہت خاموش مگر زندہ دل ہنس مکھ عورت ہے۔" اس کے بعد اُس سے میرا تعارف کرایا گیا۔

مس کارڈلائن اگرچہ واقعی مکمل حسن کا نمونہ نہ تھی پھر بھی وہ کافی دل آویز تھی۔ اگرچہ وہ اپنے تیسویں سال کو پورا کر رہی تھی لیکن اس پر بھی اس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔ اس کے بال نہایت خوبصورتی سے سنوارے گئے تھے یونانی عورتوں کی طرح۔ حالانکہ یہ بات مشتبہ تھی کہ آیا اس نے کبھی یونانی عورتوں کو دیکھا ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں اور ہونٹ باریک تھے جن کے درمیان خوبصورت دانت چمک رہے تھے۔ گلے میں جھالر کا گلوبند تھا جس میں پیازی رنگ کا پن بہت خوبصورت معلوم ہورہا تھا اس کے ہاتھ میں ایک پنکھا تھا جس کے کپڑے کا رنگ ہلکا آسمانی رنگ کا تھا۔ وہ گفتگو میں تھوڑے بہت ضابطہ اور اصول کی پابند معلوم ہوتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے اظہار خیال پر وہ نہ صرف خوشامد پسند نظر آتی تھی بلکہ بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بعد میں نے لیمپ کے قریب دو کرسیوں کو ملا کر اس پر البم رکھا۔ یہ تصویریں سوئٹزرلینڈ، اٹلی، پیرس اور سپین وغیرہ کی مشہور عمارتوں اور تاریخی مجسموں پر مشتمل تھیں۔ وہ میرے بازو کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے ان تصویروں سے متعلق وہ تمام باتیں بیان کیں جو میں جانتا تھا اور وہ خاموشی سے فوٹوؤں کو دیکھتی رہی اور میری باتوں کو غور سے سنتی رہی۔ پنکھے کی ڈنڈی کو منہ میں دبائے وہ نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ جب ایک تصویر سامنے آتی تو وہ عموماً مجھ سے سوال کرتی۔ "کیا تم نے یہ مقام دیکھا ہے؟" اور میں بھی جواب دیتا کہ بارہا میں اس جگہ کو دیکھ چکا ہوں

کیونکہ میں ایک زبردست سیاح ہوں۔ میں نے دیکھا کہ وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں نے اس سے پوچھا "کیا تم نے یورپ کی سیر کی ہے؟"

"نہیں نہیں!" وہ آہستہ سے بولی -اس کے بعد وہ خاموشی سے تصویریں دیکھتی رہی اور اپنی نظریں ایک منٹ کے لئے بھی کسی جانب بھٹکنے نہ دیں۔ اس کی خاموشی اور اس کا یہ انہماک دیکھ کر میں سمجھنے لگا کہ وہ یقیناً ناراض ہو گئی ہے یا گھبرا گئی ہے۔ اور جب میں نے تصویروں کا پہلا البم ختم کر کے اس کی جانب سوالیہ انداز سے دیکھا کہ اگر حکم ہو تو دوسرا البم لاؤں۔ تو میں نے دیکھا کہ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے ہلکے سے نشانات موجود ہیں اور میری طرف دیکھنے کی بجائے وہ دوسرے البم پہ نظریں گاڑے تھی جو کرسی پر اس کی داہنی طرف رکھا تھا۔

"کیا تم مجھے وہ تصویریں بھی دکھاؤ گے" اس نے جذباتی آواز میں پوچھا گویا اس کے احساسات مشتعل ہو گئے ہیں۔

"شوق سے" میں نے کہا۔ "اگر تم تھک نہ چکی ہو"

"نہیں میں بالکل تھکی ہوئی نہیں ہوں" اس نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "یہ شغل مجھے بہت عزیز ہے"

جب میں نے دوسرا البم اُسے دکھانے کے لئے کھولا تو اس نے اس پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ "کیا تم نے ان مناظر اور عمارات کو دیکھا بھی ہے جو اب تم مجھے بتانے والے ہو؟"

"البم کی پہلی تصویر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ مقام بھی میرا دیکھا ہوا ہے یہ تصویر جنیوا کی جھیل کے قریب محل شیلن کی تھی -"ہاں!" میں نے کہا "میں کئی بار تفریح کی غرض سے گیا ہوں۔ کیا یہ خوبصورت مقام نہیں ہے"

"آہ! کتنا حسین منظر ہے؟" وہ بولی اور ایک لمحہ تک تصویر دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔ "کیا یہ وہی قصر ہے جہاں بونیوارڈ قید کیا گیا تھا، جس کا بائرن نے اپنی نظم میں ذکر کیا ہے"

میں نے اس کی تصدیق کی۔ اور بائرن کی نظم کے بعض اشعار پڑھنے کی کوشش کی جس میں مجھے بہت کم کامیابی ہوئی کیونکہ اس نے تھوڑی دیر تک پنکھا ہلایا۔ پھر انہی شعروں کو صحت کے ساتھ پڑھا اس کی آواز نرم اور سماعت نواز تھی۔ جب اس نے اشعار ختم کئے تو وہ ستہ یا گئی۔ میں نے اس کی تعریف کی اور کہا کہ وہ سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کی سیاحت کے لئے بہت موزوں ہے۔ اس نے مجھے ترچھی نظروں سے دیکھا جیسے معلوم کرنے کے لئے کہ آیا میں نے یہ بات سنجیدگی سے کہا ہے یا مذاق کے طور پر میں نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اگر وہ بائرن کے بیان کو جانچنا چاہتی ہے تو اسے انگلستان سے باہر یورپ کی سیر کرنی چاہئے۔ موجودہ یورپ افسوسناک طور پر بائرن کے نظریہ سے مختلف ہوتا جا رہا ہے۔

"میں کب تک سیر کے لئے یورپ جاؤں" اس نے بھولے پن سے دریافت کیا۔

"زیادہ سے زیادہ دس سال کے اندر"

"میرا خیال ہے کہ میں اس عرصہ کے اندر ہی یورپ جاؤں گی" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم یورپ کو اپنے تصور سے بھی زیادہ رنگین پاؤ گی"۔ ٹھیک اسی وقت ایک ایسی تصویر نکلی جس میں ایک کنج عزلت کا منظر پیش کیا گیا تھا اور یہ مقام مجھے بیحد پسند تھا۔ اس تصویر نے میرے دل میں حسین یادداشتوں کو تازہ کر دیا اور میں نے خوش گفتاری کا ایک دریا بہا دیا۔ میرے ساتھی نے غور سے میری باتیں سنیں اور بولی "کیا تم غیر ملکوں میں بہت دنوں تک رہ چکے ہو؟"

"برسوں تفریح میں گذرے"

"یورپ کا ہر مقام؟"

"جی ہاں! تقریباً ہر جگہ، کیوں کہ تفریح کا دلدادہ ہوں اور مجھے اس کے لئے موقع بھی حاصل تھا۔ یہ میری خوش بختی ہے" اس نے مجھے کنکھیوں سے دیکھا۔

"کیا تم غیر ملکی زبانوں سے واقف ہو"

"بطور فیشن کے" میں نے جواب دیا۔

"کیا غیر زبانوں میں گفتگو کرنا مشکل ہے؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ ان زبانوں کے سیکھنے میں تم دقت محسوس کرو گی" میں نے بہادرانہ طور پر کہا۔

"میں زبان سیکھنا نہیں چاہتی۔ میں صرف دوسری زبانوں میں لوگوں کو گفتگو کرتے سننا چاہتی ہوں" کچھ وقفہ کے بعد وہ پھر بولی، "لوگ کہتے ہیں کہ فرانسیسی تھیئٹر بہت دلکش ہوتا ہے"

"ہاں وہاں دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے بہتر تھیئٹر پیرس میں موجود ہے"

"کیا تم وہاں کبھی گئے ہو؟"

"جب میں پہلی بار پیرس گیا تھا اس وقت قریباً روزانہ جایا کرتا

کیا ہر بات ؟" اس نے اپنی نیم باز آنکھوں کو کھولتے ہوئے کہا۔
اور مجھے یہ ....." وہ ایک لمحہ پس و پیش کرنے کے بعد بولی "بہت
عجیب بات معلوم ہوتی ہے یہ" تھوڑی دیر خاموش رہ کر اس نے
مجھ سے پوچھا "تم کون سے ملک کو بہتر سمجھتے ہو ؟"
صرف ایک ملک کو میں تمام ممالک پر ترجیح دیتا ہوں اور مجھے
یقین ہے کہ تم بھی میری رائے سے متفق ہو گی "
وہ ایک منٹ تک مجھے دیکھتی رہی اور صاف آواز میں کہنے لگی
اٹلی ــــــ"

"ٹھیک ہے وہ ملک اٹلی ہی کا ہے" میں نے بھی نرم اور صاف
آواز میں کہا۔ اس کے بعد کچھ دقفے تک ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے
اس وقت وہ مجھے اس قدر خوبصورت معلوم ہو رہی تھی کہ بجائے تصویر
دکھانے کے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اس سے عاشقی کر رہا ہوں آخر
اس نے شرما کر سر جھکا لیا اور حجاب دور کرتے ہوئے کہا "یہی وہ مقام
ہے جہاں میں جانا چاہتی ہوں "
"درحقیقت یہ ایسا ہی مقام ہے" میں نے جواب دیا۔ اس کے
بعد دو تین تصویریں خاموشی سے دیکھی گئیں۔
"لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس قدر خوبصورت نہیں ہے" وہ پھر بولی
لیکن وہاں دلکشی اور حسن و جمال بکثرت ہے کیا ایسا نہیں ہے ؟"
"کیا تم یورپ کے متعلق کہہ رہی ہو ؟"
"ہاں اسی کے متعلق مجھے سفر یورپ کا بہت شوق ہے لیکن مشکل
ہے کہ میرے پاس روپیہ کافی نہیں ہے" مس اسپنسر نے کہا۔
"یقیناً کافی روپیہ کی ضرورت ہے لیکن پھر بھی کوئی چاہے تو کم
خرچ کر سکتا ہے"۔ میں نے کہا۔
"میرا خیال ہے کہ میں کم خرچ میں سفر کر سکتی ہوں۔ میں ہمیشہ کچھ نہ
کچھ پس انداز کرتی رہی اور وہ محض اس مقصد کے لئے" مس اسپنسر کچھ
دیر رکی اور پھر رکتے ہوئے جلدی جلدی گفتگو کرنے لگی۔ گویا وہ مجھے اپنا
قصہ سنانا چاہتی تھی۔ "روپیہ بڑی چیز ہے۔ یہی سب کچھ ہے لیکن
حالات میرے خلاف تھے۔ میں مسلسل انتظار کرتی رہی لیکن یہ ایک
ہوائی قلعہ ثابت ہوا۔ میں اس کے متعلق گفتگو کرتے خوف محسوس
کرتی ہوں۔ دو تین مرتبہ تو ایسا معلوم ہوا کہ اب میرا مقصد حاصل ہونے
والا ہے لیکن وہ پھر خواب و خیال ہو گیا" میں نے دیکھا کہ وہ اس
گفتگو سے کافی لذت محسوس کر رہی ہے۔ اور اس پر ایک کیف سا چھا
رہا ہے۔ "میری ایک عزیز سہیلی ہے لیکن وہ میرے ہمراہ سفر کرنے پر
آمادہ نہ ہوئی۔ اگرچہ میں نے بہت اصرار کیا۔ یہی نہیں بلکہ اسے بہت
تنگ کیا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا کہ اگر میں یورپ چلی گئی تو ضرور پاگل
ہو جاؤں گی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر میں یورپ چلی گئی تو ضرور پاگل
ہو جاؤں گی "
"لیکن!" میں نے کہا "تم اب تک پاگل نہیں ہوئیں کیونکہ تم
ابھی تک یورپ نہ جا سکیں "
"یہ درست ہے کہ میں پاگل نہیں ہوں لیکن میں ہمیشہ اسی کے
متعلق سوچتی رہتی ہوں اور اس کا خیال مجھے دنیا کی کسی اور چیز کے متعلق
سوچنے سے باز رکھتا ہے یہ ایک قسم کا پاگل پن ضرور ہے۔ مجھے اس بات
پر اعتقاد ہے کہ میں کبھی نہ کبھی یورپ ضرور جاؤں گی۔ یورپ میں میرا
ایک بھتیجا ہے "
اس کے بعد میں نے چند اور فوٹو دکھائے۔
"کیا تم ہمیشہ گرم ونٹر میں رہتی ہو؟" میں نے دریافت کیا۔
"جی نہیں!" وہ بولی "میں نے تیس برس لوئس میں گزارے ہیں"
اس پر میں نے مزاحاً کہا۔ "اس صورت میں تم غیر ملکی سیاحت
سے بہت واقف ہو گی" لیکن میں اسے بہت خوف زدہ کرنے میں
کامیاب نہ ہوا۔
"میں اس کے متعلق تم سے زیادہ جانتی ہوں" وہ مسکرا کر بولی
"میں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ میں نے صرف بائرن کی نظم ہی
نہیں پڑھی بلکہ کئی سیاحت نامے اور سفر نامے بھی میری نظر سے گزر چکے ہیں"۔
"میں اب اچھی طرح تمہارا مطلب سمجھ گیا" میں خوش ہو کر بولا۔
"تم امریکن باشندوں کی طرح دلفریب اور حسین مناظر کی تصویر دیکھ کر
ان حقیقی مناظر سے لطف اندوز ہونے کی آرزومند ہو لیکن صرف تجربہ
سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر دلکش اور جاذب نظر ہیں ورنہ وہ ایک
خواب و خیال سے زیادہ نہیں "
"تمہارا خیال بالکل درست ہے" مس اسپنسر نے کہا۔ "میں بھی
ہر چیز کا خواب دیکھا کرتی ہوں۔ لیکن مجھے اب اس خواب سے
بیدار ہونا چاہئے۔ تم نے میرے ساتھ اپنا بہت سا وقت ضائع
کیا ـــــ"

"یہ میری بڑی کمزوری ہے "
ہمارے ارد گرد سے لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے،
وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ میں نے اس کا
ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "میں پھر وہاں جا رہا ہوں۔ تمہیں

...تلاش کرونگا!

"میں تم سے ضرور ملوں گی" وہ چلی گئی۔ حسین اور دل آویز مناظر کی تصویریں آنکھوں میں لئے جذبات کی رَو میں بہتی ہوئی اور اپنا چھوٹا سا پنکھا ہلاتی ہوئی۔!

دوسری ملاقات

اس واقعہ کے چند ماہ بعد میں یورپ واپس گیا۔ اور تین مہینے وہاں گزارے۔ اکتوبر کے اواخر میں پیرس میں کچھ دن قیام کرکے میں ہیورا روانہ ہوا اپنی بہن اور بہنوئی سے ملنے جنہوں نے وہاں اپنی آمد کی مجھے اطلاع دی تھی۔ ہیورا پہنچنے پر مجھے معلوم ہوا کہ جہاز پہلے ہی آچکا ہے۔ میں قریباً دو گھنٹے دیر سے پہنچا اور سیدھا اس ہوٹل کو گیا جہاں عموماً میری ہمشیر قیام کرتی تھی۔ میری بہن بستر پر دراز ہو چکی تھی۔ سفر کی تکان سے اس کی طبیعت کچھ ناساز ہو گئی تھی۔ اسے کامل آرام کی ضرورت تھی اس لئے وہ جلد ہی بستر پر سونے چلی گئی۔ میں صرف ۵ منٹ اس سے گفتگو کر سکا۔ میں تفریح کے لئے باہر جانا چاہتا تھا اس لئے اپنے بہنوئی کو ساتھ چلنے پر مجبور کیا جو اپنی بیوی کی علالت سے قدرے فکر مند تھا۔ خزاں کا اوّلیں فرحت بخش زمانہ تھا۔ پیرس کا یہ قدیم ساحلی صوبہ تھا جس کی سڑکیں پر رونق تھیں۔ ہم آباد بازاروں میں سے گزرتے ہوئے ایک سڑک پر آئے جو نصف سائے میں تھی اور نصف سورج کی روشنی میں۔ سڑک کے دونوں جانب خوبصورت اور رنگدار رنگ کے مناظر دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ کئی منزلہ مکانات، بلند عمارتیں چوڑی چھتیں، کھڑکیوں پر ہرے رنگ کے پردے لٹک رہے تھے۔ چھجوں پر پھولوں کی بیلیں نظر آ رہی تھیں اور سفید ٹوپیوں والی عورتیں اپنے گھروں کے دروازوں پر کھڑی تھیں۔ ان نظاروں سے لطف اٹھاتے ہم آہستہ آہستہ چل رہے تھے کہ دفعتہً میرا بہنوئی مجھے شانے سے پکڑ کر ایک طرف گھورنے لگا۔ میں نے اس کی نظروں کا پیچھا کیا تو معلوم ہوا کہ ہم ایک ہوٹل کے سامنے کھڑے ہیں جس کی چھت پر کرسیاں اور میز قرینے سے آراستہ ہیں۔ منڈیروں پر پھولوں اور کروٹن کے گونڈے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک عورت جسے خوبصورتی کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے ایک خالی میز کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کی ٹوپی پر چمکدار ربن لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک دوسری جانب کو ٹکٹکی باندھے کسی چیز کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میرے بہنوئی نے مجھے اسی عورت کو دیکھنے کے لئے روکا تھا۔ میں نے اسے ایک لمحہ دیکھا اور مجھے فوراً اس بات کا شبہ ہوا کہ ضرور میں نے اس عورت کو

کہیں دیکھا ہے

"یہ عورت جہاز پر ہمارے ساتھ تھی" میرے ساتھی نے تعجب سے کہا۔ "وہ ہمیشہ عرشہ جہاز پر مستول کے قریب بیٹھی رہتی تھی۔ دونوں ہاتھ باندھے اور نظریں مشرقی افق پر گاڑے"۔

"کیا تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے اس سے شناسائی تک پیدا نہیں کی۔ لیکن دوران سفر میں مجھے اس سے دلچسپی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ میرے خیال میں وہ ایک سکول مسٹرس ہے جسے تفریح کے لئے شاگردوں نے رقم مہیا کر دی ہے"۔

عورت نے اپنا چہرہ دوسری جانب موڑا اور ایک خاکی رنگ کے مکان کو دیکھنے لگی۔

"میں خود اس سے ملونگا" میں نے کہا۔

"مجھے تو معاف ہی رکھئے وہ بہت شرمیلی ہے"۔

"میرے یار! وہ میری دوست ہے" میں نے اب اسے اچھی طرح پہچانتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے تصویروں کا البم دکھایا تھا"۔

میں اپنے ساتھی کے ہمراہ اس کے پاس پہنچا۔ وہ مڑی اور اس نے میری طرف دیکھا۔ وہ درحقیقت مس اسپنسر تھی۔ میرا قیافہ صحیح ثابت ہوا لیکن وہ مجھے فوراً نہ پہچان سکی۔ وہ کچھ گھبرا کر میری طرف دیکھتی رہی میں نے ایک کرسی اس کے قریب کی اور اس پر بیٹھ گیا۔

"مجھے یقین ہے تم ناامید نہ ہوئی ہوگی"۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا پھر کچھ شرما گئی اور اس کے بعد مجھے پہچان کر اچھل پڑی۔ "کیا تمہی نے مجھے گرم دنوں میں فوٹو دکھائے تھے؟"

"جی ہاں! وہ میں ہی ہوں۔ یہاں تمہارا استقبال کرنے کے لئے اور تمہیں خوش آمدید کہنے کے لئے۔ میں نے تم سے یورپ کی بہت سی باتیں کہی تھیں"۔

"تم نے زیادہ تو نہیں کہا تھا...... لیکن ہاں! میں یہاں پہنچ کر بہت خوش ہوں...... بہت مسرور..."

یقیناً وہ بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔ اس کے چہرے پر اس بات کی کوئی علامت نہیں تھی کہ وہ زیادہ عمر کی ہے بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ دلفریب اور نازک نظر آتی تھی۔ اگر اسے کسی ہلکے رنگ کے پھول کے پاس دیکھا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ اس کے حسن و جمال کے آگے پھول کی دل آویزی ماند پڑ جاتی۔ اس کے بعد میں نے اپنے بہنوئی سے اس کا تعارف کرایا۔ لیکن اس نے میرے بہنوئی کی طرف اس طرح دیکھا

گویا پہلی مرتبہ اسے دیکھا ہے۔ مجھے اپنے بہنوئی کی یہ بات صحیح معلوم ہوئی کہ دوران سفر میں لڑکی کی نظریں شرقی افق پر گڑی ہوئی تھیں، بحقیقت وہ ریاکاری سے کام نہیں لے رہی تھی۔ کچھ دیر ٹھہر کر وہ اپنی بیوی کے پاس ہوٹل چلا گیا اور میں مس اسپنسر کے ساتھ ہی ٹھہر گیا، میں نے مس اسپنسر سے کہا: "خشکی پر اترنے کے بعد ایک گھنٹہ کے اندر ہماری آپس میں ملاقات ہو گئی۔ یہ بہت تعجب انگیز بات ہے۔ لیکن میں اس سے خوش ہوں کہ میں ہی وہ پہلا آدمی ہوں جو تمہاری سیاحت کے اولین تاثرات تمہاری زبان سے سنوں گا۔"

"میں فی الحال تم سے کچھ نہیں کہہ سکتی" اس نے جواب دیا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا میں ایک خواب دیکھ رہی ہوں...... میں ایک گھنٹہ سے یہاں بیٹھی دلکش نظاروں کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ پھر بھی میں یہاں سے ہٹنا نہیں چاہتی۔ ہر چیز یہاں کی اس قدر دلفریب اور دلآویز نظر آ رہی ہے کہ مجھے شبہ ہونے لگا ہے کہ میں نے کافی کی جگہ کوئی نشہ آور چیز پی لی ہے۔"

"تمہارا کہنا ایک حد تک ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا۔ "لیکن اگر تم اس معمولی سے مقام پر پہنچ کر اس قدر خوش ہو تو لازمی طور پر تم یہاں سے بہتر مقامات کے لئے کوئی شوق نہ رکھو گی۔ یہ خیال رکھو کہ یورپ کے اور بھی کئی خوبصورت دلکش اور دلفریب شہر تمہارے منتظر ہیں — بالخصوص اٹلی —!"

"مجھے اپنے شوق کے کم ہونے کا کوئی خطرہ نہیں۔ میں یہاں بیٹھ کر دل کو اس بات کا یقین دلاتی ہوں کہ آخر میں یورپ پہنچ گئی۔"

"اچھا مجھے یہ تو بتاؤ" میں نے پوچھا۔ "تم کسی اور جگہ ٹھہرنے کی بجائے اس ہوٹل میں کیونکر آئیں؟"

"میرا بھتیجا مجھے یہاں لے آیا" وہ بولی۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ یورپ میں میرا ایک بھتیجا ہے وہ آج صبح مجھے جہاز پر ملا۔"

"لیکن اس کے ملنے سے تمہیں کیا فائدہ ہوا جبکہ وہ جلد ہی تمہیں تنہا چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔"

"وہ مجھ سے نصف گھنٹے کی اجازت لے کر گیا ہے" مس اسپنسر بولی۔ "وہ میرا روپیہ لانے گیا ہے۔"

"تمہارا روپیہ کس جگہ جمع ہے؟"

وہ مسکرائی اور بولی۔ "میں تم سے اس کا ذکر کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتی ہوں۔ میرے پاس چند گشتی ہنڈیاں ہیں۔"

"اور وہ ہیں کہاں؟"

"میرے بھتیجے کے جیب میں" یہ حقیقت بہت متانت سے مجھ پر آشکارا ہوئی لیکن نہ جانے کیوں اس وقت میرے دل میں ایک ہوشمندانہ کپکپی پیدا ہوئی۔ میں اس جذبے کی وجہ بتانے کے ناقابل تھا کیونکہ میں مس اسپنسر کے بھتیجے سے ناواقف تھا چونکہ وہ اس کا بھتیجا تھا اس لئے میں اس کے متعلق کوئی برا خیال دل میں قائم کرنے کے خلاف تھا لیکن دوسری طرف اس خیال سے بے اطمینانی ضرور تھی کہ مس اسپنسر کو یہاں آئے بمشکل نصف گھنٹہ ہوا ہے لیکن اس کا روپیہ اس کے بھتیجے کے ہاتھ میں آ گیا۔

"کیا وہ سفر میں تمہارے ساتھ رہے گا؟" میں نے کچھ دیر خاموش رہ کر پوچھا۔

"صرف پیرس تک! وہ پیرس کالج میں شعبہ فنون کا طالب علم ہے۔ میں نے اسے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ لیکن مجھے امید نہ تھی کہ وہ جہاز پر مجھے لینے آئے گا۔ وہ بہت رحیم الطبع خوش مزاج اور نیک لڑکا ہے۔"

چنانچہ میں بھی اس خوش مزاج شعبہ فنون کے طالبعلم سے ملنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

"وہ شاید کسی بنک کی تلاش میں گیا ہے۔"

"تمہارا خیال درست ہے" وہ کہنے لگی۔ "وہ پہلے مجھے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ جہاں قیام کا بہترین انتظام تھا۔ اپنا اسباب وہاں رکھنے کے بعد ہم بنک کی تلاش میں پیدل نکل پڑے کیونکہ میرے پاس فرانسیسی سکہ نہ تھا۔ ہم اپنی جستجو میں یہاں پہنچے۔ پھر وہ مجھے اس ہوٹل میں چھوڑ کر چلا گیا کیونکہ میں یہاں بیٹھ کر سیر کا لطف اٹھانا چاہتی تھی۔ میں یہاں اس کے واپس آنے تک انتظار کروں گی۔"

حالانکہ یہ بہت دلچسپ اور سیدھی سادی باتیں تھیں لیکن نہ معلوم کیوں میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ وہ کبھی واپس نہ آئے گا۔ مس اسپنسر کے بازو میں بیٹھے ہوئے میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس کا انتظار کروں گا۔ چاہے کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو جائے۔ مس اسپنسر سڑک پر سے گزرتی ہوئی ہر چیز کا بغور مشاہدہ کر رہی تھی۔ اور ہم کاروباری آدمیوں، گاڑیوں کی مختلف قسموں، نارمن کے مشکی گھوڑوں، موٹے پادریوں اور بے بال کے کتوں پر گفتگو کر رہے تھے۔ اس کی اشتیاق آمیز نظر دل میں مسرت ناچ رہی تھی۔ وہ ہر نئی چیز کو کتابوں میں پڑھی ہوئی یادداشت سے دیکھ کر اس کا خیر مقدم کر رہی تھی۔

"تم نے آئندہ کا پروگرام کیا بنایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر تامل کرتی رہی۔ "ہم نے ابھی کوئی پروگرام نہیں بنایا" وہ بولی۔

"تم پیرس کب جاؤ گی۔ اگر چار بجے کی ٹرین سے تمہارا جانے کا ارادہ ہے تو میں بھی تمہاری ہمرکابی کی مسرت حاصل کرونگا۔"

"میرا خیال ہے کہ ایسا نہ ہوگا۔ کیونکہ میرا بھتیجا کہتا تھا کہ ہمیں چند روز یہاں قیام کرنا چاہئے۔" میں پانچ منٹ تک خاموش رہا اور سوچتا رہا کہ وہ اپنے بھتیجے کو کیا سمجھتی ہے اور میں نے اسے دیکھنے کے لئے سڑک کے ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن افسوس شعبہ فنون کے طالب علم کا مسرت بخش چہرہ نظر نہ آیا۔ پھر میں نے ہیورا پر نظر ڈالی۔ یہ جمالیاتی نقطہ نظر سے بالکل سیاحت کے لئے موزوں مقام تھا۔ وہ ایک آرام دہ جگہ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ وہ ایک گندگاہ ہے جہاں زیادہ قیام فرحت بخش نہیں ہوسکتا۔ میں نے اسے شام کی ٹرین سے پیرس جانے کا مشورہ دیا جہاں وہ جہاز میں بیٹھ کر ساحل کے قریب پرانے فوجی قلعے کے منظر کا لطف اٹھائے گی۔ وہ دلفریب چوکور ساخت کی عمارت ہے جس سے فرانسس اوّل کا نام زندہ ہے۔"

وہ دلچسپی سے سنتی رہی اس کے بعد کچھ سنجیدگی سے بولی۔ "میرے بھتیجے نے کہا تھا کہ وہ واپسی پر ایک خاص خبر مجھے سنائے گا۔ میں یہ خبر اس کے آتے ہی سنونگی اس کے بعد ہم فوجی قلعہ دیکھنے جائیں گے۔ مجھے بھی جلدی نہیں میرے پاس کافی وقت ہے۔"

آخری الفاظ کہتے وقت اس کے لب تبسم پاش ہوگئے لیکن میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تشویش کی ایک جھلک دیکھی۔

"تم یہاں یورپ میں تفریح کی غرض سے آئی ہو۔" میں نے کہا۔ "لوگوں کی باتیں سننے نہیں آئی ہو۔"

اب مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اس کا بھتیجا ضرور آئے گا کیونکہ اُسے ایک ناخوشگوار خبر سنانا تھا۔ پھر اس نے اپنی سیاحت کا پروگرام سنایا، وہ پیرس سے ڈی جن اور ردیکین اور وہاں سے مارسیلز اور کارنگ اس کے بعد خیوا۔ اسپیزا۔ فیسہ فلارنس اور وہاں سے وہ سیدھی روم جائیگی۔ لیکن اس نے یہ بات بالکل نہ سوچی کہ کسی دوست کے ساتھ سفر کرنے میں دوچند مسرت حاصل ہوگی لیکن میں اس کا تذکرہ کرکے اسے پریشان کرنے سے باز رہا۔ آخرکار اس کا بھتیجا نظر آیا۔ مس اسپنسر نے اشارے سے مجھے بتایا کہ وہ ایک گلی سے نکل کر ہمارے ہوٹل کی طرف آرہا ہے۔ شعبہ فنون کا طالب علم ایک چوڑی ہیٹ پہنے ہوئے تھا۔ سیاہ جیکٹ اور پتلون کی قمیص کا رنگ دور سے کچھ سُرخی مائل نظر آرہا تھا۔ وہ لمبا اور دُبلا تھا اور اس کے سر کے بال سُرخ تھے اور اس کے چہرے پر ہلکے بھورے رنگ کے دھبے تھے۔ وہ ہوٹل کی جانب بڑھتے ہوئے مجھے ناراضی کی نظروں سے دیکھتا رہا اور میں اس عرصہ میں اس کا کافی مطالعہ کرسکا۔ قریب آنے پر مس اسپنسر نے میرا تعارف اپنے ایک پرانے دوست کے الفاظ سے کرایا۔ اس نے سختی سے میری جانب دیکھا اور فرانسیسی فیشن کے مطابق تعظیماً کچھ خم ہوگیا۔

"آپ جہاز پر نظر نہیں آئے۔" اس نے کہا۔

"نہیں میں جہاز پر نہیں تھا۔ میں تین سال سے یورپ ہی میں ہوں۔" پھر ایک بار اور خم ہوکر اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں کچھ دیر اور وہاں ٹھہر گیا تاکہ مس اسپنسر کے بھتیجے کا اچھی طرح سے مطالعہ کرسکوں حالانکہ وقت کافی ہوچکا تھا اور مجھے اپنی بہن کے پاس واپس جانا تھا۔

مس اسپنسر کا بھتیجا عجیب قسم کا آدمی تھا۔ قدرت نے اسے اپنی کاریگری کا اچھا نمونہ نہیں بنایا تھا۔ اس کے موٹے ہونٹ اس کے چہرے پر ذرا بھی اچھے معلوم نہ ہوتے تھے۔ اس کے بال اس کے سر کے لئے موزوں نہ تھے۔ کان بڑے اور بدنما اور آنکھوں کا رنگ بھی عجیب تھا جیسے وہ شرانگیز ہوں۔ شاید میں نے تعصب سے یہ باتیں کہہ دیں کیونکہ مس اسپنسر سے میں کافی دلچسپی رکھتا ہوں لیکن میں اس بات کا یقین دلا سکتا ہوں کہ وہ مجموعی طور پر کچھ اچھا آدمی معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے اپنی چھڑی سے سامنے کے مکان کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا۔ "بہت خوبصورت رنگ ہے۔" میں نے اس کی پیروی کی اور دیکھا کہ وہ سامنے کی کھڑکی پر لگے ہوئے پردے کا ذکر کررہا ہے۔

"بہت خوشنما دکھائی دیتا ہے۔" اس نے پھر کہا۔ "اس لئے وہاں اور بھی قابل کشش چیزیں ہونگی۔" اس نے نہایت غیر مہذبانہ انداز میں کہا۔

"تمہاری نظریں بہت تیز ہیں کیونکہ تم شعبہ فنون کے طالب علم ہو، جیسا کہ مجھے تمہاری چچی سے معلوم ہوا ہے۔" اس نے مجھے دوبارہ انہی غضبناک نظروں سے دیکھا۔

کچھ دیر بعد میں رخصت ہونے کی غرض سے کھڑا ہوگیا اور مس اسپنسر سے پوچھا کہ وہ دوبارہ مجھے کسی جگہ ملے گی۔ اس نے مستفسرانہ انداز سے اپنے بھتیجے کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ دی پرنسس ہوٹل سے واقف ہیں؟" اس کے بھتیجے نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہاں

یہ آپ سے ملیں گی؟" جب میں جانے لگا تو اس کے بھتیجے نے اپنی عجیب ہیٹ ہلائی اور تعظیماً خم ہو گیا۔

تیسری ملاقات

میری بہن اس قابل نہ تھی کہ ہم شام ہی کو سیدھا سے پیرس روانہ ہو جاتے۔ اسی لئے جب نرس اس کے شام کے دسترخوان پہ بھانے لگے تو میں پرنسس ہوٹل کی جانب روانہ ہوا۔ مجھے اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ میں اس سے ملنے کے بعد اکثر فرصت کے اوقات میں یہ بات سوچا کرتا کہ یہ کس قدر تلخ حقیقت ہے کہ میری خوبصورت دوست کے ساتھ اس قدر ناشائستہ اور بدتہذیب آدمی ہے جو اس کا بھتیجہ کہلاتا ہے۔ ہوٹل پہنچ کر مس اسپنسر کی تلاش میں مجھے کوئی دقت نہ ہوئی۔ کھلے صحن میں ایک بنچ پر وہ بیٹھی تھی۔ میں نے پہلے ہی نظر میں پہچان لیا کہ ضرور اس پر کوئی حادثہ گذرا ہے۔ وہ کسی گہرے خیال میں ایک جگہ گھور رہی تھی۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ رو رہی ہے۔ میں اس کے بازو میں بنچ پر بیٹھ گیا اور جب وہ میری طرف مڑی تو اسے میری موجودگی پر کوئی تعجب نہ ہوا بلکہ وہ بغیر کسی تعجب کے مجھے گھورنے لگی۔

وہ بالکل بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی گویا کسی نے کوئی بُری خبر سُنی تھی چنانچہ میں نے فوراً اس سے پوچھا۔ "تمھارے بھتیجے نے تمھیں ضرور کوئی رنجیدہ خبر سنائی ہے۔ تم بہت دُکھی ہو۔"

وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اور اس نے ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکالا۔ میں نے خیال کیا کہ وہ اس وقت تک گفتگو نہ کریگی جب تک اس کے آنسو نہ رک جائیں گے۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ وہ اس چھوٹے سے وقفہ میں جو صبح سے اب تک ملا تھا اپنے تمام آنسو بہا چکی تھی اور اس وقت انتہائی ضبط سے کام لے رہی تھی۔

"میرا غریب بھتیجا مصیبت میں ہے۔" دردبھری آواز میں وہ بولی "اس کی خبر یقیناً بُری تھی۔" اس کے بعد کچھ رک کر اس نے کہا۔ "اسے روپیہ کی شدید ضرورت ہے۔"

"کیا تمھارے روپیہ کی؟"

"جس کسی کا روپیہ اسے مل جائے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فی الحال میرے پاس تو قلیل سی رقم ہے۔"

"کیا وہ تمھاری رقم لے چکا ہے؟"

وہ ایک لمحہ رکی لیکن اس کی نظریں غمازی کر رہی تھیں۔ "جو کچھ میرے پاس تھا میں نے اسے دے دیا:"

میں ان الفاظ کی روح کو سمجھ گیا جو انسان کو بعض اوقات معصوم فرشتوں کے قریب تر کھڑا کر دیتے ہیں۔ ہمدردی۔ معصومیت اور لاچاری کی ایسی مثال میں نے اب تک نہ سنی تھی۔ میں غصہ سے اچھل پڑا اور کھڑا ہو گیا۔ "اے خدا!" میں بول اٹھا۔ "کیا تم اسے ایماندارانہ طریقے سے وصول کر سکتی ہو؟" میں اس سے زیادہ کہنے والا تھا لیکن اس کے چہرے کے متغیر رنگ کو دیکھ کر رک گیا۔

"ہمیں اس موضوع پر گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔"

"ہم اس مسئلہ پر ضرور گفتگو کریں گے۔" میں نے نرمی سے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں تمھارا دوست ہوں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں اس وقت ایک دوست کی ضرورت ہے۔ تمھارے بھتیجے پر کیا افتاد پڑی ہے؟"

"وہ مقروض ہے۔"

"اس کا قرضہ ادا کرنا کیا تم پر فرض تھا؟"

"اس نے مجھ سے اپنی غم انگیز داستان بیان کی۔ میں بہت آزردہ ہوئی۔"

"لیکن کیا میں یہ امید رکھوں کہ وہ تمھارا روپیہ واپس کر دے گا؟"

"کیوں نہیں!" وہ بولی۔ "جب وہ اس قابل ہو گا۔"

"نیک خاتون! تم اس کی دروغگوئی پر اعتبار نہ کرو اور یہ امید چھوڑ دو۔ وہ عزیز بھتیجا ہے کہاں؟"

وہ پہلے ہچکچائی۔ "کھانے کی میز پر۔" وہ بولی۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ بڑے دروازے کے اندر کے کمرے میں ایک لمبی میز کے آخری سرے پر مس اسپنسر کا قابل رحم بھتیجا نظر آیا۔ وہ میری موجودگی کو نظرانداز کرتے ہوئے ہمہ تن کھانے میں معروف تھا۔ طرح طرح کے لذیذ کھانے اس کے آگے چُنے ہوئے تھے۔ اور فواکہات سے بھری ہوئی دو رکابیاں بھی اس کے سامنے تھیں۔ وہ مصیبت میں گرفتار غمزدہ تھا۔ میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ آخر غصہ کو دباتے ہوئے میں نے مس اسپنسر سے پوچھا۔ "کیا تم یہ ثابت کر سکتی ہو کہ اس بدتمیز چالاک اور عیار آدمی نے تمھاری رقم ہضم نہیں کر لی۔"

وہ میرے اوپر سے نظریں دوڑا کر دوسری طرف دیکھنے لگی گویا میں اسے قلبی اذیت دے رہا تھا۔ ... معاملہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ وہ اونچا مضبوط گنوار آدمی اس کے لئے باعث دلچسپی تھا۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔" میں نے معاملہ کو ایک

سمجھتے ہوئے کہا۔"اگر میں نے کچھ ناشائستہ الفاظ اس کے متعلق کہے ہیں تو مجھے معاف کردو۔ لیکن مجھے اتنا کہنے دو کہ تم واقعی بڑی فیاض اور کشادہ دل ہو...... لیکن وہ کسی طرح اس بات کا مستحق نہیں اسے اپنا قرض خود ادا کرنا چاہیئے" میں نے نرمی سے کہا۔

"دراصل اس سے بڑی حماقتیں سرزد ہو گئی ہیں۔ اس نے مجھے تفصیل سے تمام باتیں سنائی ہیں اور خود کو میرے رحم و کرم پر ڈال دیا۔ اس نے ایک بڑی رقم پر غلطی سے دستخط کر دیئے"

"پھر تو واقعی وہ بڑا بیوقوف ہے"

"وہ بڑی مصیبت میں ہے صرف اکیلا ہی نہیں بلکہ اس کی بیوی بھی"

"اس بیچارے کی ایک بیوی بھی ہے؟"

"میں اس سے لاعلم تھی۔ آخر اس نے تمام باتوں کا اقرار کر لیا۔ دو سال ہوئے اس نے خفیہ طور پر شادی کر لی ہے"

"خفیہ طور پر کیوں؟"

مس اسپنسر نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور رازدارانہ طور پر دل گرفتہ آواز میں کہا۔"وہ ایک کاونٹ کی بیٹی ہے"

"کیا تمھیں اس کا یقین ہے؟"

اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔"مجھے اس نے ایک طویل اور دلچسپ خط لکھا ہے"

"تم سے روپیہ طلب کرنے کے لئے؟"

"نہیں بلکہ مجھ سے ہمدردی اور میرا اعتماد حاصل کرنے کے لئے" مس اسپنسر نے کہا۔"اسے اپنی موروثی جائداد سے محروم کر دیا گیا۔ میرے بھتیجے نے اس کا پورا حال مجھ سے بیان کیا اور اس کی سرگزشت ایک قدیم داستان کے مانند ہے۔ کاونٹ نے شادی کی مخالفت کی اور جب اس نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف کام کیا تو اسے خاندان سے خارج کر دیا"

میں اسے دیکھتا رہا اور تعجب سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ بیچاری خاتون اپنے عیار بھتیجے اور اس کی بیوی ۔۔۔ کاونٹ کی بیٹی ۔۔۔ کی رومانی کہانی سے بہت دلچسپی لے رہی تھی اور اس نے اپنے احساسات کو سوچنے کا موقع بھی نہ دیا۔ کہ اس کی ضبط شدہ رقم کیونکر واپس ہوگی۔

"میری عزیز نادان خاتون" میں نے آخرکار اس سے کہا۔"تمھیں اپنی سیاحت کے شوق کو پورا کرنا ہے اس لئے تمھیں تباہ نہ ہونا چاہیئے"

"میں تباہ نہ ہونگی۔ میں کچھ عرصہ بعد ایک مدت تک قیام کرنے کے لئے اس کے پاس آ ؤنگی۔ وہ اس بات پر مصر ہے"

"کیا تم گھر جا رہی ہو؟"

کچھ دیر وہ اپنی نظریں نیچی کئے خاموش رہی۔"سیاحت کے لئے اس وقت میرے پاس رقم نہیں ہے" وہ بولی۔

"تم نے اپنی کل رقم اسے دے دی ہے؟"

"صرف گھر تک پہنچنے کے لئے میرے پاس رقم ہے"

غصہ کی ایک آواز میرے منہ سے نکلی۔ ٹھیک اسی وقت اس کا خوش نصیب بھتیجا ڈکارتا ہوا کمرۂ طعام سے نکلا اور غلام گردش پر کھڑا ہو کر ادائے بے نیازی سے ہماری جانب دیکھنے لگا۔ میری دوست مس اسپنسر اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس پر ایک نظر ڈالی جس سے شوق اور رضامندی کا اظہار ہوتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک بے معنی انبساط اور مسرت کا بھی، میں اسے ہمیشہ بد شکل۔ ریاکار اور غیر مہذب سمجھتا تھا اس کے باوجود وہ اس کے نازک خیالوں کو ابھارنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں اس کے معاملہ میں دخل نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایسا کرنا سود مند نہیں۔ میں حالات کو ناقابل برداشت سمجھ کر رخصت ہونے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اس نے سفید چہرے اور بیٹھی بیٹھی آنکھوں سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے مجھے دیکھا۔

مس اسپنسر نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔"تم میری فکر نہ کرو۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"مجھے یقین ہے کہ تم خوبصورت یورپ کو ضرور دیکھو گی"

میں اگلے دن اس سے ملنے کا اقرار کرکے رخصت ہو گیا اس کے بھتیجے نے اپنی چوڑی ہیٹ ہلائی اور غم ہو گیا۔ میں وہاں سے سیدھا اپنی قیام گاہ پر گیا۔ دوسری صبح جب میں پرنسس ہوٹل پہنچا تو مس اسپنسر اپنے کمرے میں نظر نہ آئی میں نے منتظم سے دریافت کیا۔"موسیو!" اس نے کہا۔"وہ گذشتہ رات دس بجے یہاں سے چلی گئی۔ اپنے ...... وہ یقیناً اس کا شوہر نہ تھا۔ وہ امریکن جہاز پر سوار ہوئے"

میں واپس ہو گیا۔ آہ وہ بیچاری عورت یورپ میں صرف تیرہ گھنٹہ رہ سکی۔

آخری ملاقات

میں یورپ میں پانچ برس تک رہا۔ اس عرصہ میں میں اپنے دوست لانرچ کو ہمیشہ کے لئے کھو چکا تھا۔ وہ ملیریائی بیماری سے فوت ہوا تھا۔ سب سے پہلا کام جو میں نے انگلستان پہنچ کر کیا وہ یہ تھا کہ میں گرم وشر اس کی ماں کے یہاں تعزیت کے لئے گیا۔ اس کی دکھیا ماں کو میں نے انتہائی انتہائی حزن و ملال میں مبتلا پایا۔ جوانمرگ بیٹے کا غم جہاں روح فرسا ہوتا تھا اور ہم

بہت دیر تک مرحوم کے اوصاف بیان کرتے رہے۔ ہماری گفتگو کا موضوع اس وقت بدلا جب ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ پادری کی بیوی تھی اور علاقے بھر میں سب سے زیادہ باتونی مشہور تھی۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھ کر شام کی تفریح کے ارادے سے اٹھا اور مسز ... طریح سے کہا۔

"میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔ کچھ دیر تک گھومنے جاتا ہوں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ مس اسپنسر کہاں رہتی ہے میں اس کے گھر تک جاؤں گا۔"

مجھے بتایا گیا کہ وہ سینٹ چرچ کے آگے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی ہے۔ "بیچاری مس اسپنسر سے تم ضرور ملو" مس لاریج بولی۔ "وہ ایک اجنبی کو دیکھ کر ضرور خوش ہوگی۔"

"میرا خیال ہے" پادری کی بیوی نے کہا۔ "اس کے یہاں اکثر ملاقاتی آتے ہیں لیکن تمھارا ارادہ اس کے پاس دس سال تک ٹھہرنے کا تو نہیں ہے؟"

"کیا اس قسم کے ملاقاتی اس کے یہاں نہیں آتے؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"تم ایک الگ قسم کا آدمی وہاں دیکھو گے" پادری کی بیوی بولی "تم اس سے بآسانی مل سکتے ہو۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ جو کچھ اس سے کہو نہایت ہی سوچ سمجھ کر۔"

"کیا وہ اس قدر زود رنج ہے؟"

"ہاں وہ ایک کومس ہے" اس جملے کو اس نے بڑی حقارت سے ادا کیا۔ میں کچھ یاد کرتے ہوئے چند لمحہ اُسے دیکھتا رہا۔

"تم اطمینان رکھو میں اس سے نہایت اخلاق سے پیش آؤں گا" یہ کہہ کر میں ہیٹ اور چھڑی لے کر گھر سے روانہ ہوا۔ سینٹ چرچ مجھے آسانی سے مل گیا اور اس ویران جگہ کے قریب ہی اس عورت کا گھر تھا جسے دلکش مناظر سے عشق تھا۔ میں نے پھاٹک میں داخل ہو کر متلاشی نظریں چاروں طرف دوڑائیں۔ ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا جہاں کچھ میووں کے درخت بھی تھے۔ ایک بڑے درخت کے نیچے چند کرسیاں اور ایک میز نظر آئی جس پر کچھ کتابیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ چل کر دروازے میں داخل ہوا۔ گھر بہت مختصر اور حقیر سا معلوم ہو رہا تھا۔ میں ہچکچاتا ہوا آگے بڑھا اس وقت حیرت مجھ پر مسلط تھی ٹھیک اسی وقت سامنے کا دروازہ کھلا اور ایک شبیہ نمودار ہوئی۔ اور وہ وہ آکر ہی میں کھڑے ہو کر مجھے گھورنے لگی۔ میں نے پہچان لیا وہ مس اسپنسر تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے مجھے پہچانا نہیں۔ نہایت باادب اور سنجیدہ ہو کر میں آگے بڑھا اور خلوص آمیز لہجہ میں اسے مخاطب کیا۔

"میں تمھارا انتظار کرتا رہا لیکن تم نہ آئیں۔"

"صاحب! آپ کہاں میرے منتظر تھے؟" حیرت سے اس نے کہا۔

"میں یورپ میں تمھارا انتظار کرتا رہا۔" وہ مجھے گھورتی رہی پھر پہچان لیا۔ وہ مسکرائی اور شرما گئی۔

"میں تمھیں پہچان گئی۔" کچھ دیر سوچ کر وہ بولی۔ "مجھے وہ دن بھی نہیں بھولا۔" لیکن وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ نہ تو آگے بڑھی اور نہ مجھے اندر آنے کو کہا۔ جیسے وہ پریشان ہو گئی ہو اور میں بھی ایک قسم کی جھجک محسوس کر رہا تھا۔

"میں ہر سال تمھارا انتظار کرتا تھا۔" آخر میں نے مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"تمھارا مطلب یورپ سے ہے نا؟" اس نے نظریں اوپر اٹھا کر کہا۔

"ہاں یورپ میں!"

وہ دروازے کا سہارا لئے کھڑی تھی اور اس کا سر ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر تک بغیر کچھ کہے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے جذبات مچل جانے کو تیار ہیں اور وہ اشکبار ہونے والی ہے۔ پھر وہ بلا وجہ ہنس دی اگرچہ وہ خوبصورت اب بھی نظر آرہی تھی لیکن اس کا حسن سوگوار تھا۔

"کیا تم اس دن کے بعد پھر کبھی وہاں گئے ہو——؟" دھیمی آواز میں وہ بولی۔

"تین ہفتہ پہلے میں وہیں تھا لیکن تم وہاں نہ آئیں۔"

مسکراتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا پھر وہ فوراً ہی ہٹی۔ اور دروازہ کھول کر کہا۔ "میں بھی کتنی بد اخلاق ہوں" وہ بولی۔ "کیا تم اندر نہ آؤ گے؟"

"مجھے اندیشہ ہے کہ میری آمد سے تمھیں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔"

"بالکل نہیں" اس نے پہلے سے بھی زیادہ مسکراتے ہوئے کہا اور مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھی۔ ہم ایک تنگ ہال سے گذر کر ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچے۔ اس کمرے سے بھی گذر کر آگے کے کمرے میں آئے جہاں سے باغیچہ دکھائی دیتا تھا۔ مس اسپنسر صوفہ کے ایک کونے پر بیٹھ گئی اور میں اس کے قریب کی کرسی پر۔ وہ اپنی اصلی عمر سے دس سال بڑی معلوم ہوتی تھی لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ اس وقت بھی کافی جاذب توجہ ضرور تھی۔ اس کے جذبات مشتعل ہو گئے تھے اور خوابیدہ حسرتیں جاگ اٹھی تھیں اور میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا واقعی میں ان جذبات سے بے خبر ہوں لیکن فوراً ہی مجھے پیرس کی یاد آئی۔ ساتھ ہی اس کی دوستی کی اور میں نے اس سے کہا۔

"میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور پھر سسکیاں لیتی ہوئی۔ "یہ اس لئے کہ تم نے مجھے پیرس کی یاد دلائی — اور ..... "

"تمہارا یہ مطلب ہے کہ میں نے تمہیں وہ غمناک ایام یاد دلا دیئے؟"

اس نے چہرے سے ہاتھوں کو ہٹا لیا اور خود پر قابو حاصل کرتے ہوئے بولی۔ "وہ غمناک دن نہیں تھے۔ وہ تو مسرت کے قیمتی لمحے تھے۔"

"مجھے اتنا صدمہ کبھی نہیں ہوا تھا جتنا اس روز ہوا جب میں تم سے ملنے پرنسس ہوٹل گیا! اور وہاں معلوم ہوا کہ تم چلی گئی ہو۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی اور تاسف انگیز لہجہ میں بولی۔ "خدارا آپ اس بات کا ذکر اب نہ کرنا چاہیئے۔"

"بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم وہاں سے سیدھی یہاں آئیں؟"

"وہاں سے روانہ ہونے کے تیسویں دن میں گرم ونڈر پہنچی۔"

"اور اس وقت سے تم یہاں مقیم ہو؟"

"آہ! اسی وقت سے!" اس نے نہایت خوش اخلاقی سے کہا۔

"تو پھر یورپ کب جاؤ گی؟" یہ سوال نہایت غیر مہذب تھا اور بے وقت بھی لیکن میں اپنے جذبات سے مجبور تھا۔ اُس نے ایک لمحہ تک کھڑکی سے آنے والے غروب آفتاب کی روشنی کو دیکھا۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کا پردہ کھینچ دیا اور اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئی اور نرم آواز میں جواب دیا۔

"کبھی نہیں!"

"مجھے امید ہے کہ تمہارے بھتیجے نے تمہارا روپیہ واپس کر دیا ہوگا؟"

"مجھے اب اس کی کوئی پروا نہیں۔" اس نے اپنی نظریں میری طرف سے ہٹا کر کہا۔

"کیا تمہیں اپنے روپے کی پروا نہیں؟"

"ہاں یورپ جانے کے لئے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تمہارا یہ مطلب ہے کہ اگر تم یورپ جانا چاہو بھی تو نہیں جا سکتیں؟"

"میں نہیں جا سکتی۔ میں ہرگز نہیں جا سکتی۔" مس اسپنسر نے کہا "مجھ میں بڑا تغیر ہو گیا ہے۔ میں اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی اب میں یورپ جانے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتی۔"

"اس نے تمہیں رقم واپس نہیں کی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"خدا کے لئے ...... خدا کے لئے ......" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

بھاری قدموں کی آواز ہال سے آ رہی تھی۔ میں بھی دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک خاتون اندر داخل ہوئی اور اس کے پیچھے ایک نوجوان لڑکا۔ خاتون نے مجھے گہری نظر سے دیکھا۔ جس نے میرے دل میں بھولے ہوئے اثرات کی یاد تازہ کر دی۔ وہ مس اسپنسر کی طرف مڑی اور صاف لہجہ میں بولی۔ "مداخلت کو معاف کرنا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم کسی سے گفتگو کر رہی ہو۔" میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ شریف آدمی نہایت خاموشی سے گھر میں آیا مجھے خبر تک نہ ہوئی۔" یہ کہہ کر وہ پھر مجھے دیکھنے لگی۔

اگرچہ وہ میرے لئے بالکل اجنبی تھی۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ پھر میں نے سوچا۔ نہیں میں نے اس کی ہم شکل عورت کو ضرور دیکھا ہے۔ لیکن یہاں نہیں گرم ونڈر سے دور، بہت دور —— اور اسے دیکھ کر میرے دل میں ایک عجیب جذبہ پیدا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی مسکراہٹ تھی جو دل پر اثر کر رہی تھی اور جسے فرانسیسی زبان میں پسندیدہ تبسم کہا جاتا ہے۔ وہ پرانی قسم کا کشمیری کپڑے کا گاؤن پہنے تھی۔ وہ قدرے مسکرا کر مس اسپنسر سے بولی۔ "میں کافی کے لئے کہنے آئی ہوں۔ باغ ہی میں انتظام کیا جائے۔"

اس کا ساتھی کمسن نوجوان مجھے مسلسل گھور رہا تھا۔ وہ صدمائی شخصیت کا نمونہ تھا۔ بہ الفاظ دیگر وہ گرم ونڈر کا "ایڈونس" معلوم ہوتا تھا۔ وہ میری طرف منہ کھولے ہوئے بیوقوفی سے دیکھ رہے تھے۔

"ہم اس درخت کے نیچے بیٹھیں گے۔" مس اسپنسر سے وہ یہ کہہ کر جانے کے لئے مڑی پھر فوراً ہی بڑھ کر مجھے تسلیم کیا اور چلی گئی اور اس کے پیچھے وہ نوجوان بھی۔

"وہ کون ہے؟" میں نے مس اسپنسر سے پوچھا جو مسلسل زمین کو گھور رہی تھی۔

"وہ کونٹس ہے۔"

"اور وہ نوجوان؟"

"اس کے شاگرد مسٹر گسٹر ہیں۔"

اس انکشاف پر میں ہنس پڑا۔ مس اسپنسر نے سنجیدگی سے مجھے دیکھا۔ "وہ اسے فرانسیسی زبان سکھاتی ہے۔ اس کی قسمت برگشتہ ہو گئی ہے۔ وہ اپنا شاندار مستقبل کھو چکی ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے جواب دیا۔ —— "بات یہ ہے کہ —— وہ اپنا بوجھ کسی پر ڈالنا نہیں چاہتی۔ یہ بہت بہتر ہے۔"

"مجھے کافی بنانا ہے۔" وہ نیچی نظریں کئے ہوئے بولی۔

"کیا اس کے اور بھی شاگرد ہیں؟"

"نہیں صرف مسٹر گسٹر۔ وہ دولتمند کا لڑکا ہے۔ اسے کافی معاوضہ ملتا ہے۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"تمھیں کونٹس کے لئے کافی بنانا ہے:" میں نے پوچھا۔

"ہاں اگر تم تھوڑی دیر کے لئے اجازت دو۔"

"کیا یہاں اور کوئی اس کام کو انجام نہیں دے سکتا؟"

"میرے یہاں کوئی ملازم نہیں ۔"

"کیا وہ بھی کوئی ملازم نہیں رکھ سکتی ہے؟"

"وہ اس کی عادی نہیں ۔"

"اچھا جانے سے پہلے مجھے یہ بتاتی جاؤ کہ وہ ہے کون؟"

"میں نے اس کے متعلق تم سے پہلے بھی ذکر کیا تھا ۔ میرے بھتیجے کی بیوی ہے۔"

"وہ عورت جس نے محبت کی خاطر اپنے خاندان اور دراثتی جائداد کو چھوڑ دیا تھا۔"

"ہاں وہی عورت انھوں نے اسے خاندان سے خارج کر دیا ۔"

"اور اس کا شوہر کہاں ہے؟"

"وہ مر گیا ایک حادثہ میں ۔"

"اور تمھارا روپیہ؟"

غریب مس اپنسر میرے اس سوال پر گھبرا گئی ۔ "میں نہیں جانتی" اس نے جیسے تھک کر جواب دیا۔ لیکن میں سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"وہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد یہاں آگئی؟"

"ہاں وہ ایک دن آخر یہاں آگئی ۔"

"کتنا عرصہ ہوا؟"

"تقریباً دس سال۔ لیکن یہ جگہ اسے پسند نہیں ہے۔"

"کیا وہ تمھیں پسند کرتی ہے؟"

اس پر مس اپنسر نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ پھر فوراً ہی کونٹس کے لئے کافی بنانے کے لئے کمرے سے نکل گئی۔ میں تنہا کمرے میں بیٹھا رہا۔ میں کچھ اور باتیں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ پانچ منٹ گذرنے کے بعد وہ نوجوان لڑکا گنگناتا کمرے میں آیا۔ وہ کچھ دیر مجھے مُنہ کھولے ہوئے دیکھتا رہا۔

"کیا آپ وہاں آئینگے؟" وہ بمشکل بولا۔

"کس نے بلایا ہے؟"

"کونٹس نے دریافت کیا ہے ۔"

میں اس کے ہمراہ کمرے سے باہر نکلا۔ کونٹس باغیچہ میں پیڑ کے درخت کے نیچے بیٹھی تھی۔ وہ کشیدہ کاری میں مصروف تھی۔ جب میں قریب پہنچا تو اس نے مجھے سر کے اشارے سے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ مسٹر [illegible] درختوں کے پاس گھاس پر بیٹھ گیا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم فرانسیسی زبان جانتے ہو" کونٹس نے ایک شان بے نیازی کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں! خاتون، بطور فیشن کے ۔" میں نے نہایت اخلاق سے جواب دیا۔

"شکریہ!" وہ خوش ہو کر بولی "کیا تم میرے خوبصورت وطن میں رہ چکے ہو؟"

"بہت دنوں تک ۔"

"یہاں کے لوگ فرانسیسی مطلق نہیں جانتے ۔ تم میری مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتے جب میں نے تم جیسے آدمی کو یہاں پایا جو فرانسیسی زبان جانتا ہے ۔"

"ہاں" پر میں نے کہا۔ "خود میری خوشی اس سے کم نہیں ۔" وہ پھر کروشیہ کے کام میں مصروف ہو گئی۔ ہر چند منٹ کے بعد وہ نظر اٹھا کر مجھے دیکھ لیتی۔ میں نے اب غور کیا کہ وہ ایک کم حیثیت عورت ہے جو ایک حقیقی کونٹس سے کہیں دور ہے۔ اس کا غرور اور شان بے نیازی اس بات کی چغلی کھا رہی تھی کہ وہ کونٹس نہیں ہے ۔

"تم مجھ سے پیرس کی گفتگو کرو۔ اس کے ذکر سے میرے دل میں جذبات کی دنیا بس جاتی ہے۔ آہ! وہاں کے عیش کے دن — کیا وہاں کے لوگ اب بھی پارکوں اور ہوٹلوں میں . . . " اس نے آہ بھر کر کہا۔ پھر اس نے اپنے ابروؤں سے وہاں کی ہر چیز کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں اجڑے ہوئے مقام پر ٹھہری ہوں ۔ یہاں کی ہر چیز ویران اور بےجان نظر آتی ہے۔ مجھے تو قید خانہ معلوم ہوتا ہے۔"

"شاید تم یہاں جلاوطنی کی حالت میں ہو۔" میں مسکرا کر بولا۔ "تم اس کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ بعض آدمی کچھ چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ میں بھی کچھ چیزوں کی عادی ہو گئی ہوں لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جو ہمیشہ پہلے کی طرح تکلیف دہ ہیں۔ مثلاً میری کافی! میری چچی ہمیشہ کافی میں شکر کم ڈالتی ہے اور فرانسیسی شراب کے قطرے ڈالنا بھول جاتی ہے۔ چنانچہ مجھے اپنی خاموشی توڑنا پڑتی ہے زبان کھولنے کے بعد بک بک اور جھک جھک کرنے پر ایک پیالی کافی مجھے ملتی ہے۔"

بیچاری مس اپنسر کے متعلق اس قدر حقیر اور نفرت انگیز الفاظ سن کر میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ رُک گیا۔ اسی وقت مس اپنسر کشتی لئے ہوئے کمرے سے نکلی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اس نے جواب میں مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جس سے میں تڑپ گیا۔ اس میں التجا، آرزو، عاجزی

اور گزارش سب ہی کچھ تھا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ لیکن افسوس میں اس بات کا انکشاف مس اسپنسر پر نہ کر سکا کہ یہ عورت کونس نہیں بلکہ ایک نہایت معمولی درجے کی عورت ہے میں یہ برداشت نہ کر سکتا تھا کہ مس اسپنسر وہاں ایک خادمہ کی طرح کھڑی رہے۔ "تم یہاں کچھ دن تک رہو گی؟" میں نے کونس سے کہا۔

"کون جانے ... ممکن ہے برسوں ..... جب ایک آدمی صیبونیل میں .... " وہ رکی — "بدتمیز، بے وقوف۔" وہ مس اسپنسر کی طرف پلٹی۔ "تم فرانسیسی شراب کے قطرے ڈالنا پھر بھول گئیں!"

وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے پلٹی۔ میں نے خاموشی سے اس سے ہاتھ ملایا وہ بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر ایک صبر آزما علامت تھی۔ شاید میرے رخصت ہونے پر وہ خوش تھی۔ جب میں سینٹ چرچ کے پاس سے گزرا تو مجھے یاد آیا۔ مس اسپنسر یہ کہنے میں حق بجانب تھی کہ وہ اب اس خوبصورت یورپ کو کبھی نہ دیکھ سکے گی

"صبحِ غربت" اور "یادِ جاناں"

از

حضرت جلال ملیح آبادی

صبح جب آتی ہے گردوں کا دریچہ کھول کر
جب نکھرتی ہے کلی شبنم کے موتی رول کر
خون رلواتا ہے دیوانہ پپیہا بول کر
آپ غربت کی گھٹاؤں میں مجھے آتی ہیں یاد
صبح کی ٹھنڈی ہواؤں میں مجھے آتی ہیں یاد

گلستاں میں منہ اندھیرے جب سنکتی ہے ہوا
جھوم کر آتی ہے جب ساون کی مستانہ گھٹا
دور سے آتی ہے جب پانی برسنے کی صدا
آپ غربت کی گھٹاؤں میں مجھے آتی ہیں یاد
صبح کی ٹھنڈی ہواؤں میں مجھے آتی ہیں یاد

جب ستارے جگمگاتے ہیں گھٹا کی چھاؤں میں
جب مناظر مسکراتے ہیں گھٹا کی چھاؤں میں
جب گلستاں لہلہاتے ہیں گھٹا کی چھاؤں میں
آپ غربت کی گھٹاؤں میں مجھے آتی ہیں یاد
صبح کی ٹھنڈی ہواؤں میں مجھے آتی ہیں یاد

جب شگوفے کی جوانی عطر سے ہوتی ہے نم
جب ہوا سے پھوٹتا ہے بربطوں کا زیر و بم
جب گھٹا کی چھاؤں میں گاتے ہیں طائر دم بدم
آپ غربت کی گھٹاؤں میں مجھے آتی ہیں یاد
صبح کی ٹھنڈی ہواؤں میں مجھے آتی ہیں یاد

ڈوبنے لگتا ہے ہنس کر چاند جب پچھلے پہر
دھندلے دھندلے دور سے کہسار آتے ہیں نظر
جھومتی ہے جب گھٹا گردوں پہ زلفیں کھول کر
آپ غربت کی گھٹاؤں میں مجھے آتی ہیں یاد
صبح کی ٹھنڈی ہواؤں میں مجھے آتی ہیں یاد

صبح جب آتی ہے کلیوں کی جبینوں پر نمی
جنگلوں میں جب لپکتی ہے چمکتی کامنی
منہ اندھیرے مسکراتی ہے سہانی چاندنی
آپ غربت کی گھٹاؤں میں مجھے آتی ہیں یاد
صبح کی ٹھنڈی ہواؤں میں مجھے آتی ہیں یاد

کل رات کو!

ہو گئی تھی زندگی اک داستاں کل رات کو

از جناب پروفیسر عبید اللہ قدسی بیاور

تھا سماں ناقابلِ شرح و بیاں کل رات کو
اور ہی تھے یہ زمین و آسماں کل رات کو

آگئی تھی سب سمٹ کر کائناتِ رنگ و بُو
بزم میں تھا جلوۂ کون و مکاں کل رات کو

ہر نفس میں آرہی تھی موجِ صہبا کی لپٹ
بڑھ رہی تھی اس طرح عمرِ رواں کل رات کو

اک توازن اک ترنم، اک تبسم، اک نگاہ،
تُل رہی تھی لمحہ لمحہ میری جاں کل رات کو

اس طرف حُسنِ اشارت، اس طرف حسنِ قبول
بے زبانی ہو رہی تھی ترجماں کل رات کو

شوخیوں پر شوخیاں تھیں، قہقہوں پر قہقہے
گر رہی تھیں بجلیوں پر بجلیاں کل رات کو

دعوتِ ذوقِ نظر پھر شوخیِ حسنِ کلام
بے تکلف ہو گئیں بے تابیاں کل رات کو

خود ابھرتا جا رہا تھا جذبۂ حسنِ لطیف
اوج پر تھا طالعِ حسنِ جہاں کل رات کو

حسنِ برہم کی لطافت عشقِ پیہم کے مزے
ہو گئی تھی زندگی اک داستاں کل رات کو

سرخ ریشم کی دُلائی میں تنفس بار بار
چل رہا تھا رنگ و بُو کا کارواں کل رات کو

بے تحاشا عارضِ رنگیں پہ چھا جاتی تھی زلف
بڑھ گئیں تھیں عشق کی گستاخیاں کل رات کو

حسن کی پیہم نوازش عشق کی پیہم کشش!
جُڑ گئے تھے اس طرح تیر و کماں کل رات کو

تُل رہی تھی نازکی پھولوں کی نازک سیج پر
گل فشانی تھی اُسے سنگِ گراں کل رات کو

لے رہا تھا مست ہو کر پے بہ پے انگڑائیاں
آگیا تھا باڑھ پر حسنِ رواں کل رات کو

شرمگیں، نازک جبیں سحر آفریں انجم نشیں!
بن رہی تھی کہکشاں پر کہکشاں کل رات کو

لغزشِ ہر گام پر خود جھوم جاتا تھا شباب
لُٹ رہی تھی مے فروشی کی دکاں کل رات کو

ہو گئے تھے پائمال نازِ تمکین و خرد،
جلوہ گاہ حسن میں تھیں شوخیاں کل رات کو

گوش بر آواز تھی فطرت ہمارے ساز پر
چاند تارے ہو گئے تھے نغمہ خواں کل رات کو

دو دلوں کی دھڑکنوں میں کھو گئی تھی کائنات
ہو گئے تھے محو خود ارض و سماں کل رات کو

گدگدا دیتی تھی سارے جسم کو موجِ نسیم
صبح تک قدسی رہا وہ مہرباں کل رات کو

[illegible] عورتوں کی آوازیں

ایک عورت نے دوسری عورت سے کہا

ایک نے کہا۔ بہن کیا بتاؤں اب تو شاید مرنے کا وقت آگیا۔ روز بروز میرا حال پتلا ہوتا جارہا ہے۔

دوسری نے کہا۔ یہ عورتوں کے پیچھے ایسی مصیبت لگی ہے کہ ہر مہینہ پانچ چھ دن رو رو کر کٹتے ہیں۔

تیسری نے کہا۔ جب مجھے ماہواری شروع ہوتی ہے تو میرا تمام جسم پھوڑے کی طرح دُکھنے لگتا ہے۔

چوتھی نے کہا۔ اور میرے ...... جب شروع ہوتے ہیں تو میری کمر میں اور پنڈلیوں میں اعصاب کے [illegible] معلوم ہوتا ہے۔

پانچویں نے کہا۔ او بہن! مجھے تو یہ دن قیامت معلوم ہوتے ہیں۔ دن بھر سر چکراتا ہے۔ پنڈلیوں میں اور پیٹ میں ہر وقت ایک اینٹھن سی رہتی ہے۔

چھٹی نے کہا۔ مجھے ایک نئی تکلیف ہے۔ ایک مہینہ میں دو مرتبہ ہوتے ہیں۔ بہت ہی کمزور ہوگئی ہوں

ساتویں نے کہا۔ میں اس تکلیف میں مبتلا ہوں کہ رُک رُک کر آتے ہیں۔ اور بہت ہی درد ہوتا ہے۔

آٹھویں نے کہا۔ میری تکلیف سب سے الگ ہے۔ یعنی کئی کئی مہینے بعد ہوتے ہیں۔ لیکن جب ہوتے ہیں۔ تو بس [illegible] تکلیف کے ساتھ کہ توبہ ہی بھلی۔

نویں نے کہا۔ میرے ساتھ یہ مصیبت ہے کہ ماہواری کے ساتھ ساتھ سفید پانی کی بھی کثرت ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے۔ جیسے بدن میں سے کوئی جان کھینچ رہا ہے۔ کبھی پہلے رطوبت جاتی ہے کبھی بعد۔

کوئی نہیں جانتا کہ یہ کیوں ہے

یہ سب عورتیں ماہواری ایام کی مریض ہیں۔ اگر ماہواری ایام بغیر درد کے باقاعدہ ہر مہینہ وقت مقررہ پر آجایا کریں تو کبھی ان میں سے کوئی تکلیف نہ ہو۔ ہندوستان کی سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں عورتوں کو معلوم ہے اور انہوں نے ذاتی تجربہ کیا ہے کہ اگر کوئی عورت مندرجہ بالا تکلیفوں میں سے کسی ایک یا بہت سی تکلیفوں کا شکار ہوجائے تو اسے بہت جلد تندرست کردینے کیلئے دوا "کورس" سے بہتر ہندوستان میں دوسری دوا نہیں ہے۔ دوا "کورس" استعمال کرنیکے بعد عورت کو ہر مہینہ نہایت پابندی کے ساتھ مقررہ وقت پر صحیح مقدار میں بغیر کسی تکلیف اور بغیر کسی درد کے ماہواری ایام آنے لگتے ہیں۔ "کورس" کی ایک شیشی کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ جن بہنوں کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۲۴ دہلی کو ایک خط لکھ کر بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں محصول پارسل سات آنے خرچ ہوتے ہیں۔

سلطنتِ عثمانیہ کا سنگِ بنیاد

چھ سو سال قبل

از جناب سید ارشاد حسین زبیری بی۔ اے ۔ ایل ایل۔ بی

آج جبکہ بربریت کی خونی آشام تلواریں نیاموں سے نکل کر انسانیت کا لہو پانی کی طرح بہا رہی ہیں اور سلطنت ترکیہ ہر طرف سے محصور ہو کر اپنے گرد و پیش شعلہ بار آگ کی جھلسا دینے والی گرمی محسوس کر رہا ہے اور ہر دوست نما دشمن، دشمن نما دوست بنکر فراستِ ترکیہ کا امتحان لے رہا ہے اس امر کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس سلطنت کا سنگِ بنیاد کیونکر اور کن مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا؟ تاریخ عالم ایسی کوئی دوسری مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جیسی سلطنت ترکی نے پیش کی ہے۔ نہ کسی قوم کو مسلسل تین سو برس تک ایسے جری اور ایسے مدبر دنیا میں بادشاہ ملتے رہے جو حدود ترکی کو بیش از بیش وسیع تر بناتے رہے۔ نہ کسی خطۂ ارض کو سلسلہ بہ سلسلہ کم از کم آٹھ ایسے بادشاہ ملے جنہوں نے سلطنت عثمانیہ کو چار چاند لگا دیئے اور حرب و ضرب ترکی کی دھاک سرزمین عالم میں بٹھا کر اسلام کے نام کو روشن کیا اور عیسائیت کو شکست پر شکست دی۔ کسی ملک کی تاریخ ایسی متواتر اور متعدد مثالیں پیش نہیں کر سکتی اس کی حیاتِ ملی پر سخت سے سخت حملے بار بار کئے جا رہے ہوں اور وہ سلطنت ان نازک مواقع سے ہر بار کامیاب و کامران نکل کر پیشتر سے زیادہ ابھر رہی ہو۔ جس قدر زیادہ خطرہ در پیش ہوا اسی قدر ترکوں کے جوہر کھلے اور آگ سے نکل کر سونا کندن بنکر چمکنے لگا۔ بار بار تمام صلیبی قوتوں نے فرداً فرداً اور بالاجتماع اس سلطنت کی بنیادوں کو کھلے میدان میں تمام مذہبی جوش و خروش اور تمام جسمانی قوتوں کے ساتھ حملہ کر کے کھوکھلا کرنے کی کوشش کی اور ہر بار اپنی تعداد کی کمی کے باوجود سلطنت عثمانیہ نے دشمنوں کو شکست فاش دی اور ہلال اسلام کو بلند تر کر دیا۔ بار بار عیسائیت کے علمبرداروں اور حمایتیوں نے اپنے مواعید و مواثیق کو توڑ کر اور مکر و فریب کا جال بچھا کر سلطنت ترکی کو زیر کرنا چاہا لیکن ہر بار باوجود اچانک حملہ ہونے اور عدم تیاری کے دندان شکن جواب دیکر ترک کامرانی سے ہم آغوش ہوتے رہے اور یقیناً ترکی کو حیات ابدی ملی ہے۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ یقیناً روئے ارض پر کوئی ایسی سلطنت موجود نہیں جو افتخار کے ساتھ کہہ سکے کہ باوجود محکومیت کی نسلی غیریت اور قومی امتیاز کے محکوم اقوام اور ہمسایہ اقوام میں عزت و محبت کی نگاہ سے دیکھی گئی ہو۔ ایرانی ہو یا افغانی۔ ہندی ہو یا مصری۔ شامی ہو یا عراقی۔ غرض ہر مسلم کی نگاہ آج نہیں ہمیشہ ترکی کی طرف محبت آمیز اور پرستارانہ انداز میں اٹھی۔ خواہ اس کے خلاف یہی پروپیگنڈہ کیوں نہ رہا ہو کہ وہ علماء کے خلاف ہیں یا نماز ترکی زبان میں پڑھتے ہیں۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا بانی جمہوریہ ترکیہ کا دور دیکھنے والے عصمت انونو کا دور دیکھ رہے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے دل کی گہرائیوں میں ترکی کے ہر فعل و ترکِ فعل پر جو روحانی مسرت حاصل کر رہا ہے اس سے وہ ناواقف نہیں۔ ترکی کے نام پر ہمارے قلوب مسرتوں سے چھلک جاتے ہیں اور جسم و جان میں برقی لہر دوڑ جاتی ہے۔ کوئی پوچھے کیوں؟ شاید جواب نہ دیا جا سکے لیکن ہونٹوں پر تبسم آ جائیگا۔ آج دنیا میں کونسی ایسی سلطنت ہے جو اس کامیابی کے ساتھ دو متحارب جانی دشمنوں کی دوست ہو اور مزید برآں لطف یہ کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو اس کی دوستی پر اعتماد حاصل ہو۔ عقل و فراست کی روشنی میں ناممکن اور ممکن نظر آنے لگا۔ عقول دریائے حیرت میں غرق ہیں لیکن واقعہ کچھ اسی انداز سے پیش نظر ہے کہ انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ابتدائی وطن

ایسے ہی عقل و فراست کے افراد دنیا پر حکومت کرنے کیلئے پیدا ہوتے ہیں اور اس حقیقت کو سلطنت عثمانیہ کی ابتدائی تاریخ بدرجہ اتم ثابت کرتی ہے۔ ان کی قدیم ابتدائی تاریخ وسط ایشیا کے میدانوں سے شروع ہوتی ہے۔ نیر اسلام کے طلوع ہونے سے پیشتر ترکوں نے بلخ کی حدود سے بڑھکر منچوریا لے لیکر کا...ہم کر شرقاً و غرباً اور ماوراء النہر سے دریائے ... تک شمالاً و جنوباً اپنی حکومت کی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ لیکن ظہور نور اسلام کے بعد سامانیوں نے جنوبی حصہ بہت کچھ ان سے چھین لیا تھا اہم ترک شمالی میدانوں کے مالک بنے رہے اور اپنی شمشیر زنی کے جوہر دکھلاتے

نہ صرف سلطانیوں کے یہاں بطور سپاہیوں کے داخل ہوتے رہے بلکہ مرکز خلافت کے لئے بھی اسی قدر کارآمد ثابت ہوتے رہے۔ عرب میں ان کا داخلہ اول اول بطور غلاموں کے ہوا لیکن جلد ہی ان کے جوہر پرکھے گئے اور بطور فوجی افسروں کے کارہائے نمایاں کرنے لگے یہاں تک کہ خواتین عرب سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر مقتدر و مفتخر ہستیوں میں شمار ہونے لگے۔ آہستہ آہستہ ترکوں کا ایک قبیلہ غزنی پر حکمران ہو گیا اور بعد ازاں ایک دوسرے جرگے نے خراسان میں آ کر اپنا سکہ بٹھایا اور سلجوقی خاندان کی بنیاد قائم کی۔ گیارہویں صدی سے لیکر تیرہویں صدی تک ایشیائی اسلامی ممالک پر سلجوقی خاندان حکمراں رہا۔ سلجوقیوں نے اسلام کو اناطولیہ تک بڑھا دیا اور دولت عثمانیہ کے قیام کے لئے زمین ہموار کر دی لیکن یہ قوت زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکی۔ انہی کی باجگذار سلطنتوں نے ان کو آ دبایا۔ خوارزم کے شاہوں نے ان کی عظمت کو تہس نہس کر دیا۔ قریب تھا کہ شاہ خوارزم سلطنت سلجوق کو فنا کر دے لیکن نوشتۂ تقدیر کچھ اور تھا۔ ایک آندھی آئی اور دستِ فنا کو خود شل کر دیا۔ چنگیز خاں طوفان کی طرح اٹھا اور اٹھتے ہی وسط ایشیا پر چھا گیا اور مملکت خوارزم، حکومت سلجوق حتیٰ کہ حدود سلطنت خلافت کو زیر و زبر کر دیا۔ یہاں تک کہ فطری بہادر قوم کے یہ فرزندان یورپ میں بھی جا پڑے لیکن یہاں ان کو اس قدر کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ ان کے حملے کے دائمی اثرات صرف سلطنت روس کے کچھ حصہ میں باقی ہیں ورنہ اگر یہ چنگیزی تاتاری مخلوق کا حملہ کامیاب ہو گیا ہوتا تو تاریخ یورپ کا نیا رنگ روپ ہوتا۔

بہرحال ترک باوجود اس حملے کے مغربی ایشیا میں باقی رہے۔ یہ سیلاب عظیم ان کو صرف ایشیا کے مغربی گوشہ تک بھگانے میں کامیاب ہو سکا جہاں وہ سواحل سمندر پر سلطنت کی بنیاد قائم کر سکے۔ ان بھاگے ہوئے ترکوں کے جرگے جس طرف بھی گذرے اپنے لئے نئی دنیا بساتے گئے۔ کچھ ترکمان ایران اور شام کی تاریخ میں یادگار ہیں۔ کچھ مصری مملوکی سلطانوں سے معرکہ آرا ہوتے اور پھر بھاگ کر آتے اور سلجوقیوں کی سلطنت میں شامل ہو گئے۔ غرض سر دست ایشیا مغل اور ترک میں باہم تقسیم سا ہو گیا۔ اسی دور میں چین میں بھی مغل حکمران تھے اور ہندوستان میں بھی مغل بادشاہت قائم ہوئی۔ ایران میں بھی چنگیز خاں کی نسل حکمراں ہوئی۔ لیکن آہستہ آہستہ ترکوں نے مغلوں سے ان کی عظمت کا بہت بڑا حصہ چھین لیا اور ہلاکو خاں کے تخت پر ایک عرصہ تک ترک بلا شرکت غیرے فرد کشی ہوتے رہے ...

ارتغرل

ترک و مغل کی اسی باہمی نبرد آزمائی کا واقعہ ہے کہ سلجوقی سلطان کیقباد انگورہ کے میدان میں ایک مغل جرگے میں گھر گیا قریب تھا کہ مغل ترکوں پر فتحیاب ہوتے دفعتاً چار سو نامعلوم سواروں کا حقیر سا دستہ میدان کارزار میں نمودار ہوا۔ نہ سواروں کو اسکی خبر کہ کونوں میں جنگ ہو رہی ہے نہ اُن کو اس کی اطلاع کہ وہ کس کی مدد کرنے جا رہے ہیں۔ خالص بہادری کے اصول کے مطابق اور محض سپاہیانہ جذبات کے تحت انہوں نے کمزوروں کا ساتھ دیا اور چشم زدن میں بساط کو اُلٹ دیا اور مغلوں کے ہاتھ سے کامیابی چھین کر سلجوقیوں کے ہاتھ میں دے دی۔ سلطان ارتغرل مغلوں کے ہاتھ سے شکست کھا کر خراسان سے بھاگا۔ دریائے فرات پر قدرے آرام کر کے اناطولیہ کے آرام دہ میدانوں کا قصد تھا کہ راستہ میں انگورہ کا میدان جنگ مل گیا اور سپاہیوں کی تقدیر چمک گئی۔ مصیبت زدہ ارتغرل کو خواب میں بھی یہ خیال نہ گذرا ہوگا کہ اس حقیر سی کارزار سے وہ ایک ایسی سلطنت کا سنگِ بنیاد رکھے گا جو کم و بیش تین صدیوں تک بیش از بیش ترقی کرتی رہیگی اور چھ سو سال سے زائد گذر جانے اور مختلف طریقوں سے مختلف اجزائے سلطنت کے بکھر جانیکے باوجود مختلف قوم اور قبیلہ کے مسلمانوں کے لئے مرکز خیال و عزت رہیگی۔ ترکی تخت چھتیس بادشاہوں کے قدوم سے آنکھیں مل چکا ہے یہاں تک کہ جمہوریہ ترکی کا دور آ گیا۔

ظاہر ہے کہ سلجوقی سلطان ارتغرل کا کس درجہ ممنون احسان ہوا ہوگا اس نے جذبۂ تشکر سے متاثر ہو کر اسی جنگاہ کے قریب ارمنی پہاڑوں کے دامن میں اُسے ایک صوبہ داری سی قائم کرنیکا موقع دیا۔ زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ ارتغرل کو دوبارہ داد شجاعت دینے کا موقع آ گیا انہوں نے بار دیگر یونانیوں اور مغلوں کی متحدہ قوت سے تین شبانہ روز جنگ کر کے اور کار نمایاں دکھا کر سلجوقی سلطنت کو محفوظ رکھا سلجوقی بادشاہ نے ابکی بار ارتغرل کی جانبازی کے صلہ میں ضلع عسک شہر عطا کر دیا جسے بعد میں سلطانونی کے نام سے یاد کیا گیا۔ یہ مقام ایشیائی مسلمانوں اور یونانی عیسائیوں کی مملکتوں کے درمیان واقع تھا۔ اسی وجہ سے اس بہادر قوم کو عیسائیوں کے خلاف جنگی جوہر دکھانے کا کافی موقع ملا۔ بہر نوع اسی مقام کے بوقلموں چمنستانوں اور زمردیں مرغزاروں کی گود اور شاخہائے انگور کے سایہ میں دولت عثمانیہ کا پالنا جھلایا گیا یہاں تک کہ یہ صغیر سن بچہ پروان چڑھا۔

عثمان بن ارتغرل کا خواب

۱۲۵۸ء میں ارتغرل کے لخت جگر عثمان نے اپنی ماں کے آغوش میں آنکھیں کھولیں۔ عثمان بن ارتغرل پہلا شخص ہے جس نے ترکی سلطنت کا خواب دیکھا اسی لئے صدیوں تک یہ سلطنت "سلطنت عثمانیہ" کے مفتخر و معزز نام سے یاد کی جاتی رہی۔ عثمان کی ابتدائی بچپن کی زندگی قدیم ترکی ماحول میں بیتی فنونِ حرب سے آگاہ ہوا۔ بچپنے نے قدم نکالا مسیں بھیگیں۔ جوانی آئی اور اپنی تمام رومانیت کے ساتھ آئی۔ محبت کے دیوتا کیوپڈ نے تیر و کمان سنبھالا چلہ کھینچا اور ناوک سر کیا۔ عسک شہر کے قریب مضافاتِ اطرغرنی میں ایک عالم رہتا تھا جس کا نام آدبالی تھا۔ قدرت نے اسے ایک دختر دی تھی جس کا نام قمریہ تھا۔ گلستانِ رعنائی کا یہ گل سرسبد اپنی بھرپور جوانی کے عالم میں مسکن آدبالی کے گوشہ گوشہ کو تبسم زار بنائے ہوئے تھا کہ کہیں عثمان نے اس حور وش کو دیکھ لیا۔ ناوک اپنا کام کر گیا۔ ارتغرل اپنے بیٹے کی دلی آرزو پوری کرنے میں ہر ممکن طریقہ سے کوشاں ہوا لیکن ابھی ارتغرل محض ایک نووارد اجنبی اور لامعلوم قبیلے کے سردار کی حیثیت رکھتا تھا آدبالی نے ایسا رشتہ کرنے سے انکار کر دیا۔ آدبالی کو خیال تھا کہ قمریہ کی سی نازنین کے لئے بہتر سے بہتر قبیلے کے شہزادے پیام دینگے لیکن آدبالی کا ارادہ ایک انوکھے انداز میں متزلزل ہو گیا۔

خوش نصیب عثمان نے ایک دن خواب دیکھا کہ وہ اور اس کا بڈھا میزبان آدبالی ایک مقام پر آرام کر رہے ہیں کہ دفعتاً آدبالی کے سینہ سے ایک قمر طلوع ہوا جو آہستہ آہستہ بڑھا اور عثمان کے سینہ پر آ کر چمکا اور وہیں ڈوب گیا۔ اسی وقت عثمان کی کمر سے ایک درخت اگا۔ اسکی شاخیں پھیلیں اور اس قدر چھتنار ہو گیا کہ خشکی و تری۔ زمین اور سمندر سب پر چھا گیا۔ چار عظیم الشان پہاڑ قاف۔ اٹلس۔ ہیمس اور ٹارس اس درخت کے تھامنے کے چار ستون بن گئے۔ ان پہاڑوں کے پہلو سے چار دریا نیل۔ ڈینوب۔ دجلہ۔ فرات بہہ نکلے اور ان دریاؤں میں جہاز رانی ہونے لگی۔ تختۂ زمین ہرے بھرے کھیتوں سے لہلہانے لگا۔ نخل و ثمر شمشاد و صنوبر نے زمین کو سنوار دیا۔ بلبلیں بخوش الحان طیور مسرت سے نغمے گانے لگے۔ سربفلک عمارتوں کے مینار و گنبد سر اٹھا کر نظارہ کرنے لگے اور ان کی نوک پر ایک طلائی ہلال چمکنے لگا۔ دفعتاً ہوا چلی اور ہلال کو تاج قسطنطنیہ سے ٹکرا دیا۔ اسے قسطنطنیہ دو سمندروں کے درمیان یوں معلوم ہوا گویا ایک انگوٹھی پر لعل و زمرد کے مابین ہیرا جڑ دیا گیا ہو۔ عثمان نے اس انگوٹھی کو پہن لینا چاہا لیکن اتنے میں آنکھ کھل گئی۔

[illegible]

عثمان نے اپنا خواب قمریہ کے والد سے بیان کیا۔ خواب کی تعبیر آدبالی کے سامنے حقیقت کی شکل میں نظر آنے لگی۔ اب کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ آدبالی کی نسل کے لئے مستقبل اس قدر درخشاں ہے۔ اس نے اپنی اولاد کی پھلتی پھولتی دنیا دیکھ کر اپنی نور نظر کو عثمان کے حبالۂ نکاح میں دے دیا۔ یہی قمریہ مورخین کی زبان میں "مال خاتون" کے نام سے مشہور ہے ممکن ہے اس کا نام اس لئے رکھا گیا ہو کہ اس کی وجہ سے عثمان کی تقدیر میں کس قدر مال و دولت اور وسعت سلطنت لکھ دی گئی۔ ۱۲۸۸ء میں بطن قمریہ سے ارخان پیدا ہوا اور اسی سال ارتغرل نے انتقال کیا۔ ارتغرل نے نہایت پرامن زندگی بسر کی اور کبھی یہ خیال نہ کیا کہ اپنے زور بازو سے کام لیکر سلطنت قائم کرے لیکن ابن ارتغرل دوسرے ہی مزاج کا تھا۔ باپ کے طریقہ عمل نے اس خاندان کو ہر دلعزیز کر دیا تھا عثمان نے بھی ابتدا میں امن و امان کے اصولوں پر سختی سے کاربند ہو کر اپنی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کیا دین حنیف کی پابندی اور شریعت کی ترویج کے لئے حکام مقرر کئے عسک شہر میں مسجد تعمیر کرائی اور اپنی سلطنت کی عمارت عدل و عدالت کی سنگلاخ بنیادوں پر قائم کیا۔ ۱۲۸۹ء میں سلجوقی سلطان نے "فتح حصار" کا خطاب عنایت کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد عثمان اپنی پرسکون اور بارام زندگی سے اکتا گیا اور محاربہ و مجادلہ کے خطروں اور حرب و ضرب کی ہیجانی کیفیتوں سے لطف اندوز ہونے کا خواہشمند ہوا۔ زمانہ نے مساعدت کی ہمسایہ اقوام کمزور ہو رہی تھیں عثمان نے ہر ایک کو اپنے زیر نگیں کر لیا اور رفتہ رفتہ یونانیوں کے حدود میں مداخلت کرنے لگا اور ان کے سرحدی علاقوں پر جارحانہ اقدامات کرنے لگا۔ اسکی شہرت و عظمت اس قدر بڑھ گئی کہ اجنبی اس پر حسد کرنے لگے چنانچہ ۱۲۹۹ء میں ان حاسدوں نے ایک شادی کے موقع پر اپنا جال بچھا کر مکر و فریب سے عثمان کی شمع حیات گل کر دینے کا تہیہ کر رکھا تھا لیکن عثمان کو ابھی دنیا میں بہت کچھ کرنا تھا اسے علم ہو گیا۔ ہنگامۂ سرور میں چالیس برقع پوش عورتیں حویلی میں داخل ہو گئیں۔ نقاب الٹ دیئے گئے اور عثمان کے قبیلہ کے چالیس منتخب مسلح ترک تلواریں کھینچ کر [illegible] چشم زدن میں میدان ان کے ہاتھ آ گیا۔ حویلی [illegible] بھاگتی دلہن بھی ہاتھ لگی۔ اس دلہن کا نام نیلوفر تھا۔ اسی خاتون کے بطن سے شاہزادہ مراد بن عثمان پیدا ہوا جس نے دولت عثمانیہ کو اور بھی بلند کر دیا۔ غرض اسی ہنگامہ میں ان چالیس مردوں نے "ینی شہر" کو فتح کر لیا۔ دوسری طرف عثمان آندھی کی طرح "یار حصار" پر حملہ کر کے دوڑا اور [illegible]

حملے میں قبضہ کر لیا۔ ایک فوج نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ "عین گل" پر دھاوا بول کر شامل سلطنت کر دیا۔ المختصر قلیل عرصہ میں دیکھتے ہی دیکھتے عثمان کی متروکہ مملکت دامن ارمنی سے کوہ اولمپس تک بڑھ گئی اور یونان کے دو خاص ایشیائی شہروں بروسا اور نائیکیا کے ڈانڈے سلطنت عثمانیہ سے ملا دیئے۔ عثمان نے "ینی شہر" کو اپنا دار السلطنت قائم کر کے بروسا اور قسطنطنیہ پہنچنے کا زینہ قائم کر دیا۔

فتح بروسا

لیکن باوجود ان فتوحات کے سلطنت عثمانیہ کے حدود ابھی نہایت حقیر تھے۔ یوں سمجھئے کہ ترکی کی عظمت کے زمانہ میں رقم سلطنت عثمانیہ کے پچیس صوبوں میں سے ایک تھا اور بانی سلطنت عثمانیہ کے متروکہ حدود صوبہ روم کے سترہ اضلاع میں سے صرف ایک ضلع کے برابر تھے۔ اتنا ضرور تھا کہ عثمان اب بادشاہ تھا اور اس وقت یعنی ۱۲۹۹ء سے لیکر ۱۳۲۶ء تک اس جوانمرد نے جواں سال بادشاہ نے شاہی کی اور برابر اپنی مملکت کے حدود کو وسعت ہی دیتا رہا۔ یونان کی سلطنت کے حدود سلطنت عثمانیہ سے متصل تھے عثمان نے یہی ٹھانی کہ اپنا سایہ یورپ پر بٹھایا جائے۔ اس نے متواتر جارحانہ کارروائیاں کر کے یونان کو کمزور کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ "بافیوم" کے مقام پر یونانیوں کو ایسی شکست فاش دی کہ وہ قلعہ سے باہر نہ نکل سکے ترکوں نے نائیکیا اور بروسا ایسے مشہور مقامات کی طرف توجہ مبذول کی اور دس سال متواتر و مسلسل جنگ جاری رکھ کر بروسا کو فتح کر لیا۔ قلعہ بروسا نہایت سنگین تھا جس پر کوئی حملہ اثر نہ کرتا اس لئے عثمان کے لڑکے ارخان نے جس کے ہاتھ میں فوج کی کمان تھی رسل و رسائل کے راستے مسدود کر دیئے۔ دو مضبوط قلعے مقابل میں بنا کر وہیں اقامت پذیر ہو گئے۔ غلہ کی آمد و رفت اور تجارتی مال و اسباب کی درون آمد کو روک کر رعایا اور حکومت کو پریشان کیا یہاں تک کہ رعایا نے بروسا کے پھاٹک کھول دیئے اور دس سال کے عرصہ میں ترکی افواج جنگی نقطۂ نظر سے بالکل خاموش نہ رہیں۔ باسفورس اور بحر اسود تک پیاپے حملے کرتے رہے شاہ یونان قسطنطنیہ کی بلند عمارتوں کے مناروں سے مضافات کے دیہاتوں میں آتش زدگی اور رعایا کی بے بسی کے مناظر دیکھا کرتا لیکن ناچار تھا۔ نعمتمند لڑکا باپ کو فتح بروسا کی خبر سنانے گیا۔ عثمان نے جیتے جی اپنے بستر علالت پر فتح بروسا کی خبر سن لی قلعہ بروسا کی فصیل پر ترکی جھنڈا لہرا رہا تھا اور عثمان چھبیس سال بادشاہت کر کے ستر سال کی عمر میں

خوش خوش عالم جاودانی کی طرف سفر کر رہا تھا۔

عثمان زنگی

ہر چند کہ عثمان بن ارتغرل اس قدر خوش نصیب ثابت نہ ہو سکا کہ وہ کسی بادشاہت کی تکمیل اپنی حیات میں دیکھ سکتا لیکن اس نے متواتر فتح حاصل کر کے ترکوں کو کامیابی سے روشناس کرا دیا۔ اپنی اولاد کے حوصلوں کو بڑھا کر کامیابی کے رستے کھول دیئے۔ جس طرح ارتغرل نے انگورہ کے قریب آباد ہو کر ایک مرکز قائم کیا عثمان بن ارتغرل نے اس مرکز کے گرد ایک دائرہ کھینچ دیا اب یہ اس کے لائق جانشینوں کا کام تھا کہ وہ اس دائرہ کو اس طرح بڑھا دیں جس طرح پانی کی سطح پر ذرا سا مرکزی نقطہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور فی الواقع اس کے بعد آنے والے بادشاہ برابر ایسا ہی کرتے رہے۔ عثمان بن ارتغرل بالکل سادی زندگی بسر کرتا۔ مرتے وقت اس کی ذاتی املاک انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ ایک انگریز مورخ ناقل ہے :-

"اس کے متروکہ میں نہ سونا تھا نہ چاندی۔ صرف ایک پیالہ (نشانِ مہمان نوازی) ایک چمچہ۔ ایک فرسودہ کوٹ۔ ایک سفید ریشمی صافہ۔ ایک جھنڈا۔ چند نفیس گھوڑوں کا طویلہ دو راس بیل اور چند بھیڑیں جنکی اولاد اب بھی بروسا کے مرغزاروں میں چر رہی ہے یہی اس کا متروکہ تھا۔ اس کا لباس ہر چند کہ سادہ تھا لیکن اسکی شان شاہانہ تھی۔ اس کے دست و بازو اس قدر لانبے تھے کہ گھٹنوں سے نیچے لٹکتے۔ اس کی رانیں شہسواروں کی سی تھیں۔ اس کی ناک کافی نمایاں تھی۔ ریش و سر کے بال سیاہ تھے اور چہرہ بھی ملیح تھا جس کی وجہ سے اُسے "عثمان زنگی" کہتے ہیں۔ اس لئے کہ مشرق میں سانولا رنگ بلندیٔ فطرت اور جسمانی قوت کی دلیل ہے۔ "عثمان زنگی" نے اپنی جسمانی قوت و جرأت اپنی نسل میں سلسلہ بسلسلہ منتقل کی اور کم از کم تین سو سال تک سلطنت عثمانیہ کے تخت پر کوئی ایسا سلطان متمکن نہ ہوا جو اپنی ذاتی جرأت و شجاعت میں بے مثال اور بے ہمتا نہ رہا ہو۔"

اسی لئے بعض مورخ واقعات سے مجبور ہو کر لکھتا ہے "بہادری ترکوں کا پیدائشی طرۂ امتیاز رہے۔"

ارخان بن عثمان

بہر حال عثمان بانی سلطنت عثمانیہ چل بسا اور اب ارخان کی باری تھی۔

...ارغان کا باپ کے زمانہ ہی میں بروسا فتح کر کے میدان جنگ کا نشیب و فراز سے واقف ہو چکا تھا۔ اسی سال نکومیڈیا بھی ترکوں کے قبضہ و قبضا میں آ گیا۔ آخر شاہ یونان انڈرونکس نے ہمت کی اور ۱۳۲۹ء میں ایک فیصلہ کن جنگ کے ساتھ برپا ہوا۔ یہ میدان بھی ترکوں کے ہاتھ رہا اور ان کی ... اور بڑھ گئیں۔ ۱۳۳۰ء میں نائیکیا اور ۱۳۳۶ء میں پرگامان ... عثمانیہ کا جزو ہو گئے۔ نائیکیا فتح کر کے ارخان نے اپنی اولوالعزمی و بلند ہمتی کا ثبوت دیا۔ باشندوں کو حکم دیا کہ اگر کوئی رعایا سلطنت ... میں رہنا پسند نہ کرے تو اپنی جملہ املاک لے کر کسی دوسرے مقام پر سکونت پذیر ہو سکتی ہے ایسے احکام کا ہمیشہ خاطر خواہ اثر ہوتا ہے ... نتیجہ ایسا ہی ہوا اور مفتوح اقوام کے دل میں ترکوں کی عظمت ... بڑھ گئی۔ ان فتوحات کے بعد بیس سال کی طویل مدت تک ترک بالکل خاموش رہے اور ملکی انتظام میں منہمک ہو کر حکومت کو مستحکم کرتے رہے۔

جدید فوجی تنظیم

... ستارہ چمک رہا تھا حسن اتفاق سے ارخان کا بھائی علاؤالدین زبردست تنظیمی دماغ لے کر آیا تھا یہی شخص سلطنت عثمانیہ کا پہلا وزیر اعظم تھا۔ اس کی فراست و دانائی کی وجہ سے مورخین اکثر اسی کو سلطنت عثمانیہ کا بانی کہنے کے لئے تیار ہیں۔ اس نے ارخان کے نام پر سکہ جاری کیا۔ فوج کو نئے اصول پر منظم کیا۔ اب ترکوں کا ... صرف چند ہستیوں پر مشتمل نہ تھا بلکہ شاہی کر رہا تھا اور مالک ... تھا اب ترکوں کو مختلف قبائل پر حکومت کرنی تھی۔ ... اقوام اور دوسرے ممالک کے دست برد اور حملوں سے حفاظت بھی کرنا تھا ساتھ ہی ساتھ اپنی سلطنت کی وسعتوں کو بڑھانا بھی تھا اس لئے وقت ضرورت قبیلے کو لوٹ مار کی طمع دلا کر دعوت دینا اور لڑنے کے لئے تیار کرنا کارآمد طریقہ نہیں ہو سکتا تھا اور نہ اب محض چند افراد کا دستہ بادشاہوں سے جنگ کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا اب ترکوں کو جہانگیری اور جہانبانی کرنی تھی اس لئے علاؤالدین نے فوج کو نئے نظام کے ماتحت منظم کیا۔ ایک دستہ "پیادوں" کا تنظیم دیا۔ ان کو معقول تنخواہیں دیں۔ فوجی سڑکوں کو درست رکھنے اور جنگ کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہنے کے لئے قطعات اراضی دیتے ان میں سے ہر ایک کو اپنے ذاتی جوہر کی بدولت ترقی کرنے اور اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب تک پہنچنے کیلئے برابر کے حقوق دیئے۔ ایک دوسرا دستہ ان نومسلموں کا دستہ رکھا جو ہر سال عیسائی آبادی سے منتخب کیا جاتا یا بطور غلام خرید کیا جاتا تھا۔ ان کو سخت سے سخت فوجی تعلیم دی جاتی اور ان کی فوجی صفات کے صلہ میں مناسب جلیل القدر عہدے دیئے جاتے۔ ارخان پاشا نے ان نوجوانوں کے ابتدائی ایک ہزار کے دستہ کو لے جا کر ایک درویش حاجی بکتاش کے سامنے پیش کیا تاکہ وہ ان کا نام رکھ دے اور ان کی برتری کی دعا کرے۔ حاجی بکتاش نے اپنا ... ان میں سے ایک سر پر اپنی گلیم ڈال دی اور کہا "اچھا تمہارا نام ینی چری ہے خدا تمہارے چہرہ کو نورانی۔ تمہارے بازوؤں کو قوی۔ تمہاری شمشیر کو خارا شگاف اور تمہارے تیروں کو ہلاکت بار کرے اور تم ظفریاب ہو" کہا جاتا ہے کہ اس دستہ کی اونچی ٹوپی اور لمبی ڈھیلی آستینوں کی یہی وجہ تھی اور یہی حاجی بکتاش کا رکھا ہوا نام تھا جسے یورپین مورخین "جینی سری" کے نام سے یاد کرتے ہیں اس دستے نے برابر بہادری کے وہ جوہر دکھائے جو آج تک یادگار ہیں جس کی وجہ سے ان کا رسوخ اس قدر بڑھ گیا کہ بعد میں امور سلطنت میں بے حد دخل انداز ہو گئے۔ پیشتر اس کے کہ یہ بہادر دستہ دشمن کی فوج پر اصلی حملہ کرے ایک اور دستہ ان کے آگے آگے رہتا جو پیدل اور سوار دونوں پر مشتمل رہتا۔ دشمن کا پہلا حملہ یہی دستہ روکتا۔ اس دستہ کا نام "سپاہی" تھا یہ نام ہندوستان میں اب تک رائج ہے۔ کچھ سواروں کے الگ دستے بھی بنائے گئے اور ان کو معافیاں دی گئیں ان کا نام "آکنجی" رکھا گیا یہ جرگہ بلا تنخواہ تھا اور ان کا انعام اور ان کی محنتوں کا صلہ صرف مال غنیمت تھا۔

ارخان اور شہزادی تھیوڈورا

علاؤالدین نے اس طرح فوج کو مکمل منظم کر کے بیس سال کی خاموشی کے بعد سکون کی وادی سے ترکوں کو نکالا۔ ارخان کو یورپ میں قدم رکھنے کا موقع ملا۔ ارخان کی سطوت و جبروت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ یونانی بادشاہ "کینٹا کیوزنس" نے اپنی دختر تھیوڈورا دے کر ارخان کو اپنا داماد بنانے میں افتخار محسوس کیا۔ اور اسی رشتے کے بل پر اپنی خانہ جنگیوں میں ارخان سے امداد کا طالب ہوتا رہا۔ ارخان بھی یورپین معاملات میں دخل دینے کا متمنی تھا۔ اسی زمانہ میں اہل جنیوا اور اہل وینشیا میں باہم مسلسل کارزار کا

میدان گرم رہنے لگا تھا۔ ارخان اہل وینشیا سے قدرے دل ملول تھا اس نے اہل جنیوا کی مدد کرنے کا بیڑا اٹھایا اور فی الفور ترکی اور جنیوا میں باہم وہ معاہدہ ہو گیا جس نے ترکی کو یورپ میں ترکی جھنڈا نصب کرنے کا موقع دیا۔

داخلۂ یورپ

معاہدہ کا طے پانا تھا کہ ارخان نے اپنے پسر اکبر سلیمان پاشا کی سرکردگی میں امداد بھیجدی۔ سلیمان پاشا بلقان میں اس سے پیشتر کافی کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے ایک معمولی سی ناؤ پر صرف اسّی آدمیوں کی قلیل تعداد لے کر سمندر پار کیا اور "زیمپ" کے قلعہ پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس جری افسر کے جگر کی داد دیجئے جو اس قدر قلیل التعداد فوج (جسے فوج کہنا کسی حالت میں مناسب نہیں) لے کر حملہ کے لئے نکل پڑا۔ اپنے زور بازو پر اسے کس قدر اعتماد تھا اپنے ہمراہیوں کی شمشیر زنی پر کس قدر بھروسہ تھا کہ یوں جان پر کھیل کر پہلا حملہ کر دیا۔ بہت جلد یہ اسّی کی تعداد تین ہزار میں بدل گئی اور باآسانی قلعہ ترکمان بہادروں کے ہاتھ آ گیا۔ بادشاہ یونان "کینٹا کیوزنس" اپنے دوسرے داماد "پیلیولوگس" سے پنجہ آزما ہو رہا تھا

اس نے اسے فال نیک سمجھا اور ارخان سے امداد کا طالب ہوا ارخان نے مزید فوج بھیجکر شاہ یونان کی مدد کی اور اس کی مشکل کو آسان کر دیا۔ پیلیولوگس کو شکست ہوئی اور ترکوں کے قدم سرزمین یورپ میں جم گئے۔ ۱۳۵۸ء میں "گیلی پالی" میں ایک سخت زلزلہ رونما ہوا۔ شہر کا شہر ویران ہو گیا۔ آبادی ویرانہ میں بدل گئی گرے ہوئے مکانات کی رعایا بھاگ گئی ترکوں نے اسے تائید غیبی خیال کرتے ہوئے اس مقام پر بھی قبضہ کر لیا۔ شاہ یونان اعتراض ہی کرتا رہا۔ ارخان نے قدرتی احکام کی تاویل کر دی۔ اس طرح یورپین ساحل پر ترکی جھنڈا لہرانے لگا۔ اور وہاں کی ترکی بندرگاہیں ترکی بحری بیڑے کی حفاظت میں آ گئیں۔

سلطان ارخان "گیلی پالی" کو شامل سلطنت کر کے دوسرے سال موت کی میٹھی نیند سو رہا اور یہ اس کے لڑکے سلطان مراد کے حصہ میں آیا کہ وہ ترکی افواج کو دریائے ڈینوب کے کنارے تک پہنچا کر سلطنت عثمانیہ کو وسط یورپ تک پہنچا دے۔

چنگاری

[illegible]ہی زبان کا ایک ایکٹ کا ڈراما

نوشتہ :- پروفیسر سیتارام راؤ پھڑکے ایم ۔اے
مترجمہ :- جناب امجد علی خاں یوسف زئی (منشی فاضل)

افراد :-

راؤ بہادر [illegible] ... ایک متمول وکیل
میرا اور انجنی ... راؤ بہادر کی لڑکیاں
بالوجی ۔ ... راؤ بہادر کا کلرک
[illegible] ... راؤ بہادر کا ملازم
[illegible] ... بیڑی کا کارخانہ دار
[illegible]ھو کملے ۔ ... شہر کا معزز شخص
[illegible]نر نانا ۔ ... ایک مزدور

منظر :-

(راؤ بہادر ساوئے وکیل کا آفس - بیچ میں رکھی ہوئی میز کی دراز میں وکیل صاحب کی چھوٹی لڑکی انجنی کچھ ڈھونڈنے میں مشغول ہے - سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی حسن کے دروازے میں قدم رکھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے درازوں میں ڈھونڈنے پر بھی اس کی تلاش کرنے والی چیز نہ ملنے پر وہ کھسیانی سی ہو جاتی ہے - آخر وہی "رکھنا 'نہیں رکھنا سرکار ظالم نہیں رکھنا" گنگنا چھوڑ کر وہ باندھ کے کمرے میں بیٹھی ہوئی بڑی بہن کو زور سے پکارتی ہے)

انجنی - میرا' او میرا!
میرا - (کمرہ میں سے بولتی ہے) کیا کہتی ہے ری!
انجنی - نہیں مل رہی ہے -
میرا - ٹھیک طور سے دیکھو بالکل نیچے کے دراز میں ہے -
انجنی - نا مجھے نہیں ملتی - سب تو ڈھونڈ لیا -
میرا - کیسی پگلی لڑکی ہے -
انجنی - اچھا میں پگلی اور تم سیانی ہی سہی - خود آ کر دیکھ لو اور اپنا سیانا پن دکھاؤ -

(اتنا کہہ کر وہ میز کے پاس سے ہٹ جاتی ہے - میرا قریب آ کر دیکھنے لگتی ہے - انجنی پھر اپنا "رکھنا 'نہیں رکھنا" والا گیت شروع کر دیتی ہے میرا بھی اس کے ساتھ گانے لگتی ہے - اتنے میں وکیل صاحب کا کلرک بالوجی گھبراہٹ میں اندر آتا ہے)

انجنی - کون —— بالوجی؟
میرا - بالوجی! ٹھیک وقت پر آئے - ہم کب سے ڈھونڈ رہے [illegible] لیکن نہیں مل رہی ہے [illegible]
بالوجی - کیا ——؟
میرا - اجی قینچی چاہیئے قینچی!
بالوجی - کس لئے؟
میرا - کاغذ کے حروف کاٹنے ہیں - ہم بیڑی کے کارخانے میں کام کرنے والی عورتوں کا جلوس نکالنے والی ہیں جو ہڑتال کر رہی ہیں - لال کپڑے پر "سرمایہ داری کا قلع قمع کر دو" اور اس طرح کے حروف کاٹ کر لگانے ہیں - قینچی پتاجی کی میز میں رہتی ہے - مگر سب ڈھونڈ لیا نہیں ملی - ذرا بتا دو نا -
انجنی - حروف بھی کاٹ دو بالوجی! آپ کا خط بہت اچھا ہے - پتا[جی] تو ہمیشہ تعریف کیا کرتے ہیں کہ ......
بالوجی - ناممکن —— میں نہیں دونگا -
میرا - یہ کیا کہتے ہو جی! لال کپڑا دیکر جس طرح آپ نے ہماری خواہش پوری کی اسی طرح ......
بالوجی - میں نے لال کپڑا دیا - کب؟ کہاں؟ کس کو؟
میرا - آپ کو علم نہیں - لیکن آپ نے تو حقیقت میں کپڑا دیا ہے، انجنی گواہ ہے -

(دونوں ہنستی ہیں)

بالوجی - سارے آپ ہنستی کیوں ہیں؟ کہو نا' میں نے کب دیا؟
میرا - اجی سر پر باندھنے کے لئے آپ کا لال رومال ہے نا؟ پرانا ہونے کے باوجود آپ اسے پنشن دینے کے لئے راضی نہیں تھے اسی لئے ہم نے اسی کو پھاڑ کر جھنڈا بنا لیا -

(دونوں پھر ہنستی ہیں)

بالوجی۔ غضب کر دیا آپ لوگوں نے۔۔۔ ہر۔۔ہر۔۔ میرا رومال!

میرا۔ آپ بُرا کیوں مانتے ہیں؟ یہ رومال کا مصرف ایک اچھے کام میں ہوگا۔ پرانا تو ہو گیا تھا۔

انجنی۔ اسی لئے تو کہتی ہوں۔ کاغذ کے حروف کاٹ کر دو گے تو آپ کے معمار بن جاؤ۔

میرا۔ اچھے حروف ہونے چاہئیں۔

بالوجی۔ ارے! میں نے پہلے کب کہا تھا مجھے [illegible] کہہ رہی ہو؟

انجنی۔ واہ! آپ کو منظور کرنا ہی ہوگا۔

(دونوں اسے پکڑ لیتی ہیں وہ [illegible])

بالوجی۔ آپ لوگوں نے کیا یہ طے کر لیا ہے کہ مجھے نوکری سے نکلوا دیا جائے وکیل صاحب خفا ہونگے نا؟

میرا۔ پتاجی کو معلوم ہی کیسے ہوگا؟

انجنی۔ ان کو بمبئی سے آنے کے لئے ابھی چار روز چاہئے۔

بالوجی۔ وہ تو صبح ہی لوٹ آئے۔

میرا۔ کیا کہتے ہو؟ وہ آگئے؟

انجنی۔ پتاجی آگئے؟

بالوجی۔ یہی تو کہہ رہا ہوں۔ ابھی شیو کیا اور غسل کر کے آ ہی رہے ہونگے آپ کے پیر پڑتا ہوں آپ یہاں سے جائیے۔ وہ خفا ہیں۔

میرا، انجنی۔ کیوں ——؟

بالوجی۔ ان کو جو خاص بیڑی پسند ہے وہ ختم ہو گئی۔ راما کو بھیجا ہے مل گئی تو زہے نصیب!

(راما آتا ہے اور گھبرا کر کہتا ہے "بالوجی!")

بالوجی۔ ارے چلاتے کیوں ہو؟ کیا خبر ہے؟

راما۔ بڑی بُری خبر ہے۔ تمام عورتیں ہڑتال پر ہیں۔ مالکوں نے سوچا تھا کہ چار دن کے بعد جھک مار کر لوٹینگی۔ لیکن یہ خیال ہی رہا، مالکوں نے چالاکی سے پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن یہاں ان کی ہار ہوئی۔ کل ان کے جلوس پر غنڈوں کے ذریعہ پتھر پھینکے گئے آج بھی شاید پھر جلوس نکلنے والا ہے۔ کیوں ہے نا مزے دار خبر ——؟

بالوجی۔ ارے بیوقوف! تجھے خبر کے لئے بھیجا تھا یا بیڑی کے لئے۔؟ تو لایا ہے نا؟

راما۔ تھوڑا بہت بیڑی کا جلا ہوا ٹکڑا بھی مل جائے تو قسم لے لو تمام دکانیں۔۔۔۔

بالوجی! نکل یہاں سے (وہ جاتا ہے) تو اب کیا کریں [illegible] وکیل صاحب تو غضب ڈھا دینگے۔

(میرا اور انجنی ہنستی ہیں)

اور آپ دونوں اس ہڑتال کی بانی مبانی ہیں۔ آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔ ابھی آپ یہاں سے جائیے۔

میرا۔ قینچی تو دو۔

بالوجی۔ یہ میز پر کیا ہے؟ بغل میں بچہ اور گاؤں میں منادی۔

انجنی۔ ارے! یہ تو یہیں پڑی ہے۔ اچھا بالو شکریہ!

(دونوں جاتی ہیں)

بالوجی۔ کیسی لڑکیاں ہیں۔ آنکھوں کے سامنے کی چیز دکھائی نہیں دیتی اور چلی ہیں لیڈری کرنے۔

(راؤ بہادر آتے ہیں۔ میز کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ کر کاغذات دیکھتے ہیں۔ ڈبہ میں سے ایک بیڑی نکال کر منہ میں لیتے ہیں اور سلگاتے ہیں۔ کچھ خراب معلوم ہوتی ہے اسے پھینک کر دوسری لیتے ہیں اور بات چیت کرتے ہیں)

راؤ بہادر۔ کیوں جی! آج کتنے مقدمے ہیں؟

بالوجی۔ چار ——

راؤ بہادر۔ کن کے؟

بالوجی۔ پہلا نمبر ۱۳۸

راؤ بہادر۔ نام ——؟

بالوجی۔ وہ اپنے نرسپا۔ بیڑی کے کارخانے کے مالک۔

راؤ بہادر۔ کس پر؟

بالوجی۔ انہی کے کارخانے کی ایک مزدور عورت نے ان پر مار پیٹ کی وجہ سے نالش کی ہے۔ آپ مدعا علیہ کی طرف ہیں۔

راؤ بہادر۔ بیشک کیوں نہیں؟ ہم ہمیشہ مالکوں کی طرف ہی رہتے ہیں۔ یہ عورتیں بڑی بدمعاش ہوتی ہیں۔ اچھا اس کے بعد دوسری پیشی کی ہے؟ ۔۔۔ ارے بالو! بیڑی میں مزا کیوں نہیں آرہا ہے؟

بالوجی۔ آں۔۔۔۔ آں ۔۔۔ شاید سفر کی وجہ سے منہ میں فرق ہے۔

راؤ بہادر۔ غلط، تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ یہ ہمیشہ والی بیڑی نہیں ہے

بالوجی۔ جی نہیں۔ وہی تو ہے۔

راؤ بہادر۔ قطعی نہیں۔ دوسرا بنڈل نکالو۔

بالوجی۔ ختم ہو گیا۔

راؤ بہادر۔ تو راما کو لانے کے لئے بھیجو اور دیکھنا ایک ہزار زیادہ منگانا
بمبئی کے ہمارے لالہ صاحب کو یہ بہت پسند آئی ان کے یہاں بھیجنا ہے
جاؤ دیر نہ کرو۔

بالوجی۔ بھیجتا ہوں۔ لیکن ..... لیکن .....

راؤ بہادر۔ لیکن ویکن کیا کہتے ہو۔ مجھے اسی وقت چاہیئے۔

بالوجی۔ ٹھیک۔ لیکن آپ کی خاص بیڑی آنے تک یہ سگریٹ ہی پی کر
دیکھئے۔ کل ہی "پپو ساہ" کی جانب سے بطور تحفہ بھیجی گئی ہے بہت
بڑھیا ہے۔

راؤ بہادر۔ پھینکو اسے چولہے میں۔ تمباکو پینے کا حقیقی لطف ہی بیڑی
میں ہے۔ اس کے سامنے سگریٹ کی کیا ہستی۔ تحفہ بھیجنے والا
پپو ساہ ایک اُلّو۔ اور تم سات اُلّوؤں کا مجموعہ ہو۔ چلو جلدی
منگاؤ یہ بیڑی .....

بالوجی۔ اگر آپ یہی چاہتے ہیں تو .....

راؤ بہادر۔ ہاں، وہی چاہتا ہوں۔

بالوجی۔ تو انتظار کرنا ہوگا۔

راؤ بہادر۔ کتنی دیر؟ پانچ منٹ؟

بالوجی۔ شاید پانچ دن بھی لگ جائیں۔

وکیل۔ کیا بکتے ہو۔ بازار سے خریدنے میں پانچ دن لگتے ہیں؟ اس کا کیا
مطلب ہے؟

بالوجی۔ جی مطلب وطلب نہیں، بلکہ صاحب غضب ہوگیا ہے

راؤ بہادر۔ یعنی؟

بالوجی۔ ہڑتال!

راؤ بہادر۔ کیا کہا؟ کس کی؟ بیڑیوں کی؟

بالوجی۔ بیڑی بنانے والی مزدور عورتوں کی۔

راؤ بہادر۔ اس کے کیا معنی؟

بالوجی۔ کارخانے بند ہوگئے۔ عورتوں نے ہڑتال کردی۔ پرانا سٹاک
ختم ہوگیا۔

راؤ بہادر۔ بدترین زمانہ آنے میں کیا باقی رہ گیا۔ رؤسا و اُمرا کی ایسی
بے عزتی۔ یہ کیسی ہڑتال۔ ایک ایک مزدور عورت کو مار پیٹ کر
کھینچ کر کیوں نہیں لایا جاتا ہے؟

بالوجی۔ دس پانچ عورتیں نہیں، پوری ڈیڑھ ہزار ہیں ڈیڑھ ہزار۔

راؤ بہادر۔ آخر عورتیں ہی تو ہیں۔ عورتیں ہڑتال کرتی ہیں اور مرد
کیا چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھتے ہیں۔ وہ آگے کیوں نہیں بڑھتے

(ماما گرکشا بے کر بیڑی کے کارخانے والے نرساپا سیٹھ آگئے ہیں)

(نرساپا سیٹھ آتے ہیں)

راؤ بہادر۔ آیئے آیئے۔ اچھے آئے۔ میں آپ ہی کو یاد کر رہا تھا۔ ایسے
کیا بوڑھے کی طرح لکڑی ٹیک کر آپ کب سے چلنے لگے۔

نرساپا۔ کیا کہوں اب؟ ان ہڑتالیوں نے تو پریشان کر دیا جہاں سو
دو سو کی روزانہ آمدنی تھی وہاں اب چھ کوڑی بھی مشکل ہوگیا۔
سب کچا مال پڑا ہے سات آٹھ سو کو لوٹا گیا۔

راؤ بہادر۔ آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ گنوار عورتوں کی ہڑتال کرنے
سے آپ اتنا ڈر گئے۔

نرساپا۔ تمام ہتھیار استعمال کرکے دیکھ لئے۔ سچ مچ میں ہار گیا ان کے
حقوق پورے کئے بغیر۔

راؤ بہادر۔ ان کے حقوق کیا ہیں؟

نرساپا۔ پوچھئے ہی نہیں۔ بس لوٹنے اور بدلہ لینے پر ہی آمادہ ہوگئی ہیں
کہتی ہیں کہ ایک ہزار بیڑی کی سات آنے مزدوری ملنی چاہیئے۔

راؤ بہادر۔ اب آپ کیا دیتے ہیں؟

نرساپا۔ پانچ آنے!

راؤ بہادر۔ بہت زیادہ ہے۔ معاشیات ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ ایک ملکی
کا روزانہ کھانے کا خرچ چھ پیسوں سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے۔

نرساپا۔ لیکن یہ تو روز بروز بدمعاش ہوتی جاتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ بیٹھنے
کے لئے جو مالک کی جگہ ہے اس کا چار آنہ کرایہ بھی نہیں دینگی۔

راؤ بہادر۔ بیٹھنے کے لئے گدا تکیہ نہیں مانگا انھوں نے؟

نرساپا۔ صاحب۔ آپ ہی غور کیجئے اور کہتی ہیں کہ مزدور عورت کی
زچگی کے زمانہ میں اسے گھر بیٹھے بھتا بھی دینا ہوگا۔ کس کا کام اور
کون پرائشچت (کفارہ) ادا کرے۔

راؤ بہادر۔ بے شرم ہوگئی ہیں۔ اور بھی کچھ کہتی ہیں۔

نرساپا۔ ہاں کہتی ہیں کہ دھرم دیا نہ کاٹا جائے۔ اس دھرم دیا پر تو ہم
جاترا کرتے ہیں۔ تیرتھوں کو جاتے ہیں۔ اسی لئے کہ ان کے ہاتھوں
دھرم نہیں ہوگا۔ ہم ہی ان کی خاطر دھرم کرکے ان کے ثواب
کے لئے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔

راؤ بہادر۔ ارے ارے تو آپ نے انھیں اس حد تک بڑھنے دیا؟

نرساپا۔ ہم نے نہیں بڑھنے دیا۔ روکنے میں ساری طاقت لگا دی،
لیکن تحریک کو چلانے والے دوسرے ہی لوگ ہیں۔

راؤ بہادر۔ وہ کون ——؟

نرساپا۔ اب فکر کروں کیوں؟ وہ آپ ہی کے گھر تو ہیں۔

راؤ بہادر۔ میرے گھر میں؟ راما یا باورچی کلرک؟ اچھا جب ہی تو مجھے شک ہوا تھا۔ کیوں رے بدمعاش؟

باورچی۔ (ہاتھ جوڑ کر) نہیں نہیں سرکار۔ غریب پر ان نیائے (ناانصافی) ہو رہا ہے!

نرساپا۔ اجی نہیں، یہ دونوں نہیں بلکہ آپ کی دونوں صاحبزادیاں۔

راؤ بہادر۔ (غصہ اور تعجب سے) ناممکن؟ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟

نرساپا۔ آپ گزشتہ ہفتہ یہاں نہیں تھے نہیں تو دیکھتے کہ ہڑتالی مزدور عورتوں کا جلوس زور سے نعرے لگاتا ہے کہ سرمایہ داری کا قلع قمع کر دو۔ اور ان کی لیڈر ہیں آپ کی انجنی اور میرا۔

راؤ بہادر۔ غلط —— غلط —— ناممکن ——

نرساپا۔ خاک ناممکن اور غلط۔ دس برس پہلے جن کی یہ حالت تھی کہ دس گھنٹے مر مر کر کام کریں، مار پیٹ پر بھی چوں وچرا نہیں کرتی تھیں وہ اب آزادانہ گھومتی ہیں، بکتی ہیں، یہ کیسے ممکن ہوا؟

(رائے صاحب کھوکھلے آتے ہیں)

کھوکھلے۔ آگ لگ گئی راؤ بہادر۔ آگ لگ گئی۔ آپ کا آنا سنتے ہی دوڑ آیا۔ آپ کیسے خاموش ہیں؟

راؤ بہادر۔ کیا بکتے ہو؟ گھر میں آگ لگی؟ کہاں؟ دوسری منزل یا تیسری؟ باپو دیکھتا کیا ہے؟ فائر بریگیڈ کو فون کرو۔ ورنہ محمد دوڑ کر جا، راما کو اٹھا۔ راما ارے راما۔

کھوکھلے۔ اجی آگ یہی سچ مچ!

راؤ بہادر۔ ارے تو نے تو مجھے گھبرا دیا۔ (باپو کو بلاتے ہیں) ارے مت جاؤ۔

کھوکھلے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں آپ ٹھیک طور سے سنئے۔ آپ راؤ بہادر، میں رائے صاحب، اور دو چار معزز لوگ ہیں۔ ہم ہی اس چھوٹے سے شہر کی آبرو ہیں۔ امن وامان رکھنا ہمارا فرض نہیں ہے؟ قانون کی طرح اٹل۔

نرساپا۔ بالکل پتھر کے کھمبے کہئے نا!

کھوکھلے۔ سوا سولہ آنہ بات کہی۔ ہاں تو راؤ بہادر آپ کی لڑکیاں اس طرح راؤ بہادری کی شان وشوکت کو چھوڑ کر ان حدود میں داخل ہونے لگیں تو آگ سے بھی بڑھ کر نہیں ہوا؟

راؤ بہادر۔ اس سے تو سچ مچ کی آگ ہی بھلی۔

کھوکھلے۔ میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ آپ کم از کم گھر کی آگ بجھا دیں تو زہے نصیب!

نرساپا۔ میں نے ان سے ابھی کہا کہ دیکھو آپ کی دونوں لڑکیاں جھنڈا لے کر جلوس ......

راؤ بہادر۔ توبہ .... توبہ ..... اب سنا نہیں جاتا۔ اگر کہیں کلکٹر صاحب کے کانوں تک پہنچ ......

کھوکھلے۔ اب تو پہنچ بھی گئی ہو گی۔

راؤ بہادر۔ کمشن صاحب کو ذرا بھی شک ہوا تو ......

کھوکھلے۔ تو کبھی بھولے بھٹکے آنے والے موکلین بھی بند ہو جائیں گے۔

راؤ بہادر۔ ہائے اب کیا ہو گا —— میرا، اری میرا!

میرا۔ (اندر سے) ہاں تپاجی!

راؤ بہادر۔ پہلے باہر آؤ۔

میرا۔ (کمرے میں سے) کیا کام ہے تپاجی! کیا آپ کو قینچی چاہیئے؟

راؤ بہادر۔ کیسی قینچی؟ میرے گلے میں پھانسی لگ گئی ہے .... اور تم ... چل پہلے باہر آ ——

(میرا "آئی ہوں" کہتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی ہے)

میرا۔ تپاجی! کیا ہوا؟

راؤ بہادر۔ پوچھ کیا رہی ہو۔ یہ رائے صاحب اور نرساپا جی کیا کہہ رہے تھے

میرا۔ میں تو کمرہ میں تھی۔ یہ کیا کہہ رہے تھے، یہ میں کیسے سن سکتی؟ اور یہ ہیں کون؟

راؤ بہادر۔ ارے اپنے رائے صاحب کھوکھلے، پورے دس سال تک میونسپلٹی کے صدر تھے۔ بنک کے نائب صدر اور ریل کے ڈائرکٹر اور یہ نرساپا جی۔ ۴، ۶ لاکھ کے مالک، بڑے کارخانہ دار۔

میرا۔ میں ان کو اچھی طرح پہچانتی ہوں، لیکن تپاجی! آپ ذرا غلطی پر ہیں۔ دس سال تک ضرور صدر رہے ہونگے لیکن اب اس عوام کی بیداری کے زمانہ میں ان کی دال نہیں گلے گی۔ اب انھیں کوئی منتخب نہیں کرتا۔

راؤ بہادر۔ میرا —— میرا —— یہ کیا بک رہی ہو؟

میرا۔ (تپاجی کی طرف دھیان نہ دیتے ہوئے) اور یہ نرساپا۔ انھوں نے لاکھوں روپے کہاں سے پیدا کئے۔ کیا خود ہی پسینہ بہایا؟ یہ سخاوت بھی کرینگے تو غریبوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے۔ مزدور عورتوں کو پیس کر اور ان کا خون چوس کر یہ بنے ہوئے ہیں۔ اس کمرہ سے بھی چھوٹی جگہ ہے جہاں ٹین کی چھت ہے۔ گرمی میں کام کرنے والی عورتوں سے پوچھئے کہ کیا حالت

ہوتی ہے ان کی اور ان کے ساتھیوں کی؟ پینے کے لئے پانی نہیں
پھر چار آنہ کرایہ۔ قصور نہ ہونے پر بھی مزدوری میں پچاس فی صد
کانٹ چھانٹ۔ مزدوری کتنی؟... پانچ آنے... وہ بھی پوری
نہیں... کسی نہ کسی بہانے سے اس میں لوٹ کھسوٹ۔ روتے
ہوئے بچوں کو تپتے ہوئے گھروں میں پھینک کر دس گھنٹے کام
کرنے والی عورتوں پر کبھی رحم بھی آیا آپ کو نرسا پا جی؟

نرسا پا۔ ارے باپ رے! یہ تو الٹا مجھ ہی پر سارا الزام دھر رہی ہیں۔

کھو کھلے۔ دیکھئے راؤ بہادر صاحب! میں نہ کہتا تھا کہ آگ لگ گئی ہے۔

راؤ بہادر۔ میرا۔۔۔ میرا! کیا تو میری ہی لڑکی ہے؟ اتنی باغی کب سے
بنی۔ اب تک تو میرا یہی خیال تھا کہ تم دونوں بہنیں اپنی تعلیمی مصروفیات
میں مشغول رہتی ہوگی۔۔۔ لیکن میرا! تجھے ایسا کس نے بنایا؟

میرا۔ وقت نے۔ اس زمانہ کے نوجوانوں کے دلوں میں آگ بھڑکانے
کے لئے وقت ہی کی کافی طاقت ہے۔

راؤ بہادر۔ خاموش! میں بھی دیکھ لونگا۔ میں زمانہ کو بگاڑنے والا
تم کو آگے بڑھنے دونگا۔ بھول جاؤ۔ گنوار، بیوقوف، جاہل عورتوں
کے ساتھ رہ کر گھر کو بدنام کر دیا۔ چنگاری، آوارہ،

میرا۔ چنگاری! چنگاری! پتا جی ایک بار پھر کہئے وہ لفظ۔ آپ نے مجھے
سخت سست کہا لیکن میں تو سچ مچ چنگاری ہی بننا چاہتی ہوں
تاکہ اس سے دنیا کے گناہ، ظلم، سیہ کاریوں کو خاکستر کر سکوں،
میرے دل میں آگ بھڑک رہی ہے اسی لئے میں سچ مچ چنگاری
بننا چاہتی ہوں۔ غریبوں کی جھونپڑیوں میں جو بھوک کی، دکھ کی
درد کی آگ دہک رہی ہے اس سے میں سماج کو بیدار کرنا چاہتی ہوں
یہ ان کے بڑے بڑے محل اور بنگلے دیکھ کر آپ ان پر فدا ہو رہے
ہیں۔ مگر ان کے اندر دیکھئے۔ اپنے خون کی، اپنے جسم کی اور اپنے
پسینہ و محنت کی اینٹیں لگا کر بنائی ہوئی یہ پختہ عمارتیں دیکھ کر
ان غریبوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ جونک کی طرح خون چوس
چوس کر یہ [illegible] آٹھ دن سے ڈیڑھ ہزار عورتیں
بھوکی [illegible]؟ وہ آپ کے جواہر، آپ
کے [illegible] بیٹھے پکوان نہیں چاہتیں۔ وہ تو صرف
پوری مزدوری چاہتی ہیں۔۔۔ مزدوری۔ جان توڑ محنت کا معاوضہ
دیجئے۔ بس یہی مانگ ہے۔ پانچ آنے میں وہ اپنی زندگی نہیں
گذار سکتیں، کہئے، کچھ جواب دیجئے نا نرسا پا جی؟

نرسا پا۔ کیا جواب دوں، یہ سب کچھ ایں فضول ہے، سات آنے نہیں
تو آنے دینے پر بھی ان کی جنم جات عادتیں نہیں جائیں گی اور
ان کے مرد شراب اور تاڑی پر یہ اضافہ شدہ آمدنی اڑائے بغیر
نہیں چھوڑیں گے۔ ٹھیک ہے نا رائے صاحب!

کھو کھلے۔ بالکل سولہ آنے۔ کیا چن کر بے جوڑ دلیل دی ہے واہ، واہ
کل ہی کسی نے لیکچر میں کہا تھا کہ پہلے بڑی عادتیں چھوڑ دینے چاہئے
یہ وہ چھوٹیں تو مفلسی کا قلع قمع آپ ہی ہو جائیگا۔

راؤ بہادر۔ کتنی اچھی نصیحت ہے۔ میرا تم ہڑتال کے پھیر میں نہ پڑو۔
اور نصیحت کرتی رہو ابھی سب سدھر جاتے ہیں۔

نرسا پا۔ میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا۔ دیکھو ہمارا تما جی شراب نہ پینے
کا اپدیش دیتے ہیں۔

میرا۔ بس بس! اس ہستی کو کیوں بدنام کرتے ہو۔ اپنے فائدے کے
لئے اوروں کی آڑ میں چھپنا بزدلوں کا کام ہے۔ اب یہی کہنا
پڑیگا کہ شیطان کو بھی گیتا کے فلسفہ کا ٹھیک ٹھیک علم ہے اور
اپنے مطلب کے لئے شیطان اس کی مثالیں بھی دینے میں
تامل نہیں کرے گا۔ سرمایہ داروں کی عائد کی ہوئی پابندیوں اور
مظالم پر آپ کی نگاہ نہیں جاتی۔ کیوں؟ آپ کا نقصان ہے اس
لئے نا؟ وجہ کو نہ جانے بغیر اس قسم کا اپدیش اچھا ہے۔۔۔ کیوں
تو پھر آپ کی بھابی کا جھنڈا اچھو کیوں ہوا تھا؟ روز رات کو
بوتلوں کی بوتلیں کیوں کھلتی ہیں۔ یا آپ کا اپدیش غریبوں ہی
کے لئے ہے؟ آپ لوگوں کی راتیں کہاں کٹتی ہیں؟..... رائے
صاحب نے......

راؤ بہادر۔ میرا... میرا... زبان بند کر۔ رائے صاحب کا اپمان
(بے عزتی) کرتی ہے۔ بے حیا!

میرا۔ ڈیڑھ ہزار گھروں کو ستیاناس کرتے وقت کہاں گئی تھی یہ حیا؟
پتا جی! یہ سچ ہے اس لئے کڑوا۔ آپ کو سننا ہی پڑے گا۔ آخر
غریب شرابی کیوں بنتا ہے؟ آپ جیسوں کے مظالم سے کچھ
لمحوں کے لئے بچنے کے لئے۔ نرسا پا جی! اور آپ جیسوں کی
سرمایہ داری کا طوق اس کے گلے میں پڑا ہوا ہے جسے نہس نہس
کئے بغیر.....

(سرمایہ داری کا قلع قمع کرو۔ کہتے ہوئے اور انہی جملوں
سے لکھی ہوئی جھنڈی لے کر انجنی اندر سے آتی ہے)

راؤ بہادر۔ انجنی۔۔۔ کون۔۔۔ میری لڑکی انجنی ہے؟

کھو کھلے۔ راؤ صاحب! اب تو سچ مچ! آپ کے گھر میں آگ لگی ہے۔

نرساپا۔ میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا۔

انجنی۔ (ان کی طرف خیال نہ کرتے ہوئے میرا سے کہتی ہے۔) میرا! کتنی خوبصورت بنی ہے یہ جھنڈی؟

میرا۔ واہ، تم نے تو کمال کر دیا۔

(دونوں جھنڈی کے بلوں کو زور سے پڑھتی ہیں۔ اس وقت باہر میدان میں جمع شدہ عورتیں زور سے کہہ اٹھتی ہیں سرمایہ داری کا قلع قمع کر دو۔ کالے قانون کو مٹا دو)

انجنی۔ میرا چلو۔ عورتیں شاید جمع ہو گئی ہیں۔

میرا۔ چلو۔

راؤ بہادر۔ خاموش! ابھی راما سے کہہ کر دروازے میں قفل ڈلوا دیتا ہوں پھر دیکھتا ہوں تمہاری کتنی طاقت .....

(اتنے میں راما ایک مضبوط آدمی سے لڑتے جھگڑتے ہوئے اندر آتا ہے۔ وہ آدمی بھی اندر آنا چاہتا ہے اور راما کے کہے کو ٹھکرا دیتا ہے)

وہ آدمی۔ جانے دو۔ مجھے اندر جانے دو۔

راما۔ ابے تو کچھ سمجھتا بھی ہے۔ مالک بیٹھے ہیں اور تجھے بے دھڑک آنے میں کچھ شرم بھی نہیں آتی۔

راؤ بہادر۔ کیوں رے راما! کیسا شور ہے؟ کون ہے رے تو؟ کیوں شرارت کے ساتھ پیش آتا ہے؟

آدمی۔ شرارت نہ کروں تو کیا کروں۔ مجھے یقیناً معلوم ہوا ہے کہ اس گھر میں میری بیوی چھپی ہے۔

راؤ بہادر۔ اس گھر میں؟ پاگل تو نہیں ہوا ہے۔

آدمی۔ پاگل نہیں، رائے بہادر سچ مچ آپ کی ان دونوں لڑکیوں نے ہی اسے یہاں چھپا رکھا ہے۔

راؤ بہادر۔ ارے تو کہتا کیا ہے؟ تو ہے کون اور یہ کیا شرارت کرتا ہے؟

آدمی۔ میرا نام شرنپا ہے۔ میں اگر غلط کہتا ہوں تو اپنی ان دونوں صاحبزادیوں سے پوچھئے۔

راؤ بہادر۔ اب تو شاید میں ہی پاگل ہو رہا ہوں۔ میرا، انجنی یہ کیا کارنامے دکھا رہی ہو؟

میرا۔ یہ ٹھیک کہتا ہے پتا جی! لیکن یہ بدمعاش ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ ہڑتالیوں میں پھوٹ ڈالتا ہے۔ بمبئی کے مزدوروں نے اس کو نکال دیا ہے۔ یہ اپنی عورت کو اس لئے مارتا تھا کہ وہ بھی ہڑتال میں نہ جائے اس لئے رنگما کو میں نے اس گھر میں پناہ دی ہے۔ اس نے تو گھر سے نکال دیا تھا۔

راؤ بہادر۔ کس کے گھر میں؟ کیا یہ تیرے باپ کا گھر ہے؟

انجنی۔ اس میں کیا شک ہے؟

میرا۔ کیوں رے اب کیوں لوٹ آیا۔ رات کو گھر سے نکال دیا تھا نا! بےشرم!

شرنپا۔ اس وقت ضرورت نہیں تھی اور اب ضرورت ہے۔

میرا۔ بےشرم کیا عورت پیر کی جوتی ہے یا لونڈی! ضرورت ہے تب چاہئے۔ ورنہ بے شک مر جائے۔ نکل یہاں سے۔

شرنپا۔ میری عورت مجھے دیدو۔ میں ابھی جاتا ہوں کیوں وکیل بنتا ہے؟

رائے بہادر۔ میرا! اس کی بیوی کہاں ہے؟

میرا۔ میرے کمرے میں۔

راؤ بہادر۔ اس کو ابھی اس کے ساتھ بھیج دو۔

میرا۔ ہرگز نہیں۔

راؤ بہادر۔ کیوں؟

میرا۔ وہ زچہ ہے پتا جی! کیا بے رحمی سے زدوکوب کرنے والے اس بیرحم کو یہاں سے آپ نہیں نکال سکتے۔ مردوں کی آمرانہ ذہنیت کو بھی مٹانا ہوگا۔

(باہر سے آواز آتی ہے — آمریت مردہ باد!)

انجنی۔ میرا۔ میرا۔ چلو جلدی۔

میرا۔ اوہ کافی وقت ہو گیا۔ چلو جلدی۔

راؤ بہادر۔ ٹھہرو تو۔ اگر گئیں تو...

میرا۔ انجنی۔ ہم تو جائینگے ہی۔

راؤ بہادر۔ اچھا خبردار، اگر اب تم دونوں میرے گھر میں لوٹ کر آئیں تو

میرا۔ پتا جی! یہ آپ ہی کا گھر نہیں ہے اس پر ہمارا بھی حق ہے عورتوں اور بچوں کو غلام سمجھنے کا وقت گیا۔ شرنپا جس طرح خاوند کے حقوق جتا کر اپنی بیوی کو نہیں لے جا سکتا اسی طرح آپ بھی ہمیں گھر سے نہیں نکال سکتے۔ حکومت کے دن گذر چکے انجنی چلو!

راؤ بہادر۔ (افسوس کے ساتھ) اف! میرے گھر میں لوٹ، یہ واقعہ! میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں ہائے میرا نے جاتے وقت کیا کہا حکومت کے دن گذر چکے۔

نرساپا۔ ہم بھی ہار گئے راؤ بہادر۔

کھوکھلے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں آپ کے گھر ہی میں نہیں سرمایہ داروں کے گھروں میں اس چنگاری نے آگ سلگا دی ہے۔

(دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر سر پیٹ لیتے ہیں باہر سے میرا

رباعیات

از:- حضرت امجد حیدرآبادی

رباعی حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ

رفتم بہ طبیب گفتم از سوز نہاں
گفتا از غیر دوست بر بند زباں
گفتم کہ غذا؟ گفت ہمیں خون جگر
گفتم پرہیز؟ گفت از ہر دو جہاں

ترجمہ

جب میں نے طبیب سے کہا سوز نہاں
بولا کہ اسے اور ذرا تیز کرو
پوچھا کہ غذا؟ کہا یہی خون جگر
پرہیز میں؟ دو جہاں سے پرہیز کرو

رباعی حضرت عبداللہ انصاری رح

آں کس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند
فرزند و عیال و خانماں را چہ کند
دیوانہ کنی و دو جہانش بخشی
دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

ترجمہ

جاناں کے طلبگار کو جاں سے کیا کام
فرزند و عیال و خانماں سے کیا کام
دیوانہ بنا کے دو جہاں دیتا ہے
دیوانے کو تیرے دو جہاں سے کیا کام

ـــــــــــ

یہ ترجمہ اگرچہ اصل سے بالکل الگ ہے لیکن معنوی لحاظ سے قابل لحاظ ہے۔ امجد

سیاسی مقالہ

از جناب طفیل عبدالرحمٰن

تہذیب کے لوازم

تہذیب[1] وہ نظام معاشرت ہے جو تمدنی تخلیق کا موجب ہوتا ہے۔ اور چار عناصر سے ترکیب پاتا ہے یعنی معاشی اہتمام، سیاسی تنظیم، اخلاقی روایات اور علم و ہنر کی جستجو۔ اس کی ابتداء ابتری اور خوف و خطر کے اختتام سے ہوتی ہے۔ کیونکہ جب خوف و خطر پر قابو پالیا جاتا ہے تو تجسس اور تعمیر کی راہیں کھل جاتی ہیں اور انسان فطری تحریک کے زیر اثر زندگی کو سمجھنے اور آرائش دینے میں مشغول ہو جاتا ہے۔

تہذیب کا انحصار چند لوازم پر ہے جو اسے ترقی دیتے یا آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔

۱۔ ارضیاتی لوازم

تہذیب برفانی زمانوں کے درمیان کا وقفہ ہے۔ برفانی دھارے معلوم نہیں کس وقت دوبارہ ابھر آئیں۔ انسانی آثار کو تخ بستہ کر دیں اور زندگی زمین کے کسی تنگ و تاریک کونے کھدرے میں سر چھپا لے۔ یا زلزلے کا عفریت جس کی رضامندی سے ہم اپنے شہروں کی تعمیر کرتے ہیں کسی وقت اپنے کندھوں کو جھٹک دے اور نہایت اطمینان سے ہمیں ہضم کر جائے۔

۲۔ جغرافیائی لوازم

منطقہ حارہ کی گرمی اور اس میں پھلنے پھولنے والی بے شمار نباتات تہذیب کی دشمن ہیں۔ کاہلی۔ بیماری۔ قبل از وقت نشو و نما اور انحطاط انسانی قوتوں کا رخ زندگی کے ان راستوں سے پھیر دیتے ہیں جو تہذیب کی منزل کو جاتے ہیں۔ اور ان قوتوں کو بھوک کے تدارک اور تولید و تناسل میں جذب کر لیتے ہیں۔ علم و ہنر کے ذوق اور ذہنی تفحص کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ بارش نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ بارش زندگی کا سہارا ہے۔ اور سورج کی روشنی سے بھی زیادہ اہم۔ عناصر کا ناقابل فہم کھیل ان خطوں کو جو سرسبزی اور شادابی سے لہلہاتے ہیں۔ بابل اور نینوا کی طرح خشک اور برباد کر سکتا ہے۔ یا ان شہروں کو جو تجارتی شاہراہوں سے دور ہیں۔ برطانیہ کے شہروں کی طرح دولت اور طاقت بخش سکتا ہے۔ اگر زمین غذا اور دھاتوں کے لحاظ سے زرخیز ہے۔ اگر دریا مبادلہ کے لئے سہل راستوں کا کام دیتے ہیں۔ اگر ساحل کٹا پھٹا اور تجارتی بیڑوں کے لئے قدرتی بندرگاہوں کا حامل ہے اور خصوصاً اگر کوئی قوم ایتھنز۔ کارتھیج۔ فلورنس اور وینس کی طرح دنیا کی تجارتی شاہراہوں پر آباد ہے ـــــ تو جغرافیہ (اگرچہ وہ اسے پیدا نہیں کر سکتا) تہذیب کی پرورش کرتا اور اسے رونق بخشتا ہے۔

۳۔ معاشی لوازم

معاشی لوازم زیادہ اہم ہیں۔ ایک قوم میں خواہ منظم ادارے ایک بلند اخلاقی ضابطہ اور ہنر کی ادنٰے جزئیات کے لئے بھی کچھ صلاحیت پائی جائے ـــــ جیسے امریکہ کے قدیم باشندوں میں تھی ـــــ لیکن اگر وہ "شکار" کی منزل سے آگے نہ بڑھے اور اس کی زندگی کا دار و مدار شکار کے غیر مستقل اور پُرخطر کھیل ہی پر ہو تو وہ کبھی بھی مکمل طور پر بربریت سے تہذیب کی سرحدوں میں داخل نہیں ہو سکے گی۔ عرب کے بدوؤں کی طرح ایک خانہ بدوش قوم اگرچہ نہایت ہی ذہین اور طاقتور ہو اور کیرکٹر کی تمام اعلیٰ صفات مثلاً بلند حوصلگی، سخاوت اور شرافت سے متصف ہو لیکن تمدن کے اس معمولی اور ناگزیر لازمہ یعنی خوراک کے دوام کے بغیر اس کی ذہانت شکار کے خطروں اور تجارت کی چالوں پر پانی کی طرح بہہ جائے گی۔ اور تہذیب کے آرام و آسائش ہنر اور خوش گواریوں کی تخلیق کے لئے کچھ باقی نہ رہے گا۔ تمدن کی اولین شکل زراعت ہے۔ جب انسان زمین کی کاشت کے لئے ایک جگہ مقیم ہو کر ایک غیر متعین مستقبل کے لئے سرمایہ فراہم کرتا ہے تو اُسے

[1] تہذیب اس زاویۂ نگاہ، طریق فکر اور امتیازی رنگ کا نام ہے جو کسی خاص تعلیم و تربیت کے زیر اثر کسی قوم میں پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کے ذریعہ سے وہ قوم زندگی بسر کرنے کا ایک خاص طریق اختیار کرتی ہے۔ زندگی بسر کرنے کا خاص طریق اور اس کے پیدا کردہ ادارے اس قوم کا تمدن کہلاتے ہیں۔

مہذب بننے کے لئے ذریعہ اور وقت میسر آتا ہے۔ امن وامان کے اس تنگ دائرے یعنی پانی اور خوراک کی قابلِ اعتماد رسد کے اندر وہ اپنے جھونپڑے تیار کرتا ہے۔ اپنے معبد اور مکتب بناتا ہے۔ تخلیقی اوزاروں کی اختراع کرتا ہے۔ گھوڑوں۔ گدھوں اور کتوں کو پالتا ہے اور آخر میں اپنے آپ کو گھریلو زندگی کا شائق بناتا ہے۔ باقاعدگی سے کام کرنا سیکھتا اور زندگی کی میعاد کو بڑھاتا ہے اور پہلے سے زیادہ تکمیل کے ساتھ اپنے ذہنی اور اخلاقی ورثہ کو منتقل کرنے کے قابل بنتا ہے۔

ایک لحاظ سے تہذیب شائستگی کی عادت ہے اور شائستگی (CIVILITY) وہ نفاست ہے جسے شہری شہر میں سکونت پذیر ہوکر ممکن بناتے ہیں۔ کیونکہ شہر ہی میں گاؤں کے پیدا کردہ دماغ اور دولت بجا یا بے جا طور پر جمع ہوتے ہیں۔ شہر ہی میں اختراع اور صنعت و حرفت کے ذریعہ سے آرام و آسائش عیش و عشرت اور فراغت میسر آتی ہے۔ شہر ہی میں سوداگر جمع ہوتے اور دولت و خیالات کا مبادلہ کرتے ہیں۔ تجارت کے شاہراہوں پر ذہنوں کے باہمی اختلاط سے ذہانت و ذکاوت تیز ہوتی۔ اور تخلیقی قوت کی تحریک حاصل کرتی ہیں۔ اور شہر ہی میں چند اشخاص مادی اشیاء کی تخلیق سے چھٹکارا پاکر فلسفہ۔ سائنس۔ ادب اور آرٹ کی تخلیق کرتے ہیں۔ تہذیب دہقان کے جھونپڑے میں جنم لیتی ہے لیکن بار آور شہر ہی میں ہوتی ہے۔

۴۔ نسلی لوازم

نسلی لوازم کوئی نہیں۔ وہ کسی براعظم پر اور کسی رنگ کے باشندوں میں ظاہر ہوسکتی ہے۔ پیکن یا دہلی میں ممفس (MEMPHIS)[1] یا بابل میں۔ ریونا (RAVENNA)[2] یا لندن میں۔ پیرو یا یوکتان (YUCATAN)[3] میں کوئی بڑی قوم تہذیب کو پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ ایک بڑی تہذیب قوم کو پیدا کرتی ہے۔ جغرافیائی اور معاشی حالات کسی کلچر کو پیدا کرتے ہیں۔ اور وہ کلچر ایک خاص قسم کی قوم کو جنم دیتا ہے۔ انگریز برطانوی تہذیب کو پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ برطانوی تہذیب انگریزوں کو جنم دیتی ہے۔ اگر انگریز جہاں جاتا ہے اپنی تہذیب کو بھی ساتھ لے جاتا ہے۔ اور ٹمبکٹو میں بھی اپنا ہی کھانا کھاتے کا لباس زیب تن کرتا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ وہاں اپنی تہذیب کو نئے سرے سے تخلیق کر رہا ہے۔ بلکہ یہ کہ وہ اس جگہ بھی اپنے اوپر اسی کی دسترس کو تسلیم کرتا ہے۔ ایک ہی طرح کے مادی حالات میں دو قومیں یکساں نتائج پیدا کریں گی۔ جاپان نے بیسویں صدی میں انگلستان کی انیسویں صدی کی تاریخ کا اعادہ کیا ہے۔ تہذیب کا کسی قوم سے صرف اس لحاظ سے تعلق ہے کہ وہ اکثر مختلف انسانی گروہوں کے باہم اختلاط اور تدریجی انجذاب سے ہم جنس قوم میں متشکل ہونے کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہے۔

۵۔ نفسیاتی لوازم

مندرجہ بالا مادی اور حیاتیاتی لوازم تہذیب کی لازمی شرائط ہیں لیکن وہ تہذیب کی تشکیل یا تخلیق نہیں کرتے۔ اب لطیف نفسیاتی عناصر میدان میں آتے ہیں۔ سیاسی نظام کا ہونا بھی ضروری ہے۔ خواہ وہ ابتری کے بالکل قریب ہی ہو۔ جیسا کہ تحریکِ احیائے علوم کے دور میں فلورنس یا روم میں تھا۔ لوگوں کو محسوس ہونا چاہئے کہ ہر موڑ پر ان کو موت یا ٹیکسوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ذہنی مبادلہ کے لئے زبان کی وحدت کے واسطہ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک متحد کرنے والے اخلاقی ضابطہ کی موجودگی بھی خواہ وہ مذہب، خاندان، تعلیم یا کسی اور ذریعے سے حاصل ہو۔ نہایت اہم ہے۔ زندگی کی تکمیل کے لئے بھی کچھ قوانین کی ضرورت ہے جنہیں وہ لوگ بھی تسلیم کریں جو ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اور جو انسانی اطوار کو باقاعدگی۔ نظام، رہنمائی اور تحریک بخشیں۔ اور شاید کسی حد تک بنیادی عقاید کی وحدت۔ کسی فوق الفطری یا خیالی اعتقاد بھی ہونا لازمی ہے۔ جو اخلاق کو دو اور دو چار کی حد سے اٹھا کر عقیدت کی حد تک پہنچا دے اور باوجود ہمارے آنی اور فانی ہونے کے زندگی کو ایک خاص وقعت اور فراغت بخش دے۔ اور آخر میں تعلیم و تدریس کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کوئی طریق (خواہ کتنا ہی قدیمی ہو) جو تمدن کے انتقال میں مدد دے۔ قبیلے کی موروثی روایات —— اس کی زبان اور علم۔ اس کے اخلاق و اطوار۔ اس کے فنون اور فنی قابلیت —— کا اس کی آنے والی نسلوں کو منتقل کرنا بھی ضروری ہے۔ خواہ وہ تقلید، تعلیم و تدریس۔ والدین۔ استاد یا پادری کے ذریعہ سے انجام پائے۔ کیونکہ انہی کے ذریعے سے وہ حیوانوں سے انسان بن سکیں گے۔

---

[1] مصر کا ایک قدیم شہر [2] اٹلی کے اسی نام کے ایک صوبے کا دارالحکومت [3] میکسیکو کی ایک ریاست کا نام

تہذیب کے زوال کے اسباب

مندرجہ بالا لوازم کا ——— کسی وقت ان میں سے کسی ایک کا بھی ——— مفقود ہو جانا تہذیب کو غارت کر دیتا ہے۔ کسی اتفاقیاتی بان یا آب وہوا کی مکمل تبدیلی سے۔ کسی مطلق العنان وبا جیسے کہ بلیک ڈیتھ (BLACK DEATH) کے ظاہر ہونے یا زمین کی قوت کے سلب ہو جانے سے۔ شہر کا گاؤں سے بے جا فائدہ اٹھا کر زراعت کو تباہ کر دینے سے جس کا نتیجہ اپنی خوراک کی رسد کے لئے غیر ممالک کا دست نگر بننا ہو۔ قدرتی ذرائع ——— ایندھن یا خام اشیاء ——— کے کم ہو جانے سے۔ تجارتی شاہراہوں کی تبدیلی سے جو کسی قوم کو دنیا کی تجارت کے بڑے راستوں سے دور پھینک دے۔ شہری زندگی کی ذمہ داریوں، محرکات اور میل جول سے معاشرتی تربیت کے روایاتی سوتوں کے خشک ہو جانے اور ان کی جگہ نئے پیشوں کے نہ ہونے کے سبب ذہنی اور اخلاقی اختلاط کے ظاہر ہونے سے۔ غیر منظم جنسی زندگی عیش پسندانہ، مایوسانہ اور مذہب تسلیم و رضا کے فلسفہ کے ذریعے کسی گروہ کے کمزور ہو جانے سے۔ قابل آدمیوں کے لاولد ہونے یا ان خاندانوں کے جو کسی قوم کی تمدنی میراث کو مکمل طور پر اٹھا چھوڑ سکیں۔ نسبتاً چھوٹا ہونے کی وجہ سے رہنمائی کے زوال پذیر ہو جانے سے۔ دولت کے بے جا طور پر ایک جگہ سمٹ کر طبقاتی جنگ۔ تعزیہ انگیز انقلابات اور مالی کمزوری پیدا کر دینے سے ——— تہذیب تباہی کے غار میں جا گرتی ہے۔ کیونکہ تہذیب کوئی جبلی یا لازوال چیز نہیں ہے۔ ہر ایک نسل کو اسے از سر نو حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے حاصل کرنے اور انتقال میں کسی بڑے خلل کے واقع ہونے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ صرف تعلیم ہی انسان کو حیوان سے ممیز کرتی ہے۔ اور تعلیم ہی تہذیب کے انتقال اور استحکام کا ذریعہ ہے۔

تہذیبیں قوموں کے مختلف روحانی آثار ہیں۔ جس طرح خاندانی زندگی اور پھر تحریر نے مختلف نسلوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر کے مرنے والوں کی روایات کو آنے والوں تک پہنچایا۔ اسی طرح طباعت اور تجارت اور آمد و رفت اور رسل و رسائل کے دوسرے ہزاروں طریقے مختلف تہذیبوں کو باہم مربوط کر سکتے ہیں۔ اور آنے والے تمدنوں کے لئے جو کچھ کہ ہمارے اپنے تمدنوں میں قیمتی ہے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ مرنے سے پہلے اپنے اثاثہ کو جمع کر لیں اور اسے اپنے بچوں کے سامنے پیش کریں۔

عورت کی عمر [illegible] سال - جوانی ختم

سفید پانی کی بیماری کا ہولناک نتیجہ

اگر کسی جوان عورت کو پانی گرنے کی بیماری ہو جائے یعنی وقت بیوقت...... سفید پانی جانے لگے تو یہ عورت کی جوانی کے لئے زہر ہے۔ اس بیماری کو سیلان الرحم اور لیکوریا بھی کہتے ہیں۔ یہ خطرناک بیماری عورت کی جوانی کو چند ہی روز میں تباہ کر ڈالتی ہے۔ اس کی کمر اور ناف نلوں اور پیٹ میں بلکہ تمام جسم میں بے کلی اور بے چینی کا درد ہونے لگتا ہے۔ ماہواری بھی بیقاعدہ کر دیتی ہے۔



پانی بند کرنے کا طریقہ

اس مرض کا سب سے آسان علاج یہ ہے کہ ایسی بیمار عورت کو ایک شیشی دوا "روک" استعمال کرا دینی چاہئیے۔ اس دوا کے مسلسل استعمال سے تیسرے دن سفید پانی آنا بند ہو جائیگا اور پوری شیشی استعمال کرنے سے سیلان الرحم یعنی لیکوریا بالکل ختم ہو کر مریضہ پوری تندرست ہو جائے گی۔ اور پھر سفید رطوبت خارج نہ ہوگی۔ دوا "روک" سالہا سال سے اس مرض کا بہترین علاج تسلیم ہو چکی ہے۔ صرف ایک ہی شیشی عورت کو تندرست کر دیتی ہے۔ ملک کے کونے کونے میں یہ دوا اپنا شاندار ریکارڈ قائم کر چکی ہے۔ ایک شیشی دوا "روک" کی قیمت تین روپے ہے۔ جس کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے بی ۳۴ دہلی

سے پتہ پر خط لکھ کر دوا "روک" کی شیشی بذریعہ وی-پی پارسل منگا لیں اور استعمال کر لیں۔ تیسرے دن ہی سفید پانی آنا بند ہو جائیگا۔ پارسل پر صرف آنے محصول لگیگا۔

ٹیلیفون نمبر ۱۲۶۰

چوڑیاں

دلگداز افسانہ

از جناب صاحب فتحپوری

"میری امی نے مجھے بڑی اچھی سی ساڑی دی ہے ــــ آؤ تمہیں دکھاؤں دیبا اپنی ساڑی"

وہ اُسے دالان کے ایک کونے میں لے گئی اور ٹوٹے پھوٹے ٹین کے صندوقچے کو دکھا کر بولی۔ "میری اچھی ساڑی اسی میں رکھی ہے بہن! بیٹھو میں تمہیں ابھی ابھی دکھاتی ہوں اچھی اچھی ساڑی"

وہ زمین پر بیٹھ گئی اس نے صندوقچہ کھولا اور میلے کچیلے پھٹے چیتھڑوں میں سے ایک لمبا کپڑا جس میں بچاسوں پیوند لگے ہوئے تھے اٹھاتے ہوئے بولی۔

"دیکھی تم نے میری ساڑی کتنی خوبصورت ہے؟ میں اسے گڈے کے بیاہ پر پہنوں گی"

"ہوں!" اس نے کہا "میری ساڑی تو اس سے بھی اچھی ہے"

"وہ کیسی ہے بہن؟"

"اس میں بہت سے پھول بنے ہوتے ہیں اور ــــ"

"میں بھی اپنی امی سے کہونگی۔ مجھے بھی ویسی ہی ساڑی منگا دینگی"

"اور سنو۔ میرے ابا جان سونے کی چوڑیاں بھی لائینگے انہیں میں عید کے دن پہنوں گی"

ــــ ۲ ــــ

تقی اور ذکی دونوں حقیقی بھائی تھے۔ ذکی اپنی بہن کے متواتر بہکانے سے بڑے بھائی سے آئے دن جھگڑا مول لیا کرتا۔ نوبت بایں جا رسید کہ دو عدالت کی زنجیر کھٹکھٹانا پڑی مگر۔ جائداد۔ روپیہ۔ پیسہ پالو سب کا نصف ہوگیا مگر بہن کو حصہ کم ملا یہ کیوں؟

دونوں بھائی ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے اور آگ لگانے والے دور سے آتش دگی کا سماں دیکھ دیکھ کر خوشی سے بغلیں بجانے لگے مہینے اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے۔ تقی ترقی کرکے بےکار ہوگیا اور ذکی کے کان جب بہن کے طعنوں سے بھر گئے تو روز روز کی چیخ پکار سے اکتا کر لکھنؤ چلا گیا۔

اللہ کی دین چند دنوں میں دوکان چمک گئی۔ کام خوب آنے لگا کاریگر بھی ملازم رکھ لئے گئے۔ وہیں کہیں شادی بھی کرلی۔ شاید خاندان میں کوئی ایسی لڑکی نہ تھی جو درزی کو بیاہی جاتی۔ دونوں پھول ایک ہی درخت کے تھے۔ ایک گلے کا ہار بنا دوسرا پیروں میں روندڈالا گیا، دونوں ایک ہی سیپ کے موتی تھے۔ ایک کو تاج میں جگہ ملی دوسرا کیچڑ میں پھینکدیا گیا۔

سال کے پہلے مہینہ میں وہ خوشی بھی نصیب ہوئی جو ہر زن و شوہر کے دلوں میں پرورش پایا کرتی ہے مگر ــــ وہ لڑکی تھی۔ تقی نے موقع دیکھ مناسب خیال کرکے مولود کی خوشی میں شادیانے بجوائے۔ خیرات تقسیم کی۔ فقیروں کو کھانا کھلوایا۔ لاکھوں منت سماجت کے بعد دونوں بھائی گلے ملے مرحوم باپ کی بھٹکی ہوئی روح کو تسکین ہوئی اور ماں کو قبر کی تاریکیوں میں سنہری چمک دکھائی دی۔

ــــ ۳ ــــ

ہاجرہ۔ رباب کی چچیری بہن تھی۔ دونوں کی آنکھیں دیہاتی فضا میں کھلی تھیں۔ مکان کے سامنے ایک تالاب تھا جس میں کبھی کبھی محلے کے بچوں کے ساتھ دونوں کاغذ کی ناؤ کا کھیل کھیلا کرتی تھیں۔ ان کے پانچ سال مٹی کے گھروندوں میں بیت گئے تو ان کے دلوں میں گڑیوں کا شوق پیدا ہوا۔ ایک دن دونوں گڑیوں کو گہنا پہنا رہی تھیں کہ فاطمہ بلبلاتی ہوئی آئی اور ہاجرہ کو گود میں لے کر بھینچ بھینچ کر رونے لگی۔ رباب حیران ہاجرہ متوحش۔ معصوم بچی ٹکٹکی باندھے حیرت سے تکنے لگی۔ تار نظر ٹوٹ کر کبھی گڑیوں کی پوشاک پر جا پڑتا اور کبھی پھوپھی کے سرخ و سپید چہرے پر۔ فاطمہ نے چھاتی سے لگاتے ہوئے کہا۔ "بیٹی تیرا باپ مرگیا۔ اب تو یتیم ہوگئی" زندگی ایک مسلسل راگنی کا نام ہے جسے موت آکر توڑ دیتی ہے۔ بچے کیا جانیں مرنا کسے کہتے ہیں؟ اور زندگی کس کا نام ہے؟ اگر جانتے تو بچے کیوں کہلاتے؟ وہ پھر گڑیوں میں سما گئی۔

سارا گھر گاؤں کی بڑی بوڑھیوں سے بھرا پڑا تھا۔ اتفاقیہ موت پر کھچڑی پک رہی تھی۔ "ہم جیسی بوڑھیوں کو موت پوچھتی بھی نہیں" "ذکی تو ابھی جوان تھا۔ ابھی مرنے کے دن نہ تھے۔ نہ جانے آنکھ کیسے لگ گئی!"

دوکان جلاتی جل جاتی مگر ہونہار جوان تو ہاتھ سے نہ جاتا۔ ابھی تو وہ جوان تھا۔ نہ معلوم آگ کیسے لگی۔

لوگ تیسرے ہی دن مُنہ پھیلانے لگے۔ میرا اتنا روپیہ ہے میرا اتنا۔ بیوہ نے اپنا زیور فروخت کر کے مرحوم کے سر کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

—— ۴ ——

سائرہ نے گرتے پڑتے مکان کا سہارا لیتے ہوئے جُھانی کا ہاتھ بٹانا بھی فرض سمجھا۔ کام کے صلے میں باسی روٹی اور ماش کی کالی دال، یا کبھی کبھی گڑ، شمی خوربا پیٹ کے جہنم کو بہلانے اور خشک آنتوں کو نمی پہنچانے کے لئے مل جاتا۔

رباب کے باپ نے پوشیدہ طور پر اس کی مدد کرنی شروع کی۔ شاید وہ غمگین بھائی کی غمگین روح کو خوش کر رہا تھا لیکن انسان جو بات چھپانے کی کوشش کرتا ہے وہ ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ اس کی بیوی نے اس کا تدارک کرنا چاہا۔ عورت کے دل کی گرہ آسانی سے نہیں کھل سکتی۔ فاطمہ برسوں پہلے آگ لگا چکی تھی۔ تقی کا ہر مستحسن فعل آگ پر تیل کا کام کر رہا تھا۔ وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو گئی۔

بیوہ کے دن اپنی بچی اور عزیزوں کے نشیب و فراز کے ساتھ گذر رہے تھے۔ جائداد کی قلیل ترین آمدنی بسر اوقات کے لئے بہت ہی کم تھی، برسات کے دنوں میں جب کچے مکان کی مٹی پانی کے ساتھ مل کر بہتی تو دل کا خون آنسوؤں کی شکل اختیار کر لیتا اور جب منڈیر کی مٹی پٹ پٹ نیچے گرتی تو کلیجہ ٹکڑے ہو کر گرنے لگتا۔ جب کوئی چھت ٹپکتی تو اس کی روح تھرا جاتی اور موت کی بھیانک تصویر سامنے آجاتی۔ اس نے جس طور بھی ممکن سمجھا مرمت جاری رکھی مگر تابہ کے۔ اگر پہاڑی چشمے دریاؤں کی معاونت سے دست بردار ہو جائیں تو وہ بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ تین سال کے طویل عرصہ میں گھر کے برتن اور قیمتی کپڑے ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ مکان کی چولیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ بنواتا کون؟ جیٹھ نے چاہا مگر نبا کیسے؟ تالی تو دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے نا؟

گاؤں میں یوں تو بہت سی سہاگنیں تھیں لیکن سائرہ کی شان ہی نرالی تھی۔ حسن غربت کے شکنجے میں جکڑا جا چکا تھا دور حیات تنگ ہوتا جاتا تھا۔ لباس و خوراک کی فراہمی عنقا ہوتی جاتی تھی۔ اس کی حالت اس ہرن کی سی ہو گئی تھی جو صحرا میں ایک لکڑی کے سہارے کو غنیمت جان کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ جائداد کی قلیل ترین آمدنی کا چپو بھی کشتیٔ حیات کو پار لگانے سے مجبور تھا اور سمندر کی موجیں غرق ہو جانے کی دعوت دے رہی تھیں۔

جُھانی کی خوشحالی کا کیا کہنا؟ ہر طرف روپیہ برس رہا تھا۔ فاطمہ کے دن بھی اچھے کٹتے تھے مگر سائرہ کی اکیلی جان سب کے لئے وبال جان تھی۔ کیا ہر شخص پیاسے کو ایک گھونٹ پانی پلانا اور بھوکے کو ایک لقمہ سے بھی پوچھنا گناہ خیال کرتا ہے؟

ہاجرہ اور رباب دن دن بھر گڑیوں سے دل بہلایا کرتیں۔ بچپن کی سہیلیاں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتی تھیں۔ ان کے معصوم دلوں میں اب بھی اتنی ہمدردی تھی کہ اگر کسی وقت ایک کو دوسرے سے سختی سے جدا کیا جاتا تو گھنٹوں بلک بلک کر رویا کرتیں اور پھر کیوں نہ روتیں۔ خون پھر بھی خون ہے۔ گڑیوں کی شادیاں ہوتیں دعوت میں اگر ہاجرہ مدعو نہ کی جاتی تو رباب بھی جانے سے انکار کر دیتی ہاجرہ کے پاس کھلونوں کے قسم کی بہت سی چیزیں تھیں جو رباب کی عطا کردہ تھیں۔ اس دین پر ماں کچھ نہ بولتی۔ بچہ کا قصور ہی کیا؟ اکثر لڑکیاں اس کی گندی پوشاک سے بچکتی رہتیں۔ رباب لاکھ گھلی ملی رہتی لیکن جب بھی تیل اور پانی کی طرح دونوں جدا نظر آتیں —— یہ کیوں؟

ہاجرہ کی خواہش تھی کہ اپنے گڈے کی شادی رباب کی گڑیا سے رچائے لیکن وہ مجبور تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ماں سے کہا۔ غمزدہ نے پھٹے پرانے چیتھڑوں کو صاف کر کے کسی حد تک آرزو پوری کر دی ابھی بیاہ کو ایک مہینہ باقی تھا۔

ایک دن اس نے اپنا معمولی سامان رباب کو دکھایا۔ وہ ہنس کر بولی چلو میں تمہیں اپنی گڑیا کا جہیز دکھاؤں۔ وہ ساتھ ہولی۔ آنکھیں چندھیا گئیں جب اس نے اچھی اچھی چمکدار، ریشمی، سنہری روپہلی اور پھولدار ساریاں اور طرح طرح کے کپڑے اور زیورات دیکھے تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ بادل آسمان پر زور سے گرجا۔ دونوں خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے سے چمٹ گئیں۔

—— ۵ ——

برسات جوبن پر تھی۔ رباب کے ابا کسی تعطیل میں آئے اور اپنے ساتھ سونے کی چوڑیاں بھی لائے۔ بیٹی سنہری چمکیلی چوڑیاں دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ دوڑی دوڑی کھڑکی پر آئی اور ہاجرہ کو آواز دی۔

"دیکھو ابا جان! میرے لئے کیسی اچھی چوڑیاں لائے ہیں۔"

ہاجرہ کی آنکھیں ان کی چمک نہ برداشت کر سکیں۔ وہ بھاگی بھاگی ماں کے پاس پہنچی اور سینے سے لپٹ کر بولی —— "امی! مجھے بھی چوڑیاں منگا دو۔"

جوان بیوہ نے معصوم بچی کو گلے سے لگا لیا اور بھیگی ہوئی آنکھیں آنسو بالوں کے جھنڈ میں جا کر پھنسے ہوئے تنکے نکالنے لگی۔

"تم روتی کیوں ہو امی؟"

ہاجرہ کو کیا معلوم کہ اس کی تیرہ و تار دنیا میں تیرا سوال چمک گیا ہے زخم پھر مواد دینے لگے۔ ایام گذشتہ کی دھندلی سی تصویر چلتی پھرتی نظر آنے لگی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ بیٹی اگر تیرا باپ زندہ ہوتا تو خوبصورت سے خوبصورت چوڑیاں آسکتی تھیں۔ یا وہ خیال کرتی ہوگی۔ میری چوڑیاں تو نہیں جو تجھے دیکر بہلا پھسلا دوں۔ سنہرے پیسے کی معمولی چوڑیاں ہی لا کر دل کا حوصلہ پورا کر دوں۔ دفعتہً منہ سے چیخ نکل گئی اور آنکھوں سے ندیاں بہنے لگیں۔

آنکھ کا تارا مچل کر بولا۔ "تم روتی کیوں ہو امی؟ میں تو چوڑیاں مانگتی ہوں!"

وہ بدستور کسی خیال میں ڈوبی رہی۔ اس نے مرجھائی ہوئی آواز میں پھر پوچھا "آؤ! میں تمھارے آنسو پونچھ دوں۔ امی کب تک روتی رہو گی؟"

تقدیر نے مسکرا کر کہا۔ "عمر بھر اور تمام عمر۔ تو آنسو خشک کرتے کرتے تھک جائے گی لیکن یہ روتے روتے نہ تھکے گی۔ اسے رونے دے۔" ذہن ابر میں بجلی مسکرائی۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا گویا شلپاشی کو گوہر مقصود ہاتھ آگیا ہو۔ وہ اٹھی۔

"کہاں جاتی ہو امی؟"

"تیرے لئے چوڑیاں لینے بیٹی!" سینے سے لگا لیا آنسو کے چند قطرے سرخ آنکھوں سے نکل کر بھورے بھورے بالوں میں جذب ہو گئے۔ وہ کڑی اور زمین کے بکسوں کے پرانے کپڑے اٹھانے دھرنے لگی۔

"امی! یہ کیا کر رہی ہو تم؟"

"چوڑیاں ڈھونڈ رہی ہوں منی!"

"کیا تم نے اس بکس میں رکھی تھیں؟"

"ہاں بیٹی!"

"تم اس کو بند کیوں کر رہی ہو؟ اسی میں تو چوڑیاں ہیں نا؟"

"میں پاگل ہو گئی ہوں بیٹی! ——— حافظہ کام نہیں دیتا ——— دوسرے صندوق میں ہونگی۔"

"پاگل کسے کہتے ہیں امی؟"

"تمھارے باپ ——— اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ پھوڑے پھوٹتے جا رہے تھے۔ مواد بہتا جاتا تھا۔ کوئی مرہم کا پھایا رکھنے والا دور تک بھی نہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ کئی ٹوٹے پھوٹے بکس چھان چکی مگر چوڑیاں نہ ملیں وہ صندوق سر پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "مگر چوڑیاں مل گئیں؟" کے سوال سے پریشان ہو گئی۔

"امی تم کیوں رو رہی ہو؟ میں تو چوڑیاں مانگتی ہوں نا!"

کوٹھری کی تنگ و تاریک فضا میں سنگ مرمر کا مجسمہ نصب تھا شاید وہ اسکے بہلانے پھسلانے کے لئے کوئی حیلہ تراش رہی تھی یا شاید مرحوم شوہر کی روح سے باتیں کر رہی تھی "تمھاری بیٹی آج چوڑیوں کی فرمائش کر رہی ہے۔ بولو میں کہاں سے لاؤں؟" سکندر نے جب آبحیات کے کنارے کووں کی موت نما زندگی کا دلخراش و بھیانک منظر دیکھا تو اس نے کہا۔ "اس زندگی سے تو موت بہتر ہے؟"

ہاجرہ نے ساری کا دامن انگلیوں میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ "امی میلے کچیلے پرانے کپڑوں میں چمکنے والی چوڑیاں کیسے رکھی جا سکتی ہیں؟" سائرہ نے دل کے ٹکڑے کو کلیجہ سے لگانے کی ناکام کوشش کی وہ ہنستی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

"کہاں جاتی ہو ہاجرہ؟ بادل گرج رہے ہیں!"

"آتی ہوں امی چوڑیاں لے آؤں!"

سائرہ بت بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ سامنے شوہر کا سہرا کھڑا مسکرایا۔

دو کان مبادا تھی جل جاتی مگر ہونہار جوان تو ہاتھ سے
نقصان تھا۔ نہ معلوم آگ کیسے لگی

ہاں اولاد ہو سکتی ہے

جب کسی عورت مرد کی شادی کو کئی برس گذر جائیں۔ اور پھر بھی اُن کے ہاں ولادت نہ ہو یا کسی اندرونی اور نا معلوم خرابی کے باعث عورت نہ ٹھہرتا ہو یا وہ لوگ جو بچہ کے لئے ترستے ہوں۔ اور اُن کے ہاں بچہ نہ پیدا ہوتا ہو تو ایسی حالت میں صرف ایک ہی ترکیب ہے جس کے بعد عورت کو حمل ٹھہر جائیگا۔ برسوں کی تمنا پوری ہو جائیگی۔ یعنی اس ترکیب پر عمل کرنے کے بعد اولاد پیدا ہونے لگے گی۔

عورت کو حمل ٹھہرنے کی ترکیب

موجودہ زمانے کی تحقیقات اور کئی سال کی مسلسل کوشش کے بعد ایک ایسی عجیب دوا تیار ہوئی ہے۔ جسے اگر سات روز تک مسلسل ایک ایک خوراک عورت کو کھلا دی جائے اور ان سات دنوں میں وہ .... بالکل علیحدہ رہے۔ اور ٹھیک آٹھویں رات ...... تو اُسی آٹھویں رات عورت کو حمل ٹھہر جاتا ہے۔ اس دوا کا نام " محافظ اولاد " ہے۔ اور تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ مسلسل سات دن تک اس دوا کے استعمال سے عورت کا اندرونی جسم (بچہ دانی) بالکل قدرتی اور نیچرل حالت میں آجاتا ہے۔ اور جب آٹھویں رات ...... تو اس کو اُسی رات حمل ٹھہر جاتا ہے۔ اور پھر نو مہینے اپنی گود میں بچہ دیکھ لیتی ہے۔ ایک شیشی دوا " محافظ اولاد " میں ایک عورت کیلئے پوری سات خوراک دوا ہوتی ہے۔ اور اس کی قیمت دو روپیہ آٹھ آنے ہے جس کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۳۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر یہ دوا بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لینی چاہیئے۔ پارسل پر سات آنے محصول خرچ ہوگا۔ اور اس طرح اسے گھر بیٹھے دوا کی شیشی پہونچ جائیگی۔

نوٹ:۔ اس دوا کی بدولت آج سینکڑوں عورتوں کی گود میں بچے موجود ہیں۔

عورت کی ظاہری جوانی

عورت کی شروع جوانی میں ہی اگر اُس کا سینہ یعنی پستان ڈھیلے اور نرم ہو کر نیچے کو گرے ہوئے معلوم ہوں تو یہ بہت بدصورتی کہلاتی ہے۔ ایسی عورت میں کشش ختم ہو جاتی ہے یہ خرابی عورت کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ ہر سال بچوں کو دودھ پلانے پر مجبور ہو جائے یا کسی بیماری یا بداحتیاطی کے باعث بھی عورت کا سینہ (یعنی پستان) ڈھیلے ہو کر بدنما معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور وہ عین جوانی میں ہی شباب کی کشش ختم کر بیٹھتی ہے۔

ایسی عورت پھر نوجوان لڑکی نظر آ سکتی ہے

کیونکہ سائینس کی جدید کرشمہ سازی کی بدولت ایک ایسی بیش بہا دوا تیار ہوئی ہے۔ جسکے استعمال سے عورت کے ڈھیلے اور نرم اور نیچے کو گرے ہوئے پستان دوبارہ درست ہو کر عورت کو از سر نو جوان لڑکی کے روپ میں پیش کرنے لگتے ہیں۔ اور اس پر شباب کی رنگینیاں پھر اپنی بہار پھیلا دیتی ہیں۔ یہ لگانے کی دوا ہے اور اس کا نام " برسٹین " ہے یہ وہی دوا ہے۔ جس کی بدولت اب تک سینکڑوں عورتیں اپنے سینہ میں دوبارہ شباب کا رنگ بھر چکی ہیں۔ اور اب تک کافی عمر کے باوجود نوخیز لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ دوا کا سب سے زبردست ثبوت یہ ہے کہ اسکے ہر روز کا استعمال عورت کو ثابت کرتا رہتا ہے کہ کتنی جلدی اسکے سینہ میں ابھار اور سختی پیدا ہو رہی ہے۔ جن عورتوں کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۳۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر ایک شیشی " برسٹین " بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں۔ ایک شیشی ایک عورت کو پوری طرح جوان لڑکی بنا دیگی اور اس کے سینہ کی یہ سب خرابیاں دور ہو کر مستقل ابھار اور سختی پیدا کر دیگی۔ ایک شیشی " برسٹین " کی قیمت چار روپے پندرہ آنے ہے۔ پارسل پر صرف سات آنے محصول لگیگا۔

نوٹ:۔ اگر کوئی بچہ عورت کی گود میں ہے۔ تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ دوا بچہ کے دودھ پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ اور بچہ نہایت اطمینان کے ساتھ دودھ پیتا رہیگا۔ کیونکہ دوا کسی حال میں نقصان نہیں کرتی۔

تم نہ جانے سر جھکا کر کیا بتا کر چھپ گئیں

حجابِ ناز

جناب ضیا نثار احمد ضیا جالندھری

سامنے آتے ہی کیوں تم مسکرا کر چھپ گئیں　　کس لئے یوں اوٹ میں نظریں چرا کر چھپ گئیں
جھینپ کر، شرما کر آئیں اور لجا کر چھپ گئیں　　خرمنِ اُمید پر بجلی گرا کر چھپ گئیں
دل میں احساسات کی شمعیں جلا کر چھپ گئیں　　ایک پل میں طور کا جلوہ دکھا کر چھپ گئیں
دے کے پیغامِ نظارہ تھرتھرا کر چھپ گئیں　　ہر نظر کو آزمایا آزما کر چھپ گئیں
چپکے چپکے آئیں اور پا کر مجھے محوِ خیال　　چھیڑ کر مجھ کو کبھی مجھ کو ڈرا کر چھپ گئیں
نرم و نازک انگلیوں سے چھیڑ کر سازِ حیات　　نغمۂ عشق و محبت گنگنا کر چھپ گئیں
دیر تک صحنِ چمن میں شوخیاں کرتی رہیں　　پھول سے الجھیں، کلی کو گدگدا کر چھپ گئیں
نکہتیں برساتی آئیں میرے قلب و روح پر　　میری آنکھوں میں سمائیں اور سما کر چھپ گئیں
میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تم کو بھی ہے مجھ سے پیار؟　　تم نہ جانے سر جھکائے کیا بتا کر چھپ گئیں
میری آنکھوں نے خدا جانے انہیں کیا کہدیا　　ڈھانپ کر ہاتھوں میں چہرہ تلملا کر چھپ گئیں
تم میرا کاڑھتی تھیں گوشۂ رومال پر　　پاس جب دیکھا مجھے گردن جھکا کر چھپ گئیں

چھپ گئیں وہ سامنے آکر ضیاؔ مثلِ ہلال
اک جھلک میں نور کے دریا بہا کر چھپ گئیں!

ہر عورت کے ہاں اولاد ہو سکتی ہے

جب کسی عورت مرد کی شادی کو کئی برس گذر جائیں۔ اور پھر بھی اُن کے ہاں اولاد نہ ہو یا کسی اندرونی اور نا معلوم خرابی کے باعث عورت کو حمل نہ ٹھہرتا ہو یا وہ لوگ جو بچہ کے لئے ترستے ہوں۔ اور اُن کے ہاں بچہ نہ پیدا ہوتا ہو تو ایسی حالت میں صرف ایک ہی ترکیب ہے جس کے بعد عورت کو حمل ٹھہر جائیگا۔ برسوں کی تمنا پوری ہو جائیگی۔ یعنی اس ترکیب پر عمل کرنے کے بعد اولاد پیدا ہونے لگے گی۔

عورت کو حمل ٹھہرنے کی ترکیب

موجودہ زمانے کی تحقیقات اور کئی سال کی مسلسل کوشش کے بعد ایک ایسی عجیب و غریب دوا تیار ہوئی ہے۔ جسے اگر سات روز تک مسلسل ایک ایک خوراک عورت کو کھلائی جائے اور ان سات دن میں وہ .... بالکل علیحدہ رہے۔ اور ٹھیک آٹھویں رات ...... تو اُسی آٹھویں رات عورت کو حمل ٹھہر جاتا ہے۔ اس دوا کا نام "محافظ اولاد" ہے۔ اور تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ مسلسل سات دن تک اس دوا کے استعمال سے عورت کا اندرونی جسم (یعنی بچہ دانی) بالکل قدرتی اور نیچرل حالت میں آجاتا ہے۔ اور جب آٹھویں رات ...... تو اس کو اُسی رات حمل ٹھہر جاتا ہے۔ اور پھر نو مہینے بعد وہ اپنی گود میں بچہ دیکھ لیتی ہے۔ ایک شیشی دوا "محافظ اولاد" میں ایک عورت کیلئے پوری سات خوراک دوا ہوتی ہے۔ اور اس کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے جس کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۲۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر یہ دوا بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لینی چاہیئے۔ پارسل پر سات آنے محصول خرچ ہوگا۔ اور اس طرح اسے گھر بیٹھے دوا کی شیشی پہونچ جائیگی۔

نوٹ:۔ اس دوا کی بدولت آج سینکڑوں عورتوں کی گود میں بچے موجود ہیں۔

عورت کی ظاہری جوانی

عورت کی شروع جوانی میں ہی اگر اُس کا سینہ یعنی پستان ڈھیلے اور نرم ہو کر نیچے کو گرے ہوئے معلوم ہوں تو یہ بہت بدصورتی کہلاتی ہے۔ ایسی عورت میں شباب کی کشش ختم ہو جاتی ہے یہ خرابی عورت کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ ہر سال بچوں کو دودھ پلانے پر مجبور ہو جائے یا کسی بیماری یا بد احتیاطی کے باعث بھی عورت کا سینہ (یعنی پستان) ڈھیلے ہو کر بدنما معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور وہ عین جوانی میں ہی شباب کی کشش ختم کر بیٹھتی ہے۔

ایسی عورت پھر نوجوان لڑکی نظر آ سکتی ہے

سائینس کی جدید کرشمہ سازی کی بدولت ایک ایسی بیش بہا دوا تیار ہوئی ہے۔ جسکے استعمال سے عورت کے ڈھیلے اور نرم اور نیچے کو گرے ہوئے پستان دوبارہ اور سخت ہو کر عورت کو از سر نو جوان لڑکی کے روپ میں پیش کرنے لگتے ہیں۔ اور اس پر شباب کی رنگینیاں پھر اپنی بہار پھیلا دیتی ہیں۔ یہ لگانے کی دوا ہے اور اس کا نام "برسٹین" ہے یہ وہی دوا ہے۔ جس کی بدولت اب تک سینکڑوں عورتیں اپنے سینہ میں دوبارہ شباب کا رنگ بھر چکی ہیں۔ اور اب کافی عمر باوجود نوخیز لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ دوا کا سب سے زبردست ثبوت یہ ہے کہ اسکے ہر روز کا استعمال عورت کو ثابت کرتا رہتا ہے کہ کتنی جلدی اسکے سینہ میں دوبارہ اُبھار اور سختی پیدا ہو رہی ہے۔ جن عورتوں کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۲۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر ایک شیشی "برسٹین" بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں۔ ایک شیشی ایک عورت کو پوری طرح جوان لڑکی بنا دیگی اور اس کے سینہ کی یہ سب خرابیاں دور ہو کر مستقل اُبھار اور سختی پیدا کر دیگی۔ ایک شیشی "برسٹین" کی قیمت چار روپے پندرہ آنے ہے۔ پارسل پر صرف سات آنے محصول لگیگا۔

نوٹ:۔ اگر کوئی بچہ عورت کی گود میں ہے۔ تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ دوا بچے کے دودھ پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ اور بچہ نہایت اطمینان کے ساتھ دودھ پیتا رہیگا۔ کیونکہ دوا کسی حال میں نقصان نہیں کرتی۔

حجابِ ناز

تم نہ جانے سر جھکا کر کیا بتا کر چھپ گئیں

از جناب سید ضیا نثار احمد ضیا جالندھری

سامنے آتے ہی کیوں تم مسکرا کر چھپ گئیں
کس لئے یوں اوٹ میں نظریں چرا کر چھپ گئیں

جھینپ کے شرما کر آئیں اور رجھا کر چھپ گئیں
خرمنِ امید پر بجلی گرا کر چھپ گئیں

[illegible] احساسات کی شمعیں جلا کر چھپ گئیں
ایک پل میں طور کا جلوہ دکھا کر چھپ گئیں

[illegible]ے کے پیغامِ نظارہ تھرتھرا کر چھپ گئیں
ہر نظر کو آزمایا آزما کر چھپ گئیں

چُپکے چُپکے آئیں اور پا کر مجھے محوِ خیال
چھیڑ کر مجھ کو کبھی مجھ کو ڈرا کر چھپ گئیں

نرم و نازک انگلیوں سے چھیڑ کر سازِ حیات
نغمۂ عشق و محبت گنگنا کر چھپ گئیں

دیر تک صحنِ چمن میں شوخیاں کرتی رہیں
پھول سے آنکھیں کلی کو گدگدا کر چھپ گئیں

گھٹیں برساتی آئیں میرے قلب و روح پر
میری آنکھوں میں سمائیں اور سما کر چھپ گئیں

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تم کو بھی ہے مجھ سے پیار؟
تم نہ جانے سر جھکائے کیا بتا کر چھپ گئیں

میری آنکھوں نے خدا جانے انہیں کیا کہدیا
ڈھانپ کر ہاتھوں میں چہرہ تلملا کر چھپ گئیں

نام میرا کاڑھتی تھیں گوشۂ رومال پر
پاس جب دیکھا مجھے گردن جھکا کر چھپ گئیں

چھپ گئیں وہ سامنے آکر ضیا مثلِ ہلال
اک جھلک میں نور کے دریا بہا کر چھپ گئیں!

فلسفۂ عشق

نگاشتہ علامہ محمود طرزی کابل

مترجم جناب میرزا صابر مٹھیالوی

عشق کا لفظ "عشقہ" سے نکلا ہے۔ جو سبلاب (عشق پیچاں) کی ایک قسم ہے۔ اور درختوں پر لپٹ جاتی ہے جس سے درخت خشک ہو جاتے ہیں۔ اس مرض کا نام عشق اسی مشابہت سے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ یہ مرض بھی انسانوں کو خشک کر دیتا ہے اور تر و تازگی کی رونقوں کو زائل کر دیتا ہے۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے۔

قَالَ العِشْقُ مَاخُوذٌ مِنَ العِشْقِ الَّذِی
إِذَا التَفَّ بِالأَغْصَانِ جَفَّفَ رَطْبَهَا

ترجمہ:۔ لفظ عشق اس عشق پیچہ سے نکلا ہے۔ جو شاخوں کے ساتھ لپٹ جاتی ہے اور تر شاخوں کو خشک کر دیتی ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی فتوحات مکیہ کے باب ۰۵۵ بیان حضرت وُدّ (محبت) میں فرماتے ہیں:۔ کہ عشق کا لفظ "عشقہ" سے نکلا ہے جسے دوسرے لفظوں میں عشق پیچہ کہتے ہیں۔ اور انگور وغیرہ کی طرح درختوں پر لپٹ جاتی ہے اسی طرح مرض عشق بھی عاشق کے قلب پر لپٹ جاتا ہے۔ جیسے کہ حدیث نبوی حُبُّكَ الشَّیْءَ یُعْمِی وَیُصِمُّ کے مطابق اسے محبوب کے علاوہ دوسری چیزوں کی طرف نظر کرنے سے معذور بنا کر اندھا اور بہرا کر دیتا ہے۔

عشق کیا چیز ہے؟

عشق کیا چیز ہے؟ اس کی مختصر تعریف یہ ہے۔ کہ حواس ظاہری و باطنی کے یکجا مجتمع ہونے کو عشق کہتے ہیں۔ جب حواس ظاہری و باطنی مشہودات خارجیہ یا تخیلات داخلیہ کے جمالیاتی ذوق سے متاثر ہوتے ہیں۔ تو ایک برقی قوت جو دو جوان نگاہوں کے اتصال سے پیدا ہوتی ہے نہایت سرعت سے دل و دماغ کو ماؤف کر کے ان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اور قدم جمانے کے بعد رفتہ رفتہ اس درجہ مسلط ہو جاتی ہے کہ انسان کو دنیا و مافیہا سے یکسر بے نیاز بنا دیتی ہے۔ حکماء کے نزدیک عشق ایک مرض ہے۔ جیسے انسان اس طور پر جذب کرتا ہے کہ اپنے فکر و خیال کو معشوق کی بعض خصلتوں کو اچھا تصور کرنے میں مصروف کر دیتا ہے۔ اگر یہ خصائل حقیقت میں ویسے نہ ہوں۔ تو پھر ہمیشہ غور و فکر کرنے کے باعث خون جل جانے کے بعد سودا دامنگیر ہو جاتا ہے۔ [illegible] اور فکر زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد مرض عشق قوی ہو کر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ کہ جنون کا گمان ہونے لگتا ہے

مجنون (عاشق) کی قوت باصرہ سوائے دیدار یار، قوت سامعہ بجز گفت یار، قوت لامسہ بجز وصال یار، قوت شامہ بجز شمیم زلف عنبریں، قوت ذائقہ بجز بوسہ شکریں کے دنیا کی اور کسی نعمت سے سروکار نہیں رکھتیں۔ اس کے حواس باطنی و ظاہری کو یاد محبوب کے سوا کوئی شغل پسند نہیں آتا۔ اور عاشق سودا زدہ کے دسوں حواس لذائذ کائنات و اشیائے موجودات کو خوار و بے مقدار سمجھ کر اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس مسئلہ میں کہ عشق عبارت ہے۔ حواس ظاہری و باطنی کے مجتمع ہونے سے حکماء و فلسفیوں میں سخت اختلاف ہے۔ ارسطو کا قول ہے۔ کہ عشق نام ہے محبوب کے عیوب معلوم کرنے سے آنکھوں کے اندھا ہو جانے کا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قدرت کی جانب سے انسان کے دل میں محبوب کی طرف سے کوئی بات ڈال دی جاتی ہے

حسن کیا ہے؟

عشق پیدا ہوتا ہے حسن و جمال کے مشاہدہ سے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حسن کیا چیز ہے؟ ایک گروہ کا خیال ہے کہ حسن نہ تو ان اشیا میں سے ہے جن کو ہم دیکھتے ہیں اور نہ ان باتوں میں سے جن کو ہم سنتے ہیں۔ بلکہ یہ صفت خود ہماری ذات میں ہے۔ اور ہم جس چیز کی طرف چاہیں اسے منسوب کر سکتے ہیں۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ حسن و جمال ایک خارجی شے ہے انتزاع ذہنی نہیں۔ جن چیزوں کو ہم دیکھتے ہیں۔ اور جن باتوں کو ہم سنتے ہیں ان میں جمال بذات خود موجود ہے۔

ایک اور گروہ کہتا ہے کہ حسن ایک لذیذ انفعال نفسانی کا نام ہے۔ ایک اور گروہ کا خیال ہے۔ کہ حسن و جمال نام ہے چند انسانی [illegible] کے مجموعے کا۔ ایک اور گروہ یہ نظریہ قائم کرتا ہے کہ جمال نام ہے [illegible]

خوش کن [illegible]

ایک فرقہ کا عقیدہ ہے۔ کہ جمال نام ہے جدت و غرائب کا۔ جو اس مشہور مقولے کے مطابق ہے۔ لِکُلِّ جَدِیْدٍ لَذَّۃٌ

دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ ہر حسین و جمیل سے مفید و نافع ہوتی ہے اسلئے حسن نام ہے نفع اور فائدہ کا۔

ایک گروہ اشیائے مختلف اجزا کے وحدانیت کی صورت میں جمع ہونے کو حسن کہتا ہے۔ اور اس کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ مختلف نغمے ایک یا من یا سُر کی صورت میں جمع ہو کر کانوں کو بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

ایک طبقہ کا خیال ہے کہ جمال نام ہے ترتیب و تناسب موزوں کا

علاماتِ عشق

عاشق انسان ہر وقت حیران و پریشان رہتا ہے۔ کیونکہ اس کا خیال معشوق میں گڑا ہوتا ہے۔ اور اس کی قوت فکری محبوب کی خوبیوں میں لگی رہتی ہے۔ اس لئے وہ خاموش رہتا ہے۔ اور جب کبھی کسی شخص کا خیال کرنے لگتا ہے۔ تو بالطبع سر جھکا لیتا ہے۔ اس سے غرض یہ ہوتی ہے۔ کہ روحیں دماغ کے مقدم حصہ کی طرف چلی جائیں کیونکہ یہی حصہ خیالات کا مقام ہے۔ اور حواس ظاہری و باطنی اسی جگہ جمع ہوتے ہیں۔ انسان کی حالت مالیخولیا کے مریضوں کی سی ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ ہمیشہ غم زدہ سا رہتا ہے۔ تنہائی اور خاموشی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کام کاج کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ آنکھیں گہری ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ مسلسل فکر کرنے، غذا کم کھانے، اور شب بیداری کے باعث فساد ہضم لازمی ہے تحلیل زیادہ ہو جاتی ہے جس سے روح نفسانی کم ہو جاتی ہے۔ آنکھوں کی تازگی زائل ہو جاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ آنکھوں کی ساخت فطرتاً لطیف واقع ہوئی ہے آنکھوں میں حرکت زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ روح میں اشتعال کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ آنکھوں میں ناز و کرشمہ اور سرور ہوتا ہے۔ گویا وہ کسی لذیذ شے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ یا کوئی مسرت بخش خبر سن رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ محبوب کی پیاری شکل اور دلکش ادائیں اس کے سامنے ایسی جمی ہوئی ہوتی ہیں۔ گویا آنکھوں کے سامنے رکھی ہوئی ہیں۔ عاشق کی نبض باقی افراد انسانی سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ عشاق کی طبیعت اور توجہ محبوب کی طرف یا اس کی صورت کو خیال کے سامنے حاضر کرنے کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اسلئے طبیعت نبض کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا لیتی ہے۔ حتےٰ کہ نبض کی ضرورت شدید ہو جاتی ہے۔ پھر طبیعت نبض کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ [illegible] طبیعت کا انتقال ایک امر سے دوسرے امر کی طرف ہوتا رہتا ہے

نبض میں اختلاف پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ عاشق ہمیشہ امید و بیم کے درمیان رہتے ہیں۔ جب امید کا غلبہ ہوتا ہے تو خوش و خرم انسانوں کی مانند ان کی نبض کسی قدر سستی مائل ہوتی ہے۔ جب ناامیدی کا غلبہ ہو تو ان کی نبض غمزدوں کی طرح بہت زیادہ ضعیف اور سست ہو کر چلنے لگتی ہے۔ اس کی سانس بلندی پر چڑھنے والوں کی طرح بہت زیادہ رکتی اور پھر لوٹتی ہے۔ سانس کے رکنے کی وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ نفس اور طبیعت محبوب کے خیال اور فکر میں لگ جاتے ہیں۔ اور سانس کے لوٹنے کی وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ روح چونکہ قلب کی طرف لوٹ آتی ہے۔ اس لئے دخانی بخارات کے اندفاع کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔ روفس کا قول ہے۔ کہ عاشق کی علامت یہ ہے۔ کہ بدن میں خشکی ہوتی ہے۔ مریض چپ چاپ رہتا ہے۔ اور کام کاج میں طبیعت نہیں لگتی۔ ابن تلمیذ کہتا ہے کہ ان علامتوں سے مرض عشق کی جنس و غم معلوم ہوتا ہے۔ و غم مرض عشق کی ایک جنس اور عشق اس کی ایک قسم ہے اگر مریض اپنے غم کی وجہ نہ بتلائے بلکہ اسے چھپائے۔ تو مرض عشق کی خصوصیت معلوم ہو جاتی ہے۔ علے الخصوص ان علامتوں کے ساتھ اگر مریض طبیب کے استفسارات کا کوئی جواب نہ دے۔ اور اس کی باتوں کی کوئی پروا نہ کرے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ مریض اپنے مرض سے واقف ہے۔ اور عمداً چھپانے کی کوشش کر رہا ہے یا دوسرے شخص کے قبضہ میں ہے یا شرم و حیا مانع اعلان ہے۔ ان کے علاوہ کسی شخص کا نام سننے یا دیکھنے سے مریض کی نبض و تنفس اور رنگ تیز ہو کر تبدیل ہو جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کو اس شخص سے کوئی خاص تعلق رو حانی ہے۔ (جسکی ایک مثال عالمگیر اکتوبر ۱۹۲۷ء کے شمارہ میں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہے) اسی طرح جالینوس نباض فطرت و علم نبض کا موجد جالینوس ہے۔ اس سے پہلے بقراط نے صرف دس قسمیں مقرر کی تھیں لیکن حکیم مذکور نے ان کی تعداد بڑھا کر ۲۱ تک پہنچا دی۔ نے ایک عاشق عورت کا حال معلوم کر لیا تھا۔ جالینوس جو سوال کرتا۔ وہ ان کی کوئی پروا نہ کرتی تھی۔ اتفاقاً ایک شخص کا ذکر آگیا [illegible] عورت کا رنگ تبدیل ہو کر نبض تیز چلنے لگی۔ پھر کسی دوسرے شخص کا ذکر کیا گیا۔ تو اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ پھر پہلے شخص کا ذکر کیا گیا۔ تو اس کی حالت میں نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی۔ جالینوس سمجھ گیا

کہ ہونہ ہو یہ عورت اس پر عاشق ہے۔ آمدم برسر مطلب۔ بعض حکماء کو اس مسئلہ سے اختلاف ہے۔ اور یہ بات وہ ماننے کو تیار نہیں کہ جملہ حواس لبشریہ ایک محل میں جمع ہو سکتے ہیں۔ وہ ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ایک پھول جو بظاہر دیکھنے میں دیدہ زیب اور خوشنما ہے۔ لیکن خوشبو نہ رکھنے کی وجہ سے قوت شامہ کی تسکین کے لئے ناکافی ہے۔ مان لیا کہ قوت باصرہ و شامہ اس کے استلذاذ میں متفق ہو جائیں۔ لیکن قوت لامسہ کانٹوں سے مجروح ہونے کے باعث کبھی اتفاق کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے حالت عشق عبارت ہے ایک مرض سے کہ جو دل و دماغ انسانی پر مسلط ہو کر اسے تمام کاروبار دنیاوی سے باز رکھتا ہے لیکن باب اعتراض اس گروہ کے نظریہ پر بھی ہمیشہ کے لئے کھلا ہے۔ کیونکہ حالت عشق تنہا نہ صرف ان اشخاص پر جن کے دل و دماغ کمزور ہوں۔ بلکہ ہر اہل دل و دماغ پر مستولی ہو سکتا ہے ؎

عشق را با ہر دے نسبت بقدر جوہر است
قطرہ بر گل شبنم و در قعر دریا گوہر است

منازلِ عشق

یہ اظہر من الشمس ہے۔ کہ دماغ مرجع کا نہ حواس انسانی ہے اگر دماغ کو "دارالخلافہ" تصور کیا جائے۔ تو حواس کو ولایت سے مشابہت دینی پڑے گی۔ حواس انسانی پرچہ نویس کی طرح روزانہ واقعات حوادث کو مرکز کی طرف روانہ کرتے ہیں۔ اور دماغ موصول شدہ خبروں کو روزنامچہ میں درج کرنے کے بعد محاکمہ میں لگ جاتا ہے۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ فلاں مرد فلاں عورت پر عاشق ہے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیسے عاشق ہؤا؟ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ پہلے پہل اس نے دیکھا اس کے حسن و جمال نے اس کے قوت باصرہ پر قبضہ کر لیا۔ حواس نے اس واقعہ کی اطلاع "دارالخلافہ" کو روانہ کی۔ وہ روزنامچہ میں درج کرنے کے بعد محاکمہ میں لگ گیا۔ اسی دوران میں اگر گفتگو کی نوبت آگئی۔ تو اس کی دلنشین آواز عاشق کی قوت سامعہ کو جادو کے زور سے مسخر کرنے میں کامیاب ہو جائیگی۔ جب یہ دونوں حواس حلقہ بگوش ہو جائیں گے۔ تو قوت ذائقہ بھی بوسۂ شیریں کی آرزو مند نظر آنے لگیگی جب تینوں حواس پر محبوب کا تسلط ہو جائے گا۔ تو تینوں متفق ہو کر دل کو دمساز بنا کر اُسے بھی زلف گرہ گیر کے دام میں پھنسا دینگے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ جب عاشق کے حواس ظاہری و باطنی مسخر ہو جائیں گے تو دل و دماغ پر ہر وقت اس کا تصور چھایا رہیگا۔ اور اگر ان میں سے کوئی حواس محاکمہ دماغ پر تنقیدی نگاہ ڈالے گا۔ تو بقیہ حواس دندان شکن جواب دے کر ہمیشہ کے لئے اس کا منہ بند کر دیں گے۔ اور پھر عاشق اس وادی کو طے کرنا شروع کر دے گا۔ جہاں محبت ہی محبت ہے۔ اور محبوب کی برائیاں بھی بھلائیاں نظر آتی ہیں ؎

عشق است کہ ہم بندہ و ہم بندہ نواز است
ایں حاصل افسانۂ محمود و ایاز است!

عالمگیر لاہور ۔۔۔ ۴۶ ۔۔۔ جنوری سنہ

مردکو دھات کی بیماری

اگر کسی مرد کو پیشاب کرنے کے بعد یا پیشاب سے پہلے سفید رنگ کا پانی خارج ہو تو یہ بہت خطرناک بات ہے اسے جریان کی بیماری کہتے ہیں رفتہ رفتہ یہ مرض بڑھ جاتا ہے۔ تو پھر آدمی شادی کے مطلب کا نہیں رہتا اس کی قوت مردمی ختم ہو جاتی ہے۔ اس واسطے جن مردوں کو یہ شکایت ہو یعنی پیشاب کرنے سے پہلے یا پیشاب کے بعد یا بیوی کے پاس جانے سے پیشتر ہی سفید رطوبت خارج ہو جائے یا رات کو سوتے میں احتلام ہو جائے تو اس خطرناک مرض سے غفلت نہ کرنی چاہیے۔ ورنہ ایک دن زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا۔

اگرچہ بعض ڈاکٹر اور حکیم اس مرض کو بہت مشکل بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے علاج میں کافی روپیہ خرچ ہوگا۔ لیکن یہ ان کی بھول ہے

جریان کا مرض صرف ایک ہفتہ میں ختم کیا جا سکتا ہے

اور صرف ساڑھے تین روپے خرچ ہوں گے۔ دوا "جوہر اعظم" اس مرض کے لئے فوری اکسیر کا کام کرتی ہے۔ صرف ایک شیشی دوا "جوہر اعظم" سے بڑے بڑے پرانے مریضوں کو تندرستی ہوگئی۔ سنہ ۱۹۴۲ء کے انعامی مقابلہ میں بھی یہ دوا سرتاج رہی اور یقین کیا گیا کہ "جوہر اعظم" جریان کے مرض کا بہترین علاج ہے۔ چنانچہ اس وقت سے آجتک اس دوا پر محصول ڈاک معاف ہے۔ جن لوگوں کو ضرورت ہو وہ

منیجر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۳۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر "جوہر اعظم" کی ایک شیشی بذریعہ وی۔ پی منگالیں۔ ایک شیشی کی قیمت تین روپے آٹھ آنے ہے۔ پارسل کا محصول کسی ہندوستانی خریدار سے نہیں لیا جاتا۔

بال کالا کرنے کی۔ کھانے کی دوا

ایک نہایت ہی کامیاب ایجاد

سفید بالوں کو ہمیشہ کیلئے کالا کر دینا اور آئندہ کالا بال نکلنا اب بہت آسان ہو گیا۔ لگانے کا خضاب سفید بالوں کو صرف ایک ہفتہ کے لئے کالا کر سکتا ہے اور پھر سفیدی آ جاتی ہے۔ لیکن تحقیقات کے بعد اب ایک ایسی عجیب غریب دوا ایجاد ہوئی ہے۔ جس کے کھانے سے سفید بال کالے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر کالے ہی رہتے ہیں۔ کیونکہ بالوں کی جڑیں تک سیاہ ہو جاتی ہیں۔ اس دوا کا نام "کیشول" ہے۔ تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ دوا کیشول کے صرف ایک ہفتہ استعمال کر لینے سے ہی سفید بالوں پر سیاہی پھیلنے لگتی ہے۔ اور پوری شیشی "کیشول" کی استعمال کرنے کا مطلب ہے کہ بال کالے بھی ہو جائیں گے۔ اور آئندہ کالے ہی نکلیں گے۔

چار روپے میں تمام بال سیاہ ہو جائینگے دوا کیشول قطعی بیضرر ہے۔ عام طور پر لوگ ایسے کھانے کا خضاب کہنے لگے ہیں۔ اور یہ کسی حال میں استعمال کرنے والے کو نقصان نہیں کرتا۔ دنیا میں اس سے بہتر خضاب شاید آپ حاصل نہ کر سکیں گے۔ ایک شیشی کیشول جو ایک ضرورت مند کیلئے قطعی کافی ہے اسکی قیمت چار روپے دو آنے ہے

منیجر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۳۴ دہلی کو خط لکھ کر دوا کیشول بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیجئے۔ پارسل پر گیارہ آنے محصول خرچ ہوگا۔ اور اس معمولی رقم میں آپ اپنی ضرورت کا ایک لاثانی تحفہ حاصل کر لیں گے۔ کیونکہ اس دوا کے استعمال کے بعد لگانے کے خضاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بال از خود کالے نکلنے لگتے ہیں۔

پہلے [illegible] بن جاؤ — بعد میں قیمت دینا

تمہارے بدن میں چور ہے — اور یہ جوانی کی خفیہ طاقت ختم کر دے گا

مرد کی خاص کمزوری کا علاج مفت

صرف ایک روپیہ خرچ ہوگا جب کسی مرد کی مردانہ طاقت کمزور ہو جائے۔ جب ...... شرمندگی ہونے لگے۔ اور مرد اپنی شرمندگی کی وجہ سے خودکشی کا خیال کرنے لگے۔ جب کوئی مردانی خاص کمزوری کی کمی کو پھر پورا کرنا چاہے۔ جب کوئی مرد ...... کے سامنے ذلیل ہو جاتا ہو تو اس کا ایک ہی علاج ہے جسکے بعد پھر کایا پلٹ ہو جائیگی۔ پھر نوجوانی اپنا کام کرنے لگے گی۔ پھر وہی مایوس مرد اپنے بدن میں بجلی کی سی تڑپ اور اُمنگ محسوس کرنے لگے گا۔ پھر اس کا جی چاہے گا کہ کوئی اس سے محبت کرے۔ اس کی طرف دیکھے۔ اور ....

یہ علاج ہے ہندوستان کی سب سے بڑی دوا "معجون کاشمیری" کا استعمال جس نے ہر مقوی دوا کے مقابلہ پر اپنا سکہ جما لیا ہے اور جس کی ایک ایک خوراک مریض کے جسم میں جوانی اور شباب کا صحیح اور اصل جوش پیدا کرتی ہے۔ ہر خوراک سے مریض خود محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ کیا تھا اور اب جوانی کتنی تیزی سے اس کے جسم میں واپس آ رہی ہے۔ دوا "معجون کاشمیری" کی تیاری میں ایک پہاڑی بوٹی شامل ہے اور یہ تمام کرشمہ اُسی کی بدولت ہے۔ ناکارہ مرد اور وقت پر شرمندہ ہو جانیوالے انسان کیلئے یہ دوا سب سے بڑی دولت ہے اور کئی سال سے ہندوستانی مارکیٹ میں اپنا سکہ جما رہی ہے۔ اگرچہ ایک شیشی کی قیمت چار روپے سات آنے ہے لیکن اس کو ملک کے گوشہ گوشہ تک پہونچا دینے کے لئے ایک مختصر عرصہ تک صرف ایک روپیہ قیمت لی جا رہی ہے۔ اور یہ قیمت قطعی مفت برابر ہے۔

لہذا اعلان کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی مرد مایوس ہو چکا ہو۔ کثرت کار، بچپن کی بے احتیاطی یا کسی مرض کے باعث جوانی کی خاص طاقت کمزور پڑ گئی ہو یا وقت پر شرمندگی ہوتی ہو۔ یا عمر کی زیادتی کے سبب کمزوری محسوس ہوتی ہو ایسے ہی لوگوں کے لئے دوا "معجون کاشمیری" بہترین علاج ہے۔ اُسے چاہیئے کہ وہ

منیجر زنانہ دواخانہ - اے بی ۳۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر ایک شیشی دوا "معجون کاشمیری" بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالے۔ محصول پارسل سات آنے لگے گا اس طرح ایک روپیہ سات آنے میں "معجون کاشمیری" کی پوری شیشی اُسے دیدی جائیگی۔ ایک مریض کو اس رعایتی قیمت میں صرف ایک ہی شیشی دی جائے گی۔ زیادہ نہیں۔ ہاں! اس کی اجازت ہے کہ کئی مریض مل کر ایک ہی پارسل میں کئی شیشیاں منگالیں۔ کیونکہ اس سے محصول بھی کم خرچ ہوگا۔

ٹیلی فون نمبر ۳۶۸

تار کا پتہ :- "زنانہ دواخانہ" دہلی

مان اور شاہین

تاریخی رومان

از جناب مشیر الہدیٰ عثمانی

جن سیاحوں کو اسپین کے مشرقی ساحل کے سفر کا اتفاق ہوا ہے انھیں وہ منظر یقیناً یاد ہوگا۔ جب دریائے سایبن سرسبز پہاڑیوں میں سے ایک سنہری رستہ بناتا ہوا خود کو بحیرۂ روم کے سپرد کر دیتا ہے۔ اسی خوبصورت جگہ کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ واقع ہے جو اپنے کھنڈروں کی وجہ سے تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ فتح اسلام سے پہلے یہی قصبہ سپین کا ایک بہت بڑا شہر تھا جسے اس زمانے کے لوگ عیسائیت کا مرکز سمجھتے تھے اور اب بھی یہاں کے کھنڈر بعض عیسائی زائرین کے لئے موجب تسکین ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ سنسان مقام ان دو ہستیوں کی یاد تازہ کر دیتا ہے جنہوں نے اپنے زمانہ کے مذہبی ماحول پر ناقابل فراموش اثر ڈالا اور جن کے عشق و جمال کا تذکرہ آج بھی تاریخ کے صفحات میں ملتا ہے۔

اس شہر کا نام عربی تاریخوں میں مرتنہ بتایا گیا ہے۔ مرتنہ کی عظمت کا سبب ایک خانقاہ تھی جس کی عظیم الشان عمارت کا اندازہ اس کے کھنڈروں سے لگایا جا سکتا ہے کہتے ہیں کہ اس خانقاہ میں بیک وقت دس ہزار سے زیادہ آدمی بود و باش رکھتے تھے اور اس کی شہرت صرف سپین ہی تک محدود نہ تھی بلکہ تمام مسیحی دنیا اس کی لاجواب عظمت کو تسلیم کرتی تھی، اس عالمگیر شہرت کا راز یہ تھا کہ وقت کی سب سے زیادہ متبرک ہستی اسی خانقاہ کی زینت بنی ہوئی تھی۔

حشمان نے مشکل سے چالیس بہاریں دیکھی ہوں گی مگر اس کے علم و فضل نے اس کی پاکیزگی، خوش اخلاقی اور خلوص سے فائدہ اٹھا کر اپنے وقت کی عیسائیت کا ناخدا بنا دیا تھا۔ بڑے بڑے علما اپنے تشنگیٔ ذوق سے مجبور ہو کر اپنی زندگی اس کی خانقاہ کے لئے وقف کر چکے تھے اکثر بادشاہوں نے اظہار عقیدت کے لئے اپنے اس کے قدموں میں ڈال دیئے تھے اور بیش بہا تحائف سے اس کی بے نیازی کو فتح کرنے کی ناکام کوششیں کی تھیں۔ یہ تمام تحائف صرف خانقاہ کے تصرف میں لائے جاتے تھے۔

حشمان کے خلوص اور اخلاق نے اس کے اکثر عقیدتمندوں کی عقیدت کو محبت کی شکل میں بدل دیا تھا اور اس سے زیادہ ہر دلعزیز شخصیت اگر دنیا میں کوئی اور تھی تو وہ شاہین تھی۔ جس طرح حشمان چمن علم و مذہب کے سب سے بڑے گلاب کی حیثیت سے ہزاروں بلبلوں کا مرجع نظر بنا ہوا تھا اسی طرح شاہین محفل حسن و عشق کی وہ روشن ترین شمع تھی جس کے پروانوں کی تعداد آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ زیادہ تھی۔

شاہین پیرس کی ایک حسن فروش رقاصہ تھی جس کی شہرت کا حلقہ عیسائی دنیا سے بھی زیادہ تھا۔ کیونکہ اس زمانہ کی اسلامی تصنیفات میں بھی اسے ایک عیسائی ساحرہ کے لقب سے یاد کیا گیا ہے ایک پرانے مورخ کا خیال ہے کہ یہ صرف ایک اتفاق تھا کہ ہیلن اور قلوپطرہ نے دنیائے تاریخ میں وہ نام پیدا کر لیا جو شاہین کو نصیب نہ ہو سکا ورنہ اگر ہیلن یا قلوپطرہ کی جگہ شاہین یونان یا مصر کی ملکہ ہوتی تو تاریخ عالم اس سے یقیناً اتنا ہی اثر لیتی جتنا ہیلن اور قلوپطرہ بہم پہنچا سکیں۔

علاوہ حسین ہونے کے شاہین ان تمام چیزوں کی مالک تھی جو ایک عشوہ فروش مغنیہ کی زندگی کو کامیاب بنانے میں مدد پہنچا سکتی ہیں۔ اس کی معصوم نظر آنے والی آنکھوں میں ہزاروں فریب پنہاں تھے۔ اس کی حسین ترین آواز کے پیچھے ایک سیاہ دل تھا۔ وہ جانتی تھی کہ نفرت کو محبت میں کس طرح تبدیل کر سکتے ہیں اور زہد کی سنگلاخ زمین میں معصیت کا بیج کیسے بویا جا سکتا ہے؟ ہزاروں ایمان اس کے دلگداز گانے کی قربانگاہ پر نذر کئے جا چکے تھے اور لاکھوں دامن زہد اس کے بے پناہ رقص کی بدولت تار تار ہو چکے تھے حالانکہ ابھی وہ شباب کی اس منزل کو طے کر رہی تھی جس کے بعد بھی ترقی کا امکان باقی رہتا ہے۔

حشمان کے کان بھی شاہین کے نام سے ناآشنا نہ رہ سکے اس نے اکثر اس ساحرہ کے حسن و عشق کے تذکرے سنے اور ان شکستوں کا ذکر بھی سنا جو زہد کو اس کے بے پناہ ہاتھوں سے نصیب ہوئی تھیں۔ ایک حسن تمام کی سیاہ کاریوں نے حشمان کو کافی متاثر کیا اور وہ چاہنے لگا کہ کاش شاہین نیک ہوتی۔ اس نے دعائیں مانگیں مگر لوگوں کی دعاؤں سے قسمتیں نہیں بدلا کرتیں۔ آخرکار حشمان کے جذبۂ ہمدردی اور آرزوؤں نے اسے دوسری صورت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ بہت سی دولت لے کر مرتنہ سے پیرس کی طرف روانہ ہوا تاکہ ایک گمراہ انسان کو سیدھا رستہ بتلائے۔

ایمان اور کفر کا پہلا مقابلہ ایک رقص کی محفل میں ہوا جس میں اپنی اپنی جگہ پر دونوں ٹھہر گئے۔ شاہین حشمان کی عظمت سے واقف تھی جس کی پُرجلال موجودگی سے محفل میں ایک روحانیت سی طاری ہو گئی اور شاہین خود بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ آج خلاف معمول اس کا رقص مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا پھر بھی اس کا حسن اور نغمہ معبدوں کو جنبش دینے کے لئے کافی تھا اور حشمان نے آج پہلی مرتبہ اپنی چالیس سالہ مُردہ دلی کے بعد پہلی بار دل میں زندگی کے آثار محسوس کئے۔

دوسرے دن حشمان کا ارادہ تھا کہ شاہین کے یہاں جا کر خود اُسے ایمان کی دعوت دے مگر آج وہ دل جس کی ہر خواہش ارشادات انجیل کی تفسیر ہوا کرتی تھی اپنے آپ پر اعتماد کرنے سے قاصر رہا اور بجائے خود جانے کے حشمان نے شاہین کو ایک خط لکھا جس میں نیکی کی ہدایت حد درجہ پُرزور الفاظ میں کی گئی اور جس کا حامل صرف اسی کا قلم ہو سکتا تھا۔ جہاں تک مومنین کی یاد اور ان کا قیاس کارفرما ہو سکا ہے۔ اس تحریر کی شکل یہ تھی۔

"اے دنیا کی لطیف ترین چیز! حشمان تجھے بتانے آیا ہے کہ فردوس ایک مدت سے اس امر کا ماتم کر رہی ہے کہ تو اس کی قسمت نہیں بن سکے گی جہنم کے شعلے کانپ رہے ہیں کہ وہ مجھے اذیت پہنچانے کے لئے مجبور کئے جائیں گے عصمت عالم افسردہ ہے کہ وہ تجھ سے داد نہ لے سکی اور معصیت کی روح نادم ہے کہ اس سے تیری بھی تخریب ہو گئی مگر تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ تیرے ارادے کی ایک جنبش ان سب چیزوں کی قسمتیں بدل سکتی ہے کاش تو صرف ایک مرتبہ رحم کے لئے قابل افتخار بن سکے۔

تو شہرت و ثروت کے ان مدارج کو طے کر رہی ہے جن کے بعد کسی ترقی کی گنجائش نہیں رہتی دنیا کا کوئی عیش ایسا نہیں ہے جو تیری راتوں کو آباد نہ کر چکا ہو ایسی کوئی خواہش تیرے دل میں پیدا ہوئی جس نے استغفار کی خواہشیں دیکھی ہوں اور حشمان تجھے بتاتا ہے کہ اب وہ وقت قریب ہے جب تیری ہوس کا پیمانہ لبریز ہو جائیگا اس سے پہلے کہ دنیا خود تیرے لئے بے کیف ہو جائے تو مزنہ کی اس خانقاہ کی دعوت قبول کرنے میں کہ زمین آسمانوں سے زیادہ مقدس ہے اور جہاں کی محبت کا سر در کبھی خمار سے نہیں بدلا۔ غالباً تو عیسائیت کے اس غلام کو ناکام نہیں واپس کرے گی جس کو تیری دنیا شہنشاہ نواز کے نام سے یاد کرتی ہے"۔ حشمان

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس خط کا فوری اثر شاہین پر کیا ہوا۔ مگر قیاساً اتنا کہا جا سکتا ہے کہ گذشتہ رات کے اثرات جو غالباً شخصیت پرستی پر مبنی تھے اسے زیادہ اہم محسوس ہونے لگے۔ باوجود کوشش کے خط کا

کوئی معقول جواب اس کی سمجھ میں نہ آیا اور نہ معلوم کس جذبے سے مجبور ہو کر اس نے یہ مختصر دعوت نامہ حشمان کے یہاں بھیج دیا۔

"اے انسانیت کی تکمیل! شاہین اپنے گھر کی کا فرزمین سے اسی طرح واقف ہے جس طرح تیرے قدموں کی پاکیزگی سے مگر پھر بھی وہ یہ تمنا کرنے کی ہمت رکھتی ہے کہ کاش اس کا معصیت خانہ تیرے ان قدموں کی خاک سے سرفراز ہو سکے جس کے نیچے برکت کی تعمیر ہوتی ہے۔ اپنی قسمت کے امتحان کے لئے تیری گنہگار شاہین شام کا وقت تجویز کرتی ہے۔"

دوسرے دن شام تک شاہین کا جذبۂ شوق بیدار رہا اور ادھر حشمان کے دل میں جاتی کی وہ عصمت سوز چنگاری جس کی تخلیق پچھلی محفل رقص میں ہوئی تھی ایک شعلہ کی صورت اختیار کرنے لگی۔

وہ شام جو عنقریب دو ہستیوں کی یادگار بننے والی تھی آگئی مگر حشمان ابھی تک یہ طے نہ کر سکا کہ آیا وہ دعوت کو قبول کرے یا نہیں، کیونکہ شاہین کی دلفریب آنکھوں کا خیال اب بھی اسے کانپنے پر مجبور کر دیتا اور وہ اپنے اس ایمان کی تباہی سے ڈرتا تھا جس کی پرورش میں ۴۰ سال صرف ہوئے تھے۔

لیکن اگر اس طرف ایمان حشمان کو رنگنے کی روکنے کی کوشش کر رہا تھا تو دوسری طرف کفر کی بے پناہ طاقتیں اسے کھینچنے میں مصروف تھیں۔ آخر کار دل کے اضطراب نے یہی فیصلہ کیا کہ کم از کم ایک مرتبہ اور اس کی چیز کو دیکھا جائے جس کی نگاہوں کے ساتھ لوگوں کی تقدیریں بدلا کرتی ہیں۔

جب حشمان شاہین کے محل میں پہنچا جہاں کا ہر ہر نقش ہزاروں گناہوں کی دعوت دے رہا تھا تو وہ خود اپنے ضمیر کی لرزش محسوس کرنے لگا۔ شاہین سے اس کی ملاقات محل کے اس خوبصورت ترین کمرہ میں ہوئی جس سے جنت کے حسن و جمال کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ شاہین سفید ریشمی لباس میں لپٹی ہوئی ایک ایسے بت کی طرح کھڑی تھی جسے قدرت نے نہ معلوم کس ترنگ میں آکر بنا دیا تھا عمارت زہد کی آخری بار بنیادیں ہلیں اور اس طرح کہ حشمان کو اپنی بربادی پر افسوس کرنے پر بھی مہلت نہ ملی اور یہ غالباً اس وقت ہوا جب حشمان کی روحانیت آفریں موجودگی شاہین کے گزشتہ تاثرات کو ثانوی بنا چکی تھی کہ اس نے تائب ہو جانے کا مصمم ارادہ کر لیا شاید اس کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حشمان کے ظاہری وقار کے پیچھے کتنی نیازمندیاں چھپی ہوئی ہیں اور وہ اس سے یوں مخاطب ہوئی۔ "حشمان میں اپنے گناہوں پر نادم ہوں اور میری روح تیرے قدموں میں پناہ ڈھونڈنے کے لئے بیتاب ہے۔"

یہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حشمان اپنی کامیابی پر کس درجہ پچھتایا اس نے بہت چاہا کہ سنبھلے مگر ضمیر کی آخری کشمکش بھی ناکام رہی۔ اور وہ کہنے کے لئے مجبور ہو گیا۔ "میں اب وہ حشمان نہیں ہوں۔ تیرے زہد سوز حسن نے مجھے یہ بتا دیا کہ زندگی صرف معصیت کا نام ہے اور جینے کے لئے گناہ کرنا ہوگا۔ اب میں خانقاہ واپس نہیں جاؤنگا۔ بلکہ دنیا کے دوسرے غلامان نفس کی طرح صرف تیری عبادت کرونگا۔ تیرے التفاقات کی قیمت میں میں وہ جواہر تیرے قدموں میں ڈالدونگا جو کبھی شہنشاہوں کے تاجوں کے لئے وجہ نازش رہ چکے ہیں۔ میں تجھ سے منت کرتا ہوں کہ تو جہاں تھی وہیں لوٹ آ۔ اپنے ارادوں کو بدل کہ خانقاہ کی خشکیاں تیری رنگینیوں کو اس طرح بے کیف بنا دینگی جیسے خزاں کی ہوائیں صنوبر کے پتوں کو۔"

شاہین کو اس تقریر کی صداقت پر یقین نہ آنا چاہئے تھا نہ آیا، اور اس نے کہا: "اے میرے رہنما! میرا امتحان مت لے۔ میں اپنے ارادے پر قائم رہونگی۔"

حشمان نے دوبارہ یقین دلانے کی کوشش کی۔ "افسوس اے شاہین تو نہ انسان کی مجبوریوں سے واقف ہے نہ اپنی طاقتوں سے حشمان فطرت انسانی سے مجبور ہے اور تو ان طاقتوں سے معمور جو نغمہ و حسن کے لئے ازل سے وقف ہیں۔ وہ سر جسے موجودہ دنیا سب سے زیادہ متبرک سمجھتی ہے تیرے قدموں پر جھکنے کے لئے بیتاب ہے میں وہ زہد تیری قربانگاہ پر لایا ہوں جس پر عیسائیت کو مدتوں ناز رہا۔ شاہین! میری قربانی کی قدر کر!"

مگر شاہین کی زندگی کی قسمت میں اس کے بعد کوئی انقلاب نہ لکھا تھا اور نہ حشمان ایک مرتبہ بگڑنے کے بعد بن سکا۔ شاہین اپنا تمام سرو سامان مختلف خانقاہوں اور کلیساؤں کے لئے وقف کر کے مزنہ کی خانقاہ میں داخل ہو گئی۔ حشمان شاہین کے ساتھ مزنہ تک گیا مگر خانقاہ میں جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ جتنی کوششیں اسے سمجھانے پر صرف کی گئیں سب بیکار گئیں لوگوں کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی مگر رفتہ رفتہ وقت کے اہم ترین واقعہ نے ایک معمولی کہانی کی صورت اختیار کر لی اور وہ شخصیت جس کے دیدار کے لئے آنکھیں ترسا کرتی تھیں اب خانقاہ کی چار دیواری کے باہر ایک عام نظارہ بن کر رہ گئی چونکہ حشمان، شاہین کی محبت میں سوا اس کے اور کچھ نہ کر سکتا تھا کہ خانقاہ کے چاروں طرف گھومتا رہے۔

(باقی بر صفحہ ۷۳)

(بقیہ صفحہ ۷۱)

کچھ عرصہ کے بعد شاہین کو خانقاہ میں وہی درجہ حاصل ہوگیا جو کبھی حشان کا حصہ رہ چکا تھا۔ اور اس طرح وہ مسیحی دنیا کی اس کمی کو پورا کرنے میں کامیاب ہوئی جو حشان کے زوال کے بعد لاکھوں عبادتوں کی محسوس ہوئی تھی۔ واقعہ نگاروں نے اس کے بعد بہت سے قصے حشان و شاہین کے متعلق لکھے ہیں اکثر نے دکھانا چاہا ہے کہ کس طرح شاہین پھر بھی حشان سے ملتی رہی اور اسے صحیح رستہ پر لانے کی کوشش کرتی رہی مگر معتبر مورخین نے ان باتوں کو اہمیت نہیں دی ہے۔ اتنا ضرور لکھا گیا ہے کہ جب حشان مرگیا تو شاہین کی کوششوں سے خانقاہ میں ایک خاص قبر بنایا گیا اور اس کی لاش خانقاہ کے قبرستان کی اس سمت میں دفن کی گئی جو صرف قائدین کیلئے وقف تھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب تک خانقاہ قائم رہی وہاں کے لوگ ہر صبح کو حشان کی مغفرت کی دعائیں مانگتے رہے۔

مزنہ کے موجودہ کھنڈر میں اب تک اس قبر کا نشان ملتا ہے اس کے برابر ہی دوسرے خانقاہ عظیم یعنی شاہین کی قبر ہے جتنے زائرین ان کھنڈروں میں آتے ہیں ان دونوں قبروں کو ضرور دیکھتے ہیں۔ اکثر کو یہ دعا مانگتے ہوئے سنا گیا ہے کہ "اے خدا ہمیں حشان کا آغاز اور شاہین کا انجام عطا کر — یا!"

غزل

از: جناب محمد شرف الدین علوی سلیم

دیکھ آئے کوئی چشمِ حقیقت لئے ہوئے
ہے ذرہ ذرہ یار کی صورت لئے ہوئے

ہم ان کے سامنے گئے حسرت لئے ہوئے
ناکام ہی پھرے غمِ الفت لئے ہوئے

کچھ ہم کو واسطہ نہیں ردّ و قبول سے
ہیں بے نیاز حسنِ عقیدت لئے ہوئے

بلبل سے کہدو فرق کرے نقل و اصل میں
ہر گل ہے آج حسن کی رنگت لئے ہوئے

بیٹھے ہوئے ہیں سایۂ دیوارِ یار میں
ہم اپنے دل میں حسرتِ راحت لئے ہوئے

دامن یہ روزِ حشر نہ چھوڑیگا آپ کا
ہے میرا خون رنگِ شہادت لئے ہوئے

اُٹھے ہیں آج مجلسِ پیرِ مغاں سے ہم
تقویٰ کو اے سلیم سلامت لئے ہوئے

دولت آپ کا انتظار کر رہی ہے

مبلغ دس ہزار روپیہ انعام

10,000/- عہ ۱۰۰۰۰

آخری تاریخ داخلہ بندہ ۲۷ جنوری ۱۹۴۲ء نتیجہ انعام ۳۱ جنوری ۱۹۴۲ء	لیجیے ایسا سنہری موقع پھر ہاتھ نہیں آئیگا	داخلہ فی حل آٹھ آنے ۸/ سچائی اور انصاف سے کام ہوگا

دو منٹ کی محنت۔ یقینی انعام صحیح حل کا انعام سات ہزار روپیہ۔ سب سے زیادہ حل بھیجنے کا انعام ایک ہزار روپیہ۔ سب سے پہلے صحیح حل بھیجنے والے کے لئے خاص انعام ایک ہزار روپیہ۔ اگر کوئی صاحب یہ ثابت کردیں کہ حل درست ہونے پر انعام نہیں ملا تو کمپنی مبلغ پچاس روپیہ دینے کا وعدہ کرتی ہے۔ اس معمہ میں ضرور شامل ہو جائیے ممکن ہے کہ قسمت آپ ہی کا انتظار کر رہی ہو۔ صحیح حل وہ متصور ہوگا جو ہندسہ [illegible] در خانہ اس حل سے ملے گا جو ایڈیٹر صاحب "ایوننگ نیوز" کے پاس محفوظ ہے۔ نقشہ ہذا کو اس طرح پُر کرنا ہے، کہ جس طرف سے جمع کریں میزان ۴۸ آئے۔ نقشہ میں خالی صفر یہ نہیں ہے۔

	۲۰	
	۱۶	
۱۲		

درست حل کرنے والے صاحبان اور سب سے زیادہ حل کنندہ کو مبلغ پچاس روپیہ کی گارنٹی دی جاتی ہے داخلہ بڑھ جانے اور زیادہ حل درست نکلنے پر انعامی رقوم برابر تقسیم ہونگی غلطی والوں کے لئے بھی ایک ہزار روپیہ کا نقد انعام مقرر ہے جو حل قواعد کے خلاف ہوگا وہ انعامی فہرست میں شامل نہ ہوگا۔ فیس کسی حالت میں بھی واپس نہ ہوگی مینجر صاحب کا فیصلہ ناطق و قانونی طور پر قطعی قابل تسلیم ہوگا۔

نتیجہ یا جواب کے لئے ارکا ٹکٹ آنا ضروری ہے

مینجر نیشنل کمپی ٹیشن، اے ایل ریلوے روڈ لاہور



"بالوؔ اور ماہیاؔ"

دیہاتی رومان

از جناب احمد شجاع پاشا جالندھری بی۔ اے

پنہاریوں کے پاس سے جب دن ڈھلے کبھی
گاتا ہوا گزرتا ہے اک خوبرو جوان
اک ماہوش حسینہ سمٹتی ہے ناز سے
شوخی سے مسکراتی ہیں اُس کی سہیلیاں

کھیتوں سے دُور دُور پسِ پردۂ غبار
مغموم جا رہا ہے کوئی سانڈنی سوار
شیشم کے نیچے ایک دوشیزہ بہ اضطراب
اس سمت دیکھ دیکھ کے روتی ہے زار زار

جنگل کے پار شب کی خموشی میں دیر سے
پُرسوز گیت گا رہا ہے کوئی دلفگار
مجبور ہو کے درد سے اک حورِ نازنیں
بستر میں اپنے کروٹیں لیتی ہے بار بار

پیدا ہوا فضاؤں میں گانے سے ارتعاش
کیسے کٹیں گے آہ یہ لمحے فراق کے
پگڈنڈیوں پہ ایک حسینہ نے کی نگاہ
بے اختیار آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے

پیڑوں کے سائے لیٹ گئے فرشِ خاک پر
سطحِ افق پہ ہو گئی طاری طویل رات
آنکھوں میں اک دوشیزہ کے تھرا رہے ہیں اشک
افسردگی میں ڈوبی ہوئی سی ہے کائنات

مشرق سے ایک نور کا چشمہ اُبل پڑا
تاروں کا آسماں سے بکھرنے لگا غبار
ان بیریوں کے سائے میں اک حورِ نازنیں
پگڈنڈیوں کو دیکھ کے روتی ہے زار زار

لہرا رہے ہیں ابر کے سائے میں سبز کھیت
ساون کی دلنواز جوانی ہے باڑھ پر
گاؤں سے دور اُلجھی ہوئی جھاڑیوں کے پاس
دوہے الاپتا ہے کوئی دل کو تھام کر

جب آسماں پہ رات کو شمعیں سی جل گئیں
ٹیلوں کے درمیان سے اُڑنے لگا غبار
اک نازنیں کے چہرے پہ سرخی جھلک گئی
مسرور آ رہا تھا کوئی سانڈنی سوار

بالو گاؤں کی ایک الہڑ دوشیزہ، ماہیا ایک خوبرو جوان۔

رفتار زمانہ

عالمگیر واقعات پر ماہانہ تبصرہ

از۔ شبلی بی۔کام

جب سے برطانیہ و جرمنی کی موجودہ جنگ شروع ہوئی ہے۔ مشرق بعید میں جاپان بھی جنگ جویانہ عزائم کا اظہار کر رہا تھا اور مسٹر متسوکا کے ماسکو روس و جرمنی اور مسٹر توجو کے برسر اقتدار آنے کے بعد تو یہ قیاس قوی تر ہو چکا تھا کہ جاپان بھی محوریوں کے اشارے پر برطانیہ و امریکہ سے لڑائی مول لینا چاہتا ہے چنانچہ گزشتہ شمارہ میں بتایا گیا تھا کہ ایک طرف جاپانی نمائندہ "وائٹ ہاؤس" میں مصالحت مذاکرہ کے نغمے چھیڑ رہا ہے تو دوسری طرف جاپان نے اپنی فوجیں تھائی لینڈ کی سرحد پر اتارنا شروع کر دی ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ٹوکیو کی نیت صاف نہیں ہے اور وہ ہر قیمت پر امریکہ و برطانیہ سے الجھنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ یہ قیاس درست نکلا کیونکہ ابھی امریکا و جاپان کی مصالحانہ گفتگو کا کوئی نتیجہ بھی برآمد نہ ہوا تھا کہ ۸ دسمبر کو جاپان نے اتحادیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور بحرالکاہل کے چھوٹے چھوٹے جزائر کی آزادی و خود مختاری کو پاؤں کے نیچے روندنا شروع کر دیا۔ جاپان نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟ اس کے جواب پر ان صفحات میں بارہا روشنی ڈالی جا چکی ہے تاہم مختصر طور پر جاپانی اغراض کا خلاصہ یہ ہے کہ اول یہ ملک گزشتہ ستر اسی برس سے مشرقی ممالک پر اپنی سیاسی و تجارتی سیادت کے خواب دیکھ رہا ہے اور وہ مشرق بعید میں وہی حقوق حاصل کرنا چاہتا ہے جو نظریہ منرو کی رو سے جاہیر متحدہ امریکہ کو جنوبی امریکہ میں حاصل ہیں۔ یعنی جس طرح دول یورپ نئی دنیا کے کسی علاقہ پر بغیر شمالی امریکہ کی رضامندی کے قبضہ نہیں کر سکتے اسی طرح جاپان بھی چاہتا ہے کہ وہ بحرالکاہل کے جزائر میں یورپینوں کو دخل انداز نہ ہونے دے۔ اس کے علاوہ اس کی خواہش یہ ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کے تمام ممالک سیاست و تجارت میں جاپان ہی کو اپنا رہنما اور قائد تسلیم کریں۔ جاپان نے چونکہ ہمیشہ یورپی جنگوں سے فائدہ اٹھایا ہے اس لئے اس نے خیال کیا کہ ممکن ہے موجودہ افراتفری میں بھی اُسے اپنے مشرقی نظام کے سادہ خاکے میں عمل و حقیقت کا رنگ بھرنے کا موقع مل جائے۔ دوم جاپان گزشتہ دس بارہ برس سے چین کے ساتھ نبرد آزما ہے جس کے نتیجہ میں اس کے مالیات کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچا ہے۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ و برطانیہ نے اس کا تجارتی مقاطعہ کر رکھا ہے جس کے باعث ہزاروں لاکھوں جاپانی بیکاری و فاقہ کشی کی زندگی گزار رہے ہیں اس لئے خطرہ تھا کہ جاپانی مزدور بالشوزم کا اثر قبول نہ کریں اور ٹوکیو کی شہنشاہی نظام کی دھجیاں بحرالکاہل کی محشر خرام موجوں میں غرق ہوتی نظر آئیں اس لئے حکومت نے ان کی توجہ جنگ و پیکار کی جانب مبذول کر دی ہے۔ سوم برطانیہ کو امریکہ سے مالی و تجارتی امداد مل رہی ہے۔ جرمنی چاہتا ہے کہ امریکہ کو بعض ایسی مصروفیات میں الجھا دیا جائے کہ وہ برطانیہ کو اتنی امداد نہ دے سکے جتنی معتدل حالات میں دی جا سکتی ہے۔ چہارم جرمنی کو روس میں غیر متوقع نقصانات کا سامنا تھا اور اگر اتحادیوں کی امداد روس کے شامل حال رہے تو اُسے ابھرنے کا موقع مل سکتا تھا اس لئے جرمنی نے واقعات کی رفتار کو اپنے موافق بنانے کے لئے جاپان کو اکسایا کہ وہ میدان جنگ میں کود پڑے تاکہ برطانیہ اپنا سامان جنگ مشرقی محاذ پر منتقل کرنے کو مجبور ہو جائے اور جرمنی اپنے عزائم کو اطمینان کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کے قابل ہو سکے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ توقعات پوری ہو سکیں گی؟ اوّل تو یاد رکھنا چاہیئے کہ جاپان کی معیشتی و اقتصادی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ زیادہ عرصے تک کسی ہمہ گیر جنگ میں مصروف رہ سکے۔ جنگ چین پہلے ہی اس کا کس بل نکال چکی ہے اور امریکہ و برطانیہ کے مقاطعہ سے اس کی رہی سہی قوت بھی زائل ہو چکی ہے اس لئے یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ جاپان کسی طویل لڑائی میں نقصان اٹھائے بغیر شریک رہ سکے گا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ عارضی طور پر ملایا۔ ہانگ کانگ، فلپائن، گوآم اور ویک وغیرہ پر قابض ہو چکا ہے لیکن یہ جنگ کے سمندر کا عارضی مدوجزر ہے جو ضروری نہیں کہ ایک عالمگیر طوفان کی صورت اختیار کر سکے۔ دوم امریکہ و برطانیہ کو ابھی تک جاپان کے مقابلہ میں پوری طرح صف آرا ہونے کا موقع نہیں مل سکا اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ برطانیہ کی توجہ زیادہ تر یورپی محاذ کی جانب مبذول رہی۔ دوسرے امریکہ نے تساہل سے کام لیا اور جاپانی فتنہ کو سر اٹھاتے ہی کچل دینے کے لئے کوئی موثر قدم نہ اٹھایا۔ تیسرے مشرق بعید کے برطانوی جرنیلوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ بحرالکاہل میں امریکہ و برطانیہ کے دفاعی استحکامات ناکافی تھے جن کو اب سرعت

کے ساتھ عمل کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر چرچل واشنگٹن پہنچ چکے ہیں اور مسٹر روزویلٹ سے مصروف گفتگو ہیں اس لئے امید کی جاتی ہے کہ مشرق بعید میں جلد ہی بعض ایسی تدابیر اختیار کی جائیں گی جن کے نتیجہ میں اتحادیوں کے جنگی وسائل متحد ہو سکیں گے اور بحر الکاہل کی جنگ کسی متعین مرحلے پر پہنچ سکے گی۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اُسے مشرق بعید کی جنگ سے علیحدہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اب لڑائی کا طوفان براہ راست ہندوستان کی سرحدوں سے ٹکرانے لگا ہے۔ ایک طرف برما کے علاقوں پر آگ برسائی جا رہی ہے تو دوسری طرف رنگون کو بھی جاپانی بموں کا نشانہ بنایا گیا ہے اس کے علاوہ کلکتہ کو حلقہ متاثرہ قرار دیا جا چکا ہے۔ پس یہ کہنا نادرست نہیں کہ جنگ کا دیوتا ہندوستان کے دروازے پر منہ پھاڑے کھڑا ہے اس لئے وطنی دفاع و تحفظ کا مسئلہ ہر لحاظ سے اوّلیت کا مستحق ہے۔

روس میں جرمنوں کو تقریباً تمام محاذوں پر شکست و ہزیمت کا سامنا ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جرنیل سرما اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ میدان عمل میں آ چکا ہے اور نازی فوجیں اس کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتیں۔ دوسرے اس وسیع و عریض ملک میں ہٹلر کی طاقت کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور بالشویک فوجیں اس سے بجا طور پر فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہٹلر نے مارشل براخیش کو موقوف کر دیا ہے اور تمام فوجوں کی کمان براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ تیسرے ہٹلر سمجھ چکا ہے کہ اگر وہ زیادہ دیر تک روس سے الجھتا رہا تو امریکہ و برطانیہ کو اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کا موقع مل جائیگا اس لئے وہ روس کی مہم کو ادھورا چھوڑ کر آئندہ موسم بہار میں کسی نئی چراگاہ کی تلاش میں نکلنا چاہتا ہے۔ مسٹر چرچل نے امریکہ میں بیان دیا تھا کہ ۱۹۴۲ء میں ہٹلر یا تو انگلستان پر حملہ کرنا چاہتا ہے یا بحیرۂ روم پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی فکر میں ہے تاکہ برطانیہ کو مغربی افریقہ میں زیادہ دیر تک قدم جمانے کا موقع نہ مل سکے۔ ان دونوں سکیموں میں سے ہٹلر کس کو عملی جامہ پہنائے گا اس کا جواب تو آنے والا وقت ہی دیگا لیکن سپین و فرانس میں نازیوں کی نقل و حرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر اپنی توجہ جبل الطارق اور مراکشی اسپین پر مرتکز کرنا چاہتا ہے تاکہ بحیرہ روم کا مغربی پھاٹک اتحادیوں کے لئے بند ہو سکے اور نازیوں کو اپنے مشرقی عزائم کے خاکہ میں رنگ عمل بھرنے کا موقع مل جائے۔

لیبیا میں انگریزی فوجیں کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہیں اور شمالی مغربی افریقہ اطالوی و جرمن اثرات سے پاک ہو رہا ہے۔

ہندوستان کی حالت میں کوئی قابل ذکر تغیر نہیں ہوا۔ اس ماہ قریباً تمام ممتاز لیڈروں نے ہنگامہ خیز تقریریں کیں۔ گاندھی جی، مسٹر جناح، مسٹر ساورکر، مسٹر راجے سبھی نے بیانات جاری کئے لیکن نتیجہ ا وہی ڈھاک کے تین پات۔ ملکی سیاسیات کی گتھی ابھی تک بدستور اُلجھی ہوئی ہے اور مسٹر ایمری اس گرہ کے پیچوں میں اور اضافہ کر رہے ہیں۔

بھاگلپور میں حکومت نے ہندو مہاسبھا کو جلسہ کرنے کی اجازت نہ دی لیکن ہندو مہاسبھائی نہ جانے کیوں اسی مقام پر اجلاس منعقد کرنے پر مُصر تھے انھوں نے حکومت کے حکم امتناعی کا جواب زہر آلود تقریروں اور ستیہ گرہ سے دیا چنانچہ بہت سے مہاسبھائی لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت کی یہ اصول پسندی لائق تحسین ہے کیونکہ اگر مہاسبھائیوں کو من مانی کارروائی کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو بہت ممکن تھا کہ وہ حکومت کے لئے "مستقل آزار" ثابت ہوتے۔

جنگ ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہی ہے چنانچہ جاپانی بمبار رنگون پر آتش افشانی کر چکے ہیں اور کلکتہ میں اضطراب و تشویش کے آثار پائے جاتے ہیں۔

۲۶ دسمبر ۱۹۴۱ء

فنونِ لطیفہ

فلمی اطلاعات

اَز ناظر ——— فلم بین

معصوم

فضلی برادرز کا اسلامی شاہکار "معصوم" لاہور میں ریلیز ہو چکا ہے، ہندوستان کی صنعت فلم سازی کی تاریخ میں یہ پہلی فلم ہے جو صحیح اسلامی معاشرت کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ ڈائریکٹر حسنین نے جا بجا افسانوی رنگ آمیزی سے کہانی میں جو اُبھار پیدا کیا ہے وہ سزاوارِ صد تحسین و آفرین ہے۔ اداکاری کے لحاظ سے بھی یہ فلم اپنی مثال آپ ہے۔ امجد، مظہر خاں، صابر، رمولا، مہتاب، انیس اور منزل کا پارٹ علی الخصوص دیدنی ہے۔ معصوم کا افسانہ اور مکالمے جناب فضلی کریم بی۔ لٹ۔ آئی۔ سی۔ ایس کے سحر کار قلم کے مرہونِ منت ہیں۔ گانے جناب آرزو لکھنوی نے مرتب فرمائے ہیں۔ یہ فلم پربھات سنما لاہور میں دکھائی جا رہی ہے اور روز افزوں رش لے رہی ہے۔

اُجالا

ڈائریکٹر کے ایم ملتانی "اُجالا" کی تکمیل میں شب و روز مصروف ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ فلم جلد ہی پردہ سیمیں پر پیش کر دی جائیگی اجالا کا موضوع سادہ ہے لیکن اس میں تفریحی عنصر کی فراوانی ہے۔ نسیم اور پرتھوی راج امتیازی پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ نغمہ و موسیقی سے اس فلم کی دلکشی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اُجالا کی عکاسی بھی دیدنی ہے۔ شمالی ہند کے لئے اس فلم کی تقسیم کے حقوق میسرز سکسینہ اینڈ کمپنی نے حاصل کر لئے ہیں

اور اس کی کشش انگیز پبلسٹی میں مصروف ہیں۔

سکندر

منروا کی فلم سکندر ہندوستان کے طول و عرض میں مقبول ہو چکی ہے۔ دسمبر کی سرد راتوں نے اس فلم کی کشش پر کوئی ناگوار اثر نہیں ڈالا۔ کرسمس اور عید قرباں کے ایام میں امید کی جاتی ہے کہ یہ فلم بہت زیادہ رش لیگی۔ سکندر کے بعد منروا سودی لون "پھر ملیں گے" پیش کر رہے ہیں۔

ایک رات

ڈائرکٹر ڈبلیو زیڈ احمد ایک رات کی شوٹنگ میں مصروف ہیں۔ اس فلم میں چند نئے چہرے پیش کر رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ فلم ہر لحاظ سے کامیاب ثابت ہوگی۔ نینا اور پرتھوی راج کا اس فلم میں امتیازی رول ہے۔

پردہ نشین

ہندوستان فلم کارپوریشن کی زیر تکمیل فلم "پردہ نشین" ترتیب و تدوین کے کمرے میں ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اسی ماہ کے اوائل میں ریلیز ہو جائے گی۔ پردہ نشین میں چند نئے چہرے پیش کئے جا رہے ہیں ان میں سے قابل ذکر یہ ہیں۔ حسینہ۔ کنیز۔ شیدا۔ مترا۔ گنیش اور نواز بخش وغیرہ

میری دردبھری کہانی!

ہندوستان کے جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے والے فقیروں اور مہاتماؤں نے وہ کارنامے کر دکھائے ہیں جن کو دیکھ کر آجکل کے سائنسدان اور ڈاکٹر حیران ہیں آجکل کسی ایک بیماری کا علاج جب ڈاکٹر لوگ نہیں کر سکتے تو اسکو لاعلاج قرار دیتے ہیں پرانے زمانے کے فقیر تنگ دھڑنگ جنگلوں میں رہنے والے مردوں کو زندہ کر دینے کی طاقت رکھتے تھے ان کے کرشمے ...

ایک دفعہ تو مردہ کو بھی اٹھا یا جا سکتا ہے گو زمانہ بدل چکا ہے لیکن پھر بھی ہندوستان کا نام روشن کرنے والے سچے فقیر موجود ہیں آپ میری کہانی سنئے جوانی کی غلط کاریوں اور کم فہمی کی بدولت میں صحت کا شکار ہو کر بہت طرح کی بیماریوں میں پھنس کر اپنے ہاتھوں اپنی جوانی برباد کر بیٹھا اور طاقت مردمی سے محروم ہو گیا جریان احتلام اور سرعت انزال وغیرہ نے جسم کو کھوکھلا کر دیا چہرہ زرد ہو گیا آنکھیں اندر کو دھنس گئیں دل دھڑکنا سر چکرانا سستی لاغری وغیرہ سے تنگ آ کر مایوس ہو گیا مشہور مشہور ڈاکٹروں حکیموں اور اشتہاری دواؤں پر صحت کیلئے دھن کو برباد کر کے زندہ لاش ہو بیٹھا میری خوش قسمتی سمجھئے کہ سرینگر کشمیر جانا پڑا انہی دنوں میں ایک عرس تھا میں بھی وہاں چلا گیا وہاں ہر سال ہزاروں فقیر آتے ہیں ایک دن شام کو سیر کرتا کرتا ایک پہاڑی کے کنارے پر جا پہنچا سوئی زیادہ ہو گئی تھی وہاں اچانک جو دیکھا تو ایک درویش پہاڑی سے میری طرف آتے دکھائی دیئے چہرہ پر پورا جلال تھا جب میرے نزدیک آ گئے تو مجھکو سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولے بیٹا کیا سردی زیادہ لگتی ہے پہلے تو میں ڈرا پھر حوصلہ کر کے دھیمی آواز میں کہا جی ہاں مجھ پر ترس کھا کر انہوں نے ایک سبز رنگ کی گولی کھانے کو دی۔ پیارے ناظرین اس خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہتا ہوں کہ ایک منٹ ... گذرا تھا کہ میرا جسم آگ کی طرح گرم ہو گیا اس معجزہ کو دیکھ کر میں نے فقیر کے پاؤں پکڑ لئے اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے انہوں نے مجھ سے پوچھا بیٹا شام کے وقت جنگل میں کیا اور رونے کا سبب؟ میں نے تمام دکھ بھری کہانی سچ سچ کہدی اس سچے فقیر نے مجھے حوصلہ دیا اور مجھکو اپنے ساتھ اپنے مقام رہائش پر جہاں وہ اترے ہوئے تھے لے گئے اور کہا کہ اگر تم سچے دل سے عہد کرو کہ بری باتوں سے بچو گے اور دنیا کی بھلائی کرو گے تب تمہارا بھلا ہو سکتا ہے میں نے ہاتھ جوڑ کر سچے دل سے اقرار کیا اس پر اس سچے فقیر نے مجھکو ایک دوائی کھانے اور ایک مالش کے نسخے لکھوا دیئے اور کہا بیٹا اب تم جاؤ اور اپنے جیسے دکھیوں کا بے فکر ہو کر بھلا کرو ناظرین یقین کریں کہ مجھکو اس فقیر کی اچانک ملاقات سے اس قدر فائدہ ہوا کہ خود بخود میرے دل میں جوش پیدا ہونا شروع ہو گیا میں نے واپس آ کر فقیر کے کہنے کے مطابق دونوں دوائیاں تیار کر کے استعمال کرنا شروع کر دیں جس طرح میرا یقین تھا اس کی پہلی ہی خوراک نے اپنا کرشمہ دکھانا شروع کر دیا آپ یقین جانئے پانچ چھ دن کے بعد میری کایا پلٹ گئی سب تکلیفیں دور ہو کر بجلی کی طرح طاقتور جوش پیدا ہو گیا اور میں اپنے آپ کو ایک قابل فخر مرد خیال کرنے لگا ضبط کرنا دشوار تھا پھر بھی حسب حکم مرشد کے پندرہ دن دوائی جاری رکھی دودھ مکھن گھی خوب ہضم ہونے لگا زیادہ لکھنا خلاف تہذیب ہے گیارہ سال ہو چکے ہیں کسی دوائی کی ضرورت نہیں پڑی خدا کے فضل سے تین تندرست اور خوبصورت نو نہال ہیں آج تک اس دوائی سے ہزاروں دکھیوں کا بھلا ہوا ہے سینکڑوں مرادیں پوری ہو چکی ہیں سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے مگر اس دوائی کا اثر خالی نہیں جاتا اسی دن سے مرشد کے فرمانے کے مطابق اور دنیا کی بھلائی کیلئے اس دوائی کا شہر شہر گھر گھر کر رہا ہوں ہر قسم کی سستی نامردی پیشاب میں شکر آنا جریان احتلام اور رگوں پٹھوں کی کمزوری غرض جسم کے خفیہ روگ جادو کی طرح دور ہو کر جوانی کی سچی طاقت اور جوش پیدا ہوتا ہے دوائی میں کسی قسم کی مضر صحت چیز نہیں ہے مالش سے کسی قسم کا آبلہ یا پھنسی نہیں ہوتی ہر موسم میں کھانے کے لائق ہے جوان کیا بوڑھے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں تندرست جوانی کا لطف لے سکتے ہیں خاص بات یہ ہے کہ اس دوائی کے بعد عمر بھر کسی دوائی کی ضرورت نہیں پڑیگی قیمت پندرہ دن کی تیس خوراک جو کہ صحت کیلئے کافی ہے پانچ روپے علاوہ مالش دو روپے آٹھ آنے چونکہ مجھکو اس کایا پلٹ دوائی نے موت کے منہ سے بچایا تھا اس لئے اپنا ایمان سمجھ کر اس کی اشاعت کر رہا ہوں اور قیمت صرف خرچہ اور لاگت پر رکھی ہے دونوں دوائیاں ایک ساتھ منگوانے پر محصول ڈاک معاف۔ ضروری گذارش۔ شکی مزاج اصحاب میری دوا طلب نہ کریں کیونکہ جو شخص ہر چیز کو بے یقینی کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ موقع پر پتھر سمجھ کر کھو بیٹھتا ہے میں کو اس دوائی سے فائدہ نہ ہو وہ ایمان کو جان کر قیمت واپس منگا لے اور ساتھ ہی آپ کا ایمان بھی ہے کہ اگر اس تحریر سے بڑھ کر نکلے تو اس فقیر کے پیغام کو گھر گھر پہنچا دیں!

کوئی صاحب مجھے کسی اور دوا کے لئے نہ لکھے اور نہ کوئی ضرورت سے پہلے منگائے

شرطیہ علاج اور شرطیہ عذر۔ ہندو کو دھرم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر میری دوائی کے استعمال سے حسب لخواہ فائدہ نہ ہو تو حلفی تحریر بھیجکر قیمت واپس منگوا لیں عدم صحت کی صورت میں کسی کا پیسہ کھانا گناہ سمجھتا ہوں اگر کوئی صاحب اب بھی اس دوا سے فائدہ نہ اٹھائیں تو انکی قسمت ہزاروں تعریفی خطوط اور سرٹیفکیٹ موجود ہیں جن کے لکھنے والے علم صاحبان کے علاوہ ڈاکٹر حکیم اور ویدوں اور ڈاکٹروں حکیموں ویدوں کی رائے ہے کہ یہ جوانی تقوی گولیاں اور روغن مالش لاجواب ہیں۔

ضروری اطلاع۔ یہ یاد رہے کہ میری دوائی صرف نامردی سستی جریان احتلام سرعت کمزوری لاغری اور جریان الرحم اور لیکوریا کے لئے مخصوص ہے۔ یہ امراض خواہ کسی سبب سے ہوں جلق یا کثرت مباشرت یا عادت بد سے سب کے لئے یکساں مفید ہے سوزاک آتشک سے پیدا کی ہوئی کمزوری کے لئے اس کا استعمال کرنا طاقت کا بیمہ کرانا ہے اور یاد رہے کہ نامردی کے سوا میری دوائی ہر بیماری کے لئے اکسیر ہے۔

ملنے کا پتہ:- صوفی ایم اے خاں سباتھو شملہ



موتیوں کا درخت
جرجی زیدان



روپ متی
اور
باز بہادر
قیمت ایک روپیہ


1942
فروری
قیمت فی پرچہ
پانچ آنے

موتیوں کا درخت

علامہ جرجی زیدان کے ناولوں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ تمام مشرقی و مغربی زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے لیکن شجرۃ الدر علامہ صاحب کی تمام تصانیف کا سرتاج ہے جس کا اردو ترجمہ موتیوں کا درخت کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

موتیوں کا درخت علامہ صاحب کے شہرۂ آفاق ناول شجرۃ الدر کا سلیس بامحاورہ ترجمہ ہے۔ شجرۃ الدر مصر کی ایک ملکہ کا نام ہے جس کی رومانی و سیاسی زندگی تاریخ کا ایک دلکش باب ہے۔ فاضل مصنف نے تاریخ کو رنگین پیرائے میں پیش کیا ہے۔ قیمت ۱۲

عالمگیر بک ڈپو بازار سید مٹھا لاہور



تاج شاہی حسن کے قدموں میں

شاہان یورپ کی عظمت اور شان محتاج تشریح نہیں لیکن جب عشق انہیں کشاں کشاں کوچۂ محبت میں لیجاتا ہے تو تاج شاہی حسن کے قدموں میں جگہ ڈھونڈتا ہے۔ یہ افسانہ نہیں، کہانی نہیں، حکایت نہیں بلکہ ایک زندہ تاریخی حقیقت ہے جو تاج شاہی حسن کے قدموں میں کے مطالعہ سے معلوم ہوگی۔ اس کتاب میں روس، آسٹریا، سویڈن، ہنگری، ہسپانیہ، انگلستان اور دوسرے یورپی بادشاہوں کی محبت کے سچے افسانے درج ہیں۔ قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے

ملنے کا پتہ عالمگیر بک ڈپو بازار سید مٹھا لاہور



عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی و ادبی معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے!

جلد ۳۶ — فہرست مندرجات ماہ فروری ۱۹۴۲ء — نمبر ۲

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

ملاحظات

عالمگیر کے تاریخ نمبر کی ترتیب و تدوین اعلیٰ پیمانہ پر شروع ہے۔ بیشتر مضامین نظم و نثر موصول ہو چکے ہیں جن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ نمبر اردو ادب میں ہر لحاظ سے ایک نیا ریکارڈ قائم کرے گا اور اس میں جو تاریخی و علمی جواہر ریزے پیش کئے جا رہے ہیں وہ علم التواریخ میں بیش بہا اضافہ کریں گے۔ کاغذ کی حوصلہ فرسا گرانی کے باوجود "تاریخ نمبر" کی ظاہری شکل و شباہت اور "گٹ اپ" کو بھی باصرہ نواز بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ آئندہ اشاعت میں تاریخ نمبر کے مندرجات کی ایک مختصر فہرست ہدیہ قارئین کی جائیگی۔ جس سے اس اشاعت خصوصی کی ہنگامہ پرور دلچسپیوں کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے گا۔

اشاعت زیر نظر کا آغاز حضرت مولنا ظفر علی خاں کے حقائق و معارف سے ہوتا ہے۔ اس مضمون میں آپ نے حضرت عمر بن الخطابؓ اور جبلہ کے مشہور واقعہ کا جائزہ علم و تحقیق کی روشنی میں لیا ہے اور ان غلط فہمیوں کو بدرجہ اولیٰ رفع کیا ہے جن میں بعض مورخ مبتلا نظر آتے ہیں۔ جناب مولوی نور احمد خاں اپنے محققانہ تاریخی مقالات کے باعث حلقہ عالمگیر میں کافی مقبول ہو چکے ہیں۔ اس مرتبہ آپ نے فتح پور سیکری کے شاہی محلات پر معلومات افزا روشنی ڈالی ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہر شخص آپ کی غائر نظری، وسعت مطالعہ اور مورخانہ قابلیت کی داد دے گا۔ جناب حافظ رشید احمد صاحب ارشد نے اردو کے صاحب طرز غزل گو نظیر اکبر آبادی کے محاسن شعری پر ایک مبصرانہ نظر ڈالی ہے اور ثابت کیا ہے کہ چونکہ نظیر کے کلام میں ڈرامائی عنصر غالب ہے اس لئے اگر انہیں اردو کا شکسپیر قرار دیا جائے تو غیر صحیح نہیں ہوگا۔ جناب صائب فتحپوری نے شہنشاہ عالمگیر اورنگزیب کے اصلاحی اشعار پیش کر کے بتایا ہے کہ ہندوستان کا یہ جلیل القدر بادشاہ دور وسطیٰ کا مصلح اعظم تھا۔ جناب امداد علی مضطر نے نابغہ ذبیانی کے حالات پیش کر کے اردو داں طبقہ کو عرب کے ہومر سے روشناس کیا ہے۔

تاریخ نمبر اور اشاعت زیر نظر

از ادارہ

اس اشاعت کے افسانے اور ڈرامے اردو ادب میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ جناب عبدالرحمن صدیقی نے سر رابندرناتھ ٹیگور کے ایک فلسفیانہ افسانے کا ترجمہ "تارک دنیا" کے عنوان سے کیا ہے یہ افسانہ شاعر اعظم نے اپنے مخصوص طرز نگارش میں لکھا تھا اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ایک روحانیت پسند شخص دنیا کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جناب شہاب سلمانی نے پرسیول وائلڈ کا رومان پرور افسانہ پیش کیا ہے۔ "پگلی" جناب قمرالدین رامنگر کا ایک نفسیاتی افسانہ ہے جس میں ہندو معاشرت کے بعض پہلوؤں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ "کیا میں زندہ ہوں؟" گالزورذی کا ایک طنز آمیز افسانہ ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام پر چوٹ کی گئی ہے۔ "ستم رسیدہ" فارسی کے ایک دلچسپ افسانے کا ترجمہ ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ فارسی فن افسانہ نویسی ترقی و عروج کی کس منزل پر پہنچ چکا ہے؟

افسانوں اور مضامین کے علاوہ تقریباً ڈیڑھ درجن نظمیں اور غزلیں بھی شریک اشاعت ہیں جن کی وجد آفریں کیفیات کا اندازہ قارئین خود ہی بہتر طریقے سے لگا سکیں گے۔

اشاعت زیر نظر کے [illegible]

صفحہ ۶ و ۷ پر [illegible] ملاحظہ فرمائیے [illegible]

[illegible]

منیجر

اخبار و افکار

ہندی، اُردو اور ہندوستانی

از:- ادارہ

پنڈت سندرلال ان منصف مزاج حضرات میں سے ہیں جو اتحاد زبان ہی کو فرقہ وار اتحاد کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ پچھلے دنوں آپ نے "ہندی، اُردو یا ہندوستانی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں تاریخی مثالیں دے کر متحدہ و مشترکہ زبان کی اہمیت ظاہر کی۔ ذیل میں اس مضمون کے بعض حصے درج کئے جاتے ہیں۔ ہم پنڈت سندرلال جی کی اس رائے سے تو متفق ہیں کہ ہندی اور اردو کی بحث سیاسی نوعیت رکھتی ہے لیکن ہمیں یہ ماننے میں تامل ہے کہ اس فرقہ وار بحث کو ختم کرنے کیلئے ایک نئی زبان وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ جب پنڈت جی نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اُردو ایک ارتقائی زبان ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں نے ہمیشہ مشترکہ طور پر استعمال کی ہے تو اب اس کی بجائے "ہندوستانی" کو معرض ظہور میں لا کر قدرتی رَو کے خلاف چلنے کے کیا معنی؟

پنڈت جی لکھتے ہیں: "جہاں تک ہندی، ہندستانی اور اُردو ناموں کا تعلق ہے اس دیس کی اس زبان کے لئے جسے بعد میں کھڑی بولی بھی کہا جانے لگا۔ ہندی نام ہندستانی نام سے تین سو برس زیادہ پرانا اور اُردو نام سے کم از کم چار سو برس زیادہ پرانا ہے۔ نام تینوں مسلمانوں کے آنے کے بعد کے اور مسلمانوں ہی کے رکھے ہوئے ہیں۔ تیرہویں صدی کے آخر میں فخر الدین مبارک غزنوی نے ایک "فارسی ہندی" ڈکشنری تیار کی اور تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں کے شروع میں امیر خسرو نے اپنی زبان کو "ہندوی" اور "ہندی" کہا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت سے اس نام کا آج تک برابر استعمال ہوتا رہا ہے۔ سولھویں صدی سے اس زبان کے لئے "ہندستانی" نام کا استعمال بھی ہونا شروع ہوا اور سولھویں سے انیسویں صدی تک کی بہت سی پرانی کتابوں میں ہندستانی نام کا برابر استعمال ہوتا رہا ہے۔ اسی زبان کے لئے جسے پہلے ہندستانی کہا جاتا تھا سترھویں صدی میں پہلے پہل "اُردو" نام استعمال ہونا شروع ہوا۔ اٹھارھویں صدی تک یہ نام خاصا پھیل گیا تھا۔ میر نے ۱۷۵۲ء میں اپنی زبان کو "اردوئے معلیٰ" لکھا ہے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدیوں میں "اُردو" نام خوب استعمال ہوتا رہا ہے۔

مسلمانوں کے زمانۂ حکمرانی میں دھیرے دھیرے یہی کھڑی بولی ہندی، جس میں فارسی، عربی اور ترکی کے شبد رتن مل گئے تھے ہندوستان بھر میں خوب پھیلی۔ چودھویں اور اٹھارہویں صدی کے بیچ شروع میں دکھن اور اس کے بعد اُتر بھارت (شمالی ہند) میں اس میں اعلیٰ پایہ کی نثر اور نظم لکھی جانے لگی۔ سترھویں صدی سے پہلے کے سب ہندو مسلمان انشا پرداز یہاں تک کہ دکنی کے شاعر بھی اسے ہندی یا ہندستانی کہتے تھے۔ سترھویں صدی کے بعد سے اُسے اُردو بھی کہا جانے لگا۔ چیز وہی تھی۔ برج بھاشا اور اودھی صرف نظم کے ادب کے لئے استعمال ہوتی رہی اور یہ کھڑی بولی ہندی، اُردو، ہندستانی نظم و نثر دونوں طرح کے ادب میں ترقی کرتی گئی۔ یہ ایک ملی جلی گنگا تھی جس میں ہندو اور مسلمان کا کہیں کوئی فرق نہ تھا اور جو دونوں کے میل اور پریم سے بنی تھی۔ صوبوں کی زبانیں اسی طرح الگ الگ تھیں جس طرح اب ہیں لیکن بین صوبائی سب کاروبار کے لئے یہی ایک زبان یا لنگوا فرینکا رہی اور یہی زیادہ تر ہندستانی سماج کی شائستہ بول چال کی زبان تھی۔ انیسویں صدی کے شروع تک یہی حالت تھی۔

یہ بالکل سچی بات ہے کہ انیسویں صدی کے شروع تک جبکہ برج بھاشا پریم اور بھگتی کی نظموں سے بھری تھی اور اودھی رام چرت مانس (رامائن) جیسے رتن پیدا کر چکی تھی گنگا جمنا کے دوآبے کے لوگوں کی عام زبان یعنی نثر کی زبان جو اس وقت سارے ہندستان کی بین صوبائی زبان بھی تھی صرف وہ کھڑی بولی تھی جسے اس وقت ہندی، ہندستانی اور اُردو تینوں ناموں سے پکارا جاتا تھا اور جس میں عربی، فارسی اور ترکی کے سیکڑوں لفظ بلا تکلف بولے اور لکھے جاتے تھے اور اس سب معاملے میں ملک میں کہیں بھی ہندو مسلمانوں میں کسی طرح کا کوئی فرق نہ تھا کم سے کم جہاں تک زبان اور ادب کا تعلق ہے۔ ملک کی ساری زندگی ایک طاقتور محبت بھری اور ملی جلی دھارا میں بہ رہی ہے ہندی اور اُردو اس وقت کوئی دو زبانیں نہ تھیں۔ اس کے بعد ہندی اور اُردو کے دو دھاروں میں بٹنے کا وقت آتا ہے۔

مجھے اس علیحدگی میں ہندوستان کے ٹکڑے ہونے کی خطرناک

(باقی بر صفحہ ۱۴)

حقائق و معارف

مسٹر سیدر اپنی کتاب "خفایائے مصر" میں اسلام کی مساوات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور جبلہ کے مشہور واقعہ پر اس طرح قلم اٹھاتے ہیں: "عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک واقعہ پیش آیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں حقوق انسانیت کے لحاظ سے کامل اور قطعی مساوات کا اصول کس حد تک راسخ ہو چکا ہے۔ بنو غسان کا بادشاہ جبلہ حلقہ بگوش اسلام ہو کر بڑے طمطراق اور تزک و احتشام کے ساتھ حج کرنے گیا۔ دوران طواف میں ایک غریب زایر کا لباس اتفاقیہ طور پر بادشاہ کی گردن سے الجھ گیا جس نے پلٹ کر عالم غیظ و غضب میں اس غریب کے منہ پر زور سے طمانچہ رسید کیا کہ اس کے کئی دانت جھڑ گئے مظلوم داد خواہی کے لئے دربار فاروقی میں حاضر ہوا وہاں سے جبلہ کی طلبی ہوئی جب جبلہ حاضر دربار ہوا اور فاروق اعظم نے پوچھا تم نے کیوں اپنے ایک مسلم بھائی کے ساتھ ایسی بدسلوکی روا رکھی تو اس نے جواب دیا کہ یہ شخص میری اہانت کا مرتکب ہوا تھا اور اگر حرم کا تقدس مانع نہ آتا تو میں اس کو جان سے مار ڈالتا۔ حضرت فاروق اعظم نے یہ جواب سن کر ارشاد فرمایا کہ یک نہ شد دو شد، چوری اور اس پر سینہ زوری۔ اس ستم رسیدہ سے یا تو معافی مانگو ورنہ قانون کی سخت سے سخت تعزیر کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جبلہ اپنے آپ کو اس طرح کانٹوں میں گھسیٹے جاتے دیکھ کر کہنے لگا کہ میں اس سے کس طرح معافی مانگ سکتا ہوں۔ میں بادشاہ ہوں اور یہ تین کوڑی کی حیثیت کا ایک معمولی آدمی ہے۔ حضرت عمر نے ڈانٹ کر کہا بادشاہ ہونے سے کیا تو دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا ہے؟ تم دونوں مسلمان ہو اور اس لئے قانون کی نظروں میں برابر ہو۔ جبلہ جلالی فاروقی کی تاب تو نہ لا سکا لیکن چونکہ جبلت سے مجبور تھا اس لئے راتوں رات مکہ سے یہ کہتا ہوا نکل گیا کہ میں ایسے اسلام سے باز آیا جو بادشاہوں اور گداؤں میں امتیاز کرنے کا سلیقہ نہیں رکھتا اور جھٹ اصطباغ لے کر مسیحی ہو گیا۔"

تمام روایت یہی ہے اور علامہ شبلی مغفور نے بھی اپنی کتاب

حضرت عمرؓ اور جبلہ

از [illegible] علی خاں مدظلہ العالی

"الفاروق" میں اس واقعہ کو اسی طرح لکھا ہے۔ چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"جبلہ بن الایہم غسانی شام کا مشہور رئیس بلکہ بادشاہ تھا اور مسلمان ہو گیا تھا۔ کعبہ کے طواف میں اس کی چادر کا گوشہ ایک شخص کے پاؤں کے نیچے آ گیا۔ جبلہ نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ کھینچ مارا اس نے بھی برابر کا جواب دیا جبلہ غصے سے بیتاب ہو گیا اور حضرت عمر کے پاس آیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی شکایت سن کر کہا تم نے جو کچھ کیا اس کی سزا پائی۔ اس کو سخت حیرت ہوئی اور کہا کہ ہم اس رتبے کے لوگ ہیں کہ کوئی شخص ہمارے ساتھ گستاخی سے پیش آئے تو قتل کا مستحق ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا جاہلیت میں ایسا ہی تھا لیکن اسلام نے پست و بلند کو ایک کر دیا۔ اس نے کہا اگر اسلام ایسا مذہب ہے جس میں شریف و رذیل کی کچھ تمیز نہیں تو میں اسلام سے باز آتا ہوں۔ غرض وہ چھپ کر قسطنطنیہ چلا گیا لیکن حضرت عمر نے اس کی خاطر سے قانون انصاف کو بدلنا نہیں چاہا۔"

لیکن علامہ قتیبہ نے اس روایت کو دوسری ہی شکل میں بیان کیا ہے اس دوسری روایت کے بموجب جبلہ کے ارتداد کا واقعہ مکہ معظمہ میں نہیں بلکہ دمشق میں پیش آیا تھا اور اسلام کی مساوات نے اسے حضور فاروق اعظم کے دربار میں نہیں بلکہ ابو عبیدہ جراح کے مواجہ میں منفعل کیا تھا ابن قتیبہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

"جبلہ ابن الایہم غسانیوں کا آخری بادشاہ تھا اس کا قد نہایت طویل تھا کسی طرح بارہ بالشت سے کم نہ ہوگا جب گھوڑے پر سوار ہوتا تھا تو اس کے پاؤں زمین کو لگ جاتے تھے۔ اس نے اسلام کا زمانہ پایا اور عمر ابن الخطابؓ کے عہد خلافت میں حلقہ بگوش اسلام ہوا لیکن بعد میں مسیحی ہو گیا اور دولت بازنطین میں جا کر سکونت اختیار کر لی اس کے اسلام کو چھوڑ کر مسیحیت

اختیار کر لینے کا واقعہ حسب ذیل ہے۔ ایک دن وہ گھوڑے پر سوار بازار دمشق میں سے گزر رہا تھا کہ تماشائیوں میں سے ایک کا پاؤں اس کے گھوڑے کے سم کے تلے آگیا [illegible] شخص نے اچک کر جبلہ کے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ غسانیوں نے اس شخص کو گرفتار کر لیا اور کشاں کشاں [illegible] عبیدہ جراح کے پاس لے گئے اور استغاثہ کیا کہ اس [illegible] نے ہمارے رئیس کو مارا ہے۔ جبلہ بھی موجود تھا [illegible] عبیدہ نے جب پوچھا کہ تمہارے دعویٰ کا کیا ثبوت [illegible] جبلہ نے اس سے کہا کہ آپ ثبوت کس مقصد [illegible] طلب کرتے ہیں! ابو عبیدہ نے جواب دیا کہ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ مدعی علیہ نے تمہیں طمانچہ مارا ہے تو تم کو بھی اس کے بدلے میں اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارنے کی اجازت دی جائیگی۔ جبلہ یہ سن کر حیران رہ گیا اور کہنے لگا کہ یہ شخص مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی پاداش میں قتل نہ کیا جائیگا؟ اور جب ابو عبیدہ نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا تو بدیں خیال کہ اس کے مرتبہ کا کچھ تو لحاظ کیا جائیگا پوچھنے لگا کہ کیا اس کا داہنا ہاتھ بھی نہ کاٹا جائے گا؟ ابو عبیدہ نے سختی سے کہا کہ ہرگز نہیں۔ خدا نے صرف برابر کا بدلہ لینے کی اجازت دی ہے۔ ایک چانٹے کا جواب ایک ہی چانٹا ہو سکتا ہے۔ جبلہ یہ سن کر رخصت ہو گیا اور رومن علاقہ میں جا کر عیسائیت اختیار کر لی، اور باقی عمر وہیں گزاری۔"

اگرچہ نفس واقعہ پر روایات کے اس اختلاف سے اثر نہیں پڑتا لیکن جو جزئی تفصیل ابن قتیبہ نے درج کی ہے وہ اقرب الی الوقوع معلوم ہوتی ہے اور قرائن سے اس کی مزید تائید معلوم ہوتی ہے اول تو جبلہ کی مجال نہ تھی کہ حضرت فاروق اعظم کے سامنے علانیہ اسلام سے بیزاری ظاہر کرتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی بعید از قیاس ہے کہ حضرت فاروق اعظم کا عہد خلافت ہو اور جبلہ کی حیثیت کا ایک شخص اسلام سے روگرداں ہو کر اور مکہ سے روپوش ہو کر بآسانی قسطنطنیہ پہنچ جائے اس کے مقابلہ میں ابن قتیبہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جبلہ نے ابو عبیدہ جراح کے سامنے بھی یہ شان تبختر نہ دکھائی تھی کہ کھلم کھلا اسلام سے اعراض کرے بلکہ جب اس نے دیکھا کہ دنیائے اسلام اس کی مفاخرت کے لئے تنگ ہے اور یہاں بمقابلہ جمہور اس کی انانیت برقرار نہیں رہ سکتی تو عزم ارتداد کو دل میں چھپائے ہوئے چپکے سے رومی سلطنت کی حدود کی طرف روانہ ہو گیا اور وہاں پہنچ کر مسیحیت اختیار کر لی اور چونکہ دمشق سے کہ مکہ کی بہ نسبت یہ حدود بہت زیادہ قریب تھیں اس نے بآسانی منزل مقصود کو پہنچ گیا۔

دولت بازنطین کے ساتھ جبلہ بن الایہم کے مذہبی اور سیاسی تعلقات بہت پرانے تھے۔ مسلمانوں نے جب شام پر چڑھائی کی اور ہرقلس قیصر روم کی فوجوں کے ساتھ معرکہ آرائیاں ہوئیں تو جبلہ جو ۶۳۲ء میں تخت حکومت پر بیٹھا تھا مدتوں ہرقلس کے حلیف ہونے کی حیثیت سے اسلامی لشکر کا مقابلہ کرتا رہا۔ کتاب الاغانی میں حسان ابن ثابت کی زبانی جبلہ کے دربار کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی گئی ہے۔

"میں نے غسانی دربار میں دس خوش جمال گائنیں دیکھیں جن میں سے پانچ تو یونانی کنیزیں تھیں جو بانسریوں کی تان پر یونانی نغمے گاتی تھیں اور پانچ ایاس ابن قبیصہ فرمانروائے حیرہ کی بھیجی ہوئی نازنینیں تھیں جنھیں فرمانروائے موصوف نے جبلہ بن الایہم کے حضور میں بطور نذر گذرانا تھا۔ یہ بابلی گیت گاتی تھیں۔ عرب گانے والیاں مکہ اور دوسرے بلاد عربیہ سے آکر اس کے دربار کی زینت بنتی تھیں جبلہ یاسمین دیاسمن اور بھانت بھانت کے مہکتے ہوئے پھولوں کی سیج پر بیٹھ کر شراب پیتا تھا اور اس کے چاروں طرف سونے اور چاندی کے باسن عنبر و مشک سے بھرے ہوئے رہتے۔ جاڑوں میں عود کا ایندھن اس کے ایوانوں اور کوشکوں کو گرم رکھتا تھا۔ گرمیوں میں برف اسے خنکی پہنچاتی تھی۔ خود وہ اور اس کے امرائے دربار گرمیوں میں ہلکا لباس پہنتے تھے جس سے آرائش نہیں بلکہ آسائش مقصود ہوتی تھی، جاڑوں میں وہ فنک یعنی افریقی گلہری کے سمور کے پوستین پہنتے تھے۔ جبلہ بہت ہی فیاض و فراخ حوصلہ تھا۔ بخدا کوئی تقریب مجھے ایسی یاد نہیں پڑتی کہ میں اس کی صحبت میں شریک ہوا ہوں اور اس نے اپنا خلعت اتار کر مجھے نہ

[illegible] تھا اور اپنے مقربین میں سے اکثر کے ساتھ بھی وہ ایسا ہی سلوک کرتا تھا اسکی آنکھوں میں مروت بھی بہت تھی لوگوں کی شوخ چشمی پر اغماض کا پردہ ڈالنا اس کی عادت میں داخل تھا قدرت نے اپنی رعنائیوں میں سے اس کی شکل وصورت کو بہت کچھ حصہ دیا تھا اور اس کی گفتگو بھی خوش آئند ہوتی تھی میں نے کبھی اسے کوئی تلخ بات کہتے یا کرتے نہیں پایا۔"

لیکن یہ تصویر حسان ابن ثابت نے دور جاہلیت میں کھینچی ہے دمشق میں جو واقعہ پیش آیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جبلہ بن الایہم سے اخلاق کے کسی پاکیزہ تر معیار کا متوقع تھا اور اس توقع کا جو حشر ہوا وہ ظاہر ہے۔

(اخبار و افکار بقیہ صفحہ ۱۱)

علامتیں دکھائی دیتی ہیں۔ نہ زبان سے بڑھ کر دنیا میں ملانے والی کوئی چیز ہے اور نہ زبان کی علیحدگی سے بڑھ کر پھوٹ ڈالنے والی، میں چاہتا ہوں کہ میرا دیس اس خوفناک مصیبت سے بچے۔ میری دلی تمنا ہے کہ ہم پھر سے ہندی اور اردو دونوں میں ایک ہی مادری زبان دیکھنے اور دونوں کو پھر سے ملا کر ایک کرنے کی کوشش کریں، ہم ایک تھے۔ ہم نے بہت حد تک اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی ماری ہم دو ہو گئے۔ ہمیں پھر ایک ہونا ہے میری رائے میں اسی میں ہندو مسلمان دونوں کی اور اس دیس کی اصلی بھلائی ہے۔

میں نہ فارسی عربی بھری اردو کو اس دیس کی قومی زبان بنانا چاہتا ہوں اور نہ سنسکرت بھری ہندی کو۔ میری رائے صاف ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اپنی اس مہلک تنگدلی کو دور کرنا ہوگا کہ کبھی مضمون میں "درشٹی" کی جگہ "نظر" آئی اور ہماری بھوں چڑھی۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس میں بربادی کی صورت ہے۔ اصلی حل یہ ہے کہ اردو والوں اور ہندی والوں دونوں کو ساتھ بیٹھ کر اس ہندستانی زبان کو تیار کرنا ہے جو سچ مچ سب ہندستانیوں کی قومی زبان بن سکتی ہے۔

مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ جو زبان اس طرح مل کر تیار ہوگی وہ الگ الگ ہندی اور اردو کی بہ نسبت کہیں زیادہ پیاری کہیں زیادہ سلیس اور عام فہم اور لفظوں اور محاوروں سے کہیں زیادہ مالا مال ہوگی۔"

تحقیق و تصحیح

لفظِ اُردو کی تاریخ

از۔ جناب پیر غلام دستگیر نامی

ڈاکٹر محمد باقر پروفیسر اورینٹل کالج لاہور جب پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے لندن تشریف لے گئے تو انھوں نے اپنے استاد ڈاکٹر بیلی (Bailey T. Grahame) ہیڈ آف دی انڈیا اینڈ برما ڈیپارٹمنٹ آف لندن یونیورسٹی (یعنی لندن یونیورسٹی کے اس محکمے کے افسرِ اعلیٰ جہاں ہندوستانی اور برمی زبانیں سکھائی جاتی ہیں) کا سنہ ۱۹۳۰ء کا لکھا ہوا ایک مضمون مطالعہ کیا جس میں ڈاکٹر بیلی نے قرار دیا ہوا تھا کہ مسٹر گل کرائیسٹ (Gilchrist) وہ پہلی شخصیت ہے جس نے ۱۷۹۶ء میں لفظ "اُردو" خاص زبان کے معنوں میں استعمال کیا ڈاکٹر باقر صاحب، حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اُردو" میں پڑھ چکے تھے کہ پیر مراد شاہ صاحب لاہوری متوفی ۱۷۰۲ء کو اس بارے میں تقدم حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے استاد کی توجہ اس طرف مبذول فرمائی۔ چنانچہ ڈاکٹر بیلی صاحب نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ اپریل سنہ ۱۹۳۹ء کے صفحہ ۲۶۴ و ۲۶۵ میں عنوان بالا کے تحت حسب ذیل مضمون شائع کیا۔

"میں نے سنہ ۱۹۳۰ء میں اس رسالہ کے صفحہ ۳۹۳ پر ذکر کیا تھا کہ گل کرائیسٹ ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے ۱۷۹۶ء میں لفظ اردو کو زبان کے معنوں میں استعمال کیا۔ اس وقت مجھے اور کوئی مثال نہیں ملی تھی جس سے یہ ثابت ہو سکتا کہ اس سے پہلے بھی یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہو چکا ہے حال ہی میں میرے پی۔ ایچ۔ ڈی کے متعلموں میں سے ایک نوجوان ملک محمد باقر نے میری توجہ دو نوشتوں کی طرف مبذول کی ہے جو ۱۷۹۶ء سے پہلے کے نوشتے ہیں ان میں لفظ اُردو زبان کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے ایک تو تذکرہ ہندی ہے جو شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی تصنیف ہے۔ جس میں لکھا ہے۔

"روزے در شاہجہان آباد بخانہ لطف علی خاں نامی مشاعرہ بود غزل طرحی میر صاحب کہ ردیفش بعد قافیہ حرف اور بمعنی طرف مقرر داشت، ازیں جہت بعضے از فصحا و اخلاف اُردو شمردہ پیروش نکردند"

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ گل کرائیسٹ سے دو سال پہلے یعنی ۱۷۹۴ء میں لفظ اُردو زبان کے معنی میں مصحفی نے استعمال کیا۔ مگر محمد باقر صاحب اس سے بھی وقیع دو شعر پیش کرتے ہیں جو گل کرائیسٹ سے چودہ سال (آٹھ سال۔ نامی) پیشتر کے یعنی سنہ ۱۷۸۲ء کے (۱۷۸۸ء کے نامی) تحریر کردہ ہیں اور وہ یہ ہیں ؎

بجائے تحفۂ یاران آں سو	گہر ہا آدم از بازارِ اُردو
وما اُردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے	کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے

یہ شعر نامہ مراد سے ماخوذ ہیں۔ یہ ایک منظوم خط ہے جو مراد شاہ بن کرم شاہ نے لکھا تھا۔ مراد شاہ اٹھارویں صدی میں ایک صوفی بزرگ ہوئے ہیں یہ خط پندرہ سال ہوئے پنجاب میں طبع ہوا تھا جو مراد شاہ کا وطنی صوبہ ہے یہ خط ناظم کے پوتے یا پوتے کے بیٹے (ایک بھائی کی پوتی کے اور دوسرے بھائی کے نواسے کے بیٹے) غلام دستگیر نامی نے شائع کیا تھا۔"

مراد شاہ پنجاب کی بدامنی کے زمانہ میں اپنے نانا نور الحسین عقیلی ہاشمی کے پاس لکھنو تشریف لے گئے وہاں سے سات سال بعد عزیزان پنجاب کے نام سنہ ۱۱۹۸ھ میں منظوم خط اُردو میں لکھا دو شعر اوپر درج ہو چکے ہیں اسی قسم کے چند اور شعر جو اُردو کی قبولیت کے باب میں ہیں بعض فارسی تمہیدی اشعار سمیت درج ذیل کئے جاتے ہیں ؎

صبا اے مشفقِ حالِ غریباں	تسلی بخش سوزِ عندلیباں
ز فیضِ تست آرائشِ گلاں را	کہ تسکین است جانِ بلبلاں را
گذر داری بہر ملک و ولایت	خبر داری ز ہر رمز و حکایت
مرادِ من ازیں اقوال دریاب	کہ دور افتادہ ام از ملکِ پنجاب
دلِ ما در ہوائے ملکِ پنجاب	مثالِ ماہی بے آب بیتاب
پیامِ من ز روئے مہربانی	میانِ ملکِ پنجاب اَر رسانی
برائے تحفۂ یاران آں سو	گہر ہا آرم از بازارِ اُردو
کرا بے وسعت میں اسکی سب سخنداں	سمندِ طبع کو کرتے ہیں جولاں
لطافت یہ نکالی ہے اسی میں	کہ فرماتے نہیں کچھ فارسی میں
اسی کا شہرہ اب ہو جائے سب تک	یہاں سے تا بہ ایراں بل عرب تک
پہ فہرست ہے اب اس مضمون پر کی	نہ کوئی فارسی پوچھے نہ ترکی

نغماتِ جوانی

کچھ ان سے آج کہنا ہے زبانِ بے زبانی میں

از جناب اعجاز صدیقی اکبر آبادی

لبوں پر مسکراہٹ خونِ اشکوں کی روانی میں
ثبوتِ زندگی یوں دے رہا ہوں زندگانی میں

ہو کوئی طعنہ زن انجام پر کیوں سرگرانی میں
نگاہیں چوک ہی جاتی ہیں آغازِ جوانی میں

سکوں کی بھیک وہ بھی حشر زارِ زندگانی میں
ارے کیوں کر رہا ہے تو اضافے سرگرانی میں

شریک اے سازِ غم ہو میرے اشکوں کی روانی میں
کچھ ان سے آج کہنا ہے زبانِ بے زبانی میں

یقیناً حاصلِ عشرت ہی دورِ زندگانی میں
وہ آنسو جذبِ دامن ہو گیا جو شادمانی میں

تڑپ جائے نہ کیوں ہر دل نکل آئیں نہ کیوں آنسو
ہے شامل سوز و سازِ عشق نغماتِ جوانی میں

کسی میں جرأتیں پیدا نہ ہونگی ربِ ارنی کی
حدیثِ طور ہی جب تک صدائے لن ترانی میں

ہوئی خاموش شمعِ بزم پروانوں کو نیند آئی
یہ بے ربطی یہ بے کیفی محبت کی کہانی میں

بہکنا، لڑکھڑانا، جھومنا مخمور سا رہنا
کوئی دیکھے مذاقِ بیخودی عہدِ جوانی میں

سوادِ طور سے اور مطلعِ تخریبِ انساں سے
نئی صبحیں درخشاں ہو رہی ہیں زندگانی میں

لگا اک ضربِ انفاسِ خودی کی اور رہا ہو جا
غلامِ زندگی کب تک حدودِ زندگانی میں

جب اپنے دل کی دھڑکن آپ ہی محسوس ہوتی ہے
اک ایسا وقت بھی آتا ہے لمحاتِ جوانی میں

بہت خوش ہوں میں اے اعجاز اس کا مرتکب ہو کر
محبت ہے اگر شامل گناہِ زندگانی میں

ٹیگور کا ایک دلگداز افسانہ

...ک دُنیا

مترجمہ:- جناب عبدالرحمٰن صدیقی (جہلمی)

منظر (۱)

سنیاسی۔ (غار سے باہر) شب و روز اور ماہ و سال کی تقسیم میرے لئے نہیں ہے۔ وقت کا چشمہ جس کی موجوں پر دنیا خس و خاشاک کی طرح رقص کرتی ہے۔ میرے لئے خشک ہو چکا ہے اپنے وجود کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا میں اس غار میں تنہا ہوں ۔۔۔ اک لازوال رات خاموش ہے ۔۔۔ ایک کوہستانی جھیل کی طرح جو اپنے ہی عمق سے خوفزدہ رہتی ہے۔ تنگافوں میں پانی ابلتا اور بہتا ہے۔ نالابوں میں بوڑھے مینڈک تیر رہے ہیں۔ میں بیٹھا فنا کا افسوں پڑھتا ہوں۔ میرے لئے دنیا کی حدیں آہستہ آہستہ تنگ ہوتی جا رہی ہیں ۔۔۔ ستارے آگ کی چنگاریوں کی طرح وقت کی حدود سے غائب ہو چکے ہیں میری مسرت تو وہی ہے جو بھگوان شیو کو ایک طویل خواب سے بیدار ہو کر اپنے آپ کو کامل بربادی کے بعد تنہا پانے سے حاصل ہوتی ہے میں آزاد ہوں اور مطلق خلوت گزیں۔ اے قدرت! جب میں تیرا غلام تھا تو نے مجھے اپنے دل کے خلاف بغاوت پہ آمادہ کر دیا اور اسے اپنی ہی کائنات میں خودکشی کی ہولناک جنگ میں مبتلا رکھا۔ میں اپنے ہی سائے کے تعاقب میں یہاں وہاں پاگلوں کی طرح بھاگتا پھرتا تھا۔ تو (قدرت) اپنے لطف و کرم کی ڈوریوں سے مجھے جہانِ آسودگی کی طرف ہانکتی تھی لیکن میرا نفس جو تیرا دام ہے مجھے ہمیشہ بے انتہا قحط کے مقامات پر لے گیا جہاں کھانا خاک میں اور پانی بخارات میں تبدیل ہو گیا جب میری دنیا اشکوں اور خاک سے اٹ گئی تو اے بے پایاں ہستی! اے بیشمار روپ بھرنے والی دیوی! (قدرت) میں نے قسم کھائی کہ تجھ سے انتقام لونگا اس لئے ہم نے تاریکی میں پناہ لی اور پر فریب روشنی سے ایک عرصہ تک جنگ آزما رہا حتیٰ کہ اس کے تمام ہتھیار ٹوٹ گئے۔ اور وہ مغلوب ہو کر میرے قدموں میں گر پڑی۔ اب جبکہ میں خوف و خواہشات سے بالکل آزاد ہوں، میری عقل نہایت صاف اور درخشندہ ہے، مجھے فریبوں کی مملکت کے عین وسط میں بے حس و حرکت بیٹھنے دے

—— (۲) ——

سنیاسی۔ (سڑک کے کنارے) یہ زمین کس قدر تنگ اور محدود ہے روشنی نے ایک پنجرے کی طرح ایک ایک بیت کو قید کر لیا ہے اور ساعتیں تیلیوں میں مقید پرندوں کی مانند پھڑپھڑاتی اور چیختی ہیں۔ لیکن یہ غوغا آرا لوگ کیوں بھاگے جا رہے ہیں یہ ہمیشہ ایسے متفکر نظر آتے ہیں جیسے ان کی کوئی چیز کھو گئی ہو کوئی ایسی چیز جو کبھی ان کے ہاتھ نہیں آتی۔

(ہجوم گزرتا ہے) (دیہات کا ایک معزز آدمی اور دو عورتیں داخل ہوتی ہیں)

پہلی عورت۔ تم مجھے ضرور ہنساؤ۔

دوسری عورت۔ مگر یہ کون کہتا ہے کہ تم بڑھیا ہو۔

معزز آدمی۔ ایسے بیوقوف بھی تو ہوتے ہیں جو لوگوں کو ان کی ظاہری شکل و صورت سے جانچتے ہیں۔

پہلی عورت۔ کتنے افسوس کی بات ہے! اگر ہم لوگ تمہیں اپنے بچپن سے دیکھ رہے ہیں۔ تم شروع سے ویسے ہی نظر آتے ہو۔

معزز آدمی۔ صبح کے آفتاب کی مانند ۔۔۔!

پہلی عورت۔ ہاں صبح کے کمزور ۔۔۔۔۔۔

معزز آدمی۔ تم اپنے مذاق میں بیحد دقیقہ سنج ہو۔ غیر ضروری چیزوں کو بھی تم بغور دیکھتی ہو۔

دوسری عورت۔ اپنی باتیں بند کرو۔ انگا! چلو گھر چلیں، ورنہ میرا شوہر ناراض ہو جائے گا۔

پہلی عورت۔ (آدمی سے) پرنام! ہمیں آپ ہماری ظاہری شکل و صورت سے جانچ سکتے ہیں۔ ہم برا نہیں مانیں گے۔

(جاتے ہیں) (تین دیہاتی داخل ہوتے ہیں)

پہلا دیہاتی۔ میری بے عزتی کریگا۔ بدمعاش، دیکھ لینا پچھتائے گا۔

دوسرا دیہاتی۔ اسے تو کوئی اچھا سبق ملنا چاہیئے۔

پہلا دیہاتی۔ ایسا سبق جائے قبر تک یاد ر[illegible]

دوسرا دیہاتی۔ ہاں بھائی اس کے لئے اپنا دل [illegible] کر[illegible]ے

مکان ہرگز نہیں دیا جائے گا۔

تیسرا دیہاتی۔ وہ تو بہت مغرور ہو گیا ہے۔

پہلا۔ تو اب اس کا سر نیچا ہو جائے گا۔

تیسرا دیہاتی۔ جب چیونٹی کے پنکھ آتے ہیں تو انکی موت کا وقت قریب آتا ہے

دوسرا دیہاتی۔ لیکن کوئی ترکیب بھی ہے۔

پہلا دیہاتی۔ ایک نہیں سینکڑوں۔ میں اس کے مکان پر ہل چلا دونگا

اس کے ایک گال پر سفیدی اور ایک گال پر سیاہی لگا کے

گدھے پر بٹھا کر شہر میں پھراؤنگا۔ دنیا اس کے لئے تنگ ہو جائے

گی اور . . . (سب جاتے ہیں)

(دو طالب علم داخل ہوتے ہیں)

پہلا طالب علم۔ میری رائے میں پروفیسر سند صب مباحثہ میں جیت گئے۔

دوسرا طالب علم۔ نہیں پروفیسر جبار دن جیتے۔

پہلا طالب علم۔ پروفیسر سند صب اپنی بات پر اخیر تک قائم رہے،

انھوں نے کہا چھوٹا بڑے کا حاصل ہے۔

دوسرا طالبعلم۔ لیکن پروفیسر جبار دن نے تو یہ قطعاً ثابت کر دیا کہ

چھوٹا بڑے کا ماخذ ہے۔

پہلا طالبعلم۔ ناممکن!

دوسرا طالبعلم۔ یہ تو روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔

پہلا طالبعلم۔ بیج درخت سے پیدا ہوتے ہیں۔

دوسرا طالبعلم۔ درخت بیج سے پیدا ہوتا ہے۔

پہلا طالبعلم۔ کیوں سنیاسی جی! دونوں میں سے ٹھیک بات کون سی

ہے؟ بڑا قدیم ہے یا چھوٹا؟

سنیاسی۔ کوئی بھی نہیں!

دوسرا طالبعلم۔ کوئی بھی نہیں، یہ خیال اطمینان بخش معلوم ہوتا ہے۔

سنیاسی۔ ماخذ انتہا ہے اور انتہا ماخذ، یہ ایک دائرہ ہے۔ چھوٹے

اور بڑے کا امتیاز تمھاری عقل نے پیدا کیا ہے۔

پہلا طالبعلم۔ یہ نظریہ تو بہت آسان معلوم ہوتا ہے غالباً ماسٹر صاحب

کا بھی یہی مطلب تھا۔

دوسرا طالبعلم۔ بیشک! یہ نظریہ بالکل وہی معلوم ہوتا ہے جو ماسٹر

صاحب نے پڑھایا تھا۔

(طالب علم جاتے ہیں)

[illegible]ی۔ یہ [illegible] ہیں۔ جب ان کو منہ بھرنے

کے لئے کوئی [illegible] مل جاتی ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں

(پھول بیچنے والی دو لڑکیاں گاتی ہوئی داخل ہوتی ہیں)

گیت:۔ بے کیف گھڑیاں گذرتی جاتی ہیں، منچے جو صبح کھلتے

ہیں شام کو مرجھا کر زمین پر گر جاتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ

اپنے پیارے کے لئے صبح ایک ہار گوندھونگی لیکن صبح ہو[illegible]

سب بن لیتی ہوں۔ پھول اکٹھا نہیں ہوئے اور میرا پیا[illegible]

کھو گیا ——!

راہگیر۔ اتنی مغموم کیوں ہو؟ جب ہار تیار ہو جائینگے اس وقت گرد[illegible]

کو تمھارے ہاروں کی ضرورت نہ ہوگی۔

پہلی لڑکی۔ کیا رکنے والے کو بھی ضرورت نہ ہوگی؟

دوسری لڑکی۔ تم بہت بیباک ہو۔ اتنے قریب کیوں آگئے؟

راہگیر۔ بلا وجہ ڈر رہی ہو۔ میں تم سے کافی دور ہوں میرے اور

تمھارے درمیان سے تو ایک ہاتھی گذر سکتا ہے۔

دوسری لڑکی۔ ضرور، اگر تم میرے قریب آجاتے تو میں تمھیں کھا جاتی

(سب ہنستے ہوئے جاتے ہیں) (ایک بڈھا فقیر داخل ہوتا ہے)

فقیر۔ مجھ پر ترس کھاؤ۔ ایشور تمھارا بھلا کریگا۔ اپنی دولت میں سے

مجھے صرف ایک مٹھی بھر دے دو۔

(ایک سپاہی داخل ہوتا ہے)

سپاہی۔ چلو ہٹو! تمھیں دکھائی نہیں دیتا وزیر صاحب کے [illegible]

آرہے ہیں؟ (دونوں جاتے ہیں)

سنیاسی۔ دوپہر ہو گئی۔ آفتاب اپنے عروج پر آگیا۔ آسمان تانبے کے

جلتے ہوئے اُلٹے کٹورے کی مانند نظر آرہا ہے۔ زمین گرم آہ[illegible]

بھر رہی ہے اور بگولے ناچ رہے ہیں۔ کیا میں پھر کبھی ان لوگوں

کی تنگ دنیا میں سمٹ کر ان میں سے ایک ہو سکتا ہوں؟ نہیں

میں آزاد ہوں۔ میرے گرد یہ تنہائی ہے، یہ دنیا نہیں ہے۔

تنہائی میں رہتا ہوں۔

(دامنتی اور ایک عورت داخل ہوتے ہیں)

عورت۔ لڑکی! تم راگھو کی بیٹی ہو نا؟ تمھیں اس رستے سے دور رہنا چاہ[illegible]

تم نہیں جانتیں کہ یہ سڑک مندر کو جاتی ہے۔

دامنتی۔ میں تو سڑک کے کنارے کھڑی ہوں [illegible]

عورت۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میرے کپڑے کا پلو تم سے چھو گیا ہے

[illegible] اپنے بچوں کو دیوی کے پاس لئے جا رہی ہوں۔ میر[illegible]

کپڑے نجس تو نہیں ہوئے؟

انتی - میں یقین دلاتی ہوں کہ میرا کپڑا تم سے نہیں چھوا (عورت جاتی ہے) میں واسنتی ہوں - راگھو کی بیٹی! کیا تمھارے پاس آ سکتی ہوں پتا جی؟

نیاسی - کیوں نہیں بیٹی؟

اسنتی - لوگ مجھے نجس کہتے ہیں۔

نیاسی - لیکن وہ بھی تو یہی ہیں ـــــ آلودگی! وہ اپنے وجود کی خاک میں لوٹتے ہیں۔ پاک صرف وہ ہے جس نے دنیا کو اپنے دماغ سے دھو دیا ہے۔ مگر تم نے کیا کیا ہے بیٹی؟

انتی - میرے پتا جی کا انتقال ہو چکا ہے اپنی زندگی میں ان لوگوں کے قوانین اور دیوتاؤں کو نہیں مانتے تھے۔ نہ کبھی ان کی پوجا پاٹ کرتے تھے۔

نیاسی - تم مجھ سے دور کیوں کھڑی ہو؟

اسنتی - تم مجھے چھوؤگے؟

نیاسی - ہاں کیونکہ صحیح طور سے مجھے کوئی چیز نہیں چھو سکتی - میں دنیا میں سب سے دور رہتا ہوں، اگر تم چاہو تو یہاں بیٹھ سکتی ہو۔

انتی - (ہچکی لیتے ہوئے) جب ایک بار تم نے مجھے اپنے قریب بلا لیا ہے تو اب اپنے سے دور نہ کرنا پتا!

نیاسی - آنسو پونچھ ڈالو بیٹی! میں سنیاسی ہوں، میرے دل میں نہ نفرت ہے، نہ محبت - میں تمھیں اپنی چیز نہیں کہہ رہا ہوں اس لئے تمھیں کبھی جدا بھی نہیں کر سکتا - میرے لئے تم اس پہلے آسمان کی طرح ہو ـــــ تم حالانکہ تم نہیں ہو،

انتی - پتا! مجھے دیوتاؤں اور انسانوں دونوں نے برباد کیا ہے۔

نیاسی - مجھے بھی تو لیکن میں نے دیوتاؤں اور انسانوں دونوں کو برباد کر دیا ہے۔

انتی - تمھاری ماتا نہیں ہیں؟

نیاسی - نہیں!

سنتی - نہ پتا؟

نیاسی - نہیں!

سنتی - نہ کوئی دوست؟

نیاسی - نہیں!

سنتی - تو میں تمھارے ساتھ رہوں گی تم مجھے چھوڑو گے تو نہیں؟

نیاسی - میں نے چھوڑنا ترک کر دیا ہے - تم میرے قریب نہ آ کر بھی

میرے پاس رہ سکتی ہو۔

واسنتی - تمھاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں پتا! مجھے بتایئے کیا دنیا میں میرے لئے پناہ کی جگہ نہیں ہے؟

سنیاسی - جائے پناہ؟ تمھیں نہیں معلوم یہ دنیا ایک ناقابل پیمائش شگاف ہے، لوگوں کا ہجوم فنا کے خول میں سے نکل کر جائے پناہ ڈھونڈتا ہے اور اس تہی مغزی کے کھلے ہوئے منہ میں داخل ہو کر فنا ہو جاتا ہے - تمھارے چاروں طرف فریبوں کے ہمزاد اپنی جعلسازیوں کا بازار لگائے ہوئے ہیں اور جو اشیا وہ فروخت کرتے ہیں پرچھائیاں ہوتی ہیں - یہ تمھاری آرزو پوری نہیں کرتے بلکہ دھوکا دیتے ہیں - یہاں سے ہٹ آؤ بیٹی! آ جاؤ،

واسنتی - لیکن پتا اس دنیا میں وہ کتنے خوش نظر آتے ہیں!"

سنیاسی - افسوس ہے کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا - وہ نہیں دیکھ سکتے کہ یہ دنیا ہمیشہ کے لئے پھیلی ہوئی موت ہے ـــــ یہ ہر لمحہ مرتی ہے پھر بھی اختتام پر نہیں آتی ـــــ اور ہم اسی موت کی خوراک بننے کے لئے زندہ ہیں۔

واسنتی - پتا تم مجھے ڈرا رہے ہو!

(ایک مسافر داخل ہوتا ہے)

مسافر - کیا قریب ٹھہرنے کے لئے جگہ مل سکتی ہے؟

سنیاسی - جائے پناہ سوا ایک شخص کی روح کی گہرائیوں کے کہیں نہیں ہے - بیٹا اس کی جستجو کر۔

مسافر - لیکن میں تھکا ہوا ہوں اور ٹھہرنا چاہتا ہوں۔

سنیاسی - میری جھونپڑی یہاں سے دور نہیں ہے - آؤ گے؟

مسافر - لیکن تم کون ہو؟

واسنتی - کیا مجھ سے واقفیت ضروری ہے؟ میں راگھو کی بیٹی ہوں۔

مسافر - ایشور تمھارا بھلا کرے - میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔

(جاتا ہے) (لوگ کسی کو کھاٹ پر لٹائے آتے ہیں)

پہلا لادنے والا - وہ اب بھی سو رہا ہے۔

دوسرا لادنے والا - پاجی، کتنا بھاری ہے۔

مسافر - (ان لوگوں سے جدا) کسے لئے جا رہے ہو؟

تیسرا لادنے والا - بندی جو لاما مردے کی طرح سو رہا تھا ہم لوگ اٹھا لائے۔

دوسرا لادنے والا - لیکن بھائیو میں تو تھک گیا اب اسے ہلا کر جگانا چاہیے۔

بندی - (جاگتا ہے) اے - او - ارے!

تیسرا لادنے والا - یہ کیسی آواز ہے؟

بندی - میں کہتا ہوں، تم ہو کون؟ مجھے کہاں لئے جا رہے ہو؟

(کھاٹ کو کاندھوں سے اتار کر نیچے رکھتے ہیں)

تیسرا لادنے والا - کیا تم اچھے مُردوں کی طرح خاموش نہیں رہ سکتے؟

دوسرا لادنے والا - یہ تو اس کی بےحیائی ہے کہ مرنے کے بعد بھی بول رہا ہے۔

تیسرا لادنے والا - اگر تم خاموش بے حس و حرکت پڑے رہو تو بہتر ہوگا۔

بندی - [illegible] دوستو! مجھے تم لوگوں کو مایوس کرنے کا افسوس ہے۔ تم لوگوں سے غلطی ہوئی۔ میں مرا نہیں بلکہ ذرا گہری نیند سو گیا تھا۔

دوسرا لادنے والا - مجھے اس شخص کی بےغیرتی پر حیرت ہے، مرنے کے بعد بھی جرح کرتا ہے۔

تیسرا لادنے والا - یہ سچ نہیں بولے گا۔ چلو چل کر اسے جلا دیں۔

بندی - تمہاری ڈاڑھی کی قسم میرے بھائی! میں بالکل تمہاری طرح زندہ ہوں۔

(وہ اسے ہنستے ہوئے لے جاتے ہیں)

سنیاسی - لڑکی اپنے چھوٹے سے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر سو گئی۔ میرے خیال میں اب اسے چھوڑ کر چل دینا چاہئے۔ لیکن بزدل کیا تجھے بھاگنا چاہئے۔ اس ننھی سی چیز سے بھاگنا چاہئے۔ یہ قدرت کی مکڑی کے جالے ہیں جو پروانوں کے لئے مخدوش ہیں مجھ جیسے سنیاسی کے لئے نہیں۔

واسنتی - (جاگتی ہوئی چونک کر) کیا مجھے چھوڑ گئے پتا! چلے گئے؟

سنیاسی - تمہارے پاس سے کیونکر چلا جاؤں؟ مجھے کس بات کا خوف ہے؟

واسنتی - تم سڑک پر شور سن رہے ہو؟

سنیاسی - لیکن میری روح پر تو سکوت طاری ہے۔

(ایک جوان عورت آدمیوں کے ساتھ داخل ہوتی ہے)

عورت - جاؤ اب مجھے چھوڑ دو مجھ سے محبت کی بابت مت کہو۔

پہلا آدمی - کیوں؟ آخر میں نے کیا خطا کی تھی؟

عورت - تم مردوں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں۔

پہلا آدمی - بالکل جھوٹ، اگر ہمارے دل پتھر کے ہوتے تو کیوپڈ کا تیر کس طرح پیوست ہو سکتا تھا؟

دیگر آدمی - کیا کہنا ـــ خوب کہا!

دوسرا آدمی - اس کے لئے اب آپ کا کیا جواب ہے؟

عورت - جواب؟ فضول سی بات کہہ کر تم سمجھتے ہو کہ تم نے کوئی نہایت اعلیٰ بات کہی ہے نا؟

پہلا آدمی - حضرات! میں اسے آپ لوگوں کے فیصلہ پر چھوڑتا ہوں [illegible] میں نے جو کہا تھا وہ یہ ہے کہ اگر ہمارے دل پتھر کے ہوتے تو کیوپڈ کا تیر [illegible]

تیسرا آدمی - ہاں ہاں، اس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔

پہلا آدمی - میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ ہم مردوں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں۔ یہی کہا تھا نا، اور میں نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ اگر ہم لوگوں کے دل پتھر کے ہوتے تو کیوپڈ کا تیر ان میں کیونکر پیوست ہو سکتا تھا۔ سمجھے!

دوسرا آدمی - بھیا شہر میں چوبیس سال گزر [illegible] نہیں سمجھ سکتا۔ (سب جاتے ہیں)

سنیاسی - کیا کر رہی ہو بیٹی؟

واسنتی - تمہاری چوڑی ہتھیلی دیکھ رہی ہوں پتا! میرا ہاتھ ایک چھوٹی سی چڑیا ہے جو اپنا گھونسلا یہاں تلاش کر رہی ہے تمہاری ہتھیلی ایک وسیع زمین کی طرح ہے جس میں سب کچھ ہے یہ لکیریں دریا ہیں اور یہ پہاڑیاں۔

(اپنا گال ہتھیلی پر رکھتی ہے)

سنیاسی - تمہارا لمس خواب کی طرح لطیف ہے بیٹی! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمہارے لمس میں ایک تاریکی ملی ہوئی ہے، جو کسی کی روح کو ابدی چھڑی سے چھوتی ہے ـــ لیکن بچی! تم دن کے اجالے کی پنکھی ہو۔ تمہارے لئے باغ، پرند اور کھیت ہیں۔ تم مجھ میں کیا پا سکتی ہو؟ کیونکہ میں تو صرف ایک مرکز ہوں اور دائرہ کہیں بھی نہیں!

واسنتی - مجھے کسی شے کی آرزو نہیں۔ صرف تمہاری محبت میرے لئے کافی ہے۔

سنیاسی - لڑکی کا خیال ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں ـــ بیوقوف دل! وہ اس خیال سے خوش ہے اس کی اسے پرورش کرنے دے کیونکہ ان لوگوں نے دھوکہ ہی میں نشو و نما پائی ہے اسی لئے ان کی تسکین کی خاطر فریبوں کا ہونا ضروری ہے۔

واسنتی - پتا جی! یہ بیل جو گھاس پر لوٹ رہی ہے جانتے ہو کس درخت کی جستجو کر رہی ہے تاکہ خود اس سے لپٹ کر پروان چڑھے؟ یہ میری بیل ہے۔ میں اس کی نگرانی کرتی اور اسے پانی دیتی تھی۔ اتنے عرصہ میں اس میں سے صرف دو ہی پتیاں ایک معصوم بچے کی آنکھوں کے مانند نکلیں۔ یہ بیل میں خود ہوں۔ یہ سڑک کے کنارے ایسی جگہ بڑھی جہاں بہت آسانی سے

بہا... ملکی تھی۔ آپ دیکھ رہے ہیں یہ زردی مائل نیلے پھول!
جن پر سفید داغ ہیں۔ یہ سفید داغ ان کے حجاب ہیں۔ لائیے اپنی
پھولوں کو آہستہ آہستہ بکھرنے دیجئے۔ میرے لئے حسین چیزیں
نادیدہ اور نامعلوم چیزوں کی کنجیاں ہیں۔
سنیاسی۔ نہیں نہیں حسن محض ایک تصور ہے اس شخص کے لئے جس کے
نزدیک گل و گل یکساں ہیں ـــــ لیکن میرے خون میں یہ تپش سی
کیسی ہے جو میری آنکھوں کے سامنے قوس قزح کا تمام رنگوں
کا دھندلا سا پردہ کھینچ رہی ہے۔ کیا یہ قدرت ہی ہے جو میرے
حواس پر چھا کر میرے ارد گرد اپنے خوابوں کا جال بن رہی ہے
(سنیاسی یکایک بیل کو نوچ کر اٹھا لیتا ہے۔ بس لڑکی تو میرے
ساتھ کون سی چال چل رہی ہے۔ میں سنیاسی ہوں۔ میں نے
اپنے تمام پھندے کاٹ دیئے ہیں۔ میں آزاد ہوں ـــــ نہیں
نہیں لیکن تو آنسو نہ بہا، میں ان کی تاب نہیں لا سکتا۔ گر میرے
دل میں یہ سانپ کہاں چھپا ہوا تھا جس نے خاموشی سے مجھے اپنے
زہریلے دانتوں سے ڈس لیا؟ نہیں وہ مرے نہیں ـــــ وہ
بھوک پر غالب آ چکے ہیں۔ یہ جہنمی لوگ، جب ان کی ملکہ، ایک
زبردست ساحرہ، اپنی جادو کی بانسری پھونکتی ہے تو وہ اپنی
ہڈیاں کھڑکھڑا کر میرے دل میں ناچتے ہیں۔ رو ؤ مت بیٹی میرے
قریب آؤ، تم مجھے کھوئی ہوئی دنیا کی صبح معلوم ہوتی ہو۔ اب
متحرک ستارہ کے گیت کے مانند تم میرے دماغ میں کوئی ایسی
چیز لاتی ہو جو ا(؟) قدرت اور مہرو انجم سے سوا ہے۔ تاریکی کی
طرح عظیم۔ میری سمجھ سے دور ہے۔ چونکہ پہلے کبھی میں اس سے
واقف نہیں، اس لئے خوف معلوم ہوتا ہے۔ مجھے تم کو چھوڑ دینا چاہئے
جہاں سے تم آئی تھیں وہیں چلے جاؤ۔
داسنتی۔ مجھے نہ چھوڑیئے پتا! تمہارے علاوہ میں کوئی دوسری شے
نہیں ہوں۔
سنیاسی۔ مجھے جانا ہی چاہئے۔ میرا خیال تھا کہ میں اس سے واقف
ہوں لیکن دراصل کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں تمہیں یہ معلوم کرنے کے
لئے چھوڑنا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو؟
داسنتی۔ پتا! اگر تم مجھے چھوڑ دو گے تو میں مر جاؤں گی۔
سنیاسی۔ میرا ہاتھ چھوڑ دو ـــــ مجھے مت چھوؤ۔ مجھے آزاد
رہنا چاہئے۔
(سنیاسی بھاگ جاتا ہے)

ـــــ سین (۳) ـــــ

(پہاڑی ڈھلان پر سنیاسی ایک بڑے پتھر پر بیٹھا ہوا ہے۔ ...
ایک گڈریئے کا لڑکا گاتا ہوا گزرتا ہے)
گیت:۔ پیاری مجھ سے روپوشی ٹھیک نہیں۔ بادل نے اپنا سینہ
عریاں کر دیا ہے۔ پھول تاریکی میں اپنے راز کھول رہے ہیں۔ ...
کی ہچکیوں کی طرح جنگل کی پتیوں کی سرسراہٹ سمندر کے اس
پار سے آتی ہے۔ آؤ پیاری مجھے اپنا چہرہ دکھاؤ۔ ...
سنیاسی۔ شام کا سونا نیلگوں سمندر کے دل میں گھس رہا ہے۔ پہاڑی
کی طرف کا میدان دن کی روشنی کا آخری جام چڑھا رہا ہے۔ بائیں
طرف جھاڑیوں میں سے گاؤں کی جھونپڑیوں کے جلتے ہوئے
چراغ جیسے ایک ماں اپنے سوئے ہوئے بچوں کو کھڑی دیکھ رہی
ہو۔ قدرت تو میری کنیز ہے۔ اس بڑے ہال (دنیا) میں کونے
اپنا رنگیں قالین پھیلایا ہے جہاں میں ایک بادشاہ کی طرح
تنہا بیٹھ کر تیرے مصروف رقص دیکھتا ہوں۔ تاروں سے گندھا ہوا
چکدار ہار تیرے سینہ پر جھلملاتا ہے۔
(گڈریئے کی لڑکیاں گاتی ہوئی گزرتی ہیں)
گیت:۔ موسیقی تاریک سمندر کے اس پار سے آتی ہے۔ میں اپنے
مکان میں خوش تھی لیکن رات کی خاموش فضا میں بانسری کی
آواز گونجی اور ایک درد میرے دل میں پیوست ہو گیا۔ اگر کوئی وہ
جانتا ہو تو بتلائے۔ مجھے اس کی جستجو ہے۔ میں اس کے پاس ایک
پھول لیکر جاؤں گی اور اس کے قدموں میں ڈال کر کہوں گی کہ اس کا
نغمہ میری محبت میں تحلیل ہو گیا ہے۔
(لڑکیاں جاتی ہیں)
سنیاسی۔ میری تمام زندگی میں شاید ایک بار اور ایسی ہی فضا نصیب
ہوئی تھی۔ اس وقت زندگی کا پیالہ محبت اور موسیقی سے لبریز
تھا اور میں کسی کے ساتھ مسرور و شاداں بیٹھا ہوا تھا جس کے چہرے
کی یادگار شام کے اس جھلملاتے ہوئے تارے سے جھلک رہی ہے
لیکن ـــــ میری چھوٹی لڑکی اپنی اشکوں سے ڈبڈبائی ہوئی
سیاہ و مغموم آنکھیں لیکر کہاں چلی گئی۔ کیا وہ اپنی جھونپڑی کے
باہر شام کی بے پناہ خلوتوں میں اسی تارے کو دیکھ رہی ہے؟
رات کو چاہئے کہ اس کی آنکھیں بند کر دے اور نیند میں اس کی
ہچکیاں بند ہو جائیں اور آنسو خشک، نہیں، لیکن میں واپس
نہیں جاؤں گا۔ دنیا کے خیالات کو اپنی صورتیں اختیار کر لینے

دو اس کے کاروبار میں مخل ہو کر مجھے اپنے لئے نئی پریشانیاں
[illegible] پیدا کرنی چاہئیں۔
(ایک شخص لڑکی داخل ہوتی ہے)

لڑکی۔ تم یہاں ہو پتا!

سنیاسی۔ آؤ بیٹی میرے نزدیک آؤ۔ کبھی مجھے کوئی پتا کہہ کر پکارتا تھا [illegible] کی آواز تمہاری آواز سے ملتی تھی۔ پتا اب جواب دیتا ہے —— لیکن وہ آواز کہاں ہے؟

لڑکی۔ تم کون ہو؟

سنیاسی۔ میں سنیاسی ہوں۔ تمہارے پتا کیا کرتے ہیں؟

لڑکی۔ وہ جنگل سے لکڑی اکٹھا کرتے ہیں۔

سنیاسی۔ تمہاری ماتا ہیں؟

لڑکی۔ نہیں۔ ابھی میں چھوٹی تھی کہ وہ مر گئیں۔

سنیاسی۔ بیٹی! اپنے پتا سے محبت ہے؟

لڑکی۔ میں انہیں دنیا میں سب سے زیادہ چاہتی ہوں۔ ان کے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔

سنیاسی۔ بیٹھا۔ اپنا ہاتھ مجھے دو۔

لڑکی۔ سنیاسی! کیا تم ہاتھ دیکھتے ہو۔ میرا ہاتھ دیکھ کر بتا سکو گے کہ میں کیا ہوں اور کیا ہو سکوں گی؟

سنیاسی۔ میں ہاتھ دیکھ سکتا ہوں لیکن اس کا مطلب کچھ اچھی طرح نہیں بتا سکتا لیکن ایک دن میں پوری طرح جان جاؤں گا۔

لڑکی۔ [illegible] مجھے اپنے پتا کے پاس جانا چاہیئے۔

سنیاسی۔ کہاں ——؟

لڑکی۔ جہاں سے [illegible] جنگل کی طرف جاتی ہے [illegible] مجھے اس جگہ نہیں پائیں گے تو میں کھو جاؤں گی۔

سنیاسی۔ اپنا سر میرے قریب لاؤ۔

(ماں دو لڑکیوں کو لیکر داخل ہوتی ہے)

ماں۔ مستری کے بچے کتنے مضبوط اور تندرست ہیں کیسے اچھے معلوم ہوتے ہیں لیکن میں جتنا تم لوگوں کو کھلاتی ہوں اتنا ہی تم دبلی ہوتی جاتی ہو۔

پہلی لڑکی۔ لیکن آپ ہمیشہ ہم لوگوں پر کیوں الزام رکھتی ہیں۔ ہم اس میں کیا کر سکتی ہیں؟

ماں۔ میں نے تم لوگوں سے نہیں کہا کہ آرام زیادہ کیا کرو مگر تم ہمیشہ بھاگتی پھرتی ہو۔

دوسری لڑکی۔ لیکن ماتا ہم لوگ تو آپ ہی کے کام سے بھاگتے ہیں۔

سنیاسی۔ کہاں جا رہی ہو بیٹی؟

ماں۔ پرنام پتا۔ گھر جا رہے ہیں۔

سنیاسی۔ تم کتنے آدمی ہو؟

ماں۔ میں، میری ساس، پتی اور دو بچے۔

سنیاسی۔ تمہارے دن کیسے گزرتے ہیں؟

ماں۔ یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ میرے دن کیسے گزرتے ہیں۔ صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرے پتی کھیت میں چلے جاتے ہیں۔ میں تمام گھر کی دیکھ بھال کرتی ہوں اور شام کو بیٹھ کر اپنے بچوں سے باتیں کرتی رہتی ہوں۔ (لڑکیوں سے) جاؤ سنیاسی کو پرنام کرو۔ انہیں آشیرباد دو پتا۔

(دو آدمی داخل ہوتے ہیں)

پہلا آدمی۔ یہیں سے لوٹ جاؤ دوست! زیادہ دور مت آؤ۔

دوسرا دوست۔ ہاں، میں جانتا ہوں اس دنیا میں دو دوست محض اتفاق سے ملتے ہیں وہی اتفاق ہم لوگوں کو ایک [illegible] دور لیجاتا ہے۔ اس کے بعد ایک گھڑی آتی ہے جب ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔

پہلا دوست۔ مگر ہمیں جدا ہوتے وقت یہ امید کرنی چاہیئے کہ ہم دوبارہ ملنے کے لئے جدا ہو رہے ہیں۔

دوسرا دوست۔ ہماری ملاقاتوں اور جدائیوں کا انحصار زمانے کی گردش پر ہے۔ ستارے ہمارا کوئی خاص خیال نہیں رکھتے۔

پہلا دوست۔ ہمیں ان ستاروں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جنہوں نے ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کا موقع دیا۔ یہ مختصر سی ملاقات ہی کافی ہے۔

دوسرا دوست۔ جانے سے قبل ذرا اس طرف۔ اندھیرے میں وہ پانی کی ہلکی سی چمک اور وہ ریتیلے ساحل پر درختوں کو دیکھ سکتے ہو نا! ہمارا گاؤں اس وقت تاریک سائے کا ایک ڈھیر نظر آ رہا ہے آپ صرف روشنیاں دیکھ سکتے ہیں۔ بتا سکتے ہو ان میں سے کون سی روشنی اپنے مکان کی ہے؟

پہلا دوست۔ ہاں بتا سکتا ہوں۔

دوسرا دوست۔ ہم اپنے مہمان کو اس جگہ تک چھوڑنے آتے ہیں جہاں سے وہ روشنی نظر آتی ہے اس کے آگے ذرا بڑھنے سے گاؤں ایک سیاہ نقطہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

سنیاسی۔ رات تاریک اور اداس ہو کر ایک سڑک پر بیٹھی ہوئی

بجلی رات کی طرح نظر آتی ہے۔ ستارے اس کے آنسو ہیں جو آگ میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ لڑکی تیرے ننھے دل کے غم نے میری زندگی کی تمام راتوں کو ہمیشہ کے لئے غم سے پُر کر دیا تیرے نازک ہاتھ نے اپنا لمس رات کی ہواؤں میں چھوڑ دیا ہے اور اسے میں اپنی پیشانی پر محسوس کر رہا ہوں ــــ یہ لمس آنسوؤں سے نم ہے۔ پیاری تیری ہچکیوں نے بھاگ جانے پر بھی میرا تعاقب کیا اور میرے دل سے چمٹ کر رہ گئیں اپنی موت تک میں انھیں ساتھ لئے رہونگا۔

——(۴)——

سنیاسی۔ (گاؤں کے رستہ پر) میں اپنا عصا اور کشکول توڑتا ہوں۔ یہ بڑا جہاز۔ یہ دنیا جو وقت کا سمندر پار کر رہی ہے ــــ مجھے واپس لینے دو۔ ایک مرتبہ مجھے پھر زائروں کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اے بیوقوف تو تنہا تیرگی اس کی جستجو کر رہا ہے اپنی راہ جگنوؤں کے چراغ کی مدد سے حاصل کرنے کے لئے تو نے ستاروں اور آفتاب کی روشنی کو تج دیا چڑیا فضا میں فنا ہونے کے لئے پرواز نہیں کرتی بلکہ اس زمین پر آنے کے لئے۔ میں آزاد ہوں اور موت کے حلقے سے دور ــــ محبت اپنی صداقت سے واقف ہوتی ہے۔ میری لڑکی! تو میری دنیا ہے۔ میں تجھے ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔

(گاؤں کا ایک معزز آدمی داخل ہوتا ہے)

سنیاسی۔ جانتے ہو بھائی راگھو کی بیٹی کہاں ہے؟

آدمی۔ اس نے اپنا گاؤں چھوڑ دیا۔ ہم لوگ بہت خوش ہیں۔

سنیاسی۔ وہ کہاں چلی گئی؟

آدمی۔ آپ پوچھ رہے ہیں کہ وہ کہاں چلی گئی ــــ یہ تو صرف اسی کو معلوم ہوگا۔

سنیاسی۔ وہ مجھے ڈھونڈنے نکلی ہے۔ کہیں نہ کہیں وہ مجھے ضرور پا لے گی۔

(دیہاتیوں کا ایک گروہ داخل ہوتا ہے)

پہلا آدمی۔ تو ہمارے مہاراج کے لڑکے کا آج رات بیاہ ہے۔

دوسرا آدمی۔ تمہیں معلوم ہے؟

تیسرا آدمی۔ شادی کا وقت تو دولہا اور دلہن کے لئے ہے۔ ہمیں اس سے کیا واسطہ؟

ایک عورت۔ لیکن شبھ دن پر کیا ہمیں مٹھائی نہ ملے گی؟

پہلا آدمی۔ مٹھائی؟ تم بیوقوف ہو۔ میرے چچا شہر میں رہتے ہیں میں نے سنا ہے کہ شادی میں دہی اور چاول لیں گے۔

دوسرا آدمی۔ خوب!

چوتھا آدمی۔ دہی سے زیادہ پانی ملےگا۔ اچھی طرح یاد رہے۔

پہلا آدمی۔ سچ تم بہت فضول انسان ہو۔ مہاراج کی شادی اور دہی میں پانی؟

چوتھا آدمی۔ لیکن ہم لوگ تو راجکمار نہیں ہیں پا نچو! ہم غریبوں کے لئے تو دہی کو بھی پانی سے بننے کی چالاکی معلوم ہے۔

پہلا آدمی۔ وہ دیکھو وہ کوٹنے والے کا لڑکا ابھی تک اپنا کام کیے جاتا ہے ہمیں اسے روکنا چاہیئے۔

دوسرا آدمی۔ اگر وہ دوکان سے باہر نہیں آتا تو ہم لوگ اس کی دکان کو جلا ڈالیں گے۔

سنیاسی۔ تم میں سے کوئی نہیں جانتا راگھو کی بیٹی کہاں ہے؟

عورت۔ وہ تو چلی گئی۔

سنیاسی۔ کہاں ــــ؟

عورت۔ یہ ہمیں نہیں معلوم!

پہلا آدمی۔ لیکن ہم لوگ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ راجکمار کی دلہن نہیں ہے۔ (سب ہنستے ہوئے چلے جاتے ہیں)

(عورت ایک بچہ لے کر داخل ہوتی ہے)

عورت۔ پرنام پتا۔ میرے بچے کو اپنے پاؤں چھونے دو۔ بچارا بیمار ہے اسے اشیرباد دو۔

سنیاسی۔ لیکن بیٹی اب میں سنیاسی رہا۔ اپنے پرناموں سے میرا مذاق مت اڑاؤ۔

عورت۔ پھر تم کون ہو؟ کیا کرتے ہو۔

سنیاسی۔ میں جستجو کر رہا ہوں۔

عورت۔ کس کی جستجو؟

سنیاسی۔ اپنی کھوئی ہوئی دنیا کو ڈھونڈ رہا ہوں ــــ تم راگھو کی بیٹی کو جانتے ہو؟ وہ کہاں ہے؟

عورت۔ راگھو کی بیٹی؟ وہ تو مر گئی۔

سنیاسی۔ نہیں وہ ہرگز نہیں مر سکتی۔ ہرگز نہیں۔

عورت۔ لیکن۔ اس کی موت سے تمہیں کیا سنیاسی؟

سنیاسی۔ صرف میری ہی نہیں ــــ اس کی موت ساری دنیا کی موت ہوگی۔

عورت۔ میں تمہیں نہیں سمجھ سکتی۔

سنیاسی۔ وہ ہرگز نہیں مر سکتی!!

خوابِ نظارہ

از
جنابِ فرحت شاہجہاں پوری

یہ نظم اُس کے نام سے معنون کرتا ہوں — جس کا نام میں خود بھی نہیں جانتا۔ لیکن عرصہ تک جس کا نظارہ "مرکزِ التفات" اور "زحمتِ نظر" بنا رہا۔ اور جس کی روپوشی پر — واقعات و تاثرات غیر ارادی طور پر منظوم ہوگئے خدا معلوم کیوں؟ — فرحت

دیدو وہ اک دوشیزہ کی شام کو دفتر سے آتے
باغ میں چھوٹے بھائی کو۔ اُنگلی تھامے ٹہلاتے

پھرتی ہے وہ شکل نظر میں — چھوڑ گئی جو درد جگر میں
نقشہ اُس کا، بھولا بھالا — نورِ مجسم حسنِ سراپا
لب پہ تبسم لہریں لیتا — آنکھ کے تیور موجِ صہبا
گیسو بکھرے بکھرے ہر سُو — مست لٹیں تھیں، بھینی خوشبو
موہنی صورت "پتلی کمریا" — بھولی بھالی۔ "بالی عُمریا"
تیکھی چتون۔ نین رسیلے — پھول کی پتی۔ کان سجیلے
مست نگاہیں، کیف سے بوجھل — جذبۂ دلکش، آنکھ سے اوجھل
کان میں بُندے ہلکے ہلکے — ڈھیرے ڈھیرے بجلی ڈھلکے
گورے گورے نکھرے عارض — نور سے عارض، پھول سے عارض

(۲)

چال میں جادو۔ چلتا جادو — ڈوبا ڈوبا عالم ہر سو
مست جوانی، مست ادائیں — ہوش اُڑائیں مست نبائیں
نیلی ساری، رُوپ سہانا — ہائے جوانی، ہائے زمانا
نازک نازک ابرو تانے — دل کے ارماں دل ہی جانے

نورِ مجسم، بھولی بھالی، ہر لحظہ یاد آتی ہے
چاند نہیں ہے چاندنی لیکن آنکھوں میں لہراتی ہے

فتح پور سیکری کے شاہی محلات

آثارِ قدیمہ

جناب مولوی نور احمد خاں فریدی

محل خاص

عالم شد معمار پیمان خلدِ بریں ‏ ‏ بدورِ دولت صاحبقرانِ ہفت اقلیم
کہ ببلدۂ دارالخلافہ آگرہ ‏ ‏ دگر بہ خطۂ سیکری بنام شیخ سلیمؒ
سپہر از پے تاریخ ایں دو عالی قصر ‏ ‏ رقم زدہ دو بہشت بریں بکلکِ قدیم

فتحپور سیکری میں محل خاص اکبری عہد کے جملہ محلات میں اپنی خوبصورتی اور دلکشی کے باعث ممتاز ہے۔ آئین اکبری میں علامہ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ دنیا کی کوئی عمارت اس قصر شاہی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ سنہ ۹۷۶ھ (۱۵۶۸ء) میں اس محل کی تعمیر کا آغاز ہوا اور سنہ ۹۷۹ھ (۱۵۷۱ء) میں جاکر مکمل ہوئی۔

محل خاص کے جنوبی جانب جو دالان اور کمروں کا سلسلہ ہے اس کے جنوب مشرقی گوشہ میں ایک منقش کمرہ ہے جو خوابگاہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں شاہ جلال الدین اکبر استراحت فرمایا کرتے تھے۔ یہ کمرہ چابکدست صناعوں کی رنگسازی اور کاریگری کا بہترین نمونہ ہے تمام در و دیوار پر مختلف رنگوں کی تصاویر اور دلچسپ مناظر نقش ہیں دروازوں کے درمیان میں تین فٹ پانچ انچ کی بلندی پر دو طاق بنے ہیں ان کے نیچے مختلف رنگ کی تختیوں پر پختہ کار مصوروں نے اپنے فن مصوری کے شاہکار پیش کئے ہیں۔ چند تختیوں کے مناظر تو آشوب زمانہ کا شکار ہو چکے ہیں، دو تختیاں اپنی پہلی حالت میں موجود ہیں۔ شمالی دروازے کے مغربی طاق کے نیچے دریا کا منظر پیش کیا گیا ہے اس میں کشتی چل رہی ہے جس میں چند آدمی سوار ہیں ایک ملاح مستول پر بیٹھا دریا کے ساحلی مناظر سے لطف اندوز ہو رہا ہے اور باقی چپو کھینے میں مصروف ہیں۔

اسی قسم کی متعدد اور تصاویر بھی بنی ہوئی ہیں مگر اب وہ دیرینہ سالی کی وجہ سے مدھم ہو چکی ہیں اور سرسری طور پر دیکھنے سے نظر نہیں آتیں۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں پرنس آف ویلز کی آمد پر لارڈ کرزن نے ضروری مرمت کرادی تھی مگر پھر بھی شرمندۂ تکمیل نہ ہوسکی۔ ان تصاویر کے

طاقوں کے وسط میں نو انچ چوڑی سنہری پٹی بنی ہوئی ہے۔ اس پر پہلے ہی سے خوشخط کتبے مرقوم تھے جو اب بمشکل پڑھے جاتے ہیں مشرقی دروازے کے شمالی طاق کے نیچے لکھا ہے ؎

رشکِ فردوس بریں است نگارستان چیں
منزلِ اعلیٰ است دائم در نظر منظور باد

شمالی دروازے کے مغربی طاق کے نیچے یہ تحریر ہے ؎

یارب ایں دولت سرا از چشم بد مست
.... (یہ حصہ مٹ گیا ہے)...

مشرقی دروازہ کے جانب جنوب لکھا ہے ؎

بسیار است الحق ایں عمارت را شرف
خط برخوردار یے صاحب از د موفور باد
چوں فروغ آرد نظر کردن دریں یا تمام
صاحب ایں قصر عالی دمبدم مسرور باد

کمرے کے اندرونی جانب مختلف گلکاریوں کے درمیان فیضی کے حسب ذیل اشعار بکمال دیدہ زیبی مرقوم ہیں اور اب ان پر جلا بھی کردی گئی ہے۔

مغربی دروازے پر ؎

قصر شاہ است بہر باب بہ از خلدِ بریں
سخنے نیست دریں باب کہ خلد است بریں

جنوبی دروازے پر ؎

غرفۂ شاہ نشیں از خوش و مطبوع و بلند
کردہ در قطعۂ او جنت اعلیٰ التفہیں

مشرقی دروازے پر ؎

فرش ایوان ترا آئینہ ساز د حوراں
خاکِ درگاہِ ترا سرمہ کند حور العیں

شمالی دروازے پر ؎

چوں ملک ہر کہ کند سجدۂ خاکِ درِ تو ‏ ‏ شود از خاصیتِ خاکِ درت زہرہ جبیں

برآمدوں میں بھی اسی قسم کی گلکاریاں کی ہوئی تھیں لیکن اب یہ مٹ چکی ہیں۔ برآمدہ کے شمال مشرق میں چونے اور گچ کا پختہ فرش ہے مغرب میں سنگیں فرش اور جنوب میں کٹہرہ بنا ہوا ہے۔ مشرقی صحن میں جنوبی دیوار سے ملحق ایک سنگین چبوترہ ہے جس کے درمیان جھروکہ درشن کی جالدار کھڑکی ہے یہاں سے روزانہ اکبر بادشاہ اپنی رعایا کو درشن دیا کرتے تھے۔

محل خاص کے سنگیں فرش کے درمیان میں ۹۵ ½ فٹ مربع یہ سنگین حوض ہے جسے آج کل لوگ "چار چمن" کے نام سے پکارتے ہیں اس تالاب کے عین درمیان ایک حسین چبوترہ سا بنا ہے یہاں تک پہنچنے کے لئے چاروں طرف سے پل بنے ہیں۔ اکبری دور میں نہایت صاف پانی یہاں جمع ہوا کرتا تھا۔ ۱۵۷۸ء میں بادشاہ نے پانی نکلوا کر اس حوض کو خالی کرا دیا اور پھر اس کو اشرفیوں، روپوں اور پیسوں سے بھروا دیا اور تین برس کے عرصہ میں یہ ساری نقدی امیروں اور غریبوں میں بلا کسی امتیاز کے بٹوا کر حوض خالی کرایا۔

شاہ جہانگیر اپنی توزک میں لکھتے ہیں کہ اس حوض میں ۳۴ کروڑ ۴۸ لاکھ ۴۶ ہزار دام جو سولہ لاکھ ۷۹ ہزار چار سو روپوں کے برابر ہیں اور باقی روپیہ ملا کر کل میزانیہ ایک کروڑ تین لاکھ روپے کی نقدی کے برابر ہوتا ہے جو اس حوض میں سمایا تھا۔

مغربی دالان کی چھت سے ایک پردہ دار رستہ مریم مکانی اور پنچ محل سے ہوتا ہوا جودھا بائی کے محل تک چلا گیا ہے اس کے ذریعے مغل شہزادیاں اور بیگمات اپنے اپنے مکانات سے خوابگاہ اور دوسرے محلات سے ہرن مینار تک نہایت آزادی سے سیر کر سکتی تھیں اور خود بادشاہ سلامت بھی اسی راستہ کے ذریعہ سے محلات میں پہنچا کرتے تھے۔

محل ترکی سلطانہ

محل خاص کے شمال مشرقی گوشہ میں ایک عجیب و غریب محل واقع ہے جسے ترکی سلطانہ کا محل" کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ محل بلحاظ صنعت اور خوشنمائی کے دنیا کی نفیس ترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے یہ عمارت تمام و کمال رنگ رنگ کے گلدستوں اور تصویروں سے مزین ہے۔ کمرہ کے اندر دروازہ کی بغلوں میں خاص قسم کے مختلف پہلوؤں کے کشتی نما طاق پتھر میں تراشے ہوئے ہیں اور ان کے نیچے اکثر مقامات پر بیحد خوبصورت اور حسین مناظر دکھائے گئے ہیں۔ مشرقی دروازہ کے شمالی بغل میں ہمالیہ کے کسی پرفضا جنگل کا منظر دکھایا گیا ہے۔ درختوں کی ٹہنیوں پر طوطے۔ مینا۔ بلبلیں اور کئی قسم کی چڑیاں بیٹھی نغمہ سرائی کر رہی ہیں اور نیچے دو شیر بیٹھے ہیں اس کے برابر دروازہ کی دوسری بغل میں کسی دوسرے مقام کا سین ہے برگد کا ایک عظیم الشان درخت ہے جس پر لنگور اور بندر اچھل کود رہے ہیں۔ چڑیاں ٹہنیوں پر بیٹھی جھوم رہی ہیں۔ درخت کے نیچے تالاب ہے اور اس میں کنول کے خوشنما پھول کھل رہے ہیں ایک جانور پانی پی رہا ہے کچھ ادھر ادھر بیٹھے بچوں کو دودھ پلا رہے ہیں لنگور اور بندر ٹکٹکی لگائے درخت پر کی چڑیوں کو دیکھ رہے ہیں، ایک طرف ہرا بھرا باغ لگا ہے اور اس میں انگور اور کھجور کے درخت استادہ ہیں۔ انگور کی بیلوں میں تازہ پکے انگوروں کے خوشے لٹکے ہوئے عجیب بہار دے رہے ہیں۔ ایک طرف جھاڑیوں کا پیچدار سلسلہ باغ کی رونق کو چار چاند لگا رہا ہے۔

باقی تین دروازوں کے اردگرد بھی اسی طرح سرو۔ چھالیہ تاڑ اور دیگر پہاڑی درخت اور گلدستے نہایت خوبصورتی سے ترشے ہوئے ہیں اور اکثر درختوں میں خوشے اور تاڑ کے پھل لٹک رہے ہیں الغرض یہ محل اس قدر خوشنما اور نفیس بنا ہوا ہے کہ اگر اس کو زمانہ قدیم کے سنگتراشوں کا منیئچر عجائب خانہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

پنچ محل

محل خاص کے شمال مغربی گوشہ میں بدھ اور ہندو آرٹس کے طرز کی ایک نادر الوجود پانچ منزلہ عمارت استادہ ہے جس کو پنچ محل کے نام سے پکارتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ اکبر نے بیگمات، شاہزادوں اور شاہزادیوں کی تفریح کے لئے یہ محل بنوایا تھا۔ نچلی منزل میں بچے کھیلتے تھے اور اوپر کی منازل میں بادشاہ اور بیگمات شام کی تازہ ہوا سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس عمارت میں خاص صنعت یہ ہے کہ اوپر کے درجے نیچے کے درجوں سے چھوٹے ہوتے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ پانچویں منزل چار ستونوں کا ایک چھوٹا سا گنبد ہے۔ یہ محل شاہی عہد میں بیبی محل اور خاص محل سے ملا ہوا تھا۔

محل مریم الزمانی بیگم

یہ فردوس صفت عمارت محل خاص کے مغربی جانب واقع ہے اور مریم الزمانی بیگم کی یادگار ہے۔ یہ خاتون راجہ بھاڑا مل کچھواہہ والی امبر (جے پور) کی بیٹی تھی۔ ۹۶۹ھ / ۱۵۶۱ء میں بمقام سانبھر اکبری حرم میں

داخل ہوئی۔ یہ دلفریب اور دلستاں محل ایک سنگین چبوترہ کے وسط میں [illegible] ہے۔ اس میں چار کمرے ہیں اور شمالی کمرے کے آگے برآمدہ ہے [illegible] خوبصورت بنی ہے اور ہر کمرے کی چھت پر ایک ایک ہوا دار چھتری ہے صحن کے جنوب مشرقی گوشے میں ایک چھوٹا سا منقش کمرہ [illegible] ہے جو باورچی خانہ کے نام سے موسوم ہے تمام در و دیوار بیلوں اور گلدستوں سے مزین ہیں۔ باکمال مصوروں نے بادشاہ کے مذاق کا اندازہ کر کے چاروں طرف تاریخی واقعات اور رزم و بزم کے مناظر اس [illegible]گری سے بنائے ہیں کہ یہ محل مصور کا ایک دلکش مرقع معلوم ہوتا ہے اگرچہ نقش و نگار آشوب زمانہ کا شکار ہو چکے ہیں تاہم جو کچھ نظر آ سکتا ہے ناظرین کرام کی دلچسپی کے لئے لکھا جاتا ہے۔

محرابوں کے اوپر ہنسوں کے جوڑے اور مہاراجہ رامچندر جی اور شری کرشن مہاراج کے حلیئے بنے ہوئے ہیں۔ کرشن جی کے دونوں ہاتھوں میں کنول کا ایک ایک پھول ہے۔ دوسری میں ہنومان جی مہاراج رامچندر کے حضور میں حاضر ہیں۔ تصویر کے اوپر کرتی لکھا کا ایک گچھا بنا ہے اور کنارے پر بطخیں بیٹھی ہیں۔

ایک مقام پر فرشتہ کی تصویر ہے جو نیلے رنگ کا جبہ پہنے ایک کرسی پر بیٹھا ہے ایک ٹانگ سمیٹ رکھی ہے اور دوسری نیچے لٹکی ہوئی ہے۔ فرشتہ کا چہرہ بالکل مٹ چکا ہے۔ مگر کندھوں کے پر بخوبی نظر آتے ہیں۔

برآمدہ کے شمال مغربی گوشے میں ندی کا منظر دکھایا گیا ہے جنگل میں ایک ندی بہ رہی ہے۔ پاس ہی ایک شیر پیاس بجھانے کی خاطر کھڑا ہے۔ ندی کے کنارے درخت اُگے ہیں جن میں ایک درخت پر رنگ رنگ کی چڑیاں خوبصورت ٹہنیوں پر بیٹھی حمد کے ترانے گا رہی ہیں۔ اس مقام کی زمین نیلی اور درخت سرخ ہیں۔

ایک دوسری جگہ شاہنامہ کی کسی لڑائی کا "نظارہ" دکھایا گیا ہے جس میں عمدہ عمدہ ہاتھیوں پر سرخ رنگ کے ہودج دکھائے گئے ہیں۔ ایک مقام پر لڑائی کا منظر ہے اور دوسری جگہ "شکار گاہ" کا سین ہے جہاں چیتے کا شکار ہو رہا ہے۔

ایک اور مقام پر چوگان بازی کا میدان دکھایا ہے۔ بہت سے سوار کچھ پیادے اپنے کرتب دکھا رہے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں تیر کمان ہے اور کسی کے پاس بندوق ہے اور کوئی شمشیر بکف کھڑا ہے۔ پاس ہی دو کسے ہوئے ہاتھی کھڑے ہیں۔ برآمدہ میں ملک الشعرا فیضی کے وہ اشعار جو خاص طور پر اس عمارت کے لئے موزوں کئے گئے تھے بخط نستعلیق کندہ ہیں۔ جن میں اب بمشکل یہ اشعار پڑھے جاتے ہیں ؎

این عمارت کز شرف از ہفت گردوں بہتر است
کعبہ را ماند و لے این را صفائے دیگر است
ملتجائے دولت است و مامن امن و اماں
ملجائے آسماں و قبلۂ ہفت اختر است
کہ نشد حیرت ز طرح و نقش این عالی مقام
.... (مٹ گیا ہے) ....
از صفائے صحن ایواں فلک در ہیئت است
ہم ز چوب آستانش آسماں را محور است
غرفہ اش را برتر از گردوں اگر گویم رواست
شمسہ اش را گر بہ از خورشید دانم بہتر است
گلستان نقش ہائے او برنگ باغ خلد
.... (مٹ گیا ہے) ....
در نزاکت ہمچو طاق زرنگار آسمان
در لطافت ہمچو قصر لاجورد چنبر است

مغربی برآمدہ میں ؎

.... کرد
ہست اگرچہ در گرہ کار فلک سحر آفریں
نقش ہائے خوش خط او صورت معنی نما
صورت معنی نمایش دلبر اہل یقیں
تا بود افلاک گردوں ماہ ہمدم با نجوم
تا بود ....
....
.... نقاشان چیں
بادشاہ دین ....
....

مریم الزمانی بیگم محل کے متصل زنانہ باغ واقع ہے۔ یہ ان باغوں میں سے ہے جو اجڑ گئے اور جن کے اب کچھ نشان باقی ہیں۔ اکبری عہد میں اس باغ کے اندر گلزار ارم کا جلوہ نظر آتا تھا، نہریں، فوارے آبشاریں، حوض، تالاب۔ چمن ثمردار اور سایہ دار درخت۔ گل و لالہ کے عطر بیز تختے رواں پانی کی نہریں سب کچھ تھیں، مگر اب اس عظمت رفتہ کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے ایک سنگین نالی

چھوٹا سا بھی تال اور کہیں کہیں سنگین روشوں کے نشان باقی رہ گئے ہیں۔

حمام مریم الزمانی بیگم ایک مختصر مگر مربع شکل کی دلفریب عمارت ہے جو زنانہ باغ کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ شاہی دور میں سنگین حوض بنے ہوئے تھے جو دیواروں میں آ کر ملتے تھے اور اس طرح یہ عمارت نہ تھی جیسے آج کل نظر آتی ہے۔ تالاب میں اترنے کے لئے کونوں پر سیڑھیاں بنی ہیں۔ بیگمات شاہی میں جو کناروں پر سے کود کر غسل نہ کر سکتی تھیں۔ وہ یہیں سے اتر کر فاغسلوا کے ارشاد کی تعمیل کرتیں۔ باغ کے چاروں طرف قد آدم دیواریں تھیں جن سے غیر محرم لوگ اندر داخل نہ ہو سکتے تھے۔ حمام اور باغ کے اندر پانی کا کارخانہ آب رسانی سے آتا تھا جو ہرن مینار کے قریب اسی غرض کے لئے بنایا گیا تھا

محل جودھ بائیؑ

یہ گوہ وقار محل ملکہ مریم زمانی بیگم کے شبستان عشرت کے جنوب مغربی گوشہ میں واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۵۶۹ء میں شہنشاہ اکبر نے اسے اپنی بہو جودھ بائی کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ مہارانی جودھ بائی راجہ اودے سنگھ فرمانروائے جودھ پور کی لخت جگر، شاہ جہانگیر کی اہلیہ اور شاہجہان بادشاہ کی والدہ تھی۔

یہ قصر مہارانی کے جذبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بودھ اور چینی طرز تعمیر پر بنوایا گیا تھا وہی سنگتراشی اشوک کی عمارتوں سے ملتی جلتی زنجیریں اور گھنٹیاں نہایت خوبصورتی سے تراشی ہوئی شاندار محرابیں دلفریب کٹہرے۔ وسیع کمرے۔ داخل ہونے پر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آدمی اشوک اعظم کی کسی خوبصورت عمارت میں چل پھر کر سیر نظارہ سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

یہ محل سرتا پا سنگ سرخ سے بنا ہے اور فتحپوری عمارتوں میں رقبہ اور وسعت کے لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے۔ ۲۳۱ فٹ ۸ انچ لمبا اور ۲۱۵ فٹ چوڑا ہے۔ درمیانہ صحن ۱۷۹ × ۱۶۲ فٹ ہے اس محل کے اندر چاروں طرف سوال و جواب کے طور پر ایک ہی نمونہ کے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ عمارت دو منزلہ ہے۔ مغربی ضلع کا وسطی دالان "مندر" کے نام سے موسوم ہے جو منقش ستونوں پر قائم ہے، محل کے اندر کئی ایک دالان ہیں۔ کوٹھڑیاں، حمام، بیت الخلا اور نشستگاہیں نہایت قرینے سے بنی ہیں۔ چھت کے چاروں گوشوں پر خوشنما گنبد بنے ہوئے ہیں۔

ہوا محل

جودھ بائی محل کے شمالی ضلع میں فصیل سے باہر ایک مستطیل شکل کا ہوادار کمرہ ہے طرز تعمیر مہارانی کے محل سے ملتی جلتی ہے یہاں تک کہ یہ عمارت بھی اسی کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے اور سنگ سرخ کے ستونوں پر قائم ہے۔ موسم گرما میں محلسرا کی اکثر خواتین یہاں آ جایا کرتی تھیں اور گرمی سے کچھ بچاؤ ہو جاتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ یہاں سے ہرن مینار تک ایک گیلری بنی ہوئی تھی جس کے ذریعہ سے شہزادیاں وہاں پہنچ کر جنگی کرتب اور لڑائیوں کی سیر کیا کرتی تھیں لیکن اب گیلری حوادث دہر کا شکار ہو چکی ہے

محل راجہ مہیش داس بیربر

یہ محل مہارانی جودھ بائی کے عشرتکدے کے شمال مشرقی گوشہ میں واقع ہے اسے راجہ بیربر نے اپنی صاحبزادی کے لئے ۱۵۷۱ء میں تعمیر کرایا تھا۔ ساری عمارت دو منزلہ ہے چھت سنگیں پردوں سے گھری ہوئی ہے اور دو کونوں میں مغل طرز کے گنبد بنے ہیں۔ محل میں خوشنما بیلیں، نفیس گلدستے اور روح پرور نقوش اس خوبصورتی سے کھدے ہیں کہ دیکھ کر انسان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ فرگسن صاحب کی رائے کس قدر صحیح ہے کہ "بیربل اور ترکی سلطانہ کے محلات فتحپوری کی عمارتوں میں سب سے زیادہ بیش قیمت اور خوبصورت ہیں اور اکبری عمارتوں میں اپنی صنعت و تناسب کے باعث ممتاز ہیں" اور یہ حقیقت ہے کہ شاہی عمارتوں میں ایسے عمدہ نقش و نگار اور تصاویر عنقا ہیں۔

یہ محل ایسے مرتفع پلیٹ فارم پر واقع ہے کہ یہاں سے ہرن مینار ہتھیا پول دروازہ، کارواں سرائے، جھیل اور وسیع میدان جنگ کے مناظر بخوبی نظر آتے ہیں۔ پہلے اس محل کے چاروں طرف سنگین پردہ بنا ہوا تھا جو اب ٹوٹ چکا ہے۔ محل میں ہندو اور مغل دونوں آرٹس کارفرما ہیں اپنے زمانہ میں بہترین چیز ہو گی۔

انگریزی عملداری میں کچھ عرصہ ریونیو آفیسرز اس میں اقامت کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد افسران معائین اور معزز مہمانوں کے لئے وقف رہا۔ ۱۹۰۵ء سے محکمہ آثار قدیمہ کی حفاظت میں آ گیا ہے اور اب اس کی دیکھ بھال ہونے لگی ہے۔

بیربر کا اصلی نام راجہ مہیش داس ہے آپ کا نام اکبر کے ساتھ

...ں طرح آتا ہے جیسے سکندر کے ساتھ ارسطو کا نام، لیکن اقبال میں ...طو کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ اگرچہ منصب دو ہزاری سے زیادہ سے ...ک بڑھ سکا لیکن اکبری عنایت کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں لاکھوں کے ...ہینوں میں ہو جاتے۔ "صاحب السیف والقلم" کا خطاب حاصل تھا ...خاص محرم راز اور جگری دوست تھا۔ خلوت و جلوت میں بادشاہ ... اور رہتا۔ ظرافت کی جان اور تسریت کی روح رواں کہیں تو ...ہو گا۔ اسی ہتھیار سے قریب بر ہمن ہو کر اکبری نورتنوں میں جا ... ہوا۔ بادشاہ کے دل و دماغ میں اس قدر راہ پائی کہ جب اس کے ...ی خبر پہنچی تو بادشاہ نے دو دن تک کھانا نہ کھایا۔ جب تک اکبر ...م زندہ ہے بیربر کا ذکر خیر بھی عوام و خواص سب میں ہوتا رہے گا۔

شاہی محلات کا دروازہ

"ہتھیا پول" محلات شاہی عالیشان دروازہ ہے۔ ۴۹ فٹ بلند ہے۔ دروازے کے دونوں طرف ۱۳ فٹ اونچے ہاتھی بنے ہوئے تھے ...ر دونوں کی سونڈوں سے محراب بنتی تھی۔ شاہ عالمگیر کے حکم سے ...رے گئے۔ اس دروازہ سے گزرنے کے لئے سترہ فٹ تو اونچے چوڑے ...اور گیارہ فٹ اونچے رستے کو طے کرنا پڑتا ہے۔ دروازہ کے دونوں طرف پاسبانوں کے لئے کمرے اور اوپر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں ...جو کبوتر خانہ اور سنگین برج سے متواصل ہیں۔ کبوتر خانہ کی بھدی سی عمارت ...کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ شاید شاہی دور میں بارود خانہ کے طور استعمال ہوتی ہو۔

محلاتِ ابوالفضل و فیضی

یہ محلات بلند دروازہ سے چند قدموں کے فاصلہ پر واقع ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے الگ الگ بنے ہوئے ہیں۔ ابوالفضل کا محل پہلے آتا ہے۔ لمبے لمبے ستونوں کا برآمدہ جس پر خوبصورت نقاشی کی ہوئی ہے ...دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ اشعار پڑھنے پر دریافت کرنے کی ضرورت ...نہیں رہتی کہ یہی ابوالفضل جیسے بلند اقبال انسان کا دولتکدہ ہے ...جس کا گہوارہ اور عزم و حزم کا پتلا تھا۔ یہی وہ تاریخی مقام ہے ...جہاں بادشاہ کے حکم سے عبدالنبی صدر جیسے علامہ روزگار ابوالفضل ...کے ہاں نظر بند رہے۔ یہی وہ بلند مرتبت قصر ہے جس میں کئی بار اکبر ... چلا آیا۔ اسی میں ہندوستان بھر کے اکبری دور کے حکیم ہمام ...رفیع الدین شیرازی۔ راجہ مان سنگھ اور دیوان ٹوڈرمل جیسے اعلیٰ دماغ

جمع ہو کر حکومت کے مفاد کی تجاویز سوچا کرتے تھے۔

ابوالفضل اکبر اعظم کا وزیر اعظم اور مخلص دوست تھا۔ مشکل چوبیس سال کی عمر ہوگی کہ اکبر کی باریابی نصیب ہوئی۔ مزاج شناسی، خدمت، اطاعت فرمان، علم و لیاقت اور ظرافت بامتانت سے اس طرح اکبر کا دل ہاتھ میں لیا کہ ہر وقت روئے سخن انہی کی طرف ہوتا۔ اکبر نے بہت جلد پرکھ لیا کہ ابوالفضل انشا پردازی کا بادشاہ ہے اس لئے اس کو دارالانشا کی خدمت سپرد ہوئی۔ چنانچہ اکبرنامہ، آئین اکبری، مکتوبات علامی میں اپنے مطلب کو پاک خیالات اور سادہ الفاظ میں اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ ہزار رنگینیاں اس پر قربان ہوتی ہیں اور جتنا لکھتا گیا ہے عبارت کا زور اسی قدر بڑھتا چلا گیا ہے۔ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جایئے کیا مجال کہ طبیعت میں تھکن معلوم ہو۔ سنہ ۱۶۰۲ء میں جہانگیر کی سازش سے علم و ادب کا یہ چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ اکبر کو جونہی ابوالفضل کے قتل کی اطلاع ملی۔ اس قدر غمناک اور بیقرار ہوا کہ کئی دن تک دربار نہ کیا۔ بار بار افسوس کرتا اور ڈاڑھیں مار مار کر روتا اور کہتا "ہائے شیخو جی! بادشاہت لینی تھی تو مجھے مارنا تھا بیچارے ابوالفضل نے تیرا کیا بگاڑا تھا"۔ ابوالفضل کی بے سر لاش پہنچی تو تڑپ اٹھا اور کہا ؎

شیخ ما از شوق بیحد چوں سوے ما آمدہ
ز اشتیاق پائے بوسی بے سر و پا آمدہ

دوسرا مکان ابوالفضل کے بڑے بھائی فیضی کا ہے۔ یہ بھی اپنے بھائی کی طرح علامہ روزگار اور بے نظیر شاعر تھے سنہ ۱۵۹۲ء میں اپنے گھر ہی کے اندر ضیق النفس استسقا اور خونی قے کی شدت سے نڈھال ہو کر وفات پائی۔

۱؎ مولانا محمد حسین آزاد دربار اکبری کے صفحہ ۴۸۴ میں لکھتے ہیں کہ "ابوالفضل کی لاش اٹھانے والا کوئی نہ ہوا کہ جہاں گرا وہیں ہی خاک کا پیوند ہوا۔ آج تک انتری میں اس کا مزار مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ اس سے پہلے صفحہ ۴۷۴ پر اس کی بے سر لاش کا آگرہ میں آنا بیان کرتے ہیں۔ بیان میں اس قدر تفاوت ہے کہ دونوں واقعات ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں۔ محققین خود تحقیق کی زحمت گوارا فرمائیں اور بے سر لاشہ کا دربار میں آنا غلط ثابت ہو تو درستی فرمادیں۔ (مؤلف)

اقبالؔ

نظم

از حضرت عاصم جے پور

ایک مرکز پر پہنچ جاتے ہیں جب دل اور دماغ — صلح کر لیتے ہیں جب آپس میں آندھی اور چراغ
فلسفہ جذبات سے ہوتا ہے جب شیر و شکر — عقل کر لیتی ہے جب بیعت جنوں کے ہاتھ پر
معتدل ہوتی ہے جب تاثیرِ اضداد چمن — چومتی ہے دانۂ شبنم کا منہ اک اک کرن
نقطہ مل جاتا ہے جب آغاز سے انجام کا
وقت ہوتا ہے نزولِ رحمتِ الہام کا

جس سے ہو جاتے ہیں سب اجزائے ہستی مستنیر — جس سے احساسات بن جاتے ہیں آوازِ ضمیر
جس سے رنگینی جھلکتی ہے سحر کی شام سے — فاش ہوتی ہے حقیقت پیکرِ اصنام سے
جس سے ہوتی ہے خدائی بندگی کی ہم نوا — آئینہ بنتی ہے جس سے تیرگی تنویر کا
یہ حقیقت وہ ہے جس کا درس حکمت نام ہے
جس طرح اقبال کا ہر شعر اک الہام ہے

جس کا اک اک لفظ ہے اک آیتِ فکرِ رسا — مانتی ہے جس کو دنیا شاعری کا معجزا
یوں ٹپکتا ہے بیاں سے سوز و سازِ آرزو — ہو نمود رنگ گل سے جس طرح احساسِ بو
لفظ بن جاتے ہیں جب آئینۂ حسنِ خیال — جیسے ہوتی ہے محبت ملہمِ شانِ جمال
نعرۂ مستانہ ایسا شعر کی صورت میں ہے
وہ لبِ اقبال پر ہے جو دلِ فطرت میں ہے

وہ مفکر شعر کی دنیا میں جس سے انقلاب — جس کا اندازِ بیاں تصویرِ جوش و اضطراب
دیکھ سکتا ہے جو دانہ میں جمالِ نخلِ طور — جو دکھا سکتا ہے غیبت کو ہم آغوشِ حضور
رازِ فطرت وقف ہے جس کے تامل کے لئے — تنگ دنیا جس کی پروازِ تخیل کے لئے،
شعر اس کے مسئلے ہیں ٹھوس نفسیات کے — فلسفہ بھی اس کا پُر ہے سر بسر جذبات سے
صور پھونکا اس نے ایسا اعتمادِ نفس کا — جاگ اٹھی خواب سے گویا امیدِ ارتقا
ہو گیا پیدا دلِ غمگیں میں حسنِ اعتماد — بن گیا احساسِ ناکامی تقاضائے جہاد
اس کی دلسوزی پیامِ عزم ہے ماتم نہیں
یعنی اس کی آہ بھی لحنِ رجز سے کم نہیں

تعارف

ایک ایکٹ کا ڈراما

نوشتہ:- پرسیول وائلڈ

ترجمہ جناب شہاب سلمانی

افراد:-

دوشیزہ

نوجوان

مقام:- "ایک سمر ہوٹل"

(گرمیوں کے ایک گرم اور اکتا دینے والے دن کی شام کا وقت ہے ہوٹل کا برآمدہ خالی معلوم ہو رہا ہے لیکن حقیقتہً وہ خالی نہیں ہے۔ اس کے اندرونی کونے میں ایک بہت زیادہ حسین اور خوبصورت دوشیزہ ایک آرام کرسی پر لیٹی ہوئی ہے۔ سنہرے بالوں کی ایک لٹ منہ پر پڑی ہے جو سانس کی ذرا سی تبدیلی پر ہلنے لگتی ہے۔ اس کی گود میں ایک خوبصورت لیس کا حسین ہیٹ رکھا ہوا ہے۔ ایک بہت عمدہ رنگ کی چھتری ایک بے پروائی سے پڑے ہوئے ہاتھ میں زمین سے لگی ہوئی رکھی ہے اور دوسرے خوبصورت سفید ہاتھ میں جو ہیروں سے آراستہ نہیں کیا گیا ہے ایک بہت چھوٹا سا ریشمی دھاگوں سے کاڑھا ہوا رومال رکھا ہے۔

ناظر پہلی ہی نظر میں اسے ایک ساحرۂ دلربا کے نام سے پکارے گا اس کی دوسری نظر موزوں الفاظ کی تلاش پر مجبور ہوگی جو اس کے حسن وجمال کے اظہار کے لئے موزوں ہوں۔ کیونکہ وہ "جو کچھ ہے" ہے اس کی خوبصورتی بیان سے باہر ہے۔ اس کے نرم رخساروں کا شہابی رنگ شباب کی شعاع رنگیں ہے۔ دوسرے اوپری ذرائع کبھی اس قدرتی رنگ کو نہیں پہنچ سکتے اس کا سارا جسم حسن وخوبصورتی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ اس کے انداز اور چہرے سے معصومیت ٹپکتی ہے ایک معصوم کلی ہے جسے ابھی باد شمیم نے نہیں چھوا ہے کیا؟ یہ ناظر کیا بڑبڑا رہا ہے؟ کیا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ سب عورتیں سوتے وقت ایسی ہی معصوم اور خوبصورت نظر آتی ہیں؟ یہ بات اس کی بدذوقی کی دلیل ہے! ——— اس دوشیزہ کی وہ سرگوشی نما سانس جو اس کے نصف کشادہ ہونٹوں سے نکل رہی ہے۔ بالکل اس ساز کی سی معلوم ہوتی ہے جو اس وقت بجتا ہے جب "لوبان" اور "لیس" میں خواب استراحت کے مزے لے رہی ہوتی ہیں ——— اس ساحر نواز خراٹوں کا ساز۔

ایک وقفہ! ——— وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتی ہے اور اسی لمحہ ایک فلالین کے سوٹ میں ملبوس نوجوان داخل ہوتا ہے۔ وہ خوبصورت ہے اور آنکھیں بڑی بڑی ہیں وہ صنف نازک کے افراد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا ہے۔ وہ ٹینس کا پجاری ہے اور اس وقت بھی ٹینس کا لباس زیب تن کئے ہوئے ہے اور ہاتھ میں ریکٹ ہے۔ لیکن محو خواب دوشیزہ کو دیکھ کر اس پر ایک برقی اثر ہوتا ہے۔ وہ یک دم رک جاتا ہے اور دوشیزہ کی طرف آنا دانہ پسندیدہ نظریں ڈالتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ بغیر شور پیدا کئے، ایک کرسی سرکا کر دوشیزہ کے قریب بیٹھ جاتا ہے۔

دوسرا وقفہ! ——— صاف دکھائی دے رہا ہے کہ وہ دوشیزہ نہیں جاگے گی۔ وہ گہری نیند میں ہے۔ یہ بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوجوان اسے نہیں پہچانتا اور یہی مسئلہ وہ حل کرنا چاہتا ہے کہ وہ کس طرح اس کو جگائے اور اس سے تعارف حاصل کرے تھوڑی دیر بعد اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس مسئلہ کو حل کر لیا ہے وہ آہستہ سے جھکتا ہے اور بڑی ہوشیاری سے دو تین جھٹکے دے کر دوشیزہ کے ہاتھ سے رومال چھڑا دیتا ہے اور فرش پر رکھ دیتا ہے۔ ہیٹ اور چھتری کا نمبر رومال کے بعد آتا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ اپنی بھنویں سکیڑ کر بقیہ مسئلے کے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے کس طرح سے جگایا جائے اتنے میں ایک تیز درد اس کو اپنے ٹخنے پر معلوم ہوتا ہے اور خود بخود اس کا ہاتھ ٹخنے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ چپکے سے اس مچھر کو پکڑ لیتا ہے جو وہاں میٹھا میٹھا کاٹنے میں مشغول ہے۔ وہ جلدی سے مچھر کو دوشیزہ کے برہنہ بازو پر رکھ دیتا ہے اور اس پر ایک چپت رسید کرتا ہے۔ دوشیزہ ایک چیخ کے ساتھ جاگتی ہے)

دوشیزہ — اوہ!

نوجوان — (تیزی سے ایک رومال نکال کر دوشیزہ کا بازو پونچھتے ہوئے) میں نے ایک مچھر آپ کے بازو پر مارا ہے۔

دوشیزہ — مچھر؟

نوجوان — ہاں! (رومال پر مرے ہوئے مچھر کو دکھاتے ہوئے) کتنا مہلک اور متعدی بیماری پھیلانے والا جانور ہے۔ کیوں نا؟

دوشیزہ — (خمار بھرے انداز میں) ہاں!

(اور نوجوان کو حیرت زدہ کرتے ہوئے وہ خاموشی سے گھومتی ہے اور پھر سے سونے کی تیاری کرتی ہے)

نوجوان — (بغیر رکے ہوئے) ذرا سننا! (وہ جواب نہیں دیتی) ذرا سننا۔

دوشیزہ — (بڑبڑاتے ہوئے) ہاں!

نوجوان — آپ کا رومال نیچے گر پڑا ہے۔

دوشیزہ — اوہ ——— (وہ چپکے آپ کو نیند کے لئے اور آرام دہ کر لیتی ہے) کیا تم اسے کرسی پر رکھ دو گے؟

نوجوان — ہاں ہاں کیوں نہیں، ضرور ضرور، بڑی خوشی کے ساتھ! (وہ بہت زیادہ شور کے ساتھ اس کے احکامات کی تعمیل کرتا ہے) آپ کا ہیٹ ——— اور یہ چھتری! (وہ جواب نہیں دیتی) میں آپ کے ہیٹ اور چھتری کا کیا کروں؟ (جواب میں ایک ساز نما خراٹے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ دوشیزہ کی چیزیں ہاتھ میں لئے غصہ میں سر ہلاتا ہے یکایک وہ برآمدہ کی جالی کے پاس دوڑتا ہے اور یک خیالی راہرو کو کان پھاڑ دینے والی چیخوں سے مخاطب کرتا ہے) جمی! ——— او ——— اوہ ——— ارے او جمی! ارے بھئی سننا! (دوشیزہ خوفزدہ ہو کر سیدھی بیٹھ جاتی ہے نوجوان کنکھیوں سے یہ دیکھ لیتا ہے) جمی! (دوشیزہ کے ہیٹ کو زور زور سے ہوا میں ہلاتے ہوئے)۔

دوشیزہ — کیوں چلا رہے ہو؟

نوجوان — کیا تم ٹینس کورٹ جا رہے ہو جمی؟

دوشیزہ — مجھے میرا ہیٹ دے دیجئے۔

(وہ متفکرانہ گھبرائی ہوئی اٹھتی ہے)

نوجوان — (جالی پر بہت زیادہ دور تک جھکتے ہوئے) میرا سگریٹ کیس وہاں سے لیتے آنا جمی!

دوشیزہ — میرا ہیٹ مجھے دے دیجئے۔

نوجوان — (مڑتے ہوئے اور دوشیزہ کے سامنے ہوتے ہوئے) ارے! معاف کیجئے گا (وہ ہیٹ لیتی ہے اور متفکرانہ نظروں سے اس کو دیکھتی ہے) کیا میں نے آپ کی نیند خراب کی؟

دوشیزہ — (معصومیت سے) ہاں! آپ نے مجھے جگا دیا۔

نوجوان — اوہ! مجھے بہت افسوس ہے! میں قطعی بھول گیا۔ میں بھی کتنا بیہودہ ہوں۔ کیا آپ مجھے معاف نہ کریں گی؟

دوشیزہ — (نوجوان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے) ہاں!

نوجوان — شکریہ! بیٹھ جائیے نا۔ آپ تو کھڑی ہی ہوئی ہیں۔

دوشیزہ — لیکن ——— لیکن ——— ہم ایک دوسرے سے متعارف نہیں

نوجوان — اوہ! کوئی بات نہیں۔

دوشیزہ — (سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے) نہیں کوئی بات ہے!

نوجوان — بلا مبالغہ! بے شک! (وہ مسکراتا ہے) آپ ہی وہ دوشیزہ ہیں جو کینس بی سے بیاہی جانے والی ہیں۔

دوشیزہ — کیا؟

نوجوان — رونالڈ کینس بی! جو لندن میں رہتا ہے۔

دوشیزہ — ہاں! (ایک شرارت آمیز ہنسی کے ساتھ) آپ کو کیسے معلوم ہوا؟

نوجوان — اوہ! اسی نے مجھ سے کہا۔ کینس بی میرے گہرے دوستوں میں سے ایک ہے۔ اور وہ لڑکی کی بہت تعریف کرتا ہے

دوشیزہ — اور لڑکی؟

نوجوان — میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا، لیکن پھر بھی ایک ہی نظر میں آپ کو پہچان گیا۔ کیونکہ وہ آپ کے متعلق صبح دوپہر شام، ہر وقت باتیں کیا کرتا تھا۔ آپ کی آنکھیں! آپ کے بال! آپ کی سحر زا آواز! ——— میں آپ کو بالکل اسی طرح پہچانتا ہوں گویا ——— گویا میں اور آپ ہمیشہ ایک دوسرے کے دوست ہوں۔

دوشیزہ — اوہ! (وہ مسکراتی ہے) اور آپ کینس بی کی پسند کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں؟

نوجوان — میں مانتا ہوں۔ واقعی اس کا انتخاب لاجواب ہے (اس کا لہجہ مسرت فزا اور شیریں ہے) میں جانتا تھا کہ آپ سے میری یہاں ملاقات ہو گی۔ کینس بی نے مجھے بتایا تھا، اس نے کہا کہ ہا جگہ آپ سے ملنے کی بہت کچھ امید ہے۔ اور اس نے کہا کہ میں خود ہی جا کر آپ سے تعارف کر لوں۔

دوشیزہ — اچھا ———

نوجوان (گلاس کو ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے) میں کینس بی کو مبارکباد دیتا ہوں ——— میں تہ دل سے اس کو مبارکباد دیتا ہوں

دوشیزہ ـ شکریہ ـ اچھا اور اب بتوتے کیا کہنا ہے (مجھ پر زور دیکر) ... آپ سے

دوشیزہ ـ کیا آپ مجھے مبارکباد نہیں دینگے (لفظ مجھ پر زور دیکر)

نوجوان ـ علاوہ، دنیا اس کارخیر کو انجام دیگی ـ کینس بی ایک نوجوان شخص ہے ـ وہ ایک اعلیٰ خاندان کا فرد ہے ——— وہ مالدار ہے ' اس کے پاس بہت روپیہ ہے ——— اور وہ حسین ہے ـ

دوشیزہ ـ (سر ہلاتے ہوئے) ہاں! ——— اخبارات اس کے نام سے بھرے پڑے ہیں

نوجوان ـ اخبارات؟ اجی ان کے کئی رپورٹر ایسے ہیں جو صرف کینس بی پر مقرر ہیں کہ جہاں وہ جائے اس کے ساتھ رہیں اور اس کی خبریں ان تک پہنچا سکیں ـ (مسکراتے ہوئے) وہ رات کو اس سوچ میں جاگتا رہتا ہے کہ ان سے کس طرح پیچھا چھڑائے ـ

دوشیزہ ـ ... لکھا کرتے تھے کہ وہ ہر ہفتہ ایک نئی لڑکی سے منگنی کرتا ہے ـ

نوجوان ـ کیا تم نے یہ بھی پڑھا تھا؟ (وہ سر ہلاتی ہے) اور ان ماؤں کی خبر بھی جنھوں نے اپنی لڑکیوں کو کینس بی کے پیش کیا ـ چمکیلی آنکھوں والی، یا سیاہ آنکھیں رکھنے والی ـ لانبے قد کی یا پستہ قد دبلی پتلی یا موٹی تازی، عقلمند یا سادہ لوح ـ روپیہ دو اور اپنی پسند پاؤ ـ

دوشیزہ ـ وہ ان سے بچ نکلا؟

نوجوان ـ خوش قسمت تھا!

دوشیزہ ـ (اپنے پہلے سوال پر آتے ہوئے) لیکن آپ نے مجھے ابھی تک مبارکباد نہیں دی ہے ـ

نوجوان ـ تو کیا مجھے مبارکباد دینی چاہیئے ـ سوچئے! ایک شخص ایک لڑکی سے ملتا ہے ـ وہ خیال کرتا ہے کہ وہ لڑکی بہت عجیب و غریب دنیا کی تمام لڑکیوں سے زیادہ حسین سب سے زیادہ ہوشیار اور سب سے زیادہ خوبصورت ہے اور وہ اس کی بے عزتی کرتا ہے ـ بہت بُری طرح اس کی بے عزتی کرتا ہے ـ اس طرح کہ وہ خود بینی کے طور پر سوچتا ہے کہ وہ ساری دنیا میں ... اور تعجب خیز لڑکی ضرور اس کی رائے کو ماننے کو تیار ہو جائے گی ـ

دوشیزہ ـ (ہنستے ہوئے) تو کیا یہ صحیح نہیں ہے؟ ورنہ پھر تو حسین لڑکیاں کبھی بھی شادی نہیں ... ـ

نوجوان ـ (دانت نکالتے ہوئے) شاید ـ میرا خیال ہے کہ میں اور آپ بہترین ساتھی ثابت ہو رہے ہیں ـ

دوشیزہ ـ کیا آپ کا یہ خیال ہے؟

نوجوان ـ مجھے اس کا پورا یقین ہے! میں اور کینس بی بچپن سے ساتھ رہے تھے ـ لہذا کینس بی کی بیوی کو ضرور میرا دوست ہونا چاہیئے ـ

دوشیزہ ـ (بھولے پن سے مسکراتے ہوئے) کیونکہ وہ کینس بی کی بیوی ہے ـ

نوجوان ـ تو کیا یہ دلیل ٹھیک نہیں ہے؟

دوشیزہ ـ ہاں (وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہے) میرا خیال ہے ——— میرا خیال ہے کہ تمہارا دوست بننے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی ـ

نوجوان ـ (دلی جذبات کے ماتحت) شکریہ!

دوشیزہ ـ میرا خیال ہے کہ آپ ایک بہت عمدہ قسم کے دوست ہونگے اگر ——— (وہ ٹھہرتی ہے) لیکن پہلے یہ بتلایئے کہیں آپ نے غلطی تو نہیں کی؟

نوجوان ـ غلطی؟

دوشیزہ ـ اگر میری کینس بی سے شادی نہیں ہو رہی ہو؟

نوجوان ـ لیکن آپ کی شادی تو اسی سے ہوگی ـ

دوشیزہ ـ (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) نہیں!

نوجوان ـ آپ کا کیا مطلب ہے؟

دوشیزہ ـ میرا مطلب ہے ——— میرا مطلب ہے کہ آپ نے لڑکی کے پہچاننے میں غلطی کی ہے ـ

نوجوان (جلدی سے) لیکن میں نے غلطی قطعی نہیں کی ـ

دوشیزہ ـ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں نے اپنی تمام عمر میں ایک بار بھی کینس بی کو نہیں دیکھا ـ

نوجوان ـ کیا؟

دوشیزہ ـ اور اگر میں اس سے ملی ہوتی تو کوئی بات بھی نہ تھی ـ آپ جانتے ہیں کہ میں کینس بی کے لائق نہیں ہوں ـ میری کوئی قدر نہیں ہے ـ میرا کوئی خاندان نہیں ہے اور نہ ہی میرے پاس زیادہ روپیہ ہے (وہ مسکراتی ہے) آپ خیال بھی نہیں کر سکتے کہ میں کتنی کم قیمت ہوں

نوجوان ـ (بہت گھبرا جاتا ہے) اوہ!

دوشیزہ ـ اور کینس بی اکیلی ہی جگہ پڑتی ہے ـ ...

کا چمپین ہے۔ جو کشتی چلانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ جو بہترین قسم کے قصوں کا ماہر ہے۔ وہ شخص جس کی شاید! میری ہستی اس کے سامنے اتنی حقیر ہے کہ ——— بیان سے باہر!

نوجوان۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ صحیح کہتی ہوں۔

دوشیزہ۔ ٹھیک ہے۔ معافی چاہتی ہوں۔

نوجوان۔ نہیں غلطی انسان سے ہوتی ہے۔ معافی چاہنا گدھوں کا کام ہے

دوشیزہ۔ (مسکراتے ہوئے) اچھا تو مجھے لڑکی کی بابت بتائیے۔ مجھے بہت دلچسپی ہے یہ معلوم کرنے کے لئے!

نوجوان۔ آپ کیا معلوم کرنا چاہتی ہیں؟

دوشیزہ۔ جب آپ نے مجھے وہ لڑکی سمجھا؟ سب کچھ! کیا وہ خوبصورت ہے؟

نوجوان۔ ہاں بہت خوبصورت!

دوشیزہ۔ اور ہوشیار اور عقلمند بھی؟

نوجوان۔ ہاں کیٹس بی ایسا ہی خیال کرتا ہے۔

دوشیزہ۔ اور تم؟

نوجوان۔ میں کیٹس بی کے خیالات کو غلط نہیں مانتا۔

دوشیزہ۔ بڑے ہوشیار دوست ہو! کیا وہ جوان ہے؟

نوجوان۔ نہیں ——— یا ایسی ہی کچھ ہے۔

دوشیزہ۔ خوش قسمت لڑکی ہے (وہ ٹھہرتی ہے) کیا آپ کا خیال ہے کہ کیٹس بی دراصل اسے چاہتا ہے؟

نوجوان۔ ہاں میرا یہی خیال ہے۔

دوشیزہ۔ (مسکراتے ہوئے) میں کروڑپتیوں کو ہمیشہ "پکے ہوئے مددگار" سمجھتی تھی۔

نوجوان۔ نہیں نہیں، کیٹس بی بہت خلیق ہے۔

دوشیزہ۔ اتنا روپیہ ہونے ہوئے بھی؟

نوجوان۔ ہاں اتنا روپیہ ہوتے ہوئے بھی۔ (اس کی آواز دھیمی ہو جاتی ہے) تم جانتی ہو جب کیٹس بی اس سے پہلی مرتبہ ملا تو اس نے خیال کیا کہ اس نے اپنی بیوی پالی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ کیٹس بی اس سے فوراً محبت کرنے لگا بلکہ ——— اس سے اتنی محبت ہو گئی جتنی کہ اسے دنیا میں کسی اور چیز سے نہیں تھی۔ صرف یہی نہیں تھا کہ وہ حسین، خوبصورت اور عفت مآب تھی بلکہ یہ اس کے خوابوں کی تعبیر تھی، اس کا تصور تھی جو انسانی پیکر میں جلوہ گر ہو گیا تھا۔ یہ وہ لڑکی تھی جو کبھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ دنیا میں موجود تھی۔

دوشیزہ۔ تو کیا کیٹس بی بھی تصورات کی دنیا بساتا ہے (دھیمے دھیمے) کیا وہ بھی تصور میں ہوائی قلعے بناتا ہے؟

نوجوان۔ ایسے تصورات! ——— جن کو وہ [illegible] میں دیکھنا چاہتا ہے۔

دوشیزہ۔ اور کیا اس نے پائے؟

نوجوان۔ (جواب نہیں دیتا ہے۔ تھوڑی دیر کا وقفہ) کیٹس بی اکثر ایک پرانی چینی کہانی سنایا کرتا تھا ——— جس کا ماحصل یہ ہے وہ نہ دکھائی دینے والا ریشمی تاگا جو ہر لڑکے کو جب وہ پیدا ہوتا ہے اس لڑکی کے ساتھ جوڑتا ہے جو اس کی بیوی بننے والی ہوتی ہے۔ وہ نہ دکھائی دینے والا بندھن جو ایک بیت قوس قزح میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک روح سے دوسری روح تک! اور کیٹس بی کہا کرتا تھا کہ وہ اپنی قوس قزح کے اختتام پر بجائے ایک سونے کے پیالے کے ایک سونے کا دل پائے گا! ——— یعنی اس لڑکی کو جو جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے۔ اس کی بیوی بنا دی گئی ہے۔

دوشیزہ۔ (ایک بہت بڑے وقفہ کے بعد) کتنا کم عقل! کتنا خوبصورت اور دل پسند!

نوجوان۔ کیا تم سمجھتی ہو گی کہ وہ خوش ہو گا؟ کیا تم سمجھ سکتی ہو کہ اس کے جسم کی رگ رگ خوشی سے چلا اٹھی ہو گی جب وہ اس سے ملا ہو گا؟

دوشیزہ۔ نہیں! (وہ مسکراتی ہے ——— غمگین سی مسکراہٹ) میری کتنی بڑی آرزو ہے کہ میں ایسے آدمی سے ملی ہوتی ——— اس آدمی سے میری دوستی ہوتی جس کے یہ محسوسات ہوں (وہ ٹھنڈی سانس بھرتی ہے) اوہ! لیکن ایسی باتیں نہیں ہوتیں ——— تمہارا قوس قزح کا بندھن، کبھی نہیں تھا کبھی نہیں ہو گا۔ (ایک لمبا وقفہ ——— چاروں طرف اندھیرا پھیلنے لگا ہے۔ اور رات کی آمد صاف طور سے ظاہر ہو رہی ہے۔ دور فاصلہ پر روشنیاں جھلملا رہی ہیں) جب تم واپس جاؤ۔ (وہ کھڑی ہوتی ہے اور نوجوان کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے) جب تم واپس جاؤ تو کیٹس بی سے کہنا ——— کہنا کہ تم ایک ایسی لڑکی سے ملے جو اسے محسوس کرتی تھی ——— اس سے کہنا کہ تم ایک ایسی لڑکی سے ملے جو اپنی تمام زندگی اس تصور میں رہی

"گونی" اس کے تصور میں آئے ——— ایک آدمی جو تخیلات کی دنیا بسا سکے ——— کیٹس ہی کی طرح! اس سے کہنا ——— کہنا تم ایک ایسی لڑکی سے ملے، جو شاید اس سے محبت کر سکتی! اور کہنا ——— (لیکن نوجوان اسے روک دیتا ہے اور اس کو اپنی … کرتا ہے ——— اور فاتحانہ اپنے سینہ میں بھینچ لیتا ہے)

نوجوان - بیوقوف نہ بنو پیاری ——— (اس کی آواز صرف ایک سرگوشی ہے ——— بہت ہلکی سرگوشی) بیوقوف نہ بنو ——— میں کیٹس ہی ہوں ———!

(بڑھتے ہوئے اندھیرے میں پردہ گرتا ہے)

غزل

زمیں پہ شیشۂ نازک گرا دیا تم نے

از حضرت نواب غازی گورد صاحب

صلۂ رفاقتِ غم کا یہ کیا دیا تم نے،
مرے دکھے ہوئے دل کو دکھا دیا تم نے

نہ سنگ سخت، نہ آہن کہ چور چور نہ ہو
زمیں پہ شیشۂ نازک گرا دیا تم نے

وہ محوِ جاں ہوں کہ ہچکی سے دم نکل آتا
نہ یاد کی یہ ثبوت وفا دیا تم نے

نہ آ سکے سر بالیں تھیں کہاں فرصت
اجل نہ آئی اُسے کیا سمجھا دیا تم نے

طبیب سر بگریباں عزیز خاک بسر
عجیب روگ ہمارے لگا دیا تم نے

تہِ مزار بجز خاک اب دھرا کیا ہے
نشانِ قبر بھی ہے ہے مٹا دیا تم نے

برہمنوں نے ہزار آگ دی ہو مُردوں کو
وہ دیندار ہو زندہ جلا دیا تم نے

نگاہ جانبِ در ہے تو گوش بر آواز
زمیں خانہ کو درباں بنا دیا تم نے

امید و بیم کی جانکاہیاں معاذ اللہ
ہلاہل آبِ بقا میں پلا دیا تم نے

طریق ظلم جو دشمن سے بن نہ آیا تھا
زہے کرم وہ برت کر دکھا دیا تم نے

بہار آئی ہے نسریں کھلے سمن پھولے
یہ دل تو خاک میں گویا ملا دیا تم نے

ستم ستم کہ جسے آندھیوں نے گل نہ کیا
وہ لالۂ تہِ داماں بجھا دیا تم نے

مرے خدا! نہ شبستاں میں زلزلے آئیں
بُرا کیا دلِ غازی ہلا دیا تم نے

نظم

حسنِ سوگوار

از جناب مرزا صابر مٹیالوی

سرنگوں ہے تربتِ شوہر پہ حسنِ سوگوار — اس کی اُمیدوں کا مرکز اس کے عاشق کا مزار
فرقتِ عاشق میں ہے کافر جوانی بیقرار — حسن کو گزری محبت کی جُدائی ناگوار
دُکھ بھری روداد کہنے آئی ہے باحالِ زار — لب پہ آہ سرد، چہرہ زرد، آنکھیں اشکبار
اب نہ وہ مخمور آنکھیں اب نہ وہ شاداب ہونٹ — اب نہ وہ ذوقِ خود آرائی نہ وہ سولہ سنگھار
اب اداؤں میں وہ پہلی سی کشش باقی نہیں — اب نہ وہ آرائشِ گیسو نہ زلفِ تابدار
اب نظر آتی نہیں ہونٹوں پہ سُرخی پان کی — اب نہیں ہے زیرِ لب برقِ تبسم آشکار
اب بپا ہوتا نہیں محشر خرامِ ناز سے — اب نہیں ہے چاند سے ماتھے پہ جھومر کی بہار
فقر و فاقہ نے اُڑا ہے پھول سے چہرے کا رنگ — مفلسی کی سُرخیاں چینِ جبیں سے آشکار
بال ہیں بکھرے ہوئے اور غم سے چہرہ ہے نڈھال — روتے روتے کر رہی ہے عرض اپنا حالِ زار
چھوڑ کر تنہا مجھے جنجال کے گرداب میں — کی مرے سرتاج نے گوشہ نشینی اختیار
یاد ہیں وہ نور میں پھیلی ہوئی راتیں ابھی — تھی بہاروں پر جوانی اور جوانی پر بہار
تنگدستی میں نہیں ہے آج کوئی دستگیر — کوئی مونس ہے نہ پرساں ہے نہ کوئی غمگسار
سوکھی روٹی بھی ہمیں قسمت سے ہاتھ آتی نہیں — اور دولت کے نشہ میں چُور ہیں سرمایہ دار
دوسرا دن ہے کہ بچے بھوک سے بیتاب ہیں — یاالٰہی تجھ پہ روشن ہے بخوبی حالِ زار
فکرِ روزی، گریۂ اطفال، بیمِ قرض خواہ — ایک جانِ ناتواں ہے اور رنج بیشمار
دیکھ کر بچوں کو روتا آہ رو دیتی ہوں میں — ابرِ بہمن کی طرح رہتی ہیں آنکھیں اشکبار
اب دوا دارو کو پاس اک پھوٹی کوڑی تک نہیں — کون دیتا ہے زمانے میں غریبوں کو اُدھار
دُکھ بھری بپتا سناؤں میں کسے تیرے سوا — بیکسوں کا کون ہے تیرے سوا اے کردگار
شافی الامراض تو ہے قاضی الحاجات تو — تو اگر چاہے مرا بیڑا ہو بحرِ غم سے پار

شکوہ از دل کے تراود نہ گردد دل دونیم
چوں زبانِ خامہ شق گردد نگوید یا کریم

اردو کا شیکسپیئر

نظیر اکبرآبادی اُردو کی وہ مایۂ ناز شخصیت ہے جو بجا طور پر یورپ کے [illegible]ل فخر شعرا کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے اور سارے اُردو شاعروں [illegible] یہ حق حاصل ہے کہ انھیں متحدہ ہندوستان کا شاعر کہا جا سکے قدیم اُردو شاعروں میں نظیر ہی ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے قدیم [illegible] طریقۂ غزل گوئی کے علاوہ اپنے لئے ایک نئی راہ تجویز کی اور اپنا دامن درباری اور ذلیل خوشامدانہ شاعری سے بچائے رکھا۔ انھوں نے سرمایہ پرستوں کی کاسہ لیسی کو چھوڑ کر جمہور اور عوام کے خیالات اور [illegible]بات کی ترجمانی کی، اور جاگیر دارانہ نظام میں رہتے ہوئے غریبوں اور [illegible]وں کی بے اطمینانیوں کو آشکارا کیا چنانچہ ان کے اشعار [illegible]وں کے مصائب۔ زمانہ کے گوناگوں انقلابات اور بے ثباتی دنیا کی ایک [illegible]ندہ تصویر ہیں۔

اس سرمایہ پرستی کے زمانہ میں چونکہ اُردو ادب پر سرمایہ پرست شاعروں اور ادیبوں کا تسلط تھا اس لئے غریب نظیر کو دنیائے شعر و ادب میں کوئی جگہ نہیں دی گئی اور انھیں مبتذل اور فحش گو کہہ کر اُردو شاعروں کی فہرست سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد جب جدید دور کا آغاز ہوا تو اس میں بھی مولانا آزاد نے اپنے مشہور تذکرہ "آبحیات" [میں] دیگر ممتاز شعرا کی طرح نظیر اکبرآبادی کو بھی شاید اس وجہ سے ساقط الاعتبار ٹھہرایا کہ خود اُردو کی جدید شاعری کے بانی کا رتبہ حاصل کر سکیں۔ مولانا [آز]اد کے علاوہ دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی نظیر کو بالکل نظر انداز کر دیا کیونکہ ان کی سطحی نظریں ان کے کمالات شاعری کا اعتراف کرنے سے بالکل قاصر تھیں۔ اس وقت سب سے پہلے جس شخص نے نظیر کی شاعری کی خوبیوں کا اعتراف کیا وہ اُردو زبان کے مغربی محقق ڈاکٹر فیلن تھے جنھوں نے اپنی اُردو زبان کی ڈکشنری میں نظیر کے کلام کو بطور سند پیش کیا ہے اور نظیر اکبرآبادی کی شاعری کا اعتراف ان [الفا]ظ میں کیا ہے۔

"شعرائے ہند میں سے فقط نظیر اکبرآبادی ہی ایک ایسا شاعر ہے [جس کا] معیار [حقیقی] شاعری کے معیار پر پورا اترتا ہے اور صحیح معنوں [illegible]

نظیر اکبرآبادی کی شاعری پر ایک نظر

از جناب حافظ سید رشید احمد ارشد مولوی فاضل منشی فاضل ادیب فاضل

[illegible] میں شاعر کہلانے کا مستحق ہے۔ نہ ہندوستانی جن کے نزدیک الفاظ معانی کی نسبت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اُسے شاعر ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں لیکن اس کی شہرت و مقبولیت کو اس سے بٹہ نہیں لگتا۔ اس کی ذات ان تمام ذہنی اور جذباتی خوبیوں کی حامل ہے جو ایک پختہ کار شاعر میں ہونی ضروری ہیں؟"

اسی طرح خدا بھلا کرے پروفیسر شہباز صاحب کا جنھوں نے نہایت جانفشانی سے نظیر اکبرآبادی کے اعزہ کے ذریعہ سے ان کے حالات زندگی فراہم کئے اور ان کی کلیات سے عوام کو روشناس کیا۔

سوانح حیات

نظیر کا نام سید ولی محمد تھا وہ سنہ ۱۱۴۲ھ میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام سید محمد فاروق تھا۔ ہوش سنبھالنے پر آگرہ کے مشہور جلیل القدر علما مولوی محمد کاظم اور ملا ولی شارح مثنوی مولانا روم کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے ہندی، سنسکرت اور معمولی طور پر پنجابی زبان بھی سیکھی تھی۔ بچپن ہی سے نظیر کو شاعری کا شوق تھا اور آگرہ کی مجالس شعر و سخن نے اس شوق کو اور بھی بھڑکا دیا تھا لیکن فطری باکمال شاعروں کے مانند انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ چونکہ شاعرانہ مزاج اور رنگین طبیعت پائی تھی اس لئے جوانی میں لہو و لعب اور مختلف تفریحات میں مشغول رہے اور عوام کی مختلف سوسائٹیوں میں شامل ہو کر ان کے مختلف کھیلوں میں حصہ لینے لگے۔ جن میں پیراکی، شطرنج، کنکوے بازی، موسیقی، گانا بجانا، میلوں، ناٹکوں، سوانگ، اور تماشوں وغیرہ میں حصہ لینا بھی شامل تھا۔ اس طرح ان تفریحی مشاغل سے انھیں عوام کی مختلف سوسائٹیوں سے بخوبی واقفیت ہو گئی تھی اور وہ ان کی معاشرت و تمدن، خیالات و جذبات سے اس قدر متاثر ہو گئے تھے کہ بالآخر انہیں اپنی شاعری کا رستہ بھی تبدیل کرنا پڑا اور اس طرح انھوں نے اُردو زبان میں ایک نئی قسم کی شاعری کی بنیاد ڈالی جس سے اُردو زبان

ابھی تک قائم تھی۔

شاعر موصوف نوجوانی کی سرمستیوں میں ابھی تک مشغول ہی تھے کہ ایک سورج مل جاٹ تباہی کا دیوتا بن کر آگرہ شہر پر چھا گیا اور آگرہ میں بدامنی، قتل و غارت اور تباہی کا ایسا دور شروع ہوا کہ اس شاعر موصوف کی آنکھیں کھول دیں۔ اس وقت ان کی عمر ۲۸ سال کے قریب تھی ان کی بےفکری اور خوشحالی کا زمانہ ختم ہو گیا اور مصیبت و افلاس نے ان پر اپنا تسلط جما لیا۔ مگر چونکہ ان کی طبیعت قانع، غیور اور خوددار تھی اس لئے انھوں نے اپنی شاعری کو شاہی درباروں میں پیشہ بنانا گوارہ نہ کیا اور یہ نہیں پسند کیا کہ انشا کی طرح درباری بھاٹ بن کر اپنی فطری قابلیتوں کو ضائع کریں بلکہ تعلیمی پیشہ کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ چنانچہ مختلف امرا اور ہندو عمائدین کے بچوں کو پڑھا کر گزر اوقات کرنے لگے۔ اس عرصے میں ان کی شاعری کی شہرت دور دراز علاقوں میں پہنچ گئی تھی، اور شاہ اودھ، راجہ بھرت پور اور راجہ چندو وزیر معظم حیدر آباد نے بارہا اصرار کے ساتھ بلوایا مگر ان کی خوددار طبیعت نے درباری تعلقات سے آلودہ ہونا گوارا نہ کیا اور گوشہ نشینی اور قناعت کو خوشامد اور چاپلوسی پر ترجیح دی۔ آخر عمر میں وہ شہر کے ایک ہندو رئیس لالہ بلاس رائے کے بچوں کو سترہ روپیہ ماہوار کی معمولی تنخواہ پر پڑھانے جایا کرتے تھے۔ اور گھر پر بھی فارسی کا مکتب قائم کر رکھا تھا۔

ان کی شادی چغتائی خاندان کی ایک شریف خاتون تہور النساء بیگم بنت عبدالرحمٰن چغتائی خلف محمد علی بیگ صوبہ دار برہانپور سے ہوئی تھی اور ان سے ایک صاحبزادہ سید گلزار علی اسیر اور ایک صاحبزادی امامی بیگم پیدا ہوئیں۔ ان کے صاحبزادے گلزار علی اسیر بھی اچھے خاصے شاعر اور تعلیم یافتہ آدمی تھے اور باپ کے انتقال کے بعد ان کے مکتب کے نگراں مقرر ہوئے تھے۔

وفات

وفات سے چند سال پہلے ۱۲۳۳ھ میں ان پر مرض فالج کا حملہ ہوا، جس سے وہ بالکل معذور ہو گئے تھے اور آخر کار ۹۸ سال کی عمر میں ۲۶ صفر ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے اور اپنے مکان میں نیم کے درخت کے نیچے مدفون ہوئے۔ ہزاروں ہندو اور مسلمان ان کے جنازے میں شریک تھے اور ان کے مرنے کے بعد مدتوں تک ان کا عرس بھی ہوتا رہا۔

اخلاق و عادات

نظیر اکبرآبادی جیسا کہ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے نہایت وسیع المشرب آدمی تھے۔ انکساری، حلم و بردباری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، نہایت ملنسار، متواضع اور خلیق آدمی تھے اور اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں ہردلعزیز تھے۔ نہایت زندہ دل، ظریف اور خوش مزاج آدمی تھے اور آخر عمر میں تو بالکل صوفی صافی بن گئے تھے اور مشائخ وقت کی صحبت نے ان کی طبیعت میں ایسا زبردست انقلاب پیدا کر دیا تھا کہ وہ دنیا کی بےثباتی، غریبوں، مسکینوں کی ہمدردی کی ہر وقت تلقین کرتے رہتے تھے۔ اور ان کی شاعری بھی اسی مقصد کے لئے وقف ہو کر رہ گئی تھی۔ خود بھی غریبوں اور فقیروں کی بروقت امداد فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ مختلف پیشہ ور لوگ فرمائش کر کے اپنے پیشہ کی تعریف و تحسین میں ان سے اشعار لکھوا لیتے تھے اور وہ ان کی درخواست کو بخوشی پورا کرتے تھے کیونکہ ان کا مقصد زندگی اور مطمح شاعری عوام اور غریبوں کی امداد کرنا اور ان کے جذبات و عواطف کی ترجمانی کرنا رہا تھا اس طرح ان کی شاعری جنس سرراہ بن گئی تھی۔ چنانچہ مختلف خوانچہ فروشوں، مداریوں، قلندروں اور گداگروں نے ان سے نظمیں لکھوائیں جو عوام میں بیحد مقبول ہوئیں۔

تصانیف

دیوان اور کلیات کے علاوہ ان کی اور تصانیف بھی ہیں۔ جن میں قصہ لیلیٰ مجنوں، مثنوی حسن و عشق، بزم عشق، رعنائے زیبا قدر متین، اور انشا و نثر میں انشائے بےنظیر مشہور ہیں۔ انھوں نے سہ نثر ظہوری کے طرز پر بھی ایک کتاب لکھی تھی لیکن ان کی یہ کتابیں عام طور پر غیر مطبوعہ اور نایاب ہیں۔ نظیر اکبرآبادی نے فارسی میں بھی شعر کہے ہیں اور انشا کی طرح دوسری زبانوں میں بھی تضمینیں اور مستزاد وغیرہ کہے ہیں۔

نظیر نے دو لاکھ سے زیادہ اشعار کہے لیکن اکثر حصہ ضائع ہو گیا۔ اب موجودہ کلیات میں تقریباً چھ ہزار اشعار موجود ہیں جن میں ۲۷ غزلیں، ایک قصیدہ، بیس واسوختیں، ۵۸ مخمس، ۲۳ مسدس، دو ترکیب بند، ایک مستزاد، ایک مربع اور ۹۵ نظمیں ہیں۔ ایک غیر مطبوعہ دیوان بھی دستیاب ہوا ہے جس میں نظمیں

نظمیں موجودہ کلیات سے زیادہ ہیں اور جن سے ان کے شاعرانہ کمالات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

خصوصیات شاعری

نظیر اکبرآبادی اردو زبان کے وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے قدرتی مناظر پر نظمیں لکھیں اور فرضی تخیلات کے دائرے سے نکل کر حقیقت نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ اور جن چیزوں کو ہم ان کے محاسن شمار کرتے ہیں انہی کی بنا پر وہ قدیم شاعروں میں مقبول نہیں ہو سکے ان غریب کا محض یہ قصور ہے کہ انھوں نے قصیدہ وغزل کو اپنے لئے باعث ناز نہ سمجھا۔ جس طرح غالب کو محض اس لئے مہمل گو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے فارسی تراکیب استعمال کیں اسی طرح نظیر کو محض اس بنا پر مبتذل اور فحش گو کہا جاتا ہے کہ انھوں نے عوام کی سیدھی سادی زبان استعمال کی اور روزمرہ کی معمولی چیزوں پر نظمیں لکھیں۔

یہاں یہ موقع نہیں کہ نظیر کے برخلاف اعتراضات کی تردید کی جائے اور دوسرے شاعروں سے مقابلہ کرکے ان کے محاسن کو واضح کیا جائے تاہم یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر کلیات نظیر کا کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کیا جائے تو پڑھنے والوں کو ہندوستان کے تمدن و معاشرت عوام کے جذبات وخیالات ان کے تہواروں اور میلوں، مختلف پیشہ وروں یہاں تک کہ جانوروں کے متعلق صحیح اور زندہ تصویر ملے گی ان کے کلام میں مختلف انسانوں کے کیریکٹر اور ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ نہ صرف مسلمانوں کے رسم و رواج کا ذکر ہے بلکہ ہندوؤں کی معاشرت کی مرقع نگاری بھی کی گئی ہے۔ نیز پند ونصائح فلسفیانہ اور گہرے خیالات کا بھی ایسا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے جیسا شیخ سعدی اور دیگر بلند پایہ شعراء کے حکیمانہ کلام میں دستیاب ہو سکتا ہے۔ آج کل چند مایہ ناز شاعروں کے پیدا ہونے کے باوجود اردو شاعری میں ان کی جگہ خالی ہے۔ اس بنا پر نظیر کی خصوصیات شاعری کو اس لئے نمایاں کیا جا رہا ہے کہ انھیں پیش نظر رکھ کر ان امور کی جانب توجہ دی جائے جن کی آج کل بھی ضرورت ہے۔

نغمہ انگیز شاعری

نظیر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر مخمس اور مسدس طرز پر نظمیں لکھی ہیں اور ان کے لئے ترنم آمیز بحریں استعمال کیں۔ اس وجہ سے ان کی نظموں میں اس قدر موسیقیت پیدا ہو گئی ہے کہ ساز و ترنم میں ان کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اور وہ گیتوں کی طرح نغمہ آفریں اور روح پرور بن جاتی ہیں۔ اسی دلکشی کی بنا پر ان کی نظمیں عوام میں بہت مقبول ہوئیں اور انہی کی مقبولیت کی وجہ سے شاعر موصوف کا نام زندہ رہا ورنہ ہمارے ادیب اور نقاد انھیں ہمیشہ کے لئے بزعم خود دفن کر چکے تھے۔

موجودہ زمانہ میں اچھے اردو گیتوں اور ترنم آمیز نظموں کی بہت بڑی کمی ہے اور اس کمی کی بنا پر عوام میں ڈراموں اور سینما کے ذریعہ سے ہندی نظمیں اور گیت رائج ہو کر اردو کو نامقبول بنا رہی ہیں لیکن اگر مخمس طرز کو جو نظیر نے زیادہ استعمال کی ہے گیتوں میں اختیار کیا جائے تو غالباً یہ اردو طرز کے مطابق ترنم اور موسیقی پیدا کرنے میں کامیاب رہے گی۔

جمہور کا شاعر

نظیر اکبرآبادی کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کلام میں مقامی اور ہندوستانی فضا اور ماحول کا رنگ بدرجہ اتم موجود اور نمایاں ہے نیز جس طرح فطرت نگاری، نیچرل شاعری اور وصف نگاری کے عناصر کو سب سے پہلے انھوں نے اردو شاعری میں داخل کیا بعینہٖ اسی طرح جمہور کے جذبات وخیالات کی ترجمانی کا فرض بھی سب سے پہلے انھوں نے ادا کیا۔ اس زمانے میں سوشلزم اور مساوات و جمہوریت کے نعرے تو بلند نہیں ہوتے تھے لیکن روٹی کا سوال عوام کے پیش نظر ضرور تھا۔ مفلسی اور غربت کی تباہ کاریاں، امراء کے مظالم اور فرعونیت، غریبوں کے مصائب اور تکلیف کا احساس انھیں بہت زیادہ تھا اور ان کا اظہار ان کی شاعری کا پہلا فرض منصبی تھا چنانچہ اتنی معلومات کی بنا پر وہ کارگاہ عالم کے انقلابات پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور انسان کے مختلف زمانوں کے اثرات کو خوب واضح کرتے ہیں۔ مفلس کا حال اور مناظر قدرت کا نقشہ بھی جب وہ اپنے الفاظ میں کھینچتے ہیں تو ورڈزورتھ اور دیگر مغربی شعرا کی فطرت نوازیوں کے برعکس وہ ان نیچرل نظاروں میں بھی عوام کی تکلیف نظرانداز نہیں کرتے۔

وسیع معلومات

نظیر کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر ہمیں ان کی ہمہ دانی پر تعجب ہوتا ہے انھیں اپنے ماحول سے گہری واقفیت تھی اور اسی وجہ سے ان میں مقامی رنگ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے جو اس زمانہ میں کہیں کہیں

سوداؔ اور انشاؔ میں پایا جاتا تھا۔

قدرتِ زبان

نظیرؔ کا خزینۂ لغت غیر مختتم تھا اور اسی بنا پر ہر قسم کے خیالات و مطالب ادا کرنے کے لئے ان کے پاس وسیع اور مناسب ذخیرۂ الفاظ موجود تھا۔ وہ محض غزل گو شاعر ہی نہیں تھے کہ گنتی کے مقررہ الفاظ سے کام چلاتے بلکہ انھوں نے نظم کو نثر کی طرح ہر قسم کے خیالات و مضامین ادا کرنے کا ذریعہ بنایا تھا اور اس طرح انھوں نے نئے نئے اچھوتے الفاظ کو نظم میں دینے کا موقع ملا۔ بقول حالیؔ مرحوم کثرتِ الفاظ کے لحاظ سے انھیں میر انیسؔ مرحوم پر ترجیح حاصل تھی چنانچہ اس طریقے سے انھوں نے اُردو زبان کو مالا مال کر کے اس کی زبردست خدمت سرانجام دی۔ سادہ اور موثر طرزِ بیان میں الفاظ کے ذریعہ سے معمولی چیزوں کی ہو بہو تصویر کھینچنا انہی کا حصہ تھا۔ ان کے اشعار سے انتخابِ الفاظ میں ان کے انہماک کا پتہ چلتا ہے۔ وہ محض لفظوں کی آواز سے مخصوص مناظر کی کیفیت پیدا کر کے الفاظ ہی کے ذریعہ سے مصوری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ نظیرؔ صنعتِ تجنیس کے شائق معلوم ہوتے ہیں مگر صنائع و بدائع کا استعمال اعتدال سے ہے اور دور از کار تشبیہات اور استعارات بھی اپنے کلام میں بہت کم استعمال کرتے ہیں۔

انشاؔ سے مقابلہ

اپنے ہم عصروں میں نظیرؔ کا اگر کسی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے تو وہ سید انشاؔ ہیں۔ انشاؔ کی خاص چیز ظرافت نظیرؔ میں بھی پائی جاتی ہے چنانچہ وہ مصائب میں بھی خوش طبعی کے اظہار سے باز نہیں رہتے مگر ان کی ظرافت میں تلخی اور طعن آمیزی نہیں ہے اور نہ ان میں فحش اور ابتذال ہے مگر اس کے برعکس انشاؔ کے کلام میں بھانڈوں کی طرح درباری ظرافت کا نمونہ موجود ہے جس میں اپنی اور دوسروں کی عزت کی بھی پروا نہیں کی گئی ہے۔ بہرحال انشاؔ اور نظیرؔ مندرجہ ذیل امور میں مشابہت رکھتے ہیں۔

(۱) دونوں نے مشکل ردیف اور قافیوں میں طبع آزمائی کی ہے اور عام طور پر ان کی ہم طرح غزلیں بھی پائی جاتی ہیں۔

(۲) دونوں میں مقامی رنگ زیادہ نمایاں ہے نیز ہندی الفاظ کی آمیزش اور ہندوستانی رسم و رواج کا ذکر بھی دونوں میں پایا جاتا ہے۔

(۳) دونوں نے مختلف زبانوں میں اشعار کہے ہیں اور اشعار میں بعض جگہ عربی مصرعے بھی موزوں کئے ہیں۔

(۴) دونوں میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ مگر زبان کی سخت پابندیوں اور قیدیوں سے آزاد ہیں لیکن فارسی اور عربی الفاظ کی صحت کا ضرور خیال رکھتے تھے۔

انشاؔ کے کلام میں نظیرؔ کی بہ نسبت متروکات کم ہیں اور ظرافت کا رنگ بھی بہت زیادہ گہرا اور نمایاں ہے مگر نظیرؔ کی دیگر خصوصیات یعنی مختلف موضوعوں پر مسلسل نظمیں، اشعار میں اثر و موسیقی، نیچرل شاعری، پند و عبرت، اخلاقی شاعری، مسدس و مخمس کا مخصوص طرز، ماحول سے گہری واقفیت، کردار نگاری کا ملکہ، زبردست قوتِ بیانیہ وغیرہ ایسی خصوصیات ہیں جن میں وہ یکتا ہیں اور ان چیزوں سے نہ صرف انشاؔ کا کلام سراسر خالی ہے بلکہ یہ معنی ہ حال میں بھی کوئی شاعر ان کے مقابلہ کا پیدا نہیں ہوا اور انہی خصوصیات کی بنا پر بقول مسٹر سکسینہ وہ شعر و شاعری میں "اردو کا شیکسپیئر" کہلانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

اُردو کا شیکسپیئر

مسٹر سکسینہ اپنی انگریزی کتاب "تاریخِ ادبِ اردو" میں نظیرؔ اکبرآبادی کو "جدید اُردو شاعری کا بانی مبانی اور" اُردو کا شیکسپیئر" قرار دیتے ہیں۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں جو انھوں نے تحریر کیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس زمانہ کے اُردو شعرا میں سے کون کون ڈرامائی اوصاف کے حامل ہو سکتے تھے۔ سوداؔ اپنی ذہانت، عام واقفیت اور ہجو کی وجہ سے "کومیڈی" لکھنے والے بن سکتے تھے مگر ٹریجڈی لکھنے کا مادہ ان میں بہت کم تھا۔ میر تقی میرؔ میں سوز و گداز کا رنگ غالب ہے۔ مگر کردار نویسی سے وہ ناواقف تھے نیز دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ان کی واقفیت محدود تھی۔ انشاؔ تسخر، قوتِ نقالی اور قدرتِ زبان کی وجہ سے کومک ایکٹر بننے کے لئے زیادہ موزوں تھے مگر درباری تعلق نے انھیں خراب کیا۔ نیز تعمقِ خیال بھی ان میں کم ہے۔ میر انیسؔ و دبیرؔ فطری شاعر تھے۔ انھیں زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ سیرت نگاری اور کردار نویسی میں بھی زبردست مہارت رکھتے تھے۔ مگر ان کا دائرہ عمل بہت محدود تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ سب شعرا کامیاب ڈرامہ نگار نہیں بن سکتے تھے۔

نظیرؔ اکبرآبادی میں ان سب سے زیادہ ڈراما لکھنے کی صلاحیت موجود تھی۔ زبان پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ وہ فضائلِ انسانی سے

واقف اور نفسیات کے ماہر تھے۔ چونکہ ملنسار اور خلیق تھے اسی لئے ان کا تعلق مختلف سوسائٹیوں سے قائم ہوگیا تھا اور اس طرح ان کی معلومات بہت وسیع ہوگئی تھیں۔ صنف نسواں کے خصائل اور اوصاف سے بھی ان کی واقفیت کافی تھی مگر پردہ کی وجہ سے معزز گھرانے کی خواتین کے متعلق ان کا دائرہ معلومات محدود تھا۔ تاہم کردار نگاری کا ملکہ اور قوت بیانیہ غضب کی تھی مگر تعمق خیال اور اعلیٰ درجہ کی ذہانت کی کمی ضرور تھی۔ بہرحال ان کی نظم "لیلیٰ مجنوں" ٹریجیڈی کا نمونہ اور "مہادیو کا بیاہ" اجتماعی رنگ میں کامیڈی کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ اب ہم نظیر کی خصوصیات شاعری کو واضح کرنے کے لئے ان کے کلام کا مختصر نمونہ پیش کرتے ہیں۔

وصف نگاری

وصف نگاری میں تو نظیر نے کمال کردیا ہے کیونکہ انھوں نے زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جس کو اپنے اشعار میں نمایاں نہ کیا ہو چنانچہ ان کی کلیات میں جوانی۔ بڑھاپا، بچپن اور ہر موسم کے لحاظ سے برسات، سردی، گرمی نیز ہولی، دیوالی اور تیراکی کے میلوں کا حال بھی موجود ہے یہاں تک کہ جانوروں تک پر انھوں نے نظمیں تحریر کی ہیں جن میں عادات وخصائل کو نہایت دلچسپ پیرایہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ جیسے "ریچھ کا بچہ"۔ "گلہری کا بچہ"۔ "جنگ جانوراں"۔ "بلبلوں کی لڑائی"۔ انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ "کورے برتن" پر بھی جو گرمی کے موسم میں دیہاتیوں کی جان ہے ایک نظم لکھ ڈالی۔

مختلف مضامین پر انھوں نے اس قدر نظمیں لکھی ہیں کہ ان میں سے چیدہ چیدہ نظموں کا نمونہ بھی پیش کرنا طوالت سے خالی نہیں ہوگا اس بنا پر یہاں "ہولی" کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں شاعر موصوف نے محض اپنے الفاظ کے ذریعہ سے ایک عجیب ترنم پیدا کیا ہے اور ہولی کی محفل کی پوری پوری نقل اور مصوری کی ہے ؎

کچھ طبلے کھڑکے تال بجے کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی
کچھ جھڑپیں بین ربابوں کی کچھ سارنگی اور چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے کچھ ڈھمڈھی اور منہ چنگ بجی
کچھ گھنگھرو کھڑکے جھم جھم جھم کچھ گت گت پر آہنگ بجی
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے

تصوف و معرفت

ایشیائی شاعروں پر تصوف کا رنگ غالب ہے اور زمانے کے انقلابات نے نظیر کو بھی آخر میں درویش اور صوفی صافی بنادیا تھا اس بنا پر ان کی آخری عمر کی شاعری ان کے ایک نئے دور کا نمونہ پیش کرتی ہے جس میں ان کے خیالات زیادہ گہرے اور فلسفیانہ ہوگئے تھے اور زبان وبیان میں بھی زیادہ صفائی اور گھلاوٹ آگئی تھی۔

تصوف کے بنیادی اصول "معرفت نفس" یعنی خود شناسی کی اس طرح تعلیم دیتے ہیں ؎

باغ جہاں کے غنچہ وگل میں نہ ہو اسیر
قمری کی سن نفیر نہ بلبل کی سن نفیر
اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیسا ہے اے نظیر
ہے حرف "من عرف" کے یہی معنی اے نظیر
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش ونگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی اپنی بہار دیکھ

جس کام کو جہان میں آیا تھا تو نظیر خانہ خراب تجھسے وہی کام رہ گیا

چمک جا پھر خدا کے واسطے اے طور کے شعلے
کہ مثل آتش افسردہ ہے دل کچھ جلا کھلا

سرشک چشم سے موتی بہت پروئے گئے
ولے یہ داغ جگر کے نہ ہم سے دھوئے گئے
ہماری ان کی یہی عمر بھر رہی صحبت
ادھر وہ ہنستے گئے ہم ادھر سے روتے گئے
نظیر کیا ہی مزہ تھا کہ کل خوشی سے ہم
گئے تھے یار کو لینے سو آپ کھوئے گئے

بے ثباتی دنیا

اخلاق ونصیحت میں نظیر کا انداز شیخ سعدی سے بالکل ملتا جلتا ہے مندرجہ ذیل اشعار میں بے ثباتی دنیا کی تصویر کھینچتے ہوئے کس بیباکی اور حقگوئی کے ساتھ اپنے زمانہ کے امرا اور حکام کو نصیحت کرتے ہیں۔ الفاظ کی شان وشکوہ اور زور واثر قابل ملاحظہ ہے ؎

جو فاقہ کھاتے ہیں کوئی ان سے یہ پوچھو دارا د سکندر گئے آہ کدھر کو
مغرور شہ پر شوکت و حشمت پہ وزیرو اس دولت و اقبال پہ مت بھولو خبر
نے ملک نہ دولت نہ سر انجام رہے گا
باقی فقط اللہ کا اک نام رہے گا

یہ اشعار واقعات کی کتنی صحیح تصویر یاد رکھنے والے سیاسی انقلابات کی کتنی سچی پیشین گوئی تھے۔

درس اتحاد

صوفی مسلک انسان اندر غیر متعصب ہوتے ہیں اسی بنا پر وہ فرقہ دار جھگڑوں میں الجھنا پسند نہیں کرتے۔ نظیر بھی اسی قسم کے انسان تھے۔ وہ مسلم و ہندو اتحاد کے زبردست علمبردار تھے اور اس اتحاد کا کس خوبی سے درس دیتے ہیں ؎

جھگڑا نہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں عاشق تو قلندر ہیں نہ ہندو نہ مسلماں
کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
باقی فقط اللہ کا اک نام رہے گا

خوشامد

نظیر درباری اور خوشامدی لوگوں سے بیحد متنفر تھے لہٰذا ان کی دنیاوی ترقیوں کو دیکھتے ہوئے اصل حقیقت کا راز یوں آشکار کرتے ہیں

چار دن جس کو خوشامد سے کیا جھک کے سلام
وہ بھی خوش ہو لیا اپنا بھی ہوا کام تمام
بڑے عاقل بڑے دانا نے نکالا ہے یہ دام
خوب دیکھا تو خوشامد کی آمد ہے تمام
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

قناعت

خوشامد کے مقابلہ میں شاعر موصوف نے قناعت و صبر کی بیش بہا دولت حاصل کر رکھی تھی۔ جو ان کی بیحد مسرت کا ذریعہ تھی۔ چنانچہ ایک مقام پر خود فرماتے ہیں ؎

دنیا نہ کہو اس کو یہ باغ ہے سربستہ
کیا دست نے قدرت کے باندھا ہے یہ گلدستہ

ہر آن ہنسی ہر آن خوشی ہر وقت امیری ہے بابا
جب عاشق مست فقیر ہوئے پھر کیا دلگیری ہے بابا

افلاس میں ادبار میں اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

کارگاہ عالم پر نظر

نظیر کے کلام کا اہم ترین حصہ وہ ہے جس میں وہ کارگاہ عالم کے انقلابات پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور شکسپیر کی طرح ایک حکیم اور فلسفی کی حیثیت سے دنیا کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہیں۔ جمہور کے شاعر ہونے کی وجہ سے وہ موجودہ نظام معاشرت سے مطمئن نہیں تھے لیکن فطرت کی عدل پرستی پر انہیں پورا اعتماد تھا۔ جاگیردارانہ نظام اور سرمایہ پرستانہ ماحول میں رہتے ہوئے بھی انہیں غریبوں اور مفلسوں سے گہری ہمدردی تھی۔ چنانچہ "مفلسی" پر ایک نظم لکھی ہے جس میں اخلاق پر مفلسی کے برے اثرات اور مفلسوں کی پریشانیوں کا دردناک نقشہ اس طرح پیش کیا ہے ؎

مفلس میں ہو دیں لاکھ اگر علم اور کمال سب خاک بیچ آ کے ملاتی ہے مفلسی
مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر دیتا ہے اپنی جان وہ ہک ایک نان پر
ہر گز کسی کے دل کو نہیں ہوتی اسکی چاہ جس طرح کتے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی
دنیا میں کیسے شاہ سے لے یار تا فقیر خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر
اشراف کو بناتی ہے اک آن بیچ حقیر کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیر
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

غیر منصفانہ تقسیم

ایک اور نظم "آدمی نامہ" میں انسان کے مختلف درجوں کا مقابلہ اور امیر و غریب کا فرق نہایت سادہ انداز میں یوں واضح کیا ہے ؎

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں دوڑتے کہار اور اس میں جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
سو سو طرح سے عیش کے کرتے ہیں رنگ ڈھنگ اور خاک میں پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
کمخواب و تاش شال دو شالوں میں غرق ہے
اور چیتھڑے لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ایک سوشلسٹ اور اشتراکیت پسند بھی نظامِ معاشرت کی بے انصافی اور غیر منصفانہ تقسیم کو ان سے بہتر الفاظ میں نہیں کر سکتا۔

فطرت کی عدل پرستی

فطرت کی عدل پرستی اور مکافات اصول کو انھوں نے اپنی کئی نظموں میں واضح کیا ہے ان میں سے یہ نظم "کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ لے اس ہاتھ دے" بہت مشہور ہے ان کی ایک دوسری نظم "کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف اور عدل پرستی ہے" بہت مشہور اور موثر ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے
جو اور کا اونچا بول کرے تو اس کا بول بھی بالا ہے
اور دے پٹکے تو اس کو کوئی اور پٹکنے والا ہے
بے جرم و خطا جس ظالم نے مظلوم ذبح کر ڈالا ہے
اس ظالم کے بھی لوہو کا پھر بہتا ندی نالا ہے

جو اور کسی کی جاں بخشے تو حق اس کی بھی جان رکھے
جو اور کسی کی آن رکھے تو حق اس کی بھی آن رکھے
جو یاں کا رہنے والا ہے وہ دل میں اپنے جان رکھے
یہ ترت پھرت کا نقشہ ہے اس نقشے کو پہچان رکھے
کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

یہ اشعار موجودہ نازک دَور میں جبکہ ظالم اور جابر انسانوں کے [illegible]یہ سے دنیا میں تباہی مچی ہوئی ہے ایک انقلاب آفریں پیشنگوئی کا کام دے رہے ہیں۔

ظلم و استبداد، سرمایہ پرستی، درباری اور جاگیردارانہ ذہنیت کے خلاف نظیر کا جہاد بالقلم ہمیشہ رہا۔ اسی طرح نظیر نے فریب کاروں اور مکر و تلبیس سے کام لینے والے افراد کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کی تھی چنانچہ فرماتے ہیں ؎

کوئی ہے عاقل کوئی ہے فاضل کوئی نجومی لگا کہنے
بوجھا ہو کوئی یہ بھید کھولے یہ سب ہیں حیلے یہ سب بہانے
چڑے بیٹھے ہیں فلکوں دھا کر ڈھونڈ نپٹ تہ ہزار سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

رنگ تغزل

اب ہم اس میدان میں قدم رکھتے ہیں جو شعرائے اردو کی خاص جولانگاہ تھا اور جس میں نظیر کو کمتر سمجھا جاتا ہے مگر ان کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس رنگ میں جذبات تخیل اور صفائی بیان کے لحاظ سے اپنے ہم عصر شعراء سے کسی طرح کمتر نہیں ہیں، ان کی غزلوں میں میر کا سوز و گداز، گہرے جذبات، "بلندی تخیل"، روزمرہ اور محاورات کی چاشنی شوخی و ظرافت سبھی کچھ موجود ہے۔ بلکہ ان کی بعض غزلیں اپنے طرز بیان میں جدید رنگ تغزل کا نمونہ پیش کرتی ہیں چنانچہ ہم اس دعوی کے ثبوت میں ان کی مختلف غزلوں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

میر کا رنگ

یہ ناز ہے یا استغنا ہے یا طرز تغافل ہے یارو
جو لاکھ کوئی تڑپے سسکے فریاد کرے کچھ دھیان نہیں
کچھ بن نہیں آتا کیا کیجیے کس طور سے ملئے اے ہمدم
وہ دیکھ ہمیں رک جاتا ہے اور ہم کو چین اک آن نہیں

سُنتے ہی نام محبت کا تھر تھراتے ہیں ‌ ‌ ‌ یہ کچھ تو حال ہے تیرے ستم کے دہلوں کا

نہ دن کو چین نہ راتوں کو خواب آنکھوں میں ‌ ‌ ‌ بھر آ رہی ہے ترے غم سے آب آنکھوں میں
جدھر ڈھونڈیکھیے ادھر صف کی صف الٹ دیجے ‌ ‌ ‌ بھری ہے شوخی کی ایسی شراب آنکھوں میں
تمام اشک نے نیند آئی نہ پلک جھپکی ‌ ‌ ‌ بسا ہے جب سے وہ خانہ خراب آنکھوں میں

دیکھ لے اس چمن دہر کو جی بھر کے نظیر ‌ ‌ ‌ پھر ترا کاہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

ابھی کہیں تو کسی کو نہ اعتبار آئے
کہ ہم کو راہ میں اک آشنا نے لوٹ لیا

طرز عاشق کے آفات کے صدموں میں نظیر
کام مشکل تھا پر اللہ نے آسان کیا

ایک دلگداز نظم

مندرجہ ذیل مخمس میں آج کل کی غزلوں اور نظموں کا سا سوز و گداز، اثر اور معانی بیان پایا جاتا ہے اور مایوسی اور قنوطیت کا گہرا جذبہ موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:

نہ زیب کعبہ نہ دیر مغاں کی زینت ہیں — نہ صحن تربت ہیں گلستاں کی زینت ہیں
کوئی کہے تو بھلا ہم کہاں کی رونق ہیں — رہیں نہ شمع جو بزم جہاں کی رونق ہیں
ہمارا کیا ہے اگر ہم رہے رہے نہ رہے

میاں چاہو تو آنکھوں میں ہم پہ بسر راہ — یہ آرزو ہے تمہیں دیکھ دیں بھر کے نگاہ
بھلا وقت تو رخصت کا آنگا اب آہ — تو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم ہیں نوک گیاہ
مثال دانۂ شبنم رہے رہے نہ رہے

ہم اپنے درد کو اب کس طرح کریں اظہار — کہ فرصت عمر کی ٹھہری ہے آکے مثل شرار
کسی کی آرزو پہ بھلا دیں اپنے دل کو قرار — بقا ہماری جو پوچھو تو جوں چراغ مزار
ہوا کے بیچ کوئی دم رہے رہے نہ رہے

بتوں کے عشق میں جینے سے ہاتھ دھو لیجے — جو صبر و ہوش کو کھونا ہو اب کھو دیجے
جہاں تلک بنے اشکوں سے منہ دھو لیجے — یہی ہے عزم کہ جی بھر کے خوب رو لیجے
کہ کل یہ دیدۂ پرنم رہے رہے نہ رہے

نوائے راز

زندگی کس طرح ہوئی برباد؟

از حضرت ابوالفاضل راز چاندپوری

فکر دنیا سے ہو گیا آزاد — میکدہ! تیرا میکدہ آباد
لٹ گیا اس دیار میں فریاد — اے خدا! اے خدائے حسن آباد
اللہ اللہ یہ نگاہ کرم — شکر صد شکر او ستم ایجاد
یہ نظام جہاں کی نیرنگی — کوئی پابند ہے کوئی آزاد
میں خطاوار ہوں یقیناً ہوں — دیجیے داد کیجیے بیداد
راہ ہستی کی سختیاں توبہ — ہر قدم پر ہے اک نئی افتاد
یک بیک ہو گیا یہ کیا مجھکو — کیا بتاؤں کہ آ گیا کیا یاد؟
جانتا ہوں بتا نہیں سکتا — زندگی کس طرح ہوئی برباد
ہو گیا جلوۂ خودی باطل — خانۂ عشق حق نما آباد
انتہا ہے یہ سرفرازی کی — بینوا اور صاحب ارشاد

راز کب تک رہیگا یوں خاموش
کوئی نغمہ، غزل، کوئی روداد؟

جگر اور اعزاز

دو ہم طرح غزلیں

مرسلہ جناب محمد مطیع خاں دیوانہ اعظم گڑھی

حضرت جگر مرادآبادی

عشق کی کیفیتیں کب دل میں پنہاں ہوگئیں
رنگِ رُخ بن بن کے میرا سب نمایاں ہوگئیں

ڈوب کے دل میں وہ نظریں تیر و پیکاں ہوگئیں
رہ گئیں جو دل کے باہر نشترِ جاں ہوگئیں

اور بھی میرے لئے آفت کا ساماں ہوگئیں
ہائے وہ مخمور آنکھیں جب پشیماں ہوگئیں

عشق کی بھی مشکلیں ہیں موت کی بھی مشکلیں
یا وہ آساں ہوگئیں اب یا یہ آساں ہوگئیں

ان جنوں سامانیوں پر کیا رہائی کی اُمید
حشر میں بھی دفن زیرِ خاکِ زنداں ہوگئیں

ہو چلی تھیں عرضِ غم پر وہ نگاہیں تیز تیز
پھر نہ جانے کیا خیال آیا پشیماں ہوگئیں

عشق کی بیتابیاں کب چھوڑ سکتی ہیں مجھے
فرق آنا … آنکھوں سے پنہاں ہوگئیں

حضرت اعزاز کلیمی اعظم گڑھی

حشر میں کس طرح رسوائی کا ساماں ہوگئیں
دل میں پوشیدہ ہوئیں رُخ سے نمایاں ہوگئیں

کون گزرا ہے اِدھر سے بول اُٹھے نقشِ قدم
خاک پر جتنی لکیریں تھیں رگِ جاں ہوگئیں

حُسن کی وہ سب ادائیں جن پہ ان کو ناز تھا
میرے دل کی جب ہوئیں مالک تو ارماں ہوگئیں

گر نہیں اُن کی نگاہِ گرم خضرِ راہِ عشق
رات کیوں آہیں مری آتش بداماں ہوگئیں

کُنتُ کنزاً کے نہاں خانے میں تھیں نیرنگیاں
جوش پر آئیں بہارِ بزمِ امکاں ہوگئیں

تھی جلالی شان کو شانِ جمالی کی تلاش
بزمِ ہستی میں یہی مل جل کے انساں ہوگئیں

جل گئیں جو ہستیاں اعزاز سوزِ عشق سے
درحقیقت وہ چراغِ راہِ عرفاں ہوگئیں

جن عورتوں کے ہاں اولاد نہ ہوتی ہو

کیسی عورت مرد کی تندرستی کو کئی برس گذر جائیں اور پیری تک ان کے ہاں اولاد نہ ہوتی ہو یا کسی اندرونی اور نامعلوم خرابی کے باعث عورت کو حمل نہ ٹھہرتا ہو یا وہ لوگ جو بچے کے لئے ترستے ہوں۔ اور ان کے ہاں بچہ پیدا نہ ہوتا ہو تو ایسی حالت میں صرف ایک ہی ترکیب ہے جس کے بعد عورت کو حمل ٹھہر جائیگا اور برسوں کی تمنا پوری ہو جائیگی۔ یعنی اس ترکیب پر عمل کرنے کے بعد اولاد پیدا ہونے لگے گی۔

عورت کو حمل ٹھہرنے کی ترکیب

موجودہ زمانے کی تحقیقات اور کئی سال کی مسلسل کوشش کے بعد ایک ایسی عجیب غریب دوا تیار ہوئی ہے۔ جسے اگر روزانہ سات دن تک مسلسل ایک ایک خوراک عورت کو کھلائی جائے۔ ان سات دنوں میں وہ ...... بالکل علیحدہ رہے۔ اور ٹھیک آٹھویں رات ...... تو اسی آٹھویں رات عورت کو حمل ٹھہر جائیگا۔ اس دوا کا نام "محافظ اولاد" ہے۔ اور تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ مسلسل سات دن تک اس دوا کے استعمال سے عورت کا اندرونی جسم (یعنی بچہ دانی) بالکل تندرست اور نیچرل حالت میں آجاتا ہے۔ اور جب آٹھویں رات ...... تو اس کو اسی رات حمل ٹھہر جاتا ہے اور پھر نو مہینے بعد وہ اپنی گود میں بچہ دیکھ لیتی ہے۔ ایک شیشی دوا "محافظ اولاد" میں ایک عورت کیلئے پوری سات خوراک دوا ہوتی ہے اور اس کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ جس کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ نمبر ۲۴۳ بی دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر یہ دوا بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیں پارسل پر سات آنے محصول ڈاک خرچ ہوگا۔

عورت کی ظاہری جوانی

عورت کی شروع جوانی میں ہی اگر اس کا سینہ یعنی پستان ڈھیلے اور نرم ہو کر نیچے کو گرے ہوئے معلوم ہوں تو یہ بہت بدصورتی کہلاتی ہے ایسی عورت میں شباب کی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ یہ خرابی عورت کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے پر مجبور ہو جائے یا کسی بیماری یا بداحتیاطی کے باعث بھی عورت کا سینہ (یعنی پستان) ڈھیلے ہو کر بدنما معلوم ہونے لگتے ہیں اور وہ عین جوانی میں ہی شباب کی کشش ختم کر بیٹھتی ہے

ایسی عورت پھر نوجوان لڑکی نظر آسکتی ہے

سائینس کی جدید کرشمہ سازی کی بدولت ایک ایسی بیش بہا دوا تیار ہوئی ہے جس کے استعمال سے عورت کے ڈھیلے اور نرم اور نیچے کو گرے ہوئے پستان دوبارہ گول اور سخت ہو کر عورت کو از سر نو جوان لڑکی کے روپ میں پیش کرنے لگتے ہیں۔ اور اس پر شباب کی رنگینیاں پھر اپنی بہار پھیلا دیتی ہیں۔ یہ لگانے کی دوا ہے اور اس کا نام "برسٹین" ہے یہ وہی دوا ہے جس کی بدولت اب تک سینکڑوں عورتیں اپنے سینہ میں دوبارہ شباب کا رنگ بھر چکی ہیں اور اب کافی عمر کے باوجود نوخیز لڑکیاں نظر آتی ہیں اس دوا کا سب سے زبردست ثبوت یہ ہے کہ اس کے ہر روز کا استعمال عورت کو ثابت کرتا رہتا ہے کہ کتنی جلدی اس کے سینہ میں دوبارہ ابھار اور سختی پیدا ہو رہی ہے۔ جن عورتوں کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۲۴۳ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر ایک شیشی "برسٹین" بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیں ایک شیشی ایک عورت کو پوری طرح جوان لڑکی بنا دینے کی طاقت رکھتی ہے اور اس سے سینہ کی سب خرابیاں دور ہو کر مستقل ابھار اور سختی پیدا کر دیگی۔ ایک شیشی "برسٹین" کی قیمت چار روپے پندرہ آنے ہے۔ پارسل پر صرف سات آنے محصول ڈاک ہوگا۔

نوٹ:- اگر کوئی بچہ عورت کی گود میں ہے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ دوا بچہ کے دودھ پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ اور بچہ نہایت اطمینان کے ساتھ دودھ پیتا رہیگا۔ کیونکہ دوا کسی حال میں نقصان نہیں کرتی۔

پگلی

نفسیاتی افسانہ

جناب محمد قمر دین رام نگری

"یہ لیجئے بابو جی!" ڈاکیہ نے زرین کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کے نام کا خط آیا ہے۔"

زرین نے لفافہ ہاتھ میں لیکر دیکھا اور جلدی جلدی کھول کر بغور اسے پڑھنے لگا۔ خط پڑھ کر اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ وہ دوڑتا ہوا گھر میں گیا۔

ماں بیٹھی ترکاری کاٹ رہی تھی۔ چھوٹی بہو چولہے پر چاول کی دیگچی چڑھائے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ بہن نندا پوجا کا سامان جمع کرنے میں مصروف تھی۔ آبھا برآمدے میں بیٹھی زرین کے بڑے لڑکے بھانو کو پڑھا رہی تھی۔ اتنے میں زرین نے آکر مسرت آمیز لہجے میں کہا "ماں! آج بھیا آ رہے ہیں۔"

ماں ترکاری چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ چھوٹی بہو۔ نندا، آبھا، بھانو سب نے دوڑ کر زرین کو گھیر لیا۔ زرین بلند آواز سے خط پڑھنے لگا۔

"شری چرن کملیشو ماں!

میں ایک مہینے کی چھٹی لے کر گھر آ رہا ہوں۔ آج یہاں سے چل کر گھر تک کل پہنچوں گا۔ باقی باتیں بوقت ملاقات

آپ کا سیوک بیرین"

بیرین آج ایک مدت کے بعد گھر واپس آ رہا تھا۔

ماں خوش ہو کر بولی۔ "کتنے دن بعد آج میرا بیٹا میری گود میں آ رہا ہے!"

آبھا نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا "بھیا صبح کی گاڑی سے نو بجے گھر آ جائینگے کیوں نہ کاکا بابو؟"

بھانو اچھلتا ہوا بولا۔ "اہا! دادا میرے لئے گھوڑا لائینگے دیکھنا... یہ ہٹ ہٹ!" وہ دونوں پاؤں کے درمیان لاٹھی رکھ کر گھوڑا دوڑانے لگا۔

گھر میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جسے بیرین کی آمد کی اطلاع نہ ہوئی ہو۔ محلہ پڑوس کے لوگوں کو بھی یہ بات معلوم ہو گئی تھی۔ مگر سب سے پہلے جسے یہ بات معلوم ہونی چاہئے تھی اسے بدقسمتی سے معلوم نہ ہو سکی تھی۔ آج زندہ ہوتے ہوئے بھی جیسے کسی کے نزدیک زندہ نہ تھی۔ بیرین کے آنے کی جسے سب سے زیادہ خوشی ہوتی وہ یکلخت نظر انداز کر دی گئی تھی۔ اس کی طرف کسی کا خیال بھی نہ گیا تھا۔

بیرین کے آنے کی خبر سے گھر کے تمام لوگ شاد و مسرور نظر آ رہے تھے۔ آبھا جس نے عرصہ سے باپ کو نہیں دیکھا تھا خوشی سے تھرکتی پھر رہی تھی مگر یکایک ماں کا خیال آتے ہی اس کا جی نہ جانے کیسا ہو گیا۔

وہ گھر کے آدمیوں سے چھپتی چھپاتی چوروں کی طرح اس کی طرف چلی۔ بلند اور وسیع کوٹھی کے اکثر حصے ویران پڑے تھے مگر اس کی ماں کو اس میں رہنے کے لئے جگہ نہ تھی۔ وہ کوٹھی کے پیچھے ٹین کی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں ڈال دی گئی تھی۔

آبھا ڈرتی سہمتی کوٹھری کے پاس گئی۔ کچھ سوچ کر اس نے آہستہ سے پکارا۔ "ماں! —— ماں!" ونودنی پیچھے کی طرف منہ کئے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ آبھا کی پکار پر اس نے کوئی دھیان نہ دیا۔

آبھا نے پھر پکارا۔ "ماں، او ماں!"

آج خلاف امید ونودنی کھڑکی پر آ بیٹھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے آبھا کو دیکھ رہی تھی جیسے اس نے بہت روز کے بعد دیکھا ہو!

پھر اس نے اپنے دبلے پتلے کمزور ہاتھوں کو کھڑکی سے باہر نکال کر آبھا کو اپنے پاس کھینچنے کی کوشش کی۔ آج اسے ماں کے طرز عمل میں ایک خاص تغیر محسوس ہوا۔ وہ ذرا بھی نہ ڈری۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ماں کے سینے سے چمٹ جائے لیکن وہ ماں تک نہ پہنچ سکتی تھی کوٹھری کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا اور کنجی کاکا کے پاس تھی۔

آبھا نے ماں کے ہاتھوں کو زور سے پکڑ لیا اور کہا۔ "ماں۔ آج بابا آ رہے ہیں!"

ونودنی کچھ نہ بولی وہ ٹکٹکی باندھے آبھا کے چہرہ کو دیکھ رہی تھی۔

آبھا نے پھر پکارا "ماں!"

ونودنی چونک کر بولی۔ "مجھے بلا رہی ہو بیٹی؟"

آبھا کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ بہت دنوں سے اس نے ماں کے مُنہ سے ایسا پیار بھرا جملہ نہ سنا تھا۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی "ماں! آج بابا آئیں گے۔"

ونودنی نے ناتوان لہجے میں کہا۔ "کس کے بابا؟ ——— تیرے؟ تو مجھے کیا بیٹی؟"

ماں کی بات سن کر آبھا چیخ مار کر رو پڑی۔

برآمدے میں سے زرین کی کرخت آواز سنائی دی۔ "وہاں کون ہے؟ کون رو رہا ہے؟"

آبھا چپکے خوف سے وہاں سے بھاگی۔ اسے ماں سے کچھ اور کہنے کا موقع نہ ملا۔ اس نے جاتے جاتے سُنا۔ بُوا کہہ رہی تھیں۔ "اور کون روئے گا، پگلی ہوگی!"

پگلی اکثر اس طرح ہنسا اور رویا کرتی تھی۔ اس وقت وہ کیوں رو رہی ہے۔ یہ پوچھنے کی کسے فرصت تھی؟ سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔

——— (۲) ———

بیرین مقررہ وقت پر آگیا۔ گھر کے تمام چھوٹے بڑے اسے گھیرے کھڑے تھے۔ کوئی خیریت پوچھ رہا تھا۔ کوئی شہر کے بارے میں کچھ دریافت کر رہا تھا۔ خوب چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ آبھا دوڑی ہوئی آئی اور باپ سے الگ ایک طرف کھڑی ہوگئی۔

دادی نے دیکھا تو بولیں۔ "ارے آبھا! تو اب تک کہاں تھی۔ آ اپنے باپ کے پاس۔" آبھا کچھ نہ بولی وہ پہلے کی طرح اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ اس کی بوا نندا آئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "چل یہاں کیا کھڑی ہے۔" اس نے آبھا کو پکڑ کر بیرین کے سامنے بٹھا دیا۔

بیرین ماں سے بولا۔ "ماں! کل تمام رات گاڑی میں جاگتے گزری۔ طبیعت بڑی بدمزہ معلوم ہو رہی ہے۔"

ماں بولیں۔ "ہاں کیوں نہیں! نندا چھوٹی بہو سے کہہ دے بستر دے جائیں۔"

چھوٹی بہو پاس ہی کھڑی تھی۔ وہ دوڑی گئی اور بستر لاکر بچھا دیا۔ نندا کچھ ناشتہ کا سامان اور گلاس میں پانی لے آئی۔

ماں نے کہا۔ "لو بیٹا اب ناشتہ کرکے ذرا سو رہو۔"

بیرین چارپائی پر بیٹھ کر بولا۔ "اب اشنان کرکے ہی کھاؤں گا ابھی اسے رکھوا دو۔"

ماں نے کہا۔ "تو ڈھک دے نندا!" پھر سب کی طرف دیکھ کر بولیں "اچھا اب سب لوگ چلو ذرا آرام کر لینے دو۔"

سب چلے گئے مگر آبھا اپنی جگہ پر بیٹھی ہی رہی دادی نے کہا "یہاں آ، جب تیرے بابا سو کر اٹھیں گے تو ....."

بیرین درمیان ہی میں بول اُٹھا۔ "نہیں ماں اسے میرے پاس رہنے دو۔"

ماں بولیں۔ "اچھا تو یہی رہ بیٹی!"

جب کمرے میں بالکل سناٹا چھا گیا تو بیرین نے آبھا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر کہا۔ "آؤ، میرے پاس آؤ نہ بیٹی!"

آبھا باپ کی گود میں سر رکھ کر رو پڑی۔

بیرین آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "کیوں بیٹی تم رو کیوں رہی تھیں؟"

آبھا نے کوئی جواب نہ دیا۔

بیرین نے کچھ دیر سوچ کر کہا "تیری ماں کیسی ہے بیٹی؟ کیا اب بھی وہ اسی طرح روتی ہے؟"

ونودنی اس چھوٹی سی کوٹھری میں تنہا بیٹھی رویا کرتی مگر پگلی کا رونا سنے کون؟ زرین جاکر ڈانٹ ڈپٹ دیتیا اور نہ مانتی تو مارتا پیٹتا بھی۔ بیچاری پگلی خاموش ہو جاتی۔

باپ کے سوال کے جواب میں آبھا نے صرف ایک ٹھنڈی سانس لی۔ بہت دیر تک باپ بیٹی دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بیرین نے کہا۔ "بیٹی! میرا سوٹ کیس تو اٹھا لاؤ۔"

آبھا نے سوٹ کیس لاکر باپ کے سامنے رکھ دیا۔

بیرین گھر کے تمام بچے بچیوں اور عورتوں کے لئے کچھ نہ کچھ تحفہ لاتا۔ مگر ونودنی کے لئے آئی ہوئی چیزیں سب سے زیادہ تھیں۔ فینسی کپڑے، خوشبودار تیل، بہترین صابن اور کھانے کی لذیذ نفیس چیزیں۔ اس کے علاوہ بہت سی قیمتی دوائیں بھی تھیں۔ اگرچہ ونودنی پاگل ہوگئی تھی پھر بھی بیرین نے اس کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آنے دیا تھا۔

بیرین نے تیل کی ایک شیشی ہاتھ میں لے کر کہا۔ "اسے میں تمہارے لئے لایا ہوں۔ یہ دماغ کے لئے بہت مفید ہے۔" اور لوگوں کی طرح بابا نے ماں کو نظر نہیں کر دیا۔ یہ سوچ کر آبھا کا ایک عجیب مسرت اور خوشی سے لبریز ہوگیا۔ وہ بشاش ہو کر بولی۔ "بہت اچھا کیا بابا! میں ماں کو روز تیل ملا کر دوں گی۔"

بیرین کپڑوں کو ہاتھ میں لئے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کچھ دیر نہ جانے کیا سوچ کر بولا۔ "کیوں بیٹی! تیری ماں زنجیر سے بندھی تو نہیں ہے؟"

آبھا نے کہا۔ "نہیں مگر کوٹھری کے دروازے پر تالا لگا رہتا ہے۔"

بیرن بولا۔ "اچھا تو کنجی لاکر مجھے دے جاؤ۔"
آبھا کنجی لینے باہر چلی گئی۔
تھوڑا کنجی لیکر خود ہی آئی بولی۔ "کیوں بھیا تم نے کنجی لیکر مانگی تھی؟
اس وقت اس کوٹھری میں جاؤ گے کیا؟"
بیرن ایک خفیف سا تبسم کے ساتھ بولا۔ "ہاں ذرا دیکھ آؤں ـــــ
وہ زندہ تو ہے؟"
آبھا نے کوئی جواب نہ دیا وہ سر جھکا کر چپ چاپ کھڑی رہی۔
بیرن کنجی لیکر آگے بڑھتا ہوا بولا۔ "آبھا یہاں آ..."
بیرن تالا کھول کر اندر داخل ہوا۔ دنودنی اپنی عادت کے مطابق پیچھے کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی۔
بیرن نے پکارا "دنیو ـــ!"
دنودنی نے ایک ترچھی نظر سے بیرن کی طرف دیکھا۔
آبھا اس کے پاس جاکر بولی۔ "ماں! بابا آئے ہیں۔"
دنودنی نے دوسری طرف سر گھما کر کہا۔ "آئے ہیں تو انھیں بٹھاتی کیوں نہیں؟"
بیرن اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ہاں! ادھر دیکھو میں بیٹھ گیا۔" اس کے بعد کپڑوں کو اس کے سامنے پھیلا کر کہا۔ "یہ کپڑے میں تمہارے لئے لایا ہوں دنیو!"
دنودنی نے ایک نظر کپڑوں کی طرف دیکھا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی پاگل ہو جانے کے باوجود اس کی ہنسی میں کوئی فرق نہ آیا تھا اس میں وہی پہلے کی سی شوخی و شرارت جھلک رہی تھی۔
بیرن بولا۔ "پہنو گی، ان کپڑوں کو؟"
دنودنی چونک سی پڑی اور کپڑے ہاتھ میں لیکر بیرن کے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔
بیرن نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "مجھے تم پہچان نہیں رہی ہو دنیو؟"
آبھا روتی ہوئی ماں سے چمٹ گئی اور بولی۔ "ماں تم بابا کو نہیں پہچانتیں؟"
دنودنی نے بیرن کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "تم لائے ہو یہ کپڑے؟"
بیرن بولا۔ "ہاں دنیو! میں ہی لایا ہوں، مگر میں کون ہوں، کس طرح ہوں۔ اسے تو تم نے پوچھا ہی نہیں۔"
دنودنی نے کہا۔ "تم ـــ! تم اچھی طرح ہو، بہت اچھی طرح ہو میں بھی اچھی ہی ہوں۔"

پھر کچھ دیر ٹھہر کر بولی۔ "لو اب تم ناراض نہ ہو سکو گے اچھے کپڑے پہنوں گی۔ سر میں پھول کھونسوں گی؟ تم شنکھ بجاؤ اور دھونی دو۔ میں اپنی گرہستی اب خود ہی دیکھوں گی۔ اب کسی کے ... کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ارے تم بیٹھو! دوڑ تو جا بیٹی! دیکھ تو آرسوئی گھر میں کیا کیا ہے؟ آج جو چیز بھی پکائی ہو گی میں ہی پکاؤں گی مگر یاد رکھنا سب تمھیں کو کھانا پڑے گا۔ اور کچھ چھوڑ بھی نہیں سکتے۔"
معلوم نہیں کیا بات تھی جو ہمیشہ خاموش رہنے والی پگلی آج یکایک اس طرح باتیں کرنے لگی تھی۔ آبھا کو اس کا گمان تک نہ تھا کہ ماں بھی ایسی باتیں کر سکتی ہے۔ وہ حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب ماں کا پاگل پن ضرور دور ہو جائیگا۔
بیرن بھی سحر زدہ سا بیٹھا تھا۔ دنودنی کے اس پیار بھرے لہجے کے لئے اس کے کان کب سے ترس رہے تھے۔

گھر میں آکر بیرن نے اپنی ماں سے کہا۔ "ماں میں جب تک یہاں رہوں اس کوٹھری میں تالا نہ لگایا جائے۔"
ماں تعجب سے بولیں۔ "بہو کی کوٹھری کے متعلق کہہ رہے ہو؟ لیکن اس طرح کھلا ......"
بیرن درمیان ہی میں بول اٹھا۔ "میں پاس والے برآمدے میں رہونگا۔ اس کے علاوہ وہ اب کسی کو مارتی پیٹتی بھی تو نہیں۔"
ماں نے کہا۔ "نہیں نہیں تم کو برآمدے میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں راکھو کی ماں سے کہدیتی ہوں وہ اس کی نگرانی کرتی رہیگی۔"
بیرن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "گرمی کا موسم ہے مجھے وہاں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ میں ہی رہونگا۔"
بیرن کی یہ بات گھر کے تمام آدمیوں کو بُری معلوم ہوئی۔ مگر کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔

(۳)

بارش بند ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ کیلے کے بھیگے پتے چاند کی کرنوں سے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ ٹین کی چھوٹی سی کوٹھری میں دروازے سے چاندنی اندر داخل ہو رہی تھی۔ کوٹھری کے پیچھے چمپا کا ایک درخت تھا جس میں بہت سے پھول کھلے ہوئے تھے ایک شیریں خوشبو سے فضا بس رہی تھی۔ رات زیادہ چلی گئی تھی۔ پھر بھی بیرن کو نیند نہیں آرہی تھی۔
اتنے میں دنودنی یکایک کوٹھری سے نکلی اور بیرن کے سامنے

شرارت آمیز تبسم رقص کر رہا تھا۔ آج وہ بالکل پاگل نہیں [illegible]
ہو رہی تھی۔ چاند کی ہلکی روشنی نے اس کے چہرے کی دلکشی میں [illegible]
اضافہ کر دیا تھا۔

"کمال! آج بابا نے ایک دلکش لہجہ میں پوچھا "کہو کیسی [illegible] اور [illegible]

[illegible] نودنی نے ناتوان سے لہجے میں۔ وہ سحر زدہ نظروں [illegible]
بیرین کو کوئی جواب [illegible] ... سے۔ نودنی کی
طرف دیکھ رہا تھا۔

نودنی بولی "پسند نہیں ہوں کیا؟"

بیرین نے اپنے کو سنبھال کر ہنستے ہوئے کہا۔ "واہ کیا کہنا
بالکل آکاش پری معلوم ہو رہی ہو"

نودنی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت آمیز لہجہ میں بولی،
"چمپا کی خوشبو آ رہی ہے۔ کیا لا دوگے دو پھول؟" بیرین کو [illegible]
بیرین اپنی دس برس پہلے کی بے کیف زندگی کو بھول سا گیا۔ وہ
اٹھا اور چمپے کے پھول توڑ کر اپنے ہاتھوں سے نودنی کے جوڑے میں
کھونس دیا۔ نودنی پھر کچھ نہ بولی۔ بیرین کی گود میں سر چھپا کر چپ
چاپ پڑی رہی۔

[illegible] جوڑے میں چمپا کے پھول کھونستی۔ بار
گنگنا کر گلے میں پہنتی۔ اور کبھی گھر والوں کی نظریں بچا کر بیرین کے
ساتھ چھت پر چڑھ جاتی۔ اس وقت چاندنی سے دھلے ہوئے
نیلے آسمان میں دونوں کی زندگی کے کون سے ایسے رنگین خواب
تھے جو نظر نہ کرتے۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب نودنی اپنے ساس سسر کی [illegible]
ہوتی۔ جب زرین اور نندا بھائی کو سامنے بٹھلائے بغیر پیٹ بھر کھانا
بھی نہ کھا سکتے تھے۔ جب زرین کے امتحان کی فیس۔ نندا کی سسرال
کے تحفے۔ بھی برت کے نیویدے غرض اس قسم کے تمام کاموں کا انتظام
اس کے سپرد تھا۔ جب ہر شخص اپنی ضرورت پر نودنی ہی کو یاد کیا
شادی کے بعد وہ مشکل دو بار میکے گئی ہوگی۔ اس کی چندن کی سی
عادت ہی کسی سے برداشت نہ ہو سکتی۔ زرین بھی اس سے بعد
محبت کرتا ــ ان دنوں بیرین کی زندگی کتنی مسرت آگیں تھی۔

مگر کچھ ہی روز کے بعد ایک ایسا حادثہ وقوع پذیر ہوا جس نے
بیرین کی امن و سکون کی دنیا میں ایک شورش اور پراگندگی پیدا
کر دی۔ آج بھی جب اسے اس شب آلام کی یاد آتی تو وہ کانپ اٹھتا



دورہ پڑنے کے بعد ونودنی بیہوش ہو گئی۔ بہت کوشش کی گئی [illegible]

ڈاکٹر ۔ ہوئی ۔ تین دن حالت بیہوشی ہی میں گزر گئے ۔ چوتھے روز ہوش تو آیا مگر وہ کامل صحتیاب نہ ہو سکی ۔ بہت سی پیٹنٹ اور دوائیں استعمال کرائی گئیں ۔ کتنے ہی مشہور معالجوں کا علاج [illegible] بے نتیجہ ۔ ونودنی کا پاگل پن کسی طرح دور نہ ہوا

ونودنی کی یاد آتے ہی بیرین کا گھر جانے کا جذبہ سرد پڑ جاتا ۔ وہ یہاں بھی کئی بار گھر آیا مگر بجائے اس کے کہ اسے گھر آ کر سکون ملتا [illegible] اس کے قلبی اضطراب و اضطراب میں اضافہ ہی ہوتا رہا ۔

[illegible] اور ہم عمر کہتے ۔ "دوسری شادی کر لو ۔ کہیں [illegible] سے گرہستی چل سکتی ہے ؟"

[illegible] نے بھی کئی بار غم آگیں لہجے میں کہا ۔ "بیٹا کب تک اس طرح تکلیف سہتے رہو گے اب کہیں شادی کر لو ۔"

[illegible] بیرین کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتیں ۔ جس کو کبھی اس نے رفیقۂ حیات کی حیثیت سے قبول کیا تھا ۔ جو ایک عرصہ [illegible] اس کی ہر تکلیف و راحت میں اس کی شریک حال رہی ۔ جس نے [illegible] خدمت و محبت سے گرویدہ بنا لیا تھا ، اگر قدرت کے کسی ناگہانی حادثے سے آج وہ پاگل ہو گئی تو کیا وہ اسے چھوڑ دے ؟ کیا اس کے ایسا کرنے سے شادی جیسے پاک اور مقدس رشتے کی توہین نہ ہو گی ؟ کیا انسانیت کے یہی معنی ہیں ؟ کیا ایک شریف انسان کے لئے کبھی یہ جائز ہو سکتا ہے ؟

مگر اس کے سوا ان باتوں کو اور کون سمجھتا تھا ؟ گھر والوں کے شادی کے پیہم تقاضوں سے تنگ آ کر بیرین نے گھر چھوڑ دیا ۔ وہ شہر میں جا کر رہنے لگا ۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب کبھی گھر واپس نہ آئے گا مگر وہ اپنے فیصلے پر زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا ۔ ونودنی کے پاگل ہو جانے پر بھی اسے بھلا دینا اس کے لئے آسان نہ تھا ۔

(۴)

گذشتہ شب کے حالات نے بیرین کے دل میں امید کی ایک دھندلی سی شمع روشن کر دی تھی ۔ مگر جب دوسرے روز وہ ونودنی کی کوٹھڑی میں داخل ہوا تو اسے اپنی غلط فہمی کا احساس ہوا ۔ ونودنی جو نئی ساری پہن کر کل رات کو اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی وہی آج کوٹھڑی کے ایک کونے میں شکستہ حال پڑی تھی ۔

[illegible] کے طرح طرح سے مخاطب کرنے پر بھی کچھ نہ بولی ۔ وہ جس طرح پڑی تھی اسی طرح پڑی رہتی ۔ نہ کچھ کھاتی نہ پیتی ۔ [illegible] سے بیرین کو سات رات بھر نیند نہ آتی ۔

اب ونودنی نے پہلے ہی کی طرح رونا بھی شروع [illegible] سے گھر والوں کا رات کا سونا حرام تھا ۔ آج کل نرین کی طبیعت کچھ خراب رہتی تھی ۔ پہلے تو وہ بڑے بھائی کی موجودگی کے باعث کچھ نہ بولا مگر آج وہ ضبط نہ کر سکا ۔ وہ لاٹھی لے کر ونودنی [illegible] اور گرج کر بولا ۔ "رونا بند کر دو نہیں تو مارتے مارتے [illegible]"

اس کی بات سن کر ونودنی اور زور سے چیخ اٹھی ۔

نرین ہاتھ چھوڑنا ہی چاہتا تھا کہ بیرین آ گیا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا ۔ "سنو ! سنو ! نرین ! پاگل کہیں کسی کی بات سمجھتے ہیں ؟ وہ اپنے حواس میں تو ہوتے نہیں ۔"

نرین کو کئی روز سے اندر اندر ونودنی پر غصہ آ رہا تھا ۔ مگر بھائی کے خیال سے وہ کچھ نہ بولتا تھا ۔ آج اس کی طبیعت معمول سے زیادہ خراب تھی اس نے جواب دیا ۔ "بھیا ! تم تو جانتے نہیں پاگلوں کو کیسے ٹھیک کیا جاتا ہے ؟ یہ سیدھے سے ماننے والے نہیں ہوتے ۔"

نرین کی آواز سن کر گھر کے تمام لوگ جمع ہو گئے ۔ بیرین نے ان کی طرف دیکھ کر عاجزانہ لہجے میں کہا ۔ "میں جب تک رہوں ایشور کے لئے تم لوگ مجھے ذرا سکون سے رہنے دو ۔"

اس کی بات سبھی کو ناگوار معلوم ہوئی ۔ نرین گرج کر نہ جانے کیا کہنے جا رہا تھا مگر ماں نے دخل دے کر اسے زبردستی دور ہٹا دیا ۔

ونودنی کے خلاف الزامات کی انتہا نہ تھی ۔ ماں کا کھانا خراب کر دیا چھوٹی بہو کا بال نوچ رہی تھی ۔ نرین کے بچے کا کھلونا توڑ ڈالا ۔ آبھا کو ہر وقت مارا کرتی ہے اس کے شور و غل اور چیخ پکار سے محلے کے لوگ رات کو سو نہ سکتے تھے ۔

بیرین ان تمام باتوں کو سننے کے باوجود بھی خاموش ہی رہا اس نے ونودنی کو کوئی سزا نہ دی اسے ہر وقت یہی فکر دامنگیر رہتی کہ کسی طرح اس کا دماغ صحیح ہو ۔ وہ رات دن اسی کوشش میں مصروف رہتا ۔

بیرین جب سے گھر سے آیا تھا اسے بیوی کے سوا کسی سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا ۔ اس لئے گھر کے تمام لوگ اس سے ناخوش ہو رہے تھے ماں تک اس کے طرز عمل سے ناراض ہو کر بدیش جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں ۔

(باقی دیکھئے صفحہ ۵۴)

آگھڑی ہوئی۔ وہ نئی ساری پہنے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے پر ایک شرارت آمیز تبسم رقص کر رہا تھا۔ آج وہ بالکل پاگل نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ چاند کی ہلکی روشنی نے اس کے چہرے کی دلکشی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔

اس نے ایک دلکش لہجہ میں پوچھا۔ "مجھ کو کیسی لگ رہی ہوں؟"

بیرین کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ سحر زدہ نظروں سے ونودنی کی صورت دیکھ رہا تھا۔

ونودنی بولی۔ "پسند نہیں ہوں کیا؟"

بیرین نے اپنے کو سنبھال کر ہنستے ہوئے کہا۔ "واہ کیا کہنا بالکل کالش پری معلوم ہو رہی ہو۔"

ونودنی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت آمیز لہجہ میں بولی، "چمپا کی خوشبو آ رہی ہے۔ کیا لا دو گے دو پھول؟ سر میں گونسونگی۔"

بیرین اپنی دس برس پیشتر کی بے کیف زندگی کو بھول سا گیا۔ وہ اٹھا اور چمپے کے پھول توڑ کر اپنے ہاتھوں سے ونودنی کے جوڑے میں کھونس دیا۔ ونودنی پھر کچھ نہ بولی۔ بیرین کی گود میں سر چھپا کر چپ چاپ پڑی رہی۔

ان دنوں بھی ونودنی جوڑے میں چمپا کے پھول کھونستی۔ بار ونہ کرکے میں پہنتی۔ اور کبھی گھر والوں کی نظریں بچا کر ساتھ چھت پر چڑھ جاتی۔ اس وقت چاندنی سے دھلے ہوئے نیلے آسمان میں دونوں کی زندگی کے کون سے ایسے رنگین خواب تھے جو نظر نہ کرتے۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ونودنی اپنے ساس سسر کی لاڈلی ہوتی جب نرین اور نندا بھابی کو سامنے بٹھائے بغیر بیٹ بھر کھا ہی نہ کھا سکتے تھے۔ جب نرین کے امتحان کی فیس۔ نندا کی سسرال کے تحفے۔ بیجنی برت کے نوید غرض اس قسم کے تمام کاموں کا انتظام اس کے سپرد تھا۔ جب ہر شخص اپنی ضرورت پر ونودنی ہی کو یاد کرتا شادی کے بعد وہ بمشکل دو بار میکے گئی ہوگی۔ اس کی چند دن کی غیر حاضری بھی کسی سے برداشت نہ ہو سکتی۔ نرین بھی اس سے بے حد محبت کرتا۔۔۔ ان دنوں بیرین کی زندگی کتنی مسرت آگیں تھی۔

مگر کچھ ہی روز کے بعد ایک ایسا حادثہ وقوع پذیر ہوا جس نے بیرین کی امن و سکون کی دنیا میں ایک شورش اور پراگندگی پیدا کر دی۔ آج بھی جب اسے اس شب آلام کی یاد آتی تو وہ کانپ اٹھتا۔



مُردہ بچہ جننے کے بعد ونودنی بیہوش ہو گئی۔ بہت کوشش کی گئی کارگر نہ ہوئی۔ تین دن حالت بیہوشی ہی میں گزر گئے۔ چوتھے روز ہوش تو آیا مگر وہ کامل صحتیاب نہ ہو سکی۔ بہت سی پیٹنٹ اور ...ب دوائیں استعمال کرائی گئیں۔ کتنے ہی مشہور معالجوں کا علاج ... نتیجہ ونودنی کا پاگل پن کسی طرح دور نہ ہو سکا۔

ونودنی کی یاد آتے ہی بیرین کا گھر جانے کا جذبہ سرد پڑ جاتا۔ وہ ...ن میں کئی بار گھر آیا مگر بجائے اس کے کہ اسے گھر آ کر سکون و قرار ... ہوتا اس کے قلبی اضطرار و اضطراب میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

...کے دوست اور ہم عمر کہتے۔ "دوسری شادی کر لو۔ کہیں ...ن ...دی سے گرہستی چل سکتی ہے؟"

...ں نے بھی کئی بار غم آگیں لہجے میں کہا۔ "بیٹا کب تک اس طرح تکلیف سہتے رہو گے اب کہیں شادی کر لو۔"

یہ باتیں سن کر بیرین کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتیں۔ جس کو کبھی اس نے رفیقۂ حیات کی حیثیت سے قبول کیا تھا۔ جو ایک عرصہ ... اس کی ہر تکلیف و راحت میں اس کی شریک حال رہی۔ جس نے ...پنی بے لوث خدمت و محبت سے گرویدہ بنا لیا تھا۔ اگر قدرت کے ...سی ناگہانی حادثے سے آج وہ پاگل ہو گئی تو کیا وہ اسے چھوڑ دے؟ کیا اس کے ایسا کرنے سے شادی جیسے پاک اور مقدس رشتے کی توہین نہ ہو گی؟ کیا انسانیت کے یہی معنی ہیں؟ کیا ایک شریف انسان کے لئے کبھی یہ جائز ہو سکتا ہے؟

مگر اس کے سوا ان باتوں کو اور کون سمجھتا تھا؟ گھر والوں کے شادی کے پیہم تقاضوں سے تنگ آ کر بیرین نے گھر چھوڑ دیا۔ وہ شہر میں جا کر رہنے لگا۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب کبھی گھر واپس نہ آئے گا مگر وہ اپنے فیصلے پر زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ ونودنی کے پاگل ہو جانے پر بھی اسے بھلا دینا اس کے لئے آسان نہ تھا۔

(۴)

گذشتہ شب کے حالات نے بیرین کے دل میں امید کی ایک ...لی سی شمع روشن کر دی تھی۔ مگر جب دوسرے روز وہ ونودنی کی کوٹھری میں داخل ہوا تو اسے اپنی غلط فہمی کا احساس ہوا۔ ونودنی جو نئی ساڑی پہن کر کل رات کو اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی وہی آج کوٹھری کے ایک کونے میں شکستہ حال پڑی تھی۔

بیرین کے طرح طرح سے مخاطب کرنے پر بھی کچھ نہ بولی۔ وہ جس طرح پڑی تھی اسی طرح پڑی رہتی۔ نہ کچھ کھاتی نہ پیتی۔ اندوہ و غم سے بیرین کو رات رات بھر نیند نہ آتی۔

اب ونودنی نے پہلے ہی کی طرح رونا بھی شروع ... سے گھر والوں کا رات کا سونا حرام تھا۔ آج کل نرین کی طبیعت کچھ خراب رہتی تھی۔ پہلے تو وہ بڑے بھائی کی موجودگی کے باعث کچھ نہ بولا مگر آج وہ ضبط نہ کر سکا۔ وہ لاٹھی لے کر ونودنی کے پاس پہنچا اور گرج کر بولا۔ "رونا بند کرو نہیں تو مار تے مارتے بھرکس نکال دوں گا۔"

اس کی بات سن کر ونودنی اور زور سے چیخ اٹھی۔ نرین ہاتھ چھوڑنا ہی چاہتا تھا کہ بیرین آ گیا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "سنو! سنو! نرین! پاگل کہیں کسی کی بات سمجھتے ہیں؟ وہ اپنے حواس میں تو ہوتے نہیں۔"

نرین کو کئی روز سے اندر ہی اندر ونودنی پر غصہ آ رہا تھا۔ مگر بھائی کے خیال سے وہ کچھ نہ بولتا تھا۔ آج اس کی طبیعت معمول سے زیادہ خراب تھی اس نے جواب دیا۔ "بھیا! تم تو جانتے نہیں پاگلوں کو کیسے ٹھیک کیا جاتا ہے؟ یہ سیدھے سے ماننے والے نہیں ہوتے۔"

نرین کی آواز سن کر گھر کے تمام لوگ جمع ہو گئے بیرین نے ان کی طرف دیکھ کر عاجزانہ لہجے میں کہا۔ "میں جب تک رہوں اس کے لئے تم لوگ مجھے ذرا سکون سے رہنے دو۔"

اس کی بات سبھی کو ناگوار معلوم ہوئی۔ نرین گرج کر ... کیا کہنے جا رہا تھا مگر ماں نے دخل دے کر اسے زبردستی دور ہٹا دیا۔

ونودنی کے خلاف الزامات کی انتہا نہ تھی۔ ماں کا کہنا تھا ... کر دیا چھوٹی بہو کا بال نوچ رہی تھی۔ نرین کے بچے کا کھلونا توڑ ڈالا۔ آبھا کو ہر وقت مارا کرتی ہے اس کے شور و غل اور چیخ پکار سے محلے کے لوگ رات کو سو نہ سکتے تھے۔

بیرین ان تمام باتوں کو سننے کے باوجود بھی خاموش ہی رہا اس نے ونودنی کو کوئی سزا نہ دی اسے ہر وقت یہی فکر دامنگیر رہتی کہ کسی طرح اس کا دماغ صحیح ہو۔ وہ رات دن اسی کوشش میں مصروف رہتا۔

بیرین جب سے گھر سے آیا تھا اسے بیوی کے سوا کسی سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ اس لئے گھر کے تمام لوگ اس سے ناخوش ہو رہے تھے یہاں تک اس کے طرز عمل سے ناراض ہو کر بدیش جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ (باقی دیکھیے صفحہ ۵۳)

زرین رو کر کہتا۔ "ایسی حالت میں میں اب زیادہ دن نہیں جی سکتا۔" ایک روز محلے کا ایک شخص کہہ رہا تھا۔ "کہیں پاگل کے ساتھ رہتے رہتے بیرین بھی پاگل نہ ہو جائے۔ اپنی بیوی سے سبھی محبت کرتے ہیں مگر بیرین کی طرح نہیں۔ وہ پگلی جس طرح لوگوں کی عافیت تنگ کرے مگر کوئی دم نہ مارے کتنی عجیب بات ہے!"

اندر باہر ہر طرف کی طعن و تشنیع برداشت کرتے کرتے بیرین کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اس نے اس کی بہت کوشش کی کہ ونودنی اچھی ہو جائے مگر اس کی کوئی کوشش بارآور نہ ہوئی بلکہ ونودنی کی شرارتوں میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا۔

محلے کی لڑکی کی شادی تھی۔ دلہن اپنی سسرال کے لئے رخصت ہو رہی تھی۔ بیرین ٹہلنے گیا تھا۔ وہ جیسے ہی گھر واپس آیا نندا آ کر اس کی بھاوج بولی۔ "بھابی شاردا بابو کے یہاں پالکی میں جا بیٹھی ہیں ان کو ٹلنا تو آتی ہی نہیں۔"

ماں نے آ کر روتے ہوئے کہا۔ "اتنے آدمیوں کی بھیڑ میں کیسی آفت بچا رکھی ہے۔ بھگوان میں مر کیوں نہیں جاتی۔"

زرین جو آ بھا کو کڑے آڑ رہا تھا کڑک کر بولا۔ "سو بار کہتا ہوں کوٹھری میں تالا لگا دو مگر سنتے ہی نہیں، دیکھو لڑکی کی کیا حالت ہو گئی گھر لانا چاہتی تھی مار کر کچومر نکال دیا۔"

بیرین نے غصّے سے سب کچھ سُنا مگر کچھ بولا نہیں، اپنی چھڑی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

ونودنی اطمینان کے ساتھ پالکی میں بیٹھی تھی۔ بچے بوڑھے جوان پالکی کو گھیرے شور و غل کر رہے تھے۔

بیرین بھیڑ چیر کر پالکی کے پاس جا پہنچا اور کڑک کر بولا۔ "چلو باہر نکلو!" ونودنی نے ہنس کر کہا۔ "کیوں؟ باہر کیوں نکلوں؟ تم بھی جلدی سے آ جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے جیسے نہیں چلنا ہی نہیں ہے۔"

بیرین برہم ہو کر بولا۔ "میں کہتا ہوں فوراً باہر نکلو۔"

اس کی اس بات کو ان سنی کر کے ونودنی نے کہا۔ "ارے تم لوگ کھڑے کیوں ہو" "الو دھونی" دو، سنکھ بجاؤ آج ہماری شادی ہے نا!"

تمام لوگ جو آس پاس کھڑے تھے اس کی بات سن کر بیساختہ ہنس پڑے۔

اب بیرین اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ ونودنی کا ہاتھ پکڑ کر اسے پالکی سے نیچے کھینچ لیا۔ ونودنی پالکی کے باہر گر پڑی۔ رنج و غم اور اہانت و بے عزتی نے بیرین کو جانور بنا دیا تھا۔ وہ بڑی بے رحمی کے ساتھ ونودنی کو پیٹنے لگا۔

ونودنی کے بدن سے خون بہنے لگا۔ جن کے یہاں شادی تھی وہ بیرین کو پکڑتے ہوئے بولے۔ "ٹھہریئے ٹھہریئے بیرین بابو یہ کیا کر رہے ہیں" لوگ کسی طرح بیرین کو الگ کر کے ونودنی کو گھر اٹھا لے گئے۔

(۵)

رات کا وقت تھا۔ گھر کے تمام لوگ خراٹے لے رہے تھے۔ بیرین آہستہ آہستہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا شام کے واقعے کو یاد کرتے ہی وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا اس نے ونودنی کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا تھا، اس پر اس کا ضمیر اسے سخت ملامت کر رہا تھا۔ ونودنی پر اس کا ہاتھ کیسے اٹھا۔ وہ اپنے حواس میں تو تھی نہیں وہ تو پاگل تھی۔ جب اس کا دماغ صحیح تھا وہ کس طرح ہر رنج و مصیبت میں اس کی ہمدرد و غمگسار رہتی تھی۔

وہ تالا توڑ کر آہستہ آہستہ ونودنی کی کوٹھری میں داخل ہوا اور چراغ جلا کر ونودنی کے پاس جا بیٹھا تھا۔ ونودنی خاموش پڑی تھی، اس کا تمام جسم متورم ہو گیا تھا۔ درد کی شدت سے وہ کروٹ بھی نہ بدل سکتی تھی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی سی لگ رہی تھی،

بیرن اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ وہ ایک معصوم بچے کی طرح رو پڑا پھر آنسو خشک کرتا ہوا بولا۔ "ونودنی! - ونو!" ونودنی حسب معمول منہ پیچھے کئے ہوئے تھی اس نے بیرن کی طرف مڑ کر دیکھا تک نہیں۔

وہ کب ونودنی کے پاس سو گیا تھا کچھ پتہ نہیں۔ ایک وحشتناک خواب دیکھ کر وہ جاگا تو صبح ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی وہ کمرے کی دھندلی روشنی میں آنکھیں مل کر دیکھتے ہی چونک پڑا۔ ونودنی اس کے پاس نہ تھی۔ - وہ ایک لمبی سانس لیکر کمرے سے باہر نکلا اور چیخ چیخ کر پکارنے لگا۔ "ونودنی! ونودنی!"

مگر کوئی جواب نہ ملا۔

بیرن نے پریشان ہو کر گھر کے تمام لوگوں کو جگایا۔ سب نے گاؤں میں چاروں طرف دوڑ دھوپ کی لیکن ونودنی کا کچھ پتہ نہ چلا، آس پاس کے گاؤں میں بھی تلاش ہوئی مگر بیسود۔

ایک آدمی نے آکر کہا۔ "درمیانہ رات کو اس نے کسی کے تیز قدموں کی آہٹ سنی تھی۔" کسی نے اطلاع دی۔ "رات کو بازار سے آتے وقت کشتی پر ایک عورت کی آواز سنی تھی۔" اس طرح کی فضول باتوں کے سوا کوئی ٹھکانے کی بات معلوم نہیں ہوئی۔

احباب و اقارب آکر بیرن کو سمجھانے لگے۔ پاگل ہی تو تھی کہیں چلی گئی ہوگی۔ اور بہت ممکن ہے کہ کسی کنوئیں یا ندی میں پھاند پڑی ہو۔ پھر وہ تھی ہی کس کام کی؟ اپنے لئے بھی مصیبت تھی اور دوسروں کے لئے بھی۔ اگر وہ کہیں مر کھپ گئی ہو تو اس سے بہتر تو کوئی بات ہی نہیں ہو سکتی اس کی مصیبتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا اور دوسروں کو بھی نجات مل گئی۔ اس کے لئے رنج و غم کرنا محض فضول ہے۔" مگر بیرن کے دل پر لوگوں کے سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا اس کے دل میں اندوہ و غم کا طوفان اُمنڈ رہا تھا وہ لوگوں کے پاس سے اٹھ کر ونودنی کی کوٹھری میں جا بیٹھا اور سوچنے لگا کہ اس پاگل عورت کو بھی اپنی توہین اور ہتک کا احساس تھا، وہ بیرن کے ہاتھوں بھی تو کئی بار پٹ چکی تھی لیکن اس کی تو اس نے کبھی پروا نہ کی۔ کیا پاگل ہو کر بھی وہ اتنا سمجھتی تھی کہ دوسرے تو اس کے ساتھ جو کچھ کرتے تھے کرتے تھے لیکن مجھے اس کے ساتھ ایسی سنگدلی اور بیرحمی سے پیش نہیں آنا چاہئے تھا۔

لیکن بیرن کے ان سوالات کا وہاں جواب دینے والا کون تھا، وہ اسی اندھیری کوٹھری میں بیٹھا یکایک چیخ اٹھا ——— "بجلی ونودنی!" ———

ساتھ ساتھ

از جناب شہید یوسفی رامپوری

میں ہوں نظامِ گردشِ شام و سحر کے ساتھ ساتھ
دورِ مہر و ماہ ہے میری نظر کے ساتھ ساتھ

گاہ میں پستیوں میں ہوں ہمرہِ گردِ کارواں
گاہ بلندیوں میں ہوں شمس و قمر کے ساتھ ساتھ

بھٹکے مسافروں کی آس اخترِ شامِ دشت ہوں
گاہ امید بن کے ہوں نجمِ سحر کے ساتھ ساتھ

میرے جنوں کا مرتبہ عقل سمجھ سکے گی کیا؟
جلوۂ رنگ رنگ ہے ذوقِ نظر کے ساتھ ساتھ

مانا کہ ظاہری سکوں مجھکو نصیب ہے مگر!
دل ہے کسی غریب کا آہِ سحر کے ساتھ ساتھ

سُنتے ہی جس کے آنکھ سے چشمۂ غم ابل پڑے
ایسا بھی اک فسانہ ہے دیدۂ تر کے ساتھ ساتھ

آتشِ شوق اور پھر گام بہ گام ہستیں!
عالمِ رنگ و حسن ہے میری نظر کے ساتھ ساتھ

اس نئے دَور میں شہید سوچ سمجھ کے چل ذرا
اہلِ جنوں سے دُور دُور عقل و نظر کے ساتھ ساتھ

سرمایہ دار

یہ انسان ہے یا کوئی جانور ہے

از جناب اقبال احمد شوق سہسوانی

کثافت سے پُر کار طینت ... خیالِ حمیت نہ احساسِ غیرت
خلوص محبت نہ پاسِ مروت سراپا جہالت سراسر حماقت

یہ انسان ہے یا کوئی جانور ہے

دِستار پسندی حکومت پرستی ہمہ کور ذوقی ہمہ کور مستی
نہ احساسِ ذلت نہ ادراکِ پستی یہ عصیانِ فطرت یہ کفرانِ ہستی

یہ انسان ہے یا کوئی جانور ہے

نہ غیر مخلص منافق طبیعت اعزا سے محو عناد و عداوت
احبا سے بیہودگی و شرارت نہ عقلِ متانت نہ فہم و فراست

یہ انسان ہے یا کوئی جانور ہے

ملازم کو اتنا نظر سے گرانا نہ ہو جس کی ذلت کا کوئی ٹھکانا
وہ بیہودہ طرزِ حکومت جتانا کہ نوکر سے چاہے خدا کہلوانا

یہ انسان ہے یا کوئی جانور ہے

نہ فہمِ مراتب کا احساس اصلا نہ چھوٹے بڑے کی کوئی جس کو پروا
بس اک خود نما خود ستائی سراپا نہ اپنے کا اچھا نہ غیروں کا اچھا

یہ انسان ہے یا کوئی جانور ہے

وہ زہریلی باتیں وہ سمی تبسم حمق آشنا غیر مخلص تکلم
نہ آدابِ مجلس نہ رنگِ تعلّم نہ شیریں بیانی نہ کیفِ ترنم

یہ انسان ہے یا کوئی جانور ہے

غرض کیلئے سب ہیں بھائی برادر غرض ہو تو رکھ لیں اک ادنیٰ کو سر پر
ازان بعد اپنے بھی غیروں سے بدتر نہ خوفِ خدا ہے نہ شرمِ پیمبر

یہ انسان ہے یا کوئی جانور ہے

سفارش کا دم دیکھ کر تمیں کمانا مگر کام ہرگز کسی کے نہ آنا
بگڑنا بلا بات کے روٹھ جانا بہرحال پبلک کو احمق بنانا

یہ انسان ہے یا کوئی جانور ہے

جو ماتحت سے کام لیتا ہو ذاتی جو سمجھے نہ مزدور کو آدمی بھی
جسے وجہ راحت ہو ذلت کسی کی ذلیل اسکی فطرت تو خلقت فریبی

یہ انسان ہے یا کوئی جانور ہے

مصاحب ہیں خیر سے سب بحفل کہ جن کی نظیر آج ملنا ہے مشکل
حمیت نہ غیرت نہ لائق نہ قابل جو نااہل خود ہیں تو سرکار جاہل

یہ انسان ہے یا کوئی جانور ہے

بناوٹ کی باتیں تصنع کے فقرے تکلف کی انداز نخوت کے غمزے
ریا کی نمازیں نمائش کے سجدے خدائی تو کیا ہے خدا کو بھی دیکھو

یہ انسان ہے یا کوئی جانور ہے

زمانہ کا دستور ہے یہ مقرر کہ جھکتی ہے جو شاخ ہو بارآور
مگر جو ہو مغرور اعزاز پا کر بلا بن کے چھا جائے خلقِ خدا پر

یہ انسان ہے یا کوئی جانور ہے

جنوری ۱۹۳۴ء کی بات

جب میں باپ نہیں تھا

(ایک ناسمجھ ہندوستانی کی سبق آموز آپ بیتی!)

میری شادی کو گیارہ سال ہو چکے ہیں لیکن بہت عرصہ تک...... میں یہ احساس نہیں کر سکا کہ شادی شدہ لوگ کیونکر خوش رہ سکتے ہیں۔ شادی کیوں ہوتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ میرے دوست جب اپنی بیوی کے قصے مجھے سنایا کرتے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے میرے دل کو مسل کر سینے سے باہر نکال دیا ہے۔ اور اس کی جگہ انگیٹھی میں آگ بھر کر رکھ دی ہے۔ بہت دن کے بعد میرے ایک خاص دوست کو میری خفیہ بیماری کا پتہ چل گیا۔ اس نے پوچھا۔

کیا تمہیں جریان کی بیماری ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ لیکن پھر اس نے کہا۔ کیا پیشاب سے پہلے اور اس کے بعد کوئی رطوبت خارج ہوتی ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے خاص بات پوچھی۔ میں نے کہا میں یہ بات جانتا تو ضرور ہوں کہ ایسا ہوتا ہے۔ لیکن آج تک......

میرا یہ جواب سنکر وہ چونک اٹھا۔ اور تعجب سے کہا کہ تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔ اگر مجھے زمانے میں بتا دیتے، جب تمہاری شادی ہوئی تھی کہ تم جریان کے مریض ہو تو میں تمہیں صرف پندرہ دن میں تندرست کر دیتا۔ چنانچہ میرے دوست نے اسی وقت "زنانہ دوا خانہ" کو خط لکھ کر "جوہر اعظم" دوا کی ایک شیشی تین روپے آٹھ آنے کو منگائی اور مجھے استعمال کے لئے دی۔ میں نے ترکیب کے مطابق اس دوا کا استعمال شروع کر دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ دوا شروع کرنے کے ساتویں یا شاید آٹھویں دن پیشاب کے وقت وہ رطوبت خارج ہونی بند ہو گئی۔ اور مجھے اپنے اندر ایک خاص بات محسوس ہوئی۔ دوا ابھی پوری ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک روز...... بیوی

جنوری ۱۹۳۶ء کی بات

اپنے دوست کی مہربانی کی بدولت اب میں اس جوانی کی ہری بھری دنیا میں ایک ایسے خوش و خرم نوجوان کی طرح ہوں، جیسے کہ مجھ جیسی عمر کے انسان کو ہونا چاہیے میری بیوی ایک بچہ کی ماں ہے۔ اور وہ جب اپنے بچے کو کھلاتی ہے۔ اور بچہ ٹمک ٹمک کر ماں کی طرف دوڑتا ہے۔ اور ماں کے ساتھ بال نوچتا ہے تو مجھے یہ بات یاد آتی ہے کہ اس بچے کے باپ کا نام "جوہر اعظم" ہے کیونکہ "جوہر اعظم" دوا سے ہی میری جریان کی بلا دور ہوئی۔ اور میری خفیہ طاقت پھر مجھے مل گئی۔ کاش جریان کے تمام مریضوں کو معلوم ہو جائے کہ اس دنیا میں جریان کی اگر کوئی بھی دوا ہو سکتی ہے تو وہ "جوہر اعظم" ہے۔ ایک شیشی کی قیمت صرف تین روپے آٹھ آنے ہے۔ اس دوا پر عام فائدہ کے خیال سے محصول ڈاک معاف ہے۔

پس ناظرین میں سے جو لوگ میری طرح جریان کی بیماری میں مبتلا ہوں۔ اور پیشاب سے پہلے یا بعد میں قوت مردمی پانی کی طرح بہہ جاتی ہو یا رات کو سوتے میں ناپاکی ہو جاتی ہو یا بعض وقت...... شرمندگی ہوتی ہو تو انہیں چاہیئے کہ

مینیجر زنانہ دواخانہ اے بی ۳۴ دہلی

کو خط لکھ کر "جوہر اعظم" دوا کی شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیں صرف ایک ہی شیشی تندرست بنا دے گی۔

"جوہر اعظم" وہی مشہور دوا ہے۔ جسے ۱۹۲۵ء میں آل انڈیا طبی سوسائٹی نے کافی تجربہ کر کے عام اعلان کے ذریعہ پبلک کو مطلع کیا تھا کہ "جوہر اعظم" دوا جریان کے مریض کو یقیناً تندرست کرتی ہے۔ اور تمام ملک سے پرزور اپیل کی تھی کہ جریان کے مریضوں کو اس دوا سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کیونکہ آل انڈیا طبی سوسائٹی نے جوہر اعظم کا بہت کافی تجربہ کرایا ہے۔ اور ہر جگہ ہر مریض کو اس دوا نے تندرست کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء سے آج تک انجمن مذکورہ کی ہدایت کے مطابق اس دوا پر محصول ڈاک معاف ہے۔ اور کسی خریدار سے محصول پارسل نہیں لیا جاتا صرف دوا کی قیمت لی جاتی ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب کے اشعار

از:-
جناب صائب فتحپوری

سلطنت مغلیہ کا یہ گوہر شب چراغ جس قدر ہدف ملامت بنایا گیا ہے شاید ہی کوئی دوسرا محمود الرحم ہوا ہو۔ افسوس کہ دنیا والوں نے ان خدمات پر پردہ ڈال کر بے ہودہ باتوں پر ملمع چڑھا چڑھا کر سونا کر دکھایا پھر بھی حق ہے۔ آج کی فرصت میں حضرت عالمگیر علیہ الرحمتہ کے وہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں جو سلطان ذی حشم نے کسی نہ کسی موقع ضرورت کے لحاظ سے رقعات میں منسلک کئے تھے۔ ان کے مطالعہ سے شہنشاہ اورنگ زیب کی شخصیت پر کافی روشنی پڑسکی۔ نیز اعلیٰ معاملات پر عبور حاصل ہوگا۔

ولیعہد حکومت شاہزادہ محمد معظم بہادر شاہ کو وقتاً فوقتاً جو رقعات تحریر کئے گئے ان میں حسب ذیل اشعار موجود ہیں :-

۱۔ گر صد ہزار لعل و گہر مے دہی چہ سود
دل را شکستۂ نہ کہ گوہر شکستۂ

۲۔ آنچہ ما کردیم بر خود ہیچ نابینا نہ کرد
در میانِ خانہ گم کردیم صاحب خانہ را

۳۔ آنچہ بر جستیم و کم دیدیم و بسیار ست و نیست
نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیار ست و نیست

۴۔ ہر یکے ناصح برائے دیگراں !
ناصح خود یافتم کم در جہاں

۵۔ گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو !

ترجمہ :- اگر تو نے انتہا جواہرات دے تو کوئی فائدہ نہیں ۔ اس لئے کہ تو نے موتی نہیں توڑا دل شکنی کی ہے۔

۲ جو کچھ ہم نے اپنے ساتھ کیا ہے وہ کسی اندھے نے بھی نہیں کیا ۔ افسوس ہم دنیا میں رہ کر آخرت کو بھلا بیٹھے۔

۳ ہم نے اچھے آدمیوں کی جس قدر جستجو کی اسی قدر کم پائے باوجودیکہ آدمی بہت ہیں لیکن قابلیت کے لحاظ سے کم ہیں۔ یا بالکل نہیں

۴ ۔ ہر شخص دوسروں کو نصیحت کرتا ہے افسوس دنیا میں کوئی بھی اپنا ناصح نہیں ہے ۔

۵ ۔ جیسی نیت ویسا پھل " جیسا کرو گے ویسا بھرو گے ۔

شاہزادہ محمد اعظم کو آپ نے یوں تو بہت سے اشعار لکھے لیکن قلت گنجائش کے باعث نمونۃً صرف چند پیش کئے جاتے ہیں ۔

۶ ۔ من ز وضع زمانہ در فکرم   کہ مبادا ازیں بتر گردد
۷ ۔ از ساحل نجات بہ بحر فنا فتاد   از حد خود کسے کہ قدم پیشتر نہاد
۸ ۔ کمال مردی و مردانگی است فروتنی   بود شکستہ کمانہاں کمان خند

ترجمہ :- میں زمانہ کی حالت سے متفکر ہوں ایسا نہ ہو کہ اس کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہو جائے ۔

۷ ۔ دنیا میں جس شخص نے چادر سے زیادہ پیر پھیلایا وہ ساحل نجات سے بہک کر بحر فنا میں گر گیا ۔

۸ ۔ عاجزی و انکساری ہی کمال بہادری کی دلیل ہے لوگوں کے ساتھ انکساری کرو اس لئے کہ ان کے ہاتھوں سے غرور کی کمان ٹوٹنے والی ہے ۔

منعم خاں کو لکھتے ہیں :-

۹ ۔ رہ روِ طول عمل را رہبری در کار نیست
تا نفس باقی ست راہ زندگی ہموار نیست

۱۰ ۔ غریق عشق چہ اندیشہ از خطر دارد
سر گذشتہ چہ پروائے دردِ سر دارد

۱۱ ۔ عقدۂ دل بستگی را اندک اندک باز کن
ورنہ مرگ ایں رشتہ را یکبار غافل می کشد

ترجمہ :- جس مسافر کا سفر بے پایاں ہو اُسے کسی رہبر کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اس لئے کہ جب تک دم میں دم ہے زندگی کا رستہ صاف نہیں ہو سکتا ۔

۱۰ ۔ جو شخص بحرِ عشق میں ڈوب رہا ہے وہ خطروں سے بےخوف ہے۔ اسلئے کہ جس کے جسم پر سر نہ ہوگا اُسے دردِ سر کی شکایت نہ ہوگی

۱۱۔ اے انسان دنیاوی دلچسپیوں کی گرہ آہستہ آہستہ کھولتا رہ ورنہ موت عالمِ غفلت میں رشتۂ زندگی کو کھینچ لے گی اور تجھے مجبوراً چھوڑنا پڑے گا۔

ذیل کا شعر خان نصرت جنگ کو تحریر کیا گیا تھا۔

۱۲۔ کند تحمل بسیار مرد را بے قدر　　کمان چو ز حد کشیدن ہد کبادہ شود

ترجمہ:۔ بہت صبر و برداشت سے انسان کی وقعت جاتی رہتی ہے۔ ایک موٹی سی بات ہے کمان جب زیادہ کھینچی جاتی ہے اور کھینچنے دیتی ہے تو ذلیل ہو جاتی ہے۔

میر حسن بخشی دوم کو کس مزے سے لکھتے ہیں۔

۱۳۔ ما زشغلِ آب و گل بر خویستن پرداختیم
خانہ سازی را بخود سازی مبدل ساختیم

۱۴۔ معمارِ خود مشو کہ کنی خانہ ہا خراب
درماندہ باش کو تو بنائے شود بلند
با خاک شو برابر و گردن مکش زکس
شاید غبار از سر پائے شود بلند

ترجمہ:۔ افسوس کہ ہم سب کاموں کو چھوڑ کر اپنی ظاہری آرائشگی کی طرف مائل ہو گئے۔ اور خانہ سازی کو خود آرائی سے تبدیل کر دیا۔

۱۴۔ اپنا معمار خود نہ بن کہ دوسرے گھروں کو بھی برباد کر دے تجھے ویرانہ بنا چاہیئے تاکہ تجھ پر عمارت کی بنیاد اٹھائی جا سکے خود آرائی کا خیال چھوڑ کر خستہ حال بن جا اس میں تیرا اور تیرے ہم جنسوں کا فائدہ ہے۔ مٹی ہے مٹی میں مل جا سرکشی نہ کر ممکن ہے کہ پستی سے بلندی پر پہنچ جائے۔

ہر شعر نصیحت کا دفتر ہے کس لطف سے زیر دستوں کو لکھتے ہیں۔ دستور معظم اسد اللہ خاں کو اس پیرایہ میں نصیحت فرماتے ہیں۔

۱۵۔ حلمِ حق با تو مواسا ہا کند　　چوں کہ از حد بگذرد رسوا کند

۱۶۔ دانی کہ بر نگین سلیماں چہ نقش بود　　خطے بزر نوشتہ کہ ایں نیز بگذرد

ترجمہ:۔ خدا کی بردباری اور مہربانی تیرے ساتھ غمخواری کرتی ہے لیکن جب تیری سرکشی حد سے متجاوز ہو جائے گی تو تجھے ذلیل کر دے گی۔

۱۶۔ تو جانتا ہے کہ حضرت سلیمان کی انگوٹھی کے نگینہ پر کیا لکھا تھا سنہری حروف میں یہ لکھا ہوا تھا کہ "یہ بھی گزر جائے گا"۔

۱۷۔ بنام میر خاں صوبہ دار کابل:۔

سر انگشت گیرد بفکر شکست　　بیک بار جرأت نباید بدست
تو از فکر دشمن بغفلت مباش　　ہمیشہ بہ تیر آش را خراش

ترجمہ:۔ دشمن انگلی توڑنے کے ارادے سے پہلے پوروں کو پکڑتا ہے اور پھر اپنی طاقت سے حملہ آور ہوتا ہے۔ تو دشمن سے غافل نہ رہ ہمیشہ اس کے سیاہ چہرے کو چھیلتا رہ۔

غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کو تحریر کرتے ہیں:۔

۱۸۔ چوں لعل ہر کہ خون جگر خورد و صبر کرد　　زیب کلاہ افسری اقبال میشود

ترجمہ:۔ لعل کی طرح جس شخص نے بھی خون جگر کھایا اور صبر کیا یعنی دل پر جبر اً تکالیف برداشت کیں وہ معزز و اقبال مند اور سر بلند ہوگا۔

نواب اسد خاں کو لکھا گیا:۔

۱۹۔ ہیچ دانی کہ شیر مردی چیست　　شیر مرد زمانہ دانی کیست
آنکہ با دشمناں تواند ساخت　　وانکہ با دوستاں تواند زیست

ترجمہ:۔ تو جانتا ہے کہ بہادری کسے کہتے ہیں؟ اور کیا تجھے معلوم ہے کہ زمانہ کا بہادر کون ہے؟ جو شخص دشمنوں سے موافقت کرتا ہے۔ اور دوستوں کے ساتھ زندگی گزارتا ہے وہی بہادر اور دلیر ہے۔

صدر الدین محمد خاں ... کو اپنی حالت کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں

۲۰۔ بوئے گل و بادِ سحری بر سرِ راہ اند
گر میروی از خود بہ ازیں قافلہ نیست
فریاد کہ اسباب گرفتاریٔ دل را
چوں حلقۂ زنجیر ز ہم فاصلہ نیست

ترجمہ:۔ پھول کی خوشبو اور نسیم سحری بر سرِ راہ قافلہ ہیں اگر تو خودی کو چھوڑ کر اپنی حد سے تجاوز کرے تو اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا قافلہ نہیں ہے۔ فریاد ہے کہ دل کی گرفتاری کے اسباب دل سے اس قدر قریب ہیں جیسے زنجیر کے حلقے۔

۲۱۔ ہر کس کہ بغیر خود صفا خواہد داد　　آئینۂ خویش را جلا خواہد داد
ہر جا کہ شکستہ بود دستش گیرد　　بشنو کہ ہمیں کاسہ صدا خواہد داد

ترجمہ:۔ جو شخص اپنے دل کو صاف کرے گا وہ اپنے آئینہ کی صیقل کرے گا جہاں کہیں بھی کوئی شکستہ حال ہو اس کی دستگیری کر غور سے سن پیالہ صدا دے رہا ہے "شکستہ حالوں کی مدد کر"۔

۲۲۔ اب جو اشعار نقل کئے جاتے ہیں وہ شہنشاہ عالمگیر کی عارفانہ زندگی پر دال ہیں پڑھئے اور سبق حاصل کیجئے۔ عارف کامل ہونے کے باوجود اپنے اعمال پر بھروسہ نہیں۔

گہے از دست گاہے از دل و گاہے ز پا مانم
بسرعت می روی اے عمر می ترسم کہ وا مانم

ترجمہ:۔ کبھی ہاتھ سے کبھی دل سے اور کبھی پیروں سے رہا جاتا ہوں

یعنی پریشان اور بے خود ہوا جاتا ہوں اسے عمر! اس تیزی سے
گزر رہی ہے کہ مجھے خوف ہے کہ کہیں میں چھوٹ نہ جاؤں۔

یار علی بیگ داروغہ کچہری کے نام :-

۲۳۔ افسوس کہ عمر گذشت بے بودہ تلف
دُنیا بتعب گذشت و دیں رفت زکف
رنجید خدا و خلق راضی نشوند !
ضائع کردیم پارۂ آب و علف

ترجمہ :- افسوس کہ میری عمر فضول کاموں میں برباد ہوگئی۔ دُنیا تکلیف سے گذری اور دین و ایمان ہاتھ سے جاتا رہا۔ نہ خدا خوش ہوا نہ مخلوق راضی ہوئی۔ ہم نے پانی اور گھاس میں اپنا قیمتی وقت ضائع کردیا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم   نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

بنام عنایت اللہ خاں دیوان خاص :-

۲۴۔ جہاں آئینہ وہم است وایں صورت پرستانش
نفس پرواز تقلید اند و میگوئند للّٰہی !

ترجمہ :- دنیا وہم اور دھوکا کا آئینہ ہے اور دنیا والے اسلاف کی اتباع میں وقت گذارتے ہیں کہ جیسے ہمارے باپ دادا کرگئے ہیں ویسا ہی ہم بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ہمارے جملہ کام خدا کیلئے ہیں۔

منصور خاں ناظم خجستہ بنیاد اورنگ آباد (دکن) کو ۱۹ شعبان ۵۰ جلوس میں تحریر کرتے ہیں :-

۲۵۔ در لحد خاک کشادہ است بغل بہر طلب
تو ہنوز از بے خبری رنگ سرامی ریزد
زود باشد کہ دریں غفلت و حرص و طلبش
استخوانہاش جدا گوشت جدا می ریزد

ترجمہ :- قبر طلب کیلئے ہاتھ بڑھائے ہوئے ہے اور حضرتِ انسان بیخبری کے عالم میں دنیا کی رنگ آمیزی میں مصروف ہیں۔ وہ وقت قریب ہے جب میری غفلت، طلب اور لالچ کی وجہ سے بدن کی ہڈیاں الگ ہوجائینگی اور گوشت گل کر بہہ جائیگا۔

یہ رکعا حزن گر سے لکھا گیا تھا عارف پر معارف پر سب عقدے کھل گئے تھے اس سفر کو "خاتمۂ سفر" قرار دیا تھا۔ اور وہی ہوا جو اس قلم سے ظاہر ہو رہا ہے۔ کتنا پرہیزگار اور متقی تھا اورنگ زیب کہ مرنے سے پہلے ہی فطرت نے نقاب کشائی کردی تھی۔ ہر رقعہ نصیحت سے مملو ہے۔ اور یہ اشعار جو پیش کئے گئے ہیں پند و نصائح کا دفتر اپنے دامن میں پوشیدہ رکھتے ہیں پھر ہم اورنگ زیب جیسے پاک طینت سلطان کو مصلح اعظم کے نام سے کیوں نہ یاد کریں ◆



کیا میں زندہ ہوں؟

نوشتہ:۔ گالزوردی

ترجمہ جناب خان شبیر احمد خاں (جبلپور)

۱۹۱۲ء کے آغاز بہار کا واقعہ ہے کہ ایک روز ایک وکیل اپنے ایک دوست کے ساتھ شراب نوشی میں مشغول تھا۔ دوران گفتگو میں وکیل نے کہا: "آج میں اپنے والد کے کاغذات اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ ایک اخبار کا ٹکڑا نظر پڑا اس میں تاریخ لکھی تھی دسمبر ۱۹۱۱ء۔ اگر تم پسند کرو تو میں اسے پڑھ کر سناؤں"۔

"ہاں ہاں ضرور" دوست نے شراب کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

وکیل نے پڑھنا شروع کیا۔

"کل لندن پولیس کورٹ میں ایک ہلچل سی مچ گئی جب آدمی نے جو شکل و صورت سے شریف معلوم ہوتا تھا لیکن اس کا لباس بوسیدہ تھا مجسٹریٹ سے کچھ پوچھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہم ان کا مکالمہ ہو بہو نقل کرتے ہیں۔

"مائی لارڈ! کیا میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟"

"ہاں اگر وہ ایسی بات ہو جس کا میں جواب دے سکوں"۔

"میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میں زندہ ہوں؟"

"باہر نکل جاؤ"۔

"میرے آقا! میں بالکل ہوش میں ہوں۔ یہ بات میں ضرور معلوم کر کے رہونگا۔ میں زنجیر ساز ہوں"۔

"کیا تم ہوش میں ہو؟"

"مائی لارڈ میں بالکل ہوش میں ہوں"۔

"تو پھر ایسا بیہودہ سوال کرنے سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

"میرے آقا میں بیکار ہوں"۔

"تم کس طرح بیکار ہوئے؟"

"میرے مالک یہ اس طرح ہوا۔ میں دو ماہ ہوئے اپنے کام سے علیحدہ کر دیا گیا۔ لیکن میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میرے آقا آپ کو معلوم ہوگا کہ میری طرح ہزاروں لاکھوں انسان ہیں"۔

"ہاں کہے جاؤ"۔

"مائی لارڈ میں کسی یونین کا رکن نہیں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہماری تجارت میں کوئی یونین نہیں"۔

"ہاں ہاں!"

"تین ہفتے ہوئے کہ میری آمدنی کے سب ذرائع مسدود ہو گئے میں نے انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح کوئی کام مل جائے لیکن میں کامیاب نہ ہو سکا"۔

"کیا تم نے اپنے ضلع کی ہمدرد کمیٹی سے درخواست کی؟"

"میرے مالک! میں نے درخواست کی لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی"۔

"کیا تم پوپ کے پاس گئے تھے؟"

"ہاں میرے آقا"۔

"کیا تمھارے کوئی رشتہ دار یا دوست مدد نہیں کرتے؟"

"ان میں سے نصف میری طرح ہیں اور باقی کو میں پہلے ہی پریشان کر چکا ہوں"۔

"تم نے ——؟"

"ہاں میں انھیں اکتا چکا ہوں۔ کاش وہ مجھے معاف کر دیں"۔

"کیا تمھاری بیوی بچے ہیں؟"

"نہیں میرے آقا یہی بدقسمتی ہے۔ اسی وجہ سے میں ہر جگہ ناکام رہتا ہوں"۔

"ہاں ہاں! اچھا تمھارے لئے قانون ہے کہ ——"

"مائی لارڈ۔ میں کل رات دو جگہ گیا۔ لیکن وہاں سے کئی درجن آدمیوں کو نکال دیا گیا کیونکہ گنجائش نہ تھی۔ آقا۔ میں بہت بھوکا ہوں۔ کیا مجھے اختیار ہے کہ میں کوئی کام کروں؟"

"ہاں! لیکن صرف قانون کی حد میں رہ کر"۔

"میں کہہ چکا ہوں کہ پچھلی رات میں نے کارخانہ میں پھر کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ کیا میں کسی کو مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ مجھے نوکری دے؟"

"میرے خیال میں نہیں"۔

"میرے آقا مجھے کھانے کی سخت ضرورت ہے۔ کیا آپ مجھے

[اجاز]ت دینگے کہ گلیوں میں بھیک مانگوں؟"

"نہیں نہیں، کبھی نہیں۔"

"اچھا تو میرے آقا کیا میں چوری کروں؟"

"اب تم عدالت کا وقت بیکار مت ضائع کرو۔"

"مگر میرے آقا! میرے لئے یہ جاننا بہت ضروری ہے۔ میں تقریباً فاقہ کر رہا ہوں کیا مجھے اجازت ہے کہ میں اپنا کوٹ بیچدوں (کوٹ کے بٹن ٹوٹ گئے ہیں اور ننگا سینہ دکھاتا ہے) میرے پاس اتنا بھی نہیں ہے کہ"

"تم کو اتنی خراب حالت میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ میں تم کو قانون شکنی کی اجازت نہیں دیتا۔"

"اچھا کیا آپ مجھے اجازت دینگے کہ میں رات کو باہر بھوکا سو جاؤں"

"میں آخری مرتبہ تم سے کہتا ہوں کہ مجھے کوئی اختیار نہیں ہے کہ میں تمہیں ان میں سے کسی کام کی بھی اجازت دے دوں۔"

"تو پھر میں کیا کروں! میں آپ سے سچ سچ عرض کر رہا ہوں میں قانون شکنی کے بغیر ہی سب کچھ کرنا چاہتا ہوں تو پھر مجھے بتائیے کہ میں کس طرح بغیر کھانے کے زندہ رہوں؟"

"کاش میں تمہیں بتا سکتا۔"

"اچھا تو اب بتائیے کیا میں قانون کی نظروں میں زندہ ہوں"

"یہی ایک سوال ہے جس کا میں جواب نہیں دے سکتا۔ تم قانون توڑ کر زندہ رہ سکتے ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم ایسا نہیں کروگے۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ اچھا تم ایک شلنگ خزانہ سے لے سکتے" وکیل ٹھہر گیا۔

"واقعی!" اس کے دوست نے کہا۔ "یہ بہت دلچسپ واقعہ ہے ـــ کتنا عجیب! ـــ بالکل انوکھا ـــ اس زمانے میں عجیب و غریب واقعات ہوتے تھے۔

(ترجمہ)

کامیاب آیا

از:- جناب محمد اسمٰعیل خان مائل بنگلوری

نظر آئی خدا کی شان جب وہ بے نقاب آیا
ہُوا ہنگامہ برپا بزم میں اک انقلاب آیا

نگاہیں اٹھ رہی ہیں ہر طرف محفل میں ساقی کی
نوید اے بادہ نوشو دور میں جام شراب آیا

غرور حسن تو دیکھے کوئی اس جان محفل کا
نگاہِ لطف کی درخواست پر جس کو عتاب آیا

سہے لاکھوں ستم اُف تک نہ کی اللہ ری ہمت
مبارک امتحانِ عشق میں دل کامیاب آیا

وہ نالہ جو نہ تھا مقبول عالم کی نگاہوں میں
خدا کے دفتر رحمت سے ہو کر مستجاب آیا

بہت کیں منتیں لیکن نہ مانی ایک بھی اس نے
مری ہر التجا کا نفی ہی میں بس جواب آیا

رہا باقی نہ ہوش دید بھی سب ہو گئے بیخود
کچھ اس انداز سے محفل میں وہ مستِ شباب آیا

بتوں کی بھی پرستش ہے خدا کی بھی پرستاری
جہان عشق میں افسوس کیسا انقلاب آیا

ارے دل ابھی تک سو رہا ہے خواب غفلت میں
ذرا آنکھیں اٹھا کر دیکھ سر پر آفتاب آیا

مجھے بھی چاہنے والوں میں اس نے کر لیا شامل
خدا کا شکر دیوانے کا مائل کو خطاب آیا

عرب کا سب سے پہلا شاعر

نابغہ ذبیانی

از جناب امداد علی مضطر میرٹھی

"نابغہ ذبیانی عرب کا ہومر تھا" یہ ہے وہ فقرہ جو نابغہ ذبیانی کے متعلق تمام راویانِ سلف نے بالاتفاق لکھا ہے۔ یہ شخص جاہلیت عرب کے شاعروں میں سب سے زیادہ ممتاز اور عربی ادب کے دورِ اولیں کا مستند استاد مانا جاتا تھا۔ اس کا تعلق قبائل مضر بن عدنان یعنی حضرت اسمٰعیل کی نسل سے تھا۔ اس کا اصلی نام زیاد بن معاویہ تھا۔ ابو امامہ کنیت اور نابغہ اس کا لقب تھا۔ اور اسی لقب سے اس نے تمام اطراف و جوانب میں شہرت پائی۔ بلاشبہ سرزمین عرب کا سب سے پہلا یہی شاعر ہے جس پر عرب کی شاعری کو بجا ناز تھا۔

تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ نابغہ کے کلام کا اثر عوام و خواص پر یکساں تھا۔ اس کی شاعری سے نہ صرف عوام الناس کیف حاصل کرتے تھے۔ بلکہ بڑے بڑے علما فضلا اور ادبا بھی وقت اس کے اشعار سے متاثر ہو کر اس کی تعریف و توصیف فرماتے تھے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق نے بنی غطفان کے کچھ لوگوں کو چند ایک آفریں اشعار سنا کر دریافت فرمایا کہ "بتاؤ یہ اشعار کس کے ہیں؟" جواب دیا گیا کہ "نابغہ کے" امیرالمومنین نے فخریہ لہجہ میں فرمایا کہ "بیشک نابغہ ہی کے اشعار ہیں جو سب شاعروں سے بڑھا ہوا ہے"۔

نابغہ کی شاعری کا سب سے بہتر پہلو یہ تھا کہ اس کا کلام توحید و خدا پرستی کے لکنات سے پُر ہوتا تھا۔ اس کا ہر شعر اصلاحِ اخلاق کا سبق دیتا تھا اور اس کے ساتھ ہی ان میں انبیائے کرام کا بھی ذکر ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ نابغہ کے اشعار نہ صرف مجالس عوام میں بڑی تعریف و توصیف کے ساتھ پڑھے جاتے تھے بلکہ خلفائے اسلام میں بھی اس کے کلام سے حافی حظ حاصل کئے بغیر نہ رہتے تھے۔

اسی دور کے بے مثل ادیب، زبان عربی کے ماہر، صرف و نحو اور رسم الخط کے موجد ایک صاحب تھے جن کا نام ابوالاسود تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ابوالاسود حضرت عبداللہ بن عباس کی محفل خاص میں بیٹھے ہوئے تھے۔ از راہِ تذکرہ شعر و سخن کا ذکر آ گیا کسی صاحب نے حضرت عبداللہ سے پوچھا کہ "سب سے پہلا شاعر کون ہے؟" حضرت عبداللہ نے اس شخص سے فرمایا کہ اس کا جواب ابوالاسود دیں گے۔ چنانچہ اس شخص نے وہی سوال ابوالاسود سے کیا۔ ابوالاسود نے فوراً نابغہ ذبیانی کے کچھ اشعار پڑھ کر کہا جس کے یہ شعر ہیں۔ وہی عرب کا سب سے بڑا شاعر ہے اس کے بعد حضرت عبداللہ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "ابوالاسود جیسے بلند ترین ادیب کے اس فیصلہ کے بعد کسی کو نابغہ کے کمال سخن میں شک ہو سکتا ہے۔"

ایک اور شخص حماد راویہ تھے جن کے متعلق مشہور ہے کہ یہ شخص کلام عرب کا بہت بڑا محقق اور حافظ تھا۔ یہ بھی نابغہ کی شاعری کا بڑا مداح تھا۔ ایک دن معلویہ بن بکر باہلی نے حماد سے دریافت کیا کہ "نابغہ کو دوسرے شعراء پر کیوں فوقیت حاصل ہے" حماد نے نابغہ کے کچھ اشعار سنا کر معلویہ سے کہا کہ "اگر اس قسم کے اشعار کہنے کی تم کو آدھی یا چوتھائی قابلیت بھی پیدا ہو جائے۔ تو تمہارے اساتذہ فن میں شمار ہو جانے کیلئے کافی ہے۔"

ان واقعات کے علاوہ متعدد ایسے واقعات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نابغہ ذبیانی بالاتفاق عرب کے شعرا میں سب سے اول درجہ رکھتا تھا۔ دوسرے اساتذۂ فن شاعری بغیر کسی خیال کے اس کو اپنے سے زیادہ قابل اور فنی اعتبار سے استاد مانتے تھے۔ اور یہ سب کچھ کسی وجہ سے نہ تھا بلکہ صرف نابغہ کی خداداد استعداد و موزونیٔ طبع کی بدولت تھا۔

عکاظ کا میلہ عرب کا بہت ہی بارونق اور مشہور میلہ ہوتا ہے اس میلہ میں عرب کے قریب قریب تمام شاعروں کا اجتماع ہر سال ہوتا تھا۔ اس جگہ ہر ایک شاعر اپنا اپنا کلام سنا کر سخن سنجان عرب سے داد خواہ ہوتا۔ اس مجلس کے صدرِ اعظم نابغہ تھے۔ ان کیواسطے ایک خیمہ نصب کیا جاتا تھا۔ نابغہ منہ پر نقاب ڈال کر بڑے احتشام و انعام کے ساتھ اس خیمہ میں صدر نشین ہوتے۔ اور ہر موجودہ شاعر باری باری اپنا کلام نابغہ کے روبرو پیش کرتے جس شاعر کا کلام نابغہ پسند کر لیتا وہ اپنی شاعری پر نہ صرف ناز کرتا بلکہ اپنے ہم چشموں میں ہمیشہ

(باقی بر صفحہ ۶۵)


یہ عورت
لیکوریا کی بیمار تھی
اس کو پانی گرنے کی بیماری ہوگئی تھی - ہر وقت یا کبھی کبھی یا
ماہواری کے آگے پیچھے اس کے مخفیہ جسم سے سفید رطوبت جانے
لگی تھی - رفتہ رفتہ یہ بیچاری بستر پر دراز ہوگئی جوانی کا رنگ روپ
اڑ گیا - چہرہ زرد پڑ گیا - مگر جب اس نے اپنی سہیلیوں سے سنا کہ
لیکوریا یعنی سیلان الرحم کی بیماری کو دوا "رُوک" صرف تین
دن میں ختم کر دیتی ہے - تو اس نے بھی ایک شیشی منگالی اور دوا کا
استعمال شروع کر دیا - ٹھیک تیسرے دن پانی آنا بند ہوگیا - اور یہ
پھر تندرست ہوگئی -
دوا "رُوک" اس مرض کا سب سے بڑا علاج ہے جس عورت
کو پانی گرنے کی بیماری (یعنی لیکوریا) ہو جائے اُسے چاہیئے
کہ وہ
لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ بی ۱۲۳ دہلی سے
پتہ پر خط لکھ کر دوا "رُوک" کی ایک شیشی بذریعہ
وی پی پارسل منگالے اور استعمال شروع
جوان تھی
اور اتنی خوبصورت کہ دیکھنے والا
دیکھتے رہ جاتے تھے - مگر جب
سیلان الرحم کی بیمار ہوگئی
تو شباب کا رنگ روپ ڈھل گیا اور
زندگی کے دن ہی ہو گئے -
بستر پر لیٹ گئی
کردے - ٹھیک تیسرے دن ہی پانی آنا بند ہو جائے گا - بارہ سال کی آزمودہ دوا ہے - ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مشہور ہے کہ ایک ہی
شیشی عورت کو تندرست کر دیتی ہے - ایک شیشی دوا "رُوک" کی قیمت تین روپے ہے - ساتھ آنے پارسل پیکنگ علیحدہ لگتا ہے -

فرمانروائے حیرہ نعمان کے دربار میں نالغہ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ نعمان کے مقربین خاص میں سے تھا۔ اور ہر وقت اُن کے ساتھ رہتا تھا حتیٰ کہ محلسرا میں بھی باریابی حاصل تھی۔ ایک روز نالغہ بلا حصول اجازت نعمان کے محل خاص میں جا پہنچا۔ اتفاق سے اس وقت نعمان کی ماہ رُخ و مہ جبین ملکہ نیم عریاں حالت میں حمام کی طرف جا رہی تھی۔ نالغہ نے اُسے دیکھ لیا اور ملکہ نے بھی اس کی طرف دیکھ کر شرم و حیا کے سبب اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ نالغہ اسی وقت محل سے واپس آ گیا لیکن اس منظر سے اُس کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے فوراً چند اشعار کہہ ڈالے۔ وہ اشعار اس کی زبان سے نکلنے کی دیر تھی کہ تمام قرب و جوار میں زبان زد خاص و عام ہو گئے۔ اور ہوتے ہوتے نعمان کے کانوں تک بھی پہنچ گئے جن کو سُن کر نعمان بہت رنجیدہ ہوئے اور فوراً نالغہ کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ نالغہ پہلے ہی سے خوفزدہ تھا وہ اپنی طلبی کا حکم سنتے ہی وہاں سے فرار ہو گیا اور سیدھا مدینہ پہنچا۔

نالغہ کے مدینہ پہنچنے سے قبل ہی وہ اشعار مدینہ کے ہر ایک شخص کی زبان پر رواں تھے۔ مدینہ کے کسی شاعر نے ان اشعار کو سُن کر کہا کہ ایک شعر میں کچھ عیب ہے لیکن ایسے مانے ہوئے اُستاد کے کلام کے متعلق زبان کھولنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ مگر اس چیز کو نالغہ کے کانوں تک پہنچانے کے لئے ایک تدبیر سوچی گئی۔ ایک محفل سرود منعقد کی گئی جس میں نالغہ کو بھی مدعو کیا گیا اور ایک رقاصہ کے ذریعہ سے اس طور پر وہی ملکہ نعمان والے اشعار سنائے گئے جس شعر میں کچھ سقم تھا اس کو اس رقاصہ نے متعدد مرتبہ کہا۔ نالغہ نے اس کو سنا اور خود اپنی غلطی کو محسوس کرتے ہوئے بھرے مجمع میں اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا اور اسی وقت اس شعر کو درست کر دیا۔ نالغہ اس قدر عالی ظرف تھا کہ اس واقعہ کے بعد جب کسی صحبت میں اس کے شاعرانہ کمال کا تذکرہ ہوتا تو وہ فوراً اپنی غلطیوں کا بھی اعتراف کر لیتا۔

نالغہ دربار نعمانی سے فرار ہونے کے بعد مدینہ میں اقامت پذیر ہو گیا۔ نعمان کی اس پر اس درجہ لطاف و عنایات تھیں کہ نالغہ اپنی مذموم حرکت پر بہت پشیمان تھا۔ اُن مراحم خسروانہ کو چھوڑ دینے کے بعد وہ بے انتہا طول خاطر رہتا۔ اگرچہ یہاں بھی اس کے لئے ہر امیر و کبیر شخص کی بخشش تا حد امکان موجود تھیں۔ لیکن جس شخص نے ایک اولوالعزم، فراخ دل اور قدردان بادشاہ کی نظریں دیکھی ہوں وہ دوسروں کی عنایات کو کب خاطر میں لا سکتا ہے۔ چنانچہ نالغہ ہر وقت اسی خیال میں منہمک رہتا کہ کسی طریقہ سے نعمان سے اپنے قصور کی معافی مانگ کر داخل دربار ہو جاؤں۔

حسن اتفاق سے قبیلہ بنی قرارہ کے دو ایسے شخصوں سے نالغہ کی ملاقات ہو گئی جن سے نعمان کی رسم و راہ تھی۔ اور نعمان ان دونوں کی بات کو کبھی رد نہ کرتا تھا۔ نالغہ کی قدر و منزلت ہر شخص کے دل میں موجود تھی۔ نالغہ نے ان دونوں کو اپنا دلی مدعا بتا کر نعمان سے سفارش کی درخواست کی۔ اگرچہ نالغہ کا قصور کچھ کم اہم نہ تھا تاہم ان دونوں نے نالغہ کو تسلی و تشفی دے کر حتی الوسع اس کی امداد کا وعدہ کیا۔

ایک دن یہ دونوں حضرات نالغہ کو ہمراہ لے کر نعمان سے ملنے گئے نعمان نے ان کے قیام کے لئے ایک چرمی خیمہ نصب کرا دیا۔ ان دونوں نے نالغہ کو تو اس خیمہ میں پوشیدہ رکھا اور خود نعمان سے ملاقات کے لئے دربار میں پہنچے۔ ان دونوں کے ساتھ ایک مغنیہ تھی جس کو نالغہ نے اپنے چند اشعار ازبر کرا دیئے تھے اور یہ ایسے اشعار تھے جن کے مضمون کا تعلق محض نالغہ اور نعمان کی ذات سے تھا۔ دونوں شخصوں نے بعد سلام و آداب نعمان کی خدمت میں مغنیہ کو پیش کیا حکم ہوتے ہی مغنیہ نے اپنے خداداد لب و لہجہ سے سحر انگیزیاں شروع کیں اور کچھ دیر کی وجد آفرینیوں کے بعد نالغہ کے بتائے ہوئے اشعار کے ساتھ خوش الحانی شروع کی۔ ایک دو اشعار سننے کے بعد نعمان جیسے خواب سے چونک پڑے اور یکبارگی بول اٹھے "خدا کی قسم ایسے اشعار بجز نالغہ کے اور کون کہہ سکتا ہے۔" نالغہ کے اشعار کی کیف سامانیوں کے ساتھ نعمان کو اس کے علم و حلم کی یاد ستانے لگی مغنیہ وہ اشعار گا رہی تھی اور نعمان فرط جذبات سے بیخود ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے منہ بل زخمہائے دل پھر آنکھوں کے رستے رسنے لگے۔

مغنیہ نے اپنا گانا بند کیا اور نعمان نے متجسسانہ نظروں سے حاضرین کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں گویا وہ اپنے حکم پر پریشان ہوتے ہوئے نالغہ کو تلاش کر رہے ہیں۔ مدینہ کے ان دونوں نو آمدہ شیخوں نے اس موقعہ کو غنیمت خیال کرتے ہوئے خود ہی نعمان سے نالغہ کے متعلق استفسار کیا اور کچھ دیر کی گفت و شنید کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ نعمان نالغہ کو کھو کر بے حد مایوس اور شرمندہ ہیں تب انہوں نے نعمان کو اصل واقعہ سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ "نالغہ ہمارے خیمہ میں موجود ہے" اتنا سننا تھا

(باقی بر صفحہ ۹۷)

موسم بہار کے لئے

آپ کی ہر قسم کی طاقت بڑھانے کے نسخے

یہ صفحہ سنبھال کر پاس رکھیں | **یہ صفحہ سنبھال کر پاس رکھیں**

افیونیہ یہ دوائی مردوں کے واسطے جرابی ہے گو پیدا کرتی و کمال بڑھاتی ہے اور باہ کو بڑھاتی ہے۔ نیچے کو موٹا قوت بھی بڑھاتی ہے قبض کشا بھی ہے ہر امیر غریب استعمال کرتا ہے۔ قیمت ۲۰ گولی دو روپیہ۔

کامانتم امراض باہ میں بے نظیر چیز ہے کیونکہ اس سے دل و دماغ پر خاص اثر ہوتا ہے اسواسطے ذہنی ناطری کو بھی دور کرتی ہے ریت کے کم یا پتلا ہونے سست کرنے والی اشیاء دعفون چرس وغیرہ کھانے سے دماغی کثرت کار سے بری عادت سے خوف اور شرم و حیا سے کسی بھی وجہ سے کوئی بھی مادی کمزوری یا دیرج کی خرابی ہوئی ہو اس کو دور کر کے فائدہ دیتی ہے جنگل کے اشتہاروں کی طرح تعریف کیجاوے تو بیسیوں کے صفحے بھرنے چاہئیں۔ قیمت ۴۲ گولی چھ روپے۔ ۱۶ گولیاں اڑھائی روپے۔

اکسیر طلا یہ بھی جرال تک ہے مقوی باہ زیادہ ہے مریضان سستی کو اس کو استعمال کرنا چاہیئے امراض بادی و بلغم نزلہ زکام سر درد وغیرہ جن کو رہتی ہے۔ ان کو بھی فائدہ کرتی ہے۔ قیمت ۴۸ گولی چار روپیہ۔ ۱۶ گولی ایک روپیہ۔

کرن جوانی جسم کیلئے صحت بخش و مقوی نیا پیدا کرنے والے تمام غدود زنانی دیگر وابستہ تمام اعضاء رئیسہ کی کمزوری کو دور کر کے اصلی حالت پر لاتی و بڑھاپے کو دور کر کے جوانی کی امنگیں پیدا کرتی ہے بوڑھوں کو جوان بناتی ہے۔ کھانسی و دمہ۔ نزلہ زکام گنٹھیا دائمی قبض و جسمانی کمزوری کو دور کرتی ہے۔ قیمت ۴۸ گولیاں سوا روپیہ۔ ۹۰ گولی تین روپے درجہ خاص ۴۲ گولی ساڑھے تین روپیہ۔ ۹۰ گولیاں نو روپے۔

یوشال نہایت ہی طاقت مقوی باہ مقویات کے ساتھ کشتہ جات سونا۔ چاندی۔ موتی۔ زر کردہ صحیح نیز کستوری عنبر وغیرہ ملا کر تیار کیجاتی ہے۔ جریان احتلام، سرعت کا قلع قمع کر کے باہ کو خوب بڑھاتی ہے کثرت بول ذیابیطس۔ نزلہ زکام ضعف معدہ گنٹھیا گرد کمر نقرہ وغیرہ تک کو دور کرتی ہے رگ و پٹھے کو مضبوط کرتی ہے۔ قیمت ۳۲ ٹکیہ تین روپے۔ ۸ ٹکیہ آٹھ روپے۔

جوب خوش کن علے مریضان مشک کی بیماری دور کر کے نیز وقتی مزید رت کیواسطے بے مثال کی دوائی ہے جس کو بعض کو تازہ کا اثر رہتا ہے ۵-۶ گھنٹہ تو معمولی بات ہے تیسرے پہر ایک گولی کھانی چاہیئے۔ قیمت ۴ گولی دو روپے آٹھ آنے۔ ۲ گولی آٹھ آنے۔

وقت خوش کن علے یہ بھی ویسی ہی ہے لیکن اس کا اثر کم رہتا ہے تاہم بہت ہی مقوی ہے۔ قیمت ۴ گولی اڑھائی روپیہ۔ ۸ گولی آٹھ آنے

رکھیریا پاؤڈر کوئی بھی اوپر کی دوائی کھاتے وقت اس کو استعمال کیا جا سکتا ہے یا علیحدہ بھی اس کو سردیوں میں استعمال کر سکتے ہیں یہیں ذریعہ کو رکھنے پیدا کرنے والی ادویہ کیساتھ بہت سے مقویات شامل کئے گئے ہیں کھیر بنا کر کھایا جاتا ہے یا دودھ سے ویسے ہی کھا سکتے ہیں اس سے دماغ تر و تازہ ہوتا ہے جسم بھی بڑھتا اور مضبوط طاقت ور ہوتا ہے اور جریان سرعت احتلام بھی دور ہوتے ہیں۔ قیمت ۱۶ تولہ ایک روپیہ آٹھ آنے۔

کھن بہار ذریعہ کو صاف کرتا اور جریان احتلام و رقت سوزاک کی گرمی پیٹ وغیرہ کو دور کرتی ہے قیمت ۱۶ گولی ۴ روپیہ ۱۱ گولی

طلاؤں کا مسئلہ حل ہوگیا

طاقت کیلئے ہر کوئی ونود وید بھوشن پنڈت ٹھاکر دت شرما وید نے ایک ایسا لیپ تیار کر دیا ہے جسکو مدتوں آپ اپنے پاس رکھ سکتے ہیں ضرورت پر لگایا اور پھر اتار کر شیشی میں رکھ لیا اس کی نہ تیزی کم ہوگی جب تک پوری طاقت ہو جائے روزانہ استعمال کریں اور پھر بھی یہ آپکے پاس رہیگا جب کبھی ضرورت ہو استعمال کریں پھر ایک گھنٹہ باندھ لیں اور اپنے رگ و پٹھے کو چست و تیز کر لیں اسکا نام کوکا پلاسٹر ہے قیمت فی شیشی چار روپے۔ اگر تیل کی شکل کا طلاء ہی پسند ہو تو طلاء منگوا دیں جو بے نظیر ہے قیمت فی شیشی چار روپے۔ نصف دو روپیہ۔ نمونہ سوا روپیہ ✚ لمبی چوڑی دل خوش کن تعریفوں کا خیال چھوڑ کر اصلیت پر غور کریں اور جو چیز ضرورت ہو منگوا لیں یا اپنا حال لکھ کر بھیج کر دریافت کر لیں کہ کتنے دام کی دوائی آپ کے موافق رہی ہے۔ خط و کتابت و تار کا پتہ امرت دھارا لاہور

المشتہر: مینیجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا روڈ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

۔۔ نعمان جوش مسرت سے اچھل پڑے اور حاضرین کو گواہ بنا کر اس کا قصیدہ سات زبانوں کے امورت طور پر حاضر دربار کرنے کا حکم دے دیا۔ نابغہ اپنے مولیٰ نعمت کے حضور میں بعد شکر و امتنان باریاب ہوا اور نعمان کے ۔۔ پر ۔۔ تقریر دیا کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں نعمان نے اس ۔۔ بڑے تپاک کے ساتھ اٹھایا اور پھر اسی عزت و احترام کے ساتھ ۔۔ داخل کر لیا۔

دربار نعمانی سے نابغہ کے چلے جانے کے بعد ایک واقعہ پیش آیا کہ ۔۔ شاعر حسان بن ثابت نے نعمان کی شان میں ایک قصیدہ کہا اور حاضر دربار ہو کر نعمان کو سنایا۔ نعمان جو ایک قادر الکلام شاعر نابغہ کے کلام کے [illegible] اس قصیدہ کی کیا تعریف کرتے نتیجہ یہ ہوا کہ حسان کو بہت معمولی ۔۔ انعام دے کر رخصت کر دیا گیا اور درباری شاعر بننے کی جو آرزو حسان ۔۔ دل میں تھی۔ وہ پوری نہ ہو سکی۔

نابغہ کے دوبارہ داخل دربار ہو جانے پر حسان کی آتش حسد مشتعل ہو گئی ۔۔ زیادہ رنج اس کو تین باتوں کا تھا اول تو یہ کہ نابغہ کی گستاخانہ حرکت ۔۔ باوجود اس کو نہ صرف دوبارہ مقربین میں شامل کر لیا گیا بلکہ نعمان اس کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ محبت کرنے لگے۔ دوم نعمان نے نابغہ کو سو اونٹ طلائی نقرئی سکوں سے بھرے ہوئے بخشے تھے جس نے صحرا نشین بدوکی عادت شخصیت اور معاشرت تبدیل کر کے ایک عالی مرتبہ رئیس عجم بنا دیا تھا ۔۔ تیسرے نابغہ کے شاعرانہ دل و دماغ پر۔

حسان کے بغض و حسد نے اس درجہ ترقی کی کہ اس نے طرح طرح کے الزامات تراش کر نابغہ کے خلاف واقعات نعمان کے گوش گزار کرائے لیکن نعمان پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ اور حسان ایک عرصہ گزر جانے کے باوجود اپنی تمامتر کوششوں میں ناکام رہا۔ حسان اگرچہ صدق دل سے نابغہ کے شاعرانہ کمالات کا معترف تھا۔ لیکن اس کی حاسد طلب طبیعت نے نابغہ کی تعریف میں کبھی کوئی لفظ اس کی زبان تک نہ آنے دیا۔

عرب کے لوگ نابغہ کے کلام کی خوبی و لطافت کے اس درجہ قائل تھے کہ وہ اس کے فنی کمالات کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہ کرتے تھے۔

۔۔ جب حسان نے دیکھا کہ نعمان نے نابغہ کی برائیوں کا کوئی اثر نہیں لیا تو اس نے عوام کی نظروں میں نابغہ کو ذلیل کرنا چاہا لیکن یہاں بھی اس کا ۔۔ برعکس ہوا اور لوگ خود حسان کے مخالف بن گئے۔ اب حسان کیلئے ۔۔ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنے دلی اور حقیقی جذبات کے مطابق نابغہ ۔۔ اس کی شاعری کی توصیف میں رطب اللسان بن جائے۔

تمہیں بدگماں ہو

نظم

از جناب جنید احمد بی۔ ایس۔ سی ایل ایل بی

ـت کی رنگیں کہانی کے دن ہیں
ـلی راتیں جوانی کے دن ہیں
ـتی زندگانی کے دن ہیں
ـنی مے ارغوانی کے دن ہیں
یہ سب کچھ ہے لیکن تمہیں بدگماں ہو
بڑی مہرباں ہو بڑی مہرباں ہو

ـت کی رات آئی سہانی
ـتی ہوئی نامکمل کہانی
ہر اک سمت ہے جلوۂ لن ترانی
محبت میں حل ہو رہی ہے جوانی
یہ سب کچھ ہے لیکن تمہیں بدگماں ہو
بڑی مہرباں ہو بڑی مہرباں ہو

ـمیں کچھ اس طرح کی بیخودی ہے
کہ جیسے محبت کی بستی بسی ہے
نظر میں تبسم لبوں پر ہنسی ہے
رگوں میں نئی زندگی دوڑتی ہے
یہ سب کچھ ہے لیکن تمہیں بدگماں ہو
بڑی مہرباں ہو بڑی مہرباں ہو

وہ بادل اٹھے اور سنکی ہوائیں
وہ آئیں مہکتی بھٹکتی گھٹائیں
ترنم بداماں گرجتی صدائیں
تجلی سے معمور ہیں پھر فضائیں
یہ سب کچھ ہے لیکن تمہیں بدگماں ہو
بڑی مہرباں ہو بڑی مہرباں ہو

مری منتظر ہے بہاروں کی دنیا
حسیں وادیوں کے نظاروں کی دنیا
وہ سحر آفریں آبشاروں کی دنیا
جھکی جا رہی ہے ستاروں کی دنیا
یہ سب کچھ ہے لیکن تمہیں بدگماں ہو
بڑی مہرباں ہو بڑی مہرباں ہو

سہانی سہانی وہ برسات آئی
تمناؤں میں ڈوبی ہوئی رات آئی
مجھے یاد گزری ہوئی بات آئی
زباں تک نظر کی مناجات آئی
یہ سب کچھ ہے لیکن تمہیں بدگماں ہو
بڑی مہرباں ہو بڑی مہرباں ہو

محبت کے دن بیخودی کا زمانہ مسرت کی لہریں خوشی کا زمانہ
تبسم، ہنسی، دل لگی کا زمانہ یہی ہے یہی زندگی کا زمانہ
یہ سب کچھ ہے لیکن تمہیں بدگماں ہو
بڑی مہرباں ہو بڑی مہرباں ہو

ستم رسیدہ

فارسی کے ایک افسانے کا ترجمہ

از جناب ایچ ایم نہال احمد قیصر قاسمی

پھر مدت گزری قحط سالی کی وبا پھیلی اس طریقہ سے پھیلی کہ ہر شخص کیلئے اس فراموش کردہ عشق کی تصویر نظر آتا تھا۔ میرے پاس جو کچھ سرمایہ تھا وہ بھی ختم ہوگیا جب بہت ہی مجبور و بے بس ہوا تو بجز اس کے کوئی علاج سمجھ میں نہ آیا۔ کہ کسی مسجد کے دروازے پر بیٹھ کر دریوزہ گری کروں بھیک مانگوں۔ یہ سوچ کر میں گھر کا دروازہ بند کر کے چل دیا۔ ابھی تھوڑی ہی دور چلا تھا۔ کہ ایک برقعہ پوش عورت سامنے سے آئی اور میرے ہاتھ میں چند روپے دے کر کہا۔ مجھے ایک مشکل درپیش ہے۔ تو یہ روپے لے لے اور اس مشکل سے رہائی دلا دے۔ تو قاضی کے سامنے جا کر صرف اتنا کہدے کہ یہ میری بیوی ہوں اور تو مجھے طلاق دینا چاہتا ہے۔ میں چونکہ تنگدستی اور فاقہ مستی کے ہاتھوں تنگ آیا ہوا تھا اس لئے راضی برضا ہوگیا اور قاضی کے سامنے جا کر اس کے بتائے ہوئے الفاظ کہدیئے۔ جیسے ہی میں نے یہ فقرہ پورا کیا۔ اس نے فوراً ایک تھیلی بغل سے نکالی جس میں ایک شیرخوار بچہ تھا۔ قاضی کے سامنے اس بچہ کو پیش کرتے ہوئے کہا "میں اس بچہ کو دودھ نہیں پلا سکتی اور نہ اتنی مقدرت رکھتی ہوں کہ کسی اور عورت سے معاوضہ پر پلوا سکوں۔ لہٰذا یہ بچہ اس کے باپ کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ اس کی پرورش کرے" یہ الفاظ میں نے اس کے منہ سے سنے تو میرے ہوش اڑ گئے۔ اور دل میں کہا۔ خدایا! یہ کیا ماجرا ہے میں اپنے پیٹ تک کو تو روٹی دے نہیں سکتا۔ اس بچہ کی پرورش کیسے کروں گا۔ اس ناگہانی واقعہ سے کچھ ایسی حیرت مجھ پر طاری ہوئی۔ کہ "لب بہ بند و چشم و گوش بند" کا مصداق ہو کر رہ گیا ایک لفظ بھی زبان سے ادا نہ ہوسکا۔ لیکن اب پچھتانا بعد از وقت تھا کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آیا کرتا ہے۔ اس لئے مجبوراً اس بچہ کو لے کر ایک مسجد کے دروازہ پر آیا۔ موقعہ کی تلاش میں تھا کہ موقعہ ملے تو اس بچہ کو یہیں چھوڑ جاؤں لیکن آنے جانے والوں کی اس قدر کثرت تھی کہ میں اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ بالآخر بہت دیر کے بعد بھیڑ چھٹ گئی اور کوئی آدمی نہ رہا۔ میں بچہ کو مسجد کے دروازے پر ڈال جوتے ہاتھ میں دبا پاؤں سر پر رکھ کر بھاگا۔ لیکن شومئ قسمت نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ چند آدمیوں نے مجھے بھاگتا دیکھ کر پیچھے بھاگنا شروع کیا۔ میں بھی بھاگ رہا تھا لیکن خوف کی وجہ سے زیادہ نہ بھاگ سکا اور ان لوگوں نے مجھے پکڑ کر بھاگنے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے پورا واقعہ کہہ سنایا جب انہوں نے سنا کہ میں بچے کو چھوڑ کر بھاگ رہا ہوں تو انھوں نے مجھے مار پیٹا اور پھر اس بچہ کو زندہ سانپ کی طرح میرے گلے منڈھ دیا۔ میں اس بچہ کو لئے چاروں طرف حیران پریشان پھر رہا تھا لیکن عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ اس لئے مجبور ہو کر شہر کے قبرستان میں بچہ کو ڈال کر بھاگا۔ لیکن پہلے کی طرح پھر گرفتاری کا خوف تھا۔ اس لئے اپنی انتہائی قوت بھاگنے میں صرف کی حتیٰ کہ تھکان اور پیاس نے مجھ پر غلبہ کیا۔ ایک دریا کے کنارے پہونچ کر شکم سیر ہو کر پانی پیا وہیں ایک درخت کے سایہ میں لیٹ گیا۔ ابھی لیٹے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار ہو کر آیا اور مجھے لوٹا دے کر کہا اس میں پانی بھر لا۔ میں دریا سے لوٹا بھر کر واپس ہونے کو تھا کہ میرے ہاتھ کپکپانے لگے اور لوٹا چھوٹ کر دریا میں ڈوب گیا۔ جب اس شخص نے یہ دیکھا تو بہت سی گالیاں دیں اور تین چار چابک رسید کئے۔ بمشکل تمام وہاں سے جان بچا کر بھاگا ہی تھا کہ ایک جگہ پاؤں پھسلا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب ہوش میں آیا تو اپنے آپ کو ایک وسیع کمرے میں بستر پر لیٹے ہوئے پایا۔ ہر چند ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن کسی آدمی کا پتہ نہ معلوم ہوا۔ چونکہ دو وقت کا فاقہ تھا۔ اس لئے بستر سے اٹھ کر کھانے پینے کی چیز تلاش کرنے لگا۔ تمام مکان دیکھنے کے بعد باورچی خانہ ملا۔ جہاں انڈے اور مکھن رکھا ہوا تھا۔ میں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ تین انڈے رومال میں باندھ کر سر پر رکھ لئے اور کچھ مکھن جیب میں ڈال لیا۔ چونکہ داخل ہوتے وقت کھانے کی تلاش میں محو تھا۔ اس لئے دروازے کا خیال نہ رہا اور غلطی سے دوسرے دروازے میں چلا گیا۔ اب ایک ایسے کمرے میں آیا جہاں ایک بڑھیا چولھے کے آگے بیٹھی ہوئی کچھ پکا رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟

کیا یا سنا ہے؟ میں نے جواب دیا "مسافر ہوں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں" اس نے رحم کھا کر چولہے کے آگے مونڈھا ڈال دیا۔ میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں آگ کی گرمی سے مکھن پگھل پگھل کر منہ سے بہنا شروع ہوا۔ جب بڑھیا کی اس پر نظر پڑی تو ابرو پر بل ڈال کر کہا۔ "بخت ماراہے۔ اتنا بھی نہیں سوجھتا کہ مونڈھا خراب ہو رہا ہے" یہ کہکر ایک چپت سر پر رسید کی جو انڈوں پر پڑی۔ انڈے ٹوٹ گئے اور ان کی زردی اور سفیدی نے میرا تمام منہ اور اس کا مونڈھا خراب کر دیا۔ کچھ ایسی گھبراہٹ میں مبتلا ہوا کہ عقل اور سمجھ بے نور ہو گئی۔ انجام کار وہاں سے بھی بھاگتے ہی بن پڑی۔ دریا کے کنارے پہنچا۔ تمام کپڑے دھو کر خشک ہونے کے لئے ایک درخت پر لٹکا دیئے۔ اتفاق سے رومال سرخ رنگ کا تھا ایک چیل آئی اور گوشت کا ٹکڑا سمجھ کر جھپٹی اور رومال لئے یہ جا وہ جا۔ نظروں سے غائب ہو گئی۔ میں اس ڈر سے کہ کہیں دوسرے کپڑوں کا بھی یہی انجام نہ ہو جلدی جلدی بھیگے کچھ سوکھے کپڑے پہنے اور وہاں سے چل دیا۔ راستہ ادھر ادھر دیکھتا بھالتا ایک شہر میں پہنچا۔ جان پہچان کسی سے تھی نہیں ویسے ہی ایک مکان میں گھس گیا اور مالک مکان کو اپنی درد بھری کہانی کہہ سنائی۔ اس نے رحم کرتے ہوئے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔

ایک روز مالک مکان باز اور شکاری کتا لیکر شکار کھیلنے گیا۔ اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ شکار سے واپسی کے وقت ہم ایک گھر میں پہنچے جہاں میرے آقا کی پہلی شناسائی تھی۔ ان کے بہت زیادہ اصرار کرنے پر آقا تو وہیں ٹھہر گئے اور مجھے باز اور کتا دے کر گھر بھیج دیا۔ باز مجھ سے مانوس نہیں تھا۔ اس لئے اس نے پھڑپھڑا کر اڑنا چاہا۔ اور اپنے بازو اس زور سے میرے منہ پر مارے کہ مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے اسے چکر دے کر شکار کے تھیلے میں بند کر دیا۔ جب تھوڑی دور آگے چلا تو چند کتوں نے میرے کتے کو گھیر لیا اور اس پر حملہ کرنا چاہا۔ ڈر کی وجہ سے مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ اس کا پٹکا یا زنجیر ہی کھول دیتا۔ آخر ان وحشی کتوں نے اس غریب کی تکا بوٹی کر دی۔ خدا خدا کر کے میں گھر پہنچا گھوڑے سے اتر کر چاہا کہ تھیلے میں سے باز کو نکالوں دیکھا تو وہ قفس عنصری کو چھوڑ کر عالم بالا میں اپنا آشیانہ بنا چکا تھا۔ میں نے باز پرس اور پوچھ گچھ کے خوف سے رونا چلانا شروع کر دیا۔ مکان کی مالکہ جو ایک نیک عورت تھی میری اس گریہ وزاری کو دیکھکر تسلی آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ "تو مطمئن رہ میں تیرے آقا سے کہکر خطا معاف کرادونگی"

پھر تھوڑی دیر بعد بولی کہ میں کھانا پکانے میں مشغول ہوتی ہوں تو بچے کے پاس جا بیٹھ۔ میں بچہ کے پاس جا بیٹھا۔ ابھی بیٹھے ہوئے کچھ دیر نہ گزری تھی۔ کہ اس نے رونا شروع کیا۔ میں نے جتنا اسے بہلایا اس پر الٹا ہی اثر ہوا۔ میں نے ایک بوڑھی عورت سے سنا تھا۔ کہ جو بچہ زیادہ روتا ہو اگر اسے افیون دے دی جائے تو وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس نسخہ پر عمل کرتے ہوئے جو گولی افیون کی میں کھایا کرتا تھا اسے دے دی۔ وہ گولی کھا کر سو گیا۔ کچھ مدت کے بعد جب اس کی ماں نے کھانے پکانے سے فراغت حاصل کر کے بچے کے پاس آکر دودھ پلانا چاہا تو ایسی نیند سوتے ہوئے پایا جس سے بیدار ہونا ناممکن ہے۔ اس نے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑی۔ اسی عرصہ میں مالک مکان بھی آگیا۔ جب وہ اس حرکت سے واقف ہوا تو اس کی آتش غضب بھڑک اٹھی اور قریب تھا کہ میرے خرمن ہستی کو جلا کر خاکستر کر دے۔ مگر مالکہ مکان آڑے آگئی اور اس نے سفارش کر کے میری جان بچائی اور آہستہ آہستہ اپنے شوہر کے غصہ کو ٹھنڈا کیا۔ جب بہت دیر کے بعد اس کا غصہ اترا تو مجھ سے کہا کہ خیر اس مرتبہ تو میں نے تجھے چھوڑ دیا ہے لیکن خدا کے لئے آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا اور اصطبل میں جا۔ میرا بیل بہت بیمار ہے اگر اس کی زیادہ خراب حالت دیکھے تو فوراً کلمہ پڑھ کر ذبح کر دینا تاکہ گوشت کام آسکے اور وہیں گھوڑا بھی بندھا ہوا ہے۔ ذرا اس کی بھی دیکھ بھال رکھنا۔ آقا کا یہ حکم سن کر میں اصطبل میں چلا گیا اور تھوڑی دیر تک جاگتا رہا۔ لیکن کچھ دیر بعد باوجود کوشش کرنے کے مجھے نیند آگئی۔ جب آنکھ کھلی تو فوراً بیل کو تلاش کرنا شروع کیا۔ کہ کہیں مر تو نہیں گیا۔ اندھیرے میں ایک جانور کو لیٹے ہوئے دیکھا خیال کیا کہ یہی بیل ہے اور اس کا دم ٹوٹ رہا ہے فوراً کلمہ پڑھ کر چھری اس کی گردن پر پھیر دی۔ جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ بیل تو اپنی موت مرا پڑا ہے اور اندھیرے میں میں نے بجائے بیل کے گھوڑے کو ذبح کر دیا ہے۔ اب تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ بس اب جان کی خیر نہیں۔ یہاں سے بھی بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا فوراً ٹوک دم دبا کر بھاگا اور ابھی تک مارا مارا پھر رہا ہوں ؟

رفتار زمانہ

جنوری میں انتہائی سردی کے باوجود جنگ و پیکار کا آتش کدہ سرد نہ ہو سکا۔ ایک طرف مشرق بعید میں جاپان مجبور و بیکس جزائر سے آگ اور خون کا کھیل کھیل رہا ہے تو دوسری طرف روس اور افریقہ میں اتحادی و محوری حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مہینہ اتحادیوں کے لئے خوشگوار اور خوش آئند ثابت ہوا کیونکہ ایک طرف انگریزی فوجیں سائرنیکا کو اطالوی و جرمن اثرات سے پاک کرنے میں کامیاب رہیں تو دوسری طرف روسی فوجوں نے نازی حملہ آوروں کو متعدد مقامات پر شکست فاش دی۔ اس کے علاوہ امریکہ بھی اپنے تمام تر جنگی وسائل کے ساتھ میدان عمل میں آچکا ہے اس لئے عجب نہیں کہ موسم بہار میں جنگ ایک ایسے مرحلے پر آجائے جسے بہت حد تک "فیصلہ کن" قرار دیا جاسکتا ہے۔

گزشتہ شیوع میں جاپان کے مقاصد جنگ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا جاچکا ہے کہ وہ مشرق بعید میں ایک نئے نظام کے قیام کے منصوبے باندھ رہا ہے جس کی باگ ڈور وہ اپنے ہاتھ میں رکھ کر مشرق بعید کی سیاست و تجارت پر قابض ہونا چاہتا ہے چنانچہ ۲۰ جنوری کو مسٹر ٹوجو وزیراعظم جاپان نے ایک تقریر میں کہا، "جاپان چاہتا ہے کہ مشرقی ایشیا کے تمام حربی مراکز اور ذرائع آمد و رفت پر نگرانی قائم کرکے ایک ایسی مشترکہ خوشحالی کی بنیاد ڈالے جو تمام دنیا کے لئے موجب امن و امان اور باعث مسرت و بہبودی ہو" دوسرے الفاظ میں ہٹلر کی طرح جاپان بھی ایک ایسی سلطنت قائم کرنا چاہتا ہے جس کا نظم و نسق ٹوکیو کے سپرد ہو تاکہ وہ اپنی ہوس اقتدار کو تسکین دے کر سورج دیوتا کے پوتے کی شہنشاہی کو مستحکم بنیادوں پر کھڑا کرسکے۔ لیکن کیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکے گا؟ اس میں شک نہیں کہ گزشتہ دو ماہ کے عرصہ میں اس نے مسٹر چرچل کے الفاظ میں امریکی بحری بیڑے کو عارضی طور پر مفلوج کرکے اور "پرنس آف ویلز" اور "ریپلس" کو اپنے ہوائی حملوں کا نشانہ بنا کر ہانگ کانگ، ملایا اور فلپائن وغیرہ میں قدم جمالئے ہیں اور ملایا سے نیوگنی تک تمام جزیرے اس کی برق پا یلغار

عالمگیر واقعات پر ماہانہ تبصرہ

از: شبلی بی کام

کی زد میں ہیں لیکن وہ ان فوجی تیاریوں اور بحری استحکامات کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کرسکتا جن میں برطانیہ و امریکہ پوری توجہ سے مصروف ہوچکے ہیں۔ چنانچہ مسٹر ٹوجو بھی امریکہ و برطانیہ کی حربی قوتوں سے بے خبر نہیں ہیں انھوں نے متذکرۃ الصدر تقریر میں یہ بھی کہا کہ برطانیہ و امریکہ کی فوجی تیاریوں کو حقیر سمجھنا بدترین حماقت ہوگی۔ اس کے علاوہ مسٹر چرچل نے اپنی ۲۷ جنوری ۱۹۴۲ء والی تقریر میں یقین دلایا ہے کہ مشرق بعید میں امریکہ و برطانیہ کی بحری و فضائی طاقت بہت جلد جاپان کے مساوی ہوجائے گی اور اس کے بعد بحر کاہل کے حالات ایک نئی کروٹ بدلیں گے جس سے جاپان کے خوابوں کا شیرازہ یقیناً بکھر جائے گا۔ ان سب باتوں کے باوجود ہم ان خطرات و خدشات سے غافل نہیں رہ سکتے جو جاپانی یلغار کے نتیجہ میں پیدا ہورہے ہیں۔ جاپان نے اپنی پیش قدمی ۸ دسمبر کو شروع کی۔ اس عرصہ میں وہ متعدد جزیروں اور ان کے فضائی و بحری اڈوں پر قابض ہوچکا ہے۔ اب اس کے طیارے اگر ایک طرف نیوگنی پر پر تول رہے ہیں تو دوسری طرف اس کے حملے کا رخ سنگاپور اور برما کی طرف نظر آتا ہے۔

تھائی لینڈ (سیام) نے برطانیہ و امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کرکے مشرق بعید کی سیاسیات کو اور بھی پیچیدہ بنادیا ہے، کیونکہ جاپانی فوجیں تھائی لینڈ کی سرحد سے گزر کر برما میں داخل ہورہی ہیں اور ملایا و سنگاپور کا مستقبل تشویش و اضطراب سے خالی نظر نہیں آتا۔ دوسری طرف مسٹر کرٹن (وزیراعظم آسٹریلیا) نے اپنے ملک کے باشندوں کو ان مصائب و تکالیف سے آگاہ کیا ہے جو جاپان کی پیش قدمی کے نتیجہ میں پیدا ہوسکتے ہیں چنانچہ آسٹریلیا کے دفاع و تحفظ کے انتظامات مکمل کئے جارہے ہیں اور مسٹر چرچل نے آسٹریلیا کی ہر ممکن امداد کا وعدہ کیا ہے۔ الغرض جاپان کا رقص جنگ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ رہا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں اتحادی ممالک بھی صبر و سکون کے ساتھ ان تجاویز کو جامۂ عمل پہنا رہے ہیں جو آہستہ آہستہ لیکن یقینی اور مؤثر انداز میں

جاپان کے منصوبوں کو خاک میں ملا کر رہیں گی اور اس کے بعد حکومت ٹوکیو کے تنزل و زوال کا زمانہ شروع ہو جائے گا۔

محاربۂ روس و جرمنی کے ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے کیونکہ اس ماہ نازی فوجوں کو متعدد مقامات پر شکست و ہزیمت کا سامنا ہوا اور روسیوں نے اپنی شجاعت و ہمت مندی سے ثابت کر دیا کہ وہ اپنی آزادی و حریت کو کسی قیمت پر بھی سلب نہ ہونے دیں گے۔ اس کے باوجود یہ کہنا مشکل ہے کہ روسیوں نے ہٹلر کو اپنے عزائم کے خاکے میں رنگ عمل بھرنے کے ناقابل بنا دیا ہے کیونکہ روس کے اہم حربی مراکز ابھی تک جرمنی کے قبضہ میں ہیں اور جنوب مشرقی روس کا وہ رستہ بھی بدستور نازیوں کے زیر اثر ہے جس کے ذریعہ سے وہ قفقاز، باکو اور شرق وسطیٰ کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ روسیوں کی جرأت و ہمت نے نازیوں کو اپنا پروگرام بدلنے پر مجبور کر دیا ہے اور اگر فروری میں ان کو اتحادیوں کی طرف سے مزید کمک مل گئی تو روس کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن جب تک بحیرۂ کیسپین سے دریائے نیل تک نازی فوجوں کا آگا نہ روکا جائے گا۔ روس و جرمنی کی جنگ کسی فیصلہ کن مرحلہ پر نہیں پہنچ سکتی۔ یہی وجہ ہے شرق وسطیٰ میں برطانیہ زبردست جنگی تیاریاں کر چکا ہے اس لئے اگر آئندہ موسم بہار میں نازی سیلاب کا رخ عراق و عرب، شام یا مصر و فلسطین کی طرف ہوا تو اس کے لئے اتحادیوں کی دیوار دفاع کو پھاندنا آسان نہیں ہوگا۔

شمال مغربی افریقہ میں برطانوی فوجیں فیلڈ مارشل رومیل کے نازی ساتھیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا چکی ہیں۔ سائرینیکا پر "سواستکا" کی بجائے "یونین جیک" لہرا رہا ہے اور رومیل کی فوج کا تقریباً دو تہائی حصہ ناکارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن جنوری کے آخری ہفتہ میں اسے جرمنی و اطالیہ کی طرف سے مزید کمک حاصل ہو گئی اس لئے مغربی افریقہ کی لڑائی ابھی جاری ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟

بحیثیت مجموعی جنگ افریقہ اتحادیوں کے حق میں مفید ثابت ہو رہی ہے کیونکہ ایک طرف تو وہ قفقاز کی طرف سے وادیٔ نیل پر نازیوں کے حملے کو ناممکن بنا چکے ہیں دوسری طرف اٹلی کی افریقی فوج کا دو تہائی حصہ تباہ ہو چکا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اب کم سے کم اٹلی کو یہ جرأت نہ ہو سکے گی کہ وہ ریگزار افریقہ کا رخ کرے تیسری طرف جنگ لیبیا کے باعث جرمنی کی توجہ روس اور افریقہ کے درمیان تقسیم ہو کر رہ گئی اور اس طرح روس کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ حال ہی میں ہاؤس آف کامنز میں سوال اٹھایا گیا تھا کہ کیا وجہ ہے برطانیہ نے روس کی تو خاطر خواہ امداد نہ کی لیکن افریقہ میں جنرل رومیل کی فوجوں کے مقابلہ کے لئے

تک پیچیدہ ہو گئی ؟ اس کا جواب مسٹر چرچل نے یہ دیا کہ اس میں شک نہیں لیبیا کی لڑائی جنگ روس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہ رکھتی تھی لیکن اس کے باعث جرمنی کو اپنی ہوائی قوت کا ایک اہم حصہ روس کے محاذ سے ہٹا کر بحر وسطی کے خطہ جنگ میں لانا پڑا اور اس طرح وہ مقصد خود بخود حاصل ہو گیا جو روس کی براہ راست امداد سے حاصل ہو سکتا تھا۔ جنوری کے آخری ہفتہ میں ایک اطلاع موصول ہوئی کہ شمال مغربی افریقہ میں مارشل رومیل نے جوابی کارروائی شروع کر دی ہے اور بن غازی پر جرمنوں کا دوبارہ تسلط ہو چکا ہے۔ اس خبر سے جہاں یہ ظاہر ہے کہ موسم بہار میں جنگ کا سیلاب افریقہ کا رخ کرے گا۔ وہاں اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نازی اپنی توجہ روس سے ہٹا کر افریقہ کی جانب مبذول کر رہے ہیں اس لئے روسیوں کو اپنی آزادی و حریت کے بقا کے لئے جدوجہد کرنے کا پہلے سے بھی زیادہ موقع مل جائے گا۔ اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کسی فیصلہ کن مرحلہ کی طرف آ رہی ہے کیونکہ گزشتہ تجربہ سے ظاہر ہے کہ میدانی لڑائی میں جرمنی و اطالیہ برطانی فوجوں کے حریف نہیں ہو سکتے اس لئے اگر انھوں نے شمال مغربی افریقہ میں ایک مرتبہ پھر برطانیہ سے ٹکر لینے کی جرأت کی تو ان کی رہی سہی قوت کا شیرازہ بھی بکھر جائے گا اور اتحادیوں کو اپنے مقصد کی منزل نزدیک نظر آنے لگے گی۔

ہندوستانی سیاسیات کی رفتار بدستور ہے۔ مسٹر چرچل نے وعدہ کیا ہے کہ وہ عنقریب مسئلہ ہند پر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے لیکن وزارت برطانیہ کے تیور سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ دوران جنگ میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جا سکے گا جو مسلم لیگ، کانگرس اور ہندو مہاسبھا کے لئے بیک وقت اطمینان بخش ثابت ہو سکے۔ یا ہندوستانی سیاست کسی ایسے مرحلے پر پہنچ جائے جہاں سے آزادی کی منزل قریب نظر آنے لگے۔ البتہ ہندوستان کے اعتدال پسند طبقے نے بعض ایسی تجاویز حکومت برطانیہ کو بھیجی ہیں جن پر عمل کرنے سے ہندوستان اتحادیوں کے مقاصد جنگ میں زیادہ سرگرمی کا اظہار کر سکتا ہے اس لئے غالباً مسٹر چرچل انہی تجاویز پر رائے زنی کریں گے غرض جیسا کہ سر پرسی ہیرس (لبرل) نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا صرف ایک شخص ہے جو جنگ کے متعلق ہندوستانیوں کے رویہ کو بدل سکتا ہے اور وہ ہے مسٹر چرچل۔" اس لئے اب دیکھنا یہ ہے کہ وزیر اعظم برطانیہ ہندوستان کی قسمت کا کیا فیصلہ کرتے ہیں؟

کانگرس ابھی تک اپنے نصب العین کا تعین نہیں کر سکی۔ جب مسٹر گاندھی نے ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز کیا تو کانگرسیوں کی تقریروں سے معلوم ہوتا تھا کہ جب تک ہندوستان کو حریت و آزادی کی دولت سے مالا مال نہ کیا جائے وہ موجودہ جنگ میں اتحادیوں کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہونگے لیکن اس کے ساتھ ہی مسٹر راجگوپال آچاریہ اور مسٹر ستیہ مورتی کی سرگرمیاں بتا رہی تھیں کہ اگر نظام حکومت میں اصلاحی تغیر و تبدیل کر دیا جائے تو کانگرس دوبارہ عہدے سنبھالنے کے قابل ہو جائے گی اس کے علاوہ کانگرس کی سول نافرمانی میں بھی وہ جوش و خروش نہ رہا جس کا اظہار ابتدا میں کیا گیا تھا اس لئے حکومت کو غالباً یقین ہو گیا کہ کانگرس تعاون و مصالحت کی راہ پر آ رہی ہے۔ چنانچہ ستیہ گرہیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد بارڈولی میں کانگرس کا ایک اجلاس ہوا جس میں آٹھ قراردادیں منظور کی گئیں اور ہندوستان کا نصب العین "آزادی کامل" قرار دیا گیا لیکن اس قرارداد کو عملی صورت دینے کے لئے کانگرس کونسا قدم اٹھائیگی؟ اس کا جواب ابھی تک کانگرسی حلقوں کی طرف سے پیش نہیں کیا گیا۔ اُدھر گاندھی جی نہ صرف کانگرس کی قیادت سے دست بردار ہو گئے بلکہ سول نافرمانی کو بھی جنگ کے خاتمہ تک ملتوی قرار دے دیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے "ہریجن" میں قلمی قانون شکنی کا آغاز کر دیا ہے۔ اس لئے اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ گاندھی جی کا نصب العین کیا ہے؟ کیونکہ اگر عملی ستیہ گرہ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کاغذی پروپیگنڈا کیا کر سکے گا؟ باقی رہی کانگرس تو اس نے تمام مسائل کو تشدد و عدم تشدد کی بحث میں الجھا دیا ہے اس لئے بارڈولی اور واردھا کے ہنگامہ خیز اجلاسوں کے باوجود یہ ظاہر نہیں ہو سکا کہ کانگرس آزادی ہند کے لئے کون سا پروگرام مرتب کر رہی ہے؟ ان حالات میں اگر یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ گاندھی جی کی بے اصولی نے کانگرس کو بھی غیر معین طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے تو غالباً یہ غیر صحیح نہیں ہوگا۔

علامہ عنایت اللہ مشرقی مدراس جیل میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے۔ ان کی رہائی کے لئے عوام کی طرف سے مسلسل آواز اٹھائی گئی لیکن حکومت ہند متوجہ نہ ہو سکی۔ آخر علامہ مشرقی نے روزہ داری کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی جنگ کے خاتمہ تک خاکسار تحریک کے حربی پہلو کو منسوخ قرار دے کر حکومت ہند کی طرف دستِ تعاون بڑھایا۔ چنانچہ

۱۸ر جنوری کو انہیں رہا کر دیا گیا لیکن ابھی تک ان کو صوبہ مدراس سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس پابندی سے ظاہر ہے کہ تاحال حکومت کو علامہ صاحب کی امن پسندی کا یقین نہیں ہو سکا لیکن جب خاکسار پہلے ہی پر امن رہنے کا اقرار کر چکے ہیں اور علامہ صاحب نے بھی اختتامِ جنگ تک خاکساروں کی فوجی تنظیم سے ہاتھ اٹھا لیا ہے تو یہ پابندی غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ علامہ صاحب کو قانونی قیود سے آزاد کر کے اس پیشکش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے جو انہوں نے مقاصدِ جنگ کی تکمیل کے لئے خاکسار جماعت کی طرف سے کر رکھی ہے۔

پنجاب میں بقالوں، بنیوں اور مہاجنوں نے سیلز ٹیکس ایکٹ کے خلاف ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اور اپنے احتجاج کو موثر بنانے کے لئے کاروبار بھی بند کر دیا ہے چنانچہ اکثر دکانیں مقفل نظر آتی ہیں، لیکن اس ہڑتال سے حکومت کی بہ نسبت عوام کو زیادہ مشکلات و مصائب کا سامنا ہو رہا ہے آٹے، نمک، لکڑی وغیرہ کی گرانی نے عوام کا پہلے ہی ناطقہ بند کر رکھا ہے اب دوسری ضروریاتِ زندگی کے حصول میں بھی دقت محسوس ہو رہی ہے۔ حکومت نے یہ ٹیکس ان تاجروں پر عاید کیا ہے جن کی بکری پانچ ہزار روپے سالانہ سے تجاوز کرتی ہے اور محاسبہ کے لئے دکانداروں کو اپنا حساب کتاب باقاعدہ رکھنے کی تلقین کی ہے لیکن تعجب ہے کہ پانچ دس روپے سیکڑہ کے لئے سرمایہ دار دکانداروں نے اس درجہ تہدید آمیز رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ بہرحال ان کی مخاصمت حکومت سے ہے اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ عوام کو مفت میں مبتلائے مصیبت کرنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ پھر تعجب اس بات کا ہے کہ جب بکری ٹیکس کا مسئلہ حکومت پنجاب اور اسمبلی کے سامنے در پیش تھا تو اس وقت یہ بیوپاری کہاں تھے؟ اگر پنجاب اسمبلی کی اکثریت ان کے دلائل پر مطمئن نہ ہو سکی تو اس میں عوام کا کیا قصور ہے؟ اس کے باوجود ہماری دلی خواہش ہے کہ بکری ٹیکس کے بارے میں حکومت اور کاروباری حلقہ کے درمیان کوئی باعزت سمجھوتہ ہو جائے تاکہ عوام کی فاقہ کشی کے باعث حالات تشویشناک صورت اختیار نہ کر جائیں۔

لاہور ـــــــــــ ۳۰ر جنوری ۱۹۴۲ء

قطعات

ارمانِ شباب کا لہو ہے دل میں
داغِ غمِ آرزو کی تعبیر ہے دل میں
دنیا کی تو سیر کر چکے اے اختر
اب تنگ لحد کی آرزو ہے دل میں

اختر ـــــــ [illegible]

اُردو دنیا میں عالمِ پیری ہے
اب دورِ رضا میں پیری ہے
روتے جوانی میں دل کو مردہ ہو
اب فن کو بنا لیا اسیرِ پیری ہے

جلد ۳۳ فہرست مندرجات مارچ سنہ ۱۹۴۲ء نمبر ۳

علمی و ادبی مضامین

افسانے اور ڈرامے

منظومات

"تاریخ نمبر" کے مندرجات کی ایک جھلک صفحہ ۷ تا ۲۰ ملاحظہ کیجیے

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

تاریخ نمبر اور زیر نظر اشاعت

از:- ادارہ

ملاحظات

رسالہ عالمگیر کا تاریخ نمبر زیر طباعت ہے۔ اس شمارہ زیر اشاعت خصوصی میں شائع ہونے والے مضامین نظم و نثر کی ایک فہرست اسی شمارہ کے صفحہ ۷ تا ۲۰ پر درج ہے جس پر ایک سرسری اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنے سے بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ رسالہ عالمگیر کا تاریخ نمبر "تاریخ و ارتقائے اُردو" میں ایک سنگ راہ کا درجہ رکھے گا۔ تاریخ نمبر کو متنوع اور سیر حاصل بنانے کے لئے اسے چھ حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے یعنی حقائق و معارف، افسانے اور ڈرامے مقالات، سیر و سوانح، عظمت رفتہ اور منظومات۔ "حقائق و معارف" میں تاریخ کے عبرت نما اور حقیقت آموز پہلو پر گفتگو کی جائے گی "مقالات" میں تحقیقی و علمی مضامین پیش کئے جائیں گے۔ "سیر و سوانح" میں دنیا کی اُن ممتاز ترین شخصیتوں کے حالات پر روشنی ڈالی جائے گی جنہوں نے تاریخ گری میں ناقابل فراموش حصہ لیا۔ "عظمت رفتہ" کا جزو اُن آثار قدیمہ کی تفصیلات کے لئے وقف کر دیا گیا ہے جو کسی زمانہ میں تہذیب و ثقافت کا لاثانی مرکز تھے۔ تاریخ کے علمی پہلو کی نقاب کشائی کے علاوہ "تاریخ نمبر" میں کہانیاں، رومان، قصے اور نظمیں بھی درج کی جائیں گی اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ان میں ہر کہانی اور ہر نظم تاریخی اعتبار سے امتیازی شان کی مالک ہوگی گزشتہ سال تاریخ نمبر اس درجہ مقبول ہوا کہ اس وقت دفتر میں فائل کی کاپی بھی موجود نہیں ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اس سال بھی "تاریخ نمبر" کا کماحقہ خیر مقدم کیا جائے گا۔ "تاریخ نمبر" کی ضخامت موجودہ سائز کے دو سو صفحات ہوگی اس کے باوجود قیمت صرف ایک روپیہ رکھی گئی ہے تاکہ ہر امیر و غریب اس کی لمعہ افشانیوں سے اپنے دل و دماغ کو منور کر سکے۔

زیر نظر اشاعت میں "حقائق و معارف" کے تحت حضرت مولٰنا ظفر علی خاں نے تاریخی معلومات کی امداد سے اسلامی مساوات و رواداری پر روشنی ڈالی ہے آپ کا مضمون یقیناً روحانیت افروز ثابت ہوگا۔ میرزا شوق لکھنوی کی مثنویاں دنیائے اُردو میں نقیدالمثال مقبولیت حاصل کر چکی ہیں لیکن یہ ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ انہوں نے پہلے کون سی مثنوی لکھی اور بعد میں کون سی؛ جناب عطار اللہ پالوی نے اسی ادبی بحث کا محاکمہ کیا ہے۔ میر انیس لکھنوی ہندوستان کے وہ زندہ جاوید شاعر ہیں جنہوں نے اپنے نئے نئے اسالیب سے اُردو شاعری کے دامن کو مالا مال کیا۔ جناب شہنشاہ حسین نکہت نے ان کی نیچرل شاعری کے کمالات پر معلومات افزا روشنی ڈالی ہے۔ مضمون کا وہ حصہ علی الخصوص لائق داد ہے جس میں انیس کے کلام کا مغربی شعرا کے کلام سے موازنہ کیا گیا ہے جناب پیر غلام دستگیر نامی نے ولیم مورکرافٹ کا ایک سفرنامہ پیش کر کے بتایا ہے کہ زندہ قوموں کے افراد کی سیاحت محض سیر و تفریح کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ وہ غیر ملکوں سے رابطہ و اتحاد پیدا کر کے اپنی قوم کی ترقی و فلاح کے لئے بھی رستہ صاف کرتے ہیں۔ جناب حافظ سید رشید احمد ارشد نے تمدن کے صحیح مفہوم کو مختصر الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ افسانوں میں سے "پس پردہ"، "شاہی حرم سرا میں"، "زہرا"، "شہنشاہ عراق"، "سوتیلا بھائی" اور "گلاب کا پودا" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "پس پردہ" ایک دلچسپ رومان ہے جس میں ہندوستانی معاشرت کے بعض پہلوؤں کی نقاب کشائی بھی کی گئی ہے۔ "شاہی حرم سرا" اور "زہرا" تاریخی افسانے ہیں۔ "سوتیلا بھائی" سرزمین سکاٹ لینڈ کا ایک نفسیاتی افسانہ ہے جس میں بصورت نیچے سے ماں کی والہانہ محبت اور ایک بھائی کی اپنے غریب و یتیم بھائی کے لئے "قربانی" کا منظر کھینچا گیا ہے۔ افسانہ قدرے طویل ہے لیکن اس کا کوئی واقعہ کوئی کردار اور کوئی جزو غیر ضروری نہیں ہے۔ یہ افسانہ نہایت آہستگی سے اپنے اختتام کی طرف مائل ہوتا ہے۔ "گلاب کا پودا" ایک تمثیلی افسانہ ہے جس کا ترجمہ جناب سید علی رضا نے براہ راست فارسی سے کیا ہے۔

حصہ نظم میں علامہ شفق رضوی، مولٰنا اثر امرتسری پروفیسر کرپال سنگھ۔ حضرت سروش عسکری۔ جناب اختر بریکی اور جناب واحد قریشی کی دلآویز غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔

——— (ادارہ) ———

"تاریخ نمبر" تاریخی مقالات، تاریخی افسانوں اور تاریخی نظموں کا گرانقدر مرقع ہے

اخبار و افکار

اردو یا ہندوستانی؟

از :— ادارہ

زبان کے بارے میں گاندھی جی کا طرزِ عمل ہمیشہ ناقابلِ فہم رہا ہے۔ اس مسئلہ پر ان کی جس قدر تصریحات شائع ہوئی ہیں وہ بھی معنی و مطلب کی پیچیدگی کے باعث ابہام کے نئے نئے اسالیب ہی پیش کرتی رہیں۔ پیچیدگیٔ رائے کی سب سے بڑی وجہ گاندھی جی کی ہمہ گیر سیاسی شخصیت ہے۔ وہ ہندی کو ہندوستانی کے دلفریب نام سے قومی زبان بنانے کے تمنائی تو ہیں لیکن سیاسی مجبوریوں کے باعث حامیانِ اُردو کو بھی ناراض کرنا نہیں چاہتے اس لئے مسئلہ زبان کا میدان ان کی فکر و رائے کے لئے لغزشوں کا سامان مہیا کرتا رہا ہے بظاہر تو میر کے اس شعر کی عملی تصویر بننا چاہتے ہیں کہ ؎

دل کو روؤں میں یا جگر کو میر

میری دونوں سے آشنائی ہے

لیکن جب ان کا قلم اُردو کی طرف جانا چاہتا ہے۔ تو ہندی کی محبت آگے بڑھ کر اس کا رخ روک لیتی ہے چنانچہ "ہریجن" میں "ہندوستانی" کے عنوان سے گاندھی جی کا جو مضمون شائع ہوا ہے وہ اگرچہ کسی حد تک تبدیلِ قلب کا آئینہ دار ہے لیکن مفہوم کو کچھ اس درجہ پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کہ صراحت کے بجائے ابہام کا پہلو بہت زیادہ نمایاں ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"لفظ ہندوستانی سے مراد ہے ہندی اور اُردو اور اسی لئے ہندی بھی اپنے کو ہندوستانی کہہ سکتی ہے بشرطیکہ وہ اُردو کو خارج نہ کر دے بلکہ اُردو کو اس حد تک اپنے میں شامل کرنے کی کوشش کرے جس حد تک علمی طور پر ممکن ہو سکے لیکن اس کی فطری ساخت اور موسیقی پر بُرا اثر نہ پڑنے پائے۔ اُردو بھی ایسا کر سکتی ہے ہندوستانی کوئی علیحدہ چیز نہیں جو ان دو دھاروں کو ملانے کی کوشش کر رہی ہو جو ایک دوسرے سے علیحدہ ہو رہی ہوں۔"

اس کے بعد گاندھی جی لکھتے ہیں کہ۔

"میں نے ہندی ساہتیہ سمیلن کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ ہندی کی یہ تعریف کی جائے کہ وہ زبان جو شمالی ہندوستان میں ہندو اور مسلمان بولتے ہیں اور جو دیوناگری اور فارسی دونوں حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ سمیلن کے ارکان اپنی ہندی کی قابلیت اتنی بڑھا لیتے کہ اس تحریک پر عمل پیرا ہو سکتے۔ اور ایسا ادب پیش کر سکتے جو ہندو اور مسلمان دونوں پڑھ سکیں۔ اس کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ سمیلن کے ارکان فارسی کے حروف سیکھتے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ انھوں نے بڑا اچھا موقع کھو دیا۔" (ہماری زبان کی وساطت سے)

گاندھی جی کے خیالات کا تجزیہ کیا جائے تو دو باتیں سمجھ میں آئیں گی۔ اوّل مجوزہ "ہندوستانی" ہندی اور فارسی الفاظ کے اشتراک سے پیدا ہو سکتی ہے۔ دوم رسم الخط دونوں قسم کے رائج ہوں۔ اگر پہلی بات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گاندھی جی محض اُردو کی انفرادی شخصیت سے ہراساں ہیں ورنہ فصیح اُردو جس زبان کا نام ہے وہ پہلے ہی ہندوستانی زبانوں کے الفاظ اور فارسی مرادفات سے مرکب ہے لہٰذا اس کام کے لئے کسی نئی کوشش کی ضرورت نہیں کیونکہ اُردو خود بخود ہندوستانی کی قائم مقام ہے۔ اگر گاندھی جی کو اپنے نظریئے پر اعتماد ہے، وہ اپنی رائے کو صائب سمجھتے ہیں اور انھیں "اردو" لفظ سے عناد بھی نہیں ہے تو نئی کوشش کی جگہ اُردو ہی کو اپنانا شروع کیوں نہیں کر دیتے!

رہا رسم الخط کا سوال، تو یہ مسئلہ زبان کے اصولی پہلو سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ محض صوبوں کے تعلیمی رجحانات کا مرہون منت ہے۔

حقائق و معارف

تاریخی جواہر ریزے

از:- مولانا ظفر علی خاں

شیر شاہ افغان آگرہ میں ہندوستان کی مسند شاہی پر رونق افروز ہے۔ رعایا کے چھوٹے بڑے افراد اپنی حاجتیں لے کر دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور اپنی اپنی قسمت کے لحاظ سے کو ہر مراد جیب و داماں میں بھر کرے جا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک ہنہ و تقال بادشاہ معدلت پناہ کی دہائی دیتا ہوا دربار میں آتا ہے اور اپنی رام کہانی اس طرح کہہ سناتا ہے۔

"جہاں پناہ! میں ایک بنیا ہوں۔ خدا کا اور حضور کا دیا گھر میں سب کچھ تھا لیکن اب کچھ نہیں رہا اس لئے کہ عزت جسے میں دولت سے بھی بڑھکر سمجھتا تھا وہی برباد ہو گئی۔ کل سہ پہر کا واقعہ ہے کہ ولیعہد مملکت شاہزادہ عادل خاں عماری پر سوار اس کوچہ سے گذرے جہاں فدوی کا مکان واقع ہے۔ میری بی بی اس وقت آنگن میں غسل کر رہی تھی اور تقریباً نیم برہنہ تھی۔ ولیعہد بہادر کی نظر جب ہاتھی پر سے میری بی بی پر پڑی تو انھوں نے پان کا یہ بیڑا پھینک کر اس اصول کا خون کر دیا کہ رعایا کی بہو بیٹیاں بادشاہ کی بہو بیٹیاں ہوا کرتی ہیں۔ میری بی بی نے اس شرم و غیرت کے سبب سے کہ ولیعہد کی نظر اس کی عریانی پر پڑی ہے سنکھیا کھا لینی چاہی۔ لیکن میں نے اسے روکا اور اب میں بیڑا لئے داد خواہی کے لئے حضور کے دربار میں حاضر ہوا ہوں۔"

شیر شاہ کل ماجرا بغور سنتا ہے اور جب عادل خاں کو بلا کر پوری تحقیقات کے بعد اسے یقین ہو جاتا ہے کہ بنئے کا بیان درست ہے تو حکم دیتا ہے کہ محل شاہی سے عادل خاں کی بیگم کو دربار میں حاضر کیا جائے تاکہ مستغیث اسی طرح سے پان کا بیڑا اس پر پھینکے۔ یہ فرمان قہر تو امان سن کر امرائے دربار تھرا اٹھتے ہیں اور شیر شاہ سے منت و سماجت عرض کرتے ہیں کہ اس حکم کو جو حریم شہنشاہی کی رسوائی کا باعث ہوگا منسوخ فرما دیا جائے لیکن شیر شاہ ان کی ایک نہیں سنتا اور کہتا ہے کہ — "نزدیک من در عدالت فرزند و رعیت برابر است۔"

آخر جب تمام امرائے دربار بنئے کے قدموں پر گر پڑتے ہیں اور اس سے التجا کرتے ہیں کہ شاہزادے کی عزت پر رحم کرے اور اپنے حق سے دست کش ہو جائے اور جب وہ راضی ہو جاتا ہے اور شیر شاہ سے عرض کرتا ہے کہ مجھے میرا حق پہنچ گیا۔ اور میرے لئے تظلم کی گنجائش باقی نہیں رہی تو شیر شاہ اپنے حکم کو واپس لیتا ہے۔

اس عدیم النظیر رواداری اور نصفت پژوہی کا سبق شیر شاہ نے کس سے سیکھا؟ حضور سرور کائنات سے۔

اسلام کے نکتہ چین آئے دن ہمیں یہ طعنہ دیا کرتے ہیں کہ دنیا میں اسلام کی اشاعت بجبر ہوئی ہے۔ خون کی ندیاں بہائی گئی ہیں کشتوں کے پشتوں لگائے گئے ہیں۔ تلواریں تڑپی ہیں۔ نیزے چمکے ہیں تب کہیں جا کر اقصائے عالم میں توحید کا جھنڈا بلند ہوا ہے جب ان بزرگواروں کو قرآن مجید و فرقان حمید کی نص صریح کا حوالہ دیا جاتا ہے جو ببانگ دہل اس حقیقت کا اعلان کر رہی ہے کہ لا اکراہ فی الدین (مذہب میں جبر و اکراہ نہیں ہے) اور پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ لکم دینکم ولی دین (مسلمانوں کے لئے اسلام کفایت کرتا ہے نا مسلمانوں کو ان کا دین مبارک ہو) تو وہ یہ کہہ دینے کے خوگر ہیں کہ ادھر قول کا میا۔ عمل ہے اپنے پیغمبر کو دیکھو لو کہ ہجرت کے بعد مدینہ میں پہنچکر ان کا طرز عمل کیا رہا اور جسے تم کلمۃ الحق کہتے ہو اس نے اعلائے میں ان کی شمشیر جوہر دار نے کیسے کیسے جوہر دکھائے ہیں لیکن معترضین کو شاید ہماری تاریخ پر نظر انتقاد ڈالنے کا موقع نہیں ملا۔ اپنے ڈرائنگ روم کی پر تکلف آرام کرسی سے تھوڑی دیر کے لئے اٹھیں اور ہمارے ساتھ ایک ہزار تین سو اکسٹھ سال کی الٹی زقند بھر کر ذرا امر کی لق و دق وادی تک پہنچنے کی زحمت گوارا فرمائیں اور قول کو ایک عجیب شان دل آرائی کے ساتھ عمل پر اس طرح منطبق ہوتا ہوا دیکھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ میں خبر ملی ہے کہ

نواح ذاامر میں قبائل بنی ثعلبہ و محارب کا ایک جم غفیر اس غرض سے فراہم ہوا ہے کہ موقع پاکر مسلمانوں پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑے۔ رسول اللہ چار سو مسلمانوں کو ہمراہ لے کر بطریق دفاع ذاامر کی جانب روانہ ہوتے ہیں اور جب وہاں پہنچتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ غنیم ایک پہاڑی کی چوٹی پر موجود ہے لیکن فریق مخالف کی کثرت تعداد سے مرعوب ہو کر نیچے اترنے سے بچا جاتا ہے اتنے میں بادل گھر آتے ہیں اور اتنا مینہ برستا ہے کہ سب کے کپڑوں سے پانی نچڑنے لگتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک اوٹ کی جگہ تلاش کر کے کپڑے سکھانے لگتے ہیں اور ایک درخت کے نیچے استراحت فرماتے ہیں۔ قلعہ کوہ سے دشمن کی نظر آپ پر پڑ جاتی ہے اور یہ دیکھ کر کہ آپ اکیلے ہیں اور آپ کی آنکھ لگ گئی ہے قبیلہ محارب کا سردار دعثور بن الحارث دبے پاؤں پہاڑی سے نیچے اترتا ہے اور تلوار سونت کر رسول اللہؐ کے سرہانے کھڑا ہو جاتا ہے یکایک رسول اللہؐ کی آنکھ کھلتی ہے اور دعثور اسلام کی جان اپنی مٹھی میں دیکھ کر انداہ تفاخر و تبختر کہتا ہے کہ اے محمدؐ اس وقت کون ہے جو تم کو مجھ سے بچا سکے، توحید کا وہ سب سے بڑا فرزند جو خدا اے ذوالجلال کو دعثور کی تلوار سے بھی قریب دیکھ رہا ہے مطلق ہراساں نہیں ہوتا اور ایلی ایلی لما سبقتنی کہنے کے بجائے نہایت دلجمعی سے جواب دیتا ہے کہ میرا خدا مجھے بچانے پر قادر ہے۔ اس اسم اعظم میں اس بلا کی تاثیر ہے کہ دعثور کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑتی ہے۔ وہ رسول جس پر اپنے دین کو بزور شمشیر پھیلانے کا الزام آج تک لگایا جا رہا ہے۔ جھک کر یہ تلوار اٹھا لیتا ہے اور ایک ہی وار میں اپنے دشمن جان ستاں کا کام تمام کر دینے کے بجائے اس سے فقط اتنا پوچھتا ہے کہ اب تو بتا تجھ کو میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے اور جب دعثور یہ جواب دیتا ہے کہ کوئی نہیں تو حضور رحمۃ اللعالمین ارشاد فرماتے ہیں کہ وہی خدا جس نے مجھے بچایا تھا تیری حفاظت پر بھی قادر ہے اور یہ کہہ کر تلوار اسے لوٹا دیتے ہیں دعثور کے جسم پر پہلے اگر لرزہ طاری ہوا تھا تو اب اس کے قلب پر بجلی گر پڑتی ہے لیکن یہ بجلی وہی برق خاطف ہے جو پہلے طور سینا پر کوندی تھی اور اب فاران کی چوٹیوں پر اپنی تجلی دکھا رہی تھی وہ فوراً اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمد رسول اللہ پڑھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی ساری قوم حلقہ بگوش اسلام ہو جاتی ہے۔

اسلام اگر دنیا میں پھیلا ہے۔ غلغلہ حقانیت اگر بلند ہوا ہے توحید کی صدا اگر ربع مسکوں میں پھیلی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اسی اخلاقی طاقت سے ورنہ تلوار چلانے کا فن تو اور بھی جانتے ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں۔

اشاعت اسلام کی تاریخ میں قدم قدم پر اسی اخلاقی طاقت کا نور ہمیں جلوہ ریز نظر آتا ہے۔ اس یہودی کے مشرف باسلام ہونے کی داستان زباں زد خاص و عام ہے جس نے ذوالفقار حیدری کو اپنے گلے پر دیکھ کر اپنی آخری نفرت کا اظہار حضور علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ کے روئے مبارک پر تھوک دینے سے کیا تھا اور جب حضور معترض نے اس ناپاک گستاخی کی پاداش میں اس کی گردن اڑا دینے کی بجائے تلوار میان میں رکھ لی تھی تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی، اور جب اس نے اس عجیب و غریب طرز عمل کی وجہ دریافت کی تھی تو اسے یہ جواب ملا تھا کہ جب تک میں تجھے دشمن اسلام سمجھتا رہا تیرا خون مجھ پر حلال تھا لیکن جب تو میرے منہ پر تھوک کر ذاتیات کا سوال بیچ میں لے آیا تو مجھ پر واجب ہو گیا کہ تجھے چھوڑ دوں اور سچائی کو شائبہ نفسانیت کی آلودگی سے بچا لوں۔ کس طرح ممکن تھا کہ یہودی اس مذہب کو جس کے پیرووں کا اخلاق ایسا اعلیٰ درجہ کا تھا سچا نہ سمجھے اور اس کی غلامی کا حلقہ اپنے کان میں نہ ڈال لے۔

جنگ صفین میں حضور علی مرتضیٰ کی ایک زرہ گم ہو گئی جب آپ مراجعت فرمائے کوفہ ہوئے تو اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس دیکھ کر فرمانے لگے کہ یہ زرہ تمہیں کہاں سے ہاتھ لگی یہ تو میرا مال ہے یہودی کی شوخ چشمی ملاحظہ ہو کہ باوجودیکہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جس شخص کے مال پر اس نے دست تصرف دراز کیا ہے وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ایک عظیم الشان سلطنت کا فرمانروا ہے اور اس بات پر قادر ہے کہ اس سے بجبر اپنا مال وصول کر لے کہ یہ جبر بھی حق پر مبنی ہے لیکن صاف انکار کر گیا اور کہنے لگا کہ چہ خوش! یہ بھی آپ نے ایک ہی کہی کہ زرہ آپ کی ہے۔ اجی حضور یہ تو میرا مال ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس پر میرا قبضہ ہے اور قبضہ دلیل ملکیت ہے

حضرت علیؓ لاجواب ہو گئے اور کہنے لگے کہ اچھا چلو قاضی کے پاس چلیں منصب قضاۃ پر ابو شریح مامور تھے ان کے اجلاس میں جب حضرت علیؓ بحیثیت مدعی اور یہودی بحیثیت مدعی علیہ حاضر ہوئے تو انھوں نے حضرت کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا کہ امیر المومنین کہئے آپ کو کیا کہنا ہے حضرت علی نے فرمایا کہ یہودی کے پاس جو زرہ ہے یہ میری ہے۔ میں نے نہ تو اسے اس شخص کے ہاتھ بیچا ہے اور نہ بطور ہبہ اسے دی ہے۔ میرا مال مجھے دلوایا جائے۔ قاضی شریح نے یہ بات سن کر اور اسے اسلام کے قانون شہادت کی رو سے بیرشانی پاکر بطریق استخفاف "ایش" کہا جس کے معنی اردو محاورے کے مطابق یہ ہونگے کہ آپ کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے یہودی سے پوچھا کہ تمہارا کیا جواب ہے۔ اس نے کہا یہ زرہ میری ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس پر میں قابض ہوں دونوں کے بیانات سننے کے بعد قاضی شریح نے حضرت علی سے کہا کہ یا امیر المومنین آپ کے پاس اپنے دعوی کی دلیل بھی ہے انھوں نے کہا کہ ہاں میرا غلام قنبر اور میرا بیٹا حسنؓ میرے دعوے کی صداقت کے گواہ ہیں۔ ان سے دریافت کر لیا جائے کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ قاضی ابو شریح نے کہا کہ از روئے قانون آپ کے بیٹے کی شہادت آپ کے حق میں ناقابل تسلیم ہے حضرت علیؓ نے جز بز ہو کر ارشاد فرمایا کہ حسنؓ کی شہادت اور ناقابل پذیرائی ہو میں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زبانی سنا ہے کہ حسنؓ اور حسینؓ جوانان جنت کے سردار ہیں۔ کیا جنتیوں کی شہادت بھی رد کی جا سکتی ہے؟ قاضی شریح نے کہا کہ آپ فردوس بریں کا ذکر فرش زمین کے ساتھ کیوں کرتے ہیں اپنے دعویٰ کی کوئی دلیل موجہ پیش کیجئے۔

یہودی نے جب امیر المومنین اور ان کے قاضی کی یہ گفتگو سنی تو اسلام کی عدیم النظیر رواداری انصفت پژدہی اور مساوات کا قائل ہو کر بے اختیار کہہ اٹھا کہ اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمد رسول اللہ اور یہ کہہ کر زرہ حضرت علیؓ کو دے دی کہ حقیقت میں یہ مال حضور ہی کا ہے۔

بول بالا

از حضرت مولانا ظفر علی خاں

سوادِ یثرب میں گھومتا ہوں نبیؐ کی دہلیز چومتا ہوں
شرابِ حق پی کے جھومتا ہوں رہے سلامت پلانے والا

کرن قم اللیل کی جو پھوٹی تو سب نے اس کی بہار لوٹی
ہوائی جب والضحیٰ کی چھوٹی تو سارے جگ میں ہوا اُجالا

عجم ہے میرا عرب ہے میرا جہاں میں جو کچھ ہے سب ہے میرا
اگر مسلماں لقب ہے میرا تو بول ہوگا مرا ہی بالا

تاریخ نمبر اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کرتا ہے

تفسیرِ حق آگاہی

جدید رنگِ تغزل

از:- مولانا اظہر امرتسری

رہا درویش ہی نا واقفِ رازِ خود آگاہی
وگرنہ چومتی پائے فقیری کو شہنشاہی!

مقید اس کو سمجھا کم نظر زاہد نے کعبے میں
تجلی ریز ہے جس کی ضیا از ماہ تا ماہی

چراغِ فقر کر روشن کہیں ظلمت نہ چھا جائے
کہ ہے آغوشِ بادِ قیصر میں شمعِ شہنشاہی

اِدھر محکوم دہلی اور اُدھر آزاد انگورہ
یہ شرحِ باطل اندیشی وہ تفسیرِ حق آگاہی

دکھا کر تیغ کیا اچھی کہی اک مردِ غازی نے
اسی پُل سے گزرتے ہیں نعیم و خلد کے راہی

مصلّیٰ بیچکر خنجر خریدا اُسے بے عمل صوفی
کہ ٹکرانے کو ہے تیری فقیری سے شہنشاہی

شجاعت کی تلاش اور اس دغا بازوں کی دُنیا میں
ارے توبہ یہاں تو شیر بھی کرتے ہیں روباہی

نہ جانے کب تک احساسِ تمنا کو مٹائے گی
ترے ضو کی ہمہ گیری مری نظروں کی کوتاہی

لڑائی کفر و ایماں کی ہوئی کب ختم خیبر پہ
رہیگی مرحبی سے حشر تک لڑتی یداللّٰہی

غلامی نے چُرالی وہ کلاہِ فقر بھی مجھ سے
کبھی جو بھولنے دیتی نہ تھی تاجِ شہنشاہی

روایت کو حقیقت پر مسلط کرکے چھوڑیگی
فقیہہ شہر کی حق ناشناسی، باطل آگاہی

بھٹکتا پھر رہا ہوں میں تلاشِ مردِ کامل میں
جنابِ خضر تک پہنچا رہی ہے مجھکو گمراہی

کہیں اُٹھے نہ شورِ حشر اُٹھانے کے لئے تجھکو
رہا یونہی اگر اظہر ترا خوابِ سکوں خواہی

تاریخ نمبر میں ازمنۂ ماضیہ کی بولتی چالتی تصویریں پیش کی گئی ہیں!!

میخانۂ شفق

قدم واعظ کے آئے جاگ اٹھی تقدیرِ میخانہ

از حضرت شفق رضوی مینائی

سمجھتا زاہدِ بے پیر کیا توقیرِ میخانہ
نہ تھا میری طرح ساقی مریدِ پیرِ میخانہ

خراب آباد ہے اس کا لقب اے پیرِ میخانہ
نہ ہو تخریبِ میخانہ سے کیوں تعمیرِ میخانہ

سُبو ہو دوش پر، بوتل بغل میں، ہاتھ میں ساغر
چلوں اس وضع سے بہرِ سلامِ پیرِ میخانہ

تہجد خیز ایسا پینے والا کون تھا ساقی
ہلائی جس نے آدھی رات کو زنجیرِ میخانہ

کئے سجدے نمازی میکشوں نے پائے ساقی پر
صدائے قلقلِ مینا بنی تکبیرِ میخانہ

یہ کس کی مست آنکھوں کا تصور آگیا دل میں
کہ اُتری بن کے شیشے کی پری تصویرِ میخانہ

مؤذن مست تھا اللہ اکبر دی اذاں ایسی
کھُلا مسجد کا در ہلنے لگی زنجیرِ میخانہ

اٹھی ہر موجِ مے انگڑائیاں لے لے کے ساغر سے
قدم واعظ کے آئے جاگ اٹھی تقدیرِ میخانہ

صلائے جام و ساغر ہے صدائے قلقلِ مینا
دعائے میکشاں ہے طالبِ تاثیرِ میخانہ

تصور میکشی کا اور لے زاہد ترے دل میں
ارے توبہ! کہاں کعبہ کہاں تصویرِ میخانہ

بدل جائے نظامِ میکشی کر انتظام ایسا
نکال اے محتسب کوئی نئی تدبیرِ میخانہ

بنا جس طرح کعبہ ٹوٹ کر بتخانہ اے زاہد
یونہی بن جائیگی بگڑی اگر تعمیرِ میخانہ

سلامت خم ابد تک خیر ساقی جام و ساغر کی
ملے تجھکو حیاتِ خضر و عمرِ پیرِ میخانہ

لبِ واعظ پہ بھی ذکرِ مئے کوثر ہے کیا کہنا
سرِ منبر بجائے وعظ ہے تقریرِ میخانہ

شفق ہے رنگ میں ڈوبا ہوا ایک ایک حرف اس کا
نمایاں ہے خطِ ساغر سے جو تحریرِ میخانہ

عالمگیر تاریخ نمبر ۱۹۴۴ء

صفحات دو سو

تاریخی مقالے | ایک علمی تحفہ | تاریخی افسانے
تاریخی ڈرامے | | تاریخی نظمیں!

قیمت ایک روپیہ صرف

گزشتہ برس کی طرح اس مرتبہ بھی یکم اپریل ۱۹۴۴ء کو رسالہ عالمگیر کا ہنگامہ پرور "تاریخ نمبر" شائع ہوگا جس میں علم و تحقیق کی مشعل سے ماضی کے دھندلکوں کو اس درجہ اُجاگر کر دیا گیا ہے کہ عظمتِ رفتہ کے تمام خد و خال نگاہوں میں گھوم جاتے ہیں۔ "تاریخ نمبر" میں نہ صرف اقوام و مللِ عالم کے عروج و زوال کا نقشہ کھینچا گیا ہے بلکہ اس میں اُن عظیم الشان شخصیتوں کا تذکرہ بھی موجود ہے جنہوں نے "تاریخ گری" میں ناقابلِ فراموش حصہ لیا۔ اس کے علاوہ "تاریخ نمبر" میں ان عمارتوں اور شہروں کی قلمی تصویر کشی بھی کی گئی ہے جو اپنے کھنڈروں کی زبان سے عہدِ ماضی کی حکایاتِ رنگیں سنا رہے ہیں۔ "تاریخ نمبر" میں علمی مضامین بھی ہیں اور تحقیقی مقالات بھی، دلکش رومان بھی ہیں اور دلگداز افسانے بھی، ہوشربا داستانیں بھی ہیں اور دہشت فزا قصے بھی، حریت پرور نظمیں بھی ہیں اور سحر طراز غزلیں بھی، غرضکہ "تاریخ نمبر" کے دو سو صفحات میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ہر قسم کے ادبی ذوق کو آسودہ کر سکتا ہے۔ "تاریخ نمبر" کے مندرجات کی ایک فہرست آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرما کر خود ہی اندازہ کیجئے

کہ "تاریخ نمبر" آپ کے دل و دماغ میں کس درجہ تابندگی پیدا کر سکتا ہے؟

مقالات

اورنگزیب کی جنگ تخت نشینی ——— (مولوی ... راحمد خاں)

مغلیہ دور کی ایک خونچکاں داستان جو زمانۂ حال کے مورخین کی ستم ظریفیوں کا شکار بنی ہوئی ہے۔ فاضل مقالہ نویس نے یہ مقالہ درجنوں مستند تاریخی کتب کے مطالعہ کے بعد ایک نئے زاویے سے سپرد قلم کیا ہے۔

عہد اسلامی میں ہندوستان کی تاریخ نویسی (پروفیسر علم الدین سالک ایم۔ اے)

اسلامی فتوحات نے جہاں ہندوستان کی تہذیب و شائستگی کا نقشہ بدل دیا۔ وہاں علم التاریخ کی بنا بھی ڈالی۔ تفصیلات اس مضمون میں بتائی گئی ہیں۔

جزیہ کی تحقیق ——— (ماسٹر محمد قمر الہدیٰ)

بعض مسلمان بادشاہوں نے اپنے مفتوحہ علاقہ کی غیر مسلم آبادی پر فوجی خدمات کے عوض جزیہ عاید کیا۔ لیکن فرقہ پرست مورخوں نے ان کے اس جائز اقدام کو طعن و تشنیع کا مرکز بنایا ہے۔ اس مقالہ میں جزیہ کی تاریخ اور جواز پر محققانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

مختصر تاریخِ تاریخ گوئی ——— (مسٹر خالد حسن قادری)

بوستان ہند میں جہاں قسم قسم کے پھول کھلے وہاں تاریخ گوئی کا غنچہ بھی کھلا جس کے چٹکنے کی صدا نے ایک عالم کو محو کر دیا۔ اس مضمون میں فن تاریخ گوئی کی معلومات افزا تاریخ بیان کی گئی ہے۔

ہندوستان میں صحابہ کرامؓ کی آمد (الحاج مولوی عبد القیوم ندوی)

اُن اکابر اسلام کا ایمان پرور روحانیت افزا تذکرہ جن کے عملی و علمی کارناموں کی گونج آج تک گنبد دہر میں گونج رہی ہے۔ تاریخ ہند کا ایک گم شدہ ورق۔ ایک تحقیقی مقالہ ———

سیر و سوانح

امیر البحر خیر الدین باربروس ——— (ماسٹر ممتاز حسین قیس)

دولت عثمانی کا وہ عظیم الشان امیر البحر جس نے دول یورپ کے متحدہ بیڑے کو نیچا دکھایا اور سمندر کی وسعتوں پر اسلامی اقتدار قائم کیا۔

سلطان ٹیپو کی حاکمانہ عظمت (پروفیسر محمد علم الدین سالک ایم۔ اے)

سلطان ٹیپو شہید کی زندگی کا ایک نہایت خوشگوار پہلو اس کی حاکمانہ اہلیت اور معدلت گستری بھی ہے۔ اس نے تجارت و زراعت کے فروغ کے لئے جس بیدار مغزی کا ثبوت دیا۔ اس کی تشریح اس محققانہ مقالہ میں ملاحظہ فرمایئے۔

آقائے محمد علی باب ——— (مولانا اظہر امرتسری)

سرزمین ایران کا جادو اثر مذہبی انقلابی ——— جس نے بابی تحریک کا آغاز کیا ———

شیر پنجاب ——— (محمد عبد اللہ قریشی)

دنیا کے ہر بڑے آدمی کے گرد کوئی نہ کوئی افسانہ ضرور چکر لگایا کرتا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تاریخی شخصیت بھی بے شمار افسانوں سے گھری ہوئی ہے چند دلچسپ واقعات اس مضمون میں ملاحظہ فرمایئے ———

(باقی سامنے کے صفحہ پر)

رانا امر سنگھ کی کہانی شہنشاہ جہانگیر کی زبانی (پیرزادہ غلام دستگیر نامی)

شہنشاہ جہانگیر کی توزک صحیح ترین تاریخی واقعات پر مشتمل ہے اس مضمون میں رانا امر سنگھ کے وہ خاندانی حالات پیش کئے گئے ہیں جو شہنشاہ جہانگیر نے بذات خود سپرد قلم کئے تھے

ابو الصلت امیہ بن عبد العزیز — (شعلہ وارثی لکھنوی)

اسلام کے عہد اولیں کا ایک ماہر فن انجنیئر جو سرزمین اسپین میں پیدا ہوا اور جس نے جر ثقیل کی ایجاد سے ایک عالم کو متحیر کر دیا۔

افسانے اور ڈرامے

شعلۂ ماہ — (شبلی بی کام)

شہنشاہ چین منگ چو اور اس کی محبوبہ لی فائے جو چاند کی کرن کی طرح حسین تھی کا ہیجان خیز رومان۔ منگ چو اور اس کے ساتھیوں کو ایک معرکہ میں ذلت آمیز شکست کا سامنا ہوا انہوں نے زہر نوشی سے اپنی زندگی کو ختم کرنا چاہا لیکن لی فائے نے شہنشاہ کی جان کس طرح بچائی؟

جادۂ نو — (سید احسان علی شاہ بی-اے)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبول اسلام کا ایمان افروز واقعہ افسانوی پیرائے میں۔ لائق افسانہ نگار نے فن افسانہ نویسی کو مد نظر رکھنے کے باوجود اس واقعہ کی تفصیلات کی تاریخی نوعیت پر حرف نہیں آنے دیا۔

شہنشاہ نپولین اور مارگریٹ بینگر — (رحمت علی صابر)

مارگریٹ بینگر ایک سرکس میں معمولی ملازم تھی۔ وہ اپنے ناز و ادا کی بدولت شہنشاہ نپولین کی نظروں میں چڑھ گئی۔ اس افسانے میں یہی داستان عاشقہ بیان کی گئی ہے۔

رقیب کا دل — (صاحب فتحپوری)

یہ اس زمانہ کی رومان پرور کہانی ہے۔ جب کریمیا میں روس و ترکی ایک خونفشاں معرکے میں مصروف تھے اور ترکی کو ناگہاں ایک مقام پر شکست کا سامنا ہوا تھا۔

چھایا — (حکیم محمود عالم بزمی)

وہ چندر گپتر کی بہن تھی۔ اس کے بھائی نے مرنے سے پہلے اس کا ہاتھ مہاراجہ چندر گپت کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ لیکن جب سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا؟ — ایک رومانی ڈرامہ۔

زندگی کے موڑ پر — (امرت لال پیاسی)

تاریخ ہند کا ایک رنگین و رومان پرور ورق جس میں بودھی دور کا ایک کیف انگیز واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

میرزا غالب — (ساحر بی-اے)

میرزا غالب کی زندگی کا ایک مشہور تاریخی واقعہ جس کو دلگداز افسانے کا لباس پہنایا گیا ہے

عظمت رفتہ

تمدن و ثقافت کے اولیں مشعل بردار (مولانا سید رشید احمد ارشد)

مسلمان جہاں بھی گئے اپنی تہذیب و ثقافت ساتھ لیتے گئے۔ اس مقالہ میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی سبق آموز داستان پیش کی گئی ہے۔ وسط ایشیا کے علامہ ثقۃ الاسلام کے مقالات کا ملخص۔

(ورق اُلٹیے جناب)

گندھارا کی تہذیب ـــــ (مسٹر عطا محمد پراچہ)

گندھارا مغربی پنجاب اور شمال مغربی صوبہ کو ملا کر ایک مہذب علاقے کا نام تھا۔ اس تحقیقی مضمون میں گندھارا کی تہذیب پر روشنی ڈالی گئی ہے ـــــ

جزیرۂ قریطش کی تمدن پر ایک نظر (مسٹر عبدالرحمن سیمی)

بحر روم کا وہ جزیرہ جو مدت دراز تک یونانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا۔ قریطش کی تاریخ، طرز تعمیر، تمدن اور آثار جدید و قدیم ـــ وغیرہ ـــــ

منظومات

فصاحت جنگ حضرت جلیل۔ علامہ سیماب اکبر آبادی۔ مولنا اظہر امرتسری۔ علامہ شفق رضوی مینائی حضرت طالب باغپتی۔ حاجی نبی احمد بریلوی۔ میرزا صابر سٹھیالوی۔ مقبول حسین احمد پوری۔ اعجاز صدیقی اکبر آبادی

اور

ان کے علاوہ ہندوستان کے متعدد مایۂ ناز شعرائے کرام کا تازہ ترین کلام

مقالات مدیری

حقائق و معارف ـــــ اخبار و افکار ـــــ ملاحظات ـــــ رفتار زمانہ ـــــ تنقید و تبصرہ

تاریخ نمبر مفت

حاصل کرنے کے لئے آج ہی رسالہ "عالمگیر" کی مستقل خریداری کے لئے دفتر میں فرمائش بھیجئے۔ سالانہ چندہ صرف چار روپے آٹھ آنے (مع محصولڈاک) جس میں "تاریخ نمبر" کے علاوہ ماہ جون ۱۹۴۲ء میں شائع ہونے والا معرکہ آرا "سالانہ نمبر" اور ماہ دسمبر ۱۹۴۲ء میں شائع ہونے والا ہنگامہ خیز "خاص نمبر ۱۹۴۳ء" بھی مفت پیش کیا جائے گا۔ فرمائش پتہ ذیل پر بھیجئے:۔

مینجر رسالہ عالمگیر، سید مٹھا بازار، لاہور

پسِ پردہ

افسانہ

از جناب صائب فتحپوری

میں نے ابھی سگار جلایا ہی تھا کہ قبول صورت بیگم آ پہنچیں اور صوفے پر دراز ہوتے ہوئے بولیں۔

"افسانے کا نام کیا ہونا چاہیئے؟"

میں نے بیگم کے سر پر افسانہ نویسی کا بھوت سوار دیکھ کر سگار کا ایک طویل کش لگایا اور "ہوں" کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"بتایئے افسانے کا نام؟"

سگار کی خفیف سی تلخی شراب کا لطف دے رہی تھی۔ میں نے پے در پے دو تین کش لگائے اور فلسفیانہ انداز میں "ہوں" کہہ کر ٹال دیا۔ وعدہ معلوم کب تک پوچھتی رہیں اور میں کلاکار کی جھڑپ۔ تحصیلدار کی نالائقی اور دوسرے کے خیال میں نہ جانے کتنی دیر تک مصروف ہوں۔ کہتا رہا۔ آخر بیگم جھنجھلا کر بولیں۔

"آگ لگے تمہارے سگار میں۔ اتنی دیر سے چلا رہی ہوں، حلق پھاڑ رہی ہوں اور حضرت کان میں تیل ڈالے بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"ہوں" میں نے کہا۔ "یہ تو کبھی کا جل رہا ہے۔ مرتے کو مارا تو کیا کمال کیا؟"

بیگم جھینپ کر بولیں۔ "ابھی جا کر تمام سگار توڑ مروڑ کر پھینک دونگی۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

میں نے چونک کر کہا۔ "ہاں" (خفیف سے وقفہ کے بعد) "ہوں" (کسی قدر تعجب سے) "بیگم تم کیا پوچھ رہی تھیں؟ افسانے کا عنوان؟"

"ابھی تک صرف "ہوں" تھا اب حضرت "ہاں" ابھی تشریف لے آئے۔ (آنکھیں نکالتے ہوئے) اسی لئے کہتی ہوں (ہاتھ چمکاتے ہوئے) کہ حد سے زیادہ سگار نوشی صحت کے لئے مضر ہے۔ ابھی سے دماغ کا یہ حال ہے تو آئندہ خدا ہی مالک ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بیگم دماغ کی نہ کہو۔ ملک کے بہترین رسائل تھوڑے بہت معاوضے پر ماہانہ خریدتے رہتے ہیں گورنمنٹ سے تنخواہ الگ ملتی ہے مگر کمبخت جتنا فروخت نہیں ہوتا اس سے کہیں زیادہ خرچ ہو جاتا ہے۔"

بیگم کی لبوں سے مسکراہٹ منعکس ہو رہی تھی جیسے کوئی کلی کھل رہی ہو۔ ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولیں۔ "بس رہنے دیجئے فلسفہ کے مسائل مجھے تو صرف افسانہ کا نام چاہیئے۔"

میں سگار دانتوں میں دبا کر بولا۔ "تم افسانہ کی سرخی تلاش کر رہی ہو۔ لکھو کتنے نام بتلاؤں گی "نسیم سحر" "کالی آندھی" "محو ہرف جو پہنچ" "بیگن" ۔۔۔ بپھرتے ہوئے بیگم بولیں۔ "اور بتایئے۔ مرغی کا شوربہ" "انڈوں کا مربہ" "دیا سلائی کی چٹکی" "سگار کا اچار" ۔۔۔"

منہ کے ہوئے میں نے کہا۔ "سنو بیگم! تم تو خفا ہو جاتی ہو۔ ہم پھر افسانے کا نام بتلائیں گے۔ دیکھو تمہارے افسانہ کی سرخی ایسی ہونی چاہیئے جس سے نسوانیت ٹپکتی ہو۔ لہذا تم افسانے کا عنوان "دوشیزہ" نہیں "عورت" ۔۔۔ اچھا یہ بھی نہیں "سہاگن" نہیں نہیں "بیوہ"" (اچھلتے ہوئے) "بیگم بڑا قیمتی نام ہاتھ آیا ہے۔ الحمد پڑھو۔ لوگ سرخی پڑھتے ہی کلیجہ تھام کر نہ رہ جائیں تو کہنا۔ لغات میں ایسا نام قیامت تک نہ ملے گا۔ (ہاتھ ملاتے ہوئے) "مشترکہ بیوی" ۔۔۔ اسے بھی جانے دو۔ اچھا آ آ آ ۔۔۔ اگر تم مجھ سے دریافت کرتی ہو۔ او۔ او ۔۔۔ تو او ۔۔۔ او ۔۔۔ او۔"

آگ بگولا ہو کر بولیں۔ "اور کس سے پوچھتی ہوں۔ اینٹوں سے دیواروں سے۔ بھوتوں سے چڑیلوں سے۔ جنوں سے، مردوں سے یا روحوں سے۔ معاف کیجئے۔ مسافر جب منزل پر پہنچ جائے گا تو نام سے خود بخود آگاہ ہو جائے گا۔"

میں بیساختہ ہنس دیا۔ سگار منہ سے فرش پر آ رہا۔ بیگم کا پیر اس پر اس طرح حملہ آور ہوا جیسے بھوکی بلی کمزور چوہے پر جھپٹتی ہے اور منٹوں میں کچومر نکال دیا۔ میں ہکا بکا منہ ہی تکتا رہ گیا اپنی کمزوری اور سگار کی میعاد زندگی قبل از وقت ختم ہو جانے پر شرمندگی سے سر کھجانے لگا۔ خیال پیدا ہوا "عورت کیا ہے؟"

نو بج گئے۔ میں اٹھا۔ بیگم نے الوداعی سلام کے بعد کہا ۔۔۔

"افسانہ کا نام ۔۔۔ ؟"

میں نے مسکرا کر جواب دیا "بس کی کمائی!"

بیگم زخمی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی چلی گئیں۔ چند منٹ بعد
…تھا اور موٹر، ناہموار سڑک اور تحصیلدار کی کاہلی اور سستی کا خیال

—(۲)—

رقیہ دس سال سے میری ہتھیلیوں میں پلی ہوئی ہے۔ پانچ سال کی عمر میں والدہ روٹھ کر چلی گئیں۔ ابھی اچھی طرح ہوش بھی نہ سنبھلنے پائے تھے کہ ابا جان کا سایہ بھی دست فطرت نے سر سے اٹھا لیا۔ اکلوتی اور سگی بہن کے لئے جو کچھ بھی میں کر سکتی تھی اٹھا نہ رکھا۔ معقول تعلیم بھی حاصل کر چکی۔ خاندان میں اور لڑکیاں بھی ہیں مگر کوئی اس کا پاسنگ نہیں۔ گھر گرہستی کے زیور سے آراستہ۔ علم و ہنر کے لباس میں ملبوس۔ صورت کی اچھی خاصی لڑکی ہے یا لکشمی!

جوان لڑکی کا گھر میں رہنا ٹھیک نہیں، ہر وقت اسی خیال میں ڈوبی رہتی ہوں۔ بار بار رقیہ کے دولہا بھائی سے اس کی گفتگو کر چکی۔ "تم ہی کسی کو انتخاب کر دو" یہ کہہ کر جیسے انہوں نے اپنے سر سے بوجھ اتار دیا۔ عزیز و اقارب میں بہت سے ہونہار۔ لائق۔ تعلیم یافتہ نوجوان موجود ہیں۔ آئے دن پیامات آتے رہتے ہیں۔ کسے اور کیا جواب دوں؟ ایک کی طرف جھکو تو دوسرے کا منہ بنتا ہے۔ دوسری طرف متوجہ ہوتی ہوں تو تیسرے کو خلاف پاتی ہوں۔ زندگی عذاب میں پڑی ہے کیا کروں کیا نہ کروں!

سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ لڑکوں میں کوئی ماموں کا لڑکا ہے اور کوئی چچا کا۔ کوئی پھوپھی زاد بھائی ہے اور کوئی خالہ زاد۔ بزرگوں کو کیا کہوں جو ہم سب کو لکیر کا فقیر بنا گئے۔ لڑکی کسی حالت میں باہر نہیں بیاہی جا سکتی۔ اور نہ باہر ہی سے بیاہ کر لائی جا سکتی ہے۔ یہ ہے ہمارے خاندان کا دیرینہ اور عمل سا اصول۔ اگر خدانخواستہ کسی پچھلے سے ایسا فعل سرزد بھی ہو گیا تو اسے ارتکاب جرم کی پاداش میں یہ سزا بھگتنی پڑتی ہے کہ آئندہ سات پشت تک کوئی رشتہ ناتہ نہیں کیا جاتا صرف تعلقات برادری ہی قائم رکھے جاتے ہیں۔

—(۳)—

موسم کی تبدیلی کا اثر بچوں کی نازک طبع بہت جلد قبول کرتی ہے۔ کل خوب بارش ہوئی۔ رات بھر ٹھنڈی ہوا چلتی رہی۔ راحت بارہ گھنٹے بخار میں جلتا بھنتا رہا۔ وہ تندرست ہی کب رہتا ہے؟ نزلہ، زکام، کھانسی، بخار۔ یہ۔ وہ۔ غرض کوئی نہ کوئی عارضہ لگا ہی رہتا ہے۔ دائی کی جانے بلا، اسے تو بس کھٹ۔ گرم چائے کے دو پیالے۔ پیٹ بھرنے کو چپاتیاں، بکرا

کی طرح منہ چلانے کے لئے پان، اور مہینہ ختم ہونے پر دس روپے … صاحب کا بھلا ہو۔ بچے خواہ مریں خواہ جئیں۔

نیند سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔ شب بیداری کا خمار آنکھوں پر منڈلا رہا ہے جیسے سر پر سوسن کا بوجھ رکھا ہو۔ دائی کہیں چلی گئی۔ راحت کے پاس کون بیٹھے؟ نوکروں کا بھی نشان نہیں۔ خیال پیدا ہوا رقیہ تو ہے۔ میں نے رقیہ کے کمرے کی چق اٹھائی اور فوراً چھوڑ دی۔ یہ کیوں؟

راحت کی دفعتہ چیخ پکار نے مجھے گھبرا کر واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ بیچارہ تپ میں پھنکا جا رہا تھا۔ گلے سے لگائے، سینے سے چمٹائے چہل قدمی کرتی رہی۔ دائی آئی۔ اس کی حفاظت میں دے کر میں ڈراما دیکھنے چلی گئی۔

ہمشیرہ زادہ حامد کے زانو پر رقیہ سر رکھے ہوئے لیٹی تھی۔ بار بار قرآن پڑھنے کی آواز کانوں میں آ آ کر شرم و حیا کے دامن میں آگ لگا کر نگاہیں زمین میں گاڑ کر گانوں کے پردوں میں سمو جاتی تھی۔

حامد نے داہنا بازو ٹٹولتے ہوئے پوچھا "یہ کیا ہے رقیہ؟"

رقیہ نے کسی قدر پریشان ہو کر جواب دیا "تعویذ ہے"

"کیسا تعویذ؟"

"جس کی آنکھیں انگریزی طرز معاشرت اور مغربی تہذیب و تمدن کی آغوش میں کھلی ہوں وہ اس کی اہمیت معلوم کرنے سے قاصر ہے"

"لیکن تم میرے استفسار پر جھجک کیوں گئیں؟"

ساری کا آنچل انگلی پر لپیٹتے ہوئے رقیہ نے کہا "کوئی خاص وجہ نہیں"

تعویذ پر ہاتھ رکھتے ہوئے حامد بولا "کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

حامد کے قبضے سے رہائی حاصل کرنے کے لئے مچل کر رقیہ بولی "کیا مردے قبر کھود کر نکالے بھی جاتے ہیں؟"

میرے بدن کا رواں رواں کھڑا ہو چکا تھا۔ سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ غصہ سے تھر تھر کانپ رہی تھی اور دانت پیس پیس کر رہ جاتی تھی۔

"جذبات پر قابو حاصل کرو" رخسار سے لب ملاتے ہوئے حامد نے کہا "میں تمہارا پجاری ہوں رقیہ!"

ہاتھ سے سر ہٹانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ بولی "ایک مندر میں کئی مورتیاں ہوتی ہیں اور ایک مورتی کے ہزاروں پجاری ہوا کرتے ہیں حامد!"

شرم آمیز خفیف قہقہہ کے بعد اس نے کہا "حکیم بیمار کا چہرہ دیکھتے ہی مرض کی اصلیت معلوم کر لیتا ہے۔ رقیہ! میں نے کالج میں رہ کر گھاس نہیں کھودی

حامد نے بجبر وقہر تعویذ کھول لیا۔ کپڑا پھٹنے کی آواز پر رقیہ چونک گیا، وہ بجلی کی طرح اس پر جھپٹی۔ ہاتھ کی دو چوڑیاں ٹوٹ کر فرش پر آ رہیں۔ چہرہ آتش غضب سے سرخ ہو گیا (کاغذ کھلنے کی آواز) میں نے چاہا کہ اندر جاؤں اور ان دونوں کی اچھی طرح گوشمالی کروں لیکن ہاتھ پاؤں شل ہو کر رہ جاتے تھے۔

حامد مسکراتا ہوا قریب پہنچا۔ اور بولا۔ "تمہارا فرض بھی تھا کہ زبیدہ بھائی کے خط کو تعویذ بنا کر اپنی جان سے لگائے رکھو۔ تمہارا یہ فعل لائق صد تحسین و قابل صد آفرین ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو آتش محبت میں جل جل کر زندگی حاصل کرتے ہیں۔ (ٹھہر کر) لیکن یہ تباؤ میں کیا کروں؟ ابھی تک میری روح جہنم کی آگ کے شعلوں سے نہیں ٹکرائی ہے اور نہ میرا جسم کسی پلید سایہ سے مس ہوا ہے۔"

ریشمیں پلکوں کی دراز جھالروں کے اندر حسین آنکھیں صبح کے دو چمکتے ستاروں کی طرح جھلملائیں۔ اور زبان ہلی۔

"تم نے تو کالج میں رہ کر گھاس نہیں کھودی نا؟"

"دنیا کی ہر شے سے کچھ نہ کچھ داستان وابستہ ہوا کرتی ہے۔ (بلند آواز سے) میں نے خط کا مضمون دہرا کر تمہارے زخمہائے دل کو ہرا کرنے کی سعی نہیں کی۔ (آہستہ سے) اس لئے کہ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ (پھر زور سے) میں تمہاری آئندہ زندگی کے زریں ادوار اپنی آغوش میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر اعتماد کرو (فیصلہ کن لہجہ میں) انسان کی بربادی و کمزوری کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ اپنوں پر بھروسہ نہیں کرتا۔"

رقیہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ شاید بھولی ہوئی زندگی کا خاکہ نظروں میں سما گیا۔ حامد نے اسے گلے لگاتے ہوئے تسلی آمیز لہجہ میں کہا۔

"تم کیوں روتی ہو رقیہ! وہ انسان قابل صد ستائش ہے جو زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہے۔"

میں رہ رہ کر ہاتھ مل رہی تھی۔ کاش ابتدا ہی سے ان خاندانی بدمعاشوں سے پردہ کراتی تو آج یہ کہانی سننے کو نہ ملتی۔

رقیہ نے سسکتے ہوئے کہا۔ "انسان مجبور ہے اور عورت مجبور تر اس لئے یہ رحم کی مستحق ہے۔"

دونوں بانہیں پکڑتے ہوئے اس نے کہا۔ "رقیہ! محبت تو کہا اعتراف محبت بھی گناہ نہیں۔ تم رحم کی استدعا کیوں کرتی ہو؟"

بھولی بھولی آنکھیں اٹھاتے ہوئے رقیہ بولی۔ "کیا تم مصیبت کے غار سے مجھے نکال سکتے ہو؟"

دستی سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ بولا۔ "سیا سوزی کا دوسرا نام محبت نہیں تو اور کیا ہے؟"

"تو یہ خط مجھے دے دو۔"

"کیا کرو گی؟"

گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ "میں اسے چھپانا چاہتی ہوں (بیتاب ہو کر) یا اسے زمین کا سینہ چیر کر دفن کر دوں گی۔ دوزخ کی آگ میں جلا ڈالوں گی (کچھ یاد کر کے) میں اسے ڈبو دینا چاہتی ہوں سمندر میں! ایسے سمندر میں جہاں روزانہ صدہا جہاز اور بیڑے اور کشتیاں غرق ہو جایا کرتی ہیں تاکہ اس کا احساس روز ہو اور جس کا تاب برداشت نہ ہو۔"

کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بولا۔ "ہاں یہ طریقہ بہت ہی اچھا ہے مگر ہستی کا عظیم مخزن نہ چھپانے دیگا۔ (سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) تم اسے جتنا گہرا دفن کرو گی اسی قدر بلندی و سرعت کے ساتھ سماج کی نظروں میں چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ رقیہ یہ جذبات ہیں (رخسار کو چھوتے ہوئے) دوزخ کے لاتعداد شعلے انہیں نہیں جلا سکتے (پیشانی چومتے ہوئے) انہیں جتنا نظروں سے اوجھل رکھو گی۔ آہوں کی خوراک نہ پہنچاؤ گی مردہ ہو جائیں گے۔"

منہ پھیلاتے ہوئے رقیہ نے حسرت و یاس سے کہا۔ "آہوں کی خوراک!"

"ہاں اگر آہوں کی خوراک نہ ملیگی تو مرجھا جائیں گے (نرم لہجہ میں) جذبات ہمیشہ محبت کے ضامن ہوتے ہیں۔ منزل محبت میں قدم قدم پر مصائب و تکالیف سے ہم آغوش ہونا پڑتا ہے" ارتقائے زندگی کا راز محبت کے پرسوز گیت کی لے میں پوشیدہ ہے۔ محبت کئے جاؤ۔ زبیدہ کو بھی یاد رکھو۔ "درد محبت" کا مزا ملتا رہے گا۔ کبھی نہ کبھی میری ہستی تمہارے دل میں گدگدی پیدا کر کے گذشتہ نقوش مٹا دیگی۔"

سارا بدن آگ سے پھنکا جا رہا تھا۔ کان سنتے تھے دل ہزاروں فیصلے کرتا تھا لیکن ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ چق اٹھا سکیں نہ جانے کیوں؟

"یہ کیسے ہو سکتا ہے حامد! محبت دو کیلئے مسرت اور تین کیلئے جنگ و عداوت کا موجب ہوتی ہے (چپٹتے ہوئے) میرا خط مجھے دیدو۔"

ڈانٹتے ہوئے اور بیدردی سے ہٹاتے ہوئے اس نے کہا۔ "نہیں ہرگز نہیں۔ تمہیں خط حاصل کرنے کا کوئی مجاز نہیں (بلند آواز سے) یہ خط تمہاری گزشتہ حرکات ناشائستہ کا شاہد ہے ابھی کافی مہلت ہے،

ابھی طرح سوچ سمجھ لو۔ وہ وقت قریب ہے۔ جب تمہارے شرمناک حالات سے خاندان کے باوقار اشخاص واقف ہو جائیں گے اور اس وقت ہم میں سے کوئی بھی تمہیں اپنانے کے لئے کسی شرط پر بھی آمادہ نہ ہوگا۔"

میں نے خوفزدہ ہو کر دونوں ہاتھ رخساروں پر رکھ لئے اور سوچنے لگی۔ کیا حامد سچ کہہ رہا ہے؟

"حامد ہوش کی لو۔ تم مجھے خواہشات نفسانی کے زیر اثر مغلوب کرنا چاہتے ہو۔ (ذرا آواز بلند) تمہارے اجداد تمہارے حافظے تمہاری خواہشات اور تم خود فنا ہو جانے والے ہو لیکن یہ جوہر غیر فانی ہمیشہ ہمیشہ باقی رہیگا۔ سنو سوسائٹی و خاندان یہ تو محبت کے ازلی دشمن ہیں۔"

آہستہ اور لجاجت سے اس نے کہا: "رقیہ! تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ میرے پہلو میں بھی ایک دنیا آباد ہے اگر وہ اجڑ گئی تو پھر آباد نہ ہوگی۔"

"حامد! تمہاری مخاطب رقیہ ہے (جوش سے بیتاب ہو کر) تم صرف حسن کے خریدار ہو۔ آج اپنے دل کی کنجی مجھے دے دو کل ہی قفل بدل دوگے (کسی قدر بلند آواز سے) میں تمہاری گفتگو کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو چکی ہوں تم نے تو کالج میں رہ کر گھاس نہیں کھودی نا؟"

حامد اٹھتے ہوئے بولا: "رقیہ! میرا نام حامد ہے۔ اب میں جاتا ہوں لیکن خیال رہے میرا اقدام نہایت خطرناک ہوگا!"

غصے کے عالم میں دانت پیستے ہوئے اس نے کہا: "حامد یاد رکھنا میں عورت ہوں اور عورت کا انتقام نہایت خاموش اور بے پناہ ہوتا ہے۔"

میں زینے سے اترتی ہوئی رقیہ کی سسکتی کمرے میں چلی گئی۔ غم و غصہ دونوں بیک وقت طاری تھے جی چاہا کہ آج رقیہ کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں مگر عمر کے تقاضے اور موقع و محل کی نامناسبت نے خاموشی میں بھلائی جانی وہ میز پر سر رکھے سسک سسک کر رو رہی تھی میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"کیوں رو رہی ہو رقیہ؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا جوں جوں میں پوچھتی گئی اسی قدر وہ زیادہ روتی گئی اسی اثنا میں موٹر کا ہارن ہوا رقیہ کے دولہا بھائی بھی آ گئے ان کی آنکھوں سے خون برس رہا تھا۔ آواز بھاری پڑ گئی تھی۔

میں نے بیگم سے پوچھا: "کیا ماجرا ہے؟"

انہوں نے چپ رہنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہا: "ہوں!"

میں نے پھر پوچھا۔ بیگم نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا: "ہوں!"

دیکھ

از جناب پروفیسر دانش۔ ایم۔ بریلوی۔ ایم۔ اے

جو دیکھنا ہے جلوہ گہ زندگی میں دیکھ! — دل ہے تو دوستی میں بھی دشمنی میں دیکھ
کیوں سخت تر ہے صورتِ مجبوریٔ حیات — اس کو کسی اسیر محن کی ہنسی میں دیکھ
اے صنعت آشنا یہ مرقع ہے دہر کا — اپنی بھی کوئی شکل بنا کر اسی میں دیکھ
بعد فنا کہاں نظر آئیگی تجھکو موت — اس جانِ زندگی کو غمِ زندگی میں دیکھ
تو تو ابھی وہی ہے جو دنیا بدل گئی — کہنہ حقیقتوں کو نئی روشنی میں دیکھ
ارزاں نہیں ہیں حسن کی رنگیں لطافتیں — ان کو تخیلات کی صنعت گری میں دیکھ

اللہ رکھے فطرت جوہر شناس کو
جو کیفیت کہیں نہ ملے شاعری میں دیکھ

شوقِ جاں بلب

وہ شباب افروز دن اب وہ جواں راتیں نہیں!

از حضرت سروش عسکری طباطبائی

چھپ کے تنہائی میں پہروں راز کی باتیں نہیں!
اب وہ پنہاں سلسلے مخفی ملاقاتیں نہیں

سرد ہے بازار سودا ہے نہ کوئی مشتری
عشق میں گرمی نہیں اور حسن میں گھاتیں نہیں

ایک دن تھا حسن محوِ ناز برداریِ عشق
اب جنوں کی خاطریں غم کی مداراتیں نہیں

ایک دن اشکوں میں تھا خونِ تمنا جلوہ گر
ہیں مگر اب اس قدر رنگین برساتیں نہیں!

ہائے جب ہر سانس تھی تمہیدِ عیشِ جاوداں
وہ شباب افروز دن اب وہ جواں راتیں نہیں

چاند کی رونق وہی تاروں کی محفل ہے وہی
پھر بھی راتیں جانے کیوں اتنی حسیں راتیں نہیں

سرنگوں سائل ہے اور خالی ہے دامانِ سوال
حسن کی ڈیوڑھی پر اب پہلی سی خیراتیں نہیں

باتوں باتوں میں کسی کے راز کہہ ڈالے تمام
عسکری خاموش لازم تم کو یہ باتیں نہیں!

”شوق لکھنوی کی مثنویوں کی تقدیم و تاخیر“ تبصرہ

از جناب عطاء اللہ پالوی

نواب مرزا شوق لکھنوی نے بحیثیت ایک مثنوی نگار کے جیسی عظیم الشان شہرت اور فقید النظیر مقبولیت حاصل کی ہے وہ بقول نیاز ”قدر و قیمت میں اس سے کہیں زیادہ ہے کہ ان کا منہ انجاد میں موتیوں سے بھرا جاتا“ مگر یہ عجیب بات ہے کہ نہ ان کی مثنویوں کی تعداد پر محققین متفق ہیں اور نہ تقدیم و تاخیر پر۔ اول الذکر سے یہاں بحث نہیں البتہ جہاں تک آخر الذکر کا تعلق ہے۔ ہم ان صفحات میں کچھ کہنا ضروری سمجھتے ہیں اس لئے کہ شوق کی تینوں مثنویاں کچھ اس قدر متضاد و مختلف جذبات کی حامل ہیں کہ ان کی تقدیم و تاخیر کا پتہ لگانے کی کھٹک دل میں پیدا ہونا لازمی ہے۔ خیال تو کیجئے ایک طرف ”فریب عشق“ کی شعلہ بدامن نوجوانیاں دل کو جھولا جھلاتی نظر آتی ہیں اور دوسری جانب ”بہار عشق“ کی رنگینیاں جذبات سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں مگر جب تیسری جانب رخ کیجئے گا تو ”زہر عشق“ کی تلخیاں، نامرادیاں اور زہرہ گدازیاں کچھ ایسی ہوشربا صبر شکن اور قیامت زا نظر آئیں گی کہ ان کا مطالعہ قلب وجگر کو چھید کر ہی دم لیگا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت سے جب توحید میں تثلیث کی بوقلمونیاں نظر آئینگی تو یقینی طور پر ان کے جاننے اور سمجھنے کی خلش اور گدگدی سی ہر شخص میں پیدا ہوگی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج ہم اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

جناب احسن لکھنوی نے اپنے مضمون مطبوعہ نگار فروری ۱۹۲۸ء میں فرمایا ہے کہ۔

”مجھے معلوم ہے کہ بہار عشق۔ فریب عشق، زہر عشق، یہ تینوں مثنویاں حکیم نواب مرزا صاحب کی ہیں جن میں پہلی مثنوی زہر عشق تھی اور ان کے جذبات صحیحہ کا نتیجہ تھی اس کے بعد انھوں نے کئی مثنویاں اپنے احباب کے تقاضہ سے لکھیں . . . . .“

مولانا عبد الماجد دریابادی نے اپنے مضمون مطبوعہ سہیل اپریل مئی و جون ۱۹۲۷ء میں ”فریب عشق“ کو شوق کی مثنوی ماننے سے انکار سا کرتے ہوئے یہ مشتبہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:۔

”ممکن ہے نومشقی کے زمانہ کی ابتدائی تصنیف ہو۔“

جناب مجنوں گورکھپوری نے اپنے مقدمہ ”زہر عشق“ میں ”فریب عشق“ اور ”لذت عشق“ سے بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:۔

”فریب عشق“ اور ”لذت عشق“ کی زبان اتنی پختہ اور کسی ہوئی نہیں جتنی کہ ”زہر عشق“ اور ”بہار عشق“ کی ہے مگر اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ ”زہر عشق“ اور ”بہار عشق“ بعد کی تصنیفیں ہیں اس لئے زبان زیادہ چست اور رواں ہے۔“

”لذت عشق“ کا ذکر یہاں خارج از بحث ہے۔ رہی ”فریب عشق“ سو بلا شبہ یہ بالکل پہلے کی چیز ہے کیونکہ نہ صرف زبان ”زہر عشق“ اور ”بہار عشق“ کی حد تک کسی ہوئی نہیں ہے بلکہ اور شواہد بھی ہیں جس کی بنا پر اس کی اولیت کا یقین و اعتراف ناگزیر ہے۔

(۱) ”فریب عشق“ میں حمد، نعت اور منقبت کے بعد ”مدح سلطان“ نہیں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی تصنیف کے وقت شوق کو شاہان اودھ کے دربار سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کی ضرورت نہ تھی کہ وہ خواہ مخواہ بادشاہ کی ثناخوانی یا حاکم وقت کی مدح سرائی کریں۔

(۲) ”فریب عشق“ میں قصہ شروع کرنے سے پہلے ”مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا“ کی دلچسپ تشریح و تفصیل فرمائی ہے۔ یہ چیز بعد کی مثنویوں میں نہیں ہے۔ جس کا بجز اس کے اور کچھ مطلب نہیں ہو سکتا کہ ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔

(۳) ”فریب عشق“ میں داستان عشق جو بیان ہوئی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ”عشق اول“ اتفاقی نہ تھا بلکہ عنفوان جوانی کی

رنگین لغزش کی حیثیت رکھتا تھا۔ صرف اسی مقصد سے چلے

کربلا پہنچے ہو کے ہم درگاہ

اور وہیں یہ روگ لگا۔ عہد شباب ایک تو یونہی بمنزلہ داماں ہوتا ہے، پھر شوق ایک لکھنوی رئیس کے رنگین مزاج بیٹے تھے پھر وہ اس کربلا اور درگاہ کی طرف کیوں نہ جاتے جہاں کی رنگینیوں کا یہ عالم تھا

دوپہر رات جب گزرتی تھی
ڈولی پر ڈولی پھر اترتی تھی

اور پھر ڈولی بھی وہ جس کی ڈولی والیاں وہ تھیں جن کی تعریف میں جان صاحب فرما گئے ہیں ؎

یہ جتنیاں ہیں تماش بینیں نہیں زیارت کا ان کو
یہی ہے مطلب کہ جائیں درگاہ مردووں کا کریں نظارہ

پھر یہ صرف ڈولی والیاں ہی نہ تھیں جن کا منتہائے نظر اور مقصد اولین رنگ رلیاں تھا بلکہ بقول رند مردوں کا بھی یہی عالم تھا ؎

یوں تو جایا کئے ہر سال مہینوں لیکن
اب کی نوچندی میں اک چاند سا مکھڑا دیکھا

ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس مصنوعی داستان عشق کی حامل مثنوی جس کو جذبات سے کوئی تعلق نہیں ابتدائے عہد شباب کے سوا اور کسی دور کی نہیں ہو سکتی۔

(۴) تخت اودھ پر جب تک واجد علی شاہ متمکن نہ ہوئے تھے اس وقت تک رندی و ہوسناکی کا وہ زور نہ تھا جو ان کے عہد سلطنت میں ہوا لہذا ان کی سلطنت سے پہلے وہ قوانین بھی نہ بنے تھے جن کے ذریعے "عورت" پر قدرت حاصل کرنے کے سارے اسباب بہم پہنچائے گئے تھے۔ چنانچہ "فریب عشق" کی محبوبہ نے جس وقت وصل سے انکار کیا تو "بہار عشق" والی اس زبردستی کو کام میں لایا نہ جا سکا کہ

ہاتھ پکڑ کے پلنگ پر لایا

بلکہ خوف سلطانی کی وجہ سے منتیں اور قسمیں ہونے لگیں ؎

ہم کو بیٹھے سواری گر منگوائیے ۔۔۔ ہم کو بے پردہ کیجے جو گھر کو جائیے
آپ گر توڑیئے گا جی میرا ۔۔۔ دم نکل جائے گا ابھی میرا،

ظاہر ہے کہ اس وجہ سے نہ یہ واجد علی شاہ کے عہد کی تصنیف ہو سکتی ہے جبکہ عورتوں پر دسترس حاصل ہونے کے سارے وسائل بہم پہنچے ہوئے تھے۔ نہ بعد کی جبکہ شوق کی عمر کافی جا چکی تھی لہذا یہ ماننا ناگزیر ہے کہ یہ شوق کے ابتدائی عہد کی تصنیف ہے۔

(۵) "فریب عشق" میں نہ "بہار عشق" کی سی بے حجابی ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ وہ واجد علی شاہ کے عہد کی تصنیف ہے۔ نہ "زہر عشق" کی سی محزونی ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ وہ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد کی مثنوی ہے۔ لہذا اسے واجد علی شاہ سے پہلے کی ابتدائی مثنوی ماننا ہی پڑے گا۔

"فریب عشق" کے بعد کی کون مثنوی ہے، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب نہ مجنوں صاحب نے دیا ہے نہ عبدالماجد صاحب نے البتہ جناب احسن نے اپنے کو شوق لکھنوی کا نواسہ ظاہر کرتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ گھر کی بات ان سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا مثنوی "زہر عشق" کو سب سے پہلی مثنوی قرار دیا ہے مگر یہ غلط ہے۔ میرے نزدیک "فریب عشق" کے بعد "بہار عشق" لکھی گئی ہے اور "زہر عشق" سب سے آخری تصنیف ہے جس کے کئی دلائل ہیں۔

(۱) "بہار عشق" میں حمد نعت اور منقبت کے بعد واجد علی شاہ کی مدح بھی ہے ؎

آفتاب سپہر جاہ و حشم ۔۔۔ شاہ واجد علی شہ عالم
سرور خسروان عالم ہے ۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ جان عالم ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس عہد کی تصنیف ہے جب شوق کی رسائی دربار اودھ تک ہو چکی تھی، بالفاظ دیگر واجد علی شاہ تخت پر بیٹھ چکے تھے۔ "زہر عشق" میں واجد علی شاہ کی تعریف نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد کی تصنیف ہے۔

(۲) "بہار عشق" اس لئے بھی درمیان کی تصنیف سمجھی جا سکتی ہے کہ اس میں نہ "فریب عشق" کا سا یہ ابتدائی الھڑ پن ہے کہ چند دن مزے اڑانے کے بعد معشوق کو بستر مرگ پر چھوڑ دیا اور نہ "زہر عشق" کی سی یہ والہانہ پختہ کاری ہے کہ جان چلی گئی مگر عشق کی آن اور محبت کی شان میں فرق نہ آنے دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں میں شاہی ملازمت کا یہ زعم بھی ہے کہ سواری باغ میں زبردستی رکھوائی۔ اس میں یہ خود مختارانہ سرکشی بھی ہے کہ زبردستی ع

ہاتھ پکڑ کے پلنگ پر لایا

اس میں یہ بےفکری بھی ہے کہ چند ہی دنوں کے بعد بھول بسر گئے اور جان تمنا کی خبر تک نہ لی۔ اور اس میں یہ احساس رتبہ بھی ہے کہ پیام شادی قبول کر کے خاندان کی ناک کٹنے سے بچا لی۔ یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے کہ عاشق مصنف برسر اقتدار ہو اور ظاہر ہے کہ اقتدار صرف اسی وقت حاصل ہوگا جب شوق دربار اودھ سے منسلک ہوں

اور ایسا رنگین مزاج بادشاہ تختِ حکومت پر متمکن ہو۔

(۳) "بہارِ عشق" میں بدمستی اور ہوسناکی یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ ساری خلوت کی باتیں بانجمن آرا کر دی گئی ہیں۔ یہ وا شگاف گفتاری جب ہی ممکن ہے جب اخلاقی، سماجی اور قانونی غرض ہر حیثیت سے مصنف کو یہ اطمینان ہو کہ وہ گرفت میں نہ آسکے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ سہولت نہ واجد علی شاہ سے پہلے اہل لکھنؤ کو میسر تھی نہ بعد میں کبھی حاصل ہوئی۔ لہٰذا یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ یہ مثنوی اس وقت لکھی گئی جب کہ شوق شاہی ملازمت کی وجہ سے ہر طرح نڈر تھے یا لکھنؤ واجد علی شاہ کی رنگ رلیوں کی وجہ سے رندی و سرمستی کا اکھاڑا یا "دامانِ باغبان" اور "کفِ گلفروش" بنا ہوا تھا۔

(۴) "زہرِ عشق" ہرگز اس رنگین دور کی تصنیف نہیں ہو سکتی جس میں سارے لوگ شاہد و شراب کی دلفریب رنگینیوں میں ڈوبے اور رنگ و بو کی مسحور کن رعنائیوں میں کھوئے تھے بلکہ یہ مثنوی جو اپنے سینے میں محشر بدوش المناکیوں کا ایک ہولناک ذخیرہ سمیٹے ہوئے ہے، یہ فسانہ جو اپنی خاموش زبان میں دلخراش آہوں اور جگر فگار کراہوں کا ایک بے پناہ طوفان دبائے ہوئے ہے۔ یہ تصنیف جو اپنی پنہاں آنکھوں میں خونباریوں کا ایک اتھاہ سمندر جذب کئے ہوئے ہے یقیناً اس وقت لکھی گئی ہے جب لکھنؤ سانحہ ہو چکا تھا اور اس کی نشاط آگینیاں آنسوؤں میں تبدیل ہو چکی تھیں جب ہی تو اس میں درد و کسک اور حزن و ملال اس طرح کروٹیں لے رہا ہے کہ ہم اس کے ہر ہر مصرعہ اور ہر ہر شعر پر تڑپ تڑپ اٹھتے ہیں! اگر یہ نہ ہوتا تو ہرگز "زہرِ عشق" نہ لکھی جاتی اور لکھی بھی جاتی تو اس کی ہیروئن زہر کبھی نہ کھاتی بلکہ اس کا بھی انجام "بہارِ عشق" ہی کا سا نشاط آگیں ہوتا۔

(۵) "زہرِ عشق" کے سب سے آخری تصنیف ہونے کا ثبوت ایک اور بھی ہے۔ مسٹر راس مسعود کی تحقیق کے مطابق "زہرِ عشق" کا تاریخی نام "غمِ دل ربا" ہے اگر یہ صحیح ہے تو اس سے "زہرِ عشق" کا سالِ تصنیف ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) برآمد ہوتا ہے۔ اودھ کا الحاق ۷ فروری ۱۸۵۶ء (۱۲۷۲ھ) کو ہوا ہے اور واجد علی شاہ ۱۳ مئی ۱۸۵۶ء (۱۲۷۲ھ) کو کلکتہ مٹیا برج میں نظر بند کئے گئے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ "زہرِ عشق" بادشاہ اودھ کی نظر بندی کے صرف چار سال بعد لکھی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ شوق پر جو بقول احسن صاحب درباری شاعر تھے اور نواب واجد علی شاہ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے الحاقِ سلطنت اور قیدِ سلطان سے کیا کچھ نہ گزری ہوگی پھر اگر ہم یہ کہیں کہ اس حادثہ فاجعہ سے شوق کے سینے میں غم و الم کا جو طوفان کروٹیں لے رہا تھا صرف اسی کی بھڑاس نکالنے کیلئے انھوں نے یہ مثنوی لکھی تھی تو غلط نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس سے پہلے کوئی وجہ ہی نہ تھی کہ ایک درباری شاعر کے دماغ میں حزنیہ مثنوی لکھنے کا خیال بھی آئے۔

(۶) "زہرِ عشق" ۱۲۷۷ھ کی تصنیف ہے اور شوق کا سنہ وفات ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) ہے مرنے کے وقت ان کی عمر کافی تھی۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے یہ مثنوی وفات سے صرف گیارہ سال پہلے لکھی ہے۔ ہم احسن صاحب کے قول کے مطابق اگر "زہرِ عشق" کو سب سے پہلی مثنوی تسلیم کریں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ جوانی میں شوق خاموش رہے البتہ ادھر جب سلطنت اودھ کا تختہ الٹا تو ادھر انھوں نے مثنوی نگاری شروع کی۔ یہاں تک کہ سب سے پہلی مثنوی "زہرِ عشق" وجود میں آئی۔ پھر جب کچھ اور سن پایا تو "فریبِ عشق" کی سی ادسط درجے کی طربیہ مثنوی لکھی۔ پھر جب کچھ اور بوڑھے ہوئے تو نہ صرف "بہارِ عشق" کی سی سدابہار اور رنگین مثنوی لکھی اور بوڑھاپے میں جوانی کے چوچلے دکھائے بلکہ یہ بھی فرمایا کہ ؎

کر رقم اب دعائے شاہ زماں — کہ وہ ہے ملک ہند کا سلطاں
آفتابِ سپہر جاہ و حشم — شاہ واجد علی شہِ عالم
خلق پر سایۂ الٰہی ہے — مالکِ تاج و تختِ شاہی ہے
ہے بشر جو خدا کی قدرت ہے — نیک سیرت ہے خوبصورت ہے
سرورِ خسروانِ عالم ہے
حق تو یہ ہے کہ جانِ عالم ہے

اور جب بسترِ مرگ پر پہنچے تو واجد علی شاہ کے "قیصر باغ" کی تعریف میں ایک طویل مثنوی لکھی جس کا ذکر احسن صاحب نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔

(۷) "زہرِ عشق" میں جو موضوع سب سے اہم ہے وہ "دنیا کی بے ثباتی" ہے جو خالص پیرانہ سالی اور حزن و ملال کی دلیل ہے۔ جوانی میں اس کا احساس کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا یقیناً یہ سب سے آخری تصنیف ہے۔ بالکل اسی طرح "فریبِ عشق" جس میں سراسر لڑکپن اور اس

ؔ ہم نے "زہرِ عشق" کے قصہ کو جس کے متعلق جناب احسن لکھنوی کا دعویٰ ہے کہ سچا ہے فسانہ کہا ہے خود مصنف نے بھی ایسا ہی کہا ہے ؎

جب تلک چرخ بے مدار رہے
یہ فسانہ بھی یادگار رہے

کا مضمون سامانیاں کارفرما ہیں کسی بھی ایک سن شاعر کی تصنیف ہو ہی نہیں سکتی۔ مائل بہ انحطاط عہدِ زندگی میں ابتدائے شباب کی مزیداریاں ایک شاعر اس بے تکلفی سے بیان کر ہی نہیں سکتا اور "فریبِ عشق" میں یہی چیز بدرجہ اتم ہے لہذا بلاشبہ وہ "فریبِ عشق" عہدِ جوانی کی تصنیف اور سب سے پہلی مثنوی ہے

نیز "زہرِ عشق" آخری ایام کی پختہ کاری کا بہترین نمونہ، اور جب ان دونوں کا تعین قابلِ تسلیم ہو جاتا ہے تو "بہارِ عشق" لازماً جوانی سالی کی حال قرار پا جاتی ہے اور اس صورت میں جناب احسنؔ کا یہ بیان کہ سب سے پہلی مثنوی "زہرِ عشق" ہے پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتا ہے۔

سوزِ پنہاں

بڑا ہی آسرا تیرا ہمیں اے چشمِ گریاں تھا

از جناب تسکینؔ بریلوی

ازل سے اعتبارِ زندگی شعلہ بداماں تھا
مری تعمیر میں مضمر مذاقِ سوزِ پنہاں تھا

اٹھاتا انتظارِ وعدۂ فردا کی کیوں زحمت
نمودِ صبحِ محشر خود مرا چاکِ گریباں تھا

کرم کا جس پہ دھوکا تھا، کرم جس کو سمجھتے تھے
وہ تمہیدِ قیامت تھی قیامت کا وہ ساماں تھا

ہوا چشمِ حقیقت بیں کو دھوکا جستجو دامن کا
یہاں تک پاؤں پھیلائے ہوئے چاکِ گریباں تھا

مصیبت میں نظر آتے تھے مجھکو عیش کے ساماں
کچھ اس انداز سے بربادیوں کا میرے ساماں تھا

بھلی معلوم ہوتی کیوں نہ ہم کو اپنی بربادی
تمہارے دل کی حسرت تھی تمہارے دل کا ارماں تھا

حقیقت کیا بتاؤں زندگی کی اے عدم والو
وہ تھیں اک خواب کی باتیں وہ اک خوابِ پریشاں تھا

سمجھتے تھے کہ رو رو کے لگی دل کی بجھا لیں گے
بڑا ہی آسرا تیرا ہمیں اے چشمِ گریاں تھا

بندھا ٹوٹا ہزاروں بار جو اک رات میں ظالم
وہ کس کا عہد تھا کس کی قسم تھی کس کا پیماں تھا

وہی میں ہوں کہ اب جاؤں بھی تو پرسش نہ ہو میری
وہی میں تھا کہ جو ہر دم شریکِ بزمِ جاناں تھا

بھری محفل میں کیوں پردہ اٹھانا رازِ الفت کا
تجھے کچھ پاس بھی تسکینؔ کا اے چشمِ گریاں تھا

زباء اور شاہِ عراق

تاریخی افسانہ

از جناب ماسٹر ممتاز حسین بسمل (منشی فاضل ادیب فاضل)

جزیرہ نمائے عرب کا بیشتر حصہ ریگستان ہے جہاں دن بھر بگولے خاک اڑاتے ہیں اور بھیانک آندھیاں ریت کے ٹیلوں کو اٹھائے پھرتی ہیں۔ کوسوں تک پانی اور سبزہ نایاب ہے مگر اسی جزیرہ نما کا جنوب مغربی حصہ جو یمن کہلاتا ہے سرسبزی اور زرخیزی میں وادی گنگا کو شرماتا ہے۔ وہاں کوسوں تک ہرے بھرے کھیت لہلہاتے ہیں اور شاداب چراگاہیں دکھائی دیتی ہیں۔ پرانے وقتوں میں یمن کے باشندوں نے آبپاشی کے لئے بارش کا پانی جمع کرنے کے لئے بڑے بڑے بند بنائے تھے سن عیسوی کے آغاز میں ایک بہت بڑا بند سیلاب کی وجہ سے ٹوٹ گیا اور یمن کا سرسبز علاقہ پانی میں ڈوب گیا۔

یمنی قبائل شمال کی طرف چلے گئے اور شام اور عراق میں آباد ہو گئے۔ شام کے مرغزاروں میں ان قبائل نے بنو غسان کے نام سے غیر معمولی شہرت حاصل کی اور عراق میں حیرہ کی سلطنت قائم کر لی حیرہ کا پہلا بادشاہ مالک اسدی تھا۔ وہ اپنے بڑے بیٹے خدیمہ کو تیراندازی کی مشق کرایا کرتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے بیٹے کا تیر باپ کی چھاتی میں لگا۔ اور اس نے دم توڑ دیا۔ باپ کے مرنے پر خدیمہ تخت پر بیٹھا اور اپنی غیر معمولی شجاعت کی وجہ سے اپنی سلطنت کو دور دور تک پھیلا دیا۔ خدیمہ بڑا مغرور تھا کسی کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتا تھا اور نہ کسی کو اپنا ندیم بناتا تھا۔ وہ کٹر بت پرست تھا۔ سونے کے دو بت ہر وقت اس کے پاس موجود رہتے تھے۔ حیرہ سے مغرب کی جانب بنی لخم آباد تھے۔ ان کے سردار کا نام نصر بن ربیعہ تھا اس کا ایک خوبصورت اور ذہین بیٹا تھا جو عدی کہلاتا تھا۔ خدیمہ نے عدی کے حسن کی شہرت سنی اور اسے حکماً بلا بھیجا۔ نصر نے انکار کیا۔ خدیمہ آگ بگولا ہو گیا۔ ایک جرار لشکر جمع کیا اور بنی لخم پر حملہ کر دیا۔

خدیمہ کے دونوں بتوں کو زریں لباس پہنا کر گھوڑوں پر سوار کیا گیا۔ جب فوج بنی لخم کی سرحد میں داخل ہوئی تو خدیمہ نے لشکریوں کو آرام کرنے کا حکم دیا۔ بتوں کو ایک خوبصورت خیمہ میں رکھا گیا اور مضبوط پہرہ لگا دیا گیا۔ نصر نے چند چالاک آدمیوں کو حریف کے لشکر میں بھیجا۔

وہ بتوں کے محافظوں کے پاس گئے۔ انھیں کثرت سے شراب پلا کر مدہوش کر دیا اور دونوں بت اٹھا لائے۔ صبح خدیمہ حسب معمول پوجا کرنے کے لئے بتوں کے خیمہ میں گیا اور انھیں موجود نہ پا کر سخت گھبرایا تھوڑی دیر کے بعد نصر کا قاصد پیغام لایا کہ تمھارے دیوتا ناراض ہو کر ہمارے پاس چلے آئے ہیں اور تمھیں تباہ و برباد کر دیں گے۔

یہ سن کر خدیمہ سخت گھبرایا۔ اور لڑائی کا ارادہ ترک کر دیا دونوں بادشاہوں میں دوستانہ ملاقات ہوئی۔ بات چیت کے دوران میں خدیمہ کو اپنا مقصد حاصل ہو گیا۔ اور نصر نے اپنے بیٹے عدی کو اس کے ہمراہ بھیجنا منظور کر لیا۔ عدی خدیمہ کے ہمراہ حیرہ میں رہنے لگا۔ دربار شاہی میں اس کی بڑی توقیر تھی۔ خدیمہ کی نوجوان بہن زہرہ عدی کو چاہنے لگی۔

ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں رات کے وقت عدی اپنے مکان کی چھت پر لیٹا ہوا تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ تھوڑی دور دریائے فرات دھیمے سروں میں گیت گاتا ہوا بہہ رہا تھا ہوا میں پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ عدی اپنے بستر میں لیٹا ہوا چاند کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے سینہ میں دردِ عشق کی کسک محسوس کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی سے پیار کی باتیں کرے اور اپنی ہستی محبت کی قربان گاہ پر نذر کر دے۔ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ حرم سرا کی ایک لونڈی وہاں آئی اور اسے اپنے ہمراہ شاہی باغ میں لے گئی۔ وہاں حوض کے قریب رنگین اور شاداب پھولوں کے تختہ میں اس نے ایک حسینہ دیکھی جس کا حسن چاند تاروں کو شرماتا تھا۔ اس کی لانبی لانبی سیاہ زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں دنیا بھر کے میخانوں کی کیفیت آباد تھی۔ وہ جوانی کے نشہ میں چور اس کی جانب بڑھی اور اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا عدی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ روح آنکھوں میں کھنچ آئی اور قوت گویائی سلب ہو گئی۔

"میں خدیمہ کی بہن زہرہ ہوں" اس حسینہ نے کہا۔

عدی نے حسن و شباب کے اس رنگین مجسمے کو ایک نظر دیکھا تو خاموش کھڑا رہا۔

"خاموش کیوں ہو؟" زہرہ نے مسکرا کر دریافت کیا مگر عدی پر رعب حسن غالب تھا اس لئے اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"بادشاہ تم سے محبت کرتا ہے۔ اس وقت وہ شراب پینے میں مصروف ہے تم سیدھے اس کے پاس جاؤ۔ جب وہ نشے میں چور ہو جائے تو اس سے میرے متعلق درخواست کرنا۔"

عدی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں زہرہ کا شکریہ ادا کیا۔ ایک شاندار مستقبل اس کے سامنے لہرا رہا تھا۔ وہ عیش و مسرت کی ہوا میں سانس لے رہا تھا۔ اور خبث کی بہاریں اس کے حواس پر چھا چکی تھیں۔

عدی حسب ہدایت خدیمہ کی محفل میں گیا۔ وہاں ایک کمسن حسینہ بادشاہ کو مئے گلرنگ کے جام پلا رہی تھی۔ جب خدیمہ نشہ میں چور ہو گیا تو عدی نے زہرہ کے لئے درخواست کی۔ بادشاہ نے منظور کر لی اور اسی وقت عدی اور زہرہ کا نکاح ہو گیا۔

دوسرے دن صبح جب خدیمہ نے عدی کو عروسی لباس پہنے ہوئے دیکھا تو سخت حیران ہو گیا۔ سبب پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ کل رات آپ نے اپنی بہن کا نکاح مجھ سے کیا تھا۔ خدیمہ سمجھ گیا کہ عدی نے اسے دھوکا دیا ہے اور اسے قتل کرانے کا ارادہ کیا۔ عدی وہاں سے بھاگ کر اپنی قوم میں چلا گیا اور چند روز کے بعد کسی جھگڑے میں مارا گیا۔

زہرہ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عمرو بن عدی رکھا گیا۔ خدیمہ نے اسے بڑی محبت سے پالا۔ جب وہ بڑا ہوا تو ایک روز جنگل میں اتفاقاً راستہ بھول گیا۔ مدتوں دیوانوں کی طرح ادھر ادھر بھٹکتا پھرا۔ اتفاق سے جنگل میں ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ عمرو وہاں پہنچا۔ اس جھونپڑی میں دو لکڑہارے رہتے تھے۔ ایک کا نام عقیل تھا اور دوسرے کا نام مالک تھا۔ انھوں نے عمرو کو کھانا کھلایا اور رات اپنے پاس رکھا۔ خدیمہ عمرو کی غیر حاضری کی وجہ سے سخت بےچین تھا۔ شاہی سوار چاروں طرف اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ دوسرے دن مالک اور عقیل عمرو کو لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خدیمہ بڑا خوش ہوا لکڑہاروں کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ اور ان دونوں کو بادشاہ کا مصاحب بننے کا فخر حاصل ہوا۔

عمرو بن عدی شجاعان عرب میں بہت ممتاز تھا۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ آزادی اور عزت کا راستہ تلوار کی دھار پر سے گزرتا ہے اس لئے اس نے لڑائی کے فن میں بڑی مہارت حاصل کی اور اپنی ایک ذاتی فوج مرتب کی جس کی دلاوری کا شہرہ اطراف و جوانب کے تمام علاقوں میں پھیل گیا۔

موصل کے علاقہ میں عمرو بن طرب کی حکومت تھی۔ ایک بار اس نے حیرہ پر حملہ کیا اور خدیمہ کو مقابلے کے لئے للکارا۔ بوڑھا تاجدار تلوار تول کر بڑھا اور حریف کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

عمرو بن طرب اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ اس کی دو جوان کنواری بیٹیاں تھیں جن میں سے ایک کا نام زبا تھا اور دوسری زینب کہلاتی تھیں۔ زبا نے باپ کے مرنے پر حکومت سنبھال لی۔ اور باپ کی موت کا بدلہ لینے کی تدبیریں سوچنے لگی۔ وہ بڑی دلیر اور شجاع عورت تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ فوج لے کر حریف کے علاقہ پر چڑھ جائے اور دشمن کو اپنی تلوار کے جوہر دکھائے لیکن زینب نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ بہن کو نشیب و فراز سمجھا کر مکر و فریب سے کام نکالنے پر آمادہ کیا۔ اس کے مشورہ سے زبا نے خدیمہ کو نکاح کا پیغام دیا اور کہلا بھیجا کہ میں عورت ذات ہوں مجھے ڈر ہے کہ پڑوس کے سردار میرے علاقے پر قبضہ نہ کر لیں۔ اگر آپ مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمائیں تو میری طاقت بڑھ جائے گی اور دشمن کو میرے علاقہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو گی۔ آپ تشریف لائیں اور مجھ سے شادی کر لیں۔

خدیمہ بقاع کے قلعہ میں تھا۔ زبا کا قاصد وہاں آیا اور اس نے فوراً پیغام قبول کر لیا۔ مصاحبوں نے بہتیرا روکا مگر اس پر شادی کا جن سوار تھا۔ وہ اپنے ایک معتبر سردار قصیر کو ہمراہ لے کر موصل کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب دلہن کی بستی کے قریب پہنچا تو چاروں طرف فوج کے دل بادل دکھائی دیئے۔ قصیر نے بادشاہ کو وہاں سے واپس جانے کی صلاح دی مگر وہ نہ مانا۔ تھوڑی دیر میں فوج نے انھیں گھیر لیا۔ قصیر جان بچا کر بھاگ گیا مگر خدیمہ گرفتار ہو گیا۔ اور سپاہی اسے پکڑ کر زبا کے روبرو لے گئے۔

وہ شیر دل عورت بڑی شان سے دربار میں بیٹھی ہوئی تھی دور تک سپاہی نیزے لئے کھڑے تھے اور ان کی برچھیوں کے پھل دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔

زبا نے خدیمہ کو حقارت سے مسکرا کر دیکھا اور کہنے لگی۔ "میں نے اس لئے آپ کو تکلیف دی ہے کہ آسانی سے اپنے باپ کا بدلہ لے سکوں۔ آپ یہاں بیٹھ جایئے۔ آپ کے خون کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں ہو گا۔"

خدیجہ کو پکڑ کر بڑی بیدردی سے اس کا خون ایک برتن میں نچوڑا گیا اور اس میں روئی بھگو کر اور سکھا کر رکھ دی گئی۔ اس کے بعد زبار نے دریائے فرات کے دونوں کناروں پر دو محل بنوائے اور دریا کے نیچے سرنگ کھود کر دونوں کو ملا دیا ایک محل میں زبار رہتی تھی اور دوسرے میں زینب۔ سرنگ کے رستے وہ ایک دوسرے کے یہاں آتی جاتی تھیں۔ اور وہ سرنگ اس لئے کھودی گئی تھی کہ مصیبت کے وقت زبار دشمن کی آنکھوں میں خاک جھونک کر صاف نکل جائے۔

خدیجہ کا ساتھی قصیر بڑی مشکل سے جان بچا کر حیرہ پہنچا وہاں امرا نے عمرو بن عدی کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس نے خدیجہ کا بدلہ لینے کی قسم کھائی اور بہت بڑی فوج جمع کی مگر قصیر نے لشکر کشی کی تجویز کی مخالفت کی۔ وہ زبا کے ہاتھ دیکھ چکا تھا اور فریب کا جواب فریب سے دینا چاہتا تھا۔

جب کچھ عرصہ گزر گیا اور خدیجہ کا قتل ایک بھولی بسری کہانی بن گیا تو قصیر نے اپنے تاجدار کا بدلہ لینے کا ارادہ کیا۔ اس نے اپنی ناک کاٹ ڈالی اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے اسی حالت میں زبا کے پاس چلا گیا۔ زبار بڑی چالاک تھی مگر قصیر نے عمرو بن عادی کے مظالم کی فرضی کہانیاں سنا کر اس کے دل میں گھر کر لیا اور اس کے ہاں رہنے لگا۔ کچھ عرصہ کے بعد زبار کو اس پر پورا بھروسہ ہو گیا۔ ایک دن قصیر نے اس سے تھوڑا سا روپیہ مانگا اور سامان تجارت درست کر کے وہاں سے شام کی طرف چل دیا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے حیرہ کا رخ کیا اور عمرو سے بہت سا روپیہ لے کر زبار کے پاس واپس چلا گیا۔ قصیر نے چند بار ایسا کیا اور زبار اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

ایک دن قصیر نے زبار سے کہا "میں بادشاہوں کے درباروں میں رہا ہوں ہر ایک تاجدار مصیبت کے وقت اپنی جان بچانے کے لئے مناسب انتظام کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے لئے ایک محل تیار کروں جہاں آپ مصیبت کے وقت پناہ لے سکیں۔"

زبار دھوکے میں آ گئی اور قصیر کو محل میں لیجا کر وہ سرنگ دکھلائی جو دریائے فرات کے نیچے سے گزرتی ہوئی زینب کے محل میں ختم ہوتی تھی۔ قصیر وہ سرنگ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور زبار کی ذہانت کی دل کھول کر داد دی۔

کچھ عرصہ کے بعد قصیر حسب معمول بیوپار کے لئے چلا گیا۔ حیرہ پہنچ کر اس نے ایک ہزار جوان ہمراہ لیا اور عمرو بن عدی نے اس کے ملازم کا سوانگ بھرا۔ موصل کے قریب پہنچ کر قصیر نے لشکریوں کو بوریوں میں بند کر کے اونٹوں پر بٹھا دیا اور شام کے قریب قافلہ زبا کے محل کے نزدیک پہنچ گیا۔ زبار نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا شام کے دھندلکے میں اونٹوں کی لمبی قطار دیکھ کر اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں تھوڑی دیر میں قصیر سلام کے لئے حاضر ہوا اور کثیر منافع کی خوشخبری سنائی۔

رات کے سناٹے میں عمرو نے پانسو سپاہی ہمراہ لیکر زینب کا محل گھیر لیا اور باقی سپاہیوں نے قصیر کی ہدایت کے مطابق زبار کے محل پر حملہ کر دیا۔ زبار شور سن کر سرنگ کے رستہ زینب کے محل کی طرف دوڑی مگر وہاں دشمن کو محاصرہ کئے ہوئے پایا۔ الٹے پاؤں اپنے محل کی طرف بھاگی مگر اتنے عرصہ میں قصیر اور اس کے سپاہی پھاٹک توڑ کر محل میں گھس آئے تھے۔ زبار دشمن کے پھندے میں گرفتار ہو چکی تھی۔ قصیر کے لشکری کامیابی کے جوش میں سیلاب کی طرح بڑھے چلے آتے تھے۔ اگر زبار معمولی عورت ہوتی تو ہمت ہار دیتی مگر اس نے اس حالت میں بھی اپنے اوسان قائم رکھے اور انگوٹھی میں سے ہیرا نکال کر چاٹ لیا۔ ہنسی خوشی جان دے دی مگر دشمن کی اطاعت قبول نہ کی۔

نوائے بیدار

خموشی بھی لبِ فریاد بن کر بول سکتی ہے

از پروفیسر کرپال سنگھ بیدار ایم-اے

وہی محرم نظر رازِ گلستاں کھول سکتی ہے
جو گل کو خار کے کانٹے میں رکھ کر تول سکتی ہے

اگر گلچیں چمن میں لب کشائی کی اجازت دے
تو بلبل کی طرح کمسن کلی بھی بول سکتی ہے

نگاہِ عرش پیما روندتی پھرتی ہے تاروں کو
اگر چاہے تو یہ انمول موتی رول سکتی ہے

وہ آگاہی عطا کی ہے کسی کی مست نظروں نے
جو توبہ کو شرابِ ارغواں میں گھول سکتی ہے

یہ فرمانِ زباں بندی بجا، بالکل بجا، لیکن
خموشی بھی لبِ فریاد بن کر بول سکتی ہے

انیس کی شاعری

ادبی مقالہ

از جناب سید شہنشاہ حسین نکہت

یوں تو ہر قوم میں ہزاروں شاعر اور ارباب علم وکمال پیدا ہوتے ہیں اور جس طرح کائنات کی ہر چیز اپنی نمو و نمائش کے ساتھ ساتھ معدوم ہوجاتی ہے اسی طرح ان شاعروں کا وجود بھی نسیاً منسیاً ہوجاتا ہے باینہمہ ہر ملک اور ہر قوم میں ایسے باکمال افراد جن سے جماعت کو فائدہ پہنچتا ہے اور جو کسی علم یا صنعت یا لٹریچر میں کوئی بہترین اضافہ کرتے ہیں دو چار سے زیادہ نہیں ہوتے اور یہی افراد حیاتِ جاوید کے مالک ہوتے ہیں۔

حضرت انیس ہندوستان کے وہ زندۂ جاوید شاعر ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو جو کافی ترقی کر چکی تھی ایک نئی زندگی بخشی اور ایک ایسا ادیبانہ کمال دکھایا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کے کلام میں اکثر ایسی خصوصیات ہیں جن کی ابتدا اُنہی سے ہوئی اور انہی پر ختم ہوگئی۔ مرثیہ کی بنیاد اگرچہ میر انیس سے بہت پہلے پڑ چکی تھی مگر اس دور کے مرثیوں میں نہ رزم کی داستانیں تھیں، نہ بزم کی محفل آرائیاں، نہ مدح کی آرائشیں تھیں، نہ فخر کے گلدستے، نہ الفاظ میں فصاحت تھی نہ مضمون میں سادگی، نہ ادا میں جدت تھی، نہ جملوں کی ترتیب میں خوش اسلوبی، اگر کچھ تھا تو فقط بَین تھا اور وہ بھی تیس پینتیس یا چالیس پچاس بند کا۔ اگرچہ میر ضمیر کے عہد سے مرثیہ میں جدت آرائی شروع ہوئی۔ رزم، بزم اور فخر و مباہات کے نئے نئے مضامین جزو مرثیہ ہونے لگے گویا مرثیہ کا نیا دور شروع ہوا جس سے زبان میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ میر انیس نے جن کو چار پشت سے مداحی اہلبیت کا شرف حاصل تھا لکھنؤ کے اس عہد زریں میں آنکھیں کھولی تھیں جب علم و فضل کا دور دورہ تھا اور اودھ کی حکومت کا آفتاب اپنی پوری تابانی کے ساتھ جگمگا رہا تھا پھلنے پھولنے کے لئے ہر طرح کا سامان میسر تھا۔ آپ نے نہ صرف مرثیہ کو معراج کمال پر پہنچایا بلکہ اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونک دی۔

مرثیہ گویوں کے متعلق تمام شاعروں میں ضرب المثل تھی کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" شاید انیس پہلا شخص ہے جس نے اس مقولہ کو غلط ثابت کر دکھایا نیز شاعری کے بے شمار نئے نئے اسلوب پیدا کئے۔ آج یورپ "زبان زبان" پکارتا ہے اور اس کی خاطر ہزاروں کوششیں ہو رہی ہیں۔ مگر ایک انیس ہے جس نے زبان کو اس سلاست اور روانی کے ساتھ پیش کیا کہ اہل کمال کو مبہوت کر دیا۔ الفاظ میں شائستگی اور خوش سلیقگی اس حد پر پہنچا دی کہ قلم توڑ دیا۔ بحیثیت شاعری میں وہ کمال دکھایا کہ اس سے زیادہ خیال میں نہیں آتا۔ غرض کلام میں جو خوبیاں ہو سکتی ہیں مثلاً فصیح و مانوس الفاظ، سادگی ادا (یعنی جو مضمون ادا کیا ہو بآسانی ذہن نشین ہو جائے) جدتِ ادا، قریب الفہم تشبیہات موزوں استعارات۔ جملوں کی ترکیب، ان تمام ظاہری خوبیوں کے علاوہ معنوی محاسن مثلاً شجاعت، عفت، عدالت، صبر، ایثار نفس وغیرہ، اخلاقی مباحث علم اخلاق کی حیثیت سے اس خوبی سے بیان کئے کہ ع

عالم تمام مطلع انوار ہوگیا

مرثیہ میں جو چالیس پچاس بند تک محدود تھا۔ مضامین کے وہ دریا بہائے کہ اسے چار پانچ سو بند تک وسیع کر دیا مگر افسوس کہ اس باکمال شاعر کا تمام سرمایہ آج ہمارے ہاتھوں میں نہیں اور جو کچھ ہے وہ منتشر و پریشان۔ اگر انیس کا تمام و کمال کلام سلیقہ سے یکجا کر کے شایع کر دیا جائے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ فردوسی، ملٹن اور شکسپیر کے کارناموں سے زیادہ معرکہ آرا ثابت ہو۔ آج میں اس شاعر بے بدل کے مختصر سوانح حیات اور کچھ کلام کا نمونہ ناظرین عالمگیر کے لئے پیش کرتا ہوں ایسے ماہر فن کی زندگی پر غور کرنا اور اس کے افکار سے مستفیض ہونا بہترین نعمت ہے۔

انیس کا خاندان

انیس کا خاندان سید سندی تھا۔ شاعری خاندانی میراث چلی آتی تھی۔ ان کے اجداد میر امامی موسوی شاہجہاں کے عہد میں ہرات سے دلی آئے۔ فاضل متبحر اور بمثل فقیہہ تھے۔ شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے تھے

بادشاہ کی شرفا پروری سے سہ ہزاری منصب پایا اور اسی ملک میں آباد ہوگئے۔ چار پشتوں تک یہ خاندان دلی میں معزز و ممتاز رہا۔ جب سلطنت مغلیہ کا آفتاب لب بام آیا۔ شرفا پروری اور سخن کی حکومت کی قدر دانی کا کال پڑا۔ میر امامی کے پرپوتے غلام حسین ضاحک جو مرزا رفیع سودا کے ہمعصر، نہایت خوش طبع، زندہ دل اور خندہ جبین تھے۔ حوادث روزگار سے ترک وطن پر مجبور ہوئے تو اپنے خلف الرشید میر حسن کو ساتھ لے کر جن کی عمر اس وقت صرف بارہ سال کی تھی نواب وزیر اودھ کے سایۂ عاطفت میں فیض آباد پہنچے۔ شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ کی محل خاص اُمت الزہرا بیگم نے اس وقت فیض آباد کو دلی کا ایک محلہ بنا رکھا تھا ان کی فیاضی اور سیر چشمی ضرب المثل تھی۔ دلی کا ادنیٰ و اعلیٰ جو آ جاتا اس کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتی تھیں۔ آوارہ وطن معززات کی خاطر مدارات او تعظیم و تکریم ہوئی اور یہ خانوادہ فضل و کمال فیض آباد میں آباد ہوگیا۔

شجاع الدولہ کی وفات کے بعد نواب آصف الدولہ مسند نشین ہوئے ان کا فیض آباد میں دل نہ لگا۔ اپنی ماں کی روک ٹوک سے گھبرا کر شکار کے بہانے فیض آباد سے لکھنؤ آگئے اور یہیں محلسرائیں، باغات اور بازار تیار کرا کے رہ پڑے۔ جب مرکز حکومت لکھنؤ مقرر ہوا تو تعلقات شاہی کی وجہ سے میر ضاحک اور میر حسن کی آمد و رفت لکھنؤ میں جاری ہوئی اور مثنوی سحر البیان کا فخر روزگار مصنف اسی زمین کا پیوند ہوا، استاد وقت حضرت مصحفی نے "شاعر شیریں زبان" مادۂ تاریخ وفات نکالا۔

نواب سعادت علی خاں کے عہد حکومت میں شہر فیض آباد محلہ گلاب باڑی میں ۱۲۱۶ھ میں انیس کی ولادت ہوئی۔ اس زمانہ میں میر خلیق عشرت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ صاحبزادہ کے پیدا ہوتے ہی کاشانۂ سیادت روشن ہوگیا۔ صورت کا رعب داب دیکھ کر ببر علی نام رکھا۔ فیض آباد میں ایک دفتر "محاورات و اصطلاحات و ضرب الامثال اردو" کی تدوین کا قائم تھا۔ میر حسن مرحوم اس دفتر کے میر منشی رہ چکے تھے اب پھر یہ خدمت میر خلیق کے سپرد ہوئی۔ جب کوئی جدید محاورہ محلات سے ترش کر نکلتا دفتر میں قلمبند ہوتا۔ جس گھرانے میں اس کی تحقیق و تدقیق ہوتی تھی اسی میں اس مولود مسعود نے آنکھیں کھولیں۔ خورشید کمال اپنے انتہائی عروج کے وقت بھی اس نعمت خداوندی پر فخر کرتا تھا اور جب ان کی محاورہ بندی یا روزمرہ پر کوئی معترض ہوتا تو فرماتے کہ "یہ میرے گھر کی زبان ہے حضرات لکھنؤ یوں نہیں بولتے۔"

تعلیم و تربیت

والد بزرگوار کا دفتر ادب سے تعلق تھا۔ والدہ محترمہ بھی اتنی فارسی جانتی تھیں کہ فارسی کی کتابیں پڑھ لیتیں اور پڑھا دیتی تھیں۔ نکتہ رس بیگمات اور بذلہ سنج خواتین کی گھر میں آمد و رفت تھی انہی کے آغوش میں میر صاحب نے پرورش پائی جب سن شریف چار سال سے متجاوز ہوا شفیق باپ نے مکتب میں بٹھایا۔ درسیات کی ابتدائی کتابیں مولوی میر نجف علی مرحوم سے پڑھیں جو اس وقت فیض آباد میں فاضل متعین تھے۔ عربی کی تکمیل لکھنؤ میں علامہ عصر مولوی حیدر علی صاحب مرحوم سے کی۔ اہل لکھنؤ نے میر انیس کو طبقہ علما میں کبھی شمار نہیں کیا لیکن ان کا علمی تجربہ اور وسعت نظر سب کو تسلیم تھی۔ کہتے ہیں ایک روز کوئی صاحب صدرہ کی ایک عبارت پر بحث کر رہے تھے۔ میر صاحب نے اپنے حسن بیان سے اس مسئلہ کو بغیر کتاب دیکھے اس خوبی سے حل کر دیا کہ سب سن کر دنگ رہ گئے یہ بھی مشہور تھا کہ میر صاحب کو نسبت منقولات کے معقولات سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ان کے مختصر کتب خانے میں ہر علم و فن کی ضروری کتابیں جمع رہتی تھیں۔ اس وقت تک ہندوستان میں شجاعت و مردانگی کی بو باقی تھی۔ شریف زادے شہسواری، سیف زنی اور نیزہ بازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ انیس نے بھی امیر زادگان فیض آباد کے ساتھ اس ضروری فن کی مشق کی اور پھر لکھنؤ آکر اپنے پڑوسی میر کاظم علی سفید پوش کے بیٹے میر امیر علی سے جو پنے۔ بانک۔ بنوٹ کے استاد تھے علی مد، لکڑی کا کھانڈا اور بانک بنوٹ کی گھاتیاں سیکھیں۔ ان کے استاد کا قول تھا کہ "میر انیس کے ہاتھ میں ایک گز لمبے کے رومال میں مدشاہی پیسہ بندھا ہوتا تو وہ دس لکڑی پھینکنے والوں سے بھی چوٹ نہیں کھا سکتے تھے۔ ان کی ضرب کو بنوٹ جاننے والوں کے سوا کوئی روک نہ سکتا تھا۔" یہ تعلیم آگے چل کر خدائے سخن کے بہت کام آئی۔ میدان جنگ کی تصویر کشی میں مبارزوں کے فنون حرب و ضرب، ایک دوسرے کے داؤں پیچ نیزہ بازی کی گھاتیں جو آج ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے اسی مشق کے سلسلے میں حاصل ہوئیں۔ اسی زمانہ میں ورزش بھی شروع کی تھی۔ پچاس ساٹھ ڈنڑ فرش پر کرتے اور سو دو سو ہاتھ مگدر کے ہلاتے۔

شاعری کا آغاز

شاعروں کے گھر میں جنم لیا۔ بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف

طبیعت مائل تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی عاشقانہ اشعار گنگنانے اور ان سے لطف اٹھانے لگے۔ اردو فارسی کے ہزاروں اشعار یاد تھے اور ایک ایک لفظ کی سند میں بیسوں شعر پڑھ دیا کرتے تھے۔ جمادات، نباتات حیوانات میں محاسن قدرت کا نظارہ بڑی دلچسپی سے کرتے تھے اور اسی لطف اندوزی نے چند سال بعد مناظر قدرت کی تصویر آرائی میں مانی و بہزاد پر فائق کر دیا۔ نواب سید محمد خاں رند جو عمر میں ان سے چار سال بڑے تھے کمسنی سے شعر کہتے اور میر خلیق سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کی مشق انگیز صحبت نے حسن پرستی کی آگ پر ایسا تیل چھڑکا کہ پندرہ سولہ برس کے سن میں دل کا جوش اشعار کی صورت میں ظاہر ہونے لگا۔ سلسلہ تعلیم جاری تھا مشق سخن باپ سے چھپاتے تھے مگر یہ آگ کب تک دبتی؟

علامہ آزاد مرحوم نے آبحیات کے دور پنجم تذکرہ میر انیس میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کہیں مشاعرہ میں گئے اور غزل پڑھی، وہاں بڑی تعریف ہوئی۔ شفیق باپ خبر سن کر باغ باغ ہوا ہونہار فرزند سے پوچھا کل رات کہاں تھے۔ انھوں نے حال بیان کیا۔ غزل سنی اور فرمایا کہ اب اس غزل کو سلام کرو اور اس شغل میں زور طبع صرف کرو جو دین و دنیا کا سرمایہ ہے۔ سعادت مند بیٹے نے اس نصیحت پر عمل کیا۔ دنیا کو چھوڑ کر دین کے دائرہ میں آگیا اور تمام عمر اسی رنگ میں صرف کر دی۔ یہ اشعار اسی عہد کے کلام کا نمونہ ہیں۔

ہوا ہے، ابر ہے، ساقی ہے، مے ہے گر تو ہی نہیں افسوس ہے ہے

لکھ کر زمیں پہ نام ہمارا مٹا دیا
ان کا تو کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

میر انیس جب لکھنؤ میں تشریف لائے تو ان کا تخلص "حزیں" تھا ایک روز میر انیس اپنے والد ماجد کے ساتھ شیخ ناسخ مرحوم کی خدمت میں حاضر تھے۔ شعر و شاعری کی صحبت گرم تھی۔ شیخ صاحب نے میر صاحب سے فرمایا کہ میاں صاحبزادے کچھ اپنا کلام پڑھو۔ میر صاحب نے اپنے والد کے اصرار سے یہ مطلع پڑھا۔ ؎

کھلا باعث یہ اس بیدرد کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

شیخ صاحب جھومنے لگے اور میر خلیق سے فرمایا کہ یہ فرزند رشید آپ کے یادگار خاندان ہوں گے اور یاد رکھئے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ان کی زبان اور ان کی شاعری کی عالمگیر شہرت ہو گی۔ کیونکہ عنفوان شباب میں ان کی ترقی پسند طبیعت اپنی یہ چھبنیاں دکھا رہی ہے مگر بجائے حزیں ان کا تخلص کچھ اور ہو تو بہتر ہے۔ میر خلیق نے فرمایا پھر آپ ہی ان کے لئے کوئی تخلص تجویز فرمائیے شیخ صاحب نے تھوڑی دیر سکوت کیا پھر فرمایا کہ مجھے تو "انیس" پیارا معلوم ہوتا ہے۔ حزیں نے بکمال ادب سلام کیا اور اسی روز سے انیس ہو گئے۔ کیا مبارک زمانہ تھا کہ جب یہ ہر دلعزیز تخلص ایک عالی نسب سید زادہ کے نام سے مل کر ایسا چمکا کہ آج تک اس کی روشنی ملک کے ہر گوشہ میں ضیا باری کر رہی ہے اور اس قیافہ شناس بڈھے کی پیشین گوئی سچی ہو گئی۔

زوجہ میر ضمیر مرحوم کی مجلس چہلم میں میر انیس مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ رؤسا کے علاوہ شعرائے باکمال کا بھی مجمع تھا۔ خواجہ آتش مرحوم بھی موجود تھے میر صاحب وہ مرثیہ پڑھ رہے تھے جس کا مطلع ہے ؎

آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی
ڈیوڑھی سے چل چکی ہے سواری دلیر کی

تلوار کی تعریف میں جب اس بیت کی نوبت آئی ؎

اشراف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

تو خواجہ آتش مرحوم کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس بیت کی داد آپ سے چاہتا ہوں۔ خواجہ کی آزادی اور شوریدہ مزاجی مشہور ہے پہلے سے جھوم رہے تھے۔ یہ بیت سن کر نصف قد کھڑے ہو گئے اور بآواز بلند کہا ــــ "کون بیوقوف کہتا ہے کہ تم محض مرثیہ گو ہو واللہ تم شاعر گر ہو اور شاعری کا مقدس تاج تمھارے سر کے لئے موزوں ہے خدا مبارک کرے"۔

میر انیس کا مذہب

دنیا کی جانب سے وہ رُخ پھیرے ہوئے تھے اگرچہ کثیر العیالی اور دنیاداری کے اعتبار سے اس کی سخت ضرورت تھی مگر غیور تھے اور صاحب ہمت، گرانباری احسان کے متحمل نہ تھے۔ بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ اگر وہ اغنیا کے منت پذیر احسان و ایثار نہ تھے تو ایحتاج کا باب آمدنی کیا تھا؟ اس سے یہ مقصد نہیں ہے کہ انھوں نے ائمہ و اولیا کی طرح فقر و قناعت میں زندگی بسر کی۔ البتہ دولتمندوں کے خزانوں پر حریصانہ نظر نہیں ڈالی۔ چند مخصوص لوگ ایسے تھے جو ان کے ساتھ سلوک و مراعات میں فخر دنیوی و

معاد آخرت سمجھتے تھے اس لئے طبع کا شرمناک لفظ ان کی کتاب قناعت میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔ وہ شعار طبیعت کی جانب سلام کے ایک شعر میں یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

کریم جو تجھے دینا ہو بے طلب دیدے
فقیر ہوں پہ نہیں عادت سوال مجھے

وہ شیعہ مذہب کے فرد تھے مگر ان کی تصنیفات تعصبات مذہبی سے بالکل خالی ہیں۔ ان کا کوئی خیال کسی کے لئے دل شکن نہیں تھا۔ یہاں تک کہ سنی اور شیعہ مذہب کے مابہ النزاع مسائل سے بھی مرثیوں میں بحث نہیں کی گئی ہے۔ ان کا مرثیہ اہل اسلام کے ہر فرقے کے لوگ بیحد اشتیاق سے پڑھتے ہیں اور پڑھ سکتے ہیں اور ہر مذہب کی انجمنوں میں پیش کرنے کے قابل ہے۔ مذہب کے پکے علما تو ان کے عقائد مذہب کے متعلق روشن رائے دے چکے ہیں لیکن معقولات سے بحث کرنے والے فلسفی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ وہ پکے دیندار تھے، ابن رشد کا قول ہے کہ "فلاسفہ کے خیال میں سچا اور خالص مذہب وہی ہے کہ انسان موجودات عالم پر غور کرے اور ان کی معرفت میں باریک بینی سے کام لے"۔ ظاہر ہے کہ میر انیس کا خیال ہمیشہ مناظر قدرت و روحانیت و معرفت حقائق کے گرد طواف کرتا تھا اور تزکیہ نفس سے انھوں نے موجودات عالم میں اس طاقت کو مان لیا جو خاموشی سے اپنا کام کر رہی ہے۔ یہی خیال نفس انسانی کی تکمیل کا باعث ہے اور اسی کو مذہب سمجھنا چاہئے۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ دہن سے ایک مذہب کے پیشوا بنا کر بھیجے گئے تھے اس دنیا میں آکر انھوں نے کوئی نیا مذہب اختیار نہیں کیا۔

تحریر و تقریر

میر انیس اگرچہ عربی فارسی کے فارغ التحصیل تھے لیکن ان کی علمی استعداد کی بابت لوگوں کے مختلف خیالات ہیں جن کا فیصلہ خود ان کی زندگی ہی میں نہ ہو سکا۔ وجہ یہ ہے کہ مرثیہ گوئی سے انھیں اظہار علم و فضل مقصود نہ تھا۔ ان کی نظم فصاحت کے آبحیات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بے محل لفاظی اور بے موقع شوکت الفاظ سے احتراز تھا ان کی تحریر و تقریر دونوں میں متانت تھی۔ تحریر میں ان کا طرز شاعری سہل ممتنع واقع ہوا تھا اور تقریر میں وہ مباحثہ اور مناظرہ کو معیوب جانتے تھے۔ وہ خاموش تھے۔ اپنی زبان سے اپنی تعریف کے قصد سے فصاحت و بلاغت سے پڑھنا پسند نہیں کرتے تھے شاعرانہ مضامین کے پیرایہ میں جوہر ذاتی کے اظہار پر فخر و مباہات کرتے تھے۔ شائستگی مزاج اور درستی تہذیب کی وجہ سے وہ اپنی زبان سے کم اور قلم سے زیادہ کام لیتے تھے۔

درحقیقت اہل کمال کی خاموشی میں تحقیق و معلومات کے ہزارہا راز پوشیدہ ہوتے ہیں نسیم سحر کی سبک رفتاری شاداب باغوں کی کلیاں کھلاتی ہے اور باد صرصر کے تند و تیز جھونکے انہی پھولوں کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔ جن متانت پسند دماغوں سے حسب ضرورت مختصر فقرے نکلے ہیں وہ اصول کے کانٹے میں تلے ہوئے اور قانون کی پرکھ سے بنے ہوئے ہیں۔ انسان ناطق ہے مگر نطق کی یہ تعریف نہیں کہ قوت ناطقہ کے ہیجان سے زبان سا نازک عضو جسے خدا نے بھی بہ مصلحت دہن کے خزانہ میں محفوظ رکھا بلا ضرورت تکلیف پہنچائی جائے۔ جس طرح جوہر دار تلوار ضرورت کے وقت نیام سے نکلتی ہے اسی طرح جوہر دار زبان حسن بیان کے لئے پہلو بدلتی ہے اہل علم کی خاموشی بلند خیالی کی علامت ہے۔ "خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید"۔ مغربی اہل قلم نے اس لفظ کی تعریف میں علم کے دریا بہائے ہیں۔ ڈورے لندن کا ایک آرٹسٹ تھا اس نے یہاں تک خاموشی اختیار کی تھی کہ بات کا جواب تصویر سے دیتا تھا جو سائل کے لئے جواب کا کام دیتی تھی۔ اس لئے میر انیس کے خیالات شاعری منتشر ہوئے اور محفوظ رہے۔ وقتاً فوقتاً بیش بہا جواہر بن کر کان دہن سے نکلے جسے اہل علم نے اپنے کان کا گوشوارہ بنالیا واقعات عالم، مظاہر قدرت، مناظر حقیقت اور خصائص انسانی کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کرنے کے لئے میر انیس کا معجز نگار قلم فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتا ہے۔ مغرب کے اہل قلم اور یورپ کے ناولسٹ جن کی تصنیفات اس وقت نیچرل فلاسفی کا ذخیرہ مانی جاتی ہیں اور ہندوستان کے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اس تخیل کو اپنے وظیفوں میں داخل کر لیا ہے وہ حیرت انگیز نظروں سے دیکھیں گے کہ ہندوستان کا مقدس شاعر کیسی کیسی موشگافیاں کرتا ہے۔

صبح کا مغربی تصور

ناظرین کی دلچسپی کے لئے ایک ہی قسم کے مضامین پر مغربی اور مشرقی شعرا کا کلام (حیات انیس مصنفہ مولانا اشہری لکھنوی) سے نقل کرتا ہوں۔

شکسپیر صبح کا منظر یوں پیش کرتا ہے۔

Lo here the gentle lark weary of rest
From his moist cabinet mounts [illegible]
high
And wakes the morning from whose
silver breast
The sun ariseth in his majesty;
Who doth the world so gloriously behold
The cedar-tops and hills seen burnished
gold.

یعنی وہ دیکھو اب نازک اندام نواکالی آرام کر چکنے کے بعد اپنے نمناک آشیانہ سے نکل کر آسمان پر مصروف پرواز ہو جاتا ہے اور صبح کو بیدار کرتا ہے جس کے سیمیں آغوش سے سورج اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ طلوع ہو کر دنیا پر ایسی فیاضانہ نگاہ ڈالتا ہے کہ درختوں کی چوٹیاں اور پہاڑیاں طلاء احمر کی بنی ہوئی معلوم ہونے لگتی ہیں۔

ملٹن صبح کی دلفریبی کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔

The sun, who, scarce up-risen
Withwheels yet hovering o'er the ocean
brim
Shot parallel to the earth his dewy ray
Discovering in wide land-scape all the
east
Of paradise, and Eden's happy plains.

یعنی آفتاب جو ابھی طلوع نہیں ہوا اور جس کے پہیے ابھی کنار بحر پر منڈلا رہے ہیں اپنی شبنم آلود کرنیں سطح ارض کے متوازی پھیلاتا ہے اور جنت عدن کے دلکش اور خوش سواد میدانوں اور فردوس کے مشرقی مناظر کو نورانی بنا دیتا ہے۔

نیچر صبح کی تصویر یوں دکھاتا ہے۔

See the day begins to break
And light shoots like a streak
Of subtle fire, the wind blows cold
While the morning doth unfold
How the birds begin to rouse
And squirrel from the boughs
Leaps to get him nut and fruit
The early lark that was mute
Carols to the rising day
Many a note and many a lay.

یعنی اب پو پھٹنا شروع ہوئی اور روشنی تیزی سے پھیل رہی ہے ہوائے سرد چل رہی ہے اور صبح کا حسن بڑھتا جا رہا ہے۔ سب چرند پرند بیدار ہو کر اپنی اپنی ضروریات کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور سحر خیز نوا جو ابھی تک خاموش تھا شعر خوانی اور گیت گانا شروع کرتا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ یہ تینوں ٹکڑے انگریزی شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہیں اور فی الحقیقت قابل تعریف ہیں مگر ملٹن کے قاعدہ کلیہ سے ان کو پرکھا جائے تو پہلے میں نازک خیالی ہے۔ عبارت صاف نہیں۔ دوسرے اور تیسرے میں سادگی ہے نازک خیالی کا پتہ نہیں اور مضمون پر غور کیا جائے تو باستثنائے شکسپیر کسی کے طرز بیان میں حلاوت نہیں۔

میر انیس کی منظر نگاری

اب میں ایک مشرقی (میر انیسؒ) کے چند بند صبح کی تعریف میں لکھتا ہوں جو نیچر کی سچی تصویر ہیں جن میں نازک خیالیاں بدرجہ کمال ہیں جن کا اثر بھی آسانی سے زائل نہیں ہو سکتا۔ عبارت نہایت سلیس اور بیان بیحد دلکش ہے ؎

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح — گلزار شب خزاں ہوئی آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زر انجم نثار صبح — سرگرم ذکر حق ہوئے طاعت گزار صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دمبدم — مرغان باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم — سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد — مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سبز و سرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد — یہ خوف تھا کہ دامن گل پر پڑے نہ گرد

ہوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
ٹھنڈی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

تھا جنگ روز قتل شہ آسماں جناب | نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرہ پہ آفتاب
تھی نہر علقمہ بھی خجالت سے آب آب | روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں حباب

پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

رات کے مغربی مناظر

یہ تو صبح کی دلفریب تصویر تھی اب رات کا تماشہ ملاحظہ ہو شیکسپیر رات کا موثر منظر یوں دکھاتا ہے۔

Look, the world's comforter with weary gait,

His day's hot task has ended in the west

The owl, night herald, shrieks, 'tis very late !

Sheep are gone tofold, birds to their nest

And cool-black clouds that shadow heaven's light

Do summon us to part and say good night.

یعنی آفتاب نے جو دنیا کا تسلی دینے والا ہے اپنی روزانہ مسافت تمام کی۔ الو چلا رہا ہے۔ رات زیادہ آ گئی۔ وحوش و طیور اپنی اپنی آرام گاہوں کی طرف رخصت ہوئے اور سیاہ بادل جو آسمانی نور کو چھپائے ہوئے ہیں ہمیں الوداع کہنے کا حکم دیتے ہیں۔

ایڈورڈ ینگ رات کی تاریکی یوں دکھاتا ہے۔

Night, sable goddess! from her above throne

In rayless majesty, now stretches forth

Her leaden sceptor over a slumbering world,

Silence, how dead and darkness how perofound !

Nor no listening ear an object finds;

Creation sleeps.

رات کالی دیوی!! اپنے آبنوس کے تخت پر بڑی عظمت و شوکت کے ساتھ تمام سوتی ہوئی دنیا پر اپنے سیاہ عصائے شاہی کا سایہ ڈالتی ہے۔ کیا سنسان خاموشی ہے اور کیسی گہری تاریکی ہے کہ کسی وقت کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ تمام مخلوق سو رہی ہے۔

غور سے دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ پہلی نظم میں نازک خیالی نہیں اور دوسری میں اس قدر بلند پروازی ہے کہ سادگی حد سے تجاوز ہو گئی۔ لیکن ہمارا مشرقی شاعر یہی سین اس خوبی سے دکھاتا ہے کہ مذکورہ بالا تینوں اوصاف اس میں جمع ہیں۔

انیس کی معجز بیانی

جب رن کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی | پردیس میں سادات پہ آفت عجب آئی
فریاد کناں روح امیر عرب آئی | غل تھا کہ شب قتل شہ تشنہ لب آئی

سادات کو کیا کیا غم جانکاہ دکھائے
رات ایسی مصیبت کی نہ اللہ دکھائے

کاغذ پہ لکھے کیا قلم اس شب کی سیاہی | ہے چار طرف جس کی سیاہی سے تباہی
مرغان ہوا بن میں تپاں بحر میں ماہی | تربت سے نکل آئے تھے محبوب الٰہی

فریاد کا تھا شور رسولان سلف میں!
یثرب میں تزلزل تھا اداسی تھی نجف میں

تھی طرہ شب تار کہ تارے بھی تھے مستور | اک پارہ ہے جس کا شب یلدا شب دیجور
ڈھونڈے کہیں شدید نظر کا تھا نہ مقدور | ہوتا تھا نہ ثابت کوئی نزدیک ہے یا دور

حضرت پہ وہ اس بن میں پہر رات میں گزری
تکلیف سکندر پہ جو ظلمات میں گزری

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں | تھراتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ دہشت سے نہ جانیں کہیں جائیں | روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں

گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

تھا خانۂ غم خیمۂ شاہنشہ والا | آندھی یہ پریشاں تھی کہ دل تھا تہ و بالا
مشعل نہ ٹھہرتی تھی نہ شمعوں کا اجالا | خیمہ بھی اندھیرے میں نظر آتا تھا کالا

خاک اڑتی تھی منہ پہ حرم شیر خدا کے
تھا چین نہ بچھیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

اردو شاعری پر احسانات

"ہسٹری آف اردو لٹریچر" میں مسٹر رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں!

His (Anis) position in Urdu literature

is unique. He supplied the epic element to Urdu literature. Urdu could not be expected to possess an epic of the rank of Homer's Iliads, Virgil's Aeneid, Vyas' Mahabharat, Valmik's Ramayan or Firdausi's Shahnama

یعنی اُردو ادب میں میر صاحب کا رتبہ لاثانی ہے۔ آپ نے اردو ادب میں رزمیہ عنصر داخل کیا۔ اُردو میں اب تک ہومر کی ایلیاڈ، ورجل کی اینیاڈ، ویاس کی مہابھارت، والمیک کی رامائن یا فردوسی کے شاہنامہ جیسی کوئی تصنیف نہ تھی۔ اس کمی کو اُردو لٹریچر میں میر انیس نے پورا کیا۔

مولانا آصفی لکھنوی نے بالکل صحیح فرمایا ہے ؎

اپنی قسمت پہ نہیں نازش اُردو بیجا
کہ ہوا اس میں انیس ایسا سخنور پیدا

میر صاحب نے ہزارہا مرثیے، سلام، قطعات اور رباعیاں لکھی ہیں مگر افسوس ان کا پورا کلام اب تک شایع نہیں ہوا جس قدر چھپ چکا ہے، پانچ جلدوں میں ہے۔ باقی ان کے اعزہ کے پاس محفوظ ہے مشہور ہے کہ انھوں نے ڈھائی لاکھ اشعار کہے تھے جن میں کچھ غزلیں بھی تھیں۔ انیس نے ۲۹ ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں بہتر برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔

علالت کے زمانہ میں مرزا دبیر مرحوم عیادت کے لئے گئے چونکہ خود بھی شاعر تھے اور ایک شاعر کی عیادت کے لئے گئے تھے مزاج پرسی بھی ایک مصرع میں فرمائی کہ ع

کہے میاں انیس طبیعت کیسی ہے

میر صاحب نے بھی ایک ہی مصرع میں جواب دیا کہ ع

پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے

جب فاضل شاعر بستر مرگ پر خدا کے اس آخری حکم کا انتظار کر رہا تھا جس کی تعمیل ملک الموت کے سپرد کی گئی ہے تو اسے دنیا و مافیہا سے کچھ دلچسپی نہ تھی۔ وہ دنیا کو اسی نظر سے دیکھ رہا تھا جس طرح اپنی زندگی میں وہ دیکھ چکا تھا۔ عالم نزع کے وہ آخری شاعرانہ خیالات چند منٹ میں فنا ہو جانے والی قوتوں کی تراوش ہیں اور پھر اس کی موت کی ناگزیر خاموشی نے سخن آفرینی کا خاتمہ کر دیا ناظرین کی عبرت کے لئے مشتے نمونہ از خروارے صرف دو رباعیاں درج ذیل ہیں۔

آخر ہے حیات کوچ کرتا ہوں میں	رخصت اے زندگی کہ مرتا ہوں میں
اللہ سے لو لگی ہوئی ہے میری	اوپر کے دم اس واسطے بھرتا ہوں میں

درد و الم حیات کیونکر گذرے	یہ چند نفس حیات کیونکر گذرے
پیری کی بھی دوپہر ڈھلی شکر انیس	اب دیکھیں لحد کی رات کیونکر گذرے

میر انیس کی تاریخ انتقال اکثر لوگوں نے لکھی ہے، لیکن سب سے زیادہ جس تاریخ کی شہرت ہوئی وہ حضرت افصح الفصحا مرزا سلامت علی دبیر علیہ الرحمہ کی تصنیف ہے، جو میر باقر مرحوم کے امام باڑہ کی مجلس میں پڑھی گئی۔ حالت یہ تھی کہ مرزا صاحب اشعار پڑھتے جاتے تھے اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے جاتے تھے۔ مصرعہ مادہ تاریخ یہ ہے۔ ع طور سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیسؔ

(مستفاد)

ہوتی جاتی ہے

از
جناب یسین
گلشن آبادی

قیامت پر فنا مطرب غم ہوتی جاتی ہے
کہ سازِ دل کی ہر آواز مدغم ہوتی جاتی ہے

تمنا بے نیازِ مہر و عالم ہوتی جاتی ہے
تپش دردِ محبت کی مگر کم ہوتی جاتی ہے

وہ خصت ہو گئے لیکن تپش عالم ہے دل کا
کہ جیسے وسعتِ دنیائے دل کم ہوتی جاتی ہے

غزل مسلسل

سُنا ہے وہ آنسو بہانے لگے ہیں

از حضرت اختر بریلوی بی۔اے

بلانے کے فرمان آنے لگے ہیں
قدم پھر مرے ڈگمگانے لگے ہیں

"چلے آیئے"۔ "اب نہیں آؤنگا میں"
یہ پیغام اب آنے جانے لگے ہیں

تقاضا ہے، سوگند ہے، منتیں ہیں
خفا ہونے والے منانے لگے ہیں

پہنچتے ہیں ہر روز قاصد پہ قاصد
مرا صبر لوگ آزمانے لگے ہیں

انھیں شاید اس کا یقیں آچلا ہے
کہ ہم ان کو دل سے بھلانے لگے ہیں

کچھ اتنا تو دل پر اثر ہو چکا ہے
کہ پچھلے مزے یاد آنے لگے ہیں

گزشتہ مسرّت کے رنگین لمحے!
نگاہوں میں پھر مسکرانے لگے ہیں

جنھیں آج تک میں نے غمگیں نہ دیکھا
سُنا ہے وہ آنسو بہانے لگے ہیں

ترے گھر کی اب راہ تک چھوڑ دی ہر
ہم اس درجہ آنکھیں چرانے لگے ہیں

قسم ہے تری مضطرب زندگی کی
ہم اپنی بھی راتیں گنوانے لگے ہیں

تری بدگمانی غلط ہے کہ اب تک
بھلایا نہیں ہے بھلانے لگے ہیں

غرض یہ کہ جو عہد ہم نے کیا تھا
اُسے جاودانی بنانے لگے ہیں

شاہی حرم سرائیں

قطوشہ ایک سترہ سالہ حسین و جمیل جارجیوی دوشیزہ تھی اس کے حسن میں وہ تمام رعنائیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جو فطرت کسی کو عطا کرسکتی ہے۔ وہ کشیدہ قامت چھریرے بدن کی نہایت متناسب الاعضا لڑکی تھی۔ گندم گوں رنگ، لانبے لانبے سیاہ بال، بیضوی چہرہ، بڑی بڑی مست غزالیں آنکھیں۔ لمبی لمبی گھنی پلکیں، مہتاب کی طرح روشن پیشانی، آریائی طرز کی بلند اور ستواں ناک، گلاب کی نازک و نوخیز پتیوں کی طرح پتلے پتلے گلابی ہونٹ، آتشیں رخسار، گداز مرمریں بانہیں الغرض قطوشہ شباب و رعنائی کا ایک نادر الوجود مجسمہ تھی۔ خوبصورتی کے دوش بدوش وہ خوش گلو مغنیہ بھی تھی۔ اس کی آواز میں لوچ تھا، جب وہ کوئی نغمہ چھیڑتی تو روح کے تاروں میں لطیف سی جھنجھناہٹ تڑپ اٹھتی تھی اور فردوس بریں کی تمام لطافتیں عالم رنگ و بو کے ذرہ ذرہ میں سمٹ آتی تھیں۔ اس کی خوش گلوئی اور حسن عالم سوز کی دور دور تک دھوم تھی۔ اس کا باپ ایک غریب کسان تھا مگر اپنی بے مال کی بچی کی نازبرداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا تھا۔

ایک روز وہ تنہا شام کے وقت اپنے باغیچہ میں ثمردار درختوں کی گھنی چھاؤں میں بیٹھی اپنے مستقبل کے خیال میں غرق تھی کہ ناگاہ لٹیروں کا ایک گروہ اس پر جھپٹا۔ پیشتر اس کے کہ اس کی چیخ پکار سن کر کوئی اس کی مدد کو پہنچ سکے لٹیرے اسے لیکر چلتے بنے۔

ایک ہفتہ بعد اس نے اپنے آپ کو ایک اجنبی مقام پر بہت سی حسین و نوخیز دوشیزاؤں کے ہمراہ ایک کیمپ میں نظر بند دیکھا۔ اور اسے معلوم ہوگیا کہ وہ عنقریب لونڈی بنا کر بردہ فروشوں کی کسی مارکیٹ میں فروخت کی جانے والی ہے۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس نے اپنے مستقبل کے حسین و کیف انگیز خواب دیکھے تھے ان شیریں خوابوں کی تعبیر کتنی تلخ ہوگی؟ اسے بھول کر بھی اس کا خیال نہ آیا تھا۔

ان دنوں قفقاز میں بردہ فروشی کا کاروبار بہت ترقی پر تھا، اور لٹیروں کے گروہ کے گروہ نوخیز و خوبصورت لڑکیوں کو زبردستی

تاریخ ترکی کا ایک رومان پرور ورق

از جناب رحمت علی صابر نور محلوی

اغوا کرکے لے آتے تھے اور بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کیا کرتے تھے۔

آخر وہ دن آپہنچا اور اسے ۴۰۰ زر سرخ کے عوض ایک سیہ رو فربہ اندام شخص کے ہاتھ فروخت کردیا گیا جو اسے بحیرۂ زرد کی ایک بندرگاہ کی طرف لے گیا۔

"ہم کہاں جارہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے سے بے بسی اور مایوسی کا اظہار ہورہا تھا۔

"قسطنطنیہ، میرے آقا کے پاس، جن کے لئے میں نے تمہیں خریدا ہے" فربہ اندام شخص نے جواب دیا۔

"آپ کون ہیں؟"

"میں حرم سلطانی کا افسر اعلیٰ ہوں"

"حرم سلطانی!" وہ چونک کر بولی۔ اور اسے اس وقت اس کا یقین آیا جب وہ یلدیز کوشک میں پہنچ گئی اور وہاں سیہ رو اور بدہیئت مسلح حبشی پہرہ داروں اور محل کی بلند و مضبوط چار دیواری نے باہر کی دنیا سے اس کے تعلقات کو منقطع کردیا۔

بہت ہی تھوڑے عرصہ میں قطوشہ حرم سرا کی زندگی سے مانوس ہوگئی وہ شاہی حرم سرا کی ان ڈیڑھ سو دوشیزاؤں میں سے ایک تھی جنہیں سلطان کی تفریح طبع اور جی بہلاوے کی خاطر رکھا گیا تھا۔ انہیں وہاں باہر آنے جانے کے سوا ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔ تزئین جمال اور آرائش حسن کا ہر سامان انہیں میسر تھا۔ وہ ہمیشہ نظر فریب لباس میں ملبوس رہتی اور عطریات کا استعمال کرتی تھیں اپنی فطرت اور جوش رقابت سے مجبور ہوکر بعض اوقات وہ آپس میں دست و گریبان بھی ہوجاتی تھیں اور ابی سینا کے حبشی محافظ جو ہر وقت سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتے نہایت ملائمت سے ان کے درمیان صلح صفائی کرادیتے تھے۔

آخر وہ یادگار دن آیا جب قطوشہ پہلی مرتبہ دوسری دوشیزاؤں کے ہمراہ بارگاہ سلطانی میں پیش ہوئی۔ وہ رقص و سرود کی سالانہ محفل تھی

جو موسم بہار کی آمد آمد پر حرم سلطانی میں منعقد ہوتی تھی۔ کمرۂ رقص کو دلہن کی طرح آراستہ کیا گیا تھا۔ مسند سلطانی کے دائیں بائیں بڑے قرینے سے عمائدین سلطنت اور شاہزادگان عالی مقام کی نشستیں بچھائی گئی تھیں۔ ہر شے بڑے سلیقے سے آراستہ تھی۔ تمام حاضرین مودبانہ بیٹھے افتتاح جشن کا انتظار کر رہے تھے۔ نقیب نے نشائے سلطانی کو طبل کی ہلکی ہلکی تین ضربوں سے ظاہر کیا۔ حرم شاہی کے افسر اعلیٰ نے اشارا پاتے ہی چند حسین وجمیل دوشیزاؤں کو منتخب کر کے گانے اور ناچنے کا حکم دیا۔ انھوں نے حمد وثنا کے بعد رقص کرتے ہوئے بلندی اقبال سلطانی کے ترانے گئے۔ جب وہ اپنے کمال کا مظاہرہ کر چکیں تو قطلوشہ کی باری آئی۔ وہ جھجکتے جھجکتے ایک جادو اثر خرام سے جوتوں میں سحر کے انداز جگاتے ہوئے آگے بڑھی اور شرمگیں انداز میں مجرا بجالائی۔ نقرئی گھنگھروؤں کی آواز سنتے ہی تمام درباری سنبھل کر بیٹھ گئے۔ سلطان بھی پوری توجہ سے نوعمر وحسین مغنیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ قطلوشہ نے نگاہ نیم باز سے گرد وپیش کا جائزہ لیا اور آہستہ آہستہ دھیمے سُروں میں ایک جیارجیوی گیت گانے لگی اس کی آواز اتنی سریلی، لہجہ اتنا دلنشیں اور لَے اتنی دلکش وشیریں تھی کہ تمام حاضرین جھوم اٹھے اور صدائے تحسین وآفریں بلند ہونے لگی۔ وہ نغمہ طرازی میں اس درجہ محو تھی کہ اس پر بیخودی طاری ہو گئی۔ اس عالم بیخودی میں وہ یکایک آگے بڑھی اور والہانہ انداز میں رقص شروع کر دیا۔ ایسا سحر آفریں اور کیف انگیز رقص جو دلوں کو موہ لینے میں بجلی کی طاقت اور آگ کا التہاب رکھتا تھا گیت کے بول احساسات کے آئینہ دار تھے اور آلات موسیقی قدم قدم پر اس کی لَے کا ساتھ دے رہے تھے۔ تمام حاضرین پر ایک کیف سا طاری تھا۔ موی شمعیں ایک والہانہ انداز میں جھوم رہی تھیں ہوائے نرم کے فرحت آفریں جھونکے سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں سے کمرے میں داخل ہو کر بیخود مغنیہ کی پیچدار زلفوں سے کھیل رہے تھے اس کی شبنمی پشواز اور دیوگری کی نفیس ریشم کا فیروزی ڈوپٹہ دھیمی روشنی سے مس کرتا ہوا عجب بہار دکھا رہا تھا ان کی آنکھوں میں خواب آفریں مستیوں کے ڈورے، تابش حسن سے چہرے کی درخشانی، نرم ونازک جسم کا لوچ، مرمریں پیکر، بھرے بھرے شانے اور اس پر کافر شباب کی تیز دستیاں ایسے انداز تھے جو دل کی سلامتی کے خواہاں ہوں۔

جب طبیعت سیر ہوئی تو سلطان اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک شاہانہ وقار کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کی طرف بڑھا اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی، بال سیاہ، چہرہ زرد مگر پر جلال تھا۔ اس نے عنبر کی نگاہوں سے ایک دفعہ قطلوشہ کی طرف دیکھا۔ اور پھر اپنا ریشمی رومال اس کے قدموں پر ڈال کر کمرۂ رقص سے رخصت ہو گیا ——

امین السلطنت آگے بڑھے اور نہایت احترام کے ساتھ رومال اٹھا کر قطلوشہ کے ہاتھ میں دیدیا۔

وہ اپنے کمرے میں واپس آئی تو تمام لونڈیاں اس کے سامنے فرش زمین پر دوزانو ہو گئیں، اور والہانہ انداز میں کوئی اس کے لباس پر بوسہ دینے لگی اور کوئی اس کی زریں پاپوش کے ارد گرد کی زمین کو چومنے لگی۔ آج سے اسے بھی وہ اعزاز ومرتبہ حاصل ہو گیا تھا جس کا وہ عرصے سے حرم سرا میں ذکر سن رہی تھی۔ مگر حاسدوں کے جلاپے، دشمنی اور باہمی رقابت کے ذہن میں آتے ہی وہ لرز اٹھی اسے قرب سلطانی اور عزت واحترام کا درجہ تو حاصل ہو گیا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی ذات حاسدوں اور مخالفین کی دشمنی اور رقابت کا مرکز بھی بن گئی تھی۔

اس اعزاز منظور نظری کے بعد ہفتوں تک ہر رات سلطان اسے طلب کرتا اور تاروں بھری رات میں وہ رقص کرتی اور گاتی سلطان اس کی دلنشیں اداؤں، دلفریب رقص اور دلکش نغموں سے مسحور ہو چکا تھا۔ وہ اس کی محشر بدوش رعنائیوں اور معصومیت کی ہلاکت آفرینیوں کا شکار ہو چکا تھا۔

اس نے حرم شاہی میں کافی ہر دلعزیزی حاصل کر رہی تھی، ایک معزول شدہ مغنیہ سے اس کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے تھے وہ اس کی رازدار سہیلی تھی۔ ایک رات وہ اس کے پاس آئی اور چھ گولیاں دیں۔

"قطلوشہ!" وہ کہنے لگی۔ "یہ لو گولیاں، یہ سم قاتل ہے۔ ایک گولی ایک ہاتھی کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے۔ جلد ہی تمھیں اپنے بدترین دشمنوں سے واسطہ پڑنے والا ہے جو تمھارے اس اعزاز ومرتبے کو ایک نظر نہیں دیکھ سکتیں، وہ تمھیں مٹانا اور اس مرتبے سے گرانا چاہینگی۔ ان گولیوں کو تم ان پر استعمال کرنا۔"

قطلوشہ یہ سنتے ہی لرز اٹھی اور بولی: "تمھارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں ایسا کرونگی۔ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا ......"

"قطلوشہ! میری پیاری بھولی لڑکی! تمھیں کرنا ہوگا۔ وہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ وہاں تم ہوگی یا وہ ......"

مگر مجھے یہ کس پر استعمال کرنی ہوگی؟"

"ایک ایرانی لڑکی پر جو عنقریب تمہیں شاہی نظروں سے گرا کر ظلِ الٰہی کی منظورِ نظر بننا چاہتی ہے اور میں نے سنا ہے کہ اس کے پاس زہر ہے"

قطوشہ کے لئے زندگی ایک وبال ہو گئی گو ہر چہار طرف عیش وکامرانی کا تمام سامان موجود تھا۔ اسے دنیا کی ہر قیمتی بیش بہا اور نایاب شے ادنیٰ سے ادنیٰ اشارے پر میسر آجاتی تھی۔ اس کے لئے نفیس کیف آفریں مشروبات اور لذیذ وخوش ذائقہ فواکہات ہر وقت خوانوں میں موجود رہتے تھے مگر انہیں چکھنے یا کھانے سے وہ ڈرتی تھی۔ مبادا اس میں زہر ملا ہوا ہو۔

ایک روز لیلیٰ ---- اس نوعمر ایرانی دوشیزہ نے سلطان کے سامنے رقص کیا۔ اس کی سحر انگیز اداؤں اور برق بار نگاہوں نے مغلوب الجذبات سلطان کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ اس کی طرف بڑھا اور اپنا ریشمی رومال اس کے قدموں میں ڈال دیا۔ قطوشہ اپنے اعزاز اور مرتبے سے معزول و برطرف کر دی گئی۔

"میں اس اعزاز اور مرتبے کو ہاتھ سے دیدوں؟ اور سلطان کی دوسری منظورِ نظر کی لونڈی بن کر رہوں؟ نہیں! یہ نہیں ہو سکتا!" قطوشہ نے اپنے دل میں کہا اور اسی رات ایرانی دوشیزہ نے حصولِ اعزاز کی خوشی میں شراب پی۔ جس میں قطوشہ نے زہر ہلاہل کی ایک گولی گھول دی تھی اور لیلیٰ اس رات کے بعد پھر کبھی بیدار نہ ہوئی۔

زندگی قطوشہ کے لئے پھولوں کی سیج نہ تھی۔ ایک ہی ماہ بعد ایک دوسری حریف پیدا ہو گئی۔ ناہیدہ ---- ایک بدوی دوشیزہ جس کی غزالی آنکھوں میں سحر و مستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس کے قد و قامت میں شباب کی حشر انگیز رعنائیاں پنہاں تھیں ناہیدہ کو بھی ایک گولی دی گئی اور وہ غزال چشم دوشیزہ بھی ہمیشہ کے لئے سو گئی۔

اب زندگی بڑے مزے سے کٹنے لگی۔ مگر ایک دوسری مصیبت پیش آئی۔ قطوشہ جسے دنیا کی ہر نعمت میسر تھی۔ محبت و ناز برداری سے محروم تھی، اس کی پرکیف جوانی، اس کا شباب انگیز پیکر ہم آغوشی سے بے نیاز و محروم تھا۔ وہ تشنۂ محبت تھی لیکن سلطان سرحدِ شباب سے گذرا ہوا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ گرمیٔ محبت سے بے نیاز اور اس کے مقابلہ میں قطوشہ جو انیس سال کی ایک انتہائی مغلوب الجذبات عورت بن چکی تھی ایک ہم عمر شریکِ حیات کی متمنی تھی جو اس کے جذبات واحساسات کی صحیح قدر کر سکے۔ جو اس کے بہلائے تعلیں پر گرم بوسوں کی بارش کر دے۔ جس کے تنفس کی گرمی اس کے آتشیں رخساروں میں حدت بھر دے۔ ایک بدوی لڑکے کی نوخیز جوانی اس کی آنکھوں میں کھب گئی۔ اس کی عمر سترہ اٹھارہ سال کے قریب تھی مگر ہاتھ پاؤں کا مضبوط اور تنا لگتا جوان تھا۔ وہ باغبان کا بیٹا تھا اور شاہی باغ میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔

ایک دن قطوشہ نے اسے بلایا اور حکم دیا کہ اس کے کمرے کو آراستہ کرنے کے لئے تر و تازہ پھول لائے۔ لڑکا حسب الحکم پھولوں کا ایک گلدستہ لے کر اس کے کمرے میں آگیا۔ جیسے ہی وہ اندر آیا قطوشہ نے دروازہ بند کر لیا۔

اس دن سے وہ لڑکا بلاناغہ پھول لے کر آنے جانے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کی آمد و رفت کی تمام محل میں خبر ہو گئی اور جابجا اسی کے تذکرے ہونے لگے۔ جب باغبان کا لڑکا کافی عرصہ کے بعد قطوشہ کے کمرۂ خاص سے برآمد ہوتا تو حرم کی دوسری دوشیزائیں اشاروں ہی اشاروں میں باتیں کرتیں مگر کسی کو لب ہلانے کی جرأت نہ ہوتی تھی حرم سرا کی دوشیزاؤں میں سے ایک نے جو عرصہ سے قطوشہ کو

سلطان کی نظروں سے گرانے کی فکر میں تھی اور خود اس کی جگہ حاصل کرنا چاہتی تھی اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا ضروری خیال کیا اور سلطان کو تمام و کمال حالات سے آگاہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ایک دن وہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور تمام باتیں اس سے کہہ دیں۔

"یہ غیر ممکن ہے" سلطان نے غضبناک ہو کر کہا۔ "میں تمہیں اس قسم کی بہتان طرازی اور جھوٹی تہمت لگانے کے جرم میں سنگسار کرا دونگا" اس کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو رہی تھیں اور لہجہ سخت تھا۔

"مگر خداوندا میں اسے ثابت کر سکتی ہوں" لڑکی بولی۔

"اگر تم ایسا نہ کر سکیں تو جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے"

"مجھے منظور ہے ولی نعمت!"

دوسرے دن ایک پردے کی اوٹ سے لڑکی نے سلطان کو تمام منظر دکھایا سلطان غم و غصہ سے پاگل ہو گیا باغبان کا لڑکا سلطان کی منظور نظر کے کمرے میں جیسے ہی داخل ہوا دروازہ بند ہو گیا۔ سلطان اپنی کمینگاہ سے نکلا اور حبشی غلاموں کو دروازہ توڑ دینے کا حکم دیا دروازہ ضربوں کی تاب نہ لا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑا اور اندر سے پریشان و زرد و خوفزدہ اور باغبان کا لڑکا نکلے سلطان کو شکستہ دروازے کے سامنے کھڑا دیکھکر دونوں کا خون خشک ہو گیا —— اس رات کے پچھلے پہر دو بھاری گٹھڑیاں شاہی حرم سرا کے بالاخانے سے تیز رو دریا میں پھینکی گئیں۔

نہیں رہا!

دنیا میں آکے کون پریشاں نہیں رہا

از جناب سید اکبر عباس صاحب نوری

دل میں وہ لطفِ کاہشِ پنہاں نہیں رہا — شاید کسی کی یاد کے شایاں نہیں رہا

کیوں دستِ شوق سلسلہ جنباں نہیں رہا — "دامن نہیں رہا کہ گریباں نہیں رہا"

یکساں غم و الم میں گذاری تمام عمر — مجھکو یقینِ گردشِ دوراں نہیں رہا

اے دل غمِ حیات سے کس کو ملی نجات — دُنیا میں آکے کون پریشاں نہیں رہا

وحشت میں تار تار میرا پیرہن ہُوا — کچھ امتیازِ جیب و گریباں نہیں رہا

اب مجھ سے میری بے سر و سامانیاں نہ پوچھ — تو میری طرح بے سر و ساماں نہیں رہا

اُس نامرادِ عشق کی مشکل پہ غور کر — مرنا بھی جس کے واسطے آساں نہیں رہا

اکبر ہوائے دہر کچھ ایسی بدل گئی
انساں کے دل میں بھی غمِ انساں نہیں رہا

کشمیر کے پہاڑوں میں خون پیدا ہوتا ہے

وہاں ایک بوٹی پیدا ہوتی ہے جسے کھا کر انسان موٹا تندرست اور طاقتور ہوتا ہے

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ کشمیر کی پہاڑیوں میں ایک خاص قسم کی بوٹی پیدا ہوتی ہے جسے ماہرین سائنس نے تجربہ کرکے ثابت کیا ہے کہ اگر اس کو مرکب طریقہ سے انسان دس پندرہ روز مسلسل استعمال کرے تو بلاشبہ اسکے جسم میں بے حد طاقت بڑھ جائے اور وہ خوب تندرست موٹا تازہ اور سرخ و سفید ہو جاتا ہے۔ تجربہ یہ ہوا ہے کہ یہ بوٹی تازہ اور نیا خون پیدا کرنے میں حیرت خیز اثر رکھتی ہے۔ چنانچہ تجربہ کار اطبا نے اس بوٹی کو معجون کی شکل میں تیار کر لیا۔ اسکا نام "معجون کاشمیری" ہے۔ کافی تجربے کے بعد یہ ثابت ہوا ہے کہ "معجون کاشمیری" کے ایک روزانہ استعمال کرنے سے انسان کے جسم میں روزانہ دو تولہ نیا خون پیدا ہو جاتا ہے۔ بے شمار دبلے پتلے اور کمزور جسم کے اور کئی دن بیمار رہنے والے لوگوں پر اس دوا کا تجربہ کیا اور ہر جگہ ثابت ہوا ہے کہ معجون کاشمیری کے استعمال سے نیا خون بکثرت پیدا ہوتا ہے۔

پس اگر ناظرین میں سے کوئی عورت، مرد یا بچہ کمزور، دبلا پتلا، یا دائم المریض ہو تو اسے چاہیئے کہ ایک شیشی "معجون کاشمیری" منگا کر استعمال کرلے۔ اسے روزانہ اپنے جسم میں ایک انقلاب اور ایک طاقت کا احساس ہوگا۔ اور چند ہی روز میں وہ خود دیکھ لیگا کہ معجون کاشمیری کتنی حیرت انگیز چیز ہے۔ ایک شیشی "معجون کاشمیری" کی قیمت چار روپے سات آنے ہے۔ اور سات آنے محصولڈاک کے لگتے ہیں۔

یہ دوا مفت دیجائیگی

جن لوگوں کی مردانہ طاقت کمزور ہے۔ اور وہ ...... ناقابل ہیں یا اتنے کمزور ہیں کہ شرمندگی ..... ہوتی ہے تو محض دوا کا اثر ثابت کر دینے کیلئے ایسے لوگوں کو یہ دوا ایک شیشی مفت دیجائیگی۔ البتہ اشتہاری خرچ کیلئے ایک شیشی پر ایک روپیہ پہلے ضرور لیا جائیگا۔ اور جب انہیں اس شیشی سے پورا فائدہ نظر آجائے تو وہ باقی قیمت بھی بھیجنے کا وعدہ کریں۔ پارسل کا محصول بھی دینا ہوگا اس طرح ایک روپیہ سات آنے میں ایک شیشی ان کو پہونچ جائیگی۔ ایک مریض کو اس رعایتی قیمت میں صرف ایک ہی شیشی دی جا سکتی ہے۔ ہاں اسکی اجازت ہے کہ کئی مریض مل کر ایک ہی پارسل میں کئی شیشیاں منگالیں۔ فی شیشی ایک روپیہ سب کو جمع کرانا ہوگا۔ پارسل کا محصول ایک شیشی پر سات آنے اور دو سے چار شیشی تک گیارہ آنے لگتا ہے۔

منگانے کا پتہ: منیجر زنانہ دواخانہ ۱ے۔بی ۲۴ دہلی

تاریخ نما

ولیم مور کرافٹ شالامار لاہور سے لداخ میں!

از جناب پیر غلام دستگیر نامی

چند روز ہوئے مجھے شالامار باغ لاہور دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پہلے تختے کے آخیر میں اس فوارہ دار نہر سے مشرق کی جانب جو جنوب سے شمال کی سمت جاری ہے اور جس کا پانی آبشار پر گرتا ہے ایک عمارت نظر آئی۔ چند قدم چل کر اس تک پہنچ گئے۔ یہ عمارت باغ کی دوسری عمارتوں کی شان اور پایہ کی نہیں۔ انگریزی کتبہ جو درج ذیل ہے پڑھا گیا تو حقیقت حال معلوم ہوئی۔ اسے دیکھ کر مجھے شہنشاہ جہانگیر کا ایک فقرہ یاد آگیا جو اس نے راجۂ نواح کے نام شہنشاہ مذکور (نورالدین) نور پور آباد کرنے اور اس میں پر تکلف عمارات بنانے پر بعد ملاحظہ استعمال کیا تھا کہ "ہندو راجے اپنی طرف سے خواہ کتنے ہی شوق و تکلف سے عمارات بنا کریں دل نشین نہیں ہوتیں" اس لئے میں نے انہیں گرا کر از سر نو تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ بہرحال کتبہ مذکور کا ترجمہ یہ ہے۔

"اس گنبد دار یا خیمہ نما عمارت میں جو رنجیت سنگھ کی بنائی ہوئی ہے ولیم مور کرافٹ۔ (William Moorcroft) مشہور سیاح نے مہاراجہ کے دربار میں حاضری کے ایام سنہ ۱۸۲۰ء میں ترکستان کو جاتے ہوئے جہاں وہ سنہ ۱۸۲۵ء میں مر گیا' اقامت اختیار کی"

یہ کتبہ پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ ہمارے جدی کتب خانہ میں ایک قلمی کتاب ہے جس میں ولیم مور کرافٹ کا ذکر ہے۔ آج پھر اسے نکال کر دیکھا گیا معلوم ہوا کہ یہ سید نجف علی ولد سید ملک محمد خاں لاہوری کی تصنیف ہے۔ یہ صاحب ولیم مور کرافٹ کے ساتھ بطور میر منشی ہمراہ تھے۔ اور چونکہ اس زمانے میں درون ہند و بیرون ہند زبان فارسی ہماری زبان تھی اس لئے آپ حالات بحیثیت فارسی زبان میں قلمبند کرتے رہے۔ راجہ رنجیت سنگھ سے ملاقات کا حال سید صاحب یوں تحریر کرتے ہیں۔

"۲۵ر شعبان ۱۲۳۵ھ کو سرکار مرمت آثار انگریز بہادر کا بہی خیر خواہ صاحب والا مناقب ولیم مور کرافٹ اور بہادر عزیز از جان اقبال نشان میر عزت اللہ خاں کے ساتھ جو منڈی سے دگلندا کی راہ کے لئے وارد لاہور تھے مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر سے ملاقی ہوا۔ صاحب بہادر نے یک جفت تفنگچہ سہ سالہ خوردہ اور ایک جفت تفنگچہ یک نالہ اور ایک توپ برنجی خورد بقدر یکنیم دجب راجہ صاحب کو بطریق ارمغان دی تھی۔ مہاراجہ بہادر نے مبلغ پانصد روپیہ مہمانی۔ چند کوزہ شیرینی و خلعت ہفت پارچہ پوشاکی۔ دو رقم جواہر ایک سرپیچ مرصع اور دوسرا دو لڑہ مروارید مع جگنی بھیجا اور آٹھ دن ٹھہرایا اور اپنی پاتن باغ خوشحال سنگھ میں بالمشافہ دکھا کر صاحب ممدوح نے فرمایا کہ لشکر مرہٹہ سے بہتر ہیں۔ پھر رخصت کیا میں روانہ ہوا۔ روانگی سے تیسرے دن مہاراجہ بہادر کے دو نفر سنگھ صاحب بہادر کو بلانے آئے۔ پالکی شالامار باغ میں آئی ہوئی تھی۔ صاحب بہادر سوار ہو کر روانہ ہوئے شہر میں خلیفہ نورالدین جیو برادر فقیر عزیز الدین جیو استقبال کو کھڑے تھے۔ حویلی کھڑک سنگھ میں اتارا گیا۔ خلیفہ نورالدین کو مہاراجہ صاحب کی بیماری کا حال بتانے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ جو دوا صاحب بہادر نے دی وہ انہوں نے استعمال نہ کی۔ پس صاحب بہادر چھ روز آرام کر کے منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔ مہاراجہ بہادر نے اڑھائی سو روپیہ ضیافت کے طور پر بھیجا اور سجان پور تک دو زنجیر فیل دیئے ایک پر خود صاحب بہادر اور دوسرے پر میر عزت اللہ خاں اور یہ دولت خواہ اور مرزا عزت اللہ بیگ کے بیٹے عظمت اللہ بیگ سوار ہوئے۔ صاحب بہادر بڑے استقبال سے روانہ ہوئے اور ایک گھڑی دن خیمہ سے داخل امرتسر ہوئے جو ۱۲ کوس سمت شرق مائل بجنوب ہے۔"

یہاں سے منزلیں طے کرتے ہوئے گلو پہنچے اور وہاں سے جولائی ۱۸۲۰ء میں لداخ کی طرف روانہ ہوئے۔ چنانچہ سید صاحب موصوف لکھتے ہیں۔

"بتاریخ بست و نہم شہر شوال المکرم ۱۲۳۵ھ از موضع سلطانپور و مشہور گلو است روانہ تبت لداخ باتفاق صاحب والا مناقب ولیم مورکرافت صاحب بہادر شدم خواستم کہ تفصیل و تشریح نقشہ راہ و آنچہ سوانح در عرض راہ و بند واقع شود بقید قلم درآرم کہ یادگارے برائے صاحبان و خواہشمندان کہ خواہش در غبت سیر و آمدو شد ایں ولایت مرکوز خاطر دارند کہ معلوم و مفہوم ہمگناں صاحب جودت و ذکا رطبع بودہ باشد"

ولیم مور صاحب کے قافلے میں علاوہ مال تجارت' سپاہی اور اسلحہ بھی تھے اس لئے جابجا ان پر شبہ ہوا کہ یہ سوداگری کے لئے نہیں بلکہ ملک گیری کے لئے آئے ہیں۔ اس لئے ان کو عہدنامے لکھنے لکھانے کی نوبت آئی۔ ایک عہدنامے کا خلاصہ ہم کتاب مذکور سے اردو میں نقل کرتے ہیں جو خالی از دلچسپی نہیں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ زندہ قومیں کس طرح تجارت میں اپنی قوم کی بہتری کا خیال رکھتی ہیں اور انجام کار تاج بسر ہوتی ہیں۔

ولیم مورکرافٹ کا عہدنامہ

میں دولت علیہ انگریزیہ کے سوداگروں کی طرف سے مختار کار و با تجارت ہونے کی حیثیت سے ترکستان میں تجارت کرنے کے لئے اس طرف آیا ہوں۔ میں نے سرکردہائے لداخ اور راجہ صاحب سے ملاقات کی ہے انہوں نے رفاقت، رعایت' مرحمت اور مہربانی کا حق ادا کیا ہے۔ میں نے خواہش کی ہے کہ آئندہ کسی وجہ سے بھی انگریزی تاجروں پر اس ملک میں راہ تجارت بند نہ کی جائے اور وہ بلامزاحمت آئیں جائیں۔ انہوں نے میری بات مان لی ہے اور لکھ کر دے دیا ہے۔ میں بھی ان کی دلجمعی کے لئے لکھ دیتا ہوں کہ جب یارکند کی راہ کھلی ہو تو ہم ۱۵ — ۲۰ نفر سپاہیوں سے زیادہ لداخ میں ہمراہ نہیں لائینگے۔ اور اگر وہ راہ مسدود ہو تو چالیس پچاس نفر سے زیادہ ہمارے ساتھ سپاہی نہیں ہونگے۔ پہلے اس ملک میں فی بار اسپ تیرہ روپیہ محصول لیا جاتا تھا اب ہم سے از راہ رعایت و دوستی و اتحاد دس روپیہ لیں گے۔ ہر انگریز سوداگر اس نوشتہ پر کاربند رہے گا اور ملک لداخ کو ہرگز کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا۔ مقام لی سے براہ گردوق نہیں جائیں گے اور اگر راہ گردوق سے لی پہنچیں گے تو پھر براہ گردوق آمدورفت میں مضائقہ نہیں ہوگا"

مسٹر مورکرافت نے یہ عہدنامہ ۴ مئی ۱۸۲۱ء مطابق غرہ شوال ۱۲۳۶ھ کو بحروف انگریزی لکھا اور پیچھے اس کا ترجمہ فارسی میں کر کے اپنے دستخط کئے اور ہمراہیوں کے بھی کرائے۔

اس مضمون پر راجہ جسپہ نیگیل۔ کالون اور اہل کاران سرکردۂ لداخ نے تبتی زبان میں عہدنامہ لکھا کر معہ ترجمہ فارسی دستخط ثبت کئے۔

"ار شعبان کو دو قطعہ قرارداد معہ دیگر کاغذ سیاہہ و گذارشات بلاد کوہستان و راہ مع نقشہ ہائے ملک کوہستان و راہ و نقشہ دیر دو صند وقچوں اور نالچوں میں اور میووں اور غلہ گندم و جو کے بیج اور پوست حیوانات راجہ سیپار چند و راجہ سبحان پور کی طرف بھیج کر لکھا کہ اپنے معتبر آدمیوں کے ہاتھ مرتی صاحب بہادر کے پاس لودیانہ ارسال کردیں۔

یہ واقعہ لارڈ ہیسٹنگز کے عہد کا ہے جو ۱۸۱۳ء سے ۱۸۲۳ء تک وائسرائے رہے۔

اس عہدنامے سے ثابت ہوا کہ زندہ قوم کے افراد کی سیاحت محض سیر و تفریح کے لئے نہیں ہوتی بلکہ اس لئے ہوتی ہے کہ غیر ملکوں سے رابطہ و اتحاد پیدا کر کے اور وہاں کے حالات دریافت کر کے اپنی قوم کے سود و بہبود اور رسوخ کے لئے رستہ صاف کیا جائے۔

تین شعر

(جلیل مانکپوری)
شائد اسی لئے وہ چڑھے تھے نگاہ پر
وہ راہ پا کے آنکھ سے دل میں اتر گئے

(اختر صہبائی)
آنکھوں کو کچھ خبر نہ ہوئی اور خیال یار
آنکھوں کی راہ سے مرے دل میں اتر گیا

(اختر امرتسری)
ساقی تری شراب تو اتری ہے حلق سے
لیکن تو راہ چشم سے دل میں اتر گیا

صبح و شام

میری دنیا میں دن کا نام نہیں!

از جناب واحد قریشی (بمبئی)

ایک چکر ہے صبح و شام نہیں — زندگی میں کہیں قیام نہیں!
یوں گذرتے ہیں صبح و شام مرے — جیسے میرے یہ صبح و شام نہیں
میں وہ آوارہ ہوں کہ جس کے لئے — کوئی منزل نہیں مقام نہیں
تیرگیٔ خیالِ زلف نہ پوچھ — میری دُنیا میں دن کا نام نہیں
کیوں دیا مجھکو ذوقِ نظارہ — طُور اگر جلوہ گاہِ عام نہیں
حشر میں پھر ہے سامنا اُن سے — موت بھی راحتِ دوام نہیں
دل کی جرأت کا دادخواہ ہوں میں — اپنی ناکامیوں سے کام نہیں
بھول جانا ہمارے بس میں نہیں — یاد کرنا تمھارا کام نہیں
جس میں رہتا ہے ظلمتوں کا ہجوم — وہ مرا دن ہے تیری شام نہیں
ذوقِ جلوہ پہ بندشیں کیسی؟ — عاشقی قائلِ نظام نہیں
ہیں غنیمت یہ میکشی کے دن — میری گردش شریکِ جام نہیں
حُسن پابندِ مصلحت کیوں ہے — عشق کو خوفِ ننگ و نام نہیں
جن کو سجدے کئے ہیں آٹھوں پہر — اب گوارا انھیں سلام نہیں
عشق لے آیا اس جگہ مجھکو — جس کے آگے کوئی مقام نہیں

موت ہے وجہِ زندگی واحدؔ
زندگی موت کا پیام نہیں

سوتیلا بھائی

مسز گیسکل کا ایک افسانہ

ترجمہ:۔ جناب محمد عبدالرزاق [illegible]

۱۔ میری ماں

میری ماں نے نکاح ثانی کر لیا تھا۔ اس لئے اپنے مرحوم شوہر کے بارے میں کسی سے بھی کوئی بات نہ کی تھی۔ مجھے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ میں نے دوسرے لوگوں کی زبانی سنا ہے۔ میری ماں اپنی پہلی شادی کے وقت مشکل سے سترہ برس کی ہوگی اور اس کے شوہر نے اپنی زندگی کی صرف اکیس بہاریں دیکھی تھیں اس نے کمبرلینڈ میں ساحل سمندر کے نزدیک کسی جگہ تھوڑی سی زمین کرائے پر لے رکھی تھی جس میں وہ کاشت کیا کرتا تھا۔ وہ اپنی نوعمری اور ناتجربہ کاری کے باعث کھیتی باڑی کا کام اور مویشی کی دیکھ بھال بخوبی نہ کر سکا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ کاروبار روز بروز خراب ہوتا گیا۔ اور مالی حالت بھی گرتی گئی۔ ان سب باتوں کا اس کی صحت پر بہت اثر ہوا اور وہ بیمار ہو گیا۔ بالآخر دق میں مبتلا ہو کر اپنی شادی کے تین سال بعد اس دکھ بھری دنیا سے چل بسا۔ اس نے اپنے پیچھے نوجوان بیوی اور ایک بچی جو بمشکل پاؤں پاؤں چل سکتی تھی چھوڑی۔ اس کی وفات کے وقت نصف سے زیادہ مواشی یا تو مر چکے تھے یا ضروری قرضے کی ادائیگی میں فروخت کر دیئے گئے تھے۔ زمین کے ٹھیکے کے ختم ہونے میں ابھی چار سال باقی تھے۔ اس کی وفات کے بعد گھر میں نہ تو کچھ اناج تھا۔ نہ پس انداز کی ہوئی کوئی رقم۔ جس سے میری ماں ضروریات زندگی کی چیزیں خرید کر اپنی گذر اوقات کر سکتی۔ ستم یہ کہ اس کے ایک بچہ ہونے والا تھا۔ میری ماں کے لئے یہ خیال سوہان روح بنا ہوا تھا۔ اس غربت کی حالت میں اُسے ایک سخت اور تکلیف دہ موسم سرما اپنے تنہا مکان میں جس کے نزدیک میلوں تک کوئی دوسرا مکان نہ تھا بسر کرنا تھا۔

میری خالہ اپنی بہن کے پاس آ کر رہنے لگی اب یہ دونوں مل کر سوچنے لگیں کہ کس طرح ایک ایک پیسہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جائے مجھے معلوم نہیں کہ کس طرح میری چھوٹی بہن جسے میں نے نہیں دیکھا بیمار ہوئی اور فوت ہو گئی۔ میری ماں کی مصیبتوں کا پیمانہ شاید ابھی لبریز نہیں ہوا تھا کہ میری بہن گریگری کی ولادت سے دو ہفتہ قبل لال بخار میں مبتلا ہوئی اور ایک ہفتہ کے اندر ہی اندر اپنے باپ سے جا ملی۔ اس آخری ضرب کا میری ماں کے دل و دماغ پر خاص اثر ہوا۔ وفور غم سے اس پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا یہ سب خالہ فینی نے مجھے بتایا ہے۔ اس بچی کی موت پر میری ماں کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ گرا۔ اگر میری ماں کچھ رو لیتی تو خالہ فینی مسرور و ممنون ہوتی۔ لیکن وہ اس بچی کا ننھا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اس کے خوبصورت، زرد اور مردہ چہرے پر نگاہیں جمائے خاموش بیٹھی رہی۔ حتیٰ کہ لوگوں نے میت کو قبرستان لے جانے کے لئے اس کے پاس سے اٹھا لیا ماں نے اپنی بچی کا ایک بوسہ لیا اور وہاں سے اٹھ کر دریچہ کی نشست پر بیٹھ کر جنازے جانے والے کو دیکھنے لگی۔ لوگوں کی یہ مختصر جماعت چند ہمسایوں، خالہ فینی اور اس کے ایک دور کے رشتہ کے چچازاد بھائی پر مشتمل تھی یہ لوگ ایک لہراتی ہوئی قطار میں اس برف پر جو گذشتہ شب گری تھی۔ جا رہے تھے۔ خالہ فینی نے قبرستان سے واپس آ کر میری ماں کو اسی جگہ پایا۔ وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔

میری ماں کی یہ حالت گریگری کی پیدائش کے وقت تک رہی گریگری کے پیدا ہونے کے بعد اس کے منجمد آنسو پگھلے۔ اب اس نے رونا شروع کیا وہ اس طرح دھاڑیں مار مار کر رویا کرتی جیسے کوئی اس کا کلیجہ چھلنی کئے دے رہا ہو۔ رات دن وہ مسلسل روتی ہی رہتی تھی۔ اس کے گریۂ پیہم سے خالہ فینی اور دوسرے دیکھنے والے لوگ بہت پریشان تھے۔ وہ خوف سے ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے۔ اسے خاموش کرانے کی اکثر کوششیں کی گئیں لیکن سب بیکار۔ اس نے خالہ فینی سے کہا کہ وہ پریشان نہ ہو اور اسے کمرے میں تنہا پڑا رہنے دے۔ وہ جتنا روتی اس کے سر کی گرانی میں اتنی ہی کمی واقع ہو جاتی اور دماغ میں کچھ ہلکا پن محسوس ہوتا تھا۔ شب و روز رونے کے باعث اس کے آنسو خشک ہو گئے۔ اب وہ اس قدر نحیف و نزار ہو گئی کہ رونے کی آواز ہی نہ نکلتی تھی۔

[illegible] بے انتہا محبت کرتی تھی اسے شب و روز اسی کی فکر رہتی تھی۔ اس نے شاید ہی کبھی اپنے مرحوم شوہر یا بچی کے متعلق بات کی ہو جو بریکیم قبرستان میں ابدی نیند سو رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کو بالکل بھول چکی ہے۔ خالہ فینی ایسا کہتی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ خالہ کو میری ماں کے سمجھنے میں غلطی ہوئی کیونکہ میری ماں نے کبھی بے شوہر اور بچی کا ذکر نہ کیا تھا اس لئے خالہ کا ایسا خیال تھا خالہ فینی [illegible] باتیں کرنے والی واقع ہوئی تھی لیکن میری ماں تنہائی پسند اور خاموش طبیعت کی عورت تھی۔ خالہ فینی میری ماں سے عمر میں بہت بڑی تھی۔ اپنی چھوٹی بہن سے اس کا سلوک ایسا تھا جیسا ایک ماں کا اپنی بیٹی سے ہوتا ہے۔ وہ بہت مہربان اور محبت کرنے والی عورت تھی۔ خود اپنے سے زیادہ اسے اپنی بہن کی فکر رہتی تھی۔ ان لوگوں کی گذر اوقات دراصل خالہ فینی ہی کی اس قلیل رقم سے ہوتی تھی جو اس کے پاس پہلے سے موجود تھی۔ کپڑے سی کر بھی وہ تھوڑا بہت کما لیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ میری ماں کی نگاہیں کمزور ہونے لگیں۔ اس کی بینائی بیحد کم ہو گئی یہ نہیں کہ وہ قریباً اندھی ہو گئی تھی۔ اپنے گھر میں بخوبی چل پھر سکتی تھی اور خانہ داری کے ضروری امور میں بھی شرکت کر لیتی تھی لیکن اب اس سے سینے پرونے کا کام نہ ہوتا تھا۔ پہلے سلائی سے تھوڑی بہت آمد ہو جاتی تھی لیکن اب یہ آسرا بھی جاتا رہا۔ نگاہوں کی کمزوری دراصل وہ اس کثرت گریہ کی وجہ سے تھی جو اس نے پیدائش کے وقت کیا تھا ورنہ ویسے وہ ایک نہایت حسین اور نوعمر خاتون تھی۔ لوگ بتلاتے ہیں کہ دور دور کے دیہات میں بھی اس جیسی کوئی خوبصورت عورت نہ تھی۔ میری ماں کو اب یہ خیال ستانے لگا کہ وہ اپنی اور گرگیری کی گذر اوقات کے لئے کچھ نہ کما سکے گی خالہ اسے سمجھاتی اور تسلی دیتی کہ میرے پاس جو رقم ہے وہ گرگیری کی ضروریات اور ان لوگوں کے کھانے پینے کے لئے کافی ہے لیکن میری ماں کو معلوم تھا کہ اب خالہ کے پاس اتنا پیسہ بھی نہیں بچا جو خود اس کے کھانے پینے کے لئے کافی ہو سکے۔ معمولی سے معمولی قسم کی خوراک بھی ان لوگوں کو میسر نہ تھی۔ وہ تقریباً فاقہ کشی میں اپنے دن بسر کر رہے تھے۔ گرگیری چونکہ توانا و تندرست نہ تھا اس لئے اسے زیادہ خوراک کی ضرورت نہ تھی۔ جو بچہ نہایت لاغر، کمزور اور دبلا پتلا ہو اسے عام طور پر کم خوراک کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کے لئے اچھی قسم کی خوراک کا مہیا ہونا اشد ضروری تھا۔ میری ماں کو اپنی کچھ فکر نہ تھی لیکن میری کا خیال اسے گھلائے دے رہا تھا۔ یہ فکر اس کے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی کہ اب کس طرح وہ اپنے بچے کی [illegible] کر سکے گی؟

ایک دن دونوں بہنیں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں خالہ کچھ کام کر رہی تھی اور میری ماں گرگیری کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی اتنے میں ولیم پرسٹن جو ایک طرح سے میرے والد کا دوست تھا اندر آیا اس کی عمر چالیس برس کے قریب تھی۔ اس نے اب تک شادی نہیں کی تھی بلکہ تجرد کی زندگی گذار رہا تھا اور اس نواح میں وہ سب سے متمول زمیندار تھا۔ وہ میرے نانا سے واقف تھا۔ خالہ فینی اور میری ماں کو بھی ان کے کھاتے پیتے کے زمانے میں اس نے دیکھا تھا۔ کمرے میں آنے کے بعد وہ سلام کر کے بیٹھ گیا اور اپنی ہیٹ کو ہاتھ میں لئے آہستہ آہستہ گھمانے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان سے حق کردہ مسرت محسوس کر رہا ہے۔ خالہ فینی اس سے باتیں کر رہی تھی وہ بظاہر تو خالہ کی باتیں سن رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں میری ماں کے چہرے پر تھیں۔ میری ماں اپنے بچے کے پاس نیچی نگاہ کئے خاموش بیٹھی تھی۔ ولیم پرسٹن نے اس دن بذات خود بہت کم بات کی اور اس کے بعد کی ملاقاتوں میں بھی وہ بالعموم خاموش رہا۔

ایک اتوار کو خالہ فینی گرجا نہ جا سکی۔ وہ مکان پر گرگیری کی دیکھ بھال کے لئے رہ گئی۔ میری ماں تنہا گرجا گئی تھی۔ جس وقت وہ وہاں سے واپس ہوئی تو بجائے اس کے کہ باورچی خانے میں جا کر گرگیری کو دیکھے یا اپنی بہن سے کچھ بات کرے بھاگتے ہوئے بالاخانے پر چلی گئی۔ خالہ فینی نے بالاخانے پر اس کے رونے کی آواز سنی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اس کی اندوہناک اور تڑپا دینے والی چیخیں سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دل باہر نکلا پڑتا ہے۔ خالہ فینی فوراً اوپر گئی۔ دیکھا کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ باہر سے اس نے میری ماں کو خوب ڈانٹا اور برا بھلا کہا۔ بدقت تمام دروازہ کھلوایا جونہی وہ اندر داخل ہوئی میری ماں اس کے سینے سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب وہ کافی رو چکی تب اس نے بتایا کہ ولیم پرسٹن نے اس سے شادی کے لئے درخواست کی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ شادی کے بعد گرگیری کے تمام اخراجات وہ اپنے ذمے لے لیگا۔ ساتھ ہی میری ماں نے یہ بھی کہا کہ اس نے ولیم پرسٹن سے اقرار کر لیا ہے۔ خالہ یہ سن کر ششدر رہ گئی۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اس کا خیال تھا کہ میری ماں نے اپنے مرحوم شوہر کو بہت جلد بھلا دیا اس واقعہ سے اس خیال کی تائید ہو رہی تھی۔ انجیل کا

خیال تھا کہ وہ خود ہیلن کی بہ نسبت ولیم پریسٹن جیسے بہتر شخص کے لئے زیادہ موزوں تھی۔ ہیلن اگرچہ بیوہ تھی لیکن ابھی اس کی عمر کا چوبیسواں سال بھی پورا نہ ہوا تھا۔ خالہ کا کہنا تھا کہ شادی کے بارے میں ان لوگوں نے اس کی رائے مطلق نہ لی۔ دوسرے پہلو پر بہت کچھ کہا جا سکتا تھا۔

ہیلن کی شامیں بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ ان کے اچھا ہونے کی امید بھی نہیں تھی۔ ولیم پریسٹن کی بیوی ہونے کے بعد اسے کسی کام کے کرنے کی مطلق ضرورت نہ ہو گی۔ بیوہ ماں کے لئے اس کا بچہ بہت بڑا بار تھا۔ ایک اچھا متمول شخص اس کا کفیل ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ خالہ بھی اس شادی کو نسبتاً زیادہ روشن نقطۂ نظر سے دیکھنے لگی،

جب سے میری ماں نے ولیم پریسٹن سے شادی کا اقرار کیا تھا اس کی نگاہیں پھر کبھی اوپر نہ اٹھتی تھیں۔ اس کے لب بھول کر بھی متبسم نہ ہوتے تھے۔ گریگری کو اگرچہ وہ پہلے ہی سے بہت زیادہ چاہتی تھی لیکن اب اس کی محبت میں نمایاں ترقی ہو گئی۔ جب کبھی اسے تنہائی نصیب ہوتی تو اپنے بچے کو ساتھ لئے اس سے باتیں کرنے میں محو ہو جاتی لیکن وہ بہت چھوٹا تھا اپنی ماں کے رنج و غم کو نہ سمجھ سکتا تھا نہ ہی

بوسوں کے سوا کوئی راحت پہنچا سکتا تھا۔

آخر کار ولیم پریسٹن سے میری ماں کا نکاح ہو گیا۔ اب وہ ایک متمول گھر کی مالکہ بن گئی۔ ولیم پریسٹن کا مکان خالہ کے مکان سے قریباً آدھ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ میری ماں نے اپنے نئے شوہر کو خوش رکھنے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ میرا باپ خود کہا کرتا تھا کہ دنیا کی کسی فرض شناس اور فرمانبردار بیوی نے بھی اپنے شوہر کی اتنی خدمت نہ کی ہو گی۔ لیکن وہ اس سے محبت نہ کرتی تھی اور اس [illegible] باپ کو جلد ہی علم ہو گیا۔ اس کا دل گریگری کی محبت کے لئے وقف تھا۔ میرے باپ کے لئے اس کے دل میں جگہ نہ تھی۔ اگر وہ کچھ دن صبر سے انتظار کرتا تو شاید میری ماں کو اس سے محبت ہو جاتی لیکن یہ دیکھ کر وہ جل جاتا کہ جب کبھی میری ماں اپنے بچے کو دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک آ جاتی ہے اور چہرے کا رنگ بھی نکھر جاتا ہے۔ گریگری جب کبھی اس کے نزدیک جاتا ماں کے دل سے محبت کا شفاف چشمہ پھوٹ پڑتا۔ اس کے لئے جس نے اسے سب کچھ دے رکھا تھا اس کے پاس نرم، خیر، لیکن برف کی طرح سرد الفاظ کے سوا کچھ نہ تھا۔ میرے باپ کو گریگری سے حسد ہو گیا

اب وہ اس سے نفرت کرنے لگا۔ اس خیال سے کہ شاید اس طرح میری ماں اپنا رویہ تبدیل کرے گی اس نے طعنے دینے شروع کئے۔ میرا باپ اگر چاہتا تھا کہ میری ماں اس سے اور زیادہ محبت کرنے لگے تو یہ کوئی بے جا بات نہ تھی لیکن اس کی خواہش تھی کہ میری ماں اپنے بچے سے کم محبت کرے اور یہ ایک بری بات تھی۔

ایک دن میرا باپ گرگری پر بہت خفا ہوا۔ گرگری سے کچھ نقصان ہو گیا جیسا کہ عام بچوں سے ہوتا ہے۔ والد نے اسے بہت جھڑکا اور برا بھلا کہا۔ میری ماں نے اس سے معذرت چاہی۔ والد نے کہا کہ ایک شخص کے لئے یہ ناقابل برداشت ہے کہ وہ ایک غیر شخص کے بچے کو پالے اور اس کے تمام اخراجات برداشت کرے۔ وہ بچہ آئے دن اپنی شرارتوں سے کچھ نہ کچھ نقصان کرتا رہے اور اس کی ماں بجائے اس کے کہ شوہر کی ہم خیال ہو کر بچے کو تنبیہ کرے ہمیشہ اس کی طرف سے معافی مانگا کرے۔ رفتہ رفتہ بات بڑھ گئی اور خاتمہ اس پر ہوا کہ میری ماں اپنے بستر پر قبل از وقت چلی گئی اور اسی روز میں پیدا ہوا۔

میری پیدائش پر میرے باپ کو بیک وقت مسرت، ناز اور صدمہ ہوا۔ ناز و مسرت اس بات پر کہ بیٹا پیدا ہوا اور صدمہ اسے اپنی غریب بیوی کی حالت پر ہوا اور اس خیال سے بھی کہ اس کے کرخت الفاظ نے بیوی پر کیا اثر کیا ہوگا لیکن فطرتاً بجائے رنج و افسوس کرنے کے وہ ناراض ہونا زیادہ مناسب سمجھتا تھا۔ اس لئے اس کے دماغ نے جلد ہی فیصلہ کر لیا کہ یہ سب گرگری کا قصور ہے۔ میری ماں کی اس ابتر حالت اور میری قبل از وقت پیدائش کا باعث گرگری ہے اب گرگری سے اسے اور زیادہ نفرت ہو گئی۔

میری پیدائش کے بعد سے میری ماں کی صحت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ میرے والد نے کارلائل سے کئی ڈاکٹروں کو بلا کر دکھایا۔ وہ اسے بچانے کے لئے اپنے دل کے خون کو سونے کے سکوں میں تبدیل کرنے کے لئے تیار تھا لیکن اسے بچا لینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ خالہ فینی نے مجھ سے کہا کہ ہیلن زندہ رہنا نہیں چاہتی تھی اس لئے اس کے بچانے کی کوشش کرنا بیکار تھا۔ لیکن جب میں نے اس سے کئی سوالات کئے تو اس نے اقرار کیا کہ میری ماں بلا کسی شکایت کے خاموشی اور صبر کے ساتھ وہ سب کچھ کرتی تھی جس کے لئے ڈاکٹر کہتے تھے۔ زندگی بھر اس کا یہی طرز عمل رہا تھا۔ اس کی آخری التجاؤں میں ایک یہ بھی تھی کہ گرگری کو میرے بازو میں اس کے بستر پہ لٹا دیا جائے۔ جب اس کے بستر پر گرگری کو میرے بازو میں لٹا دیا گیا تو اس نے میرا ننھا سا ہاتھ اسے پکڑا دیا اور پیار کی نظروں سے ہمیں دیکھنے لگی۔ وہ جس وقت ہم دونوں ننھے ننھے سوتیلے بھائیوں کی طرف دیکھ رہی تھی اس کا شوہر کمرے میں آیا۔ وہ پلنگ پر جھک کر پوچھنے لگا کہ اس کی طبیعت کیسی ہے جب وہ سنجیدہ اور محبت کی نظروں سے ہم دونوں ننھے بھائیوں کی طرف دیکھ رہا تھا میری ماں کی نگاہیں اوپر اٹھیں اس نے میرے باپ کے چہرے کو دیکھا اور مسکرائی۔ میرے والد کے لئے یہ پہلا اور آخری تبسم تھا —— ایسا شیریں تبسم —— خالہ فینی اور دوسرے دیکھنے والے لوگ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ویسا شیریں اور لطیف تبسم اس کے ہونٹوں پر کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک گھنٹہ کے اندر ہی اندر اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

۲۔ میرا بھائی

میرے والد نے خالہ فینی سے نکاح کر لیا۔ اب وہ ہمارے ساتھ رہنے لگیں۔ یہ بہت اچھا ہوا۔ میرے والد پہلے جیسی تجرد کی زندگی اختیار کر لیتے لیکن وہ ان دو ننھے ننھے بچوں کا کیا کرتے۔ بچوں کی غور و پرداخت کے لئے انہیں ایک عورت کی ضرورت تھی ان کی بیوی کی بہن سے زیادہ اور کون عورت موزوں ہو سکتی تھی۔ مجھے خالہ فینی کی سپردگی میں دے دیا گیا۔ قبل از وقت پیدائش کی وجہ سے میں قدرتی طور پر نہایت کمزور تھا۔ خالہ رات دن میرے پاس بیٹھی رہا کرتی تھیں۔ میرے والد بھی میرے لئے بہت پریشان رہا کرتے تھے اس لئے نہیں کہ ان کی زمین تین سو برس سے ورثے میں چلی آ رہی تھی اور ان کے بعد میں اس کی رکھوالی کر سکتا تھا بلکہ بات دراصل یہ تھی کہ انہیں محبت کرنے کے لئے ایک شے کی ضرورت تھی۔ اگرچہ عام لوگوں کے لئے وہ ایک جابر اور سخت آدمی تھے لیکن مجھ سے وہ بے انتہا محبت کرتے تھے۔ جتنی محبت انہیں مجھ سے تھی اتنی انہیں دنیا کی کسی چیز سے نہ ہوئی تھی۔ میری ماں کی ابتدائی زندگی اگر ان کے لئے باعث حسد و رشک نہ ہو سکی تو شاید وہ میری ماں سے بھی ویسی محبت کرنے لگتے۔ میں بھی والد کو بہت چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے گرد و پیش کے ہر شخص سے محبت کرتا تھا۔ تمام لوگ مجھے چاہتے تھے اور ہر شخص مجھ پر مہربان تھا۔ چند روز کے بعد میری جسمانی کمزوری جاتی رہی اور اب میں ایک تندرست، توانا اور خوبصورت لڑکا تھا۔ میرے والد جب کبھی مجھے نزدیک کے گاؤں میں لے جاتے تو راہ چلتا ہر آدمی مجھے دیکھا کرتا تھا۔

میں خالہ فلپی کا پیارا بچہ۔ باپ کا لاڈلا۔ گھر کے ملازموں کا محبوب کھلونا اور کھیت کے مزدوروں کا ننھا مالک تھا۔ میں ان سب کو اپنی باتوں سے بہت ہنساتا تھا۔

گرگیری مجھ سے عمر میں تین سال بڑا تھا۔ اگرچہ خالہ اس پر مہربان تھیں لیکن وہ ہر وقت اس کا خیال نہ رکھتی تھیں۔ میں چونکہ ایک نازک بچے کی صورت میں ان کی گود میں پلا تھا اس لئے انھیں ہمیشہ میری ہی فکر رہتی تھی۔ میرے والد اپنے دل سے اپنے اس سوتیلے بیٹے سے نفرت و حقارت کے جذبات کو دور نہ کر سکے جس نے انتہائی معصومیت کے ساتھ ماں کا دل جیتنے کے لئے ان کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ گرگیری کو والدہ کی موت اور میری گزشتہ نقاہت کا باعث خیال کیا کرتے تھے تاہم ان کی یہ ناراضی غیر منصفانہ تھی۔ وہ بجائے اس کے کہ اپنے دل میں اٹھنے والے نفرت و غصہ کے جذبات کو دباتے، ایک فرض سمجھتے ہوئے ان کی پرورش کر رہے تھے۔ بایں ہمہ یہ جذبات ایسی چیزوں پر اثر انداز نہ ہوئے جو پیسے کے عوض خریدی جا سکتی ہیں، گرگیری کی تمام ضروریات وہ پوری کیا کرتے تھے۔ یہ غالباً اس معاہدے کی وجہ سے تھا جو انھوں نے میری والدہ سے شادی کے وقت کیا تھا۔

گرگیری کی شکل و صورت کچھ اچھی نہ تھی، وہ سست، بیوقوف اور گنوار سا لڑکا تھا۔ کوئی کام بھی وہ صحیح طریقہ پر نہ کر سکتا تھا۔ اس کی حماقت کی وجہ سے ہر کام میں کچھ نہ کچھ خرابی آجاتی تھی۔ کھیت کے آدمی بھی اس سے ناخوش رہتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ میرے والد کی موجودگی میں اسے برا بھلا کہتے تھے۔ مجھے شرم آتی ہے۔ میرا دل بھی دکھتا ہے۔ جب یہ خیال کرتا ہوں کہ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس سے پیش آتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اپنے یتیم بھائی سے بے اعتنائی و بے پروائی برتی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی اس کی تحقیر کی ہو یا کبھی دانستہ اس کے ساتھ برا سلوک کیا ہو۔ لیکن چونکہ تمام لوگ مجھ سے محبت کرتے تھے مجھ پر مہربان تھے اور ہر جگہ میری عزت کی جاتی تھی، اس لئے مجھ میں کچھ غرور سا آگیا تھا اور میں ایک علیحدہ شان سے رہا کرتا تھا۔ میں گرگیری کو کسی ایسے کام کے کرنے کا حکم دے دیتا جسے وہ نہ کرنا چاہتا۔ میں اس پر ناراض ہو جاتا اور وہی اہانت آمیز الفاظ جو دوسرے اس کے لئے استعمال کرتے تھے دہراتا۔ حالانکہ میں ان الفاظ کا مطلب بھی نہ سمجھتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے خفا ہونے پر وہ اس کام کو کرتا تھا یا نہیں —— مجھے رنج ہوتا ہے۔ میرا دل دکھتا ہے۔ وہ کرتا تھا۔ ایسے اوقات میں وہ ملول اور افسردہ ہو کر کسی خیال میں کھو جاتا تھا۔

والد اسے ضدی اور گھنا کہا کرتے تھے۔ خالہ اسے بیوقوف کہا کرتی تھیں۔ ہر شخص کا کہنا تھا کہ وہ سست اور بیوقوف ہے، اس کی سستی اور حماقتیں دن بدن بڑھتی گئیں۔ اس کی عادت تھی کہ اکثر وہ کسی خیال میں ڈوبا ہوا گھنٹوں بیٹھا رہا کرتا تھا اگر والد اسے کھیت وغیرہ کے کسی کام کے لئے کہتے تو جب تک دو تین مرتبہ نہ کہتے وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹتا تھا۔ جب ہم دونوں کو سکول میں داخل کیا گیا تو وہاں بھی اس کی یہی حالت تھی۔ اسے اپنا سبق یاد نہیں ہوتا تھا۔ سکول ماسٹر اسے مارتے مارتے تھک گیا۔ آخرکار تنگ آکر اس نے والد سے کہا کہ وہ اسے سکول سے لے جائیں اور کھیت وغیرہ کے کسی ایسے کام پر لگائیں جو اس کی سمجھ سے بالاتر نہ ہو۔ سکول سے نکلنے کے بعد وہ اور زیادہ افسردہ اور سست رہنے لگا اس کی بیوقوفی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ غصہ ور یا ضدی نہ تھا۔ نہایت صابر اور نیک طینت لڑکا تھا۔ وہ ہر شخص سے خلوص محبت اور مہربانی سے پیش آنے کی کوشش کرتا۔ خواہ اس شخص نے چند منٹ پہلے اسے طمانچے ہی رسید کئے ہوں۔ لوگوں کی برائی کا بدلہ وہ اپنی نیکی سے دینا چاہتا لیکن اکثر اپنے بے ڈھنگے طور طریق کی وجہ سے اس کی وہی نیکی لوگوں کو ایک شرارت معلوم ہوتی۔ مجھے یاد ہے کہ میں ہر لحاظ سے سمجھدار چالاک اور عقلمند لڑکا تھا۔ ہر جگہ میری تعریف کی جاتی تھی اسکول کا میں مایہ ناز طالب علم تھا۔ میرے ماسٹر کہا کرتے تھے کہ میں جس چیز کو سیکھنا چاہتا ہوں اسے بہت جلد سیکھ سکتا ہوں۔ والد نے چونکہ خود زیادہ تعلیم نہ پائی تھی انہوں نے مجھے بھی سکول سے جلد ہی ہٹا لیا۔ وہ مجھے کاشتکاری کے امور کی دیکھ بھال کے لئے مجھے اپنے ساتھ رکھنے لگے۔ گرگیری بوڑھے آدم کی شاگردی میں تھا اسے مویشی چرانے کا کام دیا گیا تھا۔ بوڑھا آدم اب ضعیفی کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آدم ہی پہلا شخص تھا جو گرگیری کے متعلق اچھی رائے رکھتا تھا۔ وہ دعویٰ سے کہا کرتا تھا کہ میرے بھائی کے دل و دماغ میں اچھی اچھی صلاحیتیں موجود ہیں لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ کس طرح انھیں ابھارا جائے اور ترقی دے کر بروئے کار لایا جائے۔ آدم کا کہنا تھا کہ جھاڑیوں کا رستہ جاننے میں جتنا گرگیری ماہر ہے ویسا اس نے کوئی لڑکا نہیں دیکھا۔ والد چاہتے کہ آدم ان سے گرگیری کے عیوب و نقائص کے متعلق بات چیت کرے لیکن جیسے ہی آدم کو والد کا

بقیہ صفحہ ۵۴

خشا معلوم ہوتا وہ اس کی بے حد تعریف کرتا۔

ایک دفعہ موسم سرما میں جب میری عمر سولہ اور گرگیری کی انیس برس کی تھی والد نے مجھے ایک جگہ ضروری خط پہنچانے کے لئے بھیجا۔ وہ سڑک کے ذریعے سے سات میل اور پہاڑیوں کے رستے سے صرف چار میل کے فاصلے پر تھی۔ پہاڑیوں پر جگہ جگہ بہت سی کھائیاں اور دلدلی زمین تھی۔ والد نے کہا کہ جاتے وقت خواہ تم کسی رستے سے جاؤ لیکن واپسی پر سڑک کے رستے آنا۔ موسم سرما کے باعث دن بہت چھوٹے تھے رات جلدی ہو جاتی تھی۔ سر شام ہی کہر کی وجہ سے دھندلکا چھا جاتا تھا۔ علاوہ اس کے بوڑھے آدم نے جو اب مفلوج ہو چکا تھا کئی دن پہلے برفباری کی پیش گوئی کی تھی۔ میں نے اپنا رستہ جلدی جلدی طے کر کے وہ خط پہنچا دیا۔ اور خیال کیا کہ میں نے اپنا کام اس وقت سے پہلے جس کا والد نے اندازہ لگایا تھا ختم کر لیا ہے۔ رات ہونے میں ابھی کافی دیر ہے میں پہاڑیوں ہی کے رستے جلد گھر پہنچ جاؤں گا۔ چنانچہ میں پہاڑیوں کے رستے پر چلنے لگا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ سورج غروب ہو گیا اور ہلکی ہلکی تاریکی چھانے لگی۔ ہر شے پر سکوت چھایا ہوا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ برف باری شروع ہونے سے قبل ہی میں گھر پہنچ جاؤنگا۔ میں جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ لیکن جتنی تیزی سے میں چل رہا تھا اتنی ہی تیزی سے شب کی تاریکی فضا پر محیط ہو رہی تھی۔ میں جس پگڈنڈی پر چل رہا تھا اس پر کچھ دور چلنے کے بعد دو یا تین رستے مختلف سمتوں کو جاتے تھے۔ دن کے وقت روشنی میں دور کی چیزوں کو دیکھ کر رستہ معلوم کر لیا جاتا تھا۔ ایک پتھر کی چٹان ——— ایک گڑھا ——— لیکن اب تاریکی کے باعث یہ بالکل دکھائی نہ دے رہے تھے۔ میں دل مضبوط کر کے اس رستہ پر جسے میں اپنے خیال کے مطابق صحیح رستہ سمجھتا تھا چلدیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ غلط رستہ تھا میں ایسی جگہ پہنچ گیا جس سے میں قطعی ناواقف تھا۔ وہاں کی زمین ناہموار اور دلدلی تھی۔ جگہ جگہ پتھر کی چٹانیں اور گڑھے تھے اس جگہ اپنی تنہائی کا خیال کر کے میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس خوفناک خاموشی کو توڑنے کے لئے کسی شخص کے قدموں کی آواز بھی نہ آتی تھی۔ میں نے زور سے چلانے کی کوشش کی۔

مجھے اس بات کی امید نہ تھی کہ کوئی اس آواز کو سن لے گا مقصد صرف یہ تھا کہ ہمت اور طاقت جو اب مفقود ہو رہی تھی پھر عود کر آئے۔ میں چلایا لیکن میری آواز بھرائی ہوئی اور مختصر نکلی جس سے میں خود بھی خوفزدہ ہو گیا۔ شب کی تاریکی، فضا کے سکوت اور ہوا کے بوجھل ہونے کی وجہ سے مجھے اپنی ہی آواز عجیب اور بھیانک سی معلوم ہو رہی تھی۔ یکایک ہوا زیادہ بوجھل ہو گئی اور برف کے ننھے ننھے ذرات گرنے لگے۔ برف سے میرا چہرہ اور ہاتھ نمناک ہو گئے اب مجھے ذرہ بھر بھی علم نہ تھا کہ میں کس جگہ کھڑا ہوں۔ برف سے قدموں کے نشانات بھی مٹ گئے تھے اس لئے میں واپس بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ فضا پر گہری تاریکی مسلط ہو چکی تھی ایک ہی جگہ کھڑے رہنے سے میرے قدم زمین میں دھنستے تھے لیکن کھائیوں کے خوف سے میں وہاں سے ہٹ بھی نہیں سکتا تھا۔ یکایک میری نوجوانی کی قوت اور ہمت جواب دینے لگی۔ اب میں اس حالت میں پہنچ گیا کہ اپنی بیکسی اور بے بسی پر رونے لگوں صرف شرم مجھے اب تک روکے ہوئے تھی۔ اس لئے کہ مجھے رونا نہ آجائے میں خوب زور زور سے چلانے لگا موت کے خوف سے وہ نہایت دلدوز چیخیں تھیں۔ میں نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ میری چیخوں کا کوئی جواب آتا ہے یا نہیں کچھ توقف کیا۔ لیکن صدائے بازگشت کے سوا کوئی آواز نہ آئی برف لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی تھی۔ انتہائی سردی کی وجہ سے میرے ہاتھ پاؤں شل ہونے لگے۔ مجھ پر بیہوشی کی نیند طاری ہونے لگی میں نے چاہا کہ وہاں سے آگے بڑھوں لیکن پھر کھائیوں میں گرنے کے خوف سے ہمت نہ ہوئی کچھ دیر تک میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ میں نے ایک دفعہ پھر چیخ ماری لیکن انتہائی رنج و غم کے باعث میری آواز گلوگیر ہو گئی اور آنسو نکل پڑے۔ اس سنسان جگہ میں بیکسی کی موت مر جانے کے خیال سے مجھے بہت رونا آ رہا تھا۔ وہاں کھڑا میں خیال کر رہا تھا کہ گھر کے لوگ اس وقت سرخ گرم اور جانفزا آگ کے کنارے بیٹھے ہونگے۔ میری اس مصیبت سے وہ قطعی لاعلم ہونگے انہیں کیا معلوم کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ میری موت پر میرے غریب باپ کو کس قدر صدمہ ہوگا۔ اس غم سے ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا بیچارا بوڑھا آدمی ——— یقیناً وہ اس غم و اندوہ کی تاب نہ لا سکینگے خالہ فینی بھی ——— کیا اب خالہ فینی کے تمام تفکرات کا خاتمہ ہونے والا ہے؟ مجھے اپنی زندگی ایک عجیب خواب کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ گذشتہ زندگی کے تمام واقعات میری نگاہوں کے سامنے آنے لگے۔ یہ خیال کر کے کہ میں نے کس قدر مختصر زندگی پائی مجھے بیحد قلق ہوا۔ میں نے ایک دفعہ پھر اپنی تمام قوت مجتمع کر کے زور سے آواز دی ——— وہ ایک طویل اور اندوہناک چیخ تھی۔ مجھے صدائے

بازگشت کے سوا کسی آواز کے سننے کی امید نہ تھی۔ لیکن میرے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے جواب میں ایک آواز سنی۔ وہ تقریباً میری ہی آواز کی طرح طویل، خوفناک اور عجیب سی تھی۔ وہ کسی مافوق البشر ہستی کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ کسی پہاڑی بدروح کی آواز ہے جو مجھے میری بےکسی پر چڑا رہی ہے۔ میں نے اس قسم کی کئی کہانیاں سنی تھیں۔ یکایک میرے دل کی حرکت تیز ہو گئی اتنی تیز کہ میں اس کی آواز بخوبی سن سکتا تھا۔ دو تین منٹ تک میں اس کی آواز کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب مجھ میں چلانے کی قوت باقی نہیں رہی۔ اتنے میں ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ کیا یہ لیسی کی آواز ہی ہے؟ — میرے بھائی کی سفید چہرے والی خوفناک اور بدصورت کتیا؛ جس کو دیکھتے ہی میرے والد اسے پاؤں کی ٹھوکروں سے مارا کرتے تھے۔ کچھ تو خود اس کے عیوب کی وجہ سے اور کچھ اس لئے کہ وہ میرے بھائی کی کتیا تھی۔ ایسے موقع پر گریگری اسے ہمیشہ سیٹی دے کر باہر لے جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ والد نے کتیا کو بہت مارا۔ وہ درد و کرب سے چلائی اسے زخم آ گیا اور ضمیر ملامت کرنے لگا لیکن وہ اپنے ضمیر کی ملامت کو گریگری پر خفا ہو کر اور اسے برا بھلا کہہ کر دور کرتا۔ وہ کہتا کہ گریگری کو ایک کتیا سدھانے کی بھی تمیز نہیں ہے اس نے کتیا کی عادت بگاڑ رکھی ہے۔ ایک عیسائی ملک میں وہ کتیا کو باورچی خانے کے پاس ٹھہرا رکھتا ہے۔ میرا بھائی ان باتوں کا کوئی جواب نہ دیتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ سن ہی نہیں رہا ہے۔ والد کی اس خفگی پر وہ خاموش، ملول اور کسی خیال میں مستغرق دکھائی دیتا تھا — ہاں! — کتیا کی آواز آئی! — یہ لیسی کی آواز تھی میں نے زور سے پکارا، لیسی! — لیسی!! خدا کے لئے لیسی!! —

ایک لمحہ کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ سفید چہرے والی لیسی دم ہلاتے ہوئے میرے پاؤں کے چاروں طرف گھوم رہی ہے۔ اپنا چہرہ اوپر کئے وہ مجھے تیز اور دہشت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے خطرہ ہے کہ کہیں میں اسے مار نہ بیٹھوں جیسا کہ میں نے اکثر اوقات کیا تھا۔ میں جھکا اور اسے تھپکتے ہوئے خوشی سے چلایا۔ مارے سردی کے جسمانی حسیات کے ساتھ ساتھ میری دماغی حس بھی سلب ہو رہی تھی۔ لیسی کی آمد کے متعلق میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ لیکن اتنا ضرور اندازہ ہو گیا کہ اب مدد نزدیک تھی تاریکی میں یکایک ایک سایہ مجھے اپنے قریب آتا ہوا دکھائی دیا —

[illegible] تھا — اوگر گری! [illegible] [illegible] ہیں اس کی گردن میں ڈال دیا۔ مجھ [illegible] طاقت بھی باقی نہ رہی تھی۔ اُس نے خود ہی بات [illegible] پوچھا۔ کچھ دیر بعد وہ کہنے لگا۔ "ہمیں یہاں سے چلے [illegible] — اپنی عزیز جان بچانے کے لئے ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے [illegible] ہمیں گھر کا رستہ تلاش کرنا چاہئے۔ جس طرح بھی ہو ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے۔ ورنہ ہم برف میں دب کر مر جائیں گے!"

"کیا تمہیں گھر کا رستہ معلوم نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ جس وقت میں وہاں سے چلا تھا اس وقت جانتا تھا لیکن اب برف کی وجہ سے مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے خوف ہے شاید میں گھر کا رستہ بھول گیا ہوں!"

"میں نے پاس موشی چٹانے کا عصا تھا۔ وہ ہر قدم پر اسے برف میں گھسیٹتے ہوئے جا رہا تھا۔ کچھ دور تک ہم بغیر کسی چٹان یا گڑھے میں گرے سے چلے۔ لیکن یہ سست رفتاری سخت تکلیف دہ تھی میرا بھائی زیادہ تر لیسی کی رہبری اور معلومات پر بھروسہ کئے چل رہا تھا۔ لیسی اگر کچھ دور نکل جاتی تو ہمیں دکھائی نہ دیتی۔ میرا بھائی اسے سیٹی دے کر اپنے پاس بلاتا اور اس بات کا خیال رکھتا کہ وہ کس سمت سے آ رہی ہے پھر وہ اسی سمت چلنے لگتا۔ ہماری یہ آہستہ خرامی میرے خون کو منجمد ہونے سے نہ روک سکی۔ جسم کا ریشہ ریشہ سردی کی وجہ سے پہلے دکھتا پھر سوجتا اور پھر شل ہو جاتا۔ میرا بھائی چونکہ اکثر پہاڑیوں پر آیا کرتا تھا اس لئے وہ میری بہ نسبت سردی کو زیادہ برداشت کر رہا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ اپنی ہمت کو برقرار رکھوں اور اس کے سامنے کسی قسم کی شکایت نہ بیان کروں لیکن مجھے محسوس ہوا کہ موت کی نیند مجھ پر حاوی ہو رہی ہے۔

"مجھ سے اب آگے نہیں چلا جاتا۔" میں نے مرتعش اور نحیف آواز میں کہا۔ یکایک میرے حواس کچھ درست ہوئے — "میں سوؤں گا — چاہے صرف پانچ ہی منٹ کے لئے! میں سوؤں گا، خواہ اس کے نتیجہ میں مر ہی جاؤں۔" گریگری خاموش کھڑا ہو گیا میرا خیال ہے کہ میری آواز سے اس نے میری اندرونی کیفیت کا پتہ لگا لیا تھا۔

"اب چلنا بیکار ہے!" وہ کہنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود سے کہہ رہا ہے۔ "میرا خیال ہے کہ اب ہم پہلے کی بہ نسبت گھر سے زیادہ دور رہ گئے ہیں۔ ہماری امید صرف لیسی ہی کی ذات پر منحصر ہے۔ ادھر آ لڑکے! — کمبل کو اچھی طرح اوڑھ لے — اس چٹان کے سائے میں لیٹ جا — چٹان کے بالکل نزدیک سرک جا اس طرف میں تیرے بازو میں لیٹ جاؤں گا — اور کوشش کروں گا کہ گرمی ہمارے جسموں میں برقرار رہے۔ ٹھہر کیا تیرے پاس ایسی کوئی چیز ہے جسے دیکھتے ہی گھر کے لوگ پہچان جائیں؟"

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جلد سونے نہ دیکر وہ مجھ پر ظلم کر رہا ہے لیکن جب اس نے بار بار پوچھا تو میں نے اپنی جیب سے وہ رومال جس پر خالہ فینی نے پھول کاڑھے تھے نکالا۔ میرے ہاتھ سے رومال لیکر اس نے لیسی کی گردن میں باندھ دیا۔ "لیسی تو گھر جا — لیسی بہت تیزی سے گھر جا! —" اور وہ سفید منہ والا جانور نہایت تیزی سے سنسناتی ہوئی گولی کی طرح تاریکی میں غائب ہو گیا۔

"مجھے اب لیٹ جانے دو — مجھے اب سو جانے دو"

میں نے کہا۔ مجھ پر بیہوشی کی نیند طاری ہو رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ میرے جسم کو میرے بھائی نے اچھی طرح ڈھانک دیا ہے۔ کس چیز سے — یہ مجھے معلوم نہ تھا اور نہ میں نے

اس کے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ میں اتنا مست، اتنا خود غرض اور غصے سے مغلوب تھا کہ میں نے اس کا خیال نہ کیا ورنہ مجھے معلوم ہو جاتا کہ اس مکمل جگہ میں میرے بھائی کے کپڑوں کے علاوہ اور کوئی چیز ہیرا پن کو ڈھانکنے کے لئے نہ تھی۔ میرا بھائی جب اپنے غم کو بھول کر میرے بازو میں لیٹ گیا تو مجھے یک گونہ خوشی محسوس ہوئی، میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"تجھے یاد نہیں لڑکے! ——— بالکل اسی طرح ہم اپنی مرنے والی ماں کے پاس لیٹے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے تیرا چھوٹا سا ننھا ہاتھ پکڑایا تھا ——— مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے اس وقت وہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔ ہم بہت جلد اس کے پاس پہنچ جائینگے ——— خدا کی مرضی ہر صورت میں پوری ہو کر رہے گی۔"

"پیارے گرگری!" میں بڑبڑایا اور گرمی حاصل کرنے کے لئے اس کے قریب سرک گیا۔ وہ اب بھی باتیں کر رہا تھا۔ پھر کچھ ہماری ماں کے متعلق! ——— لیکن مجھ پر بیہوشی کی نیند طاری ہو گئی۔

ایک لمحہ کے بعد ——— یا ایسا مجھے محسوس ہوا میرے متعلق کئی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے چاروں طرف لوگ مجھے گھیرے ہوئے بیٹھے تھے۔ جانفزا گرمی میرے جسم میں سرایت کر رہی تھی، اس وقت میں اپنے مکان میں بستر پر تھا۔ شک ہے کہ پہلا لفظ جو میرے منہ سے نکلا "گرگری" تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر یکے بعد دیگرے تمام لوگوں کو دیکھا۔ میرے والد نے اپنے چہرے کی سختی اور کرختگی برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے دفور غم سے ان کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

"میں نے اپنی آدھی زمین اسے دے دی ہوتی۔ میں اس کے قدموں میں گر کر اس سے اپنی سختی اور بے رحمی کی معافی مانگتا!" اس کے بعد میں کچھ نہ کہہ سکا دماغ میں ایک چکر سا آیا جس نے مجھے پھر بیہوش کر دیا۔

کئی ہفتوں کے بعد آہستہ آہستہ میرے احساسات بیدار ہوئے جس وقت میں صحتیاب ہوا والد کے تمام بال سفید ہو گئے تھے جب وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتے ان کے ہاتھ لرزنے لگتے اس کے بعد ہم لوگوں نے گرگری کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ اس متعلق ہم کوئی بات کر ہی نہ سکتے تھے لیکن عجیب طرح اس کا خیال ہمارے دماغ پر مسلط تھا۔ یعنی اب بلا روک ٹوک گھر میں

آیا جایا کرتی۔ اب اسے کوئی کچھ نہ کہتا۔ میرے والد اسے پیار سے تھپکی دینے کے لئے ہاتھ بڑھاتے لیکن وہ جھجک کر دور ہٹ جاتی۔ اس بے زبان جانور کی اس حرکت سے والد کو بہت ندامت ہوتی۔ وہ ایک آہ بھرتے اور ساکت و صامت کسی خیال میں کھو جاتے۔

خالہ زینب ــــ وہ بہت زیادہ باتونی واقع ہوئی تھیں۔ انھوں نے مجھے سب کچھ بتادیا۔ اس خوفناک رات کو میرے والد میرے نہ آنے کی وجہ سے سخت پریشان ہو رہے تھے شام کے وقت وہ گرگری پر بہت خفا ہوئے انھوں نے گرگری کو اس کے باپ کی غربت اور خود اس کی بیوقوفی پر سخت لعنت ملامت کی۔ بڑے آدم کی رائے کے باوجود والد کا کہنا تھا کہ گرگری کسی کام کا نہیں ہے۔ آخرکار گرگری کی ہی سے انتہا اس نے لیسی کو جو باربیٹ اور ٹھوکروں سے بچنے کے لئے زینب کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی سیٹی دیکر بلایا۔ کچھ عرصہ پہلے خالہ زینب اور والد کے درمیان میری واپسی کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ خالہ زینب کا خیال ہے کہ گرگری کو اس آنے والے طوفان کا علم ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ مجھے لینے کے لئے خاموشی سے چلا گیا ـــ تین گھنٹے بعد جب تمام لوگ پریشانی اور سراسیمگی کی حالت میں یہاں وہاں پھر رہے تھے ـــ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے کہاں تلاش کریں ـــ گرگری کہاں چلا گیا! غریب جانور ـــ غریب ـــ غریب جانور لیسی گھر میں داخل ہوئی۔ اس کی گردن میں میرا رومال بندھا ہوا تھا لوگوں نے دیکھا اور سب کچھ سمجھ گئے۔ تمام لوگ لحاف، کمبل، برانڈی اور لالٹین لے کر لیسی کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے لیسی نے انھیں اس چٹان کے نیچے جہاں میں بیہوشی کی نیند سو رہا تھا پہنچا دیا۔ میں زندہ تھا۔ میرا تمام جسم میرے بھائی کے کمبل سے اچھی طرح ڈھکا ہوا تھا اس کا گرم کوٹ نہایت احتیاط کے ساتھ میرے پاؤں کے چاروں طرف لپٹا ہوا تھا۔ میرے بھائی کے جسم پر صرف ایک قمیص تھی۔ اس کے بازو بے کھیرے ہوئے تھے۔ ایک خوبصورت تبسم؛ ـــ (وہ اپنی زندگی میں شاید ہی کبھی مسکرایا ہو) اس کے ساکن، مردہ اور زرد چہرے پر رقصاں تھا۔

"خداوند خدا! تو مجھے معاف کر جس نے اس یتیم بچے پر بہت سی سختیاں کی ہیں ـــ" یہ میرے والد کے آخری الفاظ تھے۔

اس کے علاوہ ان کی ندامت کے جذبات کی گہرائی اور اس والہانہ محبت کا اندازہ جو انھیں میری ماں کے ساتھ تھی اس سے ہوتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد ہمیں ایک وصیت نامہ ملا جس میں انھوں نے اپنی یہ آرزو ظاہر کی تھی کہ میری ماں کی قبر (جس میں گرگری کو بھی میرے والد کی خواہش کے مطابق دفن کیا گیا تھا۔) کے پائنتی انھیں دفن کیا جائے۔

حریم جمال

از حضرت عاصم جے پوری

ہے کس بلا کا جاذب دل پُر ملال میں — جلوے تڑپ رہے ہیں حریم جمال میں
ہو دل کا زخم ہی نہ تماشہ گہ کلیم — ہوتا ہے جس طرح مہ کامل ہلال میں
پھر کس کے لئے ہیں یہ طرب آفرینیاں — جب تم چھپے ہوئے ہو دلِ پُر ملال میں
اے بیکسی یہی نہ ہو منزل گہِ اُمید — ذرّے چمک رہے ہیں جو گرد ملال میں
آئینہ آپ کا مرے پہلو میں رہ گیا — لے جائیے اسے بھی حریم جمال میں
عاصم بھی بت پرست ہے اے برہمن مگر — بت تیرے بتکدے میں ہیں اس کے خیال میں



چمنستانِ سخن

دو جُرعے

از جناب اقبال حسین شبنم (سترکھ)

(۱)

دردِ بے پایاں نہیں یا سوزش کامل نہیں
آپ کا بخشا ہُوا سب کچھ ہے لیکن دل نہیں

باتوں باتوں میں ہنسی اچھی سرِ محفل نہیں
دیکھئے دل کا مچل جانا کوئی مشکل نہیں

قابلِ تحسیں ہے شانِ ارتباطِ باہمی
دم قدم تک دل کے غم ہیں غم نہیں تو دل نہیں

ہے یہی شاید کمالِ جذبۂ دیوانگی
اپنی منزل کو سمجھتا ہُوں مری منزل نہیں

داغ لگ جائے گا دامانِ وفا پر دیکھنا
شکوۂ قاتل مناسب اے دلِ بسمل نہیں

تو ہی حافظ ہے الٰہی کشتیٔ اُمّید کا
ہر جگہ گرداب ہی گرداب ہے ساحل نہیں

اُس بُتِ بیدرد کی اُلفت کا حاصل کچھ نہ پُوچھ
اب مجسّم درد ہے سینے میں شبنم دل نہیں

(۲)

برگِ شکستہ ہوں کہ نہالِ بُریدہ ہُوں
جس حال میں بھی ہوں غرض آفت رسیدہ ہُوں

رنگِ پریدہ اور نہ بوئے رمیدہ ہُوں
بے قیدِ جسم، صورتِ روحِ آفریدہ ہُوں

سوزِ دروں سے خشک ہُوا خونِ دل تمام
پھر بھی یہ حوصلہ ہے کہ میں آبدیدہ ہُوں

شغلِ شرابِ ناب سے محروم، الحذر
ساقی ترا غلامِ درم ناخریدہ ہُوں

ناساز ہیں جنوں کو ہوائیں بہار کی
تاثیرِ فصلِ گُل سے گریباں دریدہ ہُوں

ہے کامگاریوں میں بھی ناکامیوں کا رنگ
منزل کے سامنے ہُوں مگر پا بریدہ ہُوں

زیبا ہے ناز والوں کو شبنم کشیدگی
میری کہاں مجال کہ میں بھی کشیدہ ہُوں

تمدّن ایک مغربی فلسفی کی نظر میں

از جناب ... ایم اے ... پنجابی

معمولی الفاظ کے مفہوم کو متعین کرنا بھی نہایت دشوار کام ہے کیونکہ عوام نے معمولی الفاظ کے مفہوم کو سمجھنے میں بھی بہت بڑی غلطیاں کی ہیں۔ آزادی، مساوات، ترقی، تہذیب و تمدن، امن و امان ایسے الفاظ ہیں جن کا مفہوم ابھی تک متعین نہیں ہو سکا۔ اور ان الفاظ کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی صورت میں بہت سی قوموں کو گوناگوں مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ جو جنگوں کی صورت میں اقوام عالم کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔ اسی قسم کا لفظ "تمدّن و تہذیب" ہے جس کے صحیح مفہوم کو عام لوگ ابھی تک نہیں سمجھ سکے ہیں بعض لوگوں نے اس کا مفہوم اس طرح سمجھا ہے کہ تمدن و تہذیب خورد و نوش اور لباس میں تکلّف و تصنع سے کام لینے کا نام ہے۔ بعض اشخاص علم و ادب اور شعر و شاعری کی ترقی و ترویج کو تمدن کے مفہوم میں شامل سمجھتے ہیں یا معاشری معیار کو بلند کرنے کو تہذیب و تمدّن خیال کرتے ہیں بعض افراد تجارت و صنعت یعنی اقتصادی خوشحالی کو تمدن کا مرادف خیال کرتے ہیں۔ اور ایک جماعت ایسی بھی ہے جو تمدّن و تہذیب کو ایسی قوت اور طاقت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جس سے کمزوروں کو غلام بنایا جائے اور ان کی آزادی سلب کر کے انہیں اپنی خواہشات کے مطابق چلایا جائے جیسا کہ آج کل ہٹلر تباہی کا دیوتا بن کر کمزوروں پر اپنے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔ اور اس غارت گری کو "نئی تہذیب اور نیا نظام" سمجھے بیٹھا ہے۔ مگر ان غلط فہمیوں کے باوجود ایک حقیقت شناس تمدن کے اجزائے اصلیہ کو متعین کر سکتا ہے۔ جیسا کہ ایک مشہور یورپین ماہرِ اجتماعیات نے تمدن کو دس اصولوں کا مجموعہ قرار دیا ہے اور جو قوم ان اصولوں کے مطابق عمل پیرا ہو گی وہ صحیح معنوں میں متمدن کہلانے کی مستحق ہے چنانچہ ہمارے خیال میں بھی یہ دس اصول ایک حد تک تمدّن کے صحیح مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ لہٰذا قارئین کی معلومات کے لئے ہم انہیں ذیل میں درج کرتے ہیں۔

صحتِ عمومی

کوئی شخص اس سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ سب سے اعلیٰ درجہ ارتقا یہ ہے کہ نوع انسانی کی صحت خوشگوار رہے اور اس کے آلام و مصائب میں تخفیف کی جائے اور وہ تمدّن جس میں انسانی صحت تنزل پذیر ہو حقیقی تمدن نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس عمومی صحت کا اندازہ کرنے کے لئے وفات و پیدائش و امراض نیز معمر آدمیوں کے علاوہ شمار سے کام لیا جا سکتا ہے اور سب سے اہم چیز اموات کے تعداد و شمار اور تمام باشندوں کی تعداد کا سالانہ تناسب ہے۔

اقتصادی حالت

مادی ثروت وہ بنیاد ہے جس پر تمدّن کی بنیاد قائم ہے اور دولت سے مراد وہ تمام وسائل ہیں جن سے انسان قدرت کو مسخر کر سکے اور قدرتی ذرائع سے مناسب فائدہ حاصل کر سکے خواہ یہ ذریعہ صنعت و حرفت کا ہو یا زراعت و تجارت کا ہو یا ذرائع آمد و رفت کی توسیع ہو۔ چنانچہ جس قوم کے "ذرائع دولت" زیادہ وسیع ہوں گے، اسی قدر وہ ترقی کے اونچے مرتبے پر فائز ہو گی۔

دولت کی مناسب تقسیم

صرف مادی دولت کا بافراط موجود ہونا کافی نہیں ہے۔ بلکہ صحیح تمدّن کے حصول کے لئے دولت کی منصفانہ تقسیم بھی نہایت ضروری ہے اسی وجہ سے اشتراکیوں کا یہ قول بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظام جو کروڑپتی دولتمندوں کے ساتھ ساتھ ننگے بھوکوں کی جماعت بھی پیدا کرتا ہے۔ اس قابل نہیں ہے کہ ہم اسے صحیح تمدّن کے نام سے بھی منسوب کر سکیں۔ لہٰذا اصلاح پسندوں کے نزدیک وہ نظام تمدن قابلِ اتباع ہو سکتا ہے جس میں تمام قوم بلا لحاظ نسل و قومیت منصفانہ اور مساویانہ حیثیت سے بہرہ ور ہو۔ مگر یہ بھی خیال رہے کہ اس طریقے سے فطری قوانین و اصول میں رخنہ اندازی نہ ہو۔

اجتماعی نظام

تمدّن کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملک میں عام امن و امان ہو

جب تک انسان اپنی جان و مال کی حفاظت سے مطمئن نہیں ہوگا اس وقت تک وہ کوئی مفید کام نہیں کر سکے گا اور یہ ذہن نشین رہے کہ وحشیوں اور مجرمین کی ایک بڑی تعداد بڑے بڑے شہروں میں بھی رہتی ہے۔ جو وہاں کے باشندوں میں بدامنی پھیلانے اور ان کی جان و مال پر دست اندازی کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اس لئے کسی قوم کی حالت کا اندازہ کرتے وقت وہاں کے مجرمین کے اعداد و شمار اور مجموعی آبادی کے ساتھ ان کے تناسب پر غور و خوض کرنا چاہئے۔ اور ان اعداد و شمار سے اس قوم کے اجتماعی نظام کی اصل حقیقت منکشف ہو سکے گی۔

بہتر حکومت

حکومتوں کی کئی قسمیں ہیں مگر سب سے بہتر حکومت وہ ہے جو رعایا کے مفاد کی حفاظت کا کما حقہٗ انتظام کرے۔ عدل و انصاف کو اختیار کرتے ہوئے ان کے ذرائع معاش میں سہولت پیدا کرے۔ نیز خوشحالی اور ثروت کے مناسب طریقے رائج کرے۔ اگر تم یہ معلوم کرنا چاہو کہ حکومت اپنے فرائض کہاں تک ادا کر رہی ہے تو ان اصولوں کے مطابق ان کے اعمال کا جائزہ لو۔ مگر جب بُری حکومت کسی قوم پر مسلط ہو جاتی ہے یا اس کا نظامِ حکومت بدتر ہو جاتا ہے تو اس وقت افراد کی کوششیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ اور وہ کوئی مفید کام سرانجام نہیں دے سکتے۔

توسیعِ حریت

کسی قوم کے تمدن کا بہترین معیار یہ ہے کہ اس کے افراد میں حریت و آزادی کا جذبہ پیدا ہو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حکومت اپنے فرائض کو بخوبی سرانجام دیتی ہے مگر اپنے افراد کی آزادی میں مداخلت کرنے سے اس کی ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جنگ عظیم سے پہلے جرمنی کی حکومت نے اپنے افراد کی آزادی میں مداخلت کی اور چونکہ صحیح معنوں میں جمہوری حکومت نہیں تھی۔ اس لئے جنگِ عظیم میں اسے مختلف مصائب سے دوچار ہونا پڑا اور آج کل بھی جرمنی میں افراد کی آزادی سلب کر لی گئی ہے جس کا نتیجہ آخرکار نہایت خطرناک ہوگا۔ حقیقی جمہوری حکومت کے دو فرائض ہیں۔ پہلا فرض مساوات قائم کرنا ہے یعنی تمام افراد کو مناسب مواقع عمل کرنے میں رکاوٹ نہ پیدا کی جائے۔ اور اس سلسلے میں کسی مخصوص طبقے کی رعایت نہ کی جائے۔ نیز حکومت کو رائے عامہ کی مرضی کے مطابق چلایا جائے۔ دوسرا فرض یہ ہے کہ افراد کی آزادی کو برقرار رکھا جائے۔ یعنی ہر فرد حتی الامکان اپنی زندگی کے مخصوص کاموں کے سرانجام دینے میں آزاد ہو اور تحریر و تقریر، معاشری اور مذہبی رسوم کی ادائیگی میں اس کو پوری آزادی حاصل ہو۔

تعلیمی توسیع

نوشت و خواند کی تعلیم سے انسان اپنے طریقۂ معاش اور مفید اشیا سے مستفید ہونے کے وہ بڑے بڑے ذرائع معلوم کر لیتا ہے جو اس کے بغیر نہیں معلوم ہو سکتے اور اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ مدارس ترقی کا سنگِ بنیاد ہیں۔ اور جس قدر مدارس میں ترقی و توسیع ہوتی جائیگی اسی قدر تمدن بھی ارتقا پذیر ہوگا۔ بعض ممالک میں تعلیم خاص طبقے تک محدود ہوتی ہے۔ مگر کوئی قوم تمدن کے بلند مرتبے پر نہیں پہنچ سکتی جب تک اس کے عوام تعلیم یافتہ، مہذب اور شائستہ نہ ہوں۔

علوم و فنون کی ترقی

تمدن کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ علماء، مخترعین، موجدوں اور محققین کی کثرت ہو۔ یعنی متمدن قوم دوسروں سے اقتباس کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ وہ خود استنباط و اختراع کرے۔ اور اسی طرح علوم و معارف انسانی کے خزانوں میں جدید نظریات، ایجادات اور مفید خیالات کا اضافہ کرے۔

فنونِ لطیفہ کی ترقی

جس طرح علوم و فنون کا مقصد انکشافِ حقیقت ہے بعینہٖ فنونِ لطیفہ کا مقصد جمالیات کا ادراک اور اس کی نقاب کشائی ہے۔ چنانچہ مصوری، سنگتراشی، موسیقی اور شعر تمدن کے بہترین مظاہرے ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ معنوی کمال کے بغیر مادی ترقی تکمیل پذیر نہیں ہو سکتی۔

خواتین کی حالت

کوئی تمدن ایک ہاتھ سے مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے دو مساوی قوی بازوؤں یعنی مرد عورت دونوں کی ضرورت ہے۔

لہٰذا انسانیت کے دو اجزا مرکبہ میں سے ایک جز کو مقدم سمجھنے سے [illegible] حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ دونوں کے تعاون اور اشتراک عمل کی ضرورت ہے۔ اسی وجہ سے جدید علم الاجتماع کا یہ مسئلہ ہے کہ قوموں کی ترقی کا راز ان کی خاندانی معاشرت میں مضمر ہے۔

مذہب و اخلاق سے بے اعتنائی

فاضل موصوف نے ان بنیادی ضروری اصولوں کے ذریعے تمدن کا صحیح مفہوم سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے لیکن اگر اس معیار کے مطابق موجودہ مغربی حکومتوں اور قوموں پر بھی نظر ڈالی جائے۔ تو بہت کم قومیں اور سلطنتیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ شاید بعض جمہوری حکومتیں کسی حد تک اس معیار کے مطابق صحیح طور پر متمدن ثابت ہو سکیں۔ ورنہ تہذیب و تمدن کا جو نمونہ ڈکٹیٹروں کی حکومتوں نے پیش کیا ہے وہ تاریخ عالم پر ہمیشہ کے لئے یورپ کی تہذیب کا بدنما داغ بن کر رہیگا۔

فاضل موصوف نے سب کچھ بیان کیا۔ مگر وہ چیز جو تہذیب و تمدن کو پائدار اور مستحکم بنانے میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اس کو نظرانداز کر دیا گیا ہے یعنی مذہب و اخلاق کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مذہبی و اخلاقی اصولوں سے اس بے اعتنائی کا نتیجہ ان خطرناک جنگ کی صورت میں برآمد ہو رہا ہے۔ جس میں محوری طاقتوں نے مذہب و اخلاق کے تمام اصولوں کو پس پشت ڈال کر رہی تہذیب میں غارتگری اور آدم کشی کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ لیکن اگر مذہب و اخلاق کے اصولوں پر عمل ہوتا تو اتنی خوفناک جنگیں اور اس قدر مہلک سامان جنگ وجود میں نہ آتے۔ لہٰذا ہمارے خیال میں مذہب و اخلاق نہ صرف تمدن و تہذیب کی حفاظت کرتے ہیں۔ بلکہ قوموں کی نجات اور بقا و زیست کا دارومدار بھی انہی پر ہے۔ اور انہی سے تہذیب و تمدن کی عالیشان عمارت مستحکم ہو کر پائدار رہ سکتی ہے۔ یورپ کی اس حالت کو دیکھ کر تقریباً ایک تہائی صدی پیشتر علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا تھا ؎

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

یہ اشعار بھی اسی موضوع پر کیا خوب اور حسب حال ہیں ؎

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

روحانی سرزمین

نظم

از حضرت جلال ملیح آبادی

(۱)

چھڑے ہوئے ہیں ترانے پھر آج وقتِ غروب   مہک رہے ہیں گلستاں مہک رہی ہے دُوب
دمک رہا ہے شفق میں شراب ناب کا رنگ   مچل رہا ہے فضاؤں میں آفتاب کا رنگ
بدل رہی ہے شعاعوں سے سبزہ زار کا رُوپ   شفق کے ابر سے چھنتی ہوئی سنہری دھوپ
شفق کے ابر میں قالین بن رہا ہے کوئی
ہر ایک جلوے پہ افشاں سی چُن رہا ہے کوئی
شبابِ شعر کے پرچم اُڑا رہا ہے ضرور   پسِ شفق یہ کوئی مُسکرا رہا ہے ضرور
مچل رہے ہیں مناظر بدل رہی ہے فضا   شمیمِ گل سے معطر ہے عطر بیز ہوا
یہ جلوے شام کے پانی میں جگمگاتے ہیں
کنارِ آبِ رواں آئینہ دکھاتے ہیں

(۲)

ہر ایک سُو ہیں بہاریں جدھر بھی جائے نگاہ   اسی زمیں پہ مری مفلسی نے لی ہے پناہ
نہ ذوقِ سطوتِ شاہی نہ خنجرِ پندار   یہاں نہ "جھوٹی محبت" نہ طنز کی تلوار
یہاں نہ ظرف کی تنگی، نہ مفلسوں سے عناد   یہاں نہ دل میں کدورت، نہ طینتوں میں فساد
یہاں خوشی پہ مسرت، نہ غم پہ ہے فریاد   یہاں لبوں پہ ہے ہر وقت "ہر چہ باد اباد"
خیالِ مفلسی اس جا نہ مال و زر کا غرور   ہر ایک حال میں یہ سرزمین ہے مسرور

(۳)

یہاں ظفر کا جنوں مجھکو کھینچ لاتا ہے   مرا فریبِ سکوں مجھکو کھینچ لاتا ہے
مری عروسِ سخن کی ہے جلوہ گاہ یہی   مری غریب جوانی کی ہے پناہ یہی
زمانہ ساز رفیقوں سے فراغت ہے یہاں
جنوں مزاجِ ظفر سے مطابقت ہے یہاں

میں نے یہ نظم ظفر کے گاؤں بندرہ کے قیام میں لکھی تھی۔ جلال

گلاب کا پودا

فارسی کا ایک تمثیلی افسانہ

از جناب سید علی رضا لکھنوی

اُسے یہ علم نہیں کہ اس کی تخلیق کیونکر ہوئی؟ اور یہ بھی یاد نہیں اس نے اپنا بچپن کہاں گذارا۔ وہ پرانی اور فضول باتیں یاد نہیں رکھتا اس لئے لوگ کہتے ہیں کہ اس کی یادداشت اچھی نہیں۔ مگر وہ آئندہ کی تمام باتیں جانتا ہے اور خبریں دے سکتا ہے۔

پہلی بار جب اس نے ہوش سنبھالا تو وہ ایک ہرے بھرے باغ میں بڑی آن بان سے سر اٹھائے کھڑا تھا۔ ایک طرف بڑے بڑے درختوں کے پتوں میں چھپا ہوا مکان نظر پڑا۔ دوسری طرف ایک جالی دار بلند دیوار دکھائی دی۔ جس کے برابر ایک گلی بھی تھی۔ اس کے پاس ایک قدآور دبلا آدمی اسے کھانا دے رہا تھا۔ پھر وہ فوارے میں پانی لایا اسے نہلایا اور اس کی پیاس بجھائی۔ تیلیوں سے اس کی نازک باہوں کو باندھا کہ کہیں جھکتے جھکتے ٹوٹ نہ جائیں۔ گلاب مسکرایا اور سوچنے لگا کہ وہ اپنے مشفق کا احسان کس طرح اتارے؟

جب بہت سی کلیاں قہقہہ لگا کر پھول بن گئیں، ان کے گال خوب سرخ ہوگئے اور ان کو اپنی مست خوشبو پر ناز ہونے لگا تو گلاب نے سوچا اب وہ اپنے مشفق کے احسان کا بدلہ ادا کرے گا۔ جب اس کا مشفق آیا تو اس نے شرم اور مسکراہٹ سے شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "اب اپنے احسان کے بدلہ میں مجھ سے چند گلاب لے لے"۔ باغبان نے کہا "نہیں۔ تو میری ملکیت نہیں ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ اپنی بیمار بیوی کے لئے کچھ پھول لے جاؤں مگر میں مجبور ہوں"۔

"میں تیری ملکیت نہیں؟" گلاب نے تعجب سے کہا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ جو میرے لئے اتنی محنت کرے۔ جو میری پرورش کرے۔ میں اس کی ملکیت نہ ہوں تو پھر کس کی؟"

باغبان نے پتوں سے ڈھکے ہوئے گھر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تو اس عورت کی ملکیت ہے جو اس میں رہتی ہے"۔

"ناممکن!" گلاب نے تیور بدل کر کہا۔ "اس کو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ نہ اس نے مجھ کو سینچا، نہ میرے گھر کو درست کیا۔ نہ میری باہوں میں کبھی تیلیاں باندھیں۔ پھر کس طرح میں اس کی ملکیت ہوسکتا ہوں"۔ اس نے بھولے پن سے کہا۔

"اس نے تجھے خریدا ہے"۔ باغبان نے جواب دیا۔

"او۔ یہ بات ہے۔" میری مالکہ نے کتنی تکلیف اٹھا کر روپیہ جمع کیا ہوگا۔ تب مجھے خریدا ہوگا۔ اچھا میرے آدھے پھول اس کی ملکیت ہونگے"۔

"تو اس وقت تک دنیا کو نہیں پہچانتا پیارے گلاب!" باغبان نے طنز آلود مسکراہٹ سے کہا۔ "روپیہ حاصل کرنے کے لئے اسے ذرا بھی زحمت گوارا کرنا نہیں پڑی"۔

"پھر اس کے پاس اتنا روپیہ کیسے آیا؟" گلاب نے معصومیت سے پوچھا باغبان بولا "وہ ایک بہت بڑے کارخانے کی مالکہ ہے جس میں ہزاروں آدمی نوکر ہیں۔ وہیں سے اس کے لئے روپیہ آتا ہے"۔

گلاب کے پودے نے اس بیوقوفی کی بات پر جھلا کر اپنی ایک شاخ اونچی کی اور اسے ڈرایا کہ وہ اپنے کانٹے چبھو دے گا۔ وہ نوجوان ہے اور ناتجربہ کار بھی اور انسانوں کے حالات سے بالکل بے بہرہ۔ پھر بھی کیا وہ اتنا پاگل ہے کہ اس نے چیونٹی اور شہد کی مکھی نہ دیکھی ہو اور یہ تو اسے یقین ہے کہ جو شخص جس چیز کے لئے محنت کرتا ہے اور تکلیف اٹھاتا ہے وہ اسی کی ہوتی ہے"۔ اس لے جھلا کر کہا۔

باغبان نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "انسانوں میں یہ قاعدہ نہیں یہاں جو شخص محنت کرتا ہے اسے اتنا ہی ملتا ہے کہ بھوک سے مر نہ جائے اور محنت کا پھل کام کرانے والے کا ہوتا ہے اور وہ اس سے عالیشان عمارات اور باغات خریدتا ہے"۔

گلاب نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

مالی نے کہا۔ "ہاں!" اور آبدیدہ ہو کر پھر اپنے کام پر چل دیا۔

گلاب سوچنے لگا۔ مگر جتنا سوچتا اتنی ہی اس کی پریشانی اور بڑھتی جاتی تھی۔ اسی دوران میں ایک شہد کی مکھی اسے ملنے آئی مگر گلاب نے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ وہ شرمیلی اور نوجوان تھی گھبرا گئی اور بہت دور اُڑ گئی۔ جب قدرے ہوش آیا تو شرمندہ ہوا اول تو یہ کہ خود باادب اور شرمیلا تھا دوسرے یہ خیال آیا کہ باغبان کی بات کی تصدیق ہوجاتی۔ اسی دُھن میں ڈوبا تھا کہ کسی نے زور سے

ہلاکر پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو دوست!" گلاب نے اپنی لاتعداد آنکھوں سے پہچانا ہوا تھا۔ خوشی کے مارے اپنی زلفوں کو ہلا رہی تھی۔ موقع پاکر پوچھا۔ "پیاری ہوا تم بڑے اچھے موقع پر آئیں۔ بتاؤ باغبان سچ کہتا تھا یا نہیں؟"

ہوا نے پوچھا۔ "باغبان کیا کہتا تھا؟"

گلاب نے باغبان کی باتیں دہرائیں اور کہا۔ "باغبان کہتا تھا کہ انسانوں میں یہ قاعدہ ہے کہ جو انسان بہت محنت کرتا ہے اسے صرف اتنا ملتا ہے کہ وہ بھوکا نہ رہ سکے اور باقی سب کام کے کرانے والے کا حصہ ہوتا ہے۔"

ہوا نے یہ سن کر اپنی صورت بہت متعزز بنائی۔ مجسم ہوکر اپنے دانتوں سے آواز نکالی اور اتنے غصہ میں آئی کہ گلاب کا پودا بھی کانپنے لگا اور کہا۔ "ہاں باغبان بالکل درست کہتا تھا۔ بلکہ انسانوں کی باتیں اس سے بھی بہت بڑھ چڑھ کر ہیں۔ میں تو ہر وقت ساری دنیا میں پھرا کرتی ہوں۔ ہر چیز میری نظر سے گذرتی ہے اور اکثر میں اس روپیہ کو دیکھ کر غصہ سے کانپنے لگتی ہوں۔ اس وقت یہ بیوقوف انسان مجھے طوفان کہتے ہیں۔"

گلاب کے پودے نے اس انسانی انوکھے قاعدے کی تصدیق پر تعجب کیا۔ اس نے پھر پوچھا کہ "آیا یہ سچ ہے کہ امیر لوگ دنیا کی ہر چیز خرید سکتے ہیں؟"

ہوا نے چلّاکر جواب دیا۔ "بیشک!" پھر ہنسی اور کہا۔ "لیکن وہ مجھے نہیں خرید سکتے۔ نہ مجھے کسی طرح قید کر سکتے ہیں اور نہ میرے ساتھ چل ہی سکتے ہیں۔ میں تو غریبوں کی دوست ہوں۔ ہر ملک میں جاتی ہوں۔ ہر جگہ چلتی ہوں، ہر مقام کی سیر کرتی ہوں اور عاجز و بیکس انسان کے لئے آزادی اور حق کی صدا لگاتی ہوں۔ اپنے کام کا ایک خاص اصول بناتی ہوں اور سب کو سناتی ہوں: "ہمت کرو ایک ہو جاؤ۔ جنگ کرو۔ فتح پاؤ گے۔" اس وقت ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں از سر نو طاقت پیدا ہوگئی ہے اور وہ دوست کی طرح میری گفتگو سنتے ہیں۔" ہوا مسکرائی۔ باغ کے پتے ہلنے لگے۔ پھر اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "امیروں کی بڑی خواہش ہے کہ مجھے قید کرلیں کیونکہ میں ہر ملک میں خوشخبری لے جاتی ہوں لیکن میں بھی ان کو ذرا چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ راتوں کو جب وہ غریبوں کو ستاکر سوتے ہیں تو ان کی کھڑکیوں کو اتنی زور سے دھکا

دیتی ہو کہ وہ اپنے نرم بستر پر میٹھی نیند سے چونک کر کانپنے لگتے ہیں تب میں ان کے کان میں بے زبانی سے چلا چلا کر کہتی ہوں۔ " اے بیکار سست لوگو! تمہارا دور گذر چکا۔" تو وہ اپنے کانوں پر خوف سے اپنے ریشمی لحاف ڈال لیتے ہیں۔ اپنے دلوں کو تسکین دیتے ہیں۔ مگر یہی نہ تھا۔ پھر ہوا ایک طرف چلی اور اتنے زور سے اس شاندار سفید عمارت میں گونجی کہ کھڑکیوں سے صدائیں پیدا ہونے لگیں۔ اور ان میں سے ایک ٹوٹ کر اندرونی حصہ میں گر کر چور چور ہو گئی۔ پھر ایک عورت کے چلانے کی آواز آئی۔ ہوا مسکرائی اور اپنے پاؤں سمیٹ کر گلاب کے پاس آئی اور کہا۔ "تم بھی ایک کام کر سکتے ہو کہ امیروں کے لئے اب نہ پھولو اور پھلدار درختوں کو بھی چاہئے کہ ان کو ایک بھی میوہ نہ دیں مگر تم لوگ سب بیوقوف اور شیخی باز ہو۔ دیکھو نہ لالہ کے پھول وہ دن بھر سر بلند رہتے ہیں اور شیخی بگھارتے ہیں کہ ہم کتنے خوبصورت ہیں اس کے علاوہ کسی طرح اپنی عالی ہمتی کا اظہار نہیں کرتے۔ گلاب شرم سے اور زیادہ سرخ ہو گیا ہوا یہ دیکھ کر ہنس پڑی اور کہا کیونکہ تم نیکدل اور عقلمند بچوں کی طرح ہو اس لئے تم سے اکثر ملنے آیا کروں گی اور کہا رخصتی کی رسم میں اپنی ایک پنکھڑی مجھ کو دے دو پھر ایک کھلے گلاب کی پنکھڑی لے لی اور خدا حافظ کہتی ہوئی چلی گئی۔

عین اس وقت دو غریب لڑکے جن کے چہرے کا رنگ زرد تھا پھٹے پرانے کپڑے پہنے گلی سے گذر رہے تھے۔ دونوں جالی دار دیوار کے پاس کھڑے ہو کر چلانے لگے۔ "آہا! کتنے خوبصورت پھول" چھوٹے معصوم لڑکے نے ہاتھ بھی بڑھا دیئے۔ گلاب زور سے چلایا اے میری پیاری ہوا۔ ذرا میرے دو پھول ان کو توڑ دو۔ مگر ذرا کانٹے کا خیال رہے۔" ہوا چین بجبیں ہو کر بولی۔ "گویا میں تمہاری کلیجیں ہوں۔" پھر دو پھول ڈالی سے جدا کر کے بچوں کے آگے پھینک دیئے بچے خوشی سے شور مچانے لگے۔ گلاب بھی خوش تھا کہ ایک کرخت آواز آئی۔ "کیوں بے ہمارے باغ سے پھول چرا رہے ہو؟"

گلاب نے دیکھا کہ ایک عورت اپنی انگلی سے جس میں قیمتی انگوٹھیاں تھیں بچوں کو ڈرا دھمکا رہی تھی۔ اس کا بدہیئت جسم اور چہرہ غصہ سے لال ہو رہا تھا۔ بچے سہم کر روتے ہوئے بھاگ گئے۔ گلاب غصہ سے کانپ رہا تھا۔ وہ پھول کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ "کتنے خوبصورت اور قیمتی پھول ہیں۔ جب اس گلی کے کمینے توڑتے ہیں تو میں کیوں نہ توڑوں۔ گلاب غصہ سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ وہ دل میں کہتا اگر مجھ میں ہوا کی ایسی طاقت ہوتی تو عورت کے مزاج ٹھکانے لگا دیتا۔ یہ بدبخت ویسے تو پھولوں کے ایک باغ کی مالک ہے لیکن ان معصوموں کے واسطے اس کے پاس دو پھول بھی نہیں ہیں۔ اگر یہی ہے تو اسے بھی کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ اس کے پھول توڑے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا کے ہر ذی روح کو خدا نے آزاد پیدا کیا ہے اور انسانوں کے سوا کوئی ایک دوسرے پر حکمرانی نہیں کر سکتا اس لئے جب عورت پھول توڑنے بڑھی تو گلاب نے اپنے سب کانٹے آگے بڑھا دیئے اور عورت کے منہ پر ایسا کوڑا لگایا جیسے جھنجلائی ہوئی بلی پنجہ مارتی ہے۔ عورت چیخ اٹھی مگر اپنے ارادے سے باز نہ آئی ادھر گلاب بھی دل میں ٹھان چکا تھا۔ جب عورت ہاتھ بڑھاتی گلاب اپنا کانٹا آگے بڑھا دیتا جو اس کے ہاتھ کو زخمی کر دیتا تھا۔ آخر عورت تھک کر ناکام ہو گئی۔ اور گھر واپس چلی گئی۔ ادھر نازک گلاب اپنی فتح پر مسکرا رہا تھا گو اس کے بازو شل ہو کر جھک گئے تھے۔ پھر بھی مستقبل کے اندوہناک خیال سے اس کے پھولوں کا رنگ اڑنے لگا۔ اور وہ چپکے چپکے آنے والی شکست کی ذلت پر آنسو بہا رہا تھا۔ ایک دفعہ پھر اس نے اپنی تمام قوتوں کو جمع کیا اور سوچ کر ایک قطعی فیصلہ کر لیا۔

رات جب بھیگ گئی تو اس نے دیکھا کہ ہوا خفا سے سلام کیا ہے اس نے اشارے سے پاس بلایا اور کہا۔ میں تیری نصیحت پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔ میں انسانوں کے لئے بیکار نہ پھولوں گا۔ ہوا نے پھولوں کی پنکھڑیوں کو تسکین دی اور کہا کیا تو وہ قوت اور ارادہ رکھتا ہے جو اس کام کے لئے درکار ہے۔ کیا تجھ کو معلوم ہے کہ اس سلسلے میں سخت تکلیف اور مصیبت جھیلنا پڑے گی۔ گلاب نے اقرار کیا کہ وہ جانتا ہے اور وہ اپنے اندر قوت پیدا کرے گا۔ لیکن اس نے ہوا سے درخواست کی کہ وہ روزانہ آ کر اُسے آزادی کا نغمہ سنائے اور اس کی قوت بڑھائے۔ ہوا نے وعدہ کیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ پھول توڑنے سے باز رکھنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ وہ پیاس سے مر جائے۔ یہ اس کا مستقل ارادہ تھا۔ یعنی وہ خودکشی کرے گا۔ اب اس کی ناکامی کا زمانہ شروع ہو گیا تھا۔ اس کا مشفق اب فوارہ لے کر آتا۔ پانی سے سیراب کرتا مگر اس نے اپنے ریشوں کو اس قدر زور سے کھینچ لیا کہ وہ ذرا سا پانی بھی جذب نہ کر سکتے تھے۔ دن بھر وہ سخت دھوپ میں جلتا اس سے اس کی تشنگی اور بڑھ جاتی تھی۔ پھر شام کے سہانے وقت میں جب اس کے گھر میں پانی آتا تو اپنی علو ہمتی سے سب زمین میں جذب ہو جاتے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

پیشاب کے بعد — قطرہ

پیشاب سے پہلے — قطرہ

...کا خیال آیا تو — قطرہ

رات کو سوتے میں — قطرہ

پیشاب کے بعد...... قطرہ

اگر کسی مرد کو پیشاب کے بعد یا پیشاب سے پہلے سفید رنگ کا پانی خارج ہو تو یہ بہت خطرناک بات ہے۔ اسے جریان کی بیماری کہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ مرض بڑھ جاتا ہے۔ تو پھر آدمی شادی کے مطلب کا نہیں رہتا۔ اسکی قوت مردمی ختم ہو جاتی ہے۔ اس واسطے جن مردوں کو یہ شکایت ہو یعنی پیشاب کرنے سے پہلے یا پیشاب کے بعد یا بیوی کے پاس جانے سے پیشتر کچھ سفید رطوبت خارج ہو جائے یا رات کو سوتے میں احتلام ہو جائے تو اس خطرناک مرض سے غفلت نہ کرنی چاہیئے۔ ورنہ ایک دن زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اگرچہ بعض ڈاکٹر اور حکیم اس مرض کو بہت مشکل بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے علاج میں کافی روپیہ خرچ ہوگا لیکن یہ اُن کی بھول ہے۔

جریان کا مرض صرف ایک ہفتہ میں ختم کیا جا سکتا ہے

اور صرف ساڑھے تین روپے خرچ ہوں گے۔ دوا "جوہر اعظم" اس مرض کیلئے فوری اکسیر کا کام کرتی ہے۔ صرف ایک شیشی دوا جوہر اعظم سے بڑے بڑے پرانے مریضوں کو تندرستی ہو گئی۔ ۱۹۳۸ء کے انعامی مقابلہ میں بھی یہ دوا سرتاج رہی اور یقین کیا گیا کہ "جوہر اعظم" جریان کے مرض کا بہترین علاج ہے۔ چنانچہ اس وقت سے آج تک اس دوا پر محصول ڈاک معاف ہے۔ جن لوگوں کو ضرورت ہو وہ

منیجر زنانہ دواخانہ۔ اے۔ بی ۲۴۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر "جوہر اعظم" کی ایک شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں ایک شیشی کی قیمت تین روپے آٹھ آنے ہے۔ پارسل کا محصول کسی ہندوستانی خریدار سے نہیں لیا جاتا۔

ٹیلیفون نمبر ۲۶۸

تار کا پتہ: مرزا ناددکا اخاد دہلی

[illegible]

[illegible] پیاسا رہتا۔ آخر تھا نازک۔ کبھی کبھی سوچتا کہ اب اس میں [illegible] برداشت باقی نہیں ہے مگر ہوا آتی اور اسے تسکین دیتی تھی۔ وہ وعدہ یاد دلاتی تھی تو اس کی ہمت عود کر آتی تھی۔ اور یہ کہہ کر چلی جاتی "دل مضبوط رکھو فتح ہوگی"۔ روزانہ گلاب کا پودا پتوں سے ڈھکے ہوئے گھر کی طرف دیکھتا جہاں دولت پر ظلم ہوتے اور اس گلی کی طرف بھی دیکھتا جس میں سے غریب مفلس اور پریشاں حال گزرتے تھے اور یہ سماں ایک روحانی طاقت بخشتا تھا۔ رفتہ رفتہ گلاب کی حالت خراب ہوتی گئی اور وہ کمزور ہوتا گیا۔ شاخیں جھک گئی تھیں پھول جھڑ رہے تھے۔ پتے زرد ہوتے جا رہے تھے۔ مالی نے یہ دیکھا تو اس کا دل بھی پژمردہ سا ہو گیا۔ اس نے ایک دن پوچھا۔ یہ تیرا کیا حال ہوتا جا رہا ہے۔ مگر عزم کے پکے گلاب نے کچھ جواب نہ دیا۔ بہت ہوشیاری اور محنت سے وہ ان کی رکھوالی کرتا گیا۔

ایک دن صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ خوشنما پھولوں سے لدے ہوئے گلاب کی بجائے سوکھی شاخیں باغ کی رونق کو برباد کر رہی ہیں۔ اب اس کے لئے وہاں جگہ نہ تھی۔ اس کی مالکہ نے حکم دیا کہ گلاب کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ گلاب خوش تھا وہ اپنی فتح پر مسکرایا مگر جان کس کو عزیز نہیں اور گلاب کا تو کام پورا ہو چکا تھا۔ جب مرجھائے ہوئے دل سے مالی اسے کھود رہا تھا تو اس نے اپنی تمام قوتوں کو متحد کیا اور چپکے سے نحیف آواز میں کہا: "مجھے اپنے گھر لے چل، یہی میری آرزو ہے۔"

مالی اسے اپنے گھر لے گیا اور اپنے غریبانہ جھونپڑے میں لگایا جب مالن نے یہ دیکھا تو وہ بولی۔ "اہا! گلاب بھی میری طرح بیمار ہے پھر تجھ کو مجھے اور گلاب دونوں کو اچھا کرنا چاہئے۔ گلاب نے اب پیاس سے بیتاب ہو کر پانی مانگا۔ مالی کٹورے میں پانی لایا اور اپنے مالک کے کٹورے سے پانی پی کر گلاب بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنے ریشوں کو بالکل آزاد کر دیا اور خوب پانی پیا۔ دوسرے روز وہ اپنی شاخوں کو اور بلند کرنے کے قابل ہو گیا۔ عورت بھی اب اچھی ہونے لگی اور بچوں کی طرح خوش رہنے لگی۔

دونوں اچھے ہو گئے مالی کی کٹیا پھولوں سے بھر گئی۔ عورت نے کہا مجھے گلاب نے شفا دی ہے۔ گلاب کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ احسان کا بدلہ ادا کر رہا تھا۔ یہ لوگ بڑے بھلے مانس تھے اپنی چیز دوسروں کو دیتے۔ گلاب بھی اپنے پھول بانٹتا۔ بہت سے پھول چنے گئے جو غریبوں کے جھونپڑوں کو سجاتے تھے۔

تکلیف کے زمانے میں گلاب نے بہت سے گیت یاد کر لئے تھے اب وہ اپنے دوستوں کو سنانے لگا۔

"مل کر رہو — جنگ کرو — فتح پاؤ گے!"

جب لوگ یہ نغمے سنتے تو بہت تعجب سے ایک دوسرے سے کہتے "پھولوں کی خوشبو ہمیں نیا سبق دیتی ہے — ہم چاہتے ہیں کہ متحد ہو کر زندگی، آزادی اور علم کے لئے جد و جہد کریں۔" اور وہ بچوں سے بھی کہتے۔

"بچو! جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو جانی دار دیوار کے پیچھے حسرت دیاس کے ساتھ پھولوں کی طرف نہ دیکھنا کیونکہ تمام دنیا اس وقت اسی کی ہوگی جو محنت کرے گا!"

(فارسی سے ترجمہ)

مارچ کی رعایت

جیسا کہ اعلان کیا گیا تھا امرت دھارا اوشدھالیہ کی ادویات میں اب پانچ والی رعایت نہیں کی جاتی ہے اب آپ ادویات یا تو تھوڑی تھوڑی آپ ہمیشہ کیواسطے کر دی ہے اور رعایتی قیمتوں پر بھی اب آپ لکھا ہوا ہیں جو منظور رعایتی قیمت ملا
ملاحظہ منگوایا ہو وہ منگوا سکتے ہیں کتابیں چونکہ پہلی ہی چھپی ہیں اور آجکل کا چار گنا قیمت کا کاغذ لینا نہیں پڑا ہے اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کوی ونود وید بھوشن پنڈت ٹھاکر دت شرما وید کی
تصنیف کردہ ہر انسان کے پڑھنے کے لائق صحت اور تندرستی کے اصول سکھلانے والی طبی کتب میں نصف قیمت کی رعایت کر دی جائے۔
جیسے جیسے ختم ہو کر یہ کتب نئی چھپنی ہونگی پھر تو بعض اصل قیمت میں بھی دینی مشکل ہو جاویں گی۔ چند کتب کا اشتہار بیان نیچے دیا جاتا ہے ان میں سے جو جو مناسب ہو جلدی منگوا لو
پوری قیمتیں درج ہیں ان سے آدھی لی جاویں گی۔ بیس روپیہ یا اس سے زیادہ کی کتب منگوانے پر جو نصف دس روپیہ یا اس سے زیادہ کی ہونگی محصول ڈاک و پیکنگ معاف کیا جاوے۔

حفظ صحت و تندرستی اور درازی عمر کے اصول جو جاننا چاہیں وہ مندرجہ ذیل کتب کا خاص خیال کریں

ہدایت الموسم۔ ہمارے ملک میں ۵ موسم ہوتے ہیں ان پانچوں کا مفصل بیان ان موسموں کا انسان پر اثر اور ان کے مطابق رہنے کھانے پینے پہننے اور حفظ ما تقدم کے اصول ہر موسم میں ہونے والے امراض کا بیان و علاج اس کے علاوہ ہر موسم میں ہونے والے پھل اور ترکاریوں کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں اردو ۲ امر ہندی سوا روپیہ

کیا میں تندرست ہوں صحت و درازی عمر کا راز۔ مرد عورت بچہ بوڑھا جوان تندرست بیمار ہر ایک کو اس رسالے کے اصولوں کو جاننا چاہیے تندرستی کے اصول جن پر امیر و غریب عمل کر سکتا ہے بدلائل بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت اردو ۸ ہندی ۱۲ امر

رسالہ صحت کے دس اصول۔ یہ ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں مصنف نے دس ایسے ضروری مگر عام اصول مقرر کئے ہیں جن کی پابندی سے صحت جیسی نعمت حاصل ہوتی ہے اور بڑھاپے میں بھی جوانی کا مزا آ سکتا ہے قیمت اردو ۶ ہندی ۱۲ امر

رسالہ میٹھی نیند و فلسفہ خواب۔ اپنے طرز کا پہلا رسالہ جو آج تک ہندوستان میں لکھا گیا زندگی کا تہائی سے زیادہ حصہ نیند میں جاتا ہے نیند پر اور عمر زیادہ۔ اردو ۲ امر ہندی ۴ امر

رسالہ غذا و صحت۔ ظاہر ہے کہ صحت کا غذا سے گہرا تعلق ہے غذا کے متعلق ایک عجیب و غریب کتاب انگریزی میں چھپی ہے اس میں کھانے پینے کے متعلق بہت ہی ضروری دلچسپ تحقیقات کی ہے اس کو ترجمہ کر کے ہم نے چھاپا ہے جو بہت مفید ہے اردو ۱۲ امر ہندی سوا روپیہ ۴ امر

یادگار سلور جوبلی۔ اس میں کارخانہ کے بیان کے ساتھ صحت کے سب اصولوں کو ایسے لکھ دیا ہے کہ دریا کوزہ میں بند ہے ضرور پڑھو۔ قیمت ۴ ہندی اور اردو و انگریزی میں چھپی ہے اس پر رعایت نہیں ہے۔

ہپناٹزم اور ذاتی تربیت۔ ہپناٹزم سے دوسروں اور اپنے کو تندرست کر لینا یا تابع کرنے کے طریقے درج کئے گئے ہیں۔ اردو ۶ امر ہندی ۴ امر

تصاویر صحت۔ اس میں ایسی تصاویر دی گئی ہیں جن سے پتہ لگے کہ بیٹھنے اٹھنے چلنے پھرنے کام کرنے کھانا کھانے کے وقت جسم کی صحیح پوزیشن کیا ہونی چاہیے گھر میں بچوں کو دکھاؤ۔ ۳ امر

شباب جاودانی (ان کی طاقت کے کرشمے) کس طرح آدمی ہمیشہ جوان رہ سکتا ہے نیز اہل ہند کی جسمانی کمزوری کے اسباب اس کتاب کی تعریف بہت سے اخباروں میں چھپی ہر ایک ہندوستانی کو پڑھنا چاہیے۔ قیمت اردو ۸ امر ہندی ۱۲ امر

نقشہ صحت گھروں میں لٹکانے کے واسطے ہے جس میں تندرستی قائم رکھنے کے تمام ضروری اصول درج ہیں قیمت بہت کم یعنی رول وغیرہ لگا کر روغن کر کے نیچے کپڑا لگا کر اردو ۱۲ امر ہندی ۱۲ امر بغیر رول و روغن اردو ۴ امر ہندی ۴ امر

دل حریہ (ہدایت الیوم) اس میں درج ہے کہ دن رات میں انسان کو کیسے رہنا چاہیے صبح کیا کیا کرنا کام میں لگنا خوراک کی ہدایات سونے وغیرہ کی ہدایات سب مفصل بیان ہے قیمت ۱۲ امر

ڈاکٹر لوئی کوہنی کے چار اشنان۔ جرمنی کے ڈاکٹر لوئی کوہنی نے مرقومہ چار قسم کے غسلوں سے دنیا کے امراض کو دور کرنے کا دعویٰ کیا تھا انہی کی ضخیم کتاب کا خلاصہ ہے۔ قیمت اردو ۸ امر ہندی ۲ امر

رسالہ خوراک۔ اس میں مسئلہ خوراک کے ہر پہلو پر بتفصیل بحث کی گئی ہے اور ضروری و مفید ہدایات اور ڈاکٹری ہندی یونانی و ایلوپیتھی درج کی گئی ہے ہندوستانی گھرانوں میں جو کھانے پینے سمجھتے ہیں ان کے بنانے کی خاص ترکیبیں لکھی گئی ہیں۔ قیمت ایک روپے دو آنے ۱۲ امر

ضروریات زندگی۔ انسانی زندگی کے واسطے کونسی چیزیں ضروری ہیں اور ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے صحت کی قدر کرنے والے ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے قیمت اردو ۸ امر ہندی ۴ امر

طالب علموں کو نصیحت۔ اس میں طالب علموں کو بری صحبت سے بچنے کی ہدایات درج ہیں۔

حفظ ماتقدم اور علاج۔ ڈاکٹر ویلیس مکر ایم کی اعلیٰ تصانیف میں یہ کتاب نہایت مفید و بیش قیمت ہے پہلا سبق خاتی غلامی پر ہے انسان کو اپنے پر حکومت کرنا سیکھنا کتنا ضروری ہے پڑھنے سے معلوم ہوگا اس کتاب میں مندرجہ ذیل تکالیف مثلاً غلامی جذبات بیزاری بے اطمینانی طبیعت کا باعث ہونا جھگڑا ناکامی کا باعث خود آگاہی جلد بازی خبط و نکمان پڑ جانا اس کے ساتھ ہی تہذیب علم المراض ہو کر نالی بعض نام گرمی پاتھ پاؤں کا جلنا قبض لاغری کا بھی حفظ ماتقدم و علاج درج ہے قیمت ۱۲ امر

جیون شکتی (قوت حیات) کیا ہم ہمیشہ جوان کیسے رہ سکتے ہیں؟ اس میں صحت قائم رکھنے والی جوانی ہمیشہ برقرار رکھنے اور عمر کو دراز کرنے اور بیماریوں سے محفوظ رہنے کے اسرار مندرج ہیں ایسے ایسے نکتے اور راز کی باتیں اس کتاب میں بتائی گئی ہیں جو کہ پڑھنے سے ہی تعلق رکھتی ہیں جا بجا بہت سی زیادہ تصویریں ہیں جو مضمون کی وضاحت کرتی ہیں قیمت اردو ۸ ہندی ۱۲ امر

آفتابی غسل۔ آفتابی غسل کے فوائد اور طریقے نیز آفتابی غسل سے صحت طاقت و خوبصورتی حاصل کرنے کے راز اور سورج کے رنگوں سے امراض کو دور کرنے کا بیان لکھا ہے قیمت ۲ امر

دفعہ کتابت اشتہار کا پتہ:- امرت دھارا ٹرسٹ کے لاہور المشتہر مینیجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بلڈنگ - امرت دھارا روڈ امرت دھارا ڈاکخانہ - لاہور

رفتارِ زمانہ

عالمگیر واقعات پر ماہانہ تبصرہ

از:۔ شبلی بی کام

سنگاپور کی تسخیر

"عالمگیر" کی گزشتہ اشاعتوں میں بتایا جاچکا ہے کہ جاپان جنوب مشرقی ایشیا میں ایک ایسے سیاسی نظام کے خواب کی تعبیر ڈھونڈ رہا ہے جس کی معیشی و تجارتی باگ ڈور اس کے اپنے ہاتھ میں ہوگی چنانچہ اس نے امریکہ و برطانیہ کی حربی مصروفیات سے فائدہ اٹھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے بحر کاہل کے متعدد صغیر و کبیر جزائر پر قابض ہوگیا ماہ فروری کے شروع میں سنگاپور کے متعلق اضطراب و تشویش کا اظہار کیا گیا تھا چنانچہ ۱۵ ر فروری کو یہ افسوسناک اطلاع موصول ہوئی کہ بحر کاہل کے جبل الطارق" نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اس پر جاپانی فوجیں مسلط ہوچکی ہیں۔ ۱۶ ر فروری کو سقوط سنگاپور کے متعلق برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ونسٹن چرچل نے سلطنت کے نام ایک تقریر نشر کی جس میں انہوں نے صاف اور کھلے لفظوں میں اس واقعہ کو بھاری اور دور رس شکست سے تعبیر کیا لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے برطانیہ کی مشکلات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ برطانوی فوجوں کو بیک وقت روس، افریقہ، بحر اوقیانوس، بحر روم اور بحر کاہل کی لڑائیوں میں بلا شرکت غیرے حصہ لینا پڑا ہے اس لئے مشرق بعید میں سامان جنگ بروقت نہ بھیجا جاسکا تاہم امریکہ و برطانیہ خاموشی سے دفاعی انتظامات مکمل کر رہے ہیں اس لئے جاپان کے عارضی اقدامات سے متوحش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسباب و علل

سنگاپور کی تسخیر کے بعد بحر کاہل کے سمندری استحکامات کو نکتہ چینی کا مرکز بنایا گیا ہے لیکن میجر جنرل چارلس گوئین نے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ سنگاپور کا بحری مستقر دراصل خشکی کی طرف سے حملوں کی طویل روک تھام کے لئے تعمیر نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ اگر پیش قدمی کی ضرورت ہو تو یہاں کی بندرگاہوں کو مرکز کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے موجودہ جنگ میں سنگاپور پر سمندر کی جانب سے حملہ نہیں کیا گیا بلکہ جاپانی فوجیں تھائی لینڈ (سیام) کے ذریعہ سے اس جزیرہ میں داخل ہوئیں لہٰذا اگر ذمہ داری کسی پر عائد ہوسکتی ہے تو وہ حکومت تھائی لینڈ اور وشی گورنمنٹ پر ہونی چاہئے جنھوں نے غیر جانبداری کے اعلان کے باوجود ایک طرف سیام کے دروازے جاپانی فوجوں کے لئے کھول دیئے اور دوسری طرف جرمن دباؤ کے زیر اثر فرانسی ہند چینی کے تمام بحری و فضائی اڈے جاپان کے حوالے کر دیئے اس کے علاوہ بہت سی امیدیں زیادہ تر "پرنس آف ویلز" اور "ریپلس" سے وابستہ تھیں لیکن ان جہازوں کے ہمراہ چونکہ حفاظتی طیارے کافی تعداد میں موجود نہ تھے اس لئے برطانوی تدابیر موثر ثابت نہ ہوسکیں۔ پھر زمان و مکان کی حالات کے باعث امریکہ و برطانیہ کی کمک بروقت بحر کاہل میں نہ پہنچ سکی۔ اور ان ممالک کی جو طاقت جنوب مشرقی پانیوں میں موجود تھی ہونولولو پر جاپانی قبضے کے باعث تقسیم ہو کر رہ گئی اس لئے دشمن کی پیشقدمی کو متحدہ طور پر روکا نہ جاسکا۔

ہندوستان کے دروازے پر

ان تمام باتوں کے باوجود ان تمام خطرات و خدشات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا جو تسخیر سنگاپور کے بعد بحر کاہل اور بحر ہند کے ساحلی علاقوں میں پیدا ہوچکے ہیں۔ جاپانی فتوحات کا سیلاب ہندوستان کے جنوبی اور مشرقی ساحلوں کی جانب بڑھتا چلا آرہا ہے اور جنگ کی بجلیاں اگر ایک طرف برما کے سر پر منڈلا رہی ہیں تو دوسری طرف کلکتہ اور مدراس بھی انکی زد سے خالی نظر نہیں آتے اس لئے اب ہندوستانیوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا کہ انھوں نے اپنی حفاظت و مدافعت کیلئے کیا سامان کیا ہے؟

سنگاپور کے بعد جاپانی فوجیں کہ اگر ایک طرف برما کی طرف بڑھ رہی ہیں تو دوسری طرف انھوں نے جاوا و سماترا اور سلیبس کو اپنی حربی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا ہے۔ اس کے علاوہ نارتھ نیو گنی اور دوسرے جزیرے بھی ان کی زد میں ہیں۔ تازہ ترین اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جاپانیوں نے مرتبان پر قبضہ کرلیا ہے۔ رنگون ان سے صرف ۱۰۵ میل کے فاصلہ پر رہ گیا ہے اور دریائے بلین اور دریائے سیتانگ کے دوآبہ میں اس وقت گھمسان کی جنگ ہورہی ہے

جاپان کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ رنگون کو پامال کرنے کے بعد برما روڈ کو مسدود کر دیا جائے تاکہ اس شاہراہ کے ذریعہ سے چین کو جنگی امداد نہ مل سکے۔ اس میں شک نہیں کہ چین کے مفاد برما روڈ سے بڑی حد تک وابستہ ہیں لیکن چونکہ اس سڑک کے علاوہ چین کو دوسرے رستوں کے ذریعہ بھی امداد پہنچائی جا سکتی ہے اس لئے جاپان اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

جرمن جہازوں کا فرار

اب ہم مشرق بعید سے مغرب کی طرف آتے ہیں اس مہینے یہاں سب سے بڑا جنگی واقعہ یہ رونما ہوا کہ ۱۲ فروری کو جرمنی کے تین بڑے جنگی جہاز برطانوی مزاحمت کے باوجود آبنائے ڈوور میں سے گزر کر جرمنی کی بندرگاہوں میں صحیح و سلامت پہنچنے میں کامیاب ہو گئے یہ جرمن جہاز گزشتہ دس ماہ سے فرانس کی مغربی بندرگاہ برسیٹ میں ڈیرہ ڈالے کھڑے تھے۔ اس عرصہ میں برطانوی ہوائی جہازوں نے کم و بیش) ایکسو دس ہوائی حملے کر کے انھیں شدید نقصان پہنچایا تھا۔ اس لئے مرمت وغیرہ کے لئے جرمن انھیں اپنی بندرگاہوں میں لانا چاہتے تھے۔ ۱۲ فروری کو موسم نہایت خراب تھا۔ دھند۔ کہر اور بادلوں کی آڑ میں انھوں نے راہ فرار اختیار کی۔ رائل ایر فورس نے ان کا تعاقب کیا لیکن وہ ان کے بموں سے بچ کر بھاگ گئے جرمنی کے یہ سمندری جہاز برطانوی احتساب کی نظر بچا کر اتنی طویل مسافت طے کرنے میں کیونکر کامیاب رہے؟ یہ وہ سوال ہے جو آج کل انگلستان کے صحافتی، سیاسی اور فوجی حلقوں میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اور اس ضمن میں متعدد سوالات کئے جا رہے ہیں۔ حکومت نے اس مسئلہ کی مفصل تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے لیکن سردست بتایا گیا ہے کہ دھند اور کہر کی وجہ سے چونکہ صاف نظر نہیں آتا تھا اس لئے جرمن جہازوں کا تعاقب موثر طریقے سے نہ کیا جا سکا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جرمنوں کو موسم کی تفصیلات ڈبلن (آئرلینڈ) کے سفیر کے ذریعہ سے معلوم ہوئیں۔ بہرحال اس سانحۂ عظیم پر تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کا انتظار بہتر رہے گا۔

روس اور افریقہ

روسی فوجیں اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے میں بدستور مصروف ہیں۔ ۱۸ فروری کی ایک اطلاع سے معلوم ہوتا ہے کہ سوویٹ فوجیں سفید روس کے مغربی سرحد کو عبور کر چکی ہیں۔ یہ سرحد پولینڈ سے متواصل ہے۔

شمالی افریقہ میں لیبیا کی جنگ اگرچہ مدھم رہی تاہم مارشل رومیل کی فوجیں غزالہ سے آگے نہیں بڑھ سکیں اور چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہو رہی ہیں اس مہینہ یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جنگ افریقہ کے لئے رومیل کو وشی گورنمنٹ کی امداد سے تیونس اور طرابلس کے ذریعے سے کمک پہنچی تھی۔

مسٹر چرچل کا جواب

گزشتہ اشاعت میں ذکر کیا گیا تھا کہ سر تیج بہادر سپرو نے مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ کو ایک اہم برقیہ ارسال کیا ہے جس میں ہندوستان کی سیاسی گتھی کو سلجھانے کے لئے کم و بیش تین مطالبات پیش کئے گئے ہیں۔ مسٹر چرچل کا موعودہ جواب موصول ہو چکا ہے۔ جس میں انھوں نے پہلے تو حربی مصروفیات کے باعث جواب میں تاخیر پر معذرت کی ہے اس کے بعد لکھا ہے کہ حکومت برطانیہ نے اعتدال پسندوں کے پہلے دو مطالبات منظور کر لئے ہیں اور تیسرا زیر غور ہے منظور شدہ مطالبات یہ ہیں اوّل برطانیہ کی حربی وزارت میں ہندوستان کو بھی درجہ نمائندگی حاصل ہوگا۔ دوم۔ بحر کاہل کی جنگی کونسل میں بھی ہندوستان کے ایک نمائندے کو شریک کر لیا جائے گا۔ جو مطالبہ ابھی تک زیر غور ہے وہ وائسرائے کی انتظامیہ کو "ہندیانے" سے متعلق ہے۔ مسٹر چرچل کا یہ جواب اس لحاظ سے تو یقیناً باعث تشکر ہے کہ آخر انھوں نے ہندوستان کے بعض مسائل کو اہمیت کی نظروں سے دیکھا۔ لیکن اسے ہندوستان کی "قومی پکار" کا جواب قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اصل مسئلہ کامل آزادی یا کم سے کم درجہ مستعمرات کا ہے اس لئے جب تک اس باب میں کوئی تسلی بخش اعلان نہیں کیا جاتا ہندوستانی سیاسیات میں کسی سریع الاثر انقلاب کی توقع بے سود ہے۔ ہندوستان کو حربی کابینہ اور جنگی کونسل میں نمائندگی دینے کا اعلان تو کر دیا گیا ہے لیکن جب تک نمائندوں کا انتخاب عوام کی مرضی پر نہ چھوڑا جائے یہ اقدام موثر ثابت نہیں ہو سکتا۔

برطانوی کابینہ

کچھ عرصے سے مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ برطانوی وزارت میں ردّ و بدل زیر عمل لایا جائے تاکہ بعض وزیروں کی تبدیلی سے برطانیہ کے حربی مقاصد کو تقویت پہنچے۔ چنانچہ مسٹر چرچل نے وزارت برطانیہ کو از سر نو ترتیب دیا ہے لیکن برطانوی اخبارات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کی اکثریت ان تغیرات کو ناکافی خیال کرتی ہے چنانچہ "ڈیلی میرر"۔ "نیوز کرانیکل"۔ "ڈیلی ہیرلڈ"۔ "ڈیلی ایکسپریس"

تذ ڈیلی پوسٹ" وغیرہ مزید ردوبدل پر زور دے رہے ہیں۔ تاہم ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے وزارت جنگ میں "سر سٹیفورڈ کرپس" کا تقرر خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ صاحب اپنی ترقی پسندانہ روش کے لئے چین، مشرق بعید اور مشرق وسطی میں پہلے ہی شہرت حاصل کر چکے ہیں اس لئے خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید وہ ہندوستان کے متعلق برطانوی نقطۂ نگاہ کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ لیکن یہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ مسٹر ایمری کی بجائے سر سٹیفورڈ کو وزارت ہند کے عہدۂ جلیلہ پر متمکن کیا جائے۔

اس مہینے میڈم اور مارشل چیانگ کائی شک ہندوستان تشریف لائے انھوں نے جاتی دفعہ برطانیہ کو ہندوستان کی آزادی کے متعلق جو پیغام دیا وہ خاص طور پر مستحق توجہ ہے۔

لاہور ——— ۲۳ر فروری ۱۹۴۲ء

نقد و نظر

داستان تاریخ اردو

الحاج مولانا حامد حسن قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ ہندوستان کے ان فاضل اجل علما میں سے ہیں جو تحقیق و تدقیق کی مشعل لے کر اردو ادب کے تاریک گوشوں کو منور کرنے میں مصروف رہتے ہیں آپ نے حال ہی میں انتہائی محنت و عرق ریزی سے "داستان تاریخ اردو" مرتب کی ہے جو اردو تذکرہ نویسی میں امتیازی درجہ کی مستحق ہے۔ یہ گرانقدر تصنیف ۲۲×۲۹/۱۶ کے ۸۵۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں اردو زبان کی نشو و نما پر مورخانہ روشنی ڈالنے کے علاوہ اردو نثر نگاروں کے حالات اور ان کی تصنیفات کے نمونے بھی ناقدانہ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ آپ نے تاریخ اردو کی داستان کو چھ ادوار پر تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور میں ۸ ہویں صدی سے انیسویں صدی کے وسط تک شمالی ہند اور دکن کے خادمان اردو کی سرگرمیوں پر معلومات افزا تبصرہ کیا ہے۔ اس کے بعد بتایا ہے کہ دوسرے دور میں اہل یورپ نے اردو ادب کی ترقی و ترویج میں کیا حصہ لیا۔ پھر فورٹ ولیم کالج اور بیرون کالج کے مترجموں اور مصنفوں کی علمی و ادبی مساعی کا جائزہ لیا ہے۔ پانچویں اور چھٹے جزو میں سرسید احمد خاں سے خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی تک کی تاریخ اردو پر محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جو زیر نظر کتاب کے کم و بیش چار سو صفحات کو محیط ہے۔ یہ حصہ بہت زیادہ محنت و کاوش سے مرتب کیا گیا ہے اور ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان صفحات کے

مطبوعات جدید

از:- ادارہ

مطالعہ کے بعد کسی اور تذکرہ کے دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بعض مصنفین کے تذکرے میں تلخ موضوعات بھی زیر بحث آئے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی فاضل مؤلف کی تنقید بے لاگ، رائے صائب اور مطالعہ کی وسعت لائق داد ہے، پروفیسر صاحب کو "تاریخ گوئی" میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ اس لئے جا بجا آپ نے اس فن کے کمالات بھی دکھائے ہیں۔ تاریخ و ارتقائے اردو پر آج تک ہماری نظر سے کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جس میں مصنفین کے حالات و سوانح پیش کرنے کے علاوہ ان کے علمی و ادبی کارناموں پر اس درجہ شرح و بسط کے ساتھ بحث کی گئی ہو۔ یہ کتاب محقق و مبتدی دونوں کے لئے یکساں کارآمد ہو سکتی ہے قیمت مجلد چھ روپے ملنے کا پتہ۔ لکشمی نرائن اگروال پبلشر، آگرہ

کار امروز

"کار امروز" حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کی ۱۳۷ سیاسی، تاریخی، سوانحی، اور جذباتی نظموں کا مجموعہ ہے جو حال ہی میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ سیاسی نظموں میں سے کانگرس۔ گاندھی، بساط سیاست اور اعلان جنگ خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ شاعر چونکہ مسائل عالم کو ایک علیحدہ نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اس لئے سیاسی اختلافات کے باوجود ہمارے نزدیک حضرت سیماب کے خیالات و افکار قابل قدر ہیں "کار امروز" کے اکثر صفحات "ارض تاج" کے لئے وقف ہیں

[illegible] میں شاہجہان، اکبر، روضۂ ممتاز اور نورجہان ثانی وغیرہ کے متعلق کیف انگیز تاریخی نظمیں کہی گئی ہیں۔ "قدرتی مناظر" کی تصویر کشی میں فاضل شاعر نے وسعتِ تخیل اور قوتِ مشاہدہ کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ "جدبابی" منظومات میں سے "حسن مجبور"۔ "برق سر رہگذر" "آہ یہ قسمت" اور "تم کاش وہی ہوتے" حد درجہ وجد آفریں ہیں۔ حضرت سیماب اکبرآبادی نے جدید وقدیم اسالیب کے امتزاج سے ایک نئی راہ اختیار کی ہے۔ آپ کے شاعرانہ کمالات پر روشنی ڈالنا دوپہر کے چمکتے ہوئے سورج کو دکھاتا ہوا چراغ دکھانے کے مرادف ہے۔ "کار امروز" آپ کے طرۂ امتیاز میں ایک اور جگمگاتے ہوئے ہیرے کا اضافہ کرتی ہے۔ صفحات ۲۵۶ قیمت مجلد چار روپے عہ
ملنے کا پتہ قصر الادب آگرہ

سیاسی تحریکات

کچھ عرصہ ہوا مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی نے اردو کتابوں کی اشاعت کیلئے ایک مبسوط پروگرام بنایا جس کے تحت عالمگیر تحریکات سیاسیہ پر بھی بارہ مقالے لکھوانا طے کئے تھے حال ہی میں ان میں سے چار مقالات کتابی صورت میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ یعنی بحرالکاہل کی سیاست، نازیت، ممالک اسلامیہ کی سیاست، قومیت اور بین الاقوامیت۔ "بحرالکاہل کی سیاست" میں دنیا کے سب سے بڑے سمندر کی جغرافی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے بعد ساحلی ممالک کے سیاسی وتجارتی مسائل پر طالب علمانہ انداز میں گفتگو کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ برطانیہ، جاپان، چین، امریکہ، روس، اور ہالینڈ وغیرہ کے کون کون سے مفاد اس سمندر کے ساتھ وابستہ ہیں آج کل چونکہ بحرکاہل میں ایک خوں فشاں جنگ ہو رہی ہے اس لئے تاریخی پس منظر کا سرسری اندازہ لگانے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید رہے گا "نازیت" میں جرمنی کی سیاسی تاریخ پیش کرنے کے بعد نازی پارٹی کے اصول وضوابط پر مختصر سی بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہٹلر کے خوفناک عزائم کا کافی حد تک علم ہو سکتا ہے۔ "ممالک اسلامیہ کی سیاست" میں مصر، ترکی، عرب، شام، فلسطین، ایران، عراق اور افغانستان وغیرہ اسلامیہ ممالک کے بعض حالیہ واقعات پیش کئے گئے ہیں۔ تبصرہ اگرچہ سطحی ہے تاہم اس کتاب سے اسلامی ممالک کے متعلق ابتدائی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں "قومیت اور بین الاقوامیت" میں ان تحریکات کے مقصود پر روشنی ڈالنے کے بعد ارتقائی مدارج بیان کئے گئے ہیں۔

ان مقالات کے لئے چونکہ صفحات کی تعداد مقرر کر دی گئی تھی اس لئے مقالہ نویسوں نے مجبوراً اختصار سے کام لیا ہے۔ بہر حال یہ مطبوعات اردو داں حضرات کی واقفیت عامہ میں کافی حد تک اضافہ کر سکتی ہیں۔

سب کتابوں کی ضخامت [illegible] کے کم وبیش دو سو صفحات ہے۔ قیمت ایک روپیہ فی کتاب،
ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ قرول باغ، نئی دہلی۔

میری درد بھری کہانی

ہندوستان کے جنگلوں اور پہاڑوں میں بسنے والے فقیر اور مہاتماؤں نے وہ کارنامے کر دکھائے ہیں جن کو دیکھ کر آجکل کے سائنسدان اور ڈاکٹر حیران ہیں آجکل کسی ایک بیماری کا علاج جب ڈاکٹر لوگ نہیں کر سکتے تو اس کو لاعلاج قرار دیتے ہیں بجائے مرنے کے بغیر رنگ و نور کے جنگلوں میں رہنے والے مُردوں کو زندہ کرنے کی طاقت رکھتے تھے ان کے کرشمے ایسے ہیں کہ ایک دفعہ تو مردہ کو بھی اٹھایا جا سکتا ہے گو زمانہ بدل گیا ہے لیکن پھر بھی ہندوستان کا نام روشن کرنے والے سچے فقیر موجود ہیں آپ میری کہانی سنئے جوانی کی غلط کاریوں اور کم فہمی کی بدولت بری صحبت کا شکار ہو کر طرح طرح کی بیماریوں میں پھنس گیا میں اپنی جوانی برباد کر بیٹھا اور طاقت مردی سے محروم ہو گیا جریان احتلام اور سرعت انزال وغیرہ نے جسم کو کھوکھلا کر دیا چہرہ زرد پڑ گیا آنکھیں اندر دھنس گئیں دل دھڑکنا شروع کر دیا ... نامردی وغیرہ سے تنگ آکر مایوس ہو گیا مشہور مشہور ڈاکٹروں حکیموں اور اشتہاری دواؤں پر دولت کیلئے دھن کو برباد کر کے زندگی سے مایوس ہو کر بیٹھا۔ میری خوش قسمتی سمجھئے کہ ایک دن جانا پڑا ... میں ایک میلہ تھا میں بھی وہاں چلا گیا۔ وہاں ہر سال ہزاروں فقیر آتے ہیں ایک دن شام کو سیر کرتا کرتا ایک پہاڑی کے کنارے پر جا نکلا سردی زیادہ تھی ... وہاں جو دیکھتا ہوں ایک بوڑھا بیٹھا ہوا ہے سر پر کٹا پھٹا ... چہرے پر نور ... جب میں نزدیک گیا تو مجھ کو سردی سے کانپتا ہوا دیکھ کر پوچھا بیٹا کیا سردی زیادہ لگتی ہے پہلے تو میں چپ رہا پھر کہا کہ میں ... جہاں مجھ پر رحم کرو ... ایک سبز رنگ کی بوٹی کھانے کو دی ... کہ صرف ایک منٹ نہ گزرا تھا کہ میرا جسم آگ کی طرح گرم ہو گیا اس معجزہ کو دیکھ کر میں نے فقیر کے پاؤں پکڑ لئے اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے ... ہمدردی سے پوچھا بیٹا شام کے وقت جنگل میں اکیلا اور رونے کا سبب کیا ہے میں نے تمام دکھ بھری کہانی سچ سچ کہہ دی اس پر فقیر نے مجھے حوصلہ دیا اور مجھ کو اپنے ساتھ اپنے مقام آشرم پر جہاں آپ رہتے تھے لے گئے اور کہا اگر تم سچے دل سے عہد کرو کہ اب بری باتوں سے بچو گے اور دنیا کی بھلائی کرو گے تب تمہارا بھلا ہو سکتا ہے میں نے ہاتھ جوڑ کر سچے دل سے اقرار کیا اس پر اس سچے فقیر نے مجھ کو ایک دوائی کھانے کو دی اور ایک مالش کا نسخہ لکھوا دیا اور کہا بیٹا اب تم جاؤ اور اپنے جیسے دکھیوں کا بے فکر ہو کر بھلا کرو ... مجھے اس فقیر کی ایک ہی ملاقات سے اس قدر فائدہ ہوا کہ خود بخود میرے دل میں ایک جوش پیدا ہونا شروع ہو گیا میں نے واپس آکر فقیر کے کہنے کے مطابق دونوں دوائیاں تیار کر کے استعمال کرنا شروع کر دیں جس طرح میرا یقین تھا اسکی پہلی خوراک نے اپنا کرشمہ دکھانا شروع کر دیا آپ یقین جانیے پانچ چھ دن کے بعد ہی کایا پلٹ گئی سب تکلیفیں دور ہو کر بجلی کی طرح طاقت اور جوش پیدا ہو گیا اور میں اب ... آپ کی ایک قابل فخر خیال کرنے لگا ... جب ہم مرشد کے پندرہ دن دوائی جاری رکھی دودھ گھی خوب ہضم ہونے لگا ... آج گیارہ سال ہو چکے ہیں کسی دوائی کی ضرورت نہیں پڑی خدا کے فضل سے تمام خوبصورت تندرست نوجوان ہیں آج تک اس دوائی سے ہزاروں دکھیوں کا بھلا ہوا ہے ... ہو چکی ہیں ... مشرق کی بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے مگر اس دوائی کا اثر خالی نہیں جاتا اس ... مرشد سے کئے ہوئے وعدے اور دنیا کی بھلائی کیلئے اس دوائی کا شہر شہر گھر گھر کر رہا ہوں ہر قسم کی سستی ... پیشاب میں تکرار اور جریان احتلام رگوں کا ڈھیلا پن کمر درد کا ... جسم کے خفیہ روگ جادو کی طرح دور ہو کر نئی جوانی کی بجلی کی طاقت اور جوش پیدا ہوتا ہے دوائی میں کسی قسم کی مضر صحت چیز نہیں ہے مالش سے کسی قسم کا آبلہ یا جلن نہیں ہوتی ہر موسم میں کھانے کے لائق ہے جوان کیا بوڑھے خاص طور سے تندرست جوانی کا لطف لے سکتے ہیں خاص بات یہ ہے کہ اس دوائی کے بعد عمر بھر کسی دوائی کی ضرورت نہیں پڑتی قیمت پندرہ دن کی تیس خوراک جو کہ صحت کیلئے کافی ہیں دو روپے ... مالش دو روپے ... چونکہ مجھکو اس کا پابند دوائی نے موت کے منہ سے بچایا تھا اس لئے بلا ایمان سمجھ کر اس کی اشاعت کر رہا ہوں اور قیمت صرف خرچہ و لاگت پر رکھی ہے دونوں دوائیاں ایک ساتھ منگوانے پر محصول ڈاک معاف ضروری گزارش ... مزاج صاحبان ... طلب کریں کیونکہ جو شخص ہر چیز کو بے یقینی کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ موقع پر ہر ایک کو ... سمجھتا ہے جس کو اس دوائی سے فائدہ نہ ہو دوائیاں کو ... کر قیمت واپس منگالے ... آپ کا ایمان بھی ہے کہ اگر اس تحریر سے بڑھ کر نکلے تو اس فقیر کے پیغام کو گھر گھر پہنچا دیں۔ کوئی صاحب مجھے کسی اور دوا کیلئے نہ لکھے اور نہ کوئی ضرورت سے پہلے منگائے۔

شرطیہ علاج اور شرطیہ عذر - ہندو کو دھرم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر میری دوائی کے استعمال سے بالکل فائدہ نہ ہو تو بلا تحریر بھیج کر قیمت واپس منگالیں عدم صحت کی صورت میں کسی کا پیسہ رکھنا گناہ سمجھتا ہوں اگر کوئی صاحب اب بھی اس دوا سے فائدہ نہ اٹھائیں تو ان کی قسمت ہزاروں تعریفی خطوط اور سرٹیفکیٹس موجود ہیں جن کے لکھنے والے صاحبان کے علاوہ ڈاکٹر، حکیم اور میرے کئی بزرگ حکیموں ویدوں کی رائے ہے کہ یہ لاجواب مقوی گولیاں اور روغن مالش لاجواب ہیں۔

ضروری اطلاع - یہ یاد رہے کہ میری دوائی صرف نامردی سستی جریان احتلام سرعت کمزوری کا مرض جریان رحم اور لیکوریا کیلئے مخصوص ہے یہ مرض خواہ کسی سبب سے ہوں جو کثرت جماع یا عادت بد سے سب کے لئے یکساں مفید ہے سوزاک آتشک سے پیدا شدہ کمزوری کے لئے اس کا استعمال کرنا طاقت کا بیمہ کرانا ہے اور باقی نامردی کے سوا میری دوائی ہر بیماری کے لئے اکسیر ہے۔

پروفیسر رام ناتھ کپور نمبر ۳ برانڈرتھ روڈ لاہور

خزانچی نے بمبئی اور کلکتہ میں پنجاب کا نام روشن کیا

اب یہ شاہکار پنچولی آرٹ پکچرز کو ہندوستان کی بہترین فلم کمپنی ثابت کرنے کیلئے

آرہا ہے

خاندان

موسیقی
رومان
جذبات
نغمے
رقص
افسانہ



ہندوستان کی بہترین فلمی ستار نور جہاں، غلام محمد، منورما، بہترین فلم
پنجاب کا سر بلند کرنے والا وہ قابل فخر شاہکار جس کی تیاری پر روپیہ
پانی کی طرح بہایا گیا ہے

دیگر اداکار

پران، ابراہیم، اجمل، اے بی اختر، درگا موٹا، نفیس بیگم وغیرہ

ایک ایسا شاہکار جس پر آپ فخر کر سکیں گے !!! آپکے شہر کے بہترین سینما گھر میں کامیابی کے ریکارڈ قائم کرنے کیلئے

بہت جلد آرہا ہے



ڈائرکٹر شوکت حسین میوزک: غلام حیدر کہانی و مکالمہ: سید امتیاز علی تاج

آنسوؤں اور قہقہوں کا لاجواب مرقع دل کی گہرائیوں پر اثر کرنے کیلئے آرہا ہے

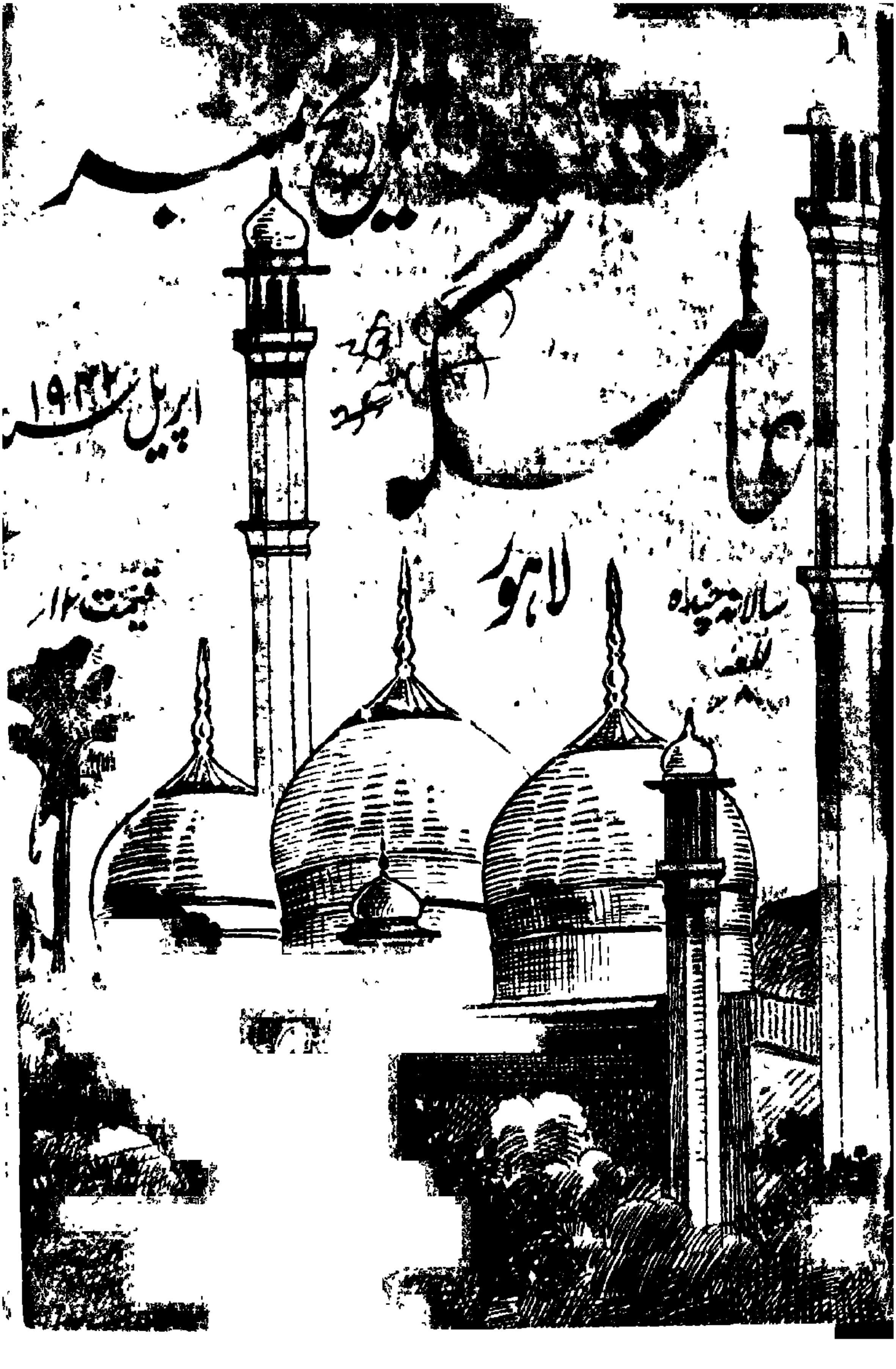
ایک ایسا شاہکار جسکی مثال نہیں مل سکتی

ہندوستان کے جادو نوا موسیقار غلام حیدر نے اس میں موسیقی کی روح بھر دی ہے

پیلس لاہور کا آئندہ پروگرام

بکنگ کے لئے لکھیے :-

ایمپائر ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز - لاہور، دہلی - کراچی



عالمگیر
اپریل ۱۹۴۲ء
لاہور
قیمت ۱۲/
سالانہ چندہ

عالمگیر بکڈپو کی قابل مطالعہ مطبوعات

یہ کتابیں اگر آپ نے ابھی تک ملاحظہ نہیں فرمائیں تو اپنی پہلی فرصت میں طلب کیجیے

اس اشتہار کو ضرور ملاحظہ فرمائیے

خونیں تحریکیں — اس کتاب میں تاریخ اسلام کی ان تمام حشر انگیز و انقلاب پرور تحریکات کا تذکرہ ہے جن کے ایک ایک اشارے پر شہنشاہوں کو رقص کرنا پڑا۔ مصنفہ مولانا اظہر امرتسری۔ ... قیمت

نادر شاہ اور ستارا — اس نے قفقاز کی پہاڑیوں سے گنگا کی وادیوں تک تمام سلطنتوں اور راجواڑوں کو اپنے ترکمانی گھوڑے کے سموں سے روند دیا لیکن جب اس نے عشق و محبت کی وادی میں قدم رکھا؟ نادر شاہ درانی اور راجپوت دوشیزہ ستارا کا دلآویز تاریخی ناول۔ قیمت ...

زرتشت اعظم کا رومان — مذہب آتش پرستی کا پیغمبر اعظم جب عشق و محبت کے میدان میں آتا ہے تو اپنے دامن عصمت کو گناہ و ہوس کی آلائشوں سے محفوظ رکھتے ہوئے کس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ قیمت

تاریخی افسانے — تاریخ میں ایسے افسانے بھی ملتے ہیں جن کے ہیرو عظیم الشان شخصیت کے مالک ہونے کے باوجود محبت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ اس کتاب میں تین ایسی ہی شخصیتوں کے حالات ہیں۔ از مولانا احمد ایم اے۔ قیمت

روسو کی سرگزشت — مفکر اعظم روسو کا شمار دنیا کے مشہور فلاسفروں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب اس کی ہیجان خیز آپ بیتی ہے۔ جس میں روسو نے اپنی رنگین و رومان پرور زندگی کو بے نقاب کیا ہے۔ قیمت ... ۱۲ر

ربیعہ — ترکی کے مایہ ناز ادیبہ خالدہ ادیب خانم کا ایک معرکہ آرا دلچسپ اور انقلاب انگیز ناول جس کو جناب تجلی بی کام نے شگفتہ اردو زبان کا لباس پہنایا ہے۔

کتاب التقدیر — علامہ ابن قیم کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ جس میں مسئلہ قضا و قدر کے ہر پہلو پر عقلی و نقلی دلائل کی رو سے مثالیں پیش کی گئی ہیں جو اس قدر دلچسپ ہیں کہ آپ ساری کتاب پڑھنے پر مجبور ہوں گے۔ آٹھ سو صفحات بڑا سائز قیمت رعایتی ایک روپیہ بارہ آنے۔ ...

دنیائے اسلام کا ماضی و مستقبل — اسلامی دنیا کی سیاست پر ایک مورخانہ اور سیاست آموز کتاب جس میں تمام اسلامی ممالک کی سیاست کا تجزیہ بہترین انداز میں کیا گیا ہے۔ از مولانا اظہر امرتسری۔ قیمت ...

موتیوں کا درخت — علامہ جرجی زیدان کا ایک شاہکار ناول جس میں ملکہ شجرۃ الدر کی رومانی زندگی کے حالات درج ہیں۔ قیمت ...

روپ متی اور باز بہادر — باز بہادر اور روپ متی کی محبت کا ذریا حسن و عشق میں ڈوبا ہوا تاریخ ہند کا ایک ورق از محشر عابدی قیمت

ماہ و انجم — جناب کوثر چاندپوری کے وجد آفریں افسانوں کا مجموعہ، ہر افسانہ نیاز عشق اور ناز حسن کی بولتی چالتی تصویر ہے۔ قیمت ایک روپے آٹھ آنے ...

تاج شاہی حسن کے قدموں میں — ہسپانیہ۔ ناروے اور یورپ کے دوسرے بادشاہوں کی رومانی داستانیں۔ قیمت ...

لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری — قاضی عبدالغفار کی دو شاہکار تصانیف جنہیں آپ بار بار پڑھنے پر مجبور ہوں گے

عالمگیر بکڈپو بازار سید مٹھا - لاہور

تاریخی مضامین تاریخی افسانوں تاریخی ڈراموں اور تاریخی نظموں کا بیش بہا مرقع

ماہ اپریل ۱۹۴۲ء

عالمگیر تاریخ نمبر ۱۹۴۲ء

ملاحظات

از:-
ادارہ

موجودہ جنگ کو شروع ہوئے پورے تین برس گزر چکے ہیں۔ لیکن ابھی تک کاغذ کی گرانی و نایابی کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ چنانچہ درجنوں رسائل ان مشکلات و مصائب کی تاب نہ لا کر بند ہو چکے ہیں۔ بعض اپنی موت کا انتظار دیکھ رہے ہیں۔ اور اکثر حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ لیکن خدا تعالےٰ کا فضل و کرم اور معاونین کرام کی امداد و اعانت شامل حال تھی۔ اس لئے "عالمگیر" اپنی شمع حیات جنگ و جدال کے جھکڑ میں بھی روشن رکھنے میں کامیاب رہا اور اب ۱۹۴۲ء کا تاریخ نمبر اپنی پوری لمعہ افشانیوں کے ساتھ آپ کے سامنے ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنگ کی قیامت انگیزیوں کا عالمگیر کے مالیات پر کوئی ناگوار اثر نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے رسائل و جرائد کی طرح ہمیں بھی کاغذ کے حصول میں بے پناہ مشکلات کا سامنا ہو رہا ہے اور اس کا اظہار کئی مرتبہ قارئین کے سامنے کیا جا چکا ہے یہاں ہم کاغذ کے مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کا ارادہ نہیں رکھتے کیونکہ اس تلخ حقیقت پر کئی مرتبہ روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ البتہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ "تاریخ نمبر" کے لئے ولیسی کاغذ فراہم کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ تاہم انسانی ارادہ جب عمل و جہد کا رُخ کرتا ہے تو راہ کی دشواریاں خود بخود ہٹ جاتی ہیں۔ رب جلیل کا بے پایاں احسان ہے کہ اس نے ہمیں اقتصادی مشکلات کے مقابلہ کی توفیق ارزانی فرمائی۔ اور ہم یہ "تاریخ نمبر" جو گلستان ادب و تاریخ کا ایک مہکتا ہوا گلدستہ ہے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔

"تاریخ نمبر" کو ہر لحاظ اور ہر جہت سے کامیاب بنانے کے لئے کس درجہ محنت و مشقت اور عرقریزی و جانفشانی سے کام لیا گیا ہے اس کا اندازہ قارئین ہی بہتر طریقے سے کر سکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنی عظیم الشان اشاعت کی معنوی و باطنی کامیابی کا سہرا ہمارے قلمی معاونین کے سر ہے جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود قلزم تاریخ کی غواصی کی اور قارئین کے دل و دماغ کی فرحت کے لئے اتنے خوش آب موتی مہیا کئے کہ مدتوں تک ان کی یاد تازہ رہے گی۔ ہم اپنے محترم معاونین کا بصمیم قلب شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی اپنے بیش بہا مقالات اور علمی جواہر ریزوں سے عالمگیر کے دامن کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

تاریخ نمبر کو متنوع اور دلچسپ بنانے کے لئے چھ حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ یعنی حقائق و معارف، مقالات، افسانے اور ڈرامے، سیر و سوانح، منظومات اور عظمت رفتہ،

"حقائق و معارف" میں تاریخ کے عارفانہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حضرت مولانا ظفر علی خاں نے مغلیہ دَور کے دو تاریخی واقعات کو ادیبانہ شگفتگی کا لباس پہنایا ہے۔ مصر کے مرد مجاہد سعد زغلول پاشا مرحوم کی فصاحت و بلاغت مسلمہ ہے۔ ان کی بعض حریت پرور تقریروں کے ایمان افروز اقتباسات بھی "حقائق و معارف" کے تحت ہدیۂ قارئین ہیں۔ "مشاہیر اپنے اوقات وفات میں" کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اکابر اسلام کو نزع کے عالم میں بھی اپنے فرائض کا کس درجہ احساس تھا۔!

مقالات میں "اورنگ زیب کی جنگ تخت نشینی" تحقیق و تدقیق کے لحاظ سے امتیازی شان کا مستحق ہے۔ مولوی نور احمد خاں فریدی تاریخی کتب پر محققانہ نظر رکھتے ہیں۔ آپ نے مغلیہ دور کی ایک پامال داستان کو بھی ایسے دلچسپ مسلسل اور مربوط پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ "ہندوستان میں صحابۂ کرام کی آمد" تاریخ کا ایک گم شدہ ورق ہے۔ جس کے بعض خد و خال مولوی عبدالقیوم صاحب ندوی نے نمایاں کئے ہیں۔ اگرچہ اس سلسلے میں مزید کدوکاوش کی ضرورت ہے تاہم ندوی صاحب نے جو کچھ بھی پیش کیا ہے شکریئے کا مستحق ہے۔ ماسٹر محمد قسمر الهدیٰ نے جزیہ کی تاریخ پر معلومات افزا روشنی ڈالی ہے اور ان اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے جو مسلمان بادشاہوں کے اس جائز اقدام پر اکثر کئے جاتے ہیں۔ پروفیسر محمد علم الدین سالک نے تاریخ کی ان کتب پر مختصر سا تبصرہ کیا ہے جو ہندوستان کے عہد اسلامی میں مرتب کی گئیں اور بتایا ہے کہ اسلامی فتوحات نے جہاں ہندوستان کی تہذیب و شائستگی کا نقشہ بدل کر

کر دیا وہاں علم التاریخ کی بنیاد بھی رکھی۔

افسانوں اور ڈراموں کا حصہ خاص طور پر بلند پایہ اور معیاری ہے۔ جناب احسان علی شاہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبول اسلام کے واقعہ کو افسانوی پیرایہ میں بیان کر کے ایک بہت بڑی جسارت کی ہے لیکن ہمیں مسرت ہے کہ یہ جسارت غیر شعوری طور پر کارنامہ سے بدل گئی ہے۔ کیونکہ شاہ صاحب نے فن افسانہ نویسی کو مد نظر رکھنے کے باوجود اصل واقعہ کی تاریخی نوعیت پر کوئی حرف نہیں آنے دیا۔ اور یہی اس افسانہ کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ افسانے کا "عروج" خاص طور پر مؤثر ہے۔ "طرز ادا" روحانیت افروز ہے۔ "بروز" لائق داد ہے۔ آخری ورق پڑھ کر انسان بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ "رقیب کا دل" اس زمانہ کا ایک رومان پرور واقعہ ہے جب کریمیا میں روس و ترکی ایک خونفشاں معرکے میں مصروف تھے۔ جناب صائب فتحپوری کا طرز تحریر دلکش اور انداز بیان مؤثر ہے۔ جناب رحمت علی صابر ایک پختہ مشق ادیب ہیں "شہنشاہ نپولین اور مارگریٹ جینگ" آپ کا ایک کامیاب ترجمہ ہے۔ جناب ساحر بی۔ اے نے میرزا غالب کی زندگی کے ایک مشہور واقعہ کو تمثیل کا لباس پہنایا ہے۔ یہ واقعہ اس زمانہ سے متعلق ہے جب دہلی کالج میں "مدرس فارسی" کا نیا عہدہ قائم کیا گیا اور میرزا غالب دہلوی ملازمت کے سلسلہ میں مسٹر ٹامسن سے ملنے گئے۔ فاضل ڈرامانویس نے میرزا غالب کی نفسیات کو خوب سمجھا ہے اور زبان کے چٹخاروں سے ڈرامے کو دلچسپ بنا دیا ہے۔

جناب امرت لال یاس نے اپنے مختصر سے افسانے میں اُن واقعات کا ایک منظر پیش کیا ہے جن سے متاثر ہو کر سدھارتھ نے شاہی زندگی کو خیرباد کہا اور گیان دھیان میں مصروف ہو کر مہاتما بودھ کے جلیل القدر خطاب سے سرفراز ہوا۔ "چھایا" ایک رومانی ڈراما ہے۔ "شعاع ماہ" چین کی ایک تاریخی کہانی ہے جس کی خوبیوں کا اندازہ خود ناظرین ہی بہتر طریقے سے کر سکیں گے۔

حصہ نظم میں علامہ محوی صدیقی۔ حضرت نوح ناروی۔ مولوی آخر امرتسری۔ علامہ شفق رضوی اور جناب مقبول حسین احمد پوری جیسے اساتذۂ فن کے علاوہ ہندوستان کے متعدد شعرائے کرام کا تازہ ترین کلام شریک ہے۔

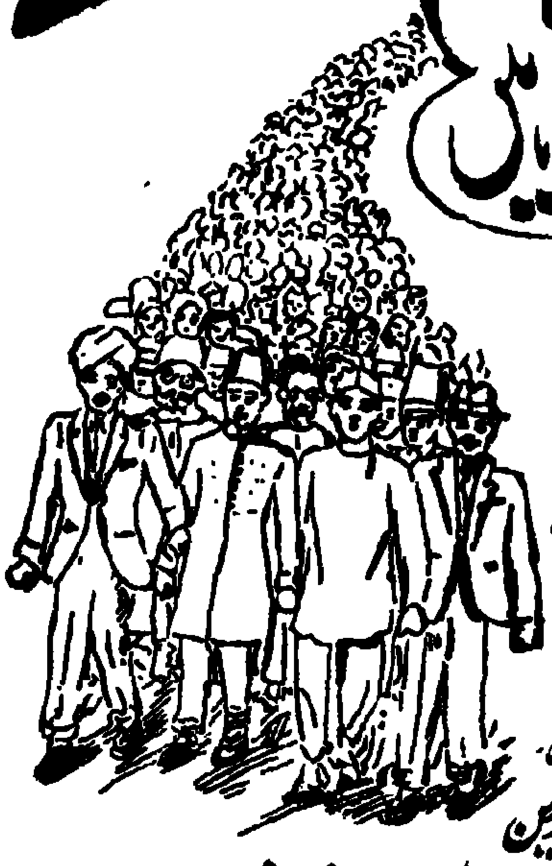
"سیر و سوانح" کا حصہ تاریخ نمبر میں امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ ماسٹر ممتاز حسین بسمل نے "امیر البحر خیر الدین بار بروس" کے جہانبانہ کارنامے مؤثر انداز میں پیش کئے ہیں۔ جناب احمد اللہ صاحب قادری بہت دیر کے بعد محفل عالمگیر میں تشریف لائے ہیں "آصف جاہ اول کے اصول و ضوابط راعی و رعایا کے لئے یکساں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ جناب محمد عبداللہ قریشی نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زندگی کے بعض دلچسپ واقعات قلمبند کئے ہیں جن سے مہاراجہ کی نعمت پروری اور رعایا نوازی کا ثبوت ملتا ہے۔ مولوی آخر امرتسری نے تحریک بہائیت کے بانی علی محمد باب کی جاہلانہ زندگی کا خاکہ کھینچا ہے۔ اور اقبال کے ایک قطعہ کا تاریخی پس منظر پیش کیا ہے۔ مضمون عالمانہ مؤرخانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ پروفیسر علم الدین سالک نے سلطان ٹیپو شہید کی حاکمانہ عظمت واضح کی ہے جناب شعلہ وارثی نے اُردو داں طبقہ کو اسلام کے اوّلین عہد کے ایک ماہر فن انجینیر سے روشناس کیا ہے۔ پیر غلام دستگیر صاحب نامی نے تزک جہانگیری سے رانا امر سنگھ کے خاندانی حالات ترجمہ کئے ہیں۔

"عظمت رفتہ" کے ماتحت تہذیب و ثقافت کے عروج و زوال کی داستان بیان کی گئی ہے۔ حافظ رشید احمد صاحب ارشد۔ جناب عطا محمد پراچہ اور جناب عبدالرحمٰن مستقیمی کے مضامین اپنے اپنے موضوع پر بہت خوب ہیں۔

ماہ جون کے اوائل میں حسب معمول رسالہ عالمگیر کا سالانہ نمبر شائع ہوگا تفصیلات آئندہ اشاعت میں پیش کی جائیں گی۔ قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ وہ ۲۰ / اپریل تک اپنے اپنے جواہر افکار دفتر میں ارسال فرمائیں تاکہ بروقت کتابت و طباعت کا انتظام ہو سکے ــــ (ادارہ) ــــ

لاکھوں انسان

ان کا استعمال کرتے ہیں



کیونکہ

بی ایم کے پی فیبرکس

ہندوستان میں ہندوستانی سرمایہ سے ہندوستانی کاریگروں کے ہاتھ سے تیار کئے جاتے ہیں جو کوالٹی میں عمدہ۔ دیکھنے میں خوبصورت اور پائیداری میں عدیم النظیر

اور

قیمت میں ارزاں ہیں۔ اور آپ بھی ہر ایک ضرورت پوری کرتے ہیں۔

سفید لٹھے۔ مکھن لین (ساٹن ڈریل) سفید زین

پاپلین۔ سفید ٹول۔ وغیرہ وغیرہ

ہر بڑے کپڑے کے ڈیلر سے طلب کریں۔

رائے بہادر دُونی چند مہرہ

۳۳۶۔ اے کالبا دیوی روڈ بمبئی نمبر ۲

بی ایم کے پی فیبرکس

حقایق و معارف

سعد پاشا زغلول کے بلیغ اقوال

اِنَّ مِنَ البیانِ لسحرا

مرحوم احمد سعد پاشا زغلول کو مصر میں جو اثر و رسوخ حاصل ہوا اس میں انکی دوسری قابلیتوں کے علاوہ ان کی قوت خطابت اور بلاغت کو بھی بڑا دخل تھا - ذیل میں ان کے بعض اقوال کا ترجمہ دیا جاتا ہے جو ضرب الامثال کے طور پر مشہور ہو گئے ہیں -

کامل آزادی - مصر کامل آزادی کا مطالبہ کرتا ہے کیونکہ آزادی قوموں کا پیدائشی حق ہے -

ناامیدی - اس وقت ہماری حالت کیسی ہی ابتر ہو مگر ہماری قوم جیسی کوئی بڑی قوم کبھی اپنی قسمت کی طرف سے ناامید نہیں ہو سکتی -

حاکم و محکوم کی مصلحت - حاکم قوم کی مصلحت ہمیشہ اس کی محکوم قوم کی مصلحت سے متضاد ہوا کرتی ہے -

عہدے کی خواہش - اپنے آزاد وطن میں ایک حقیر فرد بن کر رہنا مجھے اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ اجنبی حکومت کے ماتحت بڑے سے بڑے عہدے پر مقرر ہوں -

مادی قوت - مادی قوت قوم کے ایمان پر کبھی غالب نہیں آ سکتی -

صحیح تحریک - ہر صحیح تحریک ضرور کامیاب ہوتی ہے -

زمانے کے انقلابات - زمانے کے انقلابات دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست بنا دیتے ہیں -

انتہا پسندی - آزادی کے طلبگار انتہا پسند نہیں ہوتے اس لئے کہ یہ تو ایک ابتدائی چیز ہے - غلامی پسند کرنے والے البتہ انتہا پسند ہوتے ہیں کیونکہ غلامی ذلت نفس کی انتہا ہے -

قومی روح - قوم کی روح نہ جنگی قوانین سے مغلوب ہو سکتی ہے نہ ظلم سے اور نہ دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت کی قوت سے -

اصول نہ کہ اشخاص - اگر سعد قومی اصول سے ہٹ جائے تو اسے گرا دو -

نکتہ چینی - میں اپنی ذات پر نکتہ چینی سن کر خوش ہوتا ہوں اگرچہ وہ جھوٹی ہی ہو -

میرا اخلاق - میں چلانے والا ہوں - سازشی نہیں ہوں -

ابنائے وطن کو نصیحت - ابنائے وطن! تم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ میری نگرانی کرے - صرف سعد ہی ذمہ دار نہیں ہے، وطن کا ہر فرد ذمہ دار ہے -

قومیت - یہ دیکھ کر میری مسرت بے حساب ہو جاتی ہے کہ مصر میں صرف ایک ہی وحدت موجود ہے اور وہ مصری قوم ہے -

قومی زندگی - یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے - یہ باتوں کا دار نہیں ہے - یہ قومی زندگی کا مسئلہ ہے -

میٹھے بول - انگریز گفتگو میں بڑے ماہر ہیں - وہ جانتے ہیں کہ میٹھے بول ہمیں مسحور کر لیتے ہیں -

ہمارا مطالبہ - ہمارا مطالبہ کچھ بہت لمبا چوڑا نہیں ہے مطالبہ صرف ایک ہے: آزادی -

مصری زندگی - سعد مر کر بھی ہمیشہ زندہ رہے گا - کیونکہ ہر مصری سعد ہے - بلکہ سعد سے بھی بڑھ کر -

مصری قوم - آج مصری قوم وہ نہیں ہے جو کل تھی - آج مسلم اور غیر مسلم الگ الگ نہیں ہیں - سب ایک قوم ہیں اور صرف ایک ہی مقصد رکھتے ہیں یعنی آزادی اور وطن!

طاقت - میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ بہت سے دل ہیں کہ آدمی کی بھی طاقت بو سہارا نہیں ہو سکتی ... کا احترام

قومی عزت - میں کہہ چکا ہوں - کہتا ہوں - کہتا رہوں گا کہ جو عزت میری قوم نے مجھے دی ہے - وہ میرے لئے قابل فخر ہے -

میرا دل - میرے دل میں نہ حسد ہے اور نہ کینہ ہے - میرے دل میں قومی امانت نے کسی چیز کے لئے بھی جگہ خالی نہیں چھوڑی ہے -

وزارت - ہم وزارت کے دشمن نہیں ہیں لیکن غیر قومی وزارت دیکھ نہیں سکتے -

آزادی کا استحقاق - جو قوم اپنے فرزندوں کا خون اس لئے بہتے دیکھتی ہے کہ وہ آزادی چاہتے ہیں اور پھر خاموش رہتی ہے۔ وہ یقیناً آزادی کا استحقاق نہیں رکھتی۔

میری آرزو - آزادی میری آرزو ہے۔ جو ہاتھ بھی آزادی لانے میں سب سے پہلے اس کا بوسہ لونگا۔ اگرچہ وہ میرے کسی جانی دشمن ہی کا ہاتھ کیوں نہ ہو۔

خود اعتمادی - خود اعتمادی خود اختیاری وصف نہیں ہے، بلکہ پیدائشی صفت ہے۔ خود اعتماد آدمی اگر یہ وصف دور بھی کرنا چاہے تو دور نہیں کر سکے گا۔

میری دشمنی - میں نے اگر کسی سے دشمنی کی ہے تو صرف اپنی قوم کی مصلحت کی وجہ سے۔

زور رعایت - قومی حقوق میں زور رعایت دخل نہیں پا سکتی۔

ناکامی - جبر و قوت نے جو کچھ جمع کیا ہے بکھر جائے گا۔ طمع نے جو کچھ جوڑا ہے ٹوٹ جائے گا۔ جس کی بنیاد جھوٹ پر ہے وہ یقیناً گر پڑے گا۔

ناکامی کی علت - ناکامی کی اصلی علت کارکنوں کی باہمی بے اعتمادی ہوتی ہے۔

صبر و برداشت - ہاں ہم پر مصائب بے شمار ہیں لیکن وہی قوم زیادہ عظمت حاصل کرتی ہے جو زیادہ مصائب برداشت کر سکتی ہے۔

منفعت - اگر ملکیت میں منفعت کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو دنیا تہ و بالا ہو جائے کیونکہ ہر شخص کی منفعت اسی میں ہے کہ ساری دنیا کا مالک بن جائے۔

عمل اور قربانی - کوئی عمل حق ضائع نہیں ہوتا۔ کوئی قربانی رائگاں نہیں جاتی۔

ضرورت اور قوت - کسی زمانے میں بھی ضرورت قانون نہ تھی۔ کسی وقت میں بھی قوت حق کا معیار نہ تھی۔

ظلم - ہر ظلم اپنے دامن میں مظلوم کے لئے خوشخبری اور ظالم کے لئے سزا چھپائے ہوتا ہے۔

شہیدان وطن کی یاد - ہمہ تن خشوع ہو کر ان پاکباز، جانباز، بہادروں کی روحوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، جنہوں نے حق کا اعلان کیا۔ حالانکہ حق کا اعلان مصر میں سب سے بڑا جرم تھا۔ وہ حق کا ڈنکا بجاتے آگے بڑھے۔ ان کی بے لاگ شجاعت نے ہمیں سرخرو کر دیا۔ سب کو وطن کے احترام پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنا فرض انجام دے چکے۔ اب وہ اپنی قبروں میں آرام سے سو رہے ہیں۔ آزادی کی سہانی صبح ان کے خون سے بنائی ہوئی غلامی کی ظلمت چاک کر کے نکل آئی۔ اللہ ان کی قبریں روشن کرے، فردوس بریں میں انہیں [illegible] ہمارے عمل سے ان روحوں کو خوش کرے۔

نوجوان - میری قوم کی جوانی پر خدا کا سایہ! نوجوانوں نے جوانی کے ان تمام خزانوں کے منہ کھول دیئے جو ان کے سینوں میں بند تھے۔ پورے ملک کو جوش اور خودداری سے لبریز کر دیا۔ دلوں میں عظمت پیدا کی۔ سروں میں حکمت اتاری۔ جسموں میں نظام قائم کر دیا۔ نوجوان ہی ہماری تحریک کا اصلی ستون ہیں۔ مصر کے نئے روشنی کا مینار ہیں۔ مستقبل انہی کے ہاتھ میں ہے اور نوجوان ہاتھوں کی قوت معلوم ہے۔

علمائے دین - میں علماء اسلام اور مسیحی پیشواؤں کا شکر گزار ہوں۔ انہوں نے متحد ہو کر دشمن کی سب سے بڑی حجت باطل کر دی۔ تمام اختلافات دور کر دیئے اور ثابت کر دیا کہ سب دین اپنی غرض میں ایک ہیں۔ سب وطن کی مدافعت فرض قرار دیتے ہیں۔ سب کا تعلق خالق ارض و سما کی عبادت سے ہے۔ سب دینی مصلحت میں مخلوق کو اتحاد کی دعوت دیتے ہیں۔

اصول نہ کہ اشخاص - سعد اور اس کے رفیق تم میں انبیا نہیں ہیں جنہوں نے معجزے دکھائے۔ اولیا نہیں ہیں جنہوں نے کرامتیں دکھائی ہیں۔ وہ تمہارے ہی افراد ہیں۔ تمہارے اصول کے خدمتگزار ہیں۔ تمہارے ہی آدمی ہیں۔ تمہارے شعور کا انہوں نے احساس کیا اور تمہارے اصول سے لبریز ہو گئے۔ چنانچہ وہ ان کی خدمت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پس ہمارے لئے کوئی فخر نہیں، اور اگر ہے تو وہ تم سب کا فخر ہے۔

بلاشبہ میں نے کچھ خدمت کی ہے۔ لیکن میں نے کچھ قربانی نہیں کی کیونکہ میں بے روزگار تھا۔ البتہ میرے ساتھیوں نے قربانیاں کی ہیں۔ انہوں نے اپنے منصب اور عہدے چھوڑے۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد تک کی جدائی گوارا کی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میرے کوئی اولاد بھی نہیں۔ (اس پر حاضرین چلا اٹھے "ہم سب آپ کی اولاد ہیں") بلاشبہ تم سب میری اولاد ہو۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ یہ تمام اعزاز اشخاص کے لئے نہیں، اصول کے لئے ہے اور وہ اصول سعد اور سعد کے رفقاء سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

اتحاد - میری نظر میں سب سے بڑی اور محبوب چیز مسلمانوں اور قبطیوں کا اتحاد ہے۔ یہ علم جو اس مبارک اتحاد کا نشان ہے

مجھے دنیا اور دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ علم میرے ہاتھ میں دیا گیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی پوری قوت سے اس کی حفاظت کروں گا اور زندگی کے آخری لمحے تک اسے بلند رکھوں گا۔ "مسلمان" اور "عیسائی" مصر میں مسلمان اور عیسائی نہیں پایا جاتا۔ مصر میں صرف ایک قوم پائی جاتی ہے اور وہ مصری قوم ہے۔

وکالت۔ وکلا کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے مرحوم نے کہا: میری خدمتوں کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میرے لئے ان خدمتوں پر فخر کرنا روا نہیں ہے۔ لیکن میں آپ کی اجازت سے صرف اس بات پر فخر کرنا چاہتا ہوں کہ میں وکالت کے پیشے میں داخل ہوا اور اس کی خدمت کی۔

ہاں! میں اس خدمت پر بہت زیادہ فخر کرتا ہوں۔ مجھے کوئی انانیت کا الزام نہ دے کیونکہ میں جانتا ہوں اس زمانہ میں اس پیشے کا کیا حال تھا جب میں نے وکالت کا پیشہ اس وقت اختیار کیا جب یہ پیشہ معزز نہ تھا جیسا اس وقت ہے۔ بلکہ وہ حقیر سمجھا جاتا تھا اور اس کے آدمی بھی حقیر سمجھے جاتے تھے۔ یہ پیشہ اصل میں جس قدر شریف تھا ہمارے ملک میں اسی قدر ذلیل ہو گیا تھا۔ وکیل اور دغاباز یہ دونوں لفظ ہم معنی سمجھے جاتے تھے اونچے خاندان کا کوئی رکن بھی اس میں داخل نہیں ہوتا تھا اور سچ یہ ہے کہ اس وقت وکلا کو بھی اپنی عزت نفس کا کوئی خیال نہ تھا۔

لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں اس پیشے میں در آیا۔ بلاشبہ یہ ایک بڑی اخلاقی شجاعت کا کام تھا۔ میں سنا کرتا تھا کہ لوگ وکیل اس لئے بنتے ہیں کہ مکر و فریب کی راہوں سے دولت کمائیں۔ میں نے کہا لیکن میں اس لئے وکیل بنوں گا کہ حق و عدالت کی خدمت کر سکوں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وکیل حاکم عدالت کے رحم پر ہوتا تھا۔ اس کی ذرا سی ناراضی بھی وکیل کو اپنی کمائی سے محروم کر دیتی تھی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ میں ایک مقدمہ میں بحث کر رہا تھا۔ سرکاری وکیل نے کہا کہ پیشی بڑھا دی جائے۔ میں نے اعتراض کیا کہ مقدمہ کا التوا ناروا ہے کیونکہ ملزموں کو قید خانے میں بلا سبب رکھنا ناجائز ہے۔ حاکم خفا ہو گیا۔ فوراً اپنے الفاظ واپس لو۔ حاکم نے کہا۔ عدالت کے لئے کوئی بات بھی ناروا و ناجائز نہیں۔ لیکن میں نے الفاظ واپس لینے سے انکار کیا اور سخت صورت حال کا مقابلہ کیا۔ اسی طرح کے بہت سے واقعات پیش آتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا جب یہ پیشہ معزز ہو گیا اور حکام وکلا کی دوستی پر فخر کرنے لگے۔

قومی نگرانی کے حدود۔ ہم قوم کے نمائندے ہیں۔ قوم کو ہماری نگرانی کا حق ہے۔ قوم کا فرض ہے کہ وہ اپنا مطالبہ ہمیں بتائے۔ اس نے یہ مطالبہ ہمیں بتا دیا ہے کہ "کامل آزادی"۔ اب ہم کوشش کرتے ہیں۔ قوم کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کوشش کی راہیں بھی ہمارے لئے مقرر کرے قدم قدم پر ہم سے باز پرس کرے۔ اگر ہم کسی سے گفتگو کریں تو ہم سے روداد طلب کرے۔ اگر ہم کہیں جائیں تو ہم سے روداد طلب کرے۔ اگر ہم کہیں جائیں تو ہم سے وجہ دریافت کرے۔ قوم کو چاہئے کہ خاموشی سے ہماری کوشش دیکھے۔ جب ہم اس کے سامنے اپنی کوشش کے نتائج پیش کریں تو بلاشبہ اسے حق ہے کہ ہماری تجویزیں خوب جانچے۔ اگر اس کی پسند کے مطابق نہ ہوں تو ٹھکرا دے ہمیں ہرگز کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

آزادی کی نعمت۔ ہم دنیا کی ہر نعمت سے محروم ہو جانے پر تیار ہیں۔ سب آرام ہم سے چھین لو۔ ہمارا مال و دولت بھی ضبط کر لو۔ ہم اس پر صبر کر لیں گے۔ مگر یاد رکھو ہم آزادی سے ہرگز دست بردار نہ ہوں گے۔ آزادی خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے اس سے محرومی خود زندگی سے محرومی ہے۔

قومی وحدت۔ قوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ وہ مجموعہ جس کی مصلحت ایک ہے۔ جس کا شعور ایک ہے۔ جس کی آرزو ایک ہے۔ ہماری قوم کی اس وقت آرزو کیا ہے؟ کامل خود مختاری! ہماری قومی وحدت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے اس میں نہ فرقے ہیں نہ درجے ہیں۔

وہ جھوٹے ہیں جو کہتے ہیں کہ پاشاؤں (امیروں) کا گروہ پوری قوم پر حاوی ہے یا ہونا چاہتا ہے۔ ہمارے ملک میں پاشاؤں کا کوئی خاص گروہ ہے۔ نہ فلاحین (کسان) کا۔ ہم سب پاشا بھی ہو سکتے ہیں اور فلاح بھی ہو سکتے ہیں۔ میرے اپنے خاندان کے اکثر افراد فلاح ہیں لیکن میں سعد زغلول پاشا ہوں۔

وہ جھوٹے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے اندر دینی فرقے موجود ہیں ممکن ہے پہلے کبھی ہوں۔ لیکن اب کوئی فرقہ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی ہے تو وہ ایک ہی فرقہ ہے یعنی مصری قوم۔ جب سے جدید بیداری کا سورج طلوع ہوا ہے۔ ہلال اور صلیب نے ہمیشہ کے لئے معانقہ کر لیا ہے۔ یہ معانقہ صرف مسلمان اور قبطی کا معانقہ نہیں ہے۔ یہ مسلمانوں کا دنیا بھر کی قوموں اور مذہبوں سے اتحاد کا نشان ہے۔ ہم متعصب نہیں ہیں۔ ہم شیطان کے پجاری نہیں ہیں جو انسانوں میں پھوٹ ڈالتا ہے۔ ہم خدا کے پرستار ہیں جو انسانوں میں محبت کا رشتہ پیدا کرتا ہے۔

کہا: "اسّی ہزار دینار" پوچھا "کیوں لیا تھا؟" جواب دیا: "دو قسم کے آدمیوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں۔ شریف النفس غریبوں کی، اور حیا سے سوال نہ کر سکنے والوں کی۔ یہ مجبور ہو کر آتے تھے مگر شرم سے مانگ نہ سکتے تھے، فرطِ حیا سے چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ میں سوال سے پہلے ہی انہیں دے دیتا تھا۔" تاریخ وفات ۵۹ھ (۶۷۹ء)

سعید بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ

بڑے خوددار اور بلند ہمت تھے۔ مرض الموت میں مشورہ دیا گیا "بیمار کراہنے سے راحت پاتا اور طبیب سے اپنی حالت بیان کرنے سے مطمئن ہوتا ہے۔"

کہنے لگے "کراہنا بزدلی ہے۔ عیب ہے۔ خدا ہرگز میرا کراہنا نہیں سنے گا تاکہ اس کے حضور بزدل نہ ٹھہرایا جاؤں۔ رہا طبیب تو وہ اللہ خدا کے سوا کسی کو بھی اپنے اوپر اختیار نہیں دوں گا۔ خدا چاہے تو مجھے رکھے چاہے تو اٹھالے۔"

ربیع بن خثیم رضی اللہ عنہ

فالج میں مبتلا ہوئے۔ کہا گیا، دوا کیوں نہیں کرتے؟ جواب دیا "میں دوا کا فائدہ جانتا ہوں مگر نہ مریض ہی زندہ رہے گا نہ طبیب، پھر دوا کیوں کروں؟" ۶۱ھ (۶۸۰ء) میں وفات ہوئی۔

معاویہ بن یزید رضی اللہ عنہ

وفات کے وقت مشورہ دیا گیا۔ اپنے خاندان میں سے کسی شخص کو خلیفہ مقرر کر جائیے۔

جواب دیا: "میں نے خلافت سے نہ زندگی میں فائدہ اٹھایا نہ مرنے کے بعد اس کا بوجھ اٹھاؤں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بنی امیہ اس کی شیرینی لیں اور میرے حصہ میں تلخی آئے۔" ۶۴ھ (۶۸۳ء)

جمیل۔ مشہور شاعر عرب

جمیل کا عشق بثینہ سے مشہورِ عام ہے۔ ابو سہل ساعدی عیادت کو گیا۔ نزع کی حالت تھی۔ جمیل نے کہا۔ "ابو سہل! ایسے آدمی کی بابت کیا کہتے ہو جو خدا سے اس حال میں ملتا ہے کہ اس نے کسی کا خون نہیں بہایا۔ شراب نہیں پی۔ کبھی بدکاری نہیں کی۔ کیا اس کے لئے جنت کی امید ہے؟"

ساعدی نے کہا "بخدا ہاں، مگر وہ کون ہے؟"

"مجھے امید ہے کہ میں ہوں۔" جمیل نے جواب دیا۔

ساعدی نے بثینہ کا ذکر کیا۔

"دیکھو!" جمیل نے آہ سرد بھر کر کہا "یہ دنیا میں میرا آخری دن ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محروم ہو جاؤں اگر کبھی بثینہ کی طرف میں نے بدی سے نظر کی ہو۔"

جب وفات بالکل قریب پہنچی تو جمیل نے اپنے ایک دوست کو بلا کر وصیت کی۔

"جب میں مر جاؤں تو گھر کا تمام سامان تمہارا ہے۔ صرف میرے کپڑوں کا ایک جوڑا اس سے الگ ہے۔ تم میری اونٹنی پر سوار ہو کر بثینہ کے قبیلے میں جانا اور بلند جگہ پر کھڑے ہو کر میرے کرتے کا گریبان پھاڑ ڈالنا۔ پھر چلا کر یہ شعر پڑھ دینا۔

صدا النعی و ما کنی بجمیل ۔۔۔ وثوی بمصر ثواء غیر قفول

موت بے دھڑک آ پہنچی۔ جمیل سے کوئی رعایت کی وہ اب اس طرح مقیم ہو گیا کہ کبھی واپسی نہ ہو گی۔

ولقد اجر الذیل فی وادی القری ۔۔۔ نشوان بین مزارع ونخیل

میں وادی قریٰ میں کھیتوں اور نخلستانوں میں خوشی خوشی پھرا کرتا تھا۔

قومی بثینۃ فاندبی بعویل ۔۔۔ وابکی خلیلک دون کل خلیل

بثینہ! اٹھ اور نوحہ کر اپنے سب سے بڑے دوست کے لئے۔"

دوست نے وصیت پوری کر دی۔ جمیل نے ۸۲ھ (۷۰۱ء) میں انتقال کیا۔

مہلب بن ابی صفرہ

وفات کے وقت اپنے تمام لڑکوں کو جمع کیا۔ پھر تیر منگوایا اور کہا "کیا تم یہ تمام ایک ساتھ بندھے ہوئے تیر توڑ سکتے ہو؟" انہوں نے کہا "نہیں۔" مہلب نے کہا "اگر الگ الگ ہوں؟" انہوں نے کہا "ایک ایک تیر کا توڑنا بالکل آسان ہے۔" مہلب نے کہا "یہی مثال اتفاق واتحاد اور جماعت کی ہے۔ متحد رہو گے تو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ الگ الگ ہو جاؤ گے تو آسانی سے ہلاک کر دیئے جاؤ گے۔" ۸۳ھ (۷۰۲ء)

عبدالملک بن مروان

موت کے وقت اپنے بیٹے ولید سے کہا۔

"دیکھو میری موت پر بیوقوف عورتوں کی طرح بیٹھ کر نسوے نہ بہانا بلکہ کمر باندھنا۔ آستین چڑھانا چیتے کی کھال پہن لینا۔ مجھے میرے گڑھے میں ڈال کر مٹی دینا۔ میں اپنا معاملہ خود چکا لوں گا۔ لیکن تم اپنے معاملہ کی فکر کرنا۔ لوگوں کو بیعت کے لئے بلانا۔ جو اپنے سر سے یوں کرے (یعنی انکار کرے) تو تم بھی اپنی تلوار سے یوں کرنا (یعنی گردن اڑا دینا)
پھر یزید بن معاویہ کے دونوں لڑکوں محمد اور خالد کو طلب کیا ان سے پوچھا "کیا ولید کی بیعت پر نادم ہو" انھوں نے جواب دیا ہم ولید سے زیادہ کسی کو بھی خلافت کا حق دار نہیں سمجھتے۔ عبدالملک نے کہا واللہ اگر تم کچھ اور جواب دیتے تو فوراً تمھارا سر اڑا دیتا۔" پھر اپنے بستر کا کنارا اٹھا کر دکھایا نیچے شمشیر برہنہ رکھی تھی۔
یہ اس وقت کی گفتگو ہے جب سکرات موت طاری تھی عبدالملک نے کہنا شروع کیا۔ "واحسرتا کتنا برا ہے جو چھوٹے بڑے سب کو بے چارگی سے موت دیتا ہے۔" اس کے بعد روح پرواز کر گئی۔
اصمعی کہا کرتا تھا۔ میں عبدالملک پر حسد کرتا ہوں۔ کیونکہ اس نے مرتے وقت کہا تھا: "خدایا میرے گناہ اگرچہ بے شمار ہیں اور بے حد بڑے ہیں لیکن تیرے عفو کے سامنے بہت کم اور بہت چھوٹے ہیں لہٰذا مجھے معاف کر دے۔"
کہتے ہیں عبدالملک نے اپنی وفات کے وقت اپنے محل کی ایک کھڑکی سے ایک دھوبی کو دیکھا اس نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا "کاش میں اس دھوبی کی طرح ہوتا اپنی روز کی کمائی سے پیٹ پالتا۔ کاش میں خلیفہ نہ بنا ہوتا۔ پھر یہ شعر پڑھا۔

لیتنی کنت قبل ما قد بدالی ۔۔۔ فی رؤس الجبال ارعی الوعولا!

ابو حازم نے یہ قول سنا تو کہنے لگے۔ "الحمد للہ یہ لوگ موت کے وقت اس بات کی تمنا کرتے ہیں جو ہمیں حاصل ہے۔ لیکن ہم موت کے وقت ان کی حالت کی آرزو نہیں کرتے۔"
۸۶ھ (۷۰۵ء) میں وفات پائی۔

ابن القریہ

مشہور عرب خطیب ابن القریہ کو قتل کرنے کے لیے جب حجاج بن یوسف نے حکم دیا اور جلاد تلوار لے کر آیا تو ابن القریہ نے کہا: "خدا حاکم کی درستی کرے۔ میں مرنے سے پہلے تین لفظ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں جو میرے بعد ضرب المثل بن کر ہمیشہ زندہ رہیں گے۔
حجاج نے کہا۔ "کہہ کیا کہتا ہے؟"
ابن القریہ نے کہا: "ہر اصیل گھوڑا ٹھوکر کھاتا ہے۔ ہر تلوار کند ہو جاتی ہے۔ ہر دانا سے غلطی ہو جاتی ہے۔"
حجاج نے کہا یہ وقت مزاح کا نہیں ہے۔ جلاد اپنا کام کر۔
جلاد کا ہاتھ چلا اور ابن القریہ کا سر زمین پر تھا۔
یہ واقعہ ۸۴ھ (۷۰۳ء) کا ہے۔

اخطل

مشہور شاعر اخطل سے موت کے وقت پوچھا گیا۔ "کوئی وصیت؟" کہا "ہاں": پھر اپنے دوست فرزدق کو یہ وصیت کی۔
"میں موت کے وقت فرزدق کو وصیت کرتا ہوں کہ جریر کی ماں اور اس کی سوکنوں کا خیال رکھے۔"
۹۲ھ (۷۱۰ء) میں فوت ہوا۔

امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ

موت کے وقت سخت خوفزدہ ہوئے۔ لوگوں نے اعتراض کیا۔ کہنے لگے۔ "اس حالت سے زیادہ خطرناک حالت اور کیا ہو سکتی ہے ہر لمحہ دھڑکا لگا ہے کہ پروردگار کا قاصد پہنچے۔ اور جنت یا دوزخ کی خبر دے۔ قسم خدا کی میری تمنا ہے کہ قیامت تک میری روح یونہی حلق میں پھنسی رہے۔" ۹۶ھ (۷۱۴ء) میں انتقال ہوا۔

امام سفیان ثوریؒ

موت کے وقت نہایت مضطرب تھے۔ کہا گیا "ابو عبداللہ یہ اضطراب کیوں؟ کیا آپ اس ذات کے پاس نہیں جا رہے ہیں جس کی آپ نے ہمیشہ عبادت کی؟ اور ہمیشہ اسی کی طرف بھاگتے رہے؟" کہنے لگے "تمھارا بھلا ہو۔ میں ایک ایسے رستے میں سفر شروع کرنے والا ہوں جسے میں نہیں جانتا۔ اور اس پروردگار کے روبرو پہنچنے والا ہوں جسے میں نے دیکھا نہیں ہے"
۱۶۱ھ (۷۷۸ء) میں وفات ہوئی۔

عبداللہ بن عبدالعزیز

موت کے وقت کہنے لگے۔ "خدا کی نعمت کا ذکر کرتا ہوں۔ اگر پوری دنیا میرے ہاتھ کے نیچے آ جائے تو بھی میں اسے لینے والا نہیں کیونکہ میں ہمیشہ اسی دن سے ڈرتا رہا ہوں جو آج در پیش ہے۔" ۱۸۴ھ (۸۰۰ء) میں انتقال کیا۔

تاریخی جواہر ریزے

از :-
مولنا ظفر علی خان

—— (۱) ——

سنہ ۱۰۶۳ھ میں دکن کا مطلع سیاست غبار آلود ہے۔ شاہزادہ شجاع اور مہابت خاں جیسے بہادر سپہ سالار فاتح و ظفر مند واپس آچکے ہیں۔ شاہجہاں نے اپنے چھوٹے بیٹے اورنگ زیب کو حکومت دکن عنایت کی ہے۔ جس کے ناخن تدبیر کو ملک داری و ملک گیری کے بست و کشاد میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ شاہزادے کے پہنچتے ہی آشوبگاہ دکن میں عافیت سرائے زمن کی شان آگئی ہے۔ قطب شاہی و عادل شاہی حکومتیں بہ طیب خاطر سلطنت دہلی کے تابع ہوگئی ہیں۔ اور باقاعدہ خراج ادا کرتی ہیں۔ شاہنشاہ دہلی کا سکہ و خطبہ جاری ہے۔ روز افزوں فتوحات کی گرم بازاری ہے اور ملک بھر میں جو ہے مصروف اطاعت گذاری ہے۔

شاہزادے کے حسن انتظام سے اس کی قدر روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ شوق دیدار غالب آتا ہے۔ اور بادشاہ اس کو دولت آباد سے دہلی بلاتا ہے۔ سنہ ۱۰۶۸ھ کے آخری دنوں میں اورنگ زیب کی آمد آمد ہے۔ بادشاہ اکبر آباد میں ہے۔ اورنگ زیب کا جلوس باغ نور منزل تک پہنچا ہے کہ علامہ افضل خاں وزیر اعظم و شاہزادہ مراد بخش و یمین الدولہ آصف خاں و خان دوران بہادر بادشاہ کے حکم سے استقبال کو آتے ہیں اور شاہزادے کو بادشاہ کا فرمان سناتے ہیں۔ جس میں یہ لطیف رباعی مرقوم ہے ؎

آگاہ اگر ز در در آئی چہ شود
یا تاختہ پیش از خبر آئی چہ شود
زود آمدنت نظر بہ شوق دیر است
از زود اگر زود تر آئی چہ شود

—— (۲) ——

شہنشاہ جہانگیر کے آخری دنوں میں شاہزادہ خرم کو دربار یوں کی سازش سے تنگ آکر جلاوطنی اختیار کرنی پڑی۔ صوبہ دار دکن خان جہاں لودی شاہزادے کی تادیب پر مامور ہوا۔ ہنوز یہ مہم انجام کو نہ پہنچی تھی کہ جہانگیر نے وفات پائی۔ شاہزادے نے کہ ولی عہد سلطنت بھی وہی تھا۔ خان جہاں کو استمالت نامہ لکھ کر بھیجا لیکن اس نے جواب تک نہ دیا۔ قاصد کو یوں ہی واپس کردیا اور علاقہ شاہی (بالا گھاٹ) کو نظام شاہیوں کے سپرد کر کے خود بھی انھیں سے مل گیا۔

دوشنبہ ۸ جمادی الآخر سنہ ۱۰۳۷ھ کو تخت لاہور پر شاہزادے کا جلوس ہوا اور شاہجہاں کے خطاب سے سکہ و خطبہ کو زینت ملی۔

شاہجہاں کی عفو نواز و مرحمت گستر و اغماض پسند طبیعت نے خان جہاں کے قصور معاف کر دیئے۔ اور صوبہ مالوہ کی گورنری اس کو عطا کی۔ سنہ ۱۰۳۸ھ میں خان جہاں حکومت چھوڑ بیٹھا۔ بادشاہ نے اپنے قلم سے استمالت نامہ لکھ کر بھیجا مگر اس نے کچھ پروانہ کی۔ اور مفرور ہوگیا۔ بہت سے دوسرے امرائے سلطنت نے بھی اس فرار میں اس کا ساتھ دیا۔ جن میں ایک دریا خاں افغان بھی تھا۔

خان جہاں خود بھی ایک بہادر افغان تھا۔ اس کا اصلی نام پیرا خاں تھا۔ پیرا خاں و دریا خاں دونوں نے ایک دل ہو کر علم بغاوت بلند کیا۔ اور بادشاہی علاقوں کو تاخت و تاراج کرنے لگے۔ تقریباً تین برس تک یہ سلسلۂ شورش مسلسل رہا۔ متعدد امرائے سلطنت ان دونوں کی مقاومت کو مامور ہوتے رہے۔ مگر ان کی کوہ شکن یکدلی کے آگے انبوہ عساکر کو ہمیشہ پراگندگی ہی نصیب ہوتی تھی۔

شاہجہاں کی رسم سالگرہ بڑی دھوم دھام سے ادا ہوتی تھی۔ جس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ ایک بار اسی جشن میں ایک کروڑ اسی لاکھ روپے (نقد و جنس) چار لاکھ بیگھہ اراضی اور ایک سو بیس گاؤں کی معافی اس نے رعایا کو عطا کی تھی۔ اس موقع پر ہر سال پیرا خاں و دریا خاں کی استمالت ہوتی تھی مگر ان کی سرکشی میں کبھی فرق نہ آیا۔

سنہ ۱۰۴۰ھ میں پہلے تو بندیلکھنڈ کی لڑائی میں دریا خاں قتل ہوا اور پھر کالنجر کی جنگ میں پیرا خاں کام آیا۔ طالب کلیم ان دونوں کے قتل پر ایک رباعی لکھتا ہے ؎

ایں مژدۂ فتح از پے ہم زیبا بود	ایں کیف دوبالا چہ نشاط افزا بود
در رفتن "دریا" سر "پیرا" ہم رفت	گویا سر او حباب ایں "دریا" بود

مقالات

ہندوستان میں صحابۂ کرامؓ کی آمد

تاریخ ہند کا ایک گمشدہ ورق

جناب مولوی حاجی عبدالقیوم ندوی

ہندوستان میں صحابہ کرامؓ کی آمد کے موضوع پر ہندی مورخ خاموش ہیں لیکن تاریخ اسلام کے بڑے بڑے مصنفین کی کتب میں جابجا ان اکابر اسلام کا تذکرہ موجود ہے۔ جن کے علمی و عملی کارناموں کی گونج آج بھی فضائے ہند میں تازہ ہے۔ لہذا یہ مضمون مندرجہ ذیل کتابوں کی امداد سے لکھا گیا ہے۔

(۱) تاریخ ابن خلدون (علامہ محمد ابن عبدالرحمن ابن خلدون الاندلسی) (۲) کامل ابن اثیر (علامہ محمد ابن اثیر) (۳) فتوح البلدان (علامہ بلاذری) (۴) معجم البلدان (علامہ یاقوت حموی معاصر ابن المستعصم خلیفہ عباسی المتوفی ۶۲۲ھ ۱۲۲۵ء) (۵) سفرنامہ ابن بطوطہ (علامہ ابوعبداللہ محمد ابن عبداللہ بطوطہ) (۶) ابن حوقل معاصر ابوبکر الطائع اللہ ابن مطیع خلیفہ عباسی المتوفی ۳۲۲ھ ۱۰۲۱ء

جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ کی مقدس جماعت تبلیغ و ہدایت کے لئے دوردراز ممالک کی طرف روانہ ہوئی شمع رسالت کے یہ پروانے جس طرف نکل جاتے۔ کفر و شرک کے جھنڈے سرنگوں اور ایمان و اسلام کے علم بلند ہو جاتے تھے۔ اسی ولولۂ حق کو لے کر ۱۵ھ میں بعہد حضرت عمر فاروق اعظمؓ صحابہ کرام اور عام مسلمانوں کی ایک جماعت حضرت حکم ابن العاصؓ کی زیر سرکردگی ہندوستان کی طرف روانہ ہوئی۔ بحرین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں اسلامی مقبوضات میں آچکا تھا۔ اس زمانہ میں عثمان ابن العاصؓ جو عرب کے بہادر قبیلہ ثقیف کے چشم و چراغ تھے اور جن کا شمار صحابہ کرام میں تھا حضرت عمرؓ کی طرف سے بحرین کے والی مقرر تھے آپ نے اپنے بھائی حکم کو ہندوستان روانہ کیا۔ حضرت حکمؓ نے صحابہؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت لیکر بذریعہ کشتی ہندوستان کا رخ کیا۔ آج کل کے سفر کی راحتوں اور آسائشوں کو دیکھ کر اس زمانہ کے سفر کے مصائب کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن تبلیغ حق اور خدمت خلق کا ایک جوش تھا جو ان قدسی صفت انسانوں کو بحر و بر کے قیود پھاندنے پر مجبور کر رہا تھا۔ غرض کہ متواتر کئی ماہ کی صبر آزما مصیبتوں کے بعد یہ برگزیدہ گروہ ساحل گجرات پر تھانہ میں لنگر انداز ہوا۔ اس وقت یہاں ایک بہادر اور تاجر قوم آباد تھی جس کا بادشاہ ہندو تھا۔ ان بزرگوں نے حسب دستور مناسب طریقے سے اسلامی تعلیمات کو پیش کیا۔ لیکن لوگوں نے ان پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اکابر اسلام نے دوسری شرط یعنی جزیہ کا مطالبہ کیا اور کہا کہ محصول ادا کرنے پر ہم تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری جانوں کے پاسبان ہیں۔ تمہارا دوست ہمارا دوست اور تمہارا دشمن ہمارا دشمن ہے۔ مگر لوگوں نے اس شرط کو بھی قبول نہ کیا۔ آخر مجبوراً انسان کو انسان کا مرتبہ عطا کرنے اور وحدہٗ لاشریک لہٗ کی حکومت کے قیام کے لئے ان کو جہاد کرنا پڑا۔ اس مقصد میں مسلمانوں کو بعید کامیابی ہوئی ایک زرخیز علاقہ ان کے ہاتھ آگیا اور اس سے بڑھکر بہت سے انسانی قلوب ان کے دائرہ حکومت میں داخل ہو گئے۔ یقیناً ہندوستان کے تمام صوبوں میں سے گجرات کو ہمیشہ اس شرف پر ناز رہے گا کہ اسے صحابہ کرامؓ نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے مفتخر کیا۔ اور اس پران انوار قدسیہ کی بارش کی۔ جو گناہ و معصیت کی تاریکیاں کو دھو کر روح کو پاک و صاف کرتے ہیں۔

اس معرکے میں صحابۂ کرامؓ میں سے بعض مقدس حضرات کو مرتبۂ شہادت بھی نصیب ہوا جن کو اسی سرزمین میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس لحاظ سے سرزمین گجرات کا مرتبہ اور بھی بلند ہو جاتا ہے کیونکہ یہ علاقہ ان قدسی صفت انسانوں کو اپنی گود میں لئے ہوئے ہے جن کو قدرت نے سب سے پہلے فلاح و ہدایت کے خزانوں سے مالامال کرنے کے لئے چن لیا تھا اور جنہوں نے وحی الٰہی کو سب سے پہلے اپنے کانوں سے سنا تھا اور خاتم الرسل و سید الانبیا کے جمال جہاں آرا سے اپنی آنکھوں کو منور کیا تھا۔ آج اگرچہ ان کی قبروں کا نشان مٹ چکا ہے لیکن

جو خدا کی راہ میں فنا ہو گئے ہیں۔ ان کا نام جریدۂ عالم پر دائمی طور پر ثبت ہو جاتا ہے اس لئے ظاہری یادگار چنداں اہمیت نہیں رکھتی۔

اس معرکے کے بعد اسی سال مسلمانوں نے بھروچ کا رخ کیا۔ جو اس زمانہ میں لاکھ اور نیل کی تجارت کی وجہ سے ہندوستان کی ایک پر رونق اور آباد بندرگاہ تھی۔ یہاں بھی فتح و نصرت نے مسلمانوں کے قدم چومے۔ حضرت حکمؓ اس معرکے کے بھی جرنیل تھے اور ساری کامیابیاں درحقیقت آپ ہی کے تقویٰ۔ خلوص۔ توکل اور تدبر کا نتیجہ تھیں۔

ان شہروں کو فتح کرنے کے بعد سب سے پہلا کام صحابہ کرامؓ نے یہ کیا کہ اہل ہند کو ہدایت و رشد کی طرف بلایا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ بڑے بڑے معاندین اور دشمن بھی ان حضرات کے برگزیدہ اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور آہستہ آہستہ کفر و شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایمان و اسلام کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ اس کے بعد ایک مدت تک مسلمان چند در چند مصالح کی بنا پر آگے نہ بڑھ سکے یہاں تک کہ ۹۳ھ میں محمد ابن قاسم نے سندھ کو فتح کر کے اور ۱۰۷ھ میں جنید بن عبدالرحمن مری نے مالوہ اور بھروچ پر قبضہ کر کے ہندوستان کے ایک وسیع رقبہ پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ جس سے باطل کے عشرت کدوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ اور شرک و کفر کے بتکدوں کی جگہ اللہ اکبر کی دلکش و دلنواز صدائیں گونجنے لگیں۔

۱۶۰ھ میں خلیفہ مہدی عباسی کے حکم سے عبدالملک ابن الشہاب نے ایک لشکر جرار کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس لشکر میں حضرت ربیع ابن صبیح تابعی بھی تھے۔ جو بقول بعض مستند مورخین کے اسلام کے سب سے پہلے مصنف ہیں جنہوں نے فن حدیث پر کتاب تصنیف فرمائی۔ گویا اس وقت کے مسلمان اگر اہل قلم تھے تو اہل سیف بھی تھے۔ اور اگر خلوت کدوں میں تسبیح و تہلیل، اور عبادت و ریاضت کے پاک مشاغل میں مصروف رہتے تو جلوت میں اعلائے کلمۃ الحق کے لئے وہ سب سے بڑے جانباز مجاہد اور پرجوش سپاہی بھی ثابت ہوتے تھے۔

ابن شہاب کی یہ فوج ۱۶۰ھ میں باربد پہنچی۔ جو گجرات کا ایک مشہور شہر تھا اور شاندار فتح و کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد تبلیغ کا سلسلہ کھل گیا اور بہت سی ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا۔

ابھی یہ مجاہدین اسلام آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ ہوا میں یکایک عفونت پیدا ہو گئی۔ جس سے ایک ہزار بزرگوں نے جام شہادت نوش فرمایا۔ ان میں اسلام کا سب سے پہلا مصنف بھی شامل تھا، اس طرح سرزمین گجرات کو ایک مرتبہ پھر یہ سعادت حاصل ہوئی کہ ربیع ابن صبیح جیسی برگزیدہ شخصیت اس کی گود میں ابدی نیند سو رہی ہے۔

غرضیکہ صحابہ کرام نے اسلام کی جو شمع سرزمین گجرات میں روشن کی تھی اس کی ضیا باریاں چند ہی صدیوں میں کشمیر، مالوہ اور بلوچستان کو منور کرنے لگیں۔ اور اگر غور سے دیکھئے تو آج دس کروڑ مسلمان جو ہندوستان میں دکھائی دے رہے ہیں وہ انہی مقدس ہستیوں کے جذبۂ ایثار و قربانی کا نتیجہ ہیں جنہوں نے محض خدا اور اس کے رسول کی خاطر اپنی راحت و آسائش کو چھوڑ کر مصائب و تکالیف برداشت کیں اور اعلاء کلمۃ اللہ کے اہم ترین فریضہ انسانی کو ادا کیا۔

رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ

حسن بے نقاب [illegible] گئے
[illegible] بھی دیکھتا رہا
آیا ہے جب [illegible] بھی دیکھتے حسن
وہ جس کو [illegible] نہ دیکھی سمجھا
[illegible]
(ریحانہ)

حسن [illegible] ترا ہے
نظروں پہ اثر ترا ہے
حسن نازک دل نازک پہ اثر ترا ہے
[illegible] طبیعت ہی کو [illegible] ترا ہے
[illegible]
ایک معمولی [illegible] دل میں [illegible] ترا ہے
دیکھ [illegible]
(روشن)

عہدِ اسلامی میں ہندوستان کی تاریخ نویسی

محمد صلاح الدین زبیری ایم اے

اسلامی فتوحات کا سیلاب عرب کے گرم ریگستانوں سے اُٹھ کر دنیا کے چپے چپے کو سیراب کرتا ہوا ایک طرف تو اندلس کے مرغزاروں میں جاکر تھما۔ اور دوسری جانب ہندوستان کو زیروزبر کرتا ہوا بنگال کے پرلے سرے پر جاکر رکا۔ ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ اگرچہ خلیفۂ ثانی فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ معدلت مہد میں شروع ہو چکا تھا۔ مگر یہ سلسلہ کسی خاص نظام کے ماتحت نہ تھا۔ اس کا اثر اسی لئے خاطر خواہ نہ ہوا۔ ہندوستان کی اصل کشورکشائی کا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب ملک الجبال سلطان علاء الدین غوری کے دست راست ملک شہاب الدین محمد غوری نے ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج راسا کو شکست فاش دیکر تخت دہلی پر اپنا تسلط جمایا۔

اسلامی فتوحات کے اثرات ہندوستان پر گوناگوں ہیں۔ انہوں نے ایک طرف تو ہندوستانی تمدن ومعاشرت اور تہذیب وشائستگی کا نقشہ یک قلم بدلا۔ اور دوسری طرف فنونِ لطیفہ کی کایا پلٹ دی۔ مگر جو شعبہ سب سے زیادہ ان کا رہین منت ہے وہ علم التاریخ ہے۔

اہل ہند کو نہ معلوم علم تاریخ سے کیوں اتنی نفرت تھی کہ انھوں نے اس فن کی طرف ذرا بھی توجہ مبذول نہ کی۔ چنانچہ ان کے تمام حالات اب تک پردۂ گمنامی میں نہاں ہیں۔ دورِ ہندویہ کے آغاز کی یادگار فقط دو کتابیں ہیں جن پر وہ اکثر ناز کیا کرتے ہیں۔ یہ رامائن اور مہابھارت ہیں۔ مگر ان دونوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں تاریخی مسالہ کی بجائے شاعرانہ محاسن اپنے پورے جمال وکمال کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اس لئے ان کو تاریخی کتب کہنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ ہاں اس دور کے آخر میں ان کے دل میں کچھ خیال پیدا ہوا۔ اور انھوں نے اپنی توجہ اس طرف مبذول کی۔ اس وقت کی بھی دو کتابیں بطور سند پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک راجہ ہریشچندر کی سوانحعمری ہے۔ جسے باباتا نامی ایک شاعر نے تصنیف کیا تھا اور دوسری چند بردے نامی شاعر کی تصنیف پرتھوی راج راسا کی سوانح حیات ہے۔ مگر ان کتب میں بھی تاریخ کی بجائے شاعرانہ پہلو زیادہ نمایاں ہے۔

مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو سب سے پہلے انھوں نے اپنی قوم کے مشہور فن "علم انساب" کو ملک میں جاری کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کی تاریخ پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں علامہ ابوریحان البیرونی کی کتاب "الہند" عتبی کی "تاریخ یمینی" اور ابوالفضل کی "تاریخ آل ناصریہ" خاص طور پر مشہور ہیں۔

یہ زمانہ فتوحات ملکی کا زمانہ تھا۔ اس لئے مسلمانوں کی زیادہ تر توجہ ملک کے نظم ونسق کی طرف مبذول رہی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو تمدن ومعاشرت کا اثر ان کے رگ وریشہ میں سرایت کرتا رہا اور یہی وجہ تھی کہ جب قاضی منہاج الدین سراج نے اپنی مشہور کتاب طبقات ناصری تصنیف کی تو اس کا زیادہ حصہ ہندو تمدن ومعاشرت کی تصویر تھا۔ اس کا مطالعہ کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں مہابھارت اور رامائن کی رنگینی کے ساتھ کہیں کہیں علامہ بیرونی کی واقعہ نگاری بھی آجاتی ہے۔

اسی دور میں امیر خسرو نے چند تاریخی مثنویاں لکھ کر تاریخ نویسی کے فرائض انجام دیئے۔

امیر خسرو کے بعد تاریخ نویسی کا یہ مذاق بگڑ گیا۔ اور اس کی حالت یہاں تک خراب ہو گئی کہ ڈیڑھ سو برس کی طویل مدت میں ضیاء برنی اور سراج عفیف مصنفانِ "تاریخ فیروز شاہی" کے سوا کوئی قابل ذکر مورخ پیدا نہیں ہوا۔

یہ دور ہندوستان کی تاریخ میں دورِ افغانیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس دور کے مصنفین کا عام انداز نہایت رنگین ہوتا تھا وہ واقعہ نگاری میں عام خوش اعتقادی کو اصول روایت ودرایت پر مقدم سمجھتے تھے۔ اور خرقِ عادت واقعات اور دور از قیاس روایات سے اپنی کتب کو سجاتے تھے۔ وہ ایک واقعہ دوسرے سے نقل کرتے تھے اور اسے نہایت پرزور اور رنگین عبارت میں فصاحت وبلاغت کی رنگت دے کر اپنی کتابوں میں درج کرتے تھے۔ اور جب تحقیق وتدقیق کا وقت آتا تو اسے صاف ٹال کر نکل جاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصلیت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور آخرکار وہ وقت آگیا کہ تعویذ

کے رخ سے اصلیت کے تمام نشانات مٹ گئے اور تاریخی واقعات محض افسانہ بن کر رہ گئے۔

ہندوستان کی تاریخ نویسی کا دوسرا دَور بابر میرزا سے شروع ہوتا ہے جس نے ۱۵۲۶ء میں خاندان تیموریہ کی بنیاد ہندوستان میں رکھی۔ بابر ترکی اور فارسی ہر دو زبانوں کا ایک زبردست شاعر تھا۔ اس نے اپنے واقعات زندگی کچھ اس دلکش پیرائے میں بیان کئے ہیں کہ پڑھنے والا دل تھام کر رہ جاتا ہے۔ تُوزک اس کا روزنامچہ ہے۔ جس میں اس نے وہ تمام واقعات جو اسے سفرِ زندگی میں پیش آئے درج کئے ہیں یہ کتاب دراصل ترکی زبان میں لکھی گئی تھی اور اسے صاحب السیف والقلم میرزا عبدالرحیم خانخاناں نے فارسی کا لباس پہنا کر اکبر اعظم کے حضور میں بطور نذر پیش کیا تھا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف بابر کے واقعات زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ اس وقت کے ہندوستان اور ترکستان کے تمدن کا پورا پورا نقشہ بھی نگاہوں میں پھر جاتا ہے یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ نویسی میں ایک ایسے باب کا افتتاح کرتی ہے جس کی مثال دنیا کی کسی اور زبان میں ملنی محال ہے۔

بابر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جوہر نامی غلام نے "تذکرۃ الواقعات" کے نام سے اپنے آقائے نامدار ہمایوں کے واقعات زندگی قلمبند کئے مگر ان میں اصلیت کی رنگت بہت کم ہے۔

ہمایونی عہد دراصل تغیر و انقلاب کی زندہ و متحرک تصویر تھا۔ اس لئے اس دور میں کوئی قابل ذکر مصنف پیدا نہیں ہوا۔ ہاں اکبر کے وقت میں شاہانہ فتوحات کے ساتھ ساتھ علمی فتوحات کا چرچا بھی ہونے لگا۔ علامہ ابوالفضل نے تاریخ نویسی کا ایک نیا معیار قائم کیا۔ مگر وہ اسی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ کیونکہ اس کی تقلید کے لئے اس جیسی قابلیت اور خداداد ذہانت کی ضرورت تھی جو عام مورخین میں سرے سے مفقود ہے۔

ابوالفضل کا انداز بیان نہایت پُرجوش اور طرز ادا نہایت پُرزور ہے۔ وہ واقعات کو کچھ اس آن بان سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والا مرعوب ہو کر رہ جاتا ہے۔ عبداللہ خاں ازبک اکثر کہا کرتا تھا کہ "میں اکبر اعظم کی تلوار سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا ابوالفضل کے قلم سے"۔

اسی دَور میں ملّا عبدالقادر بدایونی نے تاریخ نویسی کا ایک نیا سکول قائم کیا۔ جو دراصل واقعہ نگاری کے ساتھ حق و باطل پر نکتہ چینی تھی۔ مگر یہ انداز بھی ملک میں زیادہ متداول نہ ہو سکا۔ کیونکہ مشرقی طبیعتیں نکتہ چینی سے محض ناآشنا تھیں اور اسے ایک عجیب و غریب چیز خیال کرتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سکول بہت جلد مٹ گیا۔

جہانگیر نے بابر کی شاہراہ پر گامزن ہو کر اپنی تُوزک لکھی جو دراصل ہندوستان میں تاریخ نویسی کی آخری کتاب ہے کیونکہ اس کے بعد مصنفین نے اصلیت کو چھوڑ کر پھر رنگین بیانی کے مسلک کو اختیار کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخی وقار بتدریج کم ہوتا گیا اور پختگی و سادہ بیانی جو تاریخ کی روح رواں ہیں ایسی معدوم ہوئیں کہ متاخرین کی تاریخوں میں ان کا مطلقاً پتہ نہیں چلتا۔ یہاں تک کہ وقائع نعمت خاں عالی جیسی کتب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے لگیں۔

شاہجہان نامے متعدد ہیں۔ مگر ان کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بزم عیش کا گانا ہو رہا ہے۔ یا قصابخانہ کی زندہ و متحرک تصاویر ہمارے سامنے پھر رہی ہیں۔ صفحوں کے صفحے الٹ جایئے مگر لفظی مناسبات و بدائع کے سوا کوئی تاریخی مصالحہ ہاتھ نہ آئیگا۔ مصنفین اپنا تمام زور طبع واقعات کی عبارت آرائی میں صرف کرتے تھے اور معمولی سے معمولی واقعہ کو اہمیت دیکر اس قدر بڑھا دیتے تھے کہ وہ ایک چھوٹا سا ادبی رسالہ بن جاتا تھا۔

عہد عالمگیری میں خافی خاں واقعی ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے اس رنگ کو بدل کر تاریخی واقعات میں علت و معلول کا سلسلہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ مگر عبارت آرائی میں وہ ملا عبدالحمید اور محمد صالح وغیرہ سے کسی حالت میں بھی کم نہ تھا۔ عالمگیر خود ایک قادر الکلام منشی تھا چنانچہ اس کے رقعات آج تک ہمارے مدارس میں بطور نصاب پڑھائے جاتے ہیں۔ وہ واقعات سربستہ کے مخزن ہیں مگر ان کو سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ پڑھنے والا عہد عالمگیری کے تمام واقعات سے پورے طور پر باخبر ہو۔ ورنہ اسے کچھ لطف نہیں آئے گا۔

دورِ تیموریہ کی سب سے مشہور یادگار یہ ہے کہ اس میں سوانح عمری کا سنگ بنیاد رکھا گیا چنانچہ سب سے اول گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ تصنیف کیا اس کے بعد ملا عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی لکھ کر علم التواریخ پر احسان عظیم کیا۔ انھیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صمصام الدولہ میرزا شہنواز خاں نے مآثر الامرا نامی ایک زبردست کتاب تین جلدوں میں تصنیف کی جو اپنا جواب آپ ہی ہے۔

عہد اسلامی جس طرح شاعری اور دیگر فنون لطیفہ کی پرورش کیلئے مشہور ہے اسی طرح علم التاریخ کی نشوونما اور ترقی کے لحاظ سے بھی بےمثل و بے نظیر ہے۔

جزیہ کی تحقیق

اسلامی مالیات کا ایک اہم پہلو

از جناب مولوی محمد قمر الہدیٰ گیاوی

مسلمان بادشاہوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں کی غیر مسلم رعایا پر فوجی خدمات کے عوض ایک ٹیکس عاید کیا ہے جزیہ کہتے ہیں۔ بعض متعصب و حقیقت ناشناس مؤرخین نے مسلمانوں کے اس جائز اقدام کو ہمیشہ بڑی بدگمان نگاہوں سے دیکھا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ جزیہ صرف مسلمان حکمرانوں کی اپنی ایجاد ہے۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ٹیکس اس قدر گراں بار تھا کہ عام طور پر لوگ اسے ادا کرنے کی بجائے اسلام قبول کر لینا بہتر اور آسان سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک جزیہ جبری طور پر اسلام قبول کرانے کا ایک زبردست آلہ تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں تین باتوں کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ کہ لفظ "جزیہ" کس زبان سے تعلق رکھتا ہے اور کن معنی میں استعمال ہو گیا ہے؟ دوسری یہ کہ اس کا رواج عرب اور فارس میں کب ہوا۔ تیسری یہ کہ اس کے رواج دینے میں مسلمان بادشاہوں کا مقصد کیا تھا؟

لغوی تحقیق

لغت کی رُو سے "جزیہ" کا اطلاق خراج یا مالگزاری پر ہوتا ہے چنانچہ قاموس (جو عربی زبان کی نہایت مستند لغت ہے) میں جزیہ کے معنی یہ درج ہیں "الجزیۃ خراج الارض وما یؤخذ عن الذمی" یعنی جزیہ زمین کی مالگزاری ہے جو ذمی سے لی جاتی ہے" ذمی اس شخص کو کہتے ہیں جو جزیہ ادا کرے۔ مصنف یہ بھی بیان کرتا ہے کہ یہ لفظ غالباً "جزا" سے نکلا ہے جس کے معنی تلافی کے ہیں۔ یا یہ "گزیت" کا معرب ہے۔

اساس البلاغۃ (عربی کی معتبر ترین لغت) میں لکھا ہے "ومنہ (من الجزاء) جزیۃ اھل الذمۃ لانھا تقضی عنھم۔ یقال ادّوا جزیتھم وجزاھم واشتری من دہقان ارضا علی ان یکفیہ جزیتھا ای خراجھا" یعنی اس لفظ جزاء سے ذمی لوگوں کا جزیہ ہے کیونکہ یہ ان لوگوں سے وصول کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے (اہل عرب کا محاورہ ہے) "ادّوا جزیتھم وادّوا جزاھم" ان لوگوں کا ٹیکس یا بدلہ ادا کرو۔ اور عرب بولتے ہیں "اشتری من دہقان ارضا علی ان یکفیہ جزیتھا" (کسی دیہاتی سے زمین اس طرح خریدی کہ قیمت کی بجائے صرف خراج ادا کر دیا۔ بہر حال دونوں لغتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیہ مالگزاری یا مالیہ کو کہتے ہیں۔ اور اس میں محصول دہندہ کا مذہب مد نظر نہیں ہوتا۔

فارسی لغات کے مصنفین کی رائے ہے کہ لفظ جزیہ "گزیت" کا معرب ہے۔ جیسا کہ برہان قاطع (جو فارسی زبان کی ایک معتبر لغت ہے) میں لکھا ہے "گزیت زرے باشد کہ حکام ہر سال از رعایا گیرند آنرا خراج ہم گویند و زرے را نیز گویند کہ از ذمی ستانند" یعنی گزیت وہ رقم ہے جو حکام ہر سال رعایا سے وصول کرتے ہیں۔ اور اسے خراج بھی کہتے ہیں۔ اور اس کا شمار اس رقم میں بھی ہے جو ذمی سے لی جاتی ہے جیسا کہ نظامی گنجوی فرماتے ہیں ؎

گمش خاقان خراج چین فرستد ٭ گمش قیصر گزیت دین فرستد

فرہنگ جہانگیری کے مصنف کا بھی یہی خیال ہے کہ جزیہ گزیت کا معرب ہے۔ اور اس کے ثبوت میں وہ حکیم سنائی کا یہ شعر پیش کرتا ہے ؎

کتاب خویش بخواہم و در عمل نکنم ٭ کہ از گزیت ستانند ناخوانی کتب

ان حوالجات سے ظاہر ہے کہ "جزیہ" دراصل فارس کے ایک لفظ "گزیت" سے معرب کیا گیا ہے اور عربوں نے اسے دوسری قوموں سے منتقل کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ "جزیہ" سب سے پہلے کس نے اور کب عاید کیا؟

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رومن پہلی قوم تھی جس نے "جزیہ" کو اپنی سلطنت میں رواج دیا۔ لیکن رومی اسے "خراج" کہتے تھے۔ جسٹن کی کتاب میں اس ٹیکس کے متعلق مفصل ہدایات اور قواعد و ضوابط مندرج ہیں۔ جب رومیوں کی سلطنت ایشیائے کوچک تک پھیلی تو وہاں کے باشندوں کا رومیوں کے ساتھ قدرتی طور پر اختلاط ہوا۔ انہوں نے رومیوں کی تقلید میں یہ ٹیکس اپنے ملک میں رائج کیا۔ چنانچہ نوشیروان عادل فارس کا پہلا بادشاہ ہے جس نے اپنی رعایا پر جزیہ عاید کیا۔ یمن اور اس کے قرب و جوار کے علاقے اس کی سلطنت میں شامل تھے۔ اس نے ان اضلاع میں جزیہ کی وصولی کا ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا۔ اس طریقہ سے لفظ "گزیت" عرب میں قانونی شکل اختیار کر گیا۔ اور رفتہ رفتہ اسے معرب کر کے "جزیہ" بنا لیا گیا۔

علامہ ابن اثیر کا بیان

بہرکیف ایشیا میں نوشیرعادل ہی پہلا بادشاہ ہے جس نے اپنی سلطنت میں "جزیہ" کو رائج کیا۔ اور اس کے مفصل قواعد وضوابط مرتب کئے۔ علامہ ابن اثیر نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ نوشیروان عادل نے اپنی مملکت کی ساری زمین کی پیمایش کرائی۔ اُس کے درجے قائم کئے۔ اور پیداوار کے مطابق اُس کا لگان تجویز کیا۔ اس نے جنگی سپاہیوں اور امرائے دربار کے سوا تمام کاشتکاروں پر جزیہ عاید کیا۔ جزیہ کی شرح اوسطاً ۱۲ سے ۴ درہم تک تھی۔ اس ٹیکس کے عاید کرنے کا سبب مفصل طور پر اُن مراسلات سے معلوم ہوتا ہے جو نوشیروان نے اپنے حکام کو بھیجے اور جن کا خلاصہ یہ ہے:-

"سپاہی ہمارے ملک کے محافظ ہیں۔ وہ ملک کی خاطر اپنی عزیز ترین جان جوکھوں میں ڈالتے ہیں۔ لہذا عزم۔ باقی باشندوں کی آمدنی میں سے ایک قلیل رقم ملک کے جاںنثاروں کے لئے وقف رہنی چاہیئے۔"

ابن اثیر آخر میں بیان کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ خلیفۃ المسلمین نے بھی بجنسہٖ اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے اپنی سلطنت میں جزیہ کو رواج دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ حکمت عملی سے بھی کام لیا۔ انہوں نے اپنی رعایا کے بیس برس سے کم اور پچاس برس سے زیادہ عمر کے تمام لوگوں کو اس ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا۔ نیز اس ٹیکس کے ادا کرنے والوں کے امن و امان کی ساری ذمہ واری اپنے سر لے لی۔

علامہ ابن اثیر کے بیان سے معلوم ہوا کہ اس ٹیکس کا تعلق صرف ذمیوں اور مسلمانوں سے نہ تھا۔ بلکہ اسے رومیوں اور آتش پرستوں نے بھی اپنی مفتوح رعایا پر عاید کیا۔ ابن اثیر کے قول کی تائید فردوسی کی زبان سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ نوشیرواں کے تذکرہ میں فردوسی لکھتا ہے سہ

ہمہ بادشاہاں شدند انجمن ⁂ زمیں را بہ بخشید ایزد زمن
گزیتے نہادند بریک درم ⁂ گراید ول کہ دہقاں جوئے درم
گزیت زر بار و شش درم ---- الیٰ آخرہٖ

اس کا مطلب یہ ہے کہ حکام سلطنت ایک جگہ جمع ہوئے۔ انہوں نے زمین کی پیمایش کرائی اور پیداوار کے مطابق اُن کے درجے مقرر کئے۔ جزیہ کی اوسط رقم جو انہوں نے لوگوں پر لگائی ایک درہم فی کس تھی۔ سر انگور اور کھجور کے کھیت پر چھ درم کے حساب سے یہ رقم وصول کی جاتی تھی۔ یہ ٹیکس حاکم وقت کو ہر سال ادا کرنا پڑتا تھا۔ جس کے پاس زر ہوتا اور زمین نہ ہوتی وہ اس سے مستثنیٰ تھا۔

اس شہادت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جزیہ ایک ایسا ٹیکس تھا جو کاشتکاروں کی جماعت پر بلا امتیاز ذات و عقیدہ عاید کیا گیا تھا۔

اسلامی نظریہ

مسلمان بادشاہوں نے "جزیہ" کو بالکل جداگانہ مقصد کے پیش نظر مروّج کیا۔ انہوں نے یہ ٹیکس صرف اُن لوگوں پر عاید کیا جن کو اختلاف مذہب کے باعث فوجی خدمت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مسلمانوں کے لئے تو فوجی سرگرمیوں میں حصہ لینا مذہباً اور عقیدتاً ضروری تھا۔ لیکن غیر مذاہب والوں کو جبری طور پر فوج میں کیونکر بھرتی کیا جاسکتا تھا؟ لہذا فوجی خدمت کی بجائے اُن سے ایک معمولی سی رقم وصول کر لی جاتی تھی۔ جسے "جزیہ" کہتے ہیں۔ یہ ٹیکس نہ صرف فوجی خدمت کا بدل تھا۔ بلکہ محصول دہندوں کے مال و جان کی حفاظت کے مصارف بھی اسی وصولی سے پورے کئے جاتے تھے۔ تاہم جب کبھی غیر مسلم باشندے فوجی خدمت پر آمادہ ہوتے یا فوج میں داخل ہونے کا وعدہ کرتے تو اُن کو جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا جاتا تھا۔

بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین کی تحریروں سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ غیر مسلموں کو فوجی خدمت سے برأت کے عوض جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ نیز اس کے صلہ میں مسلمانوں کو اُن کی حفاظت امان کا ذمہ لینا پڑتا تھا۔ جب مسلم حکمران اس حفاظت کو انجام نہیں دے سکتے تھے تو انہیں جزیہ کی رقم واپس کرنا پڑتی تھی۔ چنانچہ عرب کے ایک ضلع "ایلا" کے غیر مسلم باشندوں کے متعلق بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان "یحفظوا و یمنعوا" کے الفاظ میں جاری ہوا تھا۔ یعنی ایلا کے باشندے ذمی جزیہ ادا کرنے والے ہیں اس لئے اُن کو ہر خطرہ سے محفوظ رکھو۔ اسی طرح خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بستر مرگ پر اپنے جانشین کو یہ ہدایت فرمائی۔

"ہماری غیر مسلم رعایا ہمارے اللہ اور رسولؐ کی حفاظت میں ہیں۔ یہ لوگ ہماری ہمدردی کے مستحق ہیں۔ ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ اُن کی حفاظت کریں اور جب کبھی وہ خطرے میں ہوں تو اُن کی خاطر میدان جنگ میں بھی کود پڑیں۔"

علامہ طبری نے اپنی تاریخ میں حضرت خالد بن ولید کے دو

فرمان درج کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں :-

"عراقی فوج کے سپہ سالار خالد بن ولید کی جانب سے سلوبا بن نسطونا

تین کے یہودی سردار کے نام! ہم مسلمان تم سے اس شرط پر صلح کرتے ہیں کہ تم ہمیں جزیہ ادا کرو۔ اس کے صلہ میں ہم تمہاری جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔ اور جب تک ہم لوگ تمہاری حفاظت کریں گے جزیہ کے مستحق ہوں گے۔ ورنہ تمہیں جزیہ دینے کی ضرورت نہ ہوگی۔"

دوسرا فرمان حضرت خالد بن ولید عراقی فوج کے سپہ سالار کی جانب سے عراق و عرب کے غیر مسلموں کی طرف جاری کیا گیا جس کے الفاظ یہ ہیں :-

"تم نے جزیہ ادا کیا ہے۔ اس کے صلہ میں ہم لوگ تمہارے حفظ و امان کا ذمہ لیتے ہیں۔ ہم ہر حالت میں تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہارے دوست ہمارے دوست اور تمہارے دشمن ہمارے دشمن ہیں۔ جب تک تم جزیہ ادا کرتے رہو گے تمہیں کسی خطرے کا خوف نہ ہونا چاہئے۔ ہماری تلواریں تمہیں ہر خطرہ سے بچائیں گی۔"

جزیہ کی واپسی

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح کو شام کا حاکم متعین کیا گیا۔ انہوں نے غیر مسلم باشندوں پر جزیہ مقرر کیا لیکن ہرکولیس (رومی بادشاہ) نے ایک بہت بڑی فوج ان پر حملہ آور ہونے کے لئے بھیجی۔ ابو عبیدہ کو بھی اس خوں ریز جنگ کے لئے تمام فوج ایک محاذ پر جمع کرنا پڑی۔ اسی وقت انہوں نے شام کے مفتوحہ علاقوں کے افسروں کو جو مراسلہ بھیجا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب مسلمان محسوس کرتے تھے کہ اب وہ غیر مسلم باشندوں کی حفاظت کے قابل نہیں رہے تو وہ جزیہ واپس کر دیا کرتے تھے۔

مراسلے کا مضمون حسب ذیل ہے :-

"تم لوگ ان غیر مسلموں کا جنہوں نے اس سال کا جزیہ ادا کر دیا ہے ایک جلسہ طلب کرو اور جتنی رقم جزیہ کے طور پر ملی تھی سب کی سب انہیں واپس کر دو۔ اور ان سے صاف صاف کہہ دو کہ ہم لوگوں نے تم سے جزیہ اس شرط پر لیا تھا۔ کہ ہم تمہارے دشمنوں سے جنگ کریں گے لیکن موجودہ صورت حال میں ہم ایسا کرنے سے معذور ہیں کیونکہ اس وقت ہم رومیوں سے نبرد آزما ہیں۔"

علامہ بلاذری کا بیان ہے کہ افسروں نے اس حکم کی تعمیل میں لاکھوں روپے جو مہینوں میں وصول ہوئے تھے چند گھنٹوں میں غیر مسلموں کو واپس کر دیئے۔ جس سے خوش ہو کر انہوں نے سپہ سالار ابو عبیدہ بن جراح کو ایک تحریر بھیجی جس کا مضمون یہ ہے :-

"ہم لوگوں کو اس جزیہ کی رقم واپس مل گئی۔ جو ہم نے اپنی حفاظت کے صلہ میں ادا کی تھی۔ ہماری زندگی کا یہ پہلا تجربہ ہے کہ جو رقم ہم نے ٹیکس کی صورت میں ادا کی۔ وہ ہمیں واپس مل گئی۔ ہم رومیوں کے مقابلہ میں آپ کی فتح و نصرت کے لئے دعا کرتے ہیں ہمارے لئے وہ دن خوش بختی کا موجب ہوگا جب ہم آپ کے استقبال کے لئے اپنے شہر کا دروازہ کھولیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس جیسے نازک موقع پر اگر رومی ہوتے تو وہ ہمارا سب کچھ لوٹ کر لے جاتے جزیہ کی واپسی تو اب علیحدہ چیز ہے۔"

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں مین کے ایک ضلع جرجمہ کے نصرانی باشندے جو فوجی ملازمت میں شامل ہو گئے انہیں جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ اور صدیوں عربی سلطنت کے زوال تک وہ اس ٹیکس سے بری رہے۔

جزیہ کی شرح

امام ابو یوسف کی کتاب "الخراج" میں ان ٹیکسوں کی ایک مکمل فہرست مندرج ہے جو مسلمانوں نے عاید کئے۔ یہ ٹیکس دو طرح کے تھے ایک وہ جو مسلمانوں سے مخصوص تھے۔ اور دوسرے وہ جو غیر مسلموں پر لگائے گئے تھے۔ اوّل الذکر یہ تھے (۱) زمین کی مالگزاری (الف) پیداوار کا ۱/۱۰ حصہ اس زمین پر جو قدرتی ذرائع سے سیراب ہوتی تھی۔ (ب) پیداوار کا ۱/۲۰ حصہ اس زمین پر جو مصنوعی ذرائع سے سیراب ہوتی تھی (۲) نقد مال پر ڈھائی فیصدی زکوٰۃ (۳) مویشی پر ڈھائی فیصدی زکوٰۃ (۴) معدنیات دفینہ پر ۲۰ فیصدی بحساب قیمت (۵) صدقہ فطر ۲ ۱/۲ سیر گندم فی کس جو مرد، عورت، لڑکے، لڑکی اور غلام سب سے لیا جاتا تھا (۶) فوجی ٹیکس جس کی رقم مقرر نہ تھی (۷) چندہ یہ لازمی نہ تھا مگر غرباء و مساکین کی امداد کے لئے لاولد لوگوں سے ضرور دلایا جاتا تھا۔ ان سات ٹیکسوں کے باوجود انہیں فوجی خدمت ادا کرنا پڑتی تھی۔

دوسری طرف غیر مسلموں پر حسب ذیل ٹیکس تھے (۱) زمین کی مالگزاری جو اسی شرح سے ادا کرنا پڑتی تھی۔ جو مسلمانوں کے لئے مقرر تھی (۲) جزیہ جو چھ روپے سے تین روپیہ فی کس مقرر تھا۔ اس کی زیادہ سے زیادہ شرح بارہ روپیہ سالانہ تھی جس کے مطابق لکھ پتی لوگوں سے جزیہ

وصول کیا جاتا تھا۔ عام طور پر جزیہ کا ٹیکس صرف اُن مردوں کو دینا پڑتا تھا جو جنگی صلاحیت کے باوجود مسلمانوں کی فوج میں بھرتی ہونے کے خواہشمند نہ تھے۔ بیس برس سے کم اور پچاس برس سے زائد عمر والے مرد، تمام عورتیں، مجبوط الحواس، معذور، نابینا اور مفلس (جن کی آمدنی دو سو درہم سے کم تھی) اس ٹیکس سے بالکل بری تھے۔

اس کے مقابلہ میں جزیہ کی رقم مندرجہ ذیل مدات پر صرف ہوتی تھی :۔ (۱) فوجی مصارف (۲) ملکی حفاظت (۳) قلعوں کی تعمیر (۴) سڑک اور پلوں کی تعمیر (۵) تعلیم۔

جو ٹیکس صرف مسلمانوں پر عاید ہوتے تھے اُن کا مصرف جدا گانہ تھا۔ پس ماندہ رقم بیت المال یا خزانہ عامرہ میں جمع کر دی جاتی تھی۔ مگر ہر شخص بلا تفریق ذات یا فرقہ اپنی اہم ضرورتوں کے لئے بیت المال سے روپیہ طلب کرنے کا حق دار تھا۔ غیر مسلم لوگ بھی مسلمان حکمرانوں کے عہد میں اس حق سے ہمیشہ فایدہ اُٹھاتے رہے ہیں۔ الغرض ٹیکسوں کا بار زیادہ تر مسلمانوں پر تھا۔ اس کے علاوہ انہیں لازمی طور پر جنگ و جدال کی صعوبتوں میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ اس کے بالمقابل کم ٹیکس ادا کرنے پر غیر مسلم نہ صرف جنگی خدمت سے آزاد تھے۔ بلکہ وہ ضرورت کے وقت بیت المال سے بھی بلا تامل مستفیض ہوتے تھے۔

بقول علامہ طبری بہت سے مسلمان اُن غیر مسلموں کی خوش قسمتی پر رشک کرتے تھے جو محض جزیہ کی ادائیگی کے بعد ہر طرح مطمئن اور آزاد زندگی بسر کرتے تھے۔

ہندوستان میں جزیہ کا رواج

ہندوستان میں سب سے محمد بن قاسم نے جزیہ رائج کیا۔ ذمیوں کی برباد شدہ اور مسروقہ جائداد کو اس نے بیت المال یا خزانۂ عام سے پورا کیا۔ اس کے بعد غزنوی حکمرانوں سے لیکر پٹھان حکمرانوں تک سب کے سب نہایت مستعدی سے اسی اصول پر عمل پیرا رہے۔ یہاں تک کہ مغلوں کی سلطنت قائم ہوئی۔ بقول فرشتہ ذمی لوگ اپنے مال مسروقہ کی تلافی کے لئے اصل سے کئی گنا زیادہ سرکاری خزانہ سے طلب کرنے لگے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ جو کچھ یہ لوگ جزیہ کی صورت میں ادا کرتے تھے۔ اس سے کہیں زیادہ وہ حکومت ہی سے وصول کر لیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو ناقابل برداشت نقصان اٹھانا پڑا۔

اکبر اعظم کے عہد حکومت میں راجپوتوں کی ایک بڑی جماعت مغلیہ فوج میں شامل ہو گئی۔ اس لئے ان سب کو جزیہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ اس سے حکومت کی آمدنی پر اثر پڑا۔ جزیہ کی وصولی کم تھی اور اخراجات بدستور تھے۔ ابو الفضل بیان کرتا ہے کہ اکبر اعظم کے اوائل عہد حکومت میں جزیہ کی آمدنی ۳۱ لاکھ روپے تھی اور اخراجات ۳۹ لاکھ۔ راجپوتوں کے فوج میں شامل ہونے کے بعد یہ آمدنی صرف ۲۵ لاکھ رہ گئی۔ گویا اب بادشاہ کو ایک دم ۶ لاکھ روپے کا خسارہ اُٹھانا پڑا۔ تاہم اپنی حکومت کے اکیسویں برس کے بعد اکبر نے بعض مصالح کی بنا پر جزیہ بالکل اڑا دیا۔ اور اس کی تلافی بعض دوسرے ذرائع سے کی۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں جزیہ دوبارہ عاید کیا گیا۔ عام طور پر لوگ اسے مغلیہ سلطنت کے زوال کا سبب قرار دیتے ہیں حالانکہ اسے دوبارہ رائج کرنے کی حقیقی وجہ اُس خط سے معلوم ہوتی ہے جو اورنگ زیب نے اپنے بڑے لڑکے شاہزادہ معظم کو لکھا تھا اور وہ یہ ہے :۔

"فرزند دلبند! تم جانتے ہو کہ جزیہ کا رواج اس ملک میں قدیم زمانہ سے قائم تھا ہمارے پر دادا اعلیٰ حضرت اکبر اعظم نے کسی مالی وجہ یا اپنی ذاتی خواہش کی بنا پر یا اسلامی اصول کی جانب سے بے پروائی برت کر اسے منسوخ کر دیا تھا۔ ان کے بعد ہم لوگوں کے دادا حضرت جہانگیر نے بھی اس کی طرف توجہ نہ کی۔ کیونکہ ان کا طرز عمل "کھاؤ پیو اور موج کرو" کے اصول کے مطابق تھا۔ پھر ہمارے والد ماجد اعلیٰ حضرت شاہجہاں نے اسے دوبارہ عاید کرنے کے بارے میں اپنے وزیر اعظم سعد اللہ خاں سے مشورہ لیا۔ مگر چونکہ وہ شاندار عمارتوں کی تعمیر میں ہمہ تن مشغول تھے اس لئے یہ مسئلہ معرض التوا میں رہا۔ اب چونکہ ہم لوگ تخت پر مکمل قبضہ اور اقتدار حاصل کر چکے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ہم جزیہ کو دوبارہ مروج کریں اس کا سنجیدگی سے غور طلب ہے کہ چونکہ مغلیہ فوج میں راجپوتوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اس لئے جزیہ کی رقم بھی یقیناً کم ہو گی۔ لیکن اسکے مقابلہ میں اخراجات کی تعداد بدستور قائم ہے لہذا فوجی مصارف کیلئے ہمیں جزیہ عاید کرنا چاہیئے۔ مگر ہم گویا قرآنی حکم کے مطابق انصاف سے کام لیں گے۔ جو اس بات کی خاص طور پر تاکید کرتا ہے کہ نہ تو رعایا کو سرکاری مطالبہ سے کم ادا کرنا چاہیئے اور نہ حاکم کو مقررہ رقم سے زاید لینا چاہیئے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارے مورث غیر منصفانہ طریقوں سے روپیہ وصول

کرنے کے ملزم ہیں یعنی وہ غیر مسلموں کے میلوں اور تیوہاروں کے
موقع پر تحفے و ہدیئے کرتے تھے ۔ اور درشن کے وقت نذر اور
جواب دیتے تھے ۔ لیکن ہم اس قسم کے طریقہ پر بالکل بند کر دیتے ہیں
اور ان کی جگہ جزیہ عاید کرتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ ہماری غیر مسلم
رعایا اس ٹیکس کے رواج دینے میں بخوشی ہمارا ساتھ دیے گی ۔
ان لفظوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عالمگیر نے
جزیہ کو اپنی غیر مسلم رعایا کی توہین کے لئے ہرگز عاید نہیں کیا تھا
بلکہ حقیقت کچھ اور تھی ۔

میخانے میں آ

آب زمزم سے وضو کر لے تو میخانے میں آ

از حضرت خلیل بیکو سرائی

آ مئے رازِ حقیقت دل کے پیمانے میں آ
تیرا میخانہ ہے ویراں اپنے میخانے میں آ

کیا سمجھ کر تو الجھ بیٹھی دلِ صد چاک سے
اے کمندِ خم بخم کچھ سوچ کر شانے میں آ

مے بھی تو شیشہ بھی تو میکش بھی تو ساقی بھی تو
ساتھ لے لیکر جہانِ کیف میخانے میں آ

پھر زبانِ خلق پر ہو قصۂ دار و رسن
آ نئے عنوان سے پھر میرے افسانے میں آ

تو کہیں رسوا نہ ہو جا تنگنائے ظرف میں
آ مگر خم سے بقدرِ ظرف پیمانے میں آ

تیرے شیدائی ہیں دونوں محتسب بھی رند بھی
خواہ جا ظرفِ وضو میں خواہ پیمانے میں آ

محتسب قیدِ طہارت مشربِ رندی میں ہے
آبِ زمزم سے وضو کر لے تو میخانے میں آ

کیف سے لبریز ہو جائے جہانِ رنگ و بو
جام میں پھولوں کے آ کلیوں کے پیمانے میں آ

کیوں رہے پابندِ خم جلوہ ترا اے خم نشیں
جام سے شیشے میں شیشے سے پیمانے میں آ

تیری لغزش ہو نہ مصداق تنک ظرفی خلیل
سیکھ لے آدابِ میخانہ تو میخانے میں آ


خون معدہ اور جگر صاف رہتے ہیں تو عمر بڑھتی ہے!
آج کل ہر زبان پر صافی کا لفظ ہے۔
میں جانتا ہوں کہ چیچک، خسرہ، نکسیر، حلق میں ورم، کن پیڑے، کھجلی
پھوڑے، پھنسیاں، داغ دھبے دور کرنے اور ان کو دفع کرنے اور خون صاف ستھرا رکھنے
خون، معدہ اور جگر سے آسانی سے زہر نکال دینے کے لیے سائنس کے
پاس صافی سے بہتر کوئی دوا نہیں ہے۔
قیمت فی شیشی (۱۰ خوراک) صرف دس آنے۔ آج ہی منگائیے
رسالہ ہمدرد صحت اور ہمدرد اطفال دواخانہ سے مفت طلب فرمائیے۔
ہمدرد دواخانہ لال کنواں دہلی

اورنگ زیب کی جنگ تخت نشینی

مغلیہ دور کی ایک خونچکاں داستان

از جناب مولوی نور احمد صاحب فریدی منشی فاضل

جس اندیشہ کے پیش نظر ملکہ نے شہنشاہ کو دوسری شادی سے روکا۔ اور جس خطرہ سے بچنے کیلئے بادشاہ نے اپنی زندگی تیاگ دی وہ ہو کے رہا۔ غریب بوڑھے اور مریض باپ نے ہزاروں کوششیں کیں۔ کہ کسی طرح بچوں میں آتش حرب شعلہ زن نہ ہو۔ اور بھائی ایک دوسرے کے خون سے ہولی نہ کھیلیں۔ لیکن سب تدبیریں ناکام رہیں۔ اور بوڑھے بادشاہ کی آنکھوں نے وہ دیکھا۔ جو دیکھنا نہ چاہتا تھا۔ اور اس کے کانوں نے وہ کچھ سنا جس کے سننے کیلئے وہ کسی وقت میں تیار نہ تھا سچ ہے

تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ

یہ ایک خونچکاں داستان ہے جو زمانہ حال کے مؤرخین کی ستم ظریفیوں کا شکار بنی ہوئی ہے قلت گنجائش کے پیش نظر بحث و تحقیص سے عمداً اغماض کر کے صرف اُن کتابوں کے اقتباسات پر قناعت کی جاتی ہے۔ جو فن تاریخ میں کافی اعتماد رکھتی ہیں۔ اس میں ہماری یہ کوشش رہی ہے۔ کہ حتی الامکان مؤرخین کے بیانات ہی کو من و عن پیش کیا جائے کیونکہ ایک فرسودہ کہانی کی صحت کے لئے اس سے اچھا طریقہ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اور چونکہ فارسی زبان سے ذوق رکھنے والے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ اس لئے فارسی مصنفین کے اصل مفہوم کو رتی برابر نقصان پہنچائے بغیر اور مترادف الفاظ اور ہم مفہوم مکرر جملوں کو مختصر کر کے پیش کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں اردو تراجم میں بھی ادبی ضرورت کے پیش نظر خفیف سا تصرف کیا گیا ہے۔ امید ہے۔ کہ ادب نواز حضرات اسے استحسان کی نظر سے دیکھیں گے۔ (ن۔ ا۔ خ)

ملکہ ممتاز محل کی آخری وصیت

شاہجہاں برہانپور ملک دکن میں خان جہاں لودھی کی سرکوبی کی غرض سے خیمہ زن تھا۔ کہ ۱۷ ذیقعدہ کو دفعتہً ممتاز محل علیل ہو گئی۔ آدھی رات کے قریب لڑکی پیدا ہوئی۔ لیکن اس کی تکلیفیں برابر بڑھتی گئیں۔ غشی پر غشی آنے لگا۔ اور جب زندگی کی آس نہ رہی تو شہزادی جہاں آرا کو جو اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اشارا کیا۔ کہ زنانہ گھڑی سے بادشاہ کو بلا لائے۔ اُس وقت تین گھڑی رات باقی تھی۔ بادشاہ گھبرا کر فوراً آئے اور سرہانے بیٹھ گئے۔ ممتاز محل نے اپنی آنسو بھری آنکھیں کھول کر نظر یاس سے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ اور کہا کہ میرے بعد میری اولاد سے غافل نہ ہونا۔ اور میرے بیکس والدین کی بھی خبر گیری کرتے رہنا۔ پھر دوبارہ گہری نگاہ سے اپنے عمر بھر کے رفیق (شاہجہاں) کو دیکھ کر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

ممتاز محل کے آٹھ لڑکے چھ لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں۔ مگر وفات کے وقت صرف چھ بچے زندہ تھے۔
(۱) جہاں آرا بیگم (۲) محمد دارا شکوہ (۳) محمد شاہ شجاع
(۴) روشن آرا بیگم (۵) محمد اورنگ زیب (۶) محمد مراد بخش۔

شاہ جہاں بادشاہ نے ملکہ کے مزار پر ایسا حسین و جمیل مقبرہ تعمیر کرایا۔ جو آج دنیا میں بلحاظ خوبصورتی کے بے نظیر و بے مثل خیال کیا جاتا ہے۔

ملکہ کا والد بھی مدت العمر بادشاہ کا وزیر اعظم رہا۔ اور بادشاہ نے ان کے خاندان پر بیش از بیش عنایات کیں۔ رہا اولاد کا معاملہ تو اس کی تفصیل نہایت دردناک ہے۔ اگرچہ اس مظلوم بادشاہ نے ان کی حفاظت میں ہر ممکن کوشش صرف کی۔ مگر تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔ بادشاہ کے چار فرزند تھے۔ ان چاروں اپنی حفاظت اسی میں سمجھتے تھے۔ کہ باقی تینوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں۔ ان کی قابلیت اور لیاقت کے متعلق جو بادشاہ کی

رائے تھی۔ وہ حسب ذیل ہے :۔

۱۔ مہین پور خلافت (یعنی دارا شکوہ) اگرچہ اسباب شان و شوکت وسامان تجمل و صولت ہمہ دارد لیکن معدے نیکوان و دوست بدان واقع شد۔

۲۔ شجاع غیر از سیر چشمی وصفے ندارد۔

۳۔ مُراد بخش مجہول الکیفیت باکل و شرب اختہ دہم المحراست۔

۴۔ مگر اورنگ زیب ذی عزم و تال اندیشہ بنظر می آید لغلب کہ تحمل امر خطیر ریاست تواند شد۔

باوجودیکہ بوڑھا بادشاہ جانتا تھا۔ کہ ملکداری وجہانبانی کے لائق صرف اورنگ زیب ہے۔ اسے دارا سے بے پناہ محبت تھی۔ اور بڑا فرزند بھی وہی تھا۔ اس لئے تاج و تخت کا اُمیدوار اُسے بنا رکھا تھا۔ چونکہ تیموری سلاطین کی وفات پر ہمیشہ اولاد میں نزاع جانشینی کی بنا پر خونریزی ہوتی رہتی تھی۔ اور یہی اندیشہ اب بھی تھا۔ اس لئے حضرت شاہجہاں بادشاہ کی انتہائی آرزو یہی تھی۔ کہ

(برنی ار)

ان خود سر شہزادوں پر قابو پا کر گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دے، جہاں قدیم ہی خاندان کے سلاطین کو محبوس کیا جاتا تھا۔ تاکہ ان کی آپس میں خونریزی نہ ہو۔ لیکن یہ اس قدر طاقت و قوت اختیار کر چکے تھے۔ کہ ان کا قابو میں لانا مشکل امر ہو گیا تھا۔ اس لئے ان کے شر سے بچنے اور ان کی باہمی خونریزی کے سدباب کے لئے انہیں الگ الگ دور دراز مقامات پر بھیج دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ شجاع، بنگالہ۔ اورنگ زیب دکن۔ مراد بخش گجرات اور دارا شکوہ کو ملتان اور کابل کی صوبیداری پر نامزد کر کے رُخصت کیا۔ بادشاہ اس وقت کابل میں تھا۔ کابل سے چل کر جب شجاع اور اورنگ زیب آگرہ میں پہنچے۔ تو دارا شکوہ کے شر سے بچنے کے لئے آپس میں بڑے بڑے مستحکم عہد و پیمان کئے۔ اور کہا کہ اگر ہم آپس میں متفق رہیں۔ تو دارا شکوہ کے شر سے جو ہمارے خون کا پیاسا ہے، بچے رہیں گے۔ اور اس معاہدہ کے مزید استحکام کی غرض سے اورنگ زیب نے اپنی لڑکی شجاع کے فرزند سلطان زین العابدین سے منسوب کی۔ اور شجاع نے اپنی لڑکی کا رشتہ اورنگ زیب کے بڑے بیٹے محمد سلطان سے کیا۔[۵]

دارا شکوہ کی خودسری

شہزادوں نے اپنے اپنے صوبوں میں جا کر سُنا کہ دارا شکوہ پایۂ تخت میں موجود ہے۔ اور بادشاہ نے اُسے شاہ بلند اقبال کا خطاب عطا کر کے ولیعہد سلطنت مقرر کیا ہے۔ نیز دو کروڑ ساٹھ لاکھ پچاس ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر بھی مرحمت کی ہے۔ تو اس سے اور زیادہ متوہم ہوئے۔

(برنی ار)

دارا چونکہ تخت نشینی کا متوقع تھا اس لئے اس نے آگرہ کو نہ چھوڑا اور بادشاہ نے بھی اس کو احکام شاہی کے اجرا کی اجازت دیدی۔ نیز یہ اجازت بھی عطا کر دی۔ کہ ایک چھوٹے سے تخت پر جو تخت شاہی سے نیچے ہو۔ شہنشاہ کی موجودگی میں سر دربار جلوس کرے۔ چنانچہ اس سے ایک ہی وقت میں دو مساوی الاختیار فرمانروا دربار میں جلوہ گر نظر آنے لگے۔ ان باتوں سے اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ خود بادشاہ ہی دارا شکوہ کی اُمیدوں کی تائید کرتا تھا۔ لیکن اس بات کے باور کرنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ اگرچہ دارا شکوہ باپ کے ساتھ ادب و محبت کے طریقوں سے پیش آتا تھا۔ مگر شہنشاہ ریاکاری اور دورنگی تاڑتا تھا۔

اس کہن سال بادشاہ کو برابر یہ دھڑکا لگا رہتا تھا۔ کہ کہیں مجھ کو زہر نہ دیدیا جائے۔ اور ظنّ غالب یہ ہے۔ کہ بادشاہ کی پوشیدہ خط و کتابت اورنگ زیب سے جاری رہتی تھی جس کی نسبت اُسے ہمیشہ اعتماد تھا۔ کہ سلطنت اور ملکداری کے لئے یہ لڑکا بہت لائق و فائق ہے۔

(خلاصۃ التواریخ از سبحان رائے بٹالوی)

تینوں شہزادے اپنے اپنے صُوبوں کا انتظام باپ کے حکم کے موافق انجام دے رہے تھے۔ کہ اتفاقاً ۱۰۶۶ھ میں شاہجہاں بادشاہ دہلی میں بیمار ہوا۔ اور عرصہ دراز تک صاحب فراش رہا۔ اس عرصہ میں دارا شکوہ نے سلطنت کے تمام کاموں کو مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لے کر دہلی کی خبروں کو باہر صُوبوں میں جانے سے روک دیا۔ تمام راستوں اور دریاؤں کے گھاٹوں پر پہرے آدمی متعین کر دیئے۔ کہ کسی کو بلا پروانگی نہ جانے دیں۔ اور دہلی کی کوئی خبر اطراف مُلک میں نہ پہنچنے پائے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جابجا مُلک میں ڈاکہ زنی شروع ہو گئی۔ آمد و رفت کے مسدود ہونے سے تجارت بھی مسدود ہو گئی۔ مُلک میں صُوبیداروں اور عمال سلطنت کا اثر و اقتدار کمزور پڑ گیا۔ زمینداروں نے سرکاری مالگذاری ادا کرنے میں غفلت اختیار کی۔ تینوں شہزادوں کے وکلا کو بھی جو دربار میں موجود رہتے تھے۔ دارا شکوہ نے قید کر دیا تھا۔ لہذا وہ کسی ذریعہ سے

[۵] عاقل خان۔ برنی ار

کوئی پیغام ان شہزادوں تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔

مراد بخش نے گجرات میں ناشدنی افواہیں سنیں۔ اور بلا تامل مراسم تخت نشینی ادا کر کے اپنی بادشاہی کا اعلان اور اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کر دیا۔ اور رعایا پر طرح طرح کے مظالم شروع کئے۔ میر علی تقی کو جو اس کی سرکار کا دیوان اور اس بغاوت و سرکشی و مظالم سے اُسے باز رکھنا چاہتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا اور امراء و شرفائے گجرات کو حد سے زیادہ تنگ کیا۔ دوسری طرف محمد شجاع نے بھی بنگالہ میں یہی طریقہ اختیار کیا۔ اور بنگالہ سے لشکر لے کر بہار و پٹنہ پر فوج کشی کر کے بنارس تک بڑھ آیا۔ دارا شکوہ نے ان دونوں بھائیوں کی بغاوت کا حال سن کر بادشاہ کو مجبور کیا۔ کہ وہ اسی سخت بیماری و کمزوری کی حالت میں دہلی سے آگرے چلے۔ چنانچہ بتاریخ ۲۰ محرم ۱۰۶۸ھ بادشاہ کو کشتی میں ڈال کر دارا شکوہ براہ جمنا دہلی سے آگرہ کی طرف چلا۔ اور ۱۰ صفر ۱۰۶۸ھ کو معہ بوڑھے باپ کے آگرے پہنچا۔ کسی کو شہنشاہ کے زندہ بچنے کی توقع نہ تھی مگر وہ زندہ آگرہ پہنچ گیا۔

آگرہ پہنچتے ہی دارا شکوہ نے راجہ جے سنگھ کچھواہہ کو کہ بڑے راجاؤں میں سے تھا چند دوسرے امراء اور اپنے بہادر بیٹے سلیمان شکوہ کے ہمراہ عظیم الشان فوج اور زبردست توپخانہ کے ساتھ ۴ ربیع الاول ۱۰۶۸ھ کو محمد شجاع کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ اس فوج نے بنارس کے قریب پہنچ کر محمد شجاع سے سخت مقابلہ کیا۔ جس میں وہ شکست کھا کر بنگالہ کی طرف بھاگ گیا۔ اور صوبہ بہار پر راجہ جے سنگھ کی اتالیقی میں سلیمان شکوہ کی حکومت قائم ہو گئی۔ محمد شجاع کی فوج کے جو سردار و سپہ سالار و امراء اسیر ہوئے تھے۔ ان کو دارا شکوہ نے آگرہ میں اپنے پاس طلب کر کے شہر میں تشہیر کرایا۔ اور انواع و اقسام کی ذلتیں پہنچا کر ان سب کے ہاتھ قلم کرا دیئے۔ اس اذیت سے بہت سے مر گئے۔ اور بعض نیم مردہ حالت میں باقی رہے۔

۲۲ ربیع الاول ۱۰۶۸ھ کو دارا شکوہ نے راجہ جسونت سنگھ کو مہاراجہ کا خطاب دیا۔ اور کئی دوسرے راجاؤں، کثیر التعداد فوج اور زبردست توپخانہ کے ساتھ مالوہ کی جانب روانہ کیا۔ اور حکم دیا کہ دریائے نربدا کے تمام گھاٹوں پر اور اس نواح کے تمام قلعوں پر قبضہ رکھو۔ اور دکن سے کسی کو اس طرف نہ آنے دو۔ قاسم خاں داروغہ توپخانہ شاہی کو بھی ایک بڑا لشکر دے کر حکم دیا۔ کہ مالوہ تک مہاراجہ جسونت سنگھ کے ساتھ جاؤ۔ اور وہاں جا کر اگر مناسب سمجھو۔ تو مراد بخش کو گجرات سے بے دخل کرنے کے لئے بسمت گجرات پیش قدمی کرو۔ ورنہ مہاراجہ جسونت سنگھ کے ساتھ بطور کمکی رہو۔ القصہ مہاراجہ و قاسم خاں معہ افواج قاہرہ منزلیں طے کرتے ہوئے مالوہ پہنچے۔ دارا شکوہ اگرچہ سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا تھا۔ لیکن وہ شہزادہ محمد اورنگ زیب کی طرف سے ہمیشہ خائف رہتا تھا۔ اس نے پہلے ہی سے یہ تدبیر کی تھی۔ کہ دکن میں اورنگ زیب کے ہمراہ جو سردار متعین تھے۔ ان کے نام یکے بعد دیگرے بادشاہ کی طرف سے فرامین لکھوا کر ان کو دکن سے بلوا لیا۔ اورنگ زیب قلعہ بیجاپور کا محاصرہ کئے پڑا تھا۔ اور عادل خاں والئے بیجاپور سے مصروف جنگ تھا۔ قلعہ مذکور فتح ہونے ہی والا تھا۔ کہ دارا شکوہ نے مذکورہ تدبیر کو کام میں لا کر اورنگ زیب کو کمزور اور ملک دکن کو افواج شاہی سے خالی کر دیا۔ حالانکہ وہاں اسی وقت فوجوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ عالمگیر نے انتہائی عقل و فراست کو کام میں لا کر والئے بیجاپور سے ایک کروڑ روپیہ سالانہ خراج پر صلح کر لی۔ اور اپنی فوج کے امراء کے چلے جانے اور اپنی طاقت کے کمزور ہو جانے کو ظاہر نہ ہونے دیا۔

باوجود اس کے اس کا وکیل عیسیٰ خاں جو دربار شاہی میں رہتا تھا۔ مقید ہو چکا تھا۔ ملک کے کونے کونے میں شورش و بدنظمی پھیل رہی تھی۔ بھائیوں کی سرکشیوں کا حال بھی سن چکا تھا۔ لیکن کوئی قبل از وقت حرکت نہ کی۔ مراد بخش نے گجرات میں خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ ملامت کی۔ اور نصیحت کا خط لکھا کہ

(فیاض القوانین یعنی مکاتیب تیموریہ)

"ابھی حضور اقدس زندہ ہیں۔ ہم لوگوں کو اپنی جگہ سے ہلنا نامناسب ہے اور سورت پر تم نے جو فوج بھیجی ہے۔ یہ مناسب نہ تھا۔"

"تا حال خبر وقوع قضیہ ناگزیر (یعنی وفات شاہجہاں) بما نرسیدہ۔ بلکہ آثار صحت ظاہر می شود از جائے خود حرکت کردن بہ اظہار بعضے مراتب پرداختن مناسب نمی نماید۔ اگر آں برادر نیز بعد از تحقیق افواج بہ سورت می فرستادند۔ دریں کار نمی رفت۔ بہتر می بود۔"

(خلاصۃ التواریخ)

یعنی دارا شکوہ پوری طاقت سے اورنگ زیب کو کچل ڈالنا چاہتا

تھا اور اس کا تمام منصوبہ اورنگ زیب ہی کی بربادی کے لئے تھا۔ اس کے مرکوز خاطر یہ تھا۔ کہ جونہی عساکر شاہی اس سے حضور میں جمع ہوں پہلے محمد شجاع و مراد بخش کا فیصلہ کرے۔ اور اس کے بعد شاہزادہ محمد اورنگزیب کا کام تمام کرے۔

اسی منصوبہ کے پیش نظر دکن کو لشکر شاہی سے خالی کرا لیا۔ اور چاہتا تھا۔ کہ جب بھی سلطان سلیمان شکوہ محمد شجاع کی مہم سے مظفر و منصور واپس آئے۔ تمام شاہی جو اس کے ہمراہ ہے۔ اسی حیثیت مجموعی کے ساتھ راجہ جسونت سنگھ کے پاس اُجین روانہ کرے۔ لیکن اُسے پتہ نہ تھا۔ کہ ع

"تقدیر دگر باشد و تدبیر دگر"

اورنگ زیب یہ سنکر کہ دارا شکوہ نے امور سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں اور بادشاہ کو جو بیمار بھی ہے مقید و مجبور کر دیا ہے۔ بیجاپور سے فارغ ہو کر دولت آباد آیا۔ اور باپ کی خدمت میں پہنچنے کا ارادہ کیا۔ کہ

(۱) دارالسلطنت میں پہنچکر باپ کی خدمت میں چند روز قیام کر کے دارا شکوہ کے تسلط کو کم کرے۔

(۲) اور بادشاہ کو اس کی قید تسلط سے آزادی دلا کر سلطنت میں جو فتور پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کو دُور کرے۔

(۳) شہزادہ مراد بخش کو جسے ہمراہ نے بہکا اس کی سفارش کر کے معافی دلادے۔

چنانچہ شہزادہ محمد معظم کو دکھن کی صوبیداری پر اپنا قائم مقام مقرر کر کے خود قدیمی رفقا اور موجودہ جمعیت کو ہمراہ لے کر روانہ ہوا۔ اور محمد مراد بخش کے نام خط لکھا۔ کہ تم بھی گجرات سے روانہ ہو کر مالوہ میں مجھ سے آکر مل جاؤ۔ اور میرے ہمراہ بادشاہ کی خدمت میں چلو۔ ۲۵ جمادی الاول کو برہانپور پہنچا بادشاہ کی خدمت میں بیمار پرسی اور دریافت حالات کی عرضداشت ارسال کی۔ اور ایک مہینے تک جو کہ برہانپور میں قیام کیا۔ اور معلوم کیا کہ دارا شکوہ کی قید سے کسی طرح رہا ہو کر پایۂ تخت میں اور اورنگ زیب کے پاس پہنچا۔ اور دارالخلافت کے جملہ حالات سے آگاہ کیا نیز مہاراجہ جسونت سنگھ اور افواج قاہرہ کے مالوہ کے آنے کی خبر بھی گوش گذار کی۔ یہ سُن کر ۲۵ جمادی الثانی بروز جمعہ برہانپور سے آگرہ کی طرف کوچ ہوا۔ اور دریائے نربدا کو عبور کر کے ۲۰ رجب المرجب کو دیپالپور پہنچ کر قیام ہوا۔ ۲۱ رجب کو دیپالپور سے کوچ ہو کر تھوڑا ہی راستہ طے ہوا تھا کہ شہزادہ مراد آملا۔ اور موضع دھرمات پور میں جو اُجین سے سات کوس کے فاصلے پر ہے لشکر کا قیام ہوا!

دونوں بھائیوں نے بڑی سوچ بچار کے بعد آپس میں عہد کیا کہ جب دارا شکوہ پر غلبہ حاصل ہو جائے۔ تو ایک ثلث مال غنیمت اور کابل و پنجاب و کشمیر کے علاقے شہزادہ مُراد بخش کو ملیں گے اور شہزادہ صاحب ولایات مذکورہ میں آزادانہ طور پر بادشاہی کرینگے۔ اور اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کرینگے۔

[اصل تحریر عاقل خاں معاصر اورنگ زیب بادشاہ
بحوالہ واقعات عالمگیری]

"قرار یافت کہ ثلث از غنائم نصیبہ سلطان (یعنی مراد) و ثلثان بہرہ کار فیض آثار (یعنی عالمگیر) عائد گردد۔ و بعد تسخیر کل قلمرو حضرت صاحبقران و فتح ممالک محروسہ ہندوستان ولایت پنجاب و ملتان و کشمیر و کابل بجناب سلطان (شہزادہ محمد مراد بخش) تعلق گیرد و آں جناب (یعنی مراد بخش) در ولایات مذکورہ علم سلطنت برافرازد و آں بھی سر کوس فرمانروائی بنوازد۔ و خطبہ و سکہ بنام خود بسازد"

(خلاصۃ التواریخ از منشی سجان رائے بٹالوی)

جسونت سنگھ اور قاسم خاں کو عالمگیری لشکر کے برہانپور سے روانہ ہونے اس طرح دریائے نربدا کو عبور کر لینے کی ہرگز توقع نہ تھی۔ لہٰذا وہ دونوں متفق ہو کر مُراد بخش کے مقابلہ کو موضع کاچرود تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں سے مُراد بخش کا لشکر صرف تیرہ کوس کے فاصلے پر تھا۔ راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خاں نے کاچرود میں دو تین دن قیام کیا۔ اور یہیں اچانک سنا۔ کہ مُراد بخش راستے سے کترا کر نکل گیا اور اورنگ زیب بھی جو نربدا عبور کرنیکے بعد دھرمات پور میں آگیا ہے

---

۵۱ عاقل خاں کی اس تحریر کے مقابلہ میں ڈاکٹر برنیر اور دیگر یورپین مؤرخوں کا یہ بیان کہ عالمگیر بادشاہ نے مراد کو اس بھرے پر چڑھایا کہ ہندوستان کی سلطنت کے صرف آپ مستحق ہیں۔ اور میں آپ کو سلطنت دلا کر گوشہ نشین ہو جاؤں گا۔ کس قدر صریح افترا اور بہتان ہے۔ اور خصوصاً یہ بیان کہ آپ فوراً سورت پر قبضہ کر لیجئے دیر نہ لگایئے کس قدر صحیح ہے۔ حالانکہ مُراد کے خطوط میں اس امر کی صاف تصریح ہے کہ اورنگ زیب مہینوں مُراد کو نقل و حرکت سے روکتا رہا۔ اور سورت پر قبضہ کے متعلق لکھا کہ مناسب تھا۔ ہمیں مُراد اور ڈاکٹر برنیر میں سے کس پر اعتماد کرنا چاہیئے؟

جا ملا ہے۔ یہ سنتے ہی جسونت سنگھ کوچ کر کے اورنگ زیب و مراد کے لشکر سے ایک کوس کے فاصلے پر پہنچ کر خیمہ زن ہوا۔ اورنگ زیب نے کب رائے برہمن کو اپنا ایلچی بنا کر مہاراجہ کے پاس پیغام بھیجا کہ
"ما را جنگ عزم نیست۔ آرزوئے ملازمت حضرت اعلیٰ (شاہجہاں) داریم انسب آنست کہ آمدہ ملازمت نماید۔ والا از راہ برخیزد۔"
راجہ نے یہ بات منظور نہ کی۔ اور کب رائے کو صاف جواب دیکر رخصت کر دیا۔ کب رائے نے واپس آ کر جب یہ جواب شہزادوں کے گوش گذار کیا۔ تو جبین شاہی پر شکن آ گئی۔

معرکہ اجین

(برنی ار)

۲۲ رجب ۱۰۶۸ھ کو اورنگ زیب نے ایک بلند جگہ پر توپخانہ قائم کر کے فوجوں کو حکم دیا۔ کہ توپوں کی پناہ میں آگے بڑھتی چلی جائیں لیکن ان کی پیش بندی کو روکنے کے لئے شاہی لشکر سے بھی توپوں سے گولے اگلنے شروع کئے۔ اور سخت جوش و خروش سے مقابلہ شروع ہو گیا۔
جسونت سنگھ اور اس کے ٹھاکروں نے اورنگ زیبی لشکر کو قدم قدم پر روکا۔ اور جان بازی کو حد سے گزار دیا۔ اگرچہ اورنگ زیب کی تیغ اقبال سے وہ کھیرے اور ککڑی کی طرح کٹ کٹ کر گرتے تھے۔ مگر رام رام کا نعرہ مارتے ہوئے دیوانہ وار لشکر میں گھسے چلے آتے تھے
ادھر عالمگیری لشکر کا یہ حال تھا کہ بڑے بڑے پتھروں کی وجہ سے جو دریا کے پاٹ میں پڑے تھے۔ انہیں سخت تکلیف پہنچ رہی تھی۔ اور کناروں کے کڈھب ہونے کی وجہ سے اوپر چڑھنا دشوار ہو رہا تھا مگر مراد بخش کی شجاعت اور ہمت اس مشکل پر غالب آئی۔ اور اپنی خاص فوج کے ساتھ دریا کو عبور کر آیا۔ اور انجام کار باقی فوج بھی دریا سے گذر آئی۔ اس وقت قاسم خاں[1] بدنامی کا داغ لے کر میدان سے بھاگ نکلا اور غریب جسونت سنگھ چاروں طرف سے نرغہ میں گھر گیا۔ اور اگر اس کے بہادر راجپوت اسے بچا کر نہ لے جاتے۔ تو یقیناً مارا جاتا۔ غرض آٹھ ہزار لشکر سے بصد مشکل پانچ سو سواروں نے بھاگ کر اپنی جانیں بچائیں۔ اور باقی سارا لشکر راجہ کے اوپر سے تصدق ہو گیا۔ خود راجہ زخموں سے چور چور ہو رہا تھا۔ ندامت سے آگرہ جانا گوارا نہ ہوا۔ اس لئے بچے کھچے رفیقوں کے ہمراہ جودھپور چلا گیا۔

(برنی ار)

جس وقت اجین کی یہ غمناک اور نامبارک خبر دارا شکوہ تک پہنچی۔ تو غم و غصہ سے اس پر دیوانگی کی حالت طاری ہو گئی۔ اور اگر بادشاہ نصیحت اور فہمائش سے ذرا ٹھنڈا نہ کرتا۔ تو خدا معلوم وحشت کی اس حالت میں کیا کر گذرتا اور اس میں شک نہیں۔ کہ اگر قاسم خاں اس کے قابو میں آ جاتا تو اس کو ضرور قتل کرا دیتا۔
اب ادھر اجین کا حال سنئے۔ کہ شہزادے اس فتح پر مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے تھے۔ اور اب انہیں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا۔ کہ ہم تو کسی سے ہارنے کے نہیں۔ اور دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں ہو سکتا جسے ہم انجام نہ دے سکیں۔ اور ساتھ ہی اپنی فوج کی ہمت بڑھانے کے لئے اورنگ زیب علی الاعلان کہتا تھا۔ کہ دارا شکوہ کی فوج میں تین ہزار مغل ہماری خاطر اپنی جانیں نثار کرنے کو تیار ہیں۔ اور حقیقت میں شہزادے کا یہ دعویٰ بے اصل بھی نہ تھا جیسا کہ بعد میں جا کر ظاہر ہوا۔ اب اگرچہ مراد بخش کی تیز طبع قیام کی روادار نہ تھی۔ اور اس کے شوق کا تقاضا یہ تھا کہ برابر بڑھتے چلے جائیں۔ مگر اورنگ زیب کی تدبیر نے یہ کہہ کر روک دیا کہ اس وقت ہمیں ندی اشیپرا کے کنارے ٹھہر کر تازہ دم ہونا اور سستانا بیحد ضروری ہے۔ کیونکہ اس طرح دار السلطنت کے اپنے ہوا خواہوں سے خط و کتابت کر کے ہم صحیح معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اب کوچ آہستہ آہستہ ہونے لگا۔ روزانہ آگرہ سے تازہ دم خبریں پہنچتیں۔ اور ان پر غور و فکر کرنے کے بعد آگے کو قدم بڑھاتے۔

(برنی ار۔ عاقل خاں)

---

[1] اکثر مورخ اس جنگ کی شکست کا ذمہ دار مہاراجہ کو ٹھیراتے ہیں کہ انہوں نے اپنے لشکر کو ناہموار جگہ پر قائم رکھا تھا۔ اور ندی سے کچھ پانی کاٹ کر لشکر کے گرد کیچڑ کر دیا تھا جس سے اس کی سوار فوج اچھی طرح کام نہ دے سکی۔ قاسم خاں پر یہ شبہ ہے کہ اس نے اورنگ زیب سے سازش کر رکھی تھی۔ مگر جب بادشاہ کی ہدایت کا خیال کیا جاتا ہے۔ تو پھر یہ تمام شبہات رفع ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ آگرہ سے روانگی پر جب یہ بوڑھے بادشاہ کے سلام کو حاضر ہوئے تھے۔ تو آپ نے پیار و شفقت سے دونوں پر ہاتھ پھیر کر فرمایا تھا میرے جان نثار بہادرو! پہلے تم دشمنوں سے لڑنے جایا کرتے تھے۔ مگر اب تم شاہجہان کے جگر گوشوں اور ممتاز محل کے دل کے ٹکڑوں سے ٹکر لگانے جا رہے ہو۔ ہر وقت اور ہر حالت میں ناموس شاہی کا احترام پیش نظر رہے۔ ہر ممکن کوشش ہے انہیں یہاں آنے سے روکو لیکن مدافعت میں ان کا بال بیکا تک نہ ہونے دو۔ اب اگر ایسے میں کسی شہزادے کو نقصان پہنچ جاتا۔ تو یہ اپنے بوڑھے آقا کو کیا منہ دکھاتے

دارا شکوہ کی خودسرانہ حرکتیں

اس وقت بادشاہ پر یاس و قنوط کی ایک عجیب حالت طاری تھی۔ ایک طرف تو اُسے یقین ہو چکا تھا۔ کہ دونوں فتحمند شہزادے آگرہ میں داخل ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ اور ادھر دارا شکوہ کی بڑی بھاری تیاریاں دیکھ کر سخت مضطرب ہو رہا تھا۔ اس کی عاقبت بین نگاہیں بچوں کے "منظر کشت و خوں" کو "عالم تصور" میں دیکھ کر خون کے آنسو رو رہی تھیں۔ کیونکہ جس خطرہ سے بچنے کے لئے وہ چالیس سال سے کوشش کر رہا تھا اب وہ بالکل قریب آ چکا تھا۔ جس اندیشہ کے پیش نظر ملکہ عالیہ ممتاز محل نے دوسری شادی سے روکا تھا۔ اب ساری قوتیں اس کے روکنے سے عاجز تھیں۔ اگر دارا شکوہ آنکھوں کا نور تھا۔ تو باقی شہزادے بھی کلیجہ کی ٹھنڈک تھے۔ کسی ایک کی کامیابی کا مدار دوسرے کی ہلاکت پر منحصر تھا۔ اور اگرچہ دارا شکوہ کے پاس ایک لاکھ سوار، ۳۲ ہزار پیدل، اتنی توپیں اور بے انتہا توپخانہ اور بے شمار خزانے، بقال وغیرہ جمع ہو چکے تھے۔ اور اتنی بڑی فوج کے مقابلے میں شہزادوں کے پاس چالیس ہزار سے زیادہ جمعیت نہ تھی۔ اور وہ بھی گرما کے دنوں میں کوچ در کوچ مسافت کاٹتی چلی آ رہی تھی۔ تاہم بادشاہ اور اکابر دربار مطمئن نہ تھے کیونکہ جن امرا اور سپاہی سرداروں کے قوت بازو اور خلوص پر اعتماد تھا۔ وہ سب سلیمان شکوہ کے ساتھ شجاع کی مہم پر گئے ہوئے تھے جو دارالسلطنت میں موجود تھے۔ ان کے آثار سے غیر جانبداری کا اظہار ہوتا تھا۔

بادشاہ نے موقعہ کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے سلیمان شکوہ کی طرف قاصد دوڑائے۔ کہ شجاع کا تعاقب ترک کر کے فوراً آگرہ پہنچو۔ اور دارا شکوہ کو ملائمت سے سمجھایا۔ کہ تمہارا اس طرح مقابلہ میں نکلنا درست نہیں۔ بلکہ میرا ارادہ یہ ہے۔ کہ ضعیفی اور بیماری کے باوجود اورنگ زیب کے مقابلہ میں خود نکلوں۔ اور مجھے توقع ہے۔ کہ جب میرے نمک حلال اور وفاشعار سپاہی مجھے میدان جنگ میں دیکھیں گے۔ تو سب میرے پاس جمع ہو جائیں گے۔ اور یہ فتنہ فرو ہو جائیگا۔ اُمرائے سلطنت نے بھی بادشاہ کے اس ارشاد کی تصدیق کی لیکن دارا شکوہ کی ناتجربہ کاری اور بے لیاقتی نے اس صائب مشورہ کو قبول نہ کیا۔ بلکہ اس مشورہ کو اُمرا کی منافقت پر محمول کر کے علانیہ کہہ اُٹھا۔ کہ

" من عنقریب این دوستِ پائچہ ہا را (یعنی شرعی پائچے والے مسلمان امراء کو) در جیب زار دلی و سر سال خواہم دوانید "

اس کے سننے سے سب اُمراء بے دل ہو کر فریق ثانی کے طرفدار ہو گئے۔

(عاقل خاں۔ برنی اور عمل صالح)

حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر دارا شکوہ بادشاہ کا ارشاد مان لیتا۔ اور بادشاہ سلامت بذات خاص میدان جنگ میں تشریف لیجاتے تو شہزادے کسی صورت باپ کے مقابلے میں نہ نکلتے۔ اور اگر یہ جرأت کرتے بھی تو بُری طرح تباہ و برباد ہو جاتے۔ لیکن دارا شکوہ کو والد کی حمایت پر پورا اعتماد نہ تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس وقت کل فوج اور بادشاہ میرے قبضے میں ہے۔ شجاع شکست کھا چکا ہے۔ اور عالمگیر کا لشکر قلیل ہے اور بڑی مسافت طے کر کے آیا ہے۔ ان کو شکست دینا کوئی بڑی بات نہیں لیکن اگر بادشاہ خود موقعہ پر جا پہنچے تو کیا عجب کہ بھائیوں میں صلح ہو جائے اور منفعل ہو کر واپس لوٹ جائیں اور بادشاہ جو اب تندرست ہوتا جاتا ہے عنان حکومت پھر اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور میں دیکھتا کا دیکھتا رہ جاؤں۔

ان خیالات کے زیر اثر کچھ وہ خود بہکا اور کچھ چھتر سال اور رام سنگھ وغیرہ جیسے سرداروں نے بہکایا جس سے وہ تشویش قاہرہ کو ہر طرح سے لیس کر کے باپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور رخصت کی اجازت چاہی۔ بوڑھا باپ پہلے تو بیٹے سے بغلگیر ہو کر رونے لگا۔ مگر پھر ذرا سنبھلا۔ اور دردمندانہ لہجے میں بولا۔ کہ

" خیر! بیٹا! تم نے اپنی مرضی کا کام کیا۔ خدا تم کو اس میں سرخرو اور کامیاب کرے لیکن یاد رکھو کہ اگر لڑائی بگڑ گئی۔ تو پھر آ کر مجھے کیا منہ دکھاؤ گے "

دارا شکوہ نے ان باتوں کا کچھ جواب نہ دیا۔ اور چنبل کی طرف جو آگرہ سے بیس فرسنگ کے فاصلے پر ہے کوچ کر دیا۔ اور اس خیال پر کہ دشمنوں کی فوج یہاں سے عبور کرے گی، دریا کے گھاٹ روک کر مورچے جما دیئے۔ اورنگ زیب کی تیز نگاہی اور دور اندیشی سے دارا شکوہ کے انتظامات پوشیدہ نہ تھے۔ اور اپنے مخبروں کے ذریعے منٹ منٹ کی خبریں منگوا رہا تھا اور وہ خوب جانتا تھا۔ کہ اتنے عظیم الشان لشکر کی موجودگی میں دریا کا عبور کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ تاہم دارا شکوہ کے حاذی میں دریا کے پار اپنے ڈیرے لگا دیئے اور عمداً ایسے قریبی مقام پر کیمپ لگایا۔ کہ دارا شکوہ بخوبی دیکھ سکے۔ مُراد نے جلد مزاجی اور دلیری سے جو اس کا خاصہ تھی۔ مورچوں کے توڑنے کی صلاح دی۔ مگر یہاں بھی اورنگ زیب نے اپنی متانت خرچ کی۔

بھدادر کے راجہ چمپت سے در پردہ وعدے وعید کرکے یہ بندوبست کیا کہ فوج اس کے علاقے میں سے گذر کر ایک اور گھاٹ کے ذریعے دریا کو عبور کرے چنانچہ دارا شکوہ کو دھوکہ دینے کے لئے ڈیرے خیمے تو وہیں چھوڑ دیئے، اور خود مع فوج اس ملک کی پچیس کوس کی مسافت کو دو منزلوں میں طے کرکے رمضان المقدس ۱۰۶۸ھ کی پہلی تاریخ کو ایک غیر معروف گھاٹ سے چنبل کو عبور کیا۔ اور قبل اس کے کہ دشمنوں کو خبر ہو بلا توقف آگرہ کو روانہ ہوگیا۔

دارا نے سنا۔ تو فرط غیظ سے ہتھیلی کی پشت کو کاٹنے لگا۔ اور جھلا کر حکم دیا۔ کہ فوراً ان کا تعاقب کیا جائے۔ اورنگ زیب اس اثنا میں جمنا کے کنارے سموگڈھ کے مقام پر خیمہ زن ہو کر دارا کا راستہ دیکھ رہا تھا۔ دارا شکوہ بھی دھول پور سے اپنے مورچے چھوڑ کر آن پہنچا۔ اور اورنگ زیب کے لشکر اور آگرہ کے درمیان جمنا کے کنارے ڈیرے ڈال دیئے۔ بوڑھے بادشاہ نے جو ہر ممکن طریقے سے لڑائی کو روکنا چاہتا تھا ضعف و نقاہت کے باوجود اتنی سخت گرمی میں یہ کوشش کی۔ کہ خود جاکر دونوں لشکروں کے درمیان آ کر پڑے۔ یہاں تک کہ پیش خیمہ بھی بھیج دیا۔ اور بیماری و کمزوری کے باعث کشتی کے ذریعے آنا چاہا۔ مگر بد قسمتی سے دارا نے اس تجویز کو اپنے مدعا کے خلاف تصور کرکے پورا نہ ہونے دیا۔ تین چار دن تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل پڑے رہے۔ بادشاہ اور اس کی لائق بیٹی جہاں آرا بیگم نے آب تدبیر سے اس آگ کو بجھانا چاہا۔ شہزادوں کو قاصد پر قاصد دوڑائے۔ کہ

(فیاض القوانین یعنی مکاتیب تیموریہ)

"آپ کو شرعاً اور اخلاقاً اپنے قبلہ گاہ اور بڑے بھائی سے الجھنا نہ چاہیئے۔ نہ ہی جنگ و قتال کا میدان گرم کرکے بیمار باپ کو آزار پہنچانا مناسب ہے۔ بہتر ہے کہ آپ اپنے صوبوں کو واپس چلے جائیں۔"

جہاندیدہ بھائی نے بہن کی درد بھری چٹھی پڑھی۔ مگر دارا شکوہ کا طرفدار پاکر چپ ہو رہا۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ مگر حامل مکتوب محمد فاروق بخشی بیگم صاحب کو بادشاہ کے نام ایک طویل عرضی لکھ کر دی۔ جس کا ملخص یہ تھا۔ کہ

"ما بندگان کی آمد صرف زیارت کے لئے ہے۔ بھائی صاحب پنجاب میں اپنی جاگیر پر چلے جائیں۔ اور فدویان کو حضرت سے شرف ملنے کا موقعہ عطا کریں۔ اس کے بعد حضور والا جو مناسب خیال فرمائیں گے اس پر عمل کیا جائیگا۔"

(برنی ار)

ادھر بادشاہ نے دارا شکوہ کو خط پر خط بھیجے کہ سلیمان شکوہ قریب پہنچ چکا ہے۔ جلد بازی سے کام نہ لو۔ اور سلیمان شکوہ کے آنے تک لشکر کو آگرے سے ذرا اور قریب لے آؤ۔ اور اس کے گرداگرد خندقیں کھدوا کر مورچہ بندی کر لو۔ دارا شکوہ نے جواب میں صرف اتنا لکھ بھیجا۔ کہ

"حضور کچھ اندیشہ نہ فرمائیں۔ انشاء اللہ تین دن نہ گذرنے پائیں گے۔ کہ اورنگ زیب اور مراد بخش کو ہاتھ پاؤں باندھ کر حاضر کر دونگا۔"

میدان جنگ

آخرکار ۷ رمضان المبارک ۱۰۶۸ھ کو صف آرائی ہو کر لڑائی شروع ہوگئی۔ پہلے توپوں نے گولے اگلے۔ پھر تیر کثرت سے برسنے لگے۔ دارا شکوہ اس وقت سراندیپ کے خوبصورت ہاتھی پر سوار تھا۔ فوج کی ہمت بڑھاتا، سواروں کی ایک فوج کے ساتھ دشمنوں کی توپیں چھیننے کے لئے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ مگر عالمگیری لشکر نے اس زور کا حملہ کیا۔ کہ آن کی آن میں دارا شکوہ کے اردگرد کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ اور جو فوج اس کے ساتھ تھی۔ یا جو آکر پیچھے سے ملی تھی۔ سب تتر بتر ہوگئی۔ مگر دارا شکوہ کمال استقلال سے میدان جنگ میں ڈٹا رہا اور نہایت شان سے ہاتھی پر بیٹھا عجیب دلیری اور بیباکی سے اپنی منتشر شدہ فوج کو جمع کرنے لگا۔ سپاہیوں نے۔ الار لشکر کا جب یہ استقلال دیکھا۔ تو وہ بھی دلیر ہوگئے۔ اور بھگوڑوں نے دوڑ دوڑ کر اپنی جگہ پر آنا شروع کیا۔ اس وقت دارا شکوہ نے پورے زور سے دشمنوں پر حملہ کیا۔ اور اکثر من چلے سپاہی بھی اپنے شجاع سپہ سالار کے ہمرکاب بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ توپوں کے قریب جا پہنچے۔ اور ہمت کرکے ان کی زنجیروں کو کھول ڈالا۔ پھر یہاں سے خیمہ گاہ کا تعاقب کیا۔ زنبور خانہ کے رسالوں اور پیادوں کی فوجوں کو مار مار کر بھگا دیا۔ لیکن اس وقت عالمگیری سوار فوج تن کر سامنے آگئی۔ اور اس شدت سے مقابلہ ہوا۔ کہ خدا پناہ! تیر اندازی کا یہ عالم تھا۔ کہ آسمان تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ خود دارا شکوہ نے اس قدر تیر برسائے تھے کہ اس کا ترکش خالی ہوگیا تھا۔ اور جب ترکش خالی ہوگئے۔ تو فریقین نے تلواریں

سوخت لیں۔ دارا شکوہ نشۂ شجاعت سے بدمست ہو کر حملہ پر حملہ کئے جاتا تھا۔ اور اہل فوج کو پکار پکار کر برابر تسلی اور بڑھاوے دیئے جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ شاہی فوج نے ایک ہی ریلے میں دشمنوں کے سواروں کو بھی بھگا دیا۔ اس وقت شہزادے محمد اور نگزیب کا ہاتھی ان کے بالکل نزدیک تھا۔ اس کو وقار شہزادے نے ہر چند کوشش کی۔ کہ کسی طرح سپاہ اپنی جگہ پر قائم رہے۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ جن خلص الخاص سواروں کو ہزاروں کمیتوں کے ساتھ دارا کی مدافعت کے لئے روانہ کیا تھا۔ وہ بھی نہایت ابتری سے بھاگ گئے۔ مگر واہ رے اورنگزیب تیری دلاوری اور استقلال۔ جب یہ دیکھی کہ ساری فوج بھاگ گئی، اور جو لوگ اب تک میدان میں جمے ہوتے ہیں وہ بھی ایک ہزار سے زیادہ نہیں، تو وہ کمال استقلال سے ہاتھی کی عماری میں کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے سرداروں کے نام لے لے کر پکارا۔ کہ

"بہادرو! خدا پر نظر رکھو۔ خدا تمہارے ساتھ ہے بھاگنے سے کیا ہوگا۔ خدا سب جگہ ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ملک دکن کس قدر دُور ہے"

اور ساتھ ہی اولوالعزم سلاطین کی رسم کے مطابق حکم دیا۔ کہ

"ہمارے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈال دو"

شہزادے کی اس پُر جوش تقریر اور اس آہنی عزم سے ٹوٹے ہوئے دل پھر جُڑ گئے۔ اور سب اُمراء نے متفق طور پر اپنی جان نثاری کا یقین دلا کر شہزادے کو اس ارادے سے باز رکھا۔ ادھر دارا شکوہ نے اگرچہ تمام ترکوششیں اورنگزیب کے پاس پہنچنے کے لئے صرف کر دیں۔ مگر میدان کے ناہموار ہونے اور دشمن کے شکست یافتہ سواروں کے بد حواس ہو کر ادھر اُدھر پھیلنے سے اُس تک نہ پہنچ سکا۔ اتنے میں اسے خبر ملی کہ رستم خاں اور ستر سال بائدا حق نمک ادا کر کے مارے گئے اور رام سنگھ سخت خطرے میں ہے۔ دارا شکوہ بیتاب ہو کر اس کی مدد کو دوڑا۔ مگر اس کے پہنچنے سے پہلے مُراد بخش کے تیر نے اس جانباز کا کام تمام کر دیا تھا۔ ان سر فروش اور جان سپار بہادروں کے مرنے سے دارا شکوہ کو بڑا صدمہ ہوا۔ اور ابھی بیدرنغ شکن سُورماؤں کی بے وقت موت کا تاسف کر رہا تھا۔ کہ پیچھے ایک عجیب واقعہ ظہور میں آیا۔ روپ سنگھ راٹھور جو مہاراجہ جسونت سنگھ کا چچیرا بھائی تھا۔ اور دارا شکوہ کے ہراول کا سردار تھا۔ اپنی بے نظیر شجاعت کے بل بوتے پر عالمگیری توپ خانے سے گذر کر صفوں کو چیرتا ہوا اورنگزیب کے ہاتھی کے پاس جا پہنچا۔ اور کمال دلیری اور بہادری سے اس قدر

خوش ہوا۔ کہ بے اختیار چلّا کر کہا۔

"خبردار! اس بہادر کو نہ مارنا اور زندہ گرفتار کر لینا"

مگر لڑائی کے ہر بونگ میں قبل اس کے قدر دان شاہزادے کے یہ الفاظ سپاہیوں تک پہنچتے۔ بیک وقت سینکڑوں تلواریں چمک کر اس بے نظیر بہادر پر گریں جس سے شجاعت اور مردانگی کا یہ بے نظیر نقش ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔

مُرادبخش کی شجاعانہ تیراندازی

ادھر مُرادبخش کی سُنیئے۔ کہ رام سنگھ راٹھور کے مارے جانے سے راجپوتوں کا جوش اور بڑھ گیا تھا۔ اور وہ انتقامی جذبات میں سرشار ہو کر ترکش کے ترکش خالی کر رہے تھے۔

(خافی خان)

اگرچہ میرزا مُراد کے ہاتھی کا ہودہ[1] تیروں سے چھلنی ہو گیا تھا اور خود بھی بُری طرح سے لہولہان ہو رہا تھا تاہم پہاڑ کی طرح ڈٹا ہوا تیر برساتا رہا۔ اور اپنے سات سالہ بچے کو جو پہلو میں دبکا بیٹھا تھا۔ ڈھال سے بچاتے ہوئے کمال استقلال سے داد مردانگی دیتا رہا۔ اور اگر اس وقت قدرت عجیب اتفاق سے اس کی مدد نہ کرتی۔ تو دارا شکوہ کے خونخوارانہ حملے سے اس کا بچ نکلنا ممکن نہ تھا۔

(برنی ار)

صورت یہ ہوئی۔ کہ اس کیفیت و حالت میں میسرہ کا سردار خلیل اللہ خاں جو در پردہ اورنگزیب سے ملا ہوا تھا گھوڑا دوڑا کر قریب آیا۔ اور دور سے پکار کر کہا۔

"مُبارک باد! حضرت سلامت!! الحمد للہ! الحمد للہ!!
مگر ایسے موقعہ پر جبکہ تیر اور گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے
حضور ایسے بڑے ہاتھی پر کیوں سوار ہیں۔ خدارا جلد
اُتر آیئے۔ اور گھوڑے پر سوار ہو لیجئے۔ اب لڑائی ختم
ہو چکی ہے۔ صرف بھگوڑوں کا تعاقب باقی ہے"

ناتجربہ کار شہزادہ اس فریب میں آگیا۔ اور ہاتھی سے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اور اس کا ہاتھی سے اُترنا گویا تختِ سلطنت سے

---

[1] یہ ہودہ فرخ سیر کے زمانے تک یادگار کے طور پر قلعہ میں محفوظ رہا۔ اور جب سادات بارہہ نے سرکشی کی تو نواب زیب النساء بیگم (دختر عالمگیر) نے اسی ہودے کو دکھا کر کہا۔ کہ یہ تیموری نسل کی یادگاریں ہیں (منتخب اللباب خافی خان)

گرتا تھا۔ اس کے اوجھل ہوتے ہی تمام فوج اس دھوکہ میں پڑ کر بدحواس ہو گئی۔ کہ دارا شکوہ مارا گیا ہے۔ لشکر منتشر ہونے لگا۔ اس وقت دارا شکوہ کی آنکھ کھلی۔ پوچھا خلیل اللہ خاں کہاں ہے؟ مگر اب وہ یہاں رہ کر کیا کرتا۔ وہ تو اپنا کام کمال خوبی سے ختم کر چکا تھا۔ اس اثنا میں اورنگزیب بھی اپنے مقابلہ کی فوج کو شکست دے کر اس جانب مراد کی امداد کو آپہنچا۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک ہی حملے سے دارا شکوہ کی افواج کو تتر بتر کر دیا۔

دارا شکوہ کا فرار

بدقسمت دارا شکوہ شکست کھا کر آگرے آیا۔ مگر شرم کے مارے قلعہ میں نہ گیا کیونکہ بوڑھے باپ کے آخری الفاظ ابتک کانوں میں گونج رہے تھے۔ کہ

"خیر بیٹا۔ تم نے اپنی مرضی کا کام کیا۔ خدا تم کو اس میں سُرخرو اور کامیاب کرے۔ لیکن یاد رکھو۔ کہ اگر لڑائی بگڑ گئی۔ تو پھر آ کر مجھے کیا مُنہ دکھاؤ گے۔"

بادشاہ کو جگر گوشہ کی اس ناکامی کا حال معلوم ہوا۔ تو وہ سخت مغموم ہوا۔ محبت پدری نے غلبہ کیا۔ اسی وقت ایک معتمد خواجہ سرا کی معرفت کہلا بھیجا۔ کہ

"تمہاری اس مصیبت کا مجھے بہت رنج ہے۔ لیکن نا اُمید ہونے کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ ابھی سلیمان شکوہ کی فوج اور لشکر صحیح سلامت ہے۔ ہماری صلاح یہ ہے۔ کہ بالفعل تم دہلی کو چلے جاؤ۔ صوبہ دار کو حکم بھیج دیا گیا ہے۔ وہ تم کو بادشاہی اصطبل میں سے ایک ہزار گھوڑے خزانہ اور ہاتھی دیگا۔ اور آگرہ سے دور جانا ٹھیک نہیں۔ بلکہ ایسے معقول فاصلہ پر ٹھہرو۔ جہاں ہماری تحریریں تم کو باسانی ملتی رہیں۔ اور ہمیں ابتک اُمید ہے۔ کہ ہم اورنگزیب کو قابو میں لا کر سزا دے سکیں گے۔"

لیکن دارا شکوہ اس قدر شکستہ خاطر اور اداس ہو چکا تھا۔ کہ ان شفقت آمیز خطوط کا جواب تک نہ دے سکا۔ بلکہ آدھی رات کے وقت جہاں آرا بیگم کے پاس پیغام بھیج کر اپنے بال بچے منگا لئے۔ اور اسی وقت اپنی بیگم بیٹیوں اور اپنے فرزند سپہر شکوہ و تین چار سو آدمیوں کو ہمراہ لیکر دہلی روانہ ہو گیا۔

اورنگزیب کا اُمراء کو اپنے ساتھ ملانا

فتح نصیب شہزادوں نے سموگڑھ کا میدان جیتنے کے بعد اُمراء کو ساتھ ملانا شروع کیا۔ سب سے پہلے خلیل اللہ خاں اپنی فوج سمیت حاضر ہو کر مورد عنایت ہوا۔ نامور شائستہ خاں تو پہلے ہی سے ہمراہ تھا۔ اس کے متعلق مشہور یہ تھا۔ کہ اپنی فصاحت بیانی اور شیریں زبانی سے مشکل کام کو انجام دیسکتا ہے۔ اور اس کے وجود سے بلند بخت شہزادہ کو بہت سے فوائد حاصل ہوئے۔ لیکن اس فتح و نصرت کے باوجود حضرت محی الدین اورنگزیب نے کسی قسم کا دعویٰ نہ کیا۔ اور اسی میانہ روی سے حزم و احتیاط کو کام میں لاتا رہا۔

اُمراء کو بہ دارانِ لشکر کو وعدے وعید سے خوش کر کے شہزادے آگرے کو روانہ ہوئے۔ اور دریائی سے تیسرے نور باغ میں منزل میں جا اترے۔ اسی وقت ایک قاصد راجہ جے سنگھ اور دلیر خاں کی طرف بھیجا۔ جو سلیمان شکوہ کے لشکر کے بہت بڑے سردار تھے۔ مضمون یہ تھا کہ

"دارا شکوہ بالکل تباہ اور وہ بڑا لشکر جس پر اسے اس قدر گھمنڈ تھا۔ شکست فاش کھا کر ہمارا مطیع ہو گیا ہے۔ اور وہ ایسی بے سروسامانی سے بھاگا چلا جاتا ہے۔ کہ سوار اُس کا آپ رسالہ تک ساتھ نہیں۔ اور اُمید ہے کہ ہم بہت جلد اُسے گرفتار کر لیں گے۔ اور حضرت بادشاہ اسقدر علیل ہیں کہ صرف چند روز کے مہمان اور چراغ سحری ہیں پس اس حالت میں اگر تم ہم سے مقابلہ کرو گے۔ تو نتیجہ بجز خرابی اور ہلاکت کے کچھ نہ ہوگا۔ بہتر یہ ہے۔ کہ ہمارے حضور میں حاضر ہو جاؤ۔ اور سلیمان شکوہ کو بھی گرفتار کر کے ہمراہ لاؤ۔"

جے سنگھ اور دلیر خاں اول تو متردد اور متامل رہے لیکن آخرکار عالمگیر کی خوب کا تعویذ اثر کئے بغیر نہ رہا۔ لیکن اس کے باوجود بھی راجہ نے سلیمان شکوہ پر ہاتھ ڈالنے سے پرہیز کیا۔ اور اُسے خلوت میں تمام حالات سے آگاہ کر کے صلاح دی۔ کہ اول تو جس طرح بھی ممکن ہو دہلی پہنچ کر باپ کے ساتھ شامل ہو جائیے۔ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا۔ تو ہٹ کر الہ آباد جا ٹھہریئے۔ اور موقع وقت کا انتظار کیجئے۔

چنانچہ شہزادہ حسرت و یاس کے عالم میں اپنے اتالیق بہادر خاں کے ہمراہ الہ آباد کو روانہ ہوا۔ اور راجہ جے سنگھ و دلیر خاں نے چند سرداروں کے ساتھ شہزادہ اورنگزیب کی خدمت میں باریاب ہونے کے لئے کوچ کیا۔

باپ کی مُلاقات میں ناکامی

چونکہ مراد بخش کو سموگڑھ کی مہم میں کاری زخم آئے تھے۔ اس لئے

شہزادہ اورنگ زیب نے سب سے پہلے اطباءِ حاذق اور جراحانِ ماہر
طلب کر کے اس کے علاج پر مقرر کئے۔ پھر سیاسی الجھنوں کے حل کرنے میں
مصروف ہوا۔ یہ بھی اورنگ زیب کے لئے عجیب اتفاق تھا کہ مراد بخش
بیماری کی وجہ سے کچھ کرنے کے نااہل تھا۔ اور اورنگ زیب نے سب
کاروبار اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ چونکہ مراد بخش کی سپاہ کے لوگ
شہر آگرہ میں جا کر دست درازیاں اور بے اعتدالیاں کرنے لگے تھے۔
اس لئے اپنے فرزند اکبر محمد سلطان کو اپنی سپاہ جمیعت شہر میں بھیج کر
عمل دخل کر لیا۔ پھر بادشاہ کی خدمت میں معتمد خواجہ سرا عذر داری
کی غرض سے بھیجا جس نے حاضر ہو کر مراسم تعظیم ادا کرنے کے بعد شہزادے
صاحب کی عقیدت، خلوص اور فرمانبرداری کا اظہار کیا اور عرض کی کہ
"چونکہ گندا صرف دارا شکوہ کی کج رائے اور بیجا جاہ طلبی کے
خیالات کے باعث ہوا تھا۔ اورنگ زیب نے حضور کی خدمت میں
حصول صحت کی مبارکباد عرض کی ہے۔ اور اس اتفاق کے
وقوع میں آنے کا اُسے نہایت ہی رنج اور افسوس ہے اور
اس کا آگرہ آنا محض اس غرض سے ہے۔ کہ جو کچھ ارشاد ہو وہ
بسر و چشم اس کی تعمیل کرے"
(خلاصۃ التواریخ از سجان رائے بٹالوی عہد عالمگیر بادشاہ)

لیکن چونکہ جہاں پناہ کو دارا شکوہ کی خاطر زیادہ مطلوب تھی۔
اس لئے اورنگ زیب کو شرفِ نیاز حاصل کرنے کی اجازت نہ دی۔
جس پر مجبوراً شاہزادہ صاحب نے مصلحت وقت کے پیش نظر ملاقات کا
ارادہ ترک کیا۔
(اصل عبارت خلاصۃ التواریخ از منشی سجان رائے بٹالوی عہد عالمگیر بادشاہ)
"پیش نہاد خاطر والا آں بود۔ کہ در ساعت مسعود حصول دولت
ملازمت حضرت اعلیٰ (شاہ جہاں) نمایند۔ و در استرضائے
خاطر ملکوت مناظر کوشیدہ عذر وقوع حوادث [illegible] آورند۔
و بالکلیہ حجابے کہ حادث شدہ مرتفع سازند۔ ازاں جا کہ
حضرت اعلیٰ را کمال توجہ بحال خسران مآل دارا شکوہ بود۔
و رعایت خاطر او چشم از صلاح دولت پوشیدہ در صلاح
و تربیت آں نہال بے ثمر (دارا شکوہ) می کوشیدند۔
رضا نمی دادند کہ خدیو گیہاں (عالمگیر) بہ ملازمت
بکوشند لاجرم بحکم تقاضائے وقت خدیو آفاق ترک
عزم ملازمت نمودند۔ و در خلال ایں حال خبر اقامت دارا شکوہ
بشاہجہاں آباد (دہلی) و فراہم آوردن لشکر بقصد جنگ
بسامع والا رسید تہاون [illegible] دولت
نادانستہ عزیمت بدافعت دارا شکوہ [illegible] نمودند"

اور اس اثنا میں چونکہ دارا شکوہ کے شاہجہان آباد پہنچنے [illegible] کی
غرض سپاہ فراہم کرنے کی اطلاع پہنچ گئی تھی اس لئے آگرہ میں
زیادہ قیام کرنا مصلحت ملکی کے خلاف تصور کر کے دارا شکوہ کے
تعاقب کا ارادہ مصمم کر لیا۔ چنانچہ شاہزادہ محمد سلطان اور [illegible] کو
اکبرآباد میں چھوڑ کر اور فاضل خاں میر سامان کو بادشاہ کی خدمتگاری
اور حکیم تقرب خاں کو تین ہزار اشرفی عطا فرما کر بادشاہ کے معالجے
اور حفظ صحت پر مامور کیا۔ اور ۲۲ رمضان المبارک ۱۰۶۸ھ کو
آگرہ سے دہلی کی جانب روانہ ہوئے۔

مُراد بخش کی بے راہروی

آگرہ سے کوچ کر کے اورنگ زیب نے پہلا پڑاؤ بہادر پور میں کیا۔
اور یہاں سے اپنے فرزند ثالث شہزادہ محمد اعظم کو [illegible] کی غرض سے
آگرہ روانہ کیا جس نے جد امجد کی خدمت میں پانچ [illegible] اور چار ہزار
روپیہ نقد نذر کیا۔ اور بادشاہ نے بھی اولاد کے [illegible] ہاتھ
بڑے پیار سے بہت کچھ دے دلا کر رخصت کیا۔
بہادر پور سے کوچ کر کے ۲۴ رمضان کو سامی گھاٹ پہنچا اور
دو یوم قیام کیا۔ یہاں سے اُسے معلوم ہوا کہ شہزادہ مراد بخش جس نے
ابتک آگرہ سے کوچ نہیں کیا اس مہم میں حصہ لینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔
شہزادہ بلند اقبال کو مراد بخش کے اس تبدیلی مزاج سے تشویش ہوئی۔
بعض امرا نے تو یہاں تک بتایا۔ کہ مراد بخش خود تخت نشینی کا شوق
کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے بیس ہزار کے قریب نیا لشکر تیار کر لیا ہے۔
(عاقل خاں۔ عالمگیر نامہ۔ عمل صالح)
اورنگ زیب نے اپنے معتمد امرا کو بھیج کر مراد بخش سے ترک رفاقت کی وجہ
دریافت کی۔ اور جب اُس نے جواب میں اپنی ناداری اور فوج کی پریشان حالی کا
عذر پیش کیا۔ تو بیس لاکھ روپے بھیج دیئے۔ اور کہلا بھیجا کہ دارا شکوہ کا
قضیہ فیصل ہونے کے بعد کابل اور پنجاب و کشمیر بھی حوالے کئے جائیں گے۔
(اصل عبارت عاقل خاں۔ ملخص واقعات عالمگیری)
"لاجرم آنحضرت عالمگیر مبلغ بست لک روپیہ نقد
بواسطۂ او ارسال داشتہ پیغام کردہ کہ بالفعل ایں
مبلغ را بضروریات خاصہ خود و سپاہ صرف نمایند بموجب
کہ آں برادر والا تبار مقرر کردہ شدہ کہ [illegible] ازغنائم

"بعد کامیابی شما عاید گردد۔ و تمامی نیز خواہد رسید انشاءاللہ تعالیٰ
بعد از اتمام مہم فتح صوبہ دارالملک و ولایت پنجاب و کابل و کشمیر
بآں برادر ارجمند آرائے سلطنت و جہانداری ارزانی خواہد شد۔"

مگر جب مراد بخش شہباز خان وغیرہ چاپلوس امراء کے بہکانے سے جادۂ مستقیم سے بہک چکا تھا۔ مگر اورنگ زیب جیسا پختہ کار اور مدبر جرنیل [illegible] کسی بھی نہ چاہتا تھا۔ اس لئے وقت اور مصلحت کی انتظار میں بادل ناخواستہ آگرہ سے چل پڑا۔ مگر عالمگیری لشکر سے ایک کوس کے فاصلے پر اُترتا رہا۔ یہاں تک کہ جب دونوں لشکر اس طرح آگے پیچھے اترتے ہوئے متھرا پہنچے۔ تو ان کا درمیانی فاصلہ کچھ اور زیادہ ہوگیا۔ اُمراء جو مراد بخش کو ہمیشہ بہکاتے چلے آتے تھے۔ یہاں انہوں نے مراد بخش کو بتاکید کمال کہا کہ مصلحت وقت یہی ہے۔ کہ کسی بہانے سے اورنگزیب کو گرفتار کرلیجئے۔ ورنہ جب اس کا تسلط ہوگیا۔ یہ آپ کو ہرگز ہرگز نہ چھوڑے گا۔ پہلے تو مراد بخش نے جھنجھلا کر کہا کہ

"ایں محض واہمہ است کہ بر طبیعت شما غالب گشتہ۔ باوجود
عہد و پیمان و کلام اللہ ایمان یاران حضرت (اورنگزیب)
ایں خیال ہمہ باطل است خاطر را مداوں از طریقۂ مسلمانی نہ شمارد۔"

مگر ابراہیم خاں جیسے بدمست اُمراء جو اورنگ زیب کے اُمراء سے اندرونی طور پر حسد رکھتے تھے۔ کے باعث ہندوستان کی وزارت عظمٰی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ شہزادہ صاحب کو نہایت عیاری سے اورنگ زیب کی طرف سے بدگمان کیا۔ اور بتایا۔ کہ اس کے زندہ رہنے سے آپ کی جان کا خطرہ ہے۔ اور شکوک اٹھانے سے دہلی کا تخت ملتا ہے۔ آخر طے پایا۔ کہ اورنگزیب کو کھانے پر بلایا جائے۔ اور یہیں موقعہ پاکر اس کا کام تمام کر دیا جائے۔

(تاریخ ہند، از کرنل ٹوڈ صاحب بہادر)

اورنگ زیب کے قتل کی سازش

جب مراد بخش متھرا کے قریب پہنچا۔ تو اس سے اگلے دن سلطان مراد بخش نے اورنگ زیب کو ضیافت کا پیغام بھیجا۔ اور چونکہ وہ طبعاً کشادہ مزاج اور رنگین طبع شخص تھا اس لئے اورنگ زیب نے بغیر کسی طرح کے شک و شبہ کے اس کی دعوت کو قبول کرلیا۔ مگر جب دونوں بھائی دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ اور شہباز نے جو مراد بخش کے محلات کا افسر[1] اور اُس وقت گویا اس کے منصوبے کا راز دار تھا۔ یکایک کان میں آکر کہا کہ

"عمدہ پوشاک میں چاک کرنے کا اب وقت ہے۔"

یعنی اورنگ زیب سے یہیں نپٹ لینا چاہئے۔ اس پر اورنگ زیب جو لوگوں کی صورتوں اور چہروں سے اُن کے بھید معلوم کر لیتا تھا۔ اس سرگوشی اور بھائی کی بناوٹی رنگینیوں سے جو اس وقت دکھا رہا تھا اصل مدعا کو تاڑ گیا۔ مگر تحمل اور متانت کی راہ سے خاموش ہو رہا۔ اور جب مراد بخش نے سمجھا کر شہباز کو رخصت کر دیا۔ کہ فلاں علامت اور اشارے کا منتظر رہے تو اورنگ زیب نے یکایک یہ ظاہر کیا۔ کہ میرے پیٹ میں سخت درد ہے۔ اور مجلس سے اٹھ کر جھٹ پٹ باہر چلا آیا۔ اور اپنے ہاتھی کی ہوالی اور ہمرکاب سپاہیوں کے پاس جو ڈیوڑھی پر حاضر تھے آپہنچا۔ اور وہاں سے سیدھا اپنے لشکر کو لوٹ آیا۔ اور اس چالاکی کی چال کو ایسی خوبصورتی سے ادا کیا۔ کہ مراد بخش یہی خیال کرتا رہا۔ کہ وہ فی الواقع بیمار ہے۔ اور اس کو گمان بھی نہ ہوا۔ کہ وہ اس منصوبہ کو سمجھ گیا ہے اور ادھر اورنگ زیب نے برادر نامہربان کے ان اوضاع و اطوار کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا۔ کہ اب اسے قید کر لینا ہی مناسب ہے۔ کیونکہ شہزادہ اگر اس موقعہ پر اپنے تدبر و تفکر سے کام نہ لیتا۔ تو آج اس کی خیر نہ تھی۔ چنانچہ آناً فاناً اس کے ذہن رسا نے مراد بخش کی گرفتاری کا خاکہ بنا لیا۔

(سیر المتاخرین عبدالرحیم۔ عماد خاں بہ سنی باریجا پو راستے)

مراد بخش کی گرفتاری

۴۔ شوال ۱۰۶۸ھ کو جب مراد بخش کی گرفتاری کا خاکہ بنالیا۔ اور کیمپ کو لوٹا۔ تو اس کا ملازم خاص جو اورنگ زیب کا سکھایا ہوا تھا گھوڑا دوڑا کر سامنے پہنچا۔ اور عرض کی۔

"اورنگ زیب کے پیٹ میں یکایک سخت درد پیدا ہوگیا ہے۔
اور وہ بستر پر پڑا لوٹ رہا ہے۔ اور محبت کی وجہ سے
بار بار آپ کو یاد کرتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو
بہت جلد اُس کے پاس تشریف لیجانا چاہئے۔"

ناعاقبت اندیش مراد اتنا نہ سمجھ سکا۔ کہ کل جس کو میں ضیافت کے بہانے بلوا کر ٹھکانے لگا رہا تھا۔ اُس کے سامنے کچھ بچاؤ کا سامان کرکے جانا چاہئے۔ بغیر وسوسہ اور دغا کے چند خدمتگاروں اور خاص لوگوں کے گھوڑا دوڑاتے عالمگیری لشکر میں جا پہنچا۔ اورنگ زیب کے چالاک ملازم جو منصوبے سے آگاہ تھے۔ نہایت اچھی طرح استقبال کرکے اُسے خیمہ خاص میں جس کی ڈیوڑھی خیموں کے اندر تھی لے آئے اور اورنگ زیب نہایت ہی اشتیاق اور تعظیم و احترام سے پیش آیا۔

[1] امیرالامراء علی مردان خاں کا فرزند۔

علاوہ بریں ہوشیار اور خبردار رہنے کے لئے میر جملہ اُمراء اور سرداروں کو بہت تاکیدیں کرتا پھرا۔ اور بعد نماز عشاء اورنگ زیب اپنے مختصر سے خیمہ گاہ میں جو میدان جنگ ہی میں لگا دیا گیا تھا۔ جا کر سو رہا۔

(خلاصۃ التواریخ از سبحان رائے بٹالوی)

آدھی رات کے وقت راجہ جسونت سنگھ نے جو میمنہ کا سردار تھا، محمد شجاع کے پاس خبر بھیجی۔ کہ میں عالمگیر کے ساتھ غداری کر کے فرار ہو رہا ہوں۔ آپ اس موقعہ سے فائدہ اٹھائیں۔ اور خود اپنے تمام ہمراہی راجپوتوں کو ہمراہ لیکر لشکر عالمگیر کے کارخانہ جات کو لوٹتا اور لوگوں کو قتل کرتا ہوا چلا گیا۔ اس سے تمام لشکر میں ایک عجیب پریشانی اور ابتری پیدا ہوئی۔ اور بہت سے لوگ رات ہی کو شجاع سے جا ملے۔

(برنی ار)

مگر ابھی کچھ رات باقی تھی۔ کہ اورنگ زیب اس حال کی خبر پا کر تخت رواں پر سوار ہو کر کمال استقلال سے اپنے خیمہ کے باہر آن کھڑا ہوا اور ہنس ہنس کر اپنے رفیقوں اور امیروں کو اس طرح تسلی دیتا رہا۔ کہ

"خوب ہوا۔ کہ ہمارا لشکر منافقوں کے خس و خاشاک سے پاک ہو گیا"

اور اگرچہ اس ناگہانی فساد کے سبب سے نصف فوج رہ گئی تھی۔ مگر بڑے استقلال سے باقی ماندہ سپاہ کو از سر نو جا بجا جنگی ترتیب سے پھر مامور کیا اور اس غرض سے کہ فوج اس کو اور یہ فوج کو دیکھتا رہے معمول کے مطابق صبح کو ایک بڑے ہاتھی پر سوار ہو کر اور شہزادہ محمد اعظم کو ساتھ بٹھا کر لڑائی کے لئے نکلا۔ دونوں لشکر بُری طرح سے آپس میں لپٹ گئے۔ اور شجاع کے لشکر نے اس کی فوج کے میسرہ کو شکست دے کر ہٹا دیا جس سے بڑی پریشانی ہوئی۔ اور بہت سے سپاہی دشمنوں سے جا ملے۔ بعد ازاں انہوں نے فوج کے قلب کو جہاں یہ خود موجود تھا۔ خوب دبایا۔

(برنی ار)

اتفاقاً ایک تیر اورنگ زیب کے مہاوت کو ایسا آ کر لگا۔ کہ وہ گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اورنگ زیب نے ہاتھی کے سنبھالنے کی ہزار کوشش کی مگر وہ قابو میں نہ آ سکا۔ جس پر اُس نے گھبرا کر نیچے اترنا چاہا۔ مگر میر جملہ نے جو نزدیک تھا۔ اور جس کی جرأت اور بہادریوں کو دیکھ کر سب اہل فوج دنگ ہو رہے تھے پکار کر کہا۔ کہ

(تاریخ مغلیہ)

"آپ اپنے تخت سے اتر رہے ہیں"

اورنگ زیب حقیقت کو بھانپ گیا۔ اور "سمعنا" کو پہنچ کر ہاتھی سے اترا

بلکہ اس کے پاؤں میں زنجیر ڈلوا دی۔ اس طرح وہ سلاح بند اور آراستہ سب ہتھیاروں سے دشمن کی برچھیوں اور تیروں کے سامنے ڈٹا رہا۔ سپاہ کو اپنے سردار کی اس شجاعت سے دلیری ہوئی اور جوش سے اور جانفشانی سے حملہ کر کے دشمنوں کو بھگا دیا۔

(برنی ار)

چونکہ اورنگ زیب کو جسونت سنگھ کی کرتوتوں کا بڑا کھٹکا تھا۔ اور خیال تھا۔ کہ آگرہ سے شورش کی کوئی جلد خبر آئیگی۔ اس لئے شجاع کے تعاقب میں میر جملہ اور محمد سلطان کو بھیجکر خود دار السلطنت کو روانہ ہوا۔ اس اثنا میں اطلاع ملی۔ کہ

دارا شکوہ پھر میدان جنگ میں

دارا شکوہ نے گجرات میں پہنچکر بڑی بھاری سپاہ تیار کر لی ہے۔ اور جسونت سنگھ نے بھی اُسے امداد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس پر راجہ جے سنگھ نے جو عالمگیری لشکر کا سپہ سالار تھا۔ ایک طویل مکتوب راجہ کو ارسال کیا۔ کہ

"تم نے اس میں ایسا کیا فائدہ سوچا ہے۔ کہ دو دو بیٹے کے ساتھی بنتے ہو اور اگر تم اس بات پر قائم رہو گے تو اس کا کچھ فائدہ ہوتا تو معلوم۔ ہاں تمہارا خاندان اور تم بیشک برباد ہو جاؤ گے۔ اور اورنگ زیب تم کو کبھی معاف نہ کریگا۔ اور چونکہ میں بھی راجہ ہوں۔ اس لئے بمنت التماس کرتا ہوں۔ کہ بیچارے راجپوتوں کا خون کرانے سے باز آئیے۔ اور اس گھمنڈ میں نہ رہئے۔ کہ اور راجہ بھی تمہارے شریک ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ میں کبھی تم کو نہ ہونے دونگا۔ اور چونکہ یہ ایک ایسا امر ہے۔ جو ہر ایک ہندو شخص سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے آپ کو ایسی آگ بھڑکانے کی کیسے اجازت دی جا سکتی ہے۔ جو تمام ملک میں پھیل جائے۔ اور پھر کوئی بھی اس کو بجھا نہ سکے۔ اور اگر تم دارا شکوہ کو بحال خود چھوڑ دو گے تو اورنگ زیب آپ کی پچھلی خطائیں سب معاف کر دیگا۔ اور اس شاہی خزانہ کا بھی مطالبہ نہ کریگا جو آپ نے کھجوہ کی لڑائی میں لوٹ لیا تھا۔ بلکہ فوراً گجرات کی صوبہ داری پر سرفراز کئے جاؤ گے۔ اور ایسے صوبے کی حکومت میں جو آپ کے علاقے سے متصل ہے جو فوائد ہیں وہ آپ

سمجھ لیا کرتے ہیں۔ اور وہاں آپ بغیر کسی طرح کے خوف و
خطر کے نہایت آرام سے رہیں گے۔ اور ان وعدوں کا
کامل طور سے پورا کرانا میرے ذمہ ہے۔"
اس خط کا یہ اثر ہوا۔ کہ

(عالمگیر نامہ)

اگرچہ جسونت سنگھ دارا شکوہ کی امداد کے لئے سوار ہو آیا تھا۔ مگر راستہ ہی سے لوٹ گیا۔ بدقسمت شہزادہ احمد آباد سے بائیس ہزار سوار اور ایک توپخانہ کے ساتھ اجمیر کے عزم سے روانہ ہوا۔ اور اُسے یقین تھا کہ راجہ جسونت سنگھ بھی جب سمدر کے راستہ میں آملیگا۔ مگر جب اجمیر پہنچا تو معلوم ہوا کہ راجہ کہاں۔ اورنگ زیب اپنی تمام فوج و لشکر کے ساتھ اس کے سامنے آن موجود ہوا۔

دارا شکوہ کا توپخانہ اچھی جگہ قائم تھا۔ اور اجمیر کے قریب جو چار کی گھاٹیوں کو اچھی طرح روک کر اُس نے مورچہ بندی کی تھی۔ اس لئے دُور اندیش اور تجربہ کار اورنگ زیب کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ اس پر حملہ کرے۔ اسی طرح وہ تین دن گذر گئے۔ اور صرف توپ اور بندوق سے دُور دُور کی لڑائی ہوتی رہی۔ آخر اورنگ زیب نے مجبور ہو کر ان کو غیرتیں بھی دلائیں۔ اور ڈرایا دھمکایا بھی۔ اور انعام و اکرام کے وعدے بھی کئے۔ مگر پھر بھی حالت بدستور رہی۔ اتفاق سے راجہ راج روپ کے کوہستانی سپاہی کوکلہ پہاڑی کے پیچھے کی طرف ایک ایسی جگہ دیکھ آئے۔ کہ جہاں سے پیادے سپاہی چڑھ کر مخالف کے مورچے پر حملہ کر سکتے تھے۔ راجہ نے اورنگ زیب کو اس حال کی اطلاع کر کے چپکے اپنے سپاہی اس پہاڑی کو روانہ کئے۔ اور خود بھی اپنی باقی ماندہ فوج لے کر ان کی مدد اور نگہبانی کے طور پر مخالف کے مورچوں کی طرف چلا گیا۔ چونکہ اتفاقاً اس وقت اورنگ زیب کے توپ خانہ سے توپیں چلنی بند ہو گئی تھیں۔ اس باعث سے دارا شکوہ کی فوج میں سے کوئی ایک ہزار سوار دلیری کر کے راجہ راج روپ پر حملہ کرنے کو مورچوں سے باہر نکل آئے۔ اس پر اورنگ زیب کے مسلمان سپاہیوں میں سے اول دلیر خاں اور پھر شیخ میر نے اپنی فوجیں ساتھ لیکر ایسے زور سے حملے کئے۔ کہ ان کے مورچوں تک جا پہنچے اور اس طرح ایک اچھی لڑائی ہو پڑی جس میں شیخ میر جو ہاتھی پر سوار اپنی سپاہ کو لڑا رہا تھا بندوق کی گولی سے مارا گیا۔ مگر اس کا ایک ہم قوم سید جو پیچھے بیٹھا ہوا تھا اس نے ہوشیاری سے اُس کی لاش کو ایسے طریقے سے تھامے رکھا جس سے دشمنوں کو بلکہ خود اس کی سپاہ کو لڑائی کے خاتمے تک اس کا مرجانا معلوم نہ ہوا۔ اور دلیر خاں تو جرأت کر کے دارا شکوہ کے مورچوں ہی میں جا گھسا۔ اور اس نے ایک نامور سردار کو خاص اپنے تیر سے ہلاک کیا۔ اور خود بھی زخمی ہوا۔ اور ان حملوں میں اس طرف سے شاہنواز خاں اور کئی نامی سردار بھی مارے گئے۔ اتنے میں راجہ روپ کے کوہستانی پیدلوں نے کوکلہ پہاڑی پر اپنا نشان جا گاڑا۔ اور راجہ جے سنگھ بھی اپنی فوج لیکر ان سب سرداروں کی مدد کو جا پہنچا۔ دارا شکوہ کی سپاہ راجہ روپ اور دلیر خاں کی جرأت اور دلیری سے پہلے ہی ہمت ہار چکی تھی۔ اور خود دارا شکوہ کا تو یہ حال تھا۔ کہ اس نے مایوسی کے مارے اپنی بیگمات کو پہلے ہی ہاتھیوں پر سوار کرا کے اور ضروری مال و اسباب اور روپیہ اشرفی اونٹوں اور خچروں پر لدوا کر "آنا ساگر" تالاب کے کنارے میدانِ جنگ سے کچھ فاصلے پر کھڑا کر رکھا تھا۔

(اُمرائے ہنود)

اس بیم و رجا کی حالت میں راجہ جے سنگھ دارا شکوہ کے اتنے قریب پہنچ گیا۔ کہ اگر وہ چاہتا تو اُسے گرفتار کر سکتا تھا۔ مگر اس نامور اور عالی ہمت راجہ نے اس کا بہت ادب کیا اور کہلا بھیجا۔ کہ اگر گرفتاری سے بچنا منظور ہے۔ تو فوراً میدانِ جنگ سے الگ ہو جائیے۔" شاہزادے نے راجہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور وہ علانیہ اس قدر سراسیمہ ہو کر بھاگا۔ کہ اپنی بیگموں کو ساتھ لینا تو درکنار ان کو اپنے بھاگنے کی خبر بھی نہ کر سکا۔ اور جن کو ان کا معتمد خواجہ سرا یہاں سے لیجا کر دوسرے دن بمشکل شامل ہو سکا۔ اور سوائے فیروز مغل میواتی کے اور کسی رفیق نے اُس کا ساتھ نہ دیا۔ یہاں تک کہ جو راجپوت اُس کے مال و دولت سے لدے ہوئے اونٹوں اور خچروں کے محافظ تھے۔ اور جن پر اُس کو وفاداری کا بہت بڑا بھروسہ تھا۔ وہی اُن کو ہانک کر اپنے گھروں میں لے گئے۔

اورنگ زیب کی تخت نشینی

دارا شکوہ کو شکست فاش دے کر اورنگ زیب نے دہلی کا رُخ کیا۔ اور ۲۴ ر رمضان ۱۰۶۹ھ کو لال قلعہ میں جو ہنوز اب تک یہ داخل نہیں ہوا تھا۔ ہندؤں اور مسلمانوں کے مجوزہ "مہورت" کے مطابق جبکہ شمسی حساب سے اس کو اکتالیسواں برس تھا معمولی تکلفات کے ساتھ تاجپوشی کی رسم عمل میں لائی گئی اور اورنگ زیب نے اپنا لقب حسب ذیل قرار دیا:-

"ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگزیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی"

اور بے ادبی کے خیال سے سکّہ میں کلمہ طیبہ اور خلفائے اربعہ کے نام کی جگہ موضوع اور چاندی کی مناسبت سے باختلاف لفظ "مہر و بدر" یہ بیت تجویز ہوئی ؎

سکہ زد در جہاں چوں مہر منیر — شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اور مشہور ہے کہ جب خطیب دستور کے مطابق اس کے بزرگوں میں کو "جنت آشیاں" اور کسی کو "خلد مکانی" وغیرہ وغیرہ گننے لگا اور جہانگیر کے نام پر پہنچا۔ تو اورنگ زیب نے فراست سے معلوم کیا۔ کہ اس امر میں حیران ہے کہ جیتے جاگتے شاہ جہاں کا کیا کہہ کر نام لے۔ فوراً اسکی طرف مخاطب ہو کر قیدی باپ کے لئے یہ حسب حال اور لطیف لقب تجویز کر دیا۔ اور کہا کہ خطیب! بگو۔

"تارکِ تاج و دیہیم ثانی سلطان ابراہیم شہاب الدین
محمد شاہ جہاں بادشاہ غازی صاحبقران ثانی"

دارا شکوہ کی گرفتاری

بیچارہ دارا شکوہ راجپوتانہ کے ریگستان کی مسافت کو ہزار دقت و خرابی سے طے کرتا ہوا احمد آباد پہنچا۔ مگر قلعدار نے داخل نہ ہونے دیا۔ وہاں سے مایوس ہو کر قندھار کا عزم کیا۔ لیکن بدقسمتی سے ملک جیون نامی ایک افغان کے پھندے میں جا پھنسا۔ جسے شاہجہاں نے ایک دفعہ ہاتھی سے کچلوانے کی سزا دی تھی۔ مگر اس نے سفارش کر کے جان بخشی کرائی تھی۔ اس نے یہ نمک حرامی کی۔ کہ دنیاوی لالچ کی خاطر اپنے اس محسن کو فوراً گرفتار کر لیا۔ اور اہل و عیال سمیت لیکر دہلی پہنچا۔

(عمل صالح)

جب یہ بدنصیب قافلہ دہلی کے قریب پہنچا۔ تو اراکین سلطنت کے فیصلہ پر اس کی تشہیر کو ضروری سمجھا گیا۔ تاکہ اس کے مخفی جانبداروں کو اس کی گرفتاری کے بارہ میں شک و شبہ نہ رہے۔ چنانچہ نیلا لباس پہنا کر دارا شکوہ اور اس کے بیٹے سپہر شکوہ دونوں کو ایک ہی ہاتھی پر سوار کر کے تمام شہر میں تشہیر کیا گیا۔ مگر یہ وہ سراندیپ یا پیگو کا ہاتھی نہ تھا جس پہ دارا شکوہ ایک نہایت عمدہ اور زرق برق عماری میں سواری کیا کرتا تھا۔ اور زریں جھول اور سونے کا ساز پڑا ہوتا تھا۔ بلکہ ایک نہایت ہی سڑیل اور میلا کچیلا جانور تھا۔ اور خود اس کے گلے میں بھی اب نہ وہ بڑے بڑے موتیوں کی مالا تھی۔ جو ہندوستان کے بادشاہ اور شہزادے پہنا کرتے تھے۔ اور نہ وہ مکلف اور عمدہ پگڑی اور قبائے زربفت تھی۔ بلکہ باپ بیٹا دونوں میلے اور موٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اور ایک کشمیری اونی کپڑے کا بہت حقیر سا عمامہ جو ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے پہننے میں آتا ہے۔

(قصص ہند حصہ دوم)

دارا شکوہ دم بخود بیٹھا خدا کی قدرت دیکھتا تھا کہ یہ کون سا شاہجہان آباد ہے۔ اور آج اس میں میرا کیا حال ہے۔ شہر کے لوگ بازاروں میں کھڑے زار زار روتے تھے۔ اور دم نہ مار سکتے تھے۔ چنانچہ تمام شہر میں پھرایا گیا اور پرانی دلی میں لیجا کر قید کر دیا۔

دوسرے دن بختیار خاں بدبخت (ملک جیون) بھی اپنی حسن خدمت کے انعام کے لئے دربار میں داخل ہوا۔ جونہی شہر میں قدم رکھا ہزاروں آدمی کو ٹھوں اور دوکانوں پر کھڑے ہو گئے۔ ہر طرف سے لعنت پھٹکار کا غل ہوا۔ جوتیاں۔ ٹھیکرے۔ خاک۔ مٹی۔ جو کچھ جس کے ہاتھ میں آیا۔ برسانے لگے۔ اور اس قدر پل کر گرے کہ اس کے کئی ہمراہی پامال ہو گئے۔ بلکہ اگر کوتوال نہ آ پہنچتا تو لوگ بدبخت خاں کی بوٹیاں اڑا ڈالتے۔

دارا شکوہ نے اس عالم میں ایک رقعہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا کہ

"برادر من۔ بادشاہ من سلامت۔ سلطنت تمہیں اور تمہارے بچوں کو مبارک ہو۔ مجھے اب کچھ ہوس نہیں ہے فقط ایک گوشہ عافیت اور ایک لونڈی خدمتگار چاہتا ہوں۔ کہ لقمہ کھا کر پانی کا گھونٹ پیوں۔ اور تمہارے لئے دعا کرتا رہوں۔ والدعا"

(سیر المتاخرین)

دارا شکوہ ایک ملحد اور زندیق شخص تھا۔ اورنگ زیب نے علماء سے فتویٰ طلب کیا۔ انہوں نے اسے واجب القتل قرار دیا۔

دارا شکوہ کے الحاد کی تاریخی شہادتیں

برنی ار سے زیادہ کون شخص دارا شکوہ کا دوست ہو سکتا ہے اس نے سخت مصیبت کی حالت میں دارا شکوہ کا ساتھ دیا تھا۔ تاہم وہ اس کی ذاتی خوبیاں گنا کر لکھتا ہے۔ کہ

"اوقاتِ تخلیہ میں ہندوؤں کے ساتھ ہندو اور عیسائیوں میں عیسائی تھا۔ چنانچہ پنڈتوں اور ہندو سادھوؤں کو ہمیشہ اپنی صحبت میں رکھتا تھا اور ان کے لئے بڑے بڑے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ ان حالات سے یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ ان لوگوں ہی کی صحبت سے اس کے

حمیت اسلام سے بوئے ضعف آنے لگی تھی۔"

(بر نیر جلد اول صفحہ ۱۲)

(مؤلف عالمگیر نامہ کا بیان)

ہموارہ با برہمناں و جوگیاں و سنیاسیاں صحبت میداشت و آن گروہ را مرشدِ کامل و عارف کامل تحقیق کمال میدانست و مصحف قدیم می خواند و از کمال اعتقادے کہ بہ بید میداشت برہمناں و سنیاسیاں را از اطراف آں بہ سعی تمام طلب و رعایت ہائے عظیم جمع آوردہ در صدد ترجمۂ آں شدہ و ہموارہ او قاتش مصروفِ ایں شغل و تفکر و تفہیم مضامین آں کتاب می شد و بجائے اسمائے حسنا الٰہی اسمائے ہندی کہ ہنود آنرا "پربھو" می نامند و اسمِ اعظم می دانند بخط ہندی بر نگینہائے جواہر کرمی پوشید منقش کردہ باں تبرک می جست۔

(عاقل خاں کی گواہی)

چوں معتقد آں بود۔ کہ تکلیف عبادات برائے ناقصان ہست و عارف کامل را عبادت در کار نیست کما یکر (؟) واعبد ربک حتی یأتیک الیقین را بشرب ملاحدہ گرفتہ دلیل ایں معنی می ساخت بنا بریں عقیدۂ فاسدہ نماز و روزہ و سائر تکالیف شرعیہ را خیر باد گفتہ بود۔

بنا بریں حضرات علماء نے فیصلہ کیا۔ کہ اس طرح کے ملحد کا خون جس نے اپنے تحریر کردہ رسائل میں کفر اور اسلام کو برادر توام کہا ہو، اور لکھا ہو کہ

کفر و اسلام در رہش پویاں وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں

نیز جو احیاں الٰہیہ کی بے وقری کرتا ہو۔ اُس کا قتل روا ہے۔ اس کے بعد بادشاہ نے ارا کین سلطنت کی مجلس طلب کی۔ اور یہ معاملہ ملکی کونسل میں پیش کیا گیا۔ اور (برنی ار) اس امر میں مشورہ ہوا۔ کہ پہلی تجویز کے مطابق گوالیار بھیجنا چاہئے یا فوراً قتل کر ڈالنا بہتر ہے۔ بعض کی رائے تو یہی تھی۔ کہ قتل کی ایسی کوئی قوی ضرورت نہیں۔ اور گوالیار بھیجنے میں بشرطیکہ حفاظت کے لئے کافی جمعیت ساتھ ہو۔ کوئی اندیشہ نہیں۔ مگر کثرت رائے اس پر آن کر ٹھیری کہ اس کو قتل کیا جائے۔ القصہ اس ناشائستہ اور نہایت بے رحمانہ قتل کے لئے نذیر بیگ نامی چیلہ کو جو شاہجہان کا پروردہ اور کسی بدسلوکی کے باعث دارا سے

رنجیدہ تھا۔ مقرر ہوا۔ (قصص ہند) دونوں باپ بیٹے پرانی دلی کے ایک ویران میں گھر میں بیٹھے مسور کی دال پکا رہے تھے۔ بلکہ اس عالم میں زہر کے خوف سے اکثر وہی کھایا کرتے تھے۔ کہ یکایک یہ اور چار بدذاتوں کو ساتھ لئے ہوئے آپہنچا۔ (قصص ہند) گوسفندوں نے اپنے قصائیوں کو سامنے آتے ہی پہچان لیا لیکن تیموری لہو نے اس وقت بھی بیکسی سے خاک میں ملنا گوارا نہ کیا۔ (برنی ار) دارا شکوہ نے سپہر شکوہ کو پکار کر کہا۔ کہ لو بیٹا ہمارے قاتل آپہنچے۔ (قصص ہند) ایک چھوٹی سی چھری بادر چیخانے میں پڑی تھی۔ سو وہی اُٹھا لی۔ (برنی ار) کیونکہ کوئی ہتھیار پاس نہ تھا۔ نگران جلادوں میں سے ایک نے تو سپہر شکوہ کو قابو میں کر لیا۔ اور باقی اس کو لپٹ گئے اور زمین پر گرا کر تین نے تو پکڑے رکھا۔ اور نذیر بیگ چیلہ نے سر کاٹ لیا۔ اور فوراً اورنگ زیب کے پاس لے آیا۔ اور اس نے ایک طشت میں رکھوا کر چہرہ کا خون دُھلوایا۔ اور جب دیکھ لیا۔ کہ حقیقت میں اُسی کا سر ہے۔ تو آنکھوں سے آنسو نکال کر بولا "اے بدبخت" اور پھر کہا۔ کہ اچھا اس دردانگیز صورت کو میرے سامنے سے جلد لیجا کر ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کر دو۔ (مراۃ المتقدمین) چنانچہ شہود شر کہ اس خاموش فتنہ کو حضرت جنت آشیانی ہمایوں بادشاہ کے مقبرہ میں لیجا کر تہ خانہ کے اندر جو حضرت کے مرقد کے گنبد کے نیچے ہے شاہزادہ دانیال و مراد پسران اکبر بادشاہ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اسکی بیٹی تو اسی رات محل میں بھیجدی گئی۔ جو کچھ دنوں بعد شاہجہاں اور بیگم صاحبہ کی التجا سے اُن کے سپرد کر دی گئی۔ اور سپہر شکوہ کو گوالیار کے قلعہ میں بھیجدیا گیا۔

سلیمان شکوہ کی گرفتاری

جمادی الاول ۱۰۷۰ھ میں راجہ جے سنگھ کے فرزند کنور رام سنگھ کی کوشش سے سلطان سلیمان شکوہ بھی سرینگر سے گرفتار ہو کر دہلی میں لایا گیا۔ دربار میں لانے سے پہلے شہزادے کے پاؤں سے بیڑیاں نکال لی گئیں۔ لیکن سنہری ہتھکڑی بدستور موجود رہی۔ اور اس حالت میں اس عریاں نصیب شہزادے کو لایا گیا۔ اہل دربار اس انقلاب کو دیکھ کر بے اختیار آبدیدہ ہو گئے۔ اور بیگمات بھی جنہیں اس عزیز مجرم کے دیکھ لینے کی اجازت دیدی گئی تھی، بے حد مغموم ہوئیں۔ اور حسن و شجاعت کے اس معصوم پیکر کو دیکھ کر رو پڑیں خود شہنشاہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اور پیار و شفقت سے فرمایا۔

"خدا پر نظر رکھو۔ اور مطمئن رہو۔ کہ تم کو کچھ ضرر نہ پہنچے گا۔ اور مہربانی کی جائیگی۔ اور تمہارا باپ تو صرف اس وجہ سے قتل ہوا ہے۔ کہ وہ کافر اور لا مذہب ہو گیا تھا۔"

یہ سن کر شاہزادہ آداب شکر کے لئے مراسم دربار کے مطابق جھک گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو سر تک لے آیا۔ اور اس کے بعد کمال متانت سے عرض کی۔ کہ

"اگر حضور والا کا یہ منشا ہو۔ کہ مجھے پوست[1] پلائے جایا کریں تو اس سے بہتر یہی ہے۔ کہ مجھے ابھی سے قتل کر دیا جائے۔"

جس کے جواب میں بادشاہ نے پکار کر یقین دلایا۔ کہ

"تم خاطر جمع رکھو۔ تمہیں پوست ہرگز نہیں پلائے جائینگے۔"

اس موقعہ پر امرائے دربار کے کہنے سے شہزادے نے جھک کر دوبارہ تسلیمات کی۔ اس کے بعد اسے ایوان عام سے لے گئے۔ اور دوسرے دن گوالیار کو بھیجدیا گیا۔

مُراد بخش کا قتل

(عالمگیر نامہ۔ برنیئر۔ عاقل خاں)

انہی دنوں میں علی نقی مقتول دیوان بادشاہی متعینہ گجرات کے بیٹے والد کے قصاص کے لئے دربار میں آکر داد خواہ ہوئے۔ اور پکار پکار کر دہائی دینے لگے۔ اور انہوں نے قصاص میں مُراد بخش کے سر کا مطالبہ کیا۔ بادشاہ نے خواجہ بہلول کے ہمراہ ان کو گوالیار بھیجکر حکم فرمایا کہ ثبوت شرعی کے بعد مُراد بخش سے قصاص لیا جائے۔ چنانچہ مدعیوں نے گوالیار پہنچ کر مقدمہ کی پیروی کی۔ شہزادہ نے جواب میں کہا۔ کہ

اگر حضرت خلافت مرتبت پاسِ عہود و وفائے موعود درنظر داشتہ از خونِ ایں مرادی گذشتند نقصانے بدولت و سلطنت نداشت۔ اگر خواہ نخواہ توجہ اشرف مصروف بریں است۔ کہ وجود بے بود ایں ضعیف درمیان نباشد۔ مواجہ بایں قسم مردم کم مایہ چہ لطف دارد۔ ہر چہ می خواہند بکنند۔

اُس وقت قاضی کے اشارہ سے ۲۱ ربیع الثانی ۱۰۷۲ھ بروز بدھ دو نفر چیلوں نے تلوار کی دو ضربات سے اس رفیع الشان شہزادے کو شہید کر دیا۔ اور اس کی لاش کو گوالیار کے قلعہ میں دفن کر دیا گیا۔

شجاع کا انجام

میر جملہ نے پیا پے حملے کر کے جب شجاع پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ تو اس غریب نے اراکان کے راجہ سے خط و کتابت کی۔ اور راج محل پہنچ کر کشتیوں کے ذریعے سے اراکان کو روانہ ہوا۔ راجہ نے پہلے تو سلطان کی بڑی خاطر تواضع کی مگر چند دنوں بعد راجہ بگڑ بیٹھا۔ اور سلطان خائف ہو کر اپنے بال بچوں سمیت پیگو کے غار دار جنگل میں گھس گیا۔ لیکن دو تین دن کی دشت نوردی کے بعد راجہ کے جنگلی آدمیوں کے ہاتھوں سخت زخمی ہوا۔ اس کے آگے سلطان کے بارہ میں تاریخیں خاموش ہیں۔ اور کوئی ایسی مستند روایت نہیں ملتی جس پر اعتماد کیا جاسکے۔ الغرض عدم پتہ ہو گیا۔

(برنیئر)

گمان اغلب یہ ہے۔ کہ یہ تو جنگل کے چوروں اور رہزنوں نے مار ڈالا ہوگا۔ یا پھر اس جنگل کے ہاتھی، شیر اور چیتوں نے چیر پھاڑ ڈالا ہوگا۔ سلطان کے اہل و عیال سے جو سلوک اس وحشی راجہ نے کیا۔ وہ اس قدر دردناک ہے۔ کہ پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور خدا کی بے نیازی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھچ جاتا ہے۔

شاہجہاں کے آخری ایام

اگرچہ اورنگ زیب نے شاہجہاں کو قلعہ آگرہ میں بڑی احتیاط کے ساتھ قید کیا ہوا تھا۔ اور کسی ایسی بات میں مطلقاً غفلت نہ کی جاتی تھی جس سے اُس کے نکل بھاگنے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اور سب طرح پر ادب اور ملائمت سے سلوک کیا جاتا تھا۔ اور ان شاہی محلوں میں رہنے سہنے کی بھی اجازت دیدی گئی تھی۔ جن میں وہ پہلے رہا کرتا تھا۔ اور اس کی بیٹی جہاں آرا بیگم سے ملنے کی بھی اجازت تھی۔

محل کی کل متعلقہ عورتیں مثلاً عملہ باورچی خانہ اور ناچنے گانے والیاں وغیرہ سب حاضر رہتی تھیں۔ اور ایسے معاملات میں ان کی (شاہجہاں بادشاہ) کی کوئی فرمائش رد نہیں کی جاتی تھی۔

بعض علماء کو بھی اس کے پاس جاکر تلاوت قرآن مجید کی اجازت تھی۔ خاصے گھوڑوں، باز چرے وغیرہ شکاری جانوروں کے منگا لینے اور ہرنوں، مینڈھوں وغیرہ کی لڑائی کا تماشہ دیکھنے کی بھی اجازت تھی۔ اورنگ زیب کا برتاؤ شاہجہاں کے ساتھ مہربانی اور ادب کامل تھا۔

---

[1] پوست پینے سے قوت زائل ہو جاتی تھی۔ اور اعصاب ناکارہ ہو جاتے تھے اور آدمی کسی کام کا نہ رہتا تھا۔

وہ ہر شخص سے جو اسے ملتا ہر طرح سے خاطرداری کرتا اور نہایت لطف سے پیش آتا اور شفقت سے پیش آتا رہتا تھا۔ سلطنت کے بڑے بڑے معاملات میں ان کی صلاح اور مشورہ کو ایک پیر و مرشد کی ہدایت کے طور پر مانا کرتا تھا۔ اس کے عوض سے جو وہ لکھتا رہتا تھا۔ ادب اور اطاعت کا برتاؤ ظاہر ہوتی تھی۔ اس طرح شاہجہاں بادشاہ کا غصہ اور غضب آخر کار یہاں تک ٹھنڈا پڑ گیا۔ کہ معاملات سلطنت میں بیٹے کو لکھنے پڑھنے لگ گیا۔ اور دارا شکوہ کی بیٹی کو اس کے پاس بھیج دیا۔ نیز وہ بیش بہا جواہرات جن کے دینے سے پہلے انکار کر کے کہہ دیا تھا کہ اگر پھر مطالبہ ہوا۔ تو کوٹ کر چورا کر ڈالونگا ان میں سے بعض جواہر اورنگ زیب کے پاس از خود بھیج دیئے۔ اور اپنے باغی فرزند کی سب گستاخانہ حرکتیں معاف کر کے اس کے حق میں دعائے خیر بھی کر دی۔

(عالمگیرنامہ)

شاہجہاں کا دمِ واپسیں

۱۲ رجب ۱۰۷۶ھ کو شاہجہاں بادشاہ حبس بول کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا۔ حکیم مومنائی شیرازی نے جو اس وقت کے شاہی طبیبوں میں ایک مشہور شخص تھا۔ ہر چند علاج کیا، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ مگر اسہال وغیرہ کئی طرح کے اور عوارض پیدا ہو کر زندگی سے مایوسی ہو گئی۔ جب یہ خبر عالمگیر کو پہنچی۔ تو باپ کی آخری زیارت کو دلی سے آگرہ جانے کا ارادہ کیا۔ مگر چونکہ بادشاہی کوچ و مقام کے لئے دستور سلطنت کے مطابق نہایت بھاری سامان کی ضرورت تھی۔ اس لئے باوجود تاکید اختصار سامان کے بھی چند روز کا توقف ہونا ضروری تھا۔ اسی وجہ سے اپنے بڑے بیٹے محمد معظم کو اپنی روانگی سے پہلے احتیاطاً جلدی سے روانہ کر دیا۔ ابھی شاہزادہ آگرہ سے شاید کوس ادھر ہی تھا۔ کہ شاہجہاں پر حالت نزع طاری ہو گئی اور ۲۶ رجب شب پنجشنبہ کو آدھی رات سے پہلے "دارِ فانی" سے عالم باقی کو انتقال کر گیا۔

بیچاری مصیبت زدہ جہاں آرا بیگم نے جو باپ کے ایام قید میں ایک وہی اس کی غمخوار اور رنج و راحت کی شریک تھی

بعد ازاں ہوشدار خاں قلعدار اور بہلول خواجہ سرا کو جو قیدی بادشاہ اور قلعہ کے محافظ تھے۔ مکان معروف غسلخانہ میں طلب کر کے اور ان کی معرفت اسی وقت قلعہ کے دروازہ کی کھڑکیاں کھلوا کر غسل و کفن کی تیاری کے لئے سید محمد صاحب قنوجی کو جو بڑے عالم اور درویش مسلک تھے۔ معہ مولانا محمد قربان ملقب قاضی القضاۃ آگرہ قلعہ میں بلوا لیا۔ چنانچہ آدھی رات کے وقت جب وہ دونوں حاضر ہو گئے۔ تو قضائے روزہ و نماز کے عوض اگرچہ اس درویش صفت تاجدار سے نماز و روزہ کبھی قضا نہ ہوئے تھے، بہ رسم "اسقاط" اول بہت سا روپیہ خیرات کیا گیا۔ اور بعد ازاں برج مثمن سے کہ جہاں انتقال کیا تھا لاش کو اٹھا کر ایک قریب کے مکان میں غسل و کفن دے کر صندل کے تابوت میں رکھا گیا۔ اور برج مثمن کے نیچے کا دروازہ جو مسدود تھا کھلوا کر اس کے راستے اور فصیل برجی کے اس دروازہ سے جو اس کے محاذی تھا جنازہ کو باہر لائے۔ اور ہوشدار خاں صوبیدار نے دوسرے بادشاہی ملازموں کے ساتھ ہو کر بآئین شائستہ (یعنی مراسم اعزاز و اقتدار شاہانہ کے ساتھ) علی الصباح جمنا کے کنارے جا پہنچایا۔ اور دریا سے پار ہو کر سید محمد قنوجی، قاضی قربان وغیرہ علماء صلحا نے جنازہ کی نماز پڑھ کر اس کی اہلیہ ممتاز الزمانی ارجمند بانو بیگم معروف بہ تاج محل کے مقبرہ میں دفن کر دیا۔

جب اورنگ زیب کو باپ کے انتقال کی خبر پہنچی۔ تو بہت رویا۔ اور سوگواری کی تمام رسموں کے علاوہ اس نے اور تمام اہل دربار نے جیسا کہ اب بھی ہندوستانی ریاستوں میں دستور ہے سفید لباس پہنا اور سواری کشتی دہلی سے آگرہ پہنچ کر زیارت قبر کے وقت بھی بہت سا گریہ و بکا کیا۔ اور مجالس مولود و ختم و فاتحہ جیسا کہ بادشاہوں کی وفات کے موقعہ پر دستور تھا منعقد کر کے دھوم دھام سے خیر و خیرات کی۔ اور اپنی غمزدہ بہن جہاں آرا بیگم کے پاس کئی دفعہ قلعے میں گیا۔ اور نہایت تسلی و تشفی کی بلکہ اس قدر خاطر مدارات کی۔ کہ تمام اہل دربار کو حکم دیا کہ انکی ڈیوڑھی پر حاضر ہو کر نذریں پیش کریں۔ چنانچہ جب ایسا ہی ہوا۔ تو بیگم صاحبہ نے بھی جو دریا دلی اور فیاضی میں مشہور اور بڑی ہی سیر چشم شہزادی تھی۔ تمام اہل دربار کو عموماً ہزاری کے منصب تک بھاری بھاری خلعت مرحمت کئے۔ اور اس کے بعد جب اورنگ زیب پھر ملنے کو گیا تو رسم "پائے انداز" و رسم "نثار" بجا لا کر ایک نہایت قیمتی پیشکش

---

[1] قلعہ اکبرآباد (آگرہ) میں وہ سقاوہ اب تک موجود ہے جس میں شہزادی اپنے بوڑھے باپ کے وضو کے لئے خود پانی گرم کیا کرتی تھی۔

یعنی ایک بڑا سا سونے کا تھال جواہرات سے بھرا ہوا نذر کیا۔ جن میں سے کچھ تو شاہجہاں کے متروکہ تھے۔ اور کچھ اس نے اپنے پاس سے پیشکش کئے۔ وہ مکان جس میں بادشاہ نے قیام فرمانا تھا اُس کو سجایا اور شاہی مسہری میں کمخواب کے تھان لٹکا کر اسے آراستہ کیا۔ غرض غمزدہ بہن بلند اقبال بھائی کے لئے جو کچھ تکلفات کر سکتی تھی بجا لائی۔ اور خوش مند بھائی نے بھی اس دلجوئی اور اشک شوئی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

شہنشاہ اورنگ زیب اور مورخین

(برنی آر)

جن جن ذرائع سے اورنگ زیب نے یہ عروج و اقتدار حاصل کیا یقیناً قارئین ان کو بہت ناپسند کرینگے۔ لیکن شاید یہ بے انصافی ہوگی کہ ہم اُن کو اسی سخت نظر سے جانچیں جس سے اپنے ملک یورپ کے شاہزادوں کے افعال کو جانچتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے ملک میں جانشینی کے لئے معقول قواعد مقرر ہیں، اور بڑے بیٹے کے سوا کوئی جانشین نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہندوستان میں باپ کے بعد شاہزادوں میں سلطنت کیلئے ہمیشہ جھگڑا ہوتا ہے۔ اور ان دو بے رحمانہ باتوں میں سے ایک بات اختیار کرنا پڑتی ہے۔ یا سلطنت کی خاطر قربان ہو جائیں۔ یا بھائیوں کو قربانی بنائیں۔ تاہم ان لوگوں کو بھی جو ملک کے دستور اور رسم خاندان اور تعلیم و تربیت کے اثر کے عذر کو قبول نہیں کرتے یہ تو ماننا ہی پڑیگا۔ کہ اورنگ زیب کو خدا نے مستثنیٰ طور کی عقل و فکر اور انتقالِ ذہن عطا کیا ہے۔ اور یہ کہ وہ بڑا ہی مدبر اور عالیشان بادشاہ ہے۔

[شہنشاہ عالمگیر خلد آشیانی از پنڈت دتستہ پرشاد صاحب قدآبی سے]

اورنگ زیب پکا مسلمان تھا۔ مذہب اسلام کا سچا شیدائی تھا۔ وہ مذہب کو زندگی کا ایک جزوِ اعظم سمجھتا تھا۔ نہ کہ ایک جھوٹی سی ٹٹی جس کی آڑ میں شکار کھیلا جائے۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اس کے علاوہ جتنے شہزادے تخت دہلی کے وارث ہیں۔ وہ اسلام کو ایک ذہنی تصور تو جانتے ہونگے۔ لیکن اُسے زندگی میں ڈھالنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ ادھر وہ سب اس کی خدا پرستی اور اتقا سے ایسے متنفر تھے، جیسے لاحول سے شیطان۔ تاڑنے والی نگاہیں تاڑ گئیں۔ کہ شاہجہاں کے آنکھیں بند کرنے کی دیر ہے یہ اسیرانِ ہوس سازشوں کے ایسے جال

بچھائیں گے۔ کہ سلطنت مغلیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رہیں گے اور طرح طرح کے مفسدات سے بے گناہوں کے خون میں تیموری نام کا نام بدنام کرنے والے شہزادے عیش و عشرت کے ہاتھوں بک کر تیمور و چنگیز کے نام کو بٹہ لگائیں گے۔ غیرت کا دل میں ایک درد سا پیدا ہوا۔ ادھر خدا وندی سے تائید غیبی کے لئے اورنگ زیب آگے ہوا۔ قہر الٰہی صاعقہ بن کر گرا اور ان کے خرمن کو جلا کر ڈھیر کر گیا۔ ظاہر بیں آنکھیں اسی دھوکے میں رہیں۔ کہ اورنگ زیب نے اپنے بھائی قتل کر ڈالے۔

دیکھئے مسلمانوں کی نسبت ہندو کتنے ذرف نگر واقع ہوئے ہیں۔ ارجن نے بھی تو کورو کشیتر کے میدان میں ایک سو چچیرے بھائیوں کو پچھاڑا تھا۔ لیکن کیا مجال جو کوئی ہندو اس پر حرف گیری کر جائے۔ بلکہ سب کے سب یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ کرشن جی نے تو پہلے ہی سے کوروؤں کو نشانۂ اجل بنا رکھا تھا۔ صرف ارجن کے سر پر ظفر مندی کا سہرا باندھنا مقصود تھا۔ جو اس کے ہاتھوں میں شمشیر دی گئی۔ ادھر اورنگ زیب جیسے باکمال شخص کی آڑ اس کے مفسدہ پرداز بھائیوں پر اپنا قہر کرتی تو بجائے اس کے کہ مسلمان بھائی خدا کی حکمت کاملہ کے قائل ہوتے سارا قصور اورنگ زیب کے سر مڑھتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اورنگ زیب تخت نشین نہ ہوتا تو سلطنت مغلیہ کو کبھی زوال نہ آتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر اس کے جانشینوں میں سے دو آدمی بھی اورنگ زیب جیسے خدا پرست متقی اور معاملہ فہم ہوتے تو سلطنت مغلیہ کو غیر متوقع عروج حاصل ہوتا۔

(لین پول)

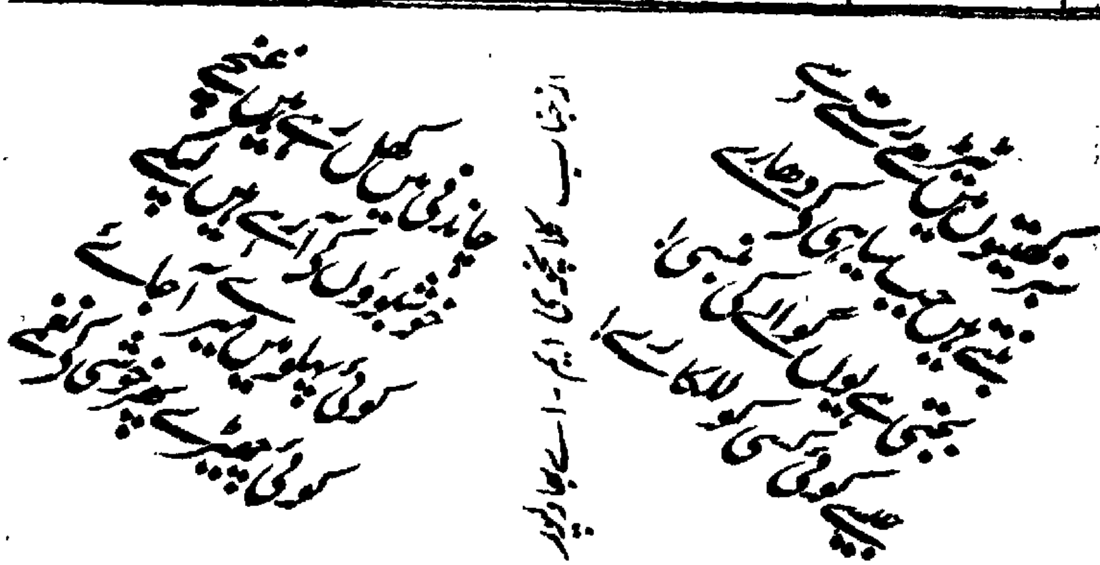
مغلوں کی تاریخ میں یہ سب سے پہلا بادشاہ ہے۔ جو پکا مسلمان تھا۔ جو ممنوعات سے خود پرہیز کرتا تھا اور دوسروں کو جو اس کے گرد تھے باز رکھتا تھا۔ دُنیا کا راستہ اس نے اپنی قوتِ ایمانیہ پر بند کر دیا تھا۔ اُس نے اپنے لئے فرض کا راستہ منتخب کر لیا تھا۔ اور باوجودیکہ وہ قطعی غیر عملی العمل تھا۔ لیکن پھر بھی وہ بڑے استقلال سے اسی پر چلا گیا۔ اگر اورنگ زیب ایک دنیادار شخص ہونے کے قابل ہو سکا ہوتا تو اس کا راستہ بے خلش فرش گل سے ڈھکا ہوتا۔ لیکن اُس کی شان و کمال تو اسی میں ہے۔ کہ اس نے اپنی روح کو مجبور نہیں کیا۔ اور علم

عالمگیر بیٹھ دکھا نہ سکی جرأت نہ کی ہندوستان کا یہ بیدار مغز
پیسالہ کا شخص تھا۔ کہ اس نے تاج شہنشاہیت پہنا (صفحہ ۱۰۱)
(مولانا شبلی نعمانی)

عالمگیر کے الزامات کی تمام روئیداد اب تمہارے سامنے ہے
غور سے پڑھو اور بار بار پڑھو اور ایک ایک واقعہ کو جانچو
اور یہ دیکھو۔ کہ مخالف مؤرخوں نے عالمگیر کے برا ثابت کرنے
کے لئے کس کس طرح واقعات کو بدلا ہے کیا کیا غلط نتائج
قائم کئے ہیں۔ کیسے کیسے پُرفریب طریقوں سے کام لیا ہے۔
عالمگیر کیا اگر یہ کوششیں فرشتوں کے متعلق صرف کی جائیں
تو وہ بھی شیطان مجسم نظر آتا۔

ماخذات

نام کتاب	مُصنف	مختصر حالات مصنف
۱۔ مآثر عالمگیری	مستعد خاں	عہدہ دار حضرت عالمگیر کے حالات۔
۲۔ عالمگیر نامہ	کاظم شیرازی	اس کا مسودہ اورنگ زیب کے ملاحظہ سے گذرا کرتا تھا۔
۳۔ منتخب اللباب	خافی خاں	اورنگ زیب کا معاند عہدہ دار۔ عالمگیر کی وفات کے دس برس بعد لکھی گئی۔
۴۔ واقعات عالمگیری	عاقل خاں	عالمگیر کے زمانہ میں، مگر اس سے چھپا کر لکھی گئی۔
۵۔ سفرنامہ برنیئر	ڈاکٹر برنیئر	عہد عالمگیری کا ایک معاند مؤرخ۔
۶۔ فیاض القوانین	مُلّا فیاض	سلاطین تیموریہ کے خطوط جو مُلّا فیاض نے ۱۱۲۳ھ میں جمع کئے۔
۷۔ عالمگیر	لین پول	انگریز مؤرخ۔
۸۔ خلاصۃ التواریخ	منشی سجان رائے پٹیالوی	عالمگیری عہد کا ہندو عالم۔ اس نے اپنے چشم دید حالات لکھے ہیں جن میں غلطی کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔
۹۔ شہنشاہ عالمگیر خلد آشیاں	پنڈت گستر پرشاد فدائی	عہد جدید کا ایک ہندو فاضل مؤرخ۔
۱۰۔ سیر المتاخرین	غلام حسین خاں طباطبائی	عالمگیر ثانی کے عہد کا ایک معاند مؤرخ۔
۱۱۔ تاریخ ہند	کرنل ڈو صاحب بہادر	ایک انگریز مؤرخ۔
۱۲۔ تاریخ مشہور بیگمات	ملک عنایت اللہ	عہد جدید کا ایک فاضل مقالہ نگار۔



مختصر تاریخ تاریخ گوئی

[illegible] میں اردو زبان کی بنیاد رکھی گئی۔ سلطنت غزنوی کے دارالسلطنت لاہور میں اس بنیاد کو اور بھی مستحکم و مضبوط بنایا گیا۔ لاہور میں مختلف ممالک کے مسلمان عرب، ترک، مغل، ایرانی، افغانی ہندوؤں سے آملے۔ آپس میں حاکم و محکوم کے علاوہ تجارتی، سماجی، دینی، اور اسی طرح کے دوسرے تعلقات قائم ہوئے تو ایک دوسرے کو مطلب سمجھانے کے لئے ایک ایسی زبان استعمال کرنا پڑی جس میں کچھ الفاظ ہندوستان کی زبان یعنی برج بھاشا کے اور کچھ حاکم کی زبان کے ہوں۔ اس طرح یہ الفاظ ملنے جلنے شروع ہوئے جنہوں نے بعد کو ترقی پاکر ایک مستقل زبان کی صورت اختیار کرلی۔ اور دو سو سال کی مدت میں یہ مقبولیت عام پاکر ایک ایسی شستہ اور پاکیزہ زبان بن گئی کہ آج بڑی بڑی قدیم زبانوں کے مقابلہ میں کسی سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہے۔

قاعدہ کی بات ہے کہ جب ایک مکان تیار ہو جاتا ہے تو اس کی آرائش و زیبائش کی جاتی ہے۔ طرح طرح کی چیزوں سے اسے سجایا جاتا ہے تاکہ دیدہ زیب معلوم ہو۔ اسی طرح جب گلشن اردو کے باغبان امیر خسرو، ولی دکنی، سودا دہلوی، میر امن، حیدری، رجب علی بیگ سرور وغیرہ اس گلشن کو تراش خراش کر سجا چکے تو قسم قسم کی اور صنعتیں بھی ایجاد کی گئیں۔ نظم و نثر کے میدان میں اشہب قلم اپنی جولانیاں دکھانے لگے۔ مومن، میر، غالب۔ آسمان شاعری کے وہ درخشاں ستارے ہیں۔ جن کی تابناکی سے ایک عالم کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔

جہاں قسم قسم کے پھول اس بوستان میں کھلے۔ وہاں "فن تاریخ گوئی" کا غنچہ بھی کھلا جس کے چٹکنے کی صدا نے ایک عالم کو محو کر دیا۔ اور جس کی فرحت روح افزا سے تمام کائنات معمور ہو گئی۔ اور جس کی شمیم معطر نے اس باغ کے تمام پھولوں کی خوشبو کو دھیما کر دیا لیکن اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہونا ہر کسی کا کام نہ تھا۔ وہی شخص اس کی خوشبو سے حظ اٹھا سکتا تھا۔ جو اس کے لئے اس باغ میں تگ و دو کرے اور خار محنت کی خلش کو بھی برداشت کرے۔

معلومات افزا مضمون

از جناب خالد حسن قادری ایم اے

اسی لئے یہ فن عام رواج نہ پاسکا لیکن پھر بھی اس میدان میں ایسے ایسے بانکے شہسوار نکلے جنہوں نے اپنے زورِ کمال سے ایک مرتبہ ناقدر دانوں کو بھی مرحبا کہنے پر مجبور کر دیا۔

ابھی تک اس امر کا قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکا کہ اس فن کی ایجاد کا سہرا کس کے سر پر باندھا جائے۔ جستجو کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فن بہت قدیم ہے۔ ہر زمانہ میں اس فن کے ماہر اور قدردان ہر عصر میں موجود رہے ہیں۔

اس فن کی قدامت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انجیل نصرانی میں سے آخری کتاب انجیل یوحنا (ST. JOHNS) میں ایک طلسماتی عدد ۶۶۶ کا ذکر آیا ہے۔ اس کا بہترین حل NERON KESAR. تجویز کیا گیا ہے۔ یہ عبرانی Hebrew زبان کا نام ہے اس کی جگہ ابتدائی Latin زبان کا لفظ Nero Kaesar مروج و مشہور ہے قدیم عبرانی زبان میں حروف علت a اور e تحریر میں نہ آتے تھے اس لئے NERON KESAR کے اعداد اس طرح حاصل ہوتے ہیں۔

N	R	O	N	K	S	R
۵۰ +	۲۰۰ +	۶ +	۵۰ +	۱۰۰ +	۶۰ +	۲۰۰
ن	ر	و	ن	ق	س	ر

ان انگریزی حروف کے مقابلہ میں ابجد کے حروف رکھنے سے یہ فرق نظر آتا ہے کہ K کے مقابلہ میں ق ہے اور یہ کہ K S R کے یا حروف علت شامل کرنے سے (KESAR) ابجد کے حروف مقابل میں قیصر بنتا ہے اور مروج عربی لفظ قیصر ہے۔ بہرحال ان حروف میں سے صرف K کے اعداد کاف کے برابر ہونا عجیب سا معلوم ہوتا ہے اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ Q کے عدد کیا ہوں گے لیکن غالباً وہاں Q اس لفظ میں مستعمل نہ ہوگا یا تمام حروف کے اعداد نہ ہوں گے۔ اینگلو سیکسن زبان یعنی قدیم انگریزی زبان میں Q کا وجود نہ تھا۔ بعد کو رومن زبان سے لیا گیا ہے۔ وہاں اس

کے عدد ۰۰ ۵ ہیں۔

غرض اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ فن اس قدر قدیم ہے۔ کہ ہماری تاریخ اس کے آغاز کا زمانہ متعین نہیں کر سکتی ہو سکتا ہے کہ اس فن کے شائقین اور ہمارے مؤرخ اس کی پیدائش کا زمانہ معلوم کر سکیں لیکن یہ امر کوہ کندن کے برابر ہوگا۔ اگرچہ یہ مثالِ برآوردن کے مصداق نہ ہوگا۔

عربی و فارسی زبان میں اس کے عدد اس طرح مقرر کئے گئے ہیں

ابجد	ہوز	حطی	کلمن	سعفص
ا ب ج د	ہ و ز	ح ط ی	ک ل م ن	س ع ف ص
۱ ۲ ۳ ۴	۵ ۶ ۷	۸ ۹ ۱۰	۲۰ ۳۰ ۴۰ ۵۰	۶۰ ۷۰ ۸۰ ۹۰

قرشت	ثخذ	ضظغ
ق ر ش ت	ث خ ذ	ض ظ غ
۱۰۰ ۲۰۰ ۳۰۰ ۴۰۰	۵۰۰ ۶۰۰ ۷۰۰	۸۰۰ ۹۰۰ ۱۰۰۰

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جو حروف ان میں نہیں آتے ہیں۔ ان کے اعداد کیا ہوں گے؟ تو ان کی مثل جو حروف ان میں آتے ہیں۔ ان کے عدد ان حروف کے برابر شمار کئے جائیں گے مثلاً پ کے عدد ب کے برابر ہوں گے۔ چ کے عدد ج کے برابر ہوں گے ڈ کے عدد د کے برابر ژ کے عدد ز کے برابر گ کے عدد ک کے برابر ہوں گے۔

تاریخ نکالنے کا قاعدہ

اس فن نے اس قدر ترقی کر لی ہے۔ کہ ہزار ہا مادۂ تاریخ اسقدر موزوں اور واقعہ سے مناسبت رکھتے ہوئے موجود ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ کہ ذہنِ انسانی کس طرح اس طرف منتقل ہوا۔ اور واقعی وہ الہام معلوم ہوتے ہیں۔ اس فن کے متعلق متعدد کتابیں بھی تصنیف کی گئی ہیں جن سے تاریخ نکالنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے اس فن میں اردو کی سب سے پہلی جامع کتاب "ام التواریخ" ہے جس کو منشی حسین علی فرحت دہلوی نے ۱۲۸۹ھ ہجری میں شائع کیا تھا اس میں سن ۱ سے لیکر ۲۰۰۰ تک کے ہزار ہا مادے موجود ہیں۔

تاریخ نکالنے کے قاعدے بنا دیئے گئے ہیں۔ جن کو ہم تفصیل سے لکھتے ہیں۔ سب سے پہلا اور ضروری قاعدہ یہ ہے کہ تاریخ نکالنے میں صرف وہ عدد لئے جائیں جو کتابت میں آتے ہوں۔ بہت سے حروف ایسے بھی جو کتابت میں آتے ہیں اور بولنے میں انکو حذف کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے تاریخ میں حروف مکتوبی کا لحاظ رکھا جاتا ہے حروف ملفوظی کا نہیں۔ مثلاً

اٰمنوا۔ واؤ کے بعد جو الف آیا ہے۔ وہ تلفظ میں نہیں آتا لیکن اس کے عدد لئے جائیں گے۔

وَلَاتَقۡتُلُوۡھُمۡ۔ واؤ کے بعد جو الف آیا ہے وہ کتابت میں آتا ہے۔ اور بولنے میں حذف کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کے عدد لئے جائیں گے۔

عمروؔ:۔ ر کے بعد کی واؤ تلفظ میں نہیں آتی لیکن اس کے عدد لئے جائیں گے۔

سمٰوٰت:۔ میم کے بعد جو الف ہے اس کے عدد نہیں لئے جائیں گے کیونکہ وہ کتابت میں نہیں آتا صرف تلفظ میں آتا ہے

اللّٰہ:۔ لام کے بعد الف کے عدد نہیں لئے جائیں گے کیونکہ کتابت میں نہیں آتا۔

گنّا:۔ اس میں نون مشدد ہے۔ دو بار تلفظ میں آتا ہے لیکن کتابت میں صرف ایک ہی الف کے عدد لئے جائیں گے قدیم تاریخ گویوں نے غلطی سے ہمزہ کا ایک عدد لیا ہے۔ حالانکہ ابجد میں ہمزہ کا پتہ بھی نہیں صرف الف ہے۔ اس لئے الف کے عدد لئے جائیں گے جو لوگ آئینہ میں ہمزہ کا عدد دیتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں دو (ی) کے عدد لینے چاہئیں۔

دوسرے تاریخ نکالنے میں اس امر کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ جس واقعہ کی تاریخ نکالنی ہو اس کی طرف اس مادہ میں اشارا موجود ہو یعنی مادہ کے الفاظ اس واقعہ کے لئے بہت مناسب اور موزوں ہونے چاہئیں۔ مثلاً منشی نثار علی شہرت نے منشی محمد عظیم مہتمم پنجابی اخبار لاہور کے لڑکے رشید الدین کی تاریخ وفات نکالی ہے "رشید الدین رفت" یا جناب پروفیسر مولانا قادری صاحب قبلہ نے برلن میں تعمیر مسجد کی تاریخ اذان کے الفاظ سے نکالی ہے

حی علی الصلوٰۃ حی علی الصلوٰۃ حی علی الفلاح حی علی الفلاح

۱۹۲۲

۱۹۳۶ء میں تاریخ عالم نے ایک نیا ورق الٹا۔ انگلستان میں عقل اور محبت، عشق اور دولت کی جنگ ہوئی جس میں عشق نے دولت کو شکست دی محبت عقل پر غالب آئی یعنی ایڈورڈ ہشتم کا سر مسز سمپسن کے سامنے جھک گیا اور تاج شاہی حسن کے قدموں میں گر پڑا۔ اس واقعہ نے ایک عالم میں تہلکہ مچا دیا تاریخ گویوں کو

ایک بے نظیر موقعہ ہاتھ آیا۔ ہندوستان کے بہت سے تاریخ گویوں نے اس پر طبع آزمائی کی لیکن سب سے بہتر اور عمدہ مادۂ تاریخ
مولانا پروفیسر الحاج حامد حسن قادری
نے نکالا فرماتے ہیں

ع "تخت سودائے عشق تاج گیے"

۱۹۳۶

دوسرا مادۂ تاریخ نکالا۔

تاریخ انقلاب شاہی ایڈورڈ

۱۹۳۶

عمدہ اور بہترین تاریخ وہ سمجھی جاتی ہے جو پورے مصرع سے نکلتی ہو یہ ابتدا شعر فن سے لیکر آج تک تمام استادوں نے اسی چیز کو برقرار رکھا ہے لیکن بعض استادوں نے تو یہ جدت کی ہے کہ قصیدہ کا قصیدہ لکھ دیا جس کے ایک مصرعہ سے سن عیسوی اور دوسرے سے سن ہجری نکلتا ہے۔ سید مقبول حسین وصل بلگرامی نے بادشاہ جارج پنجم کے جشن جبلی منعقدہ ۱۹۳۵ء کے متعلق ۲۵ اشعار کی نظم کہی ہے جس میں یہی صنعت برقرار رکھی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ایسا جشن ہے اس کا رفعت پناہ جو ہے ۱۳۵۴
۱۹۳۵ خورشید علم جو ہے شاہوں کا شاہ جو ہے
وہ شاہ جارج پنجم رشک جہان و سلطان ۱۳۵۴
۱۹۳۵ وہ تاجدار اعلیٰ ماہ کمال و ذی شان
ہے وصل کچھ نہ پوچھو دل خوب جانتا ہے ۱۳۵۴
۱۹۳۵ تاریخ کا یہ قطعہ جس فکر سے لکھا ہے

اس سے بڑھ کر کمال کسی قدیم فارسی شاعر نے کیا ہے۔ اس نے ایک قصیدہ شاہجہاں کے کسی جشن کے موقعہ پر لکھا ہے قصیدہ میں ۲۵ شعر ہیں لیکن ان ۲۵ اشعار میں صدہا صنعتیں رکھ دی ہیں یعنی:۔

۱۔ ہر مصرع سے الگ الگ تاریخ نکلتی ہے۔
۲۔ حروف غیر منقوط سے علیحدہ تاریخ نکلتی ہے۔
۳۔ حروف منقوط سے الگ تاریخ نکلتی ہے۔
۴۔ مصرعوں کے پہلے حرفوں کے جمع کرنے سے تاریخ نکلتی ہے
۵۔ آخری حروف "ن" جمع کرنے سے تاریخ نکلتی ہے
۶۔ مصرع کے پہلے حرف ملانے سے شعر بنجاتا ہے اور تاریخ نکلتی ہے

غرض قصیدہ کیا ہے عجیب و غریب صنائع بدائع کا گلدستہ ہے
اسی طرح منشی عبدالمجید صاحب نے کسی بچہ کی تاریخ ولادت لکھی ہے

شمع بزم آرائے عالم آمد فصل بہار

۱۲۶۵ھ

طالع بیدار عزت منیر برج خت

۱۸۴۹ء

اس تاریخ میں مندرجہ ذیل خوبیاں رکھی ہیں۔

۱۔ پہلے مصرعے سے ۱۲۶۵ھ نکلتے ہیں۔
۲۔ دوسرے مصرع سے ۱۸۴۹ء نکلتے ہیں۔
۳۔ پورے شعر کے حروف منقوط سے سنہ ہجری نکلتے ہیں
۴۔ پورے شعر کے حروف مہملہ (غیر منقوطہ) سے سن عیسوی نکلتے ہیں

مولانا پروفیسر قادری نے آرزو چاندپوری کے مجموعہ نظم کی تاریخ کہی ہے۔

جو شعر ہے سلک گوہر نظم	جو نظم ہے جہر نامہ شعر
۱۹۲۵	۱۹۱۰

اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ اس فن میں مختلف صنائع بدائع ایجاد کئے گئے ہیں۔ مثلاً حروف منقوطہ سے یا مہملہ سے تاریخ نکالنا ان سب کی مثالیں بھی اوپر درج کردی ہیں۔ ان کے علاوہ اور طرح طرح کی تلاش و خراش اس باغ کو سجانے کے لئے کی گئی ہے اور گوناگوں پھول اس گلشن میں لگائے گئے ہیں۔ مثلاً حروف ملفوظی کو چھوڑ کر حروف باطنی سے تاریخ نکالی ہے یعنی ہر حرف کے پورے لفظ لئے ہیں مثلاً جام کے عدد اس طرح لئے گئے کہ بجائے ج کے ۳ لینے کے جیم (ج ی م) کے لئے گئے اس قاعدہ کو زبر و بینات کہتے ہیں
اس صنعت میں جناب مولانا قادری نے مصطفےٰ کمال پاشا کی لوزان کانفرنس میں کامیابی کی تاریخ نکالی ہے۔ اس میں ایک کمال اور یہ ہے کہ مادۂ تاریخ اور قصہ کے تمام حروف غیر منقوطہ ہیں:۔

صلح کردہ کمال کامل   عادل محمود عصر و ہمدرد
حامد ما کرد ملہم الہام   صلح حاصل مراد دل کرد

۱۳۴۱ھ

مصرع تاریخی کے اعداد اس طرح لئے گئے ہیں

صاد ۹۵۔ لام ۷۱۔ حا ۹۔ حا ۹۔ صاد ۹۵۔ لام ۷۱۔
میم ۹۰۔ را ۲۰۱۔ الف ۱۱۱۔ دال ۳۵۔ لام ۷۱۔ کاف ۱۰۱۔ را ۲۰۱۔ دال ۳۵
= ۱۳۴۱

ایک اور صنعت یہ ایجاد کی گئی۔ کہ حروف اس طرح برابر رکھے جاتے ہیں کہ ان کو برابر رکھنے سے ان کے اعداد سے سن تاریخ حل آتا ہے مثلاً ایک صدی پہلے کسی تاریخ گو نے باغ کی تاریخ نکالی ہے طوبا = ۱۲۶۹ھ۔ اس کے عدد اس طرح لئے گئے ہیں۔

ط و ب ا = ۱۲۶۹ھ

مولانا قادری نے بھی اس صنعت میں ایک سیلاب کی تاریخ کہی ہے۔ جو طوبیٰ کی طرح برجستہ اور برمحل ہے

غرض میں نے تاریخ کہدی کہ بجا جو دیکھا کہ طوفان بدر ملا صفی

۱ ۵ ۲ ب

۱۳۵۲

اس طریقے سے تاریخ نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں یہ صرف موقع اور وقت کی بات ہے۔ کیونکہ نہ ہر سن میں اس طرح تاریخ نکل سکتی ہے اور نہ ہر لفظ کسی واقعہ کے لئے موزوں ہو سکتا ہے

ناسخ لکھنوی نے ایک اور جدت کی ہے فرماتے ہیں۔

از زمانے حکیم ہشت برگیر سہ مرتبہ نعمت کم کن

یعنی ۱۲۴۸۔ اس طرح بھی تاریخ نکالنا آسان نہیں کیونکہ ہر عدد میں یہ بات نہیں ہو سکتی ہے۔ مولانا قادری صاحب قبلہ فرماتے ہیں

از زمانے زمانہ ہفت گیرد

سہ مرتبہ کم کنید دو دو

یعنی ۱۳۵۷۔ یا مولانا عبدالحکیم جوش میرٹھی نے شاہ امداد اللہ صاحب کی تاریخ وفات کہی ہے

بگو سہ مرتبہ شیدائے حق آہ

۴۳۹ × ۳ = ۱۳۱۷ھ

ایک اور مشکل صنعت یہ ہے کہ سن واقعہ لفظوں میں ظاہر کیا جائے اور اس سے تاریخ نکلتی ہو۔ حکیم عبدالمجید خاں دہلوی حاذق الملک کی تاریخ وفات مولانا قادری نے نکالی ہے

جو پوچھے کوئی سال ان حادثوں کا

تو کہد و کہ "تیرہ سو اٹھارہ ہجرت"

۱۹۰۱

یا دوسرا مادۂ تاریخ ہے

کہ سن آج تیرہ سو بتیس ہیں

۱۳۳۲ھ

تخرجہ

مادۂ تاریخ میں سے کچھ عدد گھٹا کر تاریخ نکالتے ہیں۔ اور اس کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ کتنے عدد گھٹائے گئے ہیں مثلاً مرزا غالب دہلوی نے غدر ۱۸۵۷ء کی تاریخ "رستخیز بیجا" سے نکالی ہے۔ رستخیز کے ۱۲۷۵ ہیں جس میں عدد گھٹ جائیں گے اس کی طرف لفظ "بے جا" سے اشارہ کیا ہے جیسا مثلاً اکبر بادشاہ کی تاریخ وفات مشہور ہے۔

الف کشیدہ ملائک ز فوت اکبر شاہ

الف کشیدن معنی افسوس کرنا۔

۱۰۱۵ - ۱ = ۱۰۱۴ھ

ملا عبدالقادر بدایونی نے حافظ سلطان محمد سرہندی کی تاریخ وفات نکالی ہے۔ حافظ صاحب نے سرہند میں باغ اور عمارات تعمیر کرائی تھیں جو مشہور ہیں۔ تاریخ ملاحظہ ہو۔

رخنہ در باغ شدہ کیب نماند

۱۰۰۳ - ۳ = ۱۰۰۰ھ

فیضی سرہندی نے تاریخ نکالی ہے

"باغ بے آب شد"

۱۰۰۳ - ۳ = ۱۰۰۰ھ

دوسری تاریخ لفظ باغ ہی سے نکالی ہے

چو او در گوشۂ باغ است مدفون

بجز تاریخ او از گوشۂ باغ

۱۰۰۰ھ

یعنی لفظ باغ کا سرغ۔

تعمیہ

مادۂ تاریخ میں کچھ عدد جمع کر کے تاریخ نکالتے ہیں۔ اور اس کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ جناب مولانا قادری نے کیا خوب تاریخیں نکالی ہیں۔ میاں سر فضل حسین کی تاریخ وفات ہے

ذکر تھا تاریخ کا یہ ایک نے بڑھ کر کہا

آہ اک ماتم ہے ملک و قوم کا ان کی وفات

۱ + ۱۳۵۵ = ۱۳۵۶ھ

یا راشد الخیری مرحوم کی تاریخ ہے

منزل جنت میں داخل راشد الخیری ہوئے

۵۸۰ + ۷۶۹ = ۱۳۴۹ھ

ڈاکٹر صاحب مرحوم جناب مولانا نصیر عالم صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ وفات نکالی ہے۔

شد در جوارِ رحمت فاضل نصیر عالم

۸۸۸ ۴۹۱ = ۱۳۷۹ھ

علاوہ اس کے مادۂ تاریخ کو شروع کے حرفوں سے درمیانہ اور آخری حرفوں سے بھی کہ تاریخ نکلتی ہے۔ جیسا مومن خاں دہلوی نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کی تاریخ وفات نکالی ہے

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے

فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

ق ہ ف ل ر م ل م

۱۰۰ ۱۰ ۸۰۰ ۵۰ ۹ ۲۰۰ ۳۰ ۴۰ = ۱۲۳۹

جناب مولانا قادری نے ان تمام صنعتوں میں بے شمار اجباب مادۂ تاریخ نکالے ہیں۔

صرف درمیانہ حروف سے شاہ دلگیر اکبر آبادی کی تاریخ وفات نکالی ہے۔

سب بے سر و پا ہو گئے دلگیر کے جانے سے صاحب

لطف و کرم و شعر و سخن عشق و وفا کل داد

ط ر ع غ ش ف ص د

۹ ـ ۲۰۰ ـ ۷۰ ـ ۱۰۰۰ ـ ۳۰۰ ـ ۸۰ ـ ۹۰ ـ ۴ = ۱۲۵۳ھ

صرف آخری حروف سے ایک مہمان نوازی کی تاریخ سے

جو چاہو دیکھنا تاریخ اس مہمان نوازی کی

تلاش فیض و لطف و کرمت کی انتہا دیکھو

ہ ض ف ت

۴۰۰ ۸۰ ۸۰۰ ۶۰ = ۱۳۵۰ھ

درمیانہ حروف چھوڑ کر شاہ دلگیر مرحوم کی تاریخ وفات

دم بگفت کہ بے دل زرنگ او گشتند

وفائی ناز و کرم ذوق و شوق و شعر و سخن

ون ان ز ک م ذ ق ش ق ش ر ن

۶ + ۵۰ ۱ + ۶۰ ۷ + ۲۰ ۴۰ + ۷۰۰ + ۱۰۰ ۳۰۰ + ۱۰۰ ۳۰۰ + ۲۰۰ ۵۰

۱۳۵۴

آخری حروف چھوڑ کر دوسری تاریخ یہ ہے

حال مرگش گفتہ ام تا در کہ ہذا ہجر دے

آہ و افسوس و ملال و صدمہ و غم بے درست

آ + افسو + ملا + صدم + غ

۱ ۱۴۷ ۷۱ ۱۳۴ ۱۰۰۰ = ۱۳۵۴ھ

غرض اس فن تاریخ گوئی میں لوگوں نے طرح طرح کی موشگافیاں کی ہیں حد یہ کہ خود اپنے مرنے کی تاریخ نکالی ہے۔ غالب نے اپنی نکالی ہوئی تاریخ وفات "غالب مرد" پر مرنے کی تمنا میں مر گئے۔ مگر قانی نے "خدا اندا شت" کہہ کر مر کے بھی دکھا دیا۔

کتنی ہی بہاریں آئی ہیں ہستی کی عطا بخشی کرنیں

جو بیج [illegible] سمندر کے سپید نم آلود ہیں

جو بیج تھے وہ ابھی مٹی میں نہاں اور [illegible]

کتنے ہی پھول ہیں ایسے جو ہر باد [illegible]

جن کی رعنائیاں برباد ہیں ویرانوں میں

([illegible])

چاند

ہے انہی کی نسل اور میری نسل اک

جس کی نسل [illegible] جس نے نور لیا

تنہا ہوں میں بیتاب و بے کل آرزوئے زرد رو

ہوں منتظر کہ اک ہوا آ کر مجھ کو [illegible]

اک [illegible] پیرہن مرا [illegible]

([illegible] بے خود)

ان نیم وا لبوں کی حلاوت کو تو نہ پوچھ

ان میں بسے ہوئے ہیں محبت کے زمزمے

چھو کر انہیں ہوئی ہے مری روح بادہ ریز

یہ در ہیں میرے واسطے فردوس کیف کے

(عصمت جاوید) (ایڈمنڈ کار پینٹر)

افسانے اور ڈرامے

جادۂ نو

حضرت عمر فاروقؓ کی قبولِ اسلام کا واقعہ

از جناب سید احسان علی شاہ بی۔ اے

"میں امیرالمومنین ہوں" یہ خدا کی دین ہے۔ اور میں اس ذوالجلال کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا جس نے مجھ جیسے انسان کو یہ موقع دیا کہ میں ملت بیضا کی خدمت میں اپنی عمر بسر کر سکوں میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کئے ہیں لیکن میں مسلمان ہوں، نمازیں پڑھتا ہوں اور روزے رکھتا ہوں اس لئے میرے دل میں قدرتی طور پر یہ امید پیدا ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالٰے مجھے اپنے دامانِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے گا۔ اور میں بھی حضرت خاتم النبیینؐ کا پابوس ہونے کی حیثیت سے معافی کا حق دار ٹھہرایا جاؤں گا۔

لیکن اس کے باوجود مجھے مواخذے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح ممکن ہو سکے قیامت کے دن مجھ سے میرے اعمال کا حساب نہ لیا جائے اور محض خادمِ دینِ متین ہونے کی حیثیت سے میرے گناہوں اور میری لغزشوں پر پردہ ڈال دیا جائے۔ اگر مجھ سے میری ابتدائی زندگی کے متعلق مواخذہ ہوا تو میں کیا جواب دونگا؟ اس خیال کے آتے ہی میرا رواں رواں کانپ اٹھتا ہے کاش میں اس بھیانک ماضی کو بھول سکتا۔

اللہ اکبر! ایک وہ زمانہ تھا کہ میں نمدہ کا کرتہ پہنے ہوئے مکہ معظمہ کے قریب قدید سے دس میل کے فاصلے پر ضجنان کے تپتے ہوئے میدان میں اونٹ چرایا کرتا تھا اور جب کبھی تھک کر بیٹھ جاتا تو والد محترم ناراض ہوتے اور میری گوشمالی فرمایا کرتے تھے۔ آج یہ زمانہ ہے کہ خدا کے سوا میرے اوپر کوئی حاکم نہیں۔ لوگ مجھ جیسے بے نشاں کو امیرالمومنین کہتے ہیں اور تم نے کیا کہا کہ میرے نام سے عجمیوں کے دل میں ہول اٹھتے ہیں؟ ——— وہ کیا جانیں کہ ابن الخطاب خلیفۃ المسلمین اور امیرالمومنین کی حقیقت کیا ہے اور اس شخص نے اپنی جان پر کیا کیا ظلم نہیں کئے۔ آج میں تمہیں سناتا ہوں، تم جاؤ اور اپنے ہم قوموں میں اس بات کا ڈھنڈورہ پیٹ دو کہ اونٹ چرانے والے حقیر عرب کے ہاتھوں میں عرب و عجم کی باگ ڈور دینے والا صرف اسلام تھا۔ انہیں بتا دینا کہ عمر ابن الخطاب سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، البتہ اس سے ڈرو جس نے عمر ابن الخطاب کو تحت الثریٰ سے اٹھا کر منتہائے عروج پر پہنچا دیا۔

میرے عجمی بھائی! میرے والد عرب میں ایک خاص عزت کے مالک تھے وجہ یہ کہ وہ بڑے پائے کے نساب تھے اس لئے سفارت اور فیصلہ منافرہ جیسے شریف پیشے ہمارے خاندان میں موروثی تھے۔ میں نے انساب کا فن والد بزرگوار سے سیکھا تھا۔ پہلوانی اور کشتی میں بھی خاصی دسترس حاصل کر لی یہاں تک کہ عکاظ کے میلے میں بڑے بڑے معرکے کی کشتیاں لڑا کرتا تھا۔ شہسواری کے فن میں بھی مہارت تامہ حاصل کی۔ اسی زمانے میں میں نے لکھنے پڑھنے کا فن بھی سیکھا اور مجھے بجا طور پر ناز ہے کہ اس زمانے میں قریش کے قبیلہ میں کل سترہ آدمی تھے جو اس فن شریف سے واقفیت رکھتے تھے۔ ان سترہ میں سے ایک میں بھی تھا۔ اس زمانے میں اور اب بھی تجارت ہمارا قومی پیشہ ہے مجھے بھی تجارت ہی کے پیشے سے کسب معاش کرنا تھی لہٰذا اسی میں مشغول ہوا۔ اس پیشے کی بدولت مجھے دور دراز سفر کرنا پڑے۔ عرب و عجم کے بہت سے سربرآوردہ بادشاہوں کے ساتھ ملاقات کا موقع ملا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کیونکہ اس زمانے کے بہت سے تجربات اس وقت بھی میرے آڑے آتے ہیں اور میں اس اہم فرض کو بحسن و خوبی انجام دینے میں ان تجربات سے بہت کچھ فائدہ اٹھاتا ہوں۔ اس زمانے میں بھی ان دور دراز سفروں نے مجھے بہت بڑے بڑے فائدے پہنچائے۔ میں ایچ مدان تھا لیکن خدا کی عنایت کہ میری قوم نے میری (حقیر خوبیوں) کی خوب خوب داد دی اور قبائل میں جب کوئی پرخطر معاملہ پیش آتا تو مجھے ہی سفیر بنا کر بھیجا جاتا تھا۔

یہ سب باتیں بڑی خوشنما اور خوش آئند ہیں اور ان کی یاد یقیناً بہت ہی دلفریب ہے بلکہ یوں کہئے کہ اگر میں ان سب باتوں پر ناز کرنے لگوں تو یہ ناز بیجا نہ ہوگا لیکن ان دلفریب نقوش کے ساتھ ساتھ ایک ایسی گھناؤنی یاد بھی موجود ہے جو میرے ضمیر پر تیزاب چھڑک دیتی ہے اور جب کبھی وہ یاد تازہ ہو جاتی ہے تو میرا رواں رواں خوف کی شدت سے لرز اٹھتا ہے۔ میں بیتاب ہو جاتا ہوں میرا سر گھومنے

میں جھک جاتا ہے اور میری آنکھیں رونے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ الٰہی! قیامت کے دن ان دنوں کا مواخذہ نہ کیجیو ورنہ میں کہیں کا نہ رہونگا۔

اور میرے عزیز مہمان! یہ یاد اس زمانے کی ہے جب ہم جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ ہماری روحیں روشنی کے لئے بیتاب تھیں۔ ہم سب بیقرار تھے۔ اس دن کے لئے جب کوئی شمع لے کر آئے اور ہمیں ان تاریکیوں میں سے نکالے۔ لیکن جب اس نور نے ظہور فرمایا تو ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ ہم گھبرا گھبرا کر اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ڈھانپنے لگے تاکہ اس نور کا اثر قبول نہ کر لیں۔ آہ وہ سیلاب نور جس کو زید کی آنکھوں نے افق پر سے پھوٹتا ہوا دیکھ لیا تھا ہماری بدبختیوں کو خوش نصیبی میں بدلنے کے لئے ہماری طرف بڑھا لیکن ہماری بے بصر آنکھوں نے اسے طوفان آتش سمجھا اور ہم دیوانہ وار اس کو بجھانے کے لئے لپکے۔

یہ سیلاب نور رحمۃ اللعالمین کے جسد مبارک میں صورت پذیر ہو کر فاران کی چوٹیوں پر چمکا۔ یہ وہی نور تھا جس کی منادی یوحنا نے پہلے سے کر دی تھی کہ —"پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا اور دیکھا کہ ایک نقرئی گھوڑا اور اس کا سوار امانتدار اور سچا کہلاتا ہے اور وہ راستی سے عدالت کرتا ہے اور لڑتا ہے اور اس کی آنکھیں آگ کے شعلے کی مانند اور اس کے سر پر بہت سے تاج اور اس کا ایک نام لکھا ہوا جسے اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اور خون میں ڈوبا ہوا لباس وہ پہنے تھا اور اس کا نام کلام خدا ہے اور جو فوجیں آسمان میں ہیں صاف اور سفید اور کتانی لباس پہنے ہوئے نقرئی گھوڑوں پر سوار اس کے پیچھے ہو لیں اور اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے کہ وہ اس سے قوموں کو مارے اور وہ لوہے کے عصا سے ان پر حکمرانی کریگا اور وہ خود قادر مطلق خدا کے قہر و غضب کے کولھو میں روندتا ہے اور اس کے لباس اور اس کی ران پر یہ نام لکھا ہے۔ "بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوندوں کا خداوند"۔ لیکن میرے دوست اس منادی اور اس خبر کے باوجود ہم لوگ اسے نہ پہچان سکے۔ ہم نے یہی سمجھا کہ عبد المطلب کا پوتا اور عبد اللہ کا بیٹا آمنہ کی گود کا لال محمدؐ ایک عرب ہے اور بس۔ ایک ان پڑھ آدمی ہے جو پہاڑیوں کے اس طرف رہنے والے کسی رحمٰن نامی شخص کا معتقد ہے اور اسی کی باتیں سنا سنا کر ہمیں اپنے آبا و اجداد کے خداؤں کے خلاف کرنے کی سازش کر رہا ہے۔ ہم سب بڑے عقلمند تھے۔ ہم میں ایسے فصیح مقرر اور شاعر موجود تھے جن کے ہونٹوں سے پھول جھڑتے ہیں۔ ہم میں ایسے ایسے تیر انداز تھے جو ہرن کے تیر رفتار کا جگر بھی چھید ڈالتے تھے۔ ہماری عقلمندی نے ہمیں یہ بات سکھا رکھی تھی کہ خدا کے حکم سے کوئی انسان انسانوں کو سکھانے اور زندگی کی راہ بتلانے کے لئے نہیں آسکتا یہ کام تو جنوں اور فرشتوں کا ہے جو خدا کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ ہمارے منطق یا فلسفے نے ہمیں یہ خوب اچھی طرح سے بتا دیا تھا کہ اعمال کی جزا و سزا بالکل قابل تمسخر ہے۔ موت کے بعد اعمال کی جواب دہی کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ ہمارے مغرور دماغوں میں یہ ہوا سمائی ہوئی تھی کہ ہمارے خاندان اور ہمارے بزرگوں کی شرافت اپنی مثال آپ ہے۔ ایک امیر قبیلہ اور ایک سردار قوم کو بھلا ایک حقیر بدوی اور درد کے غلام سے کیا مروکار ہو سکتی ہے۔ ہم سب بت پرستی پہ قانع تھے۔ کبھی کبھار اگر ضرورت پڑتی تو پتھروں کے سامنے ناک گھسنی کر آتے اور سمجھتے کہ روحانیت کے تمام فرائض سے سبکدوش ہو گئے ہیں اس لئے جب بنو ہاشم کی ایک فرد کی زبان سے ہم نے عجیب و غریب قسم کے پیغامات سنے تو بھنا گئے۔ وہ کہتا تھا: "موت تمہارے سر پر آرہی ہے اور تم کو خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کے جوابدہ ہونا ہے"۔ وہ کہتا تھا۔ "اللہ ایک ہے دوسرا معبود کوئی نہیں۔ بتوں، پتھروں اور درختوں میں تو اتنی ہمت نہیں کہ وہ ایک انچ جنبش بھی کر سکیں یا اپنی ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی بھی اڑا سکیں"۔ وہ کہتا تھا: "تمہاری بیٹیاں تمہاری آنے والی نسلوں کی مائیں ہیں اور انہیں قتل کر دینا اپنی آئندہ نسلوں کا گلا گھونٹ دینا ہے"۔ وہ فرمایا کرتے تھے۔ "لوگو! جسم کو نجاست سے، کپڑوں کو میل کچیل سے، زبان کو گندی باتوں سے، دل کو جھوٹے دستاویزوں سے پاک و صاف کر دو۔ وعدہ اور اقرار کی سختی سے پابندی کرو کیونکہ قوم کی عزت نفس اسی سے ہے۔ لین دین میں کسی سے دغا نہ کرو۔ خدا کی ذات کو نقص سے، عیب سے اور ہر آلودگی سے پاک سمجھو۔ اس بات کا پختہ اعتقاد رکھو کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، چھوٹے بڑے سب کے سب خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ سب اسی کے محتاج ہیں دعا کا قبول کرنا، بیمار کو صحت و تندرستی دینا لات و ہبل کے نہیں بلکہ اس خدا کے قبضے میں ہے جس نے لات و ہبل کی صورت بنانے کے لئے پتھر بنائے۔ فرشتے اور نبی بھی اس کے تابع ہیں۔ وہ بھی اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے"۔

یہ تھے وہ پیغامات جو میدان عکاظ میں گونجے۔ جنہوں نے صفا و مروہ کی جھلسی ہوئی چٹانوں پر شہد کے قطرے ٹپکائے۔ یہ تھا وہ کلام

جس نے مکّہ کے رہنے والوں کو سر سے پاؤں تک غصہ اور نفرت میں بدل دیا۔ ہم نے اپنے ارد گرد عقل و دانش، فلسفہ اور منطق اور شعر و سحر کی ایک دیوار قائم کر لی اور یہ سوچ کر آپ ہی آپ مسکرانے لگے کہ محمد کا جادو اس دیوار کو توڑ کر ہمارے کانوں تک پہنچ جائے تب جانیں۔

لیکن محمد کا جادو جادو نہیں تھا، قدرت کی آواز تھی۔ فطرت کی پکار تھی جس نے اپنے سننے والے کان ڈھونڈ لئے اور جو دل میں اتر گئی۔ ہمارا سحر، ہمارے قصیدے، ہمارا فلسفہ، ہماری منطق اور ہماری عقلمندی کی دال یہاں نہ گلی اور ہادیٔ برحق کو سچائی کا اعلان کئے ابھی چند ہی دن گذرے تھے کہ مکہ میں کہرام مچ گیا۔ مرد عورتیں، بوڑھے اور بچے، دانا اور بیوقوف، شاعر اور بیمار، غرض جو کوئی بھی اس آواز کو سن پاتا اس کا والہ و شیدا ہو جاتا، دیوانہ ہو جاتا۔ محمد کا جادو چپکے چپکے ہماری فولادی دیوار میں رخنے کر کے ہمارے قلب و جگر پر حملے کر رہا تھا۔

ہم یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکتے تھے اس لئے ہم نے اس گرا گرا کر عقل و ہوش پر گرتی ہوئی اور ہمارے صدیوں سے جمع کئے ہوئے اعتقادی خزانے کو راکھ کا ڈھیر بناتی ہوئی بجلی کا مقابلہ ظلم و جور کی ڈھالوں سے کرنے کی ٹھان لی اور یہ ارادہ کر لیا کہ اب جو کوئی بھی اسلام لائے گا۔ خدا کو واحد مانے گا۔ گندگی اور نجاست سے ہاتھ اٹھائے گا۔ اپنے ہاتھ کے گھڑے ہوئے خداؤں کے سامنے سجدہ ریزی سے توبہ کرے گا ہم اسے قرار واقعی سزا دیں گے۔ ایسی سزا دیں گے کہ وہ گھبرا کر نور کا دامن چھوڑ دے اور تاریکی میں واپس چلا آئے۔

چنانچہ ہم نے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنایا اور جو مسلمان بھی ہمارے ہتھے چڑھا ہم نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ ایسی ایسی سزائیں دیں جن کا ذکر سن کر انسانیت کی پیشانی بھی شرم سے عرق آلود ہو جاتی ہے۔ سر کے بال نوچنا، گردن مروڑنا، گرم پتھروں بلکہ دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹانا۔ بوریوں میں باندھ کر نیچے سے دھواں دینا۔ پاؤں سے رسی باندھ کر تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹنا۔ یہ چند طریقے تھے جو قوم کے رہنماؤں نے قوم کی ڈوبتی ہوئی نیا کو ڈوب جانے سے بچانے کے لئے اختیار کئے ہمارا خیال تھا کہ یہ بھیانک، ظالمانہ طریقوں کی دور رس تدبیر سے بچا لے رکھیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا قدرت نے ہماری ہر کوشش کی تضحیک پر کمر باندھ رکھی تھی اور جس طرح ہمارا سحر ناکام رہا تھا اسی طرح ہمارا ظلم و جور بھی ناکام رہا۔

خود میں اپنے دل میں قومی درد کی اس تڑپ کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے بھی اپنے خداؤں کو بچانے کا دعویٰ تھا اور میں بھی سمجھتا تھا کہ اس مشکل وقت میں اگر میں نے بھی اپنے معبودوں کی حفاظت نہ کی تو ان بیچاروں کو رہنے کی جگہ نہ ملے گی۔

میری ایک لونڈی جس کا نام لبینہ تھا مسلمان ہو گئی۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ لونڈی کو بھی زکام نے آ دبایا ہے تو مجھے سخت غصہ آیا۔ میں نے لبینہ کو غلط راہ سے بچانے کے لئے کوڑا اٹھایا اور اسے اپنے سامنے بلا کر پوچھا۔

"لبینہ! کیا ہو گیا ہے تجھے؟"

لبینہ نے سادگی سے میری طرف دیکھا اور بولی۔

"کچھ بھی تو نہیں حضور!"

اور میں نے کوڑا پھٹکار کر کہا۔

"سچ بول — تو مسلمان ہو گئی ہے؟"

اور معلوم ہے آپ کو کیا جواب دیا تھا اس لونڈی نے؟ اس نے آنکھیں جھکا لیں اور دھیمی آواز میں کہا۔ "الحمدللہ!" یہ جواب سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مجھے اپنا ہوش نہ رہا اور میں نہیں جانتا کہ میں نے اسے کتنا مارا اور کتنی دیر تک مارتا رہا لیکن وہ مار کھاتی رہی اور "اللہ اللہ" کے نعرے بلند کرتی رہی جب میں تھک گیا تو میں نے ہاتھ روک کر پوچھا۔

"ابھی نشہ اترا ہے کہ نہیں؟"

وہ اس قدر پٹنے کے باوجود مسکرا کر بولی "حضور! اگر مار مار کر اَتو بھی کر دو تب بھی یہ نشہ نہیں اترے گا"

میں نے کہا اچھا تو ذرا دم لے لوں ابھی نشہ اتارتا ہوں تیرا!

اب میرا ہر روز کا یہی معمول ہو گیا اور میں سارا سارا دن لبینہ کو پیٹتا رہتا لیکن واقعی وہ نشہ جو اسے چڑھ چکا تھا نہ اترا — اللہ اللہ کیا نشہ تھا؟"

لبینہ کی ان باتوں نے مجھے سخت متعجب کیا۔ میں حیران تھا کہ ہمارے سامنے آنے جانے والے ایک سادہ سے آدمی نے یہ ایسا کاری جادو کہاں سے سیکھ لیا ہے کہ جو شخص بھی ایک دفعہ اس کا ہو جاتا ہے پھر اس سے پھرنے کا نام نہیں لیتا۔ اس تعجب نے مجھے سر سے پاؤں تک غصے میں بھر دیا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہو اس فساد کی جڑ کاٹ دینی چاہیئے۔

اس زمانے میں حضور سرور دو عالم اپنے بھائیوں کے مظالم سے

تک ارقم کے مکان میں مقیم ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ وہ تیس چالیس مسلمان بھی تھے جنہوں نے کلمۂ حق پر لبیک کہی تھی۔ قریش خود ان کی ذات پر تلوار اٹھانے سے اس لئے ڈرتے تھے کہ مبادا محمدؐ کا قبیلہ انتقام لینے کے لئے اٹھ کھڑا ہو لیکن آئینہ کا اصرار دیکھ کر مجھے اس قدر غصہ آگیا تھا کہ میں نے بنو ہاشم کے غیظ و غضب کے خیال کو بھی اپنے ذہن کے قریب نہیں آنے دیا۔ سارے قبیلے کی خشمگیں نگاہوں کا مُنہ چڑاتا ہوا تلوار ہاتھ میں لی اور ارقم کے مکان کی راہ لی۔

اثنائے راہ میں نعیم مل گئے۔ یہ ہمارے خاندان کے ایک شریف النفس اور باعزت بزرگ تھے اور مجھے ہر طرح ان کی عزت ملحوظ تھی۔ لیکن قیامت یہ تھی کہ نعیم بھی مسلمان ہو چکے تھے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے دشمن تھے اس لئے انہیں آتا دیکھ کر میں نے نفرت سے ان کی طرف سے مُنہ پھیر لیا اور رستے سے ہٹ گیا۔ نعیم نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میرے ہاتھ کی تلوار پر بھی ان کی نظر پڑ چکی تھی اور ممکن ہے میرے بگڑے ہوئے تیوروں نے بھی انہیں میرے سینے کے طوفان سے آگاہ کر دیا ہو۔ مجھے رستہ چھوڑتے دیکھ کر وہ میری طرف بڑھے اور خندہ پیشانی سے بولے۔

"ابن الخطاب کہاں چلے؟"

یہ لفظ تھے تیل کے چھینٹے تھے جنہوں نے میرے غیظ و غضب کو طوفان آتش میں بدل دیا۔ میں نے گرج کر کہا۔

"ارقم کے مکان کی طرف!"

نعیم مسکرا کر بولے۔

"کس لئے؟"

"آج میں قصہ پاک کر دونگا تاکہ یہ آئے دن کے جھگڑے مٹیں؛ نہ رہیگا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

"اوہ!" نعیم بولے۔ "یہ دعوی ہیں۔ لیکن واللہ ابن الخطاب تم ہو غضب کے۔ ارےبھئی پہلے اپنے گھر کی خبر تو لی ہوتی۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"خوب بڑے بھولے ہو۔ دودھ پیتے بچے۔ اماں تم تو کچھ جانتے ہی نہیں۔ ارے بھئی! تمہارے بہنوئی سعید ابن زید اور تمہاری بہن فاطمہ مدت سے حلقہ بگوش اسلام ہو چکی ہیں؟"

"کیا سچ؟" گو ان کے اسلام لانے کی بھنک میرے کان میں پڑ چکی تھی لیکن ہم چشم کے سامنے ایسا سنگین اعتراف کون سی آسان بات ہے!

"مجھے جب سے اللہ ایک ہے اور محمدؐ اس کا رسول ہے کہنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے مجبوراً مارے شرم کے میرے قریب بھی آجائے۔" نعیم بولے اور ہنستے ہوئے چل دیئے۔

گو میں نے نعیم پر یہی ظاہر کیا تھا کہ میں ان دونوں کے اسلام لانے سے ناواقف ہوں لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ میں اس واقعہ سے پوری طرح آگاہ تھا اسے میرے دل کی کمزوری کہیئے یا کچھ اور کہ اپنی بہن فاطمہ سے مجھے ہمیشہ محبت رہی تھی۔ یہ محبت کوئی نئی نہ تھی۔ ہم بچپن میں اکٹھے ہی رہے تھے اور اکٹھے جوان ہوئے تھے، اس لئے ان کا اسلام لے آنا گو میرے لئے سخت تکلیف کا باعث ہوا لیکن اسے کسی جسمانی یا روحانی آزار میں مبتلا کرنے کی ہمت اپنے آپ میں نہیں پاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ہمیشہ چشم پوشی کی یہاں تک کہ انہیں بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی اس حرکت سے واقف ہوں۔

لیکن اب ایک ہم چشم، ہم قوم اور ہم رتبہ شخص نے مجھے یہ بات ایک طعنے کے طور پر کہی تھی اور یہ طعنہ مجھے کھا گیا۔ میرا سارا غصہ سمٹ سمٹا کر بہن کے لئے وقف ہو گیا اور میں نے ارادہ کر لیا کہ جو ہو سو ہو۔ سب سے پہلے اپنی بہن اور اپنے بہنوئی کو اسلام کے اثر سے آزاد کرا دونگا۔ چنانچہ اسی غصے میں پیچ و تاب کھاتا اور بھناتا میں بہن کے مکان کی طرف ہو لیا۔

رستہ بھر میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے اور میرا خون کھولتے رہے یہاں تک کہ جب میں سعید بن زید کے مکان کے سامنے پہنچا ہوں تو میں خود محسوس کرتا تھا کہ میرے اعضا غصے کی شدت سے کانپ رہے ہیں اور میرے ہاتھ رہ رہ کر تلوار کے دستے کی طرف کھنچے پڑتے ہیں۔

لیکن دروازے پر پہنچ کر میں نہ معلوم کیوں ٹھٹک گیا۔ دروازہ بند تھا اور اندر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ سب سے عجیب چیز جس نے میرے روئیں روئیں میں غیر فطری تناؤ پیدا کر دیا تھا میری بہن کی آواز تھی جو نہایت خضوع و خشوع اور قرات سے قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ میں اس وقت تک کلام ربانی کا ناآشنا تھا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ نعمت عظمیٰ میرے کانوں تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ میں نے بسا اوقات جناب رسالت پناہؐ کی زبان مبارک سے پاک خدا کا پاک کلام سنا تھا لیکن بدنصیبی نے چند دن اور میرے لئے ظلمت مقدر کر رکھی تھی اس لئے جب

بھی یہ کلام میرے کانوں کے قریب پہنچا تو میں اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیا کرتا۔ میرا خیال تھا کہ ان الفاظ میں جادو ہے جو سماعت کے قریب آتے ہی بالواسطہ دل پر حملہ کر دیتا ہے۔

آج بھی اپنی بہن کی مترنم اور نرم آگیں آواز میں یہ زندگی بخش پیغام سنتے ہی میری بدنصیبی نے میری انگلیوں کو پکڑ کر میرے کانوں میں ٹھونس دیا۔ ساری رعونت کر کے ابلتے ہوئے چشمے پر پتھر رکھ کر اس کی خوشگوار دھار چلنا کو روکنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن قدرت نے مجھے اس رستے پر ڈال دینے کا عہد کر لیا تھا جو نہ صرف میرے بلکہ سارے عالم انسانیت کے لئے واحد ذریعہ نجات ہے۔ اس لئے اس پتھر کے باوجود اس ابلتے ہوئے چشمے کی زندگی بخش بوندیں رس رس کر میرے قلب معطل میں ایک ایسا نشہ چھڑکنے لگیں جو اپنی خاصیت میں دنیا کے تمام نشوں سے نرالا تھا۔ اس نشے میں بیدار کرنے کی قوت تھی۔ یہ نشہ تھا ہکر شکن ——— نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دینے والا۔

لیکن زخم پر کافوری مرہم کا پھاہا بھی مریض کو ایک دفعہ تڑپا دیتا ہے۔ میرے زخم خوردہ دل پر جب یہ پھاہا رکھا گیا تو ایک دفعہ میں ہی تڑپ اٹھا اور میری یہ تڑپ ایک خوفناک ہلاکت آفریں آندھی میں منتقل ہو گئی۔ جو دفعتہً ایک جنون خیز غصے کی صورت میں میرے سینے کی پہنائیوں میں زنجیر ہو گئی تھی۔ میرے ہاتھ نہ معلوم کس جذبے کے تحت اٹھے اور دروازے کے پرانے تختوں پر اس زور سے پڑے کہ دروازے کے پرانے زنگ خوردہ چھپکے چیخ اٹھے اور اس کے اندر سے زر کا بہتا ہوا فوارہ ایکدم رک گیا۔ اس کی جگہ دھیمی گھبرائی ہوئی آوازوں نے لے لی جن میں سے کچھ میرے کانوں تک بھی پہنچ گئیں۔

سعید کہہ رہے تھے۔

"ابن الخطاب آگئے ہیں" پھر آواز آئی۔ "پہلے میں جاتی ہوں۔ آپ سے پہلے میں شہید ہونگی" پھر آواز سنائی دی۔ "نہیں! پہلا حق مرد کو پہنچتا ہے"

دروازے کی کنڈی آہستہ سے اُتر گئی۔ سعید ابن زید کا مُسکراتا ہوا چہرہ نظر پڑا۔ میں بیک نظر پہچان گیا۔ یہ مسکراہٹ مصنوعی تھی ورنہ حقیقت یہ تھی کہ خوف کی وجہ سے ان کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں میں نے اپنی دہشت انگیزی کے احساس سے غیر شعوری طور پر لطف لیا اور شہ پا کر اور بھی شیر ہو گیا۔ سعید ابن زید کو دھکیل کر ایک طرف کر دیا اور خود گھر میں چلا گیا اور اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دی

میری بہن، میری دنیا کی تنہا رونق، فرط دہشت سے سہمی، دبکی ایک کونے میں کھڑی تھی اور قرآن پاک کے چند اجزا اس کے سینے سے اس طرح لگے ہوئے تھے گویا وہ اپنی زندگی کے حقیقی اور واحد خزانے کو دشمن کی دستبرد سے بچانے کے لئے اپنی جان کو ڈھال بنانے پر تیار ہے اور حقیقت بھی یہی تھی۔ یہ اجزا حقیقتاً ہم سب کی زندگی کا حقیقی اور واحد خزانہ ہیں۔ اس کی حفاظت کے لئے جانیں ہاری جائیں تو کیا اگر اس سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہوتی تو وہ بھی دے دی جاتی۔ لیکن اس وقت میری آنکھوں پر پٹی بندھی تھی اور میں اپنی دولت کو پہچاننے سے آپ ہی معذور تھا۔

مجھے یہ تلخ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ قرآن پاک کے اجزا کو دیکھ کر میرا غصہ طوفان کی شدت سے بڑھا۔ ایسا کہ میں اپنے بہنوئی سے دست و گریبان ہو گیا۔ میں نے ان کی قمیص پکڑ لی اور سوچے سمجھے بغیر ان کے منہ پر اپنی انتہائی قوت سے تھپڑ مارے۔ انہوں نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی لیکن میں ان سے زیادہ طاقتور تھا اور پہلوانی کو ایک فن کی حیثیت سے سیکھے ہوئے تھا اس لئے وہ میرے مقابل ثابت نہ ہوئے اور آخر چاروں شانے چت زمین پر گر پڑے۔ میں ان کے سینہ پر چڑھ بیٹھا اور میری زبان نے موحد عالم کی شان میں وہ گستاخانہ الفاظ کہے جن کی یاد اب بھی مجھے ندامت سے عرق عرق کر دیتی ہے۔

بہن غالباً یہ برداشت نہ کر سکیں۔ انہوں نے قرآن پاک کے اجزا بلند جگہ پر رکھ دیئے اور میری طرف لپکیں۔ لیکن اس وقت مجھے کسی کی پروا نہ تھی۔ میرے دماغ میں صرف ایک ہی دھن سمائی ہوئی تھی اور وہ یہ کہ ان دونوں کو جبر و اکراہ اسلام سے منحرف کر دوں چنانچہ میں نے خود اپنی بہن کو زور سے دھکا دیا۔ وہ بیچاری کا دھان پان کمزور عورت، اس جناتی قوت کی بھلا کیا تاب لا سکتی۔ کبوتر کے اس پر کی طرح جو ہوا کی لہروں میں لڑھکتا ہوا دور تک پہنچ جائے کونے میں جا گریں اور اس زور سے گریں کہ نیم بیہوش سی ہو گئیں۔ لیکن پھر ہمت کی چیخیں اٹھیں اور واسطے دیتیں، منتیں کرتیں میری طرف آئیں۔ میں نے ان کی ایک نہیں سنی اور آخر انہوں نے مجبور ہو کر میرے بالوں کو اپنی کمزور مٹھیوں میں پکڑ لیا۔ یہ میرے سر کے بال کچھ ہی دنوں سے اُگے ہیں۔ پہلے یہ ان بالوں کا ایک گنجان ذخیرہ تھا۔ ان کی دست درازی نے مجھے غصے سے دیوانہ کر دیا اور میں تڑپ کر سعید کے سینے پر سے اُٹھ بیٹھا۔ میرا خونی کوڑا میرے ہاتھ میں تھا اور میں بغیر کچھ

دیکھے بھالے۔ بغیر کچھ جانے بوجھے۔ اندھا دھند دیوانہ وار کوڑے پہ کوڑا برسا رہا تھا اور اس وقت تک برساتا رہا جب تک کہ میرے ہاتھ پاؤں شل نہیں ہو گئے۔

اب تو مومنین کی خدمت کا یہ اہم فرض جو خدا نے میرے سپرد فرمایا ہے اس کی وجہ سے کچھ متردد رہتا ہوں اور سب سے بڑھ کر اپنے ہاتھوں سے اپنے پاؤں پر جو جو کلہاڑے میں نے چلائے ہیں ان کا احساس مجھے اندر ہی اندر کھائے جاتا ہے اس وجہ سے پہلے سے بہت کچھ کمزور ہو چکا ہوں تاہم آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اب بھی میری ہڈیوں میں خاصہ کس بل ہے اس وقت تو عنفوان شباب تھا رگوں میں بجلیاں لہراتی تھیں۔ اس وقت کی میری جسمانی حالت اور طاقت کو ذہن میں رکھئے اور یہ اندازہ کیجئے کہ میں نے ان بیگناہ بے قصور اللہ کے بندوں پر کتنا ظلم کیا ہوگا اور کتنی دیر تک کرتا رہا ہونگا — خداوندا شرمسار ہوں! تیرے رحم کا امیدوار!

اور میرے عجمی دوست! جب میں تھک کر دم لینے کے لئے رکا تو میری نگاہیں سنگا اپنی کمزور بہن کی طرف کھچ گئیں اُف! ان کے جسم کے کپڑے تار تار ہو گئے تھے اور جگہ جگہ سے خون رس رس کر ان چیتھڑوں کو بھگو رہا تھا۔ ان کے چہرے پر ظالم کوڑے نے اپنی خوفناک مہریں ثبت کر دی تھیں۔ ان کے سجدوں کی برکتوں سے منور پیشانی پر جگہ جگہ نیلے نیلے زخم ابھر آئے تھے وہ میرے سامنے کھڑی تھیں، نحیف اور نقاہت کی شدت سے نیم جان! ان کے ہونٹ بے کسی کے انداز میں کانپ رہے تھے۔

یہ منظر مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ میرا غصہ ایکدم ندامت میں بدل گیا مجھے اپنے کئے پر افسوس ہوا۔ میرے ضمیر نے آواز سے پکار کر مجھے کہا کہ ابن الخطاب تو نے جو کچھ بھی کیا برا کیا۔ لیکن میرے پرانے فلسفے اور میرے قومی خدمت کے رنگوں میں رنگے ہوئے استدلال نے بہت جلد ضمیر کو جواب دیا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے اپنی بہن کی بھلائی کے لئے کیا ہے۔ اسے سیدھی راہ دکھانے کے لئے کیا ہے۔ لیکن اس جواب سے میرا ضمیر مطمئن نہ ہوا۔ اس نے کچھ اور کہا۔ میرے فلسفے نے کچھ اور جواب دیا۔ اس نے کچھ اور اعتراض کیا اور میری منطق نے میری طرف سے کچھ اور صفائی پیش کی۔ عقل اور ضمیر کی اس کشمکش نے میرے سینے میں ایک نئے جذبے کو بیدار کر دیا۔ اس جذبے کا کیا نام ہے۔ میں نہیں جانتا۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ اسی جذبے کے زیر اثر میں نے انتہائی کوشش سے اپنی آواز کو نرم بنا کر کہا۔

"فاطمہ! تم میری بہن ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میری آنکھوں کے سامنے اور میرے ہوتے ہوئے اپنے باپ دادا کے مذہب کو خیرباد کہہ کر ایک دوسرا مذہب اختیار کر لو۔ جس کے ذریعے سے ہمارے دیوتاؤں کی تضحیک کی جاتی ہے۔ تم اپنے باپ دادا کے مذہب کی طرف لوٹ آؤ۔ فاطمہ لوٹ آؤ۔ اسلام کو چھوڑ دو —— محمدؐ کو چھوڑ دو ——"

لیکن فاطمہ نے میری بات نہ سنی۔ وہ کانپتے ہوئے قالو سے اٹھیں۔ ڈگمگاتی ہوئی بڑھیں۔ اس کے لرزتے ہوئے ہاتھ بلند ہوئے اور میں نے دھندلاتی ہوئی سی آنکھوں سے دیکھا کہ ان زخم خوردہ ہاتھوں میں قرآن پاک کے وہی اجزا ہیں جو ابھی ابھی اس پلنگ پر رکھے گئے تھے۔ یہ اجزا کانپتے ہوئے لبوں سے پٹے اور فاطمہ کے سینے سے چمٹ گئے۔ گویا بادسموم میں گھرے ہوئے تنہا شتر سوار کو یکدم ایک زندگی بخش نخلستان نے اپنی آغوش میں پناہ دے دی۔ گویا قزاقوں کے جگر شگاف نیزوں میں گھرے ہوئے ایک غریب الوطن مسافر کو شاہی قانون نے اپنے سینے سے لگا کر دوبارہ زندگی بخش دی فاطمہ کے سینے اور خون میں لتھڑے ہوئے ہونٹ آہستہ آہستہ ان پاروں پر جھک گئے۔ اور اس کی آنکھیں نیم بند سی ہوتی گئیں، میں حیران و ششدر دیکھ رہا تھا۔ فاطمہ نے میری پکار کا جواب زبان سے نہیں بلکہ ایک نظر فریب حرکت سے دیا تھا۔ ایک ایسی حرکت سے جس کی جزئیات میرے قلب و دماغ میں گڑ کر رہ گئیں۔

اور اجنبی دوست! چند لمحوں کے بعد وہ آنکھیں کھلیں — وہ آنکھیں جن کے اردگرد بہتے ہوئے سرخ تازے خون نے ایک نہیں کئی ہالے بنا دیئے تھے۔ اور ان میں تم جانتے ہو کیا تھا؟ ان میں نور تھا ایک ایسا نور —— جس نے مجھے سہما دیا۔ جس نے عمر ابن الخطاب جیسے سنگدل انسان کے دل میں دہشت کی لہریں دوڑا دیں۔ میں نے ان آنکھوں کی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیبی قوت ہے۔ کوئی نظر نہ آنے والا ہاتھ ہے جو زبردستی میری آنکھوں کو جھک جانے پر مجبور کر رہا ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ فاطمہ میں کوئی ایسی روحانی قوت ہے جو میری ساری طاقتوں کو، میرے سارے غیظ و غضب کو، میرے سارے شورش اور جنون کو سلب کئے لیتی ہے۔ مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ میں ایک عورت کے سامنے۔ اپنی بہن کے سامنے اپنی اس بہن کے سامنے جس کو ابھی ابھی میں نے اپنے بازوؤں کی قوت ایک حقیر پر کی طرح اچھال اچھال کر اور پٹخ پٹخ کر مار ڈالا ہے ہار مانے

مجھے کیا جا رہا ہوں۔

لیکن میں نے اس مجبوری کے خلاف احتجاج کیا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ آنکھوں میں سے پھوٹتے ہوئے اس نور کا مقابلہ سینہ تان کر کروں گا۔ فاطمہ کی آنکھوں سے اس وقت تک آنکھیں ملائے رہوں گا جب تک کہ خود فاطمہ کی آنکھیں نہ جھک جائیں۔ مجھے فاطمہ کو شکست دینی تھی۔ مجھے اس کو سیدھے رستے پر لانا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ میرا دل اس نور کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اور میری آنکھیں کوشش کے باوجود جھک گئیں ——— اور ساتھ ہی میرا سر بھی ——— اجنبی دوست! میں فاطمہ کے سامنے ہار گیا تھا۔

لیکن ہار کو اتنی جلدی مان لینا میری فطرت کے خلاف تھا۔ میں نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ میں نے کوڑے کی موٹھ پر اپنی گرفت کو مضبوط کرنے کے لاکھ جتن کئے۔ میرے ہاتھوں نے میری ڈاڑھی کے بال نوچے۔ ہونٹوں کو اتنا کھینچا کہ ان میں درد ہونے لگا۔ میرے سینے میں اس شکست کی مخالفت کرنے کے لئے لاتعداد الفاظ تھے، الفاظ ——— جذبات ——— ان دونوں کی جنگ ہو رہی تھی ——— لیکن نہ معلوم کیوں، نہ معلوم کس لئے میرے ہونٹوں نے وہ کچھ کہا جو میں نہیں کہنا چاہتا تھا ——— لیکن میرے ضمیر کی آواز میری فطرت کی پکار، اور میرے دل کی تڑپ نے اپنے اظہار کے لئے چند الفاظ ڈھونڈ لئے اور وہی الفاظ خود بخود میری خواہش کے خلاف میرے ہونٹوں پر سے لڑھک پڑے ——— گویا سوتے میں اپنے آپ کو یہ کہتے سُنا۔

"فاطمہ! جو کچھ تم پڑھ رہی تھیں ——— مجھے بھی سناؤ۔"

بہن کی بے لوث محبت ملکوتی مسرت بن کر فاطمہ کی آنکھوں میں سے جھلکنے لگی۔ ایک سچے ایماندار کے قلب مصفا کی مسرت پاکیزہ دھڑکنیں ایک ہلکی سی مسکراہٹ میں متشکل ہو کر ان پھٹے ہوئے زخم خوردہ ہونٹوں پر معصوم فرشتوں کی طرح کھیلنے لگی اس نے چند لمحوں کے لئے میری طرف دیکھا۔ پھر اس کی آنکھیں جھک کر اجزا پر مرکوز ہو گئیں اور اس نے اپنی ٹوٹی ہوئی، اکھڑی ہوئی سی لیکن پھر بھی مترنم آواز میں قرأت کے ساتھ مجھے یہ پیغام سنایا۔

"جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اللہ کی حمد کرتا ہے۔ اور وہی غالب حکمت والا ہے۔ آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہی اسی کے لئے ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ وہی اول، وہی آخر، وہی ظاہر، وہی باطن، اور وہی سب کو جاننے والا ہے۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ اور پھر قرار پکڑا۔ وہ عرش پر جانتا ہے۔ جو کچھ کہ زمین میں داخل ہو رہا ہے۔ جو کچھ اس سے خارج ہو رہا ہے جو آسمانوں سے نازل ہو رہا ہے۔ اور آسمانوں کی طرف بلند ہو رہا ہے جہاں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ دیکھتا ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کے لئے ہے۔"

اس کا ایک ایک لفظ میرے دل میں اترتا جا رہا تھا ——— مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بہت دور سے مجھ کو پکار رہا ہے۔ اور کہتا ہے۔ "آؤ ہم تمہیں ایک نیا رستہ بتاتے ہیں۔" مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں ریگزار میں تنہا ہوں۔ میرے مشکیزے میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں اور میں چمکتی ہوئی بالو کو پانی سے لبالب بھرا ہوا حوض سمجھ کر بھاگتا پھرتا ہوں ——— ایسے میں دفعتہً کوئی فرشتۂ غیب نازل ہوا ہے اور اس نے ٹھنڈے پانی سے لبالب بھری ہوئی چھاگل میرے منہ سے لگا دی ہے۔ میں پانی پیتا جا رہا ہوں اور میری آنکھیں آنسوؤں کی زبان میں اس کا شکریہ ادا کرتی جا رہی ہیں۔ اور پھر جب میری بہن نے یہ کہا۔

"اور ہر امر اللہ کی طرف رجعت کرتا ہے۔ وہ جو رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ سینے کے بھیدوں سے واقف ہے۔ ایمان لاؤ اللہ پر۔ اور اللہ کے رسول پر۔ تم کو پہلوں کا جانشین کیا گیا ہے۔ خرچ کرو۔ تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے اور خرچ کیا ان کے لئے بہت بڑا ثواب ہے۔"

تو مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔ اور دفعتہً پکار اٹھا "میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔" میری نہایت عزیز بہن میری فاطمہ دوڑ کر میرے سینے سے لپٹ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور میرا تو یہ حال تھا گویا دفعتہً میرے چہرے پر زمزم کے دو چشمے پھوٹ پڑے ہیں۔ میں نے اپنی بہن کو سینے سے لگایا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس جوش گریہ کی کیا ممکن ہو سکتی ہے، میں نہیں جانتا۔ اور پھر میری پشت پر کسی بوجھ کا احساس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سعید بن زید میری پشت پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "کتنا مبارک ہے آپ کا رونا! ان آنسوؤں نے روح کی ساری تاریکیاں دھو ڈالی ہیں۔"

میں نے پلٹ کر ان کے زخم آلود۔ خون میں ڈوبے ہوئے زرد چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ اس دفعہ ان کی یہ

مسکراہٹ حقیقی تھی، ایک تابناک، فرحناک، زندگی بخش مسکراہٹ ان خون آلود ہونٹوں پر کانپ کانپ کر مجھے لافانی مسرت کا پیغام دے رہی تھی۔

اب سے چند منٹ قبل انھیں ہونٹوں کی مسکراہٹ نے مجھے غصہ دیکر دیوانہ بنادیا تھا۔ اور اب اسی مسکراہٹ نے میرے دل و دماغ پر شرم کا تیزاب چھڑک دیا۔ میرے ہاتھ خود بخود اٹھے اور میرا منہ ڈھانپ دیا گیا۔ سعید نے مجھے پکڑ کر سینے سے لگا لیا اور بولے ——
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی عجیب زبان بول رہے ہیں۔ ایسی زبان جس میں تحکم بھی ہے اور انکسار بھی۔ "آؤ!" انھوں نے کہا۔ "ان پیروں پر چلیں جہاں نیکیوں کی بھیک ملتی ہے"۔

میں تنہا دربار رسالت میں حاضر ہو کر اپنے گذشتہ گناہوں کا اعتراف کرکے ان کی معافی مانگنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے سعیدؓ فاطمہ کو وہیں چھوڑا اور خود ارقم کے مکان کی طرف چلا۔

لیکن اس دفعہ میرا سر جھکا ہوا تھا، میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور میرے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ میرا دل جو چند لمحے قبل غومیں خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سینے سے نکال دیا گیا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا دل رکھ دیا گیا ہے جو گوشت اور خون کا لرزتا اور دھڑکتا ہوا ٹکڑا نہیں بلکہ مجسم نور ہے جس کے ہر گوشے میں واحد خدا کی حکومت ہے۔ اور میں اس صاف، نور سے معمور اور وحدانیت کے جذبات سے بھرے ہوئے دل کو سینے میں حفاظت میں دبائے ان قدموں کی طرف کھنچتا چلا گیا جن پہ اسے بھینٹ چڑھانا تھا۔

دور مجھے ایک مکان نظر آیا۔ جس کی بلند چار دیواری میں ایک مضبوط دروازہ تھا۔ اس دروازے کی طرف جانے کے لئے چھوٹی چھوٹی کچی سیڑھیاں تھیں۔ وہی سیڑھیاں —— جنھیں باعث تکوین دوعالم نے اپنے قدموں سے کہکشاں کی طرح منور کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ مکان نہیں بلکہ میری تقدیر کا تابناک ستارہ ہے۔ جو اپنی روشنی سے ساری دنیا کو دریائے نور میں غوطے دے رہا ہے

میرا دل کانپنے سا لگا۔ میرے پاؤں میں لرزش پیدا ہو گئی۔ میری آنکھیں اپنے اندر اس مکان کی طرف اٹھنے کی جرات نہ پاتی تھیں۔ لیکن پھر بھی نہ معلوم وہ کونسی قوت تھی جو مجھے اس طرف دھکیلتی رہی۔ میں بڑھتا گیا۔ بلکہ یوں کہئے کہ کھنچتا چلا گیا۔ مجھے صرف یہی یاد ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک نورانی سیڑھی پر چڑھتا ہوا آسمان کی بلندیوں کی طرف چلا جا رہا ہوں۔ بڑھا جا رہا ہوں آگے اور آگے۔ یہاں تک کہ میں ایک دروازے پر پہنچ گیا اور میری مٹھیاں خود بخود اٹھیں۔ دروازے میں سے آواز پیدا ہوئی اور میں چونک پڑا گویا بیدار ہو گیا اور میں نے اپنے آپ کو ارقم کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے پایا۔

اندر سے بہت سے آدمیوں کی کھسر پھسر سنائی دی۔ لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ "تلوار" اور "ابن الخطاب" کے الفاظ تھے جو میری سماعت سے ٹکرائے اور میری نگاہیں غیر شعوری طور پر گھوم کر کمر میں لٹکی ہوئی تلوار کی طرف چلی گئیں۔ یہ تلوار —— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری کمر پر ایک دہشتناک سانپ لپٹا ہوا ہے۔ پھر ایک بلند آواز سنائی دی۔ یہ آواز شہید اعظم جناب حمزہ کی تھی۔ انھوں نے فرمایا۔

"آنے دو — اگر اچھی نیت سے آیا ہے تو خیر ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر کاٹ دیا جائے گا"۔

میں نے یہ سنا اور شرم کی ایک لہر تھی جو میرے سینے میں تڑپ گئی۔ میں نے نفرت سے تلوار کی طرف دیکھا۔ میرے ہاتھ غیر شعوری طور پر تلوار کے دستے پر پڑے اور تلوار ایک عجیب روتی آواز سے میان سے باہر نکل آئی۔ عین اسی وقت دروازہ کھلا اور میرے شعور پر پھر نیند سی طاری ہو گئی۔ میرے قدم خود بخود اٹھے اور میں دھیرے دھیرے دروازے میں سے ہوتا ہوا اندر چلا گیا —— تلوار ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی لیکن مجھے اس کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔

میں نے دیکھا صحابی دو رویہ بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر حیرت نے مہریں ثبت کر رکھی تھیں۔ وہ خاموش تھے گویا سناٹے میں آ گئے ہیں اور اس کے بعد میری نظریں آہستہ آہستہ پھرتے پھرتے صدر تک پہنچ گئیں۔ یہاں ایک نور متمکن تھا۔ ایک مجسم نور۔ جس کی کشادہ پیشانی اور چمکدار آنکھوں میں نہ معلوم کیا تھا۔ کیا قوت تھی کہ میرا دل قیامت کی تیزی سے دھڑکا اور پھر ایکدم بند ہو گیا —— میں رسالت پناہی کی دربار میں شمشیر بکف حاضر ہوا تھا۔

سرور دوعالمؐ اپنی جگہ سے اٹھے اور مجھ بدنصیب کی طرف ابر کرم کی طرف جھوم کر بڑھے۔ ان کے چہرے پر اطمینان تھا ان کی آنکھوں میں اطمینان تھا اور ان کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں دم بخود ان کی طرف تکتا رہا اور سیلاب نور

[illegible] میرے ہاتھ وہ نور میں گرفتار رہا۔ میرے [illegible] محسوس ہونے لگا کہ کائنات کا دل [illegible] ساکت ہو گیا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا گویا آسمان کے [illegible] کھل گئے ہیں اور کسی نے مجھے پکڑ کر کہا ہے۔

[illegible] کس لئے آئے ہو؟

[illegible] ایک نئی زندگی بھر دی [illegible] تھی جس کی لہروں نے مجھے اپنے کندھوں پر [illegible] دیا تھا جہاں میرا سر گھومنے لگا۔ میں نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ رحمتِ دو عالم کی طرف دیکھا۔ اس چہرے کے [illegible] پیغام تھا مسرت کا لامحدود اور بے کنار رحمت کا [illegible] جس کی شام نہیں ہوتی۔

[illegible] آنکھوں نے سُنا اور میرے [illegible] جھک گئے [illegible] معلوم کب اور کس وقت میرے ہاتھوں [illegible]

[illegible] کھڑا ہو گیا اور جس طرح صبح سے شام تک [illegible] وسعت میں بھٹکنے والا پیاسا ٹھنڈے اور [illegible] بہتی ہوئی چھاگل کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اسی طرح میرے ہاتھوں نے جھک کر رحمۃ للعالمین کے ہاتھوں کو پکڑ لیا اور میرے ہونٹ جھک گئے ان ہاتھوں پر جن میں دنیا کی [illegible] کی باگ ڈور تھی۔۔۔ [illegible] ان کو بوسہ دیا اور میرے ہونٹوں نے بے اختیار ہو کر کہہ دیا۔

"یا رسول اللہ!"

میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن میری گھگھی بندھ گئی۔ اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے اُبل پڑے۔

"اللہ اکبر!" رحمتِ دو عالم کی آواز سنائی دی۔ اور [illegible] ایسا محسوس ہونے لگا کہ دنیا کے ہر ذرے نے ایک زبان ہو کر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا ہے۔۔۔ ایسا نعرہ جو دیر تک فضا میں گونجتا رہا۔

اور اس کے بعد معلوم ہے مجھ پر ابر کرم کس طرح جھک جھک کر برسا ہے؟ رسول پاکؐ نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ ان کے ہاتھ میری پشت پر آہستہ آہستہ [illegible] صبح پر سے پھوٹتی ہوئی آفتاب کی کرنیں کر رہی تھیں جنہوں نے رات کی ساری تاریکیاں سمیٹ کر کسی [illegible] کر دی ہیں۔۔۔ گویا بادِ بہاری نے ہولے ہولے [illegible] کانٹوں کو پھولوں میں بدل کر خارستان کو [illegible] گلستان بنا دیا ہے۔

اور اس کے بعد کالی کملی والے کی جوش رقت سے [illegible] آواز نے کہا۔

"ابن الخطاب اسلام پر اپنی [illegible] کو بدل ڈالو۔ کہو اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمد رسول اللہ۔"

اور میں نے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ ان زندگی بخش الفاظ کو دہرایا۔۔۔ دہراتا رہا۔۔۔ دہراتا رہا۔۔۔ اب بھی میرا جی چاہتا ہے کہ انہی الفاظ کو دہراتا رہوں یہاں تک کہ میری روح ان الفاظ میں تحلیل ہو کر عرش کی طرف پرواز کر جائے۔"

خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر کیجئے

تائیس

قدیم یونانی رومانیے لباس میں

از جناب فضل حق قریشی دہلوی بی۔ اے

تائیس کی غیر فانی زندگی تاریخ کے ایک گمشدہ ورق پر ثبت تھی۔ سیرت نگاروں کی نظر سے اوجھل اور مورخین کی رسائی سے دور ۔۔۔ صدیاں گذر جانے کے بعد محققین نے بڑی دماغ سوزی سے کام لیکر اُسے دوبارہ زندہ کیا۔ اور اس طرح سکندر کا سرچشمۂ حیات تاریکی سے روشنی میں آگیا۔ ایک طرف اسے موضوع رومان بنا کر فرانس کے زندۂ جاوید ناول نویس اناطول فرانس نے بہت کچھ ردو بدل کے بعد تائیس ہی کا جامہ پہنایا۔ اور دوسری طرف انگلستان کے نازک خیال شاعر آسکر وائلڈ نے عہد نامہ عتیق کی ایک الہامی حکایت پر رنگ آمیزی کرکے سالومی کا روپ نکھارا لیکن دونوں جگہ صداقت سے اس درجہ گریز کیا گیا ہے کہ نقاب اٹھ جانے کے باوجود قارئین اصل شخصیت سے بیگانہ ہی رہے۔ انسائیکلو پیڈیا کی صرف چند سطریں میرے حسب ذیل افسانے کا ماخذ ہیں جس کو قلمبند کرتے وقت میں نے افسانوی رنگ ۔۔ اپنی طرف سے بھر دیا ہے۔ (فضل حق قریشی)

"تقریباً سوا دو ہزار سال گزرے یعنی اس وقت کہ جب حضرت مسیح کی ولادت میں بھی سوا تین سو سال کا عرصہ باقی تھا۔ سورج کا طلوع و غروب اتنا ہی دلفریب اور خوشگوار تھا جیسا کہ آج کل ہے لیکن یونانی فوجوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب عظیم نے اہل ایران کے لئے زندگی کی شیرینی تلخ کر دی تھی۔ کشت و خون کا بازار گرم تھا جس سے فضا کانپ رہی تھی۔ حتیٰ کہ فتح و نصرت کا یونانی پرچم دارالسلطنت پرسیپولس کے قلعہ پر لہرانے لگا۔ فوج کے سپاہیوں نے عرصۂ دراز سے لادا ہوا زرہ بکتر اپنے جسموں سے کھول کر پھینک دیا اور زیر حراست ایرانی دوشیزاؤں کے پرشباب آغوش میں داد عشرت دینے لگے۔ قلعہ میں بھی جشن برپا تھا۔ خود سکندر اعظم، وزیر جنگ اور دیگر مصاحب سلطنت جمع تھے کہ رقص و سرود سے لطف اندوز ہونے کے لئے تائیس کی یاد سب کو ستانے لگی۔ ذرا ذرا کا خون بہانے والا یونان کا سب سے بڑا فاتح یوں تو صنف نازک سے حد درجہ متنفر تھا لیکن تائیس، صرف تائیس ہر حال میں اس کی شریک حیات بنی رہتی۔ لہٰذا اس کو بزم نشاط میں طلب کیا گیا۔ چنانچہ وہ آئی اور دل میں عجیب جذبات لیکر آئی۔

سکندر نے پر اشتیاق لہجہ میں کہا۔ "تائیس! تو خوب جانتی ہے کہ فتح و نصرت کی خوشی میں جو جشن اس وقت منایا جا رہا ہے۔ اس میں تیری شرکت کس قدر ضروری ہے۔ تیرے بغیر یہ لطف و نشاط بے کیف و بے رنگ سا معلوم ہوتا ہے۔ رستہ کا گرد و غبار۔ جو گھوڑوں کی ٹاپوں سے اُڑ اُڑ کر ہماری آنکھوں کے بوسے لیتا رہا تھا، اب خار بن کر کھٹک رہا ہے۔ یہ خلش صرف تیرے رقص کے ایک کیف سکر سے دور ہو سکتی ہے۔ لہٰذا تو ناچ اور اس طرح ناچ کہ تیرے لوچدار لطف کی کیفیات رقصیہ کے سوا ہمیں کچھ اور محسوس نہ ہو۔ اس طرح ناچ کہ رقاصۂ فلک بھی تجھ کو خراج تحسین دینے کے لئے ستاروں کے جھرمٹ سے باہر نکل آئے۔ آسمان کے تارے ٹوٹ پڑیں اور زمین کی گردش رک جائے، اور صرف رقص ہی نہیں۔ بلکہ اپنے سرمدی ترانے سے وہ کیف سرخوشی پیدا کر جس سے ایک طرف اس سرزمین ایران کا بلبل ہزار داستان خاموش ہو کر اپنے پروں کے سوگوار دامن میں منہ چھپالے۔ اور جو دوسری طرف آزردہ دلوں سے دوری وطن کے ناخوشگوار احساسات کو مٹا دے۔ ہمارے یہ ہم جلیس جنہیں اپنا گھر بار چھوڑے کئی ماہ گزر چکے ہیں، اس حقیقت کو فراموش کردیں کہ ہم کسی دور افتادہ ملک میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تیرے شیریں نغمے انہیں وہ فریب احساس دیں کہ یہ سمجھنے لگیں گویا اپنے ہی ایوان خاص میں لطف نشاط حاصل کر رہے ہیں۔"

تائیس جھک گئی۔ گویا خداوند یونان کے حکم کی تعمیل کیلئے بسر و چشم تیار ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ دیر تک فضا میں سکوت چھایا رہا۔

ایکایک وزیر جنگ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "یہ ہماری بھی آرزو تھی بہت مناسب ہو اگر خود عالیجاہ کے قلب کی گہرائیوں میں پہنچکر ہماری تمنائیں محسوس کریں اور تائیس کو دعوت رقص وغنا دے دی ورنہ چھوٹا منہ بڑی بات۔ شاید حرف خواہش زبان تک نہ آتا۔ لیکن اب انتظار کی سختیاں ناقابل برداشت ہوتی جاتی ہیں۔ حکم خداوندی کی تعمیل میں دیر نہیں ہونی چاہیئے۔ عالیجاہ کا ارشاد بالکل حقیقت ہے کہ ہمارے لئے تائیس کا رقص نشاط روح ہے اور تائیس کا نغمہ سرور قلب!"

تائیس کو یہ سخن ناگوار گذرا۔ کیونکہ وزیر جنگ سے ہمیشہ اس کی لاگ ڈانٹ رہتی تھی۔ وزیر چاہتا تھا کہ اپنے بلند مرتبے کے اعتبار سے ہر شخص پر چھایا رہے۔ اور تائیس اس غرور و عز و ناز کے باعث کہ ذاتی طور پر وہ اس کی قدر کرتا تھا چاہتی تھی کہ خود وزیر جنگ بھی اس کے سامنے جھک جائے چنانچہ وہ تنک کر بولی۔

"اس جرات بیجا کی اجازت نہیں مل سکتی۔ عالم پناہ وزیر جنگ کو منع کر دیجئے۔ وہ اپنی رائے سینے ہی میں محفوظ رکھیں۔ میں ہر کس و ناکس کی داد و تحسین سے بے نیاز ہوں۔ شہنشاہ اعظم کے سوا مملکت یونان کی کوئی دوسری ہستی میری قدردان نہیں بن سکتی۔ ورنہ میرے کمالات فنا ہو جائیں گے جو بلا شرکت غیرے صرف عالیجاہ کے لئے مخصوص ہیں۔"

وزیر جنگ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن سکندر نے روک دیا۔ کیونکہ اس کا تڑپتا ہوا دل اور اس کی مضطرب روح اب کسی بحث کی بے لطفی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ تائیس نے جو دیر سے موقع کی منتظر تھی کچھ عرض کرنے کے لئے جان کی امان پائی اور کہا۔

"فتح و نصرت کی دیوی عالیجاہ سے اس قدر خوش ہو کہ اس کرۂ ارض کا دوسرا نام ارض سکندر ہو جائے۔ ہر ملک کے ہر قلعے پر یونانی پرچم لہرائے دنیا کی تاریکیاں مٹ جائیں لیکن صفحات تاریخ سے سکندر اعظم کا نام گرامی نہ مٹ سکے۔ مگر اس کنیز کو کیا حاصل۔ عالیجاہ نے تمام ممالک محروسہ اپنے جان نثاروں میں تقسیم کر دیئے۔ مال غنیمت کے انبار لٹا دیئے مگر ذاتی منفعت کا احساس کبھی میرے دل میں پیدا نہ ہوا۔ حرص و آز کی آگ میرے تن بدن میں نہ بھڑکی۔ لیکن اس قلعہ پرسیپولس میں قدم رکھنے کے بعد سے ایک عرصہ کی سوئی ہوئی تمنا بیدار ہو گئی ہے۔ کیا میں یقین کر لوں کہ میری مراد بر آ سکے گی؟"

اس سے قبل کہ سکندر کچھ کہہ سکے وزیر جنگ بیچ میں بول پڑا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح تائیس پر ایک وار کر سکے۔

"اپنی محرومی کی داستان کو عالیجاہ کے سامنے اس طرح طنزاً بیان کرنا گستاخی اور بے ادبی ہے تائیس!"

اور تائیس نے فوراً ڈانٹ کر کہا۔ "خاموش! ہمارا روئے سخن وزیر جنگ کی طرف نہیں ہے جو اپنی سیاسی چالوں سے شہنشاہ کو ہمیشہ مسحور کئے رہتے ہیں۔"

سکندر نے دونوں حریفوں کی بات پر توجہ نہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہم تیرا مطلب نہیں سمجھے تائیس! آخر وہ کونسی نعمت ہے جو ہمارے خزانے سے تجھے بے دریغ نہ مل سکی؟ اور تو صرف اس کی تمنا دل میں لئے موقع کی منتظر رہی!"

تائیس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "بیشک! تمنائے محض، دل کی گہرائیوں میں پنہاں، اعماق قلب میں چھپی ہوئی، ایک سربستہ راز کی مانند۔ کیونکہ میں جو کچھ چاہتی ہوں وہ کل تک خود عالیجاہ کے قبضہ و اختیار سے باہر تھا — البتہ اب ممکن ہے۔ اس لئے کیا میں امید رکھوں کہ آج اگر اپنے کمالات رقص و موسیقی سے میں نے شہنشاہ عالم پناہ کو خوش کر دیا تو منہ مانگی مراد مل جائے گی؟"

تائیس کی آرزو کی نوعیت یا اس کی تفصیل قبل از وقت معلوم کرنا سکندر اعظم کے لئے جس کے عزم و ارادے کے سامنے دنیا کی کوئی بات غیر ممکن نہ ہو سکتی تھی باعث شرم تھا اس لئے بلا تامل وعدہ کر لیا کہ منہ مانگی مراد دے دی جائیگی۔ چنانچہ رقص شروع ہوا اور موسیقی کی تانیں فضا میں بلند ہو کر حاضرین کے دلوں کو تڑپانے لگیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے جملہ کمالات کا مظاہرہ صرف اسی وقت کر دینا چاہتی تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حاضرین محسوس کرنے لگے گویا وہ وقت اور جگہ کے تعینات سے بے نیاز ایسی فضا میں پہنچ گئے ہیں جہاں رقص اور موسیقی کے سوا تیسری چیز کا امکان نہیں ہوتا۔ لیکن مسرت کے لمحات سریع الزوال ہوتے ہیں۔ جلد ہی ان کی روحوں کو آسمان کی بلندیوں سے اتر کر زمین پر آجانا پڑا۔ تائیس خاموش ہو کر بادشاہ کے سامنے جھک گئی۔ ہر طرف ایک گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ اور سکندر اعظم کے سوا کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس گہری خاموشی کو توڑ سکتا۔

"قسم ہے دیوتاؤں کی عظمت و جلال کی تائیس! تو نے ہمارا دل خوش کر دیا۔ حقیقتاً ہم نے آج محسوس کیا ہے کہ ایک تھکے ہوئے دماغ کے لئے تیرا رقص اور مضمحل روح کے لئے تیری موسیقی دنیا کی وہ بے مثل نعمتیں ہیں جن کا بدل مستقبل میں بھی دوسروں کو نصیب نہیں ہوگا۔ تیرے کمالات غیر فانی ہیں۔ سکندر کی عظمت بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ دنیا کا ہر فاتح تیرے سامنے ہتھیار ڈالدے گا۔ تیرے

پاس وہ ہتھیار ہے جس سے دلوں کی تسخیر ہوتی ہے۔ اپنے دشمنوں کو بحر ظلمات میں ڈبو دینے والا سکندر تیری موسیقی کے گرداب میں غرق ہو کر رہ گیا۔ تیری کیا آرزو ہے؟

ہر شخص یہ سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھا کہ دیکھیں تائیس کیا کون سی بیش قیمت شے طلب کرتی ہے۔ اور جب انہوں نے سنا تو وہ حیرت و استعجاب میں ڈوب گئے۔ ان کے خیال کے مطابق تائیس کی خواہش کتنی وحشیانہ تھی۔

"میں چاہتی ہوں کہ اس عظیم الشان محل کو جس کی چار دیواری میں فتح و نصرت کا جشن نشاط منایا جا رہا ہے۔ آج اور اسی وقت نذر آتش کر دیا جائے۔"

جس طرح رات کے سناٹے میں اچانک گھڑیال کی آواز سنائی دے اور دوبارہ خاموشی چھا جائے۔ ایک بار پھر گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ لیکن اس دفعہ لوگوں کے چہرے مستقبل کے کسی نامعلوم خطرے سے خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔ اس زمانہ میں عظمت و شان کے اعتبار سے پرسیپولس دنیا کا دوسرے درجہ کا شہر تھا۔ اور اس کا قلعہ اپنی نظیر آپ تھا۔ اس کو خاکستر کرنا گویا دیوتاؤں کی دی ہوئی نعمتوں کو ٹھکرا دینا تھا۔ کچھ دیر بعد سکندر کو مخاطب کر کے وزیر جنگ نے کہا۔

عالیجاہ! تائیس کا حقیقی مطلب سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ کوئی فاتر العقل انسان بھی یہ تمنا نہیں کر سکتا۔ محل کو نذر آتش کر دینے کی آرزو ایک رمزیہ انداز بیان ہے۔ جس کے پس منظر میں نسوانی حکومت کا پرچم لہرا رہا ہے۔ تائیس چاہتی ہے کہ اس تمام ملک کی خود مختار حکمران بن بیٹھے۔"

سکندر نے گردن کو اس طرح جنبش دی گویا وہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر یہ حقیقت ہے تو تائیس کی آرزو پوری کر دی جائے گی۔ مگر تائیس نے فوراً تردید کر دی۔

"میرے الفاظ کا مفہوم غلط سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے۔ شہنشاہ عالم کے ہوتے ہوئے کسی رکن سلطنت کے دل میں ذاتی خود مختار حکومت کا وہم و گمان خلل دماغ اور نمک حرامی کی لعنتی دلیل ہے۔ تائیس کے خیالات اتنے مبتذل نہیں ہو سکتے۔ میرا دلی مقصد میرے الفاظ سے ظاہر ہے۔ کسی مزید تاویل کی ضرورت نہیں۔"

سکندر نے حسرت و یاس کے ساتھ ایک نظر چاروں طرف ڈالی اور چاہا کہ تائیس کی توجہ وہاں کے سامان آرائش کی طرف منعطف کرائے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بے نظیر قالین جس کی نرم سطح پہ تائیس نے چند لمحے پیشتر مظاہرۂ رقص کیا تھا ارض کشمیر کی حسین و جمیل دوشیزاؤں نے سرائی ٹھنڈی راتوں میں اپنی آنکھوں کا تیل نکال کر نازک ہاتھوں سے تیار کئے تھے۔ اور حریر و دیبا اور کمخواب و زربفت کے ریشمی پردے جو سقف و بام کے درمیان حاضرین کی نگاہوں کے سامنے آویزاں تھے۔ چھ ماہ سے زیادہ مدت کی ساخت طے کرانے کے بعد ارض چین سے منگائے گئے تھے۔ مگر تائیس کی نگاہ میں ان چیزوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ ان چیزوں کو جلتا ہوا دیکھ کر خوش ہونا چاہتی تھی۔ سکندر نے کہا۔

زنگار رنگ کے یہ غیر فانی شاہکار جن سے دیواروں کی تزئین کی گئی ہے ان باکمال مصوروں کی جانفشانی کا نتیجہ ہیں جن کے ہاتھ ان حسن کاریوں کے ختم ہو جانے کے بعد قلم کر دیئے گئے تھے تاکہ وہ ایسے شاہکار پھر کسی دوسری جگہ نہ بنا سکیں۔

مگر تائیس کا جواب تھا۔ "مجھے نہ ان مظلوموں کے ساتھ کوئی ہمدردی ہے۔ اور نہ ان نایاب نقوش کی پروا۔ میں تو یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ جب آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے ان دیواروں کو جلاتے ہیں تو ان نقوش کے تغیر پذیر رنگ کیسے کیسے لطیف پہلو پیدا کرتے ہیں۔"

"اور تجھے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔" سکندر نے متاثر کر دینے والے لہجہ میں کہا۔ "دیگر سامان آرائش کے ساتھ یہ تخت جمشید بھی جل کر فنا ہو جائے گا۔ جسے بخت نصر شاہ بابل نے نیفرتیتی ملکہ مصر کے مقبرے کو کھدوا کر نکالا تھا۔ اس تخت میں ساڑھے تین ہزار الماس ڈھائی ہزار یاقوت، چار ہزار نیلم، اور تقریباً دس ہزار دوسرے قسم کے جواہر لگے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ ستر ہزار ایسے موتی ہیں جن کو جزیرہ پافوس کے نوجوانوں نے سمندر کی تہ میں ڈوب کر اور جان جیسی پیاری چیز کی بازی لگا کر جمع کیا تھا۔ اس میں صدہا ایسی اچھوتی سیپوں کے پشت ہائے نگارین بھی نصب ہیں جنھیں اولیں موتی بنانے سے قبل ہی پکڑ لیا جاتا ہے۔ اس تخت پر گیارہ بادشاہوں اور ایک ملکہ نے بیٹھ کر حکومت کی ہے۔"

لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تائیس پتھر کی بے جان مورت ہے۔ اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے اصرار پر قائم رہی۔ —— تب سکندر نے کہا۔

"خیر یہ سب چیزیں قیمت کے اعتبار سے گرانبہا ہیں اور دنیوی زندگی کا سامان ہیں۔ لیکن آبنوسی۔ مرمریں۔ اور دندان فیل سے بنی ہوئی شام و مصر کے دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیں جن کی ظاہری

شانِ الوہیت ہی ساوی تقدس کی دلیل ہے۔ کیا ان کو بھی فنا کر دیا جائے اور کیا اس گناہِ عظیم کے ارتکاب سے ہم پر کوئی عذاب شدید نازل نہیں ہوگا؟ ہمیں یاد ہے کہ مصر پر زہریلی مکھیوں اور ٹڈیوں کے عذاب نازل ہوئے۔ دریا میں طغیانیاں آئیں۔ وبائیں پھیلیں اور زبردست قحط پڑے۔ یہ سب اس لئے کہ قبطیوں اور کلدانیوں نے رب عمون اور اوسیرس کی شان میں گستاخی کی تھی۔ اگر ہم ان کے بت توڑ ڈالیں تو ضرور ہم پر بھی کوئی نہ کوئی عذاب نازل ہوگا۔"

بیباک تائیس پر اس گفتگو کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ "اول تو یہ دیوتا ہم سے ناراض نہیں ہو سکتے کیونکہ ہمارا ان پر کوئی عقیدہ نہیں ہے۔ اور اگر یہ عذاب نازل کرنے پر آمادہ بھی ہو جائیں تو وہ دیوتا ہم کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیں گے جن کی پرستش ہم خلوصِ قلب کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ڈرنا نہیں چاہئے۔"

جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو سکندر نے آخری ہمت سے کام لیکر کہنا شروع کیا۔

"ان تمام منقولہ اشیا سے قطع نظر محل کی مستحکم عمارت پر غور کر تائیس اس کے بلند کنگرے آستانۂ فلک کو چوم رہے ہیں۔ بیرونی دیواروں کی مینا کاری صنعت کا بے مثل نمونہ ہے۔ دائیں طرف شاہ جمشید مصریوں سے خراج وصول کر رہا ہے اور دوسری طرف یونانیوں سے۔ کیا یہ نقوش مٹ جانے کے لائق ہیں؟ آج کل یہ شاہی محل ہے لیکن عہدِ قدیم میں عبادت گاہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا سنگِ بنیاد خود زرتشت نے رکھا تھا۔"

تائیس نے اس طرح چونک کر گویا خود اس کے الفاظ سکندر کی زبان سے ادا ہوئے ہیں پر زور لہجہ میں کہا۔ "اور اسی لئے میں چاہتی ہوں کہ اس کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔"

سکندر نے ہمت ہار دی اور مایوس ہو کر خاموش ہو گیا۔ اس نے یقین کر لیا کہ تائیس آگ اور خون کی ہولی کھیلے بغیر چین نہ لیگی۔ وہ قول ہار چکا تھا۔ اور اُصولاً اسے ایفائے عہد کرنا ضروری تھا۔ اسی اثنا میں وزیرِ جنگ نے بادشاہ کو مخاطب کر کے کہا۔

"جنون کی ایک حد ہوتی ہے عالم پناہ! اور ایک فاتر العقل کے ارادے کبھی پختہ نہیں ہوتے۔ تائیس کا مسلسل اصرار کئے جانا ثابت کرتا ہے کہ اس کے دل میں کوئی بات چھپی ہوئی ہے۔ کوئی ایسا راز ہے۔ جواب تک ظاہر نہیں ہوا۔ اس سے پوچھئے کہ آخر یہ اس محل کو مع سامانِ آرائش تباہ و برباد کر دینے پر کیوں تلی ہوئی ہے؟"

یہ ایک اشارا تھا جس پر سکندر نے اس وقت تک غور نہیں کیا تھا۔ چنانچہ وہ پھر اس طرح چونک پڑا جیسے کسی کو کھوئی ہوئی چیز مل جائے۔ اور تائیس کی طرف اس انداز سے دیکھا گویا نظروں ہی نظروں میں اس سے کہہ دینا چاہتا ہے کہ وزیرِ جنگ کا سوال خود ہمارا استفسار ہے۔ جس کا جواب دیا جائے۔

تائیس کے جذبات سینے کے نشیب و فراز میں مچلنے لگے۔ اور سانس کی آمد و شد تیز تر ہو گئی۔ اس نے بلند لہجے میں کہا "جہانپناہ کا اقبال بلند ہو۔ اس کنیز کے دل میں انتقام کی آگ دبی ہوئی ہے جس کی چنگاریاں کریدکر چاہتی ہیں کہ اس محل کو جلا کر خاک سیاہ کر دیں تاریخ کے چند ورق اُلٹیے۔ جب یونان پر ایرانیوں نے حملہ کیا تو انھوں نے بھی ہماری عبادت گاہوں کو مسمار کر دیا تھا۔ دیوتاؤں اور دیویوں کے بت توڑ ڈالے تھے۔ ہماری قیمتی اور نایاب اشیا لوٹ لی تھیں صنعت و حرفت کے بے مثل نمونے تباہ کر دیئے اور مقدس نوشتے جلا ڈالے تھے۔ عفت مآب عورتوں کی عصمت دری کی تھی معصوم بچوں کے گلے نوکِ شمشیر سے چھید دیئے تھے۔ اور وہ سب کچھ کیا تھا جو تقاضائے وقت کے اعتبار سے انھیں کرنا چاہئے تھا۔ کیونکہ وہ فاتح تھے۔ گردشِ زمانہ کے ساتھ واقعات پلٹ گئے۔ اب ہمارا وقت آیا ہے۔ انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ اسی طرح ایرانیوں کی عبادت گاہوں کو مسمار کرا دیجئے۔ ان کے بت توڑ ڈالئے فلک بوس محلوں کی بلند بنیادوں کی پستی میں گرا دیجئے علوم و فنون کو اس طرح تباہ کر دیجئے کہ تاریخ میں ان کا ذکر باقی نہ رہے۔ یہ محل جن کے بام و در آج تک پری تمثال حسینانِ ایران کی جولانگاہ تھے۔ کل سے صحرائی درندوں اور خون آشام پرندوں کا مسکن بن جائیں۔ مستقبل بعید کے سیاح بمشکل معلوم کر سکیں کہ پرسیپولس ارضِ ایران میں کس جگہ واقع تھا۔ عالیجاہ! میری یہ آرزو پوری کر دیجئے۔ مجھے ڈر ہے کہ آنے والی نسلوں کو یہ کہنے کا موقع نہ مل جائے کہ جہانگیر کے بیٹے نے ایک معمولی عورت سے وعدہ خلافی کی۔"

یہ عمیق الاثر تقریر سن چکنے کے بعد ہر شخص کی نگاہیں سکندر کی طرف اُٹھ گئیں یہ معلوم کرنے کیلئے کہ دیکھیں کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ اب بادشاہ کے چہرے سے حزن و ملال کے آثار مفقود ہو چکے تھے۔ اس نے کسی قدر اطمینان کے ساتھ کہا۔ "تائیس تجھے اجازت ہے مشعل اٹھا اور یہاں کی ہر چیز کو جلا کر خاک کر دے تیرا جذبۂ انتقام لائقِ تحسین ہے۔"

اور اس کے بعد کیا ہوا اس کے اظہار سے دل دکھتا ہے۔ عورت کے انتقام کی آگ بھڑک کر ریشمی پردوں سے ہم آغوش ہو گئی اور انجام کار وہ سب کچھ ہوا جو تائیس کے دل کی آرزو تھی صدیوں میں حاصل کیا ہوا عروج لمحوں میں مٹ کر رہ گیا۔ سیلابِ فنا کی موج

رقیب کا دل

جنگ کریمیہ ۱۸۵۵ء کا ایک رومان

از جناب صائب فتحپوری

آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سردی کی لپٹیں خلاف معمول ہوا میں آ آ کر شامل ہو رہی تھیں۔ شمال کی طرف سے جنگ کا سفید دیو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھور رہا تھا۔ ملک کا بچہ بچہ بادۂ حب وطن سے سرشار ہو کر اپنے ہتھیاروں کی صیقل آرائی میں مشغول' ہر در و دیوار پر افواہیں رقص کناں' شہر کے چپہ چپہ سے تلواروں کی جھنکاریں اُٹھ اُٹھ کر مردہ دلوں کو دعوت حیات دے رہی تھیں۔ پھولوں کے گہواروں پر سارے دن اوس پڑ جاتی تھی۔ کلیاں بن کھلے مرجھا جاتیں' پنچھی آتے اور بن گائے اڑ جاتے گھٹائیں منڈلاتیں اور بے برسے نکل جاتی تھیں

سورج آنکھ ملتا اٹھا' باغ کی کھڑکی کھلی' ہر شے جوانی کے سمندر میں ڈوب گئی' خوشبودار لپٹیں آنے لگیں' غنچے چٹکنے لگے۔ پھول کھلکھلا پڑے نوجوان گلابی جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا اور وہ کسی گہرے خیال میں ڈوبی ہوئی ایک روش پر چلنے لگی۔ سورج مسکرا رہا تھا۔ سارا چمن خوشی کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ وہ نرم نرم انگلیوں سے چہرے کے نقوش کو ٹٹول کر بولی۔

"مجید اٹھا لو اپنا ہاتھ میری آنکھیں دکھ رہی ہیں"

مجید کنول کی طرح سطح زمین پر تھرکنے لگا۔ اس نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے ملک پر جنگ کے کالے کالے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ہر شخص پریشان' رعایا سوگوار اور اراکین سلطنت متفکر ہیں اس وقت ہمیں عشق و محبت کی بھول بھلیاں سے آزاد ہو کر وطن کی حفاظت کرنی چاہیئے۔

مجید نے اس کی بات گویا ہنسی میں اڑا کر کہا۔ "زلیخا مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مستقبل قریب ہولناک جنگ ہونے والی ہے اگر تم میرے سوال کا جواب حسب منشا دے دو تو میں اکیلا سفید بھیڑوں کے لشکر کو آن کی آن میں پسپا کر سکتا ہوں"

جیسے زلیخا نے اس پر پھبتی کستے ہوئے کہا "میں اپنا بیش قیمت وقت تمہاری فضول باتوں میں نہیں گنوانا چاہتی۔ حکومت کو تیرے مشورے درکار ہیں"

مجید نے مضحکہ آمیز لہجہ میں کہا۔ "کیا خوب! حکومت کے مدبرین ایک ناقص العقل کے مشورے کے طالب ———"

زلیخا قطع کلام کرتے ہوئے بولی۔ "عورت کا مفہوم بڑے بڑے منطقی اور فلسفی سمجھنے سے عاجز ہے تاریخ اٹھا کر دیکھ لو۔ عورتوں کی بہادری اور شجاعت کے کارنامے۔ یاد رکھو جس ملک میں عورتوں کی قدر و منزلت نہیں ہوتی وہ سیاست و حکومت میں ہمیشہ پیچھے رہتا ہے"

"مجھے تمہارے منطقیانہ خیالات سے اتفاق نہیں اور نہ میں ایسا ناقدر شناس ہوں کہ بارگاہ محبت میں ایسی گفتگو جائز تصور کر لوں"

زلیخا آگے بڑھی۔ مجید نے گلاب کے جھنڈ کے قریب جا کر ایک پھول توڑنا چاہا کلی نے کہا۔

"موتی توڑے نہیں جاتے"

مجید نے خواہش کی کہ کلی توڑے۔ پھول نے کہا۔

"صدف کو پاش پاش کر ڈالنے پر موتی کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں؟"

مجید کی ناامیدی اور غالباً شکست فاش پر پھولوں نے قہقہہ لگایا بہت سی کلیاں اس شور و شغف میں چٹک گئیں۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں زلیخا۔" مجید پیر دل پر جھکتا ہوا بولا "کیا تمہیں نہیں معلوم؟"

"بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور تم سے بہت پہلے" سرنگوں مجسمے کو اٹھاتے ہوئے زلیخا نے کہا۔ "لیکن افسوس مجھے تم محبت ہے"

"جب تک دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے نہیں ملتے کسی قسم کی آواز نہیں پیدا ہوتی"

"زلیخا تم مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتیں؟"

"محبت کی نہیں جاتی" زلیخا نے مدبرانہ انداز سے کہا۔ "بلکہ ہو جایا کرتی ہے"

کشتی کی چولیں پہلے ہی ڈھیلی ہو گئی تھیں۔ مسافر حیات موجود میں پرتو اجل کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اگر ملاح سمندر کو تن تنہا ہی عبور کرے تو یقیناً مسافر سمندر کی خوفناک لہروں کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شکن ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کشتی کا کوئی تختہ ہی مسافر

کو ساحل آشنا کر دیا۔

"زلیخا! مجھے [illegible] میری بہن!"
اپنے بھائی کو پھول کے جواب میں کلیاں تبسم کر دیں۔

"کوئی بھائی اپنی بہن سے ایسی محبت بھی نہیں کرتا۔"

"زلیخا! دولت نے تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ محبت کی خوابگاہ میں بادشاہی کے خواب ——— اکثر خوابوں کی تعبیر برعکس ہوا کرتی ہے۔"

"عورت ناقص العقل ہوتی ہے۔ ایک صاحب عقل کو اس کے گرد نہ لگنا چاہئے۔" فیصلہ کن لہجہ میں زلیخا نے کہا "مجھے تم سے صرف اتنی محبت ہے جتنی فطرتاً ایک بھائی اور بہن کو ہونی چاہیے۔"

"اچھا اچھا ——— میں دیکھوں گا تمہاری محبت اور ——— اور عورت" کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

اسی دن ——— رات کے وقت وہ چاندنی کا سہارا لئے ہوئے ہوا سے باتیں کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک اونچائی پر پہنچ کر کہنے لگا۔

"اے چاند! دنیا کے عزیز ترین سیارے! میں اپنے پیارے وطن اور عزیز و اقربا کو چھوڑ کر آ رہا ہوں ——— جس ملک کی عورتیں محبت کی منزلت سے ناواقف ہوں وہ ملک دستبرد زمانہ سے کبھی نہیں بچ سکتا۔" چاند نے اس کی تقریر پر قہقہہ لگایا۔ ساری کائنات ہنسنے لگی۔ ستارے مسکرانے لگے۔ آسمان کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ ٹیلے ہموار ہو گئے۔ لیکن وہ درختوں، جھاڑیوں اور دریاؤں کو پار کرتا ہوا نہ جانے کس طرف چلا جا رہا تھا۔

(۲)

"اگر تم مرد ہو تو کسی عورت کے مقابل اظہار محبت نہ کرو۔ حسن ویسے ہی مغرور ہوتا ہے۔ تمہارا اقرار محبت عشق کے مزے کو اور کرکرا کر دیگا" زہرہ نے پھر گھنٹی بجائی اور افسانے کا باقی حصہ ختم کرنے لگی۔ "اگر تم عورت ہو تو کسی مرد کے روبرو اعتراف محبت نہ کرو۔" وہ پڑھتے پڑھتے رکی، پہلو میں پھانس چبھنے لگی۔ پھر پڑھنے لگی "ورنہ تمہارا آبگینہ معمولی سی ٹھیس سے چکنا چور ہو جائے گا۔ معمہ حل کرتے کرتے ہونٹوں سے الفاظ ٹکرائے "محبت کا بہترین زیور خودداری ہو سکتا ہے۔" پردہ متحرک ہوا، پھر کلیاں پھول اور پتیاں سمٹنے لگیں۔ زہرہ نے تکلف آمیز مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور بولی۔

"محبت کی تعریف کیا ہو سکتی ہے زلیخا؟"

"اپنے وطن کی خدمت کرنا۔"

"اس کے معنی یہ ہوئے کہ محبت کا دوسرا نام خدمت ہے۔"

"اگر ابلیس ابوالبشر کو سجدہ نہ کرے تو وہ احدیت کی کیا خطا؟"

"میں نہیں سمجھی تم کیا کہہ گئیں۔"

"جن جذبات و احساسات سے متاثر ہو کر انسان وطن کی خدمت کرتا ہے اسی ولولہ کا نام محبت ہے۔"

"اور اس کے برعکس [illegible] وساطت۔"

"تم تو لکیر کی فقیر ہو۔ بہت سے الفاظ توضیح طلب ہوا کرتے ہیں۔"

"مجھے آپ کا تمثیلی ثبوت مسکاد نہیں صرف محبت کی تعریف کیجئے۔"

"مرد صرف خواہشات نفسانی سے مرعوب ہو کر اظہار محبت کرتے ہیں لیکن عورت کا معبود حسین، تندرست، خوش اخلاق اور خوبصورت نوجوان ہوتا ہے۔"

"محبت جیسے ملکوتی جذبہ کی توہین کیجئے۔ تعریف لکھی ہی تو قائل نہیں۔ معلوم ہوتا ہے تمہارا مستقبل قریب میں کوئی خوبصورت بد پر پھڑ پھڑا رہا ہے۔" زلیخا مسکرائی اور پیرایہ کلام بدلتے ہوئے بولی "جب ملک و قوم کو نازک وقت ایسی باتوں کی فرصت نہیں وہ ہماری مدد کے خواہاں ہیں۔" زہرہ نے طنزاً کہا "دیکھئے تو محاذ جنگ پر تشریف لیجا رہے ہیں۔"

"اسی خدمت کا نام محبت ہے۔" زلیخا پالا جیتتے ہوئے بولی "محبت کا شرف جگہ جگہ بدلتا رہتا ہے۔"

سورج کانپتا، تھرتھراتا خون کی بوندوں سے کائنات کو رنگتا ہوا مغربی گوشے میں جا چھپا، ہلکی ہلکی تاریکی میں بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔ پایۂ تخت کے بڑے بڑے بازاروں میں فوجی دستے گشت کر رہے تھے زلیخا کھڑکی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ رگیں تنی جا رہی تھیں۔ خون جوش مار مار کر سارے بدن میں زلزلہ بپا کر رہا تھا۔ پھر سنسناہٹ سے مسکراہٹ اور صوفے پر دراز ہوتے ہوئے بولی "یا الٰہی فتح ہو۔" دفعتہً دروازہ کھلا۔ پردہ ہٹا اور ایک میٹھا نغمہ کانوں سے ٹکرایا۔

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"

نیچی نگاہیں کان میں "ہاں" کہہ گئیں اور پتلے پتلے لب ہلے۔

"آپ کو اس کے لئے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"زلیخا تم تو وزیر اعظم کی پارۂ جگر ہو لیکن میں بحیثیت ولیعہد تم سے ملنے نہیں آیا۔" وہ کہتے کہتے کھڑکی کے پاس پہنچا۔ نیچے سڑک پر دور تک سپاہی قطار اندر قطار ایستادہ کسی حکم کے منتظر تھے۔ وہ پیچھے ہٹا اور بولا "تم کو اور اپنے عزیز وطن کو خدا کی امان اور بادشاہ کے سایۂ عاطفت میں چھوڑ کر جاتا ہوں۔" باجوں کی آواز نے سپہ سالار کی اپنی

طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے پھر کہا: "مجھے رخصت کرو۔ بہادروں کا شیوہ آنسو بہانا نہیں۔ تم عورت نہیں ہو۔" زریں تاج نے اپنی آواز میں کہا: "سردار آپ کیا کر رہے ہیں؟" سپاہی جوش شہادت سے بیتاب ہو رہے تھے، مسعود فضا میں ایک نعرہ رقص کرنے لگا۔ "بہادر سپاہی! مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چلو۔"

"اگر تم جیسا زندہ دل اور شجاع رہبر ہمارے ساتھ ہوگا تو ملک کی عورتوں کے مردہ دلوں میں شجاعت و مردانگی کی روح پھونکنے والا کوئی نہیں۔ اس معرکہ سے زیادہ اہم اور ہولناک لڑائی ہی ہے اگر ——— ترکی میں ایسی ہی بلند ہمت خواتین موجود ہیں تو یقیناً اسے ہر جنگ میں فتح نصیب ہوگی۔ اچھا خدا حافظ!"

وہ موتی نچھاور کرتی ہوئی دروازہ تک گئی اور پھر کھڑکی سے جھانک کر الوداعی رومال ہلانے لگی، ہوا چلی گرد اڑی، لہریں متحرک ہوئیں تھوڑی دیر بعد سڑک پر وہی بجلی کی گرد آلود روشنی اور کھمبوں کے سائے کے دوش بدوش ہر مرحش سناٹا دیواروں پر چھایا ہوا تھا۔

——— (۳) ———

موت کے گھڑیال کا منہ آج پھر صبح ہونے سے پہلے ہی حلق تک بھر گیا تھا۔ مجروح و مقتول سپاہی ایک دوسرے کے اوپر نیچے ادھر ادھر گر گر کر تڑپ رہے تھے۔ ترکی فوجیں دوپہر تک نہایت استقامت، ثبات قدمی اور جوانمردی سے لڑتی رہیں بگڑی گھڑی کی خبر جلائے تخت میں پہنچتی تھی گھڑیال نے دو بجائے زلیخا کا طائر دل بسمل کی طرح خون میں لوٹنے لگا پھر چہرہ اداسی کی گھٹا چھا گئی۔ گھنٹی بجائی اور نڈھال ہو کر صوفہ پر دراز ہو گئی تھوڑی دیر بعد ایک سانولے رنگ کا نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ یہ الٹی اور اس کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہو کر شہر سے باہر نکل گئی۔ حسن جب سیاہ لباس میں ملبوس ہوتا ہے تو چار چاند لگ جاتے ہیں اور جب مغموم ہوتا ہے تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے ——— آخری بار حسرت و یاس سے شہر کی بڑی مسجد کے بلند منار کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئی۔ چند منٹ کے سکوت کے بعد دونوں گھوڑے ہوا میں اڑنے لگے۔

شام ہوتے ہوتے دونوں سوار ایک وسیع سرسبز خطے میں پہنچے جہاں سے شمال مغربی گوشہ میں رات کی ڈراؤنی تاریکی کے ساتھ ساتھ بہت دور سمندر کی سیاہی نظر آ رہی تھی۔ دل بلیوں اچھلنے لگے۔ گھوڑے اور بھی تیز دوڑا دیئے گئے ——— چاند نورانی سمندر سے غوطہ لگا کر نکلا ہی تھا کہ یہ دونوں ساحل سمندر پر کسی گہری فکر میں ڈوبے ہوئے خاموش کھڑے تھے یکایک پانی میں مچھلی کے اچھلنے کا معمولی سا دھماکا ہوا۔ سرخ چہرے پر کامیابی کی لہریں نمائشیں مارنے لگیں۔ نوآمدہ کشتی لی گئی اور عین کی معاونت میں دونوں گھوڑے دے دیئے گئے۔ آسمانی سمندر میں نورانی کشتی آہستہ آہستہ اور آہستہ آہستہ رواں تھی۔ ادھر بحر اسود کے کالے سینہ پر ایک دوسری کشتی متحرک ہوئی منزل مقصود کی طرف چلی جا رہی تھی۔ زلیخا کا دل بیتاب جذبات سے ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ کون کون سی تدبیر ہو سکتی ہے جن کے ذریعہ سے حبیب جلد از جلد اپنے محبوب کے قدموں پر سر رکھ دے عورت کے نزدیک جب حصول مطلوب کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو وہ ساری کائنات کو ایک ہی چھلانگ میں پار کر لیتی ہے۔

بارہ بجے کے قریب رات کے بھیانک سناٹے اور سمندر کے ہولناک سکوت کو چیر پھاڑ کر کشتی قلعہ کی دیوار سے ٹکرائی۔ پہرہ داروں کی آوازیں کانوں میں آ آ کر   پائے استقامت کو جنبش و لرزاں کر دیتی تھیں۔ زلیخا نے صادق کے کان میں کچھ کہا اور ایک خوشبو بیک جیب سے نکال کر اس کے حوالہ کی۔

حبیب کی دنیا کا واحد مقصد محبوب کی پابوسی ہوتا ہے۔ دنیا اور اس کے لوازم، زندگی اور اس کے عناصر تکلفات کے بے پایاں سمندر مصائب و تکالیف کے فلک بوس اور اٹل پہاڑ اس کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ مصیبت کے وقت عورت کا دل بسا اوقات خدا کی طرف مائل ہوتا ہے لیکن زلیخا کی آنکھیں قلعہ کی آخری منڈیر اور دل گنبد کے آخری حصہ پر کسی امید افزا انجام کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد دو متحرک سائے قلعہ پر نظر آئے۔ پہچاننے والی آنکھیں مسکرانے لگیں۔ ہونٹ کپکپانے لگے۔ ایک لمبا سا سایہ نیچے اترا۔ دونوں آپس میں بغلگیر ہوئے زلیخا نے فتحمندانہ انداز سے چپو اٹھایا اور کشتی سمندر کے سینہ پر ناچنے لگی۔ ابھی سفینۂ محبت نے ایک فرلانگ کا فاصلہ بھی طے نہ کیا تھا کہ سمندر میں ایک ڈراؤنا دھماکا ہوا۔ پہرہ دار بے وقت کی شہنائی کی طرف متوجہ ہوئے کشتی کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

"کیوں زلیخا!" نوجوان نے چپو روکتے ہوئے کہا۔ "احسان کا بدلہ کیا ہونا چاہیئے؟"

"غلام کا فرض ہے۔" زلیخا مضمون بھانپتے ہوئے بولی۔ "کہ آقا کی حفاظت میں اپنی ہستی فنا کر دے۔"

"اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

زلیخا خاموش ہو گئی جیسے اس نے اپنی ہار مان لی ہو۔ نوجوان غلام کے چہرہ کو بغور دیکھتا ہوا بولا۔ "آقا کا فرض!"

"ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیئے۔" زلیخا نے چپو پانی کے جگر سے نکال کر کہا

"تم جاتی ہو۔" نوجوان زلیخا کی ہمت آزماتے ہوئے بولا۔ "میں پھر آزادی نصیب نہ ہوگی۔ بہتر یہ ہے کہ تمہیں ساحل تک پہنچا آؤں۔"

زلیخا نے دامن استقلال سنبھالتے ہوئے کہا۔ "قید کا دوسرا نام آزادی بھی تو ہے۔"

کشتی ساحل سے جا لگی۔ دونوں اُترے۔ سپاہیوں نے آگے بڑھنے سے روکا۔ اور باغی تصور کرکے زنجیروں میں جکڑنا چاہا۔

"اگر تم گرفتار شدہ قیدی کو آزاد کرنے کا وعدہ کرو۔" نوجوان نے ہمدردی آمیز بہادرانہ لہجہ میں کہا۔ "تو ہم دونوں کو آزادی کے ساتھ گرفتار کر سکتے ہو۔"

سپاہیوں نے یہ شرط منظور کرلی۔

(۴)

ایک قیدی بڑبڑا رہا تھا۔ "قیدیوں کی صبح بھی تیرہ رہتی ہے اور شام بھی ــــ"

دوسرا چلا رہا تھا۔ "بابا دو قلعہ کی دیواروں کو آؤ بجا دیں اینٹ سے اینٹ"

تیسری کوٹھری سے آواز آ رہی تھی۔ "اگر ہم سب متفق ہو جائیں تو حکومت کی کایا پلٹ کر سکتے ہیں۔"

صادق زنجیر کی کڑیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ "جس حکومت کے اصول وعدہ خلافی اور بزدلی پر منطبق ہوں گے وہ کبھی شاہراہ ترقی پر گامزن نہیں ہو سکتا۔"

سامنے سے گزرتے ہوئے روسی سپاہی سے مخاطب ہوتے ہوئے "دور ہو جا مردود باغی مفسد یہ تنا۔ میرے سامنے سے دفع ہو جا۔ کیوں ہنستا ہے؟"

روسی سپاہی منہ پھیلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ آفتابی کرنیں قلعہ کی منڈیر کے سہارے نیچے اتر رہی تھیں۔ آہنی سلاخوں کے اندر شور و غوغا مچا ہوا تھا۔ ایک کمرہ میں زلیخا نوجوان کے زانو پر سر رکھے اس کے بھورے بھورے بالوں سے محو تماشہ تھی۔

"میرے بال کیوں الجھا رہی ہو زلیخا؟"

"مجھے تمہارے بال بہت پسند ہیں۔" کسی قدر شوخی سے "گھونگھریالے بالوں میں اپنی بیش قیمت چیز تلاش کر رہی ہوں۔"

"تم جب ایک مٹھی بھر بالوں میں اپنی پیاری چیز نہیں تلاش کر سکتیں" نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تو میں تمہاری گھنی زلفوں میں اپنا دل کیونکر پا سکتا ہوں۔"

"بحر ظلمات طے کرنے کے بعد ہی آب حیات کا روشن ساحل نظر آتا ہے۔"

"قید خانے میں بھی تمہاری فطرت تبدیل نہیں ہوئی زلیخا۔" فلفلہ کو ہاتھوں سے چھوتا ہوا نوجوان بولا۔ "اس کے برعکس کہ عورت کی فطرت لحظہ بلحظہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔" پیشانی کو چومتے ہوئے۔ "یہ بھی کتنی بہترین پیشکش ہے فطرت کی ــــ"

"کتنی لاجواب اور ناقص العقل۔" زلیخا نے جل بھنتے ہوئے کہا۔

"اہا ہا ــــ!"

"آج ایک مدت کے بعد تم دل کھول کر ہنسی ہو۔ کیا عورت کے ناقص العقل ہونے پر تمہیں پورا پورا یقین بھی ہے۔"

"ہاں" زلیخا مرجھائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تجربہ نے یہی کچھ سکھایا ہے۔"

باز نے کبوتر کو پنجہ میں دبوچتے ہوئے کہا۔ "تمہارے تجربہ سے میں بھی آگاہ ہونا چاہتا ہوں غالباً تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"اس راز کو راز ہی رہنے دو۔" زلیخا انکار کا پہلو تلاش کرتے ہوئے بولی۔ "مبادا تکلیف پر تکلیف کی افتاد کوئی نیا گل کھلائے۔"

"مجھے تعجب ہے۔ تمہاری مشکل پسند طبیعت نے اتنی جلد تبدیلی کیوں قبول کرلی۔ زلیخا! مصیبت پر مصیبت کی صیقل ہی سے تو راحت راحت و آرام کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔"

"کیا تم نہ بتاؤ گی اپنا بیش قیمت راز۔" نوجوان نے پریشان زلفیں ہاتھ میں لیں اور ان پر مہر الفت ثبت کرکے پھر بولا۔ "جس کے سننے کے لئے میں خلوص نیت سے تیار ہوں۔"

"خواہ مخواہ خودکشی کے چند لمحے تلخ گامیوں سے ہم آغوش کرنا عقلمند کا کام نہیں۔" قرآن گھٹے میں حائل ہو کر بولا۔ "جانے دو چھوڑ دو۔ بھلا بتاؤ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم لمحہ بہ لمحہ کسی روحانی اذیت سے متاثر ہو رہی ہو۔ چہرہ پر سرخ سرخ لکیریں ظاہر ہو رہی ہیں۔ پلکیں جھپک رہی ہیں۔ شرمندہ کیوں ہو رہی ہو تم؟" کسی قدر کھینچتے ہوئے نوجوان نے کہا۔ "تمہیں ضرور بتانا ہوگا اور میں ضرور سنوں گا۔ تمہاری شیریں زبان اور مبارک ہونٹوں سے وہ پاکباز بھید جسے تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"تم مجھے نادم کرانا چاہتے ہو عباس!" ٹھنڈی سانس لے کر وہ بولی "ہو سکتا ہے کہ دوسرے دلوں کی طرح تمہارے پہلو میں بھی کمزور دل ہو۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔" عباس نے تسلی آمیز لہجہ میں کہا۔ "سناؤ تو مجھے وہ دلچسپ کہانی۔"

ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے طمانچوں نے اس کے رخسار اور سرخ کر دیئے۔ آنکھیں پانی برسانے لگیں۔ قیدی بدستور سابق شور و غوغا

لے مٹک تھے جو جی میں سمائی وہ اڑائی۔ صادق روسیوں کی بد اخلاقی اور
مشغلی پہ اپنی پوری قوت کے ساتھ زہر اگل رہا تھا اور لوسے
ناموافق موانی مسافروں کو چشم زدن میں ذرہ ذرہ کر ڈالنے کی تدبیر سوچ
رہا تھا۔ نوجوان نے حکایت سنی اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ دیوار کی تختیں
اس طرح گھور گھور کر دیکھ رہا تھا جیسے بھوکا شیر اپنے شکار کو آنکھیں
نکال نکال کر دیکھ رہا ہو۔

"عباس! تم کیوں چپ ہو؟"

نوجوان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

"پیارے! تم کیوں رو رہے ہو؟"

زلیخا کا دل بھی بھر آیا۔ سر گھٹنوں پر رکھ کر رونے لگی۔ سینہ میں آگ
روشن تھی سارا کمرہ آتشکدہ بنا ہوا تھا۔ آتشیں شعلوں نے قریب کی
لکڑی کو بھی سمیٹ لیا۔

"مجھ سے تم کیوں ناراض ہو؟"

عباس کی آنکھیں دوزخی انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں
سوجے ہوئے پپوٹے، بھیگی ہوئی پلکیں، لال لال ڈیلے ——— اُف
قیدی اس خوفناک آشفتگی سے خائف ہو ہو کر زور زور سے
چیخنے چلانے لگے۔ صادق کا مقیاس الحرارت ساعت بہ ساعت بڑھتا
جا رہا تھا۔ سورج بھی انتہائی بیتابی کے ساتھ گردن اٹھا اٹھا کر معاملات
سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"اگر میں قصوروار ہوں تو معاف کر دو"

زلیخا کے اظہار محبت کو یوسف کی پاکدامنی برابر ٹھکرا رہی تھی،
لیکن اس نے انگلیوں میں پھنسی ہوئی دھجی اور دامن کے چند تاروں کو
ثبوت میں پیش کر کے اندھیری کوٹھڑی میں بھجوا ہی دیا ——— آخرکار اپنی
غلطی تسلیم کر کے شکست خوردہ پرندے کی طرح نڈھال ہو کر پیروں پر
گر پڑی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ عباس بھی رو رہا تھا۔ بدن کا رواں
رواں آگ میں جھلس جانے کی وجہ سے سمٹا ہوا دکھائی دیتا تھا نہ جانے
وہ کس خیال میں ڈوبا ہوا آتشیں آنسوؤں سے زلیخا کے خشک بالوں
کے جھنڈ میں آگ لگا رہا تھا۔

"پیارے تم کب تک خاموش رہو گے۔ میرا کلیجہ پانی پانی ہو کر بہا
جا رہا ہے"

سیپ کا منہ کھلا۔ آنسوؤں کے تلخ اور شور ڈھلکتے ہوئے قطرے
موتی بن بن کر گرنے لگے۔ "افسوس تم نے پہلے ہی مجھے اس واقعہ پر آگاہ
نہیں کیا۔ مجید کے ہوتے ہوئے تمہارے سر پر ہاتھ رکھنے والا میں کون؟"

"لیکن مذہب عشق میں عزیز و اقارب اور حب وطن کی شراب
کا دلدادہ نہیں دیکھا جاتا۔ محبت رسم و رواج کی دیرینہ قیود سے
کی حد تک آزاد ہے"

"تم نے ایک ایسے محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے جس کے
برجوں، میناروں اور کنگروں کی روشنی سے ہزاروں محلات منور تھے
اس کے دل میں تمہاری محبت کا چراغ روشن تھا۔ تم نے اسے ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے بجھا کر قوم اور وطن کی گود ایک ہونہار، لائق، شجاع اور
وفادار جوان سے سونی کر دی ہے۔ کروڑوں سیپیں اکٹھا کرنے
پر بھی ایسا گوہر آبدار ہاتھ نہیں آسکتا"

زلیخا کے بدن کا رواں رواں کھڑا ہو گیا وہ کسی پوشیدہ خوف
سے کانپ اٹھی۔ جیسے مجید اس کا گلا گھونٹ کر کہہ رہا ہو
"یہ اسی گناہ کی سزا ہے" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔ "باغ میں صدہا پھول
کھلتے ہیں، کیا وجہ ہے کہ بلبل صرف ایک ہی پھول پہ جان دیتا ہے؟"

"اے کاش تمہارے دل میں بھی بلبل کے دل کی خاصیت ہوتی
شاید تم نے کبھی پھول کی حقیقت و ماہیت پر غور نہیں کیا۔ انسان اور
پھول ایک تصویر کے دو رخ ہیں ——— ان کی محبت سے ملک و
قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس نازک موقع پر اگر وہ جوانمرد ہوتا
تو ہم کسی صورت میں بھی شکست کا منہ نہ دیکھتے اور آج غلامی
کی زنجیروں میں جکڑے نہ ہوتے"

قیدیوں کا چلانا موقوف ہو چلا تھا۔ سورج کی آنکھیں اچھی طرح
کھل گئی تھیں۔ وہ پھر بولا۔ "زلیخا! میں تم سے محبت نہیں کرتا بلکہ
تمہاری محبت کی قدر کرتا ہوں"

"اب افسوس کرنا بیسود ہے۔ معلوم نہیں مجید کہاں ہے اور
پھر زندہ بھی ہے یا مر گیا" کسی قدر جوش سے۔ "اگر تم قطع تعلق کرنا
بھی پسند کرو تو میں تمہارے نام پر زندگی گذار سکتی ہوں۔ کیا یہ
صحیح ہے کہ روسیوں کو بہت بڑی شکست ہوئی ہے؟"

"آفریں ہے تمہاری ہمت پر اور قابل صد تحسین ہے تمہاری
محبت!" اس نے ابھی سینہ سے لپٹایا ہی تھا کہ چند مجسمے سامنے
دکھائی دیئے۔ دروازہ کھلا اور کانوں میں عجیب عجیب الفاظ آنے
لگے۔ "تم تینوں قیدی پیٹرزبرگ روانہ کئے جا رہے ہو" روسی افسر
آگے بڑھا اور عباس کے کان میں کچھ کہا۔ عباس کے چہرہ پر شرافت
وبہادری کے آثار عیاں تھے آہستہ آہستہ جواب دینے کے باوجود "آپ
بے فکر رہیں" یہ الفاظ محدود فضا میں گونج گئے۔

(۵)

کائنات کا ذرہ ذرہ دشمن بنا ہوا تھا۔ پیٹرس برگ سے دو کوس کے فاصلے پر قیدیوں کا مصور گروہ ہلکی ہلکی سردی میں ہوا سے باتیں کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دفعتہً فضا میں سرسراہٹ کی لہر دوڑ گئی۔ جھاڑیاں متحرک ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آن کی آن میں مسلح آدمیوں کے ایک نقاب پوش گروہ نے قیدیوں پر حملہ کر دیا۔ روسی افسر کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا "لٹیرے!"

آدھ گھنٹہ کے سخت ترین مقابلے میں تمام روسی سپاہی ختم ہو چکے تھے۔ صادق کی آنکھیں کھلتی جاتی تھیں اور اس کے نزدیک یہ غدار نیست و نابود ہو چکے تھے ــــ اب لٹیروں کے غول میں صرف تین قیدی تھے۔ ترکمان سردار نے عباس پر ایسا حملہ کیا جیسے بھوکی بلی چوہے پر جھپٹتی ہے لیکن زلیخا فوراً اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر حملہ آوروں کے درمیان حائل ہو گئی۔ زلیخا کی آنکھیں کبھی چہرۂ محبوب پر پڑتی تھیں اور کبھی خون آشام تلوار پر۔

"موت یا زندگی؟" ترکمان سردار نے گرسنہ شیر کی طرح گرج کر سوال کیا۔

"تم مجھے شوق سے قتل کر سکتے ہو" عباس نے مستقل مزاجی اور بہادری کا سہارا لیکر کہا۔ "اس ہیبت ناک لڑائی میں ترکی کو غلبہ حاصل ہو چکا ہے"

ترکمان سردار نے چہرے سے نقاب الٹ دی۔ عباس کی تلواریں ہاتھوں سے چھوٹ گئیں۔ دیدے زمین میں گڑ گئے۔

زلیخا گھبرا کر بولی۔ "حمید تم ہو ــــ!"

میرزا غالب دہلوی

دلگداز ڈراما

از ـــ ساحرہ

(ایک چھوٹا سا نیچی چھت کا کمرہ۔ کونے میں لکڑی کا ایک بڑا صندوق پڑا ہے جس پر اُجلا سا سفید غلاف چڑھا ہوا ہے۔ صندوق پر کچھ کاغذ اور کتابیں بے ترتیبی سے بکھری پڑی ہیں۔ دوسری جانب ایک چارپائی ہے اور اس پر میرزا غالب رضائی اوڑھے اوندھے پڑے ہیں۔ ہاتھ میں قلم ہے۔ آگے کاغذ دھرا ہے اور فکرِ سخن میں غرق ہیں)

(کمرے کا دروازہ پچھلی طرف سے آہستہ سے کھلتا ہے۔ پھر بند ہو جاتا ہے۔ مرزا بلا تامل چونک پڑتے ہیں۔ کاغذ پر مصرع لکھتے ہیں اور اسے پڑھ کر آپ ہی آپ مسکراتے ہیں۔ دروازہ پھر آہستہ سے کھلتا ہے۔)

میرزا۔ کون ہے ـــ ارے بھئی کون ہے؟

زنانہ آواز۔ میں نے کہا ـــ ناشتہ نہ کیجئے گا؟

میرزا۔ نماز سے بارے فراغت ہو گئی آپ کو؟

آواز۔ تو لے آؤں؟

میرزا۔ لے آنا۔ لیکن ذرا ادھر تو سنو!

(بیگم غالب آتی ہیں۔ چہرے مہرے سے خاصی قبول صورت ہیں، لیکن حسین خدوخال پر افکار کا سایہ بہت گہرا ہے۔ تاہم ان بادلوں کے باوجود بھی ایک خاص تبسم کا نور نظر آرہا ہے)

میرزا۔ ایک غزل ہو گئی ہے۔ بڑی پھڑکتی ہوئی۔ سچ کہتا ہوں ایسی غزل آج تک نہیں ہوئی تھی۔ ..... نہ ہوئے بہادر شاہ ورنہ موتیوں سے منہ بھر دیتے۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) کیسا پلٹا کھایا ہے زمانے نے! ایسی اُلٹی گئی ہے بساط کہ ایک ایک مہرہ پٹ گیا!

بیگم۔ سانپ گذر گیا تو لکیر پیٹنے سے کیا حاصل۔ موتیوں کے دن لد گئے اب تو روٹیوں کے لالے پڑے ہیں۔

میرزا۔ بس چھیڑ دی رام کہانی! ذرا طرح دی اور تم بے عنان ہو گئیں ان طعنوں اور روزوں سے کیا حاصل خصوصاً جب تمہیں اللہ

پر قناعت کرنے ہی کا سلیقہ نہ آیا۔ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔

بیگم۔ تو پھر آج ناشتے میں بکری کا دودھ ہی ہے۔ باقی سب چیزیں ختم ہو چکیں۔ اور اُدھار کوئی نہیں دیتا بازار میں۔

میرزا۔ بکری کا دودھ ـــ؟ جوڑوں میں تو پہلے ہی درد ہو رہا ہے ایسی قیامت تو نہ ڈھاؤ۔

بیگم۔ اوندھے منہ پڑے رہنے سے یہی حشر ہوتا ہے۔ ذرا باہر نکلئے اور کچھ نہیں تو اس صاحب کے یہاں سے ہی ہو آتے .... دو وقت کی روکھی سوکھی تو مل ہی جاتی۔

میرزا۔ کون صاحب؟ .... کیا کہہ رہی ہو بیگم؟

بیگم۔ وہی جس نے بلا بھیجا تھا ..... نوکری کے لئے!

(میرزا اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں)

میرزا۔ بیگم! یہ تمہیں کہہ رہی ہو؟ ـــ کیا غالب ہی کی بیوی کے الفاظ ہیں یہ!

(بیگم دبک کر پیچھے کھسک جاتی ہے)

میرزا۔ نواب دبیر الملک ایک کرسٹان کے دروازے پر نوکری کے لئے سر جھکائے گا ـــ وہ جس کی زبان نے ہندوستان اور ایران کا دل اپنی مٹھی میں لے لیا ہے۔ ایک بے شعور کے پاس جا کر کہے گا کہ چند ٹکلیوں کے بدلے میرا دل و دماغ خرید لو۔ یہ اندھیر بھی ہو سکتا ہے کہ علم جہالت کی چوکھٹ پر بوسے دینے کے لئے جھک جائے۔ بیگم! آخر یہ کیا نامرادی ہے جس کی طرف تم مجھے کھینچنا چاہتی ہو؟

بیگم۔ (مری ہوئی آواز میں) تو پھر ناشتہ لے آؤں؟

میرزا۔ (ایک آہ بھر کر) لے آؤ۔

(دروازہ پھر کھلتا ہے اور بیگم ہاتھ میں دودھ کا گلاس لئے آتی ہیں)

بیگم۔ لیجئے!

میرزا۔ بکری کا ہے؟

بیگم ۔ ہاں!

میرزا ۔ بادام وغیرہ کچھ نہیں گھر میں؟

(بیگم جواب دیئے بغیر گھوم جاتی ہیں۔ اور سر جھکائے واپس جانا چاہتی ہیں میرزا ان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں اور جب وہ دروازے کے قریب پہنچتی ہیں تو بلند آواز سے)

میرزا ۔ بیگم ——!

(بیگم رک جاتی ہیں اور میرزا کی طرف دیکھے بغیر تھراتی ہوئی آواز میں کہتی ہیں)

بیگم ۔ جی ——!

میرزا ۔ ہماری طرف دیکھو!

(بیگم جواب دیئے بغیر گردن جھکائے کھڑی رہتی ہیں)

میرزا ۔ آج تم نے بھی کچھ کھایا پیا ہے یا ویسے ہی ......

(کوئی جواب نہیں)

میرزا ۔ بیگم یہی نہیں —— (قدرے توقف کے بعد) —— جواب بھی نہ دوگی —— (قدرے توقف کے بعد) —— تم تو کہا کرتی ہو کہ ہم تمہارے سر تاج ہیں۔ اور اب یہ عالم ہے کہ ہماری بات کا جواب دینے میں بھی تمہیں تامل ہوتا ہے! —— ہم پوچھ رہے ہیں کہ اگر تم نے نہیں کھایا تو یہ دودھ آپس میں بانٹ لیتے۔! دونوں کا پیٹ بھر جاتا۔

بیگم ۔ (کھکھیائی ہوئی آواز میں) سب کچھ کھا لیا میں نے۔

میرزا ۔ اف بیگم! تم تو رو رہی ہو؟

(میرزا اٹھ کر بیگم کے پاس جاتے ہیں اور محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔ بیگم دوسری طرف منہ پھیر لیتی ہیں)

میرزا ۔ آنسوؤں سے کبھی پیٹ کی آگ بھی بجھی ہے۔ کہ تم جی ہلکا کئے دے رہی ہو؛ غم پر رونے سے غم بڑھ جاتا ہے۔ اس پر ہنسو تاکہ یہ شرمندہ ہو کر تمہارا پیچھا چھوڑ دے۔ زندگی کے قیدخانے میں سکھ کہاں؟ —— قیدیوں کو کبھی سکھ ملا ہے جو ہمیں اور تمہیں میسر آئے۔

بیگم ۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) مجھے تو دکھ کی کوئی شکایت نہیں۔

میرزا ۔ تو پھر یہ آنسو کیسے؟

بیگم ۔ دل ہی تو ہے ——

میرزا ۔ (مسکرا کر پلنگ کی طرف لوٹ آتے ہیں) دل ہی تو ہے! —— واللہ بیگم! —— تمہاری طبیعت بھی قیامت ہے کیا برجستہ کہا ہے! —— دل ہی تو ہے! (لپک کر بیگم کے پاس جاتے ہیں) کیا کہا تھا تم نے؟ —— دل ہی تو ہے! —— دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت! کیا غضب کا مصرع کہہ دیا تم نے۔ اس پر غزل کہی جائے تو کیسی رہے؟

بیگم ۔ پیٹ کا بھوکا ہو تو دور ہی کی سوجھتی ہے۔ اب غزل ہی تو کہی جائے گی اور کیا ہوگا؟

میرزا ۔ نہیں نہیں اس برجستگی کا انعام بھی ملے گا۔ ہم جائیں گے اس کے پاس۔ اپنے لئے نہیں تو اپنی بیگم کے لئے تو ضرور جانا ہوگا۔ تم تیاری کر رکھو۔ لیکن دیکھو جاؤں گا کل ہی۔ آج غزل کہنی ہے —— ! دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت! (پردہ)

دوسرا منظر

(بیگم غالب آنگن میں بیٹھی ہیں۔ سامنے چھوٹی بڑی گٹھڑیوں کا ڈھیر لگا ہے۔ ملازمہ قریب بیٹھی ہے اور بیگم گن رہی ہیں۔ گنتے وقت ایک ایک چیز اٹھا کر الگ رکھتی جاتی ہیں)

بیگم ۔ اچھا تو یہ مرچیں —— اور دال مونگ —— اور بادام۔ اور ارے موئے نے نہ لونگ دیئے اور نہ ہی چھالیا! ہائے اللہ کیا ہو گیا ہے ان نوکروں کو۔

ملازمہ ۔ یہ رہیں بی بی —— چھالیا ہی تو ہیں!

بیگم ۔ سر ہے تیرا .... چکنی ڈلی دھری ہے کہ چھالیا۔

ملازمہ ۔ (ہنس کر) اوئی سچ مچ!

بیگم ۔ بلاؤ اس مونڈی کاٹے کو —— یہ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے —— سارا دن بس کھا لیا اور پڑے خراٹے لیتے رہے۔ کام کا نام آیا نہیں اور سانپ سونگھ گیا نہیں۔ ان مردودوں کو! کہو اسے چھالیا اور لونگ لائے۔

باہر سے آواز ۔ اے بی! —— میں نے کہا سن رہی ہو؟

ملازمہ ۔ کیا ہے بے؟ (لپک کر دروازے پر جاتی ہے)

آواز ۔ میں نے کہا۔ یہ آنکھیں ہیں کہ بٹنے آلو دھرے ہیں تیرے ماتھے پر۔ تجھے جو کہا تھا کہ چھالیا اور لونگ وغیرہ سب دیکھ کر لائیو! —— تو تو —— اب بی بی ناراض ہو رہی ہیں۔ دیکھ تو وہ بے بھاؤ کی پڑ رہی ہیں کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔

بیگم ۔ ارے —— کیا نام ہے تمہارا —— اسے کہو ابھی اور اسی وقت جا کر لا دے۔

ملازمہ کی آواز۔ لیکن مالکن! ـــــ وہ تقال کہہ رہا تھا کہ پیسے کب ملیں گے ان کے؟

بیگم۔ بس ہاتھ بھر کی زبان رکھ لی منہ میں۔ اری کہتی کیوں نہیں اس سے جا کر بس کہہ دے۔ میاں نوکر ہو گئے ہیں۔ اب مہینے پر پیسے مل جائیں گے۔

ملازمہ کی آواز۔ ـــ تو یہی کہہ دیا تھا سرکار لیکن ـــــ!

بیگم۔ لیکن کیا؟ پوچھتی کیوں نہیں اس سے؟

ملازمہ کی آواز۔ جی، وہ کہتا تھا ـــــ کچھ شراب وغیرہ کی باتیں کر رہا تھا سرکار۔ اور مجھے آ گیا تاؤ۔ ـــ سرکار قریب تھا کہ اس کے منہ پر گھونسہ دوں ـــ کیا بتاؤں سرکار ـــ ڈر گیا میں نے کہا جو چٹکلہ چھوڑ دیا تو تیلیی گر جائے گی بیچارے کی۔ دیہان پان تو آدمی ہے سرکار۔ سچ کہتا ہوں آپ سے۔ اپنی جوانی کی ہی قسم سرکار۔ بس اس نے سرکار کے نام کے ساتھ شراب کا نام کیا لیا کہ نشہ مجھے چڑھ آیا ـــ اُف! کیا بتاؤں ـــ نہ ہوا سانڈ

بیگم۔ چپ بھی رہے گا ـــ اسے کہتی کیوں نہیں ٹرائے جاتا ہے مینڈک کی طرح۔ اسے کہہ چھالیا لائے جا کر۔

نوکر۔ اور...... اور جو سرکار نہ دے وہ تو! ـــ مجھے غصہ آ جائیگا ـــ پھر سرکار کہتی ہیں میں ٹراتا ہوں ـــ سرکار......

بیگم۔ اری قناط ...... گیا ہے نہیں ابھی یہ! کھڑے کھڑے نکلوا دونگی۔ میاں سے کہہ کر۔

نوکر۔ خادم کا کام تو تعمیل ہے سرکار ـــ جاتا تو ہوں۔

(ملازمہ اندر آ جاتی ہے)

بیگم۔ ان نوکروں پر تو اللہ کی مار ـــــ کھائیں گے دس ہاتھیوں جتنا۔ لیکن کام کہو تو زبان سے سب کام چلائیں گے! ار..... اف خداوندا! اور کچھ پنیر، نہ مسالحہ .... لایا کیا ہے۔ جلائیو تو اسے۔ ابھی یہیں پر ہوگا مردود۔

(ملازمہ باہر بھاگتی ہے لیکن ڈیوڑھی کے قریب آتے ہی یکدم رک جاتی ہے جھک کر سلام کرتی ہے اور باادب کھڑی ہو جاتی ہے چند سے توقف کے بعد مرزا آتے دکھائی دیتے ہیں اور آتے ہی کہتے ہیں۔)

مرزا۔ ان عورتوں کے پیچھے جو لگے اس کا ستیاناس نہ ہو تو ہو بھی کیا! کہہ رہا تھا کہ بندی خدا کی ہم نواب ابن نواب! ہمارے باپ داداؤں نے نوابیاں پالیں۔ خود کھایا اور اوروں کو کھلایا۔ ہمیں کیا نسبت ملازمت سے! لیکن توبہ! صاحب کب ماننے لگیں تھیں یہ حوا کی بیٹی! اسے تو بس روپے چاہئیں۔ اس میں خواہ کچھ ہی ہو جائے ـــــ لو یہ لیا انعام پہنچ گئے ہیں۔

بیگم۔ (استقبال کے لئے آگے بڑھتی ہیں) بسم اللہ!

مرزا۔ سنبھال رکھو اپنی بسم اللہ کو۔ ایسی باتیں کر کر کے اللہ میاں کو ایسا مہربان کر لیا ہے کہ وہ سمجھتا ہے اب مزید فرق ہی باقی نہیں رہی۔

بیگم۔ لیکن کچھ کہئے تو ـــ آپ گئے بھی؟

مرزا۔ ارے گئے نہیں تو کیا بھاڑ جھونکتے رہے اتنی دیر۔ گئے بھی اور دیکھو جیسے گئے تھے لوٹ آئے۔

بیگم۔ باتیں تو ہوئی ہونگی۔

مرزا۔ خاک پڑے اس مردود کے سر پر۔ استقبال ہی کو نہیں آیا کوٹھی میں سے نکل کر۔ مانو ہم اس کے باوا آدم کے نوکر تھا تو ہیں اور ـــــ خوب! یہ سب کہاں سے تبع ہو گیا۔

بیگم۔ ادھار آیا ہے۔ تو پھر آپ خود چلے گئے ہوتے اس کی کوٹھی کے اندر ـــ!

مرزا۔ کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہو بیگم! ارے ہم کیوں چلے جاتے دستور تو یہ تھا کہ جبھی ہم جو گئے تو وہ بدستور سابق باہر نکلا مصافحہ ہوا! اس نے ہمیں کمرے میں چلنے کی دعوت دی۔ اطمینان سے بٹھایا۔ باتیں ہوئیں۔ یہ تو خیر ایک بات ہے۔

بیگم۔ (متوحش ہو کر) تو پھر ہوا کیا؟

مرزا۔ ہونا کیا تھا۔ ہم گئے اور ہم نے کہلا بھیجا اندر کہ ہم آئے ہیں۔ صاحب بہادر بن گئے نواب۔ کہلا بھیجا کہ وہ باہر بیٹھیں ابھی بلائے لیتے ہیں۔ غصہ تو مجھے بیحد آیا۔ لیکن میں نے سوچا کہ شاید معلوم نہیں ہوا ابھی کہ ہم آئے ہیں۔

بیگم۔ پھر ـــ؟

مرزا۔ پھر کیا۔ ہم نے بیرے کو ڈانٹا کہ تم نے بتایا نہیں کہ نواب دبیرالملک کی سواری آئی ہے۔ وہ بولا حضور ـــ میں نے تو یہی کہا تھا۔

بیگم۔ پھر ـــ؟

مرزا۔ پھر وہی پھر! میں پوچھتا ہوں آج تمہاری عقل کو ہوا کیا ہے اتنا بھی نہیں سمجھ سکتیں۔ میں نے کہا صاحب سے کہو بدستور سابق ہمارا استقبال کرنے کو آئیں تب ہم گاڑی پر سے اتریں گے

وہ گیا اور واپس آکر بولا کہ صاحب کہتے ہیں کہ نواب صاحب اس وقت نواب صاحب کی حیثیت سے نہیں بلکہ ملازمت کے اعتبار کی حیثیت سے گئے ہیں۔ انھیں قاعدے کے مطابق باہر انتظار کرنا ہی پڑیگا۔ جب ہیں وقت ملیگا بُلا لیں گے۔ میں نے کہا ایسی نوکری پر تین حرف جسے ہماری خودداری کا پاس نہ ہو ہم نواب ہیں اور نواب ہی رہینگے۔ یہ کہا اور واپس آ گئے۔

بیگم۔ (پریشان ہو کر) اور ملازمت؟

میرزا۔ یہ ملازمت نہیں ایک ایسے کے ہاتھوں بک جانا ہے جو شرافت اور رذالت میں تمیز نہیں کر سکتا۔

بیگم۔ (آہ بھر کر) شرافت!

میرزا۔ یہ تمھاری باتیں! ... بیگم مجھے یہ نہ کہو مجھے یہ بات بُری لگتی ہے میں بادشاہ کا استاد ہوں۔ نواب دبیر الملک میرا خطاب ہے مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا ... لیکن —!

بیگم۔ اچھا ہوا۔

ملازم کی آواز۔ میں نے کہا — سن رہی ہو؟

ملازمہ۔ کیا ہے؟

ملازم۔ اندر کہدو کہ بقال اور کچھ نہیں دیتا کہتا ہے میاں کی نوکری کی بھی چھوڑ دونگا

بیگم۔ (دھیمی آواز میں) یہ بھی اٹھا کر دے دو۔ نہیں ضرورت ہے ہمیں ان میں سے کسی کی بھی۔

ملازم۔ غلام نے نہیں سنا! کیا حکم ہوا ہے سرکار سے؟

میرزا۔ کہدو اسے جائے اس وقت! اور تم بھی جاؤ۔ یہ سب چیزیں سنبھال کر رکھ دو۔

(قدرے توقف کے بعد بیگم کی طرف دیکھتے ہیں)

کس جھمیلے میں پڑ گئی ہو تم! چھوڑو ان جھگڑوں کو — تمھارے اس فقرے پر کیسی غزل ہو گئی ہے۔ کہا ہے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئینگے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

کیسا ہے —!

(بیگم اُٹھ کر کمرے میں چلی جاتی ہیں)

میرزا۔ (آپ ہی آپ ہنس کر) تم کیا جانو!

(اپنے کمرے کی طرف مڑتے ہیں)

تمہیں تو چھالیا اور چکنی ڈلی سے غرض ہے۔ ان کی قدر۔ ان موتیوں کی قدر تم کیا جانو —!

(پردہ)

شعاعِ ماہ

شہنشاہ چین مانگ چاؤ کا معاشقہ

از:۔ شبلی بی کام

مانگ چاؤ نے نہایت احتیاط سے اپنے بائیں بازو کے گہرے زخم کو دھویا۔ اور دائیں ہاتھ سے اس پر پٹی باندھی۔ اس کے بعد سرخ ریشم کی وہ قبا پہنی جو برسوں قبل اسے ہنان کے شاہ اعظم نے عطا فرمائی تھی۔ یہ قبا صرف شاہی تقریبوں کے موقعوں پر پہنی جاتی تھی۔ خصوصاً جب مانگ چاؤ کو شاہی محل میں کسی معزز مہمان کو مدعو کرنا ہوتا۔ یا روایات پارینہ کے ماتحت اسے اپنے آبا و اجداد کی ارواح کو ثواب پہنچانے کے لئے خود وہاں کھانا ہوتا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے اپنے زخمی بازو کو یہ اطمینان کرنے کے لئے ٹٹولا کہ پٹی کہیں سے کھسک تو نہیں گئی۔ یا خون کے قطرے اس کی ریشمی قبا کو داغدار تو نہیں کر رہے۔ اس کے بعد وہ اپنے دارالمطالعہ میں چلا گیا۔ جس میں دھندلی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور جسے مانگ چاؤ اپنے انوکھے مذاق کے طور پر خزانے کا کمرہ کہا کرتا تھا۔ دارالمطالعہ کی دیواروں پر منقش پردے لٹک رہے تھے۔ جنھیں کسی مشرقی فن کار نے اپنی جادو کی سوئی سے تیار کیا تھا۔ کہیں دور صحرا میں غروب ہونے والے آفتاب کی شفق آلود کرنیں ہیرے کی طرح جگمگاتی ہوئی پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں کو لباس احمریں پہنا رہی تھیں۔ کہیں پایاب جھیلوں کے سرسبز کناروں پر سفید سینہ سارس کسی گہری فکر میں گردنیں جھکائے ایک ٹانگ پر کھڑے تھے۔ کہیں چاند کی ہلکی ہلکی روشنی بھیانک کہرے کی طرح خوابناک سطحوں کی چھتوں پر خوابیدہ تھی، اور کہیں ایک غیر مادی روشنی ہزاروں زاویوں سے ایک کف آلود بحر ذخار کی آوارہ خرام موجوں پر کھیل رہی تھی۔ غرضیکہ کشیدہ کار کی سحر نما سوئی نے حسن و رومان کی ایک ایسی دلآویز دنیا بسا رکھی تھی، کہ مصور کا موقلم اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔

مانگ چاؤ نے ان خزائن کو اشتیاق آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ پھر اس کی نظریں ان محبوب ترین کتابوں پر دوڑنے لگیں۔ جن میں عہد عتیق کے چین کا ادب و شعر اور حکمت و فلسفہ خوابیدہ تھا۔ لیکن اس نے انتہائی خواہش کے باوجود مشرق کے مکمل اور بے داغ فلسفہ کی گہرائیوں میں جانے سے پرہیز کیا۔ اور اپنے زخمی بازو کو مضبوطی سے تھام کر اس کھڑکی کی طرف بڑھا جو "چیرنگ سٹریٹ" کی طرف کھلتی تھی۔ اس کے سامنے ایک جدید طرز کا شہر تھا جس میں زندگی انگڑائیاں لے رہی تھی شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اس نے شہر کی زندگی پر غور تو بہت کیا تھا۔ لیکن اس میں گم ہو جانے کا اسے آج تک موقع نہ ملا تھا۔

مانگ چاؤ کافی دیر تک اسی طرح کھڑا رہا ۔۔۔ ساکت و صامت ۔۔۔ چینی بودھ "فو" کے اس چھوٹی مجسمے کی طرح۔ جو عین اس کے سر پر ایک غرفے میں رکھا تھا اس کے بازو میں قیامت کا درد تھا۔ لیکن اس کے مجاہدانہ چہرے پر اطمینان و سکون نظر آتا تھا۔ صرف ایک مرتبہ اس نے اپنا کھلا ہاتھ کنپٹیوں پر پھیرا۔ جن پر بڑھاپے کی سفیدی اپنا تسلط جما چکی تھی۔ اور فوراً اس کے ماتھے پر ایک تیوری جز بز ہو کر رہ گئی۔

وہ سوچ رہا تھا۔ اپنے ذہن کے انتہائی عمق کو ٹٹول رہا تھا، اور وہ غصہ جو اس کے مذہب میں حرام تھا بے تحاشا اس کے خیالات کی دنیا پر چھائے جا رہا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ جذبہ بھی زائل ہو گیا۔ اور اس کا چہرہ پہلے کی طرح متین و سنجیدہ نظر آنے لگا اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ثابت کرنے لگا کہ اسے اپنے جذبات پر پورا اختیار ہے بلکہ وہ اس تہدید آمیز بدنصیبی پر بھی قابو پا سکتا ہے جو غیر مرئی طور پر کمرے کی وسیع فضا میں منڈلاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ بالآخر قطعی نتیجہ پر پہنچنے کے بعد وہ ایک منقش آبنوسی کرسی پر بیٹھ گیا جو ایک میز کے قریب بچھی تھی اور آہستہ آہستہ ایک سہ ترنم گھنٹی بجائی۔

بی فائے کا نام بھی شعاع ماہ تھا۔ اور اس وقت وہ بالکل شعاع ماہ کی طرح چپکے سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے جواہر نگار سلیپر ریشمی قالین پر اس آہستگی سے پڑ رہے تھے کہ آواز نام کو پیدا نہ ہو سکی تھی۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھی اور مانگ چاؤ کے گھٹنوں کے قریب دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ بھورے ریشم کے پھولدار کمونو کے اوپر اس کا چہرہ منقش ہاتھی دانت کی طرح دمک رہا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے سرتاج کے قدموں میں ایک شرمیلی لڑکی کی طرح بیٹھی تھی لیکن اس

شاہی وقار تھا۔ کیونکہ آخر وہ ہانچو کی فاتح قوم سے تعلق رکھتی تھی اور اس کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا تھا۔

تفاوتِ عمر کے علاوہ دونوں میں ایک اور فرق بھی نمایاں تھا، مشلرع ماہ مرکری کا اسٹیل کے بے چین، چست و چالاک اور زیرک خانہ بدوشوں کی اولاد تھی۔ اور اس کے مقابلے میں مانگ چو کی سنجیدہ مزاجی صاف ظاہر کرتی تھی کہ وہ جنوبی چین کا ایک رومانیت پسند فلسفی ہے۔

مانگ چاؤ نے اسے محبت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور دائیں ہاتھ سے اس کے شانے پر پیار کرنے لگا۔ مشلرع ماہ کی کالی سیاہ آنکھوں میں نشہ سا دوڑ گیا اور اس نے ذرا بے تکلفی سے اپنا سر مانگ چاؤ کے زانو پر رکھ دیا۔ وہ دیر تک خاموش رہا۔ آخر تیم مسموم آہ بھرنے کے بعد بولا۔ "لی فائے! تم یہاں خوش تو رہی ہو؟"

"مجھے نروان سے بھی زیادہ مسرت حاصل ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "خصوصاً ان نفرت انگیز ایام کے بعد جو میں نے وؤ فانگ کی رفاقت میں گزارے۔ اب میں گویا جنت میں آگئی ہوں۔" وؤ فانگ کے نام ہی سے وہ کانپ اٹھتی تھی۔ "میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔" اس نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔ اس کی آواز میں وثوق کی جھلک تھی۔

تاہم مانگ چاؤ نے اس کے اس باغیانہ جذبے کی داد نہ دی۔ "بیشک وہ بُرا آدمی ہے۔ لیکن یہ بھی تو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ تم پر حق دراصل اسی کا ہے۔ کیا اس نے تمہارے عوض تین ہزار ڈالر ادا نہیں کئے؟"

"لیکن آپ نے بھی تو پانچ ہزار کی پیشکش کی تھی؟"

"یہ درست ہے۔" مانگ چاؤ نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم جانتی ہو کہ اس نے میری پیشکش کو نفرت و حقارت سے ٹھکرا دیا۔ تاہم اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔" اس نے سوچ سوچ کر کہا۔ "اگر شہنشاہ اعظم منگو خان دوبارہ زندہ ہو کر تخت پر بیٹھ جائے اور تمہارے عوض اس کمرے کو ہیرے جواہرات سے بھر کر مجھے دینا چاہے جب بھی میں اس شاہی رشوت کو قبول نہیں کرونگا۔"

"میرے آقا کی آواز میں ایک سرود انگیز نغمہ تڑپ رہا ہے۔" لی فائے نے کہا۔ "جب سے وؤ نگ فانگ کے مکان میں آپ کے دیدار سے میری آنکھوں میں نور پیدا ہوا ہے۔ اور آپ نے میرے ساتھ بدسلوکی کرنے پر اسے سرزنش کی ہے میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔ آخر موقع پاکر میں وہاں سے بھاگ آئی۔ اور اب تو آپ نے وعدہ بھی فرمایا ہے کہ مجھے زبردستی اپنے قدموں سے جدا نہیں کریں گے۔"

"میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔" مانگ چاؤ نے کہا۔ "اور جس طرح میں نے کہا ہے۔ اسی طرح ہوگا لیکن ...." اس نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔ "تمہارے محافظ اب مجھے جانا ہوگا۔"

وہ چونک اٹھی۔ "آپ کو؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "لیکن کہاں؟" اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

مانگ چاؤ کے چہرے پر غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی آخری شعاع کی طرح ایک افسردہ سی انوکھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "میں جا رہا ہوں۔" اس نے نپے تلے الفاظ میں کہا۔ "میں ساحل سمندر پر جا رہا ہوں۔ جہاں میرے آباؤ اجداد اپنی قبروں میں آرام کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔"

"لیکن کیوں؟" اس نے ناقابل یقین آواز میں سوال کیا۔

"کیونکہ منگو خان سے بھی ایک بڑی ہستی کا حکم ہے۔" مانگ چاؤ نے جواب دیا۔ اس کی آواز مدھم ہوتی ہوئی قریب قریب سرگوشی کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

لی فائے کی نظریں پہلی مرتبہ اس کے زخمی بازو پر مرتکز ہو کر رہ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ کپکپا اٹھی اور اس نے فوراً ریشمی قبا کو تھام لیا۔ مانگ چاؤ کی حالت میں کوئی تغیر نہ ہوا تھا۔ اس نے اسی صبر و تحمل کے ساتھ جس کا اظہار ایک بچے کے سامنے کیا جاتا ہے لی فائے سے کہا۔ "دیوتاؤں نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ انہوں نے مجھے اپنے محبوب ترین لوگوں میں شمار کیا ہے۔ موت کا اژدہا ہمیشہ زندگی کی شاہراہ پر آوارہ خرامی میں مصروف رہتا ہے اور بہت سے انسانوں کو متنبہ کئے بغیر ہی ہڑپ کر لیتا ہے۔ اب اس کا سایہ مجھے اپنے رستے میں نظر آ رہا ہے۔ مجھے قبل از وقت آگاہ کر دیا گیا ہے۔"

"لیکن وؤ فانگ تو اس قسم کی جرات نہیں کر سکتا۔" لی فائے نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ "چین میں سب لوگ اس سے متنفر ہیں۔ لیکن آپ تو ہر جگہ مقبول و ہر دلعزیز ہیں۔"

"وؤ فانگ کھلے بندوں مجھ پر حملہ کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔" مانگ چاؤ نے تسلیم کیا۔ "لیکن وؤ فانگ کھلے بندوں حملہ نہیں کیا کرتا۔"

"تو کیا وہ تینوں میں سے ایک تھا؟" لی فائے نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "قاتل؟"

مانگ چاؤ نے اپنا سر جھکا لیا۔ "وہ لنگ چانگ تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس کے بعد ایک چمک پیدا

بھاؤ۔ یہ محض اس کے خنجر کی تھی۔ شاید میں سرک کر پیچھے ہٹ گیا یا اس کا نشانہ چوک گیا۔ کیونکہ اس کا خنجر دل کی بجائے میرے بازو کو چیرتا ہوا نکل گیا۔"

"لیکن دیوتا آپ کے کاٹے کا بچے۔" وہ بولی۔ "انھوں نے آپ کو حفاظت کی چادر سا اڑھا دی۔"

ہانگ چاؤ نے اپنا سر ہلایا۔ "بلکہ یوں کہو کہ اس نے مجھے قبل از وقت آگاہ کر دیا۔" اس نے لی فائے کے تلفظ کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "وزنا کا تسلسل خوابیدہ نہیں رہ سکتا۔ قاتلوں کا سایہ میرے رستے پر پڑ رہا ہے۔ اگر میں نے اپنی عادت کے مطابق آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میری مثال اس شخص کی سی ہوگی جو اپنے باغ میں یہ جانتا ہوا سیر کرتا ہے کہ وہ ایک سانپ کو روندتا ہوا گزر جائے گا۔ اگر میں بزدل بن کر اپنے گھر ہی میں لیٹا رہا تو اس کی عقابی نگاہیں مجھے بہرحال ڈھونڈ نکالیں گی۔"

"لیکن آپ اس کے حملے کو روک تو سکتے ہیں۔" لی فائے نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟" ہانگ چاؤ نے قدرے استہزا آمیز مسکراہٹ کے بعد دریافت کیا۔

"آپ خود اس پر حملہ کیجیے۔" اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اور اپنی انگلیوں کے لمبے ناخنوں کو مٹھی میں کچھ ایسی بری طرح کر بھینچا کہ وہ ٹوٹ کر گر پڑے۔ "پہلے اس پر حملہ کیجیے۔ قاتلوں کے جذبۂ انتقام کو خریدا جا سکتا ہے۔ آپ امیر آدمی ہیں۔ آپ ان کو معاوضہ ادا کر سکتے ہیں۔"

ہانگ چاؤ نے پرزور نفی میں جواب دیا۔ "میری جان!" اس نے پیار سے کہا۔ "تمہیں اجازت نہیں مل سکی کہ ہمارے روشن خیال فلاسفروں کے خیالات سے مستفید ہو سکو۔ کنفیوشس کیا کہتا ہے؟ برتر انسان کو غم و غصے سے بالاتر ہونا چاہیے۔ جو لوگ قانون کا خیال نہیں رکھتے ان کو بری حرکتوں سے باز رکھنا میرا کام نہیں۔ لیکن میں خود اپنے ضمیر کے بھیانک عزائم کو روک سکتا ہوں۔ تم وو فانگ کو خونی قرار دے کر بجا طور پر ایک قابل نفرت انسان سمجھتی ہو۔ لیکن کیا تمہارا خیال ہے کہ مجھے بھی اس جیسا بن جانا چاہیے؟"

"لیکن ..... آپ ..... آپ ..... پولیس؟" اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

ہانگ چاؤ نے اس کی طرف ہلکی سی ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ "کیا مقتدرین کا خون اور مشرق وسطیٰ کا علم غیر ملکیوں سے امداد کی بھیک مانگے گا؟" اس نے نرم لہجے میں زور دیتے ہوئے کہا۔

لی فائے نے ایک خاموش سسکی کے ساتھ اپنا سر جھکا لیا۔ ہانگ چاؤ کے چہرے پر عزم و ارادہ کی جھلک تھی۔

"برتر انسان!" وہ کہتا گیا۔ "موت سے نہیں بھاگتا کیونکہ موت اٹل ہے۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ تاریک گناہوں کے پیچھے ہی امن و سکون کے برفانی پہاڑ ایستادہ ہیں جن میں سے خوشگوار یادگاروں کے خاموش دریا بہہ رہے ہیں۔ لیکن نامعلوم سمندر میں کشتی کھینے والا اگر دائمی طمانیت کے جزیرے تک پہنچنا چاہتا ہے تو اسے مستقل مزاجی سے آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔ کیا میں موت کے کالے ناگ سے ڈر کر بھاگ جاؤں؟ نہیں، میں نڈر ہو کر اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ بلکہ میں اسے خود اپنے پاس آنے کی دعوت دوں گا۔ نذر قبا پہننے والے کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی بازاری دنگا فساد میں مارا جائے۔ یا کسی کی گولی بے خبری کے عالم میں اس کی زندگی کی دھجیاں اڑا دے۔ اسے تو اپنے گھر کو آراستہ کر کے ناگزیر کا خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کرنا چاہیے۔ مذاکل میں اپنے ہونے والے قاتلوں کے ساتھ ہی کھانا کھاؤں گا۔"

"تو کیا آپ اپنے قاتلوں کے ہمراہ کھانا کھائیں گے؟" وہ حیران ہو کر بول اٹھی۔

"تینوں قاتلوں کے ہمراہ!" ہانگ چاؤ نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اور میں ایسا کیوں نہ کروں؟ کیا انھوں نے اپنی اجرت وصول نہیں کی؟ کیا خون کی قیمت ان کے ہاتھوں میں نہیں ہے؟ جب میں ان کی آنکھوں کے سامنے آخری سانس لوں گا۔ تو وہ مطمئن ہو جائیں گے۔ اور وو فانگ کے سینے کی آگ بھی فرو ہو جائے گی۔ تم ڈرو نہیں میری ننھی کنول! اب خوں ریزی نہیں ہوگی!"

"دعوت طعام کے بعد میں ان کے ہمراہ پیوں گا۔ میرے لائق دوست ڈاکٹر کیانگ میرے لئے ایک سفوف تیار کریں گے۔ جس کے استعمال سے پرسکون موت حاصل ہو سکتی ہے۔ میں دوبارہ ان کے یہاں نہیں جا سکتا، میرے خیال میں اب تم جاؤ اور ڈاکٹر کیانگ کو میرا پیغام دے آؤ۔ اگر وہ تامل کریں تو انھیں کہنا کہ سفوف صرف میرے لئے درکار ہے۔"

اس رات ہانگ چاؤ نے چین کے تین خوفناک ترین قاتلوں کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ وہ آئے۔ ڈرتے۔ کانپتے۔ مشتبہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے۔ ان کو خطرہ تھا کہ ان کے ساتھ دھوکا کیا جائے گا، اس لئے وہ سر تا پا مسلح تھے۔ لیکن ان کے فلسفی میزبان نے باضابطہ ملبوس ہو کر خوش اخلاقی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔

"میں تمھیں خوش آمدید کہتا ہوں۔" اس نے شاہی طریقے کے مطابق کہا۔ "ملک الموت کی تم نے مخلصانہ خدمات سرانجام دی ہیں۔"

اس نے شائستہ انداز میں ان بدقماشوں کو اپنے میز کے قریب کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارا کیا۔ انھوں نے ترچھی نگاہوں سے اپنے ماحول کا جائزہ لیا۔ انھوں نے شمع کی دھیمی روشنی میں منقش پردوں سے پائدان تک سبھی چیزیں دیکھ ڈالیں۔ ان کے وحشیانہ چہروں پر ایک حسراتی چالاکی و عیاری رینگ رہی تھی۔ وہ اپنے پیشہ میں ماہر تھے اور حیرت و استعجاب کے باوجود ان میں ظلم و ستم کے جلو میں قوت استادھو دکر آئی۔

ممکن ہے مانگ چاؤ نے اپنے خوفناک مہمانوں کے چہروں پر متضاد جذبات کی یہ معرکہ آرائی دیکھی ہو۔ لیکن اس نے اپنے چہرے سے اس کا اظہار نہ ہونے دیا۔ اس رات مانگ چاؤ کی گفتگو حد درجہ پرلطف اور فلسفیانہ تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے غالباً زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی ذہانت و فطانت کا اتنا اعلیٰ ثبوت دیا تھا۔

"دعوت میں صرف ایک نقص ہے۔" اس نے لنگ چانگ پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ "میرے بائیں بازو کا یہ تکلیف دہ زخم! یہ ہماری انتہائی خوش قسمتی ہے پیارے لنگ! کہ تمھارا نشانہ چوک گیا ورنہ آج ہم اس پرتکلف دعوت میں شریک نہ ہو سکتے۔"

قاتل چونک اٹھا۔ لیکن اتنی بے تکلفانہ طنز کے مقابلہ میں وہ کر ہی کیا سکتا تھا؟ تاہم یہ لطیف مزاح ان سب کو بے چین کر گیا۔ تینوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے ماحول کا پراسرار طریقے سے جائزہ لیا۔ لیکن مانگ چاؤ ہمیشہ کی طرح پرسکون، متین اور مطمئن رہا۔ میز پر ایک کھانے کے بعد دوسرا کھانا آرہا تھا۔ اور مانگ چاؤ ان سب کو مسکرا مسکرا کر کھانے کی دعوت دے رہا تھا۔ وہ ہر ایک طشتری میں سے خود ایک نوالہ اٹھا کر منہ میں ڈالتا تاکہ اس کے مہمانوں کو شبہ نہ ہو کہ کھانے میں زہر شامل کر دیا گیا ہے۔ جب میز پر آخری دور آیا تو لی فائے گھبرائی ہوئی اندر آئی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق تھا۔

"وو فانگ آیا ہے۔" اس نے کہا۔ "غالباً وہ خود آیا ہے۔ وہ شور مچا رہا ہے۔ اسے یقین نہیں آتا کہ تم نے ان کو دعوت دی ہے۔" اور اس کی سیاہ کالی آنکھوں میں سے برق نگاہ تڑپ کر نکلی اور قاتلوں کے چہرے پر پڑی۔

مانگ چاؤ کے چہرے درشتی کے آثار ہویدا ہو گئے۔ "محترم وو فانگ کی خدمت میں میری طرف سے آداب عرض کرو۔" اس نے کہا۔ "میری دعوت مکمل ہے۔ اب کسی بن بلائے مہمان کی گنجائش نہیں ہے لیکن اگر وہ چاہیں تو میرے دارالمطالعہ میں آ کر کتابوں اور منقش پیالوں سے دل بہلا سکتے ہیں۔ جاؤ انھیں میرا پیغام دے دو۔ جب آخری دور ختم ہو جائے تو ہمارے لئے خاص چائے تیار کرو۔ اور اس کے ساتھ ڈاکٹر کیانگ کا وہ شاہی سفوف ضرور لانا۔"

لی فائے نے ایک لمحہ کے لئے توقف کیا۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں خوف و دہشت کے مارے بھنچ گئیں۔ اس کا چہرہ سنگ مرمر کی طرح سفید ہو گیا۔ "کاش میں اسے دو آدمیوں کے لئے سفوف تیار کرنے کو کہتی۔" اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں بہرحال آپ کے ساتھ جاؤں گی۔"

مانگ چاؤ نے محبت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "تمھارے لئے تو ابھی شاہ دانے کے پھول کھلے ہی نہیں۔ زندگی کا میدان تمھارے سامنے ہے۔ اور زندگی پرلطف ہوتی ہے۔"

"لیکن وو فانگ کی رفاقت میں؟" اس نے کھوکھلی آواز میں جواب دیا۔ "لیکن زہر کے نام سے میری روح بغاوت کرتی ہے۔ میں مانچو سے تعلق رکھتی ہوں۔ ہمارے نزدیک خنجر کی نوک سے موت حاصل ہوتی ہے نہ کہ بیہودہ نشتی دواؤں سے!"

"میری جان!" مانگ چاؤ نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "ہر شخص اپنی قسمت کا خود ذمہ دار ہے۔ اس لئے میں تمھیں حکم تو نہیں دے سکتا البتہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس نوجوانی کے عالم میں موت کو زندگی پر ترجیح دینا مناسب نہیں ہے۔"

"میں تو بہرحال آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی —" لی فائے نے وثوق کے ساتھ دہرایا۔

منگ چاؤ کے چہرے پر ناقابل بیان علامتیں ظاہر ہو گئیں۔ اس نے اپنے لبادے میں سے ایک ننھا سا جواہر نگار خنجر نکال کر اس کے حوالے کیا۔ "یہ لو، میری نازک کلی!" اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "یہ اگلے جہان کی کنجی ہے۔"

خنجر کو دیکھتے ہی تینوں قاتلوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ اور ان میں سے ہر ایک نے اپنا دایاں ہاتھ اپنی پیٹی پر رکھ لیا۔ لی فائے نے حد درجہ حقارت آمیز نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ لیکن مانگ چاؤ نے دلکش انداز میں مسکرا کر اس سانحہ کی تشریح کرتے ہوئے سادگی سے کہا۔ "اگر شارع عام کی خواہش ہو تو وہ چاند کو دوبارہ واپس جا سکتی ہے۔"

اس نے آخری رستہ اختیار کرنے میں دیر نہ لگائی۔ اسے میزبان کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا۔ اور وہ ان سے بطریق احسن سبکدوش ہونا چاہتا تھا لیکن وہ اس الزام سے بھی بری رہنا چاہتا تھا کہ اس نے زندگی کے درد کو بہلانے کی کوشش کی۔ لہٰذا اس نے ہاتھی دانت کا چھوٹا سا ڈنڈا اٹھایا۔ اور گھنٹی سے وہ ترنم ریز فیصلہ کن آواز برآمد ہوئی جس نے لی فائے کو کمرے میں حاضر کیا۔

اس کے ہاتھوں میں ایک منقش طشتری تھی جس میں ایک بڑی چائے دانی۔ چائے کی ایک صندلی صندوقچی اور چینی کی تین نازک پیالیاں سجی ہوئی تھیں۔ بشارع ماہ کا چہرہ خزاں کے پتوں کی طرح زرد تھا۔ وہ نامعلوم سے چائے تیار کرنے لگی اور مانگ چاؤ نے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ایک پڑیا لے لی۔ جسے کھول کر وہ بھورے سے سفوف کو تعجب آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے مسرت انگیز لہجے میں کہا۔ "میرے دوستو! آؤ میرے ہمراہ مشرق وسطیٰ کی بہترین چائے کی ایک ایک پیالی نوش کرو۔ یہ میرے مکرم ہنان کے شاہ معظم نے مجھے تحفہ کے طور پر بھیجی ہے۔ ذرا اس کی لطیف خوشبو تو سونگھو۔" ادھر وہ بول رہا تھا۔ ادھر لی فائے نے اپنے نسلی انتخار کے باوجود کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کہربائی عرق پیالیوں میں انڈیلا۔ "جہاں تک میرا تعلق ہے" مانگ چاؤ فلسفیانہ انداز میں کہتا گیا۔ "میں اپنے لئے ایک خاص عرق تیار کرونگا۔ اور تمہیں بھی اس میں شریک ہونے کی دعوت دونگا۔" اس نے ہلکی سی طنز کے ساتھ کہا۔ قاتلوں کا رنگ فق ہوا جا رہا تھا۔ "لیکن میں اپنے مہمانوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔"

اس نے پڑیا کا سفوف اپنی پیالی میں الٹ دیا۔ عرق ابلنے لگا آخر تھوڑی دیر کے بعد سفوف حل ہو گیا۔ سنگ چاؤ نے لی فائے کے چہرے پر آخری نگاہ ڈالی اور پیالی کو اوپر اٹھا کر پرسکون لہجے میں بولا۔ "میرے رفیقو! آؤ میرے ساتھ پیو!" سب نے موت کے تصور میں اپنی اپنی پیالی لبوں سے لگائی اور غٹ غٹ چڑھا گئے۔

مانگ چاؤ نے عرق پینے کے بعد اپنی آنکھیں موند لیں۔ وہ سقراط کی طرح جس نے زہر کا پیالہ نوش کیا تھا موت کی آمد کا انتظار دیکھنے کی بجائے خود اس سے جا کر ملنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک جرأت آزما قدم اٹھایا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ زہر کب تک اس کے جسم میں سرایت کرے گا تاہم اس کا دل مطمئن تھا۔

چند منٹ تک وہ خاموش بیٹھا رہا۔ کمرے میں ہُو کا عالم طاری تھا۔ پھر اسے ایک گھبرائی ہوئی سسکی سنائی دی۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا لی فائے اس کے سامنے بیٹھی ہے۔ وہ بیحد متعجب ہوا اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لی فائے کی ایک صندلی سی تصویر اس کی نگاہوں میں آنے لگی۔ گویا وہ عود لوبان کے دھوئیں میں سے اسے جھانک رہی ہے۔ اس کی نظریں تینوں میں عجیب ترین قاتل کے چہرے پر آکر رک گئیں۔ وہ انوکھے انداز سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر ڈھلک کر سینے سے لگا تھا۔ سانگ چاؤ ابھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک لنگ چانگ کا منہ سامنے پڑی ہوئی پیالیوں سے آلگا۔ اور تھوڑے ہی وقفہ کے بعد اس کے دونوں ساتھی بھی اپنی نشستوں سے فرش پر آرہے۔

مانگ چاؤ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے دریافت کیا۔ لی فائے کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"زہر!" سنگ چاؤ نے اپنے ابرو پر دایاں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں نے چائے میں زہر ملا دیا تھا" وہ شوخ فشاں ہو کر بولی۔

"لیکن سفوف؟"

"سفوف!" اور وہ دیر تک ہنستی رہی "ڈاکٹر کیانگ نے اسے میرے کہنے پر تریاق بنا دیا تھا"

مانگ چاؤ نے جس سکون کے ساتھ موت کو خیر مقدم کہا تھا وہ جاتا رہا۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا "لیکن ڈو فانگ!" اس نے قدرے سختی کے ساتھ کہا۔ "وہ میرے متعلق کیا خیال کریگا؟ تم نے میرے دشمن کے سامنے مجھے شرمندہ کیا"

لی فائے نے اس سرزنش پر سر جھکا لیا۔ اسکی لمبی لمبی پلکوں کے نیچے سے نگاہوں کی ایک شرمیلی چنگاری نکلی جو آہستہ آہستہ محبت کے شعلے میں بدل گئی۔ "میرے آقا اسے سمجھا دیں" اس نے عاجزانہ لہجہ میں مشورہ دیا۔ "کہ قصور میرا ہے۔ میں اسے دارالمطالعہ میں بٹھا آئی تھی۔" وہ دونوں دارالمطالعہ میں داخل ہوئے۔ ڈو فانگ ایک چھوٹی سی میز کے پیچھے کسی گہری فکر میں بیٹھا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے سامنے دیکھ رہا تھا لیکن وہ انکی آمد سے بالکل بیخبر رہا۔ سانگ چاؤ نے گفتگو کیلئے لب کھولے لیکن اسکی نظریں ایک چمکدار چیز پر جم کر رہ گئیں۔ یہ ایک جواہر نگار چھوٹے سے خنجر کا دستہ تھا جو ڈو فانگ کی قبا میں عین بائیں بازو کے نیچے دھنسا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اتنے میں باہر کچھ شور سا سنائی دیا۔ "یہ کیا ہے؟" مانگ چاؤ نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "پولیس آرہی ہے؟"

"نہیں میرے آقا!" لی فائے نے مسکرا کر کہا۔ جیسے پانی کی موجوں پر چاندنی کی کرنیں کھیل رہی ہوں۔ "یہ آپ کے خیر خواہ قلی ہیں جو ان سب لاشوں کو چور دروازے کے رستے شہر سے باہر پہنچانے کیلئے حاضر ہوئے ہیں۔ وہاں پولیس خود ان کو ٹھکانے لگائیگی۔" اور اس نے پہلے سے بھی زیادہ مسکراہٹوں کی شعاعیں اس کے چہرے پر مرتکز کر دیں۔

زندگی کے موڑ پر

سدھارتھ سے مہاتما بودھ

از جناب امرت لال یاس جالندھری

پہلا نظارہ

"سارتھی ---!"

لیکن وہ رتھ کی کھڑکھڑاہٹ اور بیلوں کے گلے کی گھنٹیوں کی ٹن ٹن میں گم آگے چلتا گیا۔ شام کا سورج شفق کے لال پردے میں منہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا جیسے کوئی نئی نویلی دلہن سسرال میں گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہو۔

"سارتھی! --- سارتھی!" وہ پھر پکارا۔

لیکن اس نے پھر بھی جواب نہ دیا۔

"سارتھی! --- سارتھی!! --- سارتھی!!! سنائی نہیں دیتا تمہیں" غصے کے لہجہ میں پھر سدھارتھ بولا۔

"پربھو"

"گاڑی روکو!"

"سوامی! --- گاڑی؟"

"ہاں گاڑی"

رتھ رک گیا۔ ہلکے ہلکے کالے رنگ کے بادل مغرب کی جانب پھیل گئے تھے۔ سورج کی آخری شعاعیں آب و تاب کے ساتھ چمک رہی تھیں۔ شاید دنیا والوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتی تھیں کہ تھکا ہوا مسافر بھی منزل کے قریب پہنچ کر تازہ دم ہو جاتا ہے۔ کئی خوبصورت نقشے آسمان پر بن بن کر بگڑ رہے تھے۔

سدھارتھ خاموش ہو چکا تھا۔ اس کے گرو پاس ہی دائیں طرف رتھ میں بیٹھے دیکھ رہے تھے کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی، خاموشی اور بیقراری کے ملے جلے جذبات صاف طور پر نمایاں تھے۔ گرو دیو کسی گہری فکر میں ڈوب گئے۔ پھر انہوں نے اپنا بایاں ہاتھ سدھارتھ کے کاندھے پر رکھ دیا اور بولے۔

"سدھارتھ!"

"گرو دیو!" وہ چونک کر بولا۔ جیسے کسی خواب سے چونک اٹھا ہو۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹا؟"

"کچھ نہیں گرو دیو --- ایسے ہی سوچ رہا تھا۔"

"مگر کیا؟"

"یہی! وہ سامنے اس طرف کون ہے بھلا؟"

"اوہ، وہ سامنے" گرو جی نے دیکھا۔ ایک بوڑھا کمزور جسم لاغر بدن۔ بال پریشان۔ چہرہ غمگین۔ تن تنہا، بے یار و مددگار۔ سوکھے ہوئے پیڑ کے نیچے۔ لاٹھی پاس رکھے ہانپ رہا تھا۔ جیسے خزاں کے موسم میں بادِ سموم کے جھونکوں سے پتے کھڑکھڑا رہے ہوں۔

"ہاں پربھو ناتھ!"

"تم نہیں سمجھ سکتے۔ نہیں سمجھو گے۔"

"کیا ہے؟"

"یونہی۔"

"مگر آپ گرو ہیں یہ مت بھولئے۔"

"جانتا ہوں۔"

"تو وہ کون ہے؟"

"مسافر۔"

"مسافر ---؟"

"ہاں مسافر۔"

"لیکن مسافر کو تو اپنی منزل سے پیار ہوتا ہے سوامی!"

"ہوتا ہے۔"

"مگر ایسے؟"

"ہاں ایسے بھی۔"

"تو وہ بیٹھا کیوں ہے؟"

"چلتے چلتے تھک گیا ہے سدھارتھ۔"

"لیکن پربھو! وہ چلتا ہی کب رہا ہے؟ وہ اس جھونپڑی سے نکلا۔ لڑکھڑایا، سنبھلا، رکا، چلا اور یہاں بیٹھ گیا۔"

"تم بھولتے ہو بیٹا!"

"بھلا کیوں؟"

"وہ کافی چلتا رہا ہے اور اب تھک گیا ہے۔"

"لیکن کس راستے پر چل رہا ہے گورودیو؟"
"زندگی کی الجھی ہوئی پگڈنڈی پر۔"
سدھارتھ نے کچھ سوچا، مسکرایا، پھر متحیر ہو کر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ ہلکے ہلکے بادل آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ رتھ کو ایک جھٹکا لگا۔ بوڑھے بیل نے جوان بیل کو خواہ مخواہ چلنے پر مجبور کر دیا۔ سدھارتھ کے خیالات کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ پرندوں کا شور بلند تھا۔ اس نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اور پھر کمزور بیل کی طرف، اس کی روح تڑپ اٹھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

دوسرا نظارہ

"مہابت!"
"سوامی!"
"ٹھہرو ذرا!"
ہاتھی ٹھہر گیا۔ گورو اپنے خیالات میں محو سورج کی نکلتی ہوئی شعاعوں کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں مست۔ چہرے پر شادمانی کی جھلک۔ ہونٹوں پر غیر معمولی سا تبسم۔ دل فرطِ انبساط سے بیقرار۔ دور، بہت دور، سرسبز درختوں کے دامن میں مویشی چارہ کھا رہے تھے۔
"پربھو! چلوں کیا؟" مہابت نے کہا۔
گورو چونک گیا۔ دیکھا سدھارتھ کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں اور وہ سامنے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے۔ اس نے بھی متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے سامنے ایک ٹوٹی ہوئی جھونپڑی تھی۔ جس کے دروازے کے سامنے ایک بوسیدہ چارپائی پر کوئی بیمار پڑا تھا۔ ایک کمزور نغمہ، ایک شکستہ ساز، تار تار بکھرے ہوئے دنیائے غم کی زندہ تصویر، حرماں نصیب، برباد شدہ آرزوؤں کا ہلکا سا نقش، مصائب و آلام کا مرقع!
اس کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کا ایک سیلاب امنڈ آیا اس نے مڑ کر دیکھا۔ سدھارتھ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے بے چینی ٹپکتی تھی۔ چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ وہ اپنے خیالات کی دنیا میں گم۔ گرد و پیش کے حالات سے بالکل بے پروا۔ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا؟
"سدھارتھ!"
"ہوں" سر اٹھایا۔ "گورودیو!"
"کیا بات ہے بیٹا؟"
"سوامی!" لہجہ بیقراری کا ثبوت دے رہا تھا۔
"سدھارتھ!"
"یہ سب کیا ہے پربھو؟"
"نشیب و فراز۔"
"نشیب و فراز؟"
"ہاں نشیب و فراز — اور ٹھوکر کھایا ہوا مسافر۔"
"ٹھوکر؟ مسافر؟ نشیب و فراز؟ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا۔ گورودیو!"
"تم بچے ہو۔"
سدھارتھ نے کچھ سوچا۔ پھر نظریں اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا ایک کسان سوکھے ہوئے درخت کو جس کی صرف ایک شاخ سرسبز تھی پانی دے رہا تھا۔
"چلو مہابت!" گورو نے کہا۔
سدھارتھ سوچتا رہا اور ہاتھی چل دیا۔

تیسرا نظارہ

"سوار!"
"مالک!"
"باگ کھینچو!"
اور اس کے ساتھ ہی سب کے سب گھوڑے رک گئے۔ جیسے سدھائے ہوئے جانور سرکس میں مالک کا حکم پاتے ہی ایک دم رک گئے ہوں۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ گورو نے اپنا گھوڑا سدھارتھ کے قریب کرتے ہوئے کہا۔
"بیٹا!"
"داتا!"
"تمہیں ہر روز کیا ہو جاتا ہے؟"
"آپ اتنے بڑے ہو کر یہ بھی نہیں جانتے کہ کیا ہو جاتا ہے مجھے؟"
"نہ جاننا بھی جاننا ہوتا ہے بیٹا!"
"اوہ۔ تب آپ جانتے ہیں۔"
"ضرور"
"لیکن یہ یاد رہے۔ یہ تمہارا دل نہیں۔ میرا ہے۔ اپنا ہی۔"
"تم بھی تو میرے ہی ہو۔ اپنے ہی۔"
سدھارتھ مسکرایا۔ جیسے اضطراب انگیز سکون سے جاگ اٹھا ہو

ایک خوشی اور مسرت اس کے چہرے پر رقص کرنے لگی۔ پھر یکایک ایک چیخ سنائی دی۔ دردناک چیخ۔ سب نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اُف! سامنے ایک جسم مُردہ پڑا تھا۔ اس کی بیوی رو رہی تھی، آہ و بکا سے آسمان تک پھٹا جاتا تھا۔ جھونپڑی میں ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ چاروں طرف درد ہی درد۔ سوز ہی سوز۔ اذیت ہی اذیت آگ ہی آگ نظر آتی تھی۔ غم کی موجیں ساحلِ دل سے ٹکرا ٹکرا کر کنارے کو چور چور کر رہی تھیں۔ سدھارتھ کے احساسات پیچیدہ اور المناک صورت اختیار کر چکے تھے۔ وہ بولا۔

"گورو دیو!"

"کہو بیٹا!"

"یہ تمام کیا ہے!"

"آخری منزل"

"آخری اور منزل — کس کی؟"

"مسافر کی"

اس کی روح لرزہ براندام ہوگئی۔ ہوا نے آندھی کی شکل اختیار کرلی۔ سورج غایب ہوگیا۔ گھوڑے کو ڈھیل دی اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ ساتھی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

آخری نظارہ

مسافر — نشیب و فراز — آخری منزل!

اس کے دل نے کہا۔ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں گورو دیو! — اور تمام نظارے اس کے پردۂ دماغ پر متحرک تصویر کی طرح اُبھرنے لگے۔ وہ تمام واقعات — وہ تمام حوادث جو اس نے مدت ہوئی دیکھے تھے اس کے دل میں زہریلے تیروں کی طرح چبھنے لگے۔ اس کی حرکات سے بےچینی ٹپک رہی تھی۔ فرطِ غم سے اس کی آنکھیں سُرخ ہوگئی تھیں جسم تھرتھرا اٹھا تھا اور وہ اضطراب کے عالم میں لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا، اس وقت وہ وارفتگی اور شیفتگی کا زندہ نمونہ تھا۔

اچانک ایک سریلی گھرائی سی آواز آئی — "کچھ سوچ رہے ہو کیا؟"

سامنے مایا اس کی بیوی کھڑی تھی۔ جس نے اپنے خوبصورت سنہرے بالوں کو جو ایک آبشار کے دو دھاروں کی طرح اس کے کندھوں پر لٹک رہے تھے پیچھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ اتنی خوبصورت دکھائی دیتی تھی کہ ایک نگاہِ ناز سے پارساؤں کو بھی اپنے قدموں پر گرنے کے لئے مجبور کر دیتی۔ اس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ سر میں مانگ کی سنہری لہر۔ پر بندی۔ گالوں پر شوخی، مگر عنبر محدود سی۔ نگاہوں میں جادو —!

سدھارتھ کو اپنی روحانیت پگھلتی ہوئی سی محسوس ہوئی اس نے آنکھیں بند کرلیں اور کھڑکی کے قریب جاکر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

رات زیادہ جا چکی تھی۔ چاند ابرپاروں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ وہ دیکھتا رہا — دیکھتا رہا! — آخر مطلع صاف ہوگیا۔ آسمانی مسافر بے کھٹکے اپنی منزل کی طرف چل دیا۔

سدھارتھ مسکرایا اور اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ پاس ہی بچہ سو رہا تھا۔ بیوی کھڑی تھی۔

"مایا! نیند نہیں آئی کیا؟"

لیکن مایا نے کچھ جواب نہ دیا۔ شاید وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ آخر قدم اٹھائے۔ رُکی۔ پھری۔ اور چادر اوڑھ کر سہمی ہوئی سو گئی لیکن صبح کے وقت وہ کمرے میں بچہ کے ساتھ اکیلی تھی۔ سدھارتھ کا کہیں پتہ نہ تھا —!

شہنشاہ نپولین اور مارگریٹ بینگر

داستانِ معاشقہ

مترجمہ جناب رحمت علی صاحب

جس امیر آدمی کو بھی مجھ سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے اس نے کبھی مجھ سے میرے خاندانی حالات دریافت کرنے کی جرأت نہیں کی نہ ہی کسی شریف آدمی نے جس نے مجھے اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی ہے کبھی مجھ سے یہ پوچھا ہے کہ میں دینِ عیسوی سے بھی عقیدت رکھتی ہوں کہ نہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر ایک سے محبت و عزت سے پیش آؤ۔ اس کے جذبات و احساسات کا احترام کرو۔ پھر جو چاہو نہیں مل جائے گا۔ قابلیت و لیاقت اور شرافت و نجابت ہماری سوسائٹی کے ڈھکوسلے ہیں۔ حسن وہ بے پناہ حربہ ہے جس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی بیکار ہے۔ شباب و رعنائی کے ہوتے خاندانی اعزاز و مراتب اور علمیت و قابلیت کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔"

اپنی آخری ناکامی کے بعد مارگریٹ بینگر نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ ظاہری نظروں میں اس کا یہ فلسفۂ حیات عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے مگر اس حیرت انگیز نظریۂ زندگی کی واقعیت و اہمیت سے انکار مشکل ہے۔ حیاتِ انسانی کی ہزارہا سال کی تاریخ ان چند فقروں میں پوشیدہ ہے۔ خود مارگریٹ بینگر کے عروج و زوال کی داستان اس حیرت انگیز نظریۂ زندگی کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ اس نے ایک گمنام گھرانے میں آنکھ کھولی۔ افلاس و نکبت کے تاریک ماحول میں پرورش پائی۔ پھر شباب و رعنائی کی لہریں اس کے سفینۂ حیات کو شاہی محل تک بہا کر لے گئیں اور چند ہی روز میں وہ نہ صرف تختِ شاہی پر جلوہ آرا تھی بلکہ شہنشاہِ وقت کے دل و دماغ پر بھی اس کا قبضہ تھا ــــ مگر صد حیف اس کے عروج سے اس کا تنزل بدرجہا حیرت خیز اور عبرت انگیز تھا۔ اس کی خود پسندی اور احسان فراموشی نے اس کے اعزاز و مرتبے کو آنِ واحد میں خاک میں ملا دیا۔ اور وہ دوبارہ تختِ شاہی سے فرشِ افلاس پر آ گری۔

اس کا بچپن افلاس و نکبت کی ایک طویل داستان تھا۔ دنیا میں اسے کوئی سہارا دینے والا نہ تھا۔ فاقہ کرتے کرتے کئی دن گذر جاتے تھے۔ تن ڈھانکنے کو کپڑا نصیب نہ ہوتا تھا۔ وہ ملازمت کرنا چاہتی تھی مگر کمسن و کمزور ہونے کی وجہ سے ملازمت نہ ملتی تھی جس سے ضروریاتِ زندگی تو کیا تن و جان کا رشتہ قائم رکھنا بھی دشوار ہو جاتا تھا۔

دس سال کی عمر میں مارگریٹ نے آخر کار ایک سرکس میں ملازمت حاصل کر لی۔ تار پر رقص کرنے کے فن میں اسے بہت مہارت ہو گئی تھی۔ اس لئے سب کوئی اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ وہ شاید دوسرے فنون میں بھی اس طرح ترقی کر لیتی مگر خود نمائی و خود پسندی اس کی راہ میں حائل نہ ہو جاتی۔ مارگریٹ ایک سرکس کے تنبو میں رہ کر اپنے بیش قیمت لمحات کو ضائع کرنے والی نہیں۔ اس نے ایک دفعہ اپنی ایک ہمجولی سے کہا۔ "یہ کامیابی میرے لئے باعثِ فخر نہیں۔ میرے ارادے بہت بلند ہیں اور میں اپنی موجودہ زندگی پر اکتفا نہیں کر سکتی۔"

"بیشک مارگی!" اس نے جواب دیا۔ "تم اپنی خوبصورتی کی بنا پر چاہو تو بہت ترقی کر سکتی ہو۔ خدا کی قسم تم دلوں پر حکومت کرنے کی اہلیت اپنے اندر رکھتی ہو۔" اس نے فخریہ انداز میں ہنس کر کہا۔ "دلوں پر حکومت سرکس میں تنبو میں رہ کر نہیں کی جا سکتی۔ شاید اسٹیج پر ہو۔"

لڈوک بارمس، اسٹیج کے شہرت یافتہ اداکار نے مارگریٹ میں وہ تمام خوبیاں پائیں جن کا ایک اسٹیج ایکٹرس میں ہونا ضروری ہے۔ اس نے فوراً اسے اپنی کمپنی میں شامل کر لیا۔ ایک مہینہ بعد [illegible] تھیٹر میں ایک رات تماشبینوں کے مارے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اور جب مارگریٹ دیدہ زیب لباس میں ملبوس بصد ناز و ادا رنگین برقی شمعوں کے روبرو اسٹیج پر نمودار ہوئی۔ تو ہال میں ایک شور سا بپا ہو گیا۔ مگر چند ہی منٹ بعد لوگوں کی وہ گرمجوشی گرمی کے ابال کی طرح سرد ہو گئی۔ ان کی توقعات پر پانی سا پھر گیا۔ مارگریٹ کی ایک ایک ادا و حرکت سے بے دلی اور تصنع و بناوٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔ تماشبین جن کا مذاقِ تمثیل بہت بلند ہو چکا تھا۔ اس غیر فطری اداکاری سے بہت بد دل ہو گئے۔ مارگریٹ نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اب تو تماشبین عجیب نفرت انگیز پیرایے

میں اس پر آوازے کستے رہتے تھے۔ اور طرح طرح سے اس کی بیوقوفی اور [illegible] کا مذاق اڑا رہے تھے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنی اس ناکامی اور [illegible] کو چھپانے کے لئے گرین روم میں جاتی۔ وہ [illegible] کے آگے آ کر کرنے پر جا کھڑی ہوتی۔ اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر جمائے اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ غصے سے نتھنے پھول رہے تھے۔ چند منٹ تک خاموش رہنے کے بعد وہ انتہائی نفرت انگیز لہجے میں چیخ کر بولی تم اپنے آپ کو مہذب و متمدن کہتے ہو۔ تمہیں اپنے بلند اخلاق ہونے کا دعویٰ ہے۔ مگر میرے خیال میں تو تمیز کے کنارے بسنے والے بھی اخلاق و عادات۔ تہذیب و انسانیت میں تم سے بدرجہا بہتر ہیں اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھو۔ کیا تم سے زیادہ ذلیل، کمینہ اور پست ذہنیت شخص بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ جو ایک بے کس و غریب عورت کی ہنسی اڑانا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ تف ہے تمہاری زندگی پر۔ اگر غیرت ہے تو ڈوب مرو۔ یہ کہہ کر وہ پیچھے گھومی۔ اور فراک کے ٹکڑوں کے پرزے کر دیے۔ جو اسے بطور مشاہرہ دیے گئے تھے۔ اور تھیٹر ہال سے نکل گئی یہ اس کے اسٹیج پر نمودار ہونے کا پہلا اور آخری موقع تھا۔

یہ صحیح ہے کہ مارگریٹ ایک مغلوب الجذبات اور مغرور المزاج حسینہ تھی۔ اور ایسے لوگوں کو زندگی میں بہت کم کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ مگر تعجب خیز امر یہ ہے۔ کہ ان طبعی خامیوں کے باوجود اسے وہ اعزاز و مرتبہ نصیب ہوا۔ جس کا کوئی مشکل ہی سے خیال کر سکتا ہے۔ خود اسے بھی اس کا کبھی خیال تک نہ گزرا تھا۔ کہ کسی دن وہ شہنشاہ نپولین کی محبوبہ دلنواز بنے گی۔ اُس پر عظمت فرمانروا کی محبوبہ جس کی عظمت و جبروت کی چار دانگ عالم میں شہرت تھی۔

مارگریٹ خوبصورت تھی۔ اور ایک حد تک آزاد بھی۔ آغاز شباب سے وہ ایک ایسے جذبات انگیز ماحول میں زندگی گزار رہی تھی جہاں کسی نشۂ شباب میں مخمور حسینہ کا اپنے جذبات و حسیات شباب پر قابو رکھنا مشکل ہی نہیں بلکہ ایک حد تک غیر ممکن تھا۔ مگر اس نے اس ہیجان خیز ماحول میں رہتے ہوئے بھی اپنی عزت و عصمت کو بچائے رکھا۔ اس نے اپنی دوسری ہمجولیوں کی طرح اپنے جوہر عصمت کو سستے داموں پر بیچنا گوارا نہ کیا۔ وہ اپنی رعنائی و خوبصورتی کو گزر اوقات کا ذریعہ بنانا نہ چاہتی تھی۔ وہ فی الحقیقت ایک منفرد، خوددار پاکباز حسینہ تھی۔ اپنی خودداری کو اپنی خواہشات پر قربان کرنا اُسے کسی حال میں بھی منظور نہ تھا۔ سرکس کی ملازمت کے دوران میں کتنی ہی بار دل پھینک اور ہوس پرست نوجوانوں نے اس پھول کو مسلنے کی کوشش کی۔ بڑی سے بڑی قیمت پر اس کے جوبن کی بہار لوٹنا چاہی مگر کامیابی نہ ہوئی۔

اوقات فرصت میں وہ اپنی تنگ سی کوٹھڑی میں بیٹھی ہوئی عالیشان محلوں کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ بادشاہوں اور شہزادوں کی ہمنشینی کے خیال میں غرق رہتی تھی۔ وہ عالم تصور میں دیکھا کرتی تھی۔ کہ بڑے بڑے عالی وقار شہزادے اس کے قدموں پر جھکے ہوئے ہیں۔ اس کی مرصّع جوتیوں کو بوسے دے رہے ہیں ذی عزت و خطاب یافتہ لوگ اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں اسی قسم کے دلفریب و دلنشین خیالات میں غرق رہنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اس نے سپاہیوں اور دوسرے لوگوں سے سن رکھا تھا۔ کہ شہنشاہ نپولین حسین و جمیل دوشیزاؤں کا بہت قدردان ہے۔ مارگریٹ نے تہیہ کر لیا۔ کہ وہ نپولین سے ضرور ملے گی۔ اس نے اپنے اس ارادے کا اپنی ایک سہیلی سے ذکر کرتے ہوئے کہا مجھے اس سے ملنے کا صرف ایک دفعہ موقع مل جائے پھر میں اسے زلفوں کے جال میں کچھ اس طرح پھنسا لوں گی۔ کہ وہ عمر بھر نکل نہ سکے۔ وہ خلاصی کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ اور میں اس کی بیچارگی و بے بسی کا تماشا دیکھتی رہوں۔ ... مگر اس سے ملاقات کیونکر ہو؟ مگر دولت، دوست یا کسی دوسرے ذریعے کے بغیر شہنشاہ تک رسائی محال ہے۔ اس نے جواب دیا۔ مگر وہ مصمم ارادہ کر چکی تھی۔ اس کا یہ ارادہ بظاہر دیوانے کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اتنی ناکامیوں کے باوجود وہ ان عورتوں میں سے نہ تھی جو آسانی سے حوصلہ ہار دیتی ہیں۔ آخر کار اسے فتح ہوئی۔ حالات نے اس کا ساتھ دیا۔ اور قسمت نے یاوری کی۔

ایک دن وہ اپنا بہترین لباس پہنے شام کے وقت سینٹ کلاؤڈ کے پارک کے قریب گھوم رہی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اسے اس معطر فضا میں سانس لیتے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ یکایک بادل گرجا۔ بجلی چمکی۔ اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اس ناگہانی آفت نے اس کے ارمانوں اور امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کے پاس چھتری نہ تھی۔ اور شال پرانی ہونے کی وجہ سے وہ گھر چھوڑ آئی تھی۔ ارد گرد کوئی مکان بھی نہ تھا۔ جہاں وہ پناہ لے سکتی وہ ایک گھنے درخت کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ اس کا استری شدہ

لباس پسینے سے بھیگ گیا تھا اور سبز ٹوپی بھیگ کر بہت ہی بدزیب ہو گئی تھی۔ وہ بے صبری سے بارش کے تھمنے کا انتظار کر رہی تھی کہ سڑک پر گھوڑوں کے زوردار سموں کی آواز سنائی دی۔ مارگریٹ نے گھبرا کر آواز والی سمت پر نظریں گاڑ دیں۔ ایک آراستہ پیراستہ فٹن جس میں دو سفید براق گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ اسے اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ فٹن کے مکین پر نظر پڑتے ہی مارگریٹ کی نبض تیز ہو گئی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ اس کے خوابوں کی دنیا بسانے والا آدمی تھا۔ شہنشاہ نپولین۔ مارگریٹ نے اسے تائید غیبی سمجھا۔ اس سنہرے موقعے سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت کے مترادف تھا۔ آج بڑی مدت کے بعد اس کی دعاؤں نے در ایجاب تک رسائی حاصل کی تھی۔ وہ چند منٹ تک کھڑی سوچتی رہی پھر دل میں کوئی فیصلہ کرنے کے بعد وہ بڑی بے پروائی سے چلتی ہوئی شاہی گاڑی کے سامنے سے سڑک پار کرنے لگی۔ عین راہ میں وہ یکایک اس طرح چونک کر گھومی۔ جیسے کہ اس نے پہلی دفعہ گاڑی کو دیکھا ہو۔ فٹن ایک دھچکے کے ساتھ اس کے قریب آ کر رکی اور مارگریٹ نے ایک معذرت خواہانہ انداز میں سوار کی طرف دیکھا۔ شہنشاہ نے نقرئی پردوں کے پیچھے سے غور بھری نگاہوں سے پانی میں شرابور حسینہ کو سر سے پاؤں تک گھورا۔ پھر دروازہ کھلا۔ اور ایک بیش قیمت عبا جو اس نے اپنے گھٹنوں پر ڈال رکھی تھی اسے اوڑھا دی۔ اور اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر چلا گیا۔ ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ مارگریٹ سڑک پر کھڑی نظروں سے اوجھل ہوتی ہوئی گاڑی کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس عبا کی طرف دیکھا جو اس کے حسین شانوں پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ تذبذب میں تھی کہ اسے اس واقعے پر خوش ہونا چاہئے۔ یا مایوس و غمگین۔ اسے عبا ملی جب نہ ....

خیر۔ مارگریٹ اس آسانی سے ایک عبا پر ٹل جانے والی حسینہ نہ تھی۔

دوسری شام ایک وردی پوش ملازم باادب شہنشاہ کے حضور میں کھڑا تھا۔ "یور مجسٹی! باہر ایک نوجوان خاتون آپ سے ملنے پر اصرار کر رہی ہے۔" وہ بولا "اور کہتی ہے کہ وہ کوئی چیز بذات خود آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہے۔"

شہنشاہ نے اپنی رائٹنگ ٹیبل سے نگاہ اوپر اٹھائی اور کہا "نابدولت ہر وہ چیز جس کے پیش کرنے والی ایک نوجوان خاتون ہو۔ لینے کے لئے تیار ہیں۔ جاؤ اسے اندر لے آؤ۔" عبا کو اپنے اوورکوٹ کے نیچے چھپائے ہوئے مارگریٹ کمرے میں داخل ہوئی۔ عبا کے دینے اور لینے میں زیادہ سے زیادہ چند منٹ کی ضرورت تھی مگر شہنشاہ اور مارگریٹ نے اس مختصر سے کام میں چھ طویل گھنٹے صرف کر دیئے۔ شہنشاہ نے گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا۔ اور درباری ملازم نے مؤدبانہ جھکایا "کیپٹن میں میڈم وازیل کے لئے ایک شاندار محل مخصوص کرنے کے لئے کہہ دو! یہ آج سے شاہی محل میں قیام فرمائیں گی!!"

"بہت بہتر یور مجسٹی"

اس طرح مارگریٹ شاہی محل میں داخل ہوئی کہ اس کی یہ کامیابی اس کی توقع کے مطابق تھی جس کے وہ عرصہ سے خواب دیکھ رہی تھی وہ دنیا کی مسرور ترین عورت تھی۔ جسے دنیا کی تمام نعمتیں میسر تھیں۔ رہنے کے لئے آراستہ و پیراستہ محل۔ پہننے کے لئے بیش قیمت ملبوس نفیس ترین سامان آرائش۔ ذی عزت احباب خدمت کے لئے نوکر چاکر سیر و تفریح کے لئے گاڑیاں گھوڑے۔ غرضیکہ عیش و عشرت کا اسے وہ تمام سامان حاصل تھا جس کی وہ عرصے سے تمنی تھی۔ اس پر مستزاد شہنشاہ وقت اس کی ناز برداری کو اپنا اولین فرض سمجھتا تھا۔ اس کی ہر خواہش کو پورا کرنا اس نے وظیفہ حیات بنا رکھا تھا۔ اس سے زیادہ بھلا ایک عورت کو اور کیا چاہئے۔ اس کی زندگی کا یہ روشن ترین دور شاید اور بھی مسرور کن اور خوشگوار ہو جاتا۔ اگر یکا یک اس کے طرز عمل میں تبدیلی نہ ہو جاتی۔ اور اس کی خود پسندی اگر اسے غلط راہ اختیار کرنے پر آمادہ نہ کر دیتی۔ اپنی مکمل کامیابی کے لئے اس نے شہنشاہ بیگم یوجین کو اپنی راہ سے ہٹانے کا منصوبہ باندھا۔ یہی وہ جذباتی حرکت اور ناشائستہ فعل تھا۔ جس نے اسے ہمیشہ کیلئے تختِ شاہی سے فرش گداگری پر پھینک دیا۔

ملکہ یوجین انتہائی خاموش اور سنجیدہ مزاج عورت تھی۔ اسے اپنے شوہر کی حسن پرستی اور ہوس رانی کے ہزاروں واقعے معلوم تھے مگر اس نے کبھی بھول کر بھی ان کا ذکر شہنشاہ سے نہ کیا وہ جانتی تھی۔ کہ جذباتی دور ہمیشہ قائم نہ رہے گا۔ اسلئے جب اسے مارگریٹ کے لئے ایک محل کے مخصوص کئے جانے کا حال سنا۔ تو پہلے کی طرح خاموش رہی۔ اسے سرکس کی شعلہ رو حسینہ کی عارضی کامیابی پر ہنسی آتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ چند روز بعد خود ہی شہنشاہ اسے پرانے لباس کی طرح اٹھا کر دور پھینک دیگا۔ اس لئے اس نے دخل دینا فضول سمجھا۔ اگرچہ چھ ماہ بعد ملکہ یوجین نے مارگریٹ کے ساتھ انتہائی نفرت انگیز سلوک کیا۔ تو یہ مارگریٹ کا اپنا قصور تھا۔

ایک شام کو ملکہ یوجین اپنی فٹن میں سوار سیر کو جا رہی تھی کہ

ایک طرف سے ایک سیاہ گھوڑے پر سوار مارگریٹ نمودار ہوئی۔ اور انتہائی بے پروائی کے ساتھ اس نے ملکہ کی گاڑی کے سامنے سے اپنا گھوڑا گزارا اور ایک قہقہہ لگا کر دوسری طرف کو چلی گئی۔ اس کی یہ حرکت ملکہ کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ یہ اس کے وقار کی انتہائی توہین تھی۔ اس نے اسی وقت رہی اس بے عزتی کا بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

دیکھنے کے پیچھے اپنے ہاتھ باندھے شہنشاہ نپولین ملکہ یوجین کی خوابگاہ میں بے چینی سے چکر کاٹ رہا تھا۔ اس کے اوضاع و اطوار اور حرکات و سکنات سے اضطراب و بیقراری کا اظہار ہو رہا تھا۔ چہرے پر دلی پریشانی کے تاثرات نمایاں تھے۔ ملکہ خاموشی سے بستر پر لیٹی ہوئی اپنے شوہر کی بے قراری کو دیکھ رہی تھی۔

"لیکن میری پیاری!" شہنشاہ آخرکار بولا۔ "اس میں برا ماننے کی تو کوئی بات نہیں۔ اور پھر اس سے ہوتا کیا ہے کہ کوئی عام عورت تمہارے بارے میں کیا خیالات رکھتی ہے۔ آخر تم ایک ملکہ ہو اور . . . ."

ایک نرم و نازک پاؤں مخملیں توشک پر زور سے پڑا۔

"کیا تم اپنی بیوی کی یہ توہین برداشت کر سکتے ہو؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہر عام عورت اس کا مذاق اڑائے۔ اس کی بے عزتی کرے!! پھر عورت بھی وہ جو کل تک . . . . ."

"لیکن میری پیاری . . . . ."

"میں کچھ اور سننا نہیں چاہتی۔" ملکہ فیصلہ کن لہجے میں قطع کلام کرتے ہوئے بولی۔ "اس خوبصورت ناگن کو یہاں سے جانا ہو گا اور وہ بھی آج ہی رات۔ آج" اس کی آنکھیں انتقامی جوش سے چمک رہی تھیں۔ اور دل مچلا ہوا تھا۔

اس رات جب مارگریٹ کبھی آئینے میں اپنی دلفریب قامت اور کبھی بیش قیمت جواہرات کو دیکھ دیکھ کر جی ہی جی میں خوش ہو رہی تھی اور بڑی بے صبری سے شہنشاہ کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے اپنی قسمت کے فیصلے کا خیال تک نہ تھا۔ رات کافی گذر چکی تھی۔ وہ شہنشاہ کی آمد سے مایوس ہو کر وہ اپنے نرم و گداز بستر پر لیٹنے ہی والی تھی کہ ایک ملازمہ اندر داخل ہوئی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ خادمہ بلا اجازت یا بے طلب، اس کے خاص کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"کیوں کیا بات ہے؟" اس نے ذرا تیز ہو کر پوچھا۔

"آپ کے لئے بہت بری خبر لائی ہوں میڈم" خادمہ بولی۔ "شہنشاہ کا حکم ہے۔ کہ آپ اسی وقت اس محل اور آج ہی رات پیرس سے چلی جائیں۔ اور مجھے آپ کی اطلاع کے لئے یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ آپ کے لئے ایک معقول پنشن مقرر کر دی گئی ہے اور آپ شہنشاہ سے دوبارہ ملنے کی کوشش نہ کریں!!" مارگریٹ کو اپنی سماعت پر یقین نہ آتا تھا۔ جب اسے اپنی بیداری کا یقین ہو گیا تو اس کی مایوسی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس کی پریشانی ناقابل بیان تھی۔ تمام تمناؤں کا خون ہو گیا۔ سب آرزوؤں پر پانی پھر گیا۔ اس کا ہی پر اس کا دل رو رہا تھا۔ مگر آنکھیں آنسوؤں سے محروم تھیں شدت گریہ سے ان کے لب تھرتھرا رہے تھے۔ مگر منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس وحشت خیز خبر نے اسے مفلوج و بیکار کر دیا ہے۔ قضا و قدر کے زبردست ہاتھوں نے اسے آن کی آن میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ جب اس کے حواس ذرا ٹھکانے آئے تو اس نے بیقراری سے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شاہی محل سے اخراج کے بعد مارگریٹ بہت دنوں تک عوام کی نگاہوں سے روپوش رہی۔ وہ کہاں تھی۔ اور کیا کرتی تھی۔ اس بارے میں کسی کو علم نہیں۔ پورے تین سال کے بعد لوگوں نے اسے مرسیو کا لیک کے ساتھ تورین میں اقامت گزیں دیکھا۔ جہاں اسے اپنے شوہر کا عشق و اعتماد حاصل تھا۔

کالی کالی گھٹائیں چھائی ہیں
مے مستی کی لے کے لائی ہیں
تم بھی آجاؤ اب چھوڑ دو رنجش
پیار کی مستیاں رنگ لائی ہیں
[illegible]

چھایا

مہاراجہ چندرگپت کی محبوبہ

از جناب حکیم محمود عالم برمی

افرادِ تمثیل

چندرگپت — ہندوستان کا شہنشاہ
چندرکیتو — چندرگپت کا دوست پہاڑی راجہ
چھایا — چندرکیتو کی بہن
مورا — چندرگپت کی ماں
سیلوکس — سکندر اعظم کا جانشین
ہیلن — سیلوکس کی دختر

پہلا منظر

(سیلوکس نے ہندوستان پر چڑھائی کی ہے۔ مہاراجہ چندرگپت اپنے دوست چندرکیتو کے ساتھ میدان جنگ میں شریک ہے)

چھایا۔ بھیا کیا خبر ہے؟

چندرکیتو۔ ہم لوگ ہار رہے ہیں چھایا۔

چھایا۔ اور چندرگپت کہاں ہیں؟

چندرکیتو۔ بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ انہی کی طرف جا رہا ہوں۔

چھایا۔ میں بھی چلتی ہوں۔

(جنگ کا بازار گرم ہے۔ لڑائی زور شور سے ہو رہی ہے مہاراجہ چندرگپت کی جے۔ مہاراجہ سیلوکس کی جے کے فلک بوس نعروں سے فضا گونج رہی ہے)

چندرکیتو۔ گھبراتا نہیں چندرگپت!

چندرگپت۔ بڑھے چلو چندرکیتو۔ فوج کی ہمت پست ہو رہی ہے کون؟ چھایا!

چھایا۔ (دھیمی آواز سے) ہاں!

دوسرا منظر

(شاہی قلعے میں چندرگپت، چندرکیتو، اور چندرگپت کی ماں مورا دیوی بیٹھے ہیں)

مورا۔ جب نند نے مجھے اچھوت کہا۔ تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں آگ کی لہروں پر کھڑی ہوں۔ اور جب دنچال نے میرے دامن کو کھینچا (رو پڑتی ہے)۔۔۔۔۔!

چندرگپت۔ ہاں! سیتا کے آنسوؤں نے لنکا کو خاک میں ملا دیا دروپدی کی بے عزتی نے کوروؤں کا خاتمہ کر دیا۔ اسی طرح مورا کی بے عزتی کے باعث نند کے خاندان کی تباہی و بربادی بھی قریب ہے۔

چندرکیتو۔ فوج تیار ہے چندرگپت۔ ہم نے اسے تین حصوں پر تقسیم کر دیا ہے۔

چندرگپت۔ تیسرے حصہ کا سپہ سالار کون ہے؟

چندرکیتو۔ چھایا ــــ

تیسرا منظر

(چندرگپت کی شکست فتح سے بدل جاتی ہے۔ سیلوکس اور ہیلن قید ہو جاتے ہیں)

سیلوکس۔ میں صلح پسند نہیں کرتا ہیلن!

ہیلن۔ ٹھیک تو ہے۔ ہم چھوٹوں سے صلح کیوں کریں گی۔ لیکن چندرگپت سے صلح کرنے میں۔۔۔۔۔۔۔

سیلوکس۔ ہیلن!

ہیلن ۔ کس نے کہا تھا آپ ہندوستان پر حملہ کیجیئے؟ کس نے کہا تھا آپ دوسروں کے گھر میں آگ لگائیے؟

سیلوکس ۔ ہیلن! تم نہیں جانتیں۔ اس مرتبہ اگر ہم رہ ہو گئے.....

ہیلن ۔ تو پھر ہزاروں بچوں کے سروں سے ان کے ماں باپ کا سایہ اٹھ جائے گا۔ لاکھوں بیواؤں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے جاری ہونگے۔ یہی تو ہرگز نہ! اب تم سے نہیں بولونگی۔ ابا! تم بہت بُرے ہو۔ (روٹھ کر ایک طرف ہو جاتی ہے)

چوتھا منظر

[شاہی محل میں محبت کی دیوی چھایا کھڑی ہے]

چھایا ۔ بھیّا بھی گئے۔ دنیا میں ایک ہی آخری سہارا تھا جسے بھگوان نے چھین لیا۔

چندرگپت ۔ (کمرے میں داخل ہوتا ہے) چھایا!

چھایا ۔ مہاراج!

چندرگپت ۔ چھایا! لڑائی کے بعد پھر تم سے ملاقات نہ ہوئی۔ چھایا تم نے میری زندگی بچائی تھی۔ آج تک میں اس کے لئے شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔ چھایا! میں تمہارا احسانمند ہوں۔

چھایا ۔ بس اتنا ہی؟

چندرگپت ۔ تمہارے اس احسان کیلئے میں تمہیں اپنی مہارانی...

چھایا ۔ نہیں مہاراج! ہم لوگ نیچ پہاڑی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر بھی نیکی کا سودا نہیں کرتے۔ میں اپنا احسان آپ کے ہاتھوں فروخت نہیں کرنا چاہتی۔ وقت پر آپ کے کام آ سکی۔ یہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتی۔

چندرگپت ۔ چھایا! تمہارے ننھے سے دل میں کتنے پاکیزہ خیالات ہیں۔ لیکن ....

چھایا ۔ ہاں مہاراج! ہم بچپن سے شکار کھیلتے ہیں۔ جوانی سے جنگ کرتے ہیں۔ لیکن کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔ ہم ذو معنی الفاظ نہیں بولتے۔ ہم جو کہتے ہیں۔ اس کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ ہم لیکن ویکن نہیں جانتے!

چندرگپت ۔ چھایا! احسان کرکے بھول جانے والا شخص آج تک نہیں دیکھا تھا۔ آج دیکھ لیا۔ جا رہی ہو؟ لیکن یہ بتاتی جاؤ۔ چھایا آج کل تم افسردہ کیوں رہتی ہو؟

چھایا ۔ افسردگی کی مت پوچھئے! مہاراج کبھی آپ نے کوہ ہمالیہ پر کھڑے ہو کر غروب آفتاب کا منظر بھی دیکھا ہے؟

چندرگپت ۔ دیکھا ہے چھایا!

چھایا ۔ ہماری زندگی بھی اسی طرح ہے۔ آخر ہم کھشتری تو ہیں!

چندرگپت ۔ اور شاید اسی لئے میں تمہیں سمجھ نہیں سکا۔

چھایا ۔ کاش آپ کے سینے میں دل ہوتا۔ مہاراج' اور اس دل میں ہمیں سمجھنے کی مسرت ہوتی۔

چندرگپت ۔ چھایا! کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟

چھایا ۔ مہاراج! دنیا میں کون سی چیز ناممکن ہے؟ قدرت نے آپ کے چہرے پر ضرورت سے زیادہ سرخی ہو کا ہے۔ غالبا اسی وجہ سے آپ زمین کو ٹھوکر مار کر چلتے ہیں۔ آپ پوچھتے ہیں کیا آپ سے میں محبت کرتی ہوں؟ کون کہتا ہے؟ میں تو آپ سے نفرت کرتی ہوں۔ آپ نے سوچا ہوگا۔ چھایا بھکاری کی طرح آپ سے پریم کی بھیک مانگے گی۔ اور آپ ازراہ کرم ایک مٹھی بھر محبت اس کی جھولی میں ڈال دیجئے اور چھایا دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے اپنے سر سے لگا لیگی۔ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں مہاراج! (چلی جاتی ہے)

چندرگپت ۔ عجیب تماشا ہے۔ اسی قسم کا ایک تماشہ پہلے بھی دیکھا تھا۔ دریائے سندھ کے ساحل پر سیلوکس کی لڑکی ہیلن نے جب اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر۔ اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ جب بھی یہی چندرگپت تھا۔ اور آج بھی میں وہی ہوں۔ اُف! آخر میں اسے کیوں یاد کرتا ہوں؟

چھایا ۔ (کمرے میں داخل ہوتی ہے) مہاراج میں معافی چاہتی ہوں۔

چندرگپت ۔ کس لئے چھایا؟

چھایا ۔ میں نے مہاراج کی توہین کی ہے۔

چندرگپت ۔ اس میں توہین کی بات ہی کیا ہے؟ چھایا تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ مجھے نہیں چاہتی ہو؟

چھایا ۔ نفرت کرتی ہوں مہاراج' اس سے جو میری آنکھوں کی روشنی ہے۔ میرے خواب کی تعبیر ہے۔ میری دنیا کی دولت ہے۔ مہاراج میں نے کتنا جھوٹ بولا ہے۔ کاش میں مہاراج سے نفرت کر سکتی۔

چندرگپت ۔ چھایا! میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو طعنے پر طعنے دیئے جا رہی ہو؟

چھایا۔ بھگوان [illegible] مہاراج! آپ نے میری [illegible] کر دی [illegible] کا سب چھین لیا۔ میرے دل کی خوشیوں کو نیا [illegible] دی۔ میں ہر دم آپ کے تصور میں کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ (رو پڑتی ہے)

چندرگپت۔ چھایا!

چھایا۔ میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے مہاراج! پتھر سے ٹکر کھانے والے برتن کی طرح میرا سر جھنجھنا اٹھا ہے۔ چھوڑ دیجئے مہاراج۔ میں آپ کے قدموں میں اپنے ارمانوں کو قربان کر دونگی۔ (چلی جاتی ہے)

چندرگپت۔ چھایا! — چھایا!

پانچواں منظر

(راج ماتا مورا بیٹھی ہے۔ کچھ دیر بعد چھایا بھی آجاتی ہے)

مورا۔ آج میرے دل کی خواہش پوری ہوئی۔

چھایا۔ کیا ہوا اماں؟

مورا۔ آج سے چھایا ہندوستان کی ملکہ ہے۔

چھایا۔ مذاق نہ کرو ماں! مہاراج چندرگپت اگر ہندوستان کے مہاراج ہیں تو چھایا بھی ایک راجہ کی بیٹی ہے۔

مورا۔ میں نے تمہارے ساتھ کبھی مذاق کیا ہے بیٹی؟

چھایا۔ سچ کہہ رہی ہو ماں۔ کیا یہ سچ ہے؟ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ آیا تھا۔ میں اس خوشی کو برداشت نہ کر سکوں گی ماں! ماں! (رو پڑتی ہے)

مورا۔ چھایا روتی ہے بیٹی؟

چھایا۔ ہاں ماں! سوچتی ہوں کہیں یہ خواب نہ ہو؟

(وزیر آتا ہے)

مورا۔ چھایا اور چندرگپت کی شادی کا پیغام لائے ہو؟

وزیر۔ مورا دیوی! میں نے صلح کر لی ہے۔ سیلوکس کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ چندرگپت اسے پانسو ہاتھی دینگے۔ اور سیلوکس کی لڑکی کی شادی چندرگپت کے ساتھ ہوگی تاکہ اس صلح کو پائدار بنایا جاسکے۔

مورا۔ یہ کیا کہہ رہے ہو وزیر؟

وزیر۔ اتنا ہی نہیں سیلوکس ہندوستان کے جنوبی اور مشرقی صوبے مہاراج کو دے دیگا۔

مورا۔ لیکن کیا چھایا کے ساتھ شادی نہ ہوگی؟

وزیر۔ چھایا کو ملک اور قوم کی خاطر یہ قربانی کرنی پڑے گی۔ اسی میں ہندوستان کی ترقی کا راز مضمر ہے؟

مورا۔ چھایا! چھایا! تمہارا چہرہ سفید کیوں ہو رہا ہے بیٹی۔؟ اُف میری بدقسمت لڑکی؟

چھایا۔ ہائے! یہ کیا سن رہی ہوں؟ — میں نے خواب کیا دیکھا تھا؟ تعبیر کیا نکلی؟ ایک ساتھ ہی محبت اور موت! اُمید و ناامیدی — وہ دیکھو! وہ دیکھو ماں! آسمان کا ایک تارہ سورج کی طرح جل کر بکھر رہا ہے۔ (روتی ہے)

چھٹا منظر

(قیدخانہ سے سیلوکس اور ہیلن کو رہا کر دیا جاتا ہے۔ چندرگپت سے باتیں ہو رہی ہیں)

چندرگپت۔ میں مانتا ہوں کہ میں ہیلن سے پیار کرتا ہوں؟

سیلوکس۔ پھر؟

چندرگپت۔ میرے دوست چندرکیتو نے مرتے وقت اپنی بہن چھایا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا تھا اس لئے ہندوستان کی ملکہ تو وہی ہوگی۔

چھایا۔ (کمرے میں آتی ہے) معاف کیجئے مہاراج! چھایا اس مہربانی کی بھوکی نہیں۔ ہندوستان کی ملکہ بننے کا حق یونان کی بیٹی ہی کو پہنچتا ہے۔ ہیلن! تم واقعی خوش قسمت ہو۔ مہاراج تم سے پیار کرتے ہیں۔ میں خوشی سے مہاراج کا دل تمہارے سپرد کرتی ہوں۔ اس امانت کی قدر کرنا۔ آج کا دن میری زندگی کا مبارک دن ہے۔ لیکن بہن! کاش تم سمجھ سکتیں کہ میں نے تمہاری خوشی کی خاطر کس درجہ قربانی سے کام لیا ہے؟ (چلی جاتی ہے)

چندرگپت۔ چھایا! چھایا! یہ نہیں ہو سکتا! (چھایا کے پیچھے جاتا ہے)

سیلوکس۔ ہیلن! کیا تم سچ مچ چندرگپت سے شادی کر دگی؟

ہیلن۔ ہندوستان کو ایک بنانے کے لئے اس شادی میں پلیٹو اور کپل منی ساتھ ساتھ جائینگے۔ سولن اور منو ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہونگے۔ ہومر کے طبلے کے ساتھ بالمیکی کی بڑنا بجیگی۔ سقراط اور بودھ، افلاطون اور بھیشم، پتھنجلی اور پرانے آن سب ایک ہو جائیں گے۔ دنیا کے پردے پر یہ شادی حیرت انگیز ہوگی۔

سیلوکس۔ ہیلن بیٹی!
ہیلن۔ دعا دیجئے پاپا!
سیلوکس۔ ہیلن! خوش رہو۔

ساتواں منظر

(بادشاہ کا یوم پیدائش منایا جا رہا ہے۔ لوگ ہنس گا رہے ہیں محل اور شہر ایک دوسرے پر سینکا جا رہا ہے۔ شاہی محل میں چندر گپت اور ہیلن سرخ کپڑوں میں ملبوس کھڑے ہیں۔ چھایا آتی ہے)

چندر گپت۔ ہیلن!
ہیلن۔ مہاراج!
چندر گپت۔ آج میری پیدائش کا دن ہے۔
ہیلن۔ ہاں مہاراج! یہ میری زندگی کا پہلا دن ہے۔
چھایا۔ (رنگ ڈالتے ہوئے) اور میری زندگی کا آخری دن ہے مہاراج بھگوان آپ دونوں کو لمبی عمر عطا کرے۔
چندر گپت۔ چھایا—!
چھایا۔ چپ کیوں ہو گئے مہاراج؟ کچھ تو کہئے۔ آج تو سب کچھ سُن لینے کا وقت ہے۔ مجھے بھی بہت کچھ کہنا ہے مہاراج!
چندر گپت۔ کہو چھایا، جو جی میں آئے کہو۔
چھایا۔ کاش دل کی بات کہہ سکتی مہاراج! اچھا تو سنئے آپ حکم دیں تو میں رنگ سے بھرا ہوا برتن آپ کے قدموں پر نثار کر دوں اور اس کے بعد چلی جاؤں۔
چندر گپت۔ کہاں جاؤ گی چھایا؟
چھایا۔ یہ بھی نہیں جانتی لیکن جانا ہے اس لئے جاؤں گی۔ آپ دونوں خوش رہیں۔ یہی میری آخری تمنا ہے۔
چندر گپت۔ چھایا!
ہیلن۔ بہن چھایا آؤ، ہم دو ندیاں مل کر ایک سمندر میں جا گریں۔
چھایا۔ ہیلن! قربانی ہی میں خوشی ہے۔ اطمینان ہے مہاراج قبول کیجئے۔ (رنگ کے قطرے دونوں کے قدموں پر نثار کرتی ہوئی چھایا بیہوش ہو کر گر پڑتی ہے۔ اور اس کی روح پرواز کر جاتی ہے)
ہیلن۔ مہاراج—! چندر گپت۔ چھایا! چھایا!
ہیلن۔ آگے مت بڑھئے مہاراج! آپ کے قدموں میں پڑے ہوئے ایک ایک قطرہ میں چھایا کے ٹوٹے ہوئے دل کی چھایا (عکس ہے)
چندر گپت۔ چھایا! چھایا! (پردہ گرتا ہے)

سیر و سوانح

امیر البحر خیر الدّین باربروسؔ

تاریخ ترکی کا ایک شجاعت آموز باب

از جناب ماسٹر ممتاز حسین بسملؔ (منشی فاضل)

آج اغیار کے جنگی بیڑے سمندر کی لہروں کو روندتے پھرتے ہیں۔ مگر ایک وہ زمانہ تھا جب اسلامی بیڑہ سمندروں پر حکمران تھا اور ہلالی پرچم کو دیکھ کر دشمن کونوں کھدروں میں دبک جاتے تھے۔

سلیمان کے عہد حکومت میں ترک تمام یورپ پر چھا گئے تھے۔ ان دنوں امیر البحر خیر الدین نے بحیرہ روم میں دول یورپ کے متحدہ بیڑوں کو نیچا دکھایا اور سمندر پر دولت عثمانیہ کا اقتدار قائم کیا۔

خیر الدین کا وطن اناطولیہ کے علاقہ میں صحرائے آچہ تھا۔ اس کا باپ یعقوب سلطان محمد فاتح کے لشکر میں شریک تھا۔ سنہ ۱۴۶۲ء میں سمرنا کے قریب مَلی کا جزیرہ مسلمانوں نے فتح کیا۔ یعقوب مَلی کی محافظ فوج میں شریک تھا اس لئے وہیں مقیم ہو گیا۔ اس کے چار بیٹے تھے جن کے نام اسحٰق، عروج، الیاس اور خضر تھے۔ خضر بعد میں کپتان پاشا خیر الدین باربروس کے نام سے مشہور ہوا اور اس کے شاندار کارنامے آج تک تاریخ اسلام کا ایک روشن باب ہیں۔

خضر ۱۴۶۶ء میں پیدا ہوا۔ بچپن کے حالات معلوم نہیں ہیں۔ یعقوب کی وفات کے بعد اس کے چاروں بیٹے بیوپار میں مصروف ہو گئے اور ان کے تجارتی جہاز یونان کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے سلانیک تک جاتے تھے ایک بار جزیرہ روڈس کے سمندری لٹیروں نے ان پر حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں الیاس شہید ہوا اور عروج کو دشمنوں نے گرفتار کر لیا۔ سلطان بایزید کے بیٹے شہزادہ قورقور کو اطلاع ملی اس نے عروج کو قید سے چھڑایا۔ جب وہ رہا ہو کر دربار سلطانی میں پہنچا تو جوش انتقام اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا۔ شہزادہ سے اس نے ۲۶ توپوں کا ایک جہاز حاصل کیا اور دشمن پر حملہ کر دیا لٹیروں نے اسے گھیرنے کی کوشش کی مگر اس کے لگاتار حملوں نے ان کی قلعہ بندیوں کو توڑ دیا۔ ایک جانب ترکی توپخانہ کی آگ تھی دوسری جانب سمندر کی گہرائی تھی اور ان کے درمیان روڈس کے سمندری لٹیروں کی بحری طاقت دم توڑ رہی تھی۔ عروج کے ایک جنگی جہاز نے دشمن کے بیسیوں جہاز غرق کئے اور سمندر پر اپنی برتری کا پھریرا لہرایا۔

اس لڑائی کے بعد عروج نے بیوپار چھوڑ دیا اور اپنے بھائی خضر کے ہمراہ بحیرۂ روم کو سمندری لٹیروں سے پاک کرنے کا ارادہ کیا۔ یورپ میں جہالت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے اندلس پر قبضہ کر کے وہاں علم کی شمع روشن کی اور یورپ کے دور دراز گوشے اس سے منور ہو گئے۔ آٹھ سو برس تک یورپ اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتا رہا اس کے بعد نصرانیوں نے مسلمانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اندلس پر قبضہ کر لیا۔ مغلوب مسلمانوں کے لئے زندگی ایک بھیانک مصیبت بن گئی اور ان پر ہر قسم کی آفتیں ٹوٹنے لگیں۔ اندلس کے شہروں میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ فاتح عیسائیوں نے مسلمانوں کی جائدادوں پر قبضہ کرنے کے بعد انھیں دولت ایمان سے محروم کرنا شروع کر دیا۔ جس ملک میں مسلمان آٹھ سو برس تک حکمران رہے تھے وہاں انھیں بھیڑ بکریوں سے ذلیل تر زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ہزاروں مسلمان جان اور ایمان لے کر اندلس سے نکل آئے اور شمالی افریقہ میں آباد ہو گئے۔ مگر عیسائیوں کے جوش انتقام نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ جہازوں میں بیٹھ کر افریقہ کے شمالی سواحل پر اتر آتے اور ملک کے اندرونی علاقوں میں گھس کر لوٹ مار کا بازار گرم کرتے۔ اندلس کے لاکھوں مسلمان گھر بار چھوڑ کر بحیرۂ روم کے ساحل کے آس پاس پہاڑوں میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ ظالموں کے چنگل سے بچ کر کسی اسلامی ملک میں جانے کی خواہش رکھتے تھے۔ مگر سمندر رستے میں حائل تھا۔ ایک دو بار چند منچلے نوجوانوں نے چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنا کر اپنے آپ کو سمندر کی لہروں کے حوالے کر دیا مگر پکڑے گئے۔ اور عیسائیوں نے انھیں بڑی بے رحمی سے قتل کیا۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ اندلس میں اسلامی خون پانی سے سستا ہو رہا تھا۔ دنیا بھر کے مسلمان ان خبروں کو سن کر انگاروں پر لوٹ رہے تھے مگر بدقسمتی سے اسلامی حکومتوں نے اندلس کے مسلمانوں کو بچانے کے لئے عملی طور پر کچھ نہ کیا۔

عروج اور اس کے بھائی خضر نے اندلس کے مظلوم مسلمانوں کو

ظالموں کے پنجے سے چھڑانے کے لئے جہازوں کا ایک بیڑہ تیار کیا۔ اس مقصد کے لئے بے شمار سرمائے کی ضرورت تھی۔ ان کے بھائی اسحٰق نے ان کی مدد کی۔ دونوں بھائی تھوڑے سے جہاز تیار کرکے اور ان پر توپیں نصب کرکے ساحل تیونس کے قریب جزیرہ جربہ پر قابض ہو گئے۔ مگر وہاں انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی اس لئے [illegible] میں دونوں بھائی محمد حفصی سلطان تیونس کے پاس گئے اور اس سے درخواست کی کہ وہ ان کو حلق الوادی کا قلعہ دے دے تاکہ وہ اس کو اپنا مرکز بنا کر اندلسی لٹیروں کا مقابلہ کر سکیں۔ سلطان نے انہیں حلق الوادی میں قیام کی اجازت دے دی۔ عروج نے وہاں قلعے تعمیر کرائے۔ توپیں چڑھائیں اور بندرگاہ میں اپنے جنگی جہاز چھپا دیئے۔ اور اس کے بعد سمندری لٹیروں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے گھات میں بیٹھ گیا۔

یورپ کے سپاہی اندلس میں مسلمانوں کی گردنوں پر اپنی تلوار کی تیزی آزمانے کے بعد روم واپس جا رہے تھے۔ بہت بڑی جمعیت تھی۔ عروج کے پاس دو تین چھوٹے چھوٹے جہاز تھے مگر وہ مقابلے پر ڈٹ گیا۔ اندلس کے مسلمانوں کی داستان مصیبت سن کر اس کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے بڑی بہادری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ سارا دن لڑائی ہوتی رہی۔ آغاز میں عیسائیوں کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا مگر بہادر ترک ان کے لئے موت کا طوفان بن گئے جس کی زد میں آ کر ان کا مضبوط بیڑہ دھوئیں کے بادلوں کی طرح بکھر گیا۔ عروج کو مکمل فتح نصیب ہوئی۔ دشمن کے اکثر جہاز ڈوب گئے باقی گرفتار ہو گئے اور یورپ میں عروج کی بہادری کی دھوم مچ گئی۔

اندلس کے عیسائی مسلمانوں کو قتل کرنے کے لئے مغربی بحیرہ روم کو عبور کرکے الجزائر کے ساحل پر چھاپے مارتے اور لوٹ مار کرنے کے بعد جہازوں پر سوار ہو کر بھاگ جاتے۔ ایک بار اندلسی عیسائیوں کے ایک بڑے لشکر نے افریقہ کے شمالی ساحل پر بجایہ کا محاصرہ کر لیا۔ امیر بجایہ نے عروج سے مدد مانگی۔ شیر دل ترک فوراً بجایہ کی طرف روانہ ہوا اور ہسپانوی لشکر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ لڑائی چھڑ گئی۔ ایک دن عروج دشمنوں کے نرغے میں پھنس گیا۔ اندلسی اسے گرفتار کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر وہ انہیں نیچا دکھا کر صاف نکل گیا۔ لڑائی کے دوران میں اُسے گولی لگی جس کی وجہ سے اسے علاج کے لئے تیونس بھیجا گیا اور بجایہ کی مہم ناتمام رہ گئی۔ بجایہ سے تیونس جاتے ہوئے راستے میں جنیوا کا ایک جہاز ملا۔ خضر نے اس پر حملہ کرکے اسے گرفتار کر لیا۔

جنیوا کی پارلیمنٹ نے جب اپنے جہاز کی گرفتاری کی خبر سنی تو بدلہ لینے کی ٹھانی۔ امیر البحر اندریا ڈوریا ایک زبردست جنگی بیڑہ لے کر تیونس پر حملہ آور ہوا۔ عروج گولی لگنے کی وجہ سے لڑائی میں حصہ نہ لے سکا۔ خضر کا مختصر بیڑہ دشمن کے زبردست جنگی بیڑے کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے وہ حکمت سے بیٹھ کر کسی اچھے موقع کا انتظار کرتا رہا۔ چند روز کے بعد عروج تندرست ہو کر اپنے بھائی سے آ ملا۔ [illegible] میں عروج نے دوبارہ بجایہ میں ہسپانوی لشکر کو گھیر لیا۔ مگر دشمن کو اندلس سے کمک پہنچ گئی۔ اس لئے عروج کو دوبارہ پسپا ہونا پڑا۔

جو مسلمان اندلس سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ وہ الجزائر میں آباد تھے اور ہسپانیہ کے بادشاہ فرڈی نینڈ کو ٹیکس ادا کرتے تھے کچھ عرصہ کے بعد ہسپانوی لشکر نے الجزائر پر قبضہ کر لیا اور نہتے مسلمانوں کو تلوار کے گھاٹ اتارنا شروع کیا۔ الجزائر کے مسلمان حاکم نے عروج سے مدد مانگی اور عروج بحر و بر پر ہوا کی طرح اڑتا ہوا دشمن کے سامنے پہنچ گیا۔ ہسپانیوں نے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر عروج کی دانائی کی وجہ سے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چند روز کے بعد اندلس سے کمک آ گئی اور عروج دشمنوں میں گھر گیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ جس میں ہسپانوی لشکر کو شکست ہوئی اور الجزائر کے مظلوم مسلمانوں کو اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا۔ جن دنوں عروج خشکی پر دشمن کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی خضر اپنا بیڑہ لے کر ہسپانیہ کے ساحل پر پہنچ گیا اور وہاں کے مظلوم مسلمانوں کو اپنے جہازوں پر بٹھا کر افریقہ پہنچاتا رہا۔

جب سلطان سلیم کو عروج کی فتوحات کی خبر ملی تو اسے دو کمکی جنگی جہاز خلعت ہفت پارچہ تلوار مرصع اور بیگلر بیگ الجزائر کا عہدہ مرحمت فرمایا۔ کچھ عرصے کے بعد شاہ ہسپانیہ نے ایک بڑی فوج جمع کی اور الجزائر پر حملہ کرکے عروج کو تلمسان کے قلعہ میں گھیر لیا۔ وہاں عروج کے پاس صرف پانچسو سوار تھے اور دشمن کے سپاہی دو لاکھ سے زیادہ تھے۔ عروج نے پسپا ہونا اسلام کی شان کے خلاف سمجھا اور دشمن پر حملہ بول دیا۔ تمام دن گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ خون کے دریا بہہ نکلے عروج کی فوج کے تمام آدمی کٹ مرے اور عروج ہزاروں دشمنوں کو خاک پر سلا کر خود بھی اس رنگین بستر پر لیٹ گیا۔ مرتے دم تک اس نے تلوار کے قبضہ کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

ان دنوں خضر الجزائر میں تھا۔ اپنے بھائی کی شہادت کی خبر سن کر شیر کی طرح جھلا کر اٹھا اور ہسپانیہ پر حملے کی تیاری شروع کر دی ہسپانوی جرنیل نے خضر کا مقابلہ کرنے کے لئے وادی فراش میں فوج

تاری۔ خضر نے سب سے پہلے ہسپانوی بیڑہ پر حملہ کیا اور اسے غرق کر کے وادی مراش میں دشمن کے سامنے پہنچ گیا۔ ہسپانوی تعداد میں بہت زیادہ تھے اور بہادری سے لڑے مگر خضر کے سامنے کوئی پیش نہ گئی۔ دشمن گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ مگر وہاں ترک سپاہی گھات میں بیٹھے تھے انہوں نے تلواروں پہ رکھ لیا اور دشمن کے اس عظیم الشان لشکر میں سے کوئی آدمی زندہ نہ بچا۔ جب سلطان کو اس فتح کی خبر ملی تو اس نے خضر کو الجزائر کا گورنر بنا دیا۔

ہسپانوی چودہ برس سے الجزائر پر قابض تھے۔ وہاں انہوں نے کئی مضبوط قلعے تعمیر کئے تھے۔ خضر نے تمام قلعے لے لئے اور اس کے بعد ہسپانیہ پر بحری تاخت کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ ہر سال دو بار اندلس پر حملہ کرتا اور مظلوم مسلمانوں کو قید سے چھڑا کر افریقہ لے آتا۔ شاہ ہسپانیہ نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک زبردست جنگی بیڑہ تیار کیا سنہ [illegible]ء میں جزائر بیلرک کے قریب ہسپانوی بیڑے نے خضر کو گھیر لیا دونوں جانب سے توپیں آگ اگلنے لگیں۔ فضا دھوئیں سے تیرہ و تار ہوگئی۔ ترک چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر تیر کی طرح دشمن کے جہازوں پر حملہ کر کے آگ لگا دیتے۔ لڑائی شب و روز جاری تھی دشمن دانت پیس پیس کر حملے کرتا مگر خضر کے تدبر کے سامنے کوئی پیش نہ جاتی۔ ہسپانوی بیڑے کے بیسیوں جہاز ایک ایک کر کے سمندر میں غرق ہوگئے۔ ہسپانوی امیر البحر لڑتا ہوا مارا گیا۔ دشمن نے مقابلہ بیسود سمجھ کر ہتھیار ڈال دیئے۔ بیشمار مال غنیمت، لاتعداد قیدی اور سات جنگی جہاز خضر کے ہاتھ آئے۔ ہسپانوی بیڑے کو شکست دیکر خضر ساحل پر جا اترا۔ القنطرہ اور ولنیشا کے آس پاس سیکڑوں مسلمان خاندان دردناک زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہیں ظلم کے پنجے سے رہائی ملی۔ اور اس طرح خضر ستر ہزار مسلمانوں کو ہسپانوی آقاؤں کی غلامی سے نجات دلانے میں کامیاب ہوا۔

سنہ ۱۵۲۱ء میں اسپین کے بادشاہ نے امیر البحر ڈوریا کو ایک جنگی بیڑہ دیکر الجزائر پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ خضر نے اس کا مقابلہ کیا۔ ڈوریا کے ایک ہزار ساتھی مارے گئے اور ایک ہزار غلام بنائے گئے۔

الجزائر کے قریب بے توں کا قلعہ اسپین کے قبضہ میں تھا خضر نے اس پر حملہ کر دیا۔ قلعہ دار نے شاہ ہسپانیہ سے مدد مانگی۔ خضر کو مخبروں نے اطلاع دی کہ ساحل اندلس پر ہسپانوی لشکر جہازوں میں سوار ہو رہا ہے۔ یہ سن کر خضر نے ایسی شدید گولہ باری کی کہ بے توں کا نام و نشان مٹ گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ہسپانوی لشکر قلعہ کی حفاظت کے لئے وہاں پہنچ گیا۔ مگر قلعہ موجود نہیں تھا۔ دشمن ساحل پر اترنے کی تیاری کر رہا تھا مگر خضر نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور گھیر کر گرفتار کر لیا۔

خضر کی بے مثال جرأت اور بحری طاقت مسلمانوں کے لئے سرمایۂ ناز تھی۔ جینوا کا امیر البحر اندریا ڈوریا ترکی ساحل کے قریب تجارتی جہازوں کو لوٹ لیتا تھا۔ اس لئے سلطان سلیمان اعظم نے خضر کو استانبول بلا بھیجا۔ خضر چالیس جہاز لے کر سنہ ۱۵۳۳ء میں استانبول کی طرف روانہ ہوا۔ باب عالی کی طرف سے اس کا شاندار استقبال کیا گیا اور سلطان نے اسے کپتان پاشا خیر الدین باربروس کا خطاب دے کر وزیر بحر مقرر کر دیا۔

نئے منصب پر فائز ہو کر امیر البحر خیر الدین نے ۸۴ جہازوں کا بیڑہ تیار کیا اور اندریا ڈ کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔ اندریا ڈ جینوا میں جا چھپا اور امیر البحر خیر الدین اٹلی کے ساحل کے آس پاس جزائر بلاریک۔ ریگیو۔ اسٹرارو وغیرہ میں دشمن کے سمندری اڈوں پہ چھاپے مار کر اور بیشمار قیدی اور جہاز پکڑ کر واپس چلا آیا۔

ان دنوں تیونس میں سلطان حسن کی حکومت تھی۔ وہاں کے باشندوں نے اس کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر سلیمان اعظم سے مدد مانگی۔ اور سلطان نے امیر البحر خیر الدین کو ترکی بیڑے کے ہمراہ وہاں جانے کا حکم دیا۔ ترکی بیڑے نے تیونس کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان حسن بھاگ کر ہسپانیہ چلا گیا اور امیر البحر خیر الدین نے ایک دوسرے دعویدار کو تخت پر بٹھا دیا۔ ادھر سلطان حسن نے شاہ ہسپانیہ سے مدد مانگی۔ وہ مدت سے شمالی افریقہ پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اسے بہانہ مل گیا اور اس نے چھ سو جہازوں کا بیڑہ لے کر تیونس پر حملہ کر دیا جرمنی اس کے ساتھ شامل تھا۔ اور شارل پنجم شاہ جرمنی اتحادیوں کی فوج کی کمان کر رہا تھا۔ دشمن نے حلق الوادی پر قبضہ کر لیا۔ اتفاق سے ان دنوں سلیمان اعظم نے امیر البحر خیر الدین کو استانبول بلا بھیجا اس کی غیر حاضری میں شارل پنجم نے تیونس پر قبضہ کر لیا اور سلطان حسن کو تخت پر بٹھا دیا۔ تیونس پر قبضہ کرنے کے بعد شارل نے قتل عام کا حکم دیا۔ ساٹھ ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ پاکدامن عورتوں کو گلیوں میں گھسیٹ کر بے عزت کیا گیا اور گلی کوچوں میں مسلمانوں کے خون کی ندی بہہ نکلی۔ امیر البحر خیر الدین ان دنوں آستانۂ عالیہ میں مقیم تھا۔ ہسپانوی لشکر کی درندگی کی داستان سن کر بدلہ لینے کے لئے تیونس کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کی آمد کی خبر سن کر

فنارل خجسم ہسپانیہ بھاگ گیا اور امیر البحر خیر الدین کا ریسیکا کو تاخت و تاراج کر کے اور بیشمار مال غنیمت اور قیدی لے کر الجزائر چلا آیا۔ ہسپانوی لشکر کے چلے جانے کے بعد تیونس کے مسلمانوں نے سلطان حسن کو تخت سے اتار کر اندھا کر دیا اور اس طرح اسے اپنی غداری کی سزا ملی۔

کچھ عرصے کے بعد استانبول میں ۲۸۰ جہازوں کا ایک بیڑہ تیار ہوا خیر الدین اٹلی کو دولت عثمانیہ کے مقبوضات میں شامل کرنا چاہتا تھا تجویز کے مطابق سلطان سلیمان اعظم بہادر ترکوں کی فوج لیکر البانیہ کی بندرگاہ الونیہ تک پہنچ گیا اور وہاں سے اٹلی پر حملہ کیا۔ وینس اور جینوا کی حکومتوں نے اٹلی کی حمایت میں ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اور تینوں حکومتوں کا متحدہ بیڑہ امیر البحر اندریاڈ کے زیر کمان جزیرہ کارفو کی طرف روانہ ہوا۔ ترکی بیڑہ اتحادیوں کے بیڑے کے ایک چوتھائی سے کم تھا اس لئے اندریاڈ نے فوراً حملہ کر دیا اس لڑائی میں ترکوں نے دشمن کی کثرت تعداد کی پرواہ نہ کی اور اسلام کے وقار کی خاطر لڑنے مرنے پر تل گئے۔ سیکڑوں ترک سپاہی بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے مگر دشمن کی طاقت کے پرخچے اڑا دیئے، اندریاڈ نے بھاگ کر کارفو میں پناہ لی اور ترکوں نے جزائر جوتہ۔ مرتد یارہ۔ نقشہ۔ اناپولی اور کسل نورہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بندقیہ والوں سے لڑائی چھڑ گئی۔ امیر البحر خیر الدین نے دشمن کو شکست دے کر ۳۰۰۰ آدمی گرفتار کئے اور اندیرہ۔ اسٹریل اور شیرہ وغیرہ جزائر پر قبضہ کر لیا۔

کچھ عرصہ کے بعد جرمنی۔ اسپین۔ جینوا۔ اٹلی اور مالٹا کی حکومتوں نے متفقہ طور پر ترکوں سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا۔ دشمن کا بیڑہ تین سو سے زاید بڑے بڑے جنگی جہازوں پر مشتمل تھا۔ ان کے مقابلہ میں عثمانی بیڑہ میں صرف ۱۴۰ چھوٹی بڑی کشتیاں اور جنگی جہاز تھے۔ سلطانی بیڑہ استانکوئی سے روانہ ہو کر ستون میں لنگر انداز ہوا۔ وہاں اطلاع ملی کہ دول متحدہ کا بیڑہ پر دیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ امیر البحر خیر الدین نے فوراً لنگر اٹھانے کا حکم دیا جب ترکی بیڑہ باکو کے پاس پہنچا تو دشمن ہلالی پرچم کو ہوا میں لہراتے ہوئے دیکھ کر بھاگ نکلے مگر امیر البحر اندریاڈ نے اپنی منتشر طاقت کو دوبارہ جمع کر لیا اور ترکی بیڑہ پر آتشباری کی دھمکی دی۔ بہادر ترک مقابلے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ دشمن نے چھوٹی چھوٹی تیز رفتار کشتیاں ترکی بیڑہ پر آگ برسانے کے لئے بھیجیں۔ یہ دیکھ کر ترکوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ نقارۂ جنگ پر چوٹ پڑی سامیر البحر خیر الدین نے اپنی ہلکی اور تیز رفتار کشتیوں کو دشمن پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ دشمن کی ہزاروں توپیں آگ برسا رہی تھیں مگر چالیس ترکی کشتیاں جنہیں حملہ کرنے کا حکم ملا تھا دشمن کی صفوں میں گھس گئیں اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر دشمن کی صفوں میں انتشار پیدا کر دیا۔ اس ناگہانی آفت کی وجہ سے دشمن گھبرا کر پیچھے ہٹا اور رات کی تاریکی میں بھاگ نکلا عثمانی بیڑہ تعاقب میں تھا۔ دوسرے دن انجیر کی بندرگاہ میں عثمانی بیڑے نے دشمن کو جا لیا۔ ہوا بند تھی اس لئے دشمن کو بھاگنے کا موقع نہ ملا۔ امیر البحر اندریاڈ نے اپنے جہازوں کی اس طرح صف بندی کی کہ بڑے بڑے جہاز اگلی صف میں تھے اور تیز رفتار چھوٹی کشتیاں پچھلی صف میں تھیں۔ تاکہ گھمسان کی لڑائی میں ترکی بیڑہ کی پشت پر حملہ کر سکیں۔

طبل جنگ پر چوٹ پڑی۔ توپوں کے دہانے کھل گئے۔ ترکی گولے دشمن کے سروں پر پھٹتے تھے۔ مگر دشمن کی توپیں دور تک مار نہیں کرتی تھیں اس لئے دشمن کے جہاز ایک ایک کر کے غرق ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر اینڈریاڈ گھبرا گیا اور چھوٹی تیز رفتار کشتیوں کو آگے بڑھا دیا تاکہ بڑے جہازوں کو صدمہ نہ پہنچے۔

امیر البحر خیر الدین نے اپنے بیڑہ کا ایک حصہ آگے بڑھا کر دشمن کی کشتیوں پر حملہ کر دیا اور انہیں ڈبونا شروع کیا۔ امیر البحر اندریاڈ گھبرا کر ایک جنگی جہاز میں جا چھپا اور ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد ترکی بیڑہ کی پشت پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ تاکہ دونوں سمت سے دباؤ ڈال کر اسے تباہ کر دیا جائے۔ امیر البحر خیر الدین دشمن کے ارادے کو بھانپ گیا اور اپنے بیڑہ کو دور تک پھیلا دیا جس کی وجہ سے دشمن اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد امیر البحر خیر الدین نے اپنے بیڑے کے دونوں بازوؤں کو بڑھا کر دشمن پر دو جانب سے حملہ کر دیا اور جب گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی تو اپنے خاص بیڑے کو آگے بڑھا کر سامنے کی جانب سے ہلہ بول دیا۔ دشمن گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ امیر البحر خیر الدین ترکی بیڑہ دشمن کے جنگی جہازوں اور چھوٹی تیز رفتار کشتیوں کے درمیان لے آیا۔ امیر البحر اندریاڈ فتح سے مایوس ہو کر تیز رفتار کشتیوں کا بیڑہ لے کر بھاگ نکلا اور دشمن کے جنگی جہاز ترکوں کے ہاتھ آئے۔ اس لڑائی میں امیر البحر خیر الدین کی صف آرائی مستقبل میں اقوام عالم کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہوئی کہ امیر البحر نلسن نے اس طریقہ جنگ کی پیروی کر کے فتح حاصل کی۔

۱۵۴۱ء میں ... اسپانیہ کی حکومت نے الجزائر کو فتح کرنے کیلئے ایک جنگی جہازوں کا بیڑہ تیار کیا اور اس کے علاوہ سوداگروں کے ایک سو جہاز پکڑ کر ایک زبردست لشکر افریقہ کے ساحل پر اتار دیا۔ الجزائر کے حاکم حسن آغا نے ... صلح کی درخواست کی اور کمک کے آنے تک دشمن کو روکے رکھا اس اثنا میں سمندر میں زبردست طوفان آیا دشمن کے سو جہاز غرق ہو گئے اور بہت سی کشتیاں ریت پر چڑھ گئیں جو فوج باقی رہ گئی تھی وہ ترکی بیڑہ کی آمد کی خبر سن کر بدحواسی کے عالم میں بھاگ نکلی اور سامان رسد کے علاوہ بیشمار جنگی سامان ترکوں کے ہاتھ آیا۔ ۱۵۴۳ء میں جرمنی کے حکمران شارل نے فرانس پر حملہ کیا۔ فرانس کے بادشاہ نے ترکوں سے مدد مانگی خیر الدین ایک سو جنگی جہازوں کا بیڑہ لے کر فرانس کی مدد کے لئے گیا اور ساحل ہسپانیہ کے بہت سے اہم مقامات پر قبضہ کر لیا فرانسیسی امیر البحر نے ترکی امیر البحر کی شاگردی اختیار کی اور امیر البحر خیر الدین کے مفید مشوروں کی بدولت فرانسیسی بیڑہ اکیلا دشمنوں کا مقابلہ کرنے لگا۔ شاہ فرانس نے امیر البحر خیر الدین کو آٹھ لاکھ فرانک سفر خرچ دیکر شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا یہ مہم امیر البحر خیر الدین کی آخری بحری جنگ تھی اس کے بعد وہ بیمار ہو کر ۱۵۴۶ء میں فوت ہو گیا اس کی قبر قسطنطنیہ کے قریب مسلمانوں کی زیارت گاہ ہے ؎

عاقبت منزل ما وادیٔ خاموشاں است — حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز



میں کیوں مرگئی

ایک ہندوستانی عورت کے جذبات عالم خیال میں

مجھے مرے ہوئے کئی ہفتہ ہوچکے تھے۔ اور مجھے یاد ہے کہ میری موت پر تقریباً تمام رشتہ داروں نے اور میری سب سہیلیوں نے بڑے زور و شور سے ماتم بھی کیا تھا اور جہاں تک میرا حافظ کام کرتا ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میرے خاوند کو میری موت کا اتنا رنج ہوا کہ وہ کئی دن تک دفتر نہیں گئے۔ لیکن میں مجبور تھی سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر کسی زندہ آدمی سے بات کرنیوالی طاقت مجھ سے چھین لی گئی تھی۔ مجھے بتادیا گیا تھا کہ اب میں دنیا کے کسی باشندہ سے نہ مل سکتی ہوں نہ اُن سے کوئی بات کرسکتی ہوں لیکن تمام باتوں کے باوجود ایک کانٹا جو میرے دل میں اندر ہی اندر چُبھ رہا تھا "میں کیوں مرگئی؟" یہ ایک سوال تھا جسکے حل کرنے اور جواب جاننے کیلئے میری روح بے چین تھی۔

میں اٹھی۔ سارا قبرستان چھان مارا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر یہ ہزاروں لاکھوں قبریں کیوں بن گئیں۔ اور یہ لوگ کیوں مرے۔

ایک فہرست میں نے بنانی شروع کردی۔ بچوں کو چھوڑ کر عورتوں اور مردوں کی پوری تعداد میں نے لکھ لی۔ اور حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ عورتیں زیادہ مری ہیں۔ یہ دیکھکر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آخر عورتوں سے موت کو کیا دشمنی ہے۔ یہ بے زبان طبقہ کیوں موت کے گھاٹ اُترتا جارہا ہے سوچتی رہی۔ غور کرتی رہی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر میں نے ایک اور فہرست بنانے کا ارادہ کیا۔ اب مجھے یہ جاننا تھا کہ یہ عورتیں کس لئے زیادہ مریں اور کس مرض میں زیادہ مریں۔

فہرست تیار ہوگئی میں نے حساب لگایا۔ اسّی فیصدی بے زبان عورتیں نسوانی امراض میں اپنی زندگی دے بیٹھی تھیں۔ اور ان میں بھی سب سے زیادہ تعداد ایسی عورتوں کی تھی جو اپنی زندگی میں سیلان الرحم یعنی لیکوریا کی مریض تھیں۔ ان کے مردوں نے یا خاوندوں نے لاپرواہی کی۔ وقت پر اس بیماری کی خبر نہ لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیلان الرحم کی وجہ سے اور کئی بیماریاں پیدا ہوگئیں۔ پھر بھی ان کے غافل مردوں نے کچھ توجہ نہ کی۔ یہاں تک کہ ان کا مرض لاعلاج ہوگیا۔ اور وہ آخرکار موت کے خوفناک پنجہ میں پھنس گئیں۔ مجھے یہ سب باتیں معلوم کرکے بڑا رنج ہوا میں نے سُنا ہے کہ ہندوستانی لوگ سیلان الرحم کی بیماری کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ اور بہت سے تو جانتے بھی نہیں کہ سیلان الرحم کسے کہتے ہیں۔ کاش ان مردوں کو معلوم ہوتا کہ شریف عورتیں اپنی زبان سے ایسی بیماریوں کا ذکر نہیں کیا کرتیں اسلئے انہیں خود ہی ان کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اگر وہ کسی قابل حکیم ڈاکٹر سے پوچھیں کہ لیکوریا کا مرض کیا ہے تو وہ بتلادے گا کہ اس مرض میں ایک سفید رنگ کی لیسدار رطوبت عورت کے خفیہ بدن سے خارج ہوتی رہتی ہے اور عورت دن بدن کمزور اور سُست ہوتی چلی جاتی ہے۔ کمر میں اور پیٹ اور زیر ناف درد ہوتا ہے۔ تمام جسم میں بیکلی ہوتی ہے۔ بھوک بند ہوجاتی ہے سر چکراتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ یہ بیماری خطرناک صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اور پھر لینے کے دینے پڑجاتے ہیں۔

پھر ہم کیا کریں؟ جو لوگ یہ پوچھتے ہوں کہ لیکوریا کی بیماری کا علاج کیسے ہو اور ہم کیا کریں۔ اُن کو بتانے کیلئے میں لکھتی ہوں کہ اگر وہ اس عورت کو جو اس کی مریض ہو ایک شیشی دوا "رفک" استعمال کرادیں تو یہ بیماری فوراً دُور ہوجائے۔ کیونکہ یہ دوا ہزارہا جگہ تجربہ میں آچکی ہے۔ اور اس بیماری کا تیر بہدف علاج ہے۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۲۲ دہلی کو خط لکھ کر منگالو۔ ایک شیشی تین روپے کی ہے۔ اور اس پر سات آنے محصول ڈاک کے خرچ ہوں گے۔ یاد رکھو اگر اپنی بے زبان عورتوں کی تندرستی چاہتے ہو تو ہمیشہ ان کی تندرستی کے متعلق ان سے سوالات کرتے رہو۔ اور نوٹ کرلو کہ دہلی کا زنانہ دواخانہ اس مقصد کیلئے بہترین خدمات انجام دے رہا ہے۔ اور تیر بہدف دوائیں ایجاد کرنے میں خاص شہرت رکھتا ہے۔

حضرت آصفجاہ اولؒ

سلطنت آصفیہ کا بانی مبانی

از جناب سید احمد اللہ قادری ایڈیٹر تاریخ

نواب آصف جاہ اوّل بانی سلطنت آصفیہ مسلمانوں کے پہلے خلیفہ امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ دُنیائے اسلام کے شہرہ آفاق صوفی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی آپ کے اجداد سے تھے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے توکّل کی یہ کیفیت تھی کہ آپ کی خانقاہ کا روزانہ خرچ ایک ہزار دینار تھا۔ یہ رقم خطیر جس طرح روزانہ وصول ہوتی اسی طرح فوراً ہی راہِ خدا میں صرف کر دی جاتی تھی۔ اور دوسرے دن کے لئے ایک حبہ بھی پس انداز نہ کیا جاتا تھا۔ تیسری صدی ہجری میں ایک دینار پندرہ درہم کے مساوی تھا۔ اس لحاظ سے شیخ الشیوخ کی سالانہ آمدنی نصف ملین گنیوں کے برابر تھی۔ اگر ہم اس کا عہد حاضر کی دولت سے تقابل کریں تو واضح ہوگا کہ ملک معظم شہنشاہ جارج ششم کو جو وظیفہ ملا کرتا ہے وہ شیخ الشیوخ کی آمدنی کا ½ ہے۔ یعنی شیخ الشیوخ کی سالانہ آمدنی ملک معظم کے وظیفہ سے پانچ گنا زاید تھی۔

حضرت شیخ شہاب الدینؒ سہروردی کے سلسلے میں شیخ عزیزان نامی ایک نامور صوفی گزرے ہیں جن کے اثر و اقتدار کا یہ عالم تھا۔ کہ بڑے بڑے بادشاہ انتہائی انکسار کے ساتھ اپنے گلے میں رسی ڈال کر آپ کی خانقاہ میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ جن کا سر ان کے غلام کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ شیخ عزیزان کے پوتے شیخ عالم بڑے متقی و پرہیزگار بزرگ تھے بہرحال نواب آصف جاہ کے اجداد سلاطین شیبانیہ کے عہد میں تقریباً سو سال تک باشندگان سمرقند و بخارا کے مذہبی رہنما بنے رہے اور ماوراءالنہر کی ریاست اسی باعظمت خانوادے سے وابستہ تھی۔

حضرت شیخ عالم کے صاحبزادے یعنی نواب آصف جاہ کے دادا خواجہ عابد شیخ خان ۱۰۶۵ھ میں شاہجہان بادشاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اورنگ زیب نے آپ کو ۱۰۷۸ھ میں صدارت کل کے ممتاز ترین عہدہ پر مقرر فرمایا۔ اورنگ زیب نے جب دوسری مرتبہ گولکنڈے پر چڑھائی کی تو آپ اس معرکہ میں شہنشاہ کے ہمراہ تھے۔ اور اسی جنگ میں آپ نے نواح گولکنڈہ میں توپ کے گولے سے مجروح ہو کر وفات پائی۔

خواجہ عابد کے صاحبزادے میر شہاب الدین خان فیروز جنگ نواب آصف جاہ کے والد تھے جنہیں عالمگیر نے ہفت ہزاری منصب عنایت کیا تھا۔ یہ منصب دربار مغلیہ کے اُن مناصب سے تھا جو شہنشاہ اکبر کے زمانے میں صرف شہزادوں کی ذات سے مخصوص تھا۔ چنانچہ اکبر نے ۱۰۰۸ھ میں اپنے فرزند شہزادہ دانیال کو جب تسخیر دکن کی مہم پر بھیجا تو اُسے ہفت ہزاری منصب دیا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نواب آصف جاہ اوّل کے والد بزرگوار نواب فیروز جنگ کی دربار مغلیہ میں کیا وقعت تھی معرکہ بیجاپور کے موقع پر عالمگیر نے نواب فیروز جنگ کی نسبت کہا تھا کہ۔

"نواب فیروز جنگ کی بدولت جس طرح اللہ تعالےٰ نے خاندان تیموریہ کی عزت رکھی ہے اسی طرح فیروز جنگ اور اُن کی اولاد تاقیامت باآبرو رہے"

شہنشاہ اورنگ زیب نواب فیروز جنگ کو فرزند ارجمند کے لقب سے یاد کیا کرتا تھا۔ یہ وہ اعزاز تھا جو نواب فیروز جنگ کے سوا کسی دوسرے امیر کو نصیب نہیں ہوا۔ نواب فیروز جنگ کا عقد شاہجہان بادشاہ کے وزیر اعظم نواب سعداللہ خان علامی کی صاحبزادی سعیدالنساء بیگم سے ہوا تھا جن کے بطن سے نواب میر قمرالدین خان آصف جاہ اوّل ۱۴ ربیع الثانی ۱۰۸۲ھ کو تولد ہوئے۔ لفظ "نیک بخت" سے آپ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔

مراۃ آفتاب نما کے مصنف نے لکھا ہے۔ کہ جب آپ کی عمر ۱۳ سال کی تھی تو شہنشاہ عالمگیر نے آپ کو اپنے امراء میں داخل فرمایا ۱۱۱۱ھ میں جب برشنی کرنیچا دکھا کر آپ واپس آئے تو شہنشاہ نے بخشی الملک مخلص خان کو دروازہ برہم پوری و اسلام پوری تک استقبال کے لئے بھیجا ۱۱۲۴ھ میں فرخ سیر نے آپ کو سات ہزاری منصب اور نظام الملک فتح جنگ کا خطاب عطا کر کے برہان پور کا گورنر بنا دیا۔ جب بادشاہ سادات بارہہ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا آپ دکن چلے آئے۔ اور ۱۳ رجب ۱۱۳۲ھ کو قلعہ آسیر مسخر فرمایا۔ سید دلاور علی خان اور عالم علی خان کو شکستیں دیں ان شاندار فتوحات کے بعد آپ اورنگ آباد میں داخل ہو کر ملک کے انتظامات میں مصروف ہوئے۔ سادات بارہہ کے خاتمہ

کے بعد بادشاہ کی طلبی پر آپ دارالسلطنت تشریف لے گئے اور ۵ جمادی الاوّل ۱۱۳۲ھ کو بادشاہ نے آپ کو وزیر کل بنالیا جب ملک میں بدانتظامی بڑھ گئی تو بادشاہ سے اجازت لیکر آپ دارالسلطنت سے نکلے اور دکن آگر ہندرہ سولہ سال تک یہاں کے انتظامات میں مصروف رہے۔ ۱۱۵۰ھ میں بادشاہ نے دارالسلطنت بلوا کر آپ کو "وکالت مطلق" کا ممتاز ترین عہدہ عنایت کیا۔ جو دربار مغلیہ کا سب سے بڑا منصب تھا۔ وزیر، میر بخشی اور گورنر سب اس کے ماتحت ہوا کرتے تھے۔ اس کے کوئی ڈیڑھ سال بعد ۱۱۵۱ھ میں نادر کی چڑھائی اور قتل وغارت گری کا جگر خراش واقعہ پیش آیا جب نادر قتل عام کا حکم دے کر دہلی کی سنہری مسجد میں تلوار کھینچ کر بیٹھ گیا تو کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے اس ارادے سے باز رکھے۔ جب مخلوق کٹنے لگی اور ملک قیامت صغرا کا نمونہ بن گیا تو امرا آصف جاہ کی جانب رجوع ہوئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس فتنہ کو روکنے کی جس میں قوت ہے وہ آپ ہی کی واحد ہستی ہے۔ غرضکہ آپ سے بھی یہ منظر دیکھا نہ گیا چنانچہ آپ گلے میں تلوار لٹکائے برہنہ سر نادر کے سامنے جاکر آبدیدہ کھڑے ہو گئے۔ نادر نے آپ کی نورانی صورت دیکھی تو پوچھا "چہ می خواہی" آپ نے یہ شعر پڑھا۔

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

نادر نے شرم سے سر جھکا لیا اور تلوار نیام میں رکھ لی اور کہا کہ "بہ ریش سفید تو بخشیدم" فوراً ایرانی نقیب اور چاوش امان امان کہتے ہوئے دوڑے اور پل کے پل میں امن قائم ہو گیا۔ نواب آصف جاہ اوّل کا اہل دہلی پر ایسا احسان تھا۔ کہ اس کی تلافی کسی سے ممکن نہ تھی

ہن خون آشام واقعہ کے بعد نادر نے آپ کو فرط عنایت سے ہندوستان کی سلطنت دینی چاہی۔ لیکن آپ نے انکار فرما دیا۔ اور کہا کہ میں بادشاہ کا مخلص اور نمک خوار ہوں۔ چونکہ نادر پیاس دیکھ رہا تھا۔ اس جواب سے بیحد مسرور ہوا۔ ۱۱۵۴ھ تک تقریباً چار سال آپ دربار میں رہے۔ جب دکن میں بغاوت شروع ہوئی تو بادشاہ سے اجازت لیکر دکن چلے آئے۔ نربدا سے کرشنا تک سارے ملک کا دورہ فرمایا۔ انگریزوں نے بھی آپ سے دوستانہ تعلقات پیدا کئے اس کی وجہ یہ تھی کہ فرانسیسیوں نے ۱۱۶۰ھ میں انگریزوں سے مدراس چھین لیا تھا۔ گورنر کے معروضہ کرنے پر آپ نے نواب انور الدین نائب ارکاٹ کو حکم دیا کہ فرانسیسیوں کو مدراس سے نکال کر انگریزوں کو یہ علاقہ دلایا جائے۔

۴ جمادی الاوّل ۱۱۶۱ھ کو آپ نے اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ فرمایا۔ وفات کے وقت آپ کی عملداری میں جو ملک تھا۔ اس کی حد شمال میں نربدا سے شروع ہو کر جنوب میں رامیشورم تک چلی گئی تھی۔ مشرق میں اڑیسہ کے ساحل پر بنگال کی سرحد تک آپ کی مملکت وسیع تھی۔ البتہ کوکن اور ملیبار کے علاقے خارج تھے۔ میسور کا راجہ اور کرناٹک کے حکمران آپ کو خراج دیا کرتے تھے۔ نیلگری کا کوہستان اور اس کا صحرا جسے سلاطین مغلیہ "بالا گھاٹ" کہتے تھے آپ کی مملکت کے جنوبی خطے میں شامل تھا۔ اس زمانے میں ملک کا محاصل نواور دس کروڑ کے لگ بھگ تھا۔

آصف جاہ اوّل کی بہ نسبت مورخین کا متفقہ خیال ہے کہ وہ انتہائی دور اندیش اور بڑے سیاست دان تھے۔ اگر اس دور کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سارے ہندوستان میں صرف آپ ہی ایک ایسے جامع الصفات بادشاہ تھے۔ جن کی فطرت مرنجان مرنج اور مسلک صلح کل تھا۔ آپ جس طرح ایک مدبر اور مفکر تھے۔ اسی طرح بے مثل منتظم اور بڑے بہادر تھے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد ملک کے لئے جب شہزادوں میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں تو آپ غیر جانبدار رہے اور جو برسر اقتدار ہوا اس کے ساتھ آپ نے ربط ضبط رکھا۔ سچ پوچھئے تو یہی جہانبانی و جہانگیری کا اصل اصول ہے۔ آپ کی اس مدبرانہ پالیسی سے ایک تو آپ کی قوت برقرار رہی اور دوسرے کسی مغل بادشاہ کو آپ سے ناخوش ہونے کا موقع نہ ملا۔ برخلاف اس کے جو امیر ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے اکثر جان سے مارے گئے اور ان پر بادشاہ کا عتاب ہوا۔ مگر آپ سلطنت و بادشاہ کی خیر خواہی میں غیر متزلزل رہے اور کسی وقت بھی بادشاہ کی بدخواہی نہیں چاہی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ آپ بادشاہ کی نظر میں ہمیشہ باوقعت رہے۔

چونکہ دکن ابتدا سے شمالی فاتحین کی توجہ کا مرکز تھا۔ اور مغلوں میں صرف عالمگیر ہی ایک ایسا بادشاہ تھا جس نے قریب قریب سارے دکن کو اپنے مقبوضات میں داخل کر لیا تھا۔ مگر دکن کی فتوحات میں اس کے بھی قدم ڈگمگا گئے تھے۔ لیکن آصف جاہ اوّل پر آفریں ہے کہ دکن کی ایک وسیع مملکت کا انتظام حسن و خوبی کے ساتھ فرما کر تاریخ میں اپنی ایک ناقابل فراموش مثال قائم فرما دی۔ اور خاص کر اس واقعہ سے بھی آپ کی قوت اور جلالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ستارہ کے راجہ ساہو جی کو ۱۱۳۹ھ میں آپ نے معزول کر کے کولاپور کے راجہ سنبھاجی کو مرہٹوں کا سردار مقرر فرمایا تھا اور راسے اپنے دربار میں طلب کر کے

دکن [illegible]۔

مہاراجہ راجہ چندر جادو جو حضرت آصف جاہ کا ایک امیر تھا۔ ایک دفعہ حضرت آصف جاہ کے ایما سے بالاجی پیشوا سے ملاقات کے لئے گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ بالاجی نے چار کوس پیدل آکر اس کا استقبال کیا اور اس کی پالکی کا کنارا پکڑے ہوئے مہمان سرائے تک ساتھ آیا اور دیر تک اس کے روبرو بیٹھا رہا۔ اس واقعہ سے راجہ چندر سین جادو کے عروج و وقار کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ مرہٹہ درباروں میں بھی ان امرا کی کیا قدر و منزلت ہوا کرتی تھی۔

آپ کے زمانے میں رعایا خوشحال تھی۔ ملک کا نظم و نسق بڑا منضبط اور مستحکم تھا۔ مالگزاری کی وصولی کا عمدہ انتظام تھا۔ ذرائع آب رسانی و آبپاشی وسیع تھے۔ ملک میں خوبصورت عمارتیں بن گئی تھیں۔ آپ کا دربار گہر بار دربار مغلیہ کی مانند بارونق اور پرعظمت تھا۔ آپ اپنے امرا کو مغلوں کی طرح بڑی بڑی منصبیں اور جاگیریں خود عطا فرمایا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود شاہان مغلیہ سے آپ کی ارادت بدستور باقی تھی حتیٰ کہ سکوں میں بھی شاہان دہلی کا نام رکھا گیا تھا۔ جب شہنشاہ پر برا وقت پڑتا تو آپ اس کی ممکنہ امداد فرماتے۔

آپ نے وفات سے چند ساعت قبل اپنے فرزند نواب ناصر جنگ کے نام جو وصیت نامہ لکھا تھا وہ سترہ کلموں پر مشتمل تھا۔ اس سے آپ کی رعایا پروری، تدبر، بے تعصبی، رواداری، دور اندیشی اور علم باخبری کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں آپ نے جانشینوں کو جس طرز پر حکومت کرنے کی ہدایت فرمائی تھی وہ آپ کی اٹھاسی سالہ مدبرانہ زندگی کا انمول سرمایہ تھا۔ اس لئے ہم اس وصیت نامے کا ترجمہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱)

رئیس دکن اگر جنگ و جدل سے بچے۔ اور ملک کی آبادی میں ترقی کا خواہاں ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ مرہٹوں کے ساتھ جو اس ملک کے زمیندار ہیں صلح رکھے اور حتی المقدور رشتہ موافقت نہ توڑے۔ البتہ اگر مجبوری کی صورت پیش آئے تو وہ معذور رہے گا۔

(۲)

آدمی اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ان کی تباہی میں تامل سے کام لینا چاہئے کیونکہ وہ گیہوں اور جوار نہیں ہیں جن کی ہر سال کاشت کی جاتی ہے۔ ہاں مجرم کو قاضی کے حوالے کرنا چاہئے جو فرائض مذہب کو عدل کے ساتھ بجا لاتا ہو۔ قاضی شرع شریف کے مطابق جو فیصلہ کرے رئیس اسے نافذ کرے اور اپنی طرف سے کبھی قتل کا حکم نہ دے۔

(۳)

رئیس مملکت کے نظم و نسق اور اپنی زندگی کو سفر پر موقوف رکھے اور خیمے مقام کی آب و ہوا اور صالحہ دار خیموں کو کبھی ہاتھ سے نہ دے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے سیروا فی الارض (یعنی اللہ کی زمین میں پھرو) اس ارشاد ربانی میں اشارہ ہے کہ سفر کرو اور امور دنیا و عقبیٰ کی انجام دہی سفر پر موقوف ہے۔ ہاں چھاونیوں میں چند دن کی اقامت ضروری ہے کیونکہ سفر میں تمام جاندار تھک جاتے ہیں۔ سپاہیوں کو ان کے وطنوں کے قریب متعین کرنا چاہئے تاکہ دور چلے جانے کے باعث وہ اپنے فرائض زوجیت ادا کرنے سے محروم نہ ہو جائیں اور اس طرح ان کی نسل منقطع نہ ہو جائے۔

(۴)

مخلوق کے کاموں کا رئیس کی ذات سے وابستہ ہونا محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ لازم ہے کہ ادائے فرض و واجب کے بعد وہ اپنے اوقات کو نظم امور متعلقہ میں تقسیم کر دے۔ وہ کسی وقت بیکار نہ بیٹھے۔ رات دن خلق کے دینی و دنیوی امور کی خبر گیری کرتا رہے تاکہ اس کی عاقبت بخیر ہو۔

(۵)

جاننا چاہئے کہ ہماری ریاست بزرگوں کے انفاس پاک کی برکت کا نتیجہ ہے۔ میں نے اس وقت تک کہ وقت رحلت ہے دعا کرنے والوں کی عزت و توقیر کو تمام امور ریاست پر مقدم رکھا ہے۔ ان کے بغیر جنگ آور لشکر بھی کام نہیں دے سکتے ہیں ہمیشہ غربا و فقرا سے جو رحمت ایزدی کا دروازہ ہیں استمداد کرتا ہوں۔ اس کام میں میں نے ہمیشہ سبقت کی ہے اس لئے کہ یہ سنت محمدی ہے۔ ہر رئیس کو اسی طریق پر عمل پیرا رہنا چاہئے۔

(۶)

زمین و آسمان اور مخلوق پہلے سے چلے آ رہے ہیں۔ اس لئے روئے زمین کو صرف اپنا حصہ سمجھ کر کسی کا حق تلف نہ کیا جائے اور ہر شخص کی محبت مودت کا پاس ملحوظ رکھا جائے۔

(۷)

تاریخ وغیرہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ کہ ملک دکن چھ صوبوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر صوبہ میں مستقل اور ذی حشمت بادشاہ تھے۔ اس ملک میں لاکھوں اپنا پیٹ پالتے تھے حضرت خلد مکان (اورنگ زیب عالمگیر) کے عہد سے یہ ساری سرزمین ایک شخص سے متعلق ہو گئی۔ رفتہ رفتہ حق سبحانہ نے محض اپنے کرم سے یہ سرزمین مجھ گناہگار کو عطا فرمائی اور مجھے ساری خلقت پر مقدم بنا دیا۔ اس وقت تک مخلوق خدا کی جو کچھ پاسبانی و قدردانی مجھ سے بن پڑی کرتا رہا۔ لازم ہے کہ میرے بعد ہر خاندان کی خبر گیری کی جائے۔ ان کے افراد کو باری باری سرکاری کاموں پر مامور کیا جائے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ عہدہ دار سال بسال بدلنے چاہئیں۔ بہر حال آخر ہر دو سال کے خاتمے پر ان کا تقرر و تبدیل ضروری ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک کے دائمی تقرر سے دوسرے محروم ہو جائیں۔ اس طریق کار کی خود بھی پیروی کرو اور اپنے جانشینوں کو بھی کرنے دو۔ میں نے جن لوگوں کو لطف و عنایت سے عمر بھر میں جمع کیا ہے ان میں سے ہر شخص جو سرمایہ ہے۔ ان کی بھلائی کو برداشت کیا جائے اور خدمات لائقہ پر مامور کیا جائے۔

(۸)

چھوٹے بھائیوں کو اپنے بیٹے سمجھو۔ ان کی پرورش و تربیت میں سعی بلیغ سے کام لو۔ ان کے مراتب بڑھانے میں سرگرم رہو۔ ان پر شفقت و سلطنت مبذول رکھو تاکہ وہ مفتخر اور بشاش رہیں۔ یقین کر لو کہ وہ قوت بازو اور تقویت ناموس ہیں۔ جب تک خوشحال رہیں گے تمہارے زوال کے خواہاں نہیں ہوں گے۔ البتہ بھوکے اور مفلس ہو جائیں گے تو حکومت آصفیہ پر فتنہ و فساد کے دروازے کھول دیں گے اور اس کی زمین ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیچ کھائیں گے۔ ہدایت محی الدین خاں کو اپنے بیٹوں کی طرح سمجھو۔ اپنی شفقت و عنایت سے اسے اپنا بنا لو اور اسے برباد کرنے کی کوشش نہ کرو۔

(۹)

تم زوال کی باتیں نہ سنو۔ رذیلوں اور نابیوں کو اپنی محفل میں بار نہ دو۔ اس لئے کہ اس وجہ سے حکومت کے وقار و آداب کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور کمینے لوگ دربار شاہی میں باریابی کے گھمنڈ کی بنا پر خلق خدا کو آزار دینا پہنچانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

(۱۰)

ادنیٰ درجہ کے آدمی اعلیٰ منصب پر اور اعلیٰ درجہ کے ادنیٰ منصب پر مامور نہ کرو۔ اس طریق عمل سے سرکاری کاموں کو نقصان پہنچتا ہے اور ان کی حیثیت گھٹ جاتی ہے۔ دیوانی پھر ان چند سے متعلق ہے جو سرکار کے بقایا روپے کی تحصیل کا کام بہتر طریقہ سے کرتا ہے۔ اگر اس کو مزید دو تین سال تک برسر کار رکھو تو مناسب ہے۔ ورنہ جس طرح چاہو کرو۔

(۱۱)

اس بات کو ہر لحظہ پیش نظر رکھو کہ دکن کی ریاست اطاعت اور خدمت گزاری پر موقوف ہے حضرت ظل سبحانی (شہنشاہ دہلی) کی ارادتمندی و نیاز کیشی میں کسی وقت بھی کوتاہی واقع نہ ہونے دو اگر ایسا ہوا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناسپاسی کے مستوجب تعزیر ہو گے اور دنیا کے نزدیک ہدف طعن و تشنیع ہو گے۔

ایران کا قہرمان بادشاہ نادرشاہ جب دہلی پہنچا تھا تو ایک روز اس نے فرط عنایت سے کام لیکر ہندوستان کی سلطنت مجھے دینے کے متعلق ذکر کیا۔ میں نے فی الفور عرض کیا۔ کہ ہم لوگ آبا و اجداد سے بادشاہ کے نوکر چلے آتے ہیں۔ آپ جو تجویز کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے میں نمک حرام ہو جاؤں گا۔ اور حضرت بادشاہ مجھے بدعہد اور قول و قرار کا جھوٹا مشہور کریں گے۔ چونکہ نادرشاہ سخن سنج و معنی آفرین طبیعت رکھتا تھا۔ اس لئے میرے جواب سے بہت خوش ہوا۔ اور میری تعریف کی۔

(۱۲)

جنگ میں حتی الامکان اقدام نہ کرو خواہ طرف ثانی کی جمعیت کتنی ہی قلیل و حقیر کیوں نہ ہو۔ اس معاملے میں خدا کی ذات اقدام کو پسند نہیں کرتی۔ اور خدا خود فرماتا ہے کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ (کتنی ہی قلیل جمعیتیں کثیر جمعیتوں پر غالب ہوئیں) جس حد تک ممکن ہو لڑائی جھگڑے کو روکنے کی کوشش کرو۔ اگر فریق ثانی پیشقدمی کرتا جائے تو اس صورت میں حق کو اپنی طرف جان کر لڑائی پر قدم اٹھایا جائے اور عجز و نیاز کے ساتھ خدا سے مدد مانگ کر اپنے مقام پر

[illegible] کیا جائے یہی مصلحت ملکی ہر قبلہ رو پھر [illegible] دنگ [illegible] اختیار میں ہے۔

(۱۳)

اتنی مدت میں تجربے سے جو کچھ معلوم ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دکن کے تمام باشندوں میں سے برہانپور اور بیجاپور کے لوگ زیادہ غرض پرست ہیں۔ ان کے قول فعل پر قطعاً اعتماد نہ کرنا چاہئے۔ ان [illegible] کی طرح سمجھ کر ان سے احتراز کیا جائے [illegible] کے معاملے میں احتیاط سے کام لیا جائے۔

(۱۴)

اللہ تعالیٰ کے فضل سے جیسا مال اس وقت مہیا ہے اگر نہ احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ خرچ کرو گے تو نسلاً بعد نسل پشت با پشت تک کفایت کریگا ورنہ دو تین سال سے زیادہ مدت تک کام نہیں دے سکے گا۔

(۱۵)

جو کچھ اس وقت تک خزانے میں موجود ہے۔ وہ سپاہ کی دلجمعی کے لئے ہے۔ شاہی خزانے کی وجہ سے تمام سرکاری کام اچھی طرح چلتے ہیں۔ اور دشمن اور لشکر دشمن خود بخود پریشان ہو جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ حکومت کے آغاز سے لیکر اس وقت تک کہ رحلت کا وقت ہے۔ سپاہ کی تنخواہ دو تین ماہ سے زیادہ کبھی میرے ذمہ نہیں رہی۔ لیکن اس کے باوجود میں سپاہ سے اتنا ڈرتا ہوں کہ مخالف سپاہ سے اتنا نہیں ڈرتا۔ سپاہیوں کو کبھی اپنی طرف سے بد دل نہ کرو۔ اس لئے کہ وہ تمام اوقات انتظام سلطنت کے رفیق اور معاون ہیں۔

(۱۶)

دکن کے برہمن سب کے سب کشتنی و گردن زدنی ہیں علی الخصوص اس قوم کے دو سرگروہ جن میں ایک کا نام مور اور دوسرے کا نام داس ہے۔

(۱۷)

[illegible] کو کام پر لگاتے ابھی تین

[illegible] سے زیادہ وقت [illegible] نہیں [illegible] کے حوالے کیا۔ وہ تمہیں ہدایت دے۔ ہر حال میں تمہارا [illegible] اور اپنی عنایات کا سایہ تمہارے سر پر ہمیشہ قائم رکھے

آپ کی رعایا پروری اور رواداری کا ایک دلچسپ واقعہ [illegible] غلام حسین خاں نے گلزار آصفیہ میں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شہر [illegible] کے لئے زمین کی ضرورت تھی۔ اس میں ایک بڑے گرو کا مکان آگیا تھا۔ وہ [illegible] سے [illegible] پر کسی طرح سے فروخت کرنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ وارو غہ عمارات نے جب اس بارے میں عرض کیا تو آپ نے حکم دیا کہ ہرگز مکان نہ لیا جائے۔ اگر اس وجہ سے قلعہ بنانے کا دروازہ کونے میں اگر بدنما ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔

آپ نماز عصر کے بعد بالعموم احادیث نبوی سنتے۔ نقل [illegible] اہل دل سے باتیں کرتے کبھی آپ کے دربار میں شعر و سخن کی محفلیں بھی گرم رہا کرتی تھیں۔ آپ نے نہ صرف ارباب علم و فضل کی قدر کی بلکہ ان کی سرپرستی فرمائی۔ آپ کے دربار میں بڑے بڑے باکمال شاعر مورخ مفسر، محدث غرض کہ کامل الفن اہل ہنر موجود تھے۔ آپ فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ ابتدا میں شاکر تخلص رہا۔ بعد کو آصف اختیار فرمایا۔ علوم متداولہ کے عالم تھے۔ عربی کے علاوہ ترکی بھی خوب جانتے تھے۔ مشہور شاعر عبدالقادر بیدل سے کلام میں اصلاح لیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کے دو ضخیم دیوان ۱۳۰۰ھ میں حیدر آباد میں چھپ چکے ہیں۔

مختصر یہ کہ حضرت آصفجاہ اول کا نام نامی ایک سرپرست علم و فن ایک سیاس و مفکر ایک مدبر و دانشمند اور ایک باتدبیر فرمانروا کی حیثیت سے تاریخ عالم کے درخشاں اوراق میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔



قبرستان میں آپ کو ایسی عورتوں کی بہت سی قبریں ملیں گی۔ یہ وہ عورتیں ہیں جو اندر ہی اندر گھلتی رہیں جنکو سیلان الرحم کی بیماری اندر ہی اندر سلگاتی رہی جنھوں نے شرم کی وجہ سے اپنا حال کسی سے نہ کہا اور آخرکار بے جا شرم کی وجہ سے موت کی نذر ہوئیں۔

ہندوستان میں سو میں سے ننانوے عورتیں سیلان الرحم کی مریض ہوتی ہیں اور شاید ان ننانوے میں سے ایک کو بھی معلوم نہیں کہ

سیلان الرحم کی بیماری بے حد خطرناک ہے

اگر خفیہ بدن سے سفید پانی جاتا ہو، ناف تلوں میں درد رہتا ہو، ایام کے دنوں میں تکلیف ہوتی ہو تو فوراً سمجھ جانیے کہ سیلان الرحم ہے۔ اس مرض کا فوری علاج کرنا چاہیئے۔ بیجا شرم کی ضرورت نہیں۔ فوراً ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر دہلی کے "مشہور دوا خانہ" سے **دوائی کیلیہ منگا لینی چاہیئے**۔ اس دوا کی ایک خوراک دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد کھائی جاتی ہے اور صرف تیس روز کے استعمال ہی سے یہ موذی مرض ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے۔ یہ دوا معتمد الملک اختر الدولہ **حکیم احسان اللہ خاں** طبیب خاص وزیر اعظم بہادر شاہ دہلی کے خاندان کا خاص عطیہ ہے اور **مشہور دواخانہ دہلی** اس دوا کو بڑی محنت اور جانفشانی سے تیار کرتا ہے۔ قیمت تیس خوراک ایک روپیہ چار آنہ۔ سات آنہ محصول ڈاک۔

دوا منگانے کے لئے صرف اتنا پتہ کافی ہے: **مشہور دواخانہ فراش خانہ دہلی**

شیرِ پنجاب

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زندگی کے چند دلچسپ واقعات

از جناب محمد عبداللہ قریشی بی۔اے

پیدائش:۔ ۱۷۸۰ء　وفات:۔ ۱۸۳۹ء　مدت حکومت:۔ چالیس سال

دُنیا کے ہر بڑے آدمی کے گرد کوئی نہ کوئی افسانہ ضرور چکر لگایا کرتا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اس معاملے میں بیحد خوش قسمت ہے کہ اس کی دلچسپ تاریخی شخصیت بیشمار افسانوں سے گھری ہوئی ہے۔ ذیل میں قارئین کے تفنن طبع کے لئے اس قسم کے چند واقعات پیش کئے جاتے ہیں جن سے اس کی شجاعت و مردانگی، حوصلہ مندی و بیدار مغزی۔ انصاف پروری و رعایا نوازی، خوش مزاجی و جوہر شناسی۔ دریا بخشی و اخلاق جرأت۔ وسیع المشربی و رواداری۔ سلیق القلبی اور طبیعت کے اُتار چڑھاؤ پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

(۱)

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ بالکل اَن پڑھ تھا ایسا اَن پڑھ کہ اپنا نام بھی نہ لکھنا جانتا تھا۔ البتہ بعض بعض القاب اسے زبانی یاد تھے اور وہ مراسلات لکھواتے وقت انہیں خوب استعمال کرتا تھا۔ اس کا حافظہ قوی اور طبیعت میں اختراع و ایجاد کا مادہ موجود تھا۔ اس لئے معاملہ دانی میں بہت چُست اور با تدبیر تھا۔ اس کی کامیابی اور سلطنت کی مضبوطی صرف اس سبب سے تھی کہ اس کے تمام ارادوں میں عملی سرگرمی اور اس کے خیالات سے ہمیشہ جولانی کا اظہار ہوتا تھا۔

ایک دفعہ درباریوں نے کہہ سُن کر اسے پڑھنے لکھنے پر آمادہ کیا فیصلہ ہوا کہ پہلے گورمکھی قاعدہ (پینتی ہاری) کو شروع کرایا جائے۔ ایک بھائی جی پڑھانے کے لئے منتخب ہوئے۔ شبھ گھڑی دیکھ کر بہت سا زرومال اور جاگیر اُستاد کو مرحمت فرما کر زانوئے شاگردی تہہ کیا اور دو گھنٹے کی سر کھپائی کے بعد صرف "اوڑا" اور "ایڑا" دو حرف بمشکل لکھنا سیکھے۔ جب تھک گیا تو بھائی جی سے کہا کہ مجھے سلطنت کے اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ اب آپ تشریف لے جائیے۔

بھائی جی اس وقت تو اُٹھ کر چلے گئے۔ مگر شام کو پھر آ گئے۔ ان کی شکل دیکھتے ہی مہاراجہ نے دُور سے کہا:۔

"بھائی جی! مَیں نے تعلیم شروع کرتے وقت جو عطیات آپ کو دیئے تھے۔ وہ سب معاف!! مگر آئندہ کبھی میرے پاس آنے کی تکلیف نہ کرنا۔ آپ کو دیکھ کر میرا دل دھڑکتا اور رُوح کانپتی ہے۔"

پھر ہنس کر فرمایا:۔

"آج سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ بچے اُستادوں سے کیوں ڈرتے ہیں۔ آج اس کا ذاتی تجربہ ہوا کیونکہ مَیں کبھی کسی تاجدار یا فاتح سے بھی اتنا خوف زدہ نہیں ہوا جتنا آج پڑھانے والے بھائی جی سے ڈر گیا ہوں۔"

(۲)

مہاراجہ تعلیم میں جتنا کورا تھا۔ عقل و دانش میں اتنا ہی بڑھا ہوا تھا۔ موقعہ کی بات اس کو خوب سوجھتی تھی۔ مُلکی پیچیدگیوں کو وہ چٹکیوں میں سُلجھا لیتا فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا اور باتوں میں نہایت تدبر اور فراست کا ثبوت دیتا تھا۔ یہاں تک کہ فرنگی سفیر اور سیاح اس کی دانائی پر عش عش کرتے تھے۔

کہتے ہیں روپڑ کے مقام پر مہاراجہ کی مُلاقات گورنر جنرل ہند سے ہوئی۔ دوران گفتگو میں گورنر جنرل نے کہا کہ:۔

"حضور کی عقل تو وزیروں جیسی ہے۔"

مہاراجہ نے اسی وقت فرمایا:۔

"بے شک بادشاہ کھڑک سنگھ ہے جو مزاج کا بادشاہ ہے اور مَیں اُس کا وزیر ہوں۔ کیونکہ ہر وقت اُس کے واسطے استحکام سلطنت کی تدبیریں سوچتا رہتا ہوں۔"

گورنر جنرل مہاراجہ کے اس برجستہ جواب کو سُن کر بہت حیران ہوا۔

(۳)

ایک فرنگستان کا ایک سوداگر آیا اور مہاراجہ کے لئے قیمتی قیمتی تحفے لایا جن میں ولایت کی بنی ہوئی ایک نہایت نفیس بلوری دوات بھی تھی۔ مہاراجہ نے اسے دیکھتے ہی حکم دیا کہ بازار سے ایک دیسی دوات بھی خرید کر پیش کی جائے جب وہ آگئی تو فرمایا کہ دونوں دواتوں کو توڑ دیا جائے۔ وہاں حکم کی تعمیل میں کونسی دیر لگتی تھی۔ ایک ہی ضرب سے دونوں دواتیں توڑ دی گئیں۔ پھر چوبدار سے کہا کہ ان دونوں شکستہ دواتوں کو بازار میں لیجا کر فروخت کر دو اور جو قیمت ملے وہ سرکار کے سامنے لاکر رکھو۔

چوبدار بازار سے پھر کر واپس آیا اور عرض کیا کہ "عالی جاہ! دیسی دوات تو پیتل کی پھوٹ کے بھاؤ بک گئی ہے اور جو پیسے اس سے وصول ہوئے ہیں وہ پیش حضور ہیں۔ مگر کانچ کی دوات کو تو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ سب یوں کہتے ہیں کہ لٹ پیسے پھینکو"۔

سوداگر حیران تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی۔ آخر مہاراجہ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں ایسی غیر ملکی چیز کو خرید کر کیا کروں گا جس کی ٹوٹی ہوئی کی کوئی قیمت ہی نہ پڑے۔ مجھے تو وہی دوات پسند ہے جو ٹوٹ جانے کے بعد بھی کچھ نہ کچھ بک جاتی ہے۔

(۴)

مہاراجہ ذاتی اور مذہبی تعصب سے بری تھا۔ لائق آدمیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ملازم رکھتا۔ ان پر ہر طرح اعتبار کرتا اور ان کی عزت کرتا تھا۔ ایک دفعہ خان بہادر مولوی سید رجب علی خاں مہاراجہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ قصبہ جگراؤں ضلع لدھیانہ کے رہنے والے تھے اور علم و حکمت کی وجہ سے اپنے وقت کے ارسطو مانے جاتے تھے۔ مہاراجہ ان کی بڑی قدر کرتا تھا۔ باتوں باتوں میں مہاراجہ نے ان سے پوچھا:-

"مولوی صاحب! آپ بڑے دانا ہیں! بھلا یہ تو بتایئے کہ ہمارے گھر میں سب سے زیادہ خوش قسمت کون ہے، میں، یا میرا بیٹا ولی عہد کھڑک سنگھ یا اس کا بیٹا کنور نونہال سنگھ؟"

مولوی صاحب نے کہا:-

"مہاراج! میرے خیال میں تو سب سے خوش نصیب شہزادہ کھڑک سنگھ جی ہیں جن کے سر پر حضور جیسے زبردست تاجدار کا سایہ ہے اور جن کے گھر میں کنور نونہال سنگھ جیسا با اقبال لڑکا موجود ہے"

مہاراجہ مولوی صاحب کے اس دانشمندانہ جواب کو سن کر بہت خوش ہوا۔

(۵)

ایک دن شیخ امام الدین صاحب مہاراجہ کے حضور کا مہاتم پڑھا رہے تھے۔ مہاراجہ نے کہا:

"شیخ جی! آپ مسلمان کیوں ہو گئے؟"

شیخ صاحب نے عرض کیا:-

"مہاراج! میں نے اپنی زندگی میں کبھی اس قسم کی درخواست نہیں کی۔ یہ جو کچھ ہوا میری ہوش سے پہلے کا واقعہ ہے"۔

مہاراجہ ہنس پڑا اور اس نے پھر کبھی ایسا سوال نہ کیا۔

(۶)

ایک دوپہر کو مہاراجہ قلعہ لاہور کے مثمن برج میں بیٹھا تھا۔ جس کے نیچے بھائی بستی رام کی دھرم شالا ہے اور باہر پیپل اور بڑ کے درخت سایہ کئے ہوئے ہیں۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ایک خادم کھڑا پنکھا ہلا رہا تھا۔ اور ایک چوبدار چاندی کا عصا ہاتھ میں لئے پہرا دے رہا تھا۔ مہاراجہ نے کھڑکیوں میں سے دیکھا کہ نیچے دو کہاروں نے ایک چند ڈولی لاکر رکھی ہے جس پر سبز رنگ کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ اور ایک دراز قامت خوبصورت جوان سبز چغہ پہنے مورچھل ہاتھ میں لئے اس کے پاس سایہ میں کھڑا ہے۔

مہاراجہ نے چوبدار سے کہا کہ ان تینوں آدمیوں کو ڈولے سمیت اندر لے آؤ۔ جب وہ اندر آگئے تو مہاراجہ نے چند عہدہ داروں کو بھی بلوا بھیجا اور سب کی موجودگی میں ان سے دریافت کیا کہ اس ڈولے میں کیا ہے۔

جوان آگے بڑھا۔ آداب بجا لایا اور کہنے لگا کہ میں خوشنویس ہوں، اور اس ڈولے میں میرے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن مجید ہے جس کو میں فلاں رئیس کے پاس لئے جا رہا ہوں اس امید پر کہ وہ اسے خرید کر مجھے اس کا معاوضہ عطا فرمائیگا۔

مہاراجہ نے پوچھا کیا تم نے یہ قرآن مجید خاص اس رئیس کی فرمائش پر لکھا ہے یا اپنے شوق سے؟

حضرت فقیر صاحب نے فرمایا میں نے قرآن مجید اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ میں سی طرح قرآن مجید لکھ لکھ کر اور فقیروں کی خدمت میں پیش کر کے اپنی بسر اوقات کرتا ہوں۔

مہاراجہ نے فرمایا کہ جب تم نے کسی خاص امیر کے لئے نہیں لکھا تو میں سمجھتا ہوں کہ تم میرے پاس اس واسطے نہیں لائے کہ میں ہندو ہوں۔ یاد رکھو کہ میری نظر میں ہندو اور مسلمان برابر ہیں۔ میں مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کی بھی اتنی ہی عزت کرتا ہوں جتنی ہندوؤں کی کتابوں کی۔ میں ہرگز اس نسخے کو نہیں چھوڑوں گا بس یہ میرا ہو گیا۔

اس کے بعد اپنے مشیر فقیر سید عزیز الدین سے ارشاد فرمایا کہ اس میں سے کچھ پڑھ کر سنائیں۔ انہوں نے نہایت ادب سے قرآن مجید کو کھولا۔ اتفاق سے وہ آیتیں سامنے آگئیں جن میں بادشاہ اور رعیت کے حقوق و فرائض کا ذکر ہے۔ فقیر صاحب نے پہلے وہ آیتیں پڑھیں پھر ان کا مفہوم بیان کیا۔ مہاراجہ یہ مضمون سن کر بہت محظوظ ہوا کہنے لگا:-

"فقیر جی! قرآن مجید تو آپ لے جائیے اور ہر روز اس کی تلاوت کیا کیجئے۔ میری طرف سے اس کی رحل اور جزدان کی خدمت کیلئے دو گاؤں آپ کی نذر ہیں"۔

پھر حکم دیا کہ اس ڈولے کو سونے چاندی سے بھر دیا جائے اور خوشنویس کو خلعت پہنا کر عزت سے رخصت کیا جائے۔

(۷)

لاہور کے مشہور دروازہ شاہ عالمی کے اندر پاپڑ منڈی میں ایک چھوٹی سی مسجد واقع ہے۔ یہ مسجد مہاراجہ کی منظور نظر رانی موراں نے بنوائی تھی۔ اس کے قریب ہی اکالیوں کا ایک گوردوارہ بھی تھا۔ جہاں نہنگ سکھ رہا کرتے تھے۔ مسجد میں پانچوں وقت اذان ہوتی تھی جو اکالیوں کو سخت ناگوار گزرتی تھی۔

ایک دن چند اکالی فریاد لے کر مہاراجہ کے دربار میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ مسجد میں اذان ہونے سے ہماری نیند میں خلل ہوتا ہے بلکہ ہمارے گیان دھیان اور نت نیم میں بھی فرق پڑتا ہے اس لئے مسلمانوں کو اذان دینے سے روک دیا جائے۔

مہاراجہ نے شہر کے قاضی اور مسجد کے امام کو بلایا اور یہ مقدمہ ان کو سنا کر دریافت کیا کہ تمہارا بانگ دینے سے مدعا کیا ہے۔

قاضی صاحب نے بتایا کہ بانگ دینے سے مدعا یہ ہوتا ہے کہ موذن کی بلند آواز سے ارد گرد کے مسلمان مقررہ اوقات پر نماز کیلئے مسجد میں جمع ہو جایا کریں اور اپنے مذہبی فرائض ادا کریں۔ اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہوتی جس سے کسی کا دل دکھے۔ صرف یہی کہا جاتا ہے کہ اللہ اکبر یعنی اللہ بڑا ہے۔

قاضی صاحب کی بات سن کر مہاراجہ نے فرمایا اچھا اگر اذان کا مطلب لوگوں کو نماز کے لئے بلانا ہی ہے تو اس کا انتظام کسی اور طریقے سے کرا دیتے ہیں۔ آپ محلے کے مسلمانوں کی فہرست مرتب کر کے اکالیوں کو دیں۔ [illegible] وہ مسلمانوں کو نماز کے مقررہ اوقات پر مسجد میں جمع کر دیا کریں گے۔

کچھ تو اکالیوں کے ڈر کے مارے اور کچھ مذہبی جوش کی بنا پر مسلمان پہلے کی نسبت بہت زیادہ تعداد میں نماز کیلئے جمع ہونے لگے اور مسجد کی رونق بڑھ گئی۔

یہ انتظام کچھ دن چلتا رہا۔ آخر اکالی اس خدمت سے تنگ آ گئے۔ ہارے درجے پھر مہاراجہ کے پاس شکایت لے کر گئے۔ کہا سرکار! پہلے تو اذان کی آواز سے ہماری نیند خراب ہوتی تھی اب مسلمانوں کو پانچوں وقت کی نماز پڑھانے کے لئے [illegible] بلکہ صبح سے لیکر رات تک در بدر مارا مارا پھرنا پڑتا ہے اور [illegible] آرام لینا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمیں اس نوکری سے سبکدوش کیا جائے۔

مہاراجہ نے ہنس کر کہا کہ اگر تم اس تکلیف کو گوارا نہیں کر سکتے تو اذان بدستور جاری رہے گی۔

اکالیوں نے با دل ناخواستہ اس بات کو منظور کر لیا اور مہاراجہ نے مسلمانوں کو اذان کہنے کی اجازت دے دی۔ اس طرح مہاراجہ کے حسن تدبر سے دونوں قومیں خوش ہو گئیں اور کبھی کسی نے پھر کبھی اذان کی بندش کا سوال نہ اٹھایا۔ مبادا انہیں نماز پڑھانے جانے کے لئے روز سے گلے پڑیں۔

(۸)

سرکار دربار صاحب امرتسر کی عمارت زیر تجویز تھی۔ مہاراجہ اسے اسلامی عمارات کی شان و شوکت کا نمونہ بنانا چاہتا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ حضرت میاں میر کے مزار کا پتھر اونچے بہت کام آ سکتا ہے۔ وہ اگر اکھاڑ لیا جائے تو اس سے دربار صاحب کی زینت بہت بڑھ جائیگی۔

درباریوں کی تحریک سے متاثر ہو کر مہاراجہ خود سوار ہو کر آیا اور حکم دیا کہ سب پتھر اکھاڑ کر لنگر تک پہنچا دیا جائے۔ جب واپس جانے کے لئے گھوڑے پر سوار ہوا تو گھوڑا بدک گیا اور بےلگام ہو کر بے قابو ہو گیا۔ مہاراجہ نے ہر چند سنبھلنے کی کوشش کی مگر اس کی کوئی پیش نہ گئی۔ آخر زمین پر گر پڑا اور اسے سخت چوٹیں آئیں۔

مہاراجہ بہت دیر تک بے ہوش پڑا رہا جب ہوش میں آیا تو اپنے کئے پر بہت نادم و پشیمان ہوا۔ دوبارہ احاطہ مزار میں آیا اور کہنے لگا کہ ہم نے بادشاہوں کے پیر کے مزار کی بے حرمتی کرنی چاہی۔ پیر صاحب ناراض ہوئے۔ خدا نے بھی ہماری اس حرکت کو پسند نہ کیا اور ہمیں ہاتھوں ہاتھ سزا دی۔ ہم اس بے ادبی کی معافی مانگتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں۔

یہ کہہ کر مہاراجہ خانقاہ میں داخل ہوا۔ اس نے قبر کو چوما اور اس پر ناک رگڑ کر پانچ سو روپیہ کی نذر پیش کی، اور مزار کی مرمت و حفاظت کے احکام جاری کئے۔

اس واقعہ کے بعد مہاراجہ جب تک زندہ رہا نذرانہ دیتا اور مزار پر سلام کے لئے حاضر ہوتا رہا۔

(۹)

مہاراجہ کو گھوڑوں کا بیحد شوق تھا، وہ خود بھی اعلیٰ درجہ کا شہسوار تھا۔ لیلیٰ۔ کہار۔ کبوتری اور کوہ نور چار گھوڑے مہاراجہ کے اصطبل کا انتخاب تھے، اور مہاراجہ خود ان پر سواری کیا کرتا تھا۔ ان میں سے اوّل الذکر اپنی اعلیٰ خصلت اور خوبصورتی کی وجہ سے بیحد مشہور تھا۔ فتح علی شاہ والئے ایران نے پچھتر ہزار روپیہ اس کی قیمت دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا مگر مہاراجہ رنجیت سنگھ اسے دل و جان سے اپنے قبضے میں لانا چاہتا تھا۔ اور کسی قیمت پر بھی اسے چھوڑنا گوارا نہ کرتا تھا۔ یار محمد خاں حاکم پشاور اس گھوڑے کا مالک تھا۔ اس نے کئی دفعہ اس بات کا یقین دلایا کہ وہ گھوڑا مر چکا ہے اور اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ مگر مہاراجہ ہمیشہ یہی جواب دیتا رہا کہ جب تک وہ گھوڑا پیش نہیں ہوگا تمہاری خلاصی نہیں ہوگی۔ آخر ۱۸۲۷ء میں مہاراجہ نے شہزادہ شیر سنگھ اور جرنیل ونتورا کے ماتحت اس کے ملک پہ فوج چڑھا دی اور قریباً تیس ہزار اشرفی اور کئی جانیں گنوانے کے بعد اس گھوڑے کو حاصل کیا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ شہزادہ کھڑک سنگھ ان گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کو چلا گیا اور واپسی پر اپنے اصطبل میں لے گیا۔ مہاراجہ کو جب اس بات کا علم ہوا تو بہت برافروختہ ہوا۔ اسے شہزادہ کی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ اس نے اپنے وزیر باتدبیر فقیر سید عزیز الدین سے اس کی شکایت کی اور کہا۔

"دیکھو فقیر جی! کتنا اندھیر ہے۔ وہ بدمعاش لڑکا کھڑک سنگھ گھوڑا کھول کر لے گیا"

فقیر صاحب نے مہاراجہ کا غصہ فرو کرنے کے لئے نہایت عاجزانہ صورت بنا کر جواب دیا:۔

"واقعی مہاراج! بڑی دلیری اور جسارت کی بات ہے!! جیسے گھوڑا اس کے باپ کا تھا!!!"

اتنا سننا تھا کہ مہاراجہ کھل کھلا کر ہنس پڑے اور اس کا سارا غصہ جاتا رہا۔

(۱۰)

مہاراجہ بڑا صاحب اقبال تھا، جو اس کے قریب آتا تھا نہال ہو جاتا تھا۔ اور جس سے وہ خوش ہوتا تھا اس کی قسمت بدل جاتی تھی۔

ایک روز مہاراجہ کسی مہم پر جانے کے لئے تیار ہوا۔ ابھی سوار ہو کر باہر نکلا ہی تھا کہ گلھو سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ ماں کا بھی تھا مگر اپنی بدصورتی کی وجہ سے نہایت منحوس سمجھا جاتا تھا۔ تمام درباریوں نے اسے دیکھ کر ناک بھوئیں چڑھائیں اور اسے سخت بدشگونی خیال کیا۔ پھر اپنے اپنے طور پر اس بدشگونی کے اثر کو کم کرنے کی تدبیریں بتائیں۔

راجہ دھیان سنگھ نے کہا کہ گلھو کی ناک کاٹ دی جائے۔

جمعدار خوشحال سنگھ نے اس کا سر قلم کرنے کی صلاح دی۔

راجہ تیج سنگھ اور سردار لہنا سنگھ نے تجویز پیش کی کہ گلھو کے سر پر ڈنڈے لگا کر اس نحوست کو دور کرنا چاہئے۔

غرض کسی نے کچھ مشورہ دیا کسی نے کچھ۔ گلھو بیچارہ شامت کا مارا بت بنا۔ سناٹا کھینچے حیران پریشان کھڑا ساری باتیں سن رہا تھا کہ نہ جانے اب اس کے ساتھ کیا پیش آئے۔ مگر مہاراجہ نے سب کی تجویزیں سن کر حکم دیا کہ گلھو کو نہلا دھلا کر خلعت پہنایا جائے اور پانچ سو روپیہ قیمت کے طلائی کڑوں کی جوڑی اس کے ہاتھوں میں ڈال دی جائے۔ اس کے بعد گلھو سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم ہر روز صبح سویرے یہاں آ جایا

کر رہا ہو جب ہم سو کر اٹھیں تو اپنی شکل دکھلانے کے لئے حاضر ہا کرو۔ چنانچہ وہ ہر صبح مہاراجہ کے جاگنے سے پہلے ان کی خوابگاہ کے سامنے کھڑا رہتا اور کسی کو اسے منحوس کہنے کی جرأت نہ ہوتی۔

(۱۱)

ایک دفعہ مہاراجہ نے ترن تارن کی سڑک پر جاتے ہوئے گاؤں کی ایک بڑھیا کو دیکھا کہ اپنا لوہے کا توا دونوں ہاتھوں پر اٹھائے چپ چاپ کھڑی ہے۔ مہاراجہ نے اشارا سے اُسے نزدیک بلایا اور پوچھا کہ تو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے۔ بڑھیا نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا:۔

"میں ایک غریب بیوہ ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ پارس ہے۔ اس کے جسم سے جو چیز چھو جاتی ہے سونا بن جاتی ہے۔ میرے پاس لوہے کا توا تھا اسے یہاں اٹھا لائی ہوں۔ اگر وہ اسے ہاتھ لگا دیں گے تو یقیناً سونے کا ہو جائیگا۔ ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ میرا بھلا ہو جائیگا۔ سوتا اٹھے جھگڑے کام آئیگا۔ برابر والوں سے ذرا نظر نیچی نہ ہوگی۔"

مہاراجہ نے توا اس کے ہاتھ سے پکڑ کر دیوان دینا ناتھ کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ اسے اتنے سو روپیہ نقد دلوا دیا جائے اور اس گاؤں کی ملکیت اس کے نام لکھ دی جائے۔

(۱۲)

مہاراجہ کی شاہی سواری سیالکوٹ کے کسی گاؤں کے پاس سے گذری۔ راستے میں ایک ارائیں کا کھیت آیا۔ توریہ کی فصل تیار کھڑی تھی ہرے ہرے پودوں میں زرد رنگ کے خوشنما پھول نہایت مزے سے لہلہاتے اور آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ مہاراجہ نے چلتے چلتے دو پھول توڑ لئے۔ تھوڑی دور جا کر پیچھے مڑ کے جو دیکھا تو تمام خدام اور باڈی گارڈ کے سپاہی ایک ایک دو دو پھول ہاتھوں میں لئے چلے آ رہے ہیں اور تمام کھیت برباد ہو گیا ہے۔ خیال گزرا کہ میرے دو پھول توڑنے کی وجہ سے سارا کھیت آن کی آن میں ویران ہو گیا ہے شیخ کی داڑھی واہ واہ میں اور گوری کا رُوپ چشمک دل میں آ گیا۔ گھوڑا روک کر وہیں کھڑا ہو گیا اسی اثنا میں کھیت کا مالک بھی رونی صورت بنائے وہاں پہنچ گیا۔ بوڑھے ارائیں نے جھک کر سلام کیا۔ مہاراجہ نے [illegible]

"یہ کھیت کس کا ہے؟"

بوڑھے ارائیں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا:۔

"خداوندا! میرا کرتاں مارے دا یعنی مجھ جنم جلے بدنصیب کا"

دریافت کیا:۔

"تمہارا نام کیا ہے"

جواب دیا:۔

"حضور پہلے تو مجھے کرم بخش کہہ کر پکارا کرتے تھے لیکن اب کرم پھوٹ گئے ہیں۔ اس لئے کرماں مارا کہنا چاہئے"

بوڑھے کے اس جواب نے مہاراجہ کے دل پر بڑا اثر کیا حکم دیا کہ فوراً مختصر دربار آراستہ کیا جائے۔ اسی وقت ہاتھی سے سنہرا شامیانہ اتار کر چاندی سونے کی چوبوں پر کھڑا کیا گیا۔ اور فرش بچھا کر زرنگار شاہی مسند لگا دی گئی۔

دربار سج گیا تو مہاراجہ نے بوڑھے کرم بخش کو شاہی مسند پر بیٹھنے کا اشارا کیا۔ بوڑھے نے معذرت چاہی۔ ہاتھ جوڑے۔ مگر وہاں کون سنتا تھا۔ درباریوں نے اسے پکڑ کر زبردستی مسند پر بٹھلا دیا۔ مہاراجہ نے اپنے خزانچی سے پانچ پانچ سو روپیہ کی دو تھیلیاں لیں اور بوڑھے کے روبرو جا کر ایک تھیلی نذر کے طور پر پیش کی اور کہا:۔

"میاں کرم بخشا سلام"

پھر دوسری تھیلی پیش کی اور کہا:۔

"بابا کرم بخشا سلام"

یہ کہہ کر مہاراجہ پیچھے ہٹ گیا۔ اور وزیر دھیان سنگھ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا، کہا:۔

"وزیر صاحب آپ نے بھی دو پھول توڑے تھے اب آگے بڑھئے اور فی پھول دو سو روپیہ کی نذر گزرانیئے"

چنانچہ انھوں نے بھی اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں "میاں کرم بخشا سلام" اور "بابا کرم بخشا سلام" کہا، دو مرتبہ چار سو روپیہ نذر کیا۔ اس کے بعد باقی تمام اہلکاروں نے باری باری سلام کیا۔ اور حسب حیثیت نذریں پیش کیں۔ کسی نے دس روپے دیئے کسی نے پانچ اور کسی نے دو۔ حتیٰ کہ سب چھوٹے اہلکاروں نے

ایک ایک پھول کے عوض ایک ایک روپیہ جرمانہ ادا کر کے اپنے قصور کی تلافی کی۔

دیکھتے ہی دیکھتے میاں کرم بخش کے قدموں میں نذر کے روپوں کا ڈھیر لگ گیا۔ مہاراجہ نے حکم دیا کہ اس کے سر سے پگڑی اتار کر روپے اس میں باندھ دیئے جائیں۔ اور اسے اسی طرح اس کے گھر پہنچا دیا جائے۔ اور خود "بابا کرم بخش اسلام" کہہ کر کوچ کا نقارہ بجوا دیا۔

(۱۳)

ایک دفعہ مہاراجہ کی سواری گھرڈیل (ضلع سیالکوٹ) سے گزری۔ مہاراجہ ہاتھی پر سوار تھا۔ دفعتہً کہیں سے ایک اینٹ آکر مہاراجہ پر گری۔ شاہی محافظوں نے ادھر ادھر بھاگ کر چند لڑکوں کو پکڑا اور سرکار میں پیش کیا۔

حالات دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک نو برس کے بچے نے بیر گرانے کے لئے درخت پر اینٹ پھینکی تھی۔ اسے علم نہ تھا کہ دیوار کی دوسری جانب سواری جا رہی ہے۔ اتفاقاً وہ اینٹ دوسری طرف جا گری۔ لڑکا زار زار رو رہا تھا اور مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بہت سے لوگ یہ واقعہ سن کر وہاں جمع ہو گئے۔ سب کی نظریں مہاراجہ پر لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیں اب لڑکے کے لئے کیا حکم نافذ ہوتا ہے۔ مگر مہاراجہ نے کہا:۔

"بچہ بے قصور ہے۔ اسے لباس فاخرہ اور سونے کے کڑے پہناؤ۔ شیرینی کھلاؤ اور ایک ٹوکری مٹھائی کی دے کر اس کے گھر پہنچا آؤ۔"

لڑکے نے مٹھائی لینے سے انکار کیا، اور معافی مانگنے کی التجاؤں کو جاری رکھا۔ مہاراجہ نے اسے تسلی دی اور ہنس کر فرمایا:۔

"جب بیری اپنے اوپر اینٹیں پھینکنے والوں کو میٹھا پھل دیتی ہے۔ تو کیا رنجیت سنگھ بیری سے بھی گیا گزرا ہے کہ اینٹ پھینکنے والوں کو مایوس کرے۔"

یہ کہہ کر بچے کو مٹھائی کھلائی اور قدم آگے بڑھایا۔

(۱۴)

گوجرانوالہ میں ایک ساہوکار موہرو شاہ نامی رہا کرتا تھا مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے ابتدائی زمانے میں اکثر ضرورت کے وقت اس سے روپیہ قرض لیا کرتے تھے۔ لیکن جب وہ پنجاب کے واحد بادشاہ ہو گئے تو موہرو شاہ کی حیثیت بالکل ایک معمولی مہاجن اور دکاندار کی رہ گئی۔

ایک دن مہاراجہ گوجرانوالہ آئے۔ دیکھا کہ موہرو حسب معمول اپنے کچے جھونپڑے میں ٹاٹ بچھائے بیٹھا ہے۔ پرانے وقتوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ جی بھر آیا۔ سواری ٹھہرا کر کہا:۔

"موہرو شاہ! چلو ہمارے ساتھ ہردوار چل کر گنگا اشنان کر آؤ۔"

موہرو کو کیا عذر ہو سکتا تھا، ساتھ ہو لیا۔ قافلہ ہردوار روانہ ہو گیا مگر جاتے وقت مہاراجہ خفیہ خفیہ اپنے میر عمارت کو حکم دے گیا کہ ہماری واپسی تک موہرو کا کچا مکان گرا کر سرکاری خرچ پر شاندار حویلی تعمیر کر دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب مہاراجہ اور موہرو شاہ ہردوار سے واپس گوجرانوالہ پہنچے تو نئی عمارت تیار ہو چکی تھی موہرو شاہ دربار سے اجازت حاصل کر کے اپنے گھر گیا۔ دیکھا تو مکان کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ کچے جھونپڑے کا نام و نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ اس کی جگہ پختہ عمارت کھڑی تھی۔ وہ آنکھیں مل مل کر تکتا تھا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ اتنے میں چند درباری بھی وہاں آ پہنچے اور اسے اپنا کچا جھونپڑا تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دیکھ کر پھر دربار میں پکڑ لے گئے۔ اور کہا:۔

"موہرو شاہ اپنا گھر ڈھونڈتا پھرتا ہے اسے گھر نہیں ملتا۔"

اس پر بڑا قہقہہ مچا۔ اور سب نے مہاراجہ کے اس شاہانہ مذاق کو جس میں پرانی جان پہچان کی قدر دانی کا راز بھی مضمر تھا بہت پسند کیا۔

(۱۵)

ایک میراثی مہاراجہ کے سامنے ضد کر کے بیٹھ گیا کہ تب تک یہاں سے نہیں ٹلوں گا جب تک مجھے ہاتھی نہ دلوا دیا جائے گا۔ مہاراجہ نے بہتیرا سمجھایا کہ گھوڑا اونٹ۔ بھینس۔ گائے۔ بکری وغیرہ جو چاہو لے لو۔ ہاتھی کا خرچ تم سے برداشت نہ ہو سکے گا۔ مگر میراثی ایک نہ مانا اور اپنی بات پر جما رہا۔ آخر مہاراجہ نے اسے ہاتھی دیدیا۔

میراثی ہاتھی پر سوار ہو کر خوشی خوشی گھر آیا۔ مگر بیچارے کی پونجی ہی کتنی تھی۔ کونسی ہنڈیاں جمع ہو رہی تھیں۔ جو کچھ جمع جتھا تھا وہ ہاتھی دو ہی دن میں چٹ کر گیا۔ پھر آئی مصیبت میراثی اور ہاتھی دونوں بھوک کے مارے مرنے لگے۔ میراثی نے ہاتھی کے گلے میں ڈھول باندھا۔ گلی گلی پھر کر بھیک مانگنا شروع کیا اور اس طرح

سالم مہتر کی خاک چھانی۔

جب مہاراجہ کو اس امر کی اطلاع ملی تو اس نے میراثی کو طلب کیا دیکھا تو ہاتھی بہت لاغر ہو گیا تھا اور میراثی پیٹ پالنے کے لئے کپڑوں میں مریل ساہو کماٹی دیتا تھا۔ حکم دیا کہ ہاتھی کا راتب سرکار سے ملا کرے اور میراثی کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے تاکہ دونوں کی پرورش ہوتی رہے۔ ہم یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ہاتھی جیسا شاندار حیوان فاقوں مرے اور میراثی آزردہ خاطر اور پریشان حال پھرتا رہے۔

(۱۶)

ایک دن لڑائی میں مہاراجہ نے ایک بھیڑ کو دیکھا کہ اس کے گلے میں ایک برتن بندھا ہے اور وہ فوج کے ساتھ ساتھ جا رہی ہے۔ مہاراجہ نے دریافت کیا کہ کیا ماجرا ہے۔ اور فوج میں بھیڑ کہاں سے آگئی ہے۔ اسے بتایا گیا کہ ایک سپاہی نے اسے پال رکھا ہے۔ اور وہ اپنے مالک کے گھی کا برتن اٹھائے اٹھائے یونہی سفر کیا کرتی ہے۔ مہاراجہ کو اس بھیڑ پر بڑا ترس آیا۔ سپاہی کو بلایا اور آٹھ آنے یومیہ اس بھیڑ کی خوراک کے لئے مقرر کر دیا کہ شاہی خزانے سے تنخواہ کے ساتھ ملا کرے۔

(۱۷)

جب جھنگ کا علاقہ فتح ہو چکا تو مہاراجہ نے تریموں گھاٹ سے اتر کر اوچ کے حکمران پر چڑھائی کی، اور وہاں کے حاکم سیدناگ کو کہلا بھیجا کہ تمہیں سید ہوتے ہوئے حکومت کرنا زیبا نہیں۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اپنی تمام دولت و ریاست میرے سپرد کرو اور خود علائق دنیا سے کنارہ کش ہو کر اللہ اللہ کرو۔

سید صاحب مہاراجہ کے پیغام کا جواب لکھ کر بھیجنے کی بجائے خود حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا:۔

"اس میں شک نہیں کہ میں فقیر ہوں۔ مگر فقیروں کی خدمت بھی بادشاہوں پر لازم ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ میرا علاقہ میرے ہی پاس رہنے دیں گے۔ میں دعا گو رہوں گا اور ہر سال کچھ نذرانہ بھی ادا کرتا رہوں گا۔"

مہاراجہ نے سید صاحب کی باتوں سے خوش ہو کر ان کا علاقہ انہی کو بخش دیا اور وہاں سے ملتان کا رخ کیا۔

(۱۸)

ایک دن مہاراجہ نے فقیر سید عزیز الدین صاحب سے پوچھا:۔

"فقیر جی! آپ کیا چیز پینا پسند کرتے ہیں؟"

سید صاحب نے کہا:۔

"مہاراج! فقیر کو دودھ پسند ہے۔"

مہاراجہ نے کہا:۔

"اچھا ہماری طرف سے دو سو گائیں اور تین ہزار گھماؤں زمین چراگاہ کے لئے قبول کرو اور خوب دودھ پیا کرو۔"

(۱۹)

ایک دن مہاراجہ گھوڑے پر سوار تھا۔ کریم بخش چھتری بردار چھتر لگائے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ مہاراجہ نے دیکھا اور کہا:۔

"کریم بخش ننگے پاؤں کیوں آ رہا ہے؟"

عرض کیا:۔

"سرکار! آج جوتا مول لے لوں گا۔"

مہاراجہ نے کچھ روپے دیئے اور کہا:۔

"جوتا ضرور خرید لینا۔"

چند کوس آگے جانے کے بعد پھر پوچھا:۔

"کریم بخش! جوتا کیوں نہیں خریدا؟"

عرض کیا:۔

"حضور! ابھی ملا نہیں۔"

مہاراجہ نے مٹھی بھر کر اور روپے دیئے اور کہا:۔

"جوتا ضرور خرید لینا۔"

راستے میں ایک نالہ آیا۔ مہاراجہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑے نے ایک ہی جست میں پھاند کر اسے عبور کر لیا۔ کریم بخش چھتری بردار نے بھی اسی تیزی سے چھلانگ لگا کر چھتر مہاراجہ پر تان دیا۔ مگر اس چھلانگ کے سبب تمام روپے اس کی جھولی سے گر پڑے جن کی جھنکار مہاراجہ نے بھی سنی۔ غرض شناس چھتری بردار نے پلٹ کر بھی روپوں کی طرف نہ دیکھا اور ڈیوٹی ادا کرتا ہوا کیمپ تک چلا گیا۔ جب منزل پر پہنچ گئے تو مہاراجہ نے پوچھا:۔

"کریم بخش! راستے میں تیرے روپے گر پڑے تھے! تجھے معلوم بھی ہے؟"

جواب دیا:۔

"ہاں سرکار! گرے ہوں گے اگر مجھے تو خدمتگزاری کے وقت

کسی چیز کی بھی شمہ بُدھ نہیں رہتی۔"
مہاراجہ نے خوش ہو کر اسے بہت سے روپے انعام دیئے۔

(۲۰)

مہاراجہ کے حضور میں رپورٹ پہنچی کہ لاہور کا فلاں ساہوکار ہزاروں روپے نقد اور بہت سامان و اسباب چھوڑ کر مر گیا ہے نہ اس کی کوئی اولاد ہے نہ قریبی رشتہ دار جو اس جائداد کو سنبھالے حکم ہو تو اس کا لاوارث مال سرکاری خزانے میں داخل کر لیا جائے۔
کوئی کمینہ حاکم ہوتا تو بڑی خوشی سے اس روپے کو اپنے مصرف میں لے آتا۔ مگر مہاراجہ نے کہا کہ لاولد کا مال کسی بال بچے دار آدمی کو ہضم نہیں ہو سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ اس کے چنے خرید کر ان کا دانہ خچروں کو کھلا دیا جائے۔ کیونکہ انکی بھی اولاد نہیں ہوتی۔

(۲۱)

مہاراجہ کے پاس گورنر کشمیر نے کچھ تحفے تحائف بھیجے۔ مہاراجہ نے اسی وقت بال بچوں میں تقسیم کر دیئے۔ مگر شہزادہ شیر سنگھ ایک طرف بیٹھا رہ گیا۔ اسے کوئی چیز نہ ملی۔ جب وہ سامنے آیا تو مہاراجہ نے کہا:—
"اوہ! افسوس! تجھے تو حصہ دینا یاد ہی نہ رہا۔
کہاں تھے ؟"
اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا:—
"میں تو حضور کے بائیں جانب بیٹھا ہوا تھا۔"
اتفاق سے مہاراجہ بائیں آنکھ سے کانے تھے، وہ بچے کی اس حاضر جوابی کو سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا:—
"اچھا بیٹا! ہم تجھ سے کانے ہو گئے۔"
ایک اور موقعہ پر کشمیر سے سالانہ خراج آیا اور معمول کے مطابق مہاراجہ کے ملاحظہ کے واسطے دربار میں فرش پر کھول کر لگا دیا گیا اس خراج میں بہت سے قیمتی دوشالے، ہتھیار اور جواہرات وغیرہ آئے تھے جن کی مجموعی قیمت بیس ہزار اشرفی سے زیادہ تھی۔ نوعمر ہیرا سنگھ پاس بیٹھا تھا۔ وہ مہاراجہ کی مہربانی پر بہت نازاں تھا۔ اس نے بغیر توقف کے عرض کیا کہ حضور کو ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے، مجھے ہی عنایت فرما دیں۔ مہاراجہ نے کہا اچھا لے لو۔ اور اسی وقت تمام اشیاء اسے بخش دیں۔

(۲۲)

لاہور میں ایک فقیر آیا جس نے دعویٰ کیا کہ وہ ایک صندوق میں بند ہو کر بغیر خورد و نوش کے زمین کے اندر جتنا عرصہ مقرر کیا جائے اتنے عرصہ تک زندہ رہ سکتا ہے۔ مہاراجہ کو قدرتی طور پر اس کے دعوے پر یقین نہ آیا۔ اور اس نے ارادہ کر لیا کہ اس کا امتحان کیا جائے۔
اس کے لئے ایک دن مقرر کیا گیا۔ اور فقیر نے تیاری شروع کر دی۔ چنانچہ مہاراجہ اور ان کے بڑے بڑے سرداروں کی موجودگی میں فقیر نے اپنا کمال دکھایا۔ اس نے اپنے نتھنے، کان اور منہ کے سوا باقی تمام سوراخ جن کے راستے اس کے جسم میں ہوا داخل ہو سکتی تھی بند کر دیئے اور اپنے آپ کو برہنہ کر کے کپڑے کے ایک تھیلے میں ڈال دیا جس وقت اس کی زبان لوٹا کر اس کے حلق کو بند کیا گیا تو وہ فوراً بے ہوش ہو گیا، اور اس پر غفلت و بے حسی طاری ہو گئی۔
اس کے بعد تھیلا بند کیا گیا اور اس پر مہاراجہ کی خاص اپنی مہر لگا دی گئی۔ پھر اس کو چھوٹے سے لکڑی کے صندوق میں رکھ کر مقفل و سربمہر کر دیا گیا۔ اس بکس کو ایک تہہ خانے میں رکھا گیا۔ اور اوپر مٹی ڈال کر جو بو دیئے گئے۔ اس تہہ خانے کے چاروں طرف مکان تھا جس کا دروازہ بھی مقفل کیا گیا۔ ایک دیوار اس کے گرد موجود تھی۔ اس کے ایک دروازے کو بھی اینٹوں سے چن کر بند کر دیا گیا۔ اس مکان کے باہر سپاہیوں کا پہرہ مقرر کیا گیا تاکہ کوئی شخص اس جگہ کے قریب نہ پھٹکنے پائے۔
چالیس دن اور رات نہایت سخت نگہبانی اور محافظت کی گئی۔ اس عرصہ کے گزر جانے کے بعد مہاراجہ اپنے نبیرہ اور چند سرداروں نیز جرنیل ونتورا، کپتان ویڈ اور ڈاکٹر میک گریگر کے ہمراہ اس جگہ فقیر کو نکالنے کے لئے آئے۔ باہر کی اینٹیں اور مٹی علیحدہ کی گئی۔ مکان کا قفل کھولا گیا اور تہہ خانے سے صندوق نکال کر باہر کھلی ہوا میں کھولا گیا۔ ڈاکٹر میک گریگر کا بیان ہے کہ:—
"ہم نے دیکھا کہ فقیر ایک سفید چادر میں لپٹا ہوا تھا اور جب اس چادر کو اُٹھایا تو اس آدمی کو بیٹھا ہوا پایا، اس کے ہاتھ اور بازو اس کے دونوں پہلوؤں کے ساتھ لگے ہوئے تھے، اور وہ دو زانو بیٹھا ہوا تھا۔ پہلی تدبیر جو اس کے زندہ کرنے کیلئے کی گئی وہ یہ تھی کہ اس کے سر پر گرم پانی ڈالا گیا۔ اور اس کے بعد آٹے کی گرم گرم روٹی اس کے سر کی چوٹی پر رکھی گئی۔ پھر موم کی ایک گولی اس کے نتھنے میں سے نکالی گئی۔ اس پلیس نے ندرے

اس برش سے دم لیا۔ اب اس کا منہ کھولا گیا اور زبان جو تالو کے ساتھ لگا دی گئی تھی اصلی جگہ پر لائی گئی۔ پھر اس کی اور اس کے ہونٹوں کی گھی سے مالش کی گئی۔ اس وقت تک بھی کلائی میں نبض کی کوئی حرکت محسوس نہیں ہوتی تھی مگر جسم کی حرارت صحت کے معمولی درجے سے زیادہ تھی۔ ٹانگوں اور بازوؤں کو سیدھا کرکے آنکھیں کھولی گئیں۔ اول الذکر کی خوب مالش کی گئی، اور آنکھوں پر کسی قدر گھی چپڑا گیا۔ میں نے دیکھا کہ آنکھوں کے ڈیلے مدھم اور بجھے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی مردہ آدمی کے ہوتے ہیں۔ اس وقت فقیر نے ایسی علامت ظاہر کی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ جان پڑ رہی ہے۔ نبض چلنے لگی اور جسم کی غیر طبعی حرارت بھی فوراً کم ہو گئی۔ اس نے ایک دو دفعہ بولنے کی کوشش کی مگر ضعف کے سبب سے اس کی آواز نہ نکل سکی۔ آخر چند لفظ اس کے منہ سے نکلے مگر آواز ایسی نرم اور کمزور تھی کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز قائم ہوتی گئی اور اس نے بعض آدمیوں کو جو کھڑے تھے پہچان لیا، اور مہاراجہ سے جو سامنے بیٹھے اس کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہے تھے ہم کلام ہوا۔ جس وقت فقیر گفتگو کرنے کے قابل ہو گیا تو اس مرحلہ کی کامیابی کو مشتہر کرنے کے لئے توپیں سر کی گئیں، اور دوسری طرح سے بھی اظہار مسرت کیا گیا۔ مہاراجہ نے ایک بھاری طلائی زنجیر اس کے گلے میں ڈالی اور تو ایک طلائی اور دو شالے اور اسباب تمائش بھی اس کو انعام دیا۔"

(۴۳)

اتنی فیاضی اور دریا دلی کے باوجود مہاراجہ زر و جواہر کا بڑا مشتاق تھا اور اس کا یہ اشتیاق لالچ کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔

فروری ۱۸۱۳ء میں جب مہاراجہ اس کوشش میں مصروف تھا کہ اٹک کی جو دھ نگرہ والے وزیر آباد کے مقبوضات کو اپنے تصرف میں لائے تو یہ خبر پہنچی کہ شاہ شجاع جو والئی کابل اپنے حریف دوست محمد خاں سے شکست کھا کر ان کے ملک میں پناہ لینے کے لئے آرہے ہیں اور اگرچہ اس کی بہت عزت اور خاطر مدارات کی گئی مگر وہ اس وقت زیادہ عرصہ قیام نہ کرسکا اور جلد واپس چلا گیا۔

مارچ ۱۸۱۳ء میں وہ پھر لاہور آیا اور اس کی بیوی نے جو پہلے سے وہاں موجود تھی اپنے خاوند کو بتایا کہ مہاراجہ اس کا دوست ہے لیکن ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ مہاراجہ کی طرف سے یہ تقاضا شروع ہو گیا کہ "کوہ نور" ہیرا اسے دیدیا جائے اور اس کے عوض جاگیر لے لی جائے۔

یہ مشہور اور نایاب ہیرا جو ڈیڑھ انچ لمبا اور ایک انچ چوڑا بتایا جاتا ہے، دہلی میں تخت طاؤس کی زینت رہ چکا تھا۔ وہاں سے وہ نادر شاہ کے ہاتھ آیا جس کے انتقال کے بعد احمد شاہ نے اپنے باپ کے ورثہ میں اسے پایا۔ چونکہ یہ الماس نہایت قیمتی تھا اس لئے مہاراجہ کی خواہش تھی کہ جس طرح بن پڑے یہ ہیرا اس کے پاس آجائے۔ ادھر شاہ شجاع کو اس کے نہ دینے پر اصرار تھا کہ یہ نادر چیز ہاتھ سے نہ جائے۔ مگر دونوں فریقوں کی موجودہ حالت یکساں نہ تھی۔ مہاراجہ نے بادشاہ کی ضد پر غالب آنے کے لئے جس قدر سختی ہو سکتی تھی کی اور ہیرے کو اپنے قبضے میں لانے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ یہاں تک کہ اس بے وطن اور پریشان حال خاندان کو دو دن تک بھوکا رکھا اور کوئی چیز کھانے کو نہ دی۔ لیکن جب دیکھا کہ انہوں نے فاقہ کی مصیبت جھیل لی ہے تو بیچاروں کو کھانا دیا۔

بادشاہ نے پہلے تو انکار کیا کہ الماس اس کے پاس نہیں ہے مگر جب کسی حجت سے کام نہ چلا تو حیلہ بہانہ تراشا مگر مہاراجہ نہ تو کسی فریب ہی میں آیا اور نہ اپنے ارادے سے ٹلا۔ آخر جب شاہ شجاع اس سختی اور تقاضا سے لاچار ہو گیا تو مجبوراً جواہر دینے پر رضامند ہو گیا۔

یکم جون ۱۸۱۳ء کو مہاراجہ اسے لینے کی خاطر شاہ شجاع کی خدمت میں گیا۔ بادشاہ نے اس کو بڑی عزت و توقیر سے بٹھایا اور ایک گھنٹہ تک دونوں بڑی متانت کے ساتھ خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد مہاراجہ بے تاب ہو گیا۔ اس نے ایک مصاحب کو اشارا کیا کہ وہ بادشاہ کو ملاقات کا مقصد یاد دلائے۔ اس کا جواب تو کچھ نہ ملا۔ مگر بادشاہ نے اپنی آنکھوں سے ایک خواجہ سرا کو کچھ اشارا کیا جو اسی وقت جا کر ایک چھوٹا سا ڈبہ اٹھا لایا اور اسے قالین پر دونوں کے درمیان رکھ دیا۔ مہاراجہ نے اس ڈبے کو کھولنے کا حکم دیا۔ اور جونہی الماس اس کی نظر پڑا

اس نے فوراً اسے شناخت کر کے اُٹھا لیا اور اسی وقت رُخصت لے کر محل سے واپس چلا آیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے بیس ہزار روپیہ اور کئی دیگر قیمتی جواہر دے کر رہائی حاصل کی اور بہت سی مصیبتیں اُٹھانے کے بعد برٹش گورنمنٹ کی پناہ لی۔ یہاں اس کا معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا، اور وہ اس پناہ میں اس وقت تک رہا جب تک اسے دوبارہ تخت کابل حاصل نہ ہو گیا۔

(۲۴)

مہاراجہ دربار کی شان و شوکت قائم رکھتا تھا۔ اسے اس بات کا بھی بڑا خیال رہتا تھا کہ جو لوگ سفارت پر بھیجے جائیں وہ نہایت شاندار لباس میں ملبوس اور قیمتی زیورات سے آراستہ و مزین ہوں تاکہ دربار کا رُعب دُوسروں کے دل پر بیٹھ جائے۔ ایک دفعہ لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل نے ایک سفارت مہاراجہ کے دربار میں بھیجی۔ مہاراجہ نے سفارت کے استقبال کیلئے چند آدمی نامزد کئے اور انہیں حکم دیا کہ وہ صبح روانگی سے پہلے ان کی خدمت میں حاضر ہوں۔ چنانچہ دوسرے دن صبح کے وقت راجہ سچیت سنگھ کو ان کے لباس اور زیور کی خوبصورتی پر خوشنودی ظاہر کرنے کے بعد شیر سنگھ کی طرف مخاطب ہو کر دریافت فرمایا:۔

"کیا وجہ ہے کہ تم آج بغیر اپنے بیش قیمت زیور کے ہو؟"

اس نے تلوار کے قبضہ پہ ہاتھ رکھ کر عرض کیا:۔

"میں سپاہی آدمی ہوں، اور صرف اسی زیور کی قدر کرتا ہوں۔"

مہاراجہ نے برہم ہو کر پھر پوچھا:۔

"تمہارا زیور کہاں ہے؟"

آخر شیر سنگھ کو یہ کہنا پڑا کہ وہ سرکاری خزانے میں ہے، کیونکہ آج سے چند ماہ پیشتر جب مہاراج ان کے مکان پر بے تکلف تشریف لے گئے تھے تو وہ بطور نذر یا پیش کش کے دیا گیا تھا۔ مہاراجہ نے اس پر اظہار ملال کیا اور اسے فوراً واپس دینے کا حکم صادر فرما دیا۔

(۲۵)

ایک دن راجہ سوچیت سنگھ زمرد کا کنٹھا پہن کر مہاراجہ کے دربار میں آیا۔ مہاراجہ کنٹھا دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ دوسرے روز جب راجہ پھر دربار میں حاضر ہوا تو کنٹھا نہ تھا۔ مہاراجہ نے پھر پوچھا:۔

"راجہ صاحب وہ کل والا کنٹھا کیا ہوا؟"

راجہ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا:۔

"سرکار! جس جوہری سے کنٹھا لیا تھا وہ اس کی قیمت اسی ہزار مانگتا تھا۔ میں ساٹھ ہزار دیتا تھا۔ قیمت کا فیصلہ نہ ہو سکا اس لئے واپس کر دیا۔"

مہاراجہ نے نہایت متانت سے فرمایا:۔

"راجہ صاحب! جو چیز ایک دفعہ لے لی جائے وہ واپس نہیں کرنی چاہئے۔"

یہ کہہ کر مصر بیلی رام کو حکم دیا کہ راجہ صاحب کو اسی ہزار روپیہ دے دیا جائے تاکہ وہ کنٹھا خرید لیں۔

(۲۶)

مہاراجہ رنجیت سنگھ خود تلوار کا دھنی تھا، اور ایسا نڈر بہادر کہ کیسا ہی جان جوکھوں کا کام کیوں نہ ہو ذرا نہیں گھبراتا تھا اور ہر مہم میں سب سے آگے آگے ہوتا تھا۔

۱۳ مارچ ۱۸۲۳ء کا واقعہ ہے کہ مہاراجہ سرحد کی مہم کے سلسلے میں دریائے اٹک کے کنارے پہنچا۔ کشتیاں موجود نہ تھیں۔ مہاراجہ نے پرانے اعتقاد کے مطابق ایک طشت میں کچھ اشرفیاں اور جواہرات رکھ کر اپنے ہاتھ سے دریا کی نذر کئے اور گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ پھر اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے آئیں۔ اتفاق سے دریا پایاب ہو گیا، اور تقریباً ساری فوج صحیح و سلامت پار اتر گئی۔ اس کے بعد یکایک پانی چڑھ آیا اور پانچ سو کے قریب آدمی دریا میں ڈوب گئے۔ مہاراجہ نے فرمایا:۔

"جا کے من میں اٹک رہے سو ہی اٹک رہیا"

یعنی جس کے دل میں رکاوٹ تھی وہ رُک گیا یا جس نے خدا پر بھروسہ نہ کیا وہ غرق ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ جب تک مہاراجہ دریا میں تھا دریا پایاب تھا، جونہی مہاراجہ کا گھوڑا دریا سے باہر نکلا طغیانی آ گئی۔

(۲۷)

مہاراجہ حساب کتاب کو خوب سمجھتا تھا، اور جس حساب میں کوئی فرق دیکھتا تھا اس سے بہت ناراض ہوتا اور سخت سزا دیتا تھا۔

ایسے ہی خود مہاراجہ کے حضور میں ایک رئیس سلام کرنے آیا۔ مہاراجہ کسی معاملہ میں مہاراجہ اس سے بگڑ گیا اور سخت ناراض ہوا۔ وہ رئیس ڈرتا ہوا بھاگا، مہاراجہ تلوار لے کر اس کے تعاقب میں نکلا۔ فقیر سید عزیز الدین نے دیکھ لیا۔ اور بلند آواز سے اس رئیس کا نام لے کر کہا:۔

"بھاگتے کیوں ہو۔ ٹھہر جاؤ۔ آج اکادشی کا دن ہے

اس روز تو ہندو چیونٹی کو بھی نہیں مارتے"

یہ سُن کر مہاراجہ کا غصہ ہلکا ہوگیا، اور اس نے رئیس کا قصور معاف کر دیا۔

(۲۸)

مہاراجہ اپنے اہلکاروں کے بگاڑ کو ملکی نقصان تصور کرتا تھا، اور نہیں چاہتا تھا کہ وہ آپس میں لڑ کر حکومت کے کام میں خلل پیدا کریں۔ ایک دفعہ مہاراجہ کے دو معزز عہدہ داروں میں کچھ ناچاقی ہوگئی۔ بات طول پکڑ گئی اور کسی کے سلجھائے نہ سلجھی۔ مہاراجہ نے اپنے موکل سردار جوند سنگھ کو ان کی صلح صفائی کرانے کے لئے بھیجا اور دو تین رئیس ساتھ کر دیئے۔

جب سردار جوند سنگھ نے انہیں منانے کی کوشش کی اور ہر ایک کو اس کے قصور بتائے تو دونوں امیر ان سے ناراض ہوگئے۔ دوسرے رئیسوں نے کہا کہ آپ کی یہ حکمت عملی ٹھیک نہیں اس طرح یہ رضامند نہ ہوں گے بلکہ ہمارے بھی دشمن ہو جائیں گے۔ اور اگر رضامند ہو بھی گئے تو ہمیں اچھا نہ سمجھیں گے۔ سردار جوند سنگھ نے کہا کہ میں سُنا کرتا تھا۔ دو دوستوں کو منانے والا ایک دوست کو کھو دیتا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ دونوں دوستوں کو کھو دیتا ہے۔ اور جب تک دونوں دوستوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔ ان میں صلح نہیں ہو سکتی۔ جس وقت تم دیکھو کہ دونوں ہمارے مخالف ہو گئے ہیں تو سمجھو لو کہ ان میں دوستی کا کس قدر حصہ آگیا ہے۔ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد انہوں نے دونوں کو دوبارہ اکٹھا کیا اور شیر بکری کی لمبی کہانی سُنائی جس سے یہ نتیجہ نکالا کہ بادشاہ جب آپس میں لڑتے ہیں تو وہ ملک اور دولت حاصل کرتے ہیں۔ مگر اہلکاروں اور رعایا کی لڑائی میں فریقین کی تباہی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ "دو مرغ جنگ کنند فائدہ تیر گر"

سردار نے سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اول قصور الف کا ہے وہ معافی مانگے۔ پھر قصور ب کا ہے وہ معافی مانگے۔ الف نے کہا کہ میں تو ہرگز معافی نہ مانگوں گا۔ سردار جوند سنگھ نے کہا کہ آپ معافی نہیں مانگتے تو اپنا کوئی وکیل مقرر کیجئے۔ اس نے کہا کہ میں آپ کو اپنا وکیل مقرر کرتا ہوں۔ سامنے میں تب بھی بولا کہ میں بھی اپنا وکیل آپ کو بناتا ہوں۔ سردار نے فوراً یہ لفظ کہے۔

"میں معافی مانگتا ہوں۔ میں معافی مانگتا ہوں

اب آئندہ کبھی تکرار نہیں ہوگا"

یہ سُن کر دونوں ہنس پڑے۔ سردار نے کہا اب مشکل یہ ہے کہ میں اپنے گلے آپ نہیں مل سکتا۔ آپ دونوں اُٹھئے اور ایک دوسرے کی ہڈی پسلی کی خبر لیجئے۔ کہتے ہیں کہ دونوں اُٹھ کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور دیر تک ایک دوسرے کو بھینچتے رہے۔

سردار جوند سنگھ نے کہا کہ دو دوست آپس میں ناراض ہو کر اگر اسی طرح ایک دوسرے سے بدلہ لے لیا کریں تو دوسروں کو بیچ میں پڑنے کی ضرورت تو نہ رہے۔

مہاراجہ نے جب یہ قصہ سُنا تو مسرت کا اظہار کیا۔

(۲۹)

مہاراجہ کے بڑھاپے کا زمانہ تھا۔ اقبال کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ سونا چاندی۔ جواہرات۔ نوکر چاکر کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ فیل خانوں میں ہاتھی کھڑے جھومتے اور اصطبل میں گھوڑے بندھے ہنہناتے تھے۔ بات مُنہ سے نکالنے کی دیر ہوتی تھی۔ جو چاہتا تھا ہو جاتا تھا۔ مگر ایک دن دربار میں بیٹھے بیٹھے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر کر اس کی سفید لمبی ڈاڑھی کو تر کرنے لگے۔

درباری بے حد حیران ہوئے۔ وزیروں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ حضور نے کسی مشکل کو مشکل نہیں سمجھا کسی مہم کو سر کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ فتح بڑھ بڑھ کر آپ کے قدم چومتی ہے۔ سارے مصالح ملکی حسب خواہش انجام پا رہے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ آج آپ رو رہے ہیں۔ کونسا صدمہ پہنچا ہے جس سے دل دکھ گیا ہے۔ ہم سے آپ کی آزردگی نہیں دیکھی جاتی۔

مہاراجہ نے جواب دینے کی کوشش کی مگر آواز حلق ہی میں پھنس گئی جیسے کوئی گلا دبا رہا ہو۔ آخر بڑی مشکل سے دل کو قابو میں لا کر کہا:۔

"بات کہنے کی نہ تھی مگر آنکھوں نے رو کر اس کا اظہار کر دیا۔ میں تمہیں اپنے بچے سمجھتا ہوں۔ اس لئے اب بتائے

دیتا ہوں کہ میں بچپن میں ایک معمولی سردار تھا۔ مگر مجھے گھوڑ دوڑ کا اتنا شوق تھا کہ میری سواری میں جو گھوڑا آتا تھا میں اُسے دوڑا دوڑا کر مار دیا کرتا تھا۔ ایک روز میرے پاس سواری کے لئے کوئی گھوڑا نہ رہا۔ میں نے اپنی والدہ کو گھوڑا خریدنے پر مجبور کیا۔ اس نے اپنے کانوں کی بالیاں اُتار کر گروی رکھیں اور مجھے گھوڑا خرید کر لا دیا۔ اب وہ زمانہ یاد آیا اور میں نے خیال کیا کہ جس ماں نے میری وہ حالت دیکھ کر اس قدر ایثار کیا وہ آج زندہ ہوتی تو میری اقبال مندی کو دیکھ کر کس قدر خوش ہوتی اور پتہ نہیں کتنی کتنی دفعہ کی ڈھیری پہ قربان ہوتی۔ اب اصطبل میں ہزاروں اچھے سے اچھے گھوڑے موجود ہیں۔ سینکڑوں ہاتھی کھڑے جھومتے ہیں۔ سونا چاندی اور زر و جواہر کا کچھ شمار نہیں۔ افسوس کہ اُسے یہ زمانہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔"

یہ کہہ کر بوڑھا مہاراجہ پھر رو پڑا اور اس نے ساون بھادوں کی جھڑی لگا دی۔

عالمگیر بکڈپو سے کتابیں طلب فرما کر رسالہ "عالمگیر" کی امداد کیجئے

علی محمد باب

ایران کا ایک مذہبی علمبردار انقلاب

اقبالؒ کے ایک قطعہ کا تاریخی پہلو

از مولوی اظہر امرتسری

تھی خوب حضورِ علما باب کی تقریر
بیچارہ غلط پڑھتا تھا اعرابِ سماوات
اُس کی غلطی پر علما تھے متبسم
بولا تمھیں معلوم نہیں میرے مقامات
اب میری امامت کے تصدق میں ہیں آزاد
محبُوس تھے اعراب میں قرآن کے آیات

یہ قطعہ پڑھنے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ باب کون تھا؟ اس کے عقاید کیا تھے؟ اور وہ زندگی کے کن مرحلوں سے گزرا؟ ان سوالوں پر اگر تشریحی روشنی ڈالی جائے تو اس تفصیل کے سامنے عجیب و غریب دلچسپ کہانیاں بھی بے کیف نظر آئیں گی کیونکہ اس مسئلہ پر سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اور باب کے پیرو جب تک زندہ ہیں بابیت کے متعلق تحقیق و تجسس کی نئی نئی راہیں نکلتی رہیں گی۔ کیونکہ بابی مذہب اپنی نیم صوفیانہ، نیم فلسفیانہ اور نیم ملحدانہ خصوصیات کے اعتبار سے ایک معجون مرکب بن گیا ہے جس کے اجزائے ترکیبی سہل الحصول نہیں ہیں۔ لیکن ہمیں بابیت سے سروکار نہیں۔ مرقومہ بالا قطعہ کی تلمیح کا تعلق صرف علی محمد باب اور اس کی محرفانہ حرکت سے ہے۔ جس کا نشانہ قرآن کریم کو بنایا گیا۔ اس لئے ذیل میں باب کی داستانِ حیات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱)

"مَیں مہدی ہوں"

علی محمد باب ۲۰ر اکتوبر ۱۸۱۹ء مطابق یکم محرم ۱۲۳۵ھ کو بمقام شیراز پیدا ہوا۔ ابھی وہ بچپن کی معصوم وادی ہی میں تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اب علی محمد کا مستقبل تاریک تھا۔ پرورش اور تربیت کے ذرائع مفقود تھے۔ لیکن اس کے ماموں میرزا علی نے اس کے سر پہ شفقت کا ہاتھ رکھا۔ اور یہیں باب کا لڑکپن جوانی تک پہنچا۔ بابیوں کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ باب اَن پڑھ تھا۔ اور اسی بے علمی کو وہ اس کی "رسولانہ خصوصیت" قرار دیتے ہیں۔ لیکن واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس زمانہ کی تعلیم سے پوری طرح بہرہ وَر تھا۔ حاجی میرزا جانی کاشانی جو باب کے مریدوں میں سے تھا اپنی کتاب "نقطۃ الکاف" میں لکھتا ہے کہ باب بھی دوسرے رسولوں کی طرح اُمّی تھا۔ لیکن "دورِ بہائی" میں لکھا ہے کہ علی محمد باب نے شیخ محمد عابد سے تعلیم حاصل کی تھی۔

زندگی کا میدان۔ باب تعلیم کے بعد معاشی میدان میں آیا۔ اس نے ۱۵ برس کی عمر میں بمقام بوشہر تیلیوں کا کام شروع کیا۔ لیکن اس کی طبیعت تجارتی مشاغل کو پانچ برس سے زیادہ عرصے تک قبول نہ کر سکی۔ اس کے بعد اس نے نجف اشرف و کربلائے معلیٰ کا سفر کیا اور ان مقامات میں چند علماء سے ملا جن سے خصوصیات مہدی کے متعلق بات چیت کی۔ ان مذاکرات سے باب نے محسوس کیا کہ شیعی دنیا مہدی کا انتظار دیکھ رہی ہے۔ لہٰذا اس وقت اگر مہدویت کے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا کی جائے۔ اور اس کے بعد اس غلط فہمی سے فائدہ اٹھایا جائے تو اتفاقات کی مدد شامل حال ہوگی۔ اس زمانے میں شیعوں کے ایک فرقے کا خیال تھا کہ مہدی موعود کا ظہور ہو چکا ہے۔ وہ اس احساس کے باعث شہر شہر اور قریہ قریہ مہدی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ باب اس فرقے کی سرگرمیوں کو بغور دیکھتا رہا۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ اب اگر مہدویت کا دعویٰ

کیا جائے تو مخالفت کی بہ نسبت حمایت کا ہنگامہ زیادہ زیادہ بلند ہوگا۔ وہ اس فن کا بڑا ماہر تھا۔

مہدویت کی تبلیغ:۔ یہاں اس نے مہدی کی فضیلت اور ضرورت پر تقریریں کیں۔ وہ ایک فصیح البیان مقرر تھا۔ اس کے الفاظ چلتا ہوا جادو تھے۔ اس کی باتوں میں شیرینی اور کشش تھی، اس کا طرز تکلم دلچسپ اور عوام فریب تھا۔ اس لئے تھوڑے ہی دنوں میں باب کی خطیبانہ شہرت کا ستارہ آسمان کامیابی پر چمکنے لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ فضا سازگار ہو گئی۔ تو دعوی مہدویت کی تدریجی راہ پر چلنا شروع کر دیا۔ چنانچہ باب نے کہا کہ میں صاحب الزمان کا باب ہوں۔ میرا وجود مہدی اور عوام کے درمیان ایک واسطہ ہے۔ لوگ چونکہ مہدی کے منتظر تھے انھوں نے خیال کر لیا کہ ہو نہ ہو امام آخر الزمان نے باب کو اپنا نقیب بنا کر بھیجا ہے۔ جب اس دعوی پر مقبولیت کے دروازے کھلنے لگے۔ تو ۱۲۶۰ھ میں وہ شیراز آیا۔ اب اس کی عمر ۲۵ برس کی تھی۔ جوانی کا جوش دماغ میں عجیب و غریب خیالات پیدا کر رہا تھا اور ان خیالات کو عمل و حقیقت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ذرائع کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ صد درجہ راسخ العزم تھا۔ اور وقت سے فائدہ اٹھانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ اس لئے ذرائع کا میسر آنا مشکل نہ تھا۔ چنانچہ اس نے شیراز میں اپنے آپ کو باب کے نام سے متعارف کرانا شروع کر دیا۔ اور اس مقصد کے لئے اس حدیث سے استدلال کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علم کا شہر ہیں۔ اور علی اس کا دروازہ (باب) ہیں۔ باب کا بیان تھا کہ جس طرح حضرت علیؓ رسول اللہ کے مدینۃ العلم کا باب ہیں۔ اسی طرح میں امام مہدی کی مقربی کے لئے ایک دروازہ ہوں۔ جو شخص مہدی تک پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ میرے وسیلہ و واسطہ پر اعتماد کرے۔ شیعہ مجتہدین نے اس دعوی کو دیوانے کا خواب سمجھا اور ہر طرف سے مخالفانہ آوازیں بلند ہونے لگیں۔ لیکن فرقہ شیخیہ نے اس عقیدے کو قبول کر لیا۔ یہ وہی فرقہ ہے جو مہدی موعود کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہتا تھا اس کے بعد باب کا اشہب دعاوی اچھلتا کودتا ذرا آگے بڑھا اور اس نے کہا کہ میں خود ہی مہدی موعود ہوں۔

اس دعوی سے ایران کی شیعی دنیا میں ہلچل مچ گیا۔ لیکن فرقہ شیخیہ کی عملی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں اس لئے بابی عقاید مخالفت کے ہنگامے سے دب نہ سکے۔

---

(۲)

ہلاکت انگیز راہ پر سفر

باب نے مختلف مبلغین سلاطین اسلام کے پاس بھیجے۔ اس کے بعد خود مکہ معظمہ چلا گیا۔ واپسی پر جب وہ بوشہر پہنچا تو بوشہر میں ہلاکت انگیز ہنگامے اس کا انتظار دیکھنے لگے۔ حاکم شہر بھی نقض امن کے خطرے سے بے قرار ہونے لگا۔ اس نے عوام کے مطالبے پر ایک بابی مبلغ کو سر بازار سزا کے تازیانہ دی اور تین بابیوں کی ڈاڑھیاں نچوا دیں اور انھیں شہر کے بازاروں میں پھرایا گیا۔ اس کے بعد باب شیراز آیا۔ مشتعل ہجوم پہلے ہی اس کی جان لینے کے لئے کھڑا تھا لیکن حاکم شہر نے تدبر سے کام لیتے ہوئے کہا کہ بحث و مناظرہ کا کام ہاتھوں کے سپرد کرنا دانشمندی نہیں۔ علما نے جواب دیا کہ ہم اس کام کے لئے بھی تیار ہیں۔ چنانچہ سر دربار بزم مناظرہ منعقد ہوئی۔ جہاں باب نے قرآن کی آیتیں غلط پڑھیں۔ جب اسے غلطی پر ٹوکا گیا تو اس نے جواب دیا ؎

اب میری امامت کے تصدق میں ہوئیں آزاد
محبوس تھے اعراب میں قرآن کے آیات

زدوکوب:۔ اس پر بات بڑھ گئی۔ علما نے زبان کا کام ہاتھوں سے لینا شروع کر دیا۔ بالآخر باب کا ماموں میرزا علی بزاز آیا اور اپنے بھانجے کو ضمانت پر چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ میرزا علی نے اسے گھر میں بند کر دیا۔ لیکن اس کی چلبلی طبیعت پابندیوں کی تاب کب لا سکتی تھی؟ ایک دن جب میرزا علی کہیں باہر گیا ہوا تھا باب چپکے سے نکلا اور جامع مسجد پہنچ گیا۔ جمعے کا دن تھا۔ مسجد نمازیوں سے بھرپور تھی۔ باب کو دیکھتے ہی ہر طرف سے انگلیاں اٹھنے لگیں تماشائی نے اسے ڈانٹا۔ لیکن باب ہر بلا کو ٹالنا جانتا تھا۔ اس نے کہا کہ میں چلا تو جاؤں گا لیکن میری ایک بات تو سن لو۔ یہ کہا اور منبر پر چڑھ گیا۔

جادو بیانی کا اثر:۔ اس نے اس درجہ جادو انگیز تقریر کی کہ حاضرین میں سے اکثر نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس کامیابی کے بعد وہ ایک انقلابی کی حیثیت سے اٹھا اور ایران پر چھا جانے کے منصوبے باندھنے لگا۔ ان دنوں محمد شاہ تخت ایران پر جلوہ گر تھا۔ اسے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں باب کی انقلابی قوتیں بروئے کار نہ آ جائیں۔ بادشاہ نے ایک شیعہ عالم دین مولوی سید یحییٰ دارابی کو شیراز بھیجا۔ جس نے باب سے بات چیت کی۔ اور اس کی خواہش

پیدا ہوئے سورۂ کوثر کی تفسیر لکھ دی۔ جسے دیکھتے ہی دارابی کا غرور علم عاجزانہ عقیدت سے بدل گیا۔ اس نے شاہ کی خدمت میں پیش ہونے کا ارادہ ترک کر دیا اور ایران کے شہروں میں بابیت کا پرچار کرنے لگا۔ سلطنت علاوہ دارابی کی سرگرمیوں کو دماغی خرابی کا نتیجہ قرار دیا۔ لیکن عوام نے اس کی طرف متوجہ ہونا شروع کر دیا۔

(۳)

علمبردار انقلاب

اس کے بعد چند اور مجتہد بھی بابیت میں شامل ہوگئے۔ اب حکومت ایران کو بھی ہوش آیا کیونکہ بابی پارٹی ایک انقلابی جماعت کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ چنانچہ حاکم شہر کے حکم سے کوتوال نے باب کو گرفتار کرنے کی ٹھان لی۔ آدھی رات کو جب دنیا پر خاموشی چھائی ہوئی تھی، کوتوال نے میرزا علی کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ اور محمد علی باب' میرزا علی اور سید کاظم زنجانی کو گرفتار کر لیا۔ یہ تینوں حاکم کے سامنے پیش کیے گئے اور رہائی کے لئے التجائیں کیں۔ حاکم نے انھیں اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ شیراز میں نہیں رہیں گے۔ اس کے بعد باب نے اپنے ایک مخلص مرید محمد حسین روستائی کی معرفت تین گھوڑے خریدے اور ان پر باب اپنے ماموں میرزا علی اور اپنے مرید کاظم زنجانی سمیت سوار ہو کر اصفہان کو چل پڑا۔ لیکن آقائے محمد حسین کو سازشوں کے لئے چھوڑ گیا مگر یہ شخص اپنی سرگرمیوں پر رموز و اسرار کا پردہ نہ ڈال سکا۔ حاکم شہر نے اسے گرفتار کر لیا اور گرفتاری کے بعد کہا کہ تم اگر بابیت کے راز بتا دو تو اس مصیبت سے نجات پا سکتے ہو ورنہ تمھیں مار ڈالا جائے گا۔ محمد حسین نے بے پروائی کی ہنسی کے ساتھ جواب دیا کہ اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ مجھے حضرت باب کی راہ میں ہلاک کر دیا جائے۔ یہ سنتے ہی ایک سپاہی نے بندوق اٹھائی۔ گولی اس کی دائیں آنکھ پر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اب باب کی سنئے۔ وہ اصفہان پہنچا۔ معتمد الدولہ منوچہر خاں حاکم شہر سے اس کی ملاقات ہوئی۔ باب اسے اپنا مرید بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب اسے روکنے والا کون تھا؟ ہر جگہ بابیت کی تبلیغ ہونے لگی۔ لیکن رائے عامہ اس کے خلاف تھی۔

جان کے لالے:۔ آخر شورش برپا ہوئی۔ باب کو جان کے لالے پڑ گئے۔ مشتعل ہجوم نے اس کا پیچھا کیا۔ لیکن وہ ایک سرائے میں چھپ گیا۔ یہاں بھی عوام اس کی جان لینا چاہتے تھے۔ لیکن فوج نے بروقت امداد کی۔ اور باب کو موت کے منہ سے نکال لیا۔ اس کے بعد حاکم شہر نے ایک مجلس مناظرہ منعقد کی جس میں شیعہ علماء کو بحث کے لئے بلایا گیا۔ مناظرہ شروع ہوا۔ شیعہ مجتہد نے سوال کیا کہ تم صرف قرآن و حدیث سے استدلال کرتے ہو یا کسی فقیہ کے پیرو بھی ہو؟ باب نے جواب دیا کہ میں کسی کو بھی نہیں مانتا۔ میرا مقام قلبی ہے اور یہ وہ بلندی ہے جہاں تک علم و دانش اور عقل و نقد کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ جو شخص مقام قلب میں ہو اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ کیا تم بھی اس خوبی کا اظہار کر سکتے ہو؟ باب نے کہا ہاں! اس کے بعد مرزا محمد حسن نے پوچھا حدیث میں آیا ہے کہ حضرت علیؓ ایک ہی رات میں بیک وقت چالیس آدمیوں کے مہمان ہوئے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس واقعے کو عقلی دلیلوں سے ثابت کرو۔

عجیب جواب:۔ باب نے کہا میں اس کا تحریری جواب دے سکتا ہوں۔ یہ بات مان لی گئی۔ لیکن جب جواب نامہ میرزا محمد حسن کے سپرد کیا گیا تو اس پر حمد و نعت اور مناجات کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب باب کے لئے شکست و ناکامی مقدر ہو چکی تھی لیکن حاکم شہر بدستور اس کا معتقد رہا۔ اس ناکامی کے بعد باب اصفہان سے چلا گیا۔ اور ایک گاؤں میں مقیم ہوا لیکن نہایت رازداری سے دوبارہ اصفہان چلا آیا اور معتمد الدولہ کی نگرانی میں رہنے لگا۔ اسی اثنا میں معتمد الدولہ کا آخری وقت آ گیا۔ اس نے اپنی ساری جائداد باب کے نام منتقل کر دی اور خود اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔ جب معتمد الدولہ کے بھتیجے گرگین خاں کو اس بات کا پتہ چلا۔ تو اس نے دربار شاہی میں فریاد کی وہاں سے حکم آیا کہ باب کی وضع و ہیئت بدل دی جائے۔ اس کے بعد اُسے طہران بھیجا جائے۔ یہ حکمنامہ اس وقت پہنچا جب سورج ڈوب چکا تھا۔

(۴)

قید و بند کے مصائب

باب اپنے مریدوں سمیت شاہانہ راحت کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ حاکم نے اسے اور اس کے مریدوں کو بارہ سواروں کی نگرانی میں اصفہان سے چلتا کیا۔ اور رخصت کے وقت اسے بیوی سے بھی ملنے نہ دیا گیا۔ اس کا باب کو اس درجہ صدمہ ہوا کہ اس نے دوران سفر میں دو دن تک کھانا نہ کھایا۔ جب اسے تبریز لایا گیا تو اس نے حاکم شہر سے درخواست کی کہ مجھے یہیں قیام کی اجازت دی جائے۔ لیکن یہ درخواست

اب باب نے ستیہ گری کی ٹھان لی۔ اس نے کہا میری نعش تبریز سے جائے تو جائے لیکن میں یہاں سے نہیں جاؤنگا۔ مگر سپاہیوں کی سختی سے اُسے چلنا ہی پڑا۔ بالآخر اسے ماکو میں لایا گیا۔ جہاں ایک پہاڑی قلعے میں نظر بند کیا گیا۔ یہاں اس پر کڑی پابندیاں تھیں۔ بایں ہمہ وہ پراسرار طریقے سے اپنے عقاید کی تبلیغ کرتا رہا۔ لیکن یہ راز بھی کھل گیا اور حکومت نے اسے ماکو سے چہریق بھیجدیا۔

انقلابی ہنگامے کا اثر ۔ بابیوں نے ایران کے مختلف گوشوں میں ہنگامے برپا کردیئے۔ حکومت کو اپنا انتظامی مستقبل خطرناک نظر آنے لگا۔ اس لیئے محمد شاہ والی ایران نے یہی مناسب سمجھا کہ باب سے علما کا مناظرہ کرایا جائے۔ چنانچہ سنہ ۱۲۶۳ھ میں ناصرالدین شاہ ولیعہد نے باب کو تبریز بلایا۔ اور مجلس مناظرہ منعقد کی۔ شیعوں کی طرف سے نظام العلماء ملا محمود نے مناظرہ کیا لیکن اس مباحثہ میں بھی باب کو ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ ناصرالدین شاہ نے جب باب کو جھوٹا سمجھا تو اسے پٹوانا شروع کردیا جب وہ خوب پٹ چکا تو کہنے لگا میں توبہ کرتا ہوں۔

مُرید باب کی بغاوت ۔ اس بات سے ناصرالدین کی تسلی ہوگئی۔ اس نے اسے دوبارہ قلعہ چہریق میں بھیجدیا۔ اب باب کے مریدوں کی سنئے۔ ملا حسین بابی مذہب کا بہت بڑا مبلغ تھا۔ وہ سو دو سو مسلح ساتھیوں کو لے کر مازندران کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ مقام بارفروش پہنچا تو شہریوں نے آگا روک لیا۔ بالآخر فریقین میں لڑائی ہوئی۔ جس میں تین بابی مارے گئے۔ لیکن سات شہریوں کو بھی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یہاں سے ہٹنے کے بعد حسین نے قلعہ طبرسی کے قریب ایک چھوٹا سا قلعہ بنا لیا اور اردگرد کے دیہات کو لوٹ کر کھانے پینے کا سامان بھی مہیا کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی تبلیغی سلسلہ کو بھی بہت زیادہ وسعت دی۔ جس کا نتیجہ خاطر خواہ ہوا۔ ہزاروں لوگوں نے بابیت قبول کرلی۔ اور ملا حسین ایک اچھی خاصی فوجی قوت کا مالک بن گیا۔

(۵)

ہمہ گیر شورشیں

اسی زمانہ میں بابیوں کی ٹولیاں سارے ایران میں پھیلی ہوئی تھیں جب انھیں معلوم ہوگیا کہ ایک مرکزی نظام قائم ہوگیا ہے۔ تو وہ مختلف مقامات سے آئے اور حسین کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے جب یہ خبر طہران پہنچی تو سرکاری حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ بادشاہ نے خیال کیا کہ اس فتنے کا اگر سر نہ کچلا گیا تو یہ قیامت بن کر سارے ایران پر چھا جائے گا۔ دربار شاہی کی طرف سے شاہزادہ مہدی قلی خاں کو لکھا گیا کہ وہ مازندران سے کوچ کرے اور بابی قلعہ پر دھاوا بولدے۔ شہزادے نے اس حکم کی تعمیل کی۔ ابھی وہ بابی قلعے سے چند میل کے فاصلہ پر تھا کہ ملا حسین کو ایک مکتوب بھیجا۔ جس میں لکھا گیا کہ بغاوت و سرکشی سے توبہ کرلو۔ ورنہ تمہاری سیاسی قوت فنا کردی جائے گی حسین نے جواب دیا کہ ہم راہ حق پر ہیں۔ ہمیں صداقت کے لئے جان تک کی بھی پروا نہیں۔ لیکن ناصرالدین شاہ اور اس کے تمام ساتھی جہنمی ہیں۔ ہم ان لوگوں کی اطاعت کیوں قبول کریں۔ اس جواب سے مہدی قلی کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ اس نے محسوس کیا کہ قوت کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

شاہی فوج کی شکست ۔ ابھی وہ تیاریوں ہی میں مصروف تھا کہ رات آگئی۔ جنگ کے منصوبوں کی جگہ راحت و آرام کی تدبیروں نے لی لی۔ دوسرے دن ابھی آفتاب افق کی چلمن سے جھانک ہی رہا تھا کہ تین ہزار بابی تلواریں سونت کر نکل آئے۔ شاہی فوج نے سمجھا کہ طہران سے کمک آرہی ہے۔ اس لئے مقابلے کی تیاری نہ ہوسکی بابیوں نے اس تعطل سے فائدہ اٹھایا۔ تلوار پر تلوار چلنے لگی۔ شاہی سپاہ اس حملے سے بدحواس ہوگئی۔ اور بھاگنے کی راہ دیکھنے لگی بابیوں نے ایک ہزار سپاہیوں کو تو ٹھکانے لگا دیا۔ اور ایک ہزار بھاگنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے بعد وہ بھوکے شیروں کی طرح گرجتے ہوئے آگے بڑھے۔ ایک جماعت نے تو سامان جنگ کو آگ کے حوالے کرنا شروع کیا۔ دوسرے گروہ نے شہزادہ مہدی قلی کے محل کا محاصرہ کرلیا۔ مہدی قلی تو بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ البتہ دو اور شہزادے (یعنی سلطان حسین میرزا اور فتح علی شاہ) ایوان سے نکل نہ سکے۔ بابیوں نے مکان کو آگ لگا دی۔ جس کے باعث شاہی خاندان کے یہ دو نوعمر نوجوان بھی موت کی نیند سوگئے۔

دندان شکن تیر ۔ دوسرے دن شکست خوردہ فوج پلٹ کر آگئی۔ لیکن بابیوں نے اسے صف بندی سے پہلے ہی بھگا دیا مگر بھاگتے ہوئے سپاہیوں میں سے کسی نے تیر مارا جو بابی لیڈر محمد علی بارفروشی کے مُنہ پر لگا۔ اور اس کے دانت ایک ایک کرکے زمین پر آگرے۔ اس شکست نے دربار ایران میں کہرام برپا کردیا آخر شہزادہ عباس قلی کثیر التعداد سپاہیوں کے ساتھ بابی قلعہ پر

حملہ آور ہوا۔ لیکن اس نے لڑائی سے پہلے خندقیں کھود لی تھیں تاکہ دشمن سے محفوظ رہا جاسکے۔ بالآخر ملا حسین فوج لے کر قلعے پر آیا۔ فریقین میں معرکۂ ہلاکت و قتال گرم ہوا۔ بابی لیڈر ملا محمد حسین بشرویہ کے ایک تیر لگا اور وہ قلعے میں آکر تھوڑی دیر میں مر گیا۔ اس صدمے سے بابیوں کی تنظیمی قوت کو بہت زیادہ صدمہ پہنچا۔ اس کے بعد بابی خوب مردانگی سے لڑے۔ لیکن شاہی توپ خانہ آگیا۔ اب آگ کا مقابلہ انسانی شجاعت کے بس میں نہیں تھا۔ اس لئے بابیوں نے بھاگ کر قلعہ میں پناہ لی۔ اور شاہی فوج نے محاصرہ کرلیا۔ شہزادہ عباس قلی نے بڑے بڑے برج بنوائے۔ اور ان پر توپیں نصب کردیں۔ بابی نہایت صبر و استقامت سے قلعے میں بیٹھے رہے۔ لیکن جب ان کے پاس کھانے کے لئے درختوں کے پتے تک بھی نہ رہے۔ تو ابتری پھیل گئی۔ چنانچہ ایک بابی لیڈر میرزا محمد حسین قمی اپنے ساتھیوں سے کٹ کر حریفوں سے مل گیا۔ اس کے بعد بابیوں پر کمزوری چھا گئی۔ شاہی فوج نے سرنگیں کھود کھود کر ڈائنامیٹ کے ذریعے سے قلعے کو اڑانا شروع کردیا اس حرکت سے بھوکوں کے مارے بیتاب ہوئے ان کے صبر و استقامت کا پیمانہ لبریز ہوکر چھلک گیا۔ چنانچہ محمد علی بارفروشی تین سو مریدوں سمیت رہی سہی فوج کے نیچے میں آنے پر مجبور ہوگیا۔ محمد علی کو اس کے وطن بارفروش میں لایا گیا۔ جہاں اس بہادر بابی کو انتہائی ذلت و رسوائی کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔ اور اس کی نعش زاغ و زغن کی ضیافت کے لئے چھوڑ دی گئی۔ اس واقعہ کے بعد بابی تحریک کی کمر ٹوٹ گئی۔ اور جب علی محمد باب کو اس ناکامی کی اطلاع ہوئی تو وہ ایک مہینہ تک روتا رہا۔

(۶)

آگ کی بجھتی ہوئی چنگاریاں

بابیوں کے انقلاب و شورش کی جو آگ لگا رکھی تھی اس کی دھیمی دھیمی چنگاریاں ملک کے مختلف حصوں میں مسکرا رہی تھیں۔ چنانچہ یزد میں بابی مبلغ یحییٰ کام کر رہا تھا۔ اس نے مذہبی تبلیغ کے علاوہ دعوت انقلاب کا جال بھی پھیلا رکھا تھا۔ حاکم یزد نے جب دیکھا کہ بابیت قیامت کی طرح سر اٹھانے والی ہے تو یحییٰ کی گرفتاری کا حکم صادر کردیا لیکن بابی پولیس سے لڑ بھڑ کر شیراز بھاگ گئے۔ یہاں بھی یحییٰ کے لئے جائے امان نہ تھی۔ حاکم شیراز ان کے پیچھے موت کی طرح پڑا ہوا تھا۔ آخر وہ تبریز آیا مگر اس شہر کی فضا بھی بابیت کی آواز قبول نہ کرسکی حاکم شہر نے اس کی گرفتاری کے لئے پولیس بھیجی۔ لیکن وہ جان بچا کر مسجد میں جا چھپا۔ جمعہ کا دن تھا۔ مسجد میں شیعہ نمازیوں کا ہجوم تھا یحییٰ منبر پر چڑھ گیا اور ایک موثر تقریر کی۔ جس میں کہا کہ مسلمانو! میں رسول اللہ کا فرزند ہوں۔ اس کے سوا میرا کوئی قصور نہیں کہ میں حق کی آواز بلند کرتا ہوں اور باطل کے ہنگامے کو دبانا چاہتا ہوں۔ اسی جرم کے باعث میں اپنے جد محترم حضرت امام حسینؓ کی طرح ظالموں کے نرغے میں ہوں۔ جو شخص اس وقت ظلم کے خلاف میری مظلومی کا ساتھ دیگا وہ قیامت کے دن امام حسینؓ کی شفاعت و سفارش کا حقدار ہوگا۔

یحییٰ کی سرگرمیاں — یحییٰ کی باتوں میں جذب و کشش کا جادو تھا۔ اس کا انداز بیان موثر تھا۔ اور شیعوں کو امام حسینؓ کے نام پر مشتعل کرلینا ویسے بھی کوئی بڑا کام نہیں۔ اس لئے تمام حاضرین نے بابیت قبول کرلی۔ اور گھر بار چھوڑ کر اس کے ساتھ ہولئے۔ یحییٰ ان رضاکاروں کو لے کر چل پڑا۔ اس زمانے میں شیراز سے چند میل کے فاصلے پر ایک غیر آباد قلعہ تھا۔ بابیوں نے اس پر قبضہ کرلیا اور خطرناک گروہ کی طرح ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ حاکم شیراز بھی صورت حال سے ناواقف نہیں تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی فوجی جمعیت مقابلہ کے لئے بھیجی۔ لیکن بابیوں نے اس جوانمردی سے لڑائی لڑی کہ ایک بھی سپاہی زندہ نہ بچ سکا۔ اس واقعے سے حکومت ایران کا اشتعال بڑھ گیا۔ اس نے شہزادہ فرہاد مرزا کو لشکر جرار دے کر بھیجا جس کے سامنے بابیوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کردیا۔ لیکن یہ سب کے سب موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اس سلسلے میں ایک شجاعت آموز واقعہ بھی سن لیجئے کہ ایک بابی حسن کو جس نے یحییٰ کے لئے راہ فرار مہیا کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب توپ کے دہانے سے باندھا گیا تو اس نے کہا میری آخری گزارش قبول کرلو۔ سپاہیوں نے کہا۔ کہو کیا کہتے ہو۔ حسن نے جواب دیا۔ کہ مجھے منہ کے بل توپ کے منہ سے باندھا جائے۔ تاکہ میں حضرت باب پر قربان ہونے کا فرحت بخش نظارہ اچھی طرح کرسکوں۔ یہ تھی بابیوں کی فدائیت۔ جس نے حسن ابن صباح کی پرتاثیر سرگرمیوں کو ایک بار پھر زندہ کر دیا تھا۔

مورچہ بندی ۔ تبریز میں تو بابیت کی آگ بجھ گئی۔ لیکن اس کا ایک پیچ و تاب کھاتا ہوا شعلہ اٹھا۔ اس شعلے کا نام تھا محمد علی۔ اسے باب کی نظروں میں اتنی عزت حاصل تھی کہ نماز جمعہ کی امامت کرا سکتا تھا۔ حالانکہ باب کے سوا کسی کو بھی یہ اعزاز حاصل نہ تھا،

لیکن لوگ اسے مسجد میں آنے نہ دیتے تھے۔ ایک دن نمازی اس کیلئے جھگڑ پڑے۔ انھوں نے حاکم سے فریاد کی۔ حاکم نے محمد علی کو گرفتار کر لیا۔ لیکن بابی لڑائی کے لئے بہانہ ڈھونڈتے تھے۔ انھوں نے حملہ کر کے محمد علی کو چھڑا لیا۔ جب یہ خبر طہران پہنچی تو حکومت کی طرف سے چند اشخاص بھیجے گئے۔ محمد علی نے بھی چند ہزار آدمیوں کو منظم کر لیا۔ اور کامیابی کے ساتھ قلعۂ زنجان پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد بابیوں نے تقریباً آدھے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اور مقبوضہ علاقے کو انیس حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ جہاں مورچوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ہر مورچے میں بابی مرد، عورتیں اور بچے رہتے تھے۔ جو سب کے سب لازم آرائی کے فن میں ماہر تھے۔ لیکن حکومت ان کا نقش ہستی مٹانے پر تلی ہوتی تھی۔ چنانچہ شاہی سپاہیوں نے تمام مورچوں کا محاصرہ کر لیا۔ اب محمد علی زنجانی کو جان کے لالے پڑ گئے۔ اس نے حکمت عملی سے کام لیا۔ شاہی سالار کو لکھا کہ ہمارا مقصد حکومت کی مخالفت نہیں ہم صرف حق کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر محاصرہ اٹھا لیا جائے تو ہم ایران چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

علاج بالموت ۔ اس گذارش کا جواب بے پروائی کی ہنسی سے دیا گیا۔ سالار نے لکھا کہ تمہارا علاج موت کے سوا کچھ نہیں۔ اس جواب سے محمد علی کی تمناؤں کا خون ہو گیا۔ اس نے تنگ آ کر روسی و ترکی سفیروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان سفارت خانوں کے افسر اس کے پاس آئے۔ محمد علی نے ان سے کہا۔ ہم شورش و بغاوت کے تمنائی نہیں ہم تو مسلمانوں کے اس عقیدے کے قائل ہیں کہ امام مہدی غایب ہیں۔ اب وہ ظاہر ہو گئے۔ اور ان کا نام علی محمد باب ہے۔ لیکن یہ لوگ ہمیں جھٹلاتے ہیں۔ حالانکہ آئمہ کے اقوال ہماری صداقت پر شہادت دیتے ہیں۔ سفیروں نے جب یہ باتیں سنیں تو وہ چلے آئے لیکن محمد علی اپنی سرگرمیوں میں معروف رہا۔ ایک دن جب وہ مورچے کے قریب کھڑا تھا اسے ایک تیر لگا آخر تیسرے دن تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اس کے بعد بابیوں کی کمر بہت ٹوٹ گئی۔ انھوں نے اپنے آپ کو حکومت کے حوالے کر دیا۔

(۷)

باب کی موت

اس حادثے کے باوجود بابیوں نے انقلاب و بغاوت کی آگ بھڑکائے رکھی۔ اور حکومت کی سختیاں اس آگ کو بجھا نہ سکیں۔ آخر حکام نے تنگ آکر یہ تدبیر سوچی کہ باب کو قتل کر دیا جائے کیونکہ جب تک بابیت کا منبع موجود ہے اس سے انقلاب و بغاوت کی ندیاں جاری ہوتی رہیں گی۔ اس تدبیر کے پیش نظر باب کو چہریق سے تبریز لایا گیا۔ یہاں اتمام حجت کی غرض سے مجلس مناظرہ منعقد کی گئی۔ حشمت الدولہ نے باب سے کہا کہ تم صاحب وحی ہو؟ باب نے کہا یقیناً۔ حشمت الدولہ نے کہا کہ اچھا کوئی تازہ الہام سناؤ۔ باب نے جھٹ سورۂ نور کی دو آیتیں پڑھ دیں۔ حشمت الدولہ نے پھر کہا کہ الہام تو صاحب الہام کے دل پر نقش ہو جاتا ہے لہذا اسے دوبارہ پڑھو۔ باب نے اس حکم کی بھی تعمیل کی لیکن حسب معمول اعراب و الفاظ میں ردو بدل کر گیا۔ اب حشمت الدولہ کو موقع مل گیا۔ اس نے کہا تم جھوٹے، ملحد اور مرتد ہو۔ لہذا تمہارے قتل کا حکم صادر کیا جاتا ہے۔ ۲۰ رشعبان ۱۲۶۶ھ کا دن قتل کے لئے مقرر ہوا۔ جب رات آئی تو باب نے اپنے مریدوں سے کہا میں کل ذلت کی موت مارا جاؤں اس سے بہتر یہی ہے کہ تم میں سے کوئی اٹھے اور میرا کام تمام کر دے تاکہ عزت کی موت مر جاؤں۔ تمام مرید کانپ اٹھے۔ لیکن ایک شخص آقائے محمد علی نے کہا کہ آپ کا ارشاد بہرصورت قابل تعمیل ہے۔ میں آپ کو شہید کر کے خودکشی کر لوں گا۔ باب نے مسکراتے ہوئے اس کے خلوص کا اعتراف کیا۔ وہ تلوار لے کر اٹھا لیکن دوسرے بابیوں نے اسے باز رکھا۔ اس کے بعد باب نے تمام مریدوں سے کہا کہ جان بہت عزیز چیز ہے۔ مجھ پر لعنت بھیجو اور موت سے بچ جاؤ لیکن سب نے جواب دیا کہ ہماری ہزار جانیں بھی ہوں تو آپ پر قربان کر دیں۔

صبح انجام ۔ آخر ۲۸ رشعبان کی صبح آگئی۔ سورج کی کرنیں ایک انقلابی کا انجام دیکھنے کے لئے مشرقی دریچے سے جھانکنے لگیں باب کو مقتل میں لایا گیا۔ حکم یہ تھا کہ ایک ستون کے ساتھ اسے باندھ دیا جائے تاکہ گولیوں کی بارش آسانی سے ہو سکے۔ سب سے پہلے آقائے محمد علی کو باندھا گیا۔ اتفاق سے اس کی پشت باب کی طرف ہو گئی۔ وہ چلایا کہ مجھے اس طریقے سے باندھو کہ مرتے وقت منہ تو حضرت "حق" (باب) کی طرف ہو۔ اس درخواست کو قبول کر لیا گیا۔ اس کے بعد افسر فوج اور محمد علی کے درمیان دلچسپ بات چیت ہوئی۔

جاں فروشانہ فدائیت ۔ افسر:۔ بابیت سے توبہ کر لو اگر اپنی جان بچانا چاہتے ہو؟

آقائے محمد علی:۔ حضرت حق سے توبہ کیوں کروں۔ یہ تو سب سے بڑا گناہ ہے۔

محمد علی کا ایک رشتہ دار بیچ میں بول اٹھا۔ "یہ تو دیوانہ ہو گیا ہے"

اسے چھوڑ دیجئے۔ جوش میں تو ہے نہیں۔

محمد علی - میں ہوشمند ہوں۔ عاقل ہوں۔ فرزانہ ہوں اور عقلمندی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرت حق پر قربان ہونا چاہتا ہوں

افسر - تمہارے حق تو خود موت کی آغوش میں ہیں۔

محمد علی - تو ہم دونوں جنت میں ملیں گے۔

افسر - تم بھی بابی معلوم ہوتے ہو۔

محمد علی - اگر میں دیوانہ ہوں تو دیوانے کو سزائے قتل دینے والا کیونکر فرزانہ ہو سکتا ہے؟

افسر - اچھا اب تمہارے سامنے دو راہیں ہیں۔ موت یا توبہ؟

محمد علی - دونوں راہوں پر چلنا چاہتا ہوں۔ موت کا رستہ سیدھا حیات ابدی تک پہنچاتا ہے۔ توبہ اس لئے کرتا ہوں کہ ایسی سرزمین میں پیدا ہوا جہاں حق کے پرستاروں کے خون سے یہاں انتقام کی آگ بجھائی جاتی ہے۔

بہشتی ساتھی - آقائے محمد علی نے جب یہ کہا تو باب چلا اٹھا میرے خدا کا رحم نہ کہا تو جنت میں میرے ساتھ رہے گا۔ اس کے بعد باب کو بھی ستون سے باندھا گیا اور حمزہ مرزا گورنر آذربائیجان نے ارمن سپاہیوں کو حکم دیا کہ باڑھ مار دو۔ لیکن وہ خدا جانے کس احساس سے متاثر ہوئے کہ گولیاں ہوا میں چلا دیں۔ لیکن ایک سپاہی نے آقائے محمد علی تبریزی کے گولی مار ہی دی۔ محمد علی نے آخری وقت باب سے کہا کہ بس اب تو آپ مجھ سے خوش ہیں؟ اس کے بعد اس کی روح لہو میں لت پت ہوکر پرواز کر گئی۔ سپاہیوں نے دوبارہ فیر کئے۔ کرشمۂ اتفاق دیکھئے کہ ایک گولی سے باب کی رسی ٹوٹ گئی۔ وہ اپنی کرامت کا نعرہ لگاتا ہوا بھاگ نکلا۔ اور ایک سپاہی کی کوٹھری میں جا چھپا۔ لیکن اسے پکڑ کر ہلاک کیا گیا۔ اس واقعے کے بعد بابیوں کی آتش انتقام بھڑک اٹھی۔ انھوں نے دو سال بعد ناصر الدین شاہ قاچار پر قاتلانہ حملہ کیا۔ لیکن گولی نشانے پر نہ لگی۔ پولیس نے اس جرم میں ۲۸ بابیوں کو جن میں مشہور شاعرہ قرۃ العین طاہرہ بھی شامل تھی قتل کر دیا۔ اور یہ سب کے سب ہنسی خوشی یہ شعر گاتے ہوئے موت کی نیند سو گئے۔

باز آمد باز آمدم از راہ شیراز آمدم
با عشوہ و ناز آمدم هذا جنون العاشق
یک دست جام بادہ و یک دست زلف یار
رقصے چنیں میانۂ میدانم آرزوست

باب مر گیا۔ اس کے پیرو بھی دنیا میں کم نظر آتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس کے عقائد کی بنیاد الحاد و ارتداد اور بدعات و اختراعات پر تھی۔ لیکن اس کی فدا کاری، عزیمت مندی اور راسخ العزمی توصیف و ستائش کا خراج حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ دھن کا پکا تھا ہٹ کا دھنی تھا اور عزم و ارادہ کا راسخ تھا۔ اس نے قید کی بے عزتی قبول کی۔ مار پیٹ گوارا کی۔ بالآخر مرگِ ذلت کی راہ سے آخری جہاں تک پہنچا۔ لیکن کسی مرحلہ پر بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی۔ اگر اس کی زندگی کے مذہبی پہلو کو نظر انداز کیا جائے اور اسے صرف ایک انقلابی کے بھیس میں دیکھا جائے تو اس کی ہمت مندی تحسین سے محروم نہ رہے گی۔ بہرحال علامہ اقبال نے اس ہستی کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے۔ اس کا تشریحی پہلو قارئین کے سامنے ہے۔ لہٰذا ہم باب کی اعتقادی حیثیت پر گفتگو کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

جو مرد اپنی عورتوں کو ہر مہینہ رِستا ہوا دیکھتے ہیں



وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ یہ ماہواری کی تکلیف ہے

تیرہ چودہ سال کی نوجوان لڑکی سے لیکر چالیس سال عمر تک کی عورت کیلئے ہر مہینہ ماہواری ایام کا بغیر کسی درد اور تکلیف کے باقاعدہ آنا بہت ضروری ہے۔ لیکن اگر کسی عورت کو ماہواری آنے میں تکلیف اور درد ہوتا ہے یا ماہواری خون باقاعدہ نہیں آتا یا مہینہ میں دوبار یا دو تین مہینے میں ایکبار آتا ہے۔ یا زیادہ دن تک آتا رہتا ہے یا ماہواری کے دنوں میں اسکی کمر اور ناف نلوں میں یا بدن میں سخت درد ہو جاتا ہے یا کسی عورت کو ماہواری رک رک کر آتی ہے۔ یا عرصے بند ہے یا ماہواری کی اور کوئی خرابی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی عورت بہت جلد کسی خطرناک مرض کا شکار ہو جائے گی۔ اور پھر اس کا علاج بیحد دشوار ہو جائیگا۔ لہذا ماہواری کی خرابی اور اس زمانہ کے درد وغیرہ کو ہرگز معمولی بات نہ سمجھئے۔ بلکہ جلد سے جلد ماہواری کی ان خرابیوں کا علاج کر لینا چاہیئے۔

ماہواری کو باقاعدہ کرنیکی ترکیب

یہ ہے کہ ایسی بیمار عورت جو مندرجہ بالا خرابیوں میں یا ماہواری کی کسی تکلیف میں مبتلا ہو اس کو ایک شیشی دوا "کورس" استعمال کرا دیجئے۔ اس دوا کی صرف ایک شیشی استعمال کرنے کے بعد عورت کو ہر مہینہ بغیر درد اور بغیر کسی تکلیف کے ماہواری باقاعدہ ٹھیک وقت پر اور صحیح مقدار میں آنے لگتی ہے۔ اور اس سے ہر قسم کی ماہواری کی خرابی اور بے قاعدگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نہایت کارگر دوا ہے۔ اور تقریباً بارہ تیرہ سال سے ہندوستانی عورتوں میں مشہور ہے اور ایک شیشی دوا "کورس" کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ لے بی ۱۲۲ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر بذریعہ وی۔پی پارسل منگالیں۔ پارسل پر سات آنے محصول خرچ ہوگا۔

اولاد .... بند کرو

بار بار بچہ کی پیدائش سے عورت کی تندرستی تباہ ہو جاتی ہے بیس برس کی لڑکی چالیس برس کی عورت معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور بعض وقت زیادہ بچے پیدا ہونے سے عورت کی زندگی کو بھی خطرہ ہو جاتا ہے۔ پس ایسی حالت میں عورت کو چاہیئے۔ کہ کچھ عرصہ کے لئے اولاد کا پیدا کرنا بند کر دے۔ اسکی ترکیب یہ ہے کہ ایک شیشی دوا "روہیل" منگا کر اپنے پاس رکھ لے اور خاص وقت "سے پہلے ایک خوراک اس دوا کی کھا لیا کرے۔ حمل نہ ٹھہر سکیگا۔ چنانچہ جبتک عورت...... پہلے یہ دوا کھا لیا کرے گی حمل سے بچی رہیگی۔ اور جب اس دوا کو ترک کر دیگی حمل کا ٹھہر جانا ممکن ہے۔ اس دوا سے عورت کی تندرستی پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ ضبط تولید (برتھ کنٹرول) کے لئے بہترین دوا ہے۔ اور بالکل بے ضرر۔ ایک شیشی میں اتنی مرتبہ استعمال کے لائق دوا ہوتی ہے۔ ایک شیشی "روہیل" کی قیمت چار روپے آٹھ آنے ہے۔ محصول ڈاک گیارہ آنے لگتا ہے۔

دوا منگانے کا پتہ :- لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ لے بی ۱۲۲ دہلی

علامہ ابو الصُّلت اُمیّہ

اسلام کے عہدِ اولین کا ایک ماہرِ فن انجینئر

از جناب شعلہ وارثی لکھنؤ

تاریخ کے بوسیدہ اجزا اور کہنہ اوراق میں بہت سے ایسے نام بھی ملتے ہیں جن کے ناموں اور کارناموں سے ہمارے کان ابھی اس وقت تک آشنا نہیں اور اگر آشنا بھی ہیں تو بہت کم۔ چنانچہ علامہ ابو الصلت اُمیّہ بن عبد العزیز کے نام سے بہت کم حضرات واقف ہوں گے حالانکہ یہ سرزمینِ اسپین کے نامی گرامی طبیب حقیقت شناس فلاسفر جادو نگار اور فصیح اللسان ادیب و شاعر دلوں کو موم کرنے اور انسانی روح پر سحر آگیں حکومت کرنے والے موسیقی کے عالم گزرے ہیں۔

سنہ ۴۶۰ ہجری میں ابو الصلت شہر دانیہ میں پیدا ہوئے جو اندلس کے مشرقی اضلاع میں شہر اشبیلیہ کے قریب واقع تھا۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے قاضی علامہ ابو الولید دمشقی سے اکتساب علم کیا اور ان کے بعد دیگر اساتذہ [illegible] کی تعلیم سے فیضیاب ہوئے اور انیس برس کے سن میں تمام علوم و فنون میں وہ کمال حاصل کیا کہ ان کے مؤرخ کہتے ہیں کہ ابو الصلت خود اپنی مثال آپ تھے طب میں جو کمال حاصل کیا وہ اطبائے اندلس کو نصیب نہیں ہوا۔ ریاضی و ہندسہ میں فریدِ عصر شمار کئے گئے۔ ادب و شاعری میں وہ مقبولیت حاصل کی کہ اسپین کے شعرا میں بھی بہت کم ایسے تھے جو ان کے ہم پایہ مانے جاتے تھے۔ ان فنون کے علاوہ علمِ موسیقی میں وہ کمال حاصل کیا کہ عرب کے تمام مغربی گویوں کی شہرت میں تزلزل پیدا ہو گیا اور عملی طور پر اس فن کے مستند اُستاد مان لئے گئے۔ سرود بجانے میں وہ اس وقت اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے علاوہ اس کے افریقہ کی تمام مروجہ دُھنیں انہی کی بنائی ہوئی تھیں جو اتنی مقبول ہوئی تھیں کہ اُن کے مرنے کے بعد بھی پانچ چھ سو برس تک وہ دُھنیں قائم رہیں۔

غرضیکہ انیس برس کے سن میں وہ تمام علوم و فنون میں کمال حاصل کر چکے تھے اور اب دانیہ اور اندلس اُن کے لئے کوئی ایسا استاد نہیں پیش کر سکتا تھا کہ وہ ان کو تعلیم دے اور تحصیلِ علم کی تشنگی کو وہ اپنے وطن ہی میں بجھا سکیں۔ لہذا ۴۸۹ھ ہجری میں عید الاضحیٰ کے دن ابو الصلت ارضِ مصر کو روانہ ہوئے اور اسکندریہ ہوتے ہوئے انہوں نے قاہرہ کی راہ لی جو کہ دار السلطنت تھا۔ مصر اس وقت حوادثِ زمانہ کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کیونکہ خاندان بنی فاطمہ زوال پذیر تھا اور حکومتِ مصر میں افضل کا طوطی بول رہا تھا جو مسلم بدر الجمالی وزیر جنگ کا بیٹا تھا اور جسے خلیفہ مستنصر باللہ فاطمی نے بدر الجمالی کے مرنے کے بعد وزیر جنگ کے عہدہ پر ممتاز کیا تھا۔ افضل نے خلیفہ مستنصر کے انتقال کے بعد فوراً اس کے بیٹے نزار کو جو ولی عہد تھا نالائق قرار دے کر الگ کرا دیا۔ اور مستعلی کے ہاتھ پر بیعت کر لی مستعلی نزار کا بھائی تھا لیکن افسوس کہ افضل نے اسی بھائی کے حکم سے نزار کو گرفتار کر کے دیوار میں زندہ چنوا دیا۔ غرضیکہ یہ فتنے اور ہنگامے بپا تھے جب ابو الصلت امیہ قاہرہ پہنچے اور وہاں کے امرا اور علما سے ملے۔ قدردانوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور انہیں موقع ملا کہ وہ ایک زمانے تک اپنے کمالات اور علم کو وسیع کرتے رہیں۔

۴۹۲ھ میں جب حروبِ صلیبیہ کا ہنگامہ برپا ہوا بطرس راہب اور گاڈ فرے ارضِ مقدس پر قابض ہوئے اور مسجد اقصیٰ کی زمین تقریباً اسی ہزار مسلمانوں کے خون سے رنگین ہوئی تو مستعلی مر گیا اور آمر باحکام اللہ خلیفۂ مصر ہوا جس کی عمر ابھی صرف پانچ ہی برس کی تھی۔ اب افضل گویا خود ہی بادشاہِ مصر تھا۔ اور سیاہ و سپید کا مالک۔ اس نابالغ خلیفہ کا عہد شروع ہوئے تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا کہ اتفاق سے ایک تجارتی جہاز تانبہ لئے مصر سے آ رہا تھا کہ بندرگاہ اسکندریہ کے قریب ڈوب گیا جس سے تجارِ اسکندریہ کے ساتھ دولتِ مصر کا بھی بہت کچھ نقصان ہوا جب یہ حال ابو الصلت نے سنا تو انہوں نے غور کرنا شروع کیا اور اپنے علم کے زور سے چند تدبیروں کا مسودہ قائم کر کے ملک افضل سے نذر کیا۔

---

[1] علامہ مقری علامہ ابو الصلت اُمیّہ کے چھ سو برس بعد ہوئے ہیں انہوں نے اپنی کتاب "نفح الطیب" میں لکھا ہے کہ بلادِ افریقہ میں اس وقت جتنی دُھنیں مروج تھیں وہ سب ابو الصلت اُمیّہ کی بنائی ہوئی تھیں۔

"اگر آپ روپیہ صرف کرنے کو تیار ہوں۔ اور جو سامان اور چیزیں میں کہوں فراہم کر دیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ غرق شدہ جہاز کو قعرِ دریا سے نکال دوں گا۔"

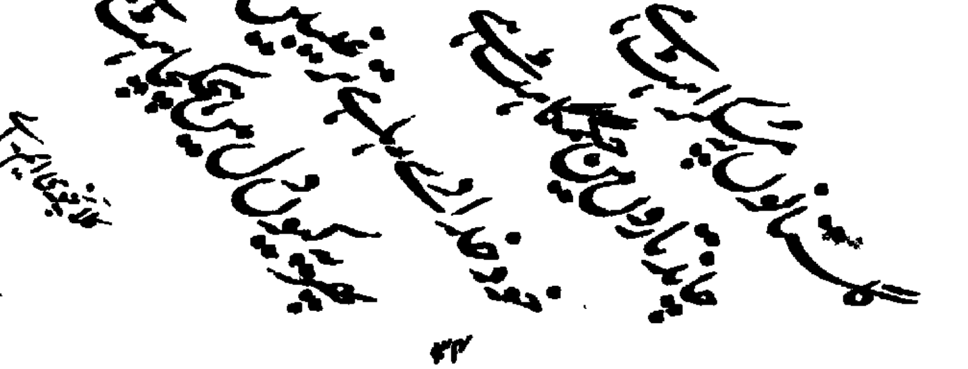
افضل یہ سن کر متحیر ہوا اور تمام مصارف کا متکفل ہو گیا۔ لیکن چونکہ دولت مصر کا اس جہاز کے ڈوبنے سے بہت نقصان ہو گیا تھا اور خزانہ میں کافی روپیہ نہ تھا۔ لہٰذا کچھ روپیہ قرض بھی لے لیا اور جو چیزیں علامہ ابو الصلت نے کہیں انہی کی نگرانی میں بنوانا شروع کر دیں۔ جب سب سامان درست ہو گیا تو انہوں نے اپنے ایجاد کئے ہوئے آلات کو ایک بڑے اور مضبوط جہاز پر اصول انجنیری کے مطابق ترتیب سے قائم کیا۔ گویا جرِ ثقیل کی ایک بہت بڑی مشین بنا کے کھڑی کر دی جس میں بڑی بڑی گراریاں لگی ہوئی تھیں جب ان سب چیزوں کو چلا کر دیکھ لیا اور بخوبی کامیابی کا اطمینان ہو گیا۔ تو اس جہاز کو لے کر اس مقام پر پہنچے جہاں تانبے کا جہاز غرق ہوا تھا۔ جہاز کو ٹھیرایا اور غوطہ خوروں کی ہدایت کی کہ پانی میں اتر کر ریشم کے مضبوط رسے غرق شدہ جہاز میں چاروں طرف باندھ دیں۔ اور پانی سے نکل آئیں۔ جب اس امر کی تعمیل ہو گئی۔ تو وہ رسے گراریوں پر چڑھائے گئے اور مشین چلانا شروع کی گئی۔ ابھی تک تو لوگ ابو الصلت کو اپنے ذہن میں بیوقوف خیال کر رہے تھے۔ اور اکثر اس کا آپس میں مضحکہ بھی اڑا رہے تھے لیکن جب گراریوں نے اپنا کام کرنا شروع کیا اور جہاز آہستہ آہستہ ابھرنے لگا۔ تو گھبرا گھبرا کے اس کی صورت دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد جہاز سطحِ آب کے برابر آ گیا اور اس کے کونے پانی سے باہر نکل آئے۔ لیکن اب گراریاں چلنا بند ہو گئیں۔ اور انتہائی کوشش کے بعد جہاز اس سے زیادہ نہ ابھر سکا۔

واقعہ یہ تھا کہ ابو الصلت اپنی ایجاد میں کامیاب تو ہو گئے تھے۔

لیکن افسوس کہ انہوں نے یہ غور نہ کیا کہ جہاز سطحِ آب کے برابر آنے کے بعد اس سے زیادہ کیوں نہ ابھر سکا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پانی کے اندر ہر بھاری سے بھاری چیز کا وزن بہت کم محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے ابھارنے میں پانی بھی اپنی قوت صرف کرتا ہے۔ لیکن سطحِ آب کے قریب پہنچنے کے بعد پانی کی قوت کام نہیں دیتی۔ لہٰذا اس عالی مرتبہ مہندس کو اس پہلے تجربہ میں اس بات کا خیال نہ رہا کہ جہاز کو سطحِ آب سے اوپر لانے کے بعد کیا کرنا چاہئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ابو الصلت نے جہاز کو ابھارنے کے لئے اور زیادہ زور لگانے کا حکم دیا۔ تو دفعتاً گراریاں اور رسّے ٹوٹ گئے اور جہاز پھر غرق ہو گیا۔

ابو الصلت کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا اور انہیں انتہائی تکلیف ہوئی۔ افضل نے دل برداشتہ ہو کر ابو الصلت کو گرفتار کر کے ہمیشہ کے لئے قاہرہ کے کتب خانہ میں قید کر دیا۔ لیکن اگر ابو الصلت کی ہمت افزائی کی جاتی اور سلطنت ان کو مالی امداد دیتی تو وہ دوبارہ اپنی کوشش میں ضرور کامیاب ہوتے اور اس جرِ ثقیل کی ایجاد کا سہرا اسی طریقے سے بھی دوسری قوم کے سر نہ ہوتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

۵۰۶ھ میں رؤسا و امرا کی انتھک کوششوں کے بعد قید سے رہائی پائی۔ لیکن ملک افضل نے ان کو قاہرہ میں رہنے کی اجازت نہ دی۔ علامہ ابو الصلت اس علمی قید خانہ سے چھوٹ کر فوراً اسکندریہ چلے گئے اور ۵۱۰ھ میں اسکندریہ سے شہر مہدیہ پہنچے جو اس زمانہ میں افریقیہ کا مرکزِ حکومت اور فرمانروایان بنی صنہاج کا دار السلطنت تھا۔ اس وقت علی بن یحییٰ بن تمیم وہاں کا حکمران تھا۔ اس نے ابو الصلت کے علم و فضل کی شہرت سے متاثر ہو کر بڑی عزت کی اور اتنی قدر و منزلت کی کہ ابو الصلت نے شہر مہدیہ کو اپنا وطن بنا لیا اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مرنے کے بعد بہت سی ایسی نادر تصنیفیں چھوڑیں جو ممالک افریقہ میں اب بھی موجود ہیں۔ غرہ محرم ۵۲۹ھ بروز دوشنبہ مرحوم کا انتقال ہوا اور شہر مہدیہ ہی میں مدفون ہوئے۔



رانا امر سنگھ کی کہانی

نوشتہ: شہنشاہ جہانگیر
ترجمہ: جناب پیر غلام دستگیر نامی

شہنشاہ جہانگیر کی تزک ذہنیت ہی صحیح واقعاتِ تاریخی کی حامل ہے۔ حالات کو سلیس عبارت میں بیان کر کے قارئین کے ذہن نشین کرنے میں اس شہنشاہ کو کمال حاصل ہے۔ ذیل میں رانا امر سنگھ کے حالات پیش کئے جاتے ہیں، جو خود شہنشاہ جہانگیر نے اپنی قلم حقیقت رقم سے تزک میں درج کئے ہیں:۔

رانا امر سنگھ مشہور ہندوستان کے معتبر راجاؤں اور زمینداروں میں سے ہے۔ اس کی اور اس کے آبا و اجداد کی سرداری کو اس ولایت کے تمام راجاؤں اور سرداروں نے قبول کیا ہے۔ بڑی دیر سے اس کے خاندان میں دولت اور ریاست قائم ہے۔ انہوں نے ایک مدت تک حدودِ مشرق میں جو پورب ہوتی ہیں حکومت کی ہے۔ اور اُن دنوں راجگی کے خطاب سے مشہور رہے ہیں پھر دکن کی طرف بڑھے اور کئی ولایتیں تصرف میں لے آئے۔ اور راجہ کی بجائے راول کا لقب اپنے نام کا جزوِ اعظم بنا لیا۔ اس کے بعد کوہستانِ میوات میں آئے اور رفتہ رفتہ قلعہ چتوڑ پر متصرف ہو گئے۔ اور اس تاریخ سے آج تک کہ میرے جلوس کا آٹھواں سال ہے۔ ایک ہزار چار سو اکہتر برس ہوتے ہیں اور چھبیس اشخاص اور اس طائفہ سے جن کی مدتِ حکومت ایک ہزار اور دس سال ہے۔ راول کے خطاب سے مخاطب رہے ہیں۔ راول اول سے رانا امر سنگھ تک جو آج کل رانا ہے چھبیس اشخاص نے چار سو اکسٹھ سال حکومت کی ہے۔ اس مدتِ مدید میں انہوں نے کسی ہندوستانی بادشاہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا بلکہ اکثر اوقات سرکشی اور فتنہ انگیزی ہی دکھائی ہے چنانچہ حضرت فردوس مکانی ربابر بادشاہ کے عہد میں رانا سانگا نے اس ولایت کے تمام راجاؤں، سرداروں اور زمینداروں کو جمع کر کے ایک لاکھ اسی ہزار سوار اور کئی لاکھ پیادہ فوج کی جمعیت سے والئی بیانہ میں جنگ کی مگر باری تعالیٰ کی تائید اور یاوری بخت سے اسلام کے ظفر اثر لشکر کو افواجِ کفر پر غلبہ حاصل ہوا۔ اور رانا کو شکستِ عظیم ملی۔ اس جنگ کی تفصیل تواریخ معتبرہ میں اور بالتخصیص حضرت فردوس مکانی کے خود نوشتہ واقعات میں مذکور و مسطور ہے۔

یہ سلسلہ بزرگوار والد بادشاہ اکبر جن کا مرقد منور رضا ہی نیم کا محل ہو۔ ان سرکشوں کے دفعیہ کے لئے مساعی بلیغہ عمل میں لائے اور کئی بار فوجیں ان پر متعین کیں اور اپنے جلوس کے بارھویں سال قلعہ چتوڑ کی تسخیر جو دنیا کے محکم ترین قلعوں میں سے ہے اور حکومتِ رانا کو مٹانے کا عزم کیا اور چار ماہ دس دن قلعہ کو محصور رکھ کر رانا امر سنگھ کی سپاہ سے جنگ و جدال کر کے قوت و طاقت سے فتح پائی اور قلعہ کو ویران کر کے واپس آئے اور ہر مرتبہ ان کی افواجِ قاہرہ نے اس پر عرصۂ حیات تنگ کر کے کوشش کی کہ یا وہ ہاتھ آئے یا خراب اور آوارہ ہو جائے۔ یہاں یہ مہم سر نہ ہوئی آخرِ اپنے عہد کے اخیر میں ایک دفعہ خود ملکِ دکن کی تسخیر کو متوجہ ہوئے اور مجھے جہانگیر کو بڑے بھاری لشکر اور معتبر سرداروں کے ساتھ رانا کے سر پر بھیجا مگر حسبِ اتفاق یہ دونوں کام ان اسباب کے واسطے سے جن کا ذکر بڑا طویل ہے صورت پذیر نہ ہوئے حتیٰ کہ زمانِ خلافت مجھ تک پہنچا۔ چونکہ یہ مہم میری نیم کارہ (ادھوری) رہی تھی اس لئے میں نے اپنے اولیں جلوس کے بعد جو لشکر سب سے پہلے روانہ کیا وہ یہی لشکر تھا۔ میں نے فرزند پرویز کو سردار بنا کر ان عظمائے سلطنت کے ساتھ جو پائے تخت میں حاضر تھے اس خدمت پر مقرر کیا اور خزانہ معمور اور توپخانہ موفور ہمراہ بھیجا۔ مگر چونکہ ہر کام ایک وقت پر موقوف ہے اس لئے بدعاقبت خسرو (شہزادہ اکبر جہانگیر) کا قضیہ وقوع میں آیا۔ مجھے ناچار اس کے تعاقب میں پنجاب کی طرف جانا پڑا۔ لہٰذا مجبوراً پرویز کو آگرے واپس بلا بھیجا۔ دارالخلافہ خالی نہ رہے۔ مجملاً رانا کی مہم جیسی چاہیے تھی نہ ہوئی۔

جب خسرو کے فتنہ سے خاطر جمع ہوئی تو میں نے آگرے آکر مہابت خاں اور عبداللہ خاں اور دوسرے سرداروں کو مقرر کر دیا اور میرے جانے کی طرف روانہ ہونے تک رانا کی ولایات عساکرِ فیروزی مآثر سے پامال ہوتی رہیں مگر مہم نے پسندیدہ صورت پیدا نہ کی۔ آخر خیال آیا کہ مجھے آگرہ میں پڑا رہنے سے کیا حاصل؟

یقین ہے کہ جب تک میں خود متوجہ نہیں ہوں گا کام نہیں بنے گا۔
اس لئے میں آگرے کے قلعہ سے چل کر باغ دھرہ میں منزل گزیں ہوا

رانا کی اطاعت

ماہِ بہمن میں پے درپے رانا امر سنگھ کی اطاعت اختیار کرنے کی خوشخبریاں پہنچیں۔ اس نے فرزند سعادتمند بلند اقبال سلطان خرم (شاہجہاں) کے دلیرانہ حملوں اور دار و گیر سے معلوم کر لیا کہ یا تو مجھے ملک چھوڑ کر آوارہ ہونا پڑے گا یا اسیر۔ لہٰذا اس نے اپنے خالو سرب کرن کو تحفہ کے ساتھ میرے فرزند اقبال مند کے پاس بھیج کر التماس کیا کہ میری سابقہ تقصیرات معاف کر دی جائیں اور تسلی خاطر کے لئے نشان پنجۂ مبارک بھیج دیا جائے تو میں خود حاضر خدمت ہو جاؤں۔ یا اپنے جانشین بیٹے کرن کو درگاہِ والا میں حاضر کر دوں یا حسبِ رواج بارگاہِ سلطانی کے غلاموں میں شمولیت کی سعادت حاصل کر لوں۔ مگر عطوفتِ شاہانہ سے کام لے کر مجھ بوڑھے کو حاضرِ درگاہ ہونے سے معاف کر دیں تو زہے قسمت۔ آخر فرزند شاہجہان نے اپنے دیوان ملا شکر اللہ کو جسے میں (جہانگیر) نے اس مہم کے اتمام پر افضل خاں کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اور میر سامان سندر داس کو جو اس کام کے انصرام کے بعد بخطاب رائے رایان ممتاز ہوا۔ درگاہِ والا میں بھیج کر حقیقت کو معروض کیا۔ چونکہ ہماری ہمت عالی اس طرف مائل ہے کہ جہاں تک ممکن ہو قدیمی خاندانوں کو خراب نہ کریں۔ اس لئے میں نے رانا امر سنگھ کی عرضداشت منظور کر لی اور نشانِ پنجہ مبارک اور فرمانِ مرحمت عنوان روانہ کیا۔ ہمارا مقصد سوا اس کے کچھ نہ تھا کہ رانا امر سنگھ کہ جو اپنے آبا و اجداد سے اپنے کوہستان اور مکان کے استحکام پہ مغرور ہو کر کسی بادشاہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا تھا یہ دعا کیا جائے۔

۲۶ بہمن کو رانا نے غلاموں کی طرح فرزند اقبال مند کی ملازمت کی۔ اور ایک بڑا لعل جو اس کے گھر تھا مرصع آلات۔ سات زنجیر فیل ۹ راس اسپ نذر گزرانے۔ خرم بھی کمال عنایت سے پیش آیا اور اس وقت جبکہ رانا اس کے پاؤں پکڑ کر عذرِ تقصیرات کر رہا تھا اس فرزند اقبال مند نے اس کا سر کنار میں لے کر اس کی تسلی اور خاطر جمع کی اور خلعتِ فاخرہ۔ شمشیر مرصع۔ اسپ بازین مرصع اور فیل خاصہ با یراقِ نقرہ اسے عنایت کیا۔ اس کے سو ساتھیوں کو خلعت دست سرو پا بچاس اسپ اور بارہ مرصع کمپوے دئے۔

زمینداروں کی اس رسم کے مطابق کہ جانشین بیٹا باپ کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا۔ رانا اپنے بیٹے کرن کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ پھر اس نے واپس جا کر اسے خرم کے پاس بھیجا اور وہ اسے ہمرکاب لے کر روانۂ درگاہ ہوا۔

فتحمند خرم کی باریابی

دوسرے دن شاہزادہ پوری شان و شوکت اور اپنے فتحمند لشکروں کے ساتھ داخل دولت خانۂ خاص و عام ہوا۔ [illegible] دو گھڑی دن گزرے اسے دولت کورنش حاصل ہوئی۔ [illegible] سجدات و تسلیمات بجا لا کر ایک ہزار اشرفی اور ایک ہزار روپیہ بطریق نذر اور ایک ہزار مہر اور ایک ہزار روپیہ بطور تصدق گزرانا۔ میں نے اُسے پاس بلا کر آغوش میں لیا۔ سر اور منہ چوما اور خاص نوازشوں [illegible] سے اسے اختصاص بخشا۔ اس کے التماس پر میں نے بخشیوں کو حکم دیا کہ کرن کو مقررہ آداب کے ساتھ حاضر کریں۔ جب وہ کورنش سجدہ سے فارغ ہو چکا۔ تو حسب الالتماس فرزند خرم میں نے حکم دیا کہ [illegible] دست راست کے جرگہ میں مقدم کھڑا کریں۔ پھر میں نے خرم سے فرمایا کہ جا کر اپنی ماؤں کو سلام کرو۔ اور اسے خلعت خاصہ۔ جو چار قب مرصع قبائے زربفت۔ تسبیح مروارید پر مشتمل تھا۔ اور اسپ خاصہ بازین مرصع اور فیل خاصہ مرحمت ہوا۔

رانا کرن پر انعامات کی بارش

کرن کو میں نے خلعتِ فاخرہ اور شمشیر مرصع سے سرفراز فرمایا چونکہ وہ وحشی طبیعت تھا۔ اور اس کی زندگی مجلس نادیدہ کوہستان میں بسر ہوئی تھی اور اس کے دل کو ہاتھ میں لینا ضروری تھا اس لئے میں نے اس پر تازہ مرحمت کا سلسلہ شروع کیا چنانچہ دوسرے دن کی ملازمت پر خنجر مرصع۔ تیسرے دن اسپ خاصہ عراقی جو زین مرصع سے آراستہ تھا عنایت ہوا۔ اسی دن محل کے دربار میں جا کر نور جہاں بیگم کی طرف سے خلعتِ فاخرہ۔ شمشیر مرصع۔ زین دار گھوڑے اور ہاتھی کی عطا سے سربلند ہوا۔ اس کے بعد میں نے اسے گراں بہا تسبیح مروارید مرحمت کی۔ اس سے اگلے دن اسے فیل خاصہ مع [illegible] عنایت ہوا۔ چونکہ میرا ارادہ تھا کہ اسے ہر جنس اور ہر چیز عطا کی جائے اس لئے میں نے اسے تین دست باز۔ تین دست جرہ۔ ایک قبضہ شمشیر خاصگی ایک بکتر ایک جوشن خاصگی دو انگشتری ایک نگین لعل اور ایک نگین

بر دعنایت فرمائی اور بیٹے کے کمر میں بے کم دیا کہ آتش کی جمیع اقسام لے کر قالین سفید کمبے اور ہر قسم کی خوشبوئیں۔ طلائی ظروف اور ۔۔۔ ایسی گجراتی اور مالکش کو ستہ قرانوں میں رکھ کر اور راعدی کندھوں پر ڈال کر دولتخانۂ خاص و عام میں حاضر کریں۔ اور یہ سب چیزیں یا علاحدہ میں نے حکم دیا ہوا تھا کہ رانا اور اس کے بیٹے کرن کا مجسمہ تیار کر کے چنانچہ سنگ تراشان تیز چابک نے دونوں کے قد اور ترکیب کے مطابق صورت بنا کر پیش کی۔ میں نے فرمایا کہ آگرے لے جا کر جھروکۂ درشن کے نیچے انہیں باغ میں نصب کر دیا جائے۔

رانا کا نذر کردہ تاریخی لعل

میں بروز یکشنبہ (۱۰۲۵ ہجری) بابا خرم کے ہاں گیا اور ایک پہر رات وہاں رہا۔ اس کی دوسری پیشکش نظر سے گزری جس دن سے پہلے حاضر ہوا تھا۔ اس نے رانا امر سنگھ کا ایک مشہور لعل جس کی قیمت جوہریوں نے ساٹھ ہزار کی تھی۔ اور جو اس قدر نہ تھا جتنی اس کی تعریف کرتے تھے۔ نظر سے گزرا۔ تھا۔ یہ لعل آٹھ تانک ہے۔ یہ پہلے بھی یہ راٹھور کے سردار رائے مالدیو کے پاس تھا جو ہندوستان کے رایان میں سے تھا۔ اس سے اس کے پسر چندر سین کے پاس منتقل ہوا۔ اس نے پریشانی اور ناکامی کے ایام میں اسے رانا اودے سنگھ کے پاس فروخت کر دیا۔ اس سے وہ رانا پرتاپ کو ملا اور رانا امر سنگھ کے پاس پہنچا۔ اس سے بہتر تحفہ اس کے خاندان میں نہ تھا۔ اس نے یہ لعل اپنے تمام ہاتھیوں کے ساتھ جنہیں ہندوؤں کی اصطلاح میں کھبنہ چار کہتے ہیں۔ روز ملازمت ہمارے فرزند اقبالمند بابا خرم کی خدمت میں پیش کیا۔ میں نے حکم دیا کہ اس لعل میں یہ عبارت نقش کر دیں:-

"بہ سلطان خرم در حین ملازمت رانا امر سنگھ پیشکش نمود"

(یعنی رانا امر سنگھ نے سلطان خرم کی خدمت میں حاضری کے وقت یہ لعل نذر کیا)

میں نے کرن کو پنجہزاری ذات اور سوار کے منصب پر سرفراز کیا اور علاوہ ازیں اسے ایک چھوٹی تسبیح جس کے درمیان لعل تھا اور جسے ہندوؤں کی اصطلاح میں سمرن کہتے ہیں عنایت کی۔

خلاصۂ سخن

جہانگیر کے اس مضمون سے حسب ذیل نتائج مترتب ہوتے ہیں۔

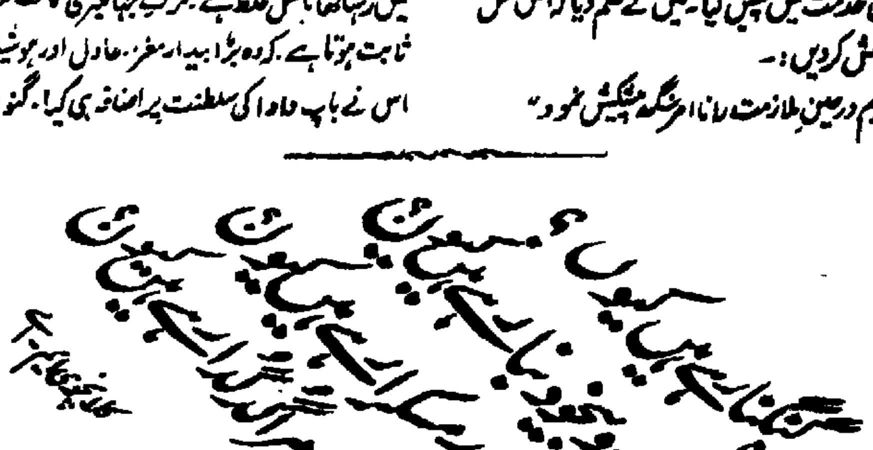
(۱) دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند یعنی ایک ملک کے دو خود مختار بادشاہ نہیں ہو سکتے جو زبردست ہوگا۔ دوسرے کو مطیع کرے گا۔

(۲) عالی وقار بادشاہ قدیمی خاندانوں کو برباد نہیں کرتے۔

(۳) جہانگیر نے امر سنگھ کو مغلوب کر کے جس پیار و اس کے بیٹے پر جو جو نوازشیں کیں وہ اس کی فیاضی، جوانمردی اور عالی وقار ہونے کی بین دلیل ہے۔ علم عرف اور ذہنی فاتح غلبہ حاصل کرنے پر مفتوح قوم کے افراد کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں۔ امر سنگھ اور کرن کے مجسموں کا تو اب پتہ نہیں۔ ہاں قلعہ آگرہ کا جو دروازہ جس سے عام و خاص داخل ہوتے ہیں۔ اب تک اسی (دروازۂ امر سنگھ) کے نام سے مشہور چلا آتا ہے۔

(۴) بادشاہوں کا قاعدہ تھا کہ ان کی خدمت میں جو نذر پیش کی جاتی تھی وہ علی سبیل تبادل اس سے بڑھ کر داد و دہش کرتے تھے جیسا کہ جہانگیر اور امر سنگھ کے معاملے سے ثابت ہوا۔

(۵) جہانگیر کے متعلق یہ جو مشہور کیا گیا ہے۔ کہ وہ ہمیشہ مدہوش رہتا تھا بالکل غلط ہے۔ تزک جہانگیری کا مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ بڑا بیدار مغز، عادل اور ہوشیار شہنشاہ تھا۔ اس نے باپ دادا کی سلطنت پر اضافہ ہی کیا۔ گنوایا نہیں۔



سلطان ٹیپوؒ کی حاکمانہ عظمت

سیاسی حریفوں کے بیانات کی روشنی میں!

از جناب پروفیسر محمد علم الدین سالک ایم۔ اے

شاہانہ دل گردہ

سلطان ٹیپو کی زندگی کا ایک نہایت خوشگوار پہلو اس کی حق پرستی اور عدل گستری بھی ہے۔ یہ دونوں ایسے اوصاف ہیں جو کسی متعصب اور تنگ دل بادشاہ میں پیدا نہیں ہوسکتے۔ سلطان عدل و انصاف کا مجسمہ تھا۔ اس کی معدلت گستری کے افسانے اب تک میسور کے ہندو مسلمانوں کی زبان پر جاری ہیں۔ وہ عدل و انصاف کے معاملہ میں کسی کی رو رعایت نہ کرتا تھا۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے کو ایک غریب دہقان کے کھیت سے زبردستی سبزیاں توڑ لینے پر سخت سزا دی۔ ڈنڈی گل کے قلعے پر حملہ کرتے وقت اس نے یہ حکم دیا کہ قلعہ کے پچھلی طرف سے گولہ باری نہ کی جائے کیونکہ وہاں راجہ کا مندر ہے۔ یہ ایسی باتیں نہیں ہیں کہ ہر شخص سے آسانی کے ساتھ ظہور میں آسکیں۔ ان کے لئے ٹیپو سلطان جیسے شاہانہ دل و گردہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

جب سلطان کے برہمن دیوان کی غداری ظاہر ہو گئی تو سلطنت کے بعض امیروں نے یہ صلاح دی کہ برہمن قوم چونکہ عام طور پر غدار ہوتی ہے۔ اس لئے انہیں قرار واقعی سزا دینی چاہیئے۔ سلطان نے انہیں بیش بہا وظیفے دے رکھے ہیں انہیں ایک قلم موقوف کر دینا چاہیئے۔ سلطان نے یہ سن کر کہا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں ظالم کے سوا کسی دوسرے شخص کو جس کا گناہ ثابت نہیں ہوتا کیسے سزا دوں؟ اس قسم کا اقدام کھلا ہوا ظلم ہے۔ درباری خاموش ہو گئے۔ اور اس کے بعد کبھی اس قسم کا معاملہ سلطان کے سامنے نہ لایا گیا۔

بحری بیڑہ

سلطان نے ہر شہر اور ہر قصبہ میں پنچائتیں مقرر کیں۔ مسلمانوں کے مقدمات کے لئے قاضی نامزد کیئے ان کو خاص طور پر ہدایت دی جاتی تھی کہ وہ کسی وقت اور کسی قیمت پر بھی انصاف کے سر رشتہ کو ہاتھ سے نہ دیں۔

سلطان پہلا بادشاہ ہے جس نے اس بات کو محسوس کیا کہ ہندوستان کی حفاظت کے لئے ایک بیڑے کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس نے سلطنت خداداد کے لئے ایک بیڑہ تیار کیا جو ہندوستان کے ساحل کے علاوہ تمام بحری راستوں کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ اس نے بیڑے کی استقامت کے لئے یہ بھی مناسب خیال کیا کہ بصرہ، بوشہر، عمان، اور عدن کی بندرگاہوں پر اگر اس کا قبضہ نہیں تو کم از کم ان علاقوں پر اس کا عمل دخل ضرور ہونا چاہیئے۔ سلطان کی بحری فوج میں دس ہزار پانچسو بیس ملاح ملازم تھے۔ اس کے پاس بہتر توپوں کا ایک بہت بڑا جہاز تھا جس کے ماتحت بہت چھوٹے جہاز تھے۔ چھیالیس توپوں کا ایک جہاز اور تھا۔ جس کے ماتحت چھیاسٹھ چھوٹے جنگی جہاز تھے۔ بورنگ لکھتا ہے کہ

"اس کی دور بیں آنکھیں یہ بھی دیکھ رہی تھیں کہ اسے ایک زبردست بیڑے کی ضرورت ہے۔ اس نے ایک فرمان جاری کیا جس میں جہازوں کے بنانے کا طریقہ لکڑی کا انتخاب اور بحری فوج کی ترتیب اور ضبط کے متعلق تمام قواعد درج تھے۔ یہ فرمان اتنا مفصل ہے کہ اس میں جزئیات تک بیان کی گئی ہیں۔ اس فرمان کی رو سے بحری محکمہ عالم وجود میں آیا جس میں گیارہ میریم اور تیس میر بحر تھے۔"

تجارتی فروغ

بیڑے کے قیام نے سلطنت خداداد کی تجارت کو بہت فروغ دیا۔ کرنل ولکس میسور کی تجارتی ترقی کو دیکھ کر تعصب سے بے قابو ہو جاتا ہے اور کہتا ہے۔

"سلطان نے اس سلسلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی نقل کی۔"

—— رائس قدرے فراخدلی سے کام لیتا ہوا کہتا ہے۔

"سلطان کا نصب العین یہ تھا کہ ملک کا روپیہ ملک کے اندر رہے۔ باہر نہ رہے۔ وہ یورپ کے تاجروں سے بالعموم اور انگریزی تاجروں سے بالخصوص تجارت کرنا خطرناک خیال کرتا تھا۔ اس نے مال کی درآمد کو بڑی سختی سے روکا اور برآمد پر بھی کسی قدر قیود لگائیں۔"

زرعی ترقی

تجارت کے علاوہ سلطان نے ملک کی زراعت کو بیحد ترقی دی، اس نے زمینداری سلسلے کو ختم کر کے کسانوں کو زمین کا مالک بنا دیا، جس سے کاشتکار آزادی کا سانس لینے لگے۔ اور زرعی پیداوار کے بڑھانے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ سلطان نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ جس زمین سے پیداوار نہ ہو اس زمین سے لگان وصول نہ کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میسور کی زمینیں سونا اگلنے لگیں۔ اور تمام گرد و نواح کی سلطنتیں اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک جرنیل میجر ڈائرم جو تیسری جنگ میسور میں شامل تھا۔ اپنے چشم دید حالات کی بنا پر سلطنت خداداد کی ترقی کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"سلطان ٹیپو نے نظام حکومت کو ایسے طریقہ پر چلایا ہے کہ ملک کا چپہ چپہ آباد ہو گیا ہے۔ وہ زمین جو کاشت ہو سکتی تھی کاشت ہو رہی ہے اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اس کا عسکری نظام اور اس کی فوجوں کی وفاداری جس کا ثبوت بارہا میدان جنگ میں مل چکا ہے۔ اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ رعایا اس سے خوش ہے اور سپاہی اس پر اعتماد کرتے ہیں۔ اور ملک کا نظام حکومت قابل تعریف ہے۔ بادشاہ پر رعایا کو پورا پورا اعتماد ہے۔ وہ ان کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتا ہے۔ اور ان کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے۔ اگر رعایا کے ساتھ اس کا سلوک وحشیانہ یا برا ہوتا تو رعایا اس کی مخالفت میں اٹھ کھڑی ہوتی"

عظمت کا راز

یہ سلطان کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ انتہائی مخالفت اور نفرت کے باوجود اس کا بڑے سے بڑا دشمن اس کی خوبیوں کا معترف ہے، گو ہر مصنف اپنے اپنے خیال کے مطابق اس کی الگ تصویر کھینچتا ہے۔ مگر جب ان تصویروں کو پہلو بہ پہلو رکھا جاتا ہے تو جو چیزیں سب میں مشترک نظر آتی ہیں وہ سلطان کی خداداد شجاعت، انتظامی قابلیت جفاکشی اور رعایا نوازی ہیں۔ یہ باتیں جس شخصیت میں جمع ہو جائیں وہ شخصیت اگر تخت حکومت کی مالک ہو تو اسے ایک کامیاب حکمران، رعایا پرور بادشاہ اور ملک و ملت کا حقیقی خیر خواہ کہا جا سکتا ہے۔ سلطان کی یہ خوبیاں ایسی ہیں کہ دوست دشمن دونوں اس کے حضور میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ اور اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو دوستوں سے زیادہ دشمنوں نے اس کی تعریف کی ہے اور حقیقی عظمت کا راز اسی میں ہے کہ دوستوں کی بجائے عیب چیں دشمن تعریف کریں۔ ہم ذیل میں اس کے چند سیاسی حریفوں کی آراء کے اقتباس پیش کرتے ہیں جن سے سلطان کی حقیقی عظمت کا پتہ چل جائے گا۔

حریفوں کی رائے

مشہور مورخ ای۔ رابرٹس لکھتا ہے۔

"مشرق کی تاریخ میں ٹیپو اپنی وضع کا ایک ہی انسان ہے اس کے اخلاق و عادات میں یہ بات قابل تعریف ہے کہ اس نے مغرب کی سائنس اور سیاست سے کما حقہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کی فطرت میں مشرق کی روایتی قنوطیت نام کو بھی نہ تھی۔ اس کا دماغ ہر وقت مصروف کار رہتا تھا۔ وہ ہر قسم کی طاقتوں کو ایک مرکز پر لا کر مرکزی قوت کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔"

مسٹر بیری کلوز کا قول ہے۔

"اس نے اپنی سلطنت کے تمام محکموں کو سرگرم اور پرجوش مسلمانوں سے بھر دیا تھا۔ پھر بھی وہ تمام طاقت اور حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔" [1]

انتظامی قابلیت

وہ سخت محنت کا عادی اور ہر کام کو اپنے ہاتھ سے کرتا تھا اس کی خط و کتابت بہت ضخیم اور باترتیب تھی یہی وجہ تھی جنگ میسور کے بعد جب انگریزوں نے سرنگاپٹم پر قبضہ کیا تو انہیں یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا

---

[1] ویلزلی ڈسپیچز جلد دوم ص۱۳

کہ اس کے کتب خانے میں سلطنت کے دور کے نوادرات کتنے قیمتی تھے بیداری، حسن انتظام اور ... کتنے باقاعدہ تھے۔ وہ اپنے تمام کارندوں پر انتہائی نگرانی رکھتا۔ مال، فوج اور تجارت کے متعلق ہر شخص کو ہدایات جاری کرتا۔ کوئی چیز اس کے اختیار سے باہر نہ تھی ... رکھتا تھا۔ مختلف علوم و فنون مثلاً ... مذہب اور فن عسکریت پر اسے پورا پورا عبور حاصل تھا۔

اس نے میسور میں کئی اصلاحات نافذ کیں۔ پرانے ضلعوں کو از سر نو مرتب کیا۔ فوج کو ... ڈویژنوں اور ... رجمنٹوں میں تقسیم کیا۔ ... تین حصوں میں تقسیم تھیں۔ باقاعدہ، رضاکار اور ... اس نے نئی وضع کا سکہ جاری کیا۔ بھدے اور بدصورت سکوں کی بجائے خوبصورت سکے رائج کئے۔ ہر قسم کے منشیات کی فروخت قانوناً روک دی۔ نئے نئے اوزان اور پیمانے رائج کئے۔

تجارت کو باقاعدہ اور فائدہ مند بنانے کے لئے سترہ خارجی اور تیس داخلی کارخانے قائم کئے اور نو کمشنر ان کی دیکھ بھال کیلئے مقرر کئے۔ ان کا بورڈ "ملکی بورڈ" کہلاتا تھا۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ ایسی ہدایات جاری کرتے رہیں جن سے سلطنت خداداد کی بری و بحری تجارت خاطر خواہ ترقی کرتی رہے۔ اس نے بنک جاری کئے اور بنک ... کو حکومت کا اجارہ قرار دے کر اعلان کیا کہ جو شخص پانچ سو روپیہ جمع کرائے گا۔ اسے سال کے آخیر میں سات سو پچاس روپیہ دیئے جائینگے۔

ایک سپاہی کی حیثیت سے اس نے بیسوں موقعوں پر اپنی ذاتی شجاعت سے دوسروں کو محو حیرت کیا۔ چنانچہ ہیسٹنگز کی جنگ میں جب وہ کرنل برتھ ویٹ کے خلاف لڑ رہا تھا تو اس کی بہادری دیکھ کر دوست اور دشمن عش عش کر اٹھتے تھے۔ اسی طرح ۱۷۸۶ء کی مرہٹوں کی جنگ میں اور پھر ہیلڈروز کی لڑائی میں وہ مجسم شجاعت بنا بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمن کی صفوں کو چیرنے لگا۔ مگر امیروں کی غداریوں اور سازشوں نے اس کے یہ جوہر چمکنے نہ دیئے۔

حکومت کا ملکہ

جیمز مل کہتا ہے:

"ایک ملکی حکمراں کی حیثیت سے جب اس کا مقابلہ ایشیا کے بڑے بڑے شہزادوں سے کیا جاتا ہے تو اس کی خوبیاں اتنی زیادہ نکلتی ہیں کہ ان کے مقابل میں اس کا پلہ بہت بھاری ہوتا ہے۔ اس کا علاقہ ہی زرخیز علاقہ اور آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کا سب سے گنجان اور ترقی یافتہ علاقہ تھا۔"[1]

سر جان شور اس کی تعریف کرتا ہوا لکھتا ہے۔

"ہم اپنے تجربے کی بنا پر اس کی رعایا کو جانتے ہیں۔ اس کے پاس رازدار ملازم اور نیک مشورہ دینے والے امیر تو موجود ہیں لیکن کوئی بااثر وزیر نہیں۔ اس لئے وہ حکومت کے ہر شعبہ کی دیکھ بھال اور پڑتال خود کرتا ہے اس کے ملک کے دہقان ہر قسم کے ظلم اور تشدد کی دست برد سے محفوظ ہیں۔ انہیں اپنی محنت کا ثمرہ بخوبی مل جاتا ہے اور ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔"

آگے چل کر سر جان شور لکھتے ہیں۔

"اس کے مظالم کی داستانیں بہت ہی مبالغہ آمیز ہیں۔ اس کی رعایا اس کی اطاعت کرتی ہے اور سچے دل سے اس کا احترام کرتی ہے۔ اس کی ریاست کے پشتینی باشندوں میں سے کسی شخص نے جو کسی عہدے پر متمکن تھا یا جو کسی طریقے سے ملک میں اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ ان لڑائیوں میں جو ہمارے ساتھ لڑی گئیں اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔"[2]

ملکی خوشحالی

جب برطانوی سپاہ فاتح کی حیثیت سے اس کے ملک میں داخل ہوئی۔ تو وہ اس کے ملک کی خوشحالی دیکھ کر حیران رہ گئی چنانچہ اس زمانے کے بہترین سیاسی اور فوجی دماغ جو اس کے خلاف برسر پیکار رہے اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"جب کوئی شخص کسی اجنبی ملک سے گزرتا ہوا یہ دیکھتا ہے کہ اس کی زرعی حالت بہتر ہے۔ ملک آباد اور رعایا خوش حال ہے۔ لوگ محنتی اور جفاکش ہیں نئے نئے قصبے اور شہر آباد ہو رہے ہیں۔ تجارت خوب ترقی کر رہی ہے شہروں اور قصبوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ

---

[1] تاریخ ہند از جیمز مل جلد ششم ص ۱۰۵،
[2] مالکم سیاسی تاریخ ہند جلد دوم ترجمہ دوم ص ۱۱۰،

ہوتا ہے۔ غرض ہر چیز میں ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں تو وہ قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اس ملک کی حکومت کو لوگ پسند کرتے ہیں۔ اس کے خلاف کسی قسم کی شکایت نہیں۔ یہی سلطان ٹیپو کے ملک کا حال تھا۔ اس کی طرز حکومت کے متعلق ہمارا بھی یہی خیال ہے۔"

— ڈیروں کا بیان ہے۔

"اس کا ملک ہر طرح سے آباد تھا۔ جو زمین زراعت کے قابل تھی وہ کاشت ہو رہی تھی۔ سپاہیوں کی وفاداری اور فوج کا نظم و نسق بتاتا ہے کہ اس کا فوجی نظام بھی نہایت اعلیٰ اور عمدہ تھا۔ اس کا طرز حکومت گو خود مختارانہ اور سخت تھا لیکن وہ عالی ظرفی اور قابلیت سے خالی نہ تھا۔"

یہ ان لوگوں کے بیانات ہیں جو ٹیپو سلطان کے سخت مخالف اور اس کی جان کے دشمن تھے اور اس کے خلاف بارہا تلوار اٹھا چکے تھے۔ اس لئے ان بیانات میں جو حقائق مضمر ہیں انہیں کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور انہی سے سلطان کی حقیقی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

رابرٹس ہندوستان بعہد ولزلی میں لکھتا ہے۔

"ہندوستان کا کوئی زرخیز سے زرخیز علاقہ کسی یورپین قوت کے خلاف لڑ کر اتنی خوشحالی اور فارغ البالی کا ثبوت نہیں دے سکا۔ جتنا میسور نے کمپنی کے ساتھ تین مرتبہ جنگ کرنے کے بعد دیا۔"

فوجی تربیت

سر ٹامس منرو نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں بہت سی نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ سلطان ٹیپو سے لڑتا رہا ہے۔ اور آخر میں مدراس کا گورنر بھی مقرر ہوا ہے۔ وہ اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر ایک خط میں لکھتا ہے۔

"میسور کی حکومت میں ٹیپو نے طاقت و استحکام کی ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ یہ سلطنت اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ کسی کمزور یا نابالغ حکمران کے ماتحت زوال پذیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے خلاف ہندوؤں کی مرکزی حکومت اور اس کی طاقت سلطنت کے مختلف ارکان کے وقتی رجحانات کے ماتحت ہر لحظہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ وہ کبھی تو اپنے اتحاد سے طاقت حاصل کر لیتے ہیں اور کبھی باہمی اختلافات کی وجہ سے کمزور کر لیتے ہیں۔ ..... میسور کے پاس ایک لاکھ سے زیادہ تنخواہ دار فوج ہے۔ اس فوج کا بہت بڑا حصہ ان غلاموں پر مشتمل ہے جنہیں چیلے کہتے ہیں۔ ان کی تربیت بالکل اسی طریقہ پر ہوتی ہے جس طریقہ پر ترکی جانثاروں کی ہو رہی ہے۔ ان کے علاوہ ٹیپو یورپین فنون حرب اور اس کے اصولوں کو انتہائی سرگرمی سے اختیار کر رہا ہے۔ اس نے اپنے افسروں کی ہدایت کے لئے ایک کتاب شائع کی ہے۔ جس میں فوجی نقل و حرکت کے وہ تمام قواعد درج ہیں جو یورپ میں رائج ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں وہ تمام قاعدے بھی شامل ہیں جو سلطان نے خود ایجاد کئے ہیں۔ اس کتاب میں کوچ، مقام اور جنگ کے متعلق تمام ہدایات جمع ہیں۔"

نظم و نسق

— آگے چل کر سر ٹامس منرو پھر لکھتا ہے۔

"سلطان نے مختلف آئین و ضوابط اور مختلف احکام کے ذریعے سے اپنی رعایا کے ہر طبقہ میں اطاعت یا بہتری نظم اور خبرداری کی ایسی روح پیدا کر دی ہے کہ اسے کبھی ان حوادث سے سابقہ نہیں پڑا جو ایشیا میں جنگوں کی ناکامی کا باعث ہوتے ہیں۔ ..... عام بدنظمی کے اس ہنگامہ میں صرف سلطان ٹیپو کی طاقت ہر قسم کے نقصان اور ابتری سے محفوظ رہی ہے۔ حالانکہ اس کی طاقت کو دبانے کے لئے ہم نے ہر قسم کے معاہدے اور متحدہ کارروائیاں کیں۔"

— ہنری ڈاڈویل سلطان ٹیپو کی صلاحیتوں کی مدح و ستائش کرتا ہوا لکھتا ہے۔

"سلطان کے مقدر میں لکھا تھا کہ وہ تمام عمر ناموافق حالات کا مقابلہ کرتا رہے۔ اسے ورثہ میں ایک عظیم الشان سلطنت ملی تھی جسے برقرار رکھنے کے لئے اس نے بھی وہی وسائل اختیار کئے جو اس کے باپ نے اختیار کئے تھے۔ مگر کئی ایسے موجود پیدا ہو گئے جن سے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی اکثر کوششیں ناموافق حالات کو سازگار بنانے میں صرف ہوئیں۔ ٹیپو صرف زندگی کے حالات سدھارنے آیا تھا میں

بدقسمتی سے [illegible] غیروں کے طرزِ عمل کا وہ زیادہ شکوہ سنج ہے...... ٹیپو کے تمام احسانات اس کے انتظامِ ملک داری سے [illegible] ہیں۔ اس نے زمینداریوں اور جاگیروں کو ختم کر دیا۔ اور اپنی سلطنت میں اس قسم کے تجارتی قوانین نافذ کئے جو کسی کل مذہب ملک کا نصب العین ہیں۔ بیرونی تجارت کو ختم کیا۔ ساہوکارا مٹا دیا۔ اور ان کی جگہ رہائشی کوٹھیاں قائم کیں۔ اگر ٹیپو کی جگہ کوئی اور کم ظرف دل اور ضمیر فروش حکمران ہوتا تو وہ انگریزوں کی اطاعت قبول کر کے اپنا تخت و تاج بچا لیتا مگر ٹیپو کی غیرت نے اس ذلت و رسوائی کو برداشت نہ کیا۔ وہ تمام عمر ناموافق حالات کا مقابلہ کرتا رہا۔ اس نے غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دی اور آزادی کی خاطر لڑتا ہوا مردانہ وار جامِ شہادت نوش کر گیا۔ اگر وہ چاہتا تو بخیت سنگھ کی طرح اپنے آپ کو ہر طرح سے محفوظ و مصئون کر سکتا تھا لیکن اسے اس قسم کی زندگی پسند نہ تھی۔ وہ غیور تھا اور اسے یہ معلوم نہ تھا کہ ویلزلی کو اس کے دلی ارادوں کا پتہ چل چکا ہے۔ ان سب کے علاوہ انگریزوں کی بحری طاقت ٹیپو کے لئے بے حد نقصان دہ تھی۔ ٹیپو انہی طاقتوں میں گھر کر پس گیا۔ جسے وہ نہ سمجھ سکا لیکن درحقیقت اس کی بہادری اس کے دلیرانہ وصف اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی پے در پے کوششیں اس کی تباہی کا باعث بنیں۔

یومیہ پروگرام

سلطان کے کردار اور سیرت کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن سرِدست اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس کے دیگر اوصاف کے متعلق خاص کر اس کے جذبۂ جہاد، اس کی رعایا نوازی، اس کے عدل و انصاف اور اس کی داخلی و خارجی پالیسی۔ ہندوستانی ریاستوں کی طاقت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی سعی۔ بیرونی ممالک سے رشتہ جوڑنے کی کوشش۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مستعمرانہ عزائم کے خلاف موثر اقدام کے متعلق ہم کسی اور موقع پر مفصل بحث کریں گے۔

اس وقت ہم سلطان کا یومیہ پروگرام نہایت اختصار کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ تاکہ سلطان کی زندگی کا نصب العین قارئین کی سمجھ میں آ جائے۔

سلطان ایک سچے مسلمان کی طرح علی الصباح بیدار ہوتا۔ حوائج سے فارغ ہو کر نماز ادا کرتا اور پھر قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہو جاتا۔ اور پورے ایک گھنٹہ تک قرآن پاک کے مطالب و معارف پر غور کرتا۔

اس سے فارغ ہو کر توشہ خانہ میں جاتا اور جواہرات کا معاینہ کرتا۔ اس کام سے فراغت پا کر وہ محل میں آتا اور ناشتہ کرتا۔ اس وقت شہزادے اور میر منشی اس کے ساتھ ہوتے۔ نہایت اہم اور ضروری خطوط و مراسلات کا جواب وہ اسی وقت لکھاتا۔ اس کی مرغوب غذا دودھ اور پھل ہوتے تھے۔ ناشتے کے بعد وہ فوج کے معائنے کے لئے نکلتا اور اپنی فوج کے مختلف دستوں کا معاینہ کرتا۔ فوج کی قواعد دیکھتا۔ آلاتِ حرب کو ملاحظہ کرتا۔ اس ضروری اور اہم کام سے واپس آ کر وہ مختلف محکموں کی رپورٹیں سنتا۔ اس طرح تمام دن سلطنت کے کاموں میں مشغول رہتا تھا۔

رات کے کھانے پر سلطنت کے بڑے بڑے ارکان، شہزادے اور افسر موجود ہوتے تھے۔ کھانے کے دوران میں مختلف ملکی موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ کھانا کھا چکنے کے بعد سلطان کچھ عرصہ چہل قدمی کرتا پھر مطالعہ کتب میں مشغول ہو جاتا۔

سلطان کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ وہ چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں بھی عار نہیں سمجھتا تھا۔ سلطنت کا ہر شعبہ اس کی نظروں میں ہوتا تھا۔ اور اس کا دماغ ہر وقت رعایا اور ملک کی بہتری کے لئے نت نئی تجاویز سوچتا رہتا تھا۔ اگر اسے پر سکون حالات میں دل کی حسرتیں نکالنے کا موقع دیا جاتا تو پتہ نہیں وہ سلطنت خداداد کو کہاں سے کہاں لے جاتا۔

جریان — جوہرِ اعظم — جوانی

جریان یہ بیماری عام طور پر ان لوگوں کو ہوتی ہے جو کھٹائی زیادہ کھاتے ہیں. چائے اور دوسری گرم چیزیں زیادہ کھاتے ہیں تنہائی میں بیٹھکر جوانی کے خیالات پر زیادہ غور کرتے ہیں. ننگی تصویریں دیکھنے کے شوقین ہیں یا جنہوں نے بچپن اور شروع جوانی میں اپنے ہاتھوں ...... جوانی کو خراب کیا ہے. ایسے مرد جریان کے مریض ہو جاتے ہیں اور پھر پیشاب کے وقت دھات گرنے لگتی ہے. قوتِ مردمی ادھوری رہ جاتی ہے. اور کسی خاص خیال کے آتے ہی رطوبت پانی کی طرح گرنے لگتی ہے. اسے کہتے ہیں جریان کا مرض.

جوہرِ اعظم یہ اُس دوا کا نام ہے جسے آجکل سینکڑوں ڈاکٹر جریان کا سب سے زیادہ کامیاب علاج کہتے ہیں اور جریان کے مریضوں کو وہ ہمیشہ "جوہرِ اعظم" دوا سے اچھا کر دیتے ہیں. صرف ایک ہی شیشی ایک مریض کو مرد بنا دیتی ہے. جریان کا عارضہ ختم کر دیتی ہے. اسکے استعمال کے بعد دھات گرنی بند ہو جاتی ہے اور جوانی کی خاص طاقت پھر پیدا ہو جاتی ہے. اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ "جوہرِ اعظم" دوا کی ایک ایک خوراک مریض کو اپنا فائدہ دکھاتی چلی جاتی ہے. یہ ہے "جوہرِ اعظم" دوا.

جوانی جو لوگ جریان کی بیماری کے سبب اپنی جوانی تباہ کر بیٹھے ہیں. ان کیلئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ اگر جریان سے آزادی اور چھٹکارا جلدی حاصل کرنا چاہیں تو دوا "جوہرِ اعظم" کی ایک شیشی بذریعہ وی. پی. پارسل منگا کر استعمال کر لیں. جریان کی بیماری ختم ہو جائیگی. ایک شیشی "جوہرِ اعظم" کی قیمت تین روپے آٹھ آنے ہے. پارسل کا محصول ہندوستانی خریداروں سے نہیں لیا جاتا. اس لئے آپ اطمینان سے دوا پارسل کے ذریعہ منگا لیں. اور گھر بیٹھے جریان ختم کر کے جوانی کا لطف حاصل کریں.

مینیجر زنانہ دواخانہ اے. بی ۲۴ دہلی

تار کا پتہ "زنانہ دواخانہ" دہلی — ٹیلی فون نمبر

منہ مانگی مراد مل سکتی ہے

ناامید ہونا گناہ عظیم ہے اور مایوس ہونا مردوں کا شیوہ نہیں صرف ہمت اور کوشش کریں۔ جس طرح مقدمہ میں کسی لائق وکیل کی ضرورت ہوتی ہے اور بیماری میں حکیم کی شفا و فتح خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ پس اگر آپ کسی بھی مشکل و مصیبت میں مبتلا ہیں اور اس کے حل کی کوئی بھی صورت نظر نہیں آتی تو مشہور و معروف جناب عامل حکیم کریم الدین صاحب کو لکھیے۔ ان کے عملیات روحانی سے مشکلیں حل ہو جاتی ہیں۔ بیماری میں شفا ہوتی ہے۔ مقدمہ میں فتح ہوتی ہے۔ عورت مرد کے ناخوشگوار تعلقات ہوں تو محبت میں بدل جاتے ہیں۔ امتحان میں یقیناً کامیابی ہوتی ہے۔ بشرطیکہ آپ روحانی امداد لیویں۔ ہزارہا بندگان خدا کامیاب ہو چکے ہیں اور علم و عمل کی تعریفیں کر رہے ہیں۔ مشورہ کی فیس معاف لیکن خط و کتابت جوابی بھیجکر مشورہ لیں۔

دیکھئے دنیا کہتی ہے

کہ عامل حکیم کریم الدین طبیب روحانی۔ انارکلی۔ لاہور اپنے علم و عمل میں ماہر ہیں!

جناب محمد باقر صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور حال امرتسر۔ جناب سر مرزا ظفر علی خان صاحب جج ہائیکورٹ لاہور۔ میاں جگدیش سنگھ صاحب درجہ اول مجسٹریٹ دہلی۔ جناب ملک شیر چشتی پیر سکندر ریاست بہاولپور۔ جناب خان بہادر خان محمد خان سب رجسٹرار ریٹائرڈ و آنریری مجسٹریٹ راولپنڈی۔ جناب آغا جعفر ایس ڈی او راولپنڈی حال لاہور۔ جناب ملک نور محمد صاحب پنشنر آئی او ایم کنڈاں ضلع شاہ پور۔ جناب فیض الحق صاحب پنشنڈ سپیشل مجسٹریٹ جیور ضلع بلند شہر ——— علاوہ ازیں لاکھوں افسران و شرفا تحریر فرماتے ہیں کہ عامل حکیم کریم الدین کے علم و عمل کی آزمائش کی آپ اپنے فن میں ماہر ہیں اور نہایت شریف اور ملنسار ہیں۔ آپ بھی ایک مرتبہ آزمائش کر کے حکیم صاحب کی تعریف کریں۔

مینیجر دفتر عامل حکیم کریم الدین۔ انارکلی۔ لاہور

منظومات

دنیا اور انسان

فاعتبروا یا اولی الابصار

از علامہ امجد حیدرآبادی

اک مسافر کسی جنگل سے چلا جاتا تھا
ناگہاں راہ میں اک شیر ژیاں کو دیکھا

چڑھ گیا ایک شجر پر وہیں وہ خوف زدہ
شیر نے دیکھا کہ ہاتھوں سے شکار آکے گیا

ہونٹ چابے کبھی غصے سے دھڑکے مارے
رنج و غم سے نظر آنے لگے دن کو تارے

اور تو سوجھی نہ کچھ، دل میں اس نے ٹھانی
کہ کسی روز تو اترے گا یہ خصم جانی

خون اس کا وہیں کر دوں گا بہا کر پانی
کب تک آخر ملک الموت سے آنا کانی

یہ کہا اور وہیں زیر شجر بیٹھ گیا
خوف کے مارے مسافر کا جگر بیٹھ گیا

ایک ڈالی پہ سہارا لیا بیچارے نے
خوف و دہشت سے جگر ہو گیا ٹکڑے ٹکڑے

جب نہایت ہی کیا بھوک نے مجبور اسے
پھل تو پھل شاخ پہ ظالم نے نہ چھوڑے پتے

ہو گئی شاخ وہ جب برگ و ثمر سے خالی
چاہا کمبخت نے تاکے کوئی اونچی ڈالی

دیکھا، پھن کھولے ہوئے ناگ ہے کالا سر پر
اڑ گئے ہوش، وہیں تخت سلیماں بن کر

تھی نگہ شیر پہ گاہے، کبھی افعی پہ نظر
سچ ہے آتی ہے مصیبت پہ مصیبت اکثر

یک من و بر سر قتل اند پریزادے چند
وائے بر صید، کہ یک باشد و صیادے چند

جان زار اس کی کشاکش میں پھنسی تھی ہیہات
پڑ گئی کیسی الہی نہ کوئی سنگ نہ سات

نہ کہیں بھاگنے کو رہ، نہ کہیں پائے ثبات
تھی حباب لب دریا کی طرح اس کی حیات

سانپ کی شکل کا رہ رہ کے خیال آتا تھا
خوف سے شیر ژیاں کے کبھی ڈر جاتا تھا

اور توڑا فلک پیر نے یہ اس پہ ستم
کہ وہ جس شاخ پہ بیٹھا تھا بچشم پرنم

اس کو دو چوہے کترنے لگے مل کر پیہم
کہیں کٹ جائے جو ڈالی تو گرے بس اک دم

سانپ ادھر تاک میں ہے شیر ادھر منہ کھولے
اور کترتے ہیں الگ شاخ نشیمن چوہے

پھر اسی شاخ پہ اک شہد کا چھتہ پایا
شہد کو دیکھ کے بیچارے کا جی للچایا

مخزن رزق فلاکت میں اسے ہاتھ آیا
جس قدر کھا سکا لے لے کے مزے سے کھایا

اس مسافر نے عجب شہد کی لذت پائی
نیش کا غم نہ رہا دل پہ جو غفلت چھائی

نہ رہا شیر سے کچھ خوف، نہ کچھ سانپ کا ڈر
چوہے تو ڈالی کترتے ہیں، نہیں اس کو خبر

لذتِ شہد میں مصروف رہا شام و سحر — دیکھیں کس روز گرے ٹوٹ کے ڈالی سے ثمر
پھنس گیا شہد میں کمبخت مگس کے مانند — بن گئی شاخِ نشیمن کی قفس کے مانند

اسی حالت میں اسے ایک زمانہ گذرا — ناگہاں سانپ اُترتا ہوا نزدیک آیا
ڈالی کٹنے کو ہوئی شیر نے مُنہ پھیلایا — حیف بیچارے پہ کیا پردۂ غفلت چھایا
تب بھی ان باتوں کا کچھ دھیان نہ آیا اس کو — نفس کے دیوِ لعیں کا ہُوا سایہ اُس کو

ڈس لیا کالے نے آخر اُسے، ٹوٹی ڈالی — گر پڑا نیچے تو بس شیر کے مُنہ میں جا لی
شہد سے دستِ ہوس رہ گئے دونوں خالی — شیر نے ایسا چبایا۔ کہ ہوئی پامالی
اس کو دانتوں سے کیا پیس کے بالکل چُورا — اس کے دل میں تھا جو ارمان، ہوا سب پورا

اب سنو، غور سے اے مال پہ مرنے والو — پاک نا پاک سے اس پیٹ کو بھرنے والو
ساحلِ عمرِ دو روزہ پہ اُترنے والو — اپنے اعمال کی شامت سے نہ ڈرنے والو
آپ بیتی ہے یہ سب غیر کا افسانہ نہیں — قصہ حمزہ نہیں، حالتِ بیگانہ نہیں

وہ مسافر نظر آیا، جو تھا صحرا میں — سمجھو، وہ تم ہی ہو، جو آئے ہو اس دنیا میں
شیر پھر دیکھا اچانک جو اسی اثنا میں — نقشۂ خوف کھنچا مردُمکِ بینا میں
چڑھ گیا شاخ پہ جس ڈر سے مسافر مُضطر — اور یہ مُنہ کھولے ہوئے بیٹھ گیا زیرِ شجر

آپ کچھ سمجھے بھی کیا چیز ہے وہ شیرِ ژیاں — قبر سمجھو، کہ جو ہے منتظرِ ہر انساں
شیر سا قبر بھی ہے کھولے ہوئے اپنا دہاں — کہ کسی روز تو آئے گا یہ جائے گا کہاں
اس کا سب ناز و تبختر نہ بھلا دوں تو سہی — ہڈیاں پیس کے چورا نہ بنا دوں تو سہی

عمر سمجھو اسے جس شاخ پہ اس نے جا لی — ملک الموت ہے وہ سانپ جنابِ عالی
رات دن چوہے ہیں جو کاٹ رہے ہیں ڈالی — شہد کا چھتہ ہے دنیا سببِ پامالی
وائے بر شامتِ اعمال مگس کے مانند — طمعِ شہد میں ہم ہوگئے بالکل پابند

نہ لحد کا کبھی بھولے سے خیال آتا ہے — نفسِ بدکار نہ اعمال سے شرماتا ہے
حلق تک صبح و مسا لقمۂ تر کھاتا ہے — چھوڑ کر دین کو دنیا کی طرف جاتا ہے
پھنس کے دُنیا میں زر و مال کا ہو رہتا ہے — طلبِ جاہ میں کیا کیا غم و ہم سہتا ہے

طمعِ زر، ہوسِ مال کہاں تک بے حد — تا کجا، حرص و ہوا، کین و ریا، بغض و حسد
یاد میں تیری ہے مُنہ کھولے ہوئے قعرِ لحد — جان لینے میں ہے تیری ملک الموت کو کد

رنج بیہودہ مبر بند علائق بگسل
ہمچو ہاروت ممان، در تہِ چاہِ بابل

نغمے کی آگ

نظم

از جناب سید مقبول حسین احمد پوری

کبھی امیدوں سے جا کے اُلجھا تو لی کبھی حسرتوں سے ٹکر
خیالِ شاعر کا نغمہ پیرا ہے کھا کے کون و مکاں کا چکر
سمجھ رہا ہے جنوں کوئی اس کو اور کوئی خرد کی خامی
یہ مرض ہے لا دوا دوامی کسی نے آخر کہا یہ تھک کر
مرے مسیحا نے کم ہی سوچا کہ اس میں ہے کون سا وہ جادو
اثر سے جس کے مرے ہوئے دل بھی واہ کہہ اُٹھتے ہیں پھڑک کر
گذر کبھی مرغزار سے ہو تو پھول بھی آئینگے نظر ڈال
کوئی کھلا کوئی مضمحل اور کوئی بکھرا ہُوا ٹپک کر
نہیں جن آنکھوں میں کچھ بصیرت انھیں بصارت پہ اکتفا ہے
نہ لینگے عبرت ذرا بھی گلشن کے پا فتادوں سے وہ ٹھٹک کر
جو پائیں جھرمٹ میں پتیوں کے دبی ہوئی اک اداس بلبل
تو کہنے والے کہیں گے شاید بہت تھکی یہ چہک چہک کر
مگر وہ کہتے ہیں جس کو شاعر وہ دل میں پائیگا اک خلش سی
جو بن کے کانٹا بتائیگی بھید بے بسی کا کھٹک کھٹک کر
یہ چھیڑ مضراب ہو کے اکدم بجائے گی تارِ غیر فانی
کہ روحِ حُسن سن کے جس کو رہ جائے گی پر اپنے جھٹک جھٹک کر
اُٹھے گا سینے سے وہ دھواں اور لگے گی وہ آگ جان و تن میں
کہ شعلۂ طور برق آسا چمک اُٹھے گا بھڑک بھڑک کر
جلا کے چھوڑے گی جسم و جان ہمنشیں وہ ایسی ہی آگ ہوگی
بجھا نہ پائیں جو دونوں آنکھیں بھی اپنے دریا چھڑک چھڑک کر
جہاں میں آتش نوا ہو کوئی، ہمیں تو مقبولؔ ہے یہ شکوہ
کہ اب تلک اس کے در پہ دیدی نہ جان کیوں سر ٹپک ٹپک کر

تاریخِ صنمخانہ

دشتِ وحشت میں نمائش ہے گریبانوں کی

ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی

خیر ایسے میں ہو کیا سوختہ سامانوں کی
شعلہ ہے شمع کا آغوش ہے پروانوں کی

ہر طرف بیشہ نہ ہو کس لئے دیوانوں کی
دشتِ وحشت میں نمائش ہے گریبانوں کی

میکدے میں کبھی توبہ کو جو آتے دیکھا
ایک دیوار کھڑی ہو گئی پیمانوں کی

کثرتِ یاس نے اس دل کو بھی برباد کیا
جس میں آباد تھی دُنیا ترے ارمانوں کی

کوندنا ابر میں بجلی کا یہ بیکار نہیں!
آج تقدیر چمک جائے گی مے خانوں کی

ہم نے دیکھا نہ سلامت کبھی اِن کا دامن
گُل بھی تقلید کیا کرتے ہیں دیوانوں کی

کون سمجھے گا تری زلفِ گرہ گیر کا راز
ہے یہ اُلجھی ہوئی تقدیر پریشانوں کی

پاؤں ان کے نہیں بے پاؤں چلا کرتے ہیں
یہ کرامت کوئی دیکھے مرے پیمانوں کی

سیکڑوں بیخ ہزاروں مجھے آزار دیئے
کوئی گنتی نہ رہی آپ کے احسانوں کی

حشر میں اور بھی یہ حشر بپا کر دیتے
ہے الگ اس لئے ٹولی ترے دیوانوں کی

حور و غلماں کو تعلق بشریت سے نہیں
موت ہے گلشنِ فردوس میں انسانوں کی

صبح کو محفلِ شب کا یہ نتیجہ دیکھا
شمعِ کشتہ کے قریں خاک تھی پروانوں کی

بڑھ گئے اہلِ جنوں خاک اُڑا کر آگے
دھجیاں رہ گئیں صحرا میں گریبانوں کی

دیکھ اے ساقیٔ محفل وہ گھٹائیں اُٹھیں
رکھ سبیل آج چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

ہم کو جلنے کے لئے ہم کو پگھلنے کے لئے
دل ملا شمع کا قسمت ملی پروانوں کی

گیسوئے حُسن میں پیچ اور پڑے جاتے ہیں
آج ہے سالگرہ عشق کے دیوانوں کی

دیکھ کر دل کو بتا اے مرے دل کے مالک
کس طرح اس میں کھیت ہو گئی ارمانوں کی

عید کا چاند فلک پر نظر آیا بھی نہیں،
کھڑکیاں کھل گئیں پہلے ہی سے میخانوں کی

نوحؔ سے حسن پرستی کے فسانے سنیئے
یہ تو تاریخ مکمل ہیں صنم خانوں کی

سلطان ٹیپو شہیدؒ

نظم

از علامہ محوی صدیقی لکھنوی

عجب وہ شوکتِ مسلم کا کارخانہ تھا — عجب وہ ہمتِ بیباک کا زمانہ تھا
عجب وہ عظمتِ رفتہ کا بھی فسانہ تھا — فلک بھی معترفِ سطوتِ شہانہ تھا
سرِ غرور تھا ٹیپوؒ کا آستانہ تھا

خوشا وہ دور کہ گردش میں تھا عمل کا جام — بغل میں شاہدِ گلفام اور دل خوش کام
ہر ایک موردِ الطاف ساقیٔ گلفام — تجھے خبر بھی ہے اے دورِ گردشِ ایام
زبانِ دہر پہ ٹیپوؒ کا کیا فسانہ تھا

اسی کے ذکر سے ہے آج گرمیٔ محفل — اسی کے ہجر میں ہیں آج اہلِ دل بسمل
اسی کی یاد میں روتے ہیں نازنیں قاتل — اسی کی قبر ہے اک درگاہ جو اے دل
ہلاکِ شیوۂ ناقدریٔ زمانہ تھا

تجھے خبر بھی ہے اے محوِ خوابِ زیرِ خاک — کہ تیری یاد میں ہیں آج کتنے دل غمناک
ترے فراق میں ہیں آج کتنے سینے چاک — کہاں ہے آج ترا جوشِ ہمتِ بیباک!
وہ جوشِ پشتِ عمل کو جو تازیانہ تھا

خدا کی رحمتیں دن رات تجھ پر اے سلطاں — ترے عمل تری شان و وفا پہ ہم قرباں
کہ تو نے ملتِ اسلام کی بڑھائی شاں — یہی یقین ہمارا ہے اور یہی ایماں
کہ ہر قدم تری جرأت کا مخلصانہ تھا

وفا کی راہ میں خود کو مٹا دیا تو نے — فلک کے عزم کو نیچا دکھا دیا تو نے
یقین کا ہمیں رستہ بتا دیا تو نے — زمیں کو زورِ قدم سے ہلا دیا تو نے
خدا گواہ ترا جوشِ بیکرانہ تھا

یہ وقت ہے کہ بڑھائیں قدم اٹھائیں علم — دکھائیں جوشِ عمل اپنا اور زورِ قلم
لیا نہ کام جو ہمت سے مرمٹینگے ہم — دلیلِ راہ ہے ہم کو ترا ہی نقشِ قدم
وہ ہر قدم جو رہِ حق میں والہانہ تھا

۱؎ سرنگاپٹم پایۂ تخت سلطان شہیدؒ

پڑا تھا آنکھوں پہ پردہ اُٹھا دیا تو نے — دلوں میں جوشِ تمنا بڑھا دیا تو نے
جو سو رہے تھے انہیں بھی جگا دیا تو نے — بُتانِ خوف و تغافل کو ڈھا دیا تو نے
جو عزم تھا ترا عزمِ مجاہدانہ تھا

سلام تجھ پہ ہوا اے روحِ تاجدارِ دکن — سلام تجھ پہ ہوا اے حاصلِ بہارِ چمن
سلام تجھ پہ ہوا اے نازشِ کنارِ وطن — سلام تجھ پہ ہوا اے مظہرِ وقارِ کہن
کہ ہر نفس ترا عبرت کا تازیانہ تھا

غزل

وہ خود تڑپ گئے مجھے تڑپا کے رہ گئے!

از حضرت طالب باغپتی

الفاظ چشمِ ناز تک آ آ کے رہ گئے — کہتی تھی کچھ نگاہ وہ شرما کے رہ گئے
دل کو جگر کو روح کو برما کے رہ گئے — وہ خود تڑپ گئے مجھے تڑپا کے رہ گئے
کیا زیرِ لب ادا سے وہ فرما کے رہ گئے — دل کو گمان وعدۂ فردا کے رہ گئے
شکوہ تھا کچھ نگاہ اُٹھائی جھجک گئے — پھر مُسکرا کے ناز سے شرما کے رہ گئے
مفہومِ زیست اک خلشِ ناتمام ہے — تم اس طرح خیال کو برما کے رہ گئے
اب اضطرابِ قلب کو میں کیا جواب دوں؟ — کمبخت نامہ بر بھی وہیں جا کے رہ گئے

طالب مری خلش کا مُداوا نہ ہو سکا
احباب و چارہ ساز بھی سمجھا کے رہ گئے

زرمیہ حسن و عشق

نظم

از حضرت شفق رضوی مینائی

پھر نکل آئے ہوا کھانے کو مہکش سر کھلے ۔ لاکلید فتح ساقی میکدے کا ڈر کھلے
پھر مری تیغ زباں سے طبع کا جوہر کھلے ۔ بزم میں پھر رزم حسن و عشق کا دفتر کھلے

پھر قلمرو نظم کی ہو زیر فرمان قلم
پھر مہم ہو جائے سر ہاتھ آئے میدان قلم

جام مینائی سے ہو کر مست مینائے سخن ۔ رشک صہبائی ہو میرا کیف صہبائے سخن
صفحہ ہو آئینہ رخسار سلمائے سخن ۔ خامہ ہو شانہ کش گیسوئے لیلائے سخن

مانی و بہزاد بھی ہوں دنگ وہ نقشا کھنچے
حسن کی تصویر اترے عشق کا خاکا کھنچے

نظم میں اس رزم کا کیا ذکر چھیڑوں بے محل ۔ جس سے برپا ہے نظام نظم عالم میں خلل
جس سے جیتی جاگتی دنیا ہے پامال اجل ۔ بن گئی ہے جنگ جوع الارض قہر لم یزل

رزمگاہ حسن کا سامان ہی کچھ اور ہے
عشق کا مارا ہوا میدان ہی کچھ اور ہے

حسن کی ہے وہ نگاہ اولیں اعلان جنگ ۔ جس پہ قربانی کو حاضر سر بکف مردان جنگ
معرکہ ہے اور اس کا اور ہی میدان جنگ ۔ اسلحے ہیں اور اس نے اور ہی سامان جنگ

زلف مشکیں سے شہ چین و ختن کو دے شکست
لعل رنگیں سے بدخشان و یمن کو دے شکست

حسن کا ایک ایک حملہ وہ بلائے ناگہاں ۔ ہو پسپا لاتک پسپا لئے فوج گراں
توڑ نازک اسلحوں کا الحفیظ و الاماں ۔ تیر پلکوں کے سناں غمزوں کی ابرو کی کماں

دفعتہ آنکھیں لڑیں جنگ آزمائی ٹھن گئی
دو صفیں گتھ گتھ گئیں باہم لڑائی ٹھن گئی

حسن کا دعویٰ خدائی بھر کا میں ہوں بادشاہ ۔ عشق کی یہ بحث ملک دل ہے میری تختگاہ
دونوں ہی مخلوق پر آفت ہیں خالق کی پناہ ۔ حشر سے پہلے قیامت ڈھائیں دنیا ہو تباہ

حسن کی اک اک ادا کر دینے کو نازل قضا

عشق پابندِ رضا کہہ کر رضینا بالقضا

حسن کہتا ہے عدم میں مڑ کے دیکھوں اک نظر   انقلاب آجائے بحر و بر ہوں سب زیر و زبر
سطحِ ارضی پر کہاں پہنچا نہیں میرا اثر   ہوگیا دنیا میں کیا اے عشق تجھ کو ہے خبر
بے پناہ دل بے سر و بے ساز و ساماں ہوگئے
شہر خالی، ملک ویراں، گھر بیاباں ہوگئے

میں ہوں وہ کشورستاں شاہوں سے بھی لیتا ہوں باج   نذر کے بدلے دیتے ہیں سر جو نہیں دیتے خراج
ملک میں ہر ملک ہے ہر راج میرا ہی ہے راج   تختِ کسریٰ تخت میرا تاج قیصر میرا تاج
جھکتے ہیں لاکھوں کے سر جن کی سلامی کے لئے
میرے در پر بستے ہیں حاضر غلامی کے لئے

شاعروں کو لیلیٰ و شیریں کے قصے یاد ہیں   قیس میرے ہیں ہزاروں سیکڑوں فرہاد ہیں
داد فریاد ان کی کیا جو خوگرِ بیداد ہیں   میرے قیدی ایسے بندے بھی ہیں جو آزاد ہیں
مشرق و مغرب بندھے ہیں تارِ گیسو میں مرے
چین بھی جاپان بھی ہیں چینِ ابرو میں مرے

عشق بول اٹھا سخن سازی میں ہے تجھ کو کمال   شاعری یا ساحری ہے شعر یا سحرِ حلال
میں نے تو سمجھا تھا تجھ کو مظہرِ شانِ جمال   تو نے گرما کر دکھایا جلوۂ قہرِ جلال
جابروں کو تو کرے مجبور بھی ناچار بھی
یاد رکھ تجھ سے بڑا جابر ہے اک جبار بھی

توبہ توبہ سر اٹھاتے ہیں جو خود بیں خود پرست   شکلِ فوارہ اٹھا کر سر وہ ہو جاتے ہیں پست
میرے ہاتھوں ہے ازل سے اس کا پورا بندوبست   ملکِ دل ہے نام جس کا فتح ہے جس کی شکست
دل کے آگے سرنگوں ہر قصر ہر کاشانہ ہے
ٹوٹ کر کعبہ جو بنتا ہے یہ وہ بتخانہ ہے

ہو کے بت اے حسنِ بے پروا خدا بنتا ہے تو   بندگی سے دور نافرمان بندہ کیا ہے تو
اپنے منہ تعریف اپنی خوب کی اچھا ہے تو   جانتے ہیں جاننے والے تجھے جیسا ہے تو
تجھ کو اپنی صنعتِ افسونگری پر ناز ہے
دیکھ! میرے نام کے ہر حرف میں اعجاز ہے

نکتے ہیں نقطوں میں میرے لفظ معنی دار ہوں   عین سے عشاق کی صف کا علمبردار ہوں
شین شاہد ہے شہیدِ امتِ غمخوار ہوں   قاف سے قربانِ قوم و ملتِ ابرار ہوں

صرف دو حرفوں سے لفظوں میں جدا رہتا ہوں میں
ورنہ ہمدم بن کے ہر معشوق کا رہتا ہوں میں

عشق میرا نام ہے میں ہوں وہ شاہِ بے سپاہ — ہیں نشانِ فوج میرے نالہ و فریاد و آہ
دل ہے ارمانوں کا کاشانہ مری جائے پناہ — جا [illegible] ہے تو بھرے گھر کو کرے دم میں تباہ

لے کہیں بدلہ نہ تیرا [illegible] آسماں
سینہ سپر [illegible] نہ سر پر آسماں

جو فرشتہ خو ہیں وہ ڈبتے نہیں شیطان سے — جن بھی لڑ کر جیتنے پائے کہاں انسان سے
تو لڑے گا اسلحے سے ساز سے ساماں سے — ہم بہادر لڑنے والے لڑ مریں گے جان سے

زندہ ہے عالم میں اُن کے دم سے نامِ زندگی
ہے فنا جن کی بقا، مرنا پیامِ زندگی

سیم و زر لعل و گہر تیرے خزانے میں ہیں — داغِ دل، داغِ جگر ہیں میرے دینار و درم
ہمنشیں ہیں تیرے عیش و عشرت و ناز و نعم — ہیں مرے ہمدرد درد و حسرت و رنج و الم

منعم و مفلس شہنشاہ و گدا کا فرق ہے
مجھ میں تجھ میں مالدار و بے نوا کا فرق ہے

تو نے سمجھا ہے مجھے جس فرق پر زار و حقیر — ان پہ روشن ہے جو بینا کار ہیں روشن ضمیر
بوریا والے ہوں یا ہوں صاحبِ تاج و سریر — ایک مولد ایک مسکن ایک دونوں کا خمیر

تخت والے قبر کے تختوں کے نیچے آج ہیں،
تاج والے تک چراغِ گور کے محتاج ہیں

مان لوں اے حسنِ دنیا پر ہو تیرا اقتدار — تختِ شاہی پر براجے بن کے نامی تاجدار
ہے جہانگیری لئے نورِ جہاں زیرِ مزار — چادرِ گل کے عوض اک بیت یہ ہے پردہ دار

"بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نہ گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے"

کر کے طے دم بھر میں حسن و عشق کا جھگڑا شفیق — رزمیہ تیرا یہ عبرت نامہ ہے گویا شفیق
صفحۂ ہستی ہی کا تو نے ورق الٹا شفیق — اہلِ دنیا کو دکھا دی اک نئی دنیا شفیق

خاتمہ بالخیر ہے یہ قولِ سعدی مستند
"آنکہ جنگ آرد بخونِ خویش بازی میکند"

جب سب طرف سے مایوسی ہو جائے

اور

تمام کوششیں بے کار ہو جائیں

تو مندرجہ نقش و تعویذ سے کام لیجئے یہ میرا وہ سرمایہ ہے جس کے حاصل کرنے میں میں نے ہزاروں روپیہ صرف کر دیا تھا اور برسوں محنت کی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد راز ہائے سربستہ کو چھپا کر رکھنا فرض سمجھتا تھا مگر ضرورتمندوں نے مجھ کو مجبور کیا کہ کیوں نہ خلق خدا کو اس گوہر گرانمایہ یعنی کلام الٰہی کی برکت سے مالا مال کیا جائے اسلئے میں بے کم و کاست آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کئے دیتا ہوں کہ مندرجہ ذیل نقش و تعویذ کبھی ناکامی نہ ہوگی میں چند پیسوں کی خاطر اپنے ایمان کو فروخت نہیں کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ ہر ایک مالدار قول کو سچا سمجھ کر ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور کامیابی کے بعد فقیر کے لئے دعائے خیر کرینگے تعویذ نقش حسب ذیل ہیں جن کا ہدیہ بہت قلیل ہے اور یہ تمام لفافہ کے اندر بذریعہ وی پی رجسٹری کرکے روانہ کئے جاتے ہیں۔ ہدیہ کے علاوہ رجسٹری لفافہ کا خرچ ۴ روپے ہوتا ہے

نقش بشارت یہ نقش ہر کام کی کامیابی اور ناکامی کی بشارت دیتا ہے رات کو اپنے سرہانے رکھ کر سو جاؤ اور کام کا تصور دل میں رکھو سوتے وقت میں بشارت ہو جائیگی بابت شادی، مریض کی بیماری، تجارت میں کامیابی ناکامی غرضیکہ اسکا مکمل خواب میں جواب دیدیتا ہے ہدیہ ایک روپیہ آٹھ آنے ۱۸/

تعویذ دولت مفلسی میں خدا ہی یاد آتا ہے۔ خدا کسی کو مفلس نہ کرے۔ مفلسی دور ہونے کی جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئے یا روپے کی ترقی رک جائے تو اس متبرک تعویذ کی مدد سے آپکی مفلسی دور ہو گی روپے پیسے میں رکھ دینے سے دولت کی زیادتی ہوگی اور غیب سے ایسے آمدنی کے ذرائع پیدا ہونگے بس خدا کی قدرت نظر آئیگی۔ ہدیہ ایک روپیہ چار آنہ (۱۴؍)

محبت کی ڈوری میرے بزرگ نے صرف مجھ کو اجازت دی تھی کہ یہ ایسے ضرورتمندوں کو دی جائے جو جائز طور پر طلب کریں اسلئے اس محبت کی ڈوری کو ضرورتمندوں کے لئے پیش کر رہا ہوں کہ اگر کسی کی اپنی شوہر سے لڑائی رہتی ہو یا شوہر کی طبیعت بیوی کی طرف سے ہٹی ہوئی ہو۔ بیوی سے ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا ہوتا ہو تو یہ تعویذ آپس کی محبت بڑھانے میں محبت کی زنجیر ثابت ہوگا چند ہی دن میں سارے جھگڑے ختم ہو کر شوہر بیوی کا غلام بن جائے گا یہ خدا کے کلام اور اس کے مقرب بندوں کی برکت ہے کہ جائز محبت کے وقت اس تعویذ معظم کی برقی قوت اپنا اثر دکھاتی ہے اور ضرور کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ ہدیہ صرف ڈھائی روپے (۲؍۸)

اقرار نامہ ضرورتمندوں کو یہ اقرار کرنا ہوگا کہ میں اپنے سوا کسی دوسرے کو اس نقش و تعویذ کے استعمال کی ترکیب یا نقل نہ بتلاؤں گا اور ہدایتوں پر عمل کروں گا۔

نواب میاں شاہ صاحب "چھتہ حکیم آغا جان" (ع ۔ ل) دہلی

مصلحت

مجھے بھول جانا مجھے بھول جانا
بدلتا نظر آ رہا ہے زمانا
تمھیں میری سوگند ملنے نہ آنا
یہیں ختم کر دو تم اب فسانا
مجھے بھول جانا، مجھے بھول جانا

محبت کو اپنی نظر ہو گئی ہے
بکھر کر خوشی دربدر ہو گئی ہے
مرے دشمنوں کو خبر ہو گئی ہے
ٹہلتے ہوئے اب ادھر تم نہ آنا
مجھے بھولجانا، مجھے بھولجانا

مجھے چھوڑ کر تم کو کلفت تو ہو گی
صعوبت تو ہو گی مصیبت تو ہو گی
مجھے بھولنے میں اذیت تو ہو گی
مگر اس اذیت سے گھبرا نہ جانا
مجھے بھولجانا، مجھے بھول جانا

نگاہوں کا مرکز کوئی اور ہوا اب
کسی اور ہی جام کا دور ہوا اب
نیا رنگ ہوا اب نیا طور ہوا اب
کسی اور سے اب دل اپنا لگانا
مجھے بھول جانا مجھے بھول جانا

خمسہ

از جناب علی احمد بی۔ اے

وفا کر سکی میں نہ اپنی محبت
کسی اور کے ہاتھ تھی میری قسمت
ہے اُف کتنی مجبور مجبور عورت
میں کمزور ہوں اور قوی ہے زمانا
مجھے بھول جانا، مجھے بھول جانا

خدا کے لئے مان لو میرا کہنا
مری فکر میں میرے غم میں نہ رہنا
سمجھنا کہ تھی ہی نہیں کوئی شہنا
سمجھنا کہ اک خواب تھا یہ زمانا
مجھے بھول جانا، مجھے بھول جانا

مری بیوفائی کا چرچا نہ کرنا
نہ کرنا خدارا تم ایسا نہ کرنا
مری اس ہزیمت کو رسوا نہ کرنا
جہاں تک ہو یہ راز لب تک نہ لانا
مجھے بھول جانا، مجھے بھول جانا

اسلام اور تلوار

تاریخ اسلام کا ایک واقعہ

از حضرت خلیق برہانپوری

غزوۂ شام میں اک قوم نصاریٰ کا سفیر فوج مسلم میں لئے آیا تھا کوئی پیغام
وقتِ مغرب تھا وہ لشکر میں ہوا جب داخل طاعتِ حق میں تھے مصروف مسلمان تمام
سادگی اور مساوات کی تھی شان عیاں، ایک ہی صف میں تھے استادہ خواص اور عوام
دیکھ کر بندگیٔ حق کا نظارہ یہ خلیق دل پہ قائم ہوا اس شخص کے اک نقشِ دوام
جب عبادت سے ہوئے سارے مسلماں فارغ بڑھ کے اک فرد سے اُس نے کیا اس طرح کلام
چاہتا ہوں کہ ملوں آپ کے سردار سے میں کہ مجھے افسرِ رومی کا سُنانا ہے پیام
بوعبیدہؓ کے قریب اُس کو گئے لے کے عرب آپ تھے منتخب اک افسرِ فوجِ اسلام
دیکے پیغام یہ کہنے لگا عیسائی سفیر چاہتا ہے کہ مسلمان ہو خدمت میں غلام
بوعبیدہؓ نے پڑھایا کلمہ اُس کو وہیں اور فرمانے لگے اس سے کہ اے نیک انجام
اپنے لشکر میں چلے جاؤ پیامی ہو تم کہدو افسر سے کہ کر آیا ہوں میں اپنا کام
الغرض ہو کے مسلماں ہوا رخصت وہ سفیر تشنہ کام آیا تھا پی کر گیا توحید کا جام

دل میں اپنے ذرا غور کریں وہ اصحاب
جو یہ کہتے ہیں کہ تلوار سے پھیلا اسلام

زمزمۂ بہار

بہار آئی کھلے گل میکدے جانے کے دن آئے

از مولوی اظہر امرتسری

بہار آئی، ایاغ و جام چھلکانے کے دن آئے　　جوانی کو مئے و ساقی سے بہلانے کے دن آئے
نمازِ فجر تک ہنگامہ آرائی کی رُت آئی　　عشا کے بعد چھپ کر میکدے جانے کے دن آئے
تکلف، احتیاط و وضعداری کا خدا حافظ　　مرے پینے پلانے، ناچنے گانے کے دن آئے
بنا ڈالا ہے دُنیا کو بھی جنت موسمِ گُل نے　　کہو واعظ سے اب کوثر کی پلوانے کے دن آئے
خدا جانے حجابِ حُسن کا انجام کیا ہوگا　　مرے بیباک ہونے ان کے شرمانے کے دن آئے
ہُوا پُرکار دہقاں زادیوں کا حُسنِ سادہ بھی　　جوانی کے نشے میں "ماہیا"[۱] گانے کے دن آئے
حدیثِ حُسن و مشتاقی کے دُہرانے کی رُت آئی　　کسی روٹھے ہوئے کو پھر منا لانے کے دن آئے
سلام اے اہلِ مسجد، الوداع اے طاعت و تقویٰ　　بہار آئی، کھلے گُل، میکدے جانے کے دن آئے
وفورِ شوق سے خلوت میں آ کُھل کھیلنے والے　　عدو کے سامنے جلوت میں شرمانے کے دن آئے
حسینِ نوجواں ہے اور جامِ بادۂ کہنہ　　بڑھاپے کو جوانی کی طرف لانے کے دن آئے
بنایا ترجماں آنکھوں کو اپنا جذبۂ دل نے　　نگاہوں سے رموزِ شوق سمجھانے کے دن آئے

کہی کیا ہی پتے کی اظہرِ میکش نے واعظ سے
مرے پینے کے دن آئے، ترے کھانے کے دن آئے

[۱] پنجاب کا ایک دیہاتی گیت

بہت ضروری اعلان

اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا

ہم ذیلے کی چوٹ اعلان کرتے ہیں کہ مندرجہ ذیل ادویات ویدک یونانی پستکوں کے مطابق نہایت محنت و کوشش سے خالص اعتماد سے بنائی گئی ہیں۔ عدہزاروں مریضوں پر استعمال ہو کر مجرب ثابت ہو چکی ہیں۔ جو لوگ ہر طرف سے مایوس ہو چکے ہیں آخری مرتبہ ہماری ادویات ضرور استعمال کریں۔ ایک نسخہ کا تجربہ آپ کو ہمارا مستقل گاہک بنا دیگا۔ اگر فائدہ مند ثابت نہ ہوں تو دام واپس کرنے کی گارنٹی

اصلی امساک کی گولیاں

یہ گولیاں امساک کیلئے لاجواب و بالکل بے ضرر ہیں صرف ضرورت ایک گھنٹہ پہلے صرف ایک گولی کھانے سے اسقدر امساک پیدا ہو جاتا ہے کہ جب تک کھٹی چیز نہ کھائی جائے امساک برابر قائم رہے گا۔ عقلمندوں کو اشارہ کافی ہے قیمت ۱۲ گولی ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱/۸ ۳۰ گولی دو روپے۔ فائدہ نہ ہو تو دام واپس۔

طاقت کی شاہی گولیاں

اس دوائی کے استعمال سے قوت جسمانی میں غضب کی طاقت پیدا ہوتی ہے کمزور اور گیا گذرا آدمی بھی پہلوان بن جاتا ہے سستی کمزوری۔ کاہلی۔ تھکاوٹ۔ جریان۔ احتلام۔ دل دھڑکنا وغیرہ جملہ امراض ان کے استعمال سے شرطیہ طور پر دور ہو جاتے ہیں۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱/۸ تین شیشی چار روپے ۴/-

تولادی پاؤڈر

اگر عمر بھر میں کبھی جریان ہو جائے یا زیادتی۔ رات کا اخراج ہو۔ پیشاب سے پہلے یا بعد قطرے گرتے ہوں۔ سفید یا زرد قطرے خارج ہوتے ہوں۔ کمر میں درد۔ جسمانی طاقت زائل ہو چکی ہو۔ مردمی نام کو نہ رہی ہو۔ وقت سے پہلے فراغت ہو جاتی ہو۔ تولادی پاؤڈر کے استعمال سے دھات گاڑھی بلکہ پتھر کی مانند سخت ہو جائیگی اور جلدی فراغت نہ ہوگی۔ قیمت فی بکس ۲۱ خوراک ایک روپیہ پندرہ آنہ ۱/۱۵

بال عمر بھر نہیں آئینگے

صرف دو تین مرتبہ لگانے سے بال اگنے ہمیشہ کیلئے بند ہو جاتے ہیں اور پھر عمر بھر نہیں اگتے۔ دوائی لگا کر صرف غسل ہی کرنا ہے جلد نرم و ملائم ہو جاتی ہے۔ بہت اعلیٰ چیز ہے ضرور آزمائش کریں۔ قیمت فی بوتل پندرہ آنے ۱۵/ دو بوتل صرف ایک روپیہ آٹھ آنے ۱/۸

ممیرے کا سرمہ

دھندہ جالا۔ غبار۔ رتوندہ۔ آشوب چشم۔ سرخی۔ پھولا۔ کم دیکھنا وغیرہ دور کر کے آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کرتا ہے اور نئی روشنی بخشتا ہے۔ قیمت فی شیشی صرف پندرہ آنے ۱۵/ تین شیشی صرف دو روپیہ چار آنہ ۲/۴

کیا حمل سے یقیناً لڑکا ہی پیدا کیا جا سکتا ہے؟

بہت سے لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ خدا نے پیدائش اور موت اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ سنکھیا کھانے سے آدمی مر جاتا ہے تو خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے کیا حمل ٹھہرانا یا حمل سے لڑکا ہی پیدا ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ چونکہ تجربہ سے ہم نے ایسی دوائی دریافت کر لی ہے جسکی صرف ایک گولی کو کھلانے سے

یقیناً لڑکا ہی پیدا ہوگا!

اور اس دوائی کا ایسے لوگوں پر تجربہ کیا گیا ہے جنکے متواتر چھ سات سات لڑکیاں ہی ہوتی تھیں۔ اس دوائی کے کھلانے سے انکے بھی ہر بار لڑکا ہی پیدا ہوتا ہے ہم دس سال سے اس کا تجربہ کر رہے ہیں اور ملک کے ہر حصے میں اس کی آزمائش کرنے والے موجود ہیں۔

اگر لڑکا نہ ہو تو

حلفیہ لکھ دینا کافی ہے کہ لڑکی ہوئی ہے بحلف لکھتے ہیں کہ اس کی قیمت واپس کر دی جائیگی قیمت صرف چھ روپیہ پندرہ آنہ

اصلی روغن جوانی رجسٹرڈ

اس روغن کے استعمال سے بیماری یا کسی اور وجہ سے ڈھلکے ہوئے پستان سخت ہو جاتے ہیں اور اپنی اصلی حالت پر آ جاتے ہیں عورت کی خوبصورتی قائم ہو جاتی ہے۔ تجربہ شرط ہے قیمت فی شیشی ایک روپیہ چودہ آنہ ۱/۱۴

کالے گورے ہو گئے

اگر آپ اپنے جسم کا رنگ بے حد گورا کرنا چاہتے ہیں یا آپ کا چہرہ بہت بدنما داغ کیل اور مہاسوں سے پر ہے اور گورا رنگ کی خواہش رکھتے ہیں تو ہمارا سائنٹیفک اصولوں پر تیار کردہ ولنڈن کی ہوئی کریم استعمال کریں جس سے چہرے جسم کا رنگ شرطیہ سیاہ سے گورا ہو جائیگا۔ قیمت فی بوتل صرف پندرہ آنے ۱۵/ تین بوتل مع خرچ صرف دو روپے آٹھ آنے ۲/۸

دوسری شادی

اس جادو کے سفوف کی صرف ایک چٹکی وقت ضرورت عورت کو استعمال کرا کے شب اول کا لطف حاصل کریں۔ پچاس سالہ بوڑھی عورت کو مانند پندرہ سالہ نوجوان لڑکی بنا دیتا ہے۔ آپ کیلئے یہ نایاب تحفہ نہایت مجرب ہے۔ قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ ۱/۸

برف جیسے سفید بالوں کو سیاہ کرنے والا

اصلی کالا تیل رجسٹرڈ

معجزاول

اس بال کالا تیل کے استعمال سے بال ہمیشہ کیلئے کالے ہو جاتے ہیں اور پھر تمام عمر کالے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ بے نظیر سیاہی بخشتا ہے۔ ہونے ہاتھ پاؤں دوسری دوکانوں سے ٹھیکا قیمت فی شیشی بڑی صرف ایک روپیہ چار آنہ ۱/۴ تین شیشی رعایتی قیمت دو روپے چودہ آنے ۲/۱۴

نوٹ:۔ غلط ثابت ہو تو قیمت واپس

اصلی بادشاہی طلاء رجسٹرڈ

جن لوگوں نے بچپن کی غلط کاریوں میں پھنس کر اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیا اور زندہ درگور ہو گئے ہیں وہ ہماری اس بادشاہی طلاء رجسٹرڈ کو استعمال کریں۔ اسکی چند روزہ مالش سے ستی شدہ رگوں پٹھوں کی کمزوری دور ہو کر پہلے سے زیادہ طاقت آ جاتی ہے اور انسان لوہے کی لاٹھ بن جاتا ہے قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ پندرہ آنہ

عورتوں کی دوائی

عورتوں کے رحم سے سفید رطوبت کا گرنا جسکو لیکوریا کہتے ہیں۔ اس سے دل کا دھڑکنا۔ سر چکرانا اور درد کرنا۔ درد کمر۔ ہونٹ خشک ہونا۔ بھوک کم لگنا۔ غشی کا ہونا۔ سستی کا بڑھنا اور حرارت کا رہنا بلکہ آخری نتیجہ اس کا تپ دق ہو جاتا ہے۔ یہ دوا بہت مجرب ہے۔ تین ہفتہ میں مرض کو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہے قیمت تین ہفتے کی دوا ایک روپیہ چودہ آنہ ۱/۱۴

نامردی کی مشہور دوا رجسٹرڈ

نامردی خواہ کسی قسم کی کیوں نہ ہو۔ طاقت مردمی نام کی نہ رہی ہو۔ تو خدا کے فضل سے یہ دوا رات بھر میں آپ کو طاقتور بنا دے گی۔ غلط ثابت ہونے پر قیمت واپس کر دی جائیگی یہ دوائی خاص طور پر فیض رساں ہے۔ قیمت رعایتی صرف ایک روپیہ پندرہ آنہ ۱/۱۵ وی۔ پی طلب کریں۔

دوائیں ملنے کا پتہ:۔ سکھ ایک کمپنی برانڈرتھ روڈ (ایم ایل) لاہور

عظمتِ رفتہ

اسلامی ثقافت کے اولین مشعل بردار

نوشتہ: علامہ ثقۃ الاسلام
ترجمہ حافظ سید رشید احمد ارشد
(مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل)

علامہ ثقۃ الاسلام وسط ایشیا کے شہر باکو کے مشہور مجاہد عالم باعمل تھے جنہوں نے اپنی حق گوئی اور اسلامی خدمات کے سلسلے میں جلاوطنی کی تکالیف بھی برداشت کی تھیں اور آخر عمر میں وہ ہندوستان میں مقیم رہے تھے۔ انہوں نے اسلامی عروج و زوال پر فارسی زبان میں ایک مختصر رسالہ تحریر کیا تھا جس کا نام "عبرت دیروز و ذلت امروز" ہے جس میں اسلامی عروج کی داستان بیان کرتے ہوئے انہوں نے اسلامی تمدن و تہذیب کا موجودہ ترقی یافتہ ملکوں سے مقابلہ کیا تھا اور اس کے بعد مسلمانوں کے زوال کا دردناک نقشہ کھینچتے ہوئے ان کی شاندار ماضی کا ان کی موجودہ حالت سے موازنہ کیا گیا ہے۔ اسی کتاب کے چند ابواب کا مختصر ترجمہ ہم قارئین کرام کے پیش کرتے ہیں۔ ان ابواب میں اسلامی تاریخ کے واقعات کو جدید رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ (ارشد)

مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات اور شرعی احکام کی اس طرح نشر و اشاعت کی کہ تھوڑے ہی عرصے میں دس کروڑ مشرک اور عیسائی برضا و رغبت دین اسلام میں داخل ہو گئے۔ اور دنیا کا ہر حصہ ان کے نعرۂ تکبیر اور کلمۂ توحید و رسالت سے گونجنے لگا اور کوئی براعظم یا کوئی جزیرہ اور دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہ رہا جس کو انہوں نے فتح نہ کیا ہو یا وہاں مسلمانوں کا قدم نہ پہنچا ہو۔ چنانچہ مسلمان مشرق میں دیوار چین تک اور مغرب میں بحر اوقیانوس تک اور جنوب میں بحر عمان اور عدن سے آگے افریقہ کے انتہائی جنوبی جزیرۂ مڈغاسکر تک چھائے ہوئے تھے۔ وہ بحر و بر پر قابض اور یورپ سے دوگنا قطعۂ زمین کے مالک تھے۔ اور اسی وجہ سے یورپ کی حکومتیں ان کے ایک گوشۂ التفات اور محض خط و کتابت کو اپنے لئے مایۂ صد انبساط و افتخار سمجھتی تھیں۔

اسلامی حکومتوں کا وسیع مالی نظام

اسلامی حکومتیں اقتصادی حیثیت سے بھی دنیا کی پیشرو تھیں چنانچہ مامون کے زمانے میں سرکاری اخراجات نکال کر جن میں فوج، وزراء، حکام قاضیوں اور اعلیٰ عہدیداروں اور افسروں کی تنخواہیں، شعرا، فقرا اور علما کے وظائف اور عطیے، سرحدی حفاظت، فتوحات، جنگی اخراجات شاہی خاندان کا ذاتی خرچ وغیرہ سب شامل تھے تین سو پچاس ملین فرانک فاضل بچ رہتے تھے جنہیں مسلمانوں کے بیت المال میں محفوظ رکھا جاتا تھا۔ مگر آج کل انگریزی حکومت جو اپنے ذرائع آمدنی کے لحاظ سے دوسری حکومتوں کی بہ نسبت مستحکم بنیادوں پر قائم ہے ۸ کروڑ ۱۳ لاکھ عثمانی پونڈ کی مقروض ہے (یہ حساب اور اعداد و شمار ترکی پونڈ کے لحاظ سے غالباً نصف صدی پیشتر کے ہیں (ارشد)) روسی حکومت بھی اسی قدر مقروض ہے حالانکہ وہ بھی بڑی طاقت کے لحاظ سے دنیا کی زبردست سلطنت سمجھی جاتی ہے۔ ع

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

علوم و فنون

مسلمانوں نے علوم و فنون کو بھی بہت ترقی دی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی علمی ضیاپاشیوں سے نہ صرف بلاد اسلامیہ کے گوشے گوشے کو درخشاں کر رکھا تھا۔ بلکہ روئے زمین کا چپہ چپہ ان کی علمی شعاعوں سے روشن اور منور تھا۔ اہل فرانس آج کل صنعت و تمدن کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ مگر انہی کے اسلاف اپنے وطن کو چھوڑ کر گروہ در گروہ علوم و فنون کی تحصیل کے لئے قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں میں آتے تھے۔ جہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے ملکوں میں جا کر ان علوم کی تعلیم و تدریس میں مشغول ہو جاتے تھے۔

مشہور اسلامی مدارس

گذشتہ زمانے کے مشہور مدارس اسلامیہ یہ تھے۔

مدرسۂ نیشاپور (بہ پیشتر از عہد نظام الملک ربانی مدرسہ نظامیہ بغداد) مدرسۂ ابن فورک مدرسہ بیہقیہ مدرسہ سعیدیہ۔ بنا کردہ نصر بن سبکتگین۔ مدرسۂ اسمٰعیل استرآبادی۔ مدرسۂ استاد ابو اسحٰق مدرسہ

امیہ در خراسان، مدرسہ نظامیہ نیشاپور، مدرسہ نظامیہ بغداد، مدارس نورالدین زنگی شاہ دمشق۔ یہ مدارس دمشق، حلب، حماۃ، حمص اور بعلبک میں قائم تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے مدارس مصر، اسکندریہ اور بیت المقدس میں قائم تھے۔ سلطان مظفرالدین صاحب اربل کے مدارس، سلطان صلاح الدین کے عزیز واقارب کے پانچ مدارس بھی بہت مشہور ہیں۔ نیز سلاطین ممالیک مصر کے اہم مدارس اور سلاطین ایوبی کے مصر میں ستر اعلیٰ مدارس تھے۔ (یہ مدارس ابتدائی مدارس نہ تھے بلکہ اعلیٰ قسم کے کالج تھے) غرناطہ میں ستر یونیورسٹیاں اور ایک سو بیس ابتدائی مدارس تھے۔

بے مثل سخاوت

مسلمانوں کی دولت اور خوشحالی کا اندازہ ان کے امراء اور سلاطین کی بخشش اور سخاوت سے لگایا جاسکتا ہے۔ اور اس سے یہ پتہ چلیگا کہ جن لوگوں کی سخاوت کا یہ حال ہے۔ ان کی دولت کا کیا ٹھکانہ ہوگا) مامون الرشید خلیفۂ عباسی نے خدیجہ بنت حسن بن سہل سے شادی کرتے وقت اپنی ذات پر دس کروڑ فرانک خرچ کئے تھے۔ اور اپنے خسر حسن بن سہل کو دس ملین فرانک اور فارس واہواز کا ایک سال کا خراج بطور انعام دیا تھا۔ مامون اپنے خاص آدمیوں پر روزانہ دو ہزار فرانک صرف کرتا تھا۔ اور صرف تین آدمیوں کو روزانہ پندرہ لاکھ فرانک بخشش کے طور پر دئے جاتے تھے۔ ایک دفعہ سوار ہوتے وقت اس نے ۴۰ ملین فرانک خیرات میں دئے۔ یہ رقم بھی مامون کے دوسرے شاہانہ عطیوں کے مقابلے میں قابل ذکر نہیں ہے۔

امیر معاویہ نے عبداللہ بن جعفر کو ایک لاکھ فرانک عطا کئے تھے

حجاج بن یوسف نے اس شخص کو جس کی کوششوں سے ہند بنت اسماء کے ساتھ اس کی شادی انجام پذیر ہوئی تھی تیس غلام اور تیس لونڈیاں بخشش میں دیں۔ نیز ہر غلام کے ساتھ دس ہزار فرانک عطیہ کے طور پر دیا گیا تھا۔ اور ہر کنیز کے ساتھ کپڑوں اور سامان سے بھرا ہوا ایک صندوق تھا۔

حضرت سعد بن وقاص جس شخص کو کسی غلام کے ہاتھ تحفہ بھیجتے تھے تو تحفہ کے ساتھ تحفہ لانے والا غلام بھی بخش دیا کرتے تھے۔

خلیفہ مہدی نے مہاجر و انصار کے درمیان ایک محفل میں تین ملین درہم تقسیم کردئے تھے۔ اور خاندان کے ہر ایک فرد کے لئے سالانہ چھ ہزار فرانک مقرر کررکھے تھے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ایک شاعر نے مدح وثنا کی تو اس کو ستر ملین فرانک عطا کئے۔ اسی طرح خلیفہ منصور عباسی نے بھی ایک دن اپنے خاندان میں دس ملین درہم تقسیم کئے تھے۔

معتصم نے اپنے عہد خلافت میں سو درہم صدقے میں دئے اور ایک مدح گو شاعر کے منہ کو جواہرسے بھر دیا تھا۔ متعدد شعراء کے خاص وظائف کے علاوہ ایک دفعہ نقد اور جائداد پر مشتمل تقریباً ستر ملین فرانک صرف کئے تھے۔ ہارون الرشید اپنی زکوٰۃ کے علاوہ ایک ہزار درہم صدقہ کرتا تھا۔ اور ایک محفل میں اس نے چھ ملین فرانک لوگوں میں تقسیم کرادئے تھے۔ اور دوسرے دن بھی چھ ملین فرانک تقسیم کئے تھے۔ نیز ایک اعرابی کی مدح وثنا پر اسے پندرہ ہزار دینار عطا کئے تھے۔

یحییٰ برمکی سوار ہوتے وقت جو کوئی آ ملتا اسے دوسو فرانک عنایت کرتا تھا۔ اور جب اس کی لڑکی کی شادی میں سو آدمی شریک ہوئے تو ہر ایک کو پانچ سو گنی ایک چاندی کی سینی کے ساتھ عطا کی۔ منذر بن مغیرہ دمشقی کے اہل وعیال کو یحییٰ بن خالد برمکی نے ایک لاکھ درہم اور پانچ ہزار گنی اور ایک گھر ساز وسامان کے ساتھ اور ایک زراعتی زمین ہبہ کی تھی۔ جس وقت جعفر برمکی کو قتل کرکے اس کا مال واسباب ضبط کرلیا گیا تھا۔ تو اس وقت اس سامان ومتاع میں ایک سر بمہر تھیلی بھی پائی گئی جس میں چھ ملین گنیاں تھیں۔ جو مختلف لوگوں کے انعامات، عطیے اور وظائف کے لئے وقف تھی۔ اور اس پر ہر مستحق کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔

ولید بن یزید ہر ایک شعر پر شاعروں کو ایک ہزار درہم عطا کیا کرتا تھا۔ خالد بن الولید نے ایک شاعر کو چار اشعار کے عوض چار ہزار درہم انعام میں دئے تھے۔ متوکل (خلیفہ عباسی) قصیدے کے ہر شعر پر پانچ سو اشرفیاں عطا کیا کرتا تھا۔ عباسی خلفاء کا یہ عام قاعدہ تھا۔ کہ وہ ہر ایک قصیدے کے معاوضے میں ایک لاکھ درہم انعام میں دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے انعامات اور عطیہ جات کی مقدار دس ملین درہم تک پہنچ جاتی تھی۔ سب سے پہلے خلیفہ منصور نے اس قدر رقم بخشش کی۔ بعض دفعہ ملک کا خراج اور بعض دفعہ سونے چاندی سے بھری ہوئی کشتیاں انعام کے مستحقین کو عطا کی جاتی تھیں (بعض سلاطین اسلام شعراء اور علماء کو سونے چاندی میں تول کر تمام مال انہیں بخش دیتے تھے۔ یہ تمام عطیہ جات اور انعامات ملکی انتظام اور سیاسی مصالح کا خاص لحاظ رکھ کر دئے جاتے تھے اور ملکی خزانہ پر ان کا کچھ بار نہیں پڑتا تھا)

اسلامی کتب خانے

شاپور بن اردشیر نے کرخ میں ایک کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں دس ہزار کتابیں تھیں۔ شاہ الحاکم بامر اللہ کے کتب خانۂ مصر میں ایک لاکھ کتابیں۔ حکم بن ناصر کے کتب خانۂ قرطبہ میں ۴ لاکھ کتابیں اور مراغہ کے کتب خانے میں بھی ۴ لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ ہارون الرشید خلیفۂ عباسی کے زمانے میں بغداد کے کتب خانے میں دس لاکھ کتابیں موجود تھیں اور اسی طرح عزیز باللہ کے عہد میں اس کے کتب خانۂ مصر میں بھی دس لاکھ کتابیں تھیں۔ (ان سب میں طرابلس شام کا کتب خانہ سب سے بڑا تھا) وہاں کتب خانے میں تیس لاکھ کتابیں تھیں۔ اس کتب خانے کو اہل یورپ نے نذر آتش کیا۔ اہل یورپ نے بھی اپنی کتابوں میں اس کتب خانے میں اس قدر کتابوں کے موجود ہونے کا اقرار کیا ہے۔ مگر آج کل اہل مغرب کی ان انتھک کوششوں کے باوجود جو انہوں نے کتابوں کے جمع کرنے میں صرف کی ہیں۔ دنیا کا کوئی کتب خانہ طرابلس شام کے کتب خانے کے برابر تعداد کتب کے لحاظ سے نہیں پہنچ سکا ہے۔ یورپ کا سب سے بڑا کتب خانہ "پیرس کا نیشنل لائبریری" ہے جس میں ۲۹ لاکھ کتابیں ہیں۔ اس کے بعد لندن کی لائبریری ہے جس میں تقریباً ۱۶ لاکھ ۴۰ ہزار کتابیں ہیں۔ ان کے بعد علی الترتیب پیٹرسبرگ، برلن، واشنگٹن اور اٹلی کے کتب خانے ہیں جن میں بالترتیب تیرہ لاکھ ساٹھ ہزار، دس لاکھ تیس ہزار، نو لاکھ چوبیس ہزار چھ لاکھ ستر ہزار کتابیں ہیں (یہ اعداد و شمار پرانے نہیں) جب بلاد اسلامیہ سے تمدن رخصت ہوا تو اس وقت یہ کتابیں بھی ضائع ہو گئیں۔

فن تعمیر

مسلمانوں نے ایسی مساجد، عمارتیں اور محل بنوائے جو اپنے استحکام اور خوبصورتی میں اس قدر بے نظیر تھے کہ دیکھنے والوں کو حیران اور ششدر بنا دیتے تھے۔ انہی بے نظیر عمارتوں میں سے شام (دمشق) کی جامع مسجد اموی ہے۔ جو آج تک موجود ہے اور شام کی بڑی مسجدوں میں اس کا شمار ہے۔ یہ مسجد اسلام سے پیشتر گرجا تھی مگر اسلامی عہد حکومت میں اس کا نصف حصہ گرجا اور نصف حصہ مسجد بن گیا تھا ولید بن عبدالملک نے اپنے زمانے میں اس کے تمام حصہ کو مسجد میں شامل کر لیا تھا۔ اور از سر نو اس مسجد کو تعمیر کرانا شروع کیا تھا۔ اس کی تعمیر کے لئے بارہ ہزار کاریگر دن رات کام کرتے تھے۔ اس کا طول تین سو گز اور عرض چالیس گز تھا۔ اس کے چھیاسی ستون تھے اور ایک بڑا گنبد سیسے کا تھا۔ اس کی تعمیر پر ایک کروڑ دس لاکھ چالیس ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ جو تقریباً ۵ لاکھ پونڈ کے برابر ہیں۔

متوکل خلیفۂ عباسی کے تین محل، ہارونی، جوسقی اور جعفری بھی اسی قسم کی عمارتیں تھیں صرف جعفری پر دس لاکھ پونڈ خرچ ہوئے تھے۔

دار الشجرہ

آل بویہ کے امیر معز الدولہ کے محل دار المعزیہ پر تقریباً پانچ لاکھ پونڈ خرچ ہوئے تھے۔ مقتدر باللہ کا دار الشجرہ بھی ایک عجیب و غریب عمارت تھی جس میں سونے چاندی کے مصنوعی درخت بڑے حوض کے وسط میں قائم تھے ان کے میوے اور پھل جواہرات کے تھے درختوں کی شاخوں پر سونے کی بنی ہوئی بلبلیں بیٹھی ہوئی تھیں اور جب ہوا چلتی تھی اس وقت ان میں سے نہایت دلکش آواز نکلتی تھی۔ حوض کے چاروں طرف پندرہ مردوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ جو ریشمی لباس میں ملبوس تھے اور ان کے ہاتھ میں شمشیر آبدار تھی۔ اور وہ اس طرح حرکت کرتے تھے۔ کہ دیکھنے والا یہ خیال کرتا تھا کہ وہ دوسری طرف بھی قصد کر رہے ہیں

قرطبہ کا محل

قرطبہ میں امیر عبدالرحمٰن کا عظیم الشان محل بھی اسی قسم کی حیرت انگیز عمارت میں شامل تھا۔ اس میں ۴۰۰ دریں اور طلائی گھر تھے اور ہر ایک گھر کا علیحدہ نام تھا۔ اس میں بہت سے حوض، تالاب اور جنگل و صحرا اس طرح بنائے گئے تھے کہ عقل ان کو دیکھ کر حیران ہوتی تھی۔ درندوں چرندوں اور خوبصورت پرندوں کی تصویریں سونے چاندی کی بنی ہوئی تھیں آب رسانی کے لئے دور دراز راستوں اور پہاڑوں میں سے نل نکال کر محل کے اندر تک لائے گئے تھے۔ اور ان نلوں کے اطراف میں سنہری اور روپہلی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

مسجد قرطبہ

اس مسجد کی بلندی مؤذن کے منارے تک ۴۵ گز اور "رمانہ" تک ۶۰ گز تھی۔ اس جامع مسجد کا طول ۳۳۰ گز اور عرض ۲۸۵ گز تھا زمین کا فرش نوٹے پتھروں سے تیار کیا گیا تھا جو بہت بڑے بڑے تھے چنانچہ سب سے بڑے پتھر کا عرض ڈیڑھ گز کا اور سب سے چھوٹے پتھر کا عرض ۱ گز تھا

۷۹۲

اور ایک ہزار دو سو ترانوے ستون سنگ سفید کے تھے۔ اس کا ایک دروازہ سنہری اور باقی دروازے تانبے کے تھے۔ مسجد کے بیچوں بیچ ایک شمعدان ہوتا تھا جس میں ایک ہزار چراغ کی گنجائش تھی محرابوں کی دیواروں پر طلاکاری اور اس کے کناروں پر نقاشی اور میناکاری کے دلکش نمونے تھے۔ اس مسجد کے محراب میں مشہور مصحف عثمانی عود کی ایک کرسی پر رکھا رہتا تھا جس کی میخیں سونے کی تھیں۔ اس پر در و یاقوت سے مزین ایک طلائی کپڑا لپٹا ہوا ہوتا تھا۔ اور اس کے نیچے ایک ریشمی پردہ پڑا ہوا رہتا تھا یہ جامع مسجد ہسپانیوں کے غلبے کے بعد گرجے میں تبدیل کر دی گئی تھی۔ اور اب بھی اس مسجد کی عربی تحریریں اور مشرقی نقش و نگار ببانگ دہل کہہ رہے ہیں کہ اے مسلمانو! کیا تمہاری غیرت اسلامی کفار کے نجس قدموں سے اس مسجد اعظم کو نجات دے گی۔

قصر الزہراء

یہ اندلس کے مشہور اولوالعزم خلیفہ عبدالرحمن الناصر کی بنا کردہ عمارت ہے جو قرطبہ سے چار میل کے فاصلے پر بنائی گئی تھی۔ اس کی تکمیل عبدالرحمن کے بیٹے الحکم نے کی۔ اس عمارت کی تکمیل میں چالیس سال صرف ہوئے تھے اس کا طول ۲۷۰۰ گز اور عرض ۱۵۰۰ گز تھا۔ اس کے ستونوں کی تعداد جو سفید اور سبز پتھروں کے تھے ۴۳۰۰ تھی۔ اس محل میں عجیب و غریب قسم کے حوض تھے کچھ سنہرے تھے اور کچھ سادے تھے۔ بعض حوض انسانوں کی شکل میں تھے۔ ان کے خانوں میں مختلف بارہ جانوروں کی تصویریں سرخ سونے سے بنائی گئی تھیں۔ ان تصویروں میں شیر، ہرن، تیندوا، اژدہا، عقاب، ہاتھی، کبوتر، شاہین، مور، مرغ اور گدھ کی تصویریں بھی شامل تھیں۔ یہ بیش بہا موتیوں سے آراستہ ہوتے تھے۔ اور ان کے منہ سے پانی نکلتا تھا۔ اس محل کے وسط میں ایک بڑی مسجد، چند باغیچے اور تالاب تھے۔ تالابوں میں ہر قسم کی مچھلیاں رہتی تھیں۔ بعض مؤرخین کے قول کے مطابق اس محل کی تعمیر پر ایک کروڑ اشرفیاں خرچ ہوئی تھیں۔ قصر قرطبہ کے پل کا طول ۸ سو گز اور عرض بیس گز تھا۔ بلندی چھ سو گز تھی۔ اس کے چشمے اٹھارہ اور برجیاں نوے تھیں۔

بنو فاطمہ کے محل پر پچیس لاکھ اشرفیاں صرف ہوئی تھیں۔ آل طولون کے محل کی خصوصیات بیان نہیں کی جاسکتیں۔ اس میں بہت سے باغ اور مختلف جواہرات سے مزین طلائی تصاویر تھیں۔ اس میں ایک پارے کا حوض تھا۔ جس کا طول و عرض دونوں پچاس گز تھا۔ اس کے علاوہ بعض ایسی عجیب و غریب چیزیں موجود تھیں جو بیان نہیں کی جاسکتیں

ایک فاطمی امیر نے اپنا محل قصر غربی دس لاکھ اشرفیوں سے تعمیر کرایا تھا

تعمیر و توسیع بلاد

مسلمان شہروں کے بسانے اور ان کی توسیع میں خاص اہتمام کرتے تھے چنانچہ شہر قرطبہ کا رقبہ ۲۳۰۰۰ گز تھا یعنی طولاً ۲۴ اور عرضاً چھ میل تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اس کا رقبہ ۱۴۴ مربع میل تھا۔ موجودہ زمانے میں لندن دنیا میں سب سے بڑا شہر مانا جاتا ہے اور اس کی آبادی تقریباً ۵۰ لاکھ ہے۔ مگر رقبے میں وہ صرف ۱۱۷ میل ہے۔ بغداد کی آبادی خلفائے عباسیہ کے زمانے میں پندرہ لاکھ تھی اس کے گلی کوچے ۲۴ ہزار، نہریں ۱۵۰ ہزار اور تمام گھر ۲۴۰ ہزار تھے مگر اب بغداد کی آبادی ۱۵۰ ہزار سے بھی کم ہے۔

بلال بن ابی بردہ کے عہد میں بصرہ کی نہروں کی تعداد ایک لاکھ تک، پہنچ گئی تھی۔ اور اس میں چھوٹی کشتیاں چلتی تھیں۔ بصرہ کی آبادی کا رقبہ ۳۶۴ مربع میل تھا۔ اس کی بڑی سڑک کا عرض ۶۰ گز اور باقی سڑکوں کا عرض ۲۰ گز ہوتا تھا۔ مگر آج کل بصرہ کی کل آبادی تیس ہزار ہے۔

فتح مصر کے بعد مصر میں صرف بالغ مردوں کی تعداد ۸۰ لاکھ تھی لیکن اگر عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو بھی ملا لیا جائے تو کل آبادی تقریباً تین کروڑ ہوگی اور اس لحاظ سے یہ آبادی مصر کی موجودہ آبادی سے بڑھی تھی۔ ہشام بن عبدالملک کے زمانے میں مصر کی زراعتی زمین کی پیمائش کی گئی تو وہ تین کروڑ ایکڑ نکلی۔ مگر آج کل حکومت مصر کی سخت کوششوں کے باوجود مصر کی زراعتی اراضی ۸۰ لاکھ ایکڑ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

فسطاط جو مصر کا سب سے پہلا اسلامی شہر ہے اور جسے حضرت عمرو بن العاص نے تعمیر کرایا تھا۔ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ اور جنگی چھاؤنی کی وجہ سے چاروں طرف سے عرب اور دیگر قبائل وہاں آکر بسنے لگے تھے اس بنا پر اس کی آبادی گنجان ہو گئی اور اس کا رقبہ بہت دور تک وسیع ہو گیا تھا۔ اور بعض مؤرخین کے قول کے مطابق جو اگرچہ مبالغہ پر مبنی سمجھا جائیگا اس شہر میں ۳۶ ہزار مساجد اور ۸ ہزار بازار اور سڑکیں تھیں اور ۱۱۷۰ حمام تھے۔ آبادی کے گنجان ہونے اور عمارتوں کی کثرت کی بنا پر مکانوں کے سات درجے بنا دیئے گئے تھے چنانچہ جو مکانات بہت وسیع ہوتے تھے ان میں دو دو سو اشخاص رہتے تھے۔ اسی شہر کی ایک عمارت دارالحرم نامی پر ۳۵۰ ہزار اشرفیاں خرچ ہوئی تھیں۔ یہاں کے عام باشندے اس قدر دولتمند تھے کہ کئی گھروں میں ایک ہزار تکیہ فرش ہوتا تھا۔ اس شہر کے آثار باقیہ میں سے جامع

قرون اولیٰ مصر میں موجود ہے یہ شہر موجودہ شہر اور قدیم شہر کے درمیان آباد تھا۔

اندلس کے شہروں میں تعمیر و آبادی کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی وہاں کی عمارتوں کی پختگی و استحکام اور تفاخر میں جس قدر دولت خرچ کی گئی تھی وہ تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کی جا سکتی سرزمین اندلس کے تمدن و تہذیب کے باقی ماندہ آثار آج تک ہمارے دعوے کا زبردست ثبوت دے رہے ہیں

اسلامی ہسپتال اور شفاخانے

اسلامی عہد میں عام شفاخانے اور ہسپتال اس کثرت سے کھولے گئے تھے کہ ان کا مفصل بیان کرنا طوالت سے خالی نہیں ہے مختصر طور پر چند مشہور شفاخانوں کا ذکر کیا جائے گا۔ سب سے پہلے ولید بن عبدالملک خلیفہ اموی نے ہسپتال کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد ہارون الرشید کا شفاخانۂ بغداد، شفاخانۂ برامکہ نیز فتح بن خاقان کا شفاخانہ اور سیدہ فخر اور ابن طولون کے مصر میں شفاخانے، علی بن عیسیٰ وزیر اور خلیفہ مقتدر اور خلیفہ عضد الدولہ کے بغداد کے شفاخانے، نور الدین زنگی کا شفاخانۂ دمشق، سلطان صلاح الدین ایوبی کا شفاخانۂ مصر، الملک المنصور، الملک المؤید اور کافور کے مصر میں شفاخانے نیز مکہ، مدینہ، فارس، رے، نیشاپور، خراسان، موصل، شام اور اندلس کے شفاخانے زیادہ قابل ذکر تھے۔ ان شفاخانوں میں پاکیزگی اور ضبط و نظم کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا چنانچہ ہر مریض کے لئے علیحدہ کمرہ ہوتا تھا۔ اور اس کے لئے طبیب اور تیماردار مقرر ہوتے تھے۔ اگر کوئی مریض مر جائے تو اس کے کفن اور دفن کا انتظام شفاخانوں کے ذمے ہوتا تھا۔ اس زمانے میں سفری اور فوجی ہسپتالوں کا بھی انتظام رہتا تھا اور سفر میں لشکر کے ہمراہ ہسپتال کا ساز و سامان اونٹوں پر لاد کر پہنچایا جاتا تھا چنانچہ سلطان محمود کے فوجی ہسپتال کو چالیس اونٹ اٹھاتے تھے۔

اطباء کی قدر شناسی

اسلامی سلطنتوں میں علم طب اور اطباء کی نہایت قدر و منزلت کی جاتی تھی۔ اس زمانے میں خلفاء اور سلاطین کی یہ عام عادت تھی کہ وہ کھانا کھاتے وقت طبیب کی شرکت کو نہایت ضروری سمجھتے تھے اور اس کی اجازت کے بغیر کھانا تناول نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ خلیفہ عباسی المتوکل نے طبیب کی اجازت کے بغیر کھانا کھا لیا۔ اس پر وہ بہت برانگیختہ ہو گیا۔ چنانچہ خلیفۂ موصوف نے اس کی دلجوئی اور اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی غرض سے ۱۵۰۰ اشرفیاں نقد اور ایک بہت بڑا زرعی قطعۂ زمین جس کی آمدنی ۱۵۰۰ فوانک تھی انعام میں دیا۔ اس قسم کی قدر و منزلت کا یہ نتیجہ ہوا کہ اطباء اور معالجین کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا چنانچہ جب خلیفہ مقتدر باللہ کے عہد خلافت میں ان طبیبوں کا شمار کیا گیا جنہوں نے طبابت کا امتحان نہیں دیا تھا اور باقاعدہ مستند اور تصدیق یافتہ نہ تھے۔ تو معلوم ہوا کہ اس قسم کے اطباء ۸۶۰ ہیں۔ ان میں وہ مشہور و معروف اطباء شامل نہیں تھے جنہیں سند حاصل کرنے یا امتحان دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ یا وہ خلیفہ کے دربار میں رسائی رکھتے تھے ان تمام باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے صرف دار الخلافہ بغداد میں طبیبوں کی کم از کم تعداد ایک ہزار ہو گی۔ عضد الدولہ کے ہسپتال میں ۲۴ طبیب ملازم تھے۔ اور خلیفۂ متوکل کے دربار میں مسلمان طبیبوں کے علاوہ ۵۶ عیسائی طبیب تھے۔ سیف الدولہ امیر شام کے ہمراہ ۲۴ طبیب شریک طعام ہوتے تھے۔

مشہور رصدگاہیں

مشہور اسلامی رصدگاہیں مندرجہ ذیل تھیں۔

(۱) رصدگاہ مامون بغداد میں (۲) رصدگاہ بنو شاکر بر لب دجلہ بغداد

(۳) رصدگاہ شرف الدولہ بن عضد دولہ۔

(۴) رصدگاہ الحاکم بامر اللہ (۵) رصدگاہ ہنوالاعلم۔

(۶) رصدگاہ بتانی شام میں (۷) رصدگاہ خواجہ نصیر الدین طوسی مراغہ میں

(۸) رصدگاہ تیمور لنگ سمرقند میں۔

(۹) رصدگاہ اصفہان (۱۰) رصدگاہ مصر

(۱۱) رصدگاہ اندلس

ان رصدگاہوں کے علاوہ زیچ کے متعلق مختلف کتابیں لکھی گئیں جن میں سب سے طویل "زیچ حاکمی" ہے جسے ابن یونس نے چار جلدوں میں تحریر کیا تھا۔ دوسری مشہور زیچیں یہ ہیں۔ زیچ ابو حنیفہ۔ زیچ ایلخانی (زیچ وہ علم ہے جس کے ذریعہ زائچہ، علم نجوم کا حساب، ستاروں کا استخراج اور احکام نجوم معلوم کئے جاتے ہیں۔

گندھارا کی تہذیب

مہاراجہ کنشک کے عہد حکومت پر ایک نظر

از جناب عطا محمد پراچہ متعلم بی۔اے

جس زمانے کا ذکر ہم کر رہے ہیں اس وقت گندھارا" مغربی پنجاب اور شمال مغربی صوبہ دونوں کو ملا کر ایک علاقے کا نام تھا۔ یہ مقام قدیم زمانے سے ہندوستان کے دروازے کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایران افغانستان اور چین کے قافلوں کا میل اسی جگہ ہوتا تھا۔ یہ قافلے تجارتی ہوتے جن کے ذریعے ملکوں کی تہذیب کلچر اور ادب کی بھی اشاعت ہوتی۔ اس طرح یہاں مختلف تہذیبوں کا ملاپ ہوتا رہا۔ اسی امتزاج سے گندھارا کی تہذیب ظہور میں آئی۔ اور اسے ایک خاص درجہ حاصل ہوا حتیٰ کہ اسکندر کے حملے کے وقت گندھارا کے صدر مقام ٹیکسلا کا شمار بھی ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ہوتا تھا۔

قبل اس کے کہ ہم گندھاری تہذیب پر روشنی ڈالیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مختصر سی تاریخ بیان کر دی جائے۔

دوسری صدی قبل مسیح سے تیسری صدی عیسوی کے وسط تک وسط ایشیا سے مختلف نسلوں نے ہندوستان میں ہجرت کی۔ جب ان قبائل کی جو وسط ایشیا میں بود و باش رکھتے تھے۔ آبادی بڑھ گئی تو وہ تلاش معاش کے لئے آگے بڑھے اور جو کوئی ان کے رستے میں حائل ہوا اسے شکست دی۔ ان لوگوں میں سے "یوچی" قوم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس قبیلہ کو ۱۶۵ ق م میں شمال مغربی چین سے نکالا گیا تھا۔ ان لوگوں نے تلاش معاش میں مغرب کا رخ کیا اور صحرائے گوبی میں "ووسن" نامی قوم سے ان کی جنگ ہوئی۔ اسے شکست دے کر یہ آگے بڑھی۔ پھر دریائے جیحون کے شمال میں ان کا مقابلہ سک قوم سے ہوا۔ سک قوم کو مجبور ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا اور "یوچی" ہندوستان میں داخل ہو گئے۔

"یوچی قوم دریائے جیحون کے آس پاس آباد تھی۔ لیکن اس زمانے میں "ووسن" قوم کے سردار کا بیٹا یوچیوں کے دشمن "ہیونگ نو" نامی قبیلے کی زیر سرپرستی جوان ہو گیا۔ اس نے اپنے باپ کا انتقام لینے کے لئے "ہیونگ نو" نامی قبیلے کی زیر سرپرستی "یوچی" قوم پر زبردست حملہ کیا۔ جس کے باعث "یوچی" قوم کو "سیحون" کی وادی کی طرف بھاگنا پڑا۔ وہاں جا کر اس قوم نے وہاں کی آبادی کو اپنا مطیع کر لیا اور "باختر" پر قابض ہو گئی۔

"باختر" میں یوچی قوم کے پانچ گروہ ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنی الگ الگ ریاستیں قائم کر لیں مگر "کشن" قبیلہ باقی چار پر غالب آ گیا اور اپنے سردار کی سرکردگی میں جنوب کی طرف بڑھا اور قندھار پر قابض ہو گیا۔ اس کا پہلا سردار کدفیسز (فیسز) تھا، اس نے کابل۔ کشمیر۔ ٹیکسلا اور پارتھیا کا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ویما کدفیسیس (فیسز) نے "شک" اور "پہلے" حاکموں کو پنجاب۔ راجپوتانہ اور دریائے سندھ کی وادی سے نکال دیا اور خود شمالی ہندوستان میں "کشن حکومت" قائم کر لی۔

ویما ایک وسیع سلطنت پر فرمانروائی کرتا تھا اور چین و روما سے اس کے تعلقات تھے۔ اس کے مرنے پر کنشک تخت پر بیٹھا یہ بڑا جنگجو حکمران تھا۔ اس نے کشمیر۔ کاشغر۔ یارقند اور ختن کو فتح کیا اور ہندوستان و ایران میں بہت سی لڑائیاں لڑیں۔ اس کی قلمرو میں مشرقی ترکستان۔ افغانستان۔ کشمیر۔ پنجاب۔ وسط ہند۔ راجپوتانہ اور سندھ شامل تھے۔ اجین کے صوبہ دار ولیتی بھی اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اس نے علاقہ گندھارا میں پرش پور یعنی موجودہ پشاور کو اپنا دارالحکومت بنایا۔

دوسری طرف روم کا بادشاہ ہندوستان کو فتح کرنا چاہتا تھا اسکندر کے حملے کے بعد اس کے حوصلے بڑھ گئے اور یہ لشکر لے کر نکلا۔ اور ملکوں کے ملک فتح کرتا ہوا ایران تک پہنچ گیا۔ ادھر چینی سپہ سالار بھی بڑھے۔ دونوں کی سرحدیں مل گئیں اور اس طرح چین سے روم تک آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ گندھارا جو اس تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔ چینی، ایرانی۔ یونانی اور ہندوستانی تاجروں کا مرکز بن گیا۔ آہستہ آہستہ یہ علاقہ تہذیب و تمدن کا گہوارہ بن گیا اور یہاں ہر ملک کے تہذیب، و تمدن، معاشرت اور علوم و فنون جمع ہو گئے۔

جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت ہندوستان پر کنشک حکومت کرتا تھا۔ اس نے تقریباً پینتالیس برس تک راج کیا۔ اس کے بعد ہوشک اور پھر واسدیو تخت پر بیٹھے۔ واسدیو کے مرنے کے بعد کشن سلطنت کو زوال آگیا۔ اس سلطنت کا زمانہ سنہ ۱۲۰ء سے سنہ ۲۲۰ء تک بتایا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا پس منظر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تہذیب کا ڈھانچہ کسی خاص زمانہ کی پیداوار نہیں بلکہ اس کی تیاری بہت پہلے سے ہو رہی تھی۔ ایک زمانے تک ہندوستانی تہذیب نے ایرانی تہذیب کا اثر قبول کیا۔ اگرچہ ہندوستان نے یونان سے کچھ حاصل نہ کیا لیکن جب ہندوستان میں یونانی شہزادے آکر آباد ہو گئے اور انھوں نے تہذیب و تمدن کی سرپرستی کی تو ہندوستان نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ یوچی قوم کے ہندوستان میں آنے کے بعد ترکی تہذیب بھی یہاں پہنچی۔ ویما کے عہد میں ہندوستان اور چین کے تعلقات اچھے تھے۔ چینی اور رومی سلطنتوں کی حد مل گئیں تو لین دین کا سلسلہ شروع ہوا۔ تجارت کے ساتھ ساتھ مذہبی و معاشرتی تاثرات کے باہمی مبادلہ کا بہترین موقع ہاتھ آگیا۔ گندھارا چینی، ہندوستانی، ایرانی اور رومی تاجروں کا مرکز تھا اس لئے یہ ایک نئی تہذیب کا گہوارہ بن گیا جو "گندھارا تہذیب" کہلائی۔

گندھارا کی تہذیب میں انہی چاروں تہذیبوں کا اثر نظر آتا ہے۔ کشن شہزادوں کے جسم پر لبادے اور پاؤں میں نرم چمڑے کے موزے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ لباس وہ لوگ اپنے ساتھ لائے تھے کیونکہ قدیم ہند کا لباس چادر اور دھوتی کے سوا کوئی نہ تھا۔ سکوں کے نقش و نگار اور ان کی تصویریں یونانی تہذیب کی آئینہ دار ہیں۔ سکوں میں یونانی حروف کندہ نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ان کی زبان ایران کی قدیم زبان سے تعلق رکھتی تھی۔ سکوں پر یونانی دیوتاؤں کی تصویریں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ بودھ کی مورتوں اور ہندوستانی خیالات کو اکثر یونانی شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک کتبہ سے ثابت ہوتا ہے کہ راجہ کنشک نے رومۃ الکبریٰ کے بادشاہوں کا لقب "قیصر" اختیار کر لیا تھا۔

ہندوستانی فن تعمیر اور سنگتراشی پر بہت پہلے سے مختلف اثرات پڑ رہے تھے۔ یونانیوں نے سنگتراشی کے جس نئے طرز کو ترقی دی تھی کشن عہد میں اس نے بہت مقبولیت حاصل کر لی۔ اسے گندھارا کا طرز یا یونانی بودھی طرز کہا جاتا ہے۔ اس میں بودھ مت کے خیالات کو یونانی شکل دی جاتی تھی۔ گندھارا طرز کی مورتیں جو دستیاب ہوئی ہیں۔ ان میں یونانی حسن کو صرف اسی قدر دیا گیا ہے کہ نمائشی صورت تو یونانی ہے مگر اعضا کے تناسب اور ان کی ساخت میں بہت بے توجہی سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں دھڑ کے لحاظ سے ٹانگیں چھوٹی ہیں تو کہیں جسم کے لحاظ سے سر بڑا ہے۔ اس کے دیکھنے سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یونانی آرٹ کی نقل تو کی گئی ہے مگر وہ نفاست و لطافت پیدا نہ ہو سکی۔ دوسرے یہ کہ بنانے والے یونانی تہذیب کا صرف ظاہری پہلو لیتے تھے اور اسی سے شاید واقف تھے۔ اور ان کی تعلیم صرف سنگتراشی کے فن تک محدود تھی۔ اور یہ مورتیں انھوں نے مذہبی جوش و جذبہ کے تحت بنائی تھیں۔ انھیں اس بات سے کوئی مطلب نہ تھا کہ آرٹ کے اعتبار سے مورت اچھی ہے یا بری۔

پشاور کے قریب کا اسٹوپ تیرہ منزلہ ہے۔ اور ایک اونچی کرسی پر عمارت بنائی گئی ہے۔ (یونانی آرٹ کی نقل کی گئی ہے مگر وہ نفاست و لطافت پیدا نہ ہو سکی۔) اس عمارت کے کھنڈروں سے زیورات کا ایک ڈبہ برآمد ہوا ہے۔ جس پر یونانی نقش و نگار ہیں۔ اس کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی یونانی انجینیر کی زیر نگرانی بنایا گیا ہے۔ جس کا نام اجیلاس بتایا جاتا ہے۔ اسی طرح ٹیکسلا سے بعض جواہرات کے نمونے ایسے بھی ملے ہیں جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بنانے والے خاص یونانی مذاق رکھتے تھے اور مذہبیت نے ان پر کوئی گہرا رنگ نہ چڑھایا تھا۔

ٹیکسلا میں مندروں، خانقاہوں اور اسٹوپوں کے جو کھنڈرات ملے ہیں۔ ان کی دیواروں کی آرائش بالکل یونانی مذاق کے مطابق کی گئی ہے۔ کنشک کو تعمیر عمارات کا بہت شوق تھا۔ اس نے کئی اسٹوپے بنوائے تھے۔ پرش پور (پشاور) سے باہر اس نے مہاتما بودھ کا ایک مندر بھی تعمیر کرایا تھا۔ اور اپنے دارالحکومت پرش پور میں جو اسٹوپ بنوایا تھا بودھی دور کی ایک شاندار اور اہم عمارت سمجھا جاتا تھا۔

ٹیکسلا کے کھنڈرات کو دیکھنے سے تمدنی ارتقاء کے مختلف مدارج کا پتہ چلتا ہے۔ چونکہ ابتدا میں شہروں سے قلعہ کا کام لیا جاتا تھا اس لئے شہر ہمیشہ پہاڑیوں پر بنائے جاتے تھے۔ یہ شہر بھی پہلے پہل پہاڑی پر بنایا گیا تھا۔ بعد میں آبادی بڑھنے سے مکانات پہاڑی کے دامن تک ہو گئے۔ اور پھر ترقی کرتے کرتے شہر میدان میں آگیا۔ پہاڑی کا شہر (پہلا شہر) کسی سردار نے بنوایا تھا۔ اور دوسرا شہر جسے یونانیوں

نے آباد کیا تھا اور اسے سرکاپ کہلاتا ہے۔ اور تیسرا شہر جسے "سرکھ" کہتے ہیں۔ کنشک عہد میں آباد ہوا۔ سرکاپ کی عمارتوں کے دروازوں اور دروازوں کے سامنے یونانی طرز کے بہت بڑے مندر کے آثار بھی ملے ہیں۔ سرکھ میں ایک چھوٹے سے شاہی محل کے آثار بتاتے ہیں کہ وہ بابل کے محلوں کی طرح تھا۔ ان عمارتوں کے کھنڈرات کا مشاہدہ کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سڑکیں سیدھی اور مکانات قطار میں بنائے جاتے تھے۔ دوسرا یہ کہ تعمیر سے قبل عمارت کا نقشہ بنا لیا جاتا تھا۔

گندھارا کا فن تعمیر نفیس مذاق کا آئینہ دار نہیں ہے۔ عمارتوں میں پتھر کم استعمال ہوتا تھا۔ جس سے عمارتیں پائیدار نہیں ہوتی تھیں بلکہ بہت جلد کھنڈروں میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔ اور اگر کہیں پتھر استعمال بھی کیا گیا ہے۔ تو بہت کفایت شعاری سے کام لیا گیا ہے۔ یہاں کے لوگ صرف یونانی تہذیب کے ظاہری پہلو سے واقف تھے۔ وہ یونانی فلسفہ سیاسیات سے بالکل واقف نہ تھے۔

اس تہذیبی دور میں تجارت کو بھی کافی فروغ حاصل تھا۔ اس کے دو وجوہ ہیں۔

۱۔ اس زمانے میں بحری و بری دونوں تجارتی رستے دریافت ہو چکے تھے۔

۲۔ بودھ مت اس زمانہ میں سرکاری مذہب تھا۔ اور اس کی تبلیغ کے لئے مبلغ اور راہب دور دراز کا سفر کرتے اور اس مذہب کو غیر ممالک تک پہنچاتے تھے۔ یہ لوگ تمام ایشیا میں پہنچے یعنی شمال میں چین تک جنوب میں جاوا، سماٹرا اور سیام تک مغرب میں ایران اور ایشیائے کوچک تک۔

ان مذہبی لوگوں کے ساتھ تاجر بھی دور دور تک گئے جو یہاں کی مشہور اور عمدہ چیزیں وہاں تک پہنچاتے اور غیر ممالک سے ان کی عمدہ اور مشہور اشیاء یہاں لاتے تھے۔ اس طرح تجارت کا سلسلہ قائم ہو گیا یہ بری تجارت کا حال تھا۔

بحری تجارت عرب سے تھی۔ عرب تاجر بادبانی کشتیوں کے ذریعے سے بحیرۂ عرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے یہاں پہنچتے۔ اور اس طرح ہندوستانی تاجر بھی وہاں تک پہنچتے۔ یہ تاجر ساحل عرب سے اپنا مال اونٹوں کے ذریعے سے شام اور مصر تک پہنچاتے تھے۔ اس زمانہ میں یورپ سے بھی تھوڑی بہت تجارت ہوتی تھی۔ کیونکہ قدیم روم کے سکے دکن میں پائے گئے ہیں۔ ہندوستان کو زر قیمت رومی سکوں کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا۔ یہ سکے پنجاب، کابل اور اس کے آس پاس بھی ملے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سکے یہاں عام تھے۔

ہندوستان سے بیرونی ممالک کو موٹا گرم مصالحہ۔ دار چینی ہیرے۔ موتی۔ جواہرات۔ ہاتھی دانت۔ ریشمی کپڑا اور مشک و عنبر کا سامان بھیجا جاتا تھا۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں یہاں بہت سی بندرگاہیں تھیں۔ ایک بھروچ کی بندرگاہ تھی جو بہت اہمیت رکھتی تھی مگر اب سمندر کے ہٹ جانے کی وجہ سے اس کی کوئی اہمیت نہ رہی اور اس کی جگہ "بمبئی" نے لے لی ہے۔

ساحل مالابار پر کرنگ پور اور بکارے نامی بندرگاہوں کا پتہ چلتا ہے جو بحری تجارت کا مرکز تھیں۔ کیونکہ یہاں رومی قیصروں کے سکے اور اشرفیاں ملی ہیں۔ کورومنڈل کی جانب "کورکی" اور "پوہار" دو قدیم بندرگاہوں کا ذکر آتا ہے۔ جہاں سے مصر و ملایا سے تجارت ہوتی تھی۔ مگر سمندر کے ہٹ جانے کی وجہ سے یہ خشکی میں رہ گئی ہیں اور ان کی وہ اہمیت نہیں رہی۔

اس زمانہ میں علم و فضل کا خوب چرچا تھا۔ دار العلوم ٹیکسلا کو کنشک کے عہد میں بڑی ترقی حاصل تھی۔ بہت سے غیر ممالک کے طلبہ یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔

سنسکرت علما کی زبان تھی۔ تمام کاروبار اسی زبان میں ہوتا تھا بودھوں اور جینیوں کی مذہبی اور فلسفیانہ کتب بھی اسی میں ملتی ہیں اس عہد کے بہترین انشاپرداز ناگارجن اور اشوگھوش تھے۔ اشوگھوش کی جتنی تصانیف ملی ہیں وہ نامکمل ہیں۔ صرف "بودھ کی سوانح حیات" مکمل ملی ہے جس سے اس زمانے کے علم کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے علاوہ آیورویدک کا مشہور عالم چرک بھی جو قدیم ہندی طب کا سب سے بہترین اور پرانا مصنف مانا جاتا ہے کنشک کا درباری حکیم تھا۔

اشوگھوش کو کنشک پاٹلی پتر سے لایا تھا۔ وہ ہمیشہ مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی کتابیں لکھتا تھا۔ وہ وسیع النظر عالم اور زبردست انشا پرداز تھا۔

دوسرا ادیب جس کا ذکر پہلے آچکا ہے ناگارجن تھا جو ہمیشہ مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی کتابیں لکھتا تھا۔

اس دور کی پنج تنتر (انوار سہیلی) بہت مشہور کتاب ہے۔ اس میں گوتم بدھ کی تعلیم کو قصوں میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ تمام قصے گوتم بودھ کے پچھلے جنم سے متعلق ہیں۔ یہ دنیا کی تمام زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اردو میں کلیلہ دمنہ کے نام سے مشہور ہے۔

کنشک نے آخری عمر میں بودھ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اشوک کی طرح اسے بھی ایک خونریز جنگ کرنا پڑی۔ اس کے بعد اس نے بودھ مذہب اختیار کر کے جنگ و جدال سے توبہ کر لی۔ اس نے اشوک دوم کا پارٹ ادا کیا۔ اس کے زمانے میں بودھ مت نے بہت ترقی کر لی تھی۔ اس مذہب کے پیروؤں کی تعداد بہت تیزی سے بڑھی۔ کیونکہ اس نئے مذہب نے نجات کا دروازہ سب کے لئے کھول دیا تھا۔ اب صرف سرگرم تبلیغ کی ضرورت تھی۔ اسے بھی کنشک نے پورا کر دیا۔ لیکن وہ نوجوان اور نیم مہذب نسلیں جن سے اب بودھ مت کو سابقہ پڑا تھا۔ گوتم بودھ کی اعلیٰ اور فلسفیانہ تعلیم کو پوری طرح قبول نہ کر سکتی تھیں اس لئے وہ بودھ مت اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے قومی عقائد اور اوہام پر بھی قائم رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ چیزیں بھی بودھ مت میں داخل ہو گئیں۔

اصلی بودھ مت کی بنیاد آواگون۔ نروان۔ جاندار پر رحم کرنے اور فرض برائے فرض کے اصول پر قائم تھی۔ لیکن اشوک کے بعد اس تعلیم میں زوال شروع ہو گیا اور روم کی عیسائیت، ایران کی آتش پرستی اور ہندوستان کی برہمنیت اور مختلف قوموں کے رسم و رواج اور مذہبی خیالات کا اثر بودھ مذہب پر پڑنے لگا۔ اس طرح کی آمیزش سے دو فرقے (۱) مہایان (بڑی گاڑی) اور (۲) ہنایان (چھوٹی گاڑی) ہو گئے۔

ایک گروہ تو گوتم بودھ کو خدا قرار دیتا تھا اور دوسرا کہتا تھا کہ وہ بہشت میں داخل ہیں اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے اوپر نروان اس وقت تک کے لئے حرام کر لیا ہے جب تک کہ کل نوع انسانی ان کے ساتھ نروان حاصل نہ کرے۔ ہزار قرینہ کہتا ہے کہ گوتم بودھ اس عزم کو پورا نہ کر سکے۔ دوسرے ان میں بہت سے اندرونی اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ گوتم بودھ کی صحیح تعلیم کیا تھی۔

ان تمام حالات سے متاثر ہو کر کنشک نے اپنے دینی پیشوا پارسو مہاتما سے تحریک کی کہ بودھ مت کے تمام علما کو جمع کیا جائے تاکہ بحث و تمحیص کے بعد وہ اصول قرار دیئے جا سکیں جو مسلم ہوں۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے کنشک نے پانچ سو علما کی ایک مجلس بمقام کنڈلون (کشمیر) میں بلائی۔ اس مجلس نے بحث و مباحثہ کے بعد ایک کتاب لکھی جس میں بودھ مت کی تعلیم و اصول درج کئے گئے تھے جسے "ساؤجات" کہتے ہیں۔ جس میں تمام اختلافات کا مفصل بیان قلمبند کیا اور کنشک کا یہ کام بودھ مت پر بہت بڑا احسان ہے۔

جزیرۂ قریطش

جزیرۂ قریطش کا ذکر ہومر کی مشہور کتاب ایلیڈ، اور قدیم یونانی افسانوں میں بار بار آیا ہے۔

ہومر نے بھی کریٹ اور اس کے تباہ شدہ شہروں کے متعلق بحث کی ہے۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ معبود زیوس اسی جزیرہ میں پیدا ہوا اور وہیں اس نے اپنے ایک بیٹے کو جو مینوس کے نام سے مشہور تھا۔ اپنا قائم مقام بنایا۔ مینوس ہر نو برس کے بعد اپنے معبود باپ سے ملتا اس سے حکمت و حکمرانی کے اصول سیکھ کر واپس آتا اور اسی کے مطابق جدید قوانین کا نفاذ کرتا تھا۔ یونانی قصوں میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ایتھنز (یونان کا دارالسلطنت) شاہِ قریطش کو ہر نو سال بعد سات نوخیز اور سات دوشیزہ لڑکیاں بطور جزیہ پیش کرتا تھا جنہیں مینوٹار ایک عجیب قسم کا بیل تھا اور جس کی شکل انسانوں کی سی تھی نگل جایا کرتا تھا! جزیہ کا یہ طریقہ برابر جاری رہا۔ اور وہ حیرت انگیز مخلوق انسانوں ہی کو خوراک بھی بنایا کرتا تھا کچھ دن کے بعد تھیسوس ایتھنز کے بہادر نوجوان نے اسے قتل کر ڈالا۔

ہیروڈوٹس لکھتا ہے۔ مینوس نے ایک جنگی بیڑا تیار کرایا اور ایک بھاری لشکر لے کر سسلی پر کامیکوس کے خلاف حملہ آور ہوا۔ چونکہ اس حملہ میں وہ خود شریک تھا جس کی وجہ سے اسے پائے تخت سے دور رہنا پڑا۔ یہ تھوڑی ہی غیبت اس کے لئے نہایت مضر ثابت ہوئی یونانی قبائل نے پائے تخت کو خالی دیکھ کر اسے غنیمت سمجھا اور فوراً اپنی طاقت اکٹھا کر کے قبضہ کر لیا۔ ان کا قبضہ کرنا تھا۔ کہ قریطش کے عظیم الشان تہذیب و تمدن کی بنیادیں ہل گئیں۔ جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے اس جزیرہ کی تاریخ نہایت قدیم ہے صدیوں اس کے حالات پردۂ اخفا میں رہے اور اس علم و فن کے زمانہ میں بھی اس کی تاریخ تاریکی میں گھری رہی لیکن جب جرمنی کے مشہور ماہر اثریات سلیمان نصری نے یونانی تمدن کے آثار کی تفتیش شروع کی۔ تو قریطش کے متعلق بھی تاریخی کتب میں تذکرہ ہونے لگا۔ اسی طرح ایشیائے کوچک اور یورپ میں اس کی تحقیقات ہونے لگی۔ علمائے علم الآثار کی ایک جماعت جزیرہ قریطش کے اثری مطالعہ میں

قدیم تمدن پر ایک نظر

از جناب عبدالرحمن مستیفی

منہمک ہوئی اس جماعت کا صدر مسٹر سر آرتھر ایوانس تھا۔

عام خیال یہ تھا کہ یونانی تمدن خود ہی معرض ظہور میں آیا تھا لیکن اس جماعت نے اپنے پیہم مطالعہ اور لگاتار جد و جہد سے ثابت کر دیا کہ یونانی تمدن کا اصل سرچشمہ جزیرہ قریطش کا تمدن ہے۔

اطرافِ قریطش کی تاریخ

اس جزیرے کے باشندے عام طور پر پست قد ہوتے تھے۔ ان کا سر بڑا لمبا کر تھا بال سیاہ۔ آنکھیں خوبصورت ہوتی تھیں اور زیادہ تر بحر روم کے گرد رہنے والے قبائل کے بالکل مشابہ ہوتے تھے ان کے علاوہ سارڈینیا، کارسیکا اور اٹلی کے بعض صوبوں کے باشندوں سے ان کی شکل بھی ملتی جلتی تھی۔ ان کے جسم میں حد درجہ موزونیت ہوتی تھی جس سے وہ بہت چست اور پھرتیلے معلوم ہوتے تھے۔ یونانی انہیں سرخ پوست والے کہتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا رنگ سرخ تھا۔

افسوس ہے کہ ان کی مفصل یا مجمل تاریخ کے لئے جن معلومات اور وسائل کی ضرورت تھی وہ یکسر مفقود ہیں ان کی تحریریں اور دستاویزیں جو اپنے زمانہ میں بہت ہی ترقی یافتہ اور بہترین صورت میں تھیں ان کے پڑھنے اور دیکھنے کا موقع نہ ملا اور نہ کوئی ایسی چیز ہاتھ آئی جس سے ہم قطعی نتائج تک پہنچ سکیں ممکن ہے آئندہ ایسے دلائل مہیا ہو جائیں جس سے انکی گمشدہ تاریخ روشنی میں آجائے تاہم اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جزیرہ قریطش کنوسوس کی طاقت سے مطیع نہ ہوا۔ اور نہ اس کی ہیبت سے مرعوب ہوا۔ ہاں اگر کسی حد تک اطاعت کی تو بڑی رد و قدح کے بعد پھر بھی اس کی محافظت کے سامان خود قدرت کی جانب سے موجود تھے اس کے چاروں طرف ایک عظیم الشان سمندر ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کے شہروں میں شہر پناہ اور حصار بندی کا وجود نہ تھا۔ کنوسوس میں علماء آثار کو ایک چھوٹے سے برج کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ جس کی قوت قزاقوں اور رہزنوں کی غارتگری کو روکنے کے لئے کافی نہ تھی۔ کیونکہ انہیں ان چیزوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بلکہ برطانیہ عظمیٰ کی طرح انہیں اپنے جنگی بیڑوں پر پورا اعتماد اور بھروسہ تھا۔ اور حقیقت میں بحری حکومت کی اولیت کا سہرا انہی کے

سرہے۔ اب تک صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ حکومت قریطش کی بربادی اور تباہی کا اصل سبب کیا ہے لیکن آثار قدیمہ جو برآمد ہوئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی بربادی کا سبب کچھ ایسے حوادث تھے جو یکایک عذاب آسمانی کی طرح نازل ہوئے لیکن جہاں تک قیاس کہتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکینیا (جزیرہ کریٹ کی نو آبادیات میں سب سے بڑی آبادی) کے باشندے خود مختار مینوس سے بگڑ گئے اور بغاوت کر کے اس کی جنگی طاقت ختم کر دی۔ یہاں تک کہ اس پر خود قابض ہو گئے۔ دوسری بات ان آثار سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان لوگوں نے شاہی حکومت سے مرعوب ہوئے بغیر جزیرہ کے سب سے بڑے شہر کنوسوس پر حملہ کر ڈالا۔ اور اس میں آگ لگا دی جس سے سارا شہر جل کر خاکستر ہو گیا یہ سب بربادیاں رونما ہوئیں لیکن اس کے تمدن پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہ پڑا اور نہ ان کی مدنیت اس سے کچھ متاثر ہوئی۔ البتہ جب یونانیوں نے حضرت مسیح سے بارہ سو برس قبل چڑھائی کی اور اسے فتح کر لیا۔ تو اس میں کچھ انحطاط شروع ہو گیا تھا۔

طرزِ تعمیر

قریطیوں کا طرز تعمیر مصریوں کے طرز تعمیر سے بالکل مختلف تھا۔ یہ مصری اور یونانی انجینیروں کی ذہانت طبع کا نتیجہ تھا۔ ان کے مکانات ایک مناسب طریقہ پر یک منزلہ ہوتے تھے لیکن اہل جزیرہ کو مصری اور یونانی فن تعمیر سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ ہر مکان میں ایک لمبا چوڑا صحن روشنی اور کھلی ہوا تلاش کرتے تھے۔ اور جب کسی مکان کی بنیاد ڈالی جاتی تو ان چیزوں کا سب سے پہلے خیال رکھا جاتا تھا۔ ان کے مکانات سہ منزلہ یا کم از کم دو منزلہ ضرور ہوتے تھے جن کی بلندی تقریباً اسّی گز ہوتی تھی کنوسوس کا محل بہت سے بالا خانوں پر مشتمل تھا جس کے سامنے ایک بڑا وسیع صحن تھا۔ ان بالا خانوں کو ایک گذرگاہ کہئے یا غلام گردش دو حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ پورے محل میں روشنی "لائٹ ہاؤس" یعنی روشنی خانہ سے پہنچائی جاتی تھی۔ ان کے پرنالوں کا انتظام کچھ اس عجیب و غریب طریقہ پر تھا۔ کہ آج جبکہ تہذیب و تمدن کی ترقی اپنی انتہائی منزل پر ہے۔ علماء آثار دیکھ کر محو حیرت ہو جاتے ہیں کیونکہ فی الحقیقت وہ اپنی شکل و صورت میں کوئی مثال نہیں رکھتے۔ صرف مشرق کی تاریخ قدیم ہی نہیں بلکہ آج بیسویں صدی میں یورپ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا آج بھی کریٹ میں تمدنی نشانات ایسے ملتے ہیں جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے قصر کنوسوس کی بالائی منزلوں پر دیواروں میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے کنوئیں ملتے ہیں جن میں پانی رکھنے کا انتظام تھا ان میں سے پانی بڑی بڑی نالیوں میں بہتا تھا جو پتھروں کو جوڑ کر بنائی جاتی تھیں اور ان کے اندر سیمنٹ کا پلستر ہوتا تھا ان نالیوں کا رخ دو بڑے حوض تھے ان حوضوں سے پانی بہہ کر ایک چھوٹی سی نہر میں گرتا تھا۔ جو محل کے قریب ہی اپنی تمام طلاطم خیزیوں اور نظر فریبیوں سے موجیں مارتا ہوا بہتا تھا۔ اسی طرح ان کے غسل خانوں اور استنجا خانوں میں بھی پانی کے جمع ہونے اور بہنے کا پورا انتظام تھا۔ مختصر یہ کہ مینوس شاہ قریطش ان صحت بخش اور نشاط انگیز چیزوں سے لطف اٹھاتا تھا جو شاہ جہارم وہم نوطیس کے خواب و خیال میں بھی نہ گذری ہوں گی کریٹ کے انجینیر ہیڈ رولک (جاری پانی کا علم) کے ماہر تھے ان کی چھوٹی چھوٹی نہریں جو کاٹ کر نکالی گئی تھیں اور محل کے زینے کے اردگرد بہتی تھیں۔ بالکل سیدھی نہ تھیں بلکہ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی تھیں۔ تاکہ نہروں کے بہاؤ میں تیزی نہ پیدا ہو۔

جزیرہ کی سڑکیں پختگی، صفائی، ستھرے پن اور نظم و ترتیب کے لحاظ سے بے مثال تھیں۔ انگلستان کا مشہور انجینیر میکاڈم اپنی مشہور شاہراہ کو انہی کے مشابہ مانتا ہے۔ کریٹ کی سڑکیں روما کی سڑکوں سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ شہروں کی سڑکیں عام سڑکوں سے بھی زیادہ آراستہ تھیں ان کے دونوں طرف پختہ رستے اور پہلو میں ایک نہر ہوتی تھی۔

عورتوں کا مرتبہ

عورتوں کو دوسرے ممالک کی بہ نسبت یک گونہ عزت حاصل تھی۔ قریطش میں صنف نازک کا مرتبہ بہت بلند سمجھا جاتا تھا وہ ایسے ایسے ہتھیار استعمال کرتی تھیں جن سے یونان و روما کی عورتیں واقف بھی نہ تھیں۔ اہل جزیرہ عورت کی ایک دیوی کی طرح پرستش کرتے تھے اور اسی کو اپنا حاجت روا خیال کرتے تھے۔ معابد میں عورتوں کا بھی مرتبہ ہوتا تھا۔ جو مساجد میں اماموں کنیسوں میں پادریوں اور مندروں میں سادھوؤں یا برہمنوں کا ہوتا ہے۔ سماجی زندگی میں بھی اُن کا درجہ مرد کے مساوی تھا۔ کھیتی باڑی اور مختلف شعبوں میں وہ اپنے شوہروں کے ساتھ حصہ لیتی تھیں ان کے ساتھ شکار کھیلنے اور سیرگاہوں میں تفریح کیلئے جاتیں۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے۔ کہ ورزشی کھیلوں میں شریک ہوتی تھیں وہ کشتی کا فن سیکھتیں۔ تالیاں بجاتیں اور دوسرے مردانہ کھیلوں میں حصہ لیتی تھیں۔

مردوں کا لباس عام طور پر اس زمانہ کے مردوں کے مشابہ تھا۔

بیچ کاری وہ ٹوپی پہنتے تھے اور پیر سے کھلا جوتا پہنتے تھے جاڑے میں بڑی بڑی چادریں استعمال کرتے تھے۔ اور اپنے سر کو سردی سے بچانے کے لئے عمامہ اور قبہ جو ایک انگریزی ٹوپی ہے۔ اور جسے انگریزی میں (BERET) کہتے ہیں استعمال کرتے تھے۔ ان کی عورتوں کا لباس مہذب اور متمدن یورپ کی معزز خواتین کے لباس سے بالکل مشابہ تھا۔

قریطش اور مصر

عام خیال ہے کہ مصر اپنے ہمسایہ ممالک سے ہمیشہ بے تعلق رہا لیکن یہ محض خیال ہے اور اس کی بنیاد ظن و تخمین پر ہے۔ مصر کو قرب وجوار کے ملکوں سے خصوصاً جزیرہ قریطش سے ہر نوع تعلق تھا۔ لوگوں کو دھوکہ اس بات سے ہوا کہ مصر و جزیرہ کریٹ کے درمیان تقریباً ۴۰۰ میل کی مسافت ہے جہاں پہنچنا اس زمانہ کی کشتیوں کی رفتار کے لحاظ سے مشکل تھا ہم ان کے خیال سے متفق بھی ہو جائیں۔ لیکن تاریخ کی اس شہادت سے کیسے اغماض کریں گے کہ فراعنہ کی تیسری پشت نے ایک جنگی بیڑا شام میں اور تجارتی جہاز سومالی لینڈ میں بھیجا تھا۔ کیا ایسی صورت میں یہ بات قرین قیاس نہیں کہ مصر اور جزیرہ کریٹ کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ قائم تھا۔ ہمارے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مصر و قریطش کے درمیان تجارت کا سلسلہ بہت قدیم زمانہ سے جاری تھا مصر کی بعض پرانی قبروں میں بالکل قریطیوں جیسے برتن پائے گئے ہیں دوسری طرف قریطش میں علماء آثار کو کچھ ایسے ظروف ملے ہیں جن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مصری ہیں اور ان کی ساخت ایک ایسے پتھر سے ہوئی ہے جسے دیوریت کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ظروف اسی زمانہ کے ہیں جب روئے زمین پر فراعنہ سے پہلے کے لوگ آباد تھے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ یہ ظروف زمانہ مابعد میں اہل جزیرہ تک پہنچے یعنی یہ ظروف مصریوں کی اختراع کے نمونہ تھے۔

غرضیکہ جزیرہ کریٹ اور مصر کے درمیان تجارتی اور غیر تجارتی تعلقات موجود تھے نیز مصر میں خاندان فراعنہ کی قبروں میں اس قسم کے ظروف کا پایا جانا جو قریطیوں کی ایجاد تھے۔ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ متمدن بھی تھے اور ایسے متمدن کہ مصریوں سے بھی دو قدم آگے۔

ان دونوں شہروں کی تجارت کا سلسلہ اس وقت منقطع ہوا جب مصر کی قدیم مملکت کا خاتمہ ہو گیا اور اشتراکیت مصر کے اندر پھیل گئی جس کی جڑیں مدت دراز تک ہری رہیں لیکن ذہنی اشتراکیت میں اضمحلال پیدا ہونے لگا۔ اس کی رگیں ڈھیلی پڑنے لگیں۔ ان کے تعلقات کی بندشیں بھی ٹوٹنے لگیں اور تجارت کا سلسلہ پھر از سر نو شروع ہو گیا

ایک قریطی برتن ابیدوس کی قبر میں ملا ہے جو اوح کی نسل کا ہے جس امحوت اور سنوسرت کے نام منقوش ہیں ہر شخص اس امحوت کی آواز سے گوش آشنا ہوگا جو اس عظیم الشان اور پر رفعت قربانگاہ کا بانی تھا جو تیبہ مصری، مصری بھول بھلیاں کے نام سے اب تک یاد کی جاتی ہے گو اس کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ اے کاش وہ عمارت اس سرزمین پر اپنی ساری خوبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ قائم رہتی کہ اس کا کریٹ کے مکانات سے موازنہ کیا جا سکتا لیکن اب ہمارے لئے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ہیروڈوٹس دیطبو مورخوں اور سیاحوں کے جو بیانات ہیں۔ اسی پر اکتفا کریں۔ اس کا نقشہ کریٹ کی بھول بھلیاں سے ماخوذ ہے۔ جب امحوت اور سنوسرت نے اپنے اہرام کی تعمیر کا قصد کیا تو اس کی بنیاد قاہون نامی ایک گاؤں میں رکھی اور درجہ تکمیل کو پہنچایا ان دونوں اہرام کے منہدم ہو جانے کی وجہ سے عمارت کے پتھروں اور دوسری چیزوں سے بعض محققین علم الآثار نے یہ استدلال کیا ہے جو ایک حد تک بجا بھی ہے کہ ان کی تعمیر میں کریٹ کے ماہر معماروں کا ہاتھ شامل تھا نیز مصری طرز کی تصویر چونکہ کریٹ میں پائی جاتی ہے اس لئے اس جزیرہ میں مصری بھی سکونت پذیر تھے جب ہیکسوس نے مصر فتح کیا تو مصر و قریطش کی تجارت معرض خطر میں پڑ گئی لیکن علماء آثار کو کریٹ میں سے صندوق کا ایک ڈھکن ملا ہے جو سنگ مرمر کا ہے جس کے اوپر لفظ "خیان" (جو خاندان ہیکسوس کا ایک معروف بادشاہ تھا) منقوش ہے جس سے بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ ہیکسوس نے مصر کی طرح اس جزیرہ کو بھی فتح کیا تھا لیکن یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ماحول کے اعتبار سے خاندان ہیکسوس جیسے دل و دماغ رکھنے والے بادشاہ قریطش کو فتح نہیں کر سکتے تھے اور نہ کبھی اس پر قابض ہونے کی خواہش کر سکتے تھے کیونکہ جس طرح ان کے پاس جنگی سر و سامان موجود تھا اسی طرح حکومت قریطش کے پاس بھی جنگی سر و سامان اور بحری بیڑے کافی تھے پس وہ مصر پر اس وجہ سے مسلط ہو گیا تھا کہ مصر بالکل بے سر و سامان تھا اس صورت میں سنگ مرمر کا ڈھکن جس پر ہیکسوس کے بادشاہ کا نام منقوش ہے اس بات کی روشن دلیل ہے کہ کریٹ اور مصر کے درمیان آمد و رفت اور تجارتی تعلقات قائم تھے مصریوں نے شمنت ہی کے زمانہ میں کیفتی کی طرف اشارے کئے ہیں اور اس کی بابت باہم مبادلہ خیالات کیا ہے۔ علامہ ہیکی کا قول ہے کہ کیفتی کے معنی ہیں وہ

باشندے جو بحر روم کے اس کنارے پر آباد تھے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کفطیو کوئی اور مقام نہیں ہے بلکہ کریٹ ہی ہے بحر اسود کے آخر میں واقع ہے بحر اسود کو مصری بحر روم کہتے تھے۔ اور سب سے واضح دلیل یہ ہے کہ کیفطیو جن کی تصویریں سحوت (ملکہ ہتشپسوت کا وزیر) کے مقبرے کی دیواروں پر منقوش ہیں کریٹ کی تصویروں کے بالکل مشابہ تھیں۔ کیفتی (جس کو کریٹ کہنا چاہئے) کے حکمران تھامس سوم نے مصر کی بہت بڑی بڑی خدمتیں انجام دی تھیں جن میں سے ایک اہم خدمت یہ تھی کہ شام کی لکڑیاں مصر لے جاتا تھا اور بعض لوگ کہتے ہیں روشنی خانہ (فاروس) کی مشہور بندرگاہ کی شکل وصورت اور اس کا طرز تعمیر زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میری تعمیر میں اہل قریطش کا بہت دخل ہے۔ انہی لوگوں نے یہ نقشہ تیار کیا۔

یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ بندرگاہ اہل قریطش کی تجارت کے لئے بہر صورت بہت سود مند تھی لیکن کنوسوس نے جب اس میں آگ لگا دی اور منہدم کر ڈالا تو اس نفع سے وہ محروم ہو گئے۔ اور اسی وقت سے مصر و قریطش کے تعلقات بھی منقطع ہو گئے ان کا ذکر مصر کی تاریخ قدیم میں محض ایک جگہ آیا ہے عمسیس سوم کہتا ہے مصر نے ایک ہی حملہ میں اہل جزیرہ کو مسخر کر لیا تھا۔ یہاں سے تضاد نظر آتا ہے۔ زکارو جو بلاشبہ زکرد کے باشندے تھے (زکرو جزیرہ قریطش کا ایک شہر ہے) دشمن (مصری) کی فوج کا ایک چست و چالاک عنصر بن گئے جس کی وجہ سے وہ مصر کے تخت پر فائز نظر آئے ورنہ بجا نصیب کہ مصر کی حکومت کا خواب و خیال ان کے دل میں گزرتا

آثار جدید کا اثر

اب تک علماء مدنیت کی تاریخ کا سہرا فنیشیوں کے سر باندھتے تھے لیکن آثار قدیمہ کے انکشافات سے یہ حقیقت یکسر بدل گئی قریطش میں جو آثار برآمد ہوتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مدنیت کے بانی مبانی اہل کریٹ ہیں۔ ان علماء کا خیال غلط بھی ثابت ہوا کہ ان لوگوں نے تمدن کو مصر سے یونان پہنچایا تھا اور انگریزی رسم الخط فنیشیوں کی ایجاد ہے۔ ان سب کے معلوم ہو کہ اہل قریطش میں فنیشیوں کا دور تمدن اتنا عروج نہیں حاصل کر سکتا تھا کہ وہ کتابت اور رسم الخط میں کوئی دخل دے سکتے یا اس کے خط وخال کے غازہ وصال میں کوئی خوبی کیفیت پیدا کر سکتے۔ یا اس کو سہل اور قریب الحصول بنا سکتے یہ قریطیوں ہی کے حصہ کی چیز تھی۔ فی الحال قریطہ میں سیپ کی تین کانیں دریافت ہوئی ہیں۔ جن سیپوں سے فنیشی اپنی رنگنگ کا سامان تیار کرتے تھے جو اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ جزیرہ میں رنگائی و رنگریزی کا بھی کافی رواج ہے۔

اوپر کے واقعات سے یہ بات بخوبی روشن اور واضح ہو گئی کہ یونان کے متمدن بنانے میں فنیشیوں سے زیادہ اہل قریطش کا حصہ ہے ہر شخص اس چھوٹے پہاڑ کی نسبت تھوڑی بہت واقفیت ضرور رکھتا ہوگا جسے اطلانتیہ کہتے ہیں اور جو بحر اطلانتک میں گھر گیا ہے اور یہ بحر اطلانتک اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ افلاطون کہتا ہے سولن سے ایک مصری کاہن نے دوران گفتگو میں اطلانتیہ کے متعلق بہت مفصل تقریر کی جس کی اکثر باتیں آج جزیرہ قریطش پر ٹھیک ٹھیک چسپاں ہو جاتی ہیں جس شخص نے کاہن غلماؤں اور بیلوں کی جنگ جو مقابلہ کی صورت میں ہوتی تھی کے متعلق بیان سنا ہوگا اس کی نظروں کے سامنے قریطش کے محلوں وغیرہ کھیلوں کا نقشہ کھنچ جائیگا اور وہ مشتبہ ہو جائیگا کہ کیا ایک ہی مقام کے لئے یہ دو مختلف لفظ ہیں یا واقعی ان دونوں لفظوں سے دو مقام مقصود ہیں



اشتہاری طلاؤں سے بچو!



نسخہ طلاء مردمی شائع کر دیا!

یہ نسخہ ہزاروں مریضوں میں مقبول عام ہو چکا ہے۔ اسے غور سے پڑھیں اور تیار کر کے فائدہ اٹھائیں اور اپنے رشتہ داروں کو فائدہ پہنچائیں۔ اس [illegible] کو با حفاظت رکھیں کیونکہ یہ بار بار شائع نہ ہوگا۔ مغز پستہ ۱ تولہ، مغز اخروٹ ۱ تولہ، مغز بادام ۱ تولہ، مغز چلغوزہ ۱ تولہ، سفید کنیر کی جڑ ۱ تولہ، جائفل ۱ تولہ، لونگ ۱ تولہ، کائفل ۱ تولہ، بیر بہوٹی ۶ ماشہ، ریگ ماہی (مچھلی) ۱ تولہ، مال کنگنی ۱ تولہ، سفید چرمٹی ۱ تولہ، ڈھاک کے بیج ۱ تولہ، سم اسپ ۱ تولہ، عقر قرحا ۱ تولہ، [illegible] ۱ تولہ، دارچینی ۱ تولہ، اونٹ کٹارے کی جڑ ۱ تولہ، تخم پیاز ۱ تولہ، کچلا ۱ ماشہ، زعفران ۷ ماشہ، سنکھیا ۱ ماشہ، خشک کچوے ۶ ماشہ، کستوری ۳ ماشہ، [illegible] ماشہ، [illegible] تولہ، چربی شیر ۱ تولہ، چربی سانڈہ ۵ تولہ، تیل چمبیلی ۵ تولہ، سم الفار سفید ۲ ماشہ، تیل [illegible] ۵ تولہ، تیل لونگ ۱ تولہ۔ مندرجہ بالا تمام خشک ادویات کو [illegible] کر چربی اور تیل کے ساتھ ملا کر [illegible] خوب [illegible] تیار [illegible] تیل نکال لیں۔ اب طلا تیار ہے اسے با حفاظت رکھیں۔ سوتے وقت اس کی مالش کریں [illegible] پان کا پتہ [illegible] باندھیں [illegible] اس کا استعمال [illegible] کیا جائے۔ [illegible] طاقت پیدا ہو [illegible] قائم [illegible] استعمال کر سکتے ہیں [illegible] ہر موسم میں استعمال ہو سکتا ہے۔ [illegible] طلب کریں۔ اس کے [illegible] تمام [illegible] آپ ایسے تیار نہ کر سکتے ہوں [illegible] اس طلا کی ایک شیشی جو قریب قریب دو ہفتہ کو کافی ہوتی ہے صرف تین روپیہ [illegible] معہ محصول ڈاک خرید سکتے ہیں۔



یورپ کا پلٹ



ایک بڈھے نے تین شادیاں کیں

یوگی [illegible] ایک بڈھے کو [illegible] دوائی کی [illegible] خوراکیں دیں جو مختلف وقتوں پر کھانی تھیں لیکن بڈھے نے غلطی سے سب خوراکیں ایک ہی دفعہ کھا لیں۔ [illegible] اس بڈھے نے تین شادیاں کیں اور سب [illegible] تندرست اولاد پیدا ہوئی چنانچہ [illegible] کی کوشش کرنے لگے [illegible] رشتہ دار [illegible] حیات [illegible] کی کوشش [illegible] اس نسخہ [illegible] انعام [illegible] اور آج تک کسی شخص نے اس انعام کو حاصل [illegible] نسخہ کو ہم نے تیار کیا اور احتلام، نامردی، جریان وغیرہ کے [illegible] مریضوں پر آزمایا جو بالکل مایوس ہو چکے تھے [illegible] ایک دفعہ ضرور آزمائیں [illegible] ۲۲۵ مریضوں کو احتلام، نامردی، جریان وغیرہ میں آزمایا واقعی آپ کا نسخہ قابل تعریف اور مفید پایا ہے۔ ہمارا اپنا تجربہ ہے کہ اس کا تھوڑے ہی دن استعمال سے چہرہ کو خوبصورت اور جسم کو سڈول بنا دیتا ہے۔ [illegible] ہر قسم کی کمزوری دور ہو جاتی ہے اور مایوس [illegible] مرد [illegible] ہو جاتا ہے۔ [illegible] یورپ کا پلٹ [illegible] ہمیں [illegible]

خادم وید رتن [illegible] بلاس کمپنی لمیٹڈ کان پور



عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۳۳ — فہرست مندرجات ماہ مئی ۱۹۴۲ء — نمبر ۵

سالانہ نمبر ۱۹۴۲ء کی مندرجات کی فہرست صفحہ ۱۷ تا ۲۰ ملاحظہ فرمائیے

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شایع کیا۔

عالمگیر کے سالنامہ معاونین کی توجہ کیلئے

ہر خریدار براہِ کرم اس اعلان کو غور سے پڑھے!

ماہ جون کے پہلے ہفتہ میں حسبِ سابق رسالہ عالمگیر کا سالانہ نمبر جلوہ گرِ اشاعت پر آرہا ہے۔ یہ اشاعت خصوصی کن باصرہ نواز خصوصیات کی حامل ہے؟ اس کا اندازہ یا تو عالمگیر کے گذشتہ سالناموں اور خاص نمبروں سے ہوسکتا ہے یا اس فہرست مضامین سے لگایا جاسکتا ہے جو اسی پرچہ میں صفحہ ۷ تا ۱۰ پر شایع کی جارہی ہے جن معاونین کرام کی چٹوں پر خریداری نمبر کے ساتھ حرف "س" لکھا ہوتا ہے ان کا چندہ چونکہ ماہ مئی کے پرچہ کے ساتھ ہی ختم ہو رہا ہے اس لئے سالانہ نمبر اُن کی خدمت میں بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا۔ امید ہے وہ ازراہِ ادب نوازی اسے ضرور وصول فرمالیں گے۔ جن معاونین کرام کی خریداری نمبر کے ساتھ حرف "خ" لکھا ہوتا ہے اُن کا چندہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ لہذا "سالانہ نمبر" اُن کو مزید زیر بار کئے بغیر ارسال کر دیا جائے گا البتہ چونکہ رستہ میں اس نمبر کے گم یا ضایع ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لئے معاونین کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اس اعلان کو پڑھتے ہی چار آنے کے ٹکٹ بھیج دیں تاکہ سالانہ نمبر ان کی خدمت میں بذریعہ رجسٹری ارسال کیا جائے کاغذ چونکہ انتہائی طور پر مہنگا ہو چکا ہے اس لئے سالانہ نمبر صرف ضرورت کے مطابق چھپوایا جائے گا لہذا قارئین نوٹ فرمالیں کہ عدم وصولی کی اطلاع آنے پر پرچہ دوبارہ نہیں بھیجا جاسکے گا پس بہتر یہی ہے کہ جن خریداروں کا چندہ ابھی ختم نہیں ہوا وہ سالانہ نمبر بحفاظت حاصل کرنے کیلئے چار آنے کے ٹکٹ بواپسی ڈاک بھیج دیں اور اپنا خریداری نمبر بھی تحریر فرمائیں تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔

مینیجر عالمگیر۔ لاہور

حسنی کی سولھویں سالگرہ پر

نظم

حضرت سید آوش عسکری طباطبائی بی اے

ہر نقشِ پا ہے غیرتِ صد لالہ زار آج
قدموں میں اُس کے لوٹ رہی ہے بہار آج

طرزِ خرام دیکھ کے اس مستِ ناز کا
کھاتی ہے غش نسیم چمن بار بار آج

ہر ذرہ حقیر ہے دلکش بجائے خود
لیلائے دہر پر ہے غضب کا نکھار آج

چھایا ہوا ہے فرش سے تا عرش اک سکوں
ٹھہری ہوئی ہے گردشِ لیل و نہار آج

آیا ہے گھر کے ابرِ سیہ سوئے میکدہ
اُمڈی ہوئی ہے رحمتِ پروردگار آج

ساقی کی چشمِ مست کو مے ریز دیکھ کر
بدلی ہوئی ہے نیتِ توبہ شکار آج

مستی بھری ہوا میں اثر ہے شراب کا
ہر چیز کائنات کی ہے بادہ خوار آج

سرشار ہیں حباب تو گرداب رقص میں
بہکی ہوئی ہے موجِ لبِ جوئبار آج

چلمن سے جیسے جھانک رہی ہو کوئی پری
یُوں خار و خس سے پھوٹ رہی ہے بہار آج

رگ رگ سے موجِ خونِ بہاراں اُبل پڑے
پھولوں سے ہو نسیم اگر ہمکنار آج

بادِ چمن ہی کیا ہے گل افشاں و عطر بیز
موجِ ہوائے دشت بھی ہے کیف بار آج

جشنِ طلوعِ صبح نہیں اک ترانہ خیز
بزمِ سکوتِ شام بھی ہے نغمہ زار آج

ہے ہر نگاہ حسن کا پہلو لئے ہوئے
خود اک دُلھن بنا ہوا ہے انتظار آج

جیسے کنول میں روپ دکھاتی ہے لکشمی
یوں ڈبڈبائی آنکھ میں ہے حُسنِ یار آج

ارضِ وطن ہے وادیٔ ایمن پہ خندہ ریز
یوں برق کوندتی ہے سرِ کوہسار آج

وہ عشق جس کی شان تھی آشفتہ خاطری
مشاطگی کو حُسن کی ہے بیقرار آج

حل کر دیا ہے عنبر سارا شراب میں
یا مست انکھڑیوں میں رچا ہے خمار آج

اک شورِ تہنیت سے ہے لبریز کائنات
طائر وہ نغمہ زن ہیں سرِ شاخسار آج

حوریں ہیں محوِ دید جھروکوں سے خلد کے
اُس نقطۂ عروج پہ ہے حُسنِ یار آج

اک ماہوش کے جشنِ جوانی کا روز ہے
پورے کئے ہیں عمر نے سولہ سنگھار آج

آجائے حرفِ شوق نہ لب پر کہیں بسرکش
مچلا ہے بے طرح دلِ بے اختیار آج

راز و نیاز

یہ دیکھنے کو تماشے ہیں، یا دکھانے کو

از حضرتِ راز یزدانی امبہٹوی

چلا ہوں قلب کی حسرت پہ مسکرانے کو   خیال یہ ہے کہ ٹھوکر لگے زمانے کو
گلوں کی آڑ میں تو، اور پریم کے نغمے   اِدھر تو دیکھ یہ کلیاں ہیں مسکرانے کو
مٹا دل اور یہ اندوہِ جانستاں نہ مٹا   اٹھائی آپ نے زحمت مجھے مٹانے کو
وہ بجلیوں کا چمکنا وہ برہمی توبہ   رہا نہ جب کوئی منظر مجھے دکھانے کو
جنوں نہیں اسے ذوقِ تمام کہتے ہیں   کہ میری عقل نے ٹھکرا دیا زمانے کو
بہار و برق کی بیداد کہہ نہیں سکتا   دلھن بنا کے جلایا ہے آشیانے کو
مرا جنوں ہے کہ تیرے مذاق کی تکمیل   یہ دیکھنے کو تماشے ہیں یا دکھانے کو

محال ہے کہ اُسے راز کر سکے سجدہ
جبیں سے ربط نہ ہو جس کے آستانے کو

عالمگیر سالانہ نمبر ۱۹۴۲ء

کی ایک جھلک

حسبِ معمول اوائل ماہ جون میں رسالہ "عالمگیر" کا ہنگامہ پرور "سالانہ نمبر" شائع ہو رہا ہے جس کی کائنات کاغذ کی گرانی و نایابی کے باوجود دو سو صفحات تک وسیع ہوگی اس میں

ایک درجن سے زائد علمی و ادبی اور تاریخی مضامین

ہونگے جو اپنے موضوعات کی افادی خوبیوں کے اعتبار سے تحقیق و تدقیق اور حکیمانہ تفحص و تجسس کا بہترین نمونہ ہیں۔

ڈیڑھ درجن سے زیادہ افسانے اور ڈرامے

ہونگے جن میں ہر افسانہ اور ڈرامہ رنگین و دلآویز ہونے کے علاوہ ہندوستانی افسانہ نویسی کی ترقی یافتہ مثال ہے

اڑھائی درجن کے قریب نظمیں اور غزلیں

ہونگی جو اندازِ قدیم و طرزِ جدید کی آئینہ دار ہیں مضمون نگاروں اور شاعروں میں ہندوستان کی جلیل القدر اور کہنہ مشق ہستیاں شامل ہیں۔ الغرض "سالانہ نمبر" کے دو سو صفحات میں آپ کو

علم و ادب اور شعر و شاعری کی ایک کائنات

سمٹی ہوئی نظر آئے گی۔ اگلے تین صفحوں پر "سالانہ نمبر" میں شائع ہونے والے

مضامین نظم و نثر کی ایک مختصر سی جھلک

پیش کی جا رہی ہے اسے ایک نظر دیکھ کر اندازہ لگایئے کہ "سالانہ نمبر" آپ کے سلجھے ہوئے ذوق اور علمی و ادبی مذاق کی تکمیل کے لئے کس درجہ ضروری ہے؟؟

علمی و تاریخی مقالات

منصور حلاج ——— مولانا محمد اسمٰعیل ناصح،

منصور حلاج کے متعلق اب تک جو حالات کتابوں اور رسالوں میں شایع ہوئے ہیں وہ غیر محققانہ اور محض حسنِ ظن کے ممنون ہیں۔ لائق مقالہ نویس نے بے شمار کتابوں کے مطالعہ کے بعد منصور حلاج کو اپنی حقیقی صورت میں پیش کیا ہے۔

سلاطین دہلی کے عہد میں آفتاب علم کی ضیاپاشیاں!

——— خواجہ احمد فاروقی ———

اس معلومات افروز مضمون میں بتایا گیا ہے کہ عہد غزنویہ، عہد غوریہ، خاندان غلاماں، اور خاندان تغلق کے زمانے میں کیا علمی ترقی ہوئی اور سلاطین دہلی نے ہندوستانی تہذیب کے بنانے اور سنوارنے میں کیا حصہ لیا۔

خلفا و اُمرائے عرب کی تحریریں — الحاج عبدالقیوم ندوی

خلفا و اُمرائے عرب جہاں میدان مذہب و سیاست کے شہسوار تھے وہاں علوم و فنون اور ادبی و بزمی دنیا کے بھی بادشاہ تھے۔ اس نادر مقالہ میں ان کی تحریرات کے بعض ایمان افروز نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

کیا نباتات و معدنیات ذی حیات ہیں؟

——— سید ارشاد حسین اظہر ———

سر جگدیش چندر بوس آنجہانی وہ پہلے ہندوستانی سائنسدان ہیں جنھوں نے ثابت کیا کہ نباتات و معدنیات ذی حس اور اہل دل ہیں۔ اس بلند پایہ سائنٹفک مقالہ میں اُن کے اسی نظریئے کی وضاحت کی گئی ہے۔

میر معصوم قندھاری — خانصاحب حکیم محمود علی خاں ماہر اکبرآبادی

شہنشاہ اکبر کی نظرِ انتخاب نے بے مثل اور باکمال افراد کو دور دور سے منتخب کرکے اپنے دربار کی زینت بنایا تھا۔ جن میں سے میر معصوم قندھاری کے حالات اس مضمون میں ملاحظہ فرمایئے۔

لاہور کا ایک بدنصیب بادشاہ — پروفیسر محمد علم الدین سالک

شہریار لاہور کا ایک بدنصیب بادشاہ تھا۔ وہ نورجہاں کا داماد تھا۔ اور اس کی رفیقۂ حیات کی قبر نورجہاں کے مقبرہ میں اب بھی موجود ہے۔ یہ تاریخی مقالہ شہریار کی زندگی کے حالات پر مشتمل ہے۔

ادبی مضامین

امیر مینائی کوچۂ زلف و گیسو میں — مولٰینا اظہر امرتسری

زلف و گیسو فارسی و ہندی شعرا کا ہمیشہ مرغوب ترین موضوع رہا ہے اور بعض شاعروں کے کلام میں اس کا تذکرہ اس درجہ طویل نظر آتا ہے کہ اسے ناپنے کے لئے شب دراز اور زلف رسا کی ضرورت ہوگی۔ مقالہ زیر نظر میں حضرت امیر مینائی کے ان شعروں کو موضوع تنقید بنایا گیا ہے جو زلف و گیسو سے متعلق ہیں۔

سر ست دھپ ہیں! — مولوی بشیر احمد قریشی بہاولپوری

فاضل مضمون نویس ایک عرصہ سے روزمرہ، محاورہ، حروف تکرار، اور اصواتی الفاظ کی جمع و ترتیب میں مصروف ہیں۔ اس مضمون میں آپ نے علم صوت پر گرانقدر روشنی ڈالی ہے اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت دلچسپ امثلہ سے کی ہے۔

(سامنے کا صفحہ ملاحظہ فرمائیں)

یہ سالانہ نمبر سالانہ خریداری کی صورت میں مفت پیش کیا جائے گا

شاعروں کی باتیں ——— ماسٹر ممتاز حسین بسمل

اس دلچسپ مضمون میں داغ، حالی، ریاض، شبلی، وحشت، اردو کے ممتاز ترین شعرا کی بعض پُرلطف باتیں بیان کی گئی ہیں جن سے ان کی زندگی کے انسانی پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

شاد کا مرثیہ شباب ——— عطاء اللہ پالوی

"جوانی" کے موضوع پر اردو کے تمام شعرا نے گل افشانیاں کی ہیں لیکن جتنے درد انگیز پیرائے میں شاد نے مرثیہ شباب لکھا ہے۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ مقالہ اسی زاویۂ نگاہ سے سپرد قلم کیا گیا ہے۔

عرب کا بذلہ سنج شاعر ——— از: علی مظفر بیرگی

ابوجعفر منصور کے دربار میں ابودلامہ ایک بذلہ سنج حاضر جواب، اور نظر شناس شاعر تھا۔ اس مضمون میں اس کی زندگی کے بعض دلچسپ واقعات پیش کئے گئے ہیں۔

افسانے اور ڈرامے

قلوپطرہ کی ایک رات ——— شبلی بی کام

مصر کی شہرۂ آفاق ساحرہ کی ایک رومان پرور رات جس کو فرانس کے ادیب لیبیب گاشیئر کے بہار آفریں قلم نے زندۂ جاوید بنایا اور جسے شبلی بی کام نے شگفتہ اردو کا لباس پہنایا ہے

رعمسیس ثانی کا معاشقہ ——— میرزا ادیب بی۔ اے

رعمسیس ثانی مصر کا جابر و قاہر فرعون تھا۔ اس رنگین و دلاویز ڈرامے میں اس کی داستان عشق ملاحظہ فرمایئے۔ مصر کی ایک حیرت زا کہانی!

ٹوٹی ہوئی کرسی کا رومان ——— سید احسان علی شاہ بی اے

ممکن ہے ٹوٹی ہوئی کرسی آپ کے نزدیک قابل توجہ نہ ہو، لیکن فاضل افسانہ نویس نے اس معمولی سی چیز کے ساتھ ایک رومان وابستہ کر کے اس کی وقعت بڑھا دی ہے۔ معرکہ آرا افسانہ

بیزاریاں ——— شفیق الرحمان

"میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک بیزار ترین چہرہ عجیب بیزاری سے بیزار تھا۔ جس پر ایک عجیب و غریب ناک چسپاں تھی"۔ اس افسانہ نما مزاحیہ ڈائری میں اسی قسم کی مختلف بیزاریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شیریں فرہاد ——— قاضی امداد انصاری

قارئین میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے سرزمین ایران کی مشہور و معروف رومانی کہانی "شیریں فرہاد" نہ سنی ہو لیکن لائق مضمون نگار نے متعدد کتابوں کے حوالے سے اس داستان کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جو اب تک اکثر نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔

نیزہ بردار ——— ابو محمد امام الدین رامنگری

قومی غیرت اور وطنی محبت میں ڈوبا ہوا، ایک اخلاق آموز اور بصیرت افروز چینی شاہکار جس میں جنگ و جدال کے مناظر کے علاوہ عشق و محبت کی رنگینیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

آسیب زدہ مکان ——— جمیل احمد کندھاپوری ایم۔ اے

یورپ کے ممتاز ترین ماہر فراست الید اور مشہور افسانہ نویس کیرو کا ایک پراسرار، تحیر زا اور ڈراؤنا شاہکار جس کی تفصیلات کے متعلق افسانہ نگار کا دعوٰی ہے کہ وہ سو فیصدی صحیح ہیں۔

ڈاکٹر شوکت ——— مظفر واسطی شاہ آبادی

وہ ڈاکٹر تھا۔ وہ لوگوں کے پرپیچ امراض کا علاج کیا کرتا تھا لیکن ایک دفعہ وہ خود ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو گیا جس کا علاج کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا یہ مرض کیا تھا؟ ایک دلچسپ نفسیاتی افسانہ۔

چگلی (احمد ندیم قاسمی) اس رات اس کی نیندوں پر دوشیزاؤں کی جادو بھری مسکراہٹیں برستی رہیں! سے کائنات شفاف آنکھوں میں اکڑی ہوئی نظر آتی رہی۔ آخر چند دنوں کے بعد ایک رات ——— شباب انگیز افسانہ۔ رنگینی و رومانیت کے لحاظ سے فاضل (ادیب) [illegible]

عورت ــــ علی احمد بی-اے

قبل از مسیح سے تین سو سال قبل چوانگ چاؤ نامی ایک شخص چاؤ کے شہر میں رہتا تھا۔ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک تتلی میں تحویل ہو گیا ہے اس کے بعد کیا ہوا؟ چینی افسانہ نگار ری کے جو کا عظیم الشان کارنامہ۔

اعترافِ شکست ــــ اے۔ آر۔ رشدی

ان سب کو اپنے خیالات میں شکست ہوئی اور آخر ان کو اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ تفصیل اس ہنگامہ خیز، سبق آموز افسانہ میں پڑھئے۔ جو خطوط کی صورت میں لکھا گیا ہے۔

اسٹیشن ماسٹر ــــ سالک لکھنوی

عورت جس گھر میں داخل ہوتی ہے اسے جنت کا ایک گوشہ بنا دیتی ہے لیکن جب اس کی محبت کو ٹھکرا دیا جائے تو وہی گھر دوزخ کا نمونہ بن جاتا ہے یہ افسانہ اسی مرکزی نقطے کے گرد گھومتا ہے۔

ٹیگور کی پانچ مختصر کہانیاں ــــ محمد یونس حسرت

حال ہی میں رابندرناتھ ٹیگور آنجہانی کی مختصر کہانیوں کا ایک مجموعہ بنگالی زبان میں شایع ہوا ہے جس میں سے پانچ دلاویز کہانیوں کا ترجمہ، اس عنوان کے تحت "سالانہ نمبر" میں ملاحظہ فرمایئے۔

ہائے ناکامیاں محبت کی! ــــ آسی رامنگری

انھوں نے پیمانِ وفا باندھا۔ لیکن دنیا ایک پہاڑ بن کر ان کے رستے میں حائل ہو گئی۔ ایک حسرت انجام افسانۂ محبت۔

امرت کے گھونٹ ــــ میرزا عنبر بھوپالی

حسین و جمیل افسانہ جس میں جابجا مزاح کی چاشنی دی گئی ہے آپ اسے پڑھ کر یقیناً محظوظ ہوں گے۔

منظومات

موجِ فصاحت ــــ فصاحت جنگ حضرت جلیل

رعشق و مذہب ــــ حضرت امجد حیدر آبادی

طوفانِ نوح ــــ حضرت نوح ناروی

راز و نیاز ــــ حضرت راز رامپوری

تجلیات ــــ حضرت اظہر امرتسری

شام و سحر ــــ حضرت ماہر القادری

نہ تم سننے والے نہ میں کہنے والا ــــ حضرت زیبا ناروی

تغیر ــــ حضرت مقبول حسین احمد پوری

آدمی پیدا ہوا ہے ــــ حضرت ماہر اکبر آبادی

میخانۂ محبت ــــ حضرت فراق گورکھپوری

جوانی سے کے آیا ہوں ــــ جناب محمد شرف الدین سلیم

شکوۂ النفات ــــ جناب قاسم جے پوری،

علاوہ ازیں ہندوستان کے درجنوں پختہ مشق شعرا کا تازہ ترین کلام

یہ سالانہ نمبر ۱۹۴۲ء

مفت حاصل کرنے کے لئے آج ہی رسالہ عالمگیر کی سالانہ خریداری قبول فرمایئے اس صورت میں آپ کو نو ۹ عام اشاعتوں کے علاوہ تین معرکہ آرا خاص نمبر بھی مفت ملیں گے یعنی جون میں یہ سالانہ نمبر دسمبر ۱۹۴۲ء میں عید نمبر ۱۹۴۳ء اور اپریل میں تاریخ نمبر سالانہ چندہ للعہ مع محصولڈاک آج ہی فرمائش بھیجئے۔ منیجر عالمگیر لاہور

گونگا

نفسیاتی کہانی

از جناب انتصار حسین نیوتنوی

میں پورے تین برس سے خاموش ہوں۔ بالکل خاموش یہاں تک کہ لوگ مجھے گونگا سمجھتے ہیں۔ بعض کا تو یہ خیال ہے کہ میرا دماغ پھر گیا ہے اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ میری زبان پر فالج کا اثر ہے۔ میرے یہ تین سال مکمل خاموشی میں گذرے ہیں۔ اس حد تک کہ مجھے زبان کھولنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جتنے الفاظ دنیا میں بولے جاتے ہیں۔ وہ کبھی میری زبان پر بھی تھے۔ مگر آج تین برس سے میں نے کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا۔ میرے کچھ اپنے اصول ہیں جو زبان کی جگہ میری مشکل کشائی کرتے ہیں۔ اور کچھ خاص قسم کی حرکتیں اور اشارے ہیں جن کو میں نے اپنا لیا ہے اور جو آسانی سے میرے مفہوم کی ترجمانی کر دیتے ہیں۔

مدتوں میرا علاج کیا گیا۔ صینوں گنڈے اور تعویذوں سے جھاڑ پھونک ہوئی۔ درگاہوں اور خانقاہوں میں منتیں بھی مانی گئیں مگر سب کچھ بیکار ثابت ہوا۔ زبان کا یہ طلسم نہ ٹوٹنا تھا نہ ٹوٹا۔ اور اب سب ہار تھک کر بیٹھ رہے ہیں۔ سب سمجھتے ہیں کہ میرا مرض لاعلاج ہے۔ اور اب کوئی طاقت میری کھوئی ہوئی گویائی واپس نہیں لاسکتی گھر والوں کو جو اچانک چوٹ میری خاموشی سے لگی تھی وہ اب مٹ سی گئی ہے۔ اور وہ احساس جو یکدم خاموش ہو جانے سے میرے اندر بیدار ہو گیا تھا زائل ہو چکا ہے۔ میری بیوی میری اس انوکھی تبدیلی کو "اپنی قسمت کا لکھا" سمجھتی ہے۔ اور شاید میرے دوست اسے قدرت کی ستم ظریفی سمجھتے ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ میں اپنی بیسویں سالگرہ کے دن خاموش ہو گیا تھا نہ معلوم کیوں؟ اور اس وقت تک تین سالگرہیں میں نے بغیر بولے منائی ہیں۔ رسم سالگرہ عموماً بڑے گھروں میں منائی جاتی ہے۔ اور یہ رسم میرے لئے اس وقت کا عطیہ ہے جب میں بڑا تھا۔ میرا گھر بڑا تھا اور میرے منہ میں زبان تھی۔ مگر اب تو اس رسم کا میں بالکل طرفدار نہیں۔ ایک گونگے کی سالگرہ اور وہ بھی کس مپرسی کی حالت میں۔ نہ کسی کو میری زندگی کی خوشی نہ مرنے کا غم، سالگرہ اپنے معنی و مطلب میں خود گونگی سی نظر آتی ہے۔ مگر گھر والے اس روز اپنی بساط بھر سب کچھ کرتے ہیں۔ یوں تو سالگرہ کے لوازم بہت سے ہیں مگر میری سالگرہ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ دو چار دس عزیزوں کی دعوت، میرے اوپر سے کچھ پیسوں کی خیرات، میرے حضور میں کسی معمولی تحفہ کی پیشکش اور بس!

آج کے دن میرے بھولے بسرے احباب بھی آجاتے ہیں۔ اشاروں سے میری مزاج پرسی کرتے ہیں۔ خود مسکرا کر مجھے ہنسنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ خود میرا جی چاہتا ہے کہ میرے جسم کی تمام قوت سمٹ کر زبان میں آجائے اور میں بولنے لگوں مگر نہیں بول سکتا آج کے دن مجھے اگلی پچھلی ساری باتیں خواب کی طرح یاد آتی ہیں وہ میری عمر کے نورانی بیس سال! میرا شاندار ماضی! میری بھولی ہوئی کہانیاں! پھر فوراً ہی مستقبل کا ڈراؤنا منظر، ان سب کے درمیان میں میرے تاثرات بھی گونگے بن جاتے ہیں۔ میں کیا تھا کیا ہو گیا؟ میری بیوی اپنا رکھا رکھایا جوڑا پہن کر آج کے دن میرے سامنے آتی ہے۔ سر کو ریشمی دوپٹے کے آنچل سے چھپا کر پوچھتی ہے "پسند آیا؟" میں ہوں ہاں کر دیتا ہوں۔ مگر دل سے مجھے اس کی یہ حرکتیں پسند نہیں آتیں۔ میں شرما سا جاتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں وہ جو کچھ کرتی ہے۔ اس کے سن کا تقاضا ہے جس کو اگر میرے منہ میں زبان ہوتی تو پورا کرتا۔ باوجود عملی ہمدردی کے یہاں زبانی ہمدردی کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے اور میں نگاہیں نیچی کر لیتا ہوں آج کے دن میں چوروں کی طرح منہ چھپائے پھرتا ہوں۔ مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا۔ میں اپنے خیال کے مطابق سوچتا ہوں کہ ہر آنے والا میری بے زبانی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ ہر شخص کو میرے اس عیب کا احساس آج ہی کے دن زیادہ ہوتا ہے۔ مگر یہ روگ تو اب زندگی کے ساتھ ہے۔

میں نے گھر بھر سے الگ ایک کمرہ اپنے لئے تجویز کر لیا ہے رات دن اسی میں پڑا رہتا ہوں۔ یہاں مجھے سب کی بولیاں سنائی دیتی ہیں۔ سب کے قہقہے میرے کانوں میں آکر گونجتے ہیں۔ بیوی آکر ناشتہ کرا جاتی ہے۔ وقت پر کھانا دے جاتی ہے

اور ضروریات کی چیزیں بھی پہنچا جاتی ہے۔ مگر اس سے یہ مطالبہ کبھی نہیں ہوتا۔ میں چاہتا ہوں وہ بولے نہ ہنسے میری شریک زندگی بھی میری طرح گونگی بن جائے۔ میرے دکھ درد میں شریک رہے۔ کس قدر لاچاری ہے۔ اگر زبان ہوتی تو شاید یہ مطالبہ ہی نہ کرتا۔ اور اب زبان نہیں ہے تو منع بھی نہیں کر سکتا۔ میرے خاندانی عزیز بوڑھے۔ جوان۔ بچے۔ دن میں کئی کئی مرتبہ میرے گھر میں آتے ہیں۔ مگر میرے پاس نہیں آتے۔ شاید میری عادت سے واقف ہو گئے ہوں۔ میں بہت کم انھیں خوش آمدید کہنے پر رضامند ہوتا ہوں۔ دوسرے وہ آ کر کریں کیا۔ نہ اپنی سنا سکتے ہیں۔ نہ میری سن سکتے ہیں۔ میری بیوی ان سب کو ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے ان لوگوں سے اس کا دل بہت بہلتا ہے۔ ان لوگوں میں ایک صاحب ہیں، جو میرے رقیب بن کر رہ گئے ہیں۔ وہ زیادہ تر میری بیوی ہی کے پاس آ کر بیٹھتے ہیں۔ اس کا دل بھی بہلتا ہے اور اپنا دل بھی بہلاتے ہیں۔ دنیا زمانے کے قصے، اپنی جوانمردی کی نت نئی کہانیاں آ آ کر سناتے ہیں۔ جب کبھی میرے کانوں میں اُن کی باتیں پڑتی ہیں تو دل جل بھن کر خاک ہو جاتا ہے۔ مگر مجبور ہو جاتا ہوں۔ کاش میرے پاس بھی زبان ہوتی تو ان کی ساری ہیکڑی کو رد کر دیتا۔ مجھے خدا کی شان نظر آتی ہے۔ جو باتیں مجھے اپنی بیوی سے کرنا تھیں۔ وہ اب ان کی زبان پر ہیں۔

میری بیوی بہت حسین ہے۔ میری نظروں میں بھی اور دنیا کی نظروں میں بھی مگر مجھے وہ بالکل اچھی نہیں لگتی۔ اب مجھے اس کے حسن میں ایک تمسخر آمیز مسکراہٹ دکھائی دیتی ہے۔ آنکھوں سے ہر وقت شرارت جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے سب سے زیادہ آرام و سکون اپنے کمرے میں ملتا ہے۔ یہاں ہر چیز میری طرح خاموش ہے۔ کسی کو کسی سے کوئی مطالبہ نہیں۔ میری کتابیں میرا قلم۔ میرے کاغذ۔ میرا بستر۔ میرا لیمپ سب میری طرح گونگے اور بے حس ہیں۔ میں جس وقت جس چیز سے کام لینا چاہوں لے سکتا ہوں۔ ان کے ساتھ مجھے کوئی تکلف نہیں برتنا پڑتا اور نہ وہ میرے ساتھ کسی قسم کی ریاکاری کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے باہر مکر و فریب کی دنیا پھیلی ہوئی ہے۔ جسے دیکھو وہ زباندانی کا دعویٰ لے کر میرے سامنے آتا ہے۔ اشاروں سے گفتگو کرتا ہے گویا ان کے نزدیک میں انسان نہیں اور نہ انسانی بولی سمجھ سکتا ہوں۔ میرے کمرے کے باہری دروازے سے ایک پگڈنڈی سی سیدھی اسٹیشن تک چلی گئی ہے۔ کبھی کبھی میں اس دروازے کو کھول کر باہر نکل جاتا ہوں۔ یہاں بھی مجھے بہت سی بے زبان چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً غلّے سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں، جن کے بیل بے زبانی کے ساتھ اپنا رستہ طے کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ منزل دور اور زبان پر شکایت کا کوسوں پتہ نہیں۔ اتنے کافی بوجھ کے باوجود ہنٹروں کی مار مگر خاموش، اگر کبھی کسی بیل نے گھبرا کر جوئے سے نکلنا چاہا تو مالک چمکارنے لگا۔ گویا انصاف اور خاموشی میں ضد ہے۔

یہ پگڈنڈی آگے چل کر سڑک سے مل جاتی ہے جہاں یکّے تانگے۔ موٹریں سب ہی کچھ دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے یہاں جاندار اور بے جان چیزوں کی شرکت میں بڑا لطف آتا ہے۔ تانگہ کی گھنٹی برابر بجتی رہتی ہے۔ پیدل چلنے والے مسافر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں اور سڑک خالی کر دیتے ہیں۔ ایک بے زبان کے ساتھ ایک زبان دراز رستہ بھر اسی طرح شور مچاتا چلتا ہے۔ مگر کسی کو کسی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایک دوسرے سے اتنے قریب اور پھر بھی عادات و اطوار میں زمین و آسمان کا فرق! ایک خداداد اور دوسرے سائینس داد۔ اسی طرح موٹر چلانے والے ڈرائیور کی خاموشی بھی قابل رحم ہے۔ میں تو خیر گونگا ہوں مگر وہ صاحب زبان رکھتے ہوئے بھی ہارن بجاتے ہیں اور خود اپنی بے زبانی کا ثبوت دیتے ہیں۔ کاش ان کی جگہ میں موٹر پر ہوتا۔ تو کبھی ہارن نہ بجاتا بلکہ خود ہی ہر طرف ہٹو بچو، ہٹو بچو، کی صدائیں بلند کرتا ہوا چلتا۔ میرے دل میں ارمان کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے کہ میں دنیا میں شور تک نہیں مچا سکتا۔ اسی سڑک پر کہیں کہیں ٹھیلوں میں آدمی جُتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جو جانوروں کی طرح بے زبانی کے ساتھ اپنا رستہ طے کرتے رہتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر میں سوچتا ہوں کہ انسان اور جانور میں بجز جسمی اختلاف کے اور کوئی امتیازی فرق نہیں ہے۔ پھر یہ اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کس طرح کر بیٹھے؟ صرف زبانی ہی جمع خرچ ہے نا؟ کمبخت ٹھیلے میں جُتے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم سے بڑا کوئی نہیں۔ ان انسان نما جانوروں میں ایک امتیازی شان یہ ہے کہ تھکے ہوئے آدمی کو ٹھیلے پر بٹھا کر باری باری سے ٹھیلا کھینچتے ہیں۔ جب جُتا ہوا آدمی تھک جاتا ہے تو بیٹھا ہوا آدمی اتر کر ٹھیلا کھینچنے لگتا ہے اور پہلے

والے آدمی کو بٹھا دیتا ہے۔ گویا ایک دوسرے کے ساتھ رستہ بھر اسی طرح سلوک کرتا چلتا ہے۔ مجھے تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے "یہ سلوک کرنا کیا جانیں جب ان کے ساتھ دنیا میں سلوک نہیں کیا گیا۔ اسٹیشن پہنچے تو مالک نے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر مزدوری رکھدی۔ اگر گڑگڑا کر دو چار پیسے اور مانگ لئے تو کمبخت اسے مالک کا سلوک کہتے ہیں۔ اسے دھن دان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بال بچوں کو دعائیں دیتے ہیں مگر اپنے آپس کے سلوک کی ذرا سی بھی پروا نہیں کرتے جو زمانے کے لئے نمونہ عبرت ہے میں ان کی بے نیازی پہ ہنسنے لگتا ہوں۔

اسی سڑک پر اکثر اندھے فقیروں کی ٹولی دکھائی دیتی ہے۔ ان میں بعض کوڑھی ہوتے ہیں اور بعض جذامی' اور زیادہ تعداد اندھوں کی ہوتی ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کی لاٹھیاں پکڑے ہوئے ایک کے پیچھے ایک چلتے ہیں اور سرشام دن کی ساری گالیاں نکال کر گھر واپس ہوتے ہیں۔ انھیں اسٹیشن کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی اس لئے یہ باہر ہی مختلف جگہوں پر اپنا اڈا بناکر بھیک مانگتے ہیں۔ جب کوئی مسافر ان کے قریب سے گزرتا ہے تو یہ دور دور کر سوال کرتے ہیں اور سارا دن اس قسم کی محنت سے اتنے پیسے کما لیتے ہیں کہ شام کو ایک وقت پیٹ بھر لیں ایسے لوگوں کو دیکھ کر اپنی بے زبانی بھول جاتا ہوں انہیں گھنٹوں خوشامد اور منت کرنے کے بعد اگر ملا تو ایک پیسہ مل گیا۔ ورنہ محنت ہی محنت کا ثمر ہے۔ یہ لوگ کس قدر اپنی زبان سے کام لیتے ہیں۔ اس کا اندازہ کوئی لگا ہی نہیں سکتا۔ خدا معلوم زبان چمڑے کی ہے یا لوہے کی، جو سارا دن چلانے کے بعد بھی نہیں دکھتی۔ میں گونگا ہوں، مگر میری زبان کو سکون، ور اطمینان تو ہے۔ اور زبان ہوتی۔ ان کی طرح بھیک مانگنے کے لئے تو؟ میں خدا سے ڈر کر اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر کون جانے "ان فقیروں کو اگر گونگا بناکر میری ایسی حالت میں کر دیا جائے تو یہ پسند کریں گے؟ ہوسکتا ہے جس طرح میں گویائی لیکر فقیر بنا پسند نہیں کرتا۔ وہ گونگے ہوکر میری حالت میں آنا پسند نہ کریں۔

تھوڑی دیر اسی طرح گھومنے پھرنے کے بعد میں پھر لوٹ آتا ہوں اور اپنے کمرے کا باہری دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوتا ہوں۔ مدت ہوئی میں نے صدر دروازے کی صورت ہی نہیں دیکھی۔ ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ گھر کے اندر سے کون جائے۔ اگر کوئی کچھ پوچھ بیٹھا تو پھر اشاروں میں بتانا پڑے گا۔ اشاروں سے بتا تو سب کچھ دیتا ہوں مگر پھر بھی لوگوں کے سامنے پہنچ کر ایک قسم کا احساس کمتری مجھ میں پیدا ہوجاتا ہے اور میں جھینپ سا جاتا ہوں۔ جس وقت میں اپنے کمرے میں داخل ہوتا ہوں تو میری بیوی اکثر وہاں پہلے سے بیٹھی ہوئی ملتی ہے۔ اگر جلد لوٹ آیا تو ہنستی ہوئی اور دیر میں پایا تو غصہ میں پھولی ہوئی کیونکہ جب تک میں نہ آؤں اسے کھانے کے انتظار میں وہاں ٹھہرنا پڑتا ہے۔

ایک دن میں معمول سے زیادہ دیر میں پلٹا۔ میری بیوی دیر سے بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے درز کو سے جھانک کر دیکھا تو وہ پہلو بدل رہی تھی اور چہرے سے غصہ کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ جیسے ہی میں اندر گھسا تو برتنوں کو زور سے پٹک کر بولی۔ "کھالو! اور خالی برتن چارپائی کے نیچے ڈال دینا" میں خاموش رہا، پھر خود ہی کچھ سوچ کر سارا کھانا واپس لے گئی اور ذرا سی دیر میں سب چیزیں گرم کرکے لے آئی۔ میں ہاتھ دھوکر کھانا کھانے لگا اور وہ پھر واپس چلی گئی۔ جب میں کھا چکا تو میں نے برتنوں کو زور سے کھڑکایا۔ وہ سکراتی ہوئی کمرے

میں آئی - برتن اٹھائے - پھر بولی اب جاتے ہیں - میں پہلے تو سمجھا نہیں - پھر خیال آیا کہ آج اس نے یہ نئی بات کیوں کہی؟ اور کسی دن اس نے اس طرح خوش ہوکر نہیں کہا تھا حالانکہ کھانا کھلانے کے بعد چلی روز جاتی تھی - میں نے اشاروں سے پوچھا کہاں ؟ کہنے لگی بہت دور اپنے میکے - بھیا آئے ہیں - میں نے خوش ہوکر کہا - جاؤ جاؤ ، وہ چلنے لگی ، پھر پلٹ کر بولی سلام ! میں نے بھی سلام کے لئے ہاتھ اٹھا دیا اور وہ چلی گئی -

میری سسرال بلگرمئو کے قریب ایک گاؤں میں ہے - جہاں کے لئے اس اسٹیشن سے صرف ایک گاڑی چھوٹتی ہے - قریب دو بجے رات کو شروع شروع جب میں اپنی سسرال جایا کرتا تھا تو مارے خوشی کے دو بجے رات تک جاگتا تھا - اور یہ رات کے چار پانچ گھنٹے جوئے شیر ہو جاتے تھے - مگر اب تین برس سے تو میں نے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا - سوچتا ہوں کیا مُنہ لیکے جاؤں - سب یہی کہینگے فلاں کا داماد گونگا ہے - سالیاں الگ مذاق اُڑائینگی - سسر صاحب کو الگ میری بے زبانی کا احساس ہوگا انہی سب باتوں کے خیال سے میں نے آج پورے تین برس سے جانے کا ارادہ ہی نہیں کیا -

اس شب مجھے ساری رات نیند نہ آئی - یہاں تک کہ دو بجنے کے قریب ہوئے اور گھر میں دن کی طرح ہڑبونگ مچ گیا - بڑی بوڑھیاں امام ضامنیں لیکر اٹھیں اور میری بیوی کے بازو میں باندھ باندھ کر اسے امام صاحب کی ضمانت میں دینے لگیں - امام میاں کی ضمانت اللہ پھر ہنسی خوشی گھر واپس لائے وغیرہ وغیرہ - میں بھی رسمًا اٹھ بیٹھا اور اپنے کمرے کے باہری دروازے سے نکل کر چبوترہ پر آکر کھڑا ہو گیا - رخصتی کا یہ جشن بیچارگی بھی عجیب و غریب چیز ہوتا ہے - ہر شخص اپنی بساط بھر سب کچھ کر ڈالنا چاہتا ہے مگر پھر بھی یہ حسرت رہتی ہے کہ جی بھر کر رخصت نہ کر سکے - اس وقت سارے گلے شکایتیں غم و غصہ دلوں سے حرف باطل کی طرح مٹ جاتا ہے - اور ایک عجیب قسم کی کیفیت سے دل اُمڈنے لگتا ہے - کچھ اس قسم کا احساس ہوتا ہے کہ جانے والا شاید اب پھر نہ ملے - اور یہ ہماری آخری ملاقات ہو - میں بھی کچھ اس قسم کے خیالات میں محو تھا کہ میری بیوی برقع سنبھالتی ہوئی تانگے میں بیٹھی - میں نے قریب جاکر اسے غور سے دیکھا - وہ بھی مجھے دیکھنے لگی - ڈبیا سے مجھے ایک پان نکال کر پیش کیا - پھر پوچھا کب آؤگے - میں نے گردن ہلائی اور زبان پر انگلی رکھ کر کہا جب یہ میرے پاس ہوگی - میری بیوی نے اتنا یونہی رسمًا پوچھ لیا تھا - حالانکہ وہ جانتی تھی کہ میں اپنی بے زبانی سے بہت شرماتا ہوں اور جب میں اپنے عزیزوں کے سامنے نہیں جاتا تو پھر سسرال کیا جاؤنگا -

وہ چلی تو میں سڑک کے پہلے موڑ تک تانگے کے ساتھ ہی ساتھ گیا اتنے میں ایک دم تانگے والے نے گھوڑا اچکا دیا - کچھ دیر تک ٹاپوں اور پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور پھر رات کے سناٹے میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں - میں ذرا دیر اسی موڑ پر کھڑا دیکھا کیا - تانگے میں لگی ہوئی لالٹین کا پچھلا لال لال حصہ بہت دیر تک دکھائی دیا - آخر کار نظروں سے جواب دیا -

میں سست سست قدموں کے ساتھ پھر گھر کی طرف پلٹا - اسی وقت کوئی پرند میرے گھر کی چھت سے اڑ کر سٹیشن کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا - میں اسے دیکھتا رہا اور خوش ہوتا رہا - میں نے اپنے کمرے کا باہری دروازہ کھولا تو میری بیوی کی چہیتی پوسی میرے پلنگ پر بیٹھی میاؤں میاؤں کر رہی تھی - میں نے دروازہ بند کرکے سٹکنی لگائی اور پوسی کو بیٹھ کر چمکارنے لگا - وہ عادت کے مطابق میری گود میں آکر بیٹھ گئی - جیسے زبان حال سے یہ شکایت

کر رہی ہو کہ میری بی بی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ اتنے میں گھر بھر میں غل اٹھا۔ تو بھول گئیں۔ واہ واہ! اب کیا ہو۔ کون لے کر جائے۔ اتنے میں میری ماں ایک ہاتھ میں پاندان پکڑے میرے کمرے میں آئیں بولیں پاندان تو یہیں رہ گیا۔ اب اسے کون لے کر جائے۔ پھر خوشامدانہ انداز میں بولیں۔ پہنچا دیتے تو بہت اچھا ہوتا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت گھنٹے نے پورے دو بجائے۔ گھر میں سے کسی کی آواز آئی۔ اب گاڑی تو چھوٹ گئی ہوگی؟ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا اور پاندان لیکر بھاگنے ہی والا تھا کہ لوسی نے کہا "میاؤں" میں نے اسے بھی بغل میں داب لیا اور سرپٹ سٹیشن کی طرف بھاگا دوڑتے دوڑتے جب آدھی دور پہنچا تو سیٹی کی آواز آئی۔ مجھے خیال ہوا کہ گاڑی چھوٹ رہی ہے۔ اس لئے میں نے رفتار اور زیادہ تیز کر دی۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ انجن شنٹنگ کر رہا ہے۔ آخر کار بھاگتا بھاگتا اسٹیشن پہنچ ہی گیا۔ جیسے ہی پھاٹک کے اندر گھسا تو گاڑی رینگنے لگی۔ کبھی دس قدم آگے بڑھ کر زنانہ ڈبہ تلاش کرتا۔ اور کبھی دس قدم پیچھے ہٹ کر۔ آخر کار چودہ پندرہ ڈبوں کے بعد وہ ڈبہ ملا جس میں میری بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلے تو میں نے لوسی کو اس کی گود میں پھینکا۔ پھر ریل کے پائدان پر کھڑے ہو کر اسے پاندان دیا۔ دوڑنے کی وجہ سے میرے پیٹ میں سانس نہ سماتی تھی۔

مگر میں نے کسی نہ کسی طرح اشاروں سے کہا کہ تمھاری یہ دونوں امانتیں تمھیں سونپنے آیا ہوں۔ اس کے منہ سے تو اس وقت کچھ نہ نکلا البتہ نگاہوں سے پتہ چلتا تھا کہ کوئی مجرم کسی کے سلوک سے شرمندہ ہو گیا ہے اور اب وہ زندگی میں کبھی کوئی جرم نہ کریگا۔ گاڑی اب چونکہ کافی تیز ہو گئی تھی۔ اس لئے میں اتر آیا۔ اور پھر گاڑی اپنی پوری رفتار سے "چھے چھے چھیے چھے چھے چھیے" کرتی ہوئی چلی گئی۔

جب پھر پلیٹ فارم پر آیا تو ٹکٹ چیکر نے آکر کہا "ٹکٹ" میں چپ کھڑا رہا۔ مگر مجھے خیال آیا کہ یہ اس وقت ٹکٹ مانگنے میں حق بجانب ضرور ہے کیونکہ میں گاڑی سے کودا ہوں۔ ممکن ہے اس نے مجھے اسٹیشن میں داخل ہوتے ہوئے نہ دیکھا ہو — میں یہ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ اتنے میں پیچھے سے کوئی بول اٹھا۔ "ارے گونگا ہے بابوجی! جانے دیجئے —— !

کیا کہیئے؟

از جناب اقبال حسین شبنم

آپ دیتے جواب نامۂ شوق — سعیٔ پیغامبر کو کیا کہیئے
لاکھ پردوں میں تم چھپے لیکن — دیدۂ حق نگر کو کیا کہیئے
دل کی رگ رگ میں بجلیاں بھر دیں — تیری برق نظر کو کیا کہیئے
عرض مطلب پہ کوئی کہتا ہے — پھیر کر رخ اُدھر کو کیا کہیئے
خود تھا منظور پھوڑنا سر کا — یار کے سنگ در کو کیا کہیئے
کوئی آآکے لوٹ جاتا ہے — جذبۂ بے اثر کو کیا کہیئے
اور بھی ہیں حسیں زمانے میں — انتخاب نظر کو کیا کہیئے
ضبط غم تو بہت کیا شبنم
جوشش چشم تر کو کیا کہیئے!

کہتے ہیں

ہم بتوں کو بھی محبت میں خدا کہتے ہیں

از حضرت ہادی مچھلی شہری

جان دینے کو محبت میں دوا کہتے ہیں
زندگی موت کو اربابِ وفا کہتے ہیں

کفر و اسلام سے کچھ عشق کو مطلب ہی نہیں
ہم بتوں کو بھی محبت میں خدا کہتے ہیں

وہ نہیں ہے جو یہی نقش و نگارِ عالم!
اہل دل جلوۂ محسوس کو کیا کہتے ہیں

مجھکو مانا کہ نہیں منزلِ دشمن کی خبر
دیکھ تو کیا ترے نقشِ کفِ پا کہتے ہیں

قیس و فرہاد کے قصوں سے تو واقف ہے جہاں
آپ میرے دلِ شوریدہ کو کیا کہتے ہیں

دردِ دل پر مرے اظہارِ تسلی؟ لیکن!
آپ سمجھے بھی کہ اس درد کو کیا کہتے ہیں

نہ سہی ان کو مرے زخمِ محبت کا یقیں
مگر اس دیدۂ خونبار کو کیا کہتے ہیں

یہی دیتی ہے پتہ کوئے بتاں کا ہم کو
کششِ شوق کو ہم قبلہ نما کہتے ہیں

جو گھٹانے کے عوض درد بڑھا دے دل کا
ہم تو اس آہ کو بھی آہِ رسا کہتے ہیں

کاش وہ نقش مرے دیدہ و دل میں ہوتا
جس کو سب آپ کا نقشِ کفِ پا کہتے ہیں

بے خبر تیشۂ فرہاد کو جو چاہیں کہیں
ہم اسے طرۂ دستارِ وفا کہتے ہیں

میں نے مانا کہ انہیں ذوقِ کرم ہے لیکن
میری بگڑی ہوئی قسمت کو وہ کیا کہتے ہیں

کیا نتیجہ ہے جو ہم قصۂ بے تابیٔ دل
اس جفا جو سے بامیدِ وفا کہتے ہیں

آج تک منزلِ جاناں کا پتہ تک نہ دیا
حضرتِ خضر کو سب راہ نما کہتے ہیں

ہے صدا ایک مگر نسبتِ حالت سے اُسے
کبھی نغمہ کبھی فریاد و بکا کہتے ہیں

کیا کہے قصۂ غم کوئی حسینوں سے کہ جو
التماسِ غمِ فرقت کو گلا کہتے ہیں

حشر کیا دیکھئے میرے دلِ مجبور کا ہو
کہ وہ ہر بات بہ تقریبِ جفا کہتے ہیں

کون کہتا ہے ستم ترکِ وفا کا ہے سبب
ہم تو ہر آہ کو تجدیدِ وفا کہتے ہیں

یہ نزاکت تو کوئی رسمِ وفا کی دیکھے
یعنی وہ آہ بھی کرنے کو گلا کہتے ہیں

اوّلِ عشق میں جو درد تھا ہادی دل کا
اب اسی درد کو ہم دل کی دوا کہتے ہیں

شہنشاہ ظہیر الدین بابر کی شاعری

مقالہ

از جناب قریشی محمد عبداللہ بی-اے

تیموریان ہند میں جس طرح جہانگیر کو جنت مکانی - اکبر کو عرش آشیانی اور ہمایوں کو جنت آشیانی کے خطاب سے مخاطب کیا جاتا ہے اسی طرح شہنشاہ ظہیر الدین میرزا الملقب بہ بابر انار اللہ برہانہٗ کو فردوس مکانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ امیر تیمور گورگانی کی پانچویں پشت سے تھا۔ اور ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا تھا کہ باپ کا سایہ ہمیشہ کے لئے سر سے اٹھ گیا۔ اور ان کندھوں پر جو ناتجربہ کاری کی وجہ سے ابھی کمزور ہی تھے سلطنت کا بار گراں آ پڑا۔ بابر نے اسے سنبھالنے کی بتیری کوشش کی۔ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر واقعات و حوادث کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ گئی۔ اور آخر مجبور ہو کر اس نے اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہا۔ قسمت آزمائی کے لئے ہندوستان کا رخ کیا۔ اور ۲۹ر اپریل ۱۵۲۶ء کو پانی پت اور فتح پور سیکری کا میدان مار کر ہندوستان پر قابض ہوا۔ یہ پہلا تیموری بادشاہ ہے جس نے باقاعدہ طور پر خاندان چغتائیہ کی بنیاد ہندوستان میں رکھی۔

بابر کی وفات

اس کی وفات کا حال جس قدر دلچسپ ہے اسی قدر غلط بیانیوں سے مملو ہے۔ دور حاضرہ کے تمام تذکرہ نگار اس بات کو نہایت جوش و ادعا کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ دسمبر ۱۵۳۰ء میں اس کا سب سے بڑا لڑکا ہمایوں سخت بیمار ہو گیا۔ اطبائے وقت نے بتیرا اتار چڑھاؤ کیا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ یہاں تک کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ بابر نے بزرگوں کی رسم کے مطابق اپنی جان اس پر سے تصدق کرنے کی غرض سے اس کے پلنگ کے گرد تین دفعہ چکر کاٹے اور پھر دعا کی کہ اس کی بیماری مجھے لگ جائے اور وہ تندرست ہو جائے۔ چنانچہ اسی وقت ہمایوں تندرست ہو گیا اور بابر بستر مرگ پر جا لیٹا۔ اور ۲۶ر دسمبر ۱۵۳۰ء کو آگرہ کے مقام پر اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ مگر اس کی اپنی لڑکی گلبدن بیگم کا بیان ہے کہ۔

"جب ہمایوں میرزا بیمار ہوا تو بابر بادشاہ نے دعا مانگی کہ اے خدا! اگر جان کا بدلہ جان ہو سکتا ہے تو میں اپنی عمر اور جان ہمایوں کو بخشتا ہوں۔ اسی روز فردوس مکانی کی طبیعت قدرے علیل ہو گئی۔ اور ہمایوں نے غسل صحت کیا۔ باہر نکلا اور دربار منعقد کیا۔ بادشاہ کو علالت کی بنا پر محلات میں لے گئے۔ اور وہ تقریباً دو ماہ تک صاحب فراش رہا۔ ہمایوں کالنجر کی طرف چلا گیا لیکن جب بادشاہ کی حالت زیادہ تشویشناک ہو گئی تو ہمایوں کو واپس بلا لیا گیا۔ وہ یلغار کے ساتھ آگرے پہنچا اور جب بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اسے نہایت ضعیف و کمزور پایا۔ اس نے نوکروں سے دریافت کیا کہ یہ اتنے نحیف کیسے ہو گئے؟ اس کے بعد اس نے اطبا کو طلب کیا اور کہا کہ میں تو انہیں نہایت اچھی حالت میں چھوڑ کر گیا تھا۔ یہ ایکدم کیا ہو گیا۔ حکما نے طرح طرح کی تاویلیں پیش کیں۔

اسی ضمن میں بادشاہ کی حالت اور بھی ابتر ہو گئی۔ ہمایوں نے جب یہ دیکھا تو بہت فکرمند ہوا۔ اس نے اطبا کو بلایا اور جی لگا کر علاج کرنے کی تلقین کی۔ اس پر اطبا نے مل کر کہا کہ یہ ہماری بدبختی ہے کہ کوئی دوا کارگر نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ ہے جو غیب کے خزانے سے انہیں شفائے کامل عطا فرمائے۔ اس کے بعد اطبا نے نبض پر ہاتھ رکھا اور سب نے یکزبان ہو کر کہا کہ یہ سب اسی زہر کی علامتیں ہیں جو سلطان ابراہیم کی والدہ نے بادشاہ سلامت کو دیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ"

(ہمایوں نامہ صفحہ ۲۲-۲۳-۲۴-۲۵)

تذکرہ صدر بیان سے یہ صاف ظاہر ہے کہ بابر دو تین مہینے بیمار رہنے کے بعد فوت ہوا۔ اور اس کی وفات کی اصل بنا وہ زہر ہے جو سلطان ابراہیم کی والدہ نے ایک باورچی کی معرفت اسے دیا تھا۔

بابر اور فنون لطیفہ

بابر کو آج تمام دنیا ایک سپاہی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ جو دنیا کے تمام نشیب و فراز کا لذت چشیدہ تھا۔ جو آج اگر تخت شاہی پر جلوہ گر نظر آتا ہے تو کل دربدر اور خاک بسر دکھائی دیتا ہے

آج ایک لشکر کی کمان کر رہا ہے تو کل لشکر اس کی جستجو میں حیران و سرگرداں نظر آتا ہے۔ جو آج نشہ رنگے ناب سے مخمور ہو کر مجلس عیش و سرور کے مزے لوٹ رہا ہے تو کل وہی بے سروسامانی کی حالت میں جنگلوں اور کوہساروں میں سر چھپاتا پھرتا ہے۔ مگر بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھیں اس بات کا علم ہے کہ وہ ایک فاضل ادیب۔ زبردست شاعر اور فن مصوری کا ایک بے نظیر مبصر اور نقاد بھی تھا۔[۱] اور قدرت نے اسے ایک ایسا عجیب وغریب دماغ ودیعت کر رکھا تھا جو شاعری، ادب اور مصوری کے لئے نہایت موزوں تھا۔ اس مختصر سے مضمون میں ہم اس کی زندگی کے انہی پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ بابر موقلم کی جنبش سے تصویر کشی نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اس سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کے لفظ لفظ اور حرف حرف سے عجیب عجیب قسم کے مرقعے تیار ہو سکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ ایسا مصوّر و شاعر تھا جو قدرت کی دلفریبیوں اور فطرت کی سحر کاریوں کا نقشہ لفظوں کے ذریعہ صفحات قرطاس پر کھینچتا تھا۔ پرنسپل پرسی براؤن آنجہانی نے اس کے متعلق کس قدر صحیح تحریر کیا ہے کہ

"وہ ایک فاضل فلسفی۔ زبردست نثر نگار اور ایک بالغ النظر سیاح تھا۔ وہ ایسا انتھک تماشائی تھا جو فطرت کی دلفریبیوں سے کبھی سیر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک ایسا طالب علم تھا جو جانوروں کی وضع قطع اور ان کی عادات وخصائل کا مطالعہ نہایت گہری نظر سے کیا کرتا تھا۔ پھول اس کی روح رواں تھے۔ باغات[۲] اس کے جز و زندگی۔ اور مختصر یہ کہ وہ لفظوں کا مصور اور نیچر کا شیدائی تھا۔"

لفظوں کی مصوری

چنانچہ ایک دفعہ جب وہ اپنی جان بچانے کی خاطر ایک باغ میں پناہ گزیں ہوا تو اس کی نظر ایک درخت پر پڑی۔ یہ سیب کا درخت تھا اور اس کے تمام پتے باد خزاں کی تاخت و تاراج سے گر رہے تھے۔ فقط چند پتے ایک شاخ پر باقی رہ گئے تھے۔ بابر نے اس کی تصویر ایسے پیرائے میں کھینچی ہے کہ تمام نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے ملاحظہ ہو۔

"سیب کا درخت عجیب شان دلآویزی سے کھڑا ہے اس کی ایک شاخ پر پانچ چھ پتے بکھرے پڑے ہیں اور گو خزاں کے دست تعدی نے ان کی رنگت یکسر بدل دی ہے تاہم ان کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کا حسن ظاہری اور بھی دوبالا ہو گیا ہے یہ فضا اور پتوں کی یہ بہار دیکھ کر دل بے قابو ہوا جاتا ہے۔ مصوّر اپنی تمام امکانی طاقت صرف کرنے پر بھی اس کی صحیح تصویر پیش نہیں کر سکتا۔"

— بابر نے ترکستان سے آ کر ہندوستان کو جس حالت میں دیکھا اس کی تصویر اسی کے الفاظ میں یہ ہے۔

"اسپ خوب نے۔ گوشت خوب نے۔ انگور و خربزہ و میوہ ہائے خوب نے۔ یخ و آب سرد نے۔ حمام و مدرسہ نے شمع و مشعل نے۔ شمعدان نے۔

بجائے شمع۔ مشعل و جمیع کثیر نے چرکینے مے باشد ڈیوٹے میگویند۔ در دست چپ خود سہ پایہ خوردی را گرفتہ اند کہ ازیں سہ پایہ در کنار یک پایہ مشل سر شمع دان یک آہنے را بہ چوب بہ ہمیں سہ پایہ مضبوط کردہ اند۔ یک فتیلہ سستی را کہ برابر ز انگشت بود"[۳]

---

[۱] ڈاکٹر لین پول کا بیان ہے کہ بابر نہ صرف ایک دلیر سپاہی تھا بلکہ ایک فاضل ادیب اور نازک مزاج مبصر و نقاد بھی تھا۔

[۲] بابر کو تعمیرات سے دلی شغف تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی میں کئی محلات تعمیر کرائے۔ گلبدن بیگم اپنی مشہور کتاب ہمایوں نامہ میں آگرہ اور اس کے سواد میں اس کے بنا کردہ محلات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتی ہے:

"و در آگرہ آں روئے آب عمارتہا فرمودند و خانہ سنگیں کہ خلوت خانۂ ایشاں میانہ و حرم و باغ و در دیوان خانہ ہم خانۂ سنگیں راست کردہ بودند و در میانہ حوضے

[۳] و چہار حجرہ در چہار برج خانہ و در کنار دریا چوگندی راست کردہ بودہ اند و در دھولپور ہم از یک پارہ سنگ حوض دہ در دہے فرمودند و مے گفتند کہ ہرگہ ایں حوض تیار شود بہ شراب پُر خواہم کرد۔ چوں قبل از جنگ رانا سنگا کہ از شراب توبہ کردہ بودند بہ شربت لیموں پُر کردند" ہمایوں نامہ صفحہ ۱۴، ۱۵

باشد بہ چوب آہن دار پایہ دیگر بستہ اند در دست راست ایشاں یک کدوے ست کہ سوراخ آں را تنگ گذاشتہ اند کہ روغن ازاں جا باریک شدہ مے ریزد۔ بادشاہان وامرائے ایشاں شب ہا اگر کارے کہ احتیاج بہ شمع داشتہ باشند ہمیں ڈیوٹ ہائے چرکیں ایں چراغ آور دہ نزدیک گرفتہ مے ایستند۔ در باغ و عمارت ہا۔ آب ہائے رواں نے۔ در عمارات او صفا و ہوا و اندام و سیاق نے۔ رعیت و مردم ریزہ کہ تمام پائے برہنہ مے گردند۔ لنگوٹہ گفتہ یک چیزے بندند۔ زنان آں ہا خود یک لنگے بستہ اند۔ نصف آں را در کمر بستہ اند و نصف دیگر را بر سر خود انداختہ اند[1]

(تزک بابری صفحہ ۲۰۲)

مناظر فطرت

ایک دفعہ وہ ایک پہاڑی چشمے کی سیر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ جذبات سے بے قابو ہو کر اس نے حکم دیا کہ ایک پتھر پر سعدی کے مندرجہ ذیل اشعار کندہ کر کے اس چشمہ کے کنارے پر نصب کر دیا جائے ؎

شنیدم کہ جمشید فرخ سرشت ۔۔۔ بسر چشمۂ آب سنگے نوشت

بریں چشمہ چوں ما بسے دم زدند ۔۔۔ برفتند تا چشم برہم زدند

گرفتیم عالم بہ مردی و زور

ولیکن نہ بردیم با خود بگور

اسی طرح وہ اس سین کو "بہار کا موسم ہے۔ نیچر کے ذرے ذرے سے آثار زندگی نمایاں ہو رہے ہیں۔ باد بہاری اٹکھیلیاں کرتی چلی جاتی ہے۔ کبھی کبھی بوندا باندی بھی ہونے لگتی ہے۔ ایک مست ہے جس کے ہاتھ میں شراب کا پیالہ ہے اور پاؤں میں گھونگرو بندھے ہیں جس وقت کہ مستی کی ترنگ میں آتا ہے تو دنیا و مافیہا اسے ہیچ نظر آتی ہے۔ وہ ساغر کو منہ سے لگاتا ہے۔ پاؤں کو زمین پر مارتا ہے اور نہایت سُریلی آواز میں کچھ کہتا ہے ــــ" اپنے الفاظ میں اس طرح پیش کرتا ہے ؎

نوروز و نو بہار و مے و دلبرا خوش است
بابر بعیش کوش کہ عمر دوبارہ نیست

بابر کی تصنیفات

بابر کو ترکی اور فارسی ہر دو زبانوں پر قدرت حاصل تھی کیونکہ ترکی اس کی مادری زبان تھی اور فارسی اسے سلطان حسین مرزا مصنف مجالس العشاق سے ورثہ میں ملی تھی۔ اس لئے اس کی تصنیفات بھی ہر دو زبانوں میں موجود ہیں۔ بابرنامہ یا تزک بابری اس کی مشہور ترین تصنیف ہے۔ یہ ترکی زبان میں ہے۔ اور اس کا ایک نہایت اعلیٰ ایڈیشن گب میموریل سیریز کی طرف سے مدت ہوئی طبع ہوا تھا۔ مگر آج کل یہ بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اس کتاب میں اس نے اپنے روزمرہ کے تمام واقعات نک سے سک تک درج کئے ہیں۔ میرزا عبدالرحیم خاں خانخاناں نے فتح گجرات کے بعد ۹۹۷ھ میں اسے فارسی زبان میں منتقل کر کے اکبر کی خدمت میں بطور نذر پیش کیا تھا۔ یہ ترجمہ بمبئی میں چھپ گیا ہے۔ جون لیڈن اور ولیم ارسکن صاحبان نے بھی اسے انگریزی لباس میں ملبوس کر کے ۱۸۲۶ء میں شایع کرایا تھا۔

ترکی زبان میں اس نے دو چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی تصنیف کی تھیں۔ جن میں سے "مبین" تو علم الکلام اور مذہب حنفیہ کے متعلق تھی۔ اور "رسالہ والدیہ" خواجہ احرار کی منقبت میں تھا۔ موخر الذکر کا تو ایک نسخہ نواب رامپور کی شاہی لائبریری میں موجود ہے مگر دوسری صفحہ ہستی سے بالکل عنقا صفت ہے۔ بابر کا ایک رسالہ عروض کے متعلق بھی تھا۔ جو ۱۰۱۱ھ تک ملک میں متداول رہا ہے چنانچہ مولانا نورالحق صاحب دہلوی اپنی مشہور کتاب "زبدۃ التواریخ" میں جو ۱۰۱۱ھ میں تصنیف ہوئی تھی رقمطراز ہیں کہ۔

" رسالہ دارد در عروض کہ مشہور و متداول است"

لیکن اس کے بعد اس کا کہیں نام نہیں سنا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاخت و تاراج نادری میں ضائع ہو گیا ہے۔

رنگِ تغزل

بابر کا دیوان بھی ترکی و فارسی ہر دو زبانوں کے اشعار پر مشتمل ہے اور گو اس کی اصلی شاعری ترکی زبان میں ہے تاہم جو کچھ اس نے فارسی زبان میں موزوں کیا ہے اس میں بھی جوش تغزل اور

[1] تزک بابری ترکی زبان میں تھی۔ عبدالرحیم خانخاناں نے اس کو فارسی زبان میں منتقل کیا۔ یہ ترجمہ بمبئی میں چھپ گیا ہے، اور مندرجہ بالا عبارت اسی فارسی ترجمہ کی ہے۔

جاہلیت کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ بہت سے فارسی گو شعرا اس کی مثالیں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ مثلاً وہ اس وسیع مضمون کو کہ چند دوست آپس میں باتیں کرتے کسی سمت جا رہے ہیں۔ اتفاق سے ان میں سے ایک کا معشوق سامنے سے آجاتا ہے۔ عاشق ان سب کی باتوں سے منہ پھیر کر نہایت سراسیمگی اور وارفتگی کی حالت میں معشوق کی طرف دیکھنے لگ جاتا ہے۔ دوست اسے اپنی طرف ملتفت نہ دیکھ کر بے توجہی کی وجہ دریافت کرتے ہیں۔ عاشق پہلے تو انھیں ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر ان کے اصرار سے مجبور ہو کر کچھ کہنے کی جرأت کرتا ہے مگر ساتھ ہی پھر شرمندہ ہو کر تصویر حیرت بن جاتا ہے۔ یوں ادا کرتا ہے ؎

شوم شرمندہ ہر گہ یار خود را در نظر بینم
رفیقاں سوئے من بینند و من سوئے دگر بینم

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ عاشق اپنی سعی پیہم کے باوجود بھی ناکام رہتا ہے اور ہجوم یاس سے تنگ آ کر گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھتا ہے اس وقت گذرا ہوا زمانہ اسے یاد آتا ہے۔ وہ اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتا ہے اور نہایت رقت آمیز لہجہ میں کہتا ہے کہ ؎

ہیچ کس چوں من خراب عاشق و رسوا مباد
ہیچ محبوبے چو تو بے رحم و بے پروا مباد

شعر واقعات کی کس قدر سچی تصویر ہے۔ اور اس پر طرز ادا کی خوبی نے اور بھی چار چاند لگا دیئے ہیں۔ کہنا تو صرف یہ ہے کہ ؎

اللہ میرے بت یہ کس چیز کے بنے ہیں
پتھر پسیج جائے ان کو ترس نہ آئے

یعنی معشوق سنگدل ہوتے ہیں۔ ان سے دل لگانا اچھا نہیں، لیکن اس کو اس پیرائے میں بیان کیا ہے کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر میرے جیسا خراب و رسوا عاشق اور تیرے جیسا بے رحم و بے پروا معشوق پیدا ہی نہ ہوتا۔

منتخب اشعار

بابر کا مکمل دیوان جس میں اس کی ترکی اور فارسی کی تمام غزلیات و رباعیات مندرج ہیں نواب رامپور کی شاہی لائبریری میں زینت افروز ہے لیکن اس کے چند اشعار جو مختلف تذکروں سے دستیاب ہو سکے ہیں ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں ؎

ہلاک میکندم فرقت تو دانستم وگرنہ رفتن ازیں شہر میتوانستم

کارے کہ ترا باں جفا کار افتاد بس قصہ مشکل است و بس کار عجب

یارب کہ رضائے دل درویشاں دہ ایں ریش دل شکستہ را دار رہا دہ
حدیث کہ گویم ایں بدہ آں دہ چیزے کہ رضائے تو در آں است آں دہ

اے آنکہ جفائے تو بعالم عام است روزے کہ ستم نہ بینم از تو ستم است
ہر غم کہ رسد از ستم چرخ بدل مارا چو غم عشق تو باشد چہ غم است

بابا دولت کی نسبت جو مخصوصان درگاہ میں سے تھا فرمایا ہے کہ

آنکہ مغز خوش زیادہ است ز پوست
یار دیرین ماست یا با دوست ما

جمع است دلم با تو درون خانہ در کعبہ قدم بے تو بصد ویرانہ
چوں با تو شدم با خودم ہشیارم چوں بے تو شدم بے خودم و دیوانہ

یارب بکمال لطف خاصم گرداں عارف بحقائق خواصم گرداں
از عقل جفا کار دل افگار شدم دیوانۂ خود خوان و خلاصم گرداں

تا بر زلف سیہش دل بستم از پریشانیٔ عالم رستم!

آمد بہار و دل شدہ را کہ بہار نیست
پروائے لالہ زار و ہوائے بہار نیست

در روزگار فتنۂ بے دیدہ ام ولے
چشم تو فتنہ است کہ در روزگار نیست

مولانا شہاب معمائی کی نسبت کہا ہے کہ ؎

ماست ز عجم رفتہ بلکہ عرب است وز نامۂ تو درد دل مخزون طرب است
ہر کس بدر آورد از معما نامے نام از تو برآورد معما عجب است

قلعہ چندیری کی فتح کے متعلق فرمایا ہے کہ ؎

فتح کردم بحرب شب قلعہ
گفت تاریخ فتح دار الحرب

کنگن

حسرتناک افسانہ

از جناب میرزا ادیب بی اے (آنرز)

نور دین کہنے کو تو ایک دھوبی تھا مگر تھا ہٹ کا پکا اور آن پر جان قربان کرنے والا۔ برادری کا ہر رکن تہ دل سے اس کی عزت کرتا تھا اور جب کبھی عزت کا معاملہ پیش ہوتا تھا۔ عموماً اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا تھا۔

نور دین کہتا تھا جان جائے مگر آن پر حرف نہ آئے۔ وہ خود بھی اس قول پر عمل کرتا تھا اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کی ہدایت کرتا رہتا تھا۔ بدقسمتی سے جس زمانے میں نور دین کے اکلوتے بیٹے جینن کی شادی قرار پائی نور دین کا قدیمی وفادار بیل مر گیا۔ دوسرے جن گاہکوں سے بھاری رقمیں ملنے والی تھیں، وہ بھی کچھ مدد نہ کر سکے۔ خاندان کی آن کا سوال تھا۔ نور دین نے اپنی مرحوم بیوی کے بیش قیمت کنگن بیچ ڈالے۔ علاوہ ازیں مہاجنوں سے قرض بھی لیا۔ اور سب کچھ اپنے بیٹے کے بیاہ پر خرچ کر ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برادری میں دھوم مچ گئی۔ محلے والے کئی دن تک اس شاندار شادی کا تذکرہ کرتے رہے۔ اور شہر کے کئی معززین نے نور دین کو مبارکباد کہی۔ اپنی تعریف سن کر نور دین کو اتنی خوشی ہوئی جتنی اسے آج تک نہ ہوئی تھی۔

دلھن گھر میں آ گئی۔ نور دین نے اس کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ جو چیزیں امیر گھرانوں میں بھی دلھنوں کو نصیب نہیں ہوتیں ان چیزوں کا ڈھیر اپنی بہو کے سامنے لگا دیا۔ دو چار ماہ تک کسی قسم کی پریشانی کا واقعہ پیش نہ آیا۔ سسر بھی خوش تھا بہو بھی اور بیٹا بھی، اور برادری کے لوگ تو نور دین کو فرشتہ سمجھ رہے تھے مگر اس کے بعد قرضخواہ اس کے گھر کا طواف کرنے لگے۔ بیچارے نے بہت کوشش کی کہ ان کو کسی نہ کسی طرح ٹال دے مگر قرضخواہوں کے لیے ان زیورات بھی ضمانت کے طور پر موجود نہیں تھے۔ اس لئے وہ رقوم کی ادائگی پر شدید اصرار کرنے لگے۔

نور دین نے اپنی مرحوم رفیقہ حیات کی آخری یادگار ۔۔۔ جھومر بھی بیچ ڈالا۔ اور سودا ادا کر دیا۔ دو مہینوں کے لئے نجات مل گئی۔ مگر پھر وہی تقاضے اور وہی پریشانی۔ وہی وعدے اور وہی تو تو میں میں! نور دین نے انتہائی کوشش کی کہ برادری کو اس جھگڑے کی خبر نہ ہو مگر ایسی باتیں کبھی چھپی رہ سکتی ہیں۔ برادری کے دو چار سربرآوردہ افراد نے طنزاً اس معاملہ کا ذکر کیا تو نور دین کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ بہترا سوچا کہ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوئی تجویز ذہن میں آ جائے۔ مگر لاحاصل ۔۔۔ ایک دن مجبور ہو کر اس نے اپنی بہو کو پاس بلایا۔ بہو گھونگھٹ ڈالے اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ نور دین دو چار لمحے تو خاموش رہا پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"بیٹی زینو! یہ لوگ ۔۔۔ روپیہ لینے والے بڑا تنگ کر رہے ہیں ۔۔۔ ادھار لیا تھا پر ۔۔۔ میری صلاح ہے ۔۔۔"

نور دین خاموش ہو گیا اور پاس پڑی ہوئی گٹھڑی میں سے باہر نکلی ہوئی میلی قمیص کے کف غیر شعوری طور پر کھینچنے لگا۔

"جی!" زینو بولی،

وہ حیران تھی کہ اس کا سسر بات کرتے کرتے ایک لخت خاموش کیوں ہو گیا ہے؟

"تو زینو! مجھے تو ۔۔۔ کیا کہوں ۔۔۔ تمہارے کنگن! بیٹی قسم کھا کر کہتا ہوں سال کے اندر اندر نئے کنگن بنوا دوں گا۔"

نور دین کی سیاہ پیشانی پر پسینہ کے قطرے اس طرح ظاہر ہو کر جذب ہو گئے جس طرح ایک میلے کپڑے پر پانی کے چھینٹے اڑ کر پڑ گئے ہوں۔ زینو چپ چاپ اندر چلی گئی۔ اور جب وہ آئی تو اس نے

ہاتھ میں کنگن پکڑے ہوئے تھے۔

"بیٹی! تو سمجھ گئی نا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تیری بانہوں میں ضرور کنگن ڈال کر رہونگا!"

زینو نے اثبات میں سر ہلایا اور چلی گئی۔ نوردین اٹھا اور کنگن اپنی پگڑی میں لپیٹ کر اور ادھر ادھر دیکھ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

بہو کے کنگن بیچ ڈالے گئے۔ اور جو رقم وصول ہوئی اس سے وہ تمام قرض ادا ہو گیا جس کا خیال ایک تیزاب بن کر نوردین کی رگوں میں سرایت کر گیا تھا۔ بظاہر یہ بہت بڑی کامیابی تھی اور نوردین کو خوش ہونا چاہیئے تھا کہ اس کی پریشانیاں دور ہو چکی ہیں۔ مگر جس طرح میلا کپڑا دھل جانے کے بعد صاف تو ہو جاتا ہے مگر چند دن کے بعد پھر میلا ہو جاتا ہے اس طرح اس کی خوشی عارضی تھی۔ اس نے بہو سے قسم کھا کر کہا تھا کہ ایک سال کے اندر اندر تیری بانہوں میں کنگن ڈالدونگا۔ اور اس کے لئے وعدہ پورا کرنا نہایت ضروری تھا۔

وہ آٹھوں پہر دل میں سوچتا رہتا تھا کہ اگر اس کی بہو کنگن سے محروم رہی تو اس کے والدین کیا کہیں گے — عزیز رشتہ دار کس کس انداز سے طعنہ دینگے — کہ لو بھئی اچھا سسر ہے بہو کے کنگن بیچ ڈالے۔ مگر اتنی توفیق نہ ہوئی کہ دوبارہ خرید کر دے۔

اس قسم کے ناخوشگوار خیالات اس کے ذہن پر اس طرح ضربیں لگاتے رہتے جس طرح دریا کے گھاٹ پر دھوبی کپڑوں کو پیڑھی (لکڑی کا تختہ) پر مارتے ہیں۔ ایک دن اس کی ایک بہن نے بہو کی خالی باہیں دیکھ کر کہا۔ "ہائے ہائے خالی بانہیں کتنی بُری لگتی ہیں"۔

یہ الفاظ سن کر نوردین کو سخت رنج پہنچا۔ اور اس نے اسی دن سے کنگن خریدنے کے لئے رقم جمع کرنی شروع کر دی۔ جیسا دردی تھا۔ وہ جو کچھ کماتا تھا اس سے بمشکل اس کا اپنا گزارہ ہوتا تھا، ان حالات میں نوردین پر دُگنا بوجھ پڑ گیا — وہ زیادہ سے زیادہ گاہک بنانے کی کوشش کرتا اور روزمرہ کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے کم سے کم خرچ کرتا۔ اس کی محنت و مشقت کا یہ حال تھا کہ



بعض اوقات رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں صرف چند گھنٹے آرام کر سکتا اور اس عرصے میں بھی روپیہ جمع کرنے کا خیال اس کے ذہن سے علیحدہ نہ ہوتا۔

شدید محنت اور مسلسل مشقت کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسے کھانسی آنے لگی۔ کھانسی کے علاوہ ہلکا ہلکا بخار بھی ہونے لگا۔ اس حالت میں بھی وہ کام کرتا رہا۔ ہر وقت کام کرتا رہا۔

کئی بار بہو نے کھانسی سن کر کہا۔ "چچا! حکیم کو ہاتھ کیوں نہیں دکھاتا" مگر وہ ہر بار یہی جواب دیتا۔ "معمولی کھانسی ہے۔ دور ہو جائے گی دو چار دن میں"

عید آئی۔ برادری کے ہر فرد نے نئے کپڑے پہنے۔ مگر وہ اس دن بھی صبح سے لے کر شام تک کام کرتا رہا۔

مکمل گیارہ مہینوں کے بعد وہ اس قابل ہو گیا کہ سونے کی حسب منشا مقدار خرید کر کنگن بنوا لے اور چند دن کے بعد جب وہ چمکتے ہوئے کنگن گھر لے کر آیا۔ تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یقیناً وہ دن اس کی زندگی کا مسرور ترین دن تھا جب اس نے اپنی پگڑی میں سے کنگن نکال کر بہو کی باہوں میں ڈال دیئے۔

برادری اس کی ہمت پر عش عش کرنے لگی۔

یہ تو سب کچھ ہوا۔ لیکن اب نور دین کی صحت گر چکی تھی۔ بہو کے اصرار پر وہ حکیم کے پاس بھی گیا۔ چند دن میں دو چار بوتلیں بھی خالی کر دیں۔ آرام کرنے کے لئے چارپائی پر بھی لیٹ گیا مگر فضول۔

میلا کپڑا دھل کر صاف ہو سکتا ہے۔ مگر وہ کپڑا جو ہر جگہ سے پھٹ چکا ہو اسے صاف کرنے سے فائدہ؟ نور دین کی صحت بالکل گر چکی تھی کھانسی نے خوفناک صورت اختیار کر لی تھی اور بخار تھا کہ کسی وقت ٹوٹتا ہی نہ تھا۔

آخر وہی ہوا جو نہ ہونا چاہئے تھا مگر جس کی توقع ہر ایک کو تھی، نور دین کی نعش کوٹھڑی میں پڑی تھی۔ کہ زینو کے شوہر نے اسے تنہائی میں بلایا۔ "بابا تو کچھ چھوڑ کر نہیں گیا۔ اب ہوگا کیا۔؟ برادری میں ناک کٹ جائیگی"

"پھر کیا ہو۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں"

"پھر کیوں نہیں —— لاؤ بھی —— میت کو تو ٹھکانے لگایا جائے"

زینو نے حسرت انگیز نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھا اور اندر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی رومال میں لپٹی ہوئی —— شوہر نے رومال پکڑا اور چلا گیا۔ اندر کوٹھڑی میں ایک بڑھیا کہہ رہی تھی۔

"ہائے! کیا کیا ہوں —— بہو کی خالی باہیں دیکھ کے قسم کھائی اور پیسہ جمع کر کے کنگن لے ہی آیا"

زینو کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اور اس نے اپنی خالی باہیں غم آلود رخساروں سے لگا لیں۔

وہ نام!

(از جناب حافظ محمد امین جاذب)

ندیم لب پہ مرے آ رہا ہے اب وہ نام چھلکنے لگتا ہے جس سے سکونِ روح کا جام
وہ نام جس نے مجھے آشنائے درد کیا وہ نام جس نے تمنا سائے آہِ سرد کیا
وہ نام جس سے طبیعت میں نرمیاں پیدا وہ نام جس سے تمنا میں گرمیاں پیدا
وہ نام جس سے بنی زندگی سراپا راز وہ نام کرتی ہے سجدے جسے جبین نیاز
وہ نام جس میں ہے حسنِ ازل کی تابانی وہ نام جس کے قدم ڈھونڈتی ہے پیشانی
ندیم ظرف ترا کم ہے نام کیا لونگا، بڑے ادب سے مگر اپنا سر جھکا لونگا

ایک پیکرِ جمیل کو دیکھ کر

نظم

از جناب وحید الدین۔ زخمی بیگوسرائی

صبا کا مدعا تو ہے، چمن کا آشنا تو ہے
کلی کا رازداں تو ہے گلوں کا ہم نوا تو ہے

رباب و چنگ کی ہے کیا حقیقت روبرو تیرے
دلوں پر کیف برساتی ہے وہ شیریں صدا تو ہے

ہے تجھ سے روح بھی شاداں شگفتہ غنچۂ دل بھی
شمیمِ موجۂ گلشن ہے یا موجِ صبا تو ہے

میں جس کو دیکھتا ہوں وہ فدا ہے جان سے تجھ پر
سبھی کا مدعا تو ہے سبھی کا آسرا تو ہے

سرایت کر گئی تیری محبت میری رگ رگ میں
کہاں جا کر چھپے گا ہر جگہ جلوہ نما تو ہے

تجھی کو دیکھ کر جیتے ہیں تجھ پر مرنے والے بھی
فنا تو ہے، بقا تو ہے، بقا تو ہے، فنا تو ہے

اثر کرتی نہیں دل پر ترے آہ و فغاں میری
ترا دل سخت ہے یا درد سے ناآشنا تو ہے

نہ کیوں ہو بے نیازِ ہفت کشور تیرا شیدائی
جہانِ عاشقی میں سایۂ بالِ ہما تو ہے

ترے رحم و کرم پر ہے سفینہ زندگانی کا
غریقِ موج کر دے یا بچا لے، ناخدا تو ہے

زمیں رنگیں، فلک رنگیں، ہوا رنگیں، فضا رنگیں
ہر اک شے جس سے رنگیں ہے وہی رنگیں ادا تو ہے

قسم کھاتی ہیں تیرے حسن کی پریاں بھی حوریں بھی
جہانِ حسن میں حسن و ادا کی انتہا تو ہے

ہے تجھ پر شیفتہ دل بھی، جگر بھی، جسم بھی، جاں بھی
جہانِ زندگانی کا سراپا مدعا تو ہے

نظر سے ہٹ نہیں سکتا ہے دل سے مٹ نہیں سکتا
تمنائے دلی تو ہے، نظر کا مدعا تو ہے

ترے انداز ہیں بہجت فزا بھی قہر آگیں بھی
عتاب و لطف کا حامل ہے وہ معجز نما تو ہے

بھرا جاتا ہے نظارے کا عالم تیرے جلووں سے
نگاہِ حق نگر میں مظہرِ شانِ خدا تو ہے

نگاہِ ناز کا صدقہ ذرا مرہم نوازی کر
لبِ ہر زخم کہتا ہے کہ زخمی کی دوا تو ہے

عورت اور شاعری

علامہ اقبالؒ کے ایک شعر کی روشنی میں!

از جناب عطاء اللہ پالوی

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار (اقبال)

مفکرِ اعظم حضرت اقبال علیہ الرحمہ کا یہ اعتراض سارے "ہندوانِ ہند" پر ہے جن میں سب سے پہلا نمبر شاعر کا رکھا گیا ہے۔ بادی النظر میں یہ طنز اور اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے۔ "متغزلین" کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اس لئے کہ غزل کے معنی ہی جب "عورت و مرد کی گفتگو" کے ہیں تو ان کے یہاں "عورت" کی جلوہ فرمائیاں جتنی بھی نظر آئیں کم ہیں۔ رہے "ناظمین" تو ان کا دامن بھی کچھ کم رنگین نہیں معلوم ہوتا مثلاً سرور جہان آبادی کے سے چوٹی کے نظم نگار کو لے لیجئے۔ جن کی زمزمہ پردازیاں "عورت و محبت" کے جھگڑوں سے آزاد ہونے کی سند بڑے بڑوں سے لے چکی ہیں۔ مگر دیکھئے کہ کس طرح بیچارے کے اعصاب پر "عورت" سوار ہے۔

سرور ایک دن سرور میں نہیں بلکہ دماغی پریشانیوں! اور ذہنی کلفتوں سے گھبرا اور بوکھلا کر پُرامن تنہائی اور بے لوث سکون کی تلاش میں ایک سنسان میدان کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اس وقت نہ آسمان پر بادل کی کج کلاہیاں ہیں جسے شاعرانہ تخیل "عورت" کی بالی سمجھ کے یہ کہہ سکے۔ ع

چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی (اقبال)

اور نہ ستاروں کی جھرمٹ میں ماہتاب کی نشاط آگینیاں ہیں جن کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ۔ ع

جلو میں تیرے کمسن لڑکیاں زہرہ شمائل ہیں (اختر)

وہاں زمین پر نہ کوئی شنجرف گوں عمارت ہے۔ جس کو شاعر "عورت" کا پیکر قرار دے کے یہ کہہ سکے کہ ع

ہے حصارِ لالہ گوں دوشیزۂ رعنا مگر (عندلیب)

اور نہ گنگا یا جمنا کی موجیں ہوا سے اٹکھیلیاں کر رہی ہیں جن کے متعلق یہ شاعرانہ ادعا ہو کہ ع

لہرا رہی ہے ساری یا بہہ رہی ہے گنگا (شفیق)

وہاں نہ ابر آلود صبح کا سکوں آگیں سماں ہے جو یہ کہا جا سکے کہ ع

دوشیزۂ صبح کے چہرے پر ڈالے ہوئے کوئی آنچل ہے (شمس)

اور نہ شام کی رنگینیوں میں کوئی ایسا چمنستان کھلا ہوا پیش نظر ہے جس کے کسی گلاب کی شگفتہ پتیوں کے متعلق یہ شاعری کی جا سکے کہ عورنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا ہوا میں پلو سکھا رہی ہے (جوش)

وہ صرف ایک اجاڑ میدان ہے اور نرا بنجر صحرا۔ شاعر وہاں پہنچکر محو خرام ہے۔ یکایک اس کی نظر اس چھوٹے سے عقیق آسا کیڑے پر پڑ جاتی ہے۔ جسے عرفِ عام میں بیر بہوٹی کہا جاتا ہے۔ معاً شاعر کا سارا اضمحلال اور کل رنج و ملال کافور ہو جاتا ہے اور اس کا رنگیں تخیل وجد کرنے لگتا ہے۔ مگر چونکہ اس کے اعصاب پر "عورت" سوار ہے لہٰذا اس کی مدح و ثنا بھی کرتا ہے تو اس انداز سے

جلوۂ گل سے ہے رنگیں روئے زیبائے بہار
نازنیں ہے یا کوئی محو تماشائے بہار
یا ئے گلرنگ سے گلگوں ہے مینائے بہار
یا ہے آغشتہ بخون داغِ سویدائے بہار
سبزۂ کہسار نے یا لعل اگلا ہے کوئی
چن رہی ہے پھول یا دوشیزۂ رعنا کوئی

یکایک وہ کیڑا اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور شاعر اس کو نہ پاکر آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے اس کی نگاہ ایک کنڈلی مارے ہوئے مہیب مارِ سیاہ پر پڑ جاتی ہے۔ شاعر اسے دیکھ کر خوفزدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی جانب بڑھا ہی جاتا ہے۔ سانپ قدموں کی آہٹ پاکر ہوشیار ہو جاتا ہے اور پھن اٹھا کر درپئے آزار۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں شاعر کو راہ گریز اختیار کرنی چاہئے تھی۔ مگر چونکہ اعصاب پر "عورت" سوار ہے لہٰذا اس

نظارے سے وہ مغرور نہیں بلکہ مسرور ہوتا ہے۔ بیہوش نہیں بلکہ پرجوش ہوجاتا ہے۔ وہ اسے اپنا دشمن سمجھ کر اس سے محترز نہیں ہوتا۔ بلکہ دوست تصور کرکے اور ملتفت ہوجاتا ہے۔ وہ وحشیانہ طور سے اس کی جان لینے کے درپے نہیں ہوتا بلکہ والہانہ انداز سے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر پکار اٹھتا ہے کہ ؎

آ! کلیجے سے لگا لوں تجھکو اے پیاسے سیما!
ہیں کسی گیسو کے خم تجھ میں کسی ابرو کے چین[1]
یہ قیامت کی شکن اور یہ بلا کے پیچ و خم
آہ! کس کافر ادا کی تو ہے زلف عنبریں
ہے ترے حسن سیہ سے دل کو اک وابستگی
قیس میں ہوں آہ تو ہے لیلی محمل نشیں
آہ ظالم اف رے تیری گرمی جانسوز حسن
دل کو پھونکے دیتی ہے تیری نگاہ آتشیں
شب کو بانبی سے دلہن بن کر نکلتا یوں ہے تو
بال کھولے گھر سے نکلے جیسے کوئی مہ جبیں[2]
گرمیوں میں جیسے صندل ہے حسینوں کو پسند
ڈھونڈتا پھرتا ہے تو بھی یونہی شاخ صندلیں
پھن اٹھا کر آہ مستی میں وہ لہرانا ترا
جیسے ہو جوبن کی متوالی کوئی نازآفریں
سبزہ زاروں میں ہے شب کو اک عروس بے نقاب
دن کو بانبی میں ہے تو اک شاہد پردہ نشیں
آ! فسوں گر! آہ ہوں میں کشتۂ زلف دراز
مجھکو ڈس لے تیرے ڈسنے کا مجھے شکوہ نہیں
تجھ سے میرے گیسوؤں والے کی ملتی ہے ادا
میری نظروں میں تو ہے تو سو حسینوں کا حسیں
او ستمگر! آہ کب کالا سمجھتا ہوں تجھے
میں تو اپنا گیسوؤں والا سمجھتا ہوں تجھے

ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اعصاب پر "عورت" کے سوار ہونے کا کوئی اور ثبوت نہیں ہوسکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔؟ جواب یہ ہے کہ ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ یہ دنیا ہے۔ یہ "عورت" ہی کے باعث تخلیق ہوئی ہے۔ یہ "عورت" ہی کی بدولت رنگینی کے اس مرتبے پر پہنچی ہے۔ بلکہ یہ کہیئے کہ یہ بجائے خود "عورت" ہے۔ اور اس کی کل رعنائیاں، ساری کبریائیاں در اصل نسوانی جلوہ فرمائیاں ہیں ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں نہ اس "عورت" سے دامن بچایا جاسکتا ہے جس کی ادنیٰ تعریف یہ ہے کہ ؎

یہ "عورت" یہ رنگ اور نکہت کی پتلی — حقیقت میں ہے اک دلیل خدائی
یہ اک منتقد شعر دنیائے خوبی — یہ اک سجمد نغمۂ آسمانی
یہ تسنیم و کوثر کی نازک گلابی — یہ حسن ازل کی مکمل تجلی
یہ گلزار ہستی کی پرجوش تتلی — محبت کی ندی محبت کی پیاسی
یہ ماں ہو کہ بیٹی، بہن ہو کہ بیوی — ہر رنگ ہے مہر و شفقت کی دیبی
یہ گہوارۂ لطف یہ مہد راحت — یہ آغوش الفت، یہ فردوس ہستی
یہ گھر کا اجالا، یہ دنیا کا حاصل — یہ آنکھوں کی ٹھنڈک یہ دل کی تسلی
یہ شمع مودت، یہ ماہ رفاقت — یہ مہر تعطف، یہ ہمدرد طفلی
یہ تعبیر خواب تمنا و ارمال — یہ سرمایۂ عشرت و شادمانی
جوانی میں دلدار، دمساز، مونس — بڑھاپے میں غمخوار، ہمراز ساتھی
محبت میں گنگا، وفا میں ہمالہ — نزاکت میں پھول استقامت میں دھرتی
سندرتا کا سنسار، شکتی کا ساگر — پتی کی پجارن ستی، لاجونتی
صفا میں یہ ہیرا، ضیا میں یہ تارا — ادا میں یہ بجلی، بہا میں یہ موتی
شباب آفریں اس کا ایک ایک انداز — جو بولی رسیلی، تو نظریں نشیلی
تبسم سراپا، تعطف مجسم — چمن زار اس سے ہے زندگانی
یہ غربت میں راحت ہے دنیا میں جنت
یہ انعام قدرت ہے احسان ہستی! (کوکب)

اور نہ اس دنیا کی ان جاذبیتوں سے منہ موڑا یا کنارہ کشی کیا جاسکتا ہے جس کی ہر شے میں "عورت" اور اس کی رنگینیت ممزوج و محلول ہے۔ جس کی ہر چیز میں عورت اور اس کی نکہت اسی بسی ہے۔

اصل یہ ہے کہ قدرت کاملہ کا یہ عام قانون ہے کہ جس چیز کو زیادہ ضروری اور اہم سمجھتی ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے نہایت ہی مکمل قانون مرتب کرتی ہے۔ اور بہت ہی سخت انتظامات فرماتی ہے تاکہ اس کی انجام دہی میں کسی طرح کی کبھی کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہونے پائے۔ چنانچہ اسی قانون قدرت کے ماتحت اس نے تولید و

---

[1] لیکن آتش کی بیخوفی ملاحظہ ہو ؎
عاشق ہوں برابر مجھے اندیشۂ جاں ہے
بل کھائے ہوئے سانپ سی بکھرے ہوئے گیسو سے

[2] مگر تجر لکھنوی نے عورت سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ ؎
جواب ہو نہ سکا تیری زلف کی لٹ کا
نکل کے سانپ نے بانبی سے لاکھ سر پٹکا

تناسل کے متعلقات بھی بہت محکم فرمائے ہیں اور اس بقائے نسل کی تحفظ کے لئے اس نے نہ صرف عورت کو رنگینی و رعنائی کا ایک دلکش پیکر بنا دیا ہے بلکہ دنیا کی ہر چیز اور کائنات کی ہر شے میں کچھ اس درجہ جنسیت آگئیں "جذبۂ تسخیر" اور کچھ ایسی قوت انجذاب کوٹ کوٹ کے بھر دیا ہے کہ ہم باہمہ دانائی و فرزانگی اس کی جانب کھچے بغیر رہ ہی نہیں سکتے ظاہر ہے کہ اس صورت میں مناظر چاہے قدرتی ہوں یا غیر قدرتی۔ جب ان کی ادوں میں "عورت" اپنی جھلکیاں دکھا رہی ہو تو وہ مرد کے لطیف جذبات و احساسات پر اثر انداز ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ فطرت انسانی محنت کے بوجھ سے ہزار دبی سہی لیکن یہ ناممکن ہے کہ تحریک انجذاب تناسلی کی بنا پر قدرت کے نقوش میں نسوانی ادائیں اس کی نگاہوں کے سامنے رقص کریں۔ لیکن اس کے سینے کی مطمئن خلوت متورہ اور اضطراب سے بے پرواہ رہے ان سب سے قطع نظر جب بقول خود حضرت اقبال ؒ ؎

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک انسان چاہے وہ شاعر اور صورت گر ہو یا افسانہ نویس اس سے کیسے پرہیز اور گریز کر سکتا ہے ایسا تو ازل سے ہوتا آیا ہے اور ابد تک ہوتا رہے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جب وہ ایسا نہیں کر سکتا ہے تو اسے نشانۂ ملامت بھی نہیں بنایا جا سکتا۔

وجدانیات

پیئے جا رہے ہیں جیئے جا رہے ہیں!

از:- مولانا اظہر امرتسری

شرابِ محبت پیئے جا رہے ہیں ــــ کہ مر مر کے تم پر جیئے جا رہے ہیں
نہ بھولے سرِ حشر بھی ان کو عشوے ــــ یہاں بھی بہانے کئے جا رہے ہیں
مئے تلخ ہے مایۂ جان شیریں ــــ پیئے جا رہے ہیں جیئے جا رہے ہیں
قیامت ہے بن کر خدا حسن والے ــــ خدائی کو دھوکے دیئے جا رہے ہیں
وہ راہ سحر کیوں نہ حسرت سے دیکھیں ــــ شبِ غم کے بدلے لئے جا رہے ہیں
کہاں ہم کہاں مے یہ ہے فضل مولیٰ ــــ دیئے جا رہا ہے پیئے جا رہے ہیں
ترے ڈر سے جن کو اجل نے بھی چھوڑا ــــ وہ مجبور اب تک جیئے جا رہے ہیں
جہاں کے حسینوں کو چھوڑوں نہ کیونکر ــــ کہ حوروں کے لالچ دیئے جا رہے ہیں

نماز سحر کا ہوا وقت اظہر!
مگر آپ اب تک پیئے جا رہے ہیں

دلگداز افسانہ

اندھیرا

از:- موسیقار ہوشیارپوری

وہ اندھا تھا۔ اور اس کی دنیا اتنی اندھیاری کہ ہر طرف بھیانک سیاہیاں تیر رہی تھیں۔ ادھر سے ادھر تک تاریکی ہی تاریکی ——— نور کی کرن کبھی پھوٹی بھی تو قدرت نے اسے جلد ہی بجھا دیا۔

آنکھیں بے نور، مگر چہرہ جو قدرت نے دیا وہ خوب تھا۔ سر کے بال گھنگھریالے، اعضا متناسب، مگر اس کا اندھاپن اس کی ان جسمانی خوبیوں پر اتنا حاوی تھا کہ دیکھنے والے کی نظریں ہر پھر کر جب اس کی اندھی آنکھوں پر، جن کی عمیق گہرائیوں میں خاموش شکلیں ناچتی تھیں مرکوز ہوتیں تو اسے ڈر سا محسوس ہوتا اور وہ جھٹ اپنی آنکھیں سمیٹ کر پرے ہٹ جاتا تھا۔

زندگی، اس کے لئے ایک ڈراؤنے خواب سے زیادہ نہ تھی۔ وہ ازل سے تاریک چلی آتی تھی اور تاریک چلی جا رہی تھی۔ ایک نامعلوم منزل کی طرف! ——— اس نے بہت دفعہ کوشش کی کہ کسی طرح وہ روشنی اور سایہ، دن اور رات، سیاہ و سفید، خوبصورتی اور بدصورتی کے معنی سمجھ سکے مگر وہ ہر مرتبہ ناکام رہا۔ سہانی دھوپ اس کے لئے گرمی کے احساس سے زیادہ نہ تھی۔ خوشگوار چاندنی، اس کے لئے نام تھا ایک ٹھنڈک بھری کیفیت کا اور بس، گویا زندگی اس کے نزدیک ایک خار دار وادی تھی، جس میں قدم قدم پر مصائب کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ اپنی بیچارگی و مایوسی پر اکثر آنسو بہایا کرتا، جن کی رو میں چپکے چپکے وہ بہتا ہوا بالآخر ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا جہاں اس کی مضطرب روح احساس تنہائی کے ویرانے سے نکل کر رسیلے گیتوں اور دلگداز نغمات سے ہمکنار ہوتی اور وہ جھوم جھوم جاتا۔ اس کی زندگی کی وہ چھوٹی چھوٹی ساعتیں جو نغموں کی راحت بھری گود میں گذرتیں بہت ہی کیفیت انگیز ہوتیں، وہ کچھ لمحوں کے لئے تو اپنے آپ کو اور اپنے اندھے پن کو بھول جاتا۔ لیکن جب اس بےخودی و خودفراموشی کا سہانا طلسم ٹوٹتا تو اس کی روح پھر احساس غم کی انہی دلسوز سنگینیوں سے دست و گریبان ہو جاتی۔ ایسی حالت میں بس اس کی غمگساری کو آنسو تھے مگر بے سود، اس کا غم لازوال تھا۔

ایک دن اسی طرح وہ رو رہا تھا کہ ننھے نے چپکے سے اس کا بازو دباتے ہوئے کہا۔ "آؤ بھیا! اوپر چلیں بھابی کہتی ہے یہاں بڑی ٹھنڈ ہو گی۔ اوپر کوٹھے پر بڑی اچھی دھوپ کا ہو رہی ہے"۔ تو وہ آنسو پونچھتا ہوا اس طرح چونکا جیسے بچے نیند میں ڈر کر چونکتے ہیں۔ بیتاب سا ہو کر بولا۔ کون؟ ننھا! ارے بھئی! اوپر بہت اچھی دھوپ نکلی ہوئی ہے! خیر، اچھا چلو ——— !"

ننھے نے ایک ہلکی خفیف سی جنبش دی اور پھر اس کی انگلی پکڑ کر اسے بالائی منزل کی چھت پر لے گیا۔ اور وہاں اسے آرام کرسی پر بٹھا دیا۔

بسنت کی رت تھی۔ فضا پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ بڑا ہی کیف انگیز منظر تھا۔ خوشگوار دھوپ بہت ہی بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ ننھے کا بھیا بھی جیسے دھوپ سے کھلے ہوئے موسم سے لطف اندوز ہو رہا تھا کیونکہ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پپوٹوں میں کچھ اس طرح گھوم رہی تھیں گویا وہ بھی قدرت کی دلفریبیوں کو دیکھنے کا خواہشمند ہو۔ یہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں صرف سیاہیوں کو دیکھ سکتی تھیں۔ سیاہیاں! ——— کپکپاتی ہوئی تاریکیاں!

وہ گم سم بیٹھا تھا کہ معاً ایک یاد اس کے دماغ میں ایک لطیف موج کی طرح کانپی اور وہ کچھ زیادہ ہی بیقراری سی محسوس کرنے لگا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے، وہ نیچے بیٹھا تھا۔ کہ اس کے کانوں میں مندر کی گھنٹیوں کی مانوس آواز پڑی اور اس نے سمجھا کہ شام ہو رہی ہے۔ شام کے وقت وہ ایک بھجن گایا کرتا تھا۔ چنانچہ آج بھی اس نے بھجن گانے کی غرض سے ستار اٹھائی۔ لیکن ابھی اس کی انگلیاں ستار کے تاروں سے مس نہ ہوئی تھیں کہ اس کی بیٹھک کے آگے عورتوں کا ایک گروہ قہقہے لگاتا ہوا گذرا۔ اور اس کی تمام تر توجہ ان پر سمٹ گئی۔ وہ تمام کی تمام نوعمر معلوم ہوتی تھیں۔ کیونکہ ان کی آوازیں نہایت نازک مگر پرکشش تھیں۔ ان میں سے ایک نے نہایت ہی مبتسم ریز لہجہ میں کہا۔ "دیکھو ری مینا! بسنت رت کی وجہ سے چیزوں پر کتنا نکھار اور جوبن آ گیا ہے اور تم تو آج بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتی ہو!" اس کے بعد آہنگ خلود قہقہوں کے سوا کچھ نہ سن سکا کیونکہ وہ

دور جا چکی تھیں! ـــــ ان کے چلے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک اس کے متعلق سوچتا رہا جو آج بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتی تھی ۔ دراصل وہ نینا کو جانتا تھا اور شاید اسی لئے وہ ان لڑکیوں کی آوازوں کو غور سے سننے لگ گیا تھا ۔ ورنہ یہ حقیقت تھی کہ عورتوں کی آوازیں اُسے بجائے خوش کرنے کے مغموم و ملول بنا دیتی تھیں ۔ عورت کی آواز سنتے ہی اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگتا اور ساتھ ہی اس کی روح زخمی پرندے کی طرح تڑپنے لگ جاتی تھی ۔ جذبات و احساسات میں ایک ہیجان بپا ہو جاتا ۔ اور یہ باتیں اس کے لئے ناقابل برداشت سی تھیں کہ جذبات اُبھریں مگر اپنا ما دا نہ پاکر سطح دل سے پانی کے بلبلوں کی طرح مٹ جائیں ۔

ہاں تو جب یہ کل شام والی بات اسے یاد آئی تو اس نے تو ق آمیز انداز سے پوچھا ۔ "بھئی ننھے بہادر ۔ بھلا خوبصورتی کسے کہتے ہیں ؟"

ننھا اس وقت افق پر ایک بطخ نما بادل کو تیرتے دیکھ رہا تھا ، چونک کر بولا ۔ "خوبصورتی بادل کو کہتے ہیں بھیا !" کتنا معصوم مگر بامعنی جواب تھا ۔ مگر اندھے اُمنگ نے کبھی ! دل دیکھا ہوتا تو سمجھ سکتا ۔ بادل کا تصور باندھنا اس کے لئے ایک نئی مشکل تھی ۔ تاہم اس نے پھر شوق سے سوال کیا ۔ "بھئی ننھے بہادر ۔ بادل کیسا ہوتا ہے ؟"

ننھا بادل کو چھوڑ کر اُمنگ کو دیکھ رہا تھا ۔ اس کی آنکھوں میں ایک فلسفیانہ کیفیت نمودار تھی ۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا معصوم دل و دماغ کسی گہری فکر میں ڈوبا جا رہا ہے ۔ وہ کچھ دیر بھیا کے چہرے کو برابر تکتا رہا پھر دفعتہً موثر لہجہ میں بولا ۔ "بھیا تم بھی تو خوبصورت ہو مگر ، .." اور وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا ۔ "مگر کیا . ؟" اُمنگ نے اضطراری لہجہ میں پوچھا اور ننھے نے جواب کچھ اس پھرتی سے دیا کہ جھٹ ہی بعد یہ کہہ کر سہم گیا ۔ "بھیا ! ـــــ مگر نینا کہتی تھی اسے تمہاری آنکھوں سے بہت ڈر لگتا ہے ۔"

نادان چھوکرا اپنی طرف سے تو تمام باتیں نینا کے سر تھوپ گیا ، مگر اسے کیا معلوم کہ وہ امنگ کی زندگی کے رہے سہے سکون کو بھی آگ لگا گیا ـــــ اب اُمنگ نے جانا کہ نینا اتنے دنوں سے اس کے یہاں کیوں نہیں آئی ۔

کیا اس کی اندھی آنکھیں واقعی اتنی بھیانک ہیں کہ ان کا خوف کسی کو اس کے پاس نہ آنے دے ۔ اور دراصل اس کے پاس آتا بھی کون تھا ؟ نینا بھی یونہی آ جاتی ، دو گھڑی اس کے گیت سننے ۔ اور اس کے سوا اس کے پاس تھا ہی کیا ؟ ننھے نے یوں ہی دل رکھنے کی خاطر کہہ دیا ہوگا کہ وہ خوبصورت ہے ۔ تاہم نینا کے نہ آنے کی وجہ جان کر اس کا جی چاہا کہ وہ اپنا گلا گھونٹ لے ۔ کیونکہ اس کی دنیا ـــ اس کی زندگی ـــ پہلے سے بھی زیادہ تاریک ہوئی جا رہی تھی ۔ نینا اب نہیں آئیگی کیونکہ وہ اندھا تھا ۔ اور اندھے کو نینا سے کیا سروکار ؟ کیا واسطہ ؟ اگرچہ امنگ نے نینا کو نہ دیکھا تھا لیکن اس کے دل میں ایک یقین سا پیدا ہونے لگا تھا کہ دنیا والے جس چیز کو حسن اور خوبصورتی کہتے ہیں وہ دراصل نینا ہے ۔ نینا خوبصورت کیوں نہ ہو ؟ اس کی آواز میں ایک رسیلا لوچ تھا ۔ نینا کے داد و تحسین کے کلمات سن کر اسے وہی لطف آتا جو اس کی روح موسیقی کی دلآویز سروں سے محسوس کرتی ۔ امنگ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں اور اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی دنیا پر چھائی ہوئی تمام تاریکیاں چھٹ کر ایک ایسی چیز کو راہ دینے والی ہیں جو اسے اس قابل بنا دیگی کہ وہ نور و ظلمت میں تمیز کر سکے لیکن پیشتر اس کے کہ ان تاریکیوں کا پردہ چاک ہوتا وہ خوبصورت نینا ہی اس سے آنکھیں پھیر کر چلی گئی ۔ اور اب وہ اپنی حسرتناک نامرادی پر غم کے آنسو بہا رہا تھا ۔ اس کے دل و دماغ پر پریشان کن خیالات اس طرح چھا رہے تھے جیسے ابرآلود شام کی مدھم مدھم روشنی پر رات کے تاریک سائے رقص کر رہے ہوں ۔ قوت فکر بھی تھی کہ جواب دے رہی تھی ، اور وہ اس طرح بہت دیر تک سر کو گھٹنوں کے درمیان ڈھلکائے بیٹھا رہا حتیٰ کہ رات ہو گئی اور تمام کائنات کو تاریکی نے اپنی سیاہ چادر میں لپیٹ لیا ۔

زندگی کے چوبیس سال اسی طرح بیت گئے ۔ اس کے والدین نے اس کے کہنے پر دولت پانی کی طرح بہا دی ۔ لیکن اس کی آنکھوں کی بینائی ہزار ہا کوششوں کے باوجود بھی واپس نہ لائی جا سکی ۔ بڑے بڑے ماہرین امراض چشم کی خدمات حاصل کی گئیں لیکن کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا ۔ یاس و نومیدی کے ان مسلسل تھپیڑوں سے تنگ آ کر اس نے آنکھوں کا خیال ہی بالکل ترک کر دیا ۔ آخر اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا تھا ؟ ـــــ اور اب وہ اپنے وقت کا بہت سا حصہ دریا کے کنارے ایک بنگلہ نما مکان میں گذارا کرتا جو اس کے والدین نے اسے خاص طور پر بنوا کے دیا تھا ۔ دراصل وہ نینا کو بھولنا چاہتا تھا ، اور یہاں آ کر وہ اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہوتا جا رہا تھا کیونکہ دریا کی موجوں کا ترنم ، بھیگی بھیگی ہواؤں کی خوشبو سارا دن اس پر ایک سحر انگیز کیفیت طاری رکھتی تھی ۔ شہرت اب اُسے

دہشت سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اکثر سنتا کہ شہر کی اندھیاری راتیں بھی بجلی کے قمقموں کی روشنی سے دن کی طرح جگمگا اٹھتی ہیں۔ لیکن اس کی دنیا کی تیرہ و تار ویرانیاں اسی شدومد سے بڑھ رہی تھیں اور آج ——— آج صبح سے تو اسے اپنی زندگی معلوم ہوتی تھی۔ بوڑھے گولے لے اسے باتوں ہی باتوں میں ایک ایسی مسرت انجام رومانی داستان سنائی کہ اس کے ساز دل کے زنگ آلود تار ایک مرتبہ پھر جھنجھنا اٹھے دبی ہوئی چنگاری پھر سلگ اٹھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس کے دل میں کئی بار یہ تمنا پیدا ہوئی کہ وہ بھی مرلی کی سریلی تان لگا کر اسے بلا لیا کرتا اور اسے ناچ نچاتا ——— وہی رادھا اور کرشن ایسا ناچ۔ اور وہ تو گانا بھی بہت اچھا جانتا ہے۔

وہ انہی رومان پرور خیالات میں بہا جا رہا تھا کہ ایک آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے ڈھلک کر اس کے ہاتھ پر گر پڑا اور وہ چونک سا گیا۔ جاگ اٹھا۔ اور اس کے بعد وہی کپکپاتی ہوئی تاریکی اور اس کا تلخ احساس ——— آج اسے یقین ہو گیا کہ وہ دنیا میں اس لئے نہیں آیا کہ اس کا بھی زندگی کے سفر میں کوئی ساتھ دے بلکہ قدرت نے اسے پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ زندگی کی ڈگر پر تن تنہا ٹھوکریں کھاتا ہوا بڑھا جائے۔ ایک نامعلوم منزل کی طرف۔ تنہائی اس کی بہترین رفیق تھی اور بس! لیکن وہ صبر و تحمل لائے تو کہاں سے۔ اس کا سینہ جذبات کی محشر سامانیوں کے لئے تنگ ہوا جا رہا تھا۔ اور اس کا علاج؟ ———

"بالو جی!" گوالا کہہ رہا تھا۔ "میری تو مرجی یہ کہے کہ آپ بیاہ کرا لیویں۔ امیروں کو بھلا استریوں کی کیا کمی ہے؟"

شادی! یہ ایک معمہ تھا جسے وہ اپنے ماضی کے تلخ تجربوں کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کیا کرتا۔ اور بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر اس کی شادی ہو بھی گئی تو وہ شادی نہ ہوگی۔ اس کی بیوی بھی تو آخر نینا کی طرح ایک عورت ہوگی۔ اور کیا وہ بھی اس کی آنکھوں سے ڈر نہ جائیگی؟ ڈرنے کے بعد کیا وہ بھی نینا کی طرح بھاگ نہ جائیگی؟ یہ ایک ایسا صدمہ ہوگا جو اسے جیتے جی مار دے گا۔ لیکن آخر اس کے دل کی بیتا بیوں کا علاج؟ سوا اس کے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی کو ختم کر دے اور ہمیشہ کے لئے ان یاس و نومیدی میں ڈوبی ہوئی تاریکیوں سے کنارہ کش ہو کر ایک ابدی نیند سو جائے۔

خودکشی! ایک خوفناک جرم! لیکن خودکشی اسے ایک ایسی دنیا میں لے جانے کا ذریعہ ہے جہاں نہ اس کے جذبات کے بھڑک اٹھنے کا خطرہ، نہ اس اندھیری اور تاریک زندگی کا احساس! امنگ کو خودکشی

کے خیال میں ایک خوش آئند دنیا بستی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اور بالآخر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ فوراً اٹھا۔ گرتا سنبھلتا دریا کے کنارے پہنچا اور اپنے آپ کو لہروں کے سپرد کرنے کا قطعی فیصلہ کرنے لگا۔

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ کیونکہ سورج کی کرنیں امنگ کو اپنے چہرے پر متوازی گرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ پرندوں کے غول کے غول چہچہاتے ہوئے ایک ہی طرف کو اڑے جا رہے تھے دریا کی لہریں عجیب گیت الاپ رہی تھیں جیسے اپنے آغوش میں لینے کی اسے دعوت دے رہی ہوں۔ امنگ کی آنکھوں کا اندھیرا چھلکتا ہوا سا محسوس ہوا۔ دل میں ایک غیر ارادی جذبہ سا ابھرا۔ اور اس کی ٹانگیں بے اختیار ہو کر کانپنے لگیں۔ پاؤں پھسلتے سے محسوس ہوئے اور وہ سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا مگر بے سود! اگلے لمحہ وہ پانی میں تھا۔ دریا کی لہریں اسے اپنی گود میں لے کر اس طرف کو چل نکلیں جہاں ماہی گیر مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال پھیلا رہے تھے۔

امنگ کی گمشدگی دنیا کے لئے ایک پہیلی بن کر رہ گئی۔ کوئی کہتا اسے بھوت پریت اٹھا کر لے گئے۔ کوئی کہتا وہ کسی دوسرے شہر میں چلا گیا ہے لیکن کنہ کو کوئی نہ پہنچ سکا۔

"پرنام بابا جی!"

"پرنام!"

"ایک سوال ہے بابا!"

"مجھ سے؟ جو خود دوسروں کا محتاج ہے؟"

"ہاں! اگر مان لیں تو"

"اچھا کیا حکم ہے میرے لئے؟"

"وہ کل والا گیت سنا دو بابا"

"کون سا گیت؟"

"وہی جو کل رات شہر مندر کی دریائی سیڑھیوں پر بیٹھے آپ گا رہے تھے"

"اس کا کیا سننا بابو؟ یونہی ایک بے وقتی راگ تھا۔ اچھا لگا تھا کیا تمہیں؟"

"بہت ہی اچھا منگو بابا!" یہ کہہ کر مغموم شکل نوجوان نے کچھ پیسے منگو بابا کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور اپنی انگلیوں کو سر کے پریشان بالوں میں پھیرنے لگا۔ منگو بابا نے جھٹ سے پیسوں کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر انہیں ٹٹولنا شروع کر دیا۔ شاید گننے کی خاطر۔ دو نہ تین، پورے آٹھ پیسے پا کر اس کے چہرے پر خوشی دمکنے لگی۔ اس کے سیاہی مائل ہونٹ

ایک مسرت انگیز مسکراہٹ سے کانپنے لگے۔ بالآخر اس گراں رقم کو اپنے کشکول میں ڈال کر بولا۔ "رام بھلا کرے بابو تیرا۔" اور منگو بابا کی آنکھوں کی بے نور پتلیاں پپوٹوں میں اس طرح حرکت کرنے لگیں جیسے وہ اپنے محسن کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہوں مگر انھیں مایوس ہو کر ساکت ہونا پڑا۔ بابا کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ حتیٰ کہ اسے بالکل خیال نہ رہا کہ وہ پیسے کسی نے اُسے گیت سننے کے لئے دیئے ہیں۔

"بابا گیت؟" نوجوان نے کسلمندی سے کہا۔

"اوہو! میں تو بھول ہی گیا تھا بابو! اچھا تو سن لو وہ گیت!"

یہ کہہ کر اس نے ہولے ہولے گنگنانا شروع کر دیا۔ پھر اپنا مُنہ آسمان کی طرف بلند کرکے گانا شروع کر دیا۔ وہی سنت تکا رام کا دوہا ؎

جیون تو اک ساگر ہے اور من ہے اک نیا
لوبھ کرودھ کی لہریں اٹھیں ہر کا نام کھویا
کام کی آندھی کپٹ کی اگنی پل پل بڑھتی جائے
کہے تکا جو نام لے اس کا نیا پار لگائے!

یہ دوہا اندھے منگو بابا نے ایک سادہ سی سُر میں گایا۔ اور اس کے بعد اس کی آواز "جگت میں چھائی کالی رات" کے بند کو سوز میں بھگوتی ہوئی معراجِ موسیقی کو چھونے لگی ؎

"پاپ کی گھر گھر آئیں گھٹائیں لوٹ پھوٹ کی چلیں ہوائیں
کرودھ کی اگنی بڑھتی جائے ستم کی ناگن سی لہرائے
انسانوں کے روپ میں ڈاکو پھریں لگائے گھات
جگت میں ...."

اندھے کی نغمہ بار آواز لہروں کے زیروبم کی طرح فضا کی اونچ نیچ کو پھاندتی ہوئی نامعلوم آکاش کی کن بلندیوں میں کھونے لگی۔ نوجوان قریب ہی ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ خاموش، ساکت، اس کے چہرے پر ایک عجیب متانت آمیز کیف طاری تھا۔ بابا کی آواز بہت ہی دلنشیں اور موثر تھی۔ بلا کے سوز میں ڈوبی ہوئی۔ جو راہی گذرتا اندھے کا گیت اس کے پاؤں میں کھنکتی ہوئی بیڑیاں ڈال دیتا۔ اور وہ ٹھہر جاتا۔ گھڑی آدھ گھڑی جھومتا اور پھر بابا کے سیاہ کشکول میں کھن سے ایک پیسہ ڈال کر یا دل ناخواستہ ایک اضطراری آہ سی بھرتا ہوا اپنی راہ لیتا۔ گاتے گاتے اکثر منگو بابا کے ہاتھ ہولے سے کشکول میں داخل ہو جاتے اور کچھ ٹٹولتے۔ کشکول بھاری ہوتا جا رہا تھا اور اس کا بھاری ہونا گیت کو آسمان کی بلندیوں سے زمین کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ اس کے سُروں میں درد تھا، سوز تھا۔ اب اس کا گیت ایک ہلکا سا خوشگوار نغمہ بن کر رہ گیا تھا۔ تاہم وہ گائے جا رہا تھا۔ کیونکہ یہ اس کا فرض تھا۔ پھر کشکول بھی تو برابر بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس کا خیال تھا کہ اب وہ اس رقم سے گھر واپس چلا جائے گا۔ ضرور ہی۔ کل۔ کیونکہ اسے ننھے بہادر کی یاد اکثر آ آ کر تڑپاتی تھی۔

گاتے گاتے شام ہونے لگی۔ مغربی افق پر ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہی تھیں۔ اور اب جلد ہی مشرقی سمت سے تاریکی نمودار ہوا چاہتی تھی۔ منگو نے ایکدم گانا بند کر دیا اور بولا۔ "شام ہو گئی کیا؟"

منگو بابا کے گیت کی عمیق گہرائیوں میں کھویا ہوا نوجوان اس طرح چونکا جیسے ماں اپنے بچے کی آواز نیند میں سن کر فوراً ہی چونک پڑتی ہے۔ "شام ہو گئی کیا؟" اس نے ایک اداس سی جماہی لیتے ہوئے کہا

"اب تو شام معلوم ہوتی ہے بابو" بھکاری اپنے سر کے بالوں کو کھجاتے ہوئے بولا۔ "ابھی ابھی شو مندر میں پوجا کی گھنٹیاں جو بجی تھیں تو میں نے جانا شام ہو گئی ہے"

"ہاں... !" نوجوان نے لفظ ہاں کو لمبی سانس میں کہا۔ اور اس کے بعد اپنے الجھے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیاں بلاوجہ پھیرنے لگا۔

"اب جاتا ہوں" اس نے قدرے گھبراہٹ سے کہا تو منگو بابا نے فوراً پوچھا۔ "کہاں جاؤ گے اب بابو؟"

"راجن پور ——" اور وہ راجن پور کی طرف جو وہاں سے کچھ دور نہ تھا چلدیا۔ ایک وارفتگی کے عالم میں۔ ابھی وہ قریباً دس بیس قدم ہی گیا ہوگا کہ اس کے قریب سے ایک سایہ سا گذرا۔ وہ یکدم ٹھٹک گیا اور پیچھے مڑ کر متجسس نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ وہ کوئی عورت تھی گود میں بچہ لئے ہوئے۔ وہ بہت ہی حیران ہوا جب اس نے عورت کو بھی پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے دیکھا۔ ان کی نظریں ضرور آپس میں ٹکرا جاتیں۔ اگر وہاں درختوں کے دو طرف جھنڈوں کی وجہ سے اندھیرا نہ ہوتا۔ نوجوان کسی سوچ میں پڑ گیا۔ بوجھل سر کو کندھوں میں ڈھلکا کر وہ سوچے جا رہا تھا۔ اَن گنت جھرّیاں ہل پھری زمین کی اونچی نیچی سلوٹوں کی طرح نمایاں ہو رہی تھیں —— لیکن وہ بدستور سوچے جا رہا تھا۔ اور وہ عورت —— وہ موزوں قد کی پتلی سی عورت کچھ فاصلے پر اسی طرح کھڑی تھی۔ دونوں بے حرکت اور مبہوت تھے، کہ نوجوان نے گھُٹے گلے سے کہا۔ "تم کون ہو؟" اور عورت نے فوراً ہی جواب دیا۔ "میں —— میں بھکارن ہوں" اور وہ ایک قدم آگے بڑھی لیکن ٹھہر گئی۔ وہ نوجوان دو قدم آگے بڑھا لیکن ٹھہر گیا اور معاً معلوم

کیا سوچ کر اس نے قدم پیچھے ہٹا لیے۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے پھڑپھڑائے مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کیونکہ وہ انتہائی طور پر متالم ہو جا رہا تھا۔ اسے اپنے پاؤں منوں وزنی معلوم ہو کر زمین میں دھنستے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ وہ جھنجھلا کر سنبھلا اور فوراً بعد ہی منہ موڑ کر چل دیا راجن پور کی طرف ——

عورت دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

شام ہو چکی تھی۔ پجاری شومندر کی گھنٹیاں بجا بجا کر ایک ہم آہنگ بھجن گا رہے تھے۔ راجن پور کو جانے والی سڑک پر اداسی سی چھا رہی تھی۔ سنگو بابا پیپل والے تھڑے سے اٹھ کر بسرام کی غرض سے شومندر کی دریائی سیڑھیوں کو جانے ہی والا تھا کہ کسی نے کہا: "پرنام بابا جی!" آواز میں بابا کو نسائیت سی محسوس ہوئی۔ اور وہ جاتے جاتے ٹھٹک گیا۔ قدرے متانت سے بولا۔ "پرنام دیوی! مگر میں تو اب گھاٹ کو جا رہا ہوں۔"

"رانی! تم بھی سنگو بابا کے قدم چھوؤ۔" عورت یہ فقرہ بمشکل ہی ختم کر پائی تھی کہ رانی نے جھٹ سے بابا کے قدم جا چھوئے۔ مگر سنگو بابا نے فوراً ہی بچے کو پچکار کر ہٹا دیا اور محبت بھرے انداز میں پوچھا۔ "تمہاری بیٹی ہے دیوی؟"

"ہاں!" عورت نے ایک دردناک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "بھکارن ہی کی ہے بابا مہاراج!"

"بھکارن" کا لفظ سن کر سنگو بابا حیرت سے چونک پڑا۔ اس لئے نہیں کہ عورت ذات کی آمد اس کے لئے کوئی انوکھا تھا۔ نہیں بلکہ مردوں سے زیادہ عورتیں سنگو بابا کے گیتوں کی شیدائی تھیں۔ بابا کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ بابا کے انمول گیت تھے۔ اور وہ اپنے گیتوں کے شیدائیوں سے محبت اور خلق سے پیش آتا تھا۔ اس کے علاوہ بابا مہاراج دوسرے فقیروں سے کتنے مختلف تھے؟ نہ وہ گیروے کپڑے پہنتے تھے نہ ہی دوسرے سادھوؤں اور مہنتوں کی طرح اپنی جسمانی ہیئت بگاڑنے پران کا یقین تھا۔ مگر ان کا طرز گفتگو اور سلوک اتنا مخلصانہ تھا کہ بس دنیا انھیں بھگت سمجھتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے پاکیزہ گیتوں کے ذریعہ خدا سے باتیں کرتے ہیں۔ اگرچہ بابا اپنے شیدائیوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کے پاس علم موسیقی کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن بھلا کون مانتا تھا ان کی اس بات کو؟ چنانچہ بابا تک پہنچتے پہنچتے نازک مزاج عورتوں کے پاؤں نہ تھکتے۔ کنواریاں، کیا سہاگنیں اور وہ جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں بوڑھیاں بھی گرتی پڑتی سنگو بابا کے پاس پہنچ جایا کرتیں۔ شومندر کے ادھر جو پیپل کا درخت ہے وہاں بابا اپنے درشن دینے چلے آیا کرتے تھے۔ خدانخواستہ اگر کسی دن وہ نہ آ سکتے تو سنگو بابا کی شمع موسیقی کے پروانے گھاٹ پر جا نثار ہوتے اور دھن دولت اور اس طرح کی دوسری چیزیں بطور نذرانہ پیش کر کے اپنی عقیدت کا ثبوت دیتے تھے۔

آہستہ آہستہ بابا کو عوام گیانی دھیانی سمجھنے لگے۔ جس طرح دھوپ سی جھلسی ہوئی کونپلیں ساون کی آمد پر ایک نئی زندگی پاتی ہیں ایسا ہی کچھ حال امنگ کا ہوا اور اسی لئے تو لوگ اب اسے سنگو بابا کہہ کر پکارتے تھے۔ اب زندگی ایک لذت آفریں کیف بن کر اس کی رگ رگ میں پھریریاں لے رہی تھی۔ اور یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔ لیکن اس امر کا احساس امنگ کو بدرجہ اتم تھا کہ یہ سب کچھ اس کے گلے کی بدولت ہے۔ جس سے نکلی ہوئی سریں اسے خود بھی مدہوش کر دیتی تھیں۔ لیکن اب وہ اندھا ہونے کے باوجود بھی اندھاپن محسوس نہ کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دن وہ سروی کہہ رہی تھی اس کے گھونگھریالے بالوں میں اپنی پتلی پتلی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہ اس کے بال کتنے حسین ہیں۔ پھر اس نے اس کے رخساروں کو چوم لیا تھا۔ اور اس نے بھی اس کے رخساروں کو۔ غرضیکہ اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ اور بدلا بھی کچھ اس ڈھنگ سے کہ خزاں کی تباہ کاریاں ہی بہار کی دلگداز رعنائیوں ایسا مزہ دے رہی تھیں۔ تاریکی، سیاہی، ظلمت، یہ وہ بھیانک بلائیں تھیں جو اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھیں لیکن آج وہ ان سے اکتساب لذت کر رہا تھا۔

آپ اسے مبالغہ ہی تو سمجھیں گے لیکن راجن پور اور اس کے گرد و نواح کی مخلوق تو بکر زبان ہو کر کہنے کو تیار تھی کہ سنگو بابا اپنی خوش الحانی سے فضا میں پرواز سے اڑتے ہوئے پرندوں کو گرا لیتے ہیں۔ جب گاتے ہیں تو دل کی تاریکیوں کو دلنواز رونق میں بدل دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آکاش کی بلندیوں سے کوئی دیوتا اتر آیا ہے جو موسیقی کی زبان سے سننے والوں کے دلوں کی کہہ رہا ہے۔ شومندر کے پجاری جب وہاں سے گذرتے تو بابا مہاراج کی طربناک آواز کے اثر سے ان کے درشت، بیرحم اور متردد دو دل شگفتہ پھول کی طرح کھل جاتے۔ عورتوں کو تو ان کی آواز بہت ہی تمنا آفریں اور مراد افزا معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ بعض عورات کے بکراں سنانے کی پرواہ نہ کرتی ہوئی سنگو بابا کے پاس گھاٹ پر پہنچ جاتیں اور انہیں گانے پر مجبور کر دیتیں۔ بابا گاتے تو آسمان کے تارے زمین کی طرف گرتے دکھائی دیتے۔ دریا کی لہریں سا

کی روحانی اگر یہ انحطاط ہو کر جمود اور تعطل پکڑنے لگتی ـــــ بابا منگو ہوتا اور ان کا گیت، اور وہ گیت کے نشیب و فراز پر ناچنے والی پیاسی روح، جو چند ساعتوں کے لئے دنیا اور اس کی سماجی بندھنوں کو ٹھوکر مار کر وہاں پہنچ گئی ہوتی۔ منگو بابا کو اب اندھا کہنا ان کی موجیں مارتی ہوئی جوانی کی توہین کرنا تھی۔

ماں تو عورت کی آمد اس کے لئے کوئی تعجب خیز واقعہ نہ تھا، تاہم ایک بھکارن کی آمد اس کے لئے تعجب خیز ضرور تھی۔ کیونکہ کئی ایک بھکاری اور بھکارنیں بن بلائے اس کے پاس سے گذر جاتے۔ اس کے علاوہ بھیک منگوں کو اس سے واسطہ ہی کیا تھا؟ آخر وہ کوئی بھکاری تھوڑا ہی تھا۔ اگرچہ نذر قبول کرنے کے بعد اسے "رام بھلا" کہنے کی فقیرانہ عادت ضرور ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی خواہشات کو ان نذرانوں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، تاہم وہ خوش تھا کہ اس سلسلہ نذر و نیاز کی بدولت ہی اسے ان دلسوز احساسات سے رہائی مل گئی تھی جو عبارت تھے اس کی گذشتہ زندگی کی ناکامیوں اور نامرادیوں سے۔ تاہم منگو بابا نے اپنی متذبذب حیرت کو چھپاتے ہوئے کہا: "تو تم بھکارن ہو؟"

وہ بولی "ہاں!" ـــ ان لفظوں میں ایک درد خیز لوچ تھا۔ جسے سن کر منگو بابا کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس کے جسم میں ایک تھرتھری سی دوڑ گئی۔ وہ کچھ مضطرب سا ہو گیا۔ جیسے پیاسا کسی خوبصورت بلوریں گلاس میں پانی دیکھ کر ہو جاتا ہے۔

"اور تم کہاں سے آ رہی ہو؟" منگو بابا نے فکر انگیز لہجہ میں پوچھا اور وہ اپنا دایاں ہاتھ بڑے پیار سے مانی کے ننھے ننھے سر پر پھیرنے لگا اور مانی بھی اس کے پیروں سے اس طرح چمٹی ہوئی تھی جیسے بچے کچھ مانگنے کے لئے اپنے بڑوں سے چمٹ جاتے ہیں۔

"آج دراصل میں کہیں بھی نہیں گئی بابا۔" وہ یہاں آ کر دفعتہً رک گئی۔ اور جب دوبارہ اس نے زبان کھولی تو اس کی آواز حلق میں سے رک رک کر آئی۔ "اور وہ جو آدمی ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے کیا وہ یہاں روز آتا ہے؟" اس کی نظریں درختوں کے اس جھنڈ پر پڑ رہی تھیں جس کا بالائی حصہ اب مہتاب کے نورانی دھندلکے سے اکتساب نور کر رہا تھا۔

منگو بابا کا طائر خیال شاید کسی اور جگہ محو پرواز تھا۔ کیونکہ اس نے بھکارن کے سوال کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

"آج دن کیسا رہا تمہارا؟"

جھٹ سے بولی۔ "مجھے تو کچھ بھی نہیں مل سکا آج۔ لیکن آپ کی تو چاندی ہی چاندی معلوم ہوتی ہے۔"

"یہ آج پر ہی کیا موقوف ہے۔" بابا نے جوابًا کہا۔ "یہ تو اپنا معمول بن گیا ہے۔ اور میں تو کبھی کبھار سوچنے لگتا ہوں کہ آخر یہ سب کچھ کس کے لئے ہے۔ اکیلی جان اور اس کی اتنی فکر۔"

بھکارن بابا کے اس فقرے کو سن کر قدرے ڈر سی گئی اور نہایت گہری نظروں سے اس کے چہرے کو تکنے لگی۔ آخر آسنگ نے پوچھا "اپنا ڈیرا کہاں ہے؟"

"کہیں بھی نہیں۔" وہ بولی۔ "جہاں رات آئی گذار لی۔ لیکن بابا مجھے یہ تو بتاؤ کہ وہ آدمی کیا یہاں روز آتا ہے؟"

منگو بابا کے کان پر جوں رینگی اور اس نے سنجیدگی سے پوچھا

"اس آدمی سے تیرا کیا کام؟"

"نہیں کام تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن وہ آدمی بڑا رحم دل ہے۔ میں نے سوچا وہ میری بیمار بچی مانی کے علاج کے لئے ضرور کچھ رقم دے دیگا۔" بھکارن نے کہا۔

"تیرا خاوند کہاں ہے ـــ" وہ متفکر سا ہو کر بولا اور بڑی بیتابی سے بھکارن کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ اور شاید کچھ دیر اور طاری رہتی کہ مانی دفعتہً رو پڑی اور بابا کی توجہ اس کی طرف منعطف ہو گئی۔ مانی کو بھوک لگی تھی کیونکہ وہ منہ بسور بسور کر اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔ "ماں روٹی ـــ بوت ـــ بھوک لاگی ـــ ماں!"

ماں کا اپنا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ آنسو آپ ہی آپ اس کی آنکھوں سے پھسل پڑے۔ آج صبح سے اس نے مانی کو کچھ نہیں دیا تھا۔ دیتی بھی کہاں سے؟ اس کا باپ اس کے لئے کما کر لاتا ہے؟ بھکارن کے دل میں آئی کہ مانی کا گلا گھونٹ دے کمبخت کہیں کی....!

"بھوک لگی ہے تیری بچی کو۔ کہاں ہے وہ؟"

"یہ ہے بابا۔" وہ ہولے سے بولی اور ساتھ ہی اس نے مانی کو بابا کی طرف کر دیا۔

اور وہ تینوں ملک گھاٹ کی طرف چل دیئے ـــــ چاندنی رات تھی، کچھ دیر بعد وہ اکٹھے مل کر کھانا کھا رہے تھے۔ جو بھکارن بابا مہراج کے دیئے ہوئے پیسوں کا لے آئی تھی۔ وہ اب بہت گھلے ملے نظر آتے تھے بالکل ایک مختصر سا کنبہ معلوم ہوتے تھے۔

رات کا پہلا پہر بیت چکا تھا۔ مگر منگو بابا اور وہ عورت ابھی تک جاگ رہے تھے۔ جیسے انھیں نیند نہ آتی ہو۔

عورت کافی خوش نظر آتی تھی۔ اس کے برعکس منگو بابا اپنا سر گھٹنوں میں ڈھلکائے کسی گہری سوچ میں غرق تھا کہ بھکارن نے دفعتہً پوچھا۔ "لیکن منگو بابا مجھے بتاؤ نا۔ وہ آدمی کل بھی یہاں آئے گا ؟" مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

عجیب رات تھی وہ......!

بارہویں کا چاند نور کے غبار میں لپٹا ہوا دریا کے اُس پار درختوں کی اوٹ سے اُبھر رہا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے خوشگوار معلوم ہوتے تھے۔ دور کچھ فاصلے پر کھجوروں نے چند لمبے تڑنگے درخت ایک نورانی دھند لکے میں بےحس وحرکت مشعل ان فرشتوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے جو دعا میں مشغول ہوں۔ ہر طرف فرحت بخش چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ دریا کی لہروں میں آج ایک وجد انگیز نغمہ تڑپ رہا تھا۔

اندھا سیڑھی کی دیوار سے ٹیک لگائے کسی عمیق خیال میں کھویا ہوا تھا۔ پاس ہی جوان بھکارن ایک ڈھیلی سی ساڑی پہنے قدرے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ کبھی دریا کی جھلملاتی ہوئی سطح کو دیکھ لیتی اور کبھی منگو بابا کے چہرے کو جس کی وقتی ہیئت اس کے متفکر دل کی چغلی کھا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھولی بسری یادوں کو حال کے جھروکے میں سے دیکھ رہا ہے۔ بھکارن کے چہرے پر بھی ایک عجیب کیفیت نمودار تھی۔ نہ خوشی کی نہ غم کی بلکہ خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت ــــ

ماتی آج بھی ایک میٹھی نیند سو رہی تھی۔ صرف وہ ہی دن تو اسے سیر ہو کر کھانے کو ملا تھا۔ وہ دونوں اسی طرح گم سم بیٹھے تھے۔ شاید چاندنی رات کی کیف زائیوں نے ان کے ہونٹوں پر خاموشی کی مُہر لگا دی تھی۔ اب بھکارن کا مُنہ عین منگو کی طرف تھا۔ چاند کی چند ناچتی ہوئی کرنیں اس کے مُنہ پر ایک عجیب انداز سے کھیل رہی تھیں۔ جس سے اس کی سفید بےنور آنکھیں ڈراؤنی معلوم ہوتی تھیں۔ بھکارن انہیں دیکھ کر کچھ ڈری۔ ڈر سے سکڑی۔ لیکن اس نے سوچا ڈر کس بات کا؟ اندھی آنکھیں آنکھوں والوں کو اسی طرح ڈراؤنی معلوم ہوتی ہیں۔ ورنہ منگو بابا خود کوئی ڈراونی چیز تھوڑا ہی ہیں؟ ان کی محبت اور پیار نے تو ماں بیٹی کو لوٹ لیا تھا۔

"کیا کہنے لگے تھے منگو بابا؟" وہ اس کے ہونٹوں کو کانپتے ہوئے دیکھ کر بولی

"کچھ بھی نہیں۔"

"لب تو ہلے تھے۔" عورت نے حجت کی۔

"یوں ہی ہلے ہونگے لیکن بات تو کچھ نہ تھی۔" بابا کے لہجہ سے بےتابی جھلک رہی تھی۔

"کوئی بات تھی ضرور۔ آپ مجھ سے چھپاتے ہیں۔"

"اچھا تو تم مجھے آئندہ منگو بابا مت کہو۔ میرا نام.. او... منگ ہے۔ اور صرف امنگ ..." اور وہ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا حالانکہ اس کے ہونٹ کچھ اور کہنا چاہتے تھے۔ بھکارن دیکھ رہی تھی کہ بابا کچھ بےکل سے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے اپنے پتلے پتلے ہونٹوں پر تھرتھراہٹ سی کانپ کر رہ گئی۔

اب ان کے درمیان مکمل خاموشی تھی۔ بھکارن کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تمام دھرتی خاموشی اور سکوت میں ڈوبی جا رہی تھی۔ لہروں کا شور بھی کانی گھٹ چکا تھا۔ رات کے بھیگنے کے ساتھ ہی فضا میں ہلکی ہلکی ٹھنڈ تیر گئی تھی۔ اس لئے جھینگروں نے بھی بولنا بند کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ مادر ارض کی گود سے عجیب وغریب ہلکی سی نامحسوس آوازیں اٹھ رہی تھیں جن کا احساس کانوں سے زیادہ روح کو ہوتا ہے۔ یعنی ازلی اور ابدی زندگی کی نمو کی صدائیں۔ جن کو کند ذہن رکھنے والے سکوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ روح اور دل پر ایک وارفتگی کا عالم طاری کر رہی تھیں۔ اس بات کا بہت امکان تھا کہ وہ بھی ارض وسما کے اسی روح کو سلا دینے والے سکوت میں کھو گئی ہوتی بشرطیکہ اسے امنگ یاد نہ آتا

"ناراض ہو گئے بابا؟" وہ اندھے کی طرف تھوڑا سا کھسکتے ہوئے بولی۔

"میں ناراض کیوں ہوتا؟ لیکن دیکھو تم نے مجھے پھر بابا کہا۔ مجھ میں بھلا ایک بابا ایسی صفتیں کہاں؟..... میں تو اندھا ہوں... اندھا.. او ..منگ." امنگ نے گھٹی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے عورت کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ کانپی۔ اور اندھے کے بدن میں بھی ارتعاش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کی بےنور آنکھیں لمحہ بھر کے لئے اجاگر سی ہو گئیں۔ اور اس نے ایک مطمئن سانس لیتے ہوئے شوق بھرے لہجہ میں پوچھا۔ "تیرا کیا نام ہے دیوی ...؟"

"بھول گئے؟" دیوی بولی۔

"ہاں! بھول ہی گیا شاید ... میں نام بھول ہی جاتا ہوں۔ اور سچ مچ مجھے اپنا نام امنگ آج بڑی دیر کے بعد یاد آیا ہے......" امنگ نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"اچھا ــــ تو آپ کو اپنا نام بھول گیا تھا۔" وہ زیر لب ہنستے ہوئے بولی۔ "مگر کیسے بھول گئے آپ؟"

دفعتہً امنگ کی نبض میں ایک عجیب سا بھید کا۔ سر کے بالوں کی جڑیں پسینہ اُگلنے لگیں۔ اس کا دل کلاک کی طرح ٹک ٹک کرنے لگ گیا۔ اور اس اضطراب کی حالت میں اس نے بھکارن کا چھوٹا سا

ساگدگدا چکنا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے اپنی زندگی کے گرتے ہوئے گھروندے کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

"میں نام بھول گیا اپنا۔ کیونکہ کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا مگر ان لو کہ یہ ایک بہت لمبی کہانی ہے۔ مگر تم نے اپنا نام مجھے اب تک نہیں بتایا۔" وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر نہ کہہ سکا۔ حالانکہ اس کے ہونٹ اسی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے۔ دل کی دھک دھک نے اُسے کچھ بھی نہ کہنے دیا۔ اور وہ سوچ رہا تھا ایسا کیوں؟ کیا اس کی زندگی واقعی کچھ ایسے خیالات کا مجموعہ تھی کہ وہ اس کے متعلق لب کشائی کر ڈرتا ہے۔ لیکن نہیں، وہ کبھی نہ کبھی، سنا ہی تو دے گا۔ لیکن اس وقت وہ سنانے سے ڈرتا تھا۔ مبادا اس کی امیدوں کا محل ریت کی دیوار کی طرح زمین پر آ رہے؛ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ تو اس عیش و عشرت کی دنیا کو چھوڑ کر جا رہا تھا لیکن بھکارن نے اس کا دامن پکڑ لیا۔ اور اب وہ اپنی قسمت کو آزمانا چاہتا تھا۔ جس میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ اُمنگیں پوری ہوئیں تو ضرور لیکن وہ کسی کو اپنا نہ بنا سکا وہ چاہتا تھا کوئی اس کا مونس حیات بن جائے۔ کوئی اس کے دامن کو اس مضبوطی سے تھام لے کہ پھر زندگی کی آخری سانس تک نہ چھوٹے اور بھکارن کی آواز آج اس کی آس بندھا رہی تھی۔ ممکن ہے بگڑے ہاتھوں والی اس کی ہو جائے بھکارن جوان ہی تو تھی۔ جبھی اس کی آواز میں نقرئی گھنٹیاں کھنکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مالی کی اسے کوئی فکر نہ تھی کیونکہ بھکارن کے دامن حیات کا یہ بدنما دھبہ اس کے اپنے دامن حیات کے بیشمار دھبوں کے آگے کچھ بھی حقیقت نہ رکھتا تھا۔ اور پھر اس کا اندھاپن . انہیں وہ اسے ضرور اپنا بنا لے گا۔ اور وہ جوان لڑکی اسے ضرور قبول کر لیگی۔ پھر ایک دن ایسا آئیگا .. جب وہ بھی باپ بن جائے گا۔ وہ .... وہ اس کا انتظار کیا کریگی۔ گھر پر شام کے وقت پھر وہ اسے پہلے کی طرح آوارہ حالی میں پھرنے نہ دیگا۔ کیونکہ تب وہ اس کی بیوی ہو گی۔ پیاری بیوی ... مگر . "امنگ نے دل میں سوچا . وہ سوچتا رہا حتیٰ کہ دل کی دھڑکنیں ایک لخت پھر تیز ہو گئیں۔ اس نے دراصل شادی کے مسئلے کو اپنے ماضی کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ اس کے یقین میں کوئی خامی نہ رہ جائے۔

چنانچہ اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اس بات کو نمایاں طور پر ظاہر کر رہا تھا کہ ماضی سے متعلق کچھ خلش انگیز یادیں۔ کچھ پریشان کرنے والے خیالات اس کے دل و دماغ پر اس طرح چھا رہے ہیں جیسے سطح سمندر پر تاریکی کے کالے کالے سایوں کی بارش .... اس کا ماضی آج سے کچھ سال پہلے کتنا خوفناک ہے۔ ہر طرف یاس کی سیاہی اور تنہائیوں کا یہ عالم کہ زندگی ایک سنسان ظلمت کدہ معلوم ہوتی تھی۔ نینا اس کی زندگی میں آئی تو سہی مگر دیکھنے والا اس کی آمد کو بھادوں کے بادلوں سے تعبیر کریگا جو عارضی طور پر تمازت آفتاب کو گھٹاتے ہیں۔ لیکن نینا گئی تو اس کی دنیا کی خاموش تاریکیوں میں ایک حشر انگیز شور و غل مچاتی ہوئی —— امنگ کو نینا کے جانے کا خیال آتے ہی ایک پیاس سی محسوس ہوئی۔ اس کی کنپٹیوں پر نوکیلی تیلیاں سی چبھنے لگیں۔ کھوپری کی جلد پر بھیگی ہوئی ٹانگوں والی چیونٹیاں سی دوڑ گئیں۔ کتنی پرخلش تھی نینا کی یاد جو اس کی برگشتگی کے محور کے گرد لٹو کی طرح گھوم رہی تھی۔ اب! نینا کو اُمنگ کی آنکھوں سے ڈر لگا۔ اور اس کے آنا جانا بند کر دیا۔ کیا فی الحقیقت اس کی آنکھیں ان دنوں بھیانک تھیں؟ اور نینا کی خوبصورت تھیں کیونکہ وہ خود خوبصورت تھی۔ اس حقیقت کو تو امنگ نے پہلے دن ہی محسوس کر لیا تھا۔ اور کسی نے کسی کو خوبصورت کہہ کر اس کے خیال کو یقین میں بدل دیا تھا۔ اور اسی دن سے وہ اس مجسمہ خوبصورتی کو دیکھنے کے لئے بیتاب رہنے لگا تھا۔ اور شاید اسی والہانہ آرزو کے اکسانے پر اس نے کمال ہمت سے اپنی آنکھوں کو ڈاکٹروں اور حکیموں کے بیرحم نشتروں کے سپرد کر دیا تھا۔ تاکہ وہ کسی نہ کسی طرح ہمیشہ کے لئے نہ سہی تو چند لمحوں کیلئے ہی اس کی اندھی آنکھوں کو بینائی دلا دیں۔ اور وہ اس خوبصورت کو دیکھ تو لے۔ جس کی آواز میں اسے رس بھری اور مدھر سریں کانپتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ جس کی گداز انگلیوں کے مس سے ایک دفعہ اس کے تن بدن میں ایک لطیف ارتعاش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا ان لمحوں میں مگر نہ دیکھ سکا۔ آخر یاس و نومیدی کے اس داغ کو لے کر وہ اپنی زندگی کے دن وہاں گزارنے پر مجبور رہا جہاں عورتوں کی غمناک آوازیں اسے خوبصورت نینا کی یاد دلا دیا کرتی تھیں۔

وہ شہر سے دور دریا کنارے کتنی انوکھی زندگی بسر کرنے لگا۔ ایک ایسی زندگی جو سکوت پرور ہنگاموں اور راحت آگیں بیتابیوں سے عبارت تھی۔

دن گذرتے گئے۔ آخر ایک روز ...... ہاں ٹھیک ہے۔ اس بوڑھے گوالے نے اُمنگ کو بنسی کے جیون کی پریم کتھا سنا کر اس کی بھری برسات میں آگ لگا دی۔ آگ بھڑک اٹھی۔ اور اس کے شعلوں کی تپش اور ...... کو صرف دریا کی لہریں ہی ٹھنڈا کر سکیں۔ زندگی نے کروٹ بدلی۔ اس کی جوان امنگوں کے کومل پودے جن کو یاس و غم کی تپش

انگیز گرمی نے جھلس دیا تھا۔ چہرے سے ہارے ہو گئے۔ وہ اگرچہ اندھا تھا لیکن اس کے سر کے پیچ و خم کھائے ہوئے بالوں میں کئی نازک انگلیاں اُلجھ کر رہ گئی تھیں۔ امنگ کی بلند پیشانی، اونچی ناک اور باہم پیوست ہونٹ اور اس کا متناسب جسم، یہ تمام چیزیں مل کر ایک پردہ سا اس کی آنکھوں پر ڈال دیتیں۔ اور وہ سوچنے لگ جاتا کیا میں عورتوں کی نظروں میں بدصورت ہوں۔

اُمنگ کچھ ایسے پریشان کن خیالات کی رَو میں ایک تنکے کی طرح بہا جا رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی زندگی ایک اور کروٹ بدلا چاہتی ہے — ایک اور — شاید آخری؟ اور اس کے بعد ...؟ امنگ پھر بےچین ہو گیا۔ اسے خوشی اور غم ایک ساتھ قہقہے لگاتے ہوئے سنائی دیئے۔ جذبات و احساسات دو مختلف راہوں پر دو رقیب کبوتروں کی طرح مڑتے معلوم ہوئے۔ پسینہ پھوٹ نکلا اور اس کے قطرے اس کی پیشانی پر نوزائیدہ آبلوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ عورت سہم گئی۔ وہ امنگ کی خاموشی سے تو پہلے ہی بیزار تھی اب یہ پسینہ کے قطرے ......!

"بابا! چپ کیوں ہو؟" وہ بےقرار ہو کر بولی۔

"یوں ہی!" امنگ جھٹ سے بولا۔ "مگر تم نے اپنا نام نہ بتایا۔"

"بھلا دیا .... آ ... با .... او ... نہیں نہیں! میرا نام سُرمہ!" وہ قدرے لجا کر بولی۔

"سرمہ .... !" کچھ الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ لیکن اس کا دل آپ سے آپ کہہ رہا تھا۔ "سرمہ ... نینا .... اندھا ... نینا بھاگ گئی .... دوڑ گئی ... کیونکہ وہ اندھا تھا۔ اور یہ سرمہ — ! وہ تو اب بھی اندھا ہے —!" امنگ کے دل کو دھچکا سا لگا — چاہا کہ بھاگ نکلے دریا کی طرف — اسی طرح، مرجانے کے لئے، کہ وہ اندھا ہے اور سرمہ کو اس سے بالکل کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا — نینا کی طرح! وہ گھبرا کر اٹھنے ہی لگا تھا کہ پھر کچھ سوچنے لگ گیا۔

"آپ پھر چپ ہو گئے ....؟" سرمہ نے کسلمندی سے کہا۔

"تم بہت اچھی ہو سُرمہ!" اُمنگ بولا۔

"آپ بھی تو ... با ... ."

"ہاں ہاں کہو پھر بابا، جیسے میں سچ مچ کوئی بابا ہی ہوتا ہوں — دیکھو سرمہ! اول تو میں بابا کبھی ہوا ہی نہیں۔ اگر بفرض محال تھا بھی تو اب نہیں ہوں۔ اب میں اُمنگ ہوں — اندھا امنگ —!" امنگ کی آواز بھرا گئی اور اس نے اپنی بےنور آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ سرمہ قدرے سہمی تاہم بولی — "آپ ایسی بہکی بہکی باتیں کیوں کرتے ہیں؟"

"بہکی بہکی باتیں نہیں سُرمہ ..... اچھا سرمہ ..... ہو نا تم اچھی؟"

"آپ بھی تو ... بات اچھے ہیں۔" سرمہ نے کہا۔

"وہ کس طرح ...؟" امنگ نے پوچھا۔

"آپ نے ہم دونوں کو دودن بھوجن دیا .... آپ بہت اچھے ہیں۔" اس نے کچھ اس طرح سے یہ الفاظ کہے جیسے ان میں تشکر کی ایک وسیع دنیا آباد ہو۔ امنگ کا بھی دل دھڑکا — کچھ آس بندھی اور وہ اپنے ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "اوہو، تب تو مجھے پرماتما کا بہت بہت شکریہ ادا کرنا چاہیئے .... مگر سُرمہ تم چاہو تو روز اسی طرح .... !" وہ رکا اور پھر سرمہ کا ہاتھ دباتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں اندھا ہوں۔ تم یہاں میرے پاس رہا کرو۔ کیا ضرورت ہے تمہیں دربدر ٹھوکریں کھانے کی؟"

سُرمہ گھبرائی۔ اصل میں جب امنگ نے اس کا ہاتھ دبایا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے شش سے اس کے بدن میں بجلی لگا دی ہو۔ گو یا کوئی ایسا ویسا تھوڑا ہی ہے۔ ہاتھ یوں ہی دباتے ہوں گے اس نے دل میں سوچا۔ وہ تو بہت ہی اچھا آدمی ہے۔ اور اس کی نگاہ امنگ کے چہرے سے اُچٹ کر مانی پر جا پڑی۔ وہ کتنی معصومیت سے سو رہی تھی۔ مانی ... اس کی پیاری بچی . . وہ کچھ دیر اسی طرح اپنی بیٹی کو دیکھتی رہی۔ جب نگاہیں سیر ہو لیں تو اس نے امنگ کی طرف دیکھا — اندھا امنگ —! سرمہ کو یوں دکھائی دیا جیسے اس کی آنکھوں کی بصارت بحال ہو گئی ہو اور وہ اسے نظر بچا کر دیکھ رہا ہو۔ اس کا ننھا سا دل، اونچائی پر سے گرتے ہوئے پانی کے قطروں کی طرح ٹک ٹک کرنے لگ گیا۔ جیسے اس کے سر پر کوئی نامعلوم خطرہ کسی طوفانی بادل کی طرح منڈلانے لگا ہو — آنکھوں کی پتلیاں پپوٹوں میں بوجھل سی محسوس ہونے لگیں۔

ان دو انسانی دلوں کی متلون مزاجی پر فطرت رات کی حسین چاندنی کی صورت میں مسکرا رہی تھی۔ کہ سرمہ نے بمشکل تمام کہا "یہ چپ مجھے اچھی نہیں لگتی بابا! — کوئی بات کرو۔ ہم صبح ہی چلے جائیں گے۔"

امنگ کے دل کی دھڑکن بند ہوتے ہوتے رہ گئی — وہ مرد تھا۔ سنبھلا — آس ٹوٹ گئی — یہ وہ پہلے ہی جانتا تھا۔ وہ ہنس کے مسکرایا۔ اور جلد ہی یہ مسکراہٹ ایک طویل قہقہے سے بدل گئی۔

کیا وہ پاگل ہو گیا تھا؟ اتنی جلدی! نہیں ابھی دینے میں تیل کافی تھا۔

"ایک بات مانو گی؟" امنگ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں کیا بات ہے!" سرمہ نے ادب آمیز لہجہ میں کہا۔

"کیا تم..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور بات کو یوں اُٹھایا "سرمہ! مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے —— اور میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس کا احساس ہو۔"

سرمہ امنگ کی بات کا مطلب بالکل نہ سمجھ سکی۔ چپ رہی۔ ادھر امنگ بھی اپنے دل کی گہرائیوں میں کوئی آخری چیز ٹٹول رہا تھا۔

دریا کا شور اب ہولے ہولے بڑھنے لگا تھا۔ شاید اوپر سے پانی آ رہا تھا۔ تقریباً آدھی رات گذر چکی تھی۔

سرمہ اسی طرح خاموش تھی۔ اور امنگ بھی، جو سوچنے لگا تھا کہ کیا واقعی سرمہ سویرے ہوتے چلی جائے گی؟ مگر کیوں؟ یہ مُنہ پھیر کر چلے جانا کس لئے؟ کیا اسے اندھی آنکھوں سے ڈر لگا۔ مینا کی طرح۔؟ اس طرح کے کئی ایک چبھتے ہوئے سے خیال اس کے دماغ میں آئے اور دفعتہً اس کا چہرہ بہت ڈراونا اور بھیانک ہو گیا۔ لیکن جلد ہی تمام کرختگی ملائمت سے بدل گئی۔ اور سرمہ کی طرف کھسکتے ہوئے جذباتی لہجہ میں بولا۔ "سرمہ! —— میری اچھی سرمہ! کیا سچ مچ تم صبح جا رہی ہو؟" اور اس نے سرمہ کا گدگدا سا ہاتھ دبانا شروع کر دیا۔ سرمہ گھبرائی۔ اس کا جی چاہا کہ مانی کو اٹھا کر بھاگ جائے۔ امنگ کے چہرے کی ہیئت اب شیطان کے چہرے ایسی تھی۔ اس کے الفاظ سرمہ کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسہ کی طرح جا کر لگے۔ اس کی روح تھرا اٹھی دماغ سلگنے لگا۔ لیکن اس نے پھر ضبط کی ٹھانی۔ دانتوں تلے زبان دبا کر سنتی گئی۔ امنگ کہہ رہا تھا —— "سرمہ! جب پچھلی رات تو نے اپنی گذری ہوئی زندگی کے رلا دینے والے واقعات مجھے سنائے تو جانتی ہو میرا من کتنا دکھی ہوا تھا؟ جی میں آتی ہے ابھی جا کر اس شیطان فطرت منسی سے تمہارا بدلہ لوں۔" یہ سُن کر سرمہ کے چہرے کا رنگ فوراً بدل گیا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے منسی کی تصویر پھرنے لگی۔ وہ اگرچہ باری باری کبھی مانی کو دیکھ رہی تھی اور کبھی امنگ کو لیکن اس کی ظاہری اور باطنی آنکھوں کی پتلیوں میں منسی سمایا جا رہا تھا۔

امنگ کہے جا رہا تھا ایک بڑے ہمدردانہ لہجہ میں —— "منسی نے برا کیا۔ اگر اسے سرمہ کی زندگی تباہ ہی کرنا تھی تو وہ اس سے شادی کر لیتا، اور بعد کو چھوڑ دیتا۔ اس نے سرمہ کو پریم کے بدلے یہ پھل، یہ سوگ کیوں دیا۔ اسے اس ننھی سی جان پر بھی رحم نہ آیا جو سُرمہ کی گود میں پل رہی تھی"

اور اس کے بعد وہ منسی کو گالیاں دینے لگا۔ "منسی تم نے ایک بھولی بھالی سرمہ کی زندگی کو برباد کیا۔ بھگوان تمہیں بھی برباد کرے اور..."

"چپ رہو امنگ! انہیں گالیاں نہ دو" سرمہ نے امنگ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "انہیں گالیاں مت دو۔ یہ میرے کھوئے بھاگوں کا پھل ہے" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ نہ معلوم کس دل گردے سے امنگ کی ان کچوکے دینے والی باتوں کو سُن رہی تھی۔ آنسو بہ نکلے اور اب ایک سینما کا۔ نہیں اس کے اپنے سینما کا نقشہ اس کی غمناک آنکھوں کے سامنے کھنچ رہا تھا۔ گذرے ہوئے زمانے کے خونچکاں تصورات بڑی بیدردی کے ساتھ ماضی کے دریچے سے جھانک کر اس کا مُنہ چڑانے لگے۔ سب سے پہلے اسے اپنی پیاری ماں یاد آئی۔ جس نے سرمہ کو بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا، سرمہ کو اپنی ماں سے بہت پیار تھا۔ باپ کو اس نے دیکھا ہی نہیں تھا، اس کی ماں کہا کرتی کہ تمہارا باپ کسی نہ معلوم دیس کو چلا گیا ہے اور جلد ہی واپس آ جائیگا۔ لیکن وہ نہ آیا اسی طرح سرمہ جوان ہو گئی جوانی نے اسے پر لگا دیئے اور وہ تتریوں کی طرح گھومنے لگی۔ اسی اثنا میں منسی نے اُسے ایک نفیس پھولدار ساڑھی دے کر اپنی طرف مائل کر لیا اور وہ سرمہ رانی بن جانے کے سپنے دیکھنے لگی۔ محبت کی دلچسپ ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ منسی نے شادی کا وعدہ کیا۔ وہ حاملہ ہو گئی۔ منسی کی بے رخی اور اس کے بعد مکمل بے گشتگی —— مانی کی پیدائش۔ سرمہ کی ماں کی موت۔ جب ہی سرمہ کی آنکھوں کے سامنے مانی کی پیدائش اور ماں کی دردناک موت کا سین آیا تو وہ بیساختہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ گویا ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ بہت روئی —— روتی ہی گئی ——!

"نہ رو سرمہ، میری اچھی سرمہ!" یہ کہہ کر امنگ نے اس کی آنکھوں کی برکھا کو روکنا چاہا۔ مگر وہ کیا جانے کہ یہ غموں کی چپ گھپ گھٹاؤں کا مینہ تھا۔ آسانی سے نہ تھمنے والا۔ وہ روتی جاتی تھی اور امنگ اسے چپ کرانا چاہتا تھا۔ لیکن رات بیتی جا رہی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ رات کی باقی ماندہ ساعتوں کو ادھر اُدھر کی باتوں میں گذار دیں صبح ہوتے ہی ان کو دو مختلف سمتوں کو جانے والی سڑک کی طرح الگ الگ ہو جانا تھا۔

بالآخر امنگ بولا۔ "سرمہ! اری چپ رہو گی یا نہیں —— ورنہ یہ لو میں چلا...." چلنے کا نام سن کر سرمہ کے نالوں کا زور فی الفور گھٹنے لگا۔ نہ جانے کیوں جہاں پہلے چیخ پکار تھی اب وہاں صرف سسکیاں

رہی تھیں۔ آنسو اب بھی بہتے تھے مگر ٹھہر ٹھہر کر۔ کبھی کبھی ——— آخرکار وہ بھی بند ہوگئے اندھے امنگ کے پیار و محبت میں ڈوبے ہوئے فقروں کو سن کر سرمہ کا دل مدت سے فکروں اور غموں کی گرد سے اٹا پڑا تھا۔ آج آنسوؤں کی پھوار سے دھل گیا۔ نکھر گیا۔ ہلکا ہوگیا۔ بیچاری بہت روئی تھی اس لئے تھکن اسکی سیاہ آنکھوں میں نمودار ہونے لگی۔ ہولے ہولے دل کی دھک دھک اعتدال پر آئی اور جلد ہی اس پر نیند کی غنودگی چھانے لگی ایک دو حسن افروز جماہیاں اور ایک انگڑائی۔ پھر نیند۔ اپنا ہلکا پھلکا سر امنگ کے زانو پر رکھ کر گہری نیند میں کھو گئی۔ امنگ حیران ہوگیا۔ اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

قدرت دریا کی لہروں کا شور سن کر جاگ اٹھی تھی۔ رات کا سناٹا ایک مبہم شور میں بدل چکا تھا۔ ہواؤں میں سرسراہٹ پیدا ہو چکی تھی۔ آسمان پر بادل کا ایک آوارہ ٹکڑا مہتاب کو اپنے آغوش میں چھپا لینے کے لئے کشاں کشاں بڑھا آ رہا تھا۔

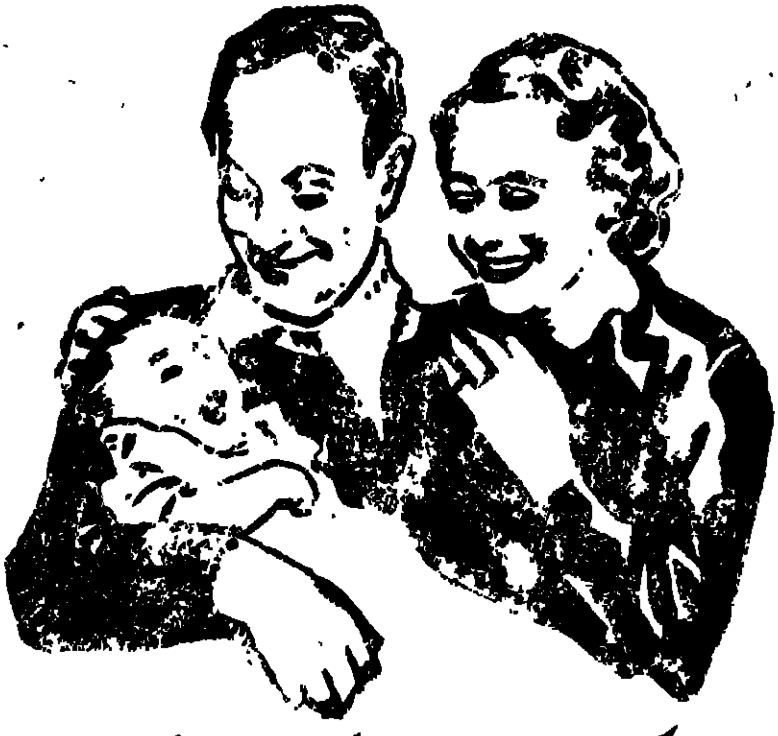
سرمہ کی آنکھیں دفعتہً کھل گئیں اور وہ گھٹے گلے سے بولی۔ "منگو بابا! یہ کیا؟" اور امنگ نے اس کے کاہیدہ جسم کو اپنے بازوؤں کی آہنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔ "ڈرو نہیں، میری جان۔ میں تم سے شادی کروں گا ——— اور یہ تو میں کل سے سوچ رہا ہوں۔ میں نیم تھوڑا ہی ہوں۔ میں امنگ ہوں ——— اندھا۔ جس کے لئے روشنی و سایہ اور خوبصورتی و بدصورتی کچھ معنی نہیں رکھتی ——— اور تم تو بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہو......" اور اندھے کی حساس انگلیاں سرمہ کے بدن کو گدگدانے لگیں ——— !

رات کا دم ٹوٹا۔ صبح ہوئی ——— سورج کی پہلی کرن پھوٹی اور سرمہ کی آنکھ کھلی ——— وہ حیران ہی تو ہوگئی جب اندھے امنگ کو وہاں سے غائب پایا۔ اس کا دل آہستہ سے دھڑکا جیسے دبی زبان سے کہہ رہا ہو۔ "اندھا امنگ بھی تو ایک مرد تھا!"

اور اس کے بعد وہ اپنی گود میں لے کر عین دریا کے کنارے جا کھڑی ہوئی ——— اس کا جسم بید مجنوں کی شاخ کی طرح کانپ رہا تھا اس کی نگاہیں سیاہی مائل بادل کے ٹکڑوں کو دیکھ رہی تھیں ——— جو آسمان پر دو بدنما دھبوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے سورج ان کالے کلوٹے درختوں کی اوٹ میں ڈوب رہا ہے اور عنقریب ہی ہر طرف اندھیرا چھانے والا ہے!

اولاد حاصل کرنے کا نیا طریقہ



دوا کے ذریعہ عورت کو حمل ٹھہر سکتا ہے

اولاد پیدا کرنے کی عجیب ایجاد

جس عورت کو حمل نہ ٹھہرتا ہو اور جو عورت اولاد کے لئے ترستی ہو وہ اگر چاہے تو ہر سال اس کے ہاں اولاد ہوسکتی ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ مسلسل سات رات تک عورت کو ایک ایک خوراک دوا "محافظ اولاد" کھلاؤ۔ ان سات روز تک خاص پرہیز کرے۔ ٹھیک آٹھویں رات یہ پرہیز توڑ دیا جائے تو اسی آٹھویں رات عورت کو حمل ٹھہر جائیگا۔ کیونکہ سات روز کے اندر یہ دوا عورت کے اندرونی جسم (یعنی بچہ دانی) کو اس قابل کردیتی ہے کہ جب آٹھویں رات ...... تو اسی رات عورت کو "اُمید" ہوجاتی ہے۔ ایک شیشی دوا "محافظ اولاد" جس میں ایک عورت کیلئے پوری سات خوراک دوا ہوتی ہے۔ اسکی قیمت ڈیڑھ روپے آٹھ آنے ہے۔ جس کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ اے۔ بی ۱۴۷۳ دہلی کے پتہ پر خط لکھکر بذریعہ وی۔ پی پارسل منگائے۔ پارسل پر سات آنے محصول لگے گا۔ ٹیلیفون نمبر ۱۲۹۶

دلکش فسانہ

اک درد کا قصہ ہے اک غم کا فسانہ ہے

از جناب محمد شرف الدین سلیم علوی

دنیا کے تغیر کا ہر لب پہ فسانہ ہے — کل اِن کا زمانہ تھا آج اُس کا زمانہ ہے

پُر درد مرا دل ہے ہر نالہ فسانہ ہے — وہ سازِ محبت ہے یہ غم کا ترانہ ہے

دلبر جسے کہتے ہیں ہے جان کا وہ دشمن — بیگانہ کی صورت ہی کہنے کو یگانہ ہے

دیکھی نہیں جاتی ہے بیتابیٔ دل اُن سے — منظور نہیں آنا یہ صرف بہانہ ہے

اب زخم کی لذت کے آئینگے مزے ہم کو — تیرِ نظر اُن کا ہے اور دل کا نشانہ ہے

پھر جوشِ بہار آیا ہے پھر رنگ چمن بدلا — غنچوں کا تبسم ہے بلبل کا ترانہ ہے

سُن لیجئے دو باتیں گر آپ کو فرصت ہے — اِک درد کا قصہ ہے اک غم کا فسانہ ہے

وہ حال مرا سُن کر مُنہ پھیر کے کہتے ہیں — فرہاد کا قصہ ہے مجنوں کا فسانہ ہے

ناشاد ہوں فرقت میں نالہ نہ مرا سمجھو — اک درد بھرے دل کا غمناک ترانہ ہے

بیتابیٔ فرقت کا حال اُن کو سُنانا ہے
سُن لیں وہ سلیم آکر دلکش یہ فسانا ہے

تاریخ اور ادب

علمی مضمون

از جناب سید مظفر برنی

زمانہ قبل تاریخ کی ایک نہایت سرد شام کا ذکر ہے ——

سورج پہاڑوں کے ایک نہایت وسیع سلسلہ کے دامن میں منہ چھپا رہا تھا۔ فضا خوابی ہوتی جا رہی تھی۔ ہوا کے برف پرور جھونکے فضا میں کپکپاہٹ پیدا کر رہے تھے کہ ایک برہنہ تن خونخوار وحشی انسان ایک مردہ ہرن کی خونفشاں لاش کو اپنے سیاہ مضبوط کندھے پر ڈالے پہاڑ کی ایک کھوہ میں داخل ہوا۔ جہاں اس کی بیوی اور بچے بھوک سے تلملا رہے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی انھوں نے ایک نہایت مہیب آواز نکالی۔ عورت نے ایک مستفسرانہ نظر ڈالی۔ وحشی مرد نے اپنی فتح و نصرت اور توانائی وقوت کی داستان کہنا شروع کی۔ اس نے صبح کی کپکپا دینے والی سردی خود رو جھاڑیوں کی خراشیں۔ ہرن کے تعاقب کی صعوبتیں خوب مبالغہ کے ساتھ بیان کیں تاکہ اپنی مردانگی و قوت کا سکہ عورت کے دل پر بٹھا دے —— اس عورت کے دل پر جسے اسی قوت و توانائی کی مدد سے اس نے حاصل کیا تھا —— عورت کی آنکھیں اپنے فاتح کے بہادرانہ کارنامے سن کر چمکنے لگیں۔ بچے اس قدر محو ہو گئے کہ بھوک کا خیال تک نہ رہا —— یہ داستان دنیا کے ادب کا قدیم ترین نمونہ تھی۔

اس دور کے کچھ عرصہ بعد ——!

ایک ایسی ہی خنک رات تھی۔ ہوا کے تیز و تند جھونکے جنگلات سے ڈھکے ہوئے پہاڑ اور تیرہ و تار جنگل کے درختوں سے ٹکرا کر سائیں سائیں کی ہولناک آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ کبھی کبھی درندوں کی وحشیانہ چنگھاڑیں فضا کو لرزہ براندام کر دیتی تھیں۔ پہاڑ کے ایک نیم روشن گہرے غار میں سوکھے پتوں اور گری ہوئی شاخوں کی آگ بھڑک بھڑک کر جل رہی تھی۔ ایک عورت دو ننگے مضبوط بچوں کو اپنے گھٹنے پر لٹائے تھپک رہی تھی۔ وہ انہیں ان کے مُردہ باپ کے کارنامے۔ ان کی پیدائش سے پہلے کے حالات۔ وحشی درندوں کے خلاف مہیں۔ ایک کھوہ سے دوسری کھوہ اور ایک جنگل سے دوسرے جنگل میں اُٹھ کر جانے کے واقعات اور قرب و جوار کے دوسرے وحشی انسانوں سے جنگ و جدال کے قصے۔ ایک ترتیب اور جوش کے ساتھ سنا رہی تھی۔ بچے کبھی مٹھیاں بند کرتے کبھی کھولتے اور کبھی گھٹنے سے سر اٹھانا چاہتے تھے۔ لیکن وہ انھیں پھر ہاتھ کے اشارے سے روک دیتی —— کہانیوں کا یہ سلسلہ دنیا کی اوّلین تاریخ تھی۔

ادب نے انسان کی قوت متخیلہ سے جنم لیا۔ برخلاف اس کے تاریخ نے بیتے ہوئے واقعات اور گذرے ہوئے لمحات کو مقید کرنے کی کوشش کی۔ گویا تاریخ نے انسان کی قوت حافظہ سے جنم لیا۔ تاریخ اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کسی دور کی تاریخ اس دور کے ظاہری حوادث اور مادی تفصیلات کا نام ہے۔ کسی دَور کا ادب اس دَور کی باطنی کیفیات اور روحانی تجربات سے عبارت ہے۔ اگر کسی دور کو ایک درخت سے تشبیہ دیں تو اس درخت کے تنے، شاخوں اور پتوں کا نباتاتی مطالعہ علم تاریخ ہے۔ لیکن اس درخت کے پھل پھول ادب ہیں۔ ظاہر ہے کہ پھل پھول درخت کے دوسرے اجزا سے جدا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زمانے جو تاریخ میں "زریں" کہلاتے ہیں اکثر و بیشتر ادب میں بھی "زریں" ہوتے ہیں۔ یونان میں پریکلیز (Pericles) کا زمانہ روم میں آگسٹس (Augustus) کا زمانہ، انگلستان میں ملکہ الزبتھ کا زمانہ، ہندوستان میں بکرماجیت کا زمانہ اور مسلمانوں کا عہد عباسیہ جس طرح تاریخ میں زرّیں خیال کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح ادب میں بھی زرّیں شمار ہوتے ہیں۔ اگر آج تاریخ ایسے شہنشاہوں کی کوئی دوسری مثال پیش نہیں کر سکتی

ب بھی یوری پائیڈز (Euripides) ایکائلز، درسوفولز (Sophocles) اسے ہوریس (Horace) اووڈ (Ovid) ورجل (Virgil) شکسپیر اور بیکن (Bacon) اور کالیداس جیسے ادیب تمثیل نگار شاعر اور عالم پیدا نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ کے سیاسی اور معاشری حالات کا اثر ادب پر ضرور پڑتا ہے۔ ادب زمانہ کا عکس ہوتا ہے۔ گویا واعکس بالفرض اگر شکسپیر عہد وکٹوریہ میں پیدا ہوتا تو اس شکسپیر سے جسے ہم سب جانتے ہیں کتنا مختلف ہوتا۔ ادیب کتنا ہی عالمگیر ہو وہ ملکی بھی ہوتا ہے۔ کتنا ہی جاودانی ہو لیکن "وقتی" بھی ہوتا ہے۔ تاریخ کسی دور کے تاریخی و معاشری حالات کو وقتی تقدم و تاخر ملحوظ رکھ کر اسباب و انجام کے رشتہ میں پرو کر پیش کرتی ہے۔ ادب انہی واقعات و حالات کے تاثرات کو ایک مخصوص انداز میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ تاریخ کسی ملک یا قوم کے ماضی کی آئینہ دار ہوتی ہے اس لئے وہ قوم یا ملک کی ملی زندگی سے متعلق ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم کسی قوم یا ملک کی ذہنی تاریخ معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں اس کے شاعروں و ادیبوں کی تصانیف پڑھنی چاہئیں۔

ابتدا میں تاریخ ادب تھی۔ ہروڈوٹس (Herodotus) تاریخ کا باوا آدم کہلاتا ہے۔ اس کی تاریخ نہ صرف اس وقت کے حالات و واقعات کا مجموعہ ہے بلکہ ادب پارہ بھی ہے۔ تھیوسیڈائڈز (Thucydides) بھی یونان کے ادبا میں شمار ہوتا ہے۔ قدیم مورخ ادیب بھی تھا۔ بلکہ وہ ادیب پہلے تھا مورخ بعد میں۔ وہ اپنے موضوع کو ادب ہی کی ایک صنف خیال کرتا تھا۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ مورخ صرف مورخ ہی نہیں ادیب بھی ہوتا ہے۔ ادیب کا طرۂ امتیاز صرف دلکش اسلوب بیان ہی نہیں بلکہ قوت متخیلہ ہے دستکار اپنے ہاتھوں سے کام لیتا ہے۔ ادیب اپنی قوت متخیلہ سے جس طرح بغیر ہاتھوں کے دستکار کا تصور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح قوت متخیلہ کے بغیر ادیب ناممکن الوجود ہستی ہے۔ مورخ زبان پر قدرت حاصل کرنے اور پاکیزہ اسلوب بیان اختیار کرنے کے علاوہ اپنی قوت متخیلہ سے بھی کام لے سکتا ہے۔ مورخ صرف واقعات کا مرتب کرنے والا نہیں ہوتا۔ اس کا کام محض بکھرے ہوئے واقعات اور حالات کو سن و سال کے رشتہ میں پرونا نہیں۔ وہ دَورِ ماضی کو اپنی قوت متخیلہ کی امداد سے زندہ کر سکتا ہے۔ وہ مردہ واقعات میں جان ڈال سکتا ہے۔ وہ پچھلے تاجداروں اور شہنشاہوں، امیروں اور وزیروں اور اس زمانہ کے مردوں، عورتوں اور بچوں کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچ سکتا ہے۔ وہ اس دور کے رہنے سہنے کے طریقوں، معاشرت کے اصولوں۔ رسوم و رواج۔ خوشیوں اور تہواروں۔ میلوں ٹھیلوں کے نقشے کھینچ سکتا ہے۔ وہ اس زمانہ کی مخصوص فضا پیدا کر سکتا ہے۔ وہ تاریخ کے صفحات کو زندہ بولتی تصاویر کا ایک بیش بہا مرقع بنا سکتا ہے اور اس کا کارنامہ تخلیقی ادب پاروں کی طرح مقبول ہو سکتا ہے۔ میکالے نے اپنی مشہور و معروف "تاریخ انگلستان" کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ "میرا مقصد یہ ہے کہ زمانۂ ماضی میں جان ڈال دوں، اس وقت کے لوگوں کی روزانہ زندگی، ان کے مشاغل، اور ان کے خیالات و معتقدات کو ایسے محاکاتی انداز میں پیش کروں کہ یہ کتاب کچھ عرصہ کے لئے نوجوان خواتین کی میزوں پر مقبول عام ناول کی جگہ لے لے۔" اصل مورخ نہ صرف واقعات و حوادث کے ڈھانچے پر گوشت پوست چڑھاتا اور اس میں جان ڈال دیتا ہے۔ بلکہ مورخ فلسفی بھی ہو سکتا ہے۔ وہ ناسمجھ بادشاہوں کے تخت و تاج کے جھگڑوں اور دنیا پرست امیروں اور وزیروں کے جاہ و جلال کی کشمکشوں کو ایک خندۂ استہزا کے ساتھ بیان کر کے انسانی نادانی، طمع و حرص، خود غرضی و مطلب پرستی کا مضحکہ اڑا سکتا ہے۔ وہ زمانے کے انقلابات اور دنیا کی ہر لحظہ تبدیلیوں سے عبرت انگیز سبق نکال سکتا ہے۔ وہ زندگی کی دھوپ چھاؤں کے کھیل کو پیش کر کے ہمارے دل پر دنیا کی بے ثباتی اور دنیا کی ناپائداری کا نقش ثبت کر سکتا ہے۔ وہ کسی قوم کے شجاعت کے واقعات بیان کر کے ہمارے دل کے زنگ آلودہ تاروں کو چھو سکتا ہے۔ وہ کسی سرفروش ہیرو کی داستان ایثار سنا کر ہمارے کہر آلودہ ذہن کو جگمگا سکتا ہے۔ غرض وہ ایک صورت سے معلم اخلاق بھی بن سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ مورخ کی ذات میں ادیب، فلسفی، معلم اخلاق سب جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے مورخ کو قوموں کا بنانے اور بگاڑنے والا کہا جاتا ہے۔

بعض مورخین تاریخ کو فلسفۂ معاشرہ کی تشکیل کا ذریعہ بتاتے ہیں جیسا کہ مشہور عالم گبن کا مقصد تھا۔ بعض واقعات ماضی کی روشنی میں زمانۂ حال کی کسی حکمت عملی کو پایۂ صداقت تک پہنچانے کا آلہ خیال کرتے ہیں جیسا کہ میکالے نے نہایت کامیابی کے ساتھ کیا اس نے اپنی مشہور و معروف تاریخ وِگ پارٹی کی حکمتِ عملی کو ماضی کے حالات کا نظر تاً نتیجہ ثابت کرنے کی غرض سے لکھی تھی۔ زمانہ

حاضر کے "پیغمبر بے جبریل" مارکس نے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ع "قلب او مومن دماغش کافر است" تاریخ کا مادی نظریہ پیش کیا۔ اس نے نہایت اجتہاد فکر سے کام لیا اور ثابت کیا کہ تاریخ اس کشمکش کی سرگزشت کا نام ہے جو ازل سے فاتح و مفتوح، غالب و مغلوب، ظالم و مظلوم، مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان چلی آ رہی ہے اور وہ اس کشمکش کی بنیاد اسی اقتصادی بے انصافی اور غیر مساوی تقسیم دولت کو قرار دیتا ہے۔ جو اس کے نظریہ اشتراکیت کا محوری نقطہ ہے۔ وہ تاریخ کا تمام تانا بانا اسی مادی کشمکش کے بے رنگ تاروں سے بُنتا ہے۔ ہر فلسفی (خواہ وہ سیاسی رہبر ہو یا معاشرتی پیغمبر) تاریخ کو اپنے خیالات کی پشت پناہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور تاریخ کے فیصلہ کو اپنی فتح یا شکست سمجھتا ہے۔ مورخ کی مثال بچوں کے اس کھلونے سے دی جا سکتی ہے جسے عکس نما (Kaleidoscope) کہتے ہیں اور جس میں شیشے کے مختلف رنگ کے ٹکڑوں کو ہلانے سے مختلف رنگ کے پھول پتے بننے لگتے ہیں۔ مورخ بھی کسی دور کے واقعات کو جس رنگ میں چاہے پیش کر سکتا ہے۔ گو مورخ تاریخ کی مشہور ہستیوں کو اپنے اشارے پر نہیں نچا سکتا۔ گو وہ واقعات کا دھارا جس طرف چاہے نہیں موڑ سکتا تاہم وہ کسی دور کے واقعات کو جس رنگ میں چاہے رنگ کر پیش کر سکتا ہے۔ وہ چہرۂ ماضی کے خد و خال تو نہیں چھپا سکتا لیکن وہ اس پر اپنے خیالات کی رنگین نقاب ڈال سکتا ہے۔ وہ نہ صرف واقعات کا شمار کرنے والا ہے بلکہ ماضی کا ترجمان اور نقاد بھی ہے۔

غرض تاریخ سے ادب نے اکثر خوشہ چینی کی ہے۔ تاریخی ڈرامے رزمیہ نظمیں، تاریخی ناول، سوانح عمری وغیرہ سب تاریخ کی ممنون منت ہیں۔ شیکسپیر کے تاریخی ڈرامے۔ ہومر کی رزمیہ نظمیں۔ ایلیاڈ کی اوراڈیسی۔ فردوسی کا شاہنامہ، بالمیک کی رامائن، مہابھارت اور والٹر سکاٹ، الیگزینڈر ڈوما۔ جرجی زیدان۔ بنکم چندر چیٹرجی اور شرر لکھنوی کے تاریخی ناول ادب عالم کا لازوال سرمایہ ہیں۔ سوانح نگاری قطعاً تاریخ سے ماخوذ ہے۔ کارلایل "ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ" میں لکھتا ہے "مشاہیر عالم کی سوانح عمریاں ہی دراصل تاریخ ہیں" اب نے سوانح نگاری کو ایک مستقل فن بنا کر تاریخ کے ایک شعبہ کو اپنا لیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ تاریخ نے ادب کیلئے ایک وسیع جولانگاہ پیش کی بلکہ اکثر تاریخ کے جواہر ریزے بھی خزینۂ ادب کی زینت بنتے ہیں۔ تھیوسی ڈائڈز کی "تاریخ سپارٹا" علامہ ابن خلدون کی تاریخ۔ موسیو لیبان کی "تاریخ عرب" گبن کی "دولۃ الکبریٰ کا عروج و زوال" ادب کا گرانبہا سرمایہ ہیں۔ اگر تاریخ اور ادب میں بیجا حد بندی کی جائے تو ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے۔ تاریخ کی مختلف اصناف۔ سوانح عمریاں۔ روزنامچے سفرنامے۔ اسی ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں جیسے علم جذباتی ناول یا افسانے۔ پلوٹارک (Plutarch) کی سوانح عمریاں، جولیس سیزر کی تنقیدات (Commentaries) مارکوپولو، ابن بطوطہ کے سفرنامے آج بھی مقبول ہیں۔

پچھلی صدی تک تاریخ ادب کے نقطۂ نظر سے لکھی جاتی تھی لیکن آج بیسویں صدی میں جبکہ تنقید کی روح علم و ادب کے ہر شعبہ میں جاری و ساری ہے تاریخ بھی اس سے کب تک محفوظ رہتی، آج تاریخ ایک علیحدہ مختلف فن بن گئی ہے۔ اس کے اصول و قواعد قائم ہوتے جا رہے ہیں جوں جوں تلاش و جستجو کا مادہ بڑھتا جاتا ہے تاریخ میں ریسرچ کی رو سماتی جاتی ہے آج مورخ ایک ایک واقعہ کی تحقیق و تدقیق میں سرگرداں رہتا ہے جزئیات کی تفحص و جستجو میں کھویا رہتا ہے سن و سال کا حد سے زیادہ خیال کرتا ہے وہ تاریخ نویسی میں اپنی دماغی صلاحیتوں کی بجائے قوت تنقید سے زیادہ کام لیتا ہے۔ اس کے برعکس پچھلی صدی کا مورخ قوت تخیلہ کو کام میں لاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ قدیم مورخ ادیب بھی تھا۔ جدید مورخ محقق ضرور ہے ادیب نہیں تاریخ کو ایک مستقل تحقیقی فن بنا کر ادب کا دلکش عنصر علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے تاریخ خشک واقعات کا بے کیف مجموعہ بنتی جا رہی ہے اگر یہی حال رہا تو وہ زمانہ دور نہیں جب تاریخ اقلیدس کی اشکال کی طرح مکمل مستقل اور منظم تو ضرور بن جائیگی لیکن ساتھ ہی ساتھ بے کیف و بے نمک بھی ہو جائیگی۔ اور ادب سے دور کا بھی واسطہ نہ رہیگا۔ یہ رجحان کسی عنوان مستحسن نہیں تاریخ کو ادب سے جدا کرنا گویا ایک ہی ماں کے دو بچوں کو بیگانہ بنا دینا ہے۔ تاریخ کی بقا اسے ایک علیحدہ فن بنانے میں نہیں بلکہ اس کی بقا کا اصل راز یہی ہے کہ اس کا دامن ادب سے وابستہ رہے ——!

کوٹ

تحیّر زا اور پُر اسرار افسانہ

نوشتہ:۔ اے۔ ای۔ ڈی۔ سمتھ
ترجمہ:۔ جناب جمیل احمد کندا پوری ایم اے

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ دفتر کے تمام ساتھی مجھے خبطی سمجھتے ہیں ——لیکن اس میں ان کا قصور نہیں۔ ایک ایسا شخص جسے شور و غضب سے نفرت ہو۔ جو فضول باتیں کرنے کی بجائے تنہا رہنا زیادہ پسند کرتا ہو۔ اور جو ضعف بصارت کے باعث موٹی عینک لگاتا ہو' اس کے متعلق لوگ ۔نہیں تو اور کیسی رائے قائم کریں گے؟ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے اپنے ساتھیوں کی رائے کو ہمیشہ بپائے حقارت سے ٹھکرایا ——لیکن اس خاص واقعہ کے سلسلہ میں میں اکثر کبھی کبھی تنہائی میں یہ سوچتا ہوں کہ ممکن ہے میرے متعلق لوگوں کا خیال درست ہو۔ میں سچ مچ خبطی ہی تو تھا ' پرلے درجہ کا خبطی' ورنہ میں دنیا کے اور لوگوں کی طرح اپنی چھٹیاں آرام سے گزارنے کی بجائے تنہا ایک بیڈ منگی سائیکل پر فرانس کے اس غیر معروف علاقے کی سیر کو کیوں نکل پڑتا۔ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ میں کسی سمندری تفریح گاہ میں چلا جاتا۔ جہاں فردوس نظر سیر گاہوں میں حسین دوشیزاؤں سے آنکھ مچولی کھیلتا اور خوش گلو لڑکیوں کے پر ترنم نغمے سنا کرتا۔ لیکن یہ میرے خبط ہی کا نتیجہ تھا کہ میں نے ان مقامات کی سیر پر ایک غیر معروف علاقہ کی سیاحت کو ترجیح دی اور اس احمقانہ انتخاب کے باعث مجھے سفر میں بھوک سے نڈھال ہو کر بارش کی تیز و تند بوچھاڑوں کی صعوبتیں سہنا پڑیں اور جب سائیکل کا ٹائر پھٹ گیا تو اس بھاری بھرکم چیز کے ساتھ پیدل سفر کرنا پڑا۔

آبادی سے دور بہت دور' ایک سنسان اور غیر آباد سڑک پر مجھے نہایت وحشت خیز آندھی سے دوچار ہونا پڑا ' اور تقریباً دو گھنٹے تک میں بھیگتا ہوا چلتا رہا' چلتا رہا' یہاں تک کہ میرے اعضا شل ہو گئے اور میرے پاؤں جواب دینے لگے۔ رستہ میں مجھے نہ کوئی متنفس ملا' نہ کسی انسانی مسکن ہی پر نظر پڑی۔

آخر اسی طرح راہ طے کرتا ہوا جب میں کافی دور جا چکا تو ایک موڑ کے پاس سے مجھے اپنے سامنے ایک بڑے سے مکان کے چمنیاں اور دودکش کے نل نظر آئے۔ یہ ایک ویران سی عمارت تھی جو سڑک سے کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں واقع تھی —— بہرحال اس ویران مقام میں اس گھر کو دیکھ کر مجھے قدرے سہارا ہوا اور آندھی اور بارش سے بچنے کے لئے میں تیز گامی سے اس کی طرف لپکا۔ دو سو گز چلنے کے بعد آخر میں بیرونی پھاٹک کے سامنے پہنچا' لیکن یہاں پہنچ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی کیونکہ مکان نہایت شکستہ حالت میں تھا اور میں سمجھ گیا کہ اس کے اندر ایک بھی آدمی نہیں' سامنے بعض کمروں کی چھتیں ٹوٹ کر گر پڑی تھیں' اور پھاٹک کے کواڑ پر کائی کی گہری تہیں جم گئی تھیں —— سامنے زمین پر لمبی گھاس اور خود رو پودے اُگ آئے تھے۔

بہرحال ان تمام چیزوں کے باوجود' موجودہ پریشان کن حالت میں ایسا ویران گھر بھی پناہ لینے کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ جہاں داخل ہو کر میں اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کو نچوڑ کر خشک کر سکتا تھا۔ اور بقیہ سفر آرام سے طے کرنے کے لئے اپنی سائیکل بھی درست کر سکتا تھا۔ لہذا بغیر کسی پس و پیش کے میں گھر کی چار دیواری میں داخل ہو گیا —— یہ پرانی وضع کی نہایت قدیم عمارت تھی جس کی دیواریں اب جنگلی بیلوں سے تقریباً ڈھک سی گئی تھیں۔ صدر دروازے پر پتھروں کو کھود کر قدیم زمانے کی ایک ڈھال بنائی گئی تھی جس پر خاندانی نشان تھا —— اس سے پتہ چلتا تھا کہ اس گھر میں کبھی کوئی نامور آدمی رہا ہوگا۔ کواڑ کے دونوں جانب ایک ایک زنگ خوردہ "بحری توپ" لٹکا ہوا تھا۔ جو شاید کسی ایسی سابقہ جنگ کی یادگار رہتی ہوگی جس میں اس گھر کے پرانے مکین نے نمایاں حصہ لیا ہوگا۔ بیشتر دریچے تختوں سے جڑے ہوئے تھے۔ اور ظاہر ہوتا تھا کہ یہ جگہ مدت ہا سال سے ویران پڑی ہوئی ہے۔

میں نے سامنے کے دروازے کو کھولنا چاہا اور میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میرے شانے کی ایک ہی ضرب سے کواڑ قبضوں سے اکھڑ کر زمین پر جا گرے۔ اندھیرے ہال میں قدم رکھتے ہی میری

ناک میں فوراً سڑی ہوئی لکڑیوں اور دوسری چیزوں کی بدبو آئی۔ چند لمحوں تک تو میں یونہی کھڑا حیرت و استعجاب سے اپنے اردگرد تکتا رہا۔ میرے بالمقابل ایک کشادہ زینہ تھا جس پر گرد و غبار کی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ میں نے زینہ پر قدم رکھا اور بالائی منزل پر جو پہلا دروازہ ملا اسے کھول کر ایک نہایت کشادہ اور آراستہ و پیراستہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ قرینہ سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی وقت اس مکان کا ملاقاتی کمرہ رہا ہوگا۔ اگرچہ اب کس مپرسی کی وجہ سے اس کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ مرصع کارنس جگہ جگہ سے اکھڑ کر جھک گئے تھے اور ایک کونے میں چھت کا پلستر اکھڑ کر بالکل نیچے آگرا تھا۔ دروازوں کے پردے تار تار نظر آرہے تھے اور خوبصورت ایرانی قالین پر جو آتشدان کے پاس پڑا تھا۔ ایک جانب کلاہ باراں (FUNGUS) چھا گئی تھی۔

آتشدان کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک خیال آیا — اگر مجھے تھوڑی سی لکڑی مل جائے تو آگ روشن کرکے میں اپنے لئے نہ صرف چائے ہی تیار کر سکتا ہوں بلکہ اس کی مدد سے اپنے بھیگے کپڑوں کو بھی اچھی طرح خشک کر سکتا ہوں۔

باہر نوکروں کے لئے جو کمرے بنے تھے ان میں معمولی سی تلاش کے بعد مجھے تھوڑی سی خشک لکڑیاں مل گئیں اور اپنے کوٹ کے نیچے انھیں دبا کر میں پھر گھر میں داخل ہوا۔ اور اوپر جانے کے لئے زینے کو طے کرنے لگا۔ مگر اس ملاقاتی کمرے کی چوکھٹ پر پہنچ کر نہ جانے کیوں میں چونک کر کھڑا ہو گیا — ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پر اسرار طاقت مجھے اندر جانے سے روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ نہ جانے کیوں میرا دل مجھے پیچھے مڑ کر بھاگ جانے کی ترغیب دینے لگا۔ لکڑیوں کو میں نے اپنے پاؤں کے پاس زمین پر رکھ دیا اور کچھ دیر تک مذبذب کی حالت میں چوکھٹ پر کھڑا رہا۔ مجھے اس جگہ کی فضا سے نامعلوم خوف کا احساس ہونے لگا۔ تمام چیزیں بظاہر اسی طرح اپنی اپنی جگہ پر رکھی تھیں جس طرح میں انھیں چھوڑ کر گیا تھا۔ پھر بھی اس وقت رہ رہ کر مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ کوئی نہ کوئی بھوت میری عدم موجودگی میں یہاں سے ہو کر گیا ہے۔

میں طبعاً نہ بزدل ہوں نہ توہم پرست — پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ ایک لمحہ بعد میں لکڑیاں اٹھا کر بیچ بیچ سیڑھیوں پر سے اتر کر واپس جانے لگا۔ درحقیقت یہ خوف کا نتیجہ نہیں بلکہ حفظ ماتقدم کا خیال تھا جس نے مجھے واپسی پر مجبور کیا — ! میرے دل میں یقیناً یہ خیال پیدا ہوا کہ صدر دروازے کے قریب آکر میں سب سے نچلی منزل کے کسی کمرے میں آگ جلاؤں تو شاید مجھے زیادہ سکون اور راحت محسوس ہوگی کیونکہ اگر کوئی غیر متوقع واقعہ پیش آیا اور بھاگنے کی نوبت آئی تو میں وہاں سے بہت جلد نکل کر بھاگ سکوں گا۔

جب میں اس غرض سے نیچے اترنے لگا تو دفعتہً میری نظر ایسی چیز پر پڑی جس سے میں لرز سا گیا۔ سیڑھیوں پر گرد کی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں اور میں نے اس گرد پر ہی ایک چوڑا نشان دیکھا بالکل ویسا ہی جیسے ابھی ابھی کوئی اس پر سے خالی بوری یا اسی قسم کی کوئی اور چیز گھسیٹ کر لے گیا ہو۔

زینے کے نیچے سے یہ نشان ہال میں اس جگہ تک چلا گیا تھا جہاں دیوار کی کھونٹی پہ ایک کرم خوردہ کوٹ لٹک رہا تھا۔ اسی قسم کے نشان ہال کے کئی اطراف تک نظر آئے۔ مگر تمام نشانات کی ابتدا اسی کھونٹی کے نیچے سے ہوئی تھی جس پر کوٹ لٹک رہا تھا۔

اب میرے تن بدن میں اضطراب اور وحشت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ گھر بظاہر غیر آباد ضرور نظر آتا تھا۔ مگر گرد پر جو نشان تھا اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی آدمی ابھی ابھی یہاں سے ہو کر گیا ہے۔ کوٹ کے پیچھے سے یہ انوکھے نشانات بنانے والا کون تھا؟ اس کے متعلق کوئی خیال قائم کرنا ناممکن سا تھا — ممکن ہے وہ کوئی دیوانہ ہو، اور شاید کوئی عورت جس کے لمبے چغے ہی نے اس کے پاؤں کے نشانات مٹا ڈالے تھے۔

میں نے اس پرانے کوٹ کو غور سے دیکھا۔ یہ پرانی وضع کا ایک فوجی کوٹ تھا۔ اور سلور کے دو ایک داغدار بٹن اب تک اس میں لگے ہوئے تھے۔ کھونٹی سے اتارتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ٹھیک بائیں شانے کے نیچے ایک چھوٹا سا گول سوراخ تھا، جس کے چاروں طرف کپڑے جھلس گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے نہایت قریب سے اس پر پستول چلایا ہے۔ اگر یہ سوراخ واقعی پستول کی گولی کا نتیجہ تھا تو ظاہر ہے یہ کوٹ کسی وقت ایک مُردے کے جسم پر ہوگا۔

دفعتہً مجھے اس کوٹ سے نفرت سی ہونے لگی، اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے اسے پھر اسی طرح کھونٹی پر چڑھا دیا۔ اب آپ اسے وہم کا نتیجہ سمجھیں یا کچھ اور مگر یہ حقیقت ہے کہ اس وقت جو بدبو میری ناک میں محسوس ہوئی وہ صرف پھپھوندی لگے ہوئے سڑے کپڑے ہی کی نہ تھی، بلکہ متعفن گوشت [illegible]

پڑھی کی بھی بُو اس وقت اس کوٹ سے آرہی تھی۔

اب مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس جگہ کی پوری فضا گناہ آلود ماضی سے وابستہ ہے۔ بڑی کوششوں کے بعد میں نے اپنے ہوش و حواس مجتمع کئے۔ لیکن آخر میرے خوف کا سبب کیا تھا ڈاکوؤں اور لٹیروں سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کیونکہ میری جیب میں ریوالور موجود تھا۔ رہے بھوت! تو اگر واقعی ان کا وجود کوئی معنی رکھتا ہے جب بھی وہ نمودار نہیں ہوتے بہرحال جگہ واقعی لرزہ خیز تھی۔ اور میں یہاں رات گزارنے کی جسارت ہرگز نہ کرسکتا تھا۔ لیکن خواہ مخواہ محض وہم کا شکار ہوکر جا ئیے پیئے اور سائیکل مرمت کئے بغیر اس آندھی اور بارش میں باہر نکل جانا بھی حد درجہ کی حماقت تھی۔

لہذا میں ایک دروازہ کھول کر ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا جو یقینا ہر کسی وقت دار المطالعہ رہا ہوگا۔ دروازے کے سامنے ہی آتشدان تھا اور اس میں ان لکڑیوں کی راکھ اب تک موجود تھی جو آخری مرتبہ اس میں جلائی گئی ہونگی۔ میں نے "آگ کریدنی" اُٹھائی۔ جو ایک بے ڈھنگی سی پرانی چیز تھی اور جس کا دستہ نار بجی سے بھی بڑا تھا۔ پہلے میں نے راکھ کو کریدا، پھر لکڑیاں رکھیں۔ مگر لکڑی نمناک تھی اور بیسوں تیلیاں استعمال کرنے کے باوجود بھی آگ روشن نہ ہوئی اور دودکش کے بند ہونے کی وجہ سے سارا کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ مایوس ہوکر میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور پھونک پھونک کر چنگاریوں کے شعلے بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ابھی میں نے پھونکنا شروع ہی کیا تھا کہ میرے کانوں میں ہال میں کسی کے چلنے کی آواز آئی اور میں چونک سا گیا ——— یہ ایک ہلکی سی پھڑپھڑاہٹ کی آواز تھی جیسے کسی نے اپنا لبادہ اتار پھینکا ہو۔

اس عجیب و غریب آواز نے میرے ہوش و حواس پر بجلی سی گرادی۔ اور میں گوش برآواز پستول ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوگیا ——— مگر دوبارہ یہ آواز پیدا نہ ہوئی اور میں بڑی ہمت و جسارت سے آہستہ آہستہ پنجوں کے بل ہال کی طرف گیا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ بارش اب بھی خوب زور سے ہو رہی تھی مگر پانی کی بوچھاڑ کے علاوہ کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ البتہ فرش کی اس جگہ سے جہاں کوٹ لٹک رہا تھا گرد اُٹھ رہی تھی جیسے ابھی ابھی کوئی اس جگہ سے گزرا ہو۔

"شاید کوئی چوہا ہوگا!" میں نے دل میں سوچا اور ہر قسم کے وہم کو دماغ سے نکال کر پھر کام میں مصروف ہوگیا۔

مگر ابھی چند ہی منٹ گزرے ہونگے کہ ایک مرتبہ پھر وہی عجیب و غریب آواز سنائی دی ——— خفیف مگر صاف اور واضح!!

میں ہال میں گیا۔ اور پہلے کی طرح پھر کوٹ کے نیچے عین اسی جگہ پر گرد اٹھتی ہوئی دیکھی ——— لیکن کسی آدمی پر نظر نہ پڑی۔ اب میرے دل میں یہ بات اچھی طرح جم گئی کہ اس قدیم اور ویران ہال میں میں تنہا نہیں ہوں بلکہ کوئی ناپاک غیر مرئی جن یا بھوت یہاں کسی نہ کسی جگہ چھپا ہوا ہے۔

"اب یہاں ٹھہرنا بیکار ہے۔" میں نے دل میں سوچا ——— ممکن ہے یہ میری کمزوریٔ طبع کا نتیجہ ہو۔ لیکن یہ چیزیں اب میری قوت برداشت سے باہر ہوگئی تھیں اور میں نے جلدی سے بھاگ جانے کے منصوبے باندھے۔

بس اس خیال کے آتے ہی میں پھر اس چھوٹے سے کمرے میں گیا اور دروازے پر خوف و دہشت سے نظریں جمائے ہوئے نہایت جلد جلد اپنا اسباب درست کرنے لگا اور عین اس وقت جب میں آخری فیتہ کس رہا تھا ہال سے نہ صرف وہ عجیب و غریب آواز ہی آئی بلکہ کسی کے قدموں کی آہٹ بھی سنائی دی جلدی سے میں نے ریوالور نکال لیا اور کھڑا ہوکر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ سچ پوچھئے تو اس وقت میرے جسم کا خون بالکل خشک ہوگیا تھا ——— دروازے کے قلابوں کے درمیان جو شگاف تھے ان میں سے میں نے ایک سایہ باہر گزرتے ہوئے دیکھا ——— پھر کواڑ میں تھوڑی سی کڑکڑاہٹ ہوئی اور اس کے بعد خود بخود کھلنے لگا۔ اور میں نے دیکھا کہ وہی پرانا کوٹ دروازے کے درمیان سیدھا تن کر کھڑا ہے۔ کبھی کبھی یہ ڈگمگا سا جاتا تھا جیسے یہ اپنے توازن کو اچھی طرح برقرار رکھنے پر قادر نہیں۔ کالر اور شانے اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے کوئی غیر مرئی انسان اسے پہنے ہوئے ہے ——— وہی پرانا پھپھوندی لگا ہوا کوٹ جسے میں نے ہال میں آویزاں دیکھا تھا۔

ایک لمحہ تک، جو میرے لئے دوام سے کم نہ تھا، میں پتھر کی طرح بے حس کھڑا اس عجیب و غریب "شے" کو تکتا رہا۔ جو دروازے کی چوکھٹ میں رکا ہوا تھا، ایک عجیب پرخطر مگر سحر انگیز طاقت نے میرے پاؤں اسی جگہ جما دیئے جہاں میں کھڑا تھا۔ میرا سارا جسم بالکل مفلوج سا ہوگیا اور ریوالور میری بے حس انگلیوں سے

چھوٹ کر زمین پر گر گیا ــــــ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ کوئی "ناپاک چیز" اس وقت میرے سامنے ہے - اور یہ کہ اس جہنمی چیز کے لمس ہی سے نہ صرف آن واحد میں میرا سارا جسم سڑ جائے گا بلکہ میری روح بھی ابدی لعنت میں مبتلا ہو جائے گی۔

اس کوٹ نے کمرے کے اندر بڑھنا شروع کیا ــــــ تحیّر زا، مگر ناقابل بیان حرکت کے ساتھ۔ دونوں آستینیں نہایت بے ڈھنگے پن سے جنبش کر رہی تھیں - دامن گرد میں جھول رہے تھے۔ اور وہ کوٹ میری جانب بڑھا آ رہا تھا۔

میری آنکھیں جیسے ماتھے سے نکلی پڑتی تھیں اور فرط خوف، سے میں نے قدم بہ قدم ایک بےحس بُت کی مانند آخر پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ہٹتے ہٹتے میری پشت آتشدان سے آ لگی - اور اب پیچھے جانے کی مطلق گنجائش نہ تھی ــــ مگر وہ کوٹ کسی نہ کسی خوفناک ارادے سے میری ہی جانب بڑھتا آ رہا تھا۔ خالی آستینیں تھرتھراتی ہوئی میرے حلق کی جانب بڑھ رہی تھیں اور میں سمجھ گیا، کہ چند ہی لمحوں میں وہ مجھے دبوچ دیں گی اور میرے ہوش و حواس ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائیں گے ــــــ لیکن اس وقت ایک اچھا سا خیال نہ جانے کس طرح میرے دماغ میں آیا۔ وہ خیال جس کی بابت میں نے چند سال پیشتر کسی سے سنا تھا ــــ یہ "مقدس نشان" کا خیال تھا جس کی طاقت کے سامنے بدی بے اثر ہو جاتی ہے۔ بس اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنی ایک مفلوج انگلی سے صلیب کا نشان بنایا۔ میرا دوسرا ہاتھ پیچھے کی جانب ایک سرد۔ سخت اور گول سی شے سے دوچار ہوا ــــ ـ پرانے "پوکر" (آتش کاوے) کے دستے سے!

سرد لوہے کے لمس نے بجلی کی سی طاقت سے میرے ہوش و حواس کو پھر مجتمع کر دیا۔ اور میں نے آتش کاوے کو گھما کر پوری طاقت سے اس دہشت فزا کوٹ پر پھینکا۔ اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ چیز فوراً دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ اور صرف ایک معمولی سا کوٹ بن کر رہ گئی ــــ اسی وقت میں جست لگاتا ہوا کمرے سے بھاگا لیکن دروازے کے پاس پہنچ کر جب میں نے گردن موڑی تو دیکھا کہ وہ کوٹ پھر سنبھل کر اپنی اصلی شکل اختیار کرنے کی کوشش کر رہا ہے ــــ جیسے وہ میرا تعاقب کرنے میں جد و جہد کرے گا!

پاگلوں کی طرح میں تمام چیزیں چھوڑ چھاڑ کر جست کرتا ہوا گھر سے بھاگا ــــــ اس کے بعد کیا ہوا؟ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میں نے اپنے آپ کو نیم بیہوشی کی حالت میں ایک چھوٹی سی سرا کے دروازے کے سامنے پایا۔

"خدا کے لئے مجھے تھوڑی سی شراب پلا دو!" میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

شراب لائی گئی اور ابھی میں نے اسے پینا شروع بھی نہیں کیا تھا کہ بہت سے لوگ میرے اردگرد جمع ہو کر مجھے حیرت سے گھورنے لگے۔ ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی زبان میں مَیں نے تمام واقعہ ان سے بیان کرنے کی کوشش کی۔ وہ حیرت و استعجاب سے مجھے گھورتے رہے۔ آخر تمام باتیں سن کر سرا کے مالک نے کہا۔

"موسیو! کیا تم سچ مچ اس مکان کے اندر گئے تھے ــــ عجیب بات ہے! اب تو تمہیں ایک بوتل شراب اور بھی چاہیئے!"

اس کے بعد اس واقعہ کے متعلق مجھے بہت سی باتیں مالک سے معلوم ہوئیں۔ اس غیر آباد گھر میں کسی وقت نپولین اول کی فوج کا ایک ریٹائرڈ افسر رہتا تھا، ایک بدمعاش ــــ جس نے دنیا کے ہر گناہ سے اپنا دامن ملوث کیا۔ سرا کے مالک نے جو واقعات بیان کئے ان سے معلوم ہوا کہ وہ پرلے درجہ کا بدکار تھا۔

"ہاں موسیو! وہ نہایت بدکار تھا" سرا کے مالک نے اخیر میں کہا "اس نے اپنی بیوی کو بیرحمی سے مار ڈالا اور دنیا بھر کے لوگوں حتیٰ کہ اپنی لڑکیوں تک کو ایسی سخت اذیتیں پہنچائیں جن کی تفصیل سے آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آخر ایک لڑکی نے تنگ آ کر اس کی پشت پر گولی چلا دی۔ وہ پرانا گھر اس علاقہ میں بہت بدنام ہے اگر تم میرے گاؤں کے کسی آدمی کو ایک لاکھ اشرفیاں دو جب بھی کوئی اس کے قریب جانے پر رضامند نہ ہوگا"

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا میں جانتا ہوں کہ دفتر کے تمام ساتھی مجھے خبطی سمجھتے ہیں اسی خوف سے میں نے اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اس واقعہ کا ہر ہر حرف سچا ہے۔

میری نئی سائیکل اور سفری اسباب شاید اب بھی اسی گھر میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ چاہیں تو جا کر انہیں لے سکتے ہیں۔

سوزِ ناتمام

کوئی انیسِ دل نہیں اب ترے نام کے سوا

از جناب شہید یوسفی رامپوری

میرے دل و نگاہ میں کوئی نہیں ہے اے ندیم
جلوۂ خاص کے سوا منظرِ عام کے سوا

آہ کوئی نہ کر سکا چارۂ تلخیِ فراق
نالۂ صبح کے بغیر، گریۂ شام کے سوا

تیری نگاہِ مست سے مجھ پہ یہ راز کھل گیا
گردشیں اور بھی ہیں کچھ گردشِ جام کے سوا

کوئی شریکِ غم نہیں اب تری یاد کے بغیر
کوئی انیسِ دل نہیں اب ترے نام کے سوا

جلوۂ صد ہزار رنگ حسن کی کائنات ہے
عشق کے پاس کچھ نہیں یاسِ دوام کے سوا

کاہشِ آرزو سہی حاصلِ زندگی مگر
حاصلِ آرزو ہے کیا سوزِ تمام کے سوا

مر کے حیاتِ جاوداں مجھ کو شہید مل گئی
جی کے ہوس کو کیا ملا مرگِ دوام کے سوا

اُردو قصیدہ گوئی کا اخلاقی پہلو

ادبی مقالہ

از جناب محمد حبیب الرحمن نگینوی بی۔اے

شاعری اور اخلاقیات کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ اگر اخلاقیات کو شاعری سے الگ کر دیا جائے تو پھر شاعری میں کوئی چیز قابل قدر باقی نہیں رہتی۔ بقول ہڈسن "گو ہم بعض اوقات مخرب اخلاق شاعری میں بھی دلچسپی پاتے ہیں اور عمر خیام کے عیش پرستانہ کلام کی تعریف بھی کر جاتے ہیں مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ شاعری کا اخلاقیات کے خلاف بغاوت کرنا زندگی سے بغاوت کرنے کے مرادف ہے"۔ بائرن کی "ڈان جون" شکسپیر کی "ریپ آف لیوکریشیا" اور ملٹن کی "فردوس گم گشتہ" میں حوا کے متعلق سراسر فحش اور گندے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس لئے محمد امیر صاحب کے الفاظ میں "ادبیات میں سب کچھ بخشا جا سکتا ہے لیکن جس کے بخشنے کے لئے کوئی آمادہ نہیں وہ یہی جرم ہے"۔

واعظانہ شاعری کو نکتہ چینی کا مرکز محض اس لئے نہیں بنایا جاتا کہ وہ شاعری نہیں ہے۔ شاعر چاہے تو پند و نصائح کی تلخیوں پر شعریت کی شکر لپیٹ کر شیریں بنا سکتا ہے۔ درحقیقت شیخ سعدی مولانا روم۔ اکبر الہ آبادی۔ علامہ اقبال وغیرہ جیسے بزرگوں کی کامیاب مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

یوں تو اُردو شاعری میں اخلاقی نظمیں عربی سے بھی زیادہ ہیں فارسی کی مشہور مثنویوں کا ترجمہ اُردو میں موجود ہے۔ مستند اخلاقی مثنویاں بھی لکھی گئی ہیں۔ جستہ جستہ اخلاقی نظمیں بھی بکثرت ہیں غزلیات میں بھی اخلاق کی آمیزش ہے۔ یہ عنصر قدیم اُردو شاعری میں بھی موجود ہے۔ اور اُردو مراثی تو اخلاقی مسائل کا خزانہ ہیں۔ ہر کہ و مہ ان سے فیضیاب ہو سکتا ہے لیکن اُردو قصاید کا حال ان سب سے مختلف ہے۔ انھوں نے کہاں تک یہ فرض ادا کیا؟ یہ بحث طلب ہے اور یہی اس مضمون کا مقصد ہے۔

تمام تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ قصیدہ کے موجد و بانی عرب ہیں۔ علامہ شبلی ایرانی قصاید کے سلسلہ میں فرماتے ہیں "جس زمانہ میں فارسی شاعری کا آغاز ہوا عرب کی شاعری مدحیہ قصاید تک محدود تھی۔ اس لئے ایرانی شعرا نے بھی انہی کی تقلید کی۔ صلہ و انعام کی توقع بھی صرف قصیدہ سے ہو سکتی تھی۔ یہ اسباب تھے کہ ایران نے سب سے پہلے قصیدہ گوئی شروع کی"۔ قصیدہ گوئی کی یہ تاریخ دیکھ کر ہماری توجہ فوراً اس طرف مبذول ہوئے بغیر نہیں رہتی کہ جس فن کی ابتدا صلہ و انعام کی توقع پر ہوئی ہو اس کا اثر اخلاق پر کیا ہو سکتا ہے؟

مگر اب تحقیق طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا قصیدہ کے موجدوں کے نزدیک بھی اس کا یہی مقصد تھا؟ عربی قصاید دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا ہرگز نہ تھا۔ جمیل نامی ایک عربی شاعر گزرا ہے سلطانِ وقت نے ایک دن اسے اپنے دربار میں طلب کیا اور اس سے ایک قصیدہ کی فرمائش کی۔ لیکن اس نے سختی سے انکار کر دیا اور کہا "تو نے کیا کارنامہ کیا ہے جس کی قصیدہ خوانی تو چاہتا ہے؟ پہلے کچھ کر کے دکھا پھر قصیدہ کی فرمائش کر"۔ یہ کس قدر حیرت آموز جواب ہے اور اس سے تاریخ قصیدہ گوئی پر کتنی روشنی پڑتی ہے۔ وہ مبصرین جنھوں نے قصاید کے ہر رکن کو معائب کی جولانگاہ ظاہر کرنا اپنے فرائض میں داخل کر لیا ہے اس واقعہ سے بصیرت حاصل کریں کیا یہ واقعہ اس بات کا بیّن ثبوت نہیں کہ وہ قصیدہ صلہ و انعام کے لئے نہ کہتے تھے بلکہ سچائی اور حقیقت بیانی کے مداح تھے۔ واقعاتی پہلو ان کے مدنظر خاص طور پر رہتا تھا۔ لہذا ابتداءً قصیدے کا مقصد مخرب اخلاق نہ تھا۔

لیکن ایک مرتبہ جب قصیدہ کہنے پر ایک شاعر کو کسی ایرانی بادشاہ نے انعام دیا تو اوروں کی رگ حرص بھی جوش میں آئی۔ انھوں نے بھی قصاید کہے۔ اور انعام پایا۔ پھر تو یہ رسم اس قدر عام ہوئی کہ قصیدے کا اصل مقصد ہی فوت ہو گیا۔ ادھر جب تمام ایشیا میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا۔ جنگ و جدل کی آگ بھڑکنا شروع ہوئی۔ سلطنت پارہ پارہ ہونے لگی۔ چھوٹے چھوٹے نواب اور سردار خود مختار بن بیٹھے تو ہر ایک نے دوسرے پر برتری چاہی

شہرت کی تمنا نے دل میں گھر کیا تو شاعروں کو ہر دربار میں طلب کیا جانے لگا۔ ان کو ملازم رکھا گیا ان کے وظیفے مقرر ہوئے۔ ان کی سرپرستی کی گئی۔ اور اپنی شان میں قصیدے قصداً کہلوائے گئے۔ یہ رنگ دیکھ کر ضرورت کے مارے 'خودغرضیوں سے آلودہ خود بخود ادھر کھنچنے لگے۔ بس اب کیا تھا۔ خوشامد اور چاپلوسی سے وہ محفل گرم ہوئی کہ قصیدہ گوئی کو "فنِ زرکشی" کا خطاب عطا ہوا۔ اور خود "آقائی و مولائی" کا مرتبہ پایا۔ کسی فارسی شاعر نے کتنا سچ کہا ہے ؎

آنکس کہ نداند و بداند کہ بداند

در جہل مرکب ابدالدہر بماند

یہ شعر ایسے ہی ممدوحین کے اخلاق کا مصداق ہے۔ دراصل قصیدہ وہی ہے جس میں ممدوح کے حسن خلاق اور حسن عمل سے متاثر ہو کر مادح اپنے صحیح ترین جذبات کا اظہار کرے۔

چونکہ اردو شعرا نے قصیدے میں ایرانیوں کی تقلید کی ہے اس لئے یہی اعتراض ان کے یہاں بھی قائم رہتا ہے یہاں بھی "عرش وقار" اور "آسماں جناب" کا مرتبہ پانے والے ممدوحین کی کمی نہیں لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں جب قصیدہ گوئی کا آغاز ہوا تو زمانہ اس کے لئے بہت ہی ناسازگار رہا۔ زمانے اور ادب کا ساتھ لازم و ملزوم کا سا ہے۔ جیسے جیسے زمانہ کا رنگ بدلتا ہے ویسے ہی ادب میں بھی نیرنگی رونما ہوتی ہے۔ اس لئے اس اعتراض پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ان کے ماحول کا مفصل طور پر جائزہ لیں اور دیکھیں کیا واقعی ان کی زندگی کا پس منظر ایسا تھا جو قصیدہ گوئی اور اخلاق پر کچھ اثر ڈال سکتا تھا بہتر ہے کہ وہ پس منظر ہم شیخ چاند صاحب کی زبان سے سنیں۔ فرماتے ہیں۔

"جب ہم اس زمانہ کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایک ڈراؤنا اور بھیانک منظر دکھائی دیتا ہے۔ ملکی اور سیاسی امور میں اس قدر اختلال پیدا ہو گیا تھا۔ کہ مغلوں کی عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اس کا اثر عام معاشری اور تمدنی حالات پر بہت برا پڑا کسی طبقے کا کوئی شخص خوش اور مطمئن نہیں تھا۔ سپاہی تنخواہ سے مہینوں محروم رہتے تھے۔ وہ بیچارے اثاثۂ بیت حتیٰ کہ ڈھال اور تلوار تک رہن رکھ دیتے تھے اور بڑی مشکلوں سے دن کاٹتے تھے۔ صناع اور کاریگروں کی مصنوعات کو افلاس نے کس مپرسی اور گمنامی سے روشناس اور قدردانی سے محروم کر دیا تھا۔ یہی حال علما و فضلا کا تھا اپنے علم و فضل کو کوڑیوں کے مول بیچتے پھرتے تھے لیکن کوئی پوچھتا نہ تھا۔ قدر و منزلت اور عزت و احترام کی بجائے بے التفاتی اور بے توجہی' اغماض و تغافل کام میں لائے جاتے تھے۔ شاعر بیچارے عجیب کشمکش اور گو مگو کے عالم میں تھے جہاں کسی نواب یا امیر کو ذرا بھی فرصت نصیب ہوئی اور اس نے شاعروں کو جمع کرنا شروع کیا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کا رنگ بگڑا تو شاعروں کی پوری جماعت بے روزگار ہو گئی۔ نواب بہادر خواجہ سرا قتل ہوا تو میر اور دوسرے شعرا بے سہارا ہو گئے۔ عمادالملک کے پائے اقتدار میں لغزش آئی تو سودا اور دوسرے کئی شاعر بے روزگار ہو گئے۔

مالی کمزوری نے عام اخلاقی معیار بھی گھٹا دیا تھا۔ اور مسلسل و متواتر جنگوں کے دھچکوں نے لوگوں کے سامنے ایک ہولناک خونیں منظر اور دنیا کی بے ثباتی کا ہولناک نقشہ کھڑا کر دیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کی معاشرت، تمدن اور اخلاق ہر چیز پر یاس و ہراس چھا گئے اور زندگی کے ہر شعبے پر قنوطیت اور خوف و رجا کا رنگ جم گیا۔ علوم و فنون پر اوس پڑ گئی اور ان کے ماہرین کے دل و دماغ خوشی و مسرت کے نور سے محروم ہو گئے۔ ان حالات میں جب ہم اردو شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کو اور بھی ٹھٹھرا ہوا دیکھتے ہیں۔ شاعروں کا فرقہ تو یوں بھی بیکار اور نکما سمجھا جاتا ہے۔ اس یاس انگیز' پرفتن' نازک اور انقلاب آفریں دور میں شاعروں کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا۔ یہ بیچارے دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے اور ناکام و نامراد زندگی کے دن کاٹتے تھے۔"

اب غور فرمائیے کہ اس سیاسی و معاشری تباہ حالی اور پراگندہ دور میں زبان اور زمان کے مخالف ہوتے ہوئے قصیدہ گوئی کا نخل اگر پروان نہ چڑھا تو کیا تعجب ہے، اسی لئے زمانہ کی ناسازگاری کو اردو قصاید نویسی میں بڑا دخل ہے۔ اگر زمانہ موافق ہوتا تو کیا کوئی بھی علم دوست انسان علم و ادب کی یہ پستی کبھی بھی گوارا کر سکتا تھا؛ ہرگز نہیں۔ کیونکہ جذبات کبھی نیچے نہیں جاتے۔ عرفی کی مثال ہمارے سامنے ہے لیکن یہاں تو سوال زندگی اور موت کا درپیش تھا۔ یہ وقت ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں بڑے بڑے دل کے پائے استقلال میں بھی لغزش آجاتی ہے۔ پھر یہاں ایک دو افراد نہیں، خاندان کے خاندان اور علاقے کے علاقے اسی مصیبت کا شکار تھے۔ اس لئے اگر اس زمانہ کے شاعروں نے خدمت ادب کے ساتھ ساتھ قصیدہ گوئی کو کسب معاش کا ذریعہ بھی ٹھہرایا تو کون سا جرم کیا؟ ان کے پاس اس کے سوا مفر ہی کیا تھا؟ اس لئے ظاہر

ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر قصیدہ گو ہر حیثیت سے گردن زدنی قرار نہیں دیئے جاسکتے بلکہ اس کے برعکس ہم خوش قسمت اور وہ قابل مبارکباد ہیں کہ زمانہ کی سخت آزمائشوں اور زوال کی بلاؤں نے ان کو چور اور ڈاکو نہیں بنا دیا۔ ورنہ یہ فصاحت و بلاغت یہ پر شکوہ الفاظ و استعارے۔ یہ زبان پر حاکمانہ قدرت، یہ تازگی اور نزاکت مضمون، یہ زور اور قادر الکلامی، یہ چستی و درستی ترکیب اور یہ خوبی محاورہ و تشبیہ جو انہی اردو قصائد کے بیش بہا تحفے ہیں اگر آج نہ ہوتے تو اردو زبان دوسری زبانوں کا منہ دیکھتی رہ جاتی۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ زمانے کی فضا بدلتے ہی قصیدہ گوئی کا خاتمہ ہونے لگا اور اس کی جگہ قومی نظموں نے لے لی۔

قصیدے کے مختلف رکن ہیں۔ مثلاً تشبیب۔ گریز۔ مدح۔ دعا اور خاتمہ۔ ان سب میں "مدح" قصیدہ کی جان ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی شعر العجم میں فرماتے ہیں۔ "قصیدہ جس کا اصل موضوع مدح ہے بڑے کام کی چیز ہے۔" چونکہ مدح اور دعا کا گہرا تعلق ہمارے موضوع سے ہے۔ اس لئے باقی کو چھوڑ کر اب ہم صرف انہی دو ارکان پر بحث کریں گے۔۔ مدح کے چار پہلو ہیں۔ اولاً اس کا اثر خود مداحین کے اخلاق پر ثانیاً ممدوحین کے اخلاق پر ثالثاً قارئین کے اخلاق پر اور رابعاً عوام کے اخلاق پر۔ اب ہم ان کو سلسلہ وار بیان کریں گے۔

اخلاق پر قصائد کا اچھا یا بُرا اثر کرنا۔ اس کے موضوعات پر جن پر وہ لکھے جاتے ہیں منحصر ہے۔ یہ موضوعات عموماً حسب ذیل ہوتے ہیں۔ (۱) مذہب (۲) امراء و سلاطین (۳) پند و نصائح (۴) ہجو (۵) واقعات۔ موضوعات کو دیکھ کر یہ تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ مخرب اخلاق نہیں ہو سکتے۔ لیکن آیئے ذرا انکی تفصیل دیکھیں۔

مدح دو حضرات کی کی جاتی ہے۔ بزرگان دین یا امراء و سلاطین اب لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تمام ممدوحین اس لائق تھے کہ ان کی شان میں نہایت کثرت سے قصیدے لکھے جاتے۔ جہاں تک بزرگان دین کی مدح کا تعلق ہے صاف ظاہر ہے کہ وہ اعتقاد کے زیر اثر ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں بزرگان دین کا علم و فضل، زہد و تقویٰ اور قوت اعجاز ان کو عوام سے بالاتر بنا دیتی ہے۔ ان کی قوتوں کا اندازہ لگانا ہی مشکل ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا کہ شاعر نے جو تعریف کی ہے وہ حق و صداقت پر مبنی نہیں ہے بڑی غلطی ہوگی

ان مذہبی قصاید کی بابت یہ ماننا پڑے گا کہ ممدوحین بلاشبہ اسی پائے اور درجے کے تھے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پنجتن پاک امام علیہا السلام۔ اولیائے کرام۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ محض رسماً لکھے گئے ہیں۔ سودا۔ غالب۔ امیر محسن وغیرہ وغیرہ نے انتہائی عقیدت اور جوش کے ساتھ ان کو قلمبند کیا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ بس جوش عقیدت میں قصیدہ گو حضرات نے کہیں کہیں صحیح واقعات اور مستند روایات کی شکل بدل دی ہے۔ بعض اوقات فرضی معجزات بھی نظم کئے ہیں۔ اور اس سے بھی بڑھکر انھوں نے بزرگان دین کی شان میں عشقیہ تشبیب اور اصطلاحیں استعمال کی ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے ان کے جسمانی اوصاف بیان کئے ہیں۔ یہ اخلاقی کمزوری کی علامت ہے لیکن یہاں بھی جیسا کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے شعر الہند میں تسلیم کیا ہے۔ "ان شعرا کا قصور نہیں ہے بلکہ ہمارے و دنیا کا قصور ہے۔"

اب رہی سلاطین و امرا کی مدح، بیشک ہمارے شاعروں نے سلاطین و امرا کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جھوٹ کے پل باندھے ہیں لیکن یہاں ایک بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہئے۔ ہمارے ہاں جتنے قصیدہ گو حضرات گزرے ہیں۔ ان میں سے قریب قریب سب کو کسی نہ کسی ذی اثر شخصیت کی سرپرستی حاصل رہی۔ بسنت خاں خواجہ سرا، نواب عماد الملک۔ شجاع الدولہ، آصف الدولہ، بہادر شاہ ظفر، میر محبوب علی۔ رئیس فرخ آباد، رئیس باندہ، نواب یوسف علی خاں، نواب کلب علی خاں وغیرہ وغیرہ سب صاحب اقتدار تھے ان کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ان کی مدح و ستائش کرنے میں حق بجانب نہ تھے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ چونکہ یہ شخصی حکمران تھے وہ رزق کے مالک، اور جانوں کے حاکم خیال کئے جاتے تھے۔ ان کے سامنے کسی کو تاب نہ تھی کہ دم بھی مار سکے۔ ان کی پیشانی کی ایک ادنیٰ شکن ہزاروں انقلابوں کا موجب ہو سکتی تھی۔ بدیں وجہ شاعروں سے بھی لغزش ہو جاتی تھی۔ اور وہ مدح کرتے وقت حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے تھے۔ گو یہ بھی حقیقت ہے کہ بعد کے شعرا کے ہاں مدح نگاری کا ایک عام معیار قائم ہو گیا تھا۔ جو تھوڑے بہت رد و بدل سے سب پر چسپاں کیا جاتا تھا۔ مولانا حالی کے ایک اقتباس سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ فرماتے ہیں۔

"مدح میں اکثر ایک نام کے سوا کوئی خصوصیت ایسی مذکور نہیں ہوتی جو ممدوح کی ذات کے ساتھ مختص ہو بلکہ ایسے حاوی الفاظ میں مدح کی جاتی ہے کہ اگر بالفرض مداح اس علت میں کہ فلاں شخص کی مدح کیوں کی؟ عدالت میں ماخوذ ہو جائے تو قصیدہ میں ایسے الفاظ نہ ملے جس سے اس کا جرم ثابت ہو سکے۔ مدح میں زیادہ تر وہی محامد بیان ہوتے ہیں جو قدیم سے شعرا باندھتے چلے آئے ہیں۔ ایک خوبی کے بیان میں ایسا مبالغہ کیا جاتا ہے کہ قصیدہ کا مصداق نفس الامر میں کوئی انسان قرار نہیں پا سکتا۔ ممدوح کی طرف اکثر وہ خوبیاں منسوب کی جاتی ہیں جن کے اضداد اس کی ذات میں موجود ہوں ...... غرض کہ کوئی بات ایسی نہیں بیان کی جاتی جن پر ممدوح فخر کر سکے۔ یا جس سے لوگوں کے دل میں اس کی عظمت و محبت پیدا ہو اور اس کے محاسن و مآثر زمانے میں یادگار رہیں"۔[1]

لیکن پھر بھی یہ بات اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے کہ ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے ممدوحین مدح کے مستحق نہ تھے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے مبالغہ کیا ہے لیکن ساتھ ہی ہم یہاں یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ شاعر ایسے موقعوں پر اپنے تخیل کے تمام جوہر دکھانے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے اور مبالغہ ہماری شاعری خصوصاً قصیدہ کی جان سمجھا جاتا ہے۔ وہ مدح بالکل بے لطف اور سپاٹ خیال کی جاتی ہے جس میں مبالغہ کی چاشنی نہ ہو۔ اسی لئے ہمارے قصیدہ گو یوں نے مبالغہ آرائی میں کوئی تامل نہیں کیا۔ اس لئے "مولانا حالی کے اصلاحی معیار پر ان کی مدحیات کو جانچنا کسی طرح درست نہیں"۔[2]

بزرگان دین کی شان میں جو قصیدے تحریر کئے گئے ہیں ان میں عظمت و بزرگی۔ شرافت و نجابت، علم و حیا، فیض و برکات، اور کشف و کرامات وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔ سلاطین و امرا کے قصاید میں عدل و انصاف، شجاعت و دلیری، سخاوت و فیاضی، ہیبت و جلال، تدبیر و سیاست وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایسی خوبیاں ہیں جن کے بغیر کسی انسان اور کسی قوم کا اخلاقی پروگرام مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی مدح سے اخلاقی پستی کے سامان پیدا نہیں ہوتے بلکہ عوام کو یہ سبق ملتا ہے کہ وہ بھی اگر یہ اعلیٰ صفات اپنے اندر پیدا کریں تو وہ ایک دن اگر ملکوں کے نہیں تو دلوں کے بادشاہ اور دنیا و عقبیٰ کے حاکم ضرور بن سکتے ہیں

بزرگان دین کے اوصاف حمیدہ کا ذکر ایسے پر جوش اور خلوص آمیز الفاظ میں پڑھکر ہمارے دل میں خیال گزرتا ہے کہ اگرچہ وہ اپنے پر فتن ماحول کے باعث چاپلوسی اور خوشامد بیجا کے شکار ہوئے لیکن روز مرہ کی زندگی میں ان کا اخلاق قصیدہ گوئی سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے وہ ویسے ہی باوقار بنے رہے۔ سودا فرماتے ہیں ؎

موقر جان ارباب ہنر کو بے لباسی میں
کہ ہو جو تیغ با جوہر اسے عزت ہے عریانی

سودا کی سوانح حیات دیکھنے سے اس امر پر اچھی طرح روشنی پڑتی ہے۔ "وہ بڑے نازک مزاج اور نہایت غیور تھے ایک دن کسی بات پر شاہ عالم سے ناراض ہو گئے۔ ہر چند بادشاہ نے بلوایا نہ گئے"[3] یہی حال ان کے پاس وضعداری کا تھا۔ جب نواب شجاع الدولہ نے ان کی معذرت والی رباعی پڑھی تو انھیں اس کا بہت احساس ہوا اور وہ دوبارہ نہ گئے۔ یہاں تک کہ نواب شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ مومن بھی غیور طبع تھے۔ "انھوں نے کسی امیر کی درباری کبھی نہ کی۔ صرف ایک مرتبہ رئیس پٹیالہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا وہ بھی مدحیہ نہیں شکریہ کے طور پر یعنی ایک ہتھنی بلا طلب ان کے نذر کی۔ اس کا صلہ سخن میں دیا"۔[4] ذوق کے ذاتی اخلاق کا نمونہ یہ ہے کہ "جب ایک مرتبہ دیوان چندو لال مدار المہام حیدر آباد نے کئی ہزار روپے بھیجکر بلا بھیجا اور مصرع طرح اپنے مشاعرہ کا بھیجا، ذوق مرحوم نے زمین مذکور میں دو غزلیں کہہ کر بھیجدیں اور روپیہ نہ لیا"۔[5] مرزا غالب اپنے ایک خط میں اپنے مزاج کے متعلق خود فرماتے ہیں۔ "قلندری۔ آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ دستگاہ کہ عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں مَیں رہوں۔ اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے .... میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں"۔[6] تیر خلکوہ آبادی جس گردش اقبال کے چکر میں رہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔ امیر مینائی صاحب زہد و تقویٰ، صوفی مشرب اور منکسر المزاج بزرگ تھے۔ وہ خوشامد بیجا کی وجہ سے نہیں بلکہ "اپنی

---

[1] از یادگار غالب۔ (۲) یہ ترجیع چاند صاحب نے صرف سودا کے متعلق لکھا ہے لیکن میرے خیال میں اوروں پر بھی اس کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے (حبیب)

[3] تنقید اُردو صفحہ ۲۲۳ [4] تنقید اُردو صفحہ ۲۶۰ [5] تنقید اُردو صفحہ ۲۷۶ [6] یادگار غالب از مولانا حالی مرحوم،

وجاہت اور لیاقت وعزت کی بدولت دربار رامپور کے سب شعرا کے صدر اعظم بنے ہوئے تھے[1] اشعار ذیل سے بھی ان کے اخلاق کی وضاحت ہوتی ہے ؎

اودھر بھی دیکھ لے چشم کرم سے — چھڑا دے مجکو بھی دنیا کے غم سے
الٰہی مانگتا ہوں میں گھوڑا — الٰہی مانگتا ہوں صبر تھوڑا
بلا آئے تو دل اس سے نہ بھاگے — چلوں راہِ طلب میں سب سے آگے
عطا کر مجکو بھی ایمان کامل — مجھے بھی کر دے ان بندوں میں شامل
بشارت جن کو بیخودی کی دی ہے — کمی کیا تیرے گھر میں تو غنی ہے

داغ اپنی خوش گوئی کی بدولت مخاطب و ممتاز ہوئے۔ اور محسن کاکوروی کا کلام تو سارا مناجات سے بھرا پڑا ہے۔ چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں ؎

ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعمتیں محسن
کلام نعتیہ رکھا میری زباں کے لئے

وہ اپنے مشہور نعتیہ قصیدے میں ان چیزوں کے لئے دربار الٰہی میں دعا فرماتے ہیں ؎

دین و دنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے
صرف تیرا ہو بھروسا تری قوت تری آس

گل رعنا[2] میں ان کے متعلق تحریر ہے کہ "وہ پرانی وضعداری اور ایشیائی مروت کا بے مثل نمونہ تھے جس میں حکمت عملی، ضرورت وقت اور پالیسی کا گذر نہ تھا[3]"

غرض کہ ان متعدد مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ اُردو قصیدہ گوئی نے مداحین کے اخلاق پر روزمرہ کی زندگی میں انفرادی حیثیت سے عام طور پر خراب اثر نہیں ڈالا۔ خواہش صلہ و انعام کا پہلو ناسازگاری زمانہ کا نتیجہ ہے۔ طبائع فطری کا پروردہ نہیں۔

اسی لئے جب قصیدہ میں دعا یا بالفاظ دیگر حسن طلب کی باری آتی ہے اور اس میں شاعر اپنا مقصد بیان کرتا ہے تو اسی منزل پر بالعموم اسے لغزش کا سامنا ہوتا ہے۔ اس نے دعا کے ساتھ اپنی ذاتی اغراض کو بھی شامل کیا۔ حالانکہ ابن رشیق تو دعا کے بھی خلاف ہے وہ لکھتا ہے کہ "شعرائے باکمال کے نزدیک دعا پر قصیدہ کا خاتمہ کرنا غیر پسندیدہ ہے۔ کیونکہ یہ ضعیف لوگوں کا کام ہے۔ البتہ بادشاہوں کے لئے یہ جائز ہے کیونکہ وہ اس کو پسند کرتے ہیں" ہمارے اکثر شعرا نے اکثر قصاید بادشاہوں ہی کی مدح میں لکھے ہیں۔ اس لئے اُن کا خاتمہ دعا ہی پر ہوا ہے۔ یہاں شاعر اس قدر سحر بیانی اور افسوں کاری سے کام لیتا ہے کہ ممدوح کی طبیعت پر گراں نہ گزرے۔ اور اگر وہ بخیل بھی ہے تو کریم بن جائے اور شاعر کا دامن گوہر مراد سے بھر دے لیکن اس خودغرضی پستی طبع کے علاوہ دعا کو خلوص سے بھی معرا کر دیا ہے۔ اب ذرا ان کے حسن طلب کے نمونے دیکھئے اور زمانہ کی نیرنگی سے عبرت حاصل کیجئے۔ سودا نے لبنت خاں خواجہ سرا کے قصیدہ میں یوں لب کشائی کی ہے ؎

لیکن نہ سمجھیو یہ اس گفتگو سے ہرگز — منظور مجکو تیری ہمت کا امتحاں ہو
اس واسطے کہ مجکو اتنا ہی چاہئے ہو — جامہ ہو ایک برس میں کھانے کو نیم ناں ہو
سو تو زیادہ اس سے تیرا کرم ہے مجھ پر — کفران نعمت اوپر کا دشنہ زباں ہو
اتنا ہی آرزو ہے کچھ عمر ہو جو باقی — مصرف جہاں میں اس کا تیرے سپہ بیاں ہو
کہہ جا سکے ہے کوئی دروازے تیرے آکر — بیٹھے جو تیرے در پر وہ سنگ آستاں ہو

ذوق کا طریقہ ؎

خسروا میں جو کہوں سب ترے اوصاف نکو — تو سدا منہ سے مرے پھول جھڑیں یا گوہر
دوستوں کو ہو ترے گنج گہر روز نصیب — ہو نہ جز اشک میسر دامن اعدا کو گہر

غالب کا ڈھنگ ؎

ماہ بن ماہتاب بن میں کون — مجکو کیا بانٹ دیگا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص — گر تجھے ہے امید رحمت عام
جو کہ بخشے گا تجکو فر فروغ — کیا نہ دیگا مجھے مئے گلفام

داغ کا اظہار ؎

سرخرو داغ ہو لیں ظل کرم سے تیرے — پرتو مہر سے جس طرح سے لعل یمن

لیکن منیر اس معاملہ میں سب کے سرغنہ ہیں۔ انھوں نے تو دامنی قصیدہ کو کاسۂ گدائی بنا لیا۔ نواب باندہ کے قصیدہ میں اپنا مطلب یوں بیان کیا ہے ؎

مختصر حال سنا جیئے اب اے عرش جناب — رشتۂ طول امل اب تو ہے طول گفتار
کردیا خاک مجھے رنج تہیدستی نے — شرح کی کچھ نہیں حاجت جو کروں میں اظہار
فرصتے کو گہم بہر پرستاری دل — تنگدستی نے دیا ضیق سے بدتر آزار
قدردان شعرا محفل دنیا میں ہیں آپ — نذر لایا ہوں پرکھ لیجئے نقد اشعار
باغ امید خدا ہو بار ب سرسبز — چشم دشمن میں کھٹکتا رہے خار اوبار

نواب نصیر الدولہ کے قصیدہ میں تو یہ چیز اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے اخلاق کی پستی و زوال کا یہ عبرتناک منظر ہے ؎

[1] تذکرہ اُردو ص ۲۲۷ [2] قند اُردو ص ۲۳۳ [3] از مولانا عبدالحی صاحب،

پہنے مقدور کی اب عرفی خاقانی تکیں ‏ ‏ تذرکے اسلے اایا ہوں میں کیا گوہر

سچ ہے یا پ سخن گو کبھی سخن فہم بھی ہیں ‏ ‏ دیکھئے ان میں کوئی نہیں جوہنا گوہر

آبروئے کی خدمتیں نبھیا ہے ایسی ‏ ‏ بن گیا اختر تقدیر ہمارا گوہر

منہ مرا گوہر انعام سے ہو مالا مال ‏ ‏ گوہر فکر کے ہوں دانت مرا یا گوہر

اپنے ملاح پر اب کیجیے بخشش کی نگاہ ‏ ‏ بخشئے آج ہم فیض سے آقا گوہر

مگر یہاں یہ بات ہرگز نہ بھولنا چاہیئے کہ اس میں خود منیر کا اتنا قصور نہیں جتنا اس کے دردناک واقعات زندگی کا ہے۔ کس کو نہیں معلوم کہ وہ طرح طرح کی تکالیف کا شکار ہو کر لکھنؤ۔ کانپور۔ فرخ آباد۔ باندہ اور رامپور مارا مارا پھرتا رہا۔ کس طرح اس کو رئیس باندہ جنھوں نے حکومت برطانیہ کے خلاف بغاوت کی تھی کی ہمراہی کے جرم میں سزائے حبس دوام لعبور دریائے شور ہوئی اور انڈمان بھیجا گیا۔ پھر کیسے چھ سال بعد قید و بند کی مصیبتیں جھیل کر رہا ہوا اور پھر الہ آباد و لکھنؤ میں اپنی بدقسمتی پر ماتم کرتا ہوا رامپور پہنچا۔ اس لئے اگر منیر حد اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے تو وہ اس کے حقائق زندگی پر مبنی ہے۔ وہ مجبور تھا۔

فرشتے کو کہ کہ کتم ہیر پرستار ہیٔ دل،

شاعر مدح گو کے علاوہ معلم اخلاق کا فرض بھی انجام دیا کرتے تھے بادشاہوں کی نازک طبیعتیں نصیحت کی تلخی کی کس طرح تاب لا سکتی ہیں۔ مولوی محمد حسن صاحب کے الفاظ میں:۔

"وہ چونکہ حاکم اخلاق ہوتے ہیں اس لئے نصیحت کی تلخی کا اثر زائل کرنے کے لئے خوشگوار شربت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے ممدوح کو حاتم جمشید اور رستم سے تشبیہ دے کر شوق پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ بھی ان کی طرح کارنامے دکھلائیں جس سے ان کا نام بھی تابندہ و پائندہ رہے۔ البتہ اس سے ایک زبردست نقص واقع ہو جاتا ہے۔ امرا و سلاطین اپنی مبالغہ آمیز تعریف سن کر مغرور ظالم خود پسند اور خود رائے ہو جاتے ہیں۔ ان کی طبیعت بہت نازک ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اچھی بات بھی بری معلوم ہونے لگتی ہے۔" لہ

علاوہ ازیں آخری دور کے خصوصاً اودھ کے نواب و امرا کی عیش پرستی بھی قصاید کے اخلاقی پہلو پر اثر انداز ہوئی۔ شاعری ایک لازمۂ امارت بن چکی تھی۔ ہر امیر کے دربار میں شاعری کا ایک مخصوص صیغہ قائم ہو گیا تھا۔ جو شعرا کی معیشت و قدردانی کا اصل ذریعہ تھا تمام تر کامیابی امرا کی پسندیدگی پر موقوف رہ گئی تھی۔ اس انقلاب نے

لہ میگزین اسلامیہ ہائی سکول بریلی۔

ممدوحین کے اخلاق پر گوناگوں اثر ڈالے۔ دن رات محفل سخن و عیش و طرب گرم رہنے لگی۔ روحانی جذبات کی جگہ تعیش کے جذبات نے لے لی۔ اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے حکومت کا انتظام مصاحبوں کے ذمہ ہوا۔ ان نااہلوں نے خوب لوٹ مار مچائی۔ دشمنوں نے ان کی اس عیش پرستی سے فائدہ اٹھایا۔ سازشیں ہوئیں اور آخر کار رفتہ رفتہ سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں اور وہ خرابی پڑی کہ پھر تعمیر کی شرمندہ نہ ہوئی۔

اب ہمیں ہجویہ قصاید پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنا چاہیئے۔ اردو شاعری میں ہجو گوئی کا بس ایک ہی مرد میدان ہے۔ وہی اس کا موجد ہے اور وہی خاتم۔ اب تک اس کا کوئی مدمقابل پیدا نہیں ہوا۔ وہ مرزا سودا ہیں۔ مرزا اس کو رسماً یا خوش طبعی یا دل بہلانے کی خاطر نہیں بلکہ ضرورتاً کہا کرتے تھے۔ ان کی ہجو گوئی کے محرکات تین قسم کے ہیں۔ اوّل سوسائٹی کی معاشرتی و اخلاقی خرابیاں۔ دوم سیاسی یعنی حکومت کی بے عنوانیاں اور خامیاں، سوم افراد و اشخاص کی بیہودگیاں۔ یہ ایسے اسباب ہیں جن کو ہر ایک نیک دل اور شریف انسان ضرور محسوس کرتا ہے۔ عام طور پر ان کا مطمح نظر ہمدردی اور اصلاح ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہجویہ قصاید بھی قومی اخلاق کو اعلیٰ اور بلند بنانے کے لئے کہے گئے تھے۔ اس کی ضرورت ہر ملک اور ہر زمانہ میں محسوس کی گئی ہے۔ اس لئے جہاں انگلستان کے سوکفٹ اور اطالیہ کے جووینال کا ذکر ہوگا۔ وہاں سودا بھی بھلائے نہیں جا سکتے۔

مرزا نے جس جگہ بالکل صحیح اور سچے مرقعے کھینچے ہیں وہاں وہ اپنی ہجو گوئی کے باب میں حق بجانب اور قابل تعریف ہیں لیکن مذہبی اختلافات اور غلط فہمیوں کی بنا پر جو ہجویہ قصاید لکھے ہیں وہاں انھوں نے نہایت ہی سخت لب و لہجہ اختیار کیا ہے۔ مثلاً مولوی ساجد متوطن کٹھر کی ہجو وغیرہ۔ یہ اخلاقی معیار پر پورے نہیں اترتے اس لئے غیر مناسب ہیں۔

مگر قطع نظر ان چند قصاید کے بعض ہجویہ قصاید ایسے بھی ہیں جن میں متعدد محاسن اخلاق پائے جاتے ہیں۔ ان کو کسی انعام کا لالچ یا انتقام کا خوف حقیقت بیانی سے روک نہیں سکتا تھا۔ اور یہی آزاد اور ترقی پذیر قوموں کے افراد کا پہلا سبق ہے۔ الغرض جہاں کسی کی بے عنوانی دیکھی تو پھر بقول رام بابو سکسینہ "

ل بوھے تراشے جاتے تھے کہ جن کو دیکھ کر لوگ اپنی آنکھیں اور سُن کر اپنے کان بند کر لیا کرتے تھے۔"[۱] یہی ان کی خوبی ہے کہ انھوں نے اس مبتذل صنف کو بھی ایک باقاعدہ اور مکمل فن بنا دیا۔ مثلاً قصیدہ "تضحیک روزگار" بظاہر ایک گھوڑے کی ہجو ہے لیکن وہ ضمناً اس زمانے کے فوجی نظام کی خرابی کا مرثیہ ہے اور اس میں کنجوسی کے عیوب بھی دکھائے گئے ہیں۔ یا مثلاً قصیدہ "شہر آشوب" میں دہلی کے باشندوں اور ان کی عام معاشرتی و مالی حالات کی سچی تصویریں ہیں۔ اس میں اس زمانہ کی بیروزگاری، کس مپرسی اور افلاس و نحوست کا ذمہ دار در پردہ اعیان حکومت اور والی ملک کی نااہلی کو قرار دیا ہے اور پردے ہی پردے میں ان کی ہجو کی ہے۔ دراصل یہ سنجیدگی مگر لطافت و شگفتگی کے انداز میں عروج و انحطاط اور اقبال و زوال کی عبرت انگیز تصویریں ہیں۔ زبوں حالی کا یہ دردناک نقشہ کچھ ایسا ہے کہ کوئی بھی پڑھنے والا ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دیدۂ عبرت نگاہ کے لئے ان میں طرح طرح کے اخلاقی اور اصلاحی سبق کے ذخیرے ہیں۔

مسلّمہ امر ہے کہ امرا و سلاطین جو کچھ کرتے ہیں اچھا یا بُرا اس کا اثر عوام پر بھی ضرور پڑتا ہے۔ اوّل تو انقلاب زمانہ نے خود ہی ان کی مالی و معاشرتی حالت کو کون کون سے گھُن نہ لگا رکھے تھے کہ اب خواص کی دیکھا دیکھی وہ بھی خوشامد پسند اور عیش پرست ہو گئے دوسروں کی قصیدہ خوانی نے ان کو عضو معطل بنا دیا۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ بقول علامہ اقبال رح "فن جب اخلاقیات اور حیاتیات سے علیحدہ ہوتا ہے تو بہت جلد مخرب اخلاق بن جاتا ہے اور پھر قوم و ملت کے حق میں زہر قاتل ہو جاتا ہے۔"[۲] قوم کا ہر فرد پدرم سلطان بود کے خوشکن خیال میں مست ہو گیا۔ رعب اور اثر سب زائل ہوتا چلا گیا۔ قومی وقار کو ٹھیس پہنچ گئی جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ کیا ہو معمولی حملوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے اور ذرا سے جھٹکے میں نیچے آ رہے کیونکہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ "کوئی امیر اس وقت تک شاعروں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا جب تک کہ اسے ملکی و سیاسی معاملات کی طرف سے کامل اطمینان نہیں ہو جاتا تھا اور پوری فرصت و فراغت حصے میں نہیں آتی تھی۔"[۳]

جہاں تک اخلاقی قصاید کا تعلق ہے۔ وہ اُردو زبان میں زیادہ نہیں۔ سودا کا "شہر آشوب" اور داغ کا قصیدہ "دہلی کی تباہی" اس سلسلہ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ہمیں اور رنگ کے قصاید بھی ملتے ہیں۔ یعنی تمثیلی قصاید۔ سودا اور ذوق کے یہاں یہ اکثر موجود ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ ان کے ہر شعر میں ایک اخلاقی سبق دیا گیا ہے۔ اور اس کا ثبوت مناظر قدرت سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ سودا حضرت امام ضامن علی موسیٰ رضا شاہ خراسان کی مدح والے قصیدہ میں فرماتے ہیں ؎

ہنر کو مفلسی ہرگز ضرر نہیں کہ نہیں — چنار کو تہی دستی سے نقص جوہر کا
فادگی میں یہ عزت ہے دیکھ اے سرکش — کہ نیک و بد نے کیا نقش پا کو راہ نما
کلام شیریں پہ مت جا تو اہل دنیا کے — بنام زہر ہلاہل بھی ہوئے ہے میٹھا
بزنگ عکس سبکسار بحر دنیا میں رہ — کہ موج حوادث نہ دیوے تجھ کو بہا

اسی طرح قصیدہ در منقبت امام عسکری میں فرماتے ہیں ؎

وضع سے کم اپنی کیا ترقی کر سکے — چاہیے گر دریا ہو کب آ گرہ میں غنچہ کا
غش بہم پہنچا نہ محروم تجلی دل کو رکھ — صیقل بس آئینہ کی گرد شکست رنگ ہے
مرد وہ اپنی ہنر پوشی سے جو ہوے ہر دم — فی الحقیقت تیغ کو جوہر سے بہتر زنگ ہے
اپنے بھی مرہون منت ہوں عالی ہمت — کوہ کی شمشیر کو کب احتیاج سنگ ہے
ٹک پرے رکھنا قدم اس آستاں سے گر دیا — خاکساری کو ہماری سرکشی سے ننگ ہے

اس لحاظ سے ہم ان پر جس قدر بھی فخر کریں وہ کم ہے۔ یہ دراصل اُردو قصیدہ گوئی کے اخلاقی پہلو میں چار چاند ہیں۔

بہر حال اس تفصیلی بحث سے اب یہ ظاہر ہو گیا کہ اُردو قصیدہ گوئی بھی اخلاقی میدان میں دیگر اصناف سخن سے پیچھے نہیں رہی یہ صحیح ہے کہ اس سے خوشامد اور چاپلوسی کے جذبہ کو تقویت پہنچی اس نے غلامانہ ذہنیت کو پیدا ہونے سے نہ روکا۔ شاعری کی روحانی لطافت کو درباروں کے مادی تکلفات سے نہ بچایا۔ بے لوث خدمت ادب کی بجائے صلہ و انعام کا وسیلہ بننے میں نہ حائل ہوا لیکن یہ بھی تو صحیح ہے کہ وہ زمانہ آرام و چین کا زمانہ نہ تھا۔ سکون و اطمینان کا زمانہ نہ تھا۔ ہر طرف انقلاب و بے ثباتی کی گھٹائیں چھائی تھیں۔ ہر جگہ خوف اور دہشت کی حکومت تھی۔ پھر وہ زمانہ اُردو زبان کے لئے ایک عبوری دور تھا۔ اور ہر عبوری دور میں طرح طرح کی لغزشوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اُردو شاعری کے

---

[۱] ہسٹری آف اردو لٹریچر ترجمہ مرزا محمد عسکری بی اے [۲] رسالہ معارف اکتوبر ۱۹۴۲ء [۳] سودا از چا

فکر کو اس سیاسی و معاشری بھونچال میں متحرک رکھنے کے لئے ضروریات زندگی کی طرف سے مطمئن ہو جانا سخت ضروری تھا کیونکہ ادب کی خدمت آج تک کبھی ننگے اور بھوکے لوگوں سے نہیں ہو سکی مدح گوئی میں بے راہ روی کے لئے بڑا میدان تھا۔ اس زبردست آزمائش کا مقابلہ کرنا ان افلاس زدہ شاعروں کے لئے ناممکن تھا علاوہ ازیں اس زمانہ میں اردو شاعری فقرا و صوفیہ کی خانقاہوں اور گوشہ نشینی سے نکل کر پہلی مرتبہ میدان میں آئی تھی۔ آزادی اور وسعت پا کر اگر وہ کچھ عرصہ کے لئے رنگ سے بے رنگ ہوئی تو کون سی حیرت ہے۔ انگریزی جیسی زبان کو بھی جسے تمام دنیا کی مشترکہ زبان (لنگوا فرنکا) ہونے کا دعویٰ ہے تو ایک ایسے ہی وقت سے گذرنا پڑا یہ انگلستان کے منسٹرل (شاعر بربط نواز) اور پوئٹ لاریٹ (شاہی شاعر) کیا ہیں؟ [1] اس لئے ہم قدرتاً اس نتیجہ پر پہنچنے کیلئے مجبور ہیں کہ اردو قصائد نے بے التفاتی اور اغماض و تغافل کے سیلاب میں بہتے ہوئے اور سلطنت کے بجھتے ہوئے چراغ کی ظلمت میں ٹکو کریں کھاتے ہوئے محاسن اخلاق کی تبلیغ میں جو حصہ لیا وہ اس کے دائرہ عمل، کم مائگی اور حوصلہ سے اگر زیادہ نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں ہے۔

---

[1] بشپ پرسی (Bishop Percy) نے ان کے متعلق لکھا ہے "پرانے زمانے میں ایک شاعر بربط نواز کی حیثیت ایک باعزت شخص کی تھی۔ وہ محض مطرب ہی نہیں بلکہ گانے نظم کرنے والا ایک شاعر بھی تھا جن کو وہ اپنے بربط پر بجاتا تھا اور یہ بعد کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ان کو ایک آوارہ، بدمعاش اور سستے بھکاریوں کی جماعت قرار دیا گیا ان نظموں میں بہادری اور دلیری کے واقعات بیان کئے جاتے تھے ان کو انگریزی ادب میں بیلڈ (Ballad) کہتے ہیں اور یہ انگریزی شاعری کی ایک مشہور صنف ہے سر والٹر سکاٹ نے بھی اسی عنوان کے اپنے مشہور بیلڈ میں لکھا ہے کہ "ان کو کسانوں اور گاؤں والوں کے لئے نظم نہیں کیا گیا تھا بلکہ عالی مرتبہ بیگمات اور نواب و امرا کی خاطر یہ لکھے گئے تھے۔"

محسوسات!

از جناب محمد عبدالہادی خاں ہادی امان آبادی

محبت میں نرالی زندگی محسوس کرتا ہوں
کہ اب میں بیخودی ہی بیخودی محسوس کرتا ہوں

ضیائے حسن جاناں میری آنکھوں سے کوئی دیکھے
ہر اک شے میں نئی تابندگی محسوس کرتا ہوں

خدا رکھے محبت کو کہ دل آباد رہتا ہے
ہمیشہ اک نہ اک حسرت نئی محسوس کرتا ہوں

بدل ڈالا کچھ ایسا عشق نے نقشہ مرے دل کا
نئی دنیا، نرالی زندگی محسوس کرتا ہوں

نگاہِ اولیں کا واسطہ پھر مجھکو تڑپا دے
کہ میں بیتابیٔ دل میں کمی محسوس کرتا ہوں

کہوں کیا ہمنفس جانسوزیاں عشق و محبت کی
دل بیتاب میں اک آگ سی محسوس کرتا ہوں

مجھے جب دیکھ لیتے ہیں وہ دزدیدہ نگاہوں سے
متاع زیست میں لٹتی ہوئی محسوس کرتا ہوں

طبیعت ہو گئی اب اس قدر غم دوست اے ہادی
کہ میں ہر حال میں آسودگی محسوس کرتا ہوں

قبرستان میں لیڈی ڈاکٹر

(ایک یونانی طبیب کے قلم سے)

وہ قبرستان میں نہایت تیزی کیساتھ دوڑتی پھر رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت نوٹ بک اور پنسل تھی۔ ہر قبر پر جاتی۔ سرہانے لگے ہوئے پتھر کو غور سے پڑھتی تھی۔ اور اس کے بعد اپنی نوٹ بک میں کچھ یاداشت لکھ لیتی تھی۔ میں یہ دیکھکر حیران رہ گیا۔ آخر وہ چاہتی کیا ہے مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے کی ضرورت تھی۔ مگر مَیں بہت دیر تک اس کی حیرت انگیز حرکتیں کھڑا دیکھتا رہا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکی۔ اور قبرستان کے دروازہ کیطرف جانے لگی۔ تو مَیں یکایک اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ معاف کیجیے گا ڈاکٹرنی صاحبہ! آپ آج کس الجھن میں ہیں۔ اور یہ کیا کر رہی ہیں اس نے اپنی نیلی نیلی آنکھیں میرے چہرے پر جما دیں میں نے غور سے دیکھا۔ تو اسکی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ وہ کچھ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ کیا بتاؤں حکیم صاحب مَیں کیا دیکھ رہی تھی میں یہ دیکھ رہی تھی۔ کہ اس پورے قبرستان میں عورتوں کی قبریں زیادہ ہیں۔ اور بچوں کی قبریں بھی بہت ہیں۔ لیکن مردوں کی کم ہیں۔ مجھے بہت دن سے یہ معلوم کرنے کی جستجو ہے کہ آخر ہم غریب عورتوں سے موت کو ایسی کیا دشمنی ہے کہ اس کا ہاتھ سب سے زیادہ ہمیں پر پڑتا ہے۔ اور جب ہماری طرف سے نظر بچاتی ہے تو ہمارے کلیجے کے ٹکڑوں کو ہمیشہ کیلئے سلا دیتی ہے۔ آخر اسکی وجہ کیا ہے کیا مردوں نے اس چڑیل کو رشوت دیدی ہے مردوں کی گردن پر اس کا ہاتھ کیوں نہیں جاتا۔

اس نے یہ دردناک گفتگو کچھ ایسے غم انگیز لہجہ میں کی۔ کہ میرا دل ہل گیا۔ مَیں نے کہا میڈم! آپ کا خیال ٹھیک ہے موت عورتوں سے زیادہ محبت کرنے لگی ہے۔ مگر اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آج کل ہمارے ہندوستان کی عورتیں گذشتہ زمانے کی عورتوں سے کہیں زیادہ نازک ہو گئی ہیں۔ اور چونکہ ہمارے ملک کی آب ہوا میں بہت کچھ خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کے علاوہ عورتیں کچھ غذاؤں میں بدپرہیزی کرتی ہیں۔ تو انہیں طرح طرح کی بیماریاں ہو جاتی ہیں۔ اور جب وہ بیمار ہو جاتی ہیں تو اپنے مردوں سے اس کا تذکرہ تک نہیں کرتیں۔ اور کہتی ہیں۔ کہ ہم اپنی بیماریوں کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ چنانچہ انجام کار اس کا نتیجہ وہ خود بھی بھگتنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اور اپنے مردوں کو بھی مشکلات میں پھنسا دیتی ہیں۔ مجھے خوب معلوم ہے۔ کہ آجکل ہندوستانی عورتیں زیادہ تر لیکوریا یعنی سیلانی کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ اسے بعض لوگ سفید بیماری بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ جب عورت سیلان الرحم کی مریض ہو جاتی ہے تو اسکے خفیہ بدن سے ایک سفید رنگ کی لیسدار اور بدبودار رطوبت مسلسل خارج ہوا کرتی ہے۔ اور اگر اسکا کوئی علاج نہ کیا جائے تو عورت کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اگر یہ عورتیں اس خطرناک بیماری میں مبتلا ہوتے ہی کسی ذریعہ سے اپنے گھر کے مرد کو اس کی اطلاع کر دیا کر دیں تو پھر رونا ہی کس بات کا ہے۔ اور اگر انہیں شرم آتی ہے تو

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ اے۔ بی ۱۳۳ دہلی کو خود خط لکھ کر دوا" روک" کی ایک شیشی منگا کر استعمال کر لیا کریں۔ مجھے یقین ہے۔ کہ دوا" **روک**" سے سیلان الرحم جیسے خطرناک مرض کو بہت جلد آرام ہو جاتا ہے۔ اور عورت بالکل تندرست ہو جاتی ہے۔ اور سفید رطوبت پھر خروج نہیں ہوتی۔ مگر افسوس تو یہ ہے۔ کہ سیلان الرحم کی مریض عورت اپنے مرض کی وجہ سے دن بھر اداس رہتی ہے۔ کمزور ہو جاتی ہے۔ اس کے ناف تلووں میں یا تو جلن ہونے لگتا ہے۔ یا ہر مہینے خاص دنوں میں سخت درد ہوتا ہے۔ اور بیچاری منہ لپیٹ کر کسی تنہا کمرے میں پڑی رہتی ہے کسی سے ذکر تک نہیں کرتی۔ کاش ان نادان عورتوں سے کوئی کہہ دے۔ کہ زنانہ دواخانہ کی مشہور دوا" روک" کو استعمال کرکے سیلان الرحم کی مصیبتوں سے نجات پالیں۔ مَیں تصدیق کرتا ہوں کہ دوا" روک" سیلان الرحم کی بہترین دوائی ہے ایک شیشی کی قیمت تین روپے ہے۔ اور اس پر ساڑھے آنے محصول پارسل کے خرچ ہوتے ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر میری یہ بات سنکر قبرستان سے چلی گئی۔ اور گھر پہنچ کر تمام اخبارات میں اعلان کر دیا کہ دوا" روک" سیلان الرحم کی بے مثال دوا ہے۔

ٹیلیفون نمبر ۱۲۶۵

جنوری سنہ ۱۹۳۴ء کی بات

جب میں باپ نہیں تھا

ایک ناسمجھ ہندوستانی کی سبق آموز آپ بیتی

میری شادی کو گیارہ سال ہو چکے ہیں۔ لیکن بہت عرصہ تک ...... میں یہ احساس نہیں کر سکا کہ شادی شدہ لوگ کیونکر خوش رہ سکتے ہیں۔ شادی کیوں ہوتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے میرے دوست جب اپنی بیوی کے قصے مجھے سنایا کرتے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میرے دل کو مسل کر سینے سے باہر نکال دیا ہے۔ اور اس کی جگہ انگیٹھی میں آگ بھر کر رکھ دی ہے۔ بہت دن کے بعد میرے ایک خاص دوست کو میری خفیہ بیماری کا پتہ چل گیا۔ اس نے پوچھا۔

کیا تمہیں جریان کی بیماری ہے۔ میں نے کہا نہیں لیکن پھر اس نے کہا کیا پیشاب سے پہلے اور اس کے بعد کوئی رطوبت خارج ہوتی ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے خاص بات پوچھی میں نے کہا میں یہ بات جانتا تو ضرور ہوں کہ ایسا ہوتا ہے لیکن آج تک ......

میرا یہ جواب سنکر وہ چونک اٹھا۔ اور تعجب سے کہا کہ تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔ اگر اسی زمانے میں بتا دیتے۔ جب تمہاری شادی ہوئی تھی کہ تم جریان کے مریض ہو تو میں تمہیں صرف پندرہ دن میں تندرست کر دیتا چنانچہ میرے دوست نے اسی وقت زنانہ دواخانہ کو خط لکھ کر جوہر اعظم دوا کی ایک شیشی تین روپے آٹھ آنے کو منگائی۔ اور مجھے استعمال کیلئے دی میں نے ترکیب کے مطابق اس دوا کا استعمال شروع کر دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ دوا شروع کرنے کے ساتویں یا شاید آٹھویں دن پیشاب کے وقت وہ رطوبت خارج ہونی بند ہو گئی۔ اور مجھے اپنے اندر ایک خاص بات محسوس ہوئی دوا ابھی پوری ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک روز......

...... بیوی

جنوری سنہ ۱۹۳۶ء کی بات

اپنے دوست کی مہربانی کی بدولت اب میں

اس جوانی کی ہری بھری دنیا میں ایک ایسے خوش و خرم نوجوان کی طرح ہوں جیسے کہ مجھ جیسی عمر کے انسان کو ہونا چاہیئے۔ میری بیوی ایک بچہ کی ماں ہے۔ اور وہ جب اپنے بچے کو کھلاتی ہے۔ اور بچہ ہمک ہمک کر ماں کی طرف دوڑتا ہے اور ماں کے سر کے بال نوچتا ہے تو مجھے یہ بات یاد آتی ہے کہ اس بچے کے باپ کا نام "جوہر اعظم" ہے۔ کیونکہ "جوہر اعظم" دوا سے ہی میری جریان کی بیماری دور ہوئی اور میری خفیہ طاقت پھر مجھے مل گئی۔ کاش جریان کے تمام مریضوں کو معلوم ہو جائے۔ کہ اس دنیا میں جریان کی اگر کوئی بھرپور دوا ہو سکتی ہے تو وہ جوہر اعظم ہے۔ ایک شیشی کی قیمت صرف تین روپے آٹھ آنے ہے۔ اس دوا پر عام فائدے کے خیال سے محصول ڈاک معاف ہے۔

پس ناظرین میں سے جو لوگ میری طرح جریان کی بیماری میں مبتلا ہوں۔ اور پیشاب سے پہلے یا بعد میں قوت مردی پانی کی طرح بہہ جاتی ہو یا رات کو سوتے میں ناپاکی ہو جاتی ہو یا بعض وقت...... شرمندگی ہوتی ہو تو انہیں چاہیئے کہ

مینجر زنانہ دواخانہ ۔ اے بی ۳۴ دہلی کو خط لکھ کر جوہر اعظم دوا کی شیشی بذریعہ وی پی پارسل منگالیں۔ صرف ایک ہی شیشی تندرست بنا دے گی "جوہر اعظم" وہی مشہور دوا ہے جسے سنہ ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا کا مریڈ سوسائٹی نے کافی تجربہ کر کے عام اعلان کے ذریعہ پبلک کو مطلع کیا تھا کہ "جوہر اعظم" دوا جریان کے مریض کو یقیناً تندرست کرتی ہے۔ اور تمام ملک سے پرزور اپیل کی تھی کہ جریان کے مریضوں کو اس دوا سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہیئے کیونکہ آل انڈیا کامریڈ سوسائٹی نے جوہر اعظم کا بہت کافی تجربہ کرایا ہے۔ اور ہر جگہ ہر مریض کو اس دوا نے تندرست کر دیا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء سے آج تک انجمن مذکور کی ہدایت کے مطابق اس دوا پر محصول ڈاک معاف ہے۔ اور کسی خریدار سے محصول پارسل نہیں لیا جاتا۔ صرف دوا کی قیمت لی جاتی ہے۔

ٹیلیفون نمبر ۶۲۶۴

سورج گرہن

نظم

از جناب تخشب جارچوی

ہو رہا ہے یہ نظامِ شمس میں کیا انقلاب — آج مشرق ہی میں ڈوبا جا رہا ہے آفتاب

چھا گئی پژمردگی ایسی در و دیوار پر — ہچکچانے میں جیسے نازک وقت اک بیمار پر

روشنی کم ہو چلی نظارے گھبرانے لگے — آج دن میں خلق کو تارے نظر آنے لگے

ڈوبا جاتا ہے نظر کے سامنے گردوں کا دل — آرزوئیں بے سر و پا ہیں نگاہیں مضمحل

گھٹتا جاتا ہے سحر کے وقت قرصِ آفتاب — بے ثباتی کا معمہ ہو رہا ہے بے نقاب

اب نظامِ چرخِ کج رفتار برہم ہو گیا — یک بیک دنیا کا کاروبار مدھم ہو گیا

امتحاں کا وقت ہے سورج گہن میں آ گیا — دونوں عالم کی فضاؤں پر دھندلکا چھا گیا

سازِ فطرت نے نوازِ نغمۂ خاموش ہے — حیرتوں کا نقشِ لوحِ دل سے ہم آغوش ہے

زندگی میں ایک ایسا دور آتا ہے ضرور — بارِ غم سے جب سکوں کا ٹوٹ جاتا ہے غرور

مشکلیں زیور ہیں حسنِ زندگانی کیلئے — رنج و غم غازہ ہیں روئے شادمانی کیلئے

وقت کی گرمی گلا دیتی ہے لوہا آس کا — آرزو کے خون سے رنگیں ہے پیکر یاس کا

سازِ اطمینان سے آتی ہے ماتم کی صدا — ایک رخ پر رہ نہیں سکتی زمانے کی ہوا

وقت کی تلوار کا ہر زخم کھانا چاہیئے
مرد کو دشواریوں میں مسکرانا چاہیئے

ہار جیت

ایک ایکٹ کا ڈراما

جناب محی الدین احمد ہوش فتحپوری

کردار

اَمر ...	...	... شہر میں پڑھنے والا ایک نوجوان
راجو ...	...	... گاؤں کا ایک نوجوان کاشتکار
موہن ..	..	... گاؤں کا ایک ادھیڑ عمر کاشتکار، روپا کا باپ
زمیندر ناتھ	...	... گاؤں کا ایک زمیندار - اَمر کا باپ
روپا ...	...	... گاؤں کی ایک نوجوان لڑکی - موہن کی بیٹی

زمانہ :- ۱۹۴۱ء　　موقع : یو-پی کا ایک اوسط درجہ کا گاؤں

پہلا منظر

وقت :- شام کا جھٹپٹا،

منظر :- ندی کے کنارے کے سرسبز کھیت،

(ندی کی روانی سکوت اختیار کرتی جاتی ہے - ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکوں سے گیہوں کی بالیاں ہل رہی ہیں - سرسوں کے پیلے پیلے پھول ماحول پر چھائے جا رہے ہیں - بور سے لدے ہوئے آم کے پیڑوں کی پتیاں خاموش ہوتی جا رہی ہیں — دور آم کی خمیدہ ڈال پر گڈریا بنسری کی دھیمی دھیمی صدا میں ڈوبا ہوا ہے - نیم سبز گھاس پر گائیں سر جھکائے ہوئے ہیں - دکھن کی جانب روپا - دور افق میں غایب ہونے والے سورج کو دیکھ رہی ہے - یکایک وائلن کی تیز آواز فضا میں بتدریج بلند ہوتی ہے - بنسری کا نغمہ وائلن کی گونج میں دب جاتا ہے - اَمر سرسوں کے پیلے کھیت میں ظاہر ہوتا ہے - روپا آواز کی طرف نظر اٹھاتی ہے - پھر چاروں طرف دیکھ کر امر کی طرف بڑھتی ہے -)

روپا :- یہ کیا ہے اَمر بابو؟ اچھے ہو نا؟ کب آئے - تم مجھ سے ملنے بھی نہیں ۔ بھول گئے کیا؟ ہاں ٹھیک تو ہے، شہر جا کر آخر لوگ بدل ہی تو جاتے ہیں - (ہجوم شوق میں یہ تمام سوالات بیک وقت کرتی ہے)

اَمر :- (ہاتھ روک کر) اُف! میں تو گھبرا گیا روپا! تم نے تو سوالوں کی بوچھار کر دی - اچھا تو سنو، یہ وائلن ہے وائلن!

روپا :- آں - وائلن - یہ کیا ہوتا ہے بابو؟

اَمر :- میری روپا یہ بھی ہوتا ہے کچھ! جیسے (وائلن بجا کر خاموش ہو جاتا ہے)

روپا :- بابو - تم نے میری باتوں کا جواب نہ دیا -

اَمر :- کیوں نہیں روپا - میں بہت اچھا ہوں - آج دوپہر کو آیا ملنے کی بھی خوب کہی - میرا مطلب یہ ہے کہ میں حضور کے سامنے ہی کھڑا ہوں - (نیم نگاہی سے روپا کو دیکھتا ہے - روپا جھینپ جاتی ہے)

روپا :- تم بڑے "وہ" ہو بابو!

اَمر :- میری روپا! گیت سناؤں تجھے؟

روپا :- (اثبات میں سر ہلا کر) ہاں (امر گاتا ہے) گانا

بچھ کے اندھے کونے میں سورج بیٹھا جاتا ہے۔
آج کا دن بھی یونہی سجنی خالی بیتا جاتا ہے۔
ہائے یہ من کی چوٹ
درد کا یہ سنسار
آشا تھی میں چھیڑ سکوں گا من کے ٹوٹے تار
گیت جان میں تڑپ رہے ہیں کاش میں تم کو سناؤں۔
لٹ گئی میری ساری پونجی بیٹھا ہوں من مار
ہائے کسی سے آس نہیں کچھ کیسے پہنچوں پار —"

(انگلیوں سے آنکھیں صاف کرکے) تیری بھی آنکھیں بھیگ گئیں روپا!
اس نے گیت ہی ایسا چھیڑا تھا بابو! بھلا وہ دل کتنا دکھی ہوگا
جس سے یہ گیت نکلا ہے۔ سامنے کی ندی ہمیشہ بہتی رہتی ہے
جہاں سے نکلی ہے وہاں کتنا پانی ہوگا؟

امر - ہاں روپا! دور سے تاپنے پر تو جھلسے جا رہے ہیں۔ وہ جگہ کیسی ہوگی جہاں یہ آگ جل رہی ہے؟

روپا - گیت کس کا تھا بابو۔ ہوگا کوئی درد کا مارا؟

امر - اور اگر میرا ہی ہو روپا؟

روپا - آپ کو دُنیا چاہئے۔ میری جان کے بدلے آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل سکتی ہے؟ میں تیار ہوں۔

امر - روپا! (گلوگیر آواز میں) میری روپا۔ (پردہ)

دوسرا منظر

منظر:- موہن کا چوپال،

وقت:- دوپہر،

(چوپال میں ایک طرف کربی بھری ہوئی ہے۔ اور دوسری طرف گوبر کے "اُپلے"۔ چوپال کے درمیان الاؤ بنا ہوا ہے۔ جس میں راکھ بھری ہوئی ہے۔ راکھ میں ایک اُپلا گھسا ہوا دھواں دے رہا ہے، پاس ہی تمباکو کا ڈبہ، ایک چلم، دیوار سے لگا ہوا نریل (دیہاتی حقہ) اور پی ہوئی تمباکو کا بہت سا گُل پڑا ہوا ہے۔ چوپال کے سامنے تھوہنے کے درخت تلے چرہی میں بندھے ہوئے بیل چارہ کھاتے کھاتے ایک آدھ بار ٹن ٹن گھنٹی بجا دیتے ہیں۔ راجو تیل سے بھیگی دھوتی باندھے گھٹنے سر پر تیل کی چمک۔ ہاتھ میں سر سے اونچا لٹھ۔ چیک بنیائن پہ ستارے جڑی واسکٹ پہنے۔ جوتوں کی تال پر گنگناتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ "دردیا ہار نہ جانی مہاراجہ!")

راجو - کاکا۔ ارے موہن کاکا۔ (روپا دروازے سے نکلتی ہے)

روپا - کھیتوں پہ ہیں۔ آتے ہی ہونگے۔ (چلی جاتی ہے)

راجو - آہا! — روپا رانی! (جیسے منہ میں پانی بھر آیا ہو) دردیا ہار نہ جانی مہاراجہ! (چلم بھر کر پیتا ہے) (موہن داخل ہوتا ہے)

موہن - ارے راجو! مزے میں!

راجو - دَیا ہے سب کاکا!

موہن - کیسے چلے آئے؟

راجو - سوچا کاکا سے ملتا آؤں۔ ویسے ہی کئی دن سے دیکھا نہ تھا تم تو جانتے ہی ہوگے کاکا! میرا کوئی نہیں۔ میرا مطلب ہے ....

موہن - ہاں۔ کیا راجو؟

راجو - یہی آخر۔ آں (تامل) بات یوں ہے کہ ....

موہن - ہاں ہاں، کہو نا آخر

راجو - کاکا گھر کی شوبھا استری سے ہوتی ہے۔ اور میں۔ میرا مطلب ہے کہ آخر میں کب تک بیٹھا رہوں۔ بُرا نہ ماننا کاکا یہی بات میں نے روپا سے بھی کہی تھی۔

موہن - ہاں ہاں پھر!

راجو - پھر ——؟ پھر اس نے کہا ٹھیک تو ہے۔ گھر کی شوبھا عورت سے ہوتی ہے۔ چاہے وہ ماں ہو یا بہن۔ کہو تو میں تمھاری بہن۔

موہن - بات تو کچھ ٹھیک ہی ہے۔

راجو - لیکن کاکا۔ مجھے اس سے پریم ....

موہن - بس راجو!

راجو - لیکن میں کاکا!

موہن - راجو تمھارے کھیت "بنجر" ہیں۔ انھیں زرخیز بنانے کی کوشش کرو۔ قسمت میں تو "شعلے" لیکر آئے ہو اور امید سکون کی باندھتے ہو۔ گھر کی سوبھا کی فکر اگلے جنم میں کرنا۔

راجو - کاکا۔ (غصے سے چہرہ تمتما اٹھتا ہے)

موہن - شانتی۔ شانتی! راجو یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ تم بھی ... دشمن ہو جاؤگے۔

راجو - میں جاتا ہوں کاکا۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ آندھیاں گھری ہوتی ہیں بجلیاں تڑپ رہی ہیں۔ اور پھر تمھارے یہ کھلیان۔ ہو سکتا ہے کہ راکھ ڈھیر ہو جائیں۔ جب امر تمھاری ساری پونجی لوٹ لے جائے تو میرے پاس آنا۔ یہ سہانے سپنے بہت جلد سور گباش ہو جائیں گے۔ کاکا! میں بجھی ہوئی راکھ سہی! لیکن کبھی تم نے میرے من کی سوئی ہوئی چنگاری بھی دیکھی ہے؟ تم مجھے تنکا سمجھتے ہو۔ سمجھو۔ لیکن امر تیز بھاگنے والا موٹر ہے کہ آگے اجالا اور پیچھے گرد۔

موہن - راجو... (اور پھر غصہ کی وجہ سے ایک لفظ بھی آگے نہیں نکل سکتا) (پردہ)

تیسرا منظر

منظر:- ندی کا کنارا۔

وقت:۔ سورج ڈوبنے سے کچھ ہی پہلے۔

(منظر قریب قریب وہی ہے جو پہلے سین میں تھا۔ ندی کی لہریں سکون کی گود میں سوئی جا رہی ہیں۔ سامنے ایک بگلا پانی میں بیٹھا مچھلی کے انتظار میں اونگھ رہا ہے۔ دھارے میں بہتے ہوئے پھول در پتیاں ناچ ناچ کر کنارے لگی جا رہی ہیں۔ آفتاب کی سنہری کرنیں لہروں کو آخری سلام کر رہی ہیں۔ روپا اور امر ندی کے پانی سے کھیل کھیل کر باتیں کر رہے ہیں)

روپا۔ میں جب سے پیدا ہوئی برابر ندی کے پانی کو دیکھ رہی ہوں۔ بہتا چلا جا رہا ہے۔ اسی۔ پانی کو دیکھتے دیکھتے میری ماں کی جوانی ختم ہو گئی۔ اور پھر کون جانے کب سے بہتا جا رہا ہے۔ صرف ساگر سے ملنے کی آرزو میں۔

امر۔ ہاں روپا۔ ہوا کے خاموش گیتوں کو سنو۔ یہ بھی تو اسی دیس سے آتے ہیں جہاں پریم ہی پریم ہے۔ جہاں پانی کی ایک ایک بوند میں ساگر کا پھیلاؤ ہے۔ جہاں ہم اور تم کا کوئی سوال نہیں جہاں وقت کا تیز دھارا چکر کھا کر رک جاتا ہے۔

روپا۔ بابو تم تو بعض وقت بالکل تم نہیں معلوم ہوتے۔ بھلا اتنی بھاری بھاری باتیں میں کیسے سمجھ سکتی ہوں۔ ایک بوند اور ساگر کا پھیلاؤ —— وقت کا تیز دھارا۔

امر۔ روپا جب تم میرے پاس ہوتی ہو تو میں اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ مجھے تم میں روشنی نظر آتی ہے جس کے سامنے میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ پھر میں 'میں' نہیں رہتا۔ جیسے نامعلوم بلندیوں پر اڑا جا رہا ہوں۔ (مور بولتا ہے می اوں می اوں)

روپا۔ سورج پچھم میں بیٹھا جا رہا ہے۔ چڑیوں کے چہچہے کے ساتھ ایک گیت سنا دو بابو۔ دن کے بعد رات آتی ہے اور یہ اندھیرا میری آتما پر چھایا جا رہا ہے۔ اور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے بابو کہ آج کی رات شاید کبھی ختم نہ ہو گی۔

امر۔ عورت کا دل کمزور ہوتا ہے۔ تم ہی ہر ہر لہر پر لرزنے لگیں۔ ایسا نہیں کہتے۔ ہر رات کے بعد دن ہر اندھیرے کے بعد اجالا آتا ہے۔ آؤ میں تمہیں گیت سناؤں۔ (گاتا ہے)

سورج کو پچھم میں جانے دو۔ ہو جانے دو اندھیرا
آشاؤں کا دیپ جلا لیں رات ابھی بن جائے سویرا
آشا کا پتوار اٹھا لو —— چھوڑ دو جیون ناؤ!
سنگنی ——
چھوڑ دو جیون ناؤ۔
پار بسے سنسار سنہرا۔

(جب نغمہ شباب پر آتا ہے تو وائلن کا تار ٹوٹ جاتا ہے)

امر۔ روپا ——

روپا۔ بابو —— (دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جاتے ہیں) ندی میں طوفان آ رہا ہے بابو۔ لہریں کہیں ہم دونوں کو جدا نہ کر دیں۔ طوفان، طوفان۔

روپا۔ روپا —— روپا —— (پردہ)

چوتھا منظر

وقت:۔ ابتدائی رات۔

منظر:۔ امر کا کمرہ

(ایک طرف ایک چھوٹی سی میز کے سامنے دو کرسیاں کتابوں کی ایک مختصر سی الماری۔ الماری کے اوپر ٹک ٹک کرتا ہوا گھڑی ایک گراموفون۔ ٹوٹا ہوا وائلن۔ دریچے کے پردے ہلکی ہلکی ہوا سے ہل رہے ہیں۔ کمرہ کی خاموشی میں امر ٹہل رہا ہے)

امر۔ روپا کا باپ اتنا روپیہ نہیں دے سکتا۔ وہ ایک کاشتکار سے زیادہ نہیں۔ ٹھیک تو ہے۔ (دریچہ کھول کر فضا میں جھانکتا ہے۔ شہنائی کی تیز آواز آتی ہے) یہ آواز یہاں کیوں آ رہی ہے۔ روکو؟ روکو اسے۔ (دریچہ بند کر دیتا ہے) آج پورنماشی ہے۔ آج روپا راجو کی ہو جائے گی۔ میری روپا (وائلن پر نظر پڑتی ہے) اُف! یہ پھر دکھائی دیا مجھے۔ "ٹوٹے ہوئے تار" (وائلن کو زمین پر پٹک دیتا ہے) میرے ساز کے تار ٹوٹ گئے۔ آہ میرا پریم!

(نریندر ناتھ گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

نریندر۔ امر —— بیٹا!

امر۔ وہ ناؤ جو لہروں پر اڑی جا رہی تھی آخر ڈوب گئی۔

نریندر۔ بیٹا! ——

امر۔ مجھے برباد کر کے آنسو بہا رہے ہیں آپ؟ میں چلا جا رہا تھا۔ میری راہ صاف تھی۔ آپ نے درمیان میں پہاڑ کھڑے کر دیئے۔ میرے بھرے ہوئے زخموں کو کرید کرید کر ناسور بنا دیا! اب آپ آنسو بہاتے ہیں۔

نریندر۔ بیٹا میں نے جو کچھ کیا تیری بھلائی کے لئے کیا۔ ذرا سوچو،

کوئی باپ اپنے بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا چاہتا ہے؟ کیا میں تیرے گلے پر چھری پھیر سکتا ہوں؟

امر۔ پتا جی ——!

نرنیدر۔ بیٹا —— امر ——!

امر۔ ابھی وقت ہے۔ مجھے اجازت دیجئے۔ میرے لئے نہیں تو اُس کے لئے۔ میں اسے ابھی بچا سکتا ہوں۔ ابھی بارات آنے میں دیر ہے۔ وہ راجو کے ساتھ کیسے سکھی رہ سکتی ہے۔ میں اسے بچاؤں گا وہ میری ہے۔ روپا —— روپا ——!

نرنیدر۔ امر —— ہوش میں آؤ۔ جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ ایشور کی مرضی ہی یہی ہے۔ تم اس میں دخل نہیں دے سکتے۔ وہ تمہارے لئے دولت نہیں لا سکتی۔

امر۔ میرے لئے وہی ہزاروں خزانوں سے بہتر ہے —— پتا جی میں مر جاؤں گا۔

نرنیدر۔ خاموش! میں تمہارا —— ہوں۔ میرا حکم تمہارے لئے فرض ہے۔ بولو فرض اٹل ہے یا محبت؟

امر۔ فرض پتا جی!

نرنیدر۔ تو جاؤ اپنے کاروبار میں لگ جاؤ اور اس وقت کے منتظر رہو جب روپا کی یاد بھی تمہارے دل سے نکل جائے۔

(نرنیدر چلا جاتا ہے)

امر۔ فرض اٹل ہے۔ (کلاک ٹن ٹن نو بجاتا ہے) نو ——! ابھی وقت ہے —— گاڑی نو منٹ پر آتی ہے۔

——— (پردہ) ———

ادغامِ غم

غمِ دنیا بھی تیرے غم میں مدغم ہوتا جاتا ہے!

از جناب سید امین گیلانی

تعجب ہے نظامِ دہر برہم ہوتا جاتا ہے
کہ آدم ہی یہاں معبودِ آدم ہوتا جاتا ہے

تمہارے عشق میں اپنا یہ عالم ہوتا جاتا ہے
غمِ دنیا بھی تیرے غم میں مدغم ہوتا جاتا ہے

شبِ آخر ہے وہ آئے نہیں دل کی یہ حالت ہے
کہ مانندِ چراغِ صبح مدھم ہوتا جاتا ہے

چلا ہوں ان کی جانب حالِ دردِ دل سنانے کو
قدم بڑھتا ہے جوں جوں حوصلہ کم ہوتا جاتا ہے

یہ رعبِ حسن ہے آنکھیں مقابل ہو نہیں سکتیں
سرِ تسلیم اُن کے سامنے خم ہوتا جاتا ہے

غمِ عالم سمٹ آیا مرے کاشانۂ دل میں
تمہارا حسن جب سے حسنِ عالم ہوتا جاتا ہے

امینؔ اہلِ جہاں کافر مجھے کہنے لگے جب سے
مرا اُس بُت پہ ایماں اور محکم ہوتا جاتا ہے

سیاسیاتِ اسلامی پر لاجواب کتاب

دُنیائے اسلام کا ماضی و مستقبل

[illegible]

مصنفہ مولانا الطاف مرسی سابق ملک ایڈیٹر میتاز

اسلامی تاریخ پر سیکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ایسی کتاب مشکل سے ملیگی جس میں تاریخ کی سیاسی رفتار بتائی گئی ہو اس کتاب سے یہ ضرورت بوجوہ تمام پوری ہو گئی ہے فاضل مصنف نے ترکی، ایران، مصر، مراکش، الجزائر، تونس، طرابلس، حجاز، عراق، نجد، فلسطین، یمن، سوڈان، شام، افغانستان کی تاریخ سیاسی انقلابات کی روشنی میں لکھی ہے۔ جس میں ماضی و مستقبل کی روشنیوں سے بتایا گیا ہے کہ اس انقلاب انگیز زمانہ میں اسلامی ممالک کی راہِ عمل کیا ہے اور جنگ کے ہاتھوں جس مستقبل کی تعمیر ہو رہی ہے اس میں مسلمان کس درجہ حصہ دار ہیں۔ کتاب اس علمی نگارش کی آئینہ دار ہے جو تاریخ و سیاست کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے اور خشک حقیقتوں کو ادیبانہ لطافت کے گلفشاں لباس میں پیش کیا گیا ہے۔ سیاست، تاریخ، تنقید اور ادب کا اتنا جامع مجموعہ آپکی نظر سے گذرا نہ ہوگا۔

کاغذ لکھائی چھپائی اور ترتیب دلکش جلد رنگین و نفاست افروز۔

مسلمانوں کے عروج و زوال کا مرقع

تاریخ اسلام

از مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرحوم ان محققین میں سے ہیں جو مشعلِ علم و تحقیق لے کر تاریخی دُنیا کے ہر گوشہ میں گھومتے رہے آپنے تاریخ کو جو حقیقت افروز لباس پہنایا ہے اسکی مثال مشکل سے ملیگی تاریخ اسلام کو نہایت محققانہ، ناقدانہ اور دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے یہ تاریخ غلط روایات اور بیہودہ افسانہ طرازی سے پاک ہے مسلمانوں کے عروج و زوال اور سیاست و حکمرانی پر واقعاتِ صحیحہ کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ جو حضرات تاریخ کو حقیقی شان سے دیکھنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں

قیمت جلد اول للعہ رعایتی ۸ جلد دوم للعہ رعایتی ہے۔ قیمت جلد سوم ہے رعایتی ہے تینوں جلدوں کی مجموعی قیمت لعہ رعایتی لعہ

ملنے کا پتہ: عالمگیر بک ڈپو۔ بازار سید مٹھا۔ لاہور



لاہور
خاص نمبر ۱۹۴۲
اُردو زبان کا مقبول ترین ماہنامہ

مریضان چشم کے لئے دورِ حاضرہ کی قابل فخر ایجاد!

ٹیلیفون [illegible] — تار کا پتہ [illegible]



پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ



جس کے استعمال سے ہزاروں ..... مریضانِ چشم مکمل شفا حاصل کر چکے ہیں اکسیر [illegible] ہندوستان و ممالک غیر کے گوشے گوشے میں استعمال ہو رہی اکسیر اعظم جو خالص ہندوستانی جڑی بوٹیوں اور دیگر نہایت قیمتی مرکبات سے تیار کی جاتی ہے کے بارے میں ہزارہا سرٹیفکیٹ و سفارشات میں سے چند تازہ ترین تصدیقات کا خلاصہ:-

موتیا بند و پانی اترنے کا علاج جناب [illegible] پشاور رسالدار [illegible] مورخہ ۹ [illegible] میں رقمطراز ہیں کہ آپ کی پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ کی تین شیشیاں [illegible] [illegible] دو سال کے بعد [illegible] سے معقول فائدہ ہوا ہے [illegible] ایک [illegible] بینائی [illegible] مہربانی فرما کر ایک شیشی [illegible] عینک لگانے کی مطلق ضرورت نہ رہے گی۔

چالیس برس کا پرانا چھوٹا اشکہ اور [illegible] جناب [illegible] ڈاکٹر [illegible] صاحب ایم آئی بی ایس [illegible] ہسپتال لاہور کے والد [illegible] صاحب گورنمنٹ پنشنر [illegible] پرل کلوریم آئی ڈراپ کے [illegible] میری عینک بالکل چھوٹ گئی ہے [illegible] بغیر عینک کے [illegible] اور کسی وقت بھی اب عینک نہیں لگانا [illegible] مجھے کافی [illegible] فائدہ ہوا ہے [illegible] آپ کا دلی مشکور رہوں گا۔

کالا موتیا بند [illegible] میری [illegible] آنکھ [illegible] برس سے عارضہ [illegible] موتیا بند [illegible] ڈاکٹر [illegible] مراد آباد۔ ڈاکٹر اشرف [illegible] ایم بی بی ایس [illegible] لکھنؤ میڈیکل کالج [illegible] ڈاکٹر [illegible] سنگھ اسسٹنٹ سرجن [illegible] کا علاج کیا [illegible] پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ کے استعمال سے [illegible] آنکھوں کو روشنی نصیب ہوئی۔

پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ پریس کی نظروں میں

اگرچہ پریس [illegible] ہندوستان [illegible] اخبارات [illegible] اس دوا کے استعمال و تصدیق کے بارے میں اپنی طرف سے [illegible] ریویو [illegible] لکھے ہیں لیکن یہاں صرف لاہور کے ہی ممتاز ترین اخبارات کے ریویوؤں کا خلاصہ دیا جاتا ہے:-

روزانہ پرتاپ لاہور: پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ [illegible] آنکھوں کی تمام امراض کو یقینی طور پر شفا دینے میں غیر فانی شہرت رکھتی ہے۔ اور ہر طبقہ کی مقتدر ہستیاں اس دوا کے بہترین ہونے پر رطب اللسان ہیں۔

روزانہ ملاپ لاہور: پرل کلوریم آئی ڈراپ خالص [illegible] کا رکھنا ہے [illegible] اکسیر کی آزمائش [illegible] ہندوستان کے پچاس بڑے بڑے شہروں کا دورہ فرما کر [illegible] آنکھوں کے لاعلاج مریضوں کو شفا بخشی ہے۔

روزانہ ویر بھارت لاہور: امراض چشم کیلئے [illegible] ہندوستان نے کوئی دوا ایجاد نہیں کی موجد پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

روزانہ احسان لاہور: پرل کلوریم آئی ڈراپ [illegible] بہترین [illegible] آنکھوں کی تمام امراض کو شفا دیتی ہے یہ اکسیر غیر فانی شہرت رکھتی ہے۔

روزانہ زمیندار لاہور: ہم قارئین زمیندار [illegible] پر زور سفارش کرتے ہیں [illegible] پیدائشی اندھے [illegible] آنکھوں کی کوئی بھی تکلیف ہو وہ پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ سے فائدہ اٹھائے۔

ہفتہ وار خیام لاہور: پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ کے استعمال سے ایسے مریضان چشم کو شفا ہوئی ہے جو ہر طرف سے لاعلاج ہو کر مایوس ہو گئے تھے۔

پرل کلوریم آئی ڈراپ رجسٹرڈ۔ فوائد سوائے پیدائشی اندھے کے آنکھوں کی تمام بیماریوں مثلاً کالا موتیا بند، موتیا بند ہر قسم، چیچک سے ضائع آنکھیں، جالا، پھولا، ککرے، [illegible] پانی [illegible] آنکھ کا بیٹھ جانا، آنکھ کا ناسور، بینائی کا کمزور ہو جانا، عینک لگانے کی عادت، آنکھ سے پانی بہنا، دن یا رات کو نظر نہ آنا، دھند، ناخونہ، پتلی کا سکڑ جانا یا پھیل جانا، آنکھ کا ڈھیلا باہر نکل آنا وغیرہ وغیرہ کو شفا دیتی ہے۔ اگر اچھی آنکھوں میں بھی ڈالی جائے تو آنکھوں میں کبھی کوئی بیماری پیدا نہیں ہوتی [illegible] بڑے بڑے رئیس نواب، ڈاکٹر، وید، حکیم اس کے استعمال کی پر زور سفارش فرماتے ہیں۔

قیمتیں اسپیشل ٹو قیمتی گیارہ روپے چار آنہ۔ نارمل قیمتی بڑی شیشی چار روپے چار آنہ۔ چھوٹی دو روپے چار آنہ علاوہ محصول ڈاک و خرچہ پیکنگ [illegible] ہمراہ مفت ہو گا۔

ضروری التماس یہ اکسیر عرصہ چودہ برس سے ہندوستان و ممالک غیر سے اپنے فوائد کے باعث خراج تحسین حاصل کر رہی ہے اس کی بڑھتی ہوئی شہرت کو دیکھ کر کچھ عرصہ سے نقال پیدا ہو چکے ہیں جو اس دوائی کے نام کی ملتی جلتی نام رکھ کر خلق خدا کو دھوکا دے رہے ہیں اس لئے دوائی خریدتے وقت کارڈ بورڈ کے بکس پر موجد کا فوٹو دیکھ کر دوا خریدیں

اپنے شہر کے مشہور دوا فروشوں سے طلب کریں — — — — لوکل جنرل ایجنٹ: میسرز بیلی رام اینڈ برادرز انارکلی۔ لاہور

منیجر پرل اینڈ کمپنی رجسٹرڈ کوٹھی ۹ ایبٹ روڈ۔ لاہور

ہندوستان کے تمام علمی و ادبی معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۳۷

شمارہ ۱

عالمگیر

خاص نمبر ۱۹۴۲ء

فہرست مندرجات ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء

منظومات

متفرقات

حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے شائع کیا۔

ملاحظات

کاغذ کا مسئلہ روز بروز تشویشناک صورت اختیار کر رہا ہے، وہی کاغذ جس کے لئے جنگ سے پہلے ہم چھ پیسے فی پونڈ بھی ادا کرنے کو تیار نہ تھے اب دس آنے فی پونڈ کے حساب سے بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ اس حوصلہ شکن گرانی اور اضطراب انگیز کمیابی و نایابی کی سب سے بڑی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ امریکہ سے کاغذ لانے کے لئے جہازوں میں گنجائش نہیں ہے حالانکہ سوال درآمد کی سہولتوں کا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ کاغذ فروشوں نے ہزاروں لاکھوں ٹن کاغذ اپنے پر اسرار گوداموں اور تاریک کوٹھڑیوں میں جمع کر رکھا ہے اور وہ کسی نرخ پر بھی ان ذخائر کو علیحدہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ غالباً انہیں توقع ہے کہ ابھی کاغذ کے بھاؤ میں مزید اضافہ کی گنجائش ہے۔ پس کاغذ کی نایابی اور گرانی کا اصل باعث یہ ہے کہ کاغذ فروش ذخیرہ داری کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اس لئے حکومت کو چاہیئے کہ وہ اس لوٹ کھسوٹ کے سدباب کے لئے کوئی مؤثر قدم اٹھائے ورنہ رسائل و جرائد جن ناقابل بیان مصائب میں گرفتار ہو جائیں گے۔ ان کا تصور بھی اس روشن خیالی اور جمہوریت کے زمانہ میں برداشت نہیں ہو سکتا۔

ان مشکلات و حالات کے باوجود عالمگیر یہ معرکہ آرا خاص نمبر پیش کر رہا ہے۔ ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ کاغذ کی گرانی ان کی ظاہری و معنوی خوبیوں پر اثر انداز نہ ہونے پائے چنانچہ کاغذ کی نایابی کے باوجود خاص نمبر کی ضخامت **دو سو صفحات سے زیادہ** ہے اور اخراجات میں تین چار گنا اضافہ کے باوجود اس کی قیمت صرف **۱۲ ار** رکھی گئی ہے تاکہ ہر طبقہ کے لوگ اس علمی و ادبی شراب سے سرشار ہو سکیں۔ اگر قارئین کے نزدیک ہمارا یہ ایثار کوئی وقعت رکھتا ہے تو انہیں چاہیئے کہ عالمگیر کے حلقۂ اشاعت میں توسیع کی کوشش فرمائیں اور اس کے علاوہ عالمگیر بکڈپو سے علمی ادبی، تاریخی اور اسلامی کتب بھی منگائیں کیونکہ بکڈپو کی آمدنی بھی رسالہ کی بہتری و بہبودی پر صرف ہوتی ہے۔

خاص نمبر پر ایک نظر

از ——— ادارہ

خاص نمبر کے معنوی و افادی پہلو کی کامیابی کا سہرا ہمارے مستقل قلمی معاونین کے سر رہے جنھوں نے گوناگوں مصروفیات کے باوجود شعر و ادب کے نایاب ترین گوہر مہیا کرکے ہیں خاص نمبر کی کامیابی و زیبائش کے لئے بھجوائے۔ مولانا ظفر علی خاں مدظلہٗ نے تاریخی واقعات و حوادث کو ادیبانہ شگفتگی کا لباس پہنایا ہے۔ مولانا اطہر امرتسری نے افغانی کے وطن پر محققانہ بحث کرکے ایک معرکۃ الآرا مسئلہ کا محاکمہ کیا ہے پروفیسر علم الدین سالک ایم۔ اے نے حقائق و شواہد کی روشنی میں ہندوستان کے جلیل القدر بادشاہ ٹیپو سلطان کی اصلی شان کو اجاگر کیا ہے۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے "ملا بدایونی اور آزاد دہلوی" کے عنوان سے ایک دلچسپ بحث کا آغاز کیا ہے۔ اور فرقہ وارانہ منافرت سے دامن بچاتے ہوئے اپنے خیالات پیش کر دیئے ہیں۔ موتمر آئین ساز۔ فسانۂ عجائب کی خصوصیات جدید ایرانی شاعری اور واردات حقیقہ اپنے اپنے موضوع کے لحاظ سے معلومات افزا اور حقائق آموز ہیں۔

افسانوں اور ڈراموں میں سے شکسپیر کی شہرۂ آفاق تمثیل "رومیو جیولیٹ" کا ترجمہ امتیازی درجہ رکھتا ہے جناب احسان بی۔ اے نے اس ڈرامے کا ترجمہ جس مہارت فن اور سلیقہ شعاری سے کیا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو کبھی شکسپیر جیسے قادر الکلام اور ادق نگار ڈرامانویس کی کوئی چیز پڑھنے کا اتفاق ہوا ہو۔ شکسپیر کی زبان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رعایت لفظی اور تجنیس لفظی کے سہارے اپنے بیان کو بہت زیادہ فصیح و بلیغ بنا دیتا ہے لیکن انہی الفاظ کو اگر اردو میں منتقل کیا جائے تو لطف زبان کا سارا عنصر خاک میں مل جاتا ہے تاہم جناب احسان نے اپنے ترجمے میں اصل کی بہت سی خوبیوں کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے اور ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ آپ اس کوشش میں بے حد کامیاب رہے ہیں۔

"رومیو جیولیٹ" کے بعد جناب فضل حق قریشی بی۔ اے کا مزاحی ڈراما "چیستان" امتیازی فوقیت کا مستحق ہے۔ آپ نے اس ڈراما میں نسائی نفسیات کی تصویر کشی کرنے کے علاوہ بعض معاشرتی نقائص پر بھی روشنی ڈالی ہے فنی اعتبار سے یہ ڈراما اس قابل ہے کہ اسے اسٹیج کیا جائے۔

بصورت بچے" جناب شفیق الرحمان کا ایک مزاحی جواب مضمون ہے جس میں آپ نے اے جی گارڈینر اور چارلس لیمب کی طرح اپنے مشاہدات و تاثرات کو ظریفانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ "ماسٹر صاحب" اور "پہلا رقص" جگر دوز اور رقت خیز نفسیاتی شاہکار ہیں اور ان کو پڑھکر انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ "لکیر کے فقیر" ایک سبق آموز ڈراما ہے جس میں روشن خیالی اور قدامت پسندی کا تصادم دکھایا گیا ہے۔ "موہنجو دارو کی غرقابی" سندھ کا ایک تاریخی افسانہ ہے جس کو جناب رفعت ہاشمی نے سحرکارانہ انداز میں سپرد قلم کیا ہے۔ "دو شیزاؤں کی سرائے" جذبات نگاری اور رومانیت کے لحاظ سے ایک بلند پایہ افسانہ ہے جس کو جناب علی احمد نے نہایت کامیابی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ "ترجمہ خیالیم و فلک درجہ خیال" ایک معاشری شاہکار کا ترجمہ ہے جسے جناب جمیل احمد کند ہاپوری ایم۔ اے نے نہایت کامیابی سے اردو کا لباس پہنایا ہے۔

حصہ نظم حسب معمول بہت بلند اور کامیاب ہے۔ اساتذہ سخن میں سے حضرت جمیل مظہری، سیماب اکبرآبادی، نوح ناروی، محوی صدیقی کا کلام شریک اشاعت ہے۔ حضرت امجد حیدرآبادی، راز یزدانی، ہادی مچھلی شہری، طالب باغپتی، مقبول حسین احمد پوری اور شاکر میرٹھی جیسے پختہ مشق شعرا کا کلام گوناگوں محاسن کا حامل ہے۔ نوجوان شاعروں میں سے حضرت اعجاز اکبرآبادی، تبسم بی۔ اے اور اختر جونا گڑھی کی منظومات بہت کامیاب ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ بعض ایسے مضامین اور افسانے درج ہونے سے رہ گئے جن کا اعلان گزشتہ شمارہ میں کیا جا چکا تھا۔ ہم اپنے محترم قلمی معاونین سے معذرت خواہ ہیں۔ انشاء اللہ۔ جواہر ریزے جنوری کی اشاعت میں پیش کر دیئے جائینگے۔

"عالمگیر" کے مشتہرین

"خاص نمبر" میں جن مشتہرین کے اشتہارات شائع ہو رہے ہیں ان میں سے بعض کا تعارف درج ذیل ہے۔

مغل لائن :-

عازمین حج کو کراچی۔ بمبئی اور کلکتہ کی بندرگاہوں سے جدہ تک پہنچانے کے فرائض مغل لائن نے اپنے ذمہ لئے ہیں اور یہ امر موجب مسرت ہے کہ جنگ و جدال کے اضطراب انگیز زمانہ میں بھی یہ جہاز ران کمپنی ان فرائض سے بوجوہ احسن سبکدوش ہو رہی ہے۔ آج کل حربی مصروفیات کے باعث جہازوں کی کمیابی اظہر من الشمس ہے لیکن مغل لائن ان مشکلات کے باوجود حاجیوں کو پر امن سفر کی سہولتیں بہم پہنچانے کا عزم کر چکی ہے چنانچہ ماہ اکتوبر اور نومبر میں اس کے جہاز متعدد مرتبہ روانہ ہو چکے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ عازمین حج اس کمپنی کی قابل قدر خدمات سے فائدہ اٹھائیں گے۔

سکھ سنچارک کمپنی :-

سکھ سنچارک کمپنی متھرا کی ایک ممتاز ترین کاروباری فرم ہے جس کا دائرہ عمل ہندوستان کے تمام شہروں تک وسیع ہے۔ یہ کمپنی آیورویدک دواؤں کی ساخت کے لئے خاص شہرت حاصل کر چکی ہے اس لئے جن حضرات کو خالص مفرد اور مرکب ادویہ کی تلاش رہتی ہے انکو اس کمپنی کی خدمات سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

زنانہ دواخانہ :-

زنانہ دواخانہ دہلی کے اشتہارات ہندوستان کے تمام جرائد و رسائل میں اس کثرت و تواتر کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں کہ اب یہ فرم محتاج تعارف نہیں رہی۔ عالمگیر میں یہ اشتہارات عرصہ دو سال سے شائع ہو رہے ہیں اور آج تک ہمارے کسی خریدار نے اس دواخانہ کے متعلق کوئی شکایت نہیں بھیجی اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ زنانہ دواخانہ کی دوائیں موثر اور کامیاب ہیں۔ حاجتمند اس دواخانہ کی خدمات سے فائدہ اٹھائیں۔

ڈاکٹر این۔ آر۔ شرما :-

ڈاکٹر این آر شرما موجد پرل کلوریم آئی ڈراپ کا اشتہار عالمگیر میں قریباً دو برس سے شایع ہو رہا ہے آپ امراض چشم کے ماہر ترین معالج ہیں، اور آپ کی شہرہ آفاق دوا کے استعمال سے ہزاروں لاکھوں مایوس العلاج مریض بصارت اور بینائی کی دولت سے مالا مال ہو چکے ہیں قارئین میں سے اگر کوئی صاحب خدانخواستہ آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا ہوں تو انہیں ڈاکٹر صاحب کی خدمات سے فائدہ اٹھانا چاہیئے

اخبار و افکار

از ـــــ ادارہ

شعبہ تاریخ اسلام

دنیا کے تمام مورخ اور تاریخ کے طلبہ اس نظریہ پر متفق ہیں کہ تاریخ اسلام اپنی افادیت، حقائق آموزی، ثقافتی انقلاب انگیزی اور قومی عروج و زوال کی تصویر کشی کے لحاظ سے اتنی جامع، مکمل، متنوع، اور دلچسپ ہے کہ دنیا کی کوئی اور تاریخ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی لیکن پنجاب یونیورسٹی کی یہ کتنی بڑی غفلت ہے کہ ابھی تک تاریخ اسلام کو اس ادارہ میں وہ درجہ عطا نہیں کیا گیا جو دوسرے مضامین کو حاصل ہے۔ چنانچہ ریاضی سائنس اور معاشیات وغیرہ کے علیحدہ شعبے موجود ہیں لیکن تاریخ اسلام کی انفرادی حیثیت ابھی تک تسلیم نہیں کی گئی حالانکہ ہندوستان اور غیر ممالک کی اکثر اہم درسگاہوں میں تاریخ اسلام کا علیحدہ شعبہ مدت سے قائم کیا جاچکا ہے حتیٰ کہ بنارس اور شانتی نکیتن جیسی خالص ہندو یونیورسٹیوں میں بھی تاریخ اسلام کو درس و تدریس میں امتیازی درجہ حاصل ہے۔ حال ہی میں مسلم ہسٹاریکل کانگرس نے حکومت پنجاب کو اس افسوسناک غفلت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وزیر تعلیم اس فروگذاشت کی تلافی کرینگے۔ اور پنجاب یونیورسٹی میں تاریخ اسلام کا علیحدہ شعبہ قائم کرکے طلبہ کے لئے علم و تحقیق کا ایک نیا دروازہ کھول دینگے۔

رفتار تعلیم

سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کا جو خلاصہ اخبارات میں شایع ہوا اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے ۴۰ کروڑ باشندوں میں صرف ۱۳ فیصدی عورتیں، مرد زیور تعلیم سے آراستہ ہیں۔ گزشتہ مردم شماری میں پڑھے لکھے افراد کی تعداد دس فیصدی سے زیادہ نہ تھی۔ گویا دس سال کی طویل مدت میں صرف تین فیصدی عورتیں اور مرد چشمۂ علم و فیضیاب ہوسکے۔ اس روشن خیالی اور سیاسی بیداری کے زمانہ میں یہ رفتار جس درجہ حوصلہ شکن اور یاس انگیز ہے وہ محتاج تصریح [illegible]ں صوبائی حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ تعلیم کے معاملہ میں زیادہ فراخدلی اور فرض شناسی کا اظہار کریں۔ ورنہ ہندوستان کے لئے تہذیب و

تمدن کی دنیا میں کوئی گنجائش نہ رہے گی اس کے ساتھ ہی ہم کانگرس اور مسلم لیگ سے یہ دریافت کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ وہ اپنے سیاسی مقاصد کی تائید حاصل کرنے کے لئے تو شبانہ روز سرگرم ہیں لیکن ذہنی انقلاب برپا کرنے کے لئے (جو سیاسی ترقی کا پیش خیمہ ہے) انھوں نے آج تک کیا کیا؟ پھر اُردو داں طبقہ کو اشاعت تعلیم کی طرف خاص طور پر متوجہ ہونا چاہئے کیونکہ اگر ۸۷ فیصدی غیر تعلیم یافتہ باشندوں کو اُردو زبان سے روشناس کرایا جائے تو ہندوستان کی لسانی منازعت آج ہی ختم ہوسکتی ہے پس جس جگہ ایک بھی اُردو پڑھا لکھا نوجوان موجود ہے اسے چاہئے کہ اپنے گاؤں یا شہر کے کم ازکم پانچ دس افراد کو اُردو کی مبادیات سے متعارف کرائے تاکہ ایک طرف ملک سے جہالت و لاعلمی کی تاریکی دور ہوسکے تو دوسری طرف اُردو داں طبقہ میں بھی اضافہ ہوجائے۔ ہمیں امید ہے کہ تمام بہی خواہان اُردو اس مسئلہ کی طرف جلد سے جلد متوجہ ہونگے۔

عربی کی لازمی تعلیم

امسال الہ آباد یونیورسٹی کا کانووکیشن ایڈریس ڈاکٹر پنا لعل (مشیر حکومت یو۔پی) نے پڑھا آپ نے جہاں اور بہت سے جدید تعلیمی مسائل پر فکر انگیز روشنی ڈالی وہاں یہ غور طلب رائے بھی پیش کی کہ اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں ہندو طلبہ کیلئے سنسکرت اور مسلمان طلبہ کے لئے عربی لازم قرار دی جائے۔ ہم اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہیں کیونکہ عربی مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا ضروری جزو ہے اور اگر یہ زبان تمام مسلم طلبہ کے لئے لازم قرار دے دی جائے تو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان الحاد و زندقہ کی سموم سے محفوظ رہ کر ایمان و روحانیت کے صراط مستقیم پر گامزن ہوسکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے ارباب بست و کشاد اس تجویز پر دور نظری کے ساتھ غور کرینگے اور عربی کو ایف۔اے اور بی۔اے وغیرہ کے کورس میں لازمی مضمون قرار دینے کے لئے کوئی موثر قدم اُٹھائینگے۔

نئی مطبوعات: عالمگیر بکڈپو سید مٹھا بازار لاہور نے امسال کاغذ کی بے پناہ گرانی کے باوجود پانچ نہایت اعلیٰ پایہ کی دلچسپ کتابیں شایع کی ہیں جن کا مفصل اشتہار آپ کو اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ نظر آئیگا ہم ان تمام

حقائق و معارف

انوری کی توہم پرستی

عہد قدیم کی صابی و کلدانی و نبطی و ہندو قومیں بھی علم ہیئات افلاک میں درخور رکھتی تھیں اور اعجاز در خور رکھتی تھیں گر اسلام کی ہیئات علم نجوم سے تیرو نشکرتی لینی روئے زمین پر جو تغیرات ہوتے ہیں۔ انسان جو کام کرتا ہے۔ جو شادمانیاں اس کو خوش آتی ہیں جو تلخکامیاں مرارت پڑھاتی ہیں۔ ان سب کے صدور میں گردش سیارات کا دخل ہے۔

عجمیوں کو یہ تخیل میراث میں ملا تھا اور مسلمان ہونے پر بھی ان میں یہ توہم باقی رہا۔

مہنہ (ایران) میں ایک بزرگ اوحد الدین تھے جن کی مہارت علم افلاک نے دربار علم سے ان کو "حکیم" کا خطاب دلا دیا تھا۔ یہ حضرت خود بھی عجمی تھے اور ان کا علم بھی عجمی تھا۔ شاعری سے ان کو مناسبت طبعی تھی اور اس میں انوری تخلص کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت نے پیشگوئی کی کہ فلاں تاریخ کو نظام شمسی میں خلل آجائے گا جس کے اثر سے ایسی تند و تیز آندھی آنے والی ہے کہ تمام دنیا برباد ہو جائیگی۔

قدرت کو اس نبوت کاذبہ کا ابطال کرنا تھا۔ وہ تاریخ بھی آگئی وہ وقت بھی آگیا مگر جب نہ آندھی آئی نہ بربادی آئی تو اسلام نے ان اوہام کا قدرتاً مضحکہ اڑایا کہ۔

گفت انوری کہ از اثر بادہائے سخت
ویراں شود سراچہ و کاخ سکندری
در روز حکم او نہ وزیدا ست ہیچ باد
یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

انوری کو ایسی خفت ہوئی۔ ایسا ذلیل ہونا پڑا کہ روپوش ہوگئے اور اسی کے ساتھ وہ توہم پرستی بھی عمر بھر کے لئے عنقا ہوگئی کچھ زمانہ کے بعد انوری کی دوسری زندگی شروع ہوئی جس کا ظہور ہوا تو خالص شاعرانہ انداز میں ظہور ہوا کیونکہ نجوم کا گھمنڈ ہمیشہ کے لئے مٹ چکا تھا اور قومی برہمی نے اس قابل ہی نہ رکھا تھا کہ اسلام پر اوہام کو ترجیح دے سکیں۔ انوری کی بہترین شاعری اس کے بعد کی ہے [illegible] میں ترقی کرنے کا محرک ہوا تھا کہ اسلام کی بے ادبی سے [illegible] کی خدمت گزاری سے اس کی تلافی ہوگئی۔

تاریخی جواہر ریزے

از حضرت مولانا ظفر علی خان [illegible]

بابر اور رانا سانگا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کو ۹۳۳ برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے۔ مسلمانوں پر عجمیت کا رنگ غالب ہے تاہم ایسے مسلمان بھی ناپید نہیں جن کی قوت اعتقادی نے تمام توہمات کو مغلوب کر رکھا ہے۔ شہنشاہ بابر سریر آرائے سلطنت دہلی ہے۔ سلطان ابراہیم لودی کا تخت و تاج اس کے قدموں پر نثار ہو چکا ہے۔ خاندان سلطنت نے اطاعت اختیار کر لی ہے اور انواع عاطفت سے مشمول ہے۔ ابراہیم لودی کی سلطنت تو چھن گئی ہے مگر اس کے گھرانے کے ہر فرد کو جاگیریں ملی ہیں جن میں والدۂ ابراہیم کی جاگیر سات لاکھ تنگہ کی ہے (تنگہ اس زمانے کا ایک نقرئی سکہ تھا جو آج کل کے یورپین فرنک کے برابر قدر و قیمت رکھتا ہے)

ملک میں یوں تو ہر جانب امن و امان ہے مگر ہندو طاقتیں اس انقلاب سلطنت سے آزردہ خاطر ہیں اور اس تبدیلی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ رانا سانگا نے بابر سے ابراہیم لودی کا انتقام لینے کا اعلان کیا ہے اور ایک بڑی جانباز و جرار جمعیت سے یلغار کرتا ہوا بیانہ تک پہنچ چکا ہے جو دار الممالک بابری (آگرہ) کے قریب ہے۔

مغل افسروں اور سپاہیوں کو ہندوستان کی آب و ہوا سازگار نہیں۔ وہ یہاں کی گرمی سے گھبرا رہے ہیں اور کابل کے سردسیر مقامات میں واپس جانا چاہتے ہیں۔

لشکر میں ایک نجومی بھی ہے جس نے پیشنگوئی کی ہے کہ مغلوں کو اس مہم میں سخت ہزیمت ہوگی اور سب ہلاک ہو جائینگے۔ عام پرست طبیعتیں نہایت مرعوب ہیں اور شہنشاہ پر ترک سلطنت ہند کا زور ڈال رہی ہیں کہ ملک و مال گنوائے۔ جان نہ کہیں لاکھوں پلے۔ ناچار بابر کو ایک مجلس شوریٰ قائم کرنی پڑتی ہے جس میں وہ خود اس طرح تقریر کرتا ہے

اسلام کجا و اوہام کجا۔ اسلام اکفاری کند کسے را کہ بنجوم
[illegible] کون را حوالت بر خدائے
[illegible] از خدا منتزع کنیم و بنجوم
سپاریم و کفر را بہ اسلام مقدم انگاریم
چنیں مملکت وسیع را کہ بہ مشقت تمام گرفتہ دخلق کثیرے
از قوم خود بہ کشتن دادہ باشیم امروز بہ پیش ہندوے
کہ بدوال جنگ بریم پادشاہان زمان ماراچہ گویند ونام ما
در محافل ملوک بہ چہ صورت مذکور شود۔
ہیہات! وقت آنست کہ عزیمت را بہ شجاعت ہمدوش
داشتہ کارزارے باید نمود کہ بیادگار بماند۔ اگر تائید
الٰہی فتح مے کنیم غازی باشیم واگر کشتہ مے شویم در زمرۂ شہدا
محسوب خواہیم شد۔

تمزیانۂ اسلام کے آگے توسنِ اوہام کا ٹھہرنا کہاں ممکن تھا؟ افسردہ اسلامی حرارت پھر جوش میں آگئی اور اس کا نتیجہ اس فتح عظیم کی صورت میں نکلا جس نے کئی سو برس کے لئے ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی بنیادیں استوار کردیں۔

بدیہہ گوئی کا کمال

سعید خاں قریشی عہد شاہجہانی کا ایک شاعر ہے جس نے شہزادہ مراد بخش کی ملازمت اختیار کرلی تھی اور رفتہ رفتہ شہزادہ کے مزاج میں یہاں تک دخیل ہوگیا تھا کہ شہزادہ کو اس کے بغیر ایک منٹ بھی چین نہ تھا۔ اس کی بدیہہ گوئی کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ برجستہ شعر کہتا تھا اور خوب کہتا تھا۔ جو واقعہ شہزادہ مراد بخش کی سرکار میں اس کے تقرب کا باعث ہوا وہ بہت پر لطف ہے۔ سعید خاں جب ڈیوڑھی پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ شہزادہ اس وقت حمام میں ہے۔ داروغہ حمام نے اسے ترشروئی سے اندر جانے سے روک دیا۔ سعید خاں نے اسی وقت یہ رباعی موزوں کی اور کسی نہ کسی طرح شہزادہ تک پہنچا کر ہمیشہ کے لئے اپنا رسوخ قائم کرلیا

اے شاہ جنابت تو جناب اللہ است
ہر حکم تو چوں حکم کتاب اللہ است
ایں حیلہ دیو فعل مشارع درت با
ابلیس صفت مانع باب اللہ است

عجب نہیں اس رباعی میں سعید خاں نے غسل کی مناسبت سے جنابت استعمال کیا ہو جس کی ت ضمیر مخاطب تو ہے ہی لیکن بر سبیل ایہام جز و لفظ بھی ہوسکتی ہے۔ اگر اس نے دانستہ یہ لفظ رباعی میں نہیں لکھا تو پھر شہزادہ مراد بخش کی سخن فہمی کی حقیقت کھل جاتی ہے کہ اس رباعی کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا گیا جو اس مصرعہ کے ساتھ ہوچکا ہے۔

اے تاج دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

عید الضحےٰ کی تقریب پر ایک دفعہ مراد بخش نے اپنے ہاتھ سے بکرا ذبح کیا۔ قربانی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سعید خاں بھی پاس ہی موجود تھا شہزادہ نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اس نے برجستہ یہ شعر پڑھا۔

عید قربان است مے خواہم کہ قربانت شوم
ہمچو چشم گوسفند کشتہ حیرانت شوم

مراد بخش کو شاہجہاں نے احمد آباد (گجرات) کی صوبہ داری پر مامور کیا تھا سعید خاں بھی شاہزادہ کے ہمراہ گیا۔ عید رمضان کی صبح تھی شہزادہ نے پوچھا کہ سعید خاں عید کی تہنیت میں کوئی قصیدہ لکھا؟ سعید خاں نے کچھ بھی نہ لکھا تھا لیکن اس کوتاہی کا اعتراف کیسے کرتا؟ کہنے لگا کہ حضور ایک غزل کہی ہے دوگانہ ادا کرنے کے بعد عرض کروں گا۔ دہ سمجھا کہ اس عرصہ میں نظم کہنے کی فرصت مل جائیگی لیکن شاہزادہ نے اسے اتنی مہلت نہ دی اور کہا کہ وہ غزل ابھی سناؤ۔ بیچارہ غزل کہاں سے لاتا۔ جیب سے ایک سفید کاغذ نکالا اور منہ کے سامنے رکھ کر اشعار آبدار جو بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس کی طبع رواں موزوں کرتی جاتی تھی پڑھنے شروع کئے۔

روز عید است لب خشک مے آلود کنید
چارۂ کار خود اے تشنہ لباں زود کنید
شربت حسن نبات لب جاں بخش ایاز
نوشدارو نے دل خستۂ محمود کنید
دیرگاہست کہ از دیر مغاں دور ترم
زود باشد کہ بکف جام مے اندود کنید
حرف بے مغز واعظ نتواں کرد بگوش
گوش بر زمزمۂ چنگ و نے و عود کنید
ہست بہبود شما بندگی شاہ مراد
بہتر آنست کہ اندیشۂ بہبود کنید
بدرش یافت رہ از طالع مسعود سعید
سعی دریافتن طالع مسعود کنید

سعید خاں غزل ختم کرچکا تو شاہزادہ نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور جب اُسے بالکل کورا پایا تو حاضرین دربار سے مخاطب ہوکر کہا کہ بدیہہ گوئی اسے کہتے ہیں۔

تحقیق و تصحیح

ذیل میں عربی کے وہ حروف مع امثلہ لکھے جاتے ہیں جن کے پہلے ل آجائے تو پڑھنے میں آتا ہے ورنہ نہیں آتا۔ اول الذکر کو قمری اور ثانی الذکر کو شمسی حروف کہتے ہیں۔ یعنی لام حروف تعداد میں چودہ ہیں۔

(۱) الف جیسے عبدُالاَحد۔ سیرۃُ الاُولیٰ۔ ابوالاَفضل۔ قصرُالاَبیض۔
(۲) ب " عبدالباری۔ عبدالباسط۔ فی البیت۔ عندالبیان بدرالبُدور۔
(۳) ج " یومُ الجُمُعہ۔ عبدُالجبار۔ بالجُنُود
(۴) ح " صوتُ الحمیر۔ قصرُالحمرا۔ عبدُالحمید۔ عبدُالحفیظ عبدُالحق۔ عبدُالحکیم۔
(۵) خ " حق الخدمت۔ عبدُالخالق۔ ابوالخیر۔
(۶) ع " بالعین۔ زین العابدین۔ عبدالعزیز۔ یومُ العید۔
(۷) غ " متاعُ الغرور۔ عبدالغفار۔ عبدالغفور۔ عبدالغنی
(۸) ف " عنادالفقر۔ صدقۃ الفطر۔ قول الفقیہ۔ عبدالفتاح۔
(۹) ق " بناءُ القبّۃ۔ رجلُ القریۃ۔ عبدُالقادر۔ عبدالقدوس عبدُالقوی۔ عبدُالقہار۔ عبدالقابض۔
(۱۰) ک " اُمّ الکتاب۔ جرعُ الکلب۔ صوتُ الکلاغ، عین الکمال۔
(۱۱) م " عبدالمجید۔ عبدالمتین۔ عبدالمومن۔ عبدالمہیمن۔ فعل المحمود۔ قول المسعود۔ عین المقصود۔
(۱۲) و " عبدالواسع۔ عبدالوکیل۔ عبدالوہاب۔ عبدالوارث عین الوصال۔ کسرالوثن۔
(۱۳) ہ " صوت الہادی۔ عین الہجر۔ قول الہزل۔
(۱۴) ی " طریق الیثرب۔ کاس الیاقوت۔ عین الیقین۔

وہ حروف جن کے ساتھ ل نہیں پڑھا جاتا درج ذیل ہیں۔

(۱) ت جیسے بالتخصیص۔ صاحب التاج۔ عبدالتواب
[illegible]

"ل" کا اعلان اور عدم اعلان

از جناب پیر غلام دستگیر نامی

(۳) د جیسے یوم الدّین۔ عبد الدّینار۔ کوکب الدُّری
(۴) ذ " عبدالذاکر۔ عندالذکر۔ عین الذکاء
(۵) ر " عبدالرّسول۔ عبدالرّزاق۔ عبدالرّشید۔ عبدالرّافع۔ کرم الرّفیع۔ غلبتِ الرّوم۔ فی الرّوضۃ
(۶) ز " فی الزّجاجہ۔ شجرالزّیتون۔ بالزّینت۔ عبادۃ الزّاہد
(۷) س " مع السّاجدین۔ عبدالسّلام۔ فی السّنبت۔ عبدالسّمیع
(۸) ش " تحت الشّجر۔ قول الشّاعر۔ عبدالشّکور۔
(۹) ص " بالصّدق۔ فی الصّدور۔ مع الصّادقین۔ عبدالصّمد رحلتُ الصّیف۔ عبدالصّبور۔ صدرالصّدور۔
(۱۰) ض " ولاالضّالین۔ عبدالضّامن۔ والضّحیٰ۔ عین الضّیا۔
(۱۱) ط " عبدالطّاعوت۔ سیدالطّعام۔ قاطع الطّریق۔
(۱۲) ظ " فی الظّلمات۔ مکافاتُ الظّلم۔ مصباحِ الظّلم۔ صلاۃ الظّہر۔ عبدالظّاہر۔
(۱۳) ل " ظرفُ اللّبن۔ عبداللّطیف۔ شعرِ اللّحیہ۔
(۱۴) ن " وقتُ النّزع۔ سیرۃ النّعمان۔ عبدالنّافع توبۃ النّصوح۔

تنبیہ

جب غیر عربی لفظ عربی کے ساتھ جوڑا جائے تو پھر آل لگانا جائز نہیں۔ مثلاً روزالعید۔ زیرالشجر۔ گفت الشاعر۔ چراغ الظلم۔ دام الصید۔ فوق البحر تک وغیرہ لکھنا غلط ہے۔ ہاں فارسی و عربی الفاظ کو اضافت سے مربوط کرسکتے ہیں جیسے بوسۂ ذقن۔ روزِ عید۔ چراغِ ہدایت۔ اور ہندی اور فارسی الفاظ کا ایسا جوڑ بھی غلط ہے۔ مثلاً بتۂ سنگ۔ چشمِ بلی۔ کنارۂ چھپر۔ دروازۂ تمبر وغیرہ بولنا اور لکھنا غلط ہے۔

موجِ فصاحت!

فسانہ درد کا غم کی کہانی لیکے آیا ہوں

نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل مانکپوری مدظلہ

نیا سودا نیا دردِ نہانی لے کے آیا ہوں نئی اس بزم سے میں زندگانی لے کے آیا ہوں
مژہ پر گرم گرم آنسو لبوں پہ سرد سرد آہیں - فسانہ درد کا غم کی کہانی لے کے آیا ہوں
خدا معلوم قاصد کیا سنائے دل دھڑکتا ہے یہ کہتا ہے کہ پیغامِ زبانی لے کے آیا ہوں
مقامِ خضر تھا یا میکدہ تھا کیا کہوں کیا تھا جہاں سے میں حیاتِ جاودانی لے کے آیا ہوں
بقا جب اپنا مرکز ہے تو مجھکو فکر کیا غم کیا اگر دارِ فنا میں عمرِ فانی لے کے آیا ہوں
لبوں پہ مُہرِ خاموشی ہے آنکھیں ڈبڈبائی ہیں اثر انداز اپنی بے زبانی لے کے آیا ہوں
ترے جلوے کی نظاروں کو خالی ہاتھ کیا آتا لُٹانے کو بہارِ نوجوانی لے کے آیا ہوں
سرشکِ خوں، دلِ پُرداغ، افسردہ تمنائیں ازل سے یہ متاعِ زندگانی لے کے آیا ہوں

جلیل ابرِ سیہ کیا جھومتا ہے سبزہ زاروں پر
یہ کہتا ہے کہ آبِ زندگانی لے کے آیا ہوں!

محبت سے عہدہ برآ ہو گئے ہم

محبت سے عہدہ برآ ہو گئے ہم
سبکسارِ رنج و وفا ہو گئے ہم

مسرت کشِ ابتدا ہو گئے ہم
بالآخر مآل آشنا ہو گئے ہم

بڑی کشمکش سے رہا ہو گئے ہم
محبت سے عہدہ برآ ہو گئے ہم

اگر فائزِ مدعا ہو گئے ہم
خودی نے یہ سمجھا خدا ہو گئے ہم

جو مایوسِ مہر و وفا ہو گئے ہم
تو اپنے لئے خود بلا ہو گئے ہم

تلوّن سے جب بے مزہ ہو گئے ہم
محبت سے عہدہ برآ ہو گئے ہم

یہ تھے معجزے التفاتِ وفا کے
کہ مانوسِ حسن و ادا ہو گئے ہم

گئے رفتہ رفتہ وفا کرنے والے
بتدریج سب سے جدا ہو گئے ہم

محبت میں کچھ انقلاب ایسے آئے
محبت سے عہدہ برآ ہو گئے ہم

غزل بہ اسلوب

از حضرت مولانا سیماب اکبر آبادی مدظلہ

نہ آرام پیری نہ عیشِ جوانی
یہ کس وہم میں مبتلا ہو گئے ہم

محبت میں برباد کی زندگانی
بقا کی ہوس میں فنا ہو گئے ہم

خدا کا کرم وقت کی مہربانی
محبت سے عہدہ برآ ہو گئے ہم

محبت میں رنگِ حقیقت نہیں ہے
حقیقت سے اب آشنا ہو گئے ہم

محبت کا مقصد محبت نہیں ہے
خود اس راز کا آئینا ہو گئے ہم

اب اس لفظ میں معنویت نہیں ہے
محبت سے عہدہ برآ ہو گئے ہم

نہ اب رقص و نغمہ، نہ اب چنگ و چغمہ
کہ بیزارِ رنگ و نوا ہو گئے ہم

نہیں اب شبِ ماہ میں جوشِ سودا
ادا فہم حسنِ فضا ہو گئے ہم

زمانے کو سیماب دیدو یہ مژدہ!
محبت سے عہدہ برآ ہو گئے ہم

چیستان

مزاحی تمثیل

از جناب فضل حق قریشی دہلوی بی اے

افراد

۱۔ جاوید ~~~~~~ } میاں بیوی
۲۔ سلمیٰ ~~~~~~ }
۳۔ نصیبن ~~~~~~ ملازمہ
۴۔ مس کملا ~~~~~~ سلمیٰ کی سہیلی
۵۔ چیف جج ہائیکورٹ ~~~~~~ عورت
۶۔ جیوری کی ممبر ~~~~~~ سات عورتیں
۷۔ سرکاری وکیل ~~~~~~ عورت
۸۔ وکیل صفائی ~~~~~~ عورت
۹۔ پولیس انسپکٹرس ~~~~~~ عورت

سپاہی۔ پیشکار۔ چپڑاسن اور جج کی خادمہ وغیرہ

منظر اوّل

جاوید کے مکان کا ایک خوبصورت کمرہ صوفہ سیٹ اور چھوٹی میز درمیان۔ سلمیٰ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی کچھ بُن رہی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ گنگنا بھی رہی ہے۔

جاوید ایک بنڈل لئے داخل ہوتا ہے۔

سلمیٰ۔ آج دفتر میں اتنی دیر لگادی۔ غضب خدا کا سات بجے گھر میں قدم رکھا ہے۔

جاوید۔ تم دیکھتی نہیں۔ کپڑا خرید کر لایا ہوں۔ دفتر سے اُٹھ کر ذرا بازار چلا گیا تھا۔

سلمیٰ (خوش ہوکر) اوہ کپڑا! میرے عزیز شوہر! تم میرے سُوٹ کیلئے سُرخ ساٹن آخر کار لے ہی آئے۔ کتنے دن ہوئے جب میں نے فرمائش کی تھی۔ (بنڈل اُٹھا لیتی ہے) میرے عزیز شوہر!

جاوید۔ سُرخ ساٹن نہیں۔ یہ نیلی سرج ہے میری شیروانی کے لئے۔ ایسی موقعہ کی چیز ملی کہ واللہ میں خریدنے کیلئے مجبور ہوگیا۔

سلمیٰ (بگڑ کر، آگ لگے تمہاری شیروانی کو ابنڈل پٹک دیتی ہے) میری تمام خوشی خاک میں مل گئی۔

جاوید۔ اتفاق سے اتنی پیاری چیز ہاتھ لگی ہے۔ کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ میں نے بھی اکٹھی دو شیروانیوں کا کپڑا خرید لیا۔ بازار میں اچھی چیز روز روز نہیں ملتی۔

سلمیٰ۔ اوہ میرے خدا! یک نہ شد دو شد۔ تب تو ساری تنخواہ برابر ہوگئی ہوگی۔ کتنے روپے خرچ کر آئے۔ ذرا میں بھی تو سُنوں۔

جاوید۔ ہمارے ہیڈ کلرک کو ناز ہے کہ ان سے اچھا کپڑا کوئی نہیں پہنتا۔ لیکن میری شیروانیاں دیکھ کر ان کے مُنہ میں بھی پانی بھر آئیگا۔

سلمیٰ۔ میں کپڑے کی قیمت پوچھ رہی ہوں۔ بتاؤ۔ کُل کتنے روپے خرچ کئے؟

جاوید۔ بزاز کے پاس صرف دو شیروانیوں کا ٹکڑا تھا۔ اور پھر لُطف کی بات یہ ہے۔ کہ کسی دوسری دُکان پر بھی نہیں مل سکتا۔

سلمیٰ (تیزی سے) تم قیمت نہیں بتاؤ گے۔ میں کتنی بار پوچھ چکی ہوں۔ پھر مجھے غصہ آجائیگا۔

جاوید۔ نہیں غصہ کی ضرورت نہیں۔ ابھی بتاتا ہوں، (سوچتے ہوئے) تو یوں سمجھو۔ کہ سلائی وغیرہ ملا کر کُل پچاس روپے خرچ ہونگے۔

سلمیٰ (تعجب سے) پچاس روپے۔ خدا کی پناہ۔ تب میرے لئے چار آنے کی انیم کھول نہ لیتے آئے۔

جاوید۔ وہ بھی آجائے گی۔ میرا مطلب ہے ٹرخ ساڑھی۔ اطمینان رکھو۔

سلمیٰ۔ مجھے ساڑھی کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو مذاق سے کہا تھا میں دیوانی نہیں ہوں۔ کہ خواہ مخواہ فضول خرچ کراؤں۔ ہر شخص پاؤں پھیلانے سے پہلے اپنی چادر دیکھ لیتا ہے۔ تاہم ذرا سوچنے کی بات ہے۔ عید قریب آن پہنچی۔ برس کے برس دن بھی مجھ نگوڑی کو نیا جوڑا نصیب نہیں ہوگا۔ محض اس لئے کہ میاں صاحب ضرورت سے زیادہ فضول خرچ ہیں۔

جاوید۔ حقیقت کے چہرے پر نقاب نہ ڈالو۔ تمہارے پاس شادی کے جوڑوں کی کمی نہیں ہے۔ ان میں ایک سے ایک اعلیٰ چیز موجود ہے آخر وہ کس دن کام آئیں گے۔ پہلے انہیں ختم کر لو۔ پھر نئے کپڑے کی فکر کرنا۔

سلمیٰ۔ میں نے یہ کب کہا ہے۔ کہ مجھے نئی پوشاک کی بہت ضرورت ہے لیکن شیروانی خریدنے سے زیادہ اہم خرچ سر پر چلے آرہے ہیں۔ ان کا خیال رکھنا چاہیئے۔ عنقریب ہمارے ہاں بچہ ہونے والا ہے کیا جیب خالی ہونے کے باعث تم مجھے خیراتی اسپتال میں بھیج کر جھونک دو گے۔

جاوید۔ تمہارے دشمن جائیں خیراتی اسپتال میں۔ آسان ترکیب یہ ہے کہ تم اپنے میکے چلی جانا۔ تھوڑا بہت خرچ میں بھی بھیج دوں گا۔ تمہاری والدہ خدا رکھے کافی تجربہ کار ہیں۔ اور یہاں ہم کو خواہ مخواہ نرس کا انتظام کرنا پڑیگا۔

سلمیٰ۔ بہت خوب۔ اس کے یہ معنے ہوئے۔ کہ میری والدہ گویا نرس کا نعم البدل ہیں۔ (تیزی سے) ذرا ہوش میں آکر بات کرو جی۔ میں بہت ہی ٹیڑھے مزاج کی عورت ہوں۔ تم اس سے پہلے بھی میرے رشتہ داروں کو دبے لفظوں میں کچھ کچھ کہہ چکے ہو۔

جاوید۔ تم تو ذرا سی بات میں بگڑنے لگتی ہو بیگم۔۔۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ ہماری کلب میں آج جلسہ ہے اور مجھے شرکت کرنی ضروری ہے۔

سلمیٰ۔ بھاڑ میں پڑے تمہاری کلب اور چولھے میں جائیں اس کے جلسے، میں تم کو ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ لو اور سنو۔ ایک تو پچاس روپے کا خرچ سنا کر ہمارا دل جلا دیا۔ اور اب کلب جانے کی سوجھی ہے۔ تاکہ میں گھر کی تنہائی میں اپنے آنسوؤں کے تار دن ان کی شیروانیاں سیتی رہوں۔ خواہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے آج تمہیں کلب جانا نہیں ملیگا۔

جاوید۔ بچوں کی سی باتیں مت کرو بیگم۔ کلب جانا بہت ضروری ہے، نصیبن کو بلا کر پوچھو۔ کھانا تیار ہو گیا۔

سلمیٰ۔ کھانے کا سوال تو بعد میں پیدا ہوگا۔ میں تم کو جانے ہی کب دوں گی۔

جاوید (گلے میں باہیں ڈال کر لطیف لہجہ میں) ہماری ننھی سی بیگم۔ خفا نہ کرو۔ تم تو ہماری دلاری ہو۔

سلمیٰ (ہاتھ جھٹک کر) آئیے ہٹو بھی۔ مجھے یہ بے وقت کی راگنی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ مردوں کا یہ وطیرہ بھی عجیب ہوتا ہے کہ جہاں کوئی مطلب کی بات ہوئی اور ظاہری چاپلوسی سے کام لینا شروع کر دیا۔ اور وقت نکل جانے کے بعد۔ پھر وہی ٹیڑھے کے ٹیڑھے۔ کُتے کی دُم کی طرح۔

جاوید۔ چلو تھوکو غصے کو۔ بلا بھی لو نصیبن کو۔۔۔ (آواز دیتے ہوئے) نصیبن!۔۔۔ نصیبن!۔۔۔

نصیبن (دور سے) جی آئی سرکار۔۔۔ (قریب آکر) کیا حکم ہے سرکار۔

جاوید۔ دیکھو نصیبن! ہمیں ابھی ابھی کلب جانا ہے۔ لہٰذا جلدی سے کھانا وغیرہ لے آؤ۔ دیر نہ ہونے پائے۔

نصیبن۔ آپ کی تمام آواز باورچی خانے تک پہنچ رہی تھی۔ آخر آپ دونوں میں ہر روز لڑائی کیوں ہوتی رہتی ہے۔

جاوید۔ کیا خوب۔ میں کھانے کے لئے جلدی کر رہا ہوں، اور تم گھر کے جھگڑے لے بیٹھیں۔ آخر تم ماما ہو۔ تمہیں ہمارے ذاتی معاملات سے کیا سروکار۔

نصیبن۔ عورت کے دل کا درد ایک عورت ہی خوب سمجھ سکتی ہے۔ میں نے بہت زمانہ دیکھا ہے سرکار۔ زندگی کے نشیب و فراز کو خوب سمجھتی ہوں۔ میاں بیوی کے درمیان روز کے جھگڑے اچھے نہیں ہوتے۔

جاوید (ہنس کر) میرا خیال ہے۔ کہ تم نے تمام تجربات کتابی صورت میں چھپوا دو۔ کتاب خوب بکے گی۔ لیکن فی الحال کھانا لے آؤ۔

نصیبن۔ کھانا آٹھ بجے سے پہلے نہیں مل سکتا۔

جاوید۔ آٹھ بجے؟۔۔۔ آخر کیوں؟۔۔۔

نصیبن۔ میں نے جن شرائط کے ماتحت آپ کی ملازمت اختیار کی ہے ان میں یہ شرط بھی شامل ہے۔ کہ رات کا کھانا آٹھ بجے تیار ہُوا کریگا۔ نہ میری طرف سے دیر ہوگی اور نہ آپ کی طرف سے

جلدی۔ لہذا سُن لیجئے۔ کہ ابھی آپ کو کھانا نہیں مل سکتا۔

جاوید (بگڑ کر) دماغ خراب ہوگیا ہے بڑھیا کا۔ سلمٰی! ذرا تم سمجھا دو۔ مجھے یہ باتیں اچھی معلوم نہیں ہوتیں۔

سلمٰی۔ نصیبن نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہے۔ تمہیں آٹھ بجے سے پہلے کھانا نہیں ملے گا۔

جاوید۔ تو صاف کہہ دیا جائے نا کہ کھانا ابھی تیار نہیں ہوا۔ گھر کی ذرا دیکھ بھال رکھا کرو سلمٰی۔ تم میری شریکِ حیات ہو کر بھی میری ضرورتوں کا خیال نہیں رکھتیں۔

سلمٰی۔ مجھے معلوم ہے۔ کہ نصیبن اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھتی ہے، پھر مجھے کیا ضرورت کہ اس کے کاموں میں دخل دوں۔

نصیبن۔ بالکل ٹھیک ہے۔ کھانا تو کبھی کا پک پکا چکا سرکار۔ ہر چیز نمک سے سک تیار ہے۔ لیکن آٹھ بجے سے پہلے ایک لقمہ بھی نہیں کھا سکتے۔ سمجھ لیجئے۔

جاوید۔ آخر یہ کیا مذاق ہے۔ جب کھانا تیار ہوگیا تو اسے کھالینے میں کیا مضائقہ ہے۔

نصیبن۔ طے شدہ اصول کی پابندی ضروری ہے۔ خود آپ ہی نے فیصلہ کیا تھا۔ صبح کا ناشتہ سات بجے۔ دوپہر کا کھانا ایک بجے۔ شام کی چائے پانچ بجے اور رات کا کھانا آٹھ بجے۔ بس اسی کے مطابق میں عمل کرتی رہی ہوں۔ اور ابھی تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

جاوید۔ لیکن میں اپنے فیصلوں کو بدل بھی سکتا ہوں۔ لہذا کان کھول کر سن لو۔ کہ آج سے رات کا کھانا ٹھیک سوا سات بجے ملا کرے۔ جاؤ کھانا لے آؤ۔

نصیبن۔ آج نہیں سرکار۔ ہر قسم کی تبدیلی کے لئے کم سے کم تین دن کا نوٹس ضروری ہے۔ اور آپ کو یہ بھی پوچھنا چاہئے۔ کہ مجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔

جاوید۔ اعتراض!! کیا ہمارے کسی فیصلے پر تمہیں اعتراض ہو سکتا ہے؟۔

نصیبن۔ کیوں نہیں۔ کام مجھے کرنا پڑتا ہے یا آپ کو۔ اگر بفرضِ محال آپ رات کا کھانا صبح کے ناشتے کے ساتھ ہی طلب کرنے لگیں۔ تو مجھے یقیناً اعتراض ہوگا۔

جاوید۔ خیر میں زیادہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ یہی حکم دیتا ہوں۔ کہ کھانا ابھی لایا جائے۔

نصیبن۔ معاف کیجئے۔ میں مجبور ہوں سرکار۔

جاوید۔ لاحول ولاقوۃ! سلمٰی آخر تم اس بوڑھی کھوسٹ کو سمجھاتی کیوں نہیں ہو؟ اور اگر یہ تمہارے بس کی بات نہیں، تو جاؤ خود جا کر کھانا لے آؤ۔ بہرحال میں خالی پیٹ کلب نہیں جا سکتا۔

سلمٰی۔ پھر تو بہت آسان سی بات ہے۔ آج نہ جاؤ کلب۔

جاوید۔ لیکن میں کہہ چکا ہوں۔ کہ جلسے کے اندر میری شرکت بہت ضروری ہے۔

سلمٰی۔ پھر تم جانو۔ تمہارا کام۔ میں ملازمہ کے کاموں میں دخل نہیں دے سکتی۔

نصیبن (روتے ہوئے) دیکھئے سرکار۔ اپنی حد سے آگے نہ بڑھئے اگر آپ نے اس وقت باورچی خانے میں قدم بھی رکھا تو میں چولہے کی تمام چنگاریاں اچھال کر سارے گھر میں آگ لگا دوں گی۔ خوب اچھی طرح سن لیجئے۔

(اکڑ کر دروازے کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے)

جاوید۔ سن لیا۔ اچھی طرح سن لیا۔ پیچھے ہٹ جا میرے سامنے سے۔

نصیبن۔ میں نہیں ہٹوں گی۔ باورچی خانے میں آپ نہیں جا سکتے۔ کھانا پیش کرنا میرا کام ہے۔

جاوید (جاوید زور سے دھکا دیکر) ہٹ پرے شیطان کی خالہ۔

(نصیبن کا سر زور سے دیوار کے ساتھ ٹکراتا ہے۔ صرف ایک ہلکی سی چیخ نکلتی ہے۔ جاوید اور سلمٰی گھبرا کر اسے دیکھنے لگتے ہیں)

سلمٰی۔ ارے اس کا تو سر پھٹ گیا۔ خون بہہ رہا ہے۔

جاوید (جھک کر نبض دیکھتے ہوئے) یہ تو بالکل ہی چل بسی۔ شاید اس کے دل کی حرکت بند ہوگئی ہے۔ بڑا غضب ہوا۔ اب کیا ہوگا سلمٰی۔

سلمٰی۔ مجھے کیا معلوم کہ کیا ہوگا۔ اپنے کئے کی سزا بھگتنا۔ اب بلاؤ 'کلب والوں کو۔۔ وہ تمہیں قانون کی زد سے بچالیں۔ ہر وقت 'کلب' ہر وقت 'کلب'، یہ لفظ سنتے سنتے میرے کان پک گئے تھے۔ اب ہمیشہ کے لئے سرکار کی بڑی کلب میں چلے جانا۔ بس اسکے سوا اور کیا ہوگا۔

جاوید۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو سلمٰی ہم۔

سلمٰی۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ انصاف کی دیوار اندھی نہیں ہے۔ اسکی آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی جا سکتی۔ بڑھیا کی موت تمہارے

[illegible] ہوئی ۔ اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا ۔

جاوید۔ لیکن واقعات کے چہرے پر نقاب بھی تو پڑ سکتا ہے ۔ اس وقت ہم دونوں کے سوا کوئی موجود نہیں ہے ۔ اگر ہم چاہیں تو اسے چھپا سکتے ہیں ۔

سلمیٰ۔ ہاں کوشش کر دیکھو ۔ کہاں ہے تمہاری شیروانیوں کا کپڑا ؟ آخر وہ کس دن کام آئیگا ۔ اسی کے اندر اس لاش کو لپیٹ لپاٹ کر کہیں پھینک آؤ ۔ لیکن اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے ۔

جاوید۔ بے شک ترکیب تو معقول ہے ۔

(بنڈل کھول کر کپڑا نکالتا ہے ۔ اتنے میں کملا داخل ہوتی ہے)

کملا۔ سلمیٰ ! ۔۔ سنتی ہو بہن ۔ ایک بڑے مزے کی بات کہنے آئی ہوں ۔ (ذرا رک کر) کیوں ؟ تم اداس کیوں ہو ؟ ۔۔ اور تمہارے شوہر بھی چُپ چاپ ہیں ۔ آخر ماجرا کیا ہے (نصیبن کو دیکھ کر چیخ مارتی ہے) ہیں ! ۔۔ یہ کیا ؟ ۔۔ خون ۔۔ ارے غضب ۔۔۔

(جلدی سے بھاگ جاتی ہے ۔ جاوید کی حالت متغیر ہونے لگتی ہے)

سلمیٰ۔ غضب ہو گیا ۔ کملا سب کچھ دیکھ گئی ۔ وہ یقیناً سارے شہر میں نشر کر دیگی ۔ اب بچاؤ کا کوئی پہلو نہیں رہا ۔

منظر دوم

عدالت کا کمرہ ۔ جیوری کی خواتین ۔ جج صاحبہ ، سرکاری وکیل ، وکیل صفائی ، پیشکار ، چپڑاسن ، پولیس انسپکٹرس ، کانسٹبل ، سلمیٰ اور جاوید اپنی اپنی جگہ موجود ہیں ۔ پردہ اٹھتا ہے ۔ دونوں وکیل عورتیں کسی سوچ میں ٹہل رہی ہیں ۔ جج صاحبہ پان کھا رہی ہیں اور جیوری کے ممبروں میں سے ایک خاتون بچے کو دودھ پلا رہی ہے ۔ دوسری لبوں پر سرخی اور چہرے پر پاؤڈر لگا رہی ہے ۔ سرگوشیوں کی خفیف آواز ۔۔۔ پھر ایک لمحہ خاموشی ۔۔۔

چپڑاسن۔ عدالت شروع ہوتی ہے ۔

جج (کھڑے ہو کر) ہمیں مسرت و شادمانی ہے کہ سات ماہ کے بعد عدالت شروع کرنے کا موقع مل رہا ہے ۔ ملک کی فضا اس درجہ خوشگوار ہو گئی ہے ۔ کہ کسی قسم کے جرم کی واردات ہوتی ہی نہیں ۔ یا ماتحت عدالتیں خاطر خواہ فیصلہ کر کے معاملہ ختم کر دیتی ہیں ، اور ہائی کورٹ تک نوبت نہیں پہنچتی ۔ آج کا مقدمہ اپنی نوعیت کے

اعتبار سے بالکل انوکھا اور قابلِ افسوس ہے ۔ پیشکار ! ۔۔ مقدمہ کی کارروائی پیش کرو ۔۔ (مسل پڑھتے ہوئے) جاوید انصاری اور ان کی بیوی مسماۃ سلمیٰ پر الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے باہمی سازش سے ۱۱ دسمبر ۱۹ء بوقت سوا سات بجے شام اپنے مکان کے ڈرائنگ روم میں اپنی ملازمہ مسماۃ نصیبن کو جان سے مار ڈالا ۔ زیرِ دفعہ ۱۸ تعزیراتِ اسلامی ملزمان کا چالان کیا گیا ۔ اور سیشن جج کی عدالت سے ان دونوں کو بیس بیس سال قید با مشقت کی سزا ہوئی ۔ اب معاملہ کا اپیل ملزمان کی طرف سے ہائیکورٹ میں پیش کیا گیا ہے ۔

جج۔ تمام پچھلی کارروائی کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں ۔ کہ مسماۃ سلمیٰ پر سراسر ظلم کیا گیا ہے ۔ قصوروار صرف جاوید ہے ۔

وکیل صفائی۔ ٹھیک ہے خالہ اماں ۔ آپ نے بجا ارشاد فرمایا ۔

جج۔ اوہو ۔ سات ماہ کی مدت میں تم عدالت کے تمام آداب بھلا بیٹھی ہو ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے ۔ کہ عدالت میں گفتگو کرتے وقت ذاتی تعلقات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ۔

وکیل صفائی۔ معاف کیجئے گا مائی لارڈ ۔

جج۔ غلط ۔ بالکل غلط ۔ میں عورت ذات ہوں ۔ اگر بدقسمتی سے اس کرسیٔ عدالت پر کوئی خبیث مرد بیٹھا ہوتا تو تم لارڈ کا لفظ استعمال کر سکتی تھیں ۔ بصورتِ موجودہ یہ بالکل غلط ہے ۔

وکیل صفائی۔ میں دوبارہ معافی چاہتی ہوں یور لیڈی شپ ۔۔ ہاں تو میں یہ کہنا چاہتی تھی ۔ کہ ایک عورت اور وہ بھی سلمیٰ جیسی کمزور عورت سے ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ قاتلانہ حملہ کر سکے ، اور حملہ بھی ایک عورت پر ۔ یہ قطعی ناممکن ہے ۔

جیوری کی ایک ممبر (گالا لال ہونٹ پیک تھوکتے ہوئے) ہم سب کا متفقہ فیصلہ بھی یہی ہے ۔ سیشن جج جو ہماری قوم کی بدقسمتی سے ایک مرد ہے غالباً نفسیات کے اصول سے بالکل ناواقف ہے ۔ اس زمانے کی ایک خوش اور مہذب عورت کبھی بھول کر بھی اپنی کسی ہم جنس کو تکلیف نہیں پہنچا سکتی ۔ دو بیویوں کو دکھ دینا اور ستانا صرف مرد ذات کا شیوہ ہے ۔

جج۔ واہ میری بھتیجی واہ ۔ کتنی معقول دلیل ہے ۔

وکیل صفائی۔ گستاخی معاف ہو مائی لیڈی ۔۔ میرا مطلب ہے مائی لیڈی آپ نے [illegible]

جج۔ واقعی مجھ سے بھول ہو گئی۔ ذرا ٹھہرو۔ میں ایک پان کھا لوں'
پاندانے کی عادت بہت ہی بری ہوتی ہے۔

(میز پر رکھے ہوئے پاندان میں سے پان کھاتی ہے۔ اور پھر اسے
ممبران جیوری کی طرف سرکا دیتی ہے۔ ایک خاتون فوراً چھالیہ
کترنا شروع کر دیتی ہیں)

جیوری کی دوسری ممبر۔ مائی لیڈی صاحبہ! میرا خیال ہے کہ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب یہ تسلیم کر لیا گیا۔ کہ سلمیٰ بالکل بے قصور ہے۔ تو پھر اسے رہا کر دیا جائے۔

جج۔ بے شک۔ بے شک سلمیٰ کو رہا کیا جاتا ہے۔

(سپاہی سلمیٰ کو کٹہرے کے باہر نکال دیتی ہے۔ سلمیٰ دوڑ کر وکیل صفائی سے گلے ملتی ہے۔ اور پھر جج وغیرہ کو سلام کرتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے)

سرکاری وکیل۔ اب اصل ملزم کے متعلق بحث شروع کی جائے، مائی لیڈی صاحبہ۔

جج۔ میرا خیال ہے۔ کہ بحث کی ضرورت نہیں۔ معاملہ بالکل صاف ہے۔ بوڑھی نصیبن خود بخود نہیں مر گئی۔ ضرور کسی نہ کسی نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا ہوگا۔ اور وہ ظالم جاوید کے سوا کون ہو سکتا ہے۔

وکیل صفائی۔ ذرا ٹھہریئے مائی لیڈی صاحبہ! مجھے اس مقدمے کے سلسلے میں بہت کچھ کہنا ہے۔

سرکاری وکیل۔ اری بہن۔ کیوں خواہ مخواہ الجھتی ہو۔ تمہاری فیس تو مل ہی گئی۔ اب چولھے میں ڈالو اس مردود کو۔

جج۔ مس کوبرا! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ "بہن" کا لفظ آداب عدالت کے خلاف ہے۔

سرکاری وکیل۔ اور مائی لیڈی صاحبہ! آپ کو بھی معلوم ہونا چاہیئے، کہ میں سرکاری وکیل ہوں۔ میرا نام لیکر مجھے مخاطب نہ کیجئے۔

جج۔ اوہو۔ یہ تو وہی مثل ہو گئی "ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔" ذرا ٹھہرو۔ میں ایک پان اور کھا لوں۔

(جیوری کی ایک ممبر پان پیش کر دیتی ہے)

وکیل صفائی۔ مائی لیڈی صاحبہ! شروع سے تمام واقعات پر غور کیجئے۔ سب سے پہلے میرے موکل کی لڑائی دفتر کے ہیڈ کلرک سے ہوئی پھر بازار میں اسے لوٹ لیا گیا۔ آپ خود خیال فرمائیں۔ معمولی نیلے رنگ کی سرج اور دس روپے گو۔ خدا کی پناہ۔ اسکے بعد اس غریب شخص کو اپنے مکان تک پیدل گھسٹنا پڑا کیونکہ جیب کی تمام رقم شیروانیوں کا کپڑا خریدنے میں خرچ ہو چکی تھی۔ گھر پہنچا تو

بیوی نے لتاڑنا شروع کر دیا۔ پھر ملازمہ نے کھانا دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس وقت تک آٹھ نہیں بجے تھے۔ میرا موکل صبح سے بالکل بھوکا تھا۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں مائی لیڈی صاحبہ کہ جس طرح محبت کرنے والوں کو محبوب کی یاد ہر وقت ستائے رکھتی ہے۔ اسی طرح بھوک کا احساس معدے اور آنتوں کو ہر وقت پیچ و تاب میں رکھتا ہے۔ عاشق کی آرزو ہوتی ہے۔ کہ محبوب کا دیدار نصیب ہو، اور معدہ چاہتا ہے کہ وہ کبھی خالی ہونے نہ پائے۔ دنیا کے کسی شخص کو نہ محبت پر اختیار ہوتا ہے، اور نہ بھوک پر۔ ان تمام واقعات کے ماتحت میرا موکل بہت زیادہ پریشان ہو گیا۔ اور اس نے غصے کی حالت میں نصیبن کو برا بھلا کہدیا۔ مرحومہ غریب سہی لیکن بڑی خوددار عورت تھی۔ اس کے دل و دماغ نے بہت اثر لیا۔ اس سے بالکل برداشت نہ ہو سکا۔ اس کے دماغ کی رگیں پھٹ گئیں۔ تمام خون بہہ نکلا۔ اور اس صدمہ سے وہ مر گئی۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے ؎

یہ دنیا سرائے فانی ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

(روتے ہوئے) مرحومہ کی عمر ستر سال تھی۔ لیکن کہا جاتا ہے، کہ اس نے ابھی تک شادی بھی نہیں کی تھی۔ صرف منگنی کی رسم ادا ہوئی تھی۔ ہائے ؎

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

سرکاری وکیل۔ مائی لیڈی صاحبہ! وکیل صفائی نے اپنے بیان کو ضرورت سے زیادہ پر درد بنا دیا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ کہ جیوری کی معزز خواتین بہت متاثر ہو گئی ہیں، اور وہ سب رو پڑنے کے قریب ہیں۔ میں چاہتی ہوں۔ کہ آئندہ اس قسم کی دل ہلا دینے والی گفتگو نہ کی جائے۔ خصوصاً اشعار کا استعمال بالکل ممنوع قرار دیا جائے۔

جج۔ بالکل ٹھیک ہے۔ وکیل صفائی کو آئندہ ان باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا۔ پیشکار۔ پہلا گواہ کون ہے۔

پیشکار۔ وہ مسماۃ سلمیٰ کی سہیلی ہے — اے چپڑاسن! مس کملا کو عدالت میں طلب کرو۔

چپڑاسن (دروازے کے قریب بلند لہجے میں) مس کملا حاضر۔

کملا ایک کرسی سے کھڑی ہو کر) اری اندھی دیکھتی نہیں۔ میں تو

پہلے سے یہاں موجود ہوں۔

جج ۔ اچھا بتاؤ۔ تم اس معاملہ میں کیا کچھ جانتی ہو؟

وکیل صفائی ۔ مائی لیڈی صاحبہ! مس کملا سے عدالتی قسم لی جائے۔

سرکاری وکیل ۔ نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ وہ عورت ذات ہے۔ اور کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔

جج ۔ ٹھیک ہے۔ مس کملا اپنا بیان شروع کریں۔

مس کملا ۔ کیا عرض کروں۔ بڑا ہولناک نظارہ تھا۔ محض خیال کرنے سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میں اپنی سہیلی سلمیٰ سے ملنے گئی۔ تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جاوید ایک بہت ہی موٹے ڈنڈے سے نصیبن کو مار رہا تھا جب وہ تھک گیا تو اس غریب عورت کے بال نوچنے شروع کر دیئے۔ اسکی ناک پر مکے مارے۔ کان کھینچے، اور آخر اسے اٹھا کر زمین پر پٹک دیا۔ وہ بیکس دکھیاری اس صدمۂ عظیم کی تاب نہ لا سکی، اور اس لئے مرتے ہی اس کا دم نکل گیا۔ مائی لیڈی صاحبہ اگر اجازت ہو تو ایک نہایت موزوں شعر میں بھی سنا دوں۔

جج ۔ عدالتی بیان میں اشعار کا استعمال ممنوع قرار دیدیا گیا ہے۔ پیشکار! دوسرا گواہ کون ہے؟

پیشکار ۔ اے چپڑاسن! پولیس انسپکٹرس کو عدالت میں طلب کرو۔

چپڑاسن ۔ پولیس انسپکٹرس حاضر۔

پولیس انسپکٹرس (باقاعدہ سلام کرتے ہوئے) مائی لیڈی صاحبہ۔ میں یہاں موجود ہوں۔ مجھے کچھ زیادہ عرض نہیں کرنا۔ جب میں موقعہ پر پہنچی۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ مقتولہ خاک اور خون میں تڑپ رہی تھی۔

جج ۔ ارے۔ ڈرائنگ روم کے اندر خاک؟ کیا تمہارا مطلب ہے کہ وہاں فرش بچھا ہوا نہیں تھا۔

انسپکٹرس ۔ فرش تو ضرور تھا۔ لیکن محاورے کے مطابق ہمیں یہی کہنا پڑیگا۔ کہ وہ خاک اور خون میں تڑپ رہی تھی۔

جج ۔ اچھا خیر۔ بیان جاری رہے۔

انسپکٹرس ۔ غور فرمائیے۔ مائی لیڈی صاحبہ! اس غریب عورت کو مرتا ہوا دیکھ کر یہ ظالم بے درد ملزم کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔

جیوری کی خواتین (یک زبان ہو کر) شیم شیم۔

انسپکٹرس ۔ ملزم چاہتا تھا۔ کہ مجھ پر بھی حملہ کرے۔ لیکن میں نے نہایت پھرتی کے ساتھ اس کی کلائی پکڑی اور فوراً ہتھکڑی

لاڈو ۔ بس اس کے علاوہ مجھے کچھ اور نہیں کہنا ہے۔

جج ۔ جیوری کی معزز خواتین کو ایک منٹ کا موقع دیا جاتا ہے تاکہ وہ بیانات کی روشنی میں کوئی متفقہ فیصلہ کر سکیں۔ لاؤ میں اتنی دیر میں ایک پان ہی کھا لوں۔

(پان لیکر کھانے لگتی ہے۔ اتنے میں ایک خادمہ ننھے سے بچے کو لئے داخل ہوتی ہے اور جج سے کہتی ہے)

خادمہ ۔ لیجئے بیگم صاحبہ۔ آپ کے بچے نے تو میرا ناک میں دم کر دیا۔ کسی طرح چپ نہیں ہوتا۔ روئے جاتا ہے۔

جج ۔ اری کم ہمت! اسے عدالت میں کیوں لے آئی۔ جانتی نہیں۔ یہ قاعدے کے خلاف ہے۔

خادمہ ۔ اجی لو۔ بڑا آیا قاعدہ۔ بچے کی جان ہلکان ہو رہی تھی۔ شیشی کا دودھ دینے کی کوشش کی۔ مگر اس نے پیا ہی نہیں۔ ذرا اپنا دودھ پلا دو۔ ابھی خاموش ہو کر سو جائیگا۔

(بچہ جج کو گود میں دیدیتی ہے)

جج ۔ اگر جیوری کی معزز خواتین کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......

جیوری کی ایک ممبر ۔ جی ہاں۔ جی ہاں۔ بڑے شوق سے۔ آخر بچے کو بھوکا کس طرح رکھا جا سکتا ہے۔

(جج صاحبہ دودھ پلانے لگتی ہیں۔ اور کچھ دیر بعد بچہ خادمہ کو دے کر چلتا کر دیتی ہیں)

جج ۔ کارروائی دوبارہ شروع ہوتی ہے۔ گواہوں کے بیان سنے جا چکے ہیں۔ کیا وکیل صفائی کو ان پر کوئی اعتراض ہے؟

وکیل صفائی ۔ ہرگز نہیں۔ میں جا و بیجا اپنے موکل کی طرفداری کرنا نہیں چاہتی۔ گواہوں کے بیان نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ ملزم دراصل مجرم ہے۔ اگر مجھے اصل حقیقت معلوم ہوتی۔ تو میں اسکی طرف سے وکالت کرنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوتی۔ واقعات شاہد ہیں۔ کہ اس نے اپنی ملازمہ کو زمین پر پٹک دیا۔ اور غریب بڑھیا کا سر جو کبھی کسی سخت چیز سے ٹکرا نے جانے کا عادی نہیں تھا پھٹ کر پاش پاش ہو گیا۔ اب عدالت جو فیصلہ چاہے کرے۔

جج ۔ عدالت جیوری کی معزز خواتین کا فیصلہ سننا چاہتی ہے۔

جیوری کی ایک ممبر ۔ ہم سب بہنوں نے تمام واقعات پر غور کرنیکے بعد متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے۔ کہ یہ جرائم کا مجسمہ، یہ گناہوں کی پوٹ، یہ معصیت کا پتلا، یہ شیطان کا چچا زاد بھائی غریب نصیبن کا

قاتل ہے سیشن جج نے جو سزا اس ہندوستانی ہٹلر کے لئے تجویز کی یعنی صرف بیس سال کی قید با مشقت، وہ بہت کم ہے۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ اسے پچاس سال تک چکیاں پسوائی جائیں۔ اور زیادہ مناسب تو یہ ہے کہ پھانسی دیدی جائے کیونکہ ایسے شخص کا زندہ رہنا تمام دُنیا کے لئے موجب خطرہ ہے۔

جج - جیوری کی معزز خواتین کا فیصلہ بالکل درست اور لائق تسلیم ہے۔

سرکاری وکیل - ذرا ٹھہریئے مائی لیڈی صاحبہ! میرے خیالات ابھی تک میرے دماغ کے پردوں میں محفوظ ہیں۔ میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔

جج (تعجب سے) تم!۔۔ ارے تم تو سرکاری وکیل ہو۔ اور جیوری کا فیصلہ ملزم ہی کے خلاف رہا ہے۔ تم اب کیا کہنا چاہتی ہو۔ بہر حال تم کو اجازت دی جاتی ہے۔

سرکاری وکیل - مائی لیڈی صاحبہ! خیال تو میرا بھی یہی تھا۔ کہ بیکس بڑھیا کا قاتل اس ملزم کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ لیکن گواہی کے دوران میں جب میری نظر اس کے چہرے پر پڑی تو دل لرز کر رہ گیا۔ میں ان جذبات کو جو اس وقت میرے سینے میں ہلچل مچاتے ہوئے ہیں ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔ خدا جانے کیوں میرا دل اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے۔ اس کی مغموم صورت، مایوس چہرا، حسرت بھری آنکھیں اور رنج و ندامت کے اثر سے کپکپاتے ہوئے ہونٹ، کیا یہ سب کے سب عدالت سے رحم کے طلبگار نہیں ہیں۔ ملزم ابھی تک خاموش ہے۔ اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ جانتا ہے۔ کہ سب اس کے خلاف ہیں۔ لیکن میں طرفداری کرونگی۔ میرا دل، میری رُوح ـــ اُف میں بیان نہیں کر سکتی۔

جج (گرج کر) خاموش! تم سرکاری وکیل ہو۔ تمہیں ملزم کے خلاف بولنا چاہیئے۔ تمہیں اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا۔ یہ زبردست نادانی ہے۔ ہوش میں آؤ۔

سرکاری وکیل - اب ہوش میں کیسے آؤں ہوش و حواس تو کھو چکی شاید تمہارا دل پتھر کا ہے۔ تم محبت کے لطیف جذبات سے ناآشنا ہو۔ یہ شخص سزا بھگتنے کے لیے نہیں پُوجے جانے کے لئے ہے۔

جج - نکال دو۔ اسے عدالت کے باہر نکال دو۔ اس کج فہم عورت نے اپنی ذمہ داریوں کا خیال نہیں رکھا۔ (انسپکٹرس اور چپراسن سرکاری وکیل کو باہر لے جاتی ہیں۔ ایک لمحہ خاموشی کے بعد) بیان ختم ہو چکے۔ وکیل صفائی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جیوری نے اپنا فیصلہ پیش کر دیا۔ اب ہمیں دیر کرنی نہیں چاہیئے معاملہ نازک ہوتا جا رہا ہے۔ لہذا عدالت یہی فیصلہ کرتی ہے کہ جاوید جو یہاں ملزم کی حیثیت سے موجود ہے نصیبن کا قاتل ہے اس جرم کی سزا اس کو پھانسی کی شکل میں دیدی جائے لیکن ذرا ٹھہریئے۔ ہمیں اس خبیث ناہنجار، اس خونریز وحشی اور اس ناپاک درندے کے ساتھ پورا انصاف کرنا چاہیئے۔ لہذا او ملعون انسان اگر تجھے اپنی مدافعت میں کچھ کہنا ہے تو جلدی سے بک۔ تاکہ اس پر بھی غور کر لیا جائے۔ بول کچھ کہنا ہے۔

جاوید - فاضل جج صاحبہ .....

جج (تیزی سے) او گستاخ، بے ادب، بدتمیز! آداب عدالت کا حافظ رکھ۔ ورنہ ابھی ابھی تیری زبان کھنچوا دی جائیگی۔

جاوید - بہت بہتر مائی لیڈی صاحبہ۔ اس وقت کی تمام کارروائی سُن لینے کے بعد مجھے اپنی مدافعت میں ایک لفظ بھی نہیں کہنا۔ میں مجرم ہوں، مجھے پھانسی کی سزا دیدی جائے۔

جج - اچھا پھر۔

جاوید - مجھے اپنی نہیں۔ ایک اور ہستی کی سفارش کرنی ہے۔ میرے مرنے کے بعد میری بیوہ کا کیا حشر ہوگا۔ اس دُنیا میں اس کا اور کوئی نہیں ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے۔ کہ آپ عورت ذات ہوتے ہوئے یہ کبھی گوارا نہیں کرینگی کہ وہ دردر کی ٹھوکریں کھانے لگی کوچوں میں بھیک مانگے، یا مجبور ہو کر عصمت فروشی کیلئے آمادہ ہو جائے۔ آپ عورت ذات ہیں۔ آپ کی رگوں میں نسوانی خون ہے۔ غالباً آپ یہ پسند نہیں کرینگی کہ میری بیوہ کا مستقبل تاریک ہو جائے۔ وہ جس نے آج تک کبھی جسمانی یا رُوحانی تکلیف برداشت نہیں کی۔ وہ دردناک زندگی کی مصیبتیں کس طرح جھیل سکتی ہے۔ آپ اس کے لئے کوئی معقول انتظام کر دیں۔ تاکہ وہ میرے مرنے کے بعد اطمینان و سکون کی زندگی شریفانہ طور پر بسر کر سکے۔ آہ میری بیوہ جو بہت جلد ایک بچے کی ماں بننے والی ہے۔ وہ بچہ جو بڑا ہو کر یہ بھی نہ جان سکے گا کہ دُنیا میں اس کا کوئی باپ تھا یا نہیں۔ (عورتیں رونا شروع کر دیتی ہیں) آپ بھی ایک ماں ہیں۔ یہیں عدالت میں اپنے بچے کو دودھ پلا چکی ہیں۔ آپ ایک بچے کی ضرورت کو اور اس کے دُکھ درد کو سمجھتی ہیں۔ خدا کیلئے

وعدہ کیجیے، کہ آپ میری بیوہ کے علاوہ اس بچے کی پرورش کا انتظام بھی کرا دیں گی۔ آہ میرا بچہ! جب وہ پیدا ہو کر پہلی بار روئیگا تو میری رُوح شفقتِ پدری سے بیتاب ہو کر دوبارہ اپنے جسم میں آجانے کی کوشش کرے گی لیکن میرا بے جان جسم وہ تو ہزاروں من مٹی کے نیچے دبا پڑا ہوگا۔ خیر آپ وعدہ کر لیجئے۔ آپ ان دونوں کی دیکھ بھال کریں گی۔

(سوائے جاوید کے سب رونے لگتے ہیں۔ کچھ دیر سسکیاں اور ہچکیاں جاری رہتی ہیں)

جج (بسورتے ہوئے) جیوری کی معزز خواتین! اب بتاؤ ایسی صورت میں تم سب کیا فیصلہ کرو گی۔

جیوری کی ایک ممبر (ہچکیاں لیتے ہوئے) مائی لارڈ جج صاحب! اس مردود جہنمی کو رہا کر دیجیے۔ اسے زندہ رہنا چاہئے۔ ایک شریف خاتون اور معصوم بچے کی خاطر۔ اس ذلیل مرد کا وجود نسائیت کے معصوم چہرے پر ایک بدنما داغ ہے۔ لیکن اب سلمیٰ اور اس کے عنقریب پیدا ہونے والے بچے کا خیال کرتے ہوئے اس بدنما داغ کو خالِ رخ سمجھنا ہی پڑے گا۔ اسے رہا کر دیجئے۔

جج۔ کیا جیوری کی باقی خواتین کو کوئی اعتراض ہے؟

جیوری کی خواتین۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

جج (جاوید سے) جا او ملعون، خبیث وحشی کتے۔ جا اور آزادی کی فضا میں سانس لے۔ عدالت تجھ کو رہا کرتی ہے۔

(جاوید سر جھکائے جانے لگتا ہے۔ جیوری کی خواتین اپنی جگہ سے اُٹھ اُٹھ کر اس پر تھوکتی ہیں۔ "اور خبیث خبیث" کہتی ہیں)

منظر سوم

مطابق منظر اوّل۔ جاوید صوفے پر ٹانگیں پھیلائے سو رہا ہے دُور سے گانے کی آواز آرہی ہے۔ جو رفتہ رفتہ قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ سلمیٰ جس کے گیلے بال کُھلے ہوئے ہیں کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ جاوید کو سوتا دیکھ کر ٹھٹکتی ہے اور پھر بالوں کی لٹوں میں سے پانی کے چند قطرے اس کے مُنہ پر ٹپکا دیتی ہے۔ جاوید چونک کر چیخنے لگتا ہے۔

جاوید۔ کیوں تھوکا۔ بتاؤ۔ تم نے میرے مُنہ پر کیوں تھوکا۔ (چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہے)۔ یہ میری تذلیل ہے۔ زبردست توہین ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ تم۔ کون۔ (آنکھیں مَل کر سلمیٰ کو دیکھتا ہے) اچھا تم ہو۔ بڑے اطمینان سے تم چلی آئیں۔ مجھے تنہا چھوڑ کر۔ موت کے مُنہ میں جھونک کر۔ تم نے اتنا انتظار بھی نہ کیا کہ وہ خبیث عورتیں میرے متعلق کیا فیصلہ کرتی ہیں۔ اُن سب نے مل کر میرے مُنہ پر تھوکا۔ اور میری جیب میں رُومال بھی نہیں تھا۔ کہ میں اپنا چہرا صاف کر سکتا۔ (مُنہ پر ہاتھ پھیر کر) یہ دیکھو۔ ابھی تک اُن کا تھوک میرے مُنہ پر باقی ہے۔

سلمیٰ (حیرت سے) کس نے تھوکا تمہارے مُنہ پر۔ بالکل غلط ہے۔ یہ تو پانی کی بوندیں ہیں۔ میں نے اپنی زلفوں سے ابھی ابھی ٹپکائیں تھیں۔

جاوید (بدستور غصے میں) میں پوچھتا ہوں کہ تم میرے اچھے لباس سے کیوں جلتی ہو۔ اگر میں نے دو شیروانیاں بنوا لیں تو ایسا کون سا ظلم ہو گیا۔ اور پھر ذرا سی دیر کے لئے تفریحاً کلب جانا آخر تمہیں کیوں ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ جیوری کی معزز خواتین اگر مجھے پھانسی کے تختے پر لٹکوا دیتیں تو اچھا ہوتا۔ میری موت تمہارے لئے باعثِ مسرت بن جاتی۔ اور سب سے زیادہ غصہ مجھے اس بوڑھی کھوسٹ پر آتا ہے۔ کیسی چُپ چاپ مر گئی گویا موم کی بنی ہوئی تھی۔

(نصیبن چائے کی ٹرے لئے ہوئے داخل ہوتی ہے)

نصیبن۔ لیجیے سرکار۔ چائے حاضر ہے۔

جاوید (چونک کر) کون؟ نصیبن؟ ارے یہ کیا ماجرا ہے کیا درحقیقت تو مری نہیں تھی۔

نصیبن۔ خدا نہ کرے سرکار۔ میں ابھی کیوں مرنے لگی۔

جاوید (حیرت سے) کیوں مرنے لگی۔ تو پھر کون مرا تھا۔ مجھے بتاؤ۔ وہ بُڑھیا کون تھی۔ جسے قتل کرنے کے جرم میں خون کا مقدمہ میرے خلاف چلایا گیا۔ آخر بات کیا ہے۔ میری عقل کام نہیں کر رہی۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ تم بھی خاموش ہو سلمیٰ۔ مجھ سے ناراض ہو۔ بگڑو نہیں۔ تمہاری طرح ساڑھی ضرور لاؤنگا۔ آج ہی شام کو لاؤنگا۔ لیکن میری باتوں کا جواب تو دو۔ میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔

سلمیٰ۔ ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ کہ تم پاگل ہو گئے ہو یا آج زندگی میں

پہلی مرتبہ شراب پی لی ہے۔

جاوید۔ شراب! ـــ میں نے شراب پی لی ہے؟ اچھا مجھے سوچ... دو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تم لوگ ذرا پیچھے پیچھے ہٹ جاؤ۔ مجھ سے دور۔ بہت دور۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اصل بات کیا ہے (کچھ سوچ کر) سلمیٰ ـــ

سلمیٰ۔ جی؟ ـــ

جاوید۔ تم نے مجھ سے سرخ ساڑھی منگائی تھی؟

سلمیٰ۔ کبھی نہیں ـــ

جاوید۔ میں اپنی شیروانیوں کے لئے نیلی سرج لایا تھا۔

سلمیٰ۔ بالکل نہیں۔

جاوید۔ اچھا تم بتاؤ نصیبن۔ تم کیا جانتی ہو۔

نصیبن۔ مجھے کیا معلوم سرکار۔ میں تو صبح سے ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی۔

جاوید۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم رات کا کھانا کس وقت کھلایا کرو گی؟

نصیبن۔ جس وقت سرکار کی مرضی ہو۔

جاوید۔ میری مرضی۔ کوئی مقررہ وقت نہیں۔ اچھا میں اب سمجھا۔ یہ سب کچھ خواب تھا۔ کیا واقعی میں چند منٹ پہلے سو رہا تھا۔

سلمیٰ۔ اور نہیں تو کیا۔ ہوا خوری کے بعد یہاں آئے اور صوفہ پر پڑ کر سو گئے۔ میں منہ دھو کر آئی تو اپنے گیلے بالوں کو تمہارے چہرے پر جھٹکا دیا۔ بس اتنی سی بات تھی۔ خواہ مخواہ مجھے پریشان کر دیا۔

جاوید (ایک طویل قہقہہ کے بعد) لیکن میرا خواب۔ میرا خواب اتنا ہولناک ہے۔ کہ جب تم سنو گی تو تمہارا نازک دل دہل جائیگا۔ لیکن آؤ پہلے چائے پی لیں۔

(ہنستا ہوا چائے بنانے کے لئے بیٹھ جاتا ہے)

(پردہ)

آفتاب

از جناب اندر جیت شرما

کس کی تلاش ہے تجھے دن رات آفتاب   ہر روز صبح صبح دکھاتا ہے سرخ رو
آرائشیں تری ہیں یہ کس درجہ کامیاب   اتنا حسیں نہیں کوئی جتنا حسیں ہے تو
اس وقت تیرا اور ہی کچھ رنگ ڈھنگ ہے
شوخی سی ہے نگاہ میں دل میں اُمنگ ہے

کرتا ہے گشت چرخ پہ شان و شکوہ سے   اتنا سبک خرام ہے تو کس اُمید پر
نیلی فضا میں جاتا ہے اونچا ہی کوہ سے   اللہ رے طویل ہے کتنا ترا سفر
ہوتا ہے چور تو جو سفر کی تکان سے
کرتا ہے رُخ زمیں کی طرف آسمان سے

لیکن ہیں اب وہ صبح کی سرگرمیاں کدھر   شوخی کہاں گئی وہ شرارت کہاں گئی
قابو نہیں رہا ترا رنگ شکست پر   صبر و سکوں کی رُخ پہ علامت نہیں رہی
ہے زرد زرد رنگ سے افسردگی عیاں
حسرت بھری نگاہ ہے پھر سوئے آسماں

طوفانِ نوح

درد کو دل سونپ کر میں سب سے بے پروا ہوا

ناخدائے سخن تاج الشعراء افصح العصر حضرت نوح ناروی

بن گیا اغماض اَور انداز میں پیدا ہوا
حشر بھی اُٹھا مگر تم نے نہ پوچھا کیا ہوا

پھر رہا ہوں در بدر میں ٹھوکریں کھاتا ہوا
وہ بھی کیا ساعت تھی سر جب مائلِ سودا ہوا

میں نشاط و عیش پا کر غم سے بے پروا ہوا
کام قدرت نے بنایا نام قسمت کا ہوا

حشر مدت سے اسی حسرت میں تھا کھویا ہوا
دو قدم چلنے نہ پائے تم کہ وہ برپا ہوا

ہر بشر ناپید ہونے کے لئے پیدا ہوا
زندگی سب کو ملی لیکن نتیجہ کیا ہوا

اَور کیا ہوتا اگر بڑھتا ہمارا جوشِ اشک
اے خیالِ ضبطِ غم گھٹ کر تو یہ دریا ہوا

جان دے دی سر پٹک کر آستانِ یار پر
اِس طرح پورا مری تقدیر کا لکھا ہوا

دیکھنا دریائے غم میں وہ مرا دل تو نہیں
اِک سفینہ پھر رہا ہے ہر طرف بہتا ہوا

جو گرے دامن پر اشکِ سُرخ وہ گلشن بنے
جو اُڑا ذرہ مرے قدموں سے وہ صحرا ہوا

درد و غم نے دی بشارت یاس و حرماں نے نوید
اللہ اللہ عشق بھی کس حُسن سے پیدا ہوا

تعزیت کو بھی نہ وہ آئے مرے مرنے کے بعد
جان دے دی جان دے دینے کا حاصل کیا ہوا

کیا اثر رکھتی تھی حُسن و عشق کی پہلی کرن
وہ بنے برقِ تجلی دل مرا موسیٰ ہوا

رہ روِ عشق و وفا روکنے والا تھا کون
بڑھ گیا آگے حدودِ غم کو ٹھکراتا ہوا

جس قدر تھی کشمکش مجھ کو ملی وہ بعد قتل
ناخنِ شمشیر سے ہستی کا عُقدہ وا ہوا

چار دن کی زندگی ہیں کچھ دنوں کی عمر میں
کیا بتاؤں کیا کہوں کیا کیا کیا کیا کیا ہوا

ہم نے اُن کو دیکھ کر محشر میں کیوں فریاد کی
[illegible]ق کو بدنام تھا ہی حُسن بھی

بالیقیں نالہ نکل کر دل سے پہنچا عرش تک
دیکھتا ہوں کہ [illegible] میرا آج لہراتا ہوا

چشمِ بد بیں دیکھ سکتی کس طرح میرا عروج
میں برا دنیا سے ٹھہرا یہ بہت اچھا ہوا

گر پڑے تھے جو مری آنکھوں سے ذکرِ حُسن پر
نام اُنہیں چند آنسوؤں کا عشق میں دریا ہوا

کیا کروں میں دل سے آہیں دل مرا نادم نہیں
وہ صدا دے کس طرح جو ساز ہو ٹوٹا ہوا

سلسلۂ الفت ہم نے کن دشواریوں سے ختم کی
ایک اک ذرہ وہاں اپنی جگہ صحرا ہوا

ہم آخر مٹ گئے سب ولولے سب حوصلے
اوّل اوّل عشق میں ایسا ہوا ویسا ہوا

اب وہ سمجھے اور یہ جانے رموزِ آرزو
درد کو دل سونپ کر میں سب سے بے پروا ہوا

میں ہوا بیمار تم نے جب کہا بیمار ہو
اور جب تم نے کہا اچھا ہو میں اچھا ہوا

یہ بھی مجھ سے پوچھتا ہے داخلِ ترکِ ادب
کیوں ہوا ایسا نہ یارب اور کیوں ایسا ہوا

اِس طرح وہ پوچھتے ہیں مجھ سے میرا حالِ دل
پھر بتاؤ پھر کہو ہاں کیا کہا ہاں کیا ہوا

حسرت اُن پر جن کو فکرِ شانِ خودداری بھی
آفریں اُس کو جو کوُئے عشق میں رُسوا ہوا

دردِ دل پر منحصر تھی آرزو کی زندگی
ہم نہ اچھے ہو سکے یہ بھی بہت اچھا ہوا

خاک اڑانے کی حقیقت اے جنوں مجھ سے نہ پوچھ
میں نے جس ذرے کو دی وسعت وہی صحرا ہوا

دینے والے نے مجھے قسمت بھی دی پھوٹی ہوئی
میں نے قسمت سے جو دِل پایا بھی تو ٹوٹا ہوا

اِس طرح جیسے اُنہیں اے نوح آگاہی نہیں
پُوچھتے ہیں حشر کیا طُوفان و کشتی کا ہوا

سیرت سید جمال الدین افغانی

ولادت و تعلیم

از ——— مولانا اظہر امرتسری

مسلمانوں میں سید المفکرین سید جمال الدین افغانی (نور اللہ مرقدہ) کی شخصیت اس شمع کی طرح ہے جو خلوت میں روشن ہوئی اور اس کی تجلیاں میدان شہرت میں آنے سے پہلے ہی آغوش افسردگی میں سو گئیں لیکن ملت اسلامیہ کی مشاہیر فراموشی کا یہ عالم ہے کہ سید صاحب کا دریائے علم و عمل ساری دنیائے اسلام کو سیراب کرنے کے باوجود مسلمانوں سے اپنے فیضان علم کا اعتراف نہیں کرا سکا۔ ان کی شخصیت کو اسلامی نقطۂ نگاہ نے بزم تاریخ میں لانے کی کوشش نہیں کی، یہاں تک کہ ہم ان کی داستان زندگی کے مختلف اجزا کی فراہمی کے لئے بھی محققین یورپ کے خرمن معلومات سے خوشہ چینی کر رہے ہیں۔ سچ پوچھئے تو سید صاحب کی شخصیت و قابلیت کی نقاب کشائی ہی حکمائے مغرب نے کی ورنہ مسلمانوں نے تو ان کی یاد بھی دل سے نکال ڈالی تھی ؎

پڑھی نماز جنازہ تو اپنی غیروں نے
مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے

ولادت

ان کی وفات کو تقریباً ۴۶ سال سے زیادہ نہیں گزرے ہونگے لیکن ہماری محسن فراموشی کا کتنا المناک مظاہرہ ہے کہ ہم ان کے مقام ولادت کے متعلق بھی کوئی صحیح اور فیصلہ کن رائے نہیں قائم کر سکتے۔ بعض کا خیال ہے کہ سید صاحب کے ظہور کا شرف ملک ایران کے ایک غیر معروف گاؤں اسد آباد کو (جو نواح ہمدان میں واقع ہے) حاصل ہے لیکن ارباب تحقیق کا ایک معتدر گروہ اس قیاس سے متفق نہیں۔ اس کا بیان ہے کہ وہ ضلع ہرات (افغانستان) کے ایک گاؤں اسعد آباد میں پردہ سرائے عدم سے بزم وجود میں آئے۔ ان دونوں روایتوں کی صداقت معلوم کرنے کے لئے کسی مستند تاریخی معیار کی ضرورت ہے جس کا حصول ناممکن ہے۔ بدقسمتی سے سید صاحب کا محل ظہور اور وطن کچھ اس درجہ تاریک ماحول میں تھا جہاں تاریخی روشنی کا داخلہ ہی ممنوع ہے بایں ہمہ سید صاحب کے نام کے ساتھ جو لفظ "افغانی" کی نسبت ہے اس سے دوسری روایت قابل اعتماد معلوم ہوتی ہے۔ مشہور محقق شرقیات پروفیسر براؤن کی مہر تصدیق بھی اسی نظریہ پر ثبت ہے۔ سید صاحب نے جو اپنے حالات زندگی لکھے ہیں ان میں بھی اپنے آپ کو افغانی ظاہر کیا ہے لیکن تمام ایرانی محققین صاحب "تاریخ بیداری ایرانیاں" کی ہمنوائی کرتے ہوئے سید صاحب کو اپنا ہم وطن ظاہر کرتے ہیں۔ "افغانی" کے متعلق ان کا خیال ہے کہ چونکہ حکومت ایران اہل سنت والجماعت ایرانیوں کو شہری مراعات کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ اس لئے انھوں نے اپنے آپ کو افغانی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس غلط فہمی کی تردید میں حضرت مولنا ظفر علی خاں صاحب قبلہ کا یہ ارشاد خاص اہمیت رکھتا ہے کہ۔

"ایسی حالت میں جب وہ خود بصراحت بیان کرتے ہیں کہ وہ افغان ہیں صاحب "تاریخ بیداری ایرانیان" اور اس کے ہم آہنگوں کی کمزور اور بودی دلیلیں سید صاحب کے دعوی کی تردید میں باور نہیں کی جا سکتیں۔ اگر ایرانی شیعیت کے خوف سے انھوں نے ایرانی الاصل ہونے کے باوجود اپنے آپ کو افغان مشہور کیا اور شیعان ایران ایسے ہی متعصب ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اسی شیعہ دنیا پر ایک سنی عالم ایسا گہرا اور ہمہ گیر اثر ڈال سکا۔ یہ خیال بھی مضحکہ انگیز ہے کہ چونکہ ان کو ایرانی گورنمنٹ کی نسبت یہ خیال تھا کہ وہ اپنی رعایا کو بچا نہیں سکتی (یا اختلاف مذہب کی بنا پر اس کو شہری حقوق کا استحقاق نہیں دیتی۔ اظہر) لہٰذا وہ افغان کہلانے لگے، یہی خیال تھا تو انھوں نے اپنے آپ کو عثمانی کیوں نہ مشہور کیا۔ اس کے علاوہ بقول پروفیسر براؤن اگر وہ اسد آباد (ایران) ہی میں پیدا ہوئے تھے تو افغانستان کے پالیٹکس سے جو گہرا تعلق انھیں ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۳ء تک رہا۔ اس کی کیا توجیہ کی جا سکتی ہے۔" (سیرت جمال الدین)

مرقومۂ بالا دلائل کی موجودگی میں سید صاحب کے افغان ہونے کے متعلق کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی۔ ورنہ اس سلسلے میں سید صاحب

کی تحریرات کے پیش نظر ایک دلچسپ علمی بحث کا دروازہ کھولا جاسکتا ہے ان کی فارسی تحریریں بلحاظ محاورات اور زبان کے مقامی اثرات کی آئینہ دار [illegible] زبان کی افغنیت نہایت نمایاں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر ایرانی تھے۔ "تاریخ بیداری ایرانیاں" نے محض اپنے وطن کی تاریخ میں [illegible] اضافہ کرنے کی غرض سے ان کو ایرانی بنانے کی [illegible] ورنہ ان کی "افغانیت" روز روشن کی طرح نمایاں ہے

تعلیم

[illegible] صاحب کی تاریخ ولادت میں محققین کو بہت زیادہ اختلاف تھا مگر بحث و تنقید کی معمولی کوشش نے یہ امر قابل تسلیم بنا دیا ہے کہ وہ ۱۸۳۹ء مطابق شوال ۱۲۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید محمد صفدر حسینی سیدا ور صحیح الخیال مسلمان تھے ابتدائی تعلیم و تربیت کے حالات صرف [illegible] صاحب ہی کو معلوم تھے جو اپنے ساتھ قبر میں لے گئے لہذا اس میں کسی مستند معلومات کی روشنی میں گفتگو نہیں کی جاسکتی لیکن جب ہم آج سے ایک صدی پہلے کے افغانستان کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ علمی و تعلیمی اعتبار سے موجودہ حالت سے بھی زیادہ تاریک تھا اس سیاہ ماحول میں اگر کوئی روشنی تھی تو وہ سید صاحب کا ظہور تھا جن کی قابلیت کے پردے میں قدرت نے مستقبل ملت کی تعمیر و تشکیل کے اسباب چھپا رکھے تھے لیکن یہ امر کسی تشریح کا محتاج نہیں کہ اس عہد میں سیاسی چپقلش اس درجہ بڑھ چکی تھی کہ تعلیمی ترقی کا خیال ہی توقع موہوم سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ اس سے ناظرین بلا دقت سمجھ سکتے ہیں کہ اتنے غیر علمی ماحول میں اتنے بڑے قائد فکر و نظر اور علمبردار ترقی و تجدد کی ذہنی تربیت کے اسباب کس درجہ مفقود تھے۔ سید صاحب کی فطری قابلیت اپنی وسعت کے اعتبار سے تعلیم و تعلم کے جس بلند درجہ کی مستحق تھی اس کا تصور بھی ہنوز پیدا نہ ہوا تھا۔ ان کو جس طریقہ تعلیم سے مستفید ہونا پڑا وہ بذات خود مسلمانوں کے علمی زوال اور دماغی تنزل کی پیداوار تھا۔ سید صاحب کو جن اساتذہ سے پالا پڑا ان میں سے کسی ایک کو بھی آغوش شہرت دنیا تاریخ میں آنے کا موقع نہیں ملا۔ ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دماغ کو جس نام نہاد تعلیم کی روشنی میں فکر و خیال کی منزل ترقی تک پہنچنا پڑا۔ وہ بذات خود ذہنی گمراہی کا سبب ہو سکتی تھی لیکن ان کی ذہنیت پر قدرت کی فیاضی سے جو روشنی موجود تھی وہ فی نفسہٖ تنویر ذہن و شعور کے لئے کافی تھی۔ آج سے تقریباً ۱۲ سال پہلے (۱۹۲۸ء) میں مشہور محسن وطن حضرت مولانا برکت اللہ بھوپالی (نور اللہ مرقدہٗ) نے اپنے اخبار "الاصلاح" برلن (جرمنی) میں سید صاحب کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے ابتدائی حالات کے متعلق لکھا تھا کہ۔

"سید جمال الدین افغانی کو قدرت نے اپنی پوشیدہ مصلحتوں کے پیش نظر جس سرزمین میں پیدا کیا تھا اس کے کسی گوشے میں تعلیم و تمدن کی ہلکی سی شعاع بھی موجود نہ تھی اگرچہ افغانستان زمانہ قدیم میں علم و فضل کا مرکز تھا اس کے آفتاب حکمت کی شعاعیں بڑے بڑے پہاڑوں کو پھاند کر سارے ایشیا میں پھیل رہی تھیں لیکن اس زمانہ میں عہد کمال کی وہ روشنی ظلمت جہل و تاریخ فراموشی میں دفن ہو چکی تھی۔ علم کی وسعت کے لئے زیادہ سے زیادہ یہ طریقہ اختیار کیا جاتا کہ ایک ملا منبر پر چراغ رکھ کر فقہ یا حدیث کی کوئی کتاب لیکر بیٹھ جاتا اور چند سعادت مند شاگرد اس کے سامنے بیٹھ جاتے اور استاد کی سادہ اور اعتقادی باتوں پر از راہ سعادتمندی سر دھننے لگتے تھے۔ اگر کوئی نوجوان محض افہام و تفہیم کی غرض سے ملا صاحب کے کسی ارشاد پر کوئی سوال کر بیٹھتا تو اس کے جذبۂ توسیع معلومات کو ڈانٹ ڈپٹ سے دبا دیا جاتا تھا۔ ان سطور سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ سید صاحب کے زمانہ میں جو طریقۂ تعلیم رائج تھا وہ فکری ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ معلم کا مقصد طالبان علم کی ذہنی تربیت کی بجائے اپنی ٹیڑھی قابلیت کا اعتراف و اعلان تھا لیکن فطری روشنی اسباب و ماحول کی تاریکی سے دب نہیں سکتی۔ سید صاحب نے مسجد کی درسگاہ سے جو کچھ بھی حاصل کیا اس کو اپنی فطری روشن دماغی کے قالب میں ڈھال کر اس درجہ منور کر لیا کہ صدیوں کی فرسودہ چیز بھی بالکل نئے فیوض کی حامل ہو کر رہ گئی"۔ (الاصلاح جلد نمبر ۳)

—— اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے سید صاحب کے شاگرد رشید مشہور مصری مفکر مفتی محمد عبدہٗ نے ایک زمانہ میں لکھا تھا کہ۔

"استاذی حضرت سید جمال الدین افغانی کی جو خوبی ہمیں حیران کرتی ہے وہ آپ کی لامحدود علمی قابلیت ہے لیکن جب ہم اس دریائے معارف کے جو آپ کے ارشادات میں موجزن ہے منبع پر غور کرتے ہیں تو وہاں جہل کی ظلمت فشاں موجوں کے بغیر کچھ نظر نہیں آتا منبع سے

ہماری مراد سید صاحب کا وطن اور اس کی دقیانوسی طرز کی درسگاہیں ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر ہمارا یہ قول اعتقادی لغزش کا نتیجہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ آپ حضرت مسیح کی طرح علمی حکمت قسلم ازل سے لیکر آئے تھے جو انسانی حصے سے بہت زیادہ ہے۔" (المنار، قاہرہ)

محمد عقیل علوی المراکشی جن کو سید صاحب کے حلقۂ تلمذ میں رہنے کا فخر حاصل ہے، اپنی کتاب "کواکب مشرق" میں لکھتے ہیں کہ۔

"میں نے سید جمال الدین افغانی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا لیکن جو امر ہمیشہ میری معلومات سے دور رہا وہ آپ کا زمانہ تعلیم ہے میں نے سید صاحب سے بارہا اس مسئلہ پر گفتگو کی۔ میرا خیال تھا کہ آپ کے ارشادات سے مجھے وہ بلند ترین علمی ماحول معلوم ہو جائے گا جو ایک بلند پایہ مدبر و مفکر کی فکر و نظر کے لئے اسباب عروج و ترقی مہیا کر سکتا ہے لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس مسئلے کے متعلق سید صاحب نے جو کچھ بیان کیا وہ میری توقع کے سراسر خلاف تھا۔ اس وقت میری حیرت کی حد نہ رہی جب سید صاحب نے فرمایا کہ ــــ قدرت کی بے نیازی نے مجھے اس سرزمین میں پیدا کیا جہاں صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کے مسائل کے بغیر کسی چیز کی تعلیم مروّج نہ تھی۔ میری فکر و نظر کی اصلاح و تہذیب کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ میں نے رفتار زمانہ سے سبق اندوز ہونے کی کوشش کی۔ دنیا کا ہر لمحہ سیکڑوں انقلابات کی پرورش کا موجب ہے۔ زندگی کی ہر ساعت گردش لیل و نہار کی آئینہ ہی نہیں بلکہ وہ ایک کتاب ہے جس کے غیر منظم اوراق انسانی بصیرت کے سامنے ہزاروں اسباق پیش کرتے ہیں اس لحاظ سے میری تعلیم علمی نہیں بلکہ عملی ہے۔"

ــــ اس روشن ترین دعوی کی تائید میں ایک برطانوی مستشرق کی شہادت ہے جو جریدۂ "اللوی" میں شائع ہوئی تھی کہ۔

"ایشیا کے مشاہیر کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے ہمیں جو امر حیران کرتا ہے وہ ان کی ابتدائی زندگی سے متعلق ہے۔ اس سرزمین کی بڑی بڑی شخصیتیں اپنی شہرت و قابلیت کے لیے مادی اسباب کی کبھی تک محتاج نظر نہیں آتیں۔ اگر چنگیزیوں میں سے ایک بے سر و سامان یتیم حیران ہو کر چنگیز جیسا عدیم النظیر فاتح بن سکتا ہے تو دوسری طرف افغانستان کا ایک دہقان زادہ محض گھریلو تعلیم کی برکت سے سیاسیات عالیہ کے وہ چھپے ہوئے رموز و حقائق منظر عام پر لے آتا ہے جن کے تجسس میں یورپ کا دماغ حکمت اب تک پریشان ہے اس شخص سے میری مراد سید جمال الدین افغانی ہے جس کے خیالات میں اسلامی دنیا کی سیاست غوطہ لگا کر فرانس و انگلستان کے دستوری اصول پر پوری اتر رہی ہے۔"

ان شہادتوں کے بعد یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ سید صاحب ظاہری تعلیم سے پوری طرح بہرہ ور نہیں ہو سکے ان کو اپنی دماغی ترقی کے لئے کتابوں کی جگہ ان فیوض سرمدی سے استفادہ کرنا پڑا جو قدرت نے ان کے لئے خاص طور پر وقف کر دیئے تھے گویا ان کا تعلیمی ماحول ہی ان کو فائدہ پہنچانے کے قابل نہیں تھا اس لئے ان کو اکتسابی قابلیت اور علمی ترقی سے محروم رہنا پڑا۔ ان کی فطرت میں قدرت نے جو جوہر ودیعت کر رکھا تھا وہ بغیر کسی امداد کے وقت و ماحول کے مطابق چمکتا رہا۔ اس لحاظ سے ان کے علمی تبحر کی جو تعبیر ہو سکتی ہے وہ خواجہ حافظ شیرازی کے الفاظ میں یہ ہے ؎

نگارِ من کہ بمکتب برفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

پروفیسر براؤن کا ارشاد

مشہور ماہر شرقیات پروفیسر براؤن نے سید صاحب کی تعلیم کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ۔

"ابھی وہ (سید جمال الدین افغانی) طفولیت ہی میں تھے کہ ان کے والد کابل چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ بچپن ہی سے ان میں دماغی ارتقا اور ذہنی عروج کے آثار پائے جاتے تھے، جب انھوں نے عمر کی آٹھویں منزل میں قدم رکھا تو سید صفدر (والد افغانی) نے اپنے ہونہار بچے کو خود پڑھانا شروع کیا اٹھارہ سال کی عمر میں انھوں نے طب، تشریح، ادیان وغیرہ کل اسلامی علوم و فنون میں فقیہانہ استعداد بہم پہنچائی۔"

پروفیسر براؤن کی قابلیت مسلم۔ ان کا طرز استدلال قابل قبول، ان کی ہمہ دانی واجب الاعتماد، لیکن علمائے مستشرقین یورپ کے طریقۂ تحقیق میں جو نقص پایا جاتا ہے اس کی ہلکی سی جھلک پروفیسر صاحب کے علمی محاسن میں بھی ہو تو تعجب نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پروفیسر براؤن [illegible]

ان کی عقل و فکر اور تلاش و جستجو کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ مشرقیات کے علمی تبحر کے متعلق ان کی محققانہ رائے قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے لیکن سید جمال الدین افغانی کے ابتدائی حالات پر جو تاریکی چھائی ہوئی ہے اس کو پروفیسر صاحب ایسے روشن دماغ محقق کی شمع فکر بھی دور نہ کر سکی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس بارے میں ان کو بھی دوسرے اہل قلم کی طرح محض سنی سنائی باتوں اور وہم و قیاس پر اکتفا کرنا پڑی۔ سید صاحب کی تعلیم کے متعلق جو تفصیل پروفیسر صاحب نے پیش کی ہے اس کو اگر سید صاحب کے زمانہ اور ماحول کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کا [illegible] خود [illegible] جائیگا۔

جب ہم پروفیسر صاحب کی مذکورہ بالا سطور کو تاریخ اور واقعات کی عینک سے دیکھتے ہیں تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ تفصیل محض تحقیقی لغزش کا نتیجہ ہے یا اس غلط فہمی کی پیداوار ہے جو سید صاحب کی قابلیت کے مطالعہ سے ہر شخص کو لاحق ہو جاتی ہے ورنہ سید صاحب کے زمانہ میں افغانستان کا علمی انحطاط حد زوال سے بھی آگے نکل چکا تھا۔ اس عہد میں کسی ایسے مدرسے کے تصور کے لئے بھی گنجائش نہیں جس میں طالبان علم تمام دینی و دنیوی علوم کی تکمیل کر سکیں۔ چنانچہ فخر وطن مولانا برکت اللہ بھوپالی کا جو بیان ہدیہ ناظرین کیا جا چکا ہے اس حقیقت پر روشن ترین شہادت ہے۔ علاوہ ازیں سید صاحب کی اپنی تصریحات جو "کوکب الشرق" کے حوالے سے نذر قارئین ہو چکی ہیں پروفیسر صاحب کے بیان کی قابل اعتماد تردید ہیں۔ رہا سید صاحب کے والد ماجد حضرت صفدر کی ذاتی قابلیت کا مسئلہ تو واقعات اس سلسلے میں بھی پروفیسر صاحب کے بھی مؤید نہیں ہیں۔ ذکی افراد کی قابلیت اور ان کا علمی تبحر قوم کے قائم کئے ہوئے نظام تعلیم اور ملک کے مدارس کے طریقہ تدریس کے مطابق ہوتا ہے لیکن اس زمانے کا افغانستان تو آغوش انقلاب میں کروٹیں لے رہا تھا۔ ملک کے علمی و تعلیمی مشاغل پر سیاسی بدنظمی چھائی ہوئی تھی۔ پرانے نظام پر نئی شورشیں مسلط ہوا چاہتی تھیں۔ ہر شخص اپنے تشویشناک مستقبل کو مامون بنانے کی فکر میں تھا۔ ایسے پر آشوب دور میں دماغی تسکین ہی مفقود تھی اور جب تک یہ چیز میسر نہ آئے کوئی شخصیت یا قوم علم و تعلیم کی دولت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتی۔ جب سید صاحب اور ان کے والد محترم کے زمانہ میں علمی طور پر کوئی ما بہ الامتیاز نہیں تو ہمیں صفدر کی قابلیت کا بھی جمال الدین کی تعلیمی حالت سے اندازہ لگانا پڑتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سید صاحب کے دماغ کو کس چیز نے آفتاب حکمت کا مطلع بنا دیا؟ ہم اس سوال کے جواب میں تفصیل کے ساتھ دلائل پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے صرف مفتی محمد عبدہٗ کے ارشاد پر اکتفا کرتے ہیں کہ:

"ہمارا یہ قول اعتقادی لغزش کا نتیجہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ آپ حضرت مسیح کی طرح قلم ازل سے اتنی علمی حکمت لیکر آئے تھے جو انسانی حصے سے بہت زیادہ ہے۔"

جریدۂ "الہلال" کا بیان

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے جریدہ "الہلال" کلکتہ نے سید صاحب کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل سطور شائع کی تھیں (الہلال کلکتہ ۲۶ اگست ۱۹۱۲ء):-

اس کے وطن (سید جمال الدین افغانی کے) کی طرح اس کی ابتدائی زندگی کے حالات پر بھی ظن و تخمین کے پردے پڑے ہوئے ہیں تاہم یہ قطعی ہے کہ تعلیم و تربیت کا اسے کوئی موقع ایسا نہیں ملا جو کسی اعتبار سے بھی ممتاز و قابل ذکر ہو۔ انیسویں صدی کے کامل تنزل یافتہ افغانستان اور پنجاب کے علماء اپنے گھروں اور مسجدوں میں عالم رئیسی کی جیسی کچھ تعلیم دیا کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ تعلیم جو اس نے حاصل کی تھی وہ بھی وہی تھی۔ جن استادوں سے اس نے تعلیم حاصل کی وہ بھی یقیناً معمولی درجہ کے تھے۔ ان میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کی علمی شخصیت قابل ذکر ہو۔ دنیا کے نئے تمدنی انقلاب اور نئے علوم سے آشنا ہونے کا بھی اسے کوئی خاص موقع نہیں ملا۔ اس کا ابتدائی زمانہ زیادہ تر افغانستان میں بسر ہوا تھا یا ایک روایت کے مطابق ایران میں (اس روایت کی تکذیب ابتدائی سطور میں ہو چکی ہے) یہ دونوں مقامات اس وقت مغربی تمدن و علوم کی تعلیم و تعلم کا کوئی سامان نہیں رکھتے تھے۔

صحبت و معاشرت بھی اکتسابی تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے بلکہ بسا اوقات درس و تدریس باقاعدہ تعلیم سے بھی کہیں زیادہ مؤثر ہوتی ہے لیکن جہاں تک اس کی زندگی کے حالات روشنی میں آئے ہیں کوئی قرینہ اس کا موجود نہیں کہ اسے مشرق و ایشیا کی عام مقلدانہ اور رسمی سطح سے کوئی بلند درجہ کی صحبت ملی ہو۔ سیر و سیاحت بھی ذہنی نشو و ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لیکن اس نے اپنی ابتدائی زندگی میں ہندوستان اور حجاز کے سوا

اور کسی مقام کا سفر نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں مقامات میں کوئی سرچشمہ ایسا موجود نہ تھا جس سے ایک مجتہدانہ فکر و نظر کی پیدائش ہو سکے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں ان دونوں مقامات کا علمی تنزل منتہائے کمال تک پہنچ چکا تھا بحث کا نتیجہ یہ کہ اس نے جتنی بھی اور جیسی کچھ بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ وہی تعلیم تھی جو بجائے خود مسلمانوں کے ذہنی تنزل کی پیداوار ہے اور کئی صدیوں سے اسلامی دنیا کے دماغی تنزل کا سب سے بڑا سبب بن گئی ہے۔ اس تعلیم سے ذہن و فکر کی تمام قوتیں پژمردہ ہو جاتی ہیں لیکن آزادانہ نشو و نما نہیں پا سکتیں۔"

علاوہ ازیں مسٹر بلنٹ مستند شہادتوں کی موجودگی میں لکھتے ہیں کہ سید صاحب کو تعلیم و تحصیل علم کا کوئی اچھا موقع میسر نہیں آسکا تھا۔ پس اتنی مستند اور قابل اعتماد شہادتوں کے بعد پروفیسر براؤن کے ارشاد کو ذہن تحقیق کسی شرط پر بھی قبول نہیں کر سکتا اس مسئلے پر ہر بالغ نظر کو یہی کہنا پڑیگا کہ ابتدائی عمر میں سید صاحب اعلیٰ تعلیم کے مواقع حاصل کرنے سے محروم رہے البتہ ان کی فطری استعداد حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ ان کا ذہن اس درجہ قابل تھا کہ جو حکمت دوسرے لوگ برسوں میں نہیں سیکھ سکتے وہ دنوں میں حاصل کر لیتے۔ ان کا آئینۂ دماغ ہر علمی جلوے کو ہر وقت قبول کرنے کے لئے تیار رہتا اور جس زبان یا علم کی طرف وہ توجہ مبذول کرتے اپنی فطری صلاحیت کے باعث بہت جلد اس میں کامیاب ہو جاتے۔ وہ حیرت انگیز طور پر دماغی قوت کے مالک تھے انھوں نے ذرا سی کوشش سے انگریزی اور فرانسیسی سیکھ لی۔ جس ملک میں پہنچے چند ہی دن میں اس کی سیاسیات کے عمیق ترین رموز و اسرار پر ناقدانہ بحث کرنے کے قابل ہو گئے۔ ان کی فکر بہت جلد پرواز کرنے کی عادی تھی جس پیچیدہ سے پیچیدہ واقعہ پر انھوں نے نظر ڈالی اس کے مستقبل اور غیر اختیاری نتائج کی بھی صحیح ترین تصویر کھینچکر رکھدی چنانچہ ان کی دور بینی اور صحیح فہمی کا یہ زندہ جاوید معجزہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ زمانے میں سیکڑوں انقلابات آئے اور سیاسیات عالم کی بنیادیں متزلزل کرتے ہوئے چلے گئے لیکن ان کے نتائج پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ان میں سید صاحب کی توقعات کی عملی صورت نظر آتی ہے۔ ترکی سیکڑوں حوادث کی ٹھوکریں کھانے کے بعد جب میدان سیاسیات میں ایک خود اعتماد کی حیثیت سے نکلا تو اس کی روش و حرکت کے آئینے سے سید صاحب کی تعلیمات کے جلوے نظر آنے لگے۔ ایران قاچاری ملوکیت کے جور و ستم کا خاتمہ کرنے کے بعد سید صاحب کے ارشادات کا عملی نمونہ بن رہا ہے۔ مصر میں ان کی مجاہدانہ

اور حریت پسندانہ سرگرمیوں کے متحرک نتائج کبھی زغلول اور کبھی نحاس کی صورت میں رونما ہوتے رہے ہیں۔ افغانستان کے متعلق سنہ ۱۹۱۹ء کی جنگ حریت ہمیشہ یادگار رہے گی جب غازی امان اللہ خاں کی شمشیر بے نیام نے مادر وطن کے پاؤں سے زنجیر غلامی کاٹ کر سید صاحب کے نقش آرزو میں رنگ عمل بھر دیا۔ غرضیکہ آج دنیائے اسلام میں خودداری و حریت کے جس قدر ہنگامے برپا ہیں سب کا مصدر سید صاحب کا آوازۂ بیداری ہے لیکن قدرت نے ان کی زندگی میں حالات کو اس درجہ بگاڑے رکھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی ایک حسرت کو بھی پورا ہوتا دیکھ نہ سکے بقول مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

گر گوش بصیرت ہیں آج بھی ان کی صدائے اخوت آرہی ہے۔ اسلامی ممالک کی جدید ترقی بزبان حال بتا رہی ہے کہ مشرق جمال الدین کا پیغام قبول کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ اور وہ دن نزدیک آ رہا ہے جب ان کی تصویر تمنا میں رنگ عمل بھر کر دکھا دیا جائے گا۔

بہرحال ہمیں اس تفصیل کے بعد یہی نظریہ قائم کرنا پڑتا ہے کہ سید صاحب کی ابتدائی زندگی جس ماحول میں مدارج ترقی طے کرنے پر مجبور کی گئی وہ قدامت پسندانہ نقطۂ نگاہ سے چاہے کتنا ہی روشن ہو لیکن اس میں ان اسباب کا فقدان تھا جو مصلحانہ فکر و نظر اور مجددانہ ذہن و دماغ کی پرورش کر سکتے ہیں لیکن ان کی ذہنیت مقلدانہ علمی قناعت کی موید نہیں تھی۔ وہ حروف اور الفاظ کی پرستش ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ایک متجسس حکمت کی حیثیت سے جو کچھ حاصل کرتے اس کے تمام افادی پہلوؤں پر دانش و فکر کی روشنی میں غور کرتے اور ان کے نتائج کو دماغ میں محفوظ کر لیتے۔ بایں ہمہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں عمر کمال میں ترقی تعلیم کے بہت سے مواقع اتفاقی طور پر میسر آتے رہے لیکن ان موقعوں پر بھی ان کی معلمانہ شخصیت تعلیمی تلمذ پر غالب رہی۔ اس اجمال کی تفصیل انشاء اللہ بشرط فرصت کبھی کی جائیگی یہاں صرف اتنا بتانے کے بعد بحث ختم کی جاتی ہے کہ انھیں اسباب و وسائل کے فقدان کی وجہ سے جیسی بھی تعلیم میسر آسکی اس کی تحصیل میں انھوں نے انتہائی شغف و انہماک سے کام لیا اس تعلیم کا ذریعۂ تحصیل خواہ سید محمد صفدر کی قابلیت ہو یا مساجد کے مولویوں کا حلقۂ تدریس — ہمیں اس سے بحث نہیں، لیکن یہ امر مسلم ہے کہ ان کی مفکرانہ تلاش نے علم و حکمت کی ایسی راہیں خود بخود دریافت کر لیں جن سے ان کے اساتذہ کا تصور بھی نا واقف تھا۔

ماسٹر صاحب

نفسیاتی افسانہ

از جناب سید شمیم العزمی

شیکسپیر نے زندگی کی تعریف کرتے ہوئے اسے "شادی وغم" کا مجموعہ لکھا ہے۔ لیکن راما راؤ! اس کی زندگی عبارت تھی صرف آہوں اور سسکیوں سے۔ خوشی! نہ معلوم اس کا وجود ہے بھی یا نہیں؟ کم از کم اس کی زندگی اس سے نا آشنا تھی۔

طفلانہ خواہشوں کا خون، معصوم آرزوؤں کا سسک سسک کے دم توڑنا، صدمات کا بارِ گراں اور غموں کا لا متناہی سلسلہ، زندگی کی ہر امنگ بھری سانس کو گھونٹ نہ دے تو کیا کرے؟ سوتیلی ماں کی زیادتیوں کے سبب زندگی میں کبھی چین نصیب نہ ہوا۔ ہوش سنبھالتے ہی اپنی دنیا کو غم و آلام سے گھرا پایا۔

دنیا میں خوشی ہے۔ چاہے وہ عارضی ہی سہی یا ایک حسین فریب ہی، اس سے راما راؤ کو انکار نہیں تھا، اور ہوتا بھی کیسے جب وہ بچشم خود اپنے سوتیلے بھائی بہنوں کی پرمسرت زندگی کو دیکھتے تھے۔ فروتری کے احساس نے بڑھتے بڑھتے امنگ بھرے جذبات کی دنیا کو کچل کر رکھ دیا —— "دوسروں کے لئے دنیا ایک فردوسِ مسرت ہے اور میرے لئے؟ آہ میرے لئے غموں کا دوزخ! —— آخر مجھ سے یہ انتقام کیوں لئے جا رہا ہے؟"

یہی درد انگیز استفسار تھے ماسٹر صاحب کی زندگی کا راز تھا جسے بیچارے ننھے ننھے طالب علم کیا سمجھتے؟

راما راؤ کی شخصیت ایک معمہ تھی، ناقابلِ فہم، احساس کمتری نے مزاج میں ایک انتقامی جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ دنیا کے ذرہ ذرہ سے انتقام لینے کی آگ ان کے سینے میں بھڑک رہی تھی۔ "کاش وہ اتنے با اختیار ہو سکتے ——! محبت اور ہمدردی بے معنی الفاظ کے دو ڈھانچے بے اثر اور بے جان!"

لڑکے ان کے نام سے ہوّا کی طرح خوفزدہ تھے۔ پیشانی کی مستقل شکنیں، چہرے کی دائمی وحشت، آنکھوں میں عجیب اضطراب اور کچھ کھچاوٹ —— آواز محبت کے لوچ اور ہمدردی کی شیرینی سے بالکل خالی، ایک سازِ نیم پائندہ کی جھنکار۔

انتقام کا ایک ذی حس مجسمہ!

"موہن کو بڑا تیز بخار ہے ماسٹر صاحب!" ایک لڑکے نے کہا۔ "اس کی ماں کہہ رہی تھی کہ کل مدرسے سے گھر آیا تب ہی سے بخار چڑھا ہے۔"

راما راؤ نے ڈانٹ بتائی، بیچارا سہم کے بیٹھ گیا۔

موہن جماعت کا سب سے ذہین لڑکا تھا۔ کل ذرا سی بات پر ماسٹر صاحب نے اسے اتنی بری طرح مارا کہ دوسرے لڑکوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے مگر ماسٹر صاحب کا دل نہ پگھلا۔

اگلے روز خبر آئی کہ موہن گذر گیا۔ تمام رات اُسے بخار رہا۔ بخار کی شدت میں چونک چونک کر وہ ماسٹر صاحب کا نام لیتا تھا۔ غریب بیوہ ماں کے ارمانوں کی دنیا اس کی نگاہوں کے سامنے اجاڑی جا رہی تھی اور وہ گھبرا گھبرا کے تڑپ تڑپ کے رہ جاتی تھی۔ ہائے وہ کس سے فریاد کرے کس سے کہے کہ کل سنسار میں تنہا موہن کی ذات اس کی زندگی کا سہارا،

آخر ایڑیاں رگڑ رگڑ کے بڑے کرب کی حالت میں موہن نے دم توڑ دیا۔ راما راؤ نے سنا۔ ان کے لبوں پر ایک فاتحانہ تبسم تھا۔ بیوہ ماں کی آہ و بکا، ان کی کچلی ہوئی روح اور ان کے انتقامی جذبات سے لبریز دل کے لئے فردوسی نغمات تھے۔

اُف مجروح روح کا انتقام ——!

لڑکوں کے دل ماسٹر صاحب کی طرف سے اور پھر گئے۔ آہ! اتنی بے رحمی؟ ان کا رُواں رُواں کانپ گیا۔

رات کے وقت راما راؤ کو موہن کا خیال آیا، جس کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں کے سامنے ایک سسکیاں بھرتا اشکبار چہرہ آگیا۔ کتنا خوفزدہ اور کتنا معصوم! ان کے خوابیدہ ضمیر کے لبوں سے ایک دبی ہوئی آواز آئی —— "راما راؤ! تم ڈاکو ہو، تم قاتل ہو، تم نے ایک بیوہ ماں کی زندگی کا سرمایہ لوٹ لیا۔ تم نے موہن کو مار ڈالا۔"

راما راؤ نے خود بخود ایک قہقہہ مارا اور ایسا معلوم ہوا گویا قہقہے کی بھیانک آواز سے ڈر کر موہن نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

انتقام کو کچھ تسکین ہوتی۔

راجو نے نرمی سے کہا۔ "ماسٹر صاحب اس بے زبان جانور نے آپ کا کیا بگاڑا ہے ــــــ؟"

صبح صبح راما راؤ رسوئی بنا رہے تھے۔ اتنے میں کسی ضرورت سے وہ کوٹھری میں چلے گئے راجو کی گائے کی جو شامت آئی تو رسوئی میں گھس کر ایک پھلکا کھا گئی۔ بس پھر کیا تھا قیامت آگئی راما راؤ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ان کا بھاری ڈنڈا تھا اور گائے کی پشت۔ وہ بھول گئے کہ گئو پالن ان کے دھرم کا کتنا بڑا رکن ہے۔ مذہب اور انسانیت دونوں ہی نقطہ نظر سے وہ مہاپاپ کے مرتکب ہو رہے تھے۔ راجو سے نہ رہا گیا۔ آخر انسان تھا، پھر گائے بھی اپنی۔

"ماسٹر صاحب اس بے زبان جانور نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟"

ماسٹر صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"میری محنت رائگاں گئی۔ میرا پھلکا کھا لیا، میرے چوکے میں گھس آئی۔ میرا کچھ بگاڑا ہی نہیں" راجو مسکرا دیا۔

"ماسٹر صاحب ایک پھلکے کے کارن بے زبان جانور کو پیٹنا کہاں کا دھرم کرم ہے؟"

"میں دھرم کرم نہیں جانتا" راما راؤ نے بگڑ کے کہا۔ "دنیا مجھ پر ظلم کرتی چلی جائے۔ میں انتقام نہ لوں۔ یہی اگر دھرم ہے تو میں ایسے دھرم پر لعنت بھیجتا ہوں"

بچارا راجو ایک جاہل کاشتکار سہی، لیکن وہ ایک ہزیمت خوردہ انسان کے مجروح دل کی پکار پہچان گیا۔ وہ جان گیا کہ راما راؤ اس معاملے میں کتنے قابل رحم ہیں۔ ان کی فطرت زخمی ہے، ان کی روح کچل ڈالی گئی ہے۔ ان کی رگ رگ ناسور ہے اور یہ جذبہ انتقام اسی درد کی تڑپ ہے۔ اس نے ہمدردانہ نظروں سے انھیں دیکھا۔

"ٹھیک ہے ماسٹر صاحب اب آپ کو ضرور بدلہ لینا چاہئے۔ کہئے تو میں گائے پکڑے لیتا ہوں، خوب جی بھر کر مار لیجئے"

راما راؤ نے راجو کی طرف دیکھا۔ راجو نے اور زیادہ افسوس اور ہمدردی کے لہجہ میں کہا۔ "واقعی آپ کو اس کی وجہ سے بہت پریشانی اٹھانی پڑی۔ اگر کوئی ہرج نہ ہو تو لایئے میں ہی آپ کی رسوئی کر دوں"

راما راؤ کچھ شرما سے گئے۔

"نہیں نہیں، آپ کہاں پکائیں گے؟" وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے لیکن راجو نہ مانا۔

"واہ، آپ کو بڑی دیر ہو گئی۔ آپ اور کام کیجئے۔ میں جلدی سے رسوئی کئے دیتا ہوں ورنہ آپ کو بھوکا ہی اسکول جانا پڑے گا" راما راؤ نے بہت انکار کیا بھلا راجو انھیں بھوکا کیسے جانے دیتا۔

راما راؤ اسکول چلے گئے۔ لیکن تمام دن ایک عجیب ادھیڑ بن میں رہے۔ نہ معلوم کیوں؟

"آخر راجو نے ان کی روٹی کیوں پکائی، کیا اس کی کوئی غرض تھی؟" یہ استفسار راما راؤ کے دل میں خلجان پیدا کئے دے رہا تھا لیکن بھلا مجھ سے کسی کی کیا غرض اٹک سکتی ہے؟

اٹھارہ روپیہ مہینہ کا ایک غریب اسکول ماسٹر!

فروتری کا احساس کتنی جلدی اپنی کم مائگی اور بے بضاعتی کی کہانی دہرانے لگا آخر راما راؤ نے جلد ہی خیالات کا یہ طلسم توڑ دیا۔

"راجو نے میرے ساتھ کوئی احسان نہیں کیا۔ اس کی گائے نے میرا نقصان کیا اس کا فرض تھا کہ اس کی تلافی کرے" کتنی ہٹ دھرمی تھی فیصلہ میں۔ راجو کے متعلق جو ذرا سا حسن ظن انھیں ہو چلا تھا وہ فوراً ہی انتہائی غصے اور نفرت میں بدل گیا۔

راجو رات کو شہر سے پلٹا ضعیفی کا عالم۔ دن بھر کی تکان، پانی پیتے ہی جی بگڑ گیا۔ جھونپڑی بستی سے باہر، سوائے ماسٹر صاحب کے گھر کے اور کوئی گھر آس پاس نہیں۔ بچاری پاربتی تنہا، باپ کی حالت دیکھ دیکھ کے کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ اندھیری رات ایک نوجوان لڑکی، کیا کرے کس کے پاس جائے اور چلی جائے تو باپ کو کس پر چھوڑے؟

"ہائے یہ تو بالکل بے سدھ ہوئے جا رہے ہیں" بصد مجبوری ماسٹر صاحب ہی کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ شرم و خوف دامنگیر، نہ معلوم ماسٹر صاحب کیسی طبیعت کے آدمی ہوں۔ بدمزاج تو پرلے درجہ کے مشہور ہیں۔

ماسٹر صاحب نے دروازہ کھول دیا۔ "کون؟"

"ماسٹر صاحب!" شرمائی ہوئی لڑکی نے انتہائی شرمگین لہجہ میں کہا "پتا جی کی حالت بہت خراب ہے"

"تو میں کیا کروں؟" ماسٹر صاحب نے انتہائی ترشروئی سے کہا۔

کس قدر مایوس کن اور غیر ہمدردانہ جواب تھا۔ پاربتی نے جھجک کے ماسٹر صاحب کے چہرہ پر نظر ڈالی ـ لیکن ہائے رے ضرورت!

"ذرا مہربانی کرکے گاؤں سے وید جی کو بلا دیجئے۔ میں چلی جاتی۔ لیکن پتا جی اکیلے رہ جائیں گے"

"لیکن اب بھی تو اکیلا چھوڑ کے آئی ہو" راما راؤ نے سرد مہری سے جواب دیا۔

لڑکی بالکل نا امید ہو گئی۔ کیا یہ آدمی ہیں؟

"رستہ خراب ہے۔" وہ کہتے کہتے شرما گئی۔ "رات کا وقت۔"

انسانیت اور اخلاق کے نام پر کتنی پُر درد اپیل تھی۔ "لیکن میں نہیں جا سکتا۔" کتنا روکھا جواب تھا۔ انسانیت سوز اور اخلاق شکن!

پاربتی تلملا گئی۔ میں ناحق ایسے بھیڑیے کے پاس آئی۔ اس کی آنکھوں سے غصہ اور رنج کے مارے آنسو نکل آئے۔ وہ سر جھکائے واپس چلی آئی۔ ماما راؤ کے لبوں پر ایک نفرت آمیز تبسم تھا۔ انھوں نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔

"ماسٹر صاحب نے میری بے بسی دیکھ کے بھی کیسا دو ٹوک جواب دے دیا۔" وہ خود گاؤں کی طرف چل دی۔ "مجھے پہلے ہی چلے جانا چاہئے تھا۔"

راجو دو تین روز میں پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ پاربتی نے ماسٹر صاحب کی کم ظرفی کی داستان سنائی۔ راجو کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"پربتی! یہ دنیا کا قصور ہے، ماسٹر صاحب کا نہیں۔" لیکن یہ بات پاربتی کی سمجھ میں نہ آئی۔ ماسٹر صاحب کے فعل کی مجرم دنیا کیسے ٹھہرائی جا سکتی ہے؟ اس کا معصوم دماغ یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

اب راما راؤ کی باری تھی——!

گرمی کی شدت، لو کے خوفناک تھپیڑے۔ جسم جھلسا جا رہا تھا۔ راما راؤ مدرسے سے واپس چلے۔ گھر پہنچتے پہنچتے جسم سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ چہرہ تمتما اٹھا۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں، ہاتھ پیر بے قابو ہو گئے۔ آتے ہی چارپائی پر گر گئے اور گرتے ہی بیہوش۔ کتنی بے بسی تھی۔ تشنگی کے سبب زبان تالو سے لگ گئی۔ بخار کی شدت سے آنکھیں ابل آئیں۔ مذبوحہ کی طرح تڑپ رہے تھے مگر کوئی اپنا تھا نہ پرایا—— وائے بیکسی و تنہائی!

راجو بیلوں کی رسی پکڑے۔ جھکے ہوئے قدموں سے گھر آ رہا تھا۔ آفتاب آم کے ہرے بھرے پیڑوں کے پیچھے آہستہ آہستہ دم توڑ رہا تھا۔ اس نے ماسٹر صاحب کے گھر کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صحن میں برتن باسن ادھر ادھر پڑے ہوئے تھے۔ ایک کتا بڑے اطمینان سے ٹانگ اٹھائے چوکے میں پیشاب کر رہا تھا۔

"آج یہ ماسٹر صاحب کہاں چلے گئے۔" راجو نے حیرت سے دروازے میں جھانک کے دیکھا۔ کتا اس کی ٹانگوں میں سے نکل کے بھاگ گیا۔ "ماسٹر صاحب تو کبھی گھر ایسے نہیں چھوڑتے۔" اس نے بیلوں کو باہر چھوڑ دیا۔

"اُف!" کمرے میں قدم رکھتے ہی راجو کے ہوش اڑ گئے۔ ماسٹر صاحب چارپائی پر بالکل بے سُدھ پڑے تھے۔ زبان باہر نکل آئی تھی۔ چہرے پر مُردنی چھا گئی تھی۔ آنکھیں حلقوں سے نکلی پڑتی تھیں۔ اس نے گھبرا کے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ بدن آگ ہو رہا تھا۔ نہ معلوم کب سے ایسے پڑے ہیں؟

مہربان راجو کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ وہ کتنی جلدی پاربتی کی وہ بے بسی اور رات کی بھیانک تاریکی بھول گیا جب اسی دروازے سے ایک پریشاں حال لڑکی دھتکار دی گئی تھی۔ اس نے لپک کر بستی سے دو آدمیوں کو پکڑا اور راما راؤ کو اپنی جھونپڑی میں اٹھا لایا۔

ہر چند پاربتی ماسٹر صاحب سے نفرت کرتی تھی لیکن ایسی حالت میں دیکھ کے وہ بھی گھبرا گئی۔ اس کا سب تنفر ہمدردی کے جوش میں ڈوب گیا۔ تمام رات دونوں نے راما راؤ کی تیمارداری میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ پاربتی نے اس انہماک اور خلوص سے خدمت کی کہ راما راؤ کا شمار ایک دفعہ پھر زندوں میں ہونے لگا—— لیکن یہ راما راؤ! آہ کوئی راما راؤ کے دل کی کیفیت دیکھتا۔ وہ حیران تھے کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔

"لوئیل" کا قول اگر غلط نہیں تو یقیناً راجو اور پاربتی کی پُرخلوص اور حقیقی ہمدردی بھی ایک شمع تھی جس نے راما راؤ کے قریب ہوتے ہی ان کے "چراغ" کو بھی روشن کر دیا۔

آج ایک پگھلی ہوئی روح گرم گرم اشکوں سے اپنے زخم دھو رہی تھی۔ پاربتی نے انھیں روتے دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

راما راؤ بھی ہمدردی کے کتنے بھوکے تھے——! آج اسے یہ بھی معلوم ہو گیا—— ان کا انتقامی جذبہ صرف دنیا کی بیدادگری کا نوحہ تھا۔ راجو، ایک روح کا اضطراب دور کر کے، ایک دل کا کانٹا نکال کے کتنا مسرور تھا——؟

اس کا ثبوت اس کے لبوں کا مطمئن تبسم تھا۔

لڑکوں کی حیرت اور خوشی کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

وہی ماسٹر صاحب جو موہن کے مرنے کے بعد سے برادر عزرائیل سمجھے جاتے تھے—— اب لڑکوں کے ایک بے تکلف اور شفیق دوست تھے جو انھیں طرح طرح کی کہانیوں اور نت نئے ہنسی کے کھیلوں سے اپنا گرویدہ بنائے ہوئے تھے۔

شرابِ ارغوانی

دیارِ حسن کی ہم نے بھی کچھ دن خاک چھانی ہے

از حضرت محوی صدیقی لکھنوی

فضا کے دوش پر ساقی ردائے آسمانی ہے
ذرا لانا کہاں تیری شرابِ ارغوانی ہے

بجا ہے حسن فانی، عارضی رنگ جوانی ہے
مگر ہوں مطمئن ہمدم! محبت غیر فانی ہے

نظر بھی اب نہیں اٹھتی یہ زورِ ناتوانی ہے
نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں یہ کیسی سخت جانی ہے

ابھی تک یاد وہ عہدِ جنوں یعنی جوانی ہے
دیارِ حسن کی ہم نے بھی کچھ دن خاک چھانی ہے

اِدھر بھی اک نظر فرصت جو ہو اے شورشِ محشر
زبانِ حال اک مظلوم غم کی بے زبانی ہے

نگاہِ شوق بھی ناکام ذوقِ عشق بھی رسوا
مگر دل ہے کہ سرشارِ فریب شادمانی ہے

نہ ہوگا غرق گر منجدھار میں بیڑا تو کیا ہوگا
محبت دل کی اندھی اور دیوانی جوانی ہے

زہے تقدیر رسوائی محبت رنگ اب لائی
ہمیں سے بدگمانی ہے ہمیں سے سرگرانی ہے

خبردار اس کو اے سوزِ دروں ہرگز نہ آنچ آئے
یہ دل کا گوشۂ خلوت یہ اُن کی راجدھانی ہے

نہیں جب خاک بھی باقی دلِ برباد یاد آیا
وفا کی قدردانی ہے جفا کی مہربانی ہے

نہ تابِ ہمکلامی ہو نہ تابِ ہم نگاہی ہو
محبت میں جبھی قدموں پہ تاجِ کامرانی ہے

نہ آئیں آپ بالیں پر اجل تو آ ہی جائیگی
بہرصورت مجھے اپنی لگی دل کی بجھانی ہے

گھٹا آئی تو محوی اور بھی افسردگی چھائی
نہیں ہے آتشِ سیال تو دل پانی پانی ہے

ٹیپو سلطان کی رواداری

تحقیقی مقالہ

از جناب پروفیسر محمد علم الدین سالک ایم۔ اے

سیاسی تاریخ کا شکار

جان کیئی اپنی مشہور کتاب "ہسٹری آف دی سپائی وار" میں لکھتا ہے کہ۔

"ہم لوگوں کا یہ عام طریقہ ہے کہ پہلے کسی دیسی حکمران کی سلطنت پر قبضہ کرتے ہیں پھر اس کے معزول بادشاہ کو بدنام کرتے ہیں"

یہ مقولہ اپنے اندر کس قدر صداقت رکھتا ہے؟ اس کا جواب اس علمی تحقیق سے مل رہا ہے جو آج ہمارے سامنے مختلف حیثیتوں سے آرہی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ آج جو تاریخیں ہمیں پڑھائی جاتی ہیں وہ سیاسی اغراض کو مدنظر رکھ کر مرتب کی گئی ہیں اور جوں جوں مورخوں کے قلم آزاد ہوتے جائینگے حقیقت کے چہرے سے خودبخود نقاب ہٹتی جائے گی اور اصلیت سامنے آتی جائیگی۔

اس قسم کی سیاسی تاریخ کا شکار سلطان ٹیپو بھی ہے۔ اس کی شخصیت پر کیچڑ اچھالنے کے لئے واقعات کو نئے نئے سانچوں میں ڈھالا گیا۔ انگریز مورخ اسے اپنا سب سے بڑا سیاسی حریف تصور کرتے ہیں اور بڑے زور شور سے کہتے ہیں کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مستعمرانہ عزائم کا زبردست مخالف تھا۔ اس کی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز تھی کہ جنوبی ہندوستان سے انگریزی اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ اس کی یہ حوصلہ مندی کمپنی کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔ اور کمپنی نے اسے مٹانے کے لئے پورا پورا زور صرف کیا۔ اس لئے جہاں سلطان کا ذکر آتا ہے عیسائی مورخوں کے قلم سے بے اختیار زہر ٹپکنا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس نے انگریز قیدیوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔ وہ تنگ نظر اور متعصب مسلمان تھا۔ یہ وہ الزامات ہیں جنھیں بار بار دہرایا جاتا ہے اور مختلف رنگوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ مگر جب ان کے متعلق غیر جانبدارانہ طریقہ پر تفتیش کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض فرضی قصے ہیں جو محض سلطان کو بدنام کرنے کے لئے تراشے گئے ہیں۔ ان افسانوں کا مصنف محض کپتان بیرڈ ہے مگر سب جانتے ہیں کہ سلطان ٹیپو کی قید میں صرف کپتان بیرڈ ہی نہ تھا اور بھی انگریز تھے۔ مگر ان میں سے کسی کو سلطان کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ ہوئی بلکہ انھوں نے سلطان کی بلند حوصلگی اور حسن سلوک کی جابجا تعریف کی ہے۔ معلوم نہیں سلطان ٹیپو پر الزام لگانے والے اس طرف سے کیوں آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ میسور کی جنگوں میں جو ہندوستانی انگریزوں کے ہاں گرفتار رہے ان کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا گیا۔ اور سرنگا پٹم پر قبضہ کرنے کے بعد انھوں نے وہاں کی رعایا سے کس قسم کا برتاؤ کیا۔ مارکوئیس آف ویلزلی کے مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ جب کمپنی کی فوجیں سرنگا پٹم میں داخل ہوئیں تو انھوں نے وہاں کی رعایا پر اس قدر سختی کی کہ گورنر جنرل کو بار بار انھیں لکھنا پڑا اور کئی بار سرزنش کرنی پڑی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت کے حالات کا موازنہ آج کے حالات سے کیوں کیا جاتا ہے؟ جب کہ اس وقت کے حالات کے بموجب سلطان کا سلوک جنگی قیدیوں کے ساتھ نہایت عمدہ تھا۔

تعصب اور تنگ نظری

تنگ نظری اور تعصب! —— یہ وہ عام الفاظ ہیں جو شاہان اسلام کے خلاف اکثر استعمال کئے جاتے ہیں اور اب بھی ہمارے ملک کی فضا اسی سے گونج رہی ہے حالانکہ مسلمانوں کی رواداری اور فراخ مشربی مسلم تھی۔ اس کے مقابلہ میں کوئی قوم رواداری کی ایسی شاندار مثالیں پیش نہیں کر سکتی۔

جن ایام میں سلطان ٹیپو میسور کا مطلق العنان بادشاہ تھا انگلستان میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے یسوع مسیح کے پرستاروں کی یہ دونوں جماعتیں محض اختلاف عقاید کی بنا پر تمام یورپ میں ایک دوسرے کو مٹا رہی تھی۔ انسانوں پر انسانیت سوز مظالم توڑے جاتے تھے، اخلاق، مروت، انسانیت اور شرافت شیوہ جیا کی وجہ سے ان کی قساوت قلبی پر ماتم کر رہے تھے۔ یہ حالات یہیں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ یہودیوں پر انسانی تہذیب کے ان علمبرداروں کی بدولت عرصہ حیات تنگ ہو رہا تھا انھیں انسانیت کے اولیں اور ابتدائی حقوق سے محروم کرکے ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ مگر

...ب بھی الزام لگا دینے سے یا انگریزوں یا اہل یورپ کو ... اور تنگ نظر ثابت کر دینے سے ٹیپو سلطان کی برئیت نہیں ہو سکتی اس لئے ہمیں ایک غیر جانبدار مورخ کی حیثیت سے ٹیپو سلطان کے عہد حکومت کا جائزہ لینا اور واقعات کی روشنی میں دیکھنا ہوگا کہ وہ ہندو مسلم عیسائی اور غیر عیسائی کو کس نظر سے دیکھتا تھا اور ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھتا تھا؟

جیمز مل کی رائے

جیمز مل ایک بالغ نظر انگریز مورخ ہے اس نے برٹش انڈیا کی ایک مفصل تاریخ لکھی ہے جو بیحد دلچسپ اور حقائق سے لبریز ہے۔ اس نے اپنے استدلال اور بیان کی بنیاد صحیح تاریخی ماخذوں پر رکھی ہے اور نسلی تعصبات سے بالاتر ہو کر اس تاریخ کو مرتب کیا ہے۔ اس لئے اس کی یہ تاریخ ہر عہد کے مورخ کی نظروں میں نہایت بلند پایہ رکھتی ہے۔ وہ سلطان کے متعلق لکھتا ہے:

"ٹیپو کی طبیعت میں مذہب کا پہلو خاص طور پر نمایاں تھا مذہب نے اس کے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ اس کے وقت کا زیادہ حصہ خداوند تعالیٰ کی عبادت میں بسر ہوتا تھا۔ اسی مذہبی رجحان کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنی سلطنت کو "سلطنت خداداد" کہتا تھا اس کا ہر قول، فعل اور کردار اس چیز کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ پر کس قدر اعتماد اور اعتقاد رکھتا تھا۔ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تباہی و بربادی کے جو اسباب بیان کئے جاتے ہیں ان میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی امداد پر حد سے زیادہ یقین رکھتا تھا۔ یہ بات اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اس کے مقابلہ میں اس نے اپنی حفاظت کے دیگر اسباب بالکل نظر انداز کر دیئے تھے اور ان کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا بھی ترک کر دیا تھا"[1]

یہ ایک حقیقت نگار بلند پایہ انگریز مورخ کے دلی جذبات ہیں جو وہ اپنے سب سے بڑے سیاسی حریف کے متعلق ظاہر کرتا ہے۔

ہندو محقق کی تحقیق

ایک ہندو محقق مہاشہ سندر لال ایڈیٹر "کرم یوگ" اور "بھوشیہ" نے ... طرز عمل اس لئے اختیار کیا کہ سلطان کی تنگ نظری اور تعصب کے متعلق خود تحقیق کرے اس نے اپنی ذاتی تجسس و تحقیق کے بعد ہندی کے مشہور اور بلند پایہ رسالہ "چاند" میں سلطان کی فراخ مشربی اور رواداری کو اس طرح غیر مبہم الفاظ میں پیش کیا۔

"ہمیں سلطان کے دو ایسے فرمان ملے ہیں جن سے ہم اس کی مذہبی حیثیت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایک فرمان اس وقت کا ہے جب وہ انگریزوں کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اس اعلان میں سلطان نے قرآن پاک کی آیتوں اور حافظ کی ابیات کا حوالہ دیکر دشمن کے علاقے میں بسنے والے مسلمانوں سے استدعا کی تھی کہ وہ غیر ملکیوں کی مدد نہ کریں اور دشمنوں کے علاقہ کو چھوڑ کر میسور میں آجائیں اسی اعلان میں اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ ہندوستان میں غیر ملکیوں کی مدد کرنا مسلمانوں کے لئے سخت گناہ ہے۔ ساتھ ہی کرناٹک اور بنگال میں انگریزوں کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہندوستان میں حکمرانی کرنے کی وجہ سے وہ چالاک قوم یعنی انگریز خواہ مخواہ سمجھ بیٹھی ہے کہ سچے دیندار لوگ کمزور اور نا قابل ہو گئے ہیں۔ ہم نے اپنی رعایا اور اہلکاروں کو حکم دیئے ہیں کہ جو لوگ دشمنوں کے علاقے سے آکر سلطنت میسور میں رہنا چاہیں ان کے جان و مال کی پوری پوری حفاظت ہو اور انھیں ضروریات زندگی مہیا کی جائینگی"

دوسرے فرمان کے متعلق مہاشہ جی لکھتے ہیں کہ:-

"اس کا تعلق میسور میں بسنے والے عیسائیوں سے ہے سلطان حیدر علی نے اپنے عہد حکومت میں عیسائی پادریوں کو عیسائی مذہب کی تبلیغ کی اجازت دے دی تھی۔ ان پادریوں نے سمندر کے کنارے بسنے والے ہندوؤں کو عیسائی کر لیا جب سلطان کے تعلقات ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ خراب ہو گئے اور باہم جنگ چھڑ گئی تو سلطان کے خلاف عیسائی رعایا نے کمپنی کی مدد کی۔ اسی طرح ٹیپو سلطان کو بھی عیسائی رعایا کے ہاتھوں زک اٹھانی پڑی۔ بار بار کی فہمائش کے باوجود جب وہ اس قسم کی شرارتوں سے باز نہ آئے تو سلطان نے ارادہ کیا کہ ان کو قرار واقعی سزا دی جائے تاکہ اس قسم کی شرارتوں کا خاتمہ ہو جائے اور دوسروں کو شرارتیں کرنے کی جرأت نہ ہو۔ چنانچہ ایک دفعہ عیسائی ...

---

[1] ہسٹری آف برٹش انڈیا از جیمز مل جلد چہارم۔

یہاں عیسائیوں نے بلاوجہ کسی دوسری قوم پر زیادتی کی سلطان نے حکم دیا کہ وہ یا تو اس کی عملداری سے باہر نکل جائیں یا مسلمان ہو جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ ساٹھ ہزار بچے بوڑھے، مرد عورتیں گرفتار ہو کر سلطان کے حضور میں پیش ہوئے اور انھیں مسلمان بنا لیا گیا۔"

اس پر مہاشہ سندر لال ان پر تبصرہ کرتا ہے اور کہتا ہے۔

"پہلا اعلان تو جنگ کے متعلق ہے جس میں مذہبی جذبات کو کسی قسم کا دخل نہیں اس سے سلطان کے عالی حوصلہ ہونے کا پتہ چلتا ہے دوسرا فرمان اس کی فراخ مشربی اور آزادی کے متعلق ہے عیسائیوں نے اس کی حکومت میں زندگی کے دن گذارے۔ ہر طرح کا سکھ پایا۔ آرام اٹھایا۔ مگر جب اس کے بدلے میں بار بار انھوں نے شرارتیں کیں، بے وفائی اور غداری سے کام لیا۔ نمک حرامی کا ثبوت بہم پہنچایا تو سلطان نے شاہانہ حلم سے کام لیا۔ ملوکانہ بردباری دکھائی یہاں تک کہ ان شریر لوگوں کی شرارتیں حد اعتدال سے بڑھ گئیں۔ سلطان ان دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنے پر مجبور تھا کہ یا تو وہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں یا مذہب تبدیل کر لیں انھوں نے شرارتاً اس بات سے بھی انکار کیا کہ وہ میسور راج سے نکل جائیں اس لئے سلطان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ دوسری راہ اختیار کرتا اس کے عہد حکومت کی ساری تاریخ ہمارے سامنے ہے اس میں کہیں نظر نہیں آتا کہ اس نے کسی اور قوم کے متعلق بھی اس قسم کا حکم جاری کیا ہو۔ یہ اس کی رواداری اور فراخ مشربی کی بیّن دلیل ہے۔"

آگے چل کر مہاشہ جی لکھتے ہیں کہ۔

"ہندوؤں کے ساتھ سلطان کا سلوک مربیانہ تھا۔ اپنی ہندو رعایا کے ساتھ سلطان کو بیحد محبت تھی وہ ان پر عنایات روا رکھتا تھا۔ اس قسم کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ آخری ایام حکومت میں سلطان کے دربار میں ہندو معزز اور ممتاز عہدوں پر متمکن تھے۔ اس کے وزیروں میں پورنیا خاص شہرت رکھتا ہے۔ کرشن راؤ ایک اور ہندو تھا جو وزارت کے عہدے پر سرفراز تھا۔ ان کے طفیل سفیروں کے عہدے بھی ہندوؤں کو ملے۔"

ایک مرتبہ مالابار کے ساحل پر بسنے والی نائر قوم کے کچھ لوگ عیسائیت کی طرف مائل ہو گئے۔ انھوں نے عیسائی مذہب قبول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں سلطان سے مشورہ طلب کیا۔ جس کے جواب میں سلطان نے انھیں لکھا۔

"بادشاہ یا راجہ اپنی رعایا کا باپ ہوتا ہے۔ اس حیثیت سے میں مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہیں یا اگر آپ اپنا مذہب بدلنا ہی چاہتے ہیں تو اپنے راج تیا (یعنی سلطان ٹیپو) کا مذہب اختیار کر لیں۔"

جگت گرو کے نام خطوط

میسور کے علاقہ میں ایک گاؤں شرنگری ہے جو ایک پہاڑی کے دامن میں تنگہ ندی کے کنارے واقع ہے۔ یہ گاؤں ہندوؤں کی نظر میں خاص تقدیس و تکریم رکھتا ہے۔ کیونکہ آٹھویں صدی عیسوی کے مشہور ہندو ریفارمر شری شنکر آچاریہ نے یہاں ایک مٹھ قائم کیا تھا۔ اس مٹھ کی اہمیت اس بات سے معلوم ہو سکتی ہے کہ بڑے بڑے راجے، مہاراجے، امیر کبیر، ادنیٰ و اعلیٰ، مرد و زن، بچے اور بوڑھے یہاں یاترا کے لئے آتے ہیں اور عقیدتمندی کے اظہار کے ساتھ بڑے بڑے چڑھاوے بھی چڑھاتے ہیں چنانچہ یہاں دولت کے انبار لگے رہتے ہیں۔ سونا، چاندی، قیمتی پتھر، بڑے بڑے ڈھیروں کی صورت میں وہاں پڑے رہتے ہیں۔ اس مٹھ کا گرو جنوبی ہندوستان میں بالخصوص اور سارے ہندوستان میں بڑی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جن ایام میں سلطان ٹیپو "سلطنت خداداد" کا مالک تھا اس مٹھ کا مذہبی پیشوا جگت گرو شنکر اچاریہ شری سچدانند بھارتی تھا۔ اس کی نیکی اور ذاتی تقدس نے سلطان کو بھی اپنا معتقد بنا لیا تھا اور سلطان اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں اس مٹھ سے کچھ خطوط برآمد ہوئے جو کنری زبان میں ہیں یہ خطوط سلطان ٹیپو نے جگت گرو کے نام روانہ کئے تھے۔ ان خطوط کا مطالعہ کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ سلطان جگت گرو کا معترف تھا۔ اس سے عقیدت رکھتا تھا۔ اس کے جذبات کی پاسداری کرتا اور اسے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ مہاشہ سندر لال جی نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں ایک خط کا ترجمہ کیا ہے یہ خط سنہ ۱۷۹۳ء میں لکھا گیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے۔

"شریمد پرم ہمساد شنگری سوامی سچدانند بھارتی چند مہاراج کی خدمت میں سلطان ٹیپو کا سلام نیاز پیش ہو۔ آپ کے

گرامی نامہ سے آپ کی خیریت معلوم ہوئی۔ آپ جگت گرو ہیں۔ ہمارے لئے اللہ پاک سے دعا فرماتے رہا کریں آپ ایسے بزرگ جس ملک میں ہوں وہاں خدا کی رحمت کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ آپ اتنے عرصہ سے پردیس میں کیوں مقیم ہیں۔ جس مقصد کے لئے آپ پردیس تشریف لے گئے تھے اس کو پورا کر کے آپ اپنی قیامگاہ پر جلد واپس آئیں۔"

ان میں سے بعض خطوط یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ سلطان نے جگت گرو سے کئی مرتبہ استدعا کی کہ وہ مذہبی رسوم بجالائیں اور دعا کریں کہ میسور کی سلطنت دشمنوں کی دست بُرد سے محفوظ رہے۔

ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹوں نے اپنے مشہور سردار پرسورام بھاؤ کی سرکردگی میں ۱۷۹۱ء میں اس مٹھ پر حملہ کیا۔ اسے بہت بری طرح لوٹا۔ بہت سے برہمنوں کو تہ تیغ کیا۔ عوام الناس کو بڑی بے دردی سے قتل کیا۔ دیوی کی مورتی کو توڑا اور مٹھ سے جو کچھ ملا لوٹ کھسوٹ لیا۔ مٹھ کی یہ بربادی دیکھ کر سوامی جگت گرو نے وہاں سے کنارا کر لیا اور اپنے چار چیلے ساتھ لے کر کرکلا کے مقام پر ڈیرے ڈال دیئے۔ وہاں سے جگت گرو نے سلطان ٹیپو کو تمام حالات سے اطلاع دی اور لکھا کہ سلطنت کی امداد اور دستگیری کے بغیر مٹھ اور دیوی کا استھان آباد نہیں ہو سکتے۔ سلطان نے اس کے جواب میں لکھا۔

"جن لوگوں نے اس مقدس مقام کو لوٹا ہے انھوں نے سخت گناہ کیا ہے وہ اپنے ان اعمال بد کی سزا عنقریب پائیں گے کسی کا مشہور مقولہ ہے کہ لوگ بُرے کرم ہنستے ہوئے کرتے ہیں مگر ان کی سزا روتے ہوئے بھگتتے ہیں۔ گرو کے خلاف کسی قسم کا اقدام اپنی نسل کو ختم کرنے کے برابر ہے۔ اس خط کے ساتھ ہمارا ایک سر مہر فرمان نگر کے ناظم کے نام بھیجا جا رہا ہے جس کی رو سے حکومت آپ کو دو طلائی سکے اور دو سو کا غلہ بطور رسد دیتی ہے تاکہ آپ دیوی کے دوارے کو درست کر سکیں وہاں کا ناظم آپ کو اس کام میں پوری پوری مدد دیگا۔ ضرورت کی چیزیں آپ ساتھ والے گاؤں سے لے سکتے ہیں۔ دیوی کے استھان کو درست کرنے اور برہمنوں کو کھانا کھلانے کے بعد آپ ہماری زیادتیٔ اقبال اور ہماری سلطنت کے دشمنوں اور بدخواہوں کی بربادی کے لئے دعا فرمائیں۔"

اس مکتوب کے مضمون اور لہجے پر تبصرہ کرتا ہوا ایک ہندو مورخ لکھتا ہے۔

"اس خط کے جذبات و تاثرات صاف صاف غمازی کر رہے ہیں کہ یہ جذبات ایک ہندو راجے ہی کے ہو سکتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا مصنف ایک مسلمان بادشاہ ہے جو مذہبی تعصب تنگ نظری اور عدم رواداری میں عالمگیر شہرت رکھتا ہے۔ اس خط کا مخاطب ایک ہندو سوامی ہے جو ایسی حکومت کے ہاتھوں سے لُٹتا ہے جس کی باگ ڈور ایک برہمن پیشوا کے ہاتھ میں تھی اور جو ہندو سلطنت ہونے پر ہمیشہ فخر کرتی تھی جس فوج نے اسے لوٹا اس کے تمام سپاہی ہندو تھے اس کے جھنڈے پر ہندو مت کے نشانات تھے۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ہندو فوج، ہندو کمانڈر کے ماتحت برہمن پیشوا کی ملازمت میں رہتی ہوئی شاردا دیوی کے مندر کو تباہ کرے۔ دیوی کے بت کو وہاں سے نکال کر پھینک دے شنکر آچاریہ کے جانشینوں کے مال و منال کو لوٹ لے اور سب سے خوفناک بات یہ ہو کہ وہ برہمن کُشی جیسے جرم کا ارتکاب بھی کرے؟ جب ہم ان واقعات پر غور کرتے ہیں تو دل نہیں مانتا کہ اس دُنیا میں کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ مگر واقعات کو کیا کیا جائے وہ ہمارے اس یقین کو جھٹلاتے ہیں۔ خود مرہٹوں کا اپنا ریکارڈ اس واقعہ کی پوری پوری تفصیلات پیش کرتا ہے اور خط کے لفظ لفظ کی تائید کرتا ہے"

انہی مکتوبات میں ایک خط ۱۷۹۱ء کا بھی ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سوامی جگت گرو نے ست چندی جپ اور سہسر چنڈی جپ رچانے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ وہ ملک کی اصلاح، سلطنت کی بہتری اور حکومت کے دشمنوں کی تباہی کے لئے دعا کرے۔ اس مقصد کے لئے اخراجات کی ضرورت تھی۔ چنانچہ تفصیلات سلطان کے پاس بھیجی گئیں۔ سلطان نے اس پر اظہار مسرت کیا اور لکھا کہ آصف کے نام احکام جاری کر دیئے گئے ہیں وہ تمام اشیاء آپ کو مہیا کر دیگا۔ اس کے علاوہ ان علاقوں کے عاملوں، کارندوں اور متصدیوں کے نام فرمان جاری ہو چکا ہے کہ وہ فوراً شری نگری پہنچ جائیں اور ضرورت کی تمام اشیاء وہاں جمع کر دیں۔

اس مکتوب میں سلطان نے یہ بھی استدعا کی کہ سوامی جگت گرو تمام رسوم اور آداب شاستروں کی رُو سے بجالائیں۔ وہ برہمنوں کو دکشنا بھی دیں اور روزانہ ایک ہزار برہمنوں کو کھانا بھی کھلایا کریں۔ ایک اور مکتوب کا خلاصہ یہ ہے۔

"آپ جگت گرو ہیں۔ آپ ہمیشہ تمام دنیا اور اہل دنیا کی فلاح و بہبود کے لئے تزکیۂ نفس (اُپاس) کرتے رہتے ہیں"

آپ خداوند تعالیٰ سے ہماری زیادتیٔ اقبال کی دعا کریں، جس ملک میں آپ جیسے پاکباز انسان ہوں وہاں باران رحمت کا نزول ضرور ہوتا ہے اور زراعت میں خیر و برکت ہوتی ہے۔"

سلطان ٹیپو کی نئی تصویر

ان مکاتیب پر غور کرو اور دیکھو کہ یہ اسی ٹیپو کی تصویر ہے جسے غیر مسلم مورخ ظالم، جابر اور متعصب بتاتے ہیں۔ ان خطوط کی روشنی میں اب سلطان ٹیپو کی نئی تصویر بنانی ہوگی۔ وہ نئی تصویر سلطان ٹیپو کی رواداری، فراخ مشربی، نیک نیتی اور بے تعصبی کی حامل ہوگی۔ سلطان ٹیپو کی اسی اصلی تصویر کا اثر تھا کہ مہاتما گاندھی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے ان الفاظ میں خراج عقیدت ادا کیا ہے۔

"میسور کا بادشاہ فتح علی ٹیپو شہید غیر ملکی مورخوں کی نظر میں ایک ایسا مسلمان تھا جس نے اپنی ہندو رعایا کو زبردستی مسلمان بنایا۔ لیکن یہ سب بہت بڑا جھوٹ ہے حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں سے اس کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے اس کے کارنامۂ زندگی کی یاد دل کے اندر خوشی اور مسرت کا طوفان پیدا کر دیتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت ہندو اور مسلمان اپنے غیر ملکی دشمن کو جوان کے دروازے پر ڈیرا جمائے ہوئے تھا بھول کر آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ طاقت آزما تھے۔ اس عظیم المرتبت سلطان کا وزیر اعظم ایک ہندو تھا۔ ہمیں نہایت ہی ندامت کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس نے آزادی کے اس فدائی کو دھوکہ دیکر دشمنوں کے حوالے کر دیا........ ٹیپو نے ہندو مندروں کے لئے نہایت فیاضی سے جائدادیں وقف کیں۔ خود ٹیپو سلطان کے محلات کے قریب شری ونکٹا رامنا سری نواس اور شری رنگناتھ کے مندروں کی موجودگی سلطان کی وسیع النظری اور رواداری کا ثبوت ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شہید قوم، سلطان شہید جس سے بڑا شہید ملک و قوم دوسرا نہیں اپنی عبادت میں ہندوؤں کی گھنٹیوں سے پریشان نہیں ہوتا تھا"

سلطان شہید کے مراسم نہ صرف جگت گرو کے ساتھ تھے بلکہ اس نے ہر ہندو کے ساتھ نیک سلوک روا رکھا۔ سرزمین میسور میں اس وقت بھی بہت سے ایسے مندر ہیں جن کے پجاریوں کے پاس سلطان کے ایسے فرمان موجود ہیں جن کی رو سے انھیں زمین کی معافیاں دی گئی تھیں ان میں منجن گڈھ سیل کوٹ وغیرہ کے مندر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قلب کی وسعت

ٹیپو سلطان نے جس مقام پر پرورش پائی وہاں اس وقت ایک عظیم الشان مسجد کھڑی ہے مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں ایک نہایت دلچسپ روایت بیان کی جاتی ہے جس سے سلطان کی وسعت قلب کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل میں کس قدر رواداری کے جذبات رکھتا تھا اور اسلامی تعلیمات کی روح کو کتنا اچھا سمجھتا تھا۔ وہ دوسروں کے جذبات کا کس قدر احترام کرتا اور اخلاق کی کتنی قدر کرتا تھا بیان کیا جاتا ہے کہ جس جگہ اب مسجد واقع ہے وہاں کسی زمانے میں ایک مندر تھا۔ جس کے پہلو میں ایک مسافر خانہ بھی تھا سلطان کے بچپن کا زمانہ تھا۔ وہ ایک دن اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ ایک فقیر ان بچوں کے پاس سے گذرا، وہ شہزادے کو دیکھ کر ٹھہر گیا۔ کچھ دیر اس کی جانب بڑے غور سے دیکھتا رہا آخر کچھ سوچ کر بولا۔ "اے خوش نصیب بچے! تیری خوش قسمتی تجھے ایک اعلیٰ مرتبے پر لے جائیگی۔ اس مرتبے سے بہتر کوئی دوسرا درجہ نہ ہوگا۔ سلطنت تیرے قدموں میں ہوگی۔ حکومت تیری رکاب چومے گی اور تاج تیرے سر بلند رتبہ پائے گا۔ یہ ملک تیرا ہوگا، تو اس کا واحد مالک ہوگا۔ اس پر تیرا پرچم لہرائے گا۔ بڑے بڑے سرکش تیرے سامنے گردن نیاز جھکائیں گے۔ اے خوش نصیب بچے! جب وہ وقت آئے تو آج کے دن کو نہ بھولنا۔ یہاں مسجد تعمیر کرانا تاکہ زمانے میں تیری یادگار رہے اور اگر کبھی زمانہ تجھے فراموش کرنا چاہے تو نہ کر سکے۔"

ٹیپو نے اس فقیر کی باتوں کو بڑی توجہ سے سنا اور مسکرا کر وعدہ کیا کہ اگر ایسا موقع ہاتھ آگیا تو جیسا آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔ ویسا ہی کیا جائیگا آپ کے ارشاد کی تعمیل میں کسی قسم کا تامل نہ ہوگا۔ چنانچہ حالات خود بخود اس کے موافق تغیر پیدا کرتے گئے اور وہ وقت آگیا جب سلطنت نے اس کے قدم چومے اور وہ میسور کا بلا شرکت غیرے حکمران بن گیا۔ اس وقت سلطان کو اس ژولیدہ مو اور پریشان حال فقیر کے الفاظ یاد آئے اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے عہد کو پورا کرے گا۔ مگر اس مقام پر مندر بن چکا تھا سلطان کا دل چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے وہ اپنے عہد کو پورا کرے مگر مندر کو دیکھتے ہی اس کے ارادے میں تزلزل پیدا ہو جاتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اسلامی شریعت کی رو سے رعایا کی عبادتگاہ کو گرانا بادشاہ کے لئے سخت گناہ ہے اس قسم کا تعصب اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔ بہت کچھ

غور و خوض کے بعد اس نے ایک دن مندر کے پجاریوں اور متولیوں کو اپنے حضور میں طلب کیا ان سے کہا کہ یہ جگہ اگر وہ مسجد کے لئے دیدیں تو اس کے معاوضے میں وہ انہیں ایک وسیع اور عالیشان مندر کسی اور جگہ بنا دیگا۔ پجاریوں نے اس بات کو مان لیا اور سلطان نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ یہ مندر کرج تک اس مسجد سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر مغرب کی جانب موجود ہے اس میں اس جاگیر کی وہ اسناد بھی محفوظ ہیں جو سلطان نے اس مندر کو عطا کی تھیں۔

فراخ مشربی

اس سے عجیب تر پیر لدھا کا واقعہ ہے جس سے سلطان کی فراخ مشربی کا پتہ چلتا ہے۔ پیر لدھا ایک بہت بڑے بزرگ تھے جن کا احترام عوام بھی کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے سلطان کے حضور میں شکایت کی کہ ہندوؤں نے ان کے مریدوں کو بہت بُری طرح پیٹا ہے۔ سلطان نے تفتیش کا حکم دیا۔ معلوم ہوا کہ اس میں زیادتی مسلمانوں کی تھی۔ ہندوؤں کا جلوس جارہا تھا۔ مسلمانوں نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی۔ سلطان نے کہا جب خطا مسلمانوں کی ہے تو ہندوؤں کی شکایت فضول ہے۔ اس پر پیر لدھا نے کہا کہ ہندوؤں کو اس طرح جرأت دلانا کہ وہ مسلمانوں کو پیٹیں اسلام کی توہین ہے۔ یہ اسلامی سلطنت ہے اس کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو اس قسم کی اہانت سے بچائے۔ اس معاملہ میں سلطان کو کوئی موثر قدم اٹھانا چاہیئے تاکہ ہندو آئندہ ایسی جرأت نہ کرسکیں سلطان نے یہ سن کر فرمایا سلطنت کی نظر میں ہندو اور مسلمان دونوں یکساں ہیں اس پر پیر لدھا نے راضی ہوکر کہا کہ اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو میں حدود سلطنت سے باہر چلا جاؤنگا۔ سلطان نے کہا میرا یہی فیصلہ ہے آپ کی طبیعت میں جو آئے وہ کیجیئے۔

سلطان کی فراخ مشربی کے سلسلے میں کچھ عرصہ ہوا گاندھی جی کے اخبار ینگ انڈیا میں ایک نہایت لطیف مضمون شایع ہوا تھا جس کا خلاصہ ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

"ٹیپو سلطان میسور کا مشہور بادشاہ گذرا ہے اس نے اٹھارویں صدی کے آخر میں انگریزوں سے سخت جنگ کی۔ اگر اس وقت نظام انگریزوں سے نہ مل جاتا تو انگریز ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے۔ یہ بادشاہ بڑا بہادر اور دور اندیش تھا اس نے انگریزوں کو نکالنے کے لئے نپولین بوناپارٹ سے بھی بات چیت کی۔ یہ بادشاہ جس قدر بہادر تھا اسی قدر خدا ترس اور بے تعصب بھی تھا۔ اس کی نگاہوں میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر تھے۔ وہ کسی کے مذہبی معاملے میں دخل نہیں دیتا تھا۔ ٹیپو سلطان نے مالابار کے ایک مشہور مندر کو کس طرح بربادی سے بچایا یہ اس کی فراخ مشربی کی بیّن دلیل ہے۔ مالابار کے علاقے میں ایک بہت پُرانا اور مشہور مندر گروایور تھا۔ یہ مندر مالابار کے ہندوؤں کی نظر میں وہی درجہ رکھتا ہے جو کعبہ مسلمانوں کی نظر میں رکھتا ہے اس مندر میں وشنو کی ایک مورتی ہے جسے کرشن جی مہاراج کے باپ واسدیو نے اپنی پرستش کے لئے بنایا تھا اور گرو برہسپتی اور وایو نے جنوبی ہند میں ایک مناسب مقام تلاش کرکے یہ مورت نصب کی۔ اس لئے اس کا نام گروایور قرار پایا۔ ٹیپو سلطان مالابار میں فتحمندی کے پھریرے اڑاتا ہوا مندر کے قریب پہنچا تو وہاں کے پجاری بہت گھبرائے انھوں نے دیوتا کی بیش قیمت مورت کو ٹراونکور کے ایک مشہور مندر میں منتقل کردیا۔ سلطان اس مقام کے قریب آکر رک گیا۔ اس نے سپاہ کے ایک حصہ کو گروایور فتح کرنے کے لئے بھیجا جسے انھوں نے تسخیر کرلیا۔ وہ زمانہ تھا جب مرہٹے اور مسلمان آپس میں لڑ رہے تھے بعض مسلمان سپاہی چاہتے تھے کہ اس مندر کو جلا کر راکھ کردیں انھوں نے مندر کی دیواروں پر گھی چھڑکا اور آگ لگادی۔ ابھی عمارت کا تھوڑا سا حصہ جلنے پایا تھا کہ فوج کے افسروں کو بادشاہ کے احکام کا خیال آیا انھوں نے آگ بجھائی اور دو تین برہمنوں کو سلطان کے حضور میں بھیجا کہ وہ ان فتنہ پرداز سپاہیوں کی شکایت کریں جب بادشاہ کو حالات کا علم ہوا تو وہ بہت ناراض ہوا۔ راتوں رات سفر کرکے گروایور پہنچا اور بہ نفس نفیس تحقیق شروع کی جن مسلمان سپاہیوں کے خلاف جرم ثابت ہوا انھیں سخت سزا دی۔ اس نے مندر کو درست کرایا اور حکم دیا کہ اس شہر سے جس قدر محاصل وصول ہوں وہ شاہی خزانے کے بجائے اس مندر کو دیدیئے جائیں۔ جب سلطان کو یہ معلوم ہوا کہ پجاریوں نے خوف کے مارے مندر کی مورتی کو ٹراونکور بھیجدیا ہے تو اس نے حکم دیا کہ مورتی کو وہاں سے منگوا کر دوبارہ مندر میں نصب کردیا جائے۔"

اس سے بڑھکر فراخ مشربی اور کیا ہوسکتی ہے؟

— ان واقعات کے ہوتے ہوئے بھی میسور گزیٹر کا مصنف کہتا ہے کہ:-

"حقیقت میں سلطان کا تعصب اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ مذہبی اور دوسرے معاملات میں کسی دوسرے کے مذہبی جذبات کی پروا نہیں کرتا تھا۔ گو اس نے شرینگری کے گرو سے تعلقات رکھے لیکن اس کا مقصد محض سیاسی تھا جس سے وہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا"

— یہ ہے وہ تنگ نظری جو غیر مسلم مؤرخین کو آج بھی حق کہنے سے روک رہی ہے وہ کہنے کو تو سب کچھ کہہ دیتے ہیں مگر اپنے دعوٰی کے جواز میں ایک معمولی سا واقعہ بھی پیش نہیں کر سکتے یہ سب کچھ ان کے ذاتی بغض و عناد اور تعصب کا اثر ہے جو الفاظ کی صورت میں ان کے قلم سے نکلتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ تعصب دُور ہو جائیگا کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ سلطان کی مظلومی اپنا رنگ لا رہی ہے۔ اس کی بے گناہی ظاہر ہوتی جاتی ہے اور اس کے مداحوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

نمازِ عشق

عدم سے آکے دنیا میں ملا کیا؟

از جناب محمّد شرف الدین سلیم بنگلوری

دلِ ناکام یہ تو نے کہا کیا ۔۔۔ سُنیں گے وہ ہماری التجا کیا

یہ دردِ دل دیا ہے اُس نے ہم کو ۔۔۔ کریں ہم درد کی اپنے دَوا کیا

وفا کا ذکر بھی سنتا نہیں تو ۔۔۔ ستم گر تجھ سے امیدِ وفا کیا

بجز درد و الم اندوہ و حرماں ۔۔۔ عدم سے آکے دنیا میں ملا کیا

وفا کا امتحاں شاید ہو منظور ۔۔۔ ستانے سے ہے ورنہ مدّعا کیا

جو روشن کی ہے ہم نے شمعِ امید ۔۔۔ بُجھائیگی اسے بادِ صبا کیا

شبِ غم کس طرح گزریگی آخر ۔۔۔ نہ آئیگی الٰہی اب قضا کیا

نگاہیں پھر گئیں چتون پہ بل ہے ۔۔۔ خفا ہو کس لئے آخر ہوا کیا

وہی وہ ہیں جدھر میں دیکھتا ہوں ۔۔۔ نمازِ عشق ہو گی اب ادا کیا

ملایا خاک میں دل مُسکرا کر ۔۔۔ ملیں ان سے نگاہیں تو ملا کیا

مزاجِ حُسن کو پاتا ہوں برہم ۔۔۔ نہیں کھُلتا مگر آخر ہُوا کیا

اُسے اپنی جفاؤں پر ہے جب ناز ۔۔۔ جفا کا اس ستمگر سے گِلا کیا

خفا وہ ہو گئے اُٹھے بگڑ کر ۔۔۔ سلیمؔ بے ادب تو نے کہا کیا

تجلّیات

مری جبیں نے مزے تیرے آستاں کیلئے

از حضرت راز یزدانی رامپوری

زبانِ شکر! ترے لطفِ بیکراں کیلئے
مری وفا بھی ستم ہے سکونِ جاں کیلئے

نہ دل زمیں کیلئے تھا نہ آسماں کیلئے
مری جبیں نے مزے تیرے آستاں کیلئے

تمہارے درد کو عقل و جنوں سے کیا نسبت
بیاں کی حد ہے مقرر مری زباں کیلئے

ادا شناسِ رسومِ چمن ملے تو کہوں
وہ جبر جھیل چکا ہوں جو آشیاں کیلئے

مرے جنوں کے مراتب کو کوئی کیا سمجھے
مجھی کو لفظ میسر نہیں بیاں کیلئے

چراغِ شمس و قمر میں بھی روشنی نہ رہی
کہاں سے راہ ملی ترے آستاں کیلئے

جنوں پہ عقل تصدق کہ تیرے ذکر کے ساتھ
رہا نہ کوئی تکلف مری زباں کیلئے

بتا دیں پڑھ کے محبت نے دل کی تقدیریں
بنا رہے تھے وہ کچھ میرے امتحاں کیلئے

جنوں تو موت کو بھی انقلاب سمجھا ہے
حیات مجھکو نہ دیجئے سکونِ جاں کیلئے

اٹھا کے ذرّے ستارے سے کچھ بکھیر دیئے
زمیں سے کچھ بھی نہ چھوٹا جب آسماں کیلئے

حیات اور اسیری جنوں نہیں مجھکو
یہ تہمتیں بھی اٹھائی ہیں آشیاں کیلئے

سمجھ لے کوئی نہ تعبیر خوابِ ہستی کی
یہ دل بنا تو دیا جورِ بیکراں کیلئے

زمانہ دل سے نزاکت کا خواستگار نہیں
کہ صبر اور ستم ہائے مہرباں کیلئے

کسے نصیب ہے دیر و حرم سے آزادی
کسے بتاؤں کہ نکلا ہوں میں کہاں کیلئے

چمن میں ہزار نشیمن بنا دیئے لیکن
کبھی چمن بھی بنایا ہے آشیاں کیلئے؟

موہنجوداڑو کی غرقابی

سندھی افسانہ

از جناب رفعت ہاشمی

"موہنجوداڑو" اور "ہڑپہ" سندھ کے پردۂ خاک میں پوشیدہ دو پرانے تباہ شدہ شہروں کے نام ہیں جو ایک عرصہ سے محکمہ آثار قدیمہ کی جان توڑ کوششوں کے نتیجہ میں پردۂ خاک سے نکل کر محققین تاریخ کے حلقۂ زلفِ تجسس میں ایک نئی گرہ کا اضافہ ثابت ہو چکے ہیں اثری انکشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر دراوڑی قوموں کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی کھدائیوں سے ہندوستان کی ان قدیم اقوام کی تہذیب و تمدن کے متعلق اہم امور کا انکشاف ہو رہا ہے چنانچہ اول الذکر شہر جسے تاریخ میں "برہمن آباد" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ کی غرقابی اور دریائے سندھ کے پرانے رستہ کی تبدیلی دنیا کے ان ہلاکت بار طوفانوں میں سے ایک کی مرہون منت دکھائی دیتی ہے جو نسل انسانی کی ابتداء سے اس کی تکمیل کے لئے ہر ملک اور ہر زمانہ میں زمین کی خشکی و تری کا نقشہ بدلتے رہے ہیں، لیکن ——— موہنجوداڑو کے طوفان عظیم کے متعلق مشہور ہے کہ یہ ایک ہولناک واقعہ کے ہیبتناک انجام کے طور پر نمودار ہوا جسے "خوناب سندھ" نے اوراق تاریخ پر بالتفصیل لکھ دیا ہے۔

لفظ "موہنجوداڑو" مرکب ہے "موہن"۔ "جو" اور "دڑو" سے "داڑو"۔ "دڑو" ہی کی مسخ شدہ صورت ہے۔ "موہن" یوں تو ہندی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں "خوبصورت" اور "پیارا"۔ —— مگر شاید یہ اس راجہ کا نام ہے جس کے نام کی مناسبت سے اس شہر کا نام موہنجوداڑو پڑا۔ یا پھر ایسے ہی معروف یا غیر معروف اشخاص کا جس نے یہ شہر بسایا یا جس کا اس شہر سے کوئی خاص تعلق تھا، لیکن یہ سب قیاسات ہیں۔ تاریخ سندھ اس باب میں کوئی راز فاش نہیں کرتی ——— "جو" سندھی زبان میں "کا" کے معنی میں مستعمل ہے اور "دڑو" کہتے ہیں "بستی" کو چنانچہ اس شہر کے نام یعنی لفظ "موہن جو دڑو" (داڑو) کا لفظی مطلب ہوا۔ "موہن کا شہر" "موہن کی بستی"۔

اس خوفناک اور عبرت انگیز داستان کو سندھ کی رومانی دنیا میں خاص اہمیت حاصل ہے تاہم یہ امر انتہائی حیران کن ہے کہ اس افسانے کی تفصیلات سے تاریخ ظاہری" تحفۃ الکرام" تاریخ معصومی" دیوان شاہ عبداللطیف بھٹائی غرض ہر مستند غیر مستند قدیم و جدید تاریخ سندھ اور تاریخی کتاب اجنبی ہے۔ حتیٰ کہ اس حکایت کے صحیح ترین زمانہ کا تعین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں صرف سندھ کے نامور محقق تاریخ میر تاج محمد خاں نے اپنی مشہور تالیف "سندھ کے تاریخی واقعات" میں یہ قصہ مختصر طور پر درج کر کے کسی بحث و تمحیص کے بغیر اس کا زمانہ "غالباً دو ہزار سال قبل از مسیح" شمار کیا ہے جسے کسی تاریخی روایت سے صحیح یا غیر صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ "مجموعۃ التواریخ" میں بھی گو اس کہانی کو کچھ غلط بیانیوں کے ساتھ مبہم صورت میں پیش کیا گیا ہے اور وہ غلط بیانیاں اس سرگذشت کی اصلیت پر اثر انداز بھی نہیں ہوتیں لیکن کسی داستان سے متعلق "تحقیق" چونکہ مؤلف تاریخ مذکور کا مقصود ہی نہیں اس لئے اس پر کسی قسم کا نقد و تبصرہ تحصیل حاصل ہے۔

"راجہ دلو راؤ کے متعلق متعدد تواریخ سندھ صرف اسی ایک بات پر متفق الرائے ہونے کے علاوہ کچھ اور بیان نہیں کرتیں کہ ——
"وہ ایک پہلے درجہ کا اوباش اور بدکار حکمران تھا اور موہنجوداڑو کی تباہی و بربادی کا اولین و آخری سبب ——!" یہ افسانہ سندھ کے تاریخی واقعات"۔ "مجموعۃ التواریخ" اور "موہنجوداڑو کی تباہی" (میرزا ادیب) کا مرہون منت ہے۔ (رفعت ہاشمی)

"یہ ہے بردوان ——!"

"ہش! خاموش ——!"

"کون بردوان ——؟"

گیروے کپڑوں میں ملبوس نوجوان نے جسے دو قوی ہیکل سپاہی اسیر سلاسل کئے کھڑے تھے مقتل میں گھٹنوں کے بل جھک کر اپنا سر روئی سی سُرخ لکڑی کے گول ٹکڑے پر رکھ دیا۔ جس کے بعد فوراً ہی بدہئیت جلاد کی وزنی تلوار بجلی کی طرح چمکی اور چشم زدن میں قیدی کا سر دھڑ سے کٹ کر دُور جا گرا —— ہمت بردوان کا سر —— اور قتل گاہ کا سنگین فرش لالہ زار بن گیا۔

یہ پرماتما کو ماننے کے جرم میں مہا مندر کے نانویں پجاری کی قربانی تھی۔ نقد —— وادیٔ مغرب میں خورشید کی خونیں شعاعیں رقصِ بسمل کا نظارہ پیش کر رہی تھیں۔

یہ اس پُر آشوب زمانے کا قصہ ہے جب سندھ پر ایک مُرد صفت فرعون دماغ راجہ دتّو راؤ حکمراں تھا۔ اس کی استبدادی ذہنیت، مذہب اخلاق اور انسانیت کے لئے سم قاتل تھی اور چونکہ کسی پاکیزہ دماغ کی انتہائی مخالفت اور شدید نفرت بھی اس کے خبیث عزائم کی راہ میں حائل نہ ہو سکی اس لئے اس نے خدائے کائنات کے خلاف بھی علی الا علان علم بغاوت بلند کر دیا اور رعونت کی چوٹ اپنے آپ کو خدا کہنے لگا۔

موسم خزاں کی ایک تپش آزمودہ شام کا ذکر ہے کہ راجہ دتّو راؤ نے موہنجو دارو کے قصر شاہی میں جواہر کے ایک سوداگر بانگوں کو شرف باریابی بخشا جس کا جہاز اسی صبح سندھ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تھا اور اس کی شاندار پیشکش کو جو چند بیش بہا ہیروں پر مشتمل تھی انتہائی مسرت سے قبول کرنے کے بعد دورانِ گفتگو میں جب اسے یہ معلوم ہوا کہ سوداگر کے ہمراہ اس کی سات نوجوان کنواری بیٹیاں بھی ہیں تو اپنی وحشتِ عادت کے زیر اثر سرتا پا ہوس بن گیا اور ملاقات کے اختتام پر اپنے معتمد خاص کو اشارہ کر دیا کہ وہ سوداگر کو شاہی قلعہ میں نظر بند اور اس کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ ساتھی کو گرفتار کر کے حضور میں پیش کرے۔

نصف شب گزر چکی تھی اور محفل انجم شاہی محلات کی تابدار شمعوں کے جلنے اور بجھنے کا دلپذیر منظر دیکھ رہی تھی۔ جب راجہ دتّو راؤ کے عشرتکدے میں جس کی زیب و زینت کے لئے شاہی نظر انتخاب نے دنیا بھر کا بےنظیر سامان آرائش منتخب کیا تھا ایک باکمال سازندہ نے ساز عیش پر نغمۂ مسرت چھیڑ رکھا تھا جس کا زیر و بم ایسا سحر انگیز تھا کہ محفل جھوم رہی تھی۔ پاس ہی راجہ دتّو راؤ کی چھوٹی بہن سوہن عشرتکدے کے فرش پر اوندھے منہ پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔

سوہن کو اگر ... حسن بہار کہا جائے تو بجا نہ ہوگا اور یہی دہ مل اس پر اس ظلم و مصیبت کے ٹوٹ پڑنے کا سبب تھا کیونکہ راجہ دتّو راؤ کی نگاہ الفت جسے صحیح معنوں میں نظر عتاب کہنا چاہیئے منجملہ دیگر ادنیٰ و اعلیٰ حسین ترین گر بدبخت خواتین کے اپنی سگی بہن کے رخ پر نور پر بھی جا پڑی تھی اور اُسے اپنے جنت ایسے گھر سے کشاں کشاں اس جہنم ارضی میں کھینچ لائی تھی —— آہ بھائی، بہن سے اس طرح کھیلنا چاہتا تھا جیسے بھوکا عقاب مجروح طائر سے کھیلتا ہے۔ کتنا حسین اور مسحور کُن ہے دنیائے رنگ و بو کا فریب! جس کے زیر اثر انسان ہوش و حواس کا مالک ہوتے ہوئے اور دنیا کے ہر عیش و نعمت کے گہوارے میں جھولتے ہوئے —— ہوا و ہوس کی فانی لذتوں میں محو ہو کر اپنے آپ کو بھی بھلا دیتا ہے۔

سوہن کا بہادر شوہر شاکرت شاہی مجلس مشاورت کا ایک سربرآوردہ رکن اور مردانہ حسن و شرافت کا کامل نمونہ تھا۔ وہ حالانکہ میدان کارزار میں بھی کئی مرتبہ جان طلب خطرات کا دلیرانہ مقابلہ کر چکا تھا لیکن دجل و فریب اور بےغیرتی و بیحیائی کے ایسے پیچ در پیچ منصوبہ میں قوت دست و بازو سے کام لینا اس کے دست و بازو کے بس کی بات نہ تھی جہاں تلوار سے زیادہ چالاکی کی ضرورت ہوتی ہے اور شرافت سے زیادہ رذالت کی۔ تاہم چونکہ سوال عزت و نجابت کا درپیش تھا اس لئے انتہائی سکون قلب و دماغ سے اس نے تقدیر کو تدبیر سے بدل دینے کا عزم صمیم کر لیا۔ اور تن تنہا ایک چور دروازے سے عشرتکدے میں داخل ہو گیا —— عشرتکدے میں! —— جہاں قدم رکھنے کا مطلب تھا موت، اور —— صرف موت!

شاکرت نے شمع کی نرم روشنی میں جب اپنی شریک حیات کو اس حال تباہ میں دیکھا تو اس کا دل خون ہو کر رہ گیا مگر وقت چونکہ بہت نازک اور جوش کے مقابلہ پر ہوش کا خواہاں تھا اور پھر اس قصر معصیت کے خونی سانپوں کی زبانیں بھی بہت لمبی تھیں اس لئے وہ سینہ پر صبر کی سل رکھ کر خاموش رفتار سے سوہن کے قریب جا کر جھکا اور ہاتھ سے اس کے شانے کو ایک ہلکی سی جنبش دیتا ہوا دھیمی آواز میں بولا۔ "خاموش!"

راجکماری چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے خوشنما لب ابھی ایسے تبسم سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ کوشش کرنے کے باوجود اس کی زبان سے کوئی لفظ نہ نکل سکا اس نے متلاشی آنکھوں سے جن میں جھلملاتے ہوئے آنسو گوہر بےبہا کی طرح چمک رہے تھے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور شاکرت

نے اس کے خاموش استفسار کا مطلب پاکر جواب میں ایسا ئے ابرو سے غزاری کا فقرہ ادا کیا اور پھر بعجلت تمام اس آرام جان کو آغوش میں لے کر اٹھتے پاؤں بور دروازے کی طرف بڑھا ——— گر وائے ناکامی کہ ابھی اس نے دوسرا قدم نہ اٹھایا ہی تھا کہ محل کے تمام دروازے ایک ہیبتناک آواز کے ساتھ بند ہو گئے اور شب تار کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

اس آفت ناگہانی سے شاکرت ایسا فولادی جوان بھی لرز اٹھا، سوتن بیچاری کا تو ذکر ہی کیا۔ کہ جو ایک ہلکی سی چیخ مار کر بچوں کی طرح اس سے لپٹ گئی تھی، اور مجرم کی طرح کانپ رہی تھی۔ کچھ دیر تک دونوں اس دہشتناک تاریکی میں مبہوت کھڑے رہے۔ پھر دفعتہً محل کے وسیع دالان میں ایک بگل کی لمبی گرجیلی آواز گونج اٹھنے پر ہمہ تن گوش ہو گئے اور اس عریاں اشارہ کا مطلب سمجھنے کی سعی کرنے لگے۔ مگر کچھ سمجھ سکنے پر شاکرت ہمت کر کے سوتن سے نرم آواز میں بولا۔

"بھوکے بھیڑیوں کو شاید میرے یہاں آنے کا علم ہو چکا ہے۔ مگر میں بھی کوئی نہ کوئی راہ فرار ڈھونڈ لیتا ہوں۔ تم میرے واپس آنے تک اس دیوار کے ساتھ لگ کر چپ چاپ کھڑی رہنا"

یہ کہہ کر سوتن کو وہیں چھوڑ۔ اس بے پناہ ظلمت میں وہ اپنا راستہ تلاش کرنے کے لئے آگے بڑھا۔

شاکرت کے قدموں کی چاپ کو غائب ہوئے ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ راجکماری کے کانوں میں طوفانی ہوا کی سی ایک خوفناک آواز آئی جو بلحقت ایک دلدوز آہ میں تبدیل ہو گئی اور ساتھ ہی اس نے چند بے آواز قدم اپنی طرف بڑھتے ہوئے محسوس کئے جیسے شکاری شکار کے قریب آ رہا ہو۔ اس کا بال بال کانپ اٹھا اور وہ دیوار سے زیادہ چمٹ کر وحشیوں کی طرح اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گھور گھور کر دیکھنے لگی۔

ذرا سی دیر کے بعد سوتن نے اپنا نرم و نازک شانہ ایک قوی ہاتھ کی مضبوط گرفت میں پایا مگر ساتھ ہی شاکرت کی اس بھاری آواز نے اسے حواس باختہ ہونے سے بچا لیا کہ ——— "میں ہوں!.... کسی نے میرے سینہ پر خنجر سے وار کیا ہے"

سوتن نے شوہر کی بات سنتے ہی بیتاب صفت تڑپ کر بے تاخیر ہاتھ اس کے دل پر رکھ دیا جو ایک ہی لمحہ میں خون سے شرابور ہو گیا اور بیچاری ایک سرد آہ بھر کر ——— اپنی گردن پہ ہاتھ رکھتے ہوئے مجروح آواز میں بولی ——— "قسمت!"

ایک بار پھر اچانک بگل اسی انداز میں بج اٹھا۔ اس مرتبہ کمرے سے باہر سنگ مرمر کے فرش پر بیشمار تیز قدموں کی آواز بھی بلند ہوئی اور کچھ دیر بعد بہت سی تلواروں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کی جس کے ساتھ ہی ہلنے والے کا ایک آتشیں طوفان بھی بھڑک اٹھا۔

یہ شور و غل سن کر شاکرت نے سوتن کو اپنے زخمی سینے سے بھینچتے ہوئے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "معلوم ہوتا ہے شہر کے باشندوں نے بہت دنوں کے غور و فکر کے بعد آج دتو رائے کے خلاف بغاوت کر ہی دی ہے اور یہ جنگ شاید باغیوں اور راجہ کے سپاہیوں ہی کے درمیان ہو رہی ہے"

عین اس وقت اس کے ملحقہ کمرے میں ناگوں کی ساتوں قبول صورت معصوم لڑکیوں کو "افکار زندان" کا سامنا ہوا۔ اور وہ حقیقت حال سے آگاہ ہونے پر انتہائی خوف و ہراس اور ناامیدی کے عالم میں زار و قطار روتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوئیں کہ "اے کردگار! ہماری عزت و ناموس کا محافظ تو ہی ہے"

خدا کی قدرت ہے کہ یہ دعا بے تاخیر باب اثر سے جا ٹکرائی اور چشم زدن میں پلٹ کر ایک قیامت انگیز زلزلے کی صورت میں سرزمین موہنجو داڑو پر نمودار ہوئی اور ہر ذی روح سمیت اسے ہمیشہ کے لئے چشم عالم سے روپوش کر گئی۔

دوسرے دن صبح اس خطہ ارض پر دریائے سندھ کا پانی موجیں مار رہا تھا جو شب کے طوفان برق و باد کے باعث اپنا راستہ بدل چکا تھا

رباعی

تھی بہار زندگانی تیری
بنیاد نشاط شادمانی تیری
سمجھا تھا جسے حسن و عشق سے جھگڑوں ہیں
سمجھو وہ زندگی ہے جوانی تیری

ابن سعید

بدصورت بچے

یہ مضمون اوّل تو غیر شادی شدہ حضرات کے لئے ہے اور دوسرے نمبر پر ان کے لئے ہے جو شادی کرنے پر تُلے بیٹھے ہوں۔

لیکن یقین مانیے کہ یہ مضمون شادی شدہ حضرات کے لئے نہیں لکھا گیا۔ وہ ہرگز مجھ سے خفا ہونے کی کوشش نہ کریں۔ بہتر یہی ہوگا کہ وہ اسے یونہی رہنے دیں اور ان صفحات کو جلدی جلدی اُلٹ دیں، کیونکہ ان کے پڑھنے سے جس قسم کے نتائج برآمد ہونے کا اندیشہ ہے میں اس سے بالکل بری الذمہ ہوں۔

اگر وہ اس مضمون کو پڑھنا چاہیں تو اپنی ذمہ داری پر پڑھیں۔

مگر یہ واضح رہے کہ مجھے اللہ کی مخلوق سے ہرگز بیر نہیں، میرے لئے خوبصورت اور بدصورت سب یکساں ہیں، ویسے اپنا اپنا نظریہ ہے جہاں مجھے خوبصورت مخلوق پسند ہے وہاں بہت سے حضرات بدصورت مخلوق پر جان چھڑکتے ہونگے اور وہ ان کی حمایت میں اعلیٰ سے اعلیٰ دلائل پیش کرسکتے ہونگے۔ مجھے نہ بدصورت لڑکوں سے بغض ہے نہ بدصورت لڑکیوں سے لیکن بدصورت بچے ——! انھیں دیکھ کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آپ ہی ذرا سوچئے، ایک یونہی سے بھدّے بچے کو دیکھ کر کس کا دل لاحول پڑھنے کو نہچاہے گا؟ اور پھر اس صورت میں تو اور بھی جب اُسے زبردستی خوبصورت ترین ہستی تصوّر کیا جائے اور لاڈ سے کہا جائے میرے پیارے لال —— میرے چاند! —— میرے سورج ——! میرے ستارے! اور نہ جانے کس کس قسم کے الفاظ استعمال کئے جائیں!

کسی بدصورت بچّے کو دیکھ کر طبیعت مکدّر ہو جاتی ہے۔ روح پر ایک تاریک سا بادل چھا جاتا ہے۔ شادی شدہ حضرات کسی آنے والے خطرے سے کانپنے لگتے ہیں۔ کنوارے شادی سے بیزار ہو جاتے ہیں اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں جس نے انھیں اب تک کنوارا رکھا۔

اچھا اب ذرا تھوڑی دیر کے لئے دماغ میں ایک تصویر بنا لیجئے، فرض کیجئے آپ کے ساتھ (خدانخواستہ) ایک بدصورت بچہ جا رہا ہو اور

ظریفانہ جواب مضمون

از جناب شفیق الرحمٰن

راستے میں کوئی ایسا شخص مل جائے (از قسم دوست) جسے یہ پتہ نہ ہو کہ اس بچّے کے حضور آپ ہیں۔ وہ پہلے تو ناک سکیڑے گا۔ پھر بھنویں چڑھائیگا اور یوں مُنہ بنائیگا جیسے کونین کمیچر پی گیا ہو۔ پھر کہے گا۔ "کیا ہے یہ؟ ——"

"بچہ ہے!" آپ بڑے انکسار سے جواب دیں گے۔

"اچھا تو یہ بچہ ہے! خوب! کس کا ہے؟"

آپ یقیناً بوکھلا جائیں گے، آپ کی آنکھیں مارے شرم کے زمین میں گڑ جائیں گی۔ آپ پر سیکڑوں کیا، ہزاروں گھڑے گرم گرم پانی کے پڑ جائیں گے آپ کبھی اقبال جرم نہ کرسکیں گے اور بات ٹالنے کی کوشش کرینگے مگر وہ پھر سوال کریگا۔ آپ ڈرتے ڈرتے پوچھینگے "کیوں؟"

"کیوں کیا! ارے میاں یہ کیا لئے پھر رہے ہو تم؟"

آپ شرما کر کہیں گے "میرا —— یہ —— میرا —— لڑ —— ڑ —— لڑکا ہے"

اب اگر وہ کوئی نیک آدمی ہوا تو کہے گا۔ "اررر! آپ کا صاحبزادہ ہے! خوب! واہ بھئی واہ، کمال کر دکھایا۔ یہ تو پتہ ہی نہ تھا۔ تم تو چھپے رستم نکلے۔ اچھا خاصہ پیارا بچہ ہے، بس رنگت ذرا کچھ سانولی ہے۔ اور ناک کسی قدر چوڑی ہے، جیسا کہ عام ہندوستانیوں کی ہوتی ہے۔ کیا ہوا! آنکھیں ذرا چھوٹی چھوٹی رہ گئیں۔ جب بڑا ہوگا تب بڑی ہو جائینگی۔ اور ہونٹ بھی کچھ موٹے ہی ہیں —— انگریزوں جیسے پتلے ہونٹ کہاں سے آئیں۔ بھئی یہ باتیں انہی کو سجتی ہیں۔ بھلا ہم پتلے ہونٹ لیکر کرینگے بھی کیا؟"

اس کے بعد نہ آپ اپنی شادی کے متعلق کچھ کہہ سکیں گے اور نہ ہی بیگم صاحبہ کے متعلق کچھ کہنے کی جرأت ہو گی۔

اور جو ہوا کوئی بے تکلف سا دوست تو پہلے تو لاحول با قرأت پڑھے گا پھر کہے گا —— "ہوں! لئے پھرتا ہے لڑکا، بڑا خوش ہے نا، اور پھر کتنے فخر سے کہتا ہے (مُنہ بنا کر) یہ میرا لڑکا ہے —— بھلا اس چیز کو لڑکا کون کہہ سکتا ہے؟ واللہ اگر میں تیری جگہ ہوتا تو خودکشی کر لیتا —— کس قدر بدشکل ہے یہ بچہ! ماشاءاللہ رنگ تو جیسا ہے ویسا ہے ہی، تو یاد آتا ہے تو لے —— ناک ہے کہ سارے مُنہ پر دھری ہے —— اِدھر

...ادھر تک ناک ہی ناک چلی گئی ہے۔ آنکھیں جیسے ہاتھی کی، دُور سے دکھائی ہی نہیں دیتیں۔ ہونٹ ہیں کہ اس کان سے اس کان تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اب کہیے کہ بچّہ اپنے ماموں یا نانے پر چلا گیا ہے۔ ارے میاں یہ بچہ ہو بہو اپنی ماں کی نقل ہے۔ جس کی تعریف تو عموماً کیا کرتا ہے۔! توبہ توبہ! کس قدر بدمذاقی کا ثبوت دیا ہے تونے؟"

بدصورت بچوں کے متعلق طرح طرح کے بہانے پیش کئے جاتے ہیں سب سے پہلے تو یہ کہ وہ کسی رشتہ دار پر پڑے جاتے ہیں۔ یعنی ان کی شکل فلاں صاحب سے ملتی ہے۔ مثلاً کہا جائیگا کہ یہ "ننھا سا پیارا بچّہ اپنے نانے پر چلا گیا ہے۔" "یہ بچہ اپنے چچا پر چلا گیا ہے۔" دراصل وہ جاتا واتا کہیں بھی نہیں، یونہی بہانہ تراشا جاتا ہے یہ۔

ورنہ "آنا جانا" موسمی چیز ہوتی ہے۔ اگر بچّہ اپنے ننھیال ہو تو محلّہ کا محلّہ یہی کہے گا کہ یہ اپنے والد پر گیا ہے یا چچا پر۔ اس کی والدہ کو بالکل معصوم قرار دیا جائے گا۔ اور اگر وہ اپنے والد کے یہاں ہے تو لازمی طور پر ماموں، نانی یا ممانی ہی پر جائیگا۔

پھر ایک اور بہانہ "بیماری" کا پیش کیا جاتا ہے کہ کس طرح یہ پھول جیسا خوبصورت بچّہ ایک مرتبہ سخت بیمار ہو گیا تھا، اس کے بچنے کی اُمید بھی نہ رہی تھی۔ اس وقت نہ جانے کس کمبخت کی کیسی دوا نے اس غریب کا حلیہ بدل دیا۔ یا یوں کہ محض بیماری کو کوسا جائیگا کہ نگوڑی کیا جان لیوا مصیبت تھی کہ بچے کا کچھ کا کچھ کر دیا۔ شکر ہے کہ جان تو بچ گئی۔

ویسے بدشکل بچوں سے سب کے سب کھنچے کھنچے سے ضرور رہتے ہیں۔ دراصل ویسے بچے ساخت کرنا ایک جُرم ہے۔ نہ صرف دنیا کے ساتھ بلکہ ان ننھی منّی جانوں کے ساتھ بھی ناانصافی ہے جو بیچارے زندگی بھر طرح طرح کے طعنوں کا شکار رہیں گے۔ ان کے نام رکھے جائیں گے۔ بیاہ شادی تو ان کے لئے قیامت سے کم نہ ہوگی۔ انھیں ہر وقت احساس کمتری رہا کریگا۔ اپنے سے دوسری جنس کے خیالات ان کے لئے کیسے حوصلہ شکن اور طبیعت صاف کر دینے والے ہونگے۔

مجھے سٹیشن پر ایک دوست ملے، جن کی شادی کچھ سال ہوئے ہو چکی تھی، خود تو بیچارے یونہی سے تھے۔ لیکن ان کی بچّی دیکھی تو دل باغ باغ ہو گیا پوچھا کہ بھئی یہ کیا معاملہ ہے؟

"یہ سب ان کی نوازش ہے" وہ ایک سیاہ برقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "یہ سب ان کی ذرّہ نوازی ہے۔ ورنہ بندہ کس لائق ہے؟"

میں نے اُدھر دیکھا۔ برقعے سے نکلے ہوئے گلابی ہاتھ ... لمبی لمبی انگلیاں ۔۔۔ کچھ کچھ پتہ دے رہی تھیں کہ واقعی وہ خاتون خوبصورت ہونگی ۔۔۔۔

عموماً یہ ہوتا ہے کہ جب دوست ملنے آئیں تو خوبصورت بچوں کے والد زبردستی زنانے سے بچے منگوا منگوا کر دکھاتے ہیں۔ گویا اپنی بلند مذاقی کی داد چاہتے ہیں۔ یا یہ ایک قسم کا چیلنج ہے کہ "جب جانیں جب اس سے بہتر چیز پیش کر دو۔" لیکن ویسے بچوں کے آبا ہمیشہ اس بات کا خیال رکھیں گے کہ دوستوں سے بات کرتے وقت بچوں کا ذکر نہ آجائے اور اگر اتفاقیہ طور پر کوئی صاحب بچوں کو ملاحظہ فرمانے کی فرمائش کر دیں تب فوراً ٹال مٹول کر دی جاتی ہے۔

ایک سیاہ رنگ کے مولانا ایک حسین لڑکی سے شادی کے امیدوار تھے، اور وہ یکطرفہ کارروائی عمل میں لانا چاہتے تھے۔ یعنی لڑکی انھیں بالکل پسند نہ کرتی تھی۔ انھوں نے ایم۔ اے کیا اور ایک مقابلے کے امتحان میں بیٹھ کر فرسٹ نکلے اور بہت اچھی جگہ پر تقرری ہو گئی۔ انھوں نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے ان خاتون کو خط لکھا۔ وہاں سے جو جواب آیا تو جناب کے دیوتا کوچ کر گئے۔ انھوں نے لکھا تھا۔ "معاف کیجئے! میں بہت بدتمیزی دکھا رہی ہوں۔ لیکن مجھے ہمیشہ صاف گو انسان پسند ہیں۔ آپ اتنے خودغرض انسان نہ بنئے۔ مانا کہ آپ کی تعلیم بہت اعلیٰ ہے، اور آپ کے اخلاق اور آپ کی عادات ۔۔۔ سب بہت اچھے ہیں۔ لیکن مجھے بدصورت بچوں سے للّہی بغض ہے"!

داد دیجئے اس برجستہ جواب کی۔ یہ خط اتفاقیہ طور پر ہاتھ آ گیا

کوئی والد اپنے "ویسے" بچے کو اوّل تو ساتھ لیکر نکلتا ہی نہیں، اور اگر نکلے بھی تو اس وقت ان حضرت کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ لڑکھڑاتی ہوئی چال، بہکے بہکے قدم پڑ رہے ہیں۔ مُنہ کہیں ہے دیکھ کہیں رہے ہیں۔ چلنے کا رُخ کسی اور طرف ہے۔ کن انکھیوں سے ادھر اُدھر دیکھتے جاتے ہیں کہ کوئی آشنا صورت تو نہیں دیکھ رہی۔ وہ بچّے کو کبھی اپنے برابر نہیں رکھتے یا تیز چلیں گے اور بچّہ پیچھے رہ جائیگا یا اس قدر آہستہ اور مڑ مڑ کر چلیں گے کہ بچّہ آگے رہے۔

آپ یہ باتیں قطعاً جھوٹ نہ سمجھیں کیونکہ یہ سب آنکھوں دیکھی ہیں بہت دن گزرے ایک بڑے گہرے دوست مجھ سے اپنی شادی کے بارے میں مشورہ لینے آئے۔ انھوں نے پہلے تو ایک زبردست تمہید باندھی لڑکی والوں کی جائداد، ان کے رسوخ اور امارت کے قصیدے پڑھے

پھر ملنسی کی [illegible] پر ریویو کیا۔ جہیز کے موضوع پر روشنی ڈالی۔ لیکن انھوں نے ہر ایک بات "مگر" پر ختم کی۔

کہا کہ جناب لگے ہاتھوں یہ مگر بھی پوری کر دیجئے۔ بولے کہ لڑکی ذرا سانولی ہے۔

اس "ذرا سانولی" پر میرے کان کھڑے ہوئے کیونکہ بیاہ شادیوں میں ذرا سانولا ہونے کا مطلب ہوتا ہے کہ ماشاءاللہ اچھی طرح سیاہ ہیں۔

میں نے مودبانہ عرض کیا کہ۔ "جناب لڑکی کا تو کچھ نہیں۔ یہ تو اتنی فکر کی بات نہیں لیکن کیا آپ تیار ہیں کہ جب آپ تھکے ماندے گھر جائیں اور آپ کا جی چاہتا ہو کہ کوئی ایسی چیز میسر ہو جس سے دل بہلے۔ گھر جاتے ہی دو سیاہ رنگ کے بھدے سے بچے "ابا ابا" کہتے آپ کی ٹانگوں سے چمٹ جائیں۔ ایک بدصورت بچہ نہایت ہی بدصورتی سے ہیں ہیں کرکے رو رہا ہو اور ایک ذراؤنی سی بچی اندر کسی کمرے سے اپنا سر کھڑکی میں سے نکال کر جھانکنے لگے اور چیخ مار کر کہے "ابا آگئے!" اور ساتھ ہی بچوں کی والدہ ——— اس کے متعلق کچھ کہنا بے ادبی میں شامل ہے۔ اگر آپ سمجھدار ہیں تو اتنا ہی کافی ہے۔ اگر اس ماحول میں رہ سکتے ہیں تو بسم اللہ ورنہ نام تک نہ لیجئے اس رشتے کا!"

نتیجہ خاطر خواہ نکلا ——— اور وہ صاحب باز آگئے۔

اب آپ ایک معمولی سی بات لے لیجئے ——— یہی صبح اٹھنے کی، اکثر حضرات کو صبح اٹھنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ خیر اُن کا ذکر یہاں نہیں آتا انھیں چھوڑیئے!

جو صبح اٹھتے ہیں ان میں زیادہ حضرات ایسے ہوتے ہیں جن کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ جاگیں۔ یا دوسرے الفاظ میں "احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا" والا معاملہ ———!

باقی جو رہے ان میں سے کوئی نہیں چاہیگا کہ انھیں کوئی بدشکل یا بھدی سی چیز صبح صبح جگائے۔ ممکن ہے کہ یہ نظریہ بہت زیادہ صحیح نہ ہو لیکن میں نے اس قسم کے بہت سے حضرات دیکھے ہیں۔

کم از کم مجھے تو اس بات کا اتنا زیادہ وہم ہے کہ بس ——— جب علی الصبح حجام بستر ہی میں اندھا دھند حجامت کرنے لگتا ہے تو میری آنکھیں مضبوطی سے بند ہوتی ہیں۔ اس کی بے ربط باتوں کا جواب بھی "ہاں" "یا" "ہوں" میں دیا جاتا ہے۔

پھر اس کے بعد تب آنکھیں کھولتا ہوں جب مجھے یقین ہو جائے کہ جگانے والا ایسا ہے جسے صبح صبح دیکھ کر اگر طبیعت مسرور نہ ہو تو مکدر بھی نہ ہو جائے۔ اسی لئے بارہا میں اپنے سرہانے کوئی اچھی سی تصویر رکھ کر سویا ہوں۔ صبح کو حالات ناموافق ہونے پر ناچار تصویر کو دیکھا ہے ——— اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک صبح جب میں نے ایک ایسی شبیہ دیکھی جسے دیکھ کر میری آنکھیں دفعتاً بچ گئیں اس دن مجھے ایسا روحانی صدمہ ہوا کہ میں نے دن کا بیشتر حصہ بستر میں گذار دیا، اور وہ دن بہت ہی بُرا ثابت ہوا۔

ذرا سوچئے تو سہی، نور کا تڑکا ہے۔ پرندے چہچہا رہے ہیں۔ چاروں طرف نور برس رہا ہے، پیارا سماں ہے، سورج کی سنہری شعاعیں کھڑکی میں سے آپ کے بستر پر رقصاں ہیں (کیونکہ سورج نکلنے سے پہلے، تمنا نایاب ہوتا جا رہا ہے) آپ کی آنکھیں مُندی ہوئی ہیں۔ آپ کچھ کچھ جاگ رہے ہیں، کچھ کچھ سو رہے ہیں۔

آپ چاہتے ہیں کہ اب بستر چھوڑ دینا چاہیئے۔ تب بہتر تو یہ ہے کہ آپ خود انگڑائی لیتے ہوئے اٹھیں۔ دو چار سیٹیاں بجائیں، کچھ چہل قدمی کریں۔ ایک آدھ سگریٹ ہی سلگا لیں۔ کوٹھی کے زنانے سے کوئی آواز نہ آئے۔ کسی قسم کی آواز نہ ہو ——— یا یوں کہ کوٹھی میں کوئی زنانہ ہو ہی نہ ——— اگر تھوڑی بہت آواز آئے تو وہ نوکر کی ہو۔ جو صبح کا ناشتہ تیار کر رہا ہو! ——— بس دیکھئے نا کیسی اچھی زندگی ہے بالکل سپاہیانہ زندگی!

اور اگر آپ اس سے محروم ہیں، یا یوں کہ آپ شادی پر تُلے بیٹھے ہیں تب کیا آپ کا جی نہ چاہے گا کہ آپ کو علی الصبح ایک سنہرے بالوں والی گلابی رنگ کی ننھی منی سی گڑیا اپنے چھوٹے چھوٹے گدگدے ہاتھوں سے جگائے اور آپ آنکھیں کھولتے ہی ایک دمکتا ہوا معصوم چہرہ دیکھیں جو سورج کی کرنوں سے جگمگا رہا ہو۔ جس کا مسکراتا ہوا چہرہ آپ کے لبوں پر زبردستی مسکراہٹ پیدا کر دے جو آپ کی گود میں بیٹھ کر رنگا رنگ پرندوں اور پیاری پیاری تتلیوں کی باتیں کرے اور جب دوران گفتگو میں آپ کو "ابا" کہے تو آپ کا سینہ یکلخت تن جائے۔ اور سر اونچا ہو جائے اس کے بعد ایک اور چہرہ (بچے کی والدہ کا) آپ کو پردوں یا شیشوں میں سے نظر آ جائے تب شاید آپ کی خفیف مسکراہٹ ایک دلیر مسکراہٹ میں بدل جائے۔

اور اگر کہیں ایک بھدا سا بچہ (جو صبح صبح رو بھی رہا ہو) جس کی آنکھیں یوں ٹمٹما رہی ہوں جیسے چمگادڑ کی جسے ذرا دھمکا کر آپ کے کمرے میں آپ کو جگانے کے لئے بھیجا گیا ہو اور آپ فوراً کڑکتے کڑکے ایک ویسا چہرہ دیکھیں ——— ذرا اندازہ کیجئے اس وقت کیا حالت ہوگی آپ کی؟

اور خاص طور پر اس صورت میں جب آپ نے رات کو بڑے حسین خواب بھی دیکھے ہوں۔ توبہ توبہ! —— میں تو بھاگ جاؤں۔ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھوں —— بس بھاگتا چلا جاؤں۔

خودکشی کی واردات کی وجہ اگر کلی طور پر نہیں تو کسی حد تک ایسی ہی باتوں پر مبنی ہوتی ہے۔ جس قدر حادثات ہوتے ہیں ان میں سے بیشتر یا کم از کم نصف تو ضرور اسی لئے ہوتے ہیں۔ خبر چھپتی ہے "خودکشی کی وجہ خانگی معاملات کی گڑبڑ بتائی گئی ہے"۔ اب صاحب! یہ خانگی معاملات کی گڑبڑ تبا یئے اور کون سی ہو سکتی ہے —— ؟ یہی نا، جو میں عرض کر چکا ہوں بالکل یہی! آپ یقین کیجئے "خانگی معاملات کو سب سے بڑی الٹ پلٹ کر دینے والی چیز "بدصورت بچے" ہیں۔ جنہیں روز دیکھ دیکھ کر لوگ چاہتے ہیں کہ اس زندگی کے جہنم سے راہ فرار اختیار کریں۔ اور بیچارے خودکشی کر بیٹھتے ہیں۔

ایک قصہ اور رہ گیا۔ وہ یہ کہ ایک اچھی خاصی شکل کے صاحب پر ایک کچھ ذرا ویسی "خاتون مائل تھیں۔ وہ صاحب اپنا فرض سمجھتے ہوئے ان سے باتیں تو کر لیا کرتے تھے لیکن ساتھ ہی ڈرتے بھی تھے۔ کیونکہ ہمارے ملک میں لڑکے اور لڑکی کی اتنی سی واقفیت یا خفیف سے خفیف دوستی کا ہمیشہ سے اندیشہ رہتا ہے کہ نہ جانے کس وقت شادی میں تبدیل ہو جائے فریقین میں سے ضرور کوئی نہ کوئی شادی پر تُل جاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ شادی پر اُتر آتا ہے۔

خیر! ایک دن وہ دونوں اکٹھے کھڑے تھے یا بیٹھے ہوں گے (مجھے اتنا یاد نہیں) ایک نہایت پیارا بچہ گزرا۔ اُن صاحب نے اسے بلا لیا۔ گود میں بٹھا پیار کیا، چمکارا۔ خاتون نے بھی بعینہٖ نقل کی۔ اور شرما کر بولیں۔ "کیا آپ کو بچے بہت اچھے لگتے ہیں؟"

اب ایک عقلمند کے لئے تو یہ اشارہ "کیکی چڑھا دینے" کے لئے کافی ہے۔ انہوں نے کچھ دیر سوچا، پھر بولے۔ "جی ہاں! اچھے لگتے ہیں لیکن صرف خوبصورت بچے!" نہ جانے اس کے بعد کیوں وہ خاتون ان صاحب سے کھنچی کھنچی رہنے لگیں۔

میں ایک مرتبہ پھر اپنی پوزیشن صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ میں پہلے بھی عرض کیا ہے کہ مجھے خدا کی مخلوق سے بیر نہیں۔ میرے لئے خوبصورت اور بدصورت سب یکساں ہیں لیکن اپنا اپنا نظریہ ہے۔

میں یہ ہرگز ہرگز نہیں کہتا کہ سب کے سب بدصورت لڑکوں اور لڑکیوں سے بیزار ہو جائیں۔ اگر آپ کسی "ذرا" ویسی لڑکی سے چند وجوہ کی بنا پر شادی کرنا چاہتے ہیں تو بینک کر لیجئے۔ اور مجھے بھی لکھئے تاکہ میں آپ کو مبارکباد پیش کر سکوں —— مگر خدا کے لئے بدصورت بچوں کو ساخت کرنے کے ذمہ دار نہ بنیئے! —— اور آپ آئندہ نسلوں کو اگر بہتر نہیں بنا سکتے تو کم از کم بگاڑیئے بھی مت ——!

رباعیات

از جناب پیارے لال شاکر میرٹھی

دل کو تری چاہ، عمرِ فتنہ سر تک
دیکھیں تری راہ، عمرِ فتنہ سر تک
رستے کا نشاں نہ نقشِ پا کا ہے سراغ
ڈھونڈیں تجھے آہ، عمرِ فتنہ سر تک؟

دل میں نہیں اب خون کا قطرہ باقی!
اشکوں نے نہ آہ کچھ بھی رکھا باقی
دل ہو گیا بیزار زیست کی حلاوت سے
رہتی ہے کسی کی چاشنی چکھنا باقی!

بہارِ اندر بہار

کسی کے قدموں پہ جان دیدے نثار ہو جا نثار ہو جا

حضرت ہادی مچھلی شہری

مرے دلِ پُر محن کے حق میں متاعِ صبر و قرار ہو جا
قسم ہے رعنائیوں کی تجھکو تمام باغ و بہار ہو جا

قرار دے طور میرے دل کو خود اپنی نظروں کی برقِ پیہم
رُخِ حسیں سے ہٹا کے پردہ بصد ادا جلوہ بار ہو جا

وفا کی راہیں ہیں تجھ سے قائم زمانہ لے تجھ سے زریں ہمت
جو مٹنا ہی ہے تو اسطرح مٹ کہ اِن کا آئینہ دار ہو جا

وہ آگ کیا جو سلگ سلگ کر فنا کے دامن میں تجھ ہی ہو
اگر ہے جلنے ہی کی تمنا تو سر سے پا تک شرار ہو جا

مزا تو جب ہے کہ نا امیدی سے شکلِ امید کی ہو پیدا
جو مٹنے کی ہے تجھے تمنا تو صرفِ رنج خمار ہو جا

گلے میں ہوں دلفریب گجرے سجے ہو پھولوں سے زلفِ مشکیں
اسی میں ہے شانِ دلربائی بہار اندر بہار ہو جا

نتیجہ کیا ایسی زندگی سے جو ختم ہو کر نہ کام آئے
تمام ذرات پر جہاں کے فنا کے نقش و نگار ہو جا

ہر ایک قطرہ ترے لہو کا ہو ہمت افزائے جاں نثاری
دلوں کے اُجڑے ہوئے چمن میں وفا کی رنگیں بہار ہو جا

ہے میکدہ جس کا نام زاہد وہی تو ہے درسگاہِ معنی
خودی اگر ہے حجابِ غفلت تو پی کے مے ہوشیار ہو جا

جمود تیرا غلط ہے بالکل ہے بیدلی تیری ننگِ فطرت
کھِلا دے گل سرخ آنسوؤں کے شریکِ ابرِ بہار ہو جا

خودی کو غرقابِ بیخودی کر یہی ہے جینا یہی ہے ہستی
زباں پہ ہو نعرۂ انا الحق حقیقت آرائے دار ہو جا

عجب نہیں ہے لا ایسی نسبت تجھے بھی اِکرام گل بنا دے
گلوں کا پہلو جو ہو میسر تو کم نہیں یہ بھی خار ہو جا

سکون تیرا ہو بیقراری خوشی تری کیفِ آہ و زاری
تڑپ کے بے اختیار ہو کے دلِ حزیں کا قرار ہو جا

ہے یہ بھی اِک دلبری کی صورت کہ ہو ہمیشہ نئی حقیقت
کسی کی بے اختیاریاں بن کسی کا صبر و قرار ہو جا

تجھے بھی معلوم ہو کہ کیا ہے غمِ محبت کی بیقراری
جلا نگاہوں کو اپنی دے کر دلوں کا آئینہ دار ہو جا

مزا تو جب ہے کہ کاوشِ دل سے سرخرو ہو تری تمنا
بہا کے آنکھوں سے اشکِ رنگیں خزانِ غم کی بہار ہو جا

فضائے گلشن کو روئے زیبا سے یکدم رنگ تازگی دے
حقیقتیں بن کے رنگ و بو کی نظر فروزِ بہار ہو جا

وفا کے معنی یہی ہیں ہادی کہ اپنی ہستی کی ہو نہ پروا
کسی کے قدموں پہ جان دیدے نثار ہو جا نثار ہو جا

پنجاب کے مشہور و معروف تاجران کتب نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور کی

نئی اور مقبول عام کتب

گل و بلبل۔ پنجاب کے مشہور افسانہ نگار قاضی محمد صادق قریشی ایم۔ اے کے دل گداز افسانوں کا نادر مجموعہ قیمت مجلد عہ ۔

آغاز و انجام۔ دلگداز افسانوں کا نادر مجموعہ۔ اس مجموعہ کے مصنف ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار جناب جمیل احمد گند ھاچوری ایم۔ اے ہیں جن کے افسانے ہندوستان کے بلند پایہ علمی و ادبی رسائل و جرائد کی زینت ہوتے رہتے ہیں۔ قیمت فی جلد مجلد عہ ۔

شمع حرم۔ یہ کتاب ہندوستان کی مختلف صوبوں کی بہترین افسانہ نگار خواتین کے شاہکار افسانوں کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے جس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی خواتین افسانہ نگاری کے فن میں مردوں کو نیچا دکھا گئی ہیں مرتبہ چوہدری علیخان۔ قیمت فی جلد ۱۲ ۔

ساقی۔ ادبیات حاضرہ میں اپنے ڈھنگ کا پہلا شاہکار ہے جس کو پنجاب کے مقتدر ادیب جناب آتش صاحب نے اردو لباس پہنایا اگر آپ اپنی اور اپنے سماج کی اصلی صورت دیکھنا چاہتے ہیں تو اس ناول کا مطالعہ فرمایئے۔ یہ اپنی نوعیت کی لاثانی اور بے مثل کتاب ہے قیمت مجلد عہ ۔

جلا وطن۔ دنیا کے ۱۰ نامور افسانہ نگاروں کے بہترین افسانوں کا مجموعہ مترجمہ لالہ تیرتھ رام صاحب فیروزپوری قیمت صرف عہ ۔

ٹالسٹائی کی کہانیاں۔ اس مجموعے میں روس کے عظیم المرتبت مہاتما ٹالسٹائی کے دس شاہکار افسانے شامل ہیں قیمت سنہری جلد صرف ۱۲ ۔

دنیائے آرزو۔ یہ کتاب ادیب الملک میرزا ادیب بی۔ اے آنرز کے تین شاہکار افسانوں پر مشتمل ہے جو ڈرامائی صورت میں لکھے گئے ہیں۔ یہ میرزا صاحب موصوف کے مخصوص رنگ کی بہترین کتاب ہے۔ قیمت فی جلد ۱۲ ۔

موت کا راگ۔ اس کتاب میں میرزا ادیب بی۔ اے نے الفاظ کے چھلکوں میں درد کی تصویریں کھینچ دی ہیں یہ مجموعہ افسانوی دنیا میں ایک انقلاب آفریں اضافہ ہے قیمت مجلد ۱۲ ۔

برف کا دیوتا اور دیگر افسانے۔ پنجاب کے مشہور افسانہ نگار حضرت سیاح سنامی کے بہترین افسانوں کا نادر مجموعہ۔ قیمت فی جلد عہ ۔

معیار محبت اور دیگر افسانے۔ حضرت سیاح سنامی کے چیدہ برگزیدہ افسانوں کا مجموعہ جس کا ہر افسانہ تخیل کی رنگینی اور بلند پروازی کا نمونہ ہے قیمت فی جلد عہ ۔

ڈی ولیرا۔ آئرلینڈ کے زندہ شہید جس کیلئے باغی کی حیثیت سے پھانسی کی سزا مقرر ہوئی کی سوانح حیات عہ ۔

سنہرے سپنے۔ ملک کے مشہور شاعر حضرت تنویر نقوی کے گیتوں کا مجموعہ قیمت مجلد سنہری ۱۲ ۔

ایکٹریس کی آپ بیتی۔ اگر آپ کالج کی فیشن زدہ لڑکیوں کے خیالات موجودہ تعلیم کا ان پر اثر۔ اور ان سب کا نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو اس کتاب کا مطالعہ فرمایئے۔ قیمت فی جلد صرف عہ ۔

آخری تحفہ۔ فطرت نگار منشی پریم چند بی۔ اے کے افسانوں کا نقش ثانی ہے یہ اس زمانے کی تصنیف ہے۔ جب ان کا ذہن زندگی کے نشیب و فراز سے ... ہو کر گرم و سرد کا مزہ چکھ کر پختہ کار ہو چکا تھا۔ قیمت ۱۲ ۔

نور و نار۔ ادبیات حاضرہ میں اپنی طرز کا پہلا ناول ہے۔ اس ناول کے مصنف پنجاب کے نامور ادیب جناب پرویز صاحب ہیں۔ قیمت صرف ۱۲ ۔

پنگھٹ۔ پنجاب کے نامور افسانہ نگار جناب نعمت ہاشمی کے کہانی افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد ۱۲ ۔

بیوی کی تلاش۔ احسان بی۔ اے آنرز کے شاہکار افسانوں کا نادر مجموعہ قیمت فی جلد ۱۲ ۔

گناہ کی غربت۔ گناہ کی غربت مہاتما ٹالسٹائی کے دو حسین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں افلاس و گناہ اور سرمایہ و گناہ کے دو گونہ پہلو کو بے باکانہ انداز میں عریاں کیا گیا ہے۔ جلد ۱۲ ۔

کملا۔ بنگالی زبان کے مشہور ناول "پارو بتی" کا اردو ترجمہ۔ اگر عشق کی جنون سامانیاں اور حسن کی کار فرمائیاں دیکھنی مطلوب ہوں تو اس ناول کو ملاحظہ فرمایئے۔ قیمت ۱۲ ۔

رقاصہ۔ بنگال کے مایہ ناز ادیب بابو شرت چندر چیٹرجی کے ایک مشہور ناول کا اردو ترجمہ۔ قیمت عہ ۔

ستارہ صبح۔ عشق و محبت کی رنگین داستانوں کا ایک خوبصورت مجموعہ۔ اس میں دنیا کے ہر ملک کے بہترین افسانہ نگاروں کا ایک ایک افسانہ منتخب کر کے درج کیا گیا ہے قیمت فی جلد ۱۲ ۔

دنیا کی رنگین مزاج عورتیں۔ یہ کتاب دنیا کی ان مشہور و معروف عورتوں کے عشقیہ داستانوں پر مشتمل ہے جن کے نام شہرت کے آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں قیمت ۱۲ ۔

مہر و ماہ۔ ملک کے جلیل القدر افسانہ نگار سید احسان علی شاہ بی۔ اے آنرز کے چودہ رومان پرور افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد ۱۲ ۔

خاموش حسن۔ ملک الشعراء ایشیا ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور مرحوم کے دس دلکش اور رنگین افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد ۱۲ ۔

پھول اور کلیاں۔ اس مجموعہ میں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور مرحوم کے ۵ بہترین افسانے ہیں۔ اس کے مترجم لالہ تیرتھ رام فیروزپوری ہیں۔ قیمت فی جلد ۱۲ ۔

سٹالن۔ روس کے ڈکٹیٹر سٹالن کی سوانح حیات۔ قیمت فی جلد صرف ۱۲ ۔

چیمبرلین۔ سابق وزیر اعظم برطانیہ کی سوانح حیات اور ان کا موجودہ جنگ میں حصہ۔ مترجمہ لالہ تیرتھ رام فیروزپوری۔ قیمت فی جلد ۱۲ ۔

آسان جوتش۔ یوں تو اردو زبان میں جوتش کے متعلق بیشمار کتب شائع ہو چکی ہیں مگر یہ کتاب اردو ادب میں اپنی نوعیت کی لاثانی کتاب ہے۔ اس کتاب کے مصنف لاہور کے مشہور ڈاکٹر شانتی لال ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ہیں۔ قیمت مجلد ۱۲ ۔

کلام محروم۔ پنجاب کے نامور شاعر لالہ تلوک چند بی۔ اے محروم کے کلام کا نادر مجموعہ۔ قیمت ۱۲ ۔

الملتمس:- نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب اندرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

نوشتہ: سیتا دیوی
ترجمہ جناب جمیل احمد کندھائیوری ایم اے

خدا کے فضل سے رامیندھی کھوشال کو مال و دولت کی کمی نہ تھی، مگر قسمت کا وہ بڑا کھوٹا تھا۔ فرشتہ موت کو تو گویا اس سے ازلی بیر تھا کیونکہ اس کا کوئی نہ کوئی عزیز ہر سال ضرور مرا کرتا — دُنیا میں اس کے قدم رکھتے ہی اس کی ماں اسے داغِ مفارقت دے گئی اور پھر اس کے باپ نے اپنی بیوہ بہن کی مدد سے کسی نہ کسی طرح اس کی پرورش شروع کی مگر ابھی رامیندھی پانچ سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ دفعتاً وہ بھی تیرِ اجل کا نشانہ بن گیا — باپ کی موت کے بعد بجز ایک بیوہ پھوپھی کے رامیندھی کا اس وسیع دُنیا میں کوئی ایسا نہ رہا جسے وہ اپنا کہہ سکے — مگر نگرانی کے سلسلے میں پھوپھی کے سامنے جلد ہی ایک غیر متوقع مگر ناخوشگوار گوشے سے دستِ تعاون دراز کیا گیا — اور یہ تھا اس کے سوتیلے بیٹے جوگیش کی طرف سے!!

ابتک جوگیش اپنی سوتیلی ماں سے کشاں کشاں رہا تھا جسکی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک غریب اور بے یار و مددگار عورت تھی اور جوگیش کو اندیشہ تھا کہ کہیں وہ اس سے مالی اعانت نہ طلب کرے۔ لہذا اس نے اس سے الگ تھلگ اور دُور دُور رہنا ہی اپنا شعار بنا لیا تھا۔ مگر اب جیسے ہی اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی سوتیلی ماں ایک مالدار یتیم بچے کی واحد نگران بن گئی ہے، اس کے لئے ایک لمحہ بھی دُور رہنا مشکل ہو گیا اور بغیر کسی تاخیر کے وہ فوراً اس کی امداد کو پہنچ گیا۔

مگر جلد ہی اسے اپنی توقعات نقش بر آب ثابت ہوتی دکھائی دینے لگیں۔ جو امیدیں لے کر وہ یہاں پہنچا تھا وہ آسانی سے پوری ہوتی نظر نہ آتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ رامیندھی نہ تو ہوشیار ہی تھا اور نہ زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا تھا مگر اپنی پھوپھی پر اسے بہت زیادہ اعتماد تھا۔ وہ اس کے ادنیٰ اشارے پر اپنی جان قربان کرنے کیلئے بھی تیار تھا۔ جوگیش کی سوتیلی ماں اپنے سوتیلے لڑکے سے بخوبی واقف تھی اور چونکہ وہ اس کے پہلے رویّے کو بھولی نہیں تھی، اس لئے آسانی سے فریب میں نہیں آ سکتی تھی۔

پھر بھی جوگیش اس قدر جلد اپنی امیدوں سے دست بردار ہو جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کی سوتیلی ماں آخر ہمیشہ تو زندہ نہیں رہ سکتی تھی اور پھر رامیندھی کا اس دُنیا میں دوسرا رشتہ دار ہی کون تھا! لہذا جوگیش کو امید تھی کہ اس کو صبر کا پھل جلد یا بدیر ضرور مل کر رہے گا — جوگیش کی شادی قدرے صغر سنی میں ہو گئی تھی مگر اس کی بیوی ہمیشہ اپنے والدین ہی کے ساتھ رہتی تھی۔ اپنی ماں سے وہ ایک منٹ کے لئے بھی علیحدہ ہونے کو تیار نہ تھی۔ رامیندھی کے یہاں آنے سے پیشتر جبتک جوگیش اپنے گاؤں میں رہا، وہ تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے اسے دو ایک بار اپنے گھر لانے میں کامیاب ہوا مگر جب سے اس نے یہاں اقامت اختیار کی تھی، یہ سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا تھا۔ اس کی ساس اپنی لڑکی کو ایسی جگہ جانے کی اجازت دینے کیلئے تیار نہ تھی جہاں اس کا خیر مقدم سرد مہری سے کیا جائے۔ علاوہ ازیں جوگیش بھی اس سلسلہ میں دباؤ ڈالنے کے لئے تیار نہ تھا کیونکہ اسے سوتیلی ماں کی طرف سے کامل اطمینان نہ تھا۔ بہت ممکن تھا وہ اس کی بیوی کی تشریف آوری کو پسند نہ کرے اور اس کی شریکِ حیات یہاں پہنچ کر ناراض ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا میں جوگیش کو اگر کسی کا خوف تھا تو صرف اپنی بیوی کا!

اگرچہ اس کی بیوی راد ھارانی خود نہیں آتی تھی مگر جوگیش کو وہ اکثر اپنے یہاں دو چار دنوں کے لئے بُلوا لیتی تھی۔ کبھی کبھی تو یہ اس کی درخواست کو قبول کر لیتا مگر اکثر و بیشتر اسے انکار ہی سے کام لینا پڑتا کیونکہ ان دنوں اس کے پاس خاص پیسے بھی نہیں بچتے تھے علاوہ ازیں اسے یہ بھی خوف تھا کہ اگر وہ رامیندھی سے تھوڑے وقفے کے لئے بھی جدا ہوا تو بہت ممکن ہے اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ اپنے استقلال کی بدولت جوگیش اس احمق بچے پر کسی قدر قابو پانے پر کامیاب ہو گیا تھا اور رامیندھی کبھی کبھی کچھ روپیے اپنی پھوپھی کی نظریں بچا کر چپکے سے اسے لا کر دیدیا کرتا تھا۔

پڑھانے کے بہانے سے جوگیش رامیندھی کو تین چار گھنٹے اپنے کمرے میں ضرور بیٹھاتا۔ ان دنوں وہ اس احمق کو ایک ہارمونیم خریدنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ دُکاندار نے جوگیش سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ کسی طرح اس کا پُرانا ہارمونیم فروخت کرا دیگا تو وہ اسے

پچاس فیصدی کمیشن دیگا۔

رامیندھی ان دنوں جس گھر میں اپنی پھوپھی کے ساتھ زندگی گذار رہا تھا وہ کلکتہ کے ایک مفصل علاقے میں واقع تھا۔ آس پاس کے تمام باشندے غریب آدمی تھے اور جھونپڑوں ہی میں رہا کرتے تھے۔ پختہ مکانات صرف تین چار ہی تھے اور وہ بھی پُرانی وضع کے! چاروں طرف یہاں سے وہاں تک چٹیل میدان تھے اور گھوڑوں کی آواز وہاں دن کے وقت بھی بآسانی سُنائی دیتی تھی۔ گاؤں میں رامیندھی کی نہ صرف کاشت ہی تھی بلکہ ایک گھر بھی تھا۔ مگر چونکہ وہاں کی آب و ہوا انہیں راس نہیں آتی تھی اس لئے گاؤں میں رہنا انہوں نے ترک کر دیا تھا اور اپنے تمام کھیت کلبند و بست کرکے وہ یہاں چلے آئے تھے۔ روپوں کی وصولی کے لئے رامیندھی کی پھوپھی سال میں دو مرتبہ گاؤں میں جایا کرتی تھی۔ اس سلسلہ میں جوگیش اپنی ماں کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر بوڑھی عورت اس کے تعاون کو کبھی قبول نہیں کرتی۔

〰〰〰

دن آہستہ آہستہ گذرتے گئے یہاں تک کہ رامیندھی اب بچپن کے حدود سے نکل کر جوانی کے حدود میں داخل ہونے لگا۔

"میں بہت ضعیف ہو چکی اور نہ جانے کس گھڑی مر جاؤں" پھوپھی نے ایک دن باتوں باتوں میں کہا۔ "اگر کسی مناسب لڑکی سے اس کی شادی ہو جاتی تو میں نہایت اطمینان سے مرتی۔"

رامیندھی اور جوگیش اس وقت دن کا کھانا کھا رہے تھے۔ شادی کی بات سُن کر رامیندھی کے دل میں مسرت کا احساس ضرور پیدا ہُوا مگر شرم سے اس نے اپنی گردن نیچے جُھکا لی۔

"تم آخر ابھی اس کی شادی کیوں کرنا چاہتی ہو؟" جوگیش نے پُوچھا "ابھی تو اس کی عُمر مشکل سے سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ علاوہ ازیں اس نے ابھی کچھ تعلیم بھی تو حاصل نہیں کی ہے۔"

"ان باتوں پر غور کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں"۔ اسکی سوتیلی ماں نے کہا! "اگر یہ ابھی کمسن ہے تو ہم دُلہن بھی اس کی عُمر کے مطابق ہی تلاش کر لیں گے۔ ہاں! جہاں تک پڑھنے لکھنے کا تعلق ہے رامیندھی کو اس کی ضرورت نہیں ــــ دُنیا کے تمام لوگ روٹی کی خاطر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ میرے بچے کو روزگار حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ کئی نسلوں کی اس کے روپوں سے ہمیشہ پرورش ہوتی رہ سکتی ہے۔"

جوگیش کو اس طعن آمیز بات پر غصہ آیا مگر پی کر رہ گیا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ اس کی بےاطمینانی اب بڑھ گئی۔ اگر بوڑھیا واقعی اب رامیندھی کی شادی کرنے پر تلی ہوئی ہے تو جوگیش کو ضرور ہوشیار رہنا چاہیئے۔ ویسے ہی اس کی سوتیلی ماں احمق لونڈے کی دولت کی نگرانی نہایت کڑی نگاہ سے کرتی تھی۔ اب اگر ایک دُلہن بھی گھر میں آگئی تو وہ کچھ کم ہوشیاری سے چیزوں کی دیکھ بھال نہیں کرے گی۔ اور ظاہر ہے ان دونوں کے درمیان اس کی تمام دیرینہ آرزوئیں پامال ہو کر رہ جائیں گی۔

اب اس کے لئے بجز اس کے دوسری کوئی تدبیر نہ تھی کہ وہ بیوقوف لڑکی کی تلاش کرکے اُس سے کسی نہ کسی طرح رامیندھی کا بیاہ کرا دے۔

چند دنوں کے بعد جوگیش ایک خط لیکر اپنی سوتیلی ماں کے سامنے گیا۔ جو اس وقت اپنے کمرے میں بعض ضروری کاموں میں مصروف تھی۔

"کیا تم اس وقت بہت مصروف ہو؟" جوگیش نے استفسار کیا۔ "میں تم سے کچھ کہنے آیا تھا۔"

اس کی سوتیلی ماں نے نگاہ اوپر کرکے اُسے دیکھا "کیا ہے؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اس دن تم رامیندھی کے بیاہ کے متعلق کہہ رہی تھیں" جوگیش نے جواب دیا "اگر اجازت دو تو میں ایک نہایت اچھی جگہ اس کے لئے بات چیت کروں۔"

جوگیش کے اس استفسار پر اس نے نہایت سرد مہری سے پُوچھا "کہاں رہتے ہیں وہ؟"

"یہاں سے قریب ہی" جوگیش نے کہا "میری بیوی سے اُس کی رشتہ داری بھی ہے اور مجھ سے پوچھو تو رامیندھی کے لئے یہ لڑکی ہر اعتبار سے بہت مناسب ہے! خوبصورت، ہوشیار، ذہین ـــ ہر لحاظ سے اچھی، یہاں آتے ہی گھر کو جنت بنا دے گی ـــ"

یہ تفصیل رامیندھی کی پھوپھی پر خاطر خواہ اثر نہیں ڈال سکی۔ "لڑکی کا باپ کیا کرتا ہے؟" اس نے پُوچھا "کیا وہ لوگ خوش حال ہیں؟"

اس سرد خیر مقدم پر حقیقت یہ ہے جوگیش کا دل کٹ گیا۔

"اس کا باپ مر چکا ہے" اس نے جواب دیا "لڑکی یتیم ہے اور اس کی پرورش میری ساس ہی نے کی ہے۔ مگر تم ان باتوں کے متعلق

کیوں سوچتی ہو؟ رامیندھی کو اپنا ہی کیا کم ہے کہ اس کیلئے سسر کی دولت تلاش کی جائے؟"

"کچھ بھی ہو۔ مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ لڑکی والے مفلس ہوں۔" اس کی سوتیلی ماں نے کہا۔ "علاوہ ازیں مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ رامیندھی کا بیاہ کسی یتیم لڑکی سے ہو۔ میرا بچہ خود ہی یتیم ہے۔ لہٰذا اس کے لئے سسر کا زندہ ازبس لازمی ہے تاکہ وہ اس کی چیزوں کی دیکھ بھال کر سکے۔ اسے خود اتنی عقل کہاں کہ تمام کاموں کا بوجھ خود سنبھال سکے۔ اس کی اور اس کی چیزوں کی نگرانی کے لئے آخر میں ہمیشہ تو زندہ نہیں رہ سکتی۔"

جوگیش کے چہرے پر شکنیں نمودار ہوگئیں اور وہ مایوس واپس چلا گیا۔ اگر رامیندھی کی شادی وہ اس لڑکی سے کرانے میں کامیاب ہو جاتا تو حالات بڑی حد تک اس کے موافق بن جاتے۔ اس کی عزت سسرال میں ضرور بڑھ جاتی اور لڑکی بھی تادم واپسیں اس کی ممنون رہتی۔ وہ ایک سیدھی سی بیوقوف دیہاتی لڑکی تھی اور دنیا کے نشیب و فراز سے بالکل ناواقف! لہٰذا جوگیش بڑی آسانی سے اُسے اپنے قبضے میں رکھ سکتا تھا۔ لیکن اس کی سوتیلی ماں نے اس وقت اس کی تمام دیرینہ توقعات پر پانی پھیر دیا۔

پھر بھی وہ ان آدمیوں میں سے نہیں تھا جو بہت جلد ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ وہ تقریباً ہر روز نئی نئی لڑکیوں کے متعلق اطلاعات بہم پہنچاتا رہا اور اس طرح اسے ہر روز اپنی سوتیلی ماں سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ رامیندھی سے بھی اس کے متعلق بات چیت شروع کر دی۔

ایک صبح بوڑھی عورت، رامیندھی کے کمرے کو صاف کرنے گئی۔ بستر سمیٹتے وقت اسکی نظر تین چار تصویروں پر پڑی جو تکیے کے نیچے رکھی ہوئی تھیں۔ تمام تصویریں نوجوان لڑکیوں کی تھیں اور سب کی سب خوبصورت تھیں۔

رامیندھی اس وقت کمرے سے باہر کھلی ہوا میں ٹہل رہا تھا مگر پھوپھی نے اسی وقت اسے بلایا اور ڈپٹ کر پوچھا "یہ کس کی تصویریں ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم؟" اس نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"تمہیں نہیں معلوم!" اس نے اور بھی زوردار آواز میں پوچھا "تو اور کسے معلوم ہے؟ یہ آخر یہاں کس طرح آئیں؟"

"جوگیش دادا نے لاکر مجھے دی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ ان میں سے کونسی زیادہ خوبصورت ہے؟"

پھوپھی کے چہرے پر تبسم نمودار ہوئے بغیر نہ رہا۔ تصویروں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے، اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا—

"تو تم نے اُسے کیا جواب دیا؟ ان میں سے کون سی زیادہ حسین ہے؟"

مگر احمق رامیندھی بغیر کوئی جواب دیئے بھاگ گیا۔

اس کی پھوپھی تصویروں کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ اور چونکہ وہ ایک بے یار و مددگار بیوہ تھی اور دنیا میں اس کا کوئی ایسا خیرخواہ نہ تھا جو اس سلسلہ میں اسکی مدد کر سکتا تھا۔ لہٰذا انہی چار میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اسے فیصلہ کرنا پڑا۔ لڑکیوں کے نام اور پتے تصویروں کی پشت پر درج تھے۔ لہٰذا اس نے اپنی پرانی ہمعمر ساتھی چندرا موکھی کی مدد سے خود ہی ان کے متعلق صحیح معلومات فراہم کرنے کا فیصلہ کیا — اور جلد جلد دن کا کھانا ختم کرکے وہ تصویروں کے ساتھ اپنی ساتھی کے یہاں روانہ ہوگئی۔ چندرا موکھی ایک بیوہ عورت تھی اور قریب ہی رہتی تھی۔ اس نے اس کا خیرمقدم گرمجوشی سے کیا اور تمام تصویروں کو نہایت شوق اور دلچسپی سے دیکھ کر کہا— "بہن! اگر تم واقعی اپنے بھتیجے کے لئے لڑکی کی تلاش میں ہو تو اجنبیوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کے بجائے اپنی غریب ساتھی ہی کو کیوں نہیں ممنون کرتیں؟"

رامیندھی کی پھوپھی یہ سُنکر کسی قدر حیرت میں آگئی۔ بولی— "میں تو صرف اتنا ہی جانتی ہوں کہ تمہارے صرف دو لڑکے ہی ہیں۔ کیا ان کے علاوہ تمہاری کوئی لڑکی بھی ہے؟"

"اپنی لڑکی نہیں ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہوئے کہ میرے خاندان میں کوئی دوسری لڑکی ہی نہیں ہے! کیا تم میری بھتیجی سشیلا کو بھول گئیں؟"

"سوشیلا! وہ تو نہایت پیاری بچی تھی! مگر کیا تم واقعی رامیندھی سے اس کو بیاہ دوگی؟ تم تو جانتی ہو اس نے تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔"

"اس کی فکر فضول ہے" چندرا موکھی نے کہا۔ "تعلیم اس نے حاصل نہیں کی ہے تو کیا ہوا؟ اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ ایک کنبہ کی پرورش کر سکتا ہے — ہمیں آخر تمام چیزیں تو نہیں مل سکتیں، ہم اپنی حیثیت سے ناواقف نہیں ہیں۔ میری غریب بہن کا شوہر مر چکا ہے اور وہ جہیز وغیرہ نہیں دے سکتی۔"

رامیندھی کی پھوپھی چند لمحوں کے لئے خاموش ہوگئی پھر کہا—

"میرے بچے کی قسمت ہی میں بغیر نگران کے رہنا لکھا ہے۔ جس لڑکی سے بھی اس کی بات آئی، وہ یتیم ہی نکلی! بہرحال! سوشیلا سب سے بہتر ہے اور بڑی بات تو یہ ہے کہ لڑکی تمہاری بھتیجی ہے۔ تم بھی بیچارے رامیندھی کی دیکھ بھال کرتے رہنا — مگر وہ لڑکی آخر ہے کہاں؟ میں نے تو اُسے اُس وقت دیکھا تھا جب وہ ننھی سی بچی تھی۔ اب اُسے پھر ایک مرتبہ دیکھ لینا ضروری ہے۔"

"وہ کلکتہ میں ہے اور تم جس وقت چاہو اُسے دیکھ سکتی ہو۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر آئندہ اتوار تم اور رامیندھی دن کا کھانا یہیں ہمارے ساتھ کھاؤ۔ میں اس روز اپنی بہن اور سوشیلا کو بلوا لونگی اور تم اُسے دیکھ لینا۔"

"تجویز نہایت مناسب ہے۔" رامیندھی کی پھوپھی نے کہا "میں سویرے ہی پہنچنے کی کوشش کروں گی" — اور اتنا کہکر وہ رخصت ہوگئی۔

〰〰〰

رامیندھی واقعی خوش نصیب تھا کہ اس مرتبہ تصویر کے بجائے اس نے گوشت پوست کی ایک چلتی پھرتی دُلہن کو دیکھا اور دیکھتے ہی اس پر لٹو ہوگیا۔ بنگالی معیار کے اعتبار سے لڑکی واقعی حسین تھی۔ اس کا رنگ نکھرا ہوا تھا، اعضا بہت مناسب تھے اور آنکھیں خاص طور پر مناسب اور دلکش تھیں۔

رامیندھی کی پھوپھی کو بھی لڑکی کی شکل و صورت پسند آئی مگر پھر بھی اس نے آخر میں اتنا ضرور کہا کہ لڑکی میرے رامیندھی کے اعتبار سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔ کوئی کمسن لڑکی زیادہ بہتر ثابت ہوتی۔"

"یہ ٹھیک ہے بہن!" چندرا موکھی نے کہا "مگر صرف اس معمولی سے نقص کے لئے اس غریب لڑکی کو مت ٹھکرا دو۔ سوشیلا میں ہزار خوبیاں ہیں اور یہ تم پر اُس وقت واضح ہوگا جب تمہارے گھر جائے گی۔ بہت زیادہ کمسن لڑکی، ممکن ہے تمہارے لئے وبال جان بن جائے۔ وہ دن رات رو رو کر تمہیں پریشانی میں مبتلا کرسکتی ہے مگر میری سوشیلا ہر کام میں تمہارا ہاتھ بٹائیگی۔ خانہ داری کے تمام امور سے وہ بخوبی واقف ہے اور انہیں نہایت کامیابی سے انجام دے گی۔"

غرضیکہ رشتہ بالکل طے پاگیا۔ رامیندھی اپنی شادی کے خیال سے بہت زیادہ مسرور تھا۔

جوگیش کو جب یہ باتیں معلوم ہوئیں تو وہ اپنا غصہ ضبط نہ کرسکا۔ دوڑتا ہوا اسی وقت اپنی سوتیلی ماں کے پاس گیا اور کہا —

"تو گویا تم ایک یتیم لڑکی ہی کو اپنے گھر لانے لگیں لیکن ایسا کرنا ہی تھا تو پھر تم نے میری تجویز کی ہوئی لڑکی کو کیوں ٹھکرا دیا تھا" — شائد اس لئے کہ میں درمیان میں تھا اور اسی وجہ سے تم نے اس کے متعلق گفتگو کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا" —

بوڑھی عورت اچھی طرح اس غیظ و غضب کا سبب سمجھتی تھی اس وقت وہ کچھ جلی کٹی سُنانا چاہتی تھی مگر تھم گئی اور کہا کہ —

"مجھے یہ لڑکی زیادہ پسند تھی، اس لئے میں نے یہ رشتہ منظور کرلیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ یتیم ہے مگر میں اسے بچپن سے جانتی ہوں اور میرا خیال ہے، یہ لڑکی ہر لحاظ سے رامیندھی کے لئے مناسب ثابت ہوگی۔"

جوگیش بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ سمجھ گیا کہ یہ سب لاحاصل رہیگا۔ شادی کو روکنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ علاوہ ازیں وہ کسی قسم کا جھگڑا بھی کھڑا نہیں کرسکتا تھا۔ جہیز کا کوئی سوال ہی نہیں تھا جو وجہ خلافی کے باعث کشیدگی کا سبب بنتا! جوگیش کی ماں لڑکی والوں سے اچھی طرح واقف تھی، لہٰذا وہ کوئی بے بنیاد بات پھیلا کر راہ میں روڑے بھی نہیں اٹکا سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ بہت سی تدابیر اس کے ذہن میں آئیں مگر لاحاصل سمجھ کر اس نے سب کو ٹھکرا دیا —

〰〰〰

آخر شادی کا روز آپہنچا —

اس تقریب کے موقع پر رامیندھی کی پھوپھی نے جوگیش کی بیوی رادھا رانی کو بھی دعوت دی مگر اس نے اپنی علالت کا عذر لنگ پیش کردیا۔ اور تقریب میں شریک نہ ہوئی۔ جوگیش کی ماں نے اس سلسلے میں زیادہ اصرار بھی نہیں کیا۔ سوتیلے بیٹے کے ساتھ نباہ کرنیکی وہ کسی حد تک عادی سی ہوگئی تھی مگر رادھا رانی سے اس کی نباہ ہرگز نہیں ہوسکتی تھی۔

بغیر کسی بے لطفی کے رامیندھی کی شادی انجام پاگئی —

اور جب سوشیلا نے اپنی سسرال میں قدم رکھا تو رسم و رواج کے مطابق اس کا شاندار خیر مقدم کیا گیا اور زور زور سے سنکھ بجا کر اس کی آمد کی خبر ہر جگہ پھیلائی گئی۔

سب سے پہلے رامیندھی کی پھوپھی کو دیکھنے کے لئے

آگے بڑھی۔ اس کے ہاتھوں میں اس وقت زیورات کا ایک بڑا سا صندوقچہ تھا جسے جوگیش نہایت حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ بوڑھی عورت نے صندوقچہ کھول کر طرح طرح کے خیرہ کن طلائی زیورات نکالے اور دُلہن کو پہنا چکنے کے بعد مہمانوں سے مخاطب ہو کر کہا ـــــ

"دُعا کیجئے کہ دُلہن کو یہ زیورات کبھی اُتارنا نہ پڑیں۔"

مہمانوں کے طبقے میں اس وقت سرگوشیوں میں تعریف و تحسین ہو رہی تھی۔

کتنے لاتعداد زیورات تھے! یقیناً اس پر کم سے کم دس ہزار روپئے صرف ہوئے ہوں گے۔ لڑکی کی قسمت واقعی بہت اچھی تھی۔ اپنے گھر سے وہ نہایت معمولی کپڑے پہن کر آئی تھی اور پتلے پتلے کنگنوں کے علاوہ جسم پر کوئی زیور نہ تھا مگر اب شوہر کے گھر میں قدم رکھتے ہی اسے اتنے زیورات مل گئے جو کسی شہزادی کو زیب دے سکتے ہیں۔

جوگیش اپنے کمرے میں جا کر اس وقت فرطِ غضب سے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ زیورات کے لئے روپے کہاں سے فراہم کئے گئے تھے۔ رامیندھی کے باپ نے اپنے ایک ہمسائے کو چند ہزار روپئے قرض دیئے تھے جس کے عوض اس نے اپنا مکان اس کے یہاں رہن کر دیا تھا۔ سُود کی رقم اب تک جمع ہوتی رہی تھی اور دو ایک سال بعد یقیناً مکان رامیندھی کے قبضے میں آ جاتا مگر بوڑھی عورت اس قدر احمق تھی کہ اس نے سُود کی تمام رقم معاف کر دی تھی اور صرف اصل روپے لیکر مکان واپس کر دیا تھا۔

جوگیش اس حماقت کا سرے سے مخالف تھا مگر بوڑھی عورت اس کی عدم موجودگی میں یہ حرکت کر بیٹھی تھی۔ جوگیش کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے اس کے پیدائشی حقوق پر ڈاکہ ڈال لیا ہے۔ اس نے رولڈ گولڈ کے نہایت سستے آویزے دُلہن کی نذر کرنے کیلئے خرید چھوڑے تھے مگر اس وقت وہ اس قدر برافروختہ تھا کہ دُلہن کو پیش کرنے کے بجائے اس نے آویزے پھر اپنی میز میں بند کر دیئے۔

جب تقریب بالکل ختم ہو گئی اور تمام مہمان رخصت ہو چکے تو وہ اپنی سوتیلی ماں کے سامنے گیا اور بولا۔ "کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ اتنے روپے معاف کر کے تم نے بہت اچھا کیا؟ میں پوچھتا ہوں آخر اس کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

بوڑھی عورت اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ "جانتے ہو اس کی بیوی کو ہسپتال ہو ...

غریب برہمن کا مکان چھین لیتی! علاوہ ازیں مجھے دُلہن کے زیورات کیلئے روپوں کی ضرورت تھی۔ وہ آخر میرے گھر میں بغیر زیورات کے کیوں رہنے لگی؟"

"مگر تم کچھ عرصہ انتظار کر سکتی تھیں"۔ جوگیش نے بگڑ کر کہا۔ "آخر اتنی عجلت کیا تھی؟ رامیندھی تو احمق ہے مگر تمہیں تو اس کے نفع نقصان کا خیال کرنا چاہئے۔"

اس کی ماں کے تیوروں پر بَل آ گئے۔

"مجھے اس کے نفع و نقصان کا تم سے زیادہ خیال ہے"۔ اس نے کسی قدر برافروختہ ہو کر کہا۔ "تمہیں اس کے لئے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ جوگیش کے جواب کا انتظار کئے بغیر غصے کی حالت میں چلی گئی۔

جوگیش کو اب موقع کی نزاکت کا اچھی طرح احساس ہو چکا تھا۔ اگر اس نے دانشمندی سے کام نہیں کیا تو اسے بہت جلد اس گھر سے نکل جانا پڑیگا ـــــ آخر صرف دو وقت کے کھانے اور ایک پختہ کمرے میں رات بسر کر لینے ہی کے لئے تو وہ یہاں نہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ چیزیں تو اسے اپنے گاؤں میں بھی میسر آ سکتی تھیں۔ اپنے آبائی گھر اور بیوی کو چھوڑ کر وہ یہاں صرف مستقبل کی اُمید میں ذلت کے ساتھ اپنی سوتیلی ماں کا نرم و گرم برداشت کر رہا تھا۔ لیکن جب یہ اُمید منقطع ہو چکی تھی تو پھر یہاں اور ٹھہرنے سے فائدہ! مستقبل اب واقعی نہایت تاریک نظر آ رہا تھا۔ پہلے تو صرف اکیلی اس کی بوڑھی سوتیلی ماں تھی جس کی طرف سے اسے اندیشہ تھا لیکن اس کے علاوہ اب رامیندھی کی بیوی بھی تھی جس کی پُشت پر اس کے تمام رشتہ دار تھے۔ بوڑھی عورت نہایت احمقانہ طور پر اس معمولی لڑکی پر روپے صرف کر رہی تھی۔ اسے صرف دس ہزار کے زیور ہی نہیں ملے تھے بلکہ ہر روز نئے نئے کپڑے، نئے نئے فرنیچر اور ہر قسم کی قیمتی اشیاء بھی دی جا رہی تھیں ـــــ اور یہ سب جوگیش کے خیال میں محض فضول تھا! اس نے رامیندھی کے روپوں پر غاصبانہ قبضہ جمانے کی تدبیر سوچ رکھی تھی مگر اسے کوئی ایسی تدبیر نظر نہیں آتی تھی جس سے وہ سوشیلا کے زیوروں میں سے حصہ طلب کر سکتا تھا ـــــ

بوڑھی عورت نے رامیندھی کی شادی واقعی ٹھیک وقت پر کر دی تھی، اس لئے کہ اس کے بعد خود اس کی صحت روز بروز خراب ہونا شروع ہو گئی تھی۔ جوگیش کو اس سے کسی قدر تقویت تو ضرور ہوئی مگر کبھی کبھی اسے اس خیال سے پریشانی ہوتی کہ ممکن ہے بوڑھی عورت جلد ختم نہ ہو۔ ان دنوں اسے یہ دیکھ کر بہت زیادہ تشویش ہو رہی تھی

مگر اس کی ماں گاؤں کی تمام جائداد کو فروخت کر کے اُس روپے سے کلکتہ میں ایک عالیشان عمارت تعمیر کرانے پر تُلی ہوئی ہے اور یہ مکان رامیندھی کی بیوی کے نام سے تیار ہونے والا تھا ——

~~~~~~~~

دسہرے کے دن آ پہنچے۔ رامیندھی کی پھوپھی نے اس سال اپنے گھر میں پُوجا کرنے کی تجویز بنائی۔ لیکن جوگیش نے اس کی شدید مخالفت کی ——

"اپنے گھر میں ہم نے آج تک کبھی پوجا نہیں کی —— اب خواہ مخواہ ایک نیا کام شروع کر لینے سے فائدہ! اس کے معنی یہ ہونگے کہ بے دریغ روپے صرف کئے جائیں۔ اب کہ رامیندھی کی شادی ہو گئی ہے ہمیں کفایت کا زیادہ خیال کرنا چاہیئے۔"

"پُوجا میں زیادہ خرچ نہیں" ضدی بوڑھی عورت نے کہا۔ "میرا لڑکا اس سے فقیر نہیں ہو جائیگا۔ اب کہ اس نے شادی کر کے گرہستی کی زندگی شروع کی ہے اس کو ضرور دیوتاؤں کو خوش رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مجھے اس کی بڑی مُدت سے تمنا تھی اور اب میں اس تمنا کو پُورا کرنے کا عزم کر چکی ہوں۔"

رادھارانی کو اس مرتبہ پھر مدعو کیا گیا اور اسے دعوت قبول کرنا ہی پڑی کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس نے بار بار انکار کیا تو تمام چہ میگوئیاں ہونے لگیں گی۔ سوشیلا کے قیمتی زیورات اور پُر تکلف کپڑوں کی شہرت اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی! لہٰذا اسے روانگی سے پیشتر چند زیورات اور بعض اچھے اچھے کپڑے اپنے رشتہ داروں سے قرض لینا پڑے تاکہ رامیندھی کی بیوی کے سامنے اُسے کمتری اور ذلت کا احساس نہ ہو۔

جوگیش جس کمرے میں یہاں رہتا تھا وہ بہت چھوٹا تھا لیکن جوگیش نے کبھی اس کا خیال نہیں کیا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ اسے اس کا احساس تک بھی نہیں ہوا مگر اب اس کی بیوی نے یہاں آتے ہی سب سے پہلے اس کی توجہ اسی طرف مبذول کی ——

"آخر غلاموں کی طرح تم اپنی زندگی یہاں کیوں برباد کر رہے ہو؟ تمہیں تو رہنے کے لئے ان لوگوں نے کوئی اچھا سا کمرہ بھی نہیں دیا۔"

"بے صبر ہونے کی ضرورت نہیں" اس کے خاوند نے کہا۔ "ہمیں ابھی موقع کا انتظار کرنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں اس گھر میں بڑے کمرے ہیں ہی کہاں! —— صرف دو کمرے اور ہیں، ایک میں ماں رہتی ہیں اور دوسرے میں رامیندھی کی دُلہن۔ میں ان دو میں سے کسی کو بھی کمرہ تبدیل کرنے کے لئے نہیں کہہ سکتا۔"

"سوشیلا واقعی بہت خوش نصیب لڑکی ہے" رادھارانی کہنے لگی "اسے عزت کی تمام چیزیں میسر ہیں، اور میں ہوں کہ اپنے باپ کے گھر محتاجی اور کس مپرسی کی زندگی گذار رہی ہوں۔"

"مصلحت اسی میں ہے کہ وقت اور موقع کا انتظار کیا جائے" جوگیش نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! انتظار ہی کرونگی!" رادھارانی نے طنز سے کہا۔ "یہاں تک کہ موت کا دن آ پہنچے! سوشیلا کو پھر چند قیمتی زیورات دسہرے کے دن مل رہے ہیں! مجھے تو رونا اس پر آتا ہے کہ میں ذلیل ہونے کے لئے آخر یہاں آئی ہی کیوں؟"

یہ باتیں رات کے اوائل میں ہوئیں اور جوگیش تقریباً صبح تک جاگتا پڑا رہا۔ اسے اپنی بیوی سے صبح تک مزید گفتگو کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

پُوجا خوب دھوم دھام سے منائی گئی۔ اور گھر کی چار دیواری ہی میں نہیں بلکہ باہر بھی سوشیلا کے نئے اور پُرانے زیورات کے متعلق کافی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ اور رادھارانی بھی اپنی طراری کا جوہر رامیندھی کو دکھائے بغیر نہ رہی۔

"میں پوچھتی ہوں بھیا" اس نے کہا "کیا تمام زیورات صرف تمہاری حسین اور کمسن دلہن ہی کے لئے ہیں؟ کیا بوڑھی اور بدصورت بھاوج کو دو ایک چیزیں بھی نہیں مل سکتیں؟"

رامیندھی تقریباً بوکھلا سا گیا —— "میں نے تو اسے کچھ نہیں دیا۔ تمام چیزیں اسے پھوپھی نے دی ہیں۔"

"ایک ہی بات ہے! روپے تمہارے ہیں نہ کہ تمہاری پھوپھی کے!" رامیندھی نے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھا پھر یہ کہتا ہوا چلا گیا —— "بہت اچھا! بہت اچھا! میں کوشش کروں گا۔"

وجیا یعنی دسہرے کے آخری دن رامیندھی اپنی بھاوج کے سامنے ایک طلائی ہار لیکر آیا اور اس کی خدمت میں پیش کر کے اس کے پاؤں چھونے لگا۔

مگر رادھارانی نے اس وقت ایسا رویہ اختیار کیا گویا اسے بہت حیرت ہوئی ہے۔

"یہ کیا ہے میرے بھائی؟ کیا تم یہ سمجھ گئے تھے کہ میں سچ مچ تم سے زیور مانگ رہی ہوں —— وہ تو میں نے تم سے مذاقاً کہا تھا [redacted]
~~~~~~~~

"مگر میں یہ کیسے سمجھ سکتا تھا؟" رامیندھی نے جواب دیا "میں سمجھا واقعی تمہارا یہی مطلب ہے، اسی لئے میں نے پھوپھی سے اس کے متعلق گفتگو کی اور انہوں نے مجھے یہ ہار تمہارے لئے دیا ہے۔"

عین اسی وقت جوگیش نے اپنی بیوی کو پکار کر بلایا اور غضبناک لہجے میں کہا "تم اس طرح آخر مجھے ذلیل کرنے پر کیوں تُل گئی ہو؟ کیا محض اس لئے کہ ہم میں زیورات خریدنے کی استطاعت نہیں ہے ہم ان سے بھیک مانگیں گے؟"

"فضول باتیں نہ بناؤ۔" رادھارانی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا ——— "مردوں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ جتنے زیادہ ناکارہ ہوتے ہیں، اسی قدر اپنی بیوی کو ستانا چاہتے ہیں۔"

جوگیش غصہ کی حالت میں کمرے سے باہر نکل گیا اور تمام دن گھر نہ آیا۔ شام کے وقت ایک شخص کے توسط سے اس نے یہ اطلاع بھجوا دی کہ "میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جا رہا ہوں اور دو تین دن گے بعد واپس آسکوں گا" ———

رادھارانی کا چہرہ غصہ سے سیاہ ہوگیا مگر وہ اس وقت اپنا غصہ کس پر آتارتی؟ مجبوراً خاموشی سے غصہ کا تلخ گھونٹ پی کر رہ گئی۔ رامیندھی نے بہت کوشش کی کہ اپنی بھاوج کو اطمینان دلائے مگر اس عورت نے اس کی باتوں پر توجہ نہ کی ———

پوجا کے تمام رسوم اسی دن ختم ہوئے تھے اور لوگ اس قدر تھک گئے تھے کہ سب کے سب دس بجتے بجتے ہی سو گئے مگر فراغت و اطمینان کی یہ نیند زیادہ دیر تک ان کی قسمت میں نہ تھی ——— ابھی رات کا تیسرا پہر شروع ہوا ہی تھا کہ ایک عورت کی مسلسل چیخوں کی آواز رات کے سکوت میں گونجنے لگی اور نہ صرف گھر کے اور لوگ ہی جاگ اٹھے بلکہ رامیندھی کے گھر کے سامنے ہمدرد پڑوسیوں کا ایک کثیر مجمع آکھڑا ہوا۔ مگر چور موقع سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو چکے تھے۔ رامیندھی کے گھر میں بقیہ تمام رات گریہ و بکا کا سلسلہ جاری رہا۔

پولیس صبح ہوتے ہی آگئی اور کچھ ہی دیر بعد جوگیش بھی گھر واپس آگیا۔

جونہی اس کی سوتیلی ماں کی نظر اس پر پڑی وہ غصہ سے اُبل پڑی ———

"کہاں تھے تم اب تک کہیں کے! کیا تم اب گھر میں ٹھہر بھی نہیں سکتے! ہم تو بالکل لٹ گئے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جوگیش کی آنکھیں اس کے ماتھے سے نکلی پڑ رہی ہیں ———

"بات کیا ہوئی؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

پیشتر ازیں کہ اس کی ماں کوئی جواب دے، رامیندھی نے افسردگی سے کہا ——— "چور آئے اور تمہاری بیوی کے تمام زیورات چھین کر لے گئے۔"

اتنا سنتے ہی جوگیش کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"مگر وہ کمرے میں تن تنہا کیوں تھی؟" اس نے بڑبڑا کر پوچھا "ماں کے ساتھ کیوں نہیں سوئی؟"

"میں نے سوچا اکیلے اس الگ تھلگ کمرے میں اسے خوف محسوس ہوگا، اس لئے ہم تمہارے کمرے میں سوئے اور بھاوج کو اپنے کمرے میں سلایا۔"

جوگیش دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر برآمدہ میں بیٹھ گیا۔ اندر کمرے میں رادھارانی زور زور سے چیخیں مار کر رو رہی تھی اور جوگیش کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ چیخیں اس کے دماغ سے پار ہوئی جا رہی ہیں ———

قدرے توقف کے بعد وہ اٹھا اور رامیندھی کو کھینچ کر برابر والے کمرے میں لے گیا۔

"سچ بتانا! تمہیں میری بیوی کے ساتھ اس قدر شریفانہ برتاؤ کرنے کے لئے کس نے کہا؟ ——— کیا ماتا جی نے؟"

"نہیں! نہیں! پھوپھی نے کچھ نہ کہا ——— یہ تو میری بیوی کی تجویز تھی۔ اُسے خیال آیا کہ بھاوج الگ تھلگ کمرے میں گھبرائے گی اس لئے اس کی تجویز سے ہم تمہارے کمرے میں چلے گئے اور انہیں اپنے کمرے میں جگہ دے دی۔"

جوگیش نے انتہائی غیظ و غضب کی نگاہوں سے احمق رامیندھی کو گھورا اور پھر اپنی دونوں مٹھیوں سے زور زور سے اپنے سر کے بالوں کو نوچنے لگا۔

حقائق

ایک قطعہ اور دو رباعیاں

از حضرت امجد حیدرآبادی

کب کسی کو سکون ملتا ہے — پانی مانگو تو خون ملتا ہے
کہیں راحت نہیں جنوں کے سوا — ہم کو سب کچھ ملا سکوں کے سوا
عقل ہی عقل ہے جنوں نہیں — گھر میں ہر چیز ہے سکون نہیں
دل مضطر، ہمیشہ مضطر ہے — گھر ہو یا گور سب برابر ہے

جوہر جسم و جان ما تپش است
قفس و آشیان ما تپش است
موجہا زندگانیٔ دریاست
بیقراری، روانیٔ دریاست

دو رباعیاں

ڈیوڑھی نہیں، در نہیں، کہ دربان نہیں — بلبل نہیں، گل نہیں، کہ بستان نہیں
ہیں جمع جہان بھر کے ساماں گھر میں — خاطر جمعی کا کوئی سامان نہیں

کیا دامن صد چاک بھی سل سکتا ہے — کیا غنچۂ پژمردہ بھی کھل سکتا ہے
امجد! کچھ ہم بھی جمع کرتے ضرور — سکّوں سے اگر سکون مل سکتا ہے

مُلّا عبدالقادر بدایونی اور علامہ آزاد دہلوی

تاریخی مبحث

الحاج مولینا پروفیسر حامد حسن قادری

قدیم زمانے میں اسلامی سلطنت ہند کی بہت سی تاریخیں لکھی گئیں، بابر و جہانگیر نے خود اپنے حالات لکھے بعض مؤرخوں نے سلاطین عہد کے حکم سے تاریخیں مرتب کیں، بعض نے اپنے شوق سے لیکن علی الاعلان لکھیں۔ کسی کسی نے پرائیویٹ طور پر چھپا کر بھی تالیف کیں، ان مختلف اسباب تالیف کا خود تالیف کی نوعیت و حیثیت پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ جو تاریخ بادشاہ وقت کی فرمائش سے لکھی جائیگی اس میں تاریخی واقعات اور اسباب و نتائج پر آزادانہ تبصرہ نہیں ہوسکتا بادشاہ کی مرضی کے مطابق ہوگی۔ جو اپنی خوشی سے لکھے گا اور پوشیدہ طور پر لکھے گا آزادی کے ساتھ لکھے گا زمانے میں کردنی و ناکردنی سب کچھ ہوتا ہے دیکھے گا تو گفتنی و ناگفتنی سب کچھ لکھ دے گا۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی اپنی ضخیم تالیف "منتخب التواریخ" اسی نوع سے لکھی ہے۔ اس کی تین جلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں ہمایوں تک کے حالات ہیں۔ دوسری میں اکبر کے۔ تیسری میں عہد اکبری کے علماء، صلحاء، شعراء وغیرہ کے تذکرے ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ء) میں تمام ہوئی۔ ملا صاحب نے تاریخ اتمام کہی۔

"انتخابے کہ ندارد ثانی"

اس میں اعداد کا تجزیہ خوب کیا ہے۔ یعنی لفظ "انتخاب" میں سے حرف ثانی (ن) نکال کر باقی حروف کے اعداد سے سال اتمام نکلتا ہے۔ ($\frac{1054}{50} = 1004$ ھ)

ملا عبدالقادر کے والد کا نام ملوک شاہ ہے بدایوں وطن اس لفظ کا قدیم املا و تلفظ بداؤں ہے اس لئے تمام فارسی تاریخوں میں ملا صاحب کو "ملائے بداؤنی" اور ان کی تاریخ کو "تاریخ بداؤنی" لکھا ہے ملا صاحب (بقول خود) ۱۷ ربیع الثانی سنہ ۹۴۷ھ (۲۱ اگست سنہ ۱۵۴۰ء) کو بساور کے قریب موضع ٹونڈہ میں پیدا ہوئے (آگرہ سے اجمیر جاتے ہوئے پہلی منزل منڈاکر دوسری فتحپور۔ پانچویں بساور چھٹی ٹونڈہ تھی) ان کی ننھیال بیانہ میں تھی چار پانچ برس کی عمر سے اپنے والد اور نانا کے پاس رہ کر قرآن پڑھا۔ قرأت سیکھی۔ تیرہ چودہ برس کی عمر تھی کہ سنہ ۹۶۱ھ (۱۵۵۴ء) میں سنبھل جا کر میاں حاتم سنبھلی سے بیعت کی اور ان سے فقہ کی تحصیل کی۔ ان کی خانقاہ میں رہکر "قصیدہ بردا" یاد کیا اور اس کی اجازت لی۔ بداؤں میں شیخ عبداللہ بدایونی سے علم کلام اور اصول فقہ پڑھے آگرہ میں رہ کر شیخ مبارک ناگوری (پدر فیضی و ابوالفضل) سے چند سال مختلف علوم حاصل کئے۔ ان کے علم و فضل اور حق استادی کا بار بار اعتراف کیا ہے۔

ملا صاحب سنہ ۹۸۱ھ (سنہ ۱۵۷۳ء) میں دربار اکبری میں حاضر ہوئے بادشاہ نے امام دربار مقرر کیا اور مصاحب خاص کے عہدے سے سرفراز کیا۔ دوسرے منصبوں پر بھی فائز رہے۔ سیر و سفر اور جنگ و جہاد میں اکثر بادشاہ کے ہمرکاب رہتے تھے۔ اکبر کے حکم سے رامائن اور سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ کیا۔ نل دمن کو نظم کیا۔ مہابھارت کے اٹھارہ بابوں میں سے دو باب کا ترجمہ کیا۔ تاریخ کشمیر کا خلاصہ مرتب کیا۔ قصیدہ بردا کی شرح لکھی سب سے مشہور اور ممتاز تصنیف منتخب التواریخ ہے۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ اردو میں مولوی حسام الدین مراد آبادی نے ترجمہ کیا۔ مطبع نولکشور میں طبع ہوچکا ہے۔

ملا عبدالقادر فاضل و ادیب، صوفی و متشرع ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ قادری تخلص تھا۔ بہت سی طویل و مختصر نظمیں لکھی ہیں منتخب التواریخ میں اپنے اور دوسروں کے برمحل اشعار و قطعات کثرت سے درج کئے ہیں "تاریخ گوئی" کا بیحد شوق تھا۔ اپنے زمانے کے تمام مشہور واقعات کے "تاریخی مادّے" نکالے ہیں۔ گویا اٹھتے بیٹھتے بات بات پر تاریخی مادّے لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً کسی نے پھوس کے چھپر میں مدرسہ قائم کیا۔ ملا صاحب نے تاریخ کہی — "مدرسہ خس" (۹۶۹ھ) اکبر بادشاہ نے آگرہ سے اجمیر تک ہر منزل پر ایک مینار بنوایا اور سب میناروں میں ہرن کے سینگ لگوائے ملا صاحب نے "میل شاخ" (۹۸۱ھ) تاریخ نکالی۔ ان کے استاد شیخ مبارک کا انتقال ہوا انھوں نے تاریخ کہی۔ "شیخ کامل" = ۱۰۰۱ھ[1]

---

[1] اس قسم کی بے شمار تاریخیں ہیں اور یہ بجائے خود شعر و ادب کے لطائف و نوادر ہیں۔ انشاء اللہ ان کو الگ مضمون میں مرتب کرکے پیش کیا جائے گا۔

ملا صاحب اکبر بادشاہ سے دو سال بڑے تھے اور دس برس پہلے ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ء) میں اپنے وطن بدایوں میں انتقال کیا۔ بدایوں سے مشرق کی طرف دو میل کے فاصلہ پر موضع عطا پور میں ملا صاحب کی قبر موجود ہے کوئی اولاد نرینہ زندہ نہ رہی۔ بیٹی سے ان کی نسلی یادگار قائم ہوئی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا عبدالحق خیرآبادی کا خاندان ملا صاحب کی صاحبزادی کی نسل سے ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس سال (یعنی ۱۰۰۴ھ میں) ملا صاحب نے اپنی تاریخ لکھ کر ختم کی اسی سال ان کی وفات ہوئی۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ ۵۶، ۵۷ سال کی عمر پائی۔ اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ ملا صاحب گویا منتخب التواریخ لکھنے کے لئے پیدا ہوئے تھے جب یہ کام ختم ہوا زندگی بھی ختم ہو گئی۔ بظاہر یہ میرے شاعرانہ خیال کی توجیہ ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ملا عبدالقادر صاحب یہ عجیب تاریخ لکھ گئے ہیں کہ اس سے پہلے کوئی تاریخ اس نوعیت کی نہیں لکھی گئی۔ ملا صاحب نے بقید سین چشم دید واقعات لکھے ہیں اور چونکہ بڑے کٹر ملا۔ اپنے عقاید کے سخت پابند۔ اسلام کے سچے عاشق، عالم، فقیہ اور صوفی تھے اس لئے اسلام کے اصول صحیحہ اور عقاید حقہ کے خلاف ادنیٰ سی بات بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ اپنے دل کی تو یہ حالت تھی اور اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا آقا اور ولی نعمت ظل اللہ و شاہنشاہ اکبر اعظم جو سچا اور پکا مسلمان، دیندار، صوفی مزاج، اولیاء اللہ کا معتقد۔ حضرت خواجہ اجمیری کا فدائی تھا روز بروز بیدین اور مرتد، ایمان فروش اور اسلام کش ہوتا جاتا ہے اور اس انقلاب کے بانی مبانی شیخ مبارک ناگوری اور ان کے صاحبزادے فیضی و ابوالفضل ہیں۔ چنانچہ ملا صاحب کے حاضری دربار کے پانچ سات سال کے اندر شاہی و درباری مذہب کی بالکل کایا پلٹ ہو گئی ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) میں "دین الٰہی" کی تحریک شیخ مبارک و ابوالفضل، فیضی نے شروع کی ۹۸۷ھ (۱۵۷۹ء) میں بادشاہ کو مجتہد ماننے کے لئے "محضر" لکھا گیا۔ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی جو امور مذہبی کے صدر تھے اور جن کے سدِ راہ ہونے کا اندیشہ تھا حج کے لئے روانہ کئے گئے۔ ان کے جانے کے بعد بادشاہ کے اجتہادات جاری ہو گئے۔ شرعی تحلیل و تحریم موقوف ہوئی۔ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ اکبر خلیفۃ اللہ کہنے کا حکم ہوا۔ شیخ مبارک نے محضر مذکور پر اپنے دستخط کے ساتھ یہ الفاظ لکھے۔

"ایں امریست کہ من بجان	یہ وہ کام ہے کہ میں بجان
و دل خواہاں واز سالہا	و دل اس کا خواہاں اور سالہا
باز منتظر آں بودم"	سال سے اس کا منتظر تھا۔

۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) تک تمام احکام شرعی بدل دیئے گئے نماز، روزہ وغیرہ کی فرضیت ساقط ہو گئی۔ ۹۹۵ھ (۱۵۸۷ء) میں فرمان شاہی صادر ہوا کہ علوم عربی اور دینی تعلیم موقوف کی جائے صرف نجوم، ریاضی، طب، فلسفہ پڑھایا جائے۔ ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) میں بادشاہ نے کوشش و اہتمام کے ساتھ اہل دربار کی ڈاڑھیاں منڈوائیں۔ اگلے سال ۱۰۰۱ھ میں فیضی و ابوالفضل نے جامہ بردہ کا مصفا کرایا۔ "آفتاب پرستی" کا رواج شروع ہوا یہاں تک کہ جب ملا تقی شیرازی نے جو اعلم العلماء کہے جاتے تھے بادشاہی حکم سے شاہنامہ فردوسی کو نثر میں لکھا تو اس کتاب میں آفتاب کے ذکر پر جلّت عظمتہٗ و عزّ شانہٗ لکھا۔ ملا تقی ۱۰۰۲ھ میں بادشاہ کے حلقہ مریدی اور دین الٰہی میں داخل ہوئے اور داڑھی کو خیرباد کہا۔

ملا عبدالقادر ایمان و اسلام کی یہ تباہی دیکھتے تھے۔ کوئی غیرتمند مسلمان اس کو دیکھ کر خوش نہیں رہ سکتا کم سے کم ایمان کے تیسرے درجہ پر عمل کرے گا۔ یعنی اگر ہاتھ سے نہ روک سکے۔ زبان سے منع نہ کر سکے تو دل سے نفرت کرے۔ ملا صاحب نے بھی یہی کیا اور غالباً اسی جوش و جذبہ کے ماتحت اپنی "منتخب التواریخ" لکھی۔ اسی لئے سب کچھ لکھا اور اسی لئے اس کو چھپا کر رکھا۔ اس کے متعلق مولوی محمد حسین آزاد دہلوی خافی خاں مورخ کے حوالے سے اپنی تالیف دربار اکبری میں لکھتے ہیں۔

"جہانگیر کے زمانے میں چرچا ہوا۔ بادشاہ نے بھی دیکھی حکم دیا کہ اس نے میرے باپ کو بدنام کیا ہے اس کے بیٹے کو قید کرو اور گھر کو لوٹ لو۔ چنانچہ جو وارث تھے گرفتار آئے، انھوں نے کہا کہ ہم تو اس وقت خورد سال تھے ہمیں خبر نہیں، ان سے مچلکے لئے کہ ہمارے پاس سے نکلے تو جو چاہو سزا دو۔ کتب فروشوں سے مچلکے لئے کہ یہ تاریخ نہ خریدیں نہ بیچیں، خافی خاں کہتا ہے کہ تعجب ہے کہ باوجود اس تشدد کے خاص دارالخلافہ میں کتب فروشوں کی دکانوں پر سب سے زیادہ بدایونی ہی نظر آتی ہے"

ملا عبدالقادر حق شناس و حق گو ہیں جو دیکھتے ہیں لکھتے ہیں جس کو جیسا پاتے ہیں ویسا بتا دیتے ہیں اپنے پرائے کسی کو نہیں چھوڑتے دوسرے بدعقیدہ و لامذہب لوگوں کو کھری کھری سناتے ہیں تو اپنے ہم مذہب بداعمالوں کی بھی دھجیاں اڑا دیتے ہیں لیکن علامہ آزاد دہلوی کو "ملا صاحب" کی یہ صاف دلی اور حق گوئی نظر نہیں آتی۔ وہ ان کو شیخ مبارک اور فیضی و ابوالفضل وغیرہ کا دشمن مذہبی اختلاف یا رقابت دربار کے سبب سے جانتے ہیں۔ حالانکہ علامہ آزاد نے "دربار اکبری" صرف ملا صاحب کی تردید و تضحیک کی غرض سے لکھی ہے۔ آزاد کو اکبر بادشاہ کی ذات و

حکومت سے کوئی خاص تعلق و ہمدردی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ... ہیں کہ وہ ابوالفضل، فیضی وغیرہ کا قدر دان ہے اور چونکہ ملا عبد القادر نے مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر فیضی وغیرہ کی زمانہ سازی و ایمان فروشی کو صداقت و جوش اسلامی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس لئے آزاد ملا صاحب سے بیزار ہیں۔

علامہ آزاد کی یہ عجیب عادت ہے کہ اپنی رائے کی تائید میں یا اپنے معروضات کو ثابت کرنے کے لئے یا اپنے پسندیدہ و ناپسندیدہ اشخاص کی مدح و ذم کی خاطر کبھی واقعات فرض کر لیتے ہیں۔ کبھی خلاف واقعہ نتائج اخذ کر لیتے ہیں اور اس کام کے لئے اسلوب بیان بڑا دلچسپ و عجیب اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کے حالات بیان کر رہے ہیں۔ اس کے جملہ محاسن و فضائل نہایت عقیدت و ارادت سے لکھتے ہیں گویا بے تعصبی کے ساتھ انصاف کرنے پر تلے ہوئے ہیں لیکن لکھتے لکھتے کبھی درمیان میں کبھی اخیر میں چٹکی لے لیتے ہیں۔ "آب حیات" اور "دربار اکبری" میں اس کا زیادہ موقع تھا۔ وہیں یہ باتیں خوب نظر آتی ہیں۔

دربار اکبری کی اصلی بنیاد اور بیشتر ماخذ ملا عبد القادر کی منتخب التواریخ ہے صفحے کے صفحے اسی تاریخ سے ترجمہ کئے ہیں لیکن بیچ بیچ میں نمک مرچ بھی خوب لگاتے جاتے ہیں اور ان چٹکیوں کے لئے بے بات کی بات پیدا کرتے ہیں اور بے جگہ جگہ نکالتے ہیں مثلاً

(۱) ملا صاحب نے اپنے نکاح ثانی کا حال لکھا ہے اور اس کی تاریخ کہی ہے۔ علامہ آزاد یہ حال اور تاریخ نقل کر کے لکھتے ہیں۔

"اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلی سے خوش نہ تھے۔ خدا جانے اس کے جیتے جی دوسری شادی کی تھی یا بیچاری مر گئی تھی۔ اس کا تو افسوس بھی نہ کیا۔" (دربار اکبری صد ۱۴۲)

(۲) ملا صاحب نے کسی کے عشق و محبت کا قصہ لکھا ہے جس کا معاملہ اکبر بادشاہ کے سامنے پیش ہوا تھا۔ وہ عاشق چھری مار کر مر گیا تھا اور اس کے کفن دفن پر علما میں تکرار ہوئی تھی۔ شیخ ضیاء الدین نے کہا شہید عشق ہے۔ اسی طرح خاک کے سپرد کر دو۔ شیخ عبد النبی صدر وغیرہ کہتے تھے کہ ناپاک مرا۔ آسودۂ عشق نہیں، آلودۂ حسن ہے۔ آزاد ملا صاحب کی عبارت کا مفہوم لکھ کر لکھتے ہیں۔

"ملا صاحب کا اس طرح فرمانا یا تو اس سبب سے ہے کہ خود عاشق مزاج تھے اور اسی واسطے عاشقوں کے طرفدار رہتے یا یہ کہ شیخ صدر پر چوٹ کرنے میں خواہ مخواہ مزا آتا تھا۔" (صد ۱۳۳)

حالانکہ ملا صاحب نے اپنی رائے نہیں لکھی دوسرے کا کہا لکھ دیا ہے لیکن آزاد شیخ و ملا دونوں سے خفا ہیں۔

(۳) ملا صاحب نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ۹۸۴ھ میں جب بادشاہ نے راجہ مان سنگھ کو رانا کیکا کے مقابلہ پر روانہ کیا تو ملا عبد القادر بھی بادشاہ سے اجازت لے کر جنگ کے لئے گئے فتح ہوئی تو رانا کا سب سے بڑا مشہور ہاتھی بھی قبضے میں آیا۔ مان سنگھ نے فوراً ملا صاحب کے ساتھ ہاتھی کو بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ راستے میں ہاتھی دلدل میں پھنس گیا۔ بڑی مشکل سے نکلا۔ بادشاہ کی خدمت میں لا کر پیش کیا۔ انعام پایا۔

علامہ آزاد اس واقعہ کو منتخب التواریخ سے ملا صاحب کی زبانی بیان کرتے ہیں لیکن درمیان میں اپنی رائے اور اپنے جذبات بھی لکھتے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"ان کی انشا پردازی نے میدان جنگ کی تصویر نہایت خوبصورتی سے کھینچی ہے مگر اس میں بھی لوگوں کے پہلوؤں میں قلم کی نوکیں چبھوتے جاتے ہیں۔" (دربار اکبری صد ۱۴۴)

آزاد کی رائے ملا صاحب کی تحریر کے متعلق تو یہ ہے اور خود آزاد کا مقتضائے طبیعت یہ ہے کہ ہاتھی کے دھنسنے کا حال ملا صاحب کی زبانی لکھتے لکھتے ملا صاحب کے پہلو میں اپنے قلم کی نوک چبھوتے ہیں۔

"میں مالکوہ اور مانڈل گڈھ سے ہوتا ہوا آنبیر کے رستے آیا آنبیر سے پانچ کوس کے فاصلے پر ہاتھی بجن میں پھنس گیا، غضب یہ کہ جوں جوں آگے جاتا تھا زیادہ دھنستا جاتا تھا آخر نکالنے ہی تھے۔ انداز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت گھبرائے اور یہیں سے سمجھ لو کہ مہمات سلطنت اور اس کے خوفناک بوجھ ایسے لوگوں کی گردن پر پڑیں تو چھاتی نیچے پھٹے۔ کہاں ابوالفضل اور اس کے کارنامے۔ اکبر لشکر جرار لئے آسیر کے گرد پڑا ہے۔ مینہ نے طول کھینچا۔ ایک غضب اندھیرا، بادل گرجے۔ مینہ برسے۔ ابوالفضل فوج لیکر زیر دیوار پہنچا اور رستے ڈال کر شمشیر بکف قلعہ میں کود پڑا، پہلے کوئی اتنا بڑا دل دکھائے جب اس کے باب میں زبان ہلائے۔ باتیں کرنے سے کیا ہوتا ہے۔" (دربار اکبری صد ۱۴۴)

حالانکہ نہ ملا صاحب کے انداز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت گھبرائے نہ یہاں ابوالفضل کا کوئی ذکر و فکر اور موقع و محل تھا۔

(۴) ایک مرتبہ فیضی نے ملا صاحب کی سفارش کے لئے بادشاہ کو خط لکھا۔ ملا صاحب اس خط کو بجنسہ اپنی کتاب میں نقل کرتے ہیں اور فیضی کا بڑا احسان مانتے ہیں۔ لیکن علامہ آزاد کی حق پوشی اور عیب کوشی کا یہ عالم ہے کہ "دربار اکبری" میں فیضی کے اس خط کو فیضی کے اخلاق

دکھانے اور قوم صاحب پر احسان جتانے کیلئے درج کرتے ہیں لیکن ملا صاحب کے احسان شناسی کا اعتراف کرنے کی جگہ ان کی انسانیت پر حملہ کرتے ہیں۔

"فاضل مذکور (یعنی ملا عبدالقادر) نے بھی اپنی لیاقت کا نمک سمجھا ہی سبب ہے کہ اپنی تاریخ میں بجنسہ نقل کر دیا" (دربار اکبری)

(۵) ملا صاحب شیخ ابوالفضل کے دربار میں آنے اور "تفسیر" پیش کرنے پر لکھتے ہیں۔

"تفسیر آیۃ الکرسی کہ دقائق و نکات قرآنی در آں بسیلے درج شدہ دمی گویند کہ تصنیف والدش بود گذرانیدہ عز تحسین یافت و تفسیر اکبری تاریخ آں شد" (منتخب التواریخ ص ۱۹۸)

یعنی ابوالفضل نے تفسیر نذر گزرانی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کے والد کی تصنیف بھی۔ اس پر علامہ آزاد لکھتے ہیں۔

"گر روئے حسد سیاہ۔ تفسیر اکبری پیش کرنے کا حال اپنی کتاب میں لکھا تو بھی شوشہ لگا دیا کہ لوگ کہتے ہیں اس کے باپ کی تصنیف ہے۔ اچھا یہ ہی تو ہے تو اس کے باپ کا مال ہے آپ کے باپ کا تو نہیں۔ اس کا باپ تو ایسا تھا تمہارا تو باپ بھی ایسا نہ تھا" (دربار اکبری ص ۴۹۳)

ملا صاحب اپنی طرف سے کبھی شوشہ نہیں لگاتے اتنا ضرور کرتے ہیں دوسروں کے لگائے ہوئے شوشے لکھنے سے نہیں چھوڑتے۔ یہ نہیں ہو سکتا ملا صاحب کو یقین ہو کہ یہ تفسیر ابوالفتح کی لکھی ہوئی ہے یا کوئی دوسرا اس کے خلاف کچھ سنے اور وہ اپنی طرف سے یہ تہمت تراش دیں۔ دوسرے دونوں پر انھی ابوالفضل و فیضی کی ایسی تعریفیں کی ہیں کہ علامہ آزاد بھی نہ کر سکتے۔ آزاد و فیضی کے ہم مذہب لوگوں میں جس جس کو عالم، متقی، دیندار پاتے ہیں نہایت شرح صدر کے ساتھ تعریف کرتے ہیں۔ شاہ فتح اللہ شیرازی کو "سیادت پناہ و علامۂ عصر" لکھتے ہیں۔ ان کے دربار میں آنے اور منصب صدارت عطا ہونے کے موقع پر تاریخ کہتے ہیں "شاہ فتح اللہ امام اولیا رشد" (۹۹۰ھ) ان کے انتقال کی تاریخ کہتے ہیں "فرشتہ بود" (۹۹۷ھ) ان کی استقامت ایمانی کا یہ حال لکھتے ہیں کہ ایک دن بادشاہ نے ان کے سامنے راجہ بیربر سے کہا کہ عقل اس بات کو کیونکر قبول کر سکتی ہے کہ کوئی شخص ایسے بھاری جسم کے ساتھ ایک لحظے میں خوابگاہ سے آسمان پر جائے اللہ تعالیٰ سے گفتگو کرے اور واپس آجائے اور اس کا بستر ابھی تک گرم ہو اسی طرح معجزۂ شق القمر کا انکار کیا۔ وہ بدبخت بیربر اور دیگر درباری ستنا و صدقنا کہتے رہے لیکن شاہ فتح اللہ کچھ نہ بولے۔ اگرچہ بادشاہ بار بار ان کی طرف دیکھتے تھے انہی کو سنانے کے لئے کہہ رہے تھے اور ان کو اپنا

ہم خیال بنانا چاہتے تھے مگر وہ بندۂ خدا سر جھکائے کھڑا رہا اور دم بخود رہا۔ اس کے بعد ملا صاحب لکھتے ہیں کہ دیوانخانۂ شاہی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ علانیہ نماز پڑھ سکتا۔ مگر شاہ فتح اللہ بے دھڑک اور جمعیت خاطر کے ساتھ عین دیوانخانہ میں اپنے مذہب امامیہ کے مطابق نماز ادا کرتے تھے۔

ملا صاحب اسی طرح قاضی نوراللہ شستری کی ایسی تعریف کرتے ہیں کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ لکھتے ہیں۔

"بسیار بصفت نصفت و عدالت و نیک نفسی و حیا و تقویٰ و عفاف و اوصاف اشراف موصوف است و بعلم و حلم و جودت فہم و حدت طبع و صفائے قریحہ و ذکا مشہور است صاحب تصانیف لائقہ است۔ و تعریح بر تفسیر مہمل شیخ فیضی نوشتہ کہ از حیز تعریف و توصیف بیرون است و طبع نظمے دارد و اشعار دلنشین بگوید۔ بوسیلہ حکیم ابوالفتح بملازمت پادشاہی پیوست و زمانے کہ موکب منصور بلاہور رسید و شیخ معین قاضی لاہور را در وقت ملازمت از ضعف پیری و فتور در قویٰ سقطہ در دربار واقع شد۔ رحم بر ضعف او آوردہ فرمود کہ شیخ از کار ماندہ۔ بنا براں قاضی نوراللہ باں عہدہ منصوب منسوب گردید۔ الحق مفتیان ماجن و محتسبان خیال محتال لاہور را کہ بعلم الملکوت سبق میدہند خوش الضبط آوردہ، و راہ رشوت را بر ایشاں بستہ و در پوست بستہ گنجانیدہ چنانچہ فوق آں متصور نیست و می تواں گفت کہ قائل ایں بیت او را منظور داشتہ و گفتہ کہ؎

قاضی آنکس کہ نکردی ہمہ عمر قبول
در قضا ہیچ ز کس جز کہ شہادت ز گواہ

ملا صاحب اس عبارت میں قاضی نوراللہ شستری کے خلق و شرافت، علم و فہم، نظم و نثر کی تعریف کر کے لکھتے ہیں کہ جب شیخ معین قاضی لاہور ضعف پیری و فتور قویٰ کے سبب سے دربار میں گر پڑے تو اکبر بادشاہ نے رحم فرما کر ان کو ملازمت سے معافی دی اور قاضی نوراللہ کو قاضی لاہور مقرر کیا انھوں نے لاہور کے رشوت خور اور محتال و مکار عہدہ داروں کا جو علم الملکوت کو سبق پڑھاتے ہیں ایسا عمدہ انتظام کیا اور رشوت بند کی کہ اس سے بڑھ کر تصور میں نہیں آسکتا۔ گویا یہ شعر کہنے والے نے انہی کو پیش نظر رکھ کر کہا ہے؎

قاضی آنکس کہ نکرد، ہمہ عمر قبول
در قضا ہیچ ز کس جز کہ شہادت ز گواہ۔

یعنی تو ہی وہ شخص ہے جس نے اپنے عہدۂ قضا میں تمام عمر کسی سے کچھ قبول نہ کیا۔ بجز اس کے کہ گواہ سے شہادت قبول کی۔ اسی طرح ملا صاحب اپنے استاد شیخ مبارک ناگوری کی تعریف کرتے ہیں۔

"شیخ مبارک ناگوری از علمائے کبار روزگار است و در صلاح و تقویٰ و توکل ممتاز ابنائے زمان و خلائق دوراں است پیوستہ بدرس علوم دینیہ اشتغال داشت و علم شعر و معما و فنون و سائر فضائل خصوصاً علم تصوف را برخلاف علمائے ہند خوب ورزیدہ و شاطبی را یاد داشت و باستحقاق درس می گفت و بقرأت عشرہ قرآن مجید را یاد گرفتہ بودم و ہرگز بخانۂ ملوک نرفت و بسیار خوش صحبت بود۔"

—— اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"جامع اوراق در عنفوان شاب باگرہ چند سال در ملازمتش سبق خواندہ الحق صاحب حق عظیم است۔"

یعنی جامع اوراق (ملا صاحب) نے زمانۂ شباب میں آگرہ میں چند سال ان کی خدمت میں سبق پڑھے۔ بیشک ان کا بڑا حق ہے۔" لیکن آخر زمانہ میں ملا صاحب شیخ مبارک اور اور شیخ فیضی دونوں سے بیزار ہوگئے تھے اس کا سبب بھی نہایت صفائی و صداقت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اوپر کے اقتباس کے ساتھ لکھتے ہیں۔

"الحق صاحب حق عظیم است	بیشک ان کا بڑا حق ہے لیکن بعض
ولیکن بجہت ظہور بعضے امور	باتیں یعنی حب جاہ زمانہ سازی
دنیاوی و بے دینی دہوس در	مکر و فریب اور تغیر مذہب و ملت
مال و جاہ و زمانہ سازی و مکر و	(اکبر کے دین الٰہی اور اجتہاد
فریب و علو در وادی تغییر	اور ترویج بے دینی کی طرف اشارہ
مذہب و ملت انچہ سابق داشت	ہے کہ شیخ مبارک کا سب کچھ
اصلاً نماند قُلْ أَنَا وَإِيَّاكُمْ	ساختہ و پرداختہ تھا) کے متعلق
لَعَلٰی هُدًی أَوْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ	ان سے ایسی ظہور میں آئیں کہ

وہ سابق حق بالکل باقی نہیں رہا۔ "قیامت کے دن دیکھنا ہے کہ ہم میں تم میں کون ہدایت پر ہے اور کون صریح گمراہی میں" (ترجمہ آیت)

اس سے زیادہ صاف اور واضح فیضی کے حال میں لکھتے ہیں۔

"اگر کسے گوید کہ از جانب او	اگر کوئی کہے کہ اس کی (فیضی کی)
چندیں خواہش و چندیں	طرف سے اتنی محبت اور ایسا
اخلاص بود در برابر آں ایں	خلوص تھا اس کے مقابلہ میں
ہمہ خشونت و درشتی کدام آئین	اس قدر مذمت اور سختی کوا

مروت و وفا است خصوصاً	سا آئین مروت و وفا ہے،
بعد از وفات یکے را	خصوصاً مرنے کے بعد کسی کو
بایں روش یاد کردن	اس طریقہ سے یاد کرنا او عہد شکنی
واز جملہ عہد شکناں گشتن	کرنا اور اس نہی سے کہ "مردوں
واز نہی لاتذکروا امواتنا	کو بجز نیکی کے یاد نہ کیا کرو" غافل
کمْ الا بالخیر غافل بودن	ہونا کیا معنی؟ تو ہم کہیں گے کہ
چہ باشد؟ گوئیم ایں ہمہ	یہ سب درست لیکن کیا کیا جائے
راست۔ امّا چہ تواں کرد	کہ دین کا حق سب حقوق سے
کہ حق دین و حفظ عہد	بالاتر ہے اور یہ قاعدہ مقرر ہے
آں بالاتر از ہمہ حقوق	کہ محبت اور عداوت جو کچھ ہو
است والحبُّ للہ	خدا کے لئے ہو اگرچہ چالیس
والبغض للہ قاعدۂ مقرر	برس اس کی مصاحبت میں
ہر چند سنین اربعین تمام در	گذرے لیکن اس کے تغیر وضع
مصاحبت او گذشت۔ امّا	اور فساد مزاج اور خرابی حال
بعد از تغیر اوضاع و فساد	کے بعد خصوصاً مرض موت میں
مزاج و اختلال احوال آں	جو اس کا حال تھا اس کو دیکھ کر
بمرور خصوصاً در مرض موت	سب حق صحبت ختم ہوا اور
مرتفع شد و صحبت نفاق	ایک دوسرے سے بیزار ہوگئے۔
انجامیدہ از یکدیگر خلاص	ہم سب اس بارگاہ میں جانے
یافتیم و ما ہمہ متوجہ بارگاہے	والے ہیں جہاں تمام معاملے
ایم کہ ہمہ داوری ہا آنجا	فیصل ہونگے۔ "دنیا کے دوست
بفیصل می رسد۔ الاخلّاء	قیامت کے دن ایک دوسرے کے
يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ	دشمن ہو جائیں گے بجز پرہیزگاروں کے
عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ،	کہ ان کی دنیا کی دوستی قیامت میں
... ...	بھی کام آئیگی" (مفہوم آیت)

علامہ آزاد صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ملا عبدالقادر نے فیضی وغیرہ کو بُرا بھلا کہا حالانکہ مورخ کی حیثیت سے آزاد کو کچھ اور بھی اس کے ساتھ دیکھنا چاہیئے تھا یعنی یہ بھی کہ یہ لوگ کسی حیثیت سے بُرا بھلا کہے جانے کے مستحق تھے یا نہیں اور یہ بھی کہ بُرے کو بُرا کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور یہ بھی کہ کہنے والا صرف انہی لوگوں یا اُن کے ہم خیالوں ہی کو کہتا ہے یا اپنے گروہ کے بد عمالوں کو بھی کہتا ہے۔ جب سب کو سب کچھ کہتا ہے 'اچھا بھی کہتا ہے اور بُرا بھی' تو کہنے دیجیئے۔ خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدِرَ،

عطیۂ حسن

نگاہِ شوق کو تابِ سخنوری دیدی!

از حضرت طالب باغپتی

ترے نثار نئی غم کو زندگی دے دی — نئی نہالِ تمنّا کو تازگی دے دی!
جگا کے حُسن کا جادو جلا کے دل کا چراغ — جنوں کے ہاتھ میں عرفاں کی روشنی دے دی!
نگار خانۂ تخیّل جگمگا اُٹھا — مری سیاہ نصیبی کو چاندنی دے دی!
میں اس ادا کے تصدّق کہ کچھ خبر ہی نہیں — تری نگاہ نے ذرّے کو خاوری دے دی!
یہ فن، یہ سِن، یہ محبّت کی نیم وا آنکھیں — ہر ایک شے میں جوانی کی دلکشی دے دی!
فلک پہ انجمِ تاباں سے ہم کلام ہوئی — نگاہِ شوق کو تابِ سخنوری دے دی!
سجا کے ایک جبینِ صبیح پر تارہ — صنمکدوں کے سویرے کو زندگی دے دی!
جھٹک کے ناز سے کافر سیاہ بالوں کو — شبِ گُنہ کے اندھیرے کی دلکشی دے دی!
درِ قبول پہ اِک بے نوا کا یہ اعزاز — جبینِ سجدہ نوا کو سکندری دے دی!
اِدھر خرد کا جہنّم اُدھر جنوں کی بہشت — یہ کس کشاکشِ پیہم میں زندگی دے دی!

"حدیثِ عقل کُجا و منِ خراب کُجا؟
بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کُجا؟"

لکیر کے فقیر

ایک ایکٹ کا ریڈیائی ڈراما

از محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی

تعارف

(۱) شمشاد ــــــــ ایک تعلیم یافتہ روشن خیال شخص
(۲) بیگم ــــــــ شمشاد کی (قدامت پرست) بیوی
(۳) صنوبر ــــــــ ان کی لڑکی جو تعلیم حاصل کر رہی ہے

سین :—
صنوبر مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھی ہے۔ سامنے میز پر سلیقہ سے کتابیں چُنی ہوئی ہیں۔ وہ ایک رسالہ اُٹھا کر ورق گردانی کرتی ہے۔ پھر حضرت جگر مرادآبادی کا ایک شعر قدرے بلند آواز میں پڑھتی ہے۔

(ورق اُلٹنے کی آواز)

صنوبر۔ ~
گلشن پرست ہُوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں مَیں

خوب! خوب!! بہت خوب!!! کیسا پاکیزہ اور لطیف خیال ہے اور انداز بیان کتنا انوکھا۔ حقیقتاً ـــ یہ شعر پوری غزل کی جان اور تیر بے کمان ہے ....

(دروازہ کھُلنے کی آواز اور پیر کی چاپ)

بیگم۔ شاباش ـــ بیٹی ـــ شاباش۔ صبح سے شام تک یہی گل کھلایا کرو۔ خوب کنبہ کا نام اچھا لوگی۔ جس کے پلّے بندھو گی وہ کمبخت بھی بُرے بُرے خواب دیکھ رہا ہوگا۔

صنوبر۔ کیا بات ہوئی اُمّی؟ ـــ آخر کچھ کہئے بھی تو؟

بیگم۔ اوہ ـــ ذرا سی چھوکری اور یہ زبان۔ چار اُنگل اور بڑھے گی تو آسمان میں چھید کرے گی۔ یہ دیکھ اپنا سُگھڑ پن، سارے بینگن جلا کر کوئلہ کر دیئے۔ ہانڈی چُولہے پر چڑھا ـــ خبر تک نہ لی۔ بھلی "گلشن پرستی" ہوئی۔ صبح سے شام تک سُنتے سُنتے کان پک گئے۔ ایسا ہی شوق تھا تو کسی "باغوان" کے جنم لیا ہوتا۔

صنوبر۔ اُمّی! ـــ بیشک مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ آج کالج کا کام اتنا زیادہ تھا کہ اُس میں اُلجھ کر کچھ دھیان نہ رہا۔ ورنہ آپ کے شوق کی چیز اور خراب ہو جائے۔

بیگم۔ ہاں ـــ میّا کا اتنا وقر تیرے ہی دم سے تو ہے۔ یہ چکنی چُپڑی باتیں اسکولوں اور کالجوں میں خوب سیکھی ہیں۔ دیدہ تو کسی کام پر جمتا ہی نہیں۔ بس یہی چاہتی ہے کہ سارے کام کاج پر لات مار، ہر وقت کتاب ہی مُنہ سے اڑائے رہوں۔

صنوبر۔ اُمّی! ـــ علم بہت بڑی دولت ہے۔ روپیہ پیسہ تو "آنی جانی" چیز ہے۔ آج ہے، کل نہیں۔ وہ جو کہتے ہیں۔ "دُودھ کا جھاگ، دریا کی ریت"۔ البتہ علم ایک لازوال خزانہ ہے۔ چور، ڈاکو، اُچکّے تو کیا دُنیا کی کوئی طاقت اُسے نہیں چھین سکتی۔ پھر ایک تعلیم یافتہ انسان جہاں کہیں بھی جاتا ہے ہر کس و ناکس اُس کی قدر کرتا ہے اور کیوں نہ کرے۔ علم ہمیں تہذیب سکھاتا ہے، دماغ کی ساری تاریکیاں دُور کر کے سیدھی راہ پر لگاتا ہے۔ اخلاق کی بلندیاں دکھاتا ہے۔ جہاں ہم ہر بھلائی اور بُرائی میں بخوبی امتیاز کر سکتے ہیں۔

بیگم۔ ہوں ـــ جب ہی تو ماں کی بڑی خدمت کرتی ہو۔ اللہ ری تعلیم نہ ہنڈیا کی سُدھ اور نہ چُولہے کی خبر ـــ نا ـــ بابا ـــ ہم نے شریفوں کے یہ ڈھنگ نہیں دیکھے۔

صنوبر۔ اُمّی ـــ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ جب صرف دو ایک مذہبی کتابوں یا "کریما"، "مقیما" پر علم کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔

ایک بڑا انگریز سائنسدان کہتا ہے کہ "علم ایک بڑے سمندر کی مانند ہے جس کے کنارے کھڑا میں ابھی گھونگے چن رہا ہوں"۔ امی! علم کا سمندر بہت وسیع ہے۔ ہماری تصورات کی دُنیا سے بھی کہیں بڑھ کر وسیع۔

بیگم۔ بس ری چھوکری بس ـــ زبان کو تالا لگا کیسی کترنی سی چل رہی ہے اور کام کے نام سانپ سونگھ جاتا ہے۔ یہ رموز اپنے باوا سے جا کر چھانٹنا۔ اگر میں ایسی ہوتی تو تمہیں ٹکڑا بھی نصیب نہ ہوتا۔ سارے دن چولھے میں جھکتی ہوں تب جا کر کہیں تمہارا دوزخ بھرتی ہوں ـــ

صنوبر۔ بیشک ـــ آپ کو بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن کیا کروں امی ـــ وقت ایک موتی ہے جو ڈھال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ دن رات لڑھکتا چلا جا رہا ہے۔ کوئی طاقت نہیں جو اسے روک سکے۔ زندگی کے یہ لمحے بہت قیمتی ہیں۔ "سچے موتی اور جواہر سے بھی زیادہ قیمتی۔ اگر یہ ضائع کئے تو پھر عمر بھر ہاتھ ملنے کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

بیگم۔ نہیں تو ساری عمر پڑھتے ہی جانا۔ سارے خاندان میں روئی روئی ہو رہی ہے۔ جو سنتا ہے دانتوں تلے انگلی دباتا ہے۔ میں تو چار آدمیوں میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہی۔ تیرے باوا کو تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ چاہے کتنا ہی بھونکوں مگر ان کے کان پر کب جوں رینگتی ہے۔

صنوبر۔ امی ـــ یہ دُنیا ہے یہاں کوئی ایک دوسرے کو ترقی کرتے دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ ہماری یہ تعلیم اور ترقی خاندان والوں کی نظروں میں کانٹا سی کھٹک رہی ہے جبھی تو روز نئی نئی باتیں نکالتے ہیں۔ مگر کسی کے کہنے کی خاطر اپنی زندگی برباد کر دینا بھلا کونسی عقلمندی ہے۔ دیکھئے ـــ جس نے بھی ایسی باتوں کا اثر لیا تو سمجھ لیجئے کہ پھر عمر بھر ترقی کی راہ سے بھٹک کر جہالت کے گہرے اور تاریک غاروں میں ٹھوکریں کھاتا پھریگا۔

بیگم۔ بھلا ـــ انہیں کیا جلنا پڑا۔ جو کسی بُرے کام کو دیکھے گا تو کہے ہی گا۔ بھلا لڑکیوں کو پڑھا لکھا کر نوکری تھوڑی کروانی ہے۔

صنوبر۔ نہیں امی ـــ تعلیم نوکری ہی کی خاطر حاصل نہیں کی جاتی۔ یہی خیالات تو ہیں جن کی وجہ سے آج ہمارا ملک اس قدر پستی میں ہے۔ اور باوجود انتہائی ذلت اور خواری کے آج بھی وہ قدیم لغویات کو شمع راہ بنائے ہوئے ہے۔ افسوس! ہماری قوم، بدنصیب قوم، اپنی خاندانی عظمت کو بھلا بیٹھی اور آج غفلت و جہالت کی شراب پی کر کانٹوں میں گھسٹ رہی ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے اب تشنۂ مضراب (اقبالؒ)

اب ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کی زندگیوں سے اچھے اچھے سبق حاصل کریں۔

بیگم۔ سچ ہے بیٹی ـــ دُنیا میں یہی ایک سبق رہ گیا ہے کہ ہر وقت اخبار اور کتابیں ہی منہ سے لگی رہیں۔ کچھ حاصل نہ وصول۔ دماغ کا ناس ہو جاتا ہے جبھی تو اس زمانہ میں عمریں کم ہونے لگیں، اور وقت الگ برباد ہوتا ہے۔ میری تو خاک سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کونسی شان ہے اور کیا خوبی دکھائی دیتی ہے۔

صنوبر۔ خیر ـــ میری تو کیا ہستی ہے یہ آپ کو کوئی بھی نہیں سمجھا سکتا ہے۔ رہا دماغ کے متعلق ایک بڑے عالم "کارلائل" کا قول ہے کہ "کتاب دماغ کے لئے اتنی ضروری ہے جتنی کہ جسم کے لئے غذا"۔ اور اسی لئے وہ یہی کہتا ہے کہ "فرض انسانی میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ہر شخص اپنی الگ لائبریری بنا لے خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہو تاکہ ہر وقت دماغ کے لئے مناسب غذا فراہم ہوتی رہے"۔ رہی جہالت سو شیکسپیئر نے اس کے متعلق کہا ہے کہ "دُنیا میں کوئی تاریکی نہیں مگر جہالت"۔

بیگم۔ ہاں ـــ پڑھ لکھ کر یہی تو سیکھا ہے۔ تیری نظر میں تو سب ہی جاہل ہیں۔ آج بڑی پڑھی لکھی۔ کہیں کچھ گن ہوتا تو شاید سارے میں ڈیڑھ ٹانگ سے اُچھلتی پھرتی۔

صنوبر۔ امی ـــ فارسی کی مثل ہے "موتی کی قدر بادشاہ جانتا ہے یا جوہری"۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ شمشاد داخل ہوتا ہے۔ پیروں کی چاپ)

شمشاد۔ اوہو ـــ آج تو ہماری بیگم کا پارہ بہت ہی اونچا معلوم ہو رہا ہے؟

بیگم۔ مجھے تو کمبخت موت بھی نہیں، جو اس جنجال سے چھوٹ جاؤں۔

شمشاد۔ اجی بیگم! ہم ہی تم سے ڈرتے ہیں۔ تو بھلا "موت" تمہیں چھوڑ کر کہاں رہے گی؟

بیگم۔ ہاں — تم تو ایسے ہی بھولے ہو۔ جبھی تو گھر میں نت نئے سوانگ ہو رہے ہیں۔ جو کبھی شریفوں میں دیکھے اور نہ سُنے۔

شمشاد۔ (ہنستے ہوئے) خوب — بیگم خوب۔ دیکھ تو رہی ہو اور کس طرح دیکھو گی؟

بیگم۔ ہاں — یہ تو کہو ہی گی۔ بات تو جب ہے کہ دُنیا کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو۔ میرا کیا ہے۔ میں تو تمہارے نزدیک باندی ہوں جیسے چاہو نچا لو۔

شمشاد۔ بھلا بیگم — ہم کون سا ایسا کام کر رہے ہیں جس کے لئے دوسروں کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کی ضرورت ہے۔ کوئی چوری نہیں کر رہے۔ ڈاکہ نہیں ڈال رہے۔

بیگم۔ بڑے ننھے ہو۔ کچھ جانتے ہی نہیں۔ بیٹی سیانی ہو چلی ہے۔ مگر لکھنا پڑھنا ختم نہیں ہوتا۔ اور اوپر سے طرّہ یہ کہ اخباروں، رسالوں میں مضمون بھیجتی ہیں۔ ریڈیو پر ڈرامے کراتی ہیں۔ تقریریں کرتی ہیں۔ خوب باپ دادے کا نام روشن ہو رہا ہے۔ جو سُنتا ہے دانتوں تلے اُنگلی دباتا ہے۔ تمہیں تو شرم بھی نہیں رہی۔ جو چلو بھر پانی ہی میں ڈوب مرو۔

شمشاد۔ خوب — آخر اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ ہماری بلا سے جو کوئی دانتوں میں اُنگلی دباتے گا۔ آپ اپنی اُنگلی کاٹے گا۔

بیگم۔ تمہیں کاہے کو شرم آنے لگی جس کی ماں کی آج تک کسی نے آواز نہ سُنی ہو وہ بیٹی کھلے بندوں اسکولوں، کالجوں میں جائے۔ ریڈیو پر تقریریں کرتی پھرے۔ میرے سامنے تو جو کوئی اس کا ذکر بھی کرتا ہے تو مجھ پر شرم سے گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔

شمشاد۔ بات یہ ہے کہ "بندر کیا جانے ادرک کا مزا"۔ سُنو بیگم! آج دُنیا کی تمام شائستہ اور ترقی یافتہ قومیں علم کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچنے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ علم نہ ختم ہونے والی دولت ہے۔ نہ فنا ہونے والا حُسن ہے۔ لیکن افسوس! ہمارا مُلک اب بھی اس جانب کم توجہ کر رہا ہے، اور خصوصاً عورتوں کی تعلیم میں تو بجائے ترقی کرنے کے اُلٹی مخالفتیں اور رخنہ اندازیاں ہو رہی ہیں۔ دیکھو بیگم! ہر ملک اور قوم کی ترقی کا [illegible] بچوں کی صحیح تعلیم، تربیت اور پرورش پر ہے۔

اور بچوں کی صحیح دیکھ بھال کا انحصار ان کی ماں پر ہوتا ہے۔ بچہ ماں کی گود میں جو کچھ سیکھتا ہے اس کے نقوش تا زیست قائم رہتے ہیں، وہ ہمیشہ اُنہی پر چلتا ہے، اور بچہ کی صحیح دیکھ بھال اُسی وقت ممکن ہے جب ماں تعلیم یافتہ ہو۔ مگر ان اوندھی کھوپڑی والوں کو کون سمجھائے۔

بیگم۔ بس — شروع ہو گئی مجذوب کی سی بڑ۔ میرے دماغ میں اتنا گودہ نہیں جو بیکار باتوں میں اپنا مغز کھپاؤں۔ تمہیں تو لغو ہانکنے کے سوا کوئی فکر نہیں ہے۔

شمشاد۔ کیسی فکر — بیگم؟

بیگم۔ صنوبر ماشاء اللہ سیانی ہو گئی ہے۔ سارا زمانہ کہہ رہا ہے کہ ہتھنی بٹھا رکھی ہے ہتھنی — شادی بیاہ کی کچھ فکر ہی نہیں کہ چار حرف پڑھا کر فرض سے الگ ہو جائیں، اور سچ بھی ہے۔ سیانی لڑکی کا بٹھانا اچھا نہیں۔ بس بہت ہو لی۔ اب یہ پڑھائی لکھائی ختم کرو اور جہاں تک ہو سکے جلد ہی اس کے فرض سے ادا ہو جاؤ۔ مجھے تو ایک ایک پل بھاری ہو رہا ہے۔ میں تو چین سے ٹکڑا اُسی وقت کھاؤں گی جب یہ بوجھ سر سے اُتر جائیگا۔

شمشاد۔ کیسی — جاہلانہ باتیں کرتی ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں میں رہتے رہتے تمہارا چونڈا سفید ہو گیا۔ پھر بھی یہ دقیانوسی اور جاہلانہ باتیں دماغ سے نہیں نکلیں۔

بیگم۔ نہیں تو — عُمر بھر بٹھائے رکھنا۔ سارا زمانہ تھوک رہا ہے۔

شمشاد۔ ارے بیگم — ابھی تو اُس کی عُمر ہی کیا ہے، اگلے مہینہ میں جا کر کہیں ۱۳ سال کی ہو گی۔ پھر ابھی تو اس کی تعلیم بھی پوری نہیں ہوئی۔ اگر بالفرض لڑکی بیاہنے کے قابل بھی ہو جائے تو یہ کوئی گُڑیا یا گڈے کا بیاہ تو ہے نہیں کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ ہر شخص کو اس معاملہ میں بہت دیکھ بھال اور سمجھ بُوجھ کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ اسی پر لڑکی کی زندگی کے بننے یا بگڑنے کا دارومدار ہوتا ہے۔ ذرا سی عجلت اور بے پروائی میں عُمر بھر کا کیا دھرا خاک میں مل جاتا ہے۔ بیگم! ذرا ٹھنڈے دل سے سوچنے کی بات ہے کہ جہاں ماں باپ لڑکی کو پال پوس کر جوان کرتے ہیں وہاں تھوڑے دن اور صبر نہیں کر سکتے کہ اس کے لئے کوئی

مناسب شوہر مل جائے۔ بغیر دیکھے بھالے بے زبانوں کو کوئیں میں دھکیل دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔

بیگم ـ دُنیا زمانہ میں سدا اسی طرح ہوتا آیا ہے۔ یہ چوچلے تمہارے ہی گھر بن رہے ہیں۔

شمشاد ـ بیگم! تم تو کچھ بھی سوچتی سمجھتی نہیں۔ وہی "مُرغے کی ایک ٹانگ" گائے جاتی ہو۔ دیکھو! یہ جلد بازی ہی کا نتیجہ ہے جو ہندوستان میں ۷۵ فی صدی شادیاں خانہ آبادیوں کے بجائے خانہ بربادیاں ہوتی ہیں، اور معصوم لڑکیوں کو عُمر بھر خون کے آنسو بہانے پڑتے ہیں۔ ماں باپ کا کیا بگڑتا ہے وہ تو یہ کہہ کر کہ ہم نے اپنا فرض اُتار دیا الگ ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس پر پڑتی ہے اُسی کا کلیجہ جانتا ہے۔ سچ پوچھو تو شادی کے بہانے لڑکیوں کو فالتو اور بے جان سمجھ کر ایسے تیرہ و تار غار میں دھکیل دیا جاتا ہے جہاں وہ سسک سسک کر اپنی زندگی کے دن پورے کرتی ہیں۔ کوئی بھی ان کی آہ و زاری کا سُننے والا نہیں ہوتا۔

بیگم ـ ہاں ـــــ تمہاری بیٹی کے لئے تو آسمان سے بَر اُترے گا۔

شمشاد ـ یہ تو تمہاری ہٹ دھرمی ہے۔ ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ ٹاٹ میں ٹاٹ اور مخمل میں مخمل ہی کا پیوند بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مَیں نے عموماً یہی دیکھا ہے کہ لڑکی کے مذاق اور رضامندی کا خیال کئے بغیر اس کو کہیں بیاہ دیتے ہیں اسی وجہ سے بسا اوقات شوہر اور بیوی کے ازدواجی تعلقات انتہائی ناخوشگوار ہو جاتے ہیں اور پھر جو بُرے نتائج رُونما ہوتے ہیں وہ سب پر روشن ہیں۔

بیگم ـ تمہارا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ کہیں بیاہ شادیوں میں لڑکیوں کی بھی مرضی دیکھی جاتی ہے۔

شمشاد ـ اگر نہیں دیکھی جاتی تو "دیکھی جانی" چاہیئے۔ اس لئے کہ زندگی لڑکی کو نباہنی ہوتی ہے ماں باپ کو نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ جس لڑکے کو اس کے والدین پسند کرتے ہوں کسی وجہ سے وہ لڑکی کو ناپسند ہو۔ مگر سماج اور سوسائٹی کے شدید قانون اُسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی آرزوؤں اور اُمیدوں کے ذبح ہونے کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھے اور خاموش رہے۔ یہی ہندوستانی لڑکی کی عصمت و حیاداری کا ثبوت ہے۔ "قہرِ درویش برجانِ درویش" انجام کار یہی ہوتا ہے جو ہم اکثر اپنی نظروں سے دیکھتے ہیں اور پھر بھی کوئی سبق نہیں سیکھتے۔

بیگم ـ بس ـــــ تم تو عمر بھر یہی بیکار باتیں کیا کرو۔ نہ جانے تمہارے دماغ کو کیا ہو گیا ہے؟

شمشاد ـ اچھا تو ـــــ تمہارے نزدیک ہمارے دماغ کی کوئی چول ڈھیلی ہے ـــــ کیوں؟

بیگم ـ جو کچھ بھی ہو۔ مَیں تو یہی دیکھتی ہوں کہ سارے دن تیتر مارتے ہو۔ کبھی یہ بھی سوچا کہ لڑکی کے لئے کچھ جہیز کا سامان بھی کرنا ہے۔ کرنے والے تو جس دن بیٹی پیدا ہوتی ہے اُسی دن سے انتظام شروع کر دیتے ہیں۔ وقت پر میرے کئے کچھ نہ ہو گا۔ کبھی میرے بھروسہ بیٹھے رہو!

شمشاد ـ بیگم! ـــــ ہمارے مُلک میں یہ جہیز کی رسم بھی انتہائی پلید ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے کو حتی المقدور اس رسم کے بند کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

بیگم ـ توبہ ـــــ کہیں ایسا بھی ہوا ہے۔ غریب سے غریب خالی بیٹی نہیں دیتا۔ سُن نہیں رہے پڑوس میں ہوا کیا ہے۔ موئے نکٹوں نے ایک چھلا تک نہیں دیا ساری برادری تھوڑی تھوڑی کر رہی ہے۔ بیٹی بیاہنے کا تو بڑا چاؤ تھا۔ مگر دینے کے نام "کڑدک"۔

شمشاد ـ تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ سب جانتے ہیں کہ وہ شخص کس قدر غریب ہے۔ بیچارے کے اگر ایک وقت کھانے کو ہے تو دوسرے وقت کا سہارا نہیں۔ اگر وہ تن کے کپڑے بیچ کر بیٹی کو لگا دیتا تو تمہارے کلیجہ میں ٹھنڈک پڑ جاتی۔ یہی کیا کم ہے کہ پال پوس کر بیٹی دیدی۔

بیگم ـ ہو یا نہ ہو ـــــ بیٹی کو تو دینا ہی پڑتا ہے۔ عورتیں اگر کہیں تو کیا بیجا ہے؟

شمشاد ـ جبھی تو مَیں کہتا ہوں کہ عورتوں میں تعلیم کی اشد ضرورت ہے تاکہ اُن کے دماغ سے جہالت کے پردے اُٹھ جائیں بیگم! اگر تم میں ذرا بھی تعلیم کی بُو ہوتی تو ہرگز ایسی باتیں نہ کہتیں۔

بیگم ـ تم جیسے پڑھے لکھوں سے پھر بھی اچھی ہوں۔ کس کام کی وہ تعلیم جو اوندھے اوندھے قانون سکھائے۔

شمشاد ـ نہیں بیگم ـ یہ اوندھے قانون نہیں ہیں۔ بلکہ ہماری

معاشرت کا یہ اہم پہلو ہے۔ جس کو سوسائٹی بالکل ہی نظر انداز کئے ہوئے ہے۔ دیکھنے میں تو یہ باتیں بہت ہی چھوٹی چھوٹی ہیں۔ لیکن حقیقتاً یہی تمام خرابیوں کی جڑ ہیں۔

بیگم۔ ہوں گی ——— مجھے تو جہیز کے رواج میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ یوں کہو کہ لوگوں نے پیسہ بچانے کے لئے یہ ڈھکوسلے نکالے ہیں۔

شمشاد۔ بیگم ——— کیا تمہارے نزدیک یہ بات قابلِ نفرین نہیں کہ کوئی بھی اپنے سے کم حیثیت والے کے رشتہ کرنا پسند نہیں کرتا۔ خواہ وہ اپنا قریب سے قریب ہی عزیز کیوں نہ ہو۔ جانتی ہو کیوں؟ اس لئے کہ غریب کے پاس اتنی دولت کہاں جو بیٹی کو بھاری بھرکم جہیز دیکر اُن کی ہوس کی آگ بجھا سکے۔ شائد تم نے یہ دیکھا ہوگا کہ جب کسی غریب کے لڑکی پیدا ہوتی ہے تو وہ بجائے خوش ہونے کے رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ لڑکی ہے بلکہ اس لئے کہ اُس کے بیاہ شادی کے لئے بہت سا روپیہ کہاں سے آئیگا اور بقول تمہارے اگر وہ اعلیٰ جہیز کا انتظام نہ کریں تو برادری میں مُنہ دکھانے کے لائق نہیں۔

بیگم۔ خوب! یہ اچھا قانون نکالا۔ تمہارے نزدیک تو کوئی کچھ بھی نہ دے۔

شمشاد۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ مَیں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہر شخص بجائے زیورات اور دیگر سامانِ جہیز کے اپنی بچیوں کو حسبِ حیثیت علم کے زیورات سے آراستہ کریں جس سے ان کے "حُسنِ سیرت" کو چار چاند لگیں۔ اور پھر وہی لڑکیاں جو آج ہمیں بارِ گراں معلوم ہوتی ہیں ہمارے ملک اور قوم کے لئے مشعلِ راہ بن جائیں گی۔

بیگم۔ ان گول مول باتوں سے کیا فائدہ صاف ہی کیوں نہیں کہتے کہ مَیں اپنی بیٹی کو کچھ نہیں دوں گا۔

شمشاد۔ واہ ——— خوب کہی۔ دونگا کیوں نہیں۔ البتہ عوام سے مختلف جہیز۔ سونے، چاندی اور جواہرات سے کہیں زیادہ قیمتی، علم کی بے پناہ دولت، کبھی نہ ختم ہونیوالا جہیز اور دُعا کرتا ہوں کہ خدا ہندوستان کے ہر شخص کو اپنی بچیوں کو ایسا ہی جہیز دینے کی توفیق بخشے۔

بیگم۔ بھاڑ میں گیا تمہارا جہیز۔ سیکھی "جل کر تو خراب ہو ہی گئے تھے اور تمہاری رٹ میں ٹھنڈ سے ہو کر بالکل ہی ستیاناس ہو گئے مَیں تو جاتی ہوں۔

شمشاد۔ ارے بیگم ——— تم نے تو ہنڈیا میز پر رکھ کر ساری کتابیں اور میز پوش کا بھی ناس کر دیا۔

(بیگم جاتی ہے۔ پیروں کی آواز)

شمشاد۔ (خود سے) لاکھ طوطے کو پڑھایا پھر بھی حیوان ہی رہا۔ (آواز دیتا ہے) صنوبر! بیٹی صنوبر!!

صنوبر۔ جی ابا جان ———

شمشاد۔ بیٹی! آج اتنی سُست کیوں ہو؟ کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟ یا امی نے کچھ کہا ہے؟

صنوبر۔ کیا بتاؤں۔ ابا جان! میری تو زندگی وبال ہو گئی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ کوئی تعلیم پر اعتراض کرتا ہے کوئی مضامین لکھنے پر۔ غرض نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔

شمشاد۔ بھلا یہ بھی کوئی فکر کی بات ہے۔ اس دُنیا کی ہی ریت ہے۔ یہاں صرف وہی ترقی کر سکتا ہے جو ان باتوں کو ایک کان سن دوسرے کان اُڑا دے اور مستقل مزاجی سے اپنی منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھاتا رہے۔ اصغر گونڈوی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دُشوار ہو جائے

صنوبر۔ یہ ٹھیک ہے ابا جان۔ مگر باتوں کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے مجھے تو ایک لمحہ بھی جم کر کام کرنا دوبھر کر رکھا ہے۔

شمشاد۔ کچھ بھی ہو بیٹی۔ فارسی کی مثل ہے کہ کوئی راستہ ایسا نہیں کہ جس میں کانٹے نہ ہوں۔ وہ شخص انتہائی بدنصیب ہے جو راہ کی مشکلات اور تکالیف سے ڈر کر ہمت ہار بیٹھے اور حوصلے پست کر دے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دُنیا میں جتنی بھی بڑی ہستیاں گذری ہیں ان کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کے قدم کبھی راہِ راست سے نہیں ڈگمگائے۔ ہمیں اُن سے سبق سیکھنا چاہیئے۔

صنوبر۔ ابا جان ——— دُوسروں کی تو بھگتی جاتے۔ لیکن محلہ اور خاندان کی عورتوں نے امی جان کو کچھ ایسا پڑھا رکھا ہے کہ وہ تو بس ڈھائی سیر آٹا باندھ کر میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ اور ساتھ میں آپ کو بھی نہ جانے کیا کیا کہتی رہتی ہیں۔

شمشاد - بیٹی! یہ لوگ تو لکیر کے فقیر ہیں۔ ان کے نزدیک تو خود جو کچھ کریں اور جو اُن کے باوادا سے کر گئے وہ تو باون تولہ اور پاؤ رتی ٹھیک اور جو دوسرا کرے وہ بالکل غلط ہے۔ دیکھو! ہمارا ملک اُسی وقت ترقی کر سکتا ہے جب ہم ان جاہلانہ باتوں کی ذرہ برابر بھی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی بچیوں کو ظاہری بناؤ سنگار کے بجائے تعلیم کے زیورات سے آراستہ کریں۔ جو نہ صرف اُن کی زندگیاں سنوارے گی، بلکہ ملک اور قوم کے لئے بھی سمندر میں روشنی کا مینار ثابت ہوگی۔ اچھا بیٹی اب جا۔ اور خوب جی لگا کر اپنا کام کرو۔ اور دیکھو اِن کے کہنے کا کچھ خیال مت کرو۔ اُن کی تو وہ مثل ہے کہ کسی نے بارہ برس کتے کی دم نلکی میں رکھی تھی مگر جب نکالی تو ٹیڑھی کی ٹیڑھی نکلی۔"

(پردہ)

ریاضِ خلیل

جلوہ جو دیکھنا ہے آئینہ ساز ہو جا

از حضرت خلیل بیگو سرائی

مرہونِ ناز ہو جا، وقفِ نیاز ہو جا! — قیدِ عبودیت سے بیگانہ ساز ہو جا
ہے فطرتِ گلی میں فردوس بھی سقر بھی — تو خواہ سوز بن جا، تو خواہ ساز بن جا
کر آشنا بتوں کو رازِ عبودیت سے — بتخانۂ عجم میں بانگِ حجاز ہو جا
پھولوں کی جب ہو کثرت اے باغباں چمن میں — دامن فراز ہو جا، دامن دراز ہو جا
دیدار کی ہوس کیا دل ہی نہیں ہے جب تک — جلوہ جو دیکھنا ہے آئینہ ساز ہو جا
احصائے سرخوشی میں موجِ طرب کشی میں — بادہ گسار بن جا، نغمہ نواز ہو جا
جب آنکھ بے بصر ہے محدود ہے نظر جب — اے طالبِ حقیقت رہنِ مجاز ہو جا
مرہونِ بیخودی کر پابندئ خودی کو — دنیائے رنگ و بو سے بیگانہ ساز ہو جا

لگ جائیگی ٹھکانے مٹی خلیل تیری
راہِ حجاز میں تو خاکِ حجاز ہو جا

دو خواب

از: جناب سید مقبول حسین احمد پوری

آبنائے پاک

میں اس کنارے سے کھڑا دیکھ رہا تھا
لنکا کے کنارے تھی گھرے دور دھوئیں سے
ہلکی سی دھڑک میں یہ مرے دل نے کہا تھا
تخئیل میں تھی جھانک رہی یاد کنوئیں سے

گہرائی میں تاریخ کی صدیوں کا زمانہ
آتا ہے نظر اور یہ ہلتا ہوا ساگر
ہر موج کی چھل بل یہ سناتا ہے فسانہ
کس طرح سے راون نے اٹھایا تھا کبھی سر
کس طرح سے دسرتھ کے ولیعہد نے آ کر
اک پل سا بنایا تھا یہاں پاٹ کے ساگر
کس طرح گئے ساتھ میں بھارت کے دلاور
ہر ایک بلی ان میں تھا ہر ایک بہادر"

وہ خواب کی تصویر تصور سے الجھ کر
کہتی تھی "زمانے کا یہ چکر ہے نرالا
کرتا ہے جو ہر دور میں کچھ سوچ سمجھ کر
روشن سے اندھیرا تو اندھیرے سے اجالا"

تاج

اے تاج! تجھے دیکھ کے کہتی ہیں نگاہیں
ملتی ہیں اسی قصر سے فردوس کی راہیں
لیکن مری آہیں
کہتی ہیں کہ عبرت کا حسیں قصر بنا ہے
یہ اپنی ہی تصویر بقا اور فنا ہے
یا شکلِ تغیر

یاد آئے تجھے دیکھ کے اے تاج زمانے
جب ہم کو بھی دنیا تھی ہر اک بات میں مانے
ہیں اب وہ فسانے
ڈالے تھے بنا کتنے ہی جنت کے نمونے
آباد تھے پہلے مگر اب ہو گئے سونے
یا خوابِ تغیر

اے تاج ترا دور جو دنیا سے نہاں ہے
یا آج کسی اور ستارے پہ عیاں ہے؟
وہ دور کہاں ہے؟
وہ شاہجہاں اور وہ مغلوں کی حکومت
اب ایک فسانہ ہے لئے ساتھ میں عبرت
یا درسِ تغیر!

سفید بال تھے۔ ایک ہفتہ میں سیاہ ہو گئے

ایک عجیب و غریب ترکیب

بال کالا کرنے کی ۔ کھانے کی دوا

سفید بالوں کو ہمیشہ کیلئے کالا کر دینا اور آئندہ کالا بال نکلنا اب بہت آسان ہو گیا۔ لگانے کا خضاب سفید بالوں کو صرف ایک ہفتہ کیلئے کالا کر سکتا ہے۔ اور پھر سفیدی آجاتی ہے۔ لیکن تحقیقات کے بعد اب ایک ایسی عجیب و غریب دوا تیار ہو گئی ہے جس کے کھانے سے سفید بال کالے ہو جاتے ہیں اور پھر کالے ہی رہتے ہیں۔ کیونکہ بالوں کی جڑیں تک سیاہ ہو جاتی ہیں۔ اس دوا کا نام "**کیشول**" ہے تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ دوا کیشول کے صرف ایک ہفتہ استعمال کر لینے سے ہی سفید بالوں پر سیاہی پھیلنے لگتی ہے۔ اور پوری شیشی استعمال کرنے کا مطلب ہے کہ بال کالے بھی ہو جائیں گے۔ اور آئندہ کالے ہی نکلیں گے۔

چار روپے میں تمام بال سیاہ ہو جائینگے دوا کیشول قطعی بیضرر ہے۔ عام طور پر لوگ اسے کھانیکا خضاب کہنے لگے ہیں اور یہ کسی حال میں استعمال کرنیوالے کو نقصان نہیں کرتا۔ دنیا میں اس سے بہتر خضاب شاید آپ حاصل نہ کر سکیں گے۔ ایک شیشی کیشول جو ایک ضرورتمند کیلئے قطعی کافی ہے کی قیمت چار روپے دو آنے ہے۔

منیجر زنانہ دواخانہ - اے بی ۳۴ دہلی کو خط لکھ کر دوا کیشول بذریعہ وی پی پارسل منگا لیجئے۔ پارسل پر گیارہ آنے محصول خرچ ہوگا۔ اور اس معمولی رقم میں آپ اپنی ضرورت کا ایک لافانی تحفہ حاصل کر لیں گے۔ کیونکہ اس دوا کے استعمال کے بعد لگانیکے خضاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بال از خود کالے نکلنے لگتے ہیں۔

موتمر آئین ساز تاریخ کی روشنی میں

از جناب خواجہ احمد فاروقی بی۔ اے

موتمر آئین ساز "لجسلیٹو اسمبلی" کا نام نہیں ہے جو قوانین کو وضع کرتی ہے بلکہ وہ ایک ایسی مجلس کا نام ہے جو ملک کے بنیادی اور آئینی اصول کو طے کرتی ہے۔ اس مجلس سے ممالک متحدہ امریکہ، فرانس، جرمنی اور روس میں اکثر کام لیا گیا ہے لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اس کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ ناکامیوں سے بھرا پڑا ہے اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے سوا کہیں بھی اس کے فیصلے عملی صورت میں موجود نہیں ہیں اس کی شاید ایک وجہ یہ ہے کہ موتمر آئین ساز انقلاب جمہوری کی پیداوار ہے اور دنیا کے اکثر انقلاب حریت و مساوات کے نام پر ضرور شروع کئے گئے لیکن ان کا انجام اکثر یہی ہوا کہ حامیان انقلاب نے اسے طاق نسیان کی زینت بنا کر بڑی بے دردی سے پامال کر ڈالا۔ ٹی ایچ۔ پیرا (T.H.peare) نے بالکل صحیح کہا ہے کہ محض ہاتھوں کا اٹھا دینا کسی مسئلے کا قطعی حل نہیں ہے۔

جنگ آزادی امریکہ کا آغاز ۱۷۷۵ء میں ہوا۔ امریکہ والے کہتے تھے کہ برطانوی پارلیمنٹ کو ہمارے اوپر ٹیکس لگانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے اس لئے کہ اس میں ہمارے نمائندے موجود نہیں ہیں۔ لارڈ نارتھ نے جو اس وقت وزیر اعظم تھا از حد افلاس تدبر کا ثبوت دیا اور مصالحت کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوتی۔ چنانچہ ۱۷۷۶ء میں امریکی نوآبادیات نے آزادی کا اعلان کر دیا اور کانگریس نے برطانوی حکومت سے تمام سیاسی تعلقات منقطع کر لئے۔ اسی وقت تمام نوآبادیات "وفاقی جمہوریت" میں تبدیل ہو گئیں اور اس طرح ممالک متحدہ امریکہ کا وجود معرض ظہور میں آ گیا۔ ۱۷۸۳ء میں صلح نامہ ورسائی کے ذریعہ سے انگلستان نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ اب امریکہ کے لوگ انتظامی امور کی طرف متوجہ ہوئے چنانچہ مجلس فلاڈلفیا منعقدہ ۱۷۸۷ء نے ریاستہائے متحدہ کا وفاقی آئین مرتب کیا۔ اس میں تیرہ میں سے بارہ ریاستوں نے اپنے نمائندے بھیجے۔ اور ایسا بنیادی آئین وضع کیا جس میں درستی و صحت کا بہت زیادہ لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ اس آئین کی لچک، وسعت اور عمومیت ہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور آج اسی بنیاد پر امریکہ کی جمہوریت کی عمارت استوار ہے شروع میں یہ بنیادی آئین صرف دس لاکھ مربع میل رقبہ اور چالیس لاکھ آبادی سے کم کے لئے بنایا گیا تھا لیکن اب اس کا سلسلہ بیس لاکھ مربع میل رقبہ میں جاری ہے اور ۱۳۰،۰۰۰،۰۰۰ لوگ اسے مذہبی صحیفہ سمجھتے ہیں۔

فرانس میں بھی موتمر آئین ساز کا تجربہ کیا گیا۔ ۱۷۸۹ء تاریخ عالم میں بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے کہ انقلاب فرانس کا آغاز اسی زمانہ میں ہوا۔ مئی میں لوئی شش‌ششم نے ورسائی کے مقام پر اسٹیٹس جنرل یا (States General) ملکی پارلیمان کا اجلاس کیا۔ اس میں امراء، پادری اور عوام شامل تھے۔ عوام کی تعداد ۶۲۱ اور امیروں اور پادریوں کی تعداد علی الترتیب ۲۸۵ اور ۳۰۸ تھی۔ عوام انقلاب سے متاثر تھے اور یہ چاہتے تھے کہ وسیع الخیال پادریوں کی امداد سے پارلیمنٹ میں انکی اکثریت قائم ہو جائے لیکن بادشاہ اس کوشش کو ناکام بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ امیروں، پادریوں اور عوام کے جلسے الگ الگ ہوں۔ اس حکم کی تعمیل میں امراء اور پادری تو ہال سے رخصت ہو گئے لیکن عوام جمے رہے، ان کے سرخیل، مرابو نے بڑے آہنی عزم کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ "جانتے ہو، جمہور کو سوائے چمکدار نیزوں اور آبدار تلواروں کے اور کوئی چیز آسانی سے منتشر نہیں کر سکتی۔" اس پر لوئی نے کہا کہ وہ ٹھہرنا چاہتے ہیں تو ٹھہریں لیکن ہنگامۂ جمہور سے مجبور ہو کر اس نے بالآخر ۲۶ جون کو اعلان کیا کہ امراء اور پادری بھی عوام کے ساتھ ایک ہی کمرہ میں مجتمع ہوں۔ ۶ جولائی کو ایک کمیٹی آئین و دستور مرتب کرنے کیلئے مرتب کی گئی۔ اب یہ اسٹیٹس جنرل موتمر آئین ساز میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ۱۷۸۹ء سے لے کر ۱۷۹۵ء تک فرانس میں اٹھے چار آئین و دساتیر پیش کئے گئے اور ان میں آج ایک بھی باقی نہیں ہے۔ ۲۴ جون ۱۷۹۳ء کا "جے کوبن دستور" تاریخ فرانس کے اولین استشارۂ جمہور میں منظور ہوا، ۱۱۰۰۰ مخالفین کے مقابلہ میں ۱۸۰۰۰۰۰ کی اکثریت نے پاس کیا۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ یہ محبوب خلائق، آئین و دستور بھی شرمندۂ عمل

نہیں ہوا۔

اس کے بعد فرانس نے پھر موتمر آئین ساز کا دو مرتبہ اجلاس طلب کیا۔ ایک تو ۱۸۴۸ء میں، جس کے بعد لوئی فلپ نے تخت و تاج کو خیرباد کہدیا اور ایک ۱۸۷۰ء میں، جب فرانس اور پرشیا کے مابین جنگ شروع ہوئی اور لوئی نپولین فرار ہوگیا۔ ۱۸۴۸ء کے آئین نے جمہوریت کا اعلان کیا لیکن تین ہی سال بعد لوئی نپولین نے تاج شاہی پہن لیا اور اس طرح جمہوریت کا پھر خاتمہ ہوگیا۔

جرمنی کی داستان بھی بڑی عبرت آموز ہے۔ ۱۸۴۸ء میں فرینکفرٹ کی المانوی قومی مجلس نے آئین و دستور کو مرتب کرنا شروع کیا۔ مردوں کی عام رائے دہندگی کے اصول کے مطابق ... ۵۰ لوگوں کو ایک نمائندہ بھیجنے کا حق حاصل ہوا، اور اس مجلس نے بڑی کامیابی کے ساتھ ایک آئین بھی مرتب کرلیا اگر اسے ناکامی ہوئی تو اس میں کہ یہ آئین بروئے کار نہیں آسکا۔! آسٹریا نے مجلس کو خیرباد کہدیا اور اپنا الگ "اکیم آئین" مرتب کیا۔ خاص فرینکفرٹ میں بلوے ہوئے اور موتمر کی بڑی شد و مد سے مخالفت کی گئی۔ بسمارک جو اس کا قائل تھا ع

کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

مخالفین میں سب سے پیش پیش تھا۔

۷۱ برس کے بعد یعنی ۱۹۱۹ء میں جرمنی نے آئین دیمر مرتب کیا۔ اسے ترتیب دینے والی ایک قومی مجلس تھی جس کی نمائندگی کے لئے ہر بیس سال کے مرد اور عورت کو ووٹ دینے کا حق تھا۔ یہی "موتمر آئین ساز" المانوی جمہوریت کی پہلی ریشلاغ قرار پائی۔ اس آئین کی منظوری میں ۲۴۲ ووٹ موافق اور ۷۶ مخالف پڑے لیکن یہ آئین دیمر اڈالف ہٹلر نے ۱۹۳۳ء میں برسر اقتدار آتے ہی حرفِ غلط کی طرح مٹادیا۔ موتمر آئین ساز کے بطن سے جتنے بچے پیدا ہوئے تھے ان میں شاید یہ موت دنیا کے لئے سب سے زیادہ روح فرسا اور دل شکن تھی!

انقلابِ روس میں بھی لوگوں کا خیال موتمر آئین ساز کی طرف گیا۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء میں اس کا اجلاس طلب کیا گیا۔ اس میں اشتراکی انقلاب پسندوں کی اکثریت تھی۔ لینن نے یہ کوشش کی کہ اس میں بالشویک عناصر کی اکثریت ہو جائے لیکن کامیاب نہ ہوسکا اس لئے اس نے بزورِ شمشیر اراکین موتمر کو نکال باہر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اسے یہ خبر ملی کہ زراعت پیشہ قانون سازوں کو نکال دیا گیا ہے

تو وہ بڑے زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔ وہ شاید جانتا تھا کہ ع

ایں ہمہ راز ست کہ معلوم عوام ست

ہندوستان میں کانگریس نے موتمر آئین ساز کا پُر زور مطالبہ کیا ہے اور اسے اپنے دل کی واحد آرزو بنالیا ہے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس بدقسمت ملک میں جو اختلافات کا عجائب خانہ ہے اور جس میں ۹۵ فیصدی سے زیادہ علم کی روشنی سے محروم ہیں، اس کا کیا حشر ہوگا۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہندوستانیوں کی وطن پرستی محض مغرب کی نقالی ہے۔ اس جملہ میں احتراز اور طنز کا پہلو سہی، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس تنقید و احتساب اور فرادانیٔ عقل و ہوش کے دور میں کورانہ تقلید نہایت مضر ہے۔ ہمیں سفالِ ہند ہی سے مینا و جام پیدا کرنا چاہیئے۔ ہر وہ چیز جو مغرب سے علاقہ رکھتی ہے ضروری نہیں کہ وہ ہندوستان کے لئے بھی لازمی مفید اور کارآمد ہو۔ بقول لارڈ مارلے کینیڈا کا فرکوٹ خطِ استوا کے ملکوں میں نہیں پہنا جاسکتا ؂

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است

نبضِ انتظار

ہے لطفِ زندگی جبھی کہ درد میں کمی نہ ہو

از جناب اعجاز صدیقی اکبرآبادی

سکوں نصیبِ روزگارِ زندگی کبھی نہ ہو
اگر اسیرِ دامِ اعتبار آدمی نہ ہو

بڑھا ہوا جو حد سے اس کا ذوقِ تشنگی نہ ہو
تو بارِ خار مطلقاً کلی کی نازکی نہ ہو

ارادۂ فغانِ عشق کر شبِ الم مگر
یہ سوچ لے کہ روحِ کائنات جاگتی نہ ہو

قفس نصیب آج بے سبب ہیں بیقرار سے
حدودِ لالہ زار میں بہار آگئی نہ ہو

کریں بڑی خوشی سے پھر تجلیوں کی آرزو
وہ بے خبر جنہیں خبر مآلِ طور کی نہ ہو

وہی تو ایک وقتِ خاص ہے ورودِ حسن کا
کہ تیرگیٔ غم میں جب ذرا بھی روشنی نہ ہو

خدا کو جلوہ گاہِ دل میں ڈھونڈنے چلا تو ہے
مگر یہ شرط ہے خودی شریکِ بیخودی نہ ہو

نگاہِ شوخ و مست ہے خلش فروزِ زندگی
خدا کرے کہ پھانس یہ قریبِ دل چبھی نہ ہو

یہ کیا کہ شکوہ سنجِ تلخ کامیٔ حیات ہے
اسی کی دین غم بھی ہے اگر نہیں خوشی نہ ہو

نہ دیر کر تجھے قسم اے جمالِ منتظر
قدم بڑھا کہ نبضِ انتظار ڈوبتی نہ ہو

بغیرِ درد و کرب تو اگر جیا تو کیا جیا
ہے لطفِ زندگی جبھی کہ درد میں کمی نہ ہو

نہ جانے عہدِ عشق میں وہ ساعتیں کب آئیں گی
ہو صرف تیرا اک خیال اور کوئی بھی نہ ہو

فضائے نسترین و نسترن ہے سوگوار سی
کسی نے عصمتِ بہارِ باغ لوٹ لی نہ ہو

آبِ حیات کا چشمہ افریقہ کے خوفناک جنگلوں میں

ڈاکٹر ہرشفیلڈ کا سنسنی خیز انکشاف جس نے دنیائے سائنس میں ہلچل ڈال دی ہے

سدا بہار جوانی اور شاندار مردانگی حاصل کرنیکا آسان طریقہ

زندہ باد شباب! پائندہ باد جمال!!



OTONE The Elixir of Life

IN SILVER DROPS

کیا آپ اپنے کو زندہ جو یا پہلی عمر سے زیادہ محسوس کرتے ہیں یا آپکی ہمت و مردانگی جواب دے چکی ہے یا آپ دماغی کمزوری، سستی، پست ہمتی، جسمانی ناطاقتی، حافظہ کی کمی، خون کی خرابی، بالوں کے گرنے یا قبل از وقت سفید ہونے سانس پھولنے اور بدہضمی کا شکار ہیں؟

آپ خواہ کتنے عرصے سے امراض میں مبتلا ہوں اور خواہ آپ نے ان شکایتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے زندہ بھر کے جتن کئے ہوں اور کتنی ہی ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے لیکن اب مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ ڈاکٹر ہرشفیلڈ نے ... کوششوں کے بعد افریقہ کے خوفناک جنگلوں میں آبِ حیات معلوم کیا ہے جس کے استعمال کے بعد جوانی کی قوت و طاقت حیرت انگیز طریقے سے لوٹ آتی ہے۔

اوٹون کی آبِ حیات تاثیرات

اس آبِ حیات کا نام اوٹون ہے جسے سلور ڈراپ میں پیش کیا گیا ہے۔ ... کی جھریاں غائب ہوجاتی ہیں۔ رخسار گوشت و خون سے بھر کر کشمیری سیب کی مانند ہوجاتے ہیں۔ سفید بال پہلے جیسے ... سیاہ نکلنے شروع ہوجاتے ہیں۔ جلد پر شباب کی تروتازگی ... کی شادابی اور فرحت بخش پوری رعنائیوں سے ظاہر ہوجاتی ہے اگر آپ پچاس برس کے ہیں تو بیس سال کے معلوم ہونگے۔

دشمنِ جاں امراض کا خاتمہ

آبِ حیات اوٹون کے سلور ڈراپ خوراکی گولی ... آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا، چڑچڑا پن، دل کی دھڑکن، ... ذیابیطس، ... نابینائی، بھوک نہ لگنا، ... عورتوں کی پوشیدہ ... دیگر ... شکایتوں کے لئے جادو اثر دوا ہے۔ ... اس سے بہتر کوئی دوا مارکیٹ میں موجود نہیں ہے۔

شاندار نتائج کی تصدیقات

[illegible]

15.000 ہزار روپیہ نقد انعام

اوٹون لیبارٹری کی طرف سے مبلغ پندرہ ہزار روپیہ کا انعام اس شخص کو دیا جائیگا جو ثابت کردے کہ اوٹون کی آبِ حیات تاثیرات کسی ہانڈ کے نونی اجزا (ایپرون) کے باعث ہیں یا اس میں کوئی نشہ یا مضر شے ہے مرد عورتیں بچے بوڑھے ہر موسم میں بغیر کسی پابندی کے استعمال کرسکتے ہیں اوٹون کی اصل قیمت بارہ روپیہ ہے مگر ہندوستان میں اسے لوگوں کیلئے اس کی قیمت فی الحال صرف تین روپیہ آٹھ آنہ ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اوٹون لیبارٹری کب اس کی قیمت میں اضافہ کردے۔ محصول ڈاک صرف ان خریداروں کو معاف ہوگا جو رقم پیشگی بھیج کر دوا منگوائے ... محصول ڈاک لیا جاتا ہے۔

ایشیا کے سول ڈسٹری بیوٹرز

میسرز گرانڈ فارمیسی پوسٹ بکس ۲۳۲۲ کلکتہ

تار کا پتہ:۔ "اوٹون" کلکتہ — ٹیلیفون:۔ بڑا بازار ۵۳۰۰

وارداتِ عشقیہ

ادبی مضمون

از جناب جلالی شاہجہانپوری

عشق و محبت کی حالت میں جو معاملات عاشق کو پیش آتے ہیں یا جو کیفیات اُس کے دل پر طاری ہوتی ہیں اُن کو رقت انگیزی سے بیان کرنا عشقیہ شاعری کی اصطلاح میں "واردات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عشقیہ شاعری میں اس کا بیان ایک اہم مرتبہ رکھتا ہے کیونکہ دلی کیفیات کے بیان میں اوّل تو خود ہی ایک قسم کی کہربائی پائی جاتی ہے اور پھر عاشق کی زبان سے تو دوگونہ جاذبیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ ابن قدامہ نے عربی میں جو اشعار مثالاً پیش کئے ہیں اردو میں اُن کا سب سے بہتر جواب غالب کا یہ مشہور شعر ہے ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

جناب خلیل کا ایک مشہور شعر بھی اس جگہ مثالاً پیش کیا جا سکتا ہے ؎

یار جاتا ہے تو سنسان مکاں رہتا ہے
اپنی تنہائی پہ پہروں خفقاں رہتا ہے

عام قاعدہ ہے کہ جب کسی خاص متعلق ہستی کا خط آتا ہے تو مکتوب الیہ اُس کو بار بار پڑھتا ہے لیکن پھر بھی اُس کا چہرہ دل کے اضطراب کی مسلسل غمازی کرتا رہتا ہے۔ جب یہی موقع نامۂ محبوب کے سلسلہ میں عاشق کو پیش آتا ہے تو اس کا پُرسوز اور مضطربانہ اندازِ بیان سننے والوں کو بےچین ہی نہیں بنا دیتا بلکہ اُن کے دلوں میں آگ سی لگا دیتا ہے ؎

خط کسی کا جب سے آیا ہے میں ہوں اس شغل میں
گاہ پڑھنے کو اٹھایا، گاہ پڑھ کر رکھ دیا (جلالؔ)

انتظار کی تکلیف خواہ کسی نوعیت کی کیوں نہ ہو، موت سے زیادہ شدید مانی گئی ہے، لیکن عاشق کو اس منزل میں جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اپنے تسلسل کی وجہ سے اس سے بھی زائد پریشان کُن ہوتی ہیں، خدا کی پناہ! دن کو سکون اور نہ رات کو چین، تکلیف .... اور مسلسل تکلیف، وعدہ ..... اور وہ بھی محبوب کا ؏

وہ کریں گے وعدہ اور کرتے جائیں گے

اور کہیں پر عاشق کا آنکھوں پر چشم براہ، اور گوش برآواز رہنا کس قدر پریشان کُن تو تکلیف فزا تخیل ہے اور پھر عاشق کی زبان سے اس کا دردانگیز بیان اس تخیل میں اور بھی ندرت پیدا کر دیتا ہے ؎

یوں مری رات تری منتظری میں گزری
چشم براہ بھی تھا، گوش برآواز تھا (جلالؔ)

اندھوں کی طرح شب کو ترے انتظار میں
تا صبح سر پٹکتی نگہ چار سُو گئی (جلالؔ)

اس انتظار کی تکلیف سے غریب عاشق کی صورت تک تبدیل ہو جاتی ہے، قاصد کا خط جواب لاتا ہے لیکن وہ عاشق کی صورت دیکھ کر حالتِ استعجاب میں پڑ جاتا ہے۔ مجبوراً عاشق ہی اس معمہ کو حل کرتا ہے ؎

یہ انتظار میں مری صورت بدل گئی
قاصد ہے خط کو دیئے مجھے اضطراب میں (قلقؔ)

مشہور ہے کہ محبت پہلے محبوب کے دل میں گھر کرتی ہے اور حافظ شیرازی نے تو اس شہرت کو واقعیت کا لباس پہنا دیا ؏

عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود

لیکن بیچارے عاشق کی زندگی کا جامع خلاصہ سوداؔ کی زبان سے سُنیئے ؎

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب بھلی راتیں
دو چار گھڑی رونا، دو چار گھڑی باتیں

اس شبانہ روز کی آہ و زاری اور نالہ و فغاں کے باوصف محبوب کے دل میں اُس کی محبت کا کوئی اثر نمایاں نہیں ہوتا، اُس کا فراق کبھی وصل سے تبدیل نہیں ہوتا۔ جب یہ حالت ایک عرصہ تک قائم رہتی ہے تو دل میں آئی ہوئی بات اُس کی زبان سے بےساختہ طور سے نکل جاتی ہے ؎

لوگ کہتے ہیں کہ محبت میں اثر ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے (جرأتؔ)

اپنے عزیز دوست کی جانب سے دل میں کتنے شکوے کیوں نہ ہوں لیکن اُس کی بُرائی کوئی نہیں چاہتا، پھر دوسرے کی زبان سے تو اُس کے متعلق ایک لفظ بھی سُننا گوارا نہیں ہوتا، یہی حال عاشق کا بھی

اس صورت میں ہوتا ہے، محبوب کی ہر وقت کی بے اعتنائیوں اور سرد مہریوں کی وجہ سے اُس کا نازک دل شکوہ سنج ضرور ہو جاتا ہے لیکن بُرائی اُس کی زبان و فا گفتار سے کبھی نہیں نکلتی، دوسروں سے وہ اس لغویت کو کیسے برداشت کر سکتا ہے ؎

اگرچہ ہم بھی ہیں شاکی پہ جی یہ چاہے ہے
ہمارے یار کا ہرگز کوئی گلا نہ کرے (جرأت)

عاشق کے حسرت زدہ دل میں خیالات کا ایک بے پناہ تسلسل قائم رہتا ہے۔ ایک خیال کا سلسلہ ختم نہیں ہونے پاتا کہ دوسرا خیال موجود ہو جاتا ہے۔ ایک طوفان ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا ؎

لاکھوں طوفان دلِ مضطر میں اُٹھا کرتے ہیں
سینکڑوں قافلے آتے ہیں گزر جاتے ہیں (وفا رامپوری)

عالمِ تخیل میں محبوب سے چھیڑ چھاڑ اور نہ ختم ہونے والی باتیں ہوتی رہتی ہیں جس کے نتیجہ میں صدا بہار رنگینیوں کے چمن اس کے تختۂ دل پر شگفتہ ہو جاتے ہیں۔ جب حالتِ آس میں صورتِ یاس پیدا ہو جاتی ہے تو اس شگفتہ چمن میں پژمردگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں ؎

کہتے تو ہو، یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

منزلِ عشق کی ہمت شکن تکلیفیں بس خدا کی پناہ! عاشق کے دل میں تمنا پیدا ہوتی ہے کہ اس پُرخار راستہ کی آبلہ پائی کو محبوب اپنی آنکھوں سے دیکھتا، جو کچھ اس کی محبت کے راستہ میں دل پر بیت رہی ہے وہ خود آکر مشاہدہ کرتا ممکن ہے کہ اس کی بیوفائی وفاداری سے، اور بے اعتنائی اعتنا سے تبدیل ہو جاتی، یہ بھی اُمید نہ سہی تو کم از کم وہ اپنی آنکھوں سے عاشق کی حالت تو دیکھ لیتا اور عاشق کو یہ اطمینان نصیب ہو جاتا کہ اُس کا محبوب اُس کی خستہ حالی اور بربادی سے واقف ہے چنانچہ اسی جذبہ سے اس کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوتی ہے اور وہ حالتِ جذب میں پُکار کر کہتا ہے ؎

عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہے
آؤ تم بھی تو اِک ذرا دیکھو (میر)

چونکہ اس نوع کے واردات بذاتِ خود اپنی جگہ پر نہایت رنگین اور پُرکیف ہوتے ہیں اور جب عاشقِ خستہ جگر کی زبان سے وہ ادا ہوتے ہیں تو اُن میں سوز و گداز کا دریا موجزن نظر آنے لگتا ہے۔

عشق و محبت کے معاملات کسی خاص خطۂ ارضی کے ساتھ مخصوص نہیں، یہ عام و خاص کی قید سے آزاد ہیں لہٰذا وارداتِ عشقیہ کو بھی کسی ذات یا کسی جگہ سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا، جہاں عشق و محبت کا وجود پایا جائیگا وہاں اِن واردات کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔

اس صغریٰ اور کبریٰ کی ترتیب سے جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے اسی کے ماتحت جب عربی شاعری پر ایک گہری نظر ڈالی جاتی ہے تو اُس کے اندر عامۃ الورود حالات کی بہتات نظر آتی ہے۔ حقیقت میں عربی شاعری وارداتی رنگ تک فارسی شاعری سے مماثل ہے بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ کی حدود میں داخل نہ ہوگا کہ عربی نے اس معاملہ میں بہت وسعت سے کام لیا ہے ؎

اَلا رُبَّ یومٍ کان منھنّ صالحٍ
وَلا سیّما یومٌ بدارۃ جُلجُلِ

ترجمہ:- اے امراء القیس! یہ تیرا رونا پیٹنا اور ذکرِ اندوہ و فراق کب تک جاری رہے گا، آخر تجھ کو ایسے عمدہ روز بھی تو نصیب ہوئے ہیں جن میں تو وصالِ محبوب سے حسبِ دلخواہ لُطف اندوز ہوا ہے۔

اَلا رُبَّ خصمٍ فیکِ اَلوی رددتُہٗ
نصیحٍ علیٰ تعذالہٖ غیرَ مؤتلِ

ترجمہ:- مَیں نے تیرے معاملے میں بہت سے جھگڑالو لوگوں کی ملامت کو برداشت کیا ہے لیکن مَیں نے اُنکی نصیحت پر کبھی عمل نہیں کیا۔

ولیلٍ کموجِ البحرِ اَرخیٰ سُدولہٗ
علیَّ بانواعِ الھمومِ لیبتلی

ترجمہ:- اور بہت سی راتوں نے جو ہولناکی اور توحش میں سمندر کی موج کے مانند تھیں مجھ پر اپنی تاریکیوں کے پردے مع طرح طرح کے غموں کے چھوڑ دیئے ہیں تاکہ میرے صبر اور استقلال کا امتحان ہو جائے۔

صَبَنْتِ الکاسَ عَنّا اُمَّ عمرٍو
وَکانَ الکاسُ مجراھا الیمینا

زمانہ جاہلیت کا عرب شاعر عمرو ابن کلثوم اپنی محبوبہ اُمّ عمرو سے شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تو نے ہمیں شراب سے محروم رکھا حالانکہ باری داہنی جانب بیٹھنے والوں کی تھی۔

نظیری نیشاپوری نے اسی مضمون کو زیادہ رنگین اور شوخ بنا دیا ہے ؎

قسمت چنیں فتاد کہ آہوان مست
دردہ ما بہ طاق نہادند جام را

گو عرب کی عشقیہ شاعری اس معاملے میں بہت وسیع واقع ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود فارسی شاعری نے اس کے اندر جو انداز اور اسلوب قائم کیا ہے عربی شاعری اس کے مقابلہ میں مرجح نہیں کہی جا سکتی۔ عربی شاعر واردات محبت کے ہر عنوان پر قلم فرسائی کرتا ہے لیکن جو جدت اور اثر انگیزی فارسی شاعری کو حاصل ہے عربی کو وہ میسر نہیں، عاشق کا محبوب کی گلیوں میں آوارہ گردی کرنا ایک عام بات ہے، لیکن فارسی شاعر اس بیان میں ایک خاص انداز پیدا کر جاتا ہے ؎

چو رفتم بر درش بسیار دربان گفت این کیں
گرفتا دست شاید کیں طرف بسیار می آید

مرض کے آثار طاری ہو چکے ہیں، دوست احباب عزیز و اقارب اس حالت کو دیکھ کر آہستہ آہستہ رو رہے ہیں، اس مایوسانہ حالت کو دیکھ کر عاشق کے دل پر ایک عجیب اندوہ فزا کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ اس کیفیت کو نہایت درد انگیز اور مؤثر طریقے سے بیان کرتا ہے ؎

ز شب ہائے دگر دارم شب غم بیشتر امشب
وصیت می کنم باشید از من باخبر امشب
مکن دوری خدا را، از سر بالینم اے ہمدم
کہ من خود را نمی یابم چو شبہائے دگر امشب
بگرد من نشان مرگ ظاہر شد کہ می بینم
رفیقاں را نہانی آستیں بر چشم تر امشب

عاشق کا دل بھی ایک تماشا گاہ کی حیثیت رکھتا ہے، ہزاروں حسرتیں اور آرزوئیں اس میں کھیلتی رہتی ہیں، کبھی اس میں بہاریہ جلوے اپنی تمام رعنائیوں اور خوشنمائیوں کے عکس فگن ہوتے ہیں اور کبھی فکر و غم کے بادل چھائے ہوتے ہیں، کسی وقت کشمکش و جنگ کی حالت طاری ہوتی ہے، اور کسی وقت صلح و آشتی کا دروازہ کھلا ہوتا ہے۔ ہر ساعت اور ہر آن مختلف قسم کی کیفیات اس کے دل میں پائی جاتی ہیں، وہ دل ہی دل میں ہزاروں مرتبہ جنگ کرتا ہے اور سینکڑوں بار صلح، اور لطف یہ ہے کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوتی ؎

صد بار جنگ کردہ باو صلح کردہ ایم
او را خبر نبودہ ز صلح و ز جنگ ما

محبوب کے ہاتھوں جو نت نئے ظلم عاشق پر ہوتے رہتے ہیں اُن کو جب حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو اُن کی ساری ذمہ داری حضرت دل پر آجاتی ہے، اگر دل قبضے میں ہو تو اس قسم کے مصائب سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ عاشق کو جب اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے تو وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اُس چیز کو جلوت کی حالت میں اپنے سے علیحدہ کر دینا چاہئے جس کے باعث یہ تمام حوادث پیش آتے رہتے ہیں ؎

خراب گشتہ ام از دست دل علاج این ست
کہ چوں برون روم او را بہ خانہ بگذارم

معذرت عالمگیر کے گزشتہ دو تین ماہ کے پرچوں میں اورینٹل کمپنی کا زر سرمایہ ۲۷ ½ کروڑ کی بجائے ۷ ½ کروڑ چھپ گیا، جو غلط ہے صحیح مقدار سرمایہ ۲۷ ½ کروڑ ہے۔ ہمیں اس غلطی پر افسوس ہے۔ ناظرین اپنے پرچوں میں صحیح رقم ۲۷ ½ کروڑ درج کر لیں۔ (مینیجر)

عہدِ وسطیٰ کی ایک المناک داستانِ عشق

"رومیو جیولیٹ"

ولیم شکسپیئر

کی

شہرۂ آفاق تمثیل، پانچ ۵ باب میں!

ترجمہ

جناب سیّد احسان علی شاہ بی ۔ اے

کردار

رومیو ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ نواب مانٹیگ کا اکلوتا بیٹا

جیولیٹ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ نواب کاپولیٹ کی اکلوتی بیٹی

پیرس ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ جیولیٹ کا منگیتر

بینوویلو ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ نواب مانٹیگ کا بھتیجا،

ٹیبولٹ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ نواب کاپولیٹ کا بھتیجا

فرائر لارنس ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ فرانسسکی کلیسا کا ایک راہب

نواب مانٹیگ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ مانٹیگ خاندان کا بزرگ

نواب کاپولیٹ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ کاپولیٹ خاندان کا بزرگ

مرکوشیو ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ بادشاہ کا عزیز اور رومیو کا عزیز دوست

—— اور ——

بیگمات —— ملازم —— سازندے
وغیرہ وغیرہ

مقام :—— اٹلی کا ایک شہر

زمانہ :—— عہدِ وسطیٰ۔ اتوار کی صبح سے لیکر جمعہ کی سحر تک

——————

جرعۂ اوّل

منظر اوّل

(پوری اسٹیج نظر آتی ہے۔ خاندان کاپولیٹ کے ملازم سیمپسن اور گریگری تلوار کشا سے مسلح داخل ہوتے ہیں۔)

سیمپسن۔ بھئی گریگری یہ کوئلوں کی دلالی ہم سے نہ ہو سکے گی۔

گریگری۔ کیسے ہو سکتی ہے اس میں ہاتھوں کے ساتھ منہ بھی تو کالا ہوتا ہے۔

سیمپسن۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر مجھے آگیا غصہ تو پھر تلوار ہی چل جائیگی۔

گریگری۔ یہ تو ہئی ہے۔ زندہ رہنا ہے تو پھر سر اٹھا کر رہنا ہے۔

سیمپسن۔ مجھے جب غصہ آجاتا ہے تو بے سوچے سمجھے جھٹ سے وار کر بیٹھتا ہوں۔

گریگری۔ لیکن یہ غصہ تمھیں جھٹ سے نہیں آتا نا؟

سیمپسن۔ مانٹیگ گھرانے کا ایک کتا مجھے مارے غصے کے سر سے لے کر پاؤں تک لرزا دیتا ہے۔

گریگری۔ لیکن لرز گئے تو ہل گئے اور بہادر اٹل چٹان کی طرح ڈٹ جاتے ہیں تم لرزے تو سمجھو کہ تم نے دُم دبا دی۔

سیمپسن۔ اس گھرانے کا کوئی کتا مجھے ڈٹ کر کھڑا ہو جانے پر مشتعل کر دیگا اور میں مانٹیگ والوں کے کسی مرد یا عورت کی دیوار تھام لونگا۔

گریگری۔ اس سے تو تمھاری بزدلی ظاہر ہوتی ہے۔ کمزور ہی دیوار کا سہارا لیا کرتا ہے۔

سیمپسن۔ سچ کہا تم نے اسی لئے تو عورتیں۔ کمزور لونڈیاں' دیواروں میں ٹھونس دی جاتی ہیں۔ میں بھی تو یہی کرونگا کہ مانٹیگ کے مردوں کو دیوار باہر دھکیل دونگا اور ان لونڈیوں کو دیواروں میں جڑ دونگا۔

گریگری۔ لڑائی ہے تو ہے ہمارے آقاؤں کے درمیان اور ہم جوان کے نوکر ہیں انھیں بھی۔

سیمپسن۔ ارے ایک ہی بات ہے بھئی۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ میں سخت سفاک ثابت ہونگا۔ مردوں کا جھگڑا چکانے کے بعد ان عورتوں پر وہ وہ ظلم توڑونگا کہ آسمان کا کلیجہ بھی ہل جائے۔ سر اڑا دونگا ان کے!

گریگری۔ تو پھر نکال لو تلوار۔ وہ مانٹیگ کے گھرانے کے دو آدمی چلے آرہے ہیں!

(ابراہام اور بلتشار آتے ہیں)

سیمپسن۔ میری تلوار تو ہر دم ننگی باہر رہتی ہے لڑو میں تمھاری پشت پر ہوں۔

گریگری۔ کیا پیٹھ دکھانے کی فکر میں ہو۔

سیمپسن۔ مجھ سے ڈرو نہیں۔

گریگری۔ ارے واہ۔ گویا ہم ڈر رہے ہیں' اور آپ سے۔

سیمپسن۔ پہلے قانون کی مدد لے لینا چاہئے۔ پہل انہی کی طرف سے ہونے دو

گریگری۔ ان کے قریب سے گذرتے وقت ذرا اکڑے تیوروں سے ان کی طرف دیکھوں گا اس کو وہ جیسا بھی چاہے سمجھ لیں۔

سیمپسن۔ اجی جی کیا بات ہے میاں؛ اگر ہمت ہوئی تو کٹ مریں گے، میں ٹھینگا دکھاتا ہوں۔ یہ توہین کیا برداشت کریں گے؟

ابرا۔ کیوں جناب! یہ ٹھینگا ہمیں دکھایا جا رہا ہے؟

سیمپسن۔ اپنا انگوٹھا چبا رہا ہوں جی۔

ابرا۔ لیکن بندہ نواز یہ دکھایا تو ہمیں ہی جا رہا ہے نا؟

سیمپسن۔ (گریگری سے علیحدگی میں) اگر ہاں کہدوں تو قانون ہمارا ساتھ دیگا

ابرا۔ اونہوں!

سیمپسن۔ اے نہیں صاحب! بھلا آپ کو کیوں دکھاتا ٹھینگا؟ یہ تو میں یونہی انگوٹھا چبا رہا ہوں۔

گریگری۔ کیوں جی آپ خواہ مخواہ کیوں الجھتے ہیں کیا لڑائی کا ارادہ ہے؟

ابرا۔ لڑائی ــــ؟ نہیں تو۔

گریگری۔ اگر ارادہ شریف ہے تو آپ کا یہ نیاز مند بھی تیار ہے۔ آپ سے کم نہیں میں کسی طرح بھی۔

ابرا۔ خیر! مجھ سے بڑھکر بھی نہیں ہیں۔

سیمپسن۔ اے جناب!

گریگری۔ (ٹیبولٹ کو دور سے آتا دیکھکر سیمپسن سے علیحدگی میں) کہدو بڑھکر ہیں۔ وہ دیکھو ہمارے آقا کے ایک عزیز آرہے ہیں۔

سیمپسن۔ ہاں ہاں بڑھکر ہیں۔

ابرا۔ بکتے ہیں آپ۔

سیمپسن۔ اگر مرد ہو تو نکالو تلوار! گریگری! اپنے اس ہولناک وار کو نہ بھولنا۔ (لڑتے ہیں)

(بینوولیو۔ گریگری اور سیمپسن کی پشت پر سے آتا ہے)

بینو۔ ہٹو! احمقو! چھوڑ دو ہتھیار! تم نہیں جانتے کہ تم کیا کر رہے ہو

(تلواریں گرادیتا ہے۔ ٹیبولٹ ابراہام اور بلتسار کی طرف سے لپک کر آتا ہے)

ٹیبولٹ۔ کیا ان نامرد کتوں میں تم تلواریں نکالے ہو۔ بینوولیو! ——ہوشیار! تمہاری موت تمہیں للکار رہی ہے۔

بینوولیو۔ میں امن کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔ اپنی تلوار میان میں رکھو یا اسے ان لوگوں کو ہٹانے میں استعمال کرو۔

ٹیبولٹ۔ کیا خوب! بغل میں چھری اور منہ میں رام رام۔ ہاتھ میں تلوار ننگی اور منہ میں امن وامان کی تلقین۔ مجھے اس لفظ سے سخت نفرت ہے۔ اتنی ہی جتنی جہنم سے۔ مانٹیگ سے اور تمہاری صورت سے ہے وار بچا —— بزدل!

(لڑتے ہیں۔ دونوں گھرانوں کے بہت سے آدمی آتے ہیں اور لڑائی میں شامل ہو جاتے ہیں پھر شہری اور شہر کے سنتری لاٹھیاں لئے ہوئے آتے ہیں)

کپتان۔ لاٹھیاں مارو۔ چاقو چلاؤ۔ کلہاڑوں سے وار کرو۔ مار دو۔ گرا دو ان کاپولیٹ والوں کو۔ کچل ڈالو ان مانٹیگ والوں کو۔

(بوڑھا کاپولیٹ اور اس کی بیگم آتے ہیں)

کاپلو۔ کیا ہڑ بونگ مچا رکھا ہے یہ۔ لاؤ میری وہ لمبی والی تلوار۔

بیگم کاپلو۔ ہائے نوج! یہ تلوار کیوں منگائی جا رہی ہے۔

کاپلو۔ میں کہتا ہوں میری تلوار لاؤ۔ وہ دیکھو وہ کھوسٹ مانٹیگ آ گیا ہے اور میرے سامنے تلوار گھمانے کی جرأت کر رہا ہے۔

(مانٹیگ اور بیگم مانٹیگ داخل ہوتے ہیں)

مانٹیگ۔ بدمعاش کاپولیٹ! (بیوی سے) مت پکڑو —— چھوڑ دو مجھے۔

بیگم۔ میں تو ایک قدم نہ بڑھنے دوں گی تمہیں دشمن کی طرف۔

(نواب اپنے حواریوں سمیت آتا ہے)

نواب۔ بغاوت پیشہ رعیت! امن وامان کے دشمنو! اپنے پڑوسیوں کے خون سے داغدار کی ہوئی تلواروں پر اترانے والے احمقو! کیا نہیں سنو گے؟ اپنے تاریک غصے کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو اپنی نسوں سے اچھلنے والے احمریں فوارے سے بجھانے والے جنگلی درندو! تم آدمی نہیں ہو۔ خون کی غلاظتوں میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں سے ان بدکردار تلواروں کو پھینک دو اور اپنے غضبناک بادشاہ کا حکم سنو۔ ورنہ یاد رکھو کہ تمہیں ہولناک اذیت کے کولھو میں روند دیا جائے گا۔ بوڑھے کاپولیٹ اور مانٹیگ تمہارے خاندان کے نام نہاد الفاظ نے تین دفعہ فساد برپا کیا ہے۔ تین دفعہ ہمارے بازاروں کی پرسکون فضا میں تہلکہ ڈالا ہے اور ویرونہ کے دیرینہ شہریوں کو جو ہمیشہ متانت کے زیور سے آراستہ رہے ہیں مجبور کر دیا ہے کہ وہ پرانی فرقہ پرستیوں کو ان کے زنگ سے مرجھائے ہوئے ہاتھوں میں لے کر تمہاری تباہ کن سازشوں کا ساتھ دیں۔ یاد رکھو اگر اس کے بعد پھر کبھی ہمارے بازار میں یہ اندھیر مچایا گیا تو تم دونوں کی زندگی کو اس حرکت کا جوابدہ ہونا پڑیگا۔ کاپولیٹ تم ہمارے ساتھ چلو اور مانٹیگ تم آج دوپہر کے وقت پرانے فری ٹاؤن میں جو ہمارا دربار عام ہے حاضر ہو کر اس معاملے میں ہمارے ارشادات سے اطلاع پاؤ۔ باقی سب لوگ ہماری آنکھوں سے دور ہو جائیں ہم دوبارہ حکم فرماتے ہیں کہ سب منتشر ہو جائیں ورنہ موت اپنا فرض ادا کرنے پہ مجبور ہو جائیگی۔

(مانٹیگ، بیگم مانٹیگ اور بینوولیو کے سوا سب رخصت ہو جاتے ہیں)

مانٹیگ۔ کس کے تنفس نے ان دبی ہوئی چنگاریوں کو شعلوں میں بدل دیا تھا۔ بھتیجے تم کہو؟ تم موجود تھے جب یہ شروع ہوئی۔

بینوولیو۔ میرے آنے سے پہلے آپ کے اور آپ کے دشمن کے ملازم آپس میں دست وگریبان ہو چکے تھے۔ میں نے ان کے ہٹانے کے لئے تلوار کھینچ لی۔ اس اثنا میں وہ شعلہ خو ٹیبولٹ میری سماعت میں بدکلامی کا زہر ٹپکاتا اور ننگی تلوار سے ہوا کو کاٹتا ہوا آ گیا۔ گو اس کی تلوار کسی کو نقصان نہیں پہنچا رہی تھی تاہم اپنی سرسراتی ہوئی زبان میں اسے سن طعن کر رہی تھی۔ ہم لڑتے رہے اور ادھر ادھر سے اور لوگ آ آ کر شامل ہوتے رہے یہاں تک کہ بادشاہ سلامت نے یہ جھگڑا مٹایا۔

بیگم مانٹیگ۔ رومیو کہاں ہے؟ تم نے آج اسے کہیں دیکھا تھا مجھے بڑی خوشی ہے کہ وہ اس جھگڑے میں شریک نہیں تھا۔

بینوولیو۔ مشرق کی سنہری کھڑکی میں سے سورج دیوتا کے جھانکنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا کہ میری ذہنی بےچینی نے مجھے باہر نکل جانے پر مجبور کر دیا اس وقت میں نے آپ کے فرزند ارجمند کو شہر کے مشرقی حصے میں پھیلی ہوئی سرسبز جھاڑیوں کے سائے میں ٹہلتا ہوا دیکھا۔ لیکن اسے بھی میری موجودگی کا علم ہو گیا اور وہ مجھ سے آنکھ بچا کر جنگل میں چلا گیا۔ اس وقت میری اپنی ذات دا... بھی میری تنہائیوں کو ایک ہڑ مچاتے ہوئے گروہ کی طرح بادل

رہی روندرہی تھی اور میں کسی ایسے گنج کی تلاش میں تھا جہاں اور کوئی نہ ہو اس لئے میں نے اس کے جذبات کو بھی اپنے احساسات کے پیمانے سے ناپا اور انتہائی مسرت کے ساتھ اس کا خیال چھوڑ دیا جو مجھ سے دامن چھڑا کر جانا چاہتا تھا۔

مانٹیگ۔ کئی دفعہ اسے صبح کے وقت اپنے آنسوؤں سے عطرناک شبنم کو مضطرب اور اپنی آہوں سے بادلوں کے حجم میں اضافہ کرتے سنا گیا ہے لیکن جونہی کائنات پر مسرت چھڑکنے والا سورج دور افق میں ربۂ شفق کی خوابگاہ پر سے پردے ہٹاتا ہے میرا غم نصیب بیٹا روشنی سے ڈر کر اپنے کمرے میں واپس آجاتا ہے۔ کھڑکیاں بند کر لیتا ہے۔ سورج کی روشنی اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے اور ایک مصنوعی رات بنا کر اپنے کمرے کی تنگ تنہائیوں میں کھو جاتا ہے۔ اگر اس علت کو نیک مشورے سے رفع کرنے کی کوشش نہ کی جائیگی تو طبیعت کا یہ رجحان انتہائی تاریک اور ہولناک نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

بینوولیو۔ عم محترم! آپ جانتے ہیں کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟

مانٹیگ۔ میں نہ تو جانتا ہوں اور نہ میں اس سے کچھ معلوم کر سکا ہوں۔

بینوولیو۔ لیکن آپ نے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ بھی اختیار فرمایا۔

مانٹیگ۔ میں نے اور دوسرے دوستوں نے لاکھ سر پٹکا لیکن وہ اپنی خواہشات کا آپ ہی ناصح ہے اور اس غنچے کی طرح جو اپنی پتیوں میں لپٹے ہوئے خراماں کو ہوا میں لٹا دینے اور اپنے حسن کی ساری کائنات کو مہر عالمتاب کی نذر کر دینے سے پہلے اندر ہی اندر کسی کو مطلع کئے بغیر کسی ظالم کیڑے کے تیز دانتوں کو برداشت کرتا رہتا ہے رومیو میری بصارت اور میری سماعت سے اپنے راز کی حفاظت کر رہا ہے۔ اگر میں اس کے اس رنج و غم کی اصل وجہ جان سکتا تو انتہائی تن دہی کے ساتھ اس کا علاج بھی ڈھونڈتا۔

(رومیو آتا ہے)

بینولٹ۔ وہ دیکھئے وہ آ رہا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر ایک طرف کو ہٹ جائیے تاکہ میں اس رنج و غم کی وجہ معلوم کر سکوں ورنہ مجھے انکار سے واسطہ پڑے گا۔

مانٹیگ۔ میری دعا ہے کہ تمہاری خوش نصیبی تمہیں اعتراف حقیقت سمجھنے کا موقع دے۔ بیگم چلو چلیں۔

(مانٹیگ اور بیگم مانٹیگ جاتے ہیں)

بینوولیو۔ سحر بخیر بھائی صاحب!

رومیو۔ کیا دن کی جوانی ابھی ڈھلی نہیں؟

بینوولیو۔ ابھی ابھی نو بجے ہیں۔

رومیو۔ اُف نصیب میرے! یہ غم کی گھڑیاں کتنی لمبی ہوتی ہیں، اچھا وہ جو تیزی سے اُدھر کو سرک گئے تھے والد محترم ہی تھے نا؟

بینولٹ۔ ہاں وہی! ــــ لیکن وہ کیا رنج ہے جس نے رومیو کی گھڑیوں کو قیامت کی طوالت دے دی ہے؟

رومیو۔ اس نعمت کا فقدان جس کی بدولت وقت اپنی طبعی رفتار بھی کھو بیٹھتا ہے۔

بینوولیو۔ محبت؟

رومیو۔ نہیں محبوب کی نظر عنایت حاصل نہیں ہوئی۔

بینوولیو۔ ہائے وہ محبت جو بادی النظر میں انتہائی نظر فریب ہے تجربے کی کسوٹی پر آ کر کس قیامت کی ظالم ہو جاتی ہے۔

رومیو۔ افسوس تو یہ ہے کہ اندھا عشق آنکھوں کے بغیر بھی اپنے ارادوں کا رستہ تلاش کر لیتا ہے۔ کہاں کھانا کھائیں! ارے باپ ــــ یہ کیا کھینچا تانی ہوئی ہے یہاں ــــ لیکن خیر رہنے دو۔ میں نے سب کچھ سن لیا ہے نفرت کی بھی ضرورت ہے لیکن محبت کی ضرورت تو اشد ہے تو پھر کیوں اسے محبت کے جنگجو دیوتا! اے محبت سے بھری ہوئی پیاری نفرت! اے وہ دولت جس کی تخلیق کسی سے قبل ازیں نہیں ہوئی! اے غمگین مسرت۔ اے متین اوچھا پن ــــ اے نظر نواز صورتوں کے مسخ شدہ اجتماع۔ سیسے کی طرح بھاری پر! پُر انوار دھواں۔ ٹھنڈی آگ! بیمار صحت، ہمیشہ بیدار رہنے والی نیند! جو وہ نہیں ہے جو کچھ کہ ہے! میں اس محبت کے طوفان میں گھر گیا ہوں جو اپنے اندر لطیف احساس کا شائبہ نہیں رکھتی ــــ کیا آپ ہنستے نہیں؟

بینوولیو۔ نہیں بھیا! مجھے تو رونا آ رہا ہے۔

رومیو۔ اف میرے اللہ! کس بات پر؟

بینوولیو۔ تمہارے غم سے لدے ہوئے پاکباز دل پر۔

رومیو۔ ہاں محبت سے انحراف یونہی ہوتا ہے۔ میرے غم پہلے ہی میرے سینے پر بھاری پتھر کی طرح پڑے ہوئے ہیں اور تم اپنے غم کو نشر کر کے اس میں اور اضافہ کیا چاہتے ہو۔ جس محبت

کا اظہار تم نے کیا ہے اس نے میرے غم کو کہیں زیادہ کر دیا ہے عشق ایک دھواں ہے جو آہوں کے غبار سے بنتا ہے۔ یہی دھواں صاف ہونے کے بعد محبت کرنے والوں کی آنکھوں میں شعلوں کی طرح رقص کرتا ہے اور یہی مکدّر ہو کر ایک سمندر بن جاتا ہے۔ جو عاشقوں کے آنسوؤں سے صورت پذیر ہوتا ہے اس کے سوا اور کیا ہے؟ ایک جنون ہے محتاط۔ ایک درد ہے ہولناک ایک سکون ہے زندگی بخش!—— خدا حافظ عزیز بھائی!

بینوویلو —— ٹھہرو! میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ اور اگر تم نے مجھے یونہی چھوڑ دیا تو میرے ساتھ سخت بے انصافی ہوگی۔

رومیو۔ چچ! میں اپنے آپ کو کھو چکا ہوں۔ میں یہاں نہیں ہوں، ۔ رومیو نہیں ہے۔ وہ تو کہیں اور بھٹک رہا ہوگا۔

بینوویلو —— مجھے نہایت سنجیدگی سے بتاؤ کہ تم کسے دل دے بیٹھے ہو؟

رومیو۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بتاؤں؟

بینوویلو —— آنسو! وہ کس لئے؟ لیکن بھئی سچ سچ بتاؤ۔

رومیو۔ کیا کبھی بیمار نے سچے دل سے وصیت کی ہے۔ ایک بیمار کے لئے تو یہ لفظ ہی اس کی زندگی پر مُہر ثبت کر دیتا ہے لیکن بھائی میں تمھیں سنجیدگی سے کہتا ہوں کہ میں ایک عورت سے محبت کرتا ہوں۔

بینوویلو —— میرا قیاس بھی یہی تھا کہ تم محبت کرتے ہو میرا نشانہ تقریباً ٹھیک بیٹھا۔

رومیو۔ آپ بڑے اچھے نشانہ باز ہیں۔ اور یہ بھی بتا دوں کہ جس سے میں محبت کرتا ہوں وہ بہت خوبصورت ہے۔

بینوویلو —— میرے بھائی! خوبصورت نشانے پر تیر بڑی جلدی بیٹھتا ہے۔

رومیو۔ لیکن بھیّا تم یہاں چوک گئے۔ عصمت کی دیوی اس کی صلاح کار ہے اس لئے خدائے عشق کے تیر وہاں کام نہیں کرتے عصمت کے مضبوط ہتھیاروں سے وہ ایسی مسلح ہے کہ محبت کی بچوں ایسی بودی کمان اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی۔ وہ محبت بھرے الفاظ کی یورش سے نہیں گھبراتی نہ ہی گھورنے والی آنکھوں سے جھجکتی ہے اور نہ ہی فرشتوں کو شیطان بنا دینے والی دولت کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھلتی ہیں۔ آہ اس پر حسن کی دولت کا حسن برستا ہے لیکن ایک کمی باقی ہے اور وہ یہ کہ جب وہ آخری نیند سو جائے گی تو اس کی دولت کے ساتھ اس کا خزانہ بھی ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جائے گا۔

بینوویلو —— تو پھر یہ مطلب ہوا کہ اس نے تمام عمر کنواری رہنے کی سوگند کھا رکھی ہے۔

رومیو۔ ہاں اسی کنجوسی کی وجہ سے اسے بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑیگا۔ کیونکہ حسن پر جتنا بھی جبر کیا جائے وہ اتنا ہی اپنی نشوونما کا بیری ہو جاتا ہے۔ وہ بہت حسین ہے۔ بہت فہیم ہے۔ وہ اپنی مایوسیوں میں اپنی مسرت ڈھونڈتی ہے اس نے محبت سے بچ کر رہنے کی قسم کھا رکھی ہے اور میں جو اس راز کو کھول دینے کے لئے ابھی زندہ ہوں اسی قسم کے زہریلے اثرات سے موت کی طرف لپکا جا رہا ہوں۔

بینوویلو —— میری مانو اور اس کا خیال چھوڑ دو۔

رومیو۔ تو مجھے بتاؤ کہ میں کس طرح اسے بھول جاؤں؟

بینوویلو —— اپنی آنکھوں کو آزادی دو اور دوسری حسین صورتیں دیکھو۔

رومیو۔ لیکن یہ تو اس بے مثال کی یاد کو تازہ کر دینے کا ایک ذریعہ ہوگا۔ یہ حسین نقاب جو خواتین کی پیشانی کو چومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اپنے کالے ہونے ہی کی وجہ سے اس حسن کا راز افشا کر دیتے ہیں جو ان کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ وہ جو بجلی کی لپٹ میں آکر اندھا ہو چکا ہو اپنی بصارت کے گمشدہ خزانے کو کس طرح بھول جائے۔ مجھے کوئی ایسی محبوبہ دکھاؤ جو غیر معمولی طور پر حسین ہو اور یقین رکھو یہ حسینہ محض ایک تقریظ ہوگی جس سے یہی معلوم ہو سکے گا کہ اس بے مثال سے بڑھ چڑھ کر ایک اور بھی ہے۔ خدا حافظ بھیّا! تم مجھے بھلا دینے کا راستہ نہیں دکھا سکتے۔

بینوویلو —— میں یہ دکھا کر رہوں گا۔ نہیں تو مرتے دم تک میرے سر پہ تمھارا قرض رہا۔

دوسرا منظر

(وہی پس منظر ہے۔ کاپولیٹ۔ پیرس اور مسخرہ (ملازم) آتے ہیں)

کاپولیٹ۔ لیکن مانٹیگ پر بھی مجھ ایسا جرم ہی عاید کیا گیا ہے اور اس کی سزا بھی کم نہیں۔ میرے خیال میں ہم دونوں ایسے عمر رسیدہ آدمیوں کے لئے خاموشی کی زندگی بسر کرنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہے۔

پیرس۔ آپ دونوں ماشاءاللہ باعزت شرفا ہیں اور بڑے

تعجب کی بات ہے کہ آپ ہی تمام عمر ایسی فضول بات میں الجھے رہے لیکن خیر محترمی! اپنی گذارش کے متعلق آپ کا ارشاد سننے کا متمنی ہوں۔

کاپولیٹ۔ مجھے تو وہی بات دہرانا ہے جو پہلے کر چکا ہوں۔ میری بچی ابھی اس دنیا کے نشیب و فراز سے بیگانہ ہے ابھی تو زمانے نے اس کے سامنے اپنی چودہ گرمیاں بھی پوری نہیں کیں اس کے شادی کے قابل ہونے سے پہلے دو اور بہاروں کا غرور ٹوٹنا لازمی ہے۔

پیرس۔ لیکن اس سے کم عمر لڑکیاں مسرور مائیں بن چکی ہیں۔

کاپولیٹ۔ جو جلدی بنتے ہیں وہ جلدی بگڑ بھی جایا کرتے ہیں۔ یہ زمین میری ساری امیدوں کو نگل چکی ہے اور یہی ایک راز ہے جس کے ساتھ ہمارے تمام خاندان کی امیدیں وابستہ ہیں۔ لیکن خیر عزیزی پیرس! تم کوشش کرو اس کے دل کو اپنے قابو میں کرو میری اجازت اسی کی ہاں کا ایک جزو ہے اگر اس نے قبول کر لیا تو اسی کے انتخاب کے لئے میری اجازت اور میری دعائیں وقف ہونگی۔ آج کی رات میں نے ایک دعوت کا انتظام کیا ہے اور اپنے محبوب دوستوں کو اس میں مدعو کیا ہے۔ تمہارا خیر مقدم کرنے سے میرے مہمانوں کی باعزت تعداد میں عزت افروز اضافہ ہوگا آج کی رات غریب خانے پر زمین کو روندنے والے ان ستاروں کو دیکھنا جن کے جمال جہانتاب سے آسمان کی تاریکیاں دھل جاتی ہیں جذبات پرست نوجوان لڑکھڑاتی ہوئی سردیوں کے نقوش پا کو خوش پوش بہار کے پاؤں تلے مٹتا ہوا دیکھنے میں جو لطف اٹھاتے ہیں وہی آج کی رات میرے مکان پر نسائیت کی بند کلیوں کے درمیان تمہیں حاصل ہوگا۔ سب کی سنو اور ہر ایک کو دیکھو اور پھر جو ان میں بہتر ہو اسی کیلئے اپنے بہترین جذبات وقف کر دو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ حسینوں کے اس جھرمٹ میں شامل ہونے کے باوجود میری بچی اپنی مثال آپ ہی ہوگی آؤ میرے ساتھ (ملازم کو کاغذ کا پرزہ دیتے ہوئے) تو بھئی تم جاؤ۔ حسین ویرونہ کی گلیوں کو کھنگال ڈالو اور جن لوگوں کے نام اس کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں انھیں ڈھونڈ کر میری طرف سے کہنا کہ غریب خانہ ان کے استقبال سے اپنی عزت چاہتا ہے۔

(کاپولیٹ اور پیرس جاتے ہیں)

ملازم (مسخرہ) ان کو ڈھونڈوں جن کے نام یہاں لکھے ہیں۔ یہ لکھا ہے کہ موچی کو اپنے دھاگے سے درزی کو اپنے فیتے سے، مچھیرے کو اپنے جال سے اور تصویر بنانے والے کو اپنی پنسل سے کام رکھنا چاہیئے لیکن مجھے تو ان لوگوں کے ڈھونڈنے کے لئے بھیجا گیا ہے جن کے نام یہاں لکھے ہیں اور میں اس بات کو آخر دم تک نہیں ڈھونڈ سکتا جو لکھنے والے نے لکھی ہے۔ کسی پڑھے لکھے کے پاس جاؤں (بینو ولیو اور رومیو کو آتا دیکھ کر) خوب آئے صاحب!

(بینو ولیو اور رومیو آتے ہیں)

بینو ولیو۔ کیا کرتے ہو بھیا ارے ایک آگ دوسری آگ کی جلن کو مٹا دیتی ہے دوسرے کے درد و کرب سے اپنی تکلیف گھٹ جاتی ہے چکراتے ہوئے سر کا علاج الٹے پاؤں چلنا ہی ہے ایک مایوس کن رنج دوسرے صدمے سے مٹ جاتا ہے آنکھوں میں گھلی ہوئی زہر کے مٹانے کا طریقہ یہی ہے کہ انھیں کسی دوسری بیماری میں مبتلا کر دیا جائے۔

رومیو۔ رونے والی بیل کے پتے اس کے لئے بہترین ہیں۔

بینو ولیو۔ ہائیں ــــ کس کے لئے؟

رومیو۔ تمہاری زخمی پنڈلی کے لئے۔

بینو ولیو۔ کیا رومیو تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟

رومیو۔ پاگل تو نہیں ہوں، مگر پاگلوں سے زیادہ کس کر باندھا گیا ہوں ٹھونس دیا گیا ہوں قید میں اور میرا دانہ پانی بند کر دیا گیا ہے میری ننگی پیٹھ پر کوڑے برسائے جاتے ہیں اور مجھے ایک خوفناک اذیت کے جہنم میں جھونکا جا رہا ہے۔ اف میرے اللہ!

ملازم۔ اے میرے اللہ! آپ پڑھ سکتے ہیں؟

رومیو۔ ہاں مایوسیوں میں لکھے ہوئے اپنی بدنصیبی کے جلی فرمان کو۔

ملازم۔ یہ تو آپ نے بغیر کوئی کتاب دیکھے ہی سیکھ لیا ہوگا۔ لیکن میرا مطلب ہے کہ آپ کے سامنے اگر کوئی چیز کھی ہوئی ہو تو پڑھ لینگے؟

رومیو۔ ہاں اگر اس کی زبان جانتا ہوں تو۔

ملازم۔ سچ کہتے ہیں آپ! اچھا جی مجھے معاف کرو (جانے کو مڑتا ہے)

رومیو۔ ارے میاں ٹھہرو! ہم پڑھنا جانتے ہیں (پڑھتا ہے) جناب مارٹینو مع اہلیہ و دختر نیک اختر۔ نواب انسلم اور ان کی زہرہ جبیں بیٹی۔ محترمہ بیوہ وٹریو۔ جناب پلیسنیو شیو اور ان کی حسین بھتیجیاں۔ جناب مرکوشیو اور ان کے برادر عزیز جناب ویلنٹائن۔ عم محترم کاپولیٹ ان کی زوجہ محترمہ اور ان کی دختران۔ میری اپنی عزیز بھتیجی اوسیلائن۔ لویا، جناب ویلنشو

...ان کا بھتیجا ٹیبلٹ۔ لوسیو اور فرخندہ جبین ہیلینا —— بڑے بڑے لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں کہاں جائینگے یہ سب؟

ملازم۔ وہاں ——!

رومیو۔ وہاں کہاں ——؟

ملازم۔ ہمارے یہاں دعوت میں۔

رومیو۔ کس کے یہاں۔؟

ملازم۔ اجی ہمارے آقا کے یہاں!

رومیو۔ ٹھیک ہے۔ یہ بات تو مجھے پہلے پوچھنا چاہئیے تھی۔

نوکر۔ میں بغیر پوچھے ہی بتا دیتا ہوں۔ آپکو۔ ہمارے آقا وہ امیر کبیر کاپولیٹ ہیں اور جو آپ مانٹیگ گھرانے سے نا ہیں ہیں تو آپ بھی ایک آدھ گلاس سنڈھانے چلے آئیے گا۔ باقی مجھے کرو بھائی تسلیم

بینوویلو۔ کاپولیٹ کے یہاں اس دعوت میں وہ حسین روسیلائن جس پر تم اس بُری طرح سے فدا ہو ویرونہ کی حسین ترین تیتریوں کے ساتھ شامل ہوگی۔ تم بھی وہاں جاؤ اور غیر متعصب آنکھوں کے ساتھ اس کے چہرے کا موازنہ دوسری لڑکیوں سے کرو جو میں تمھیں دکھاؤنگا یقین جانو تم اپنی رجاجہ طائر کو کوا سمجھنے پر مجبور ہوگے۔

رومیو۔ جب میری آنکھوں کا ایمان مستحکم اس سفید جھوٹ پر یقین لے آئیگا اس وقت میرے آنسو شعلے بن جائینگے اور یہ ہمیشہ ڈوبے رہنے کے باوجود زندہ رہنے والی خطرناک حد تک کافر آنکھیں جھوٹ بکنے کی وجہ سے جلاکر راکھ کردی جائینگی۔ میری روح کی معبود سے زیادہ حسین۔ اونہہ! سورج کی سب کچھ دیکھنے والی آنکھ نے ابتدائے آفرینش سے لیکر آج تک اس کا ثانی نہیں دیکھا!

بینوویلو۔ چھی چھی! تم نے اس حسن کو اس وقت دیکھا جب اس کا مقابلہ اور کسی سے نہیں تھا۔ اور وہ یکہ وتنہا دونوں آنکھوں میں ترازو ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن وہاں اپنی محبت کے مرکز کو اس لڑکی کے شفاف پیلنے سے ناپنا جو میں تمھیں دکھاؤنگا۔ پھر تم دیکھوگے کہ کس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوتا ہے۔ جو آج بہترین معلوم ہوتی ہے وہ لفظ "اچھی" کے قابل بھی نہ رہے گی۔

رومیو۔ میں جاؤنگا لیکن یہ منظر دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ اس کی جیت دیکھنے کے لئے جو میری اپنی ہے۔

تیسرا منظر

(نصف اسٹیج۔ کاپولیٹ کے گھر کا ایک کمرہ۔ لیڈی کاپولیٹ آتی ہے اس کے پیچھے پیچھے آیا بھی آرہی ہے)

بیگم کاپولیٹ۔ آیا! بچی کہاں ہے اسے میرے پاس بلاؤ۔

آیا۔ میں نے اسے کہہ تو دیا تھا۔ بچی کاہے کی میمنا ہے۔ چڑیا کی طرح پھدکتی پھرتی ہے۔ ہٹی ہے اری یہ لڑکی کہاں گیا۔ اے جیولیٹ،

(جیولیٹ آتی ہے)

جیولیٹ۔ کون ——؟ کون بلاتا ہے ہیں؟

آیا۔ امی تمھاری۔

جیولیٹ۔ لیجئے امی جان! آگئی میں۔ کہئے کیا حکم ہے!

بیگم کاپولیٹ۔ بات یہ ہے کہ —— آیا! ابھی تم ذرا باہر چلی جاؤ ہمیں تخلیئے میں بات کرنا ہے۔ مگر آیا ادھر آؤ مجھے یاد ہے کہ تم نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ تم تو جانتی ہوگی میری رانی اب اللہ رکھے جوان ہوگئی ہے۔

آیا۔ اپنی قسم! میں تو اس کی عمر کے گھنٹے تک جانتی ہوں۔

بیگم کاپولیٹ۔ ابھی چودہ برس کی پوری تو نہیں ہوئی۔ چشم بددور۔

آیا۔ نہیں تو، ابھی چودہ سال کی نہیں ہوئی بیساکھی میں کتنے دن اور ہیں؟

بیگم کاپولیٹ۔ دو ہفتہ اور کچھ دو چار دن۔

آیا۔ دو چار ہوں یا تین پانچ جو کچھ بھی ہو بیساکھی کی شام کو چودہ برس کی ہوجائیں گی۔ سوسان اور یہ —— خداوند ہر عیسائی کو اپنی پناہ میں جگہ دیں، بالکل ہم عمر تھیں۔ سوسان تو اب خداوند کے پاس ہے۔ میں اس کے قابل ہی نہیں تھی۔ خیر جو کچھ بھی ہو۔ میں نے ابھی ابھی کہا نہ کہ بیساکھی کی رات کو یہ پورے چودہ برس کی ہوجائیں گی۔ مجھے خوب یاد ہے بھونچال کو آئے گیارہ سال گزر چکے اس زمانے میں یہ پاؤں پاؤں چلنے لگی تھیں۔ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ دن کبھی نہیں بھولے گا مجھے۔ میرے آقا اور آپ اس زمانے میں مانچوا میں تھے —— جی میری کھوپری میں بھیجا ہے۔ کوئی مذاق نہیں۔ میں نے ابھی ابھی کہا نہ کہ اس بات کو گیارہ برس بیت گئے اس وقت یہ اپنے پاؤں کھڑی ہوسکتی تھیں۔ نہیں نہیں قسم ہے صلیب کی! اس وقت تو یہ خوب بھاگا کرتی تھیں اور ادھر ادھر گھوما کرتی تھیں۔ اس دن سے ایک دن پہلے ان کے ماتھے پر، چوٹ آگئی۔ اور میرے میاں نے اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت دے —— بہت خوب آدمی تھے بچی کو گود میں اٹھا لیا اور "اوہ"۔ وہ بولے۔ "تم منہ کے بل گری ہو؟ جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو پیٹھ کے بل گرا کروگی۔ ہے نہیں جیول؟" اور قسم سے کہتی ہوں ہوئی

یہ سن کر اس گڑیا نے جھٹ سے رونا بند کر دیا۔ اور بولی "آں" دیکھا آپ نے کیسا اچھا مذاق تھا۔ میری عمر خواہ ہزار برس کی کیوں نہ ہو میں آخر دم تک یہ بات نہیں بھول سکتی۔ "نہیں بھول!" وہ بولے اور یہ ننھی کو دن جھٹ سے چپ ہو گئی۔ اور بولی "آں"

بیگم کاپولیٹ بس بس حد ہو گئی۔ بھئی ہاتھ جوڑتی ہوں اب تو دم لو۔

آیا ۔ سچ کہا بیگم! لیکن میں ہنسنے کے سوا اور کروں بھی تو کیا؟ دیکھئے تو رونا چھوڑ دیا اور بولی "آں" اور میں قسم سے کہتی ہوں آپ سے کہ اس کے ماتھے پر مرغی کے انڈے جتنا گومڑا ابھر آیا تھا بڑی ظالم چوٹ آئی تھی اور رو رو کے تو گھائل ہوئی جاتی تھی۔ "اوہ" میاں نے کہا: منہ کے بل گر پڑیں۔ جب بڑی ہو گی تو پیٹھ کے بل گرو گی، نہیں جیول" اور یہ جھٹ سے چپ ہو گئی اور بولی "آں"

جیولیٹ ۔ اور تم بھی خدارا چپ ہو جاؤ آیا میں منت کرتی ہوں۔

آیا ۔ میں کہہ چکی خداوند تمہیں خوش رکھیں۔ تم ان سب بچوں میں سے خوبصورت تھیں جنہیں میں نے دودھ پلایا ہے اور میری دعا یہی ہے کہ میں تمہیں دلہن بنتا دیکھوں۔

بیگم ۔ دلہن! ہاں شادی ہی کی بات میں کرنا چاہتی تھی، بیٹا جیولیٹ تم بتاؤ شادی کے متعلق تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟

جیولیٹ ۔ یہ ایک ایسی عزت ہے جس کو میں خواب میں بھی حاصل نہیں کر سکتی۔

آیا ۔ عزت! دودھ تو تم نے میرے سوا اور کسی کا نہیں پیا۔ قربان جاؤں ان چھاتیوں سے عقل پی تھی یا دودھ؟

بیگم ۔ خیر تو اب شادی کے متعلق سوچ بچار کر و بیٹا۔ یہاں ویرونہ میں تم سے کہیں چھوٹی عمر کی لڑکیاں مدت ہوئی کہ مائیں بن چکی ہیں میرے حساب سے میں تم سے کہیں چھوٹی تھی جب تم میرے یہاں پیدا ہوئی ہو اور تم ابھی تک ناکتخدا ہی ہو۔ بہادر پیرس تمہاری محبت کا طلبگار ہے۔

آیا ۔ ایک مکمل انسان کمسن خاتون! ۔۔۔ خاتون کیا انسان ہے! ساری دنیا! ۔۔۔ کیوں وہ تو موم سے بنایا گیا ہے۔

بیگم ۔ ویرونہ کی بہار نے ایسا پھول کبھی نہیں دیکھا تھا۔

آیا ۔ کیا کہا ہے ۔۔۔ وہ پھول ہے۔ اپنے سر کی قسم سچ مچ پھول۔

بیگم کاپولیٹ ۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ تم اس سے محبت بڑھانا پسند کرو گی؟ آج کی رات تم اسے اپنے یہاں دعوت میں دیکھو گی۔ ہر شادی شدہ جوڑے کو بنظر غایر دیکھو تمہیں نظر آ جائے گا کہ کس طرح ایک دوسرے کی تسکین کا سامان فراہم ہوتا ہے نوجوان پیرس کے صحیفۂ رخ کا مطالعہ ذرا غور سے کرو تو تم دیکھو گی کہ خود حسن کے قلم نے اس کے چہرے پر شادمانی مرتسم کر رکھی ہے اور جو خفیہ معانی اس حسین کتاب میں نظر نہیں آئیں گے ان کی وضاحت آنکھوں کے حاشیے سے ہو جائیگی۔ بے پناہ محبت کرنے والا یہ دل محبت کی یہ نادر کتاب اپنے حسن میں اضافہ کرنے کے لئے ایک حسین گرد پوش کی تلاش میں ہے آنکھوں سے نظر آنے والی حسین چیز اپنے پردوں میں بھی ویسی ہی نظر فریب صورت چھپانے پر فخر کیا کرتی ہے اسی لئے مچھلی سمندر میں رہتی ہے۔ وہ کتاب جو اپنی مطلا جلد بندی میں ایک سنہری رومان چھپائے ہوئے ہو ہزاروں آنکھوں سے ہدیۂ تحسین وصول کرتی ہے تم بھی اپنی وسعت کو کم کئے بغیر اسے حاصل کر کے اس کی ہر چیز پر متصرف ہو سکو گی مختصراً کہو۔ کیا تم پیرس سے محبت کرنا پسند کرو گی؟

جیولیٹ ۔ اگر محض دیکھنا جذبات محبت کو بیدار کر سکتا ہے تو میں بھی انہیں پسند کرنے کی نظروں سے دیکھونگی۔ لیکن میں اپنی نگاہوں کو اسی شدت سے نفوذ دینے دونگی جس کی اجازت آپ مرحمت فرمائیں گی

(ایک ملازم "سحرہ" آتا ہے)

ملازم ۔ بی بی جی! مہمان آ گئے۔ کھانا چن دیا گیا۔ آپ کو یاد کیا جا رہا ہے چھوٹی بی بی کی ڈھنڈیا پڑی ہے اور آیا پر باورچی خانے میں تبرا کہا جا رہا ہے۔ گویا ہر بات میں کمال ہو رہا ہے۔ میں آپ کی انتظار میں ہوں اور آپ جلدی چلئے۔

بیگم کاپولیٹ ۔ ہم تمہارے پیچھے پیچھے آتے ہیں (ملازم جاتا ہے) جیولیٹ! نواب آ گئے!

آیا ۔ جاؤ بیٹا! تمہاری مسرت پاش راتوں سے مسکراتے ہوئے دن طلوع کریں۔ (جاتے ہیں)

چوتھا منظر:

(کاپولیٹ کے گھر کی سامنے والی سڑک۔ نصف اسٹیج، اسٹیج کے بیرونی حصے کے قریب رومیو۔ مرکوشیو، بینوولیو پانچ چھ رقاصوں اور مشعلچیوں کے ساتھ آتا ہے۔ رومیو زایر کے لباس میں ہے)

رومیو ۔ کیا اپنی برّیت کے لئے یہ تقریر کی جائے؟ یا کسی عذر خواہی کے بغیر سیدھے اندر پہنچ جائیں۔

مرکوشیو ۔ زمانہ ان بیہودگیوں سے بہت آگے بڑھ چکا ہے اب

ہیں آنکھوں پر سرخ پٹی باندھ کر ہاتھ میں تاتار کی رنگدار کمان لے کر کوّے اڑانے والوں کی طرح عورتوں کو ڈرانے دھمکانے والے کیوپڈ کی ——— ضرورت نہیں اور نہ ہی کسی ایسے پیش لفظ کی ضرورت ہے جو کسی کتاب پر نہ لکھا گیا ہو بلکہ محض لقمہ دینے والے کے ساتھ ساتھ ہلکی آواز میں کہا جائے انہیں بجنے دو جو کچھ وہ سمجھنا چاہتے ہیں، کچھ دیر ناچ کر واپس چلے آئیں گے۔

رومیو۔ پھر مجھے مشعل ہی دے دو۔ مجھ سے یہ سبک حرکتیں نہ ہو سکیں گی میرے ذہن پر بوجھ مسلط ہے۔ مجھے بہرحال روشنی برداشت کرنا ہوگی

مرکوشیو۔ نہیں رومیو دوست! تمہیں ناچنا ہی ہوگا۔

رومیو۔ میری مانو، میں ناچ سکتا ہی نہیں۔ تمہارے پاس ہلکے تلووں کے ناچنے والے جوتے ہیں اور میری روح سیسے کی طرح بھاری ہو رہی ہے یہ مجھے زمین میں گاڑے دے رہی ہے۔ میں جنبش تک نہیں کر سکتا

مرکوشیو۔ تم عاشق ہو۔ کیوپڈ کے پر لگا کر اڑو اور اپنی پرواز میں سب کو پیچھے چھوڑ جاؤ۔

رومیو۔ اس کے تیروں نے میرے دل پر ایسے کاری زخم لگائے ہیں کہ میں اس کے ہلکے پھلکے پروں کے ساتھ بھی نہیں اڑ سکتا۔ میں اس میں اس بری طرح سے جکڑ دیا گیا ہوں کہ رنج و غم کی حدود سے ایک انچ ادھر نہیں جا سکتا۔ میں محبت کے بھاری بوجھ کے نیچے ڈوبتا جا رہا ہوں

مرکوشیو۔ تم چاہتے ہو کہ اس طرح ڈوب کر محبت پر سارے بوجھ لاد دو ایسی نازک شے کے لئے یہ ناقابل برداشت ہوگا۔

رومیو۔ کیا محبت بھی نازک ہے؟ یہ انتہائی کھردری، غضب کی وحشی اور قیامت کی سفاک ہے یہ کانٹے کی طرح چبھتی ہے۔

مرکوشیو۔ اگر محبت تمہارے ساتھ سختی سے پیش آتی ہے تو تم بھی ظالم بن جاؤ۔ اگر وہ کانٹے کی طرح چبھتی ہے تو تم نشتر کی طرح گڑ جاؤ اور اس طرح اسے فتح کر لو۔ مجھے چہرہ چھپانے کے لئے نقاب دو چہرہ نہیں تو نقاب ہی سہی اگر نکتہ چیں آنکھیں اس میں "مین میکھ" نکالیں تو پروا کسے ہے؟ میرے بدلے یہ نقاب شرمائے گی۔

(مرکوشیو نقاب پہن لیتا ہے)

بینوولیو۔ لو اب دروازہ کھٹکھٹاؤ اور اندر چلے چلو۔ جاتے ہی ہر آدمی ناچنے لگے۔

رومیو۔ میرے لئے مشعل ہی بہتر ہے۔ مسرور دل نازک بدنوں کو اپنی ایڑیوں سے بے ہوش جھاڑیوں کو چھونے دو۔ میں تو اس پرانی کہاوت کا قائل ہوں اور مشعلچی بن کر تماشائی کی حیثیت اختیار کرنا ہی میرے لئے بہتر ہے۔ منظر اپنے عروج پر ہے اور اس سے علیحدگی اختیار کرنا ضروری ہے

مرکوشیو۔ چپ رہو جی! امن و امان کا ڈھونگ رچا کر چوہے کی طرح بل نہ ڈھونڈو۔ تم پر اگر کوئی آفت آئی تو ہم تمہیں بچائیں گے تمہارے مقدس خزانے محبت کی حفاظت کریں گے جس میں تم کانوں تک ڈوبے ہوئے ہو۔ چلو ہم سورج کی روشنی میں آگ لگا رہے ہیں!

رومیو۔ جی نہیں! ایسا نہیں ہے۔

مرکوشیو۔ میرا مطلب یہ ہے صاحبزادے کہ اس طرح سوچنے میں ہم اپنا وقت ضایع کر رہے گویا دن کے وقت چراغ جلا رہے ہیں ہر بات کو نیک نیتی سے سننا اور سمجھنا چاہئے کیونکہ ہماری قوت فیصلہ کو حواس خمسہ میں سے ایک اور اس میں پانچ حصے دیے گئے ہیں

رومیو۔ اور ہم انتہائی نیک نیتی کے ساتھ اس ناچ میں شرکت کر رہے ہیں لیکن عقل وہاں جانے کی اجازت نہیں دیتی۔

مرکوشیو۔ وہ کیوں ——؟

رومیو۔ میں نے رات ایک خواب دیکھا تھا۔

مرکوشیو۔ خواب! دیکھا تو میں نے بھی تھا۔

رومیو۔ کیا دیکھا تم نے؟

مرکوشیو۔ وہ کچھ دیکھا جس کے متعلق خواب دیکھنے والے عموماً جھوٹ بکا کرتے ہیں۔

رومیو۔ بستر میں پڑے خراٹے لے لے کر سچے خواب دیکھتے ہیں۔

مرکوشیو۔ میں نے دیکھا کہ ملکہ میب تمہارے ساتھ ہے۔

رومیو۔ ملکہ میب؟ وہ کیا بلا ہے؟

مرکوشیو۔ وہ آیا ہے پریوں کی اور جب وہ ظاہر ہوتی ہے تو اس کا جسم کسی بوڑھے کی انگوٹھی میں جڑے ہوئے نگینے سے بڑا نہیں ہوتا اس کے پیچھے ننھے ننھے بونوں کا ایک گروہ ہوتا ہے اور جب لوگ سوتے ہیں تو یہ گروہ ان کی ناک پر محفل رقص جماتا ہے۔ اس کی رتھ کا ارا بی مکڑی کی لمبی لمبی ٹانگوں سے، چھت ٹڈے کے پروں سے راسیں عنکبوت کے مہین تاروں سے، کالر نم آلود شعاع ماہ سے اور چابک جھینگر کی ریڑھ سے بنا ہوتا ہے۔ اس کا گاڑیبان سفید رنگ کا ایک بھنگا ہوتا ہے جو سست رہنے والی دوشیزاؤں کی بیکار انگلیوں میں سے نکلنے والے کیڑوں سے بھی کہیں چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی رتھ بادام کے خالی چھلکوں سے بنی ہوتی ہے۔ جس کو عہد عتیق سے پریوں کی گاڑیاں بنانے والے لوہاروں، گلہریوں نے بنایا ہے۔ اس آن بان اور شان کے ساتھ وہ رات کی تاریکیوں میں محبت کرنے والوں کے دماغوں میں سفر کرتی ہے

اور مشق ورومان کے خوابناک منظر دکھاتی ہے۔ جب اس کا گزر درباریوں کے گھٹنوں پر سے ہوتا ہے تو وہ درباری آداب کے خواب دیکھتے ہیں جب وہ صنفِ لطیف کے ہونٹوں پر سے گزرتی ہے تو خواب میں بوسوں کی شیرینی تحلیل کر دیتی ہے۔ کبھی کبھی مٹھائیوں کی بُو سے لدی ہوئی سانسوں سے ملکۂ سیب غصے سے آگ بگولا ہو جاتی ہے اور وہ ان اَمریں ہونٹوں کو چھالوں سے داغدار کر دیتی ہے۔ بعض اوقات آمد کے دسویں حصے سے کسی پنڈت جی کی ناک کو گدگداتی ہے اور وہ بستر پر پڑے پڑے بڑے بڑے فائدے حاصل کیا کرتے ہیں۔ کبھی کسی سپاہی کی گردن اس کی گزرگاہ قرار پاتی ہے اور وہ سپاہی خواب میں اجنبی دشمنوں کے سر قلم کرتا ہے اور چست ملبوسات، ہسپانوی تلواروں اور چھلکتی ہوئی جوانی کے خواب دیکھتا ہے۔ پھر یکایک اس کے کان میں ڈھول بجا دیتی ہے جس سے وہ ڈر کر چونک پڑتا ہے شدتِ خوف سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز کے ساتھ دو ایک دعائیں گنگناتا ہے اور پھر نیند کی گہرائیوں میں کھو جاتا ہے۔ یہ سب ہی گھوڑوں کی ایال میں الجھنیں ڈال دیتی ہے اور وہ میب ہی ہے جو آوارہ عورتوں کے بالوں میں گرہیں پہنا دیتی ہے جس سے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ وہی ہے ——،

رومیو۔ چپ رہو، مرکوشیو چپ رہو، تم بے معنی باتیں کر رہے ہو۔

مرکوشیو۔ تم نے سچ کہا۔ میں خواب کی بات کر رہا ہوں جو بیکار ذہن میں پیدا ہونے والے بے معنی قیاسات کے بیہودہ بچے ہیں جو اپنی ساخت میں ہوا سے بھی زیادہ باریک اور اس متلون جھکڑ سے زیادہ بیتاب پا ہوتے ہیں جو ایک لحظہ میں شمال کی یخ بستہ وادی سے معاشقہ کرتے ہیں اور دوسرے لمحہ میں جنوب کے شبنم سے دُھلے ہوئے نخلستانوں سے۔

رومیو۔ تمہاری یاوہ گوئی کا یہ جھکڑ ہمیں اپنے سے باہر کئے دیتا ہے کھانا ختم ہو چکا ہوگا اور ہم بہت دیر سے پہنچیں گے۔

مرکوشیو۔ مجھے خوف ہے کہ ہم بہت پہلے پہنچ جائیں گے کیونکہ میرے دل کو یہ دھڑکا لگا ہے کہ ستارے اب بھی اپنے اندر کوئی ایسا بھیانک انجام چھپائے ہیں جس کا خوفناک آغاز آج کی سرتوں سے بے زنجیر ہو جائیگا اور بے وقت موت کی کسی کمینہ چال سے میرے سینہ میں مستور نفرت انگیز زندگی پر ہمیشہ کے لئے اختتام کی مُہریں ثبت کر دی جائیں گی لیکن وہ جس کے ہاتھوں میں میری زندگی کی پتوار ہے میرے بادبانوں کا محافظ ہے۔ چلو بہادر نوجوانو۔

بینوولیو۔ ڈھول بجاؤ ڈھول۔ (ہال میں چلے جاتے ہیں)

پانچواں منظر

(کاپولیٹ گھرانے کا ہال کمرہ۔ پوری اسٹیج۔ نقاب پوش رقاص اسٹیج پر ادھر اُدھر پھر رہے ہیں اور ملازم رومال ہاتھوں میں لئے آتے ہیں)

ملازم ۱۔ (سخرہ) کہاں مر گیا یہ پوٹپان! ذرہ بھر ہاتھ نہیں بٹاتا۔ رکابی اٹھائی اُدھر رکھ دی۔ رکابی اٹھائی اور صاف کر دی۔

ملازم ۱۔ نیک عادتیں جب گندے ہاتھوں والے ایک دو آدمیوں کی ہو رہیں گی تو بہت بُری ہو گی۔

ملازم (سخرہ) یہ بند ہونے والی کرسیاں اٹھاؤ۔ لیجاؤ چاندی سونے کے برتن رکھنے والی اس الماری کو۔ اے بھیا! مجھ پر کچھ تو مہربانی کرو۔ اس بک بک کو کچھ ہلکا کرو۔ اور اگر تم میرے دوست ہو تو ان مزدوروں سے کہو کہ سوسان گرائینڈسٹون، ایلنی اور پوٹپان کو بلا لائیں۔

ملازم ۲۔ تیار ہو جاؤ سب!

ملازم ا(سخرہ) وہاں بڑے کمرے میں تمہارے لئے ڈھنڈیا پڑی ہے تمہیں بلایا جا رہا ہے تمہیں ڈھونڈا جا رہا ہے اور تمہارے لئے کنوؤں میں جال ڈالے جا رہے ہیں۔

ملازم ۲۔ ہم ایک وقت میں یہاں بھی اور وہاں بھی ایک ساتھ کیسے جا سکتے ہیں۔ ہوشیار ہو جاؤ ذرا پھرتی کرو۔ جس کا دم بڑا ہوگا اس پر انعام کا مینہ برسے گا۔ (ملازم چلے جاتے ہیں)

(کاپولیٹ۔ جیولیٹ اور اپنے گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ آتا ہے مہمانوں اور رقاصوں سے ملتا ہے)

کاپولیٹ۔ خوش آمدید معزز دوستو! آج وہ خواتین جو صحت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ تمہارے ساتھ ناچ کی محفل گرم کریں گی۔ آہا میری معزز اور عزیز خواتین تم میں سے کون ہے جو آج کے دن بھی اس مسرت بیز رقص سے انکار کر سکے گی۔ وہ جو اس عالم مسرت میں شریک نہ ہو گی مجھے یقین ہے کہ بیمار ہو گی۔ میں اب آپ حضرات کے قریب تر ہوں۔ خوش آمدید معززین! خوش آمدید۔ میں نے بھی وہ دن دیکھے جب میں چہرے پر نقاب پہن کر کسی حسین عورت کے کان میں اپنی مرضی کے موافق ہلکی آواز میں کوئی میٹھی کہانی

سنایا کرتا تھا۔ اب وہ دن لد گئے۔ گئے وہ دن رخصت ہوئے،
معزز حضرات! میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ سازندو آؤ اور
تاروں پر مضراب لگاؤ۔ جگہ چھوڑ دو ——— راستہ دو۔ چھلکتی ہوئی
جوانیو! آؤ اور اسے اپنی ایڑیوں سے بھرپور کر دو۔

(ساز بجتے ہیں اور یہ ناچتے ہیں)

اے بدمعاشو! روشنی زیادہ کرو۔ ان میزوں کو اٹھا کر ایک طرف
کر دو۔ آگ دھیمی کرو۔ کمرہ گرمی سے پگھلا پڑتا ہے۔ افوہ! اجاب
یہ بن بلائے کی کھیل کود خوب رہی۔ ارے نہیں نہیں، بیٹھو بھی،
اچھے بھیا کاپولیٹ، اب ہم تم دونوں ناچنے کے زمانے سے بہت
آگے بڑھ آئے ہیں۔ کتنا عرصہ ہوا جب ہم دونوں نے آخری دفعہ نقاب
پہنا تھا ———؟

دوسرا کاپولیٹ۔ قسم خاتون مقدس کی۔ تیس سال بیت گئے۔

کاپولیٹ۔ کیا کہہ رہے ہو جی! اتنا نہیں اتنا نہیں! لیوسنیشو کی شادی
ہوئی تھی تو ہم نے آخری دفعہ نقاب پہنا تھا۔ اب پینتے کوسٹ نے
پیدا ہونے میں خواہ کتنی ہی جلدی کیوں نہ کی ہو لیکن بیس اور
پانچ ——— پچیس سال سے زیادہ نہیں گزرے۔

دوسرا کاپولیٹ۔ نہیں نہیں اس سے زیادہ ہے جناب والا اس کے صاحبزادے
عمر میں اس سے بڑے ہیں اس کی عمر تیس سال کی ہے۔

کاپولیٹ۔ ثابت کر سکو گے؟ وہ صاحبزادے تو ابھی دو سال گزرے ہیں
کہ دوسرے کی نگرانی میں رہا کرتے تھے۔ جوانی، اپنے سر کی قسم!
جوانی بڑی لطیف چیز ہے۔

رومیو۔ (ملازم سے) وہ کون خاتون ہے جو اس بہادر کے ہاتھوں
کو عزت بخش رہی ہے؟

ملازم۔ جانتا نہیں حضور!

رومیو۔ اوہ، اس کا حسن شمعوں کی روشنی میں نور بھر رہا ہے ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ وہ کسی حبشی کے بندے کی طرح رات کے چہرے پر
قیمتی آویزہ بن کر جگمگا رہی ہے۔ آہ! یہ حسن جس کی دولت
خرچ نہیں کی جا سکتی جو اتنی بیش قیمت ہے کہ دنیا اس کی متحمل
نہیں ہو سکتی۔ وہ خاتون اپنے ساتھیوں کے درمیان وہی امتیازی
شان رکھتی ہے جو برف کی طرح سفید راج ہنس کوؤں کے گروہ
میں! ——— ناچ ہو لیا، جہاں یہ کھڑی ہے۔ میں اس جگہ کو نظر
میں رکھوں گا اور اپنے کھردرے ہاتھوں کو اس جگہ سے مس کر کے
مقدس بنا لوں گا۔ کیا اس وقت تک میرا دل محبت ہی سے نا آشنا تھا؟

آہ بصارت! چھوڑ دے اسے! کیونکہ میں نے آج کی رات سے
پہلے ایسا بے داغ حسن نہیں دیکھا۔

ٹیبولٹ۔ آواز سے تو یہ مانٹیگ معلوم ہوتا ہے (ملازم سے) میری تلوار
لا دو مجھے۔ اس ذلیل غلام کی یہ جرأت کہ اپنے چہرے کو ایک بھونڈے
طرز میں چھپا کر ہماری متانت کا مذاق اڑانے اور اس پر فقرے
کسنے کے لئے یہاں تک آ گیا ہے۔ قسم اپنے آباؤ اجداد کی عزت
کی۔ اس کا قتل گناہ نہیں ہے۔

کاپولیٹ۔ کیوں؟ کیا ہوا بھائی؟ آخر یہ پیچ و تاب کیوں کھا رہے ہو؟

ٹیبولٹ۔ چچا یہ ہمارا دشمن مانٹیگ ہے۔ بدمعاش ہماری تقریب کا منہ
چڑا کر ہماری عزت اور وقار پر تھوکنے کیلئے یہاں آیا ہے۔

کاپولیٹ۔ یہ جوان رومیو ہے شاید۔

ٹیبولٹ۔ ہاں وہی بدمعاش رومیو ہی ہے۔

کاپولیٹ۔ تحمل سے کام لو عزیز بھائی۔ اسے کچھ مت کہو۔ اس کا طرز عمل
نہایت شریفانہ ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ویرونا اسے ایک نیک کردار
اور نیک اطوار نوجوان کہنے میں یک زبان ہے۔ میں اس سارے
شہر کی دولت کے عوض بھی اپنے اس گھر میں اس کی بے عزتی نہ ہونے
دونگا اس لئے اپنے غصہ پر تحمل کا پانی چھڑکو اور اس سے تعرض
نہ کرو یہ میرا منشا ہے جس کا تمہیں پاس رہا ہے اپنے جذبات
کو قابو میں رکھو۔ اور خوشی کے موقع پر ان برے معلوم ہونے والے
تیوروں کو فرخندہ روئی میں بدل دو۔

ٹیبولٹ۔ جب ایسے بدمعاش آدمی مہمان بن جائیں تو یہی تیور اچھے
لگتے ہیں میں اسے ہرگز برداشت نہ کرونگا۔

کاپولیٹ۔ تمہیں برداشت کرنا ہی ہوگا۔ اچھے بھائی! میں کہتا ہوں
کہ برداشت کرنا ہی پڑیگا۔ جاؤ کام کرو اپنا۔ اس گھر کا مالک میں
ہوں تم نہیں ہو، جاؤ کام کرو۔ تم اسے برداشت نہیں کروگے
اف! خداوند! کیا تم میرے مہمانوں میں ابتری کا زہر بکھیرنا چاہتے
ہو۔ انہیں مرغوں کی طرح لڑوانا چاہتے ہو؟ کیا آدمی ہو تم؟

ٹیبولٹ۔ لیکن چچا ابا! کتنے شرم کی بات ہے یہ۔

(یکے بعد دیگرے ٹیبولٹ کے ساتھ زیر لب اور مہمانوں کے ساتھ بولتے ہوئے)

کاپولیٹ۔ کام کرو کام اپنا۔ بڑے ضدی آدمی ہو تم بھی۔ کیا واقعی ایسا
ہے؟ تمہاری یہ حرکت بہت ممکن ہے کہ تمہیں مہنگی پڑے۔ میری
مخالفت کروگے۔ بھئی وقت ہو گیا۔ خوب کیا، بہت خوب کیا
بہت برخود غلط جوان ہو تم ——— جاؤ خاموش رہو۔ نہیں تو

روشنی کرو ـــ روشنی تیز کرو ـــ تمہیں خاموش کرنے کے لئے مجھے
کوئی خوفناک طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ خوشی سے خیر عزیزو!

ٹیبلیٹ۔ جبراً صبر کرنے کی تلقین میرے غیظ و غضب سے متصادم ہو کر
میری بوٹی بوٹی پھڑکائے دیتی ہے۔ میں جاتا ہوں لیکن دشمن کی
یہ پشت پناہی جو اس وقت بڑی ہی خوشنما اور خوش آئند معلوم
ہو رہی ہے اپنے اندر ہولناک انجام کا طوفان چھپائے ہوئے ہے۔

(جاتا ہے)

رومیو۔ (جیولیٹ سے) اگر میں اپنے ناکارہ ترین ہاتھوں سے اس
مقدس معبد کو چھو دوں تو یہ ایک لطیف گناہ ہوگا۔ میرے ہونٹ
حیا کی سرخیوں میں لپٹے ہوئے دو زائر اس کھردرے لمس کے اثر
کو نازک بوسے سے زایل کرنے پر تیار ہیں۔

جیولیٹ۔ عزیز زائر! تم اپنے ان ہاتھوں پر جن کا طرز عمل نہایت
مناسب ہے بہت بڑا ظلم کر رہے ہو کیونکہ اولیا ہی کے ہاتھ ہوتے
ہیں جن پر زائرین کے بوسے ثبت ہوا کرتے ہیں اور ہتھیلی کے
ساتھ ہتھیلی کا مل جانا ہی عقیدت کا بوسہ سمجھا جاتا ہے۔

رومیو۔ کیا اولیا اور مقدس زائرین کے ہونٹ نہیں ہوتے؟

جیولیٹ۔ ہاں زائرا ہونٹ ہوتے ہیں لیکن دعا کے لئے۔

رومیو۔ تو پھر میرے عزیز ولی ہونٹوں کو بھی وہی کرنے دو جو ہاتھوں نے
کیا ہے ان کی دعا ہے کہ تم مہربان ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمنائیں
حسرتوں میں بدل جائیں۔

جیولیٹ۔ اولیا کے مجسمے دعائیں قبول کرنے کے باوجود جنبش نہیں کرتے

رومیو۔ تو انکار میں سر کو جنبش نہ دیجئے اور مجھے دعا مانگنے دیجئے،
اس طرح آپ کی برکت سے میرے ہونٹوں کے گناہ دھل جائیں گے،

(بوسہ لیتا ہے)

جیولیٹ۔ اب میرے ہونٹوں میں وہ گناہ سرایت کر گیا ہے جو تمہوں نے حاصل کیا،

رومیو۔ میرے ہونٹوں کا گناہ؟ کیسا حسین دورا ہا ہے۔ مجھے میرا گناہ واپس
دے دیجئے۔

جیولیٹ۔ کتاب مقدس کو بوسہ دو۔

آیا۔ چھوٹی بی بی آپ کی والدہ آپ سے دو ایک لفظ کہنا چاہتی ہیں۔

رومیو۔ کون ہیں ان کی والدہ؟

آیا۔ واہ بھئی واہ! ان کی والدہ اس گھر کی مالکہ ہیں۔ نیکدل، عقلمند
اور نیک کردار خاتون ہیں۔ میں نے ان کی لڑکی کو دودھ پلایا تھا
جس سے تم باتیں کر رہے ہو؟ سچ کہتی ہوں جس نے اسے جیت

لیا اس پر دولت گھر کر برسے گی۔

رومیو۔ کیا یہ بھی کاپولیٹ ہی ہے؟ اف میرے اللہ میں نے اپنے
دشمن ہی سے زندگی مستعار لی تھی۔

بینوو یلو۔ چلو چلو اب کھیل اپنے عروج پر ہے۔

رومیو۔ مجھے بھی یہی خطرہ ہے اور میری بےچینی بڑھتی جا رہی ہے۔

کاپولیٹ۔ نہیں نہیں عزیزو جانے کی تیاری نہ کرو ابھی کچھ یونہی
سا مختصر ماحضر باقی ہے (آپس میں زیر لب معذرت کرتے ہیں)
اچھا ایسا ہے تو آپ سب حضرات کا بہت ہی شکر گذار ہوں
یقین فرمائیے معزز صاحبان کہ میں دل و جان سے ممنون ہوں
شب بخیر، اور شمعیں لاؤ ادھر، چلو پھر سوئیں چل کر (کاپولیٹ
سے) بھیا رات کافی بھیگ چکی ہے۔ اب مجھے آرام کرنا چاہئے

(مہمان جانے لگتے ہیں تو جیولیٹ آیا سے مخاطب ہوتی ہے)

جیولیٹ۔ آیا ذرا ادھر آنا۔ وہ کون صاحب ہیں؟

آیا۔ معمر تابیوریو کے صاحبزادے اور گدی نشین۔

جیولیٹ۔ اور وہ جو اب دروازے سے نکل رہا ہے؟

آیا۔ اے میں سمجھتی ہوں کہ وہ نوجوان پیٹروشیو ہے۔

جیولیٹ۔ اس کے پیچھے کون ہے جس نے رقص میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا

آیا۔ معلوم نہیں۔

جیولیٹ۔ تو پھر جاؤ اس کا نام پوچھو (آیا جاتی ہے) اگر وہ
شادی شدہ ہے تو میری موت ہی میری شب عروسی قرار
پائے گی۔

آیا۔ (واپس آکر) اس کا نام رومیو ہے اور وہ مانٹیگ گھرانے سے
تعلق رکھتا ہے تمہارے سب سے بڑے دشمن کا اکلوتا بیٹا۔

جیولیٹ۔ تو میری پہلی اور آخری محبت میری پہلی اور آخری نفرت ہی کا
دوسرا رخ ہے آنکھوں نے اسے بغیر جانے بوجھے وقت سے بہت
پہلے دیکھ لیا اور دل نے اس کا بھید بہت دیر بعد جانا۔ بدشگون محبت
کیا یہ میری ہی قسمت میں لکھا تھا کہ ایک قابل نفرت دشمن کو
دل دے بیٹھوں۔

آیا۔ ہئی ہئی! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟

جیولیٹ۔ ایک شعر جو میں نے ابھی ابھی اپنے ساتھ ناچنے والے سے سیکھا ہے

(کوئی اندر سے بلاتا ہے "جیولیٹ!")

آیا۔ آئی! ایک منٹ میں آئی، چلو چلیں سب مہمان جا چکے۔

——— (جاتی ہیں) ———

جرعۂ دوم!

پہلا منظر

(کاپولیٹ گھرانے کا باغ۔ باغ کی چار دیواری اور اس کے ساتھ ملحقہ گلی۔ پارسی اسٹیج۔ رومیو جھجکتا ہوا آتا ہے۔)

رومیو۔ میں آگے کیسے بڑھ سکتا ہوں جب میرا دل یہاں ہے؟ تو وہ خاک گھوم اُلٹے پاؤں اور اپنا مرکز ڈھونڈ۔ (اُلٹے پاؤں گھومتا ہے اور دیوار پر چڑھ کر باغ میں چلا جاتا ہے)

(گلی میں بینو ولیو اور مرکوشیو آتے ہیں رومیو باغ میں سنتا ہے)

بینو ولیو۔ رومیو: بھائی رومیو!

مرکوشیو۔ وہ بیوقوف نہیں ہے اور میں قسم سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ چپکے سے گھر جاکر سوگیا ہوگا۔

بینو ولیو۔ وہ اسطرف بھاگا تھا اور باغ کی دیوار پر چڑھا تھا۔ اچھے مرکوشیو اسے پکارو۔

مرکوشیو۔ نہیں میں اسے زیر لب آواز میں پکارونگا، رومیو! جذباتی دیوانے! عاشق رومیو! آہ کی صورت میں ظاہر ہو۔ ایک مصرع کہہ دو اور میری تسلی ہوجائیگی۔ صرف اتنا کہدو۔ "آہ میری قسمت!" صرف "محبت" کا نام لے دو۔ "کوبخ" ملکہ کو پکارو۔ میری بزرگ وینس کو ایک حسین لفظ کہہ دو۔ اس کے اندھے بیٹے اور وارث معصوم کیوپڈ کا۔ جس کے تیر اتنے کاری ہیں کہ بادشاہ کافیٹوا ایک بھکارن کے عشق میں گرفتار ہوگیا تھا۔ کوئی نام لے لو۔ وہ کچھ نہیں سن رہا۔ وہ جنبش نہیں کرتا۔ اس کے دل پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا۔ مرگیا بچارا اور اب مجھے اس کی روح کو بلانا ہوگا۔ واسطہ تمہیں روسیلائن کی پرنور آنکھوں کا۔ واسطہ تمہیں اس بلند پیشانی اور احمریں ہونٹوں کا۔ واسطہ تمہیں اس کے نازک پیروں۔ اس کی ساق بلوریں اور اس کی تھرکتی ہوئی رانوں کا اپنے اصلی روپ میں ہمارے سامنے ظاہر ہو۔

بینو ولیو۔ اگر اس نے تمہاری یہ بکواس سن لی تو سخت برہم ہوگا۔

مرکوشیو۔ اس میں بگڑنے اور برہم ہونے کی کیا بات ہے میری دعائیں معقول اور میری التجائیں ایماندارانہ ہیں۔ میں اسے اس کی محبوبہ کا واسطہ دیکر اُسے ہی اس زندگی میں واپس بلانا چاہتا ہوں۔

بینو ولیو۔ آؤ چلیں۔ وہ ان درختوں میں چھپ گیا ہے تاکہ رات کی تلون خاموشیاں اس کی جلیس بنیں۔ اس کا عشق اندھا ہے اور رات کی تاریکیاں ہی اس کے لئے مناسب ہیں۔

مرکوشیو۔ اگر عشق اندھا ہوتا تو اس کا نشانہ اتنا درست نہ ہوتا۔ شب بخیر رومیو! شب بخیر! مجھے اپنے اس غلامانہ بستر پر جانا ہوگا کیونکہ قدرت کا یہ وسیع قالین اتنا سرد اور نم آلود ہے کہ میں اس پر لیٹ کر آنکھ نہیں جھپک سکتا۔ چلو ــــ چلیں۔

بینو ولیو۔ چلو چلیں۔ کیونکہ جو نظر آنے کا ارادہ نہیں رکھتا اس کو ڈھونڈنا عبث ہے۔

دوسرا منظر

(وہی منظر)

رومیو۔ یہ ان زخموں کا مذاق اڑا رہا ہے جن کا درد اس نے کبھی محسوس نہیں کیا۔

(جولیٹ اوپر کی منزل کی کھڑکی میں نظر آتی ہے)

لیکن ٹھہرو! اس کھڑکی میں سے کس نور کے فوارے اچھلنے لگے ہیں، یہ مشرق ہے اور جولیٹ سورج کی طرح طلوع ہوئی ہے۔ ابھرو پیارے سورج! ابھرو اور حسد و عناد کے پتلے اس چاند کی زندگی ختم کردو جو پہلے ہی اپنے ساتھی کے حسن سے مارے حسد کے مرجھایا جاتا ہے اور مارے غم کے زرد پڑ رہا ہے۔ لیکن تو اس کی ساتھی کیسے ہوسکتی ہے؟ وہ تو حاسد ہے اس کے چہرے پر مُردنی چھائی جاتی ہے۔ اس کی رنگت پر ہریالی غالب آئی جاتی ہے اور یہ رنگت تو احمقوں ہی کے لئے ہے۔ پھینک دو اسے۔

یہ تو میرے دل کی ملکہ ہے۔ آہ میرے قلب و جگر کا مرکز ہے، کاش اسے معلوم ہوتا کہ میری کائنات کا واحد مرکز وہی ہے۔ وہ بول رہی ہے لیکن پھر بھی اس کے مُنہ سے ایک لفظ نہیں نکلا، کیا بات ہے یہ؟ اس کی آنکھیں بول رہی ہیں میں جواب دونگا لیکن میری جرأت حد سے بڑھی جاتی ہے اس کا روئے سخن میری طرف نہیں۔ آسمان کے دو حسین ستارے کسی کام سے باہر جانا چاہتے ہیں اور اس کی آنکھوں سے التجا کر رہے ہیں کہ ان کے لوٹ آنے تک یہ آنکھیں آسمان میں جگمگائیں۔ اگر اس کی آنکھیں آسمان پر

[illegible] اور وہ ستارے ان آنکھوں کی جگہ لے لیں تب کیا ہو؟ اس کے رُخِ زیبا کی چمک دمک ان ستاروں کو اس طرح ماند کر دیگی جس طرح سورج کا سیلابِ رنگ و نور چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی لو کو۔ اور اس کی آنکھیں کرۂ ہوا میں خیرہ کن نور کا ایسا دریا بہا دینگی کہ پرندے چہچہانے لگیں گے اور رات اپنی قبل از وقت موت کے خوف سے لرز اٹھے گی۔ دیکھو کس طرح وہ اپنے ہاتھوں سے چہرے کو سہارا دیئے ہوئے ہے۔ کاش میں دستانہ ہوتا اور ان نازک گالوں کو چھو سکتا ——!

جیولیٹ۔ ہائے میری قسمت!

رومیو۔ (اپنے آپ سے) وہ بولی! نورانی فرشتے! جس نے رات کی تاریکیوں کو سطوت و شوکت عطا کی۔ تو میرے سر پر ہے۔ اس لئے میری نظر میں آسمان کے اس بال و پر سے مزین قاصد کی طرح ہے جو منہ اٹھا اٹھا کر دیکھنے والے فانی انسانوں کی حیران و ششدر آنکھوں کے سامنے سست رو بادلوں پر چلتا ہے اور ہوا کے تلاطم سینے پر تیرتا ہے ایک دفعہ اور بول۔

جیولیٹ۔ ہائے رومیو۔ رومیو! تم رومیو کیوں ہو۔ والدین کو چھوڑ دو اپنا نام ترک کر دو اگر تم ایسا نہیں کرو گے اور صرف میری محبت کا دم بھر سکو گے تو میں کاپولیٹ نہ رہونگی۔

رومیو۔ (علیحدگی میں) کیا کچھ اور سنوں یا اس کا جواب دوں؟

جیولیٹ۔ یہ صرف تمہارا نام ہے جو میرا دشمن ہے۔ اگر تم مانٹیگ نہ ہوتے تب بھی تم تم ہی ہوتے۔ آخر مانٹیگ ہے کیا؟ یہ نہ ہاتھ ہے نہ پاؤں، نہ بازو ہے نہ چہرہ اور نہ انسانی جسم کا کوئی اور عضو۔ کاش تمہارا کچھ اور نام ہو سکتا۔ آخر نام میں یہ اہمیت ہے کیوں؟ جس کو ہم گلاب کا نام دیتے ہیں اگر کسی اور نام سے بھی یاد کیا جاتا تب بھی وہ ویسا ہی عطر بیز ہوتا۔ اسی طرح اگر رومیو کا نام رومیو نہ ہوتا تب بھی اس کی وہ پیاری شکل ویسی ہی پیاری اور دلکش ہوتی۔ رومیو اس نام کو چھوڑ دو۔ یہ تمہارے جسم کا حصہ نہیں اور اس کے عوض وہ سب کچھ لے لو جو میرا ہے۔

رومیو۔ (آواز سے) تمہاری اجازت سے میں نے تمہیں لے لیا۔ مجھے صرف محبت کے نام سے بلاؤ۔ اور میرے بپتسمہ کی تجدید ہو جائیگی۔ آج کے بعد میرا نام رومیو نہیں رہا۔

جیولیٹ۔ کون ہو تم جو اس وقت رات کی نقاب اوڑھ کر میری تنہائیوں میں مخل ہوتے ہو ——؟

رومیو۔ میں نہیں جانتا کہ کس نام سے اپنا تعارف کراؤں۔ پیارے ولی! میرا نام خود میری نظروں میں قابلِ نفرت بن گیا ہے کیونکہ یہ تمہارا دشمن ہے اگر یہ لکھا ہوتا میں اس لفظ کی دھجیاں اڑا دیتا۔

جیولیٹ۔ میری سماعت نے ابھی اس زبان سے سو لفظ بھی نہیں سنے پھر بھی میں نے اس لب و لہجہ کو پہچان لیا ہے۔ کیا تم مانٹیگ نہیں ہو اور تمہارا نام رومیو نہیں ہے۔

رومیو۔ حسین دوشیزہ! اگر تمہیں ان دونوں سے نفرت ہے تو ان میں سے ایک بھی نہیں۔

جیولیٹ۔ مجھے بتاؤ کہ تم یہاں کس طرح آئے اور کس لئے؟ باغ کی دیوار بلند اور سنگلاخ ہیں اور یہ جگہ تمہارے لئے موت ہے اگر میرے رشتہ داروں میں سے کسی نے تمہیں دیکھ لیا تب؟

رومیو۔ محبت کے ہلکے پھلکے پروں کی مدد سے میں دیوار پھاندنے میں کامیاب ہو گیا ہوں سنگین حدود محبت کو نہیں روک سکتیں۔ وہ محبت جس کو محبت سے بغلگیر ہو جانے کے لئے لپکنے کی جرأت کی ہو ڈر بھی کس سے سکتی ہے اس لئے تمہارے رشتہ دار میرے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔

جیولیٹ۔ اگر ان میں سے کسی نے بھی تمہیں دیکھ لیا تو تمہارے خون کے پیاسے ہو جائینگے۔

رومیو۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ان کی بیسیوں تلواروں میں وہ موت نہیں جو تمہاری آنکھوں میں ہے۔ تم نگاہِ لطف سے میری طرف دیکھو اور میں ان سب کی دشمنی کا منہ چڑا سکتا ہوں۔

جیولیٹ۔ میں کسی طرح بھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ ان میں سے کوئی تمہیں یہاں دیکھ لے۔

رومیو۔ ان کی آنکھوں سے بچ نکلنے کے لئے میں نے رات کا تاریک لبادہ پہن لیا ہے اور اگر تمہارے دل میں میری جگہ ہے تو میں اس بات کی بھی پروا نہیں کرتا۔ وہ مجھے یہاں دیکھ لیں۔ میری زندگی ان کی نفرت کی بھینٹ چڑھ جائے یہ میں برداشت کر سکتا ہوں لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میں تمہاری ایک نگاہ التفات کیلئے ترستا رہوں۔

جیولیٹ۔ کس نے تمہیں اس جگہ کا راستہ دکھایا تھا؟

رومیو۔ محبت نے۔ جس نے پہلے مجھے سوال کرنے پر آمادہ کر لیا اس نے مجھے مشورہ دیا اور میں نے اسے آنکھیں دیں۔ میں ملاح نہیں۔ پھر بھی اگر تم اس وسیع کنارے پر ہوتیں جس کے قدم اس دور افتادہ سمندر کے پانی سے دھوئے جاتے ہیں تب بھی میں اس قیمتی خزانے کو حاصل کرنے کے لئے اپنی کشتی ان مہیب لہروں کے سپرد کر دیتا۔

جیولیٹ۔ تم جانتے ہو کہ میرا چہرہ رات کی نقاب میں چھپا ہوا ہے ورنہ جو کچھ تم نے مجھے فرض کر لیا ہے اس قابل ہے کہ دوشیزگی کے

چہرے کو فرطِ حیا سے رنگوں کر دیتا۔ میرے لئے یہی مناسب تھا کہ میں تکلف کرتی۔ ہاں! ہاں جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے انکار کر دینا ہی میرے لئے بہتر تھا لیکن تکلف برطرف کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟ میں جانتی ہوں کہ تم ہاں کہہ دوگے اور میں تمہارے الفاظ پر مرمٹوں گی۔ تاہم اگر تم قسم بھی کھا جاؤ تب بھی تم بدل سکتے ہو۔ کہا جاتا ہے کہ نوجوان عاشقوں کی بلند آہنگ قسموں پر خدا بھی مسکرایا کرتا ہے۔ شریف زاد رومیو! اگر تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو تو سچے دل سے اس کا اقرار کرو اور اگر تم یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ میں بڑی آسانی سے تمہارے ہتھے چڑھ جاؤنگی تو میں ناک بھوں چڑھاؤنگی۔ نہ نہ کروںگی اور تمہیں میرے سامنے منت وزاری کرنا ہوگی لیکن بصورت دیگر ایسا کبھی نہ ہونے دونگی سچ تو یہ ہے حسین مانٹیگ کہ میں شدتِ جذبات سے چھلکی پڑتی ہوں اور تم میرے طرزِ عمل کو سبک حرکات کا نام دوگے لیکن معزز اور شریف شخص! یقین مانو کہ میں اس سب کے باوجود بناوٹ کی کنارہ کشی کرنے والی چالاک عورتوں سے زیادہ سچی ثابت ہونگی۔ مجھے یہ اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ میرے لئے کنارہ کشی کرنا ہی زیادہ مناسب تھا لیکن تم نے میری سچی محبت کے حقیقی جذبات کو میرے جانے بغیر سن لیا اس لئے مجھے معاف کرو اور اس التفات کو جس کا انکشاف رات کی تاریکیوں نے کر دیا ہے اوچھی محبت نہ سمجھو۔

رومیو۔ خاتونِ محترم! اس مقدس چاند کی قسم جو پھل سے لدے ہوئے درختوں کی چوٹیوں پر سیماب چڑھا رہا ہے۔۔۔۔۔۔

جیولیٹ۔ اس متلون مزاج چاند کی قسم نہ کھاؤ جو ہر مہینے اپنے محدود دائرے میں بدلتا رہتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری محبت بھی اسی طرح سیماب آسا بن کر رہ جائے۔

رومیو۔ تو تم کہو میں کس کی قسم کھاؤں۔

جیولیٹ۔ قسم کھاؤ ہی کیوں؟ اور اگر تم چاہتے ہو تو اپنی شوکت و سطوت کی قسم کھاؤ جو میری بت پرستیوں کا واحد معبود ہے۔ مجھے اعتبار آ جائیگا

رومیو۔ اگر میرے دل کا پیارا معبود ــــــ

جیولیٹ۔ چھوڑو ان قسموں کو۔ باوجودیکہ تمہاری موجودگی میری نس نس میں مسرت بن کر دوڑ رہی ہے۔ پھر بھی میں آج کی رات اس طرح مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس میں سخت جلدبازی، بے سمجھی اور فوری جذبات کا دخل ہے۔ یہ اس بجلی کی چمک کی طرح ہے جو اس سے پہلے کہ کوئی کہے "بجلی چمکی" بجھ جاتی ہے۔ شب بخیر! پیارے! خدا کرے کہ محبت کا یہ غنچہ ہماری دوسری ملاقات کے وقت بہار کے زندگی بخش جھونکوں سے کھل کر ایک حسین پھول بن چکا ہو۔ شب بخیر شب بخیر! تمہارے دل کو بھی پرسکون اور راحت بخش آسودگی میسر آئے اور میرے سینے کو بھی۔

رومیو۔ کیا تم مجھے اس تذبذب کے عالم میں چھوڑ جاؤگی؟

جیولیٹ۔ آج کی رات کس طرح مطمئن کر سکتی ہوں؟

رومیو۔ میری سوگند کے بدلے میں اپنی محبت کا قسمیہ اقرار کر کے۔

جیولیٹ۔ میں نے تو تمہارے کہنے سے پہلے ہی اقرار کر لیا تھا لیکن پھر بھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں ایک دفعہ وہی لفظ دہراؤں۔

رومیو۔ کیا اسے واپس لوگی؟ کس لئے پیاری؟

جیولیٹ۔ صرف دونوں ہاتھوں سے لٹانے کے لئے۔ تم سے لیکر تمہی کو واپس کر دینے کے لئے۔ میری دریادلی سمندر سے زیادہ وسیع اور میری محبت اس جیسی گہری ہے میں اپنے دل کی دولت جتنی فراخدلی سے تم پر نچھاور کرتی ہوں اتنی ہی اس میں برکت ہوتی ہے کیونکہ یہ دونوں غیر محدود ہیں۔ (آیا اندر سے بلاتی ہے) اندر سے آواز سنائی دے رہی ہے۔ پیارے الوداع! ـــ آئی! اچھی آیا! ابھی آئی! ـــ پیارے مانٹیگ محبت میں ثابت قدم رہنا، ایک منٹ ٹھہرو۔ میں ابھی آئی۔

رومیو۔ او خوش نصیب خوش قسمت رات۔ مجھے خوف ہے کہ رات کے وقت یہ سب کچھ کہیں خواب ہی نہ ہو۔ اس کی مٹھاس اور اس کی شیرینی اتنی زیادہ ہے کہ اسے قرار نہیں ہو سکتا۔

(جیولیٹ اوپر کی منزل میں دوبارہ آتی ہے)

جیولیٹ۔ رومیو پیارے! صرف دو باتیں اور پھر سچ مچ شب بخیر! میں کوشش کرونگی کہ کل کسی کو تمہاری طرف بھیجوں اگر تمہاری محبت کا رجحان شریفانہ ہے اور تمہارا مقصد تاہل کی زنجیروں سے ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو جانا ہے تو اس کے ہاتھ مجھے کہلا بھیجنا کہ اس شریف رسم کی ادائیگی تم کہاں اور کس طرح کرنا چاہتے ہو اور تمہیں مالک بنا کر میں اپنی کائنات کا ہر ذرہ نچھاور کر کے جہاں تم جاؤگے تمہارے ساتھ جاؤنگی۔

آیا۔ (اندر سے) چھوٹی بی بی ـــ!

جیولیٹ۔ ابھی آئی ـــ لیکن اگر تمہارے ارادے نیک نہیں ہیں تو میں منت کرتی ہوں کہ۔۔۔۔۔

آیا۔ چھوٹی بی بی ـــ!

جیولیٹ۔ آ تو رہی ہوں ـــ یہ کوشش چھوڑ دو۔ اور مجھے میرے

تم کے لئے رہنے دو۔ کل کسی کو بھیجونگی۔

رومیو۔ خوش رہو ——— میری روح!

جیولیٹ۔ ہزار بار شب بخیر۔

رومیو۔ تمہارے نور بار چہرے کی عدم موجودگی نے اس بخیر کو ہزار گنا "شر انگیز" کر دیا ہے۔ محبت کرنے والا اپنے محبوب کی طرف اس طرح جاتا ہے جس طرح چھٹی کے گھنٹے میں بچے سکول سے جاتے ہیں۔ ان کی جدائی اتنی ہی یاس انگیز ہوتی ہے جتنی کسی بچے کی اسکول کی طرف جاتے وقت۔

(جیولیٹ اوپر کی منزل میں پھر آگئی ہے)

جیولیٹ۔ شی رومیو! شی شی! اس شاہین کو واپس بلانے کے لئے عقاب باز کی آواز چاہیئے۔ گرفت بہت کڑی ہے اور آواز کو بلند نہیں ہونا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ میں صدائے باز گشت کی گپھا کے پرندے اڑا دوں اور اس کی ہوائی زبانیں مجھ سے بھی بلند آوازمیں میرے رومیو کا نام دہرانے لگیں۔

رومیو۔ (گھومتے ہوئے) میری روح میرا نام لے کر پکار رہی ہے محبت کرنے والوں کی زبان رات کے وقت کتنی میٹھی بولیاں بولتی ہے اور منتظر سماعتیں کیسے کیسے ترنم کا شہد ٹپکاتی ہے۔

جیولیٹ۔ رومیو ——— !

رومیو۔ پیاری۔

جیولیٹ۔ کل کس وقت بھیجوں؟

رومیو۔ نو بجے۔

جیولیٹ۔ میں اسے نہیں بھولونگی۔ لیکن ہائے اس میں ابھی بیس برس جیسا لمبا عرصہ باقی ہے۔ نہ معلوم میں نے تمہیں کیوں بلایا تھا بھول گئی ہوں۔

رومیو۔ تم یاد کرو۔ جب تک تمہیں یاد نہ آجائے میں یہیں کھڑا رہونگا۔

جیولیٹ۔ لیکن میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنے سامنے کھڑا رکھنے کے لئے بھولی رہونگی مجھے صرف یہی یاد رہے گا کہ تم میرے سامنے ہو اور دنیا کی ہر دوسری چیز میرے شعور سے کئی ہاتھ پرے ہٹ جائیگی۔

رومیو۔ اور میں تمہارے بھلائے رکھنے کے لئے یہاں کھڑا رہونگا اور اس بات کو بھول جاؤنگا کہ اس گھر کے سوا میرا کوئی اور گھر بھی ہے۔

جیولیٹ۔ پو پھٹنا چاہتی ہے اس لئے میرا فرض ہے کہ تمہیں جانے دوں لیکن اس رشک زدہ آدمی کے پرندے کی طرح جو اس پابہ زنجیر قیدی کو اپنے ہاتھ سے چند قدم بھی ادھر نہیں پھدکنے دیتا اور ریشم کی ڈور سے اسے واپس کھینچ لیتا ہے۔ وہ محبت جو محبوب کی آزادی سے رشک کھاتی ہے۔

رومیو۔ کاش میں بھی ویسا ہی پرندہ ہوتا۔

جیولیٹ۔ پیارے میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ لیکن میری بے پناہ محبت تمہارا دم گھونٹ دیگی۔ شب بخیر! شب بخیر پیارے اس طرح جدا ہونا ایسا میٹھا رنج ہے کہ میں صبح ہونے تک شب بخیر کہتی رہونگی

(جاتی ہے)

رومیو۔ نیند تمہاری آنکھوں میں اور سکون تمہارے سینے میں گھل مل جائے۔ کاش میں یہ نیند اور سکون ہوتا کہ ایسی جائے پناہ مجھے ملتی۔ اب میں اپنے روحانی صلاح کار کے مکان کو جاتا ہوں تاکہ انھیں آج کا پر لطف حادثہ سنا کر ان سے مدد مانگتا ہوں۔

تیسرا منظر

(فرائر لارنس کی گپھا صبح صادق کا وقت، نصف اسٹیج،
فرائر لارنس ٹوکری اٹھائے آتا ہے۔ آسمان کی طرف دیکھکر)

فرائر۔ نورانی آنکھوں والی صبح۔ غضب آلود رات پر مسکراہٹ بکھیر رہی ہے اور شرقی افق پر پھیلے ہوئے بادلوں کے کناروں پر انوار کا حاشیہ ٹانک رہی ہے۔ تاریکیاں کسی شرابخوار کی طرح لڑکھڑاتی ہوئی روز روشن اور آفتاب کے آتشیں پہیوں کے لئے راستہ چھوڑ رہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ سورج اپنی آتشناک آنکھیں کھول کر دن کو اذن مسرت دے اور رات کو گرنے والی نمناک شبنم کو چوس لے۔ مجھے اس کائی سے بنی ہوئی ٹوکری میں زہریلی جڑی بوٹیاں اور قیمتی رس والے پھول بھر لینے چاہئیں یہ زمین خود ہی اس کا مدفن ہے۔ فطرت کا حسن اسی میں سے ابھرتا ہے اسی میں ڈوب جاتا ہے اس کے پیٹ سے مختلف اور متضاد قسم کے بچے پیدا ہوتے ہیں جنھیں ہم اس کی خود رو چھاتیوں پر دودھ پیتا دیکھتے ہیں ان میں سے باستثنائے چند ہزاروں میں ایسی ہزاروں خوبیاں ہیں جو اپنی اصلیت میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ آہ! کتنی قوی ہے وہ قوت جو نباتات حیوانات اور معدنیات کے پردوں میں پوشیدہ ہے اور ان کی طبعی صفات کتنی سود رساں ہیں کیونکہ زمین کے سینہ پر پیدا ہونے والی کوئی چیز ایسی نہیں جو کسی نہ کسی صورت میں مفید ثابت نہ ہو البتہ وہ چیزیں جنھیں ان کی جبلی فطرت سے علیحدہ ہو جانے پر مجبور کر دیا جائے غیر مفید ہو جاتی ہیں نیکی جب غلط طریقے سے استعمال کی جاتی ہے تو گناہ بن جاتی ہے اور گناہ میں عمل کی خوبیوں سے شوکت

سطوت پیدا ہو جاتی ہے۔

(رومیو آتا دکھا آتا ہے)

پاس اُدھ کھلے پھول کی کمزور حدود میں زہر کی تخریبی طاقتیں بھی ہیں اور صحت بخش تعمیری قوتیں بھی۔ اس کی نزہت بار خوشبو مشام جان کو زندگی بخشتی ہے لیکن اسے کھا لینے سے دل بند ہو جاتا ہے اور جسمانی نظام کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ انسان اور معدنیات میں لطافت اور جور و تعدی جیسے متضاد جذبات ہمیشہ کے لئے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ اور جہاں برائیاں نیکیوں سے زیادہ ہو جاتی ہیں اس پودے کو موت کا کیڑا جلد از جلد چٹ کر جاتا ہے۔

رومیو۔ سحر بخیر مقدس باپ!

فرایر۔ خداوند کی رحمتیں تم پر نازل ہوں۔ کون اس طرح صبح ہی صبح ایسی میٹھی آوازیں مجھ پر سلامتی بھیج رہا ہے! میرے بچے اتنی جلدی بستر کو چھوڑ دینا طبیعت کی بے چینی ظاہر کرتا ہے۔ ہر عمر رسیدہ آدمی کی آنکھوں پر تفکرات کا پہرہ لگا رہتا ہے اور جہاں فکر ہو وہاں نیند نہیں ہوتی لیکن جہاں بے غم جوانی آزاد ذہن کے ساتھ لیٹتی ہو وہاں سنہری نیند کی حکومت ہوتی ہے اس لئے تمہارا یہ صبح ہی صبح بیدار ہو جانا تمہاری قلبی بے چینی کا راز فاش کئے دیتا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں تو میرا قیافہ غلط نہیں کہ ہمارا عزیز رومیو آج کی رات بستر کے قریب تک نہیں گیا۔

رومیو۔ آپ کی یہ آخری بات ٹھیک ہے۔ آج دنیا کی راحتیں میرے لئے وقف ہو گئی تھیں مگر

فرایر۔ خداوند اپنے حفظ و امان میں رکھیں۔ کیا آج روسیلائن سے ملے تھے۔

رومیو۔ روسیلائن! پیر و مرشد؟ نہیں۔ وہ نام اور اس نام سے پیدا ہونے والے رنج و غم میرے ذہن سے محو ہو چکے ہیں۔

فرایر۔ شاباش! لیکن تم تھے کہاں؟

رومیو۔ اس سے پہلے کہ آپ کو دوبارہ استفسار فرمانے کی زحمت ہو میں عرض کئے دیتا ہوں۔ میں اپنے دشمن کے یہاں دعوت کی رنگینیوں میں مصروف تھا کہ کسی کے کاری تیروں کا گھائل ہو گیا اور ساتھ ہی وہ شکاری بھی میری آنکھوں کی زد میں آکر زخمی ہو گیا مقدس طبیب! ہم دونوں کے زخم آپ کی زندگی بخش مدد ہی کر مندمل ہو سکتے ہیں۔ مقدس انسان! میرے دل میں کوئی ناپاک جذبہ نہیں ہے کیونکہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ میں اپنے ساتھ ساتھ اپنے دشمن کی بہتری کے لئے بھی التجا کر رہا ہوں۔

فرایر۔ صاف صاف کہو میرے بچے! کیونکہ گنجلک اعتراف الجھا ہوا جواب پاتا ہے

رومیو۔ تو پھر سیدھے سادے لفظوں میں یہ ہے کہ میرے دل کی دھڑکنوں نے امیر کبیر کاپولیٹ کی حسین بیٹی کو اپنا مرکز قرار دیا ہے جس طرح میں اس کے شمع رخسار کا پروانہ ہوں۔ ویسی ہی وہ میری دیوانی ہے ہم نے اپنا سب کچھ ایک دوسرے کے لئے وقف کر دیا ہے۔ کسر یہی باقی ہے کہ آپ مقدس شادی کے تار و پود سے جکڑ کر اس اتحاد پر ہمیشگی کی مہر لگا دیں۔ کب، کیسے اور کس طرح ہم ملے کیونکر ہم نے ایک دوسرے کا دل جیتا اور وفا و محبت کے کیسے کیسے وعدے کئے یہ سب کچھ میں چلتے چلتے عرض کر دوں گا۔ میری گذارش یہ ہے کہ آپ آج ہی ہماری شادی فرما دیں۔

فرایر۔ اللہ اللہ یہ کیسا انقلاب دیکھ رہا ہوں؟ کیا وہ روسیلائن جس پر تمہارا تن من دھن فدا تھا اتنی جلدی بھلا دی گئی تو پھر نوجوانوں کی محبت دل میں نہیں بلکہ آنکھوں میں رہتی ہے۔ اُف مقدس مریم کے بیٹے یسوع! نمکین پانی کی وہ کتنی تیز دھار تھی جس نے روسیلائن کے لئے تمہارے گالوں پر زرد دیاں بکھیر دیں۔ کتنا آب نمک آلود تھا جو وقتی محبت کے لئے ضائع کیا گیا اور جس میں کا ایک قطرہ بھی تمہارے حلق میں جا کر تمہیں اس کی اصلیت سے آگاہ نہ کر سکا۔ سورج کی تیز آتشیں کرنوں نے ابھی تک تمہاری آہوں کے ان بادلوں کو دور نہیں کیا جو تم نے روسیلائن کیلئے آسمان پر تان رکھے تھے۔ تمہاری گریہ وزاری ابھی تک میرے بوڑھے کانوں میں گونج رہی ہے۔ دیکھو! اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ اس زمانے کے بہائے ہوئے آنسوؤں کے داغ اب تک تمہارے چہرے پر مرتسم ہیں۔ دھوئے نہیں گئے۔ اگر کبھی تم تم ہی تھے اور یہ نالہ و شیون تمہارا ہی تھا تو یہ سب کچھ روسیلائن اور صرف روسیلائن کے لئے وقف تھا۔ کیا تم واقعی بدل گئے ہو؟ تو پھر یوں کہو کہ جب مرد ہی اتنے کمزور ہو جائیں گے تو عورتوں کا ذلت کی وادیوں میں لڑھک جانا ضروری ہے۔

رومیو۔ روسیلائن کے ساتھ محبت کرنے کی وجہ سے آپ مجھ پر ناراض ہوا کرتے تھے

فرایر۔ محبت کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے لئے دیوانہ ہو جانے کی وجہ سے

رومیو۔ اور آپ ہی مجھے اس محبت کو دفن کرنے کا حکم فرمایا کرتے تھے۔

فرایر۔ ایک کو دفن کر کے دوسری کو اکھاڑ لینے کا حکم میں نے کبھی نہیں دیا

رومیو۔ خدارا خفا نہ ہوجیئے۔ وہ جس سے اب محبت کرتا ہوں احسان کا بدلہ احسان سے اور محبت کا بدلہ محبت سے دیتی ہے پہلی ایسا نہیں کرتی تھی۔

(جولیٹ) ہاں ہاں! وہ خوب اچھی طرح جانتی تھی کہ تمہاری محبت لفظی جھگڑا ہے اور اس میں اصلیت کا نام نہیں۔ لیکن متلون مزاج نوجوان! میرے ساتھ چلو۔ میں ایک طرح سے تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں اس رشتے سے تمہارے خاندان کی پرانی عداوتیں سچی محبت میں بدل سکیں گی۔

رومیو۔ جلدی چلئے۔ میں بہت جلد جانا چاہتا ہوں۔

فرایر۔ آہستہ چلو اور عقل سے کام لو۔ جو تیز بھاگتے ہیں وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں۔

(جاتے ہیں)

چوتھا منظر

(ویرونہ کا ایک چوک۔ پہلے ایکٹ کے پہلے منظر جیسا۔ ماقبل منظر کی صبح۔ پوری سٹیج۔ مرکوشیو اور بینوولیو آتے ہیں)

مرکوشیو۔ آخر یہ پریشان کن رومیو غائب کہاں ہو گیا آج اپنے گھر بھی نہیں گیا تھا؟

بینوولیو۔ اپنے باوا کے گھر تو نہیں گیا میں نے پوچھا تھا اس کے نوکر سے۔

مرکوشیو۔ افوہ! اس زرد رو سنگدل روزالائن نے اسے ایسا پریشان کیا ہے کہ وہ بیچارا پاگل ہو جائیگا۔

بینوولیو۔ اس بڈھے کاپولیٹ کے رشتہ دار ٹیبالٹ نے اس کے والد کے گھر ایک خط بھیجا ہے۔

مرکوشیو۔ قسم کھا سکتا ہوں۔ مبارز طلبی کی ہوگی۔

بینوولیو۔ رومیو جواب دیگا اس کا۔

مرکوشیو۔ ہر شخص جو لکھ پڑھ سکتا ہے دو ایک جوابی لفظ لکھ سکتا ہے۔

بینوولیو۔ جی نہیں، وہ اس خط لکھنے والے سے بالمشافہ پوچھے گا کہ ایسی جرأت کرنے کی اس میں جرأت پیدا کیونکر ہوئی۔

مرکوشیو۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ رومیو بیچارا پہلے ہی جان بحق تسلیم ہو چکا ہے ایک سفید رو دوشیزہ کی کالی کالی آنکھوں نے اس کا سینہ چھلنی کر دیا ہے۔ محبت کی نرم موسیقی نے اس کی سماعت میں اتر کر اس کے دل کے پرزے اڑا دیئے ہیں۔ آنکھوں سے اندھے کمان بردار بچے نے اس کے دل پر تاک تاک کر تیر مارے ہیں۔ ایسا آدمی ٹیبالٹ کا مدمقابل کبھی ہو سکتا ہے؟

بینوولیو۔ کیوں ٹیبالٹ میں ایسا کون سا سرخاب کا پر لگا ہے؟

مرکوشیو۔ ارے میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ٹیبالٹ شہزادہ ہے بلیوں کا وہ مہذب نوجوانوں کا بہادر سالار ہے۔ جس طرح موسیقی میں زیر و بم کے ہر پہلوؤں پر پوری توجہ دی جاتی ہے اسی طرح وہ لڑتے وقت لڑائی کے ہر پیچ پر نظر رکھتا ہے۔ وقت، فاصلہ اور تناسب پر پوری طرح قادر ہے۔ باور کرو کہ تم ایک اور دو کہو اور اس سے قبل کہ تمہاری زبان سے تین نکلے اس کی تلوار تمہارے سینے میں ڈوب چکی ہوگی۔ جس طرح قصائی کی چھری گردن پر پھرنے میں غلطی نہیں کرتی اسی طرح اس کی تلوار سینے میں اتر جانے میں لغزش نہیں کھاتی۔ وہ غضب کا لڑاکا اور قیامت کا شمشیر باز ہے۔ وہ ایک اعلیٰ خاندان کا شریف زادہ انسان ہونے کے ساتھ ساتھ تلوار کا بھی دھنی ہے۔ بڑھنا اور نقل میں ڈوب کر سینہ چھید دینا اس کے بائیں ہاتھ کے کرتب ہیں۔

بینوولیو۔ اچھا——!

مرکوشیو۔ یہ بڑھ بڑھ کر ڈینگیں مارنے والے باتونی! دماغ کے کیڑے کا بیجا کھا جانے والے پرتکلف آدمی تو لعنت ہیں۔ یہ الفاظ سے نئی نئی آوازیں پیدا کرنے والے بے وقوف! "قسم یسوع کی شمشیر زنی کیا ہے۔ سرو رواں ہے۔ کیا دوشیزہ ہے" میرے دوست! تم ہی کہو کتنے افسوس کی بات ہے کہ ان غیر ملکی مکھیوں۔ فیشن بیچنے والے ان اشتہاری دکانداروں سان جی حضوریوں نے جو نئے طرز سے اس بری طرح سے اکڑ گئے ہیں کہ ان کے نئے پرانے فیشن کی کرسی پر بیٹھنا مشکل ہو گیا ہے ہمارا ناک میں دم کر رکھا ہو؟ اف خدایا ان کے وہ چست برجس——! (رومیو آتا ہے)

بینوولیو۔ وہ رومیو آیا—— وہ آیا رومیو!

مرکوشیو۔ اپنا آدھا نام تو وہ اپنی معشوقہ کے پاس چھوڑ آیا ہے کہ سوکھ کر آئندہ کام آئے۔ آہ گوشت خون کا لوتھڑا کس آسانی سے مچھلی کی طرح کانٹے سے لگ جاتا ہے۔ کیا اب یہ جذبات کی اسی رَو میں ڈوب رہا ہے جو پیٹرارچ کے ہونٹوں سے گیت کی صورت میں بہتا رہتا تھا۔ ابھی اس کی معشوقہ کے مقابلہ میں وہ لورا تو محض جوٹھی رکابیاں چاٹنے والی کالی کلوٹی کنیز تھی۔ یہ تو قسم مریم مقدس کی اس کی قسمت اچھی تھی کہ شعر و موسیقی کے جادو نے اسے حسن کی دیوی بنا دیا تھا اور ڈڈو! چھی، ایک آوارہ لڑکی، اور قلوپطرہ بھی کیا، ایک خانہ بدوش اور بس! یہ ہیلن اور ہیرو! توبہ کیجئے۔ لونڈی غلام سے زیادہ کیا وقعت ہو سکتی ہے ان کی؟ تھیسبے کی آنکھیں ہونگی اچھی لیکن بجھتے ہوئے چراغ کو آفتاب سے کیا نسبت؟ جناب رومیو! بان جور، آپ کے فرانسیسی پاجامے کو فرانسیسی سلام زیب دیتا ہے رات آپ نے خوب جعلسازی کی ہمارے ساتھ۔

رومیو۔ سحر بخیر عرض کرتا ہوں۔ لیکن یہ جعلسازی کون سی کی تھی میں نے؟

مرکوشیو۔ وہ جو چکمے دئے تھے۔ ہاں یاد نہیں رہا ہوگا؟ ہوں،

رومیو۔ مرکوشیو بھائی بہت شرمندہ ہوں۔ لیکن کیا کروں بات کچھ ایسی

ضروری تھی کہ ان حالات میں میں سمجھتا ہوں اس بدتمیزی کو معاف کیا جا سکتا ہے۔

مرکوشیو۔ مطلب یہ ہے کہ آپ جیسی حالت میں آدمی کو گھٹنوں کے سر جوڑ لینا چاہئے۔

رومیو۔ ادب کی وجہ سے! آپ کا مطلب ہے۔

مرکوشیو۔ یہ فرمانے میں آپ نے صد درجہ حقیقت بیان فرمائی ہے۔

رومیو۔ اور آپ نے اس کا اظہار فرمانے میں انتہائی احسان فرمایا ہے

مرکوشیو۔ احسان کرنے میں تو آپ کا یہ نیاز مند بڑی بڑی رعنایئوں کا حامل ہے۔

رومیو۔ پھول جیسی رعنائیاں۔

مرکوشیو۔ درست فرمایا۔

رومیو۔ تو پھر میرے پمپ پر بڑے پھول کڑھے ہوئے ہیں۔

مرکوشیو۔ خوب کہا، لیکن اب اس وقت تک دُم نہ دبانا جب تک تمہارا پمپ گھس گھسا کر پھٹ نہ جائے اور جب تک اس کا اکہرا تلا تمہارے پاؤں کے تلے سے اچھوتا مذاق نہ کرنے لگے۔

رومیو۔ ایسا گھسے ہوئے تلوے والا مذاق گھسے ہوئے دماغ والوں ہی کو زیب دیتا ہے

مرکوشیو۔ ارے بھئی بینوویلو! ہماری مدد کو آؤ میرا دماغ پھٹا جاتا ہے۔

رومیو۔ دُم دباؤ جلدی ——!

مرکوشیو۔ نہ بھئی اگر تمہارا دماغ جنگلی بطوں کی تیزی سے بھاگتا ہے تو میں ہارا کیونکہ تمہاری ہر حس میں اتنی جنگلی کو بخیں ہیں جتنی میری ایک حس میں نہیں۔ اس بات کا مجھے یقین ہے۔ وہ بطوں کے شکار کیلئے گیا تھا۔ میں تمہارے ساتھ تھا۔

رومیو۔ اگر بطوں کے لئے نہیں تھے تو کبھی بھی نہیں تھے۔

مرکوشیو۔ تمہارے کان کاٹ کھاؤں گا جو مذاق کیا تم نے؟

رومیو۔ نہ نہ میرے اچھے راج ہنس دانت نہ چلانا!

مرکوشیو۔ تمہاری یہ فقرہ بازی بڑے ہی تلخ سیب ایسی ہے۔ بڑی تیز چٹنی ہے یہ؟

رومیو۔ اور بھنی ہوئی بط کے ساتھ کیسا مزہ دیگا یہ سب کچھ۔

مرکوشیو۔ یہ مذاق ہے یار بڑ کر ایک انچ سے جو پھیلا تو تین فٹ کا بن گیا

رومیو۔ میں لو پھیلاتا ہوں تمہاری یکداوگردیاں بڑی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

مرکوشیو۔ سوچو تو محبت کے لئے تسوے بہانے سے یہ باتیں کتنی اچھی ہیں! اب تم ویسے ہی زندہ ہو۔ اب تم واقعی رومیو ہو۔ اب تم واقعی وہی ہو جو تمہیں اکتسابی علم اور فطرت کے ہاتھوں نے بنایا تھا یہ محبت تو ایک عظیم الجثہ احمق ہے جو اپنی احمقانہ نشانیوں کو چھپانے کیلئے ادھر اُدھر سر دیتا پھرتا ہے

بینوویلو۔ چپ ہو جاؤ اب تو ——!

مرکوشیو۔ تمہاری مرضی ہر کہیں خلاف طبیعت کہانی پوری کئے بغیر چپ سادھ لوں۔

بینوویلو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو تمہاری یہ کہانی بڑھتی چلی جائیگی۔

مرکوشیو۔ تمہیں دھوکا ہوا میں اس کہانی کو بیچ ہی چھوٹا کر رہا تھا۔ وجہ یہ کہ کہانی ختم ہونے پر تھی اور میں اس بحث میں خود بھی زیادہ اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔

رومیو۔ کیا اچھا نمونہ چلا آ رہا ہے۔ (آیا آتی ہے)

آیا۔ بادبان اٹھاؤ۔ بادبان اٹھاؤ۔

مرکوشیو۔ ایک نہیں دو۔ ایک کرتا اور دوسری کرتی۔

آیا۔ پیٹر ——!

مرکوشیو۔ جی ——!

آیا۔ میرا پنکھا لاؤ پیٹر،

مرکوشیو۔ اچھے پیٹر منہ ڈھانپنے کیلئے کیونکہ یہ پنکھا منہ سے تو زیادہ خوبصورت ہے۔

آیا۔ سحر بخیر صاحبان!

مرکوشیو۔ شام بخیر حسین خاتون۔

آیا۔ کیا یہ شام بخیر کہنے کا وقت ہے؟

مرکوشیو۔ یقین مانو کم بھی نہیں گھڑی کی سوئی دوپہر پر گھوم رہی ہے۔

آیا۔ ہائے نوج! کیا آدمی ہو تم بھی؟

رومیو۔ ایک ایسی معزز ہستی جسے خدا نے اپنی بدنامی کرانے کے لئے خلق کیا ہے

آیا۔ اپنی قسم خوب کہا تم نے "اپنی بدنامی کرانے کے لئے" خوب لیکن کیوں صاحب آپ میں سے کوئی مجھے بتا سکتا ہے کہ جوان رومیو اس وقت کہاں ہوں گے؟

رومیو۔ میں بتاتا ہوں۔ لیکن ایک بات ہے جب تمہیں جوان رومیو مل جائیگا۔ وہ بوڑھا ہو چکا ہو گا۔ اس نام والوں میں سے میں ہی سب سے چھوٹا ہوں اور بڑے لوگوں کی عدم موجودگی میں مجھے ہی ان میں سے ایک ہونے کا شرف حاصل ہے۔

آیا۔ خوب صاحب! بہت اچھا۔

مرکوشیو۔ اگر یہ بُرا ہی بہت اچھا ہے تو آپ خوب سمجھیں تسمیہ کہتا ہوں بہت ہی خوب سمجھیں آپ!

آیا۔ اگر جناب ہی رومیو ہیں تو میں آپ سے تخلیہ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

بینوویلو۔ دعوت دینا چاہتی ہے اُسے۔

مرکوشیو۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

رومیو۔ کیا مل گیا آپ کو؟

مرکوشیو۔ نہ صاحب نہ جانور نہ عورت۔ اگر یہ جانور جناب والا ہو تو پالکی میں

تو اس سے پہلے کہ اس کا استعمال ہوتا یہ سڑ گل کر پرانا ہو چکا ہوتا۔
(گاتا ہے)

"بوڑھا جانور اور دقیانوسی عورت!
چلے میں بہت مناسب رہتے ہیں۔
لیکن وہ جانور جو بوڑھاپے دوڑ میں رہ جاتا ہے
یہ استعمال ہونے سے پہلے ہانپنے لگتا ہے؛

رومیو! اپنے گھر چلو گے؟ ہم آج کا کھانا وہیں کھائیں گے۔

رومیو۔ چلو! میں آیا۔

مرکوشیو۔ خدا حافظ بوڑھی خاتون، خدا حافظ (گاتا ہے) خاتون۔ خاتون
خاتون ——" (رومیو اور مرکوشیو جاتے ہیں)

آیا۔ خدا حافظ! کیوں جناب عالی، یہ بیہودہ لونڈا کون تھا جس کے منہ میں ہاتھ بھر کی زبان ہے۔

رومیو۔ آیا یہ وہ جوان ہے جو اپنی بکواس سننے کا بہت مشتاق ہے اور ایک لمحے میں اتنا بول جاتا ہے جتنا یہ ایک مہینہ میں سننا برداشت نہیں کر سکتا

آیا۔ اور دیکھو تو جو منہ میں آیا ہے میرے خلاف بک گیا ہے۔ میں نے بڑے بڑوں کے دماغ سیدھے کر دیئے ہیں اور ایسے بیسیوں آدمیوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں۔ جی! اگر میں اپنے ہاتھوں سے اسے سیدھا نہ کر سکتی تو کسی اور سے کروا دیتی۔ بدمعاش کہیں کا لفنگا، پوچھو تو میں بھی اس کی کوئی "وہ" تھی کہ مجھے دق کرنے بیٹھ گیا میں اس کی چھیڑ تو ہوں نہیں (پیٹر سے مخاطب ہو کر) اور تو موٹا! جو لُچا لفنگا آئے گا میرے ساتھ جو چاہے گا کر کے چلتا بنے گا اور تو مٹی کا مادھو بنا کھڑا ٹکر ٹکر تکتا رہے گا۔

پیٹر۔ میں نے کسی کو آپ کے ساتھ کچھ کرتے نہیں دیکھا اور جو دیکھ لیتا تو میری تلوار پھڑک کے میان سے باہر آ جاتی۔ سچ کہتا ہوں اگر موقع مناسب ہو اور قانون میرا ساتھ دے تو میری تلوار نچلی نہیں بیٹھ سکتی۔

آیا۔ قسم رب العزت کی غصے سے میری رگ رگ پھڑک رہی ہے۔ بدمعاش کہیں کا اُچکا —— ہاں تو میری سنئے، میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میری چھوٹی بی بی نے مجھے یہ حکم دیا کہ آپ کو کہیں سے ڈھونڈ نکالوں اور ڈھونڈ کر کہوں کیا! یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گی۔ اس سے پہلے مجھے یہ کہنے دیجئے کہ اگر آپ بقول شخصے اسے کسی احمقوں کی جنت میں گھسیٹنا چاہتے ہیں تو جیسا کہ عام طور پر کیا جاتا ہے یہ بڑی جنگلیوں کی سی حرکت ہو گی کیونکہ وہ لونڈیا ابھی بچی ہی تو ہے اور اگر اس کے ساتھ یہ ظلم کیا گیا تو یہ ایک شریف زادی کے لئے ڈوب مرنے کی بات ہو گی اور یہ بہت ہی سبک حرکت ہو گی۔

رومیو۔ آیا! اپنی بی بی اور مالکہ کی خدمت میں میرا سلام شوق دینا اور کہنا کہ میں اس کے خلاف احتجاج ——!

آیا۔ اہا ہا! ضرور کہوں گی —— یہی کہوں گی —— قسم خدا کی وہ بڑی خوش و خرم عورت ثابت ہو گی۔

رومیو۔ کیا کہو گی؟ تم نے کچھ سنا بھی ہے نہیں۔

آیا۔ میں کہوں گی آپ اس کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور یہ ایک شریف آدمی کی بہترین پیشکش ہے۔

رومیو۔ نہیں کہنا کہ آج دوپہر کے بعد اعتراف کرنے کے لئے آنے کی کوشش کریں۔ فرائر لارنس کی کٹی میں اعتراف اور شادی کی رسم ادا کر دی جائیگی۔ یہ لو، تمہیں بہت تکلیف ہوئی۔

آیا۔ نہیں نہیں صاحب! ایک پیسہ مجھ پر حرام ہے۔

رومیو۔ ارے چھوڑو جی! میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔

آیا۔ تو پھر آج دوپہر کے بعد حضور والا۔ بہت بہتر وہ ضرور آ جائینگی۔

رومیو۔ اور دیکھو اچھی آیا، تم کلیسا کی پشت والی دیوار کے پاس ٹھہرنا، اسی وقت میرا ایک نوکر تمہارے پاس رسیوں سے بنی ہوئی ایک سیڑھی لائے گا جو رات کی خلوتوں میں میری مسرت کی بلند ترین چوٹیوں تک پہنچانے میں مجھے مدد دیگی۔ خدا حافظ! اپنا اعتبار قائم رکھو اور تمہاری محنتوں کی پوری پوری داد دی جائیگی۔ خدا حافظ! اپنی بی بی سے میرا سلام شوق کہنا۔

آیا۔ آسمانوں پر کا خداوند خدا آپ پر رحمتوں کی بارش فرمائے۔ لیکن سنئے تو اے حضور!

رومیو۔ ہاں عزیز آیا! کیا بات ہے؟

آیا۔ آپ کا وہ آدمی اعتباری تو ہے نا؟ آپ نے بھی شاید سن رکھا ہو گا کہ جہاں دو آدمی باتیں کر رہے ہوں، وہاں تیسرے کا آنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔

رومیو۔ یقین جانو میرا نوکر تلوار کی طرح قابل اعتبار ہے۔

آیا۔ بس تو پھر ٹھیک ہے۔ اور چھوٹی بی بی کے تو کچھ کہنے ہی نہیں، جب وہ ننھی سی روتی بسورتی ہوتی گڑیا تھیں —— ارے ہاں! شہر میں ایک صاحب ہیں بڑے شریف اور امیر کبیر۔ پیرس ہے ان کا نام۔ وہ بی بی بیچاری سے شادی کرنے کے لئے مرے جاتے ہیں لیکن وہ ننھی نادان اس کی طرف اس طرح دیکھتی ہے گویا وہ آدمی نہیں کوئی بدصورت بھونڈا مینڈک ہے۔ میں تو کے

کئی دفعہ یہ کہہ کہہ کر دق کیا کرتی ہوں کہ یہ رس دنیا بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت آدمی ہے۔ یہ سنتے ہی سچ مانیئے وہ چھپکلی کے پیٹ کی طرح زرد پڑ جاتی ہے۔ کیا رومیو اور روزمریؔ[1] ایک ہی لفظ سے شروع نہیں ہوتے؟

رومیو۔ ہاں آیا! لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ دونوں "ر" سے شروع ہوتے ہیں۔

آیا۔ اے مسخرہ کہیں کا۔ یہ تو کتے کا نام ہے۔ "ر" سے تو ——— لیکن نہیں میں جانتی ہوں یہ کسی اور لفظ سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن میری بی بی اس کے لئے اپنے جذبات وقف کئے ہوئے ہے تمہارے لئے اور روزمری کے لئے بہرحال اس کا سننا تمہارے لئے خوشی کا باعث ہوگا۔

رومیو۔ اپنی بی بی کو میرا سلام شوق دینا۔

آیا۔ ہاں ہزار بار۔ (رومیو جاتا ہے) پیٹر!

پیٹر۔ جی ———!

آیا۔ پیٹر پنکھا پکڑو اور میرے آگے آگے چلو ——— ذرا تیزی سے۔

پانچواں منظر

(کاپولیٹ کے گھر کا ایک کمرہ۔ نصف اسٹیج۔ جیولیٹ بیتابی کے عالم میں محو انتظار ہے)

جیولیٹ۔ اس وقت نو بجے تھے جب میں نے آیا کو بھیجا تھا اور وہ کہتی تھی کہ وہ آدھ گھنٹے میں لوٹ آئیگی۔ ہوسکتا ہے کہ اسے وہ نہ ملے ہوں لیکن نہیں یہ ناممکن ہے۔ اُف! لنگڑی ہوگئی ہے وہ! محبت کا قاصد تو خیالات کا بنا ہوا ہونا چاہیئے جو غضبناک پہاڑیوں پر سے سائے کے پردے ہٹانے والی سورج کی تیز رو شعاعوں سے بھی زیادہ تیز قدم ہوتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ محبت کی رتھ کھینچنے کے لئے تیز پروں والی بطوں کو استعمال کیا جاتا ہے اور ہوا کی طرح اُڑنے والا کیوپڈ پروں سے مزین کیا گیا ہے۔ اب سورج اپنے آج کے سفر کو طے کرتا ہوا پہاڑیوں کی بلند ترین چوٹیوں تک پہنچ چکا ہے۔ نو اور بارہ کے درمیان تین گھنٹوں کا طویل عرصہ ہے لیکن اس کے باوجود وہ ابھی تک واپس نہیں آئی۔ اگر اس کے دل میں بھی جوان جذبات ہوتے اور اس کی رگوں میں بھی جوانی کا گرم خون موجزن ہوتا تو وہ میرے الفاظ کو میرے پیارے تک پہنچانے اور اس کا پیغام مجھ تک لے آنے میں گیند کی طرح تیز رو اور سبک رفتار ہو جاتی لیکن بہت سے بوڑھے مردوں سے بھی زیادہ بیکار سیسے کی طرح غیر متحرک، سست، بھاری بھرکم اور مندد ہو جاتے ہیں۔ اُف میرے خدا ——— وہ آئی۔

(آیا اور پیٹر آتے ہیں۔)

آؤ! میری پیاری پیاری مٹھو آیا۔ کیا خبر لائی ہو؟ ملی تھیں تم اُن سے؟ اس اپنے نوکر کو باہر بھیج دو۔

آیا۔ پیٹر! دروازے پر ٹھہرو!

جیولیٹ۔ اچھا تو پیاری آیا! ——— سارے لیکن یہ کیا تم بہت مغموم سی معلوم ہوتی ہو؟ خبر خواہ کتنی ہی غمناک کیوں نہ ہو لیکن اسے کم از کم مسکراتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ سناؤ۔ اگر خبر اچھی ہے تو پھر تم اس افسردہ چہرے سے اس کی مسرت بیز موسیقی کو فنا کر دو گی۔

آیا۔ بہت تھک گئی ہوں۔ اے دم لینے دو۔ اُف! ہڈیاں چُورا ہوگئیں چلتے چلتے جوتیاں گھس گئیں۔

جیولیٹ۔ کاش تمہارے جسم میں میری ہڈیاں ہوتیں اور میں وہ خبر جانتی جو تم اپنے دل میں لئے پھرتی ہو ——— نہیں آیا، بولو! کچھ تو بولو ———!

آیا۔ ہئی ہے! اے اتنی جلدی کیا ہے؟ دم لو ذرا۔ دیکھتی نہیں ہو دم چڑھا ہوا ہے اور بات نہیں ہوتی۔

جیولیٹ۔ جب تم کہہ سکتی ہو کہ بات نہیں ہوتی تو پھر یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ دم چڑھا ہوا ہے۔ وہ بہانہ جو تم بنا رہی ہو اس پیاری کہانی سے زیادہ الفاظ چاہتا ہے جس کو سنانے کے لئے باتیں گھڑ رہی ہو۔ تمہاری خبر اچھی ہے یا بُری صرف اسی کا جواب دے دو۔ ان میں سے ایک لفظ کہہ دو اور باقی بعد میں سن لونگی۔ صرف اتنا اطمینان دلا دو کہ خبر اچھی ہے یا بُری۔

آیا۔ بات یہ ہے کہ تم نے انتخاب ایک سخت بیوقوف آدمی کا کیا ہے تمہیں معلوم ہی نہیں کہ آدمی کو کس طرح پرکھا جاتا ہے۔ رومیو ——! اونہوں، یہ تو ٹھیک نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کا چہرہ سب آدمیوں سے اچھا ہے لیکن اس کی ٹانگیں، اُف! میرے اللہ! دُنیا جہان کے ہر مرد کی ٹانگوں سے بازی لے گئی ہیں۔ اور وہ ہاتھ وہ پاؤں اور وہ جسم! توبہ توبہ! ان کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتی لیکن پھر بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وہ تہذیب و تمیز کا پُتلا تو نہیں کہلا سکتا لیکن میں اس بات کی قسم کھاتی ہوں کہ وہ

---

[1] ایک قسم کی سدا بہار خوشبودار جھاڑی جس کے پھولوں سے عطر بنایا جاتا ہے اور ایک دوسرے کو یادگار کے طور پر دیا جاتا ہے۔

جینے کی طرح شریف النفس ہے۔ جاؤ جی راستہ ناپو۔ کچھ خدا کی عبادت کیا کرو۔ کیا کھانا وانا کھا چکیں؟

جیولیٹ۔ نہیں نہیں، یہ تو میں سب کچھ جانتی ہوں انھوں نے شادی کے معاملے میں کیا کہا ہے؟ یہ بات بتاؤ۔

آیا۔ ہائے اللہ! کس قیامت کا درد ہے سر میں۔ کیا واہیات سر ہے یہ۔ ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور سر کے ابھی ٹکڑے اڑ جائیں گے ہائے کمر! اُف میری کمر، اپنے اس پتھر ایسے دل کے کرتوت دیکھیے تم نے۔ ایک بڑھیا بیچاری کو سارے شہر کی سڑکوں کا گز بنا کر ادھ موا کر دیا —— ہائے!

جیولیٹ۔ سچ مچ میری اچھی آیا! مجھے تمھاری اس تکلیف کا بہت ہی افسوس ہے لیکن میری اچھی آیا یہ بتاؤ میرے پیارے نے کیا کہا تھا،

آیا۔ تمھارے پیارے نے بڑے ہی ایماندار، مہذب، مہربان، شریف اور خوش شکل آدمی کی طرح بات کی تھی۔ میں دعوےٰ سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ بہت ہی شریف آدمی ہے —— امّی کہاں ہیں تمھاری؟

جیولیٹ۔ امی کہاں ہیں؟ اندر ہیں اور کہاں جا سکتی ہیں؟ تم کیسے الٹے سیدھے جواب دیتی ہو آیا۔ "تمھارے پیارے نے بڑے شریف آدمی کی طرح کہا کہ تمھاری امی کہاں ہیں؟"

آیا۔ ہائے ہائے مریم مقدس! ایسی لال پیلی کیوں ہوئی جاتی ہو؟ ہوش کی دوا کرو ہوش کی۔ ہڈیوں کو سُرمہ کر دینے کا یہ انعام دے رہی ہو تم۔ اب اپنے پیغام وغیرہ آپ ہی لے جایا کرنا۔

جیولیٹ۔ کیا سانپ کی طرح بل کھا رہی ہو جلدی بولو، کیا کہا تمھارے رومیو نے؟

آیا۔ اعتراف کرنے کی اجازت لے لی تم نے؟

جیولیٹ۔ ہاں لے لی۔

آیا۔ تو فرایر لارنس کی کٹی میں ابھی بھاگ جاؤ۔ وہاں ایک خاوند تمھیں اپنے دل کی ملکہ بنانے کے لئے تمھاری راہ دیکھ رہا ہے۔ اب تو خون سے شہابی ہو گیا ہے چہرہ۔ کیسا گناہ آلود ضمیر ہے کہ ہر بات پر چہرہ سُرخ کر دیتا ہے۔ تم جلدی سے کلیسا کو روانہ ہو جاؤ۔ مجھے دوسری طرف جا کر ایک سیڑھی لانا ہے جس کی مدد سے تمھارا محبوب شام ہوتے ہی پرندے کے گھونسلے میں بسیرا کرنے کے لئے اوپر چڑھ آئے۔ میری بھی نرالی قسمت ہے۔ خوشیاں نصیب ہونگی تمھیں اور ان کے لئے دکھ بھوگنے پڑیں مجھے۔ جاؤ میں کھانا کھاتی ہوں۔ کٹی میں جلد پہنچو۔

جیولیٹ۔ ہاں جلدی اپنی قسمت کی معراج پر۔ خدا حافظ نیک دل آیا! (جاتی ہے)

چھٹا منظر

(فرایر لارنس کی کٹی۔ رومیو اور لارنس گفتگو کر رہے ہیں)

فرایر۔ خداوند خدا اس مقدس بندھن پر رحمت فرمائے۔ اور اس کے بعد آنے والے لمحات رنج و غم سے ہم پر اپنی ناراضی کا اظہار نہ کریں

رومیو۔ آمین ثم آمین۔ لیکن ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھوں میں دیکھ لینے کی مسرت ان تمام رنج و غم کو مٹی میں ملا دیگی جو اس کے بعد مجھ پر ٹوٹیں گے۔ آپ مہربانی فرما کر ایک دفعہ ہمارے ہاتھ کو ملا کر مقدس الفاظ فرما دیجیئے۔ میں اس مسرت ایک دفعہ "میری اپنی" کے نام سے پکار لوں اور پھر محبت کو کچلنے والی موت جو کچھ کرنا چاہے کر گزرے مجھے اس کی پروا نہ ہوگی۔

فرایر۔ یہ شدت کی تیزی سے اچھلنے اور چھلکنے والی مسرتیں اپنے انجام میں بھی ایسی ہی شدت چھپائے ہوتی ہیں۔ آگ اور بارود ایک دوسرے کے گلے سے لپٹنے کے لئے جس تیزی سے لپکتے ہیں اسی تیزی سے شعلوں میں بدل کر بھسم ہو جاتے ہیں اسی طرح یہ مسرتیں بھی اپنی معراج پر پہنچ کر فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہیں زیادہ میٹھا شہد اپنی مٹھاس ہی کی وجہ سے حلق کے لئے قابل قبول نہیں ہوتا اور بھوک کی زندگی بخش صلاحیتوں کو اپنے ذائقے ہی کے دامن میں لپیٹ کر برباد کر دیتا ہے اس لئے محبت کرنے میں اعتدال کو ہاتھ سے نہ دو۔ دائمی محبت کا طرز عمل یہی ہوتا ہے۔ زیادہ تیزی سے بھاگنے والے تھک کر اپنی اصلی رفتار بھی کھو بیٹھتے ہیں

(جیولیٹ آتی ہے اور رومیو کے گلے لگ جاتی ہے)

خاتون آ گئیں۔ ایسی ہلکی پھلکی روح اس ہمیشہ رہنے والی سنگلاخ دنیا کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے گی۔ محبت کرنے والوں کا فریب نظر اتنا سبک ہوتا ہے کہ اگر عاشق موسم گرما کی چمکتی ہوئی فضا میں لرزنے والے تار عنکبوت پر بھی سوار ہو جائیں تب بھی انھیں گرنے کا خطرہ نہ ہو۔

جیولیٹ۔ روحانی باپ! شام بخیر،

فرایر۔ بیٹی! رومیو ہم دونوں کی طرف سے تمھارا شکریہ ادا کریگا۔

جیولیٹ۔ پھر مجھے رومیو پر بھی سلامتی بھیجنا ہوگی ورنہ رومیو کا شکریہ اپنے وزن میں بہت بڑھ جائیگا۔

رومیو۔ آہ جیولیٹ! اگر تمھاری مسرتوں کا اندوختہ بھی میری طرح ایک فلک رس ڈھیر میں بدل گیا ہے اور تم ان کا اظہار کرنے

کی صلاحیت اپنے آپ میں پاتی ہو تو اب ہمارے سروں پر منڈلانے والی اس شرابی ہوا میں اپنی معطر سانس سے شہد کی شیرینی حل کردو۔ اس ملاپ سے جو روحانی خوشی ہم دونوں نے حاصل کی ہے اس کا اظہار کرنے کے لئے موسیقی کی وہ زبان کھولو جو قضا و قدر کی خوش نصیب غلطی سے تمہارے مُنہ میں رکھدی گئی ہے۔

جیولیٹ۔ وہ تصور جسے الفاظ سے زیادہ حقیقت کی دولت نصیب ہوئی ہے اپنی آراستگی سے زیادہ اپنے اصلی جوہروں پر نازاں ہے تھوڑی سی خوشیاں تعداد اور مقدار کی حدود میں محدود کی جاسکتی ہیں لیکن میرا حقیقی عشق ان حدود کو عبور کرکے وہاں تک پہنچ چکا ہے جہاں میں اپنی دولت کے آدھے حصے کو بھی کسی معیار کے پیمانے میں نہیں لاسکتی ——!

رومیو۔ چلو میرے ساتھ چلو اور جتنی جلدی ہوسکے اس کام کو ختم کردیا جائے کیونکہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ جب تک کلیسائے مقدس تم دونوں کو ایک ہو جانے کی سند نہیں عطا کرتا اس وقت تک ہم دونوں کا علیحدگی میں تنہا رہنا مناسب نہیں ہے۔

(سب جاتے ہیں)

جُرعہ سوم!

پہلا منظر

(ویرونہ کا ایک چوک۔ پورا اسٹیج۔ مرکوشیو، اس کا نوکر، بینوویلو اور دوسرے سائے میں آرام سے کھڑے نظر آتے ہیں)

بینوویلو۔ مرکوشیو بھیا! میں منت کرتا ہوں آؤ چلیں گرمی بہت زیادہ ہے کاپولیٹ والے گھروں سے باہر نکلے ہوئے ہیں اور اگر وہ لوگ ہم سے مل گئے تو خواہ مخواہ کا جھگڑا ہو جائے گا کیونکہ آج کل گرمیوں کے زمانہ میں خون اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ دیوانگی پیدا ہو جاتی ہے۔

مرکوشیو۔ تم تو اس آدمی کی طرح ہو جو سرائے میں جاتے ہی تلوار کھول کر میز پر رکھ دیتا ہے اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے کہ خدا کرے اب تمہاری ضرورت نہ پڑے لیکن جب دوسرے گلاس کی نشہ خیزیاں اس کے ذہن پر اثر کرتی ہیں تو وہ آپے سے ایسا باہر ہوتا ہے کہ سرائے کے نوکر سے اُلجھ پڑتا ہے اور تلوار بلا ضرورت تڑپ کر میان سے باہر آجاتی ہے۔

بینوویلو۔ کیا میں ایسا آدمی ہوں؟

مرکوشیو۔ جی ہاں آپ ہی! تمہارے ایسا گرم مزاج تو اٹلی بھر میں ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ تم جلد ہی بگڑ بیٹھتے ہو اور بگڑنے کے لئے بہت جلد تیار ہو جاتے ہو۔

بینوویلو۔ لیکن کس لئے؟

مرکوشیو۔ تمہارے جیسے دو آدمی اگر اکٹھے ہو جائیں اور کچھ دیر تک کوئی تیسرا نہ آئے تو ان دونوں میں سے کوئی کسی ایک کا سر کاٹ دے۔ تم ارے تم تو ہر اس شخص کو مارنے پر تیار ہو جاؤ جس کی ڈاڑھی کے بال تعداد میں تمہاری ڈاڑھی کے بالوں سے کم یا زیادہ ہوں۔ تم تو اپنے سامنے بادام توڑنے والے کے ساتھ سر دھڑ کی بازی محض اس لئے لگا دوگے کہ تمہاری آنکھیں بادام ایسی ہیں۔ تمہاری آنکھیں توڑنے کے موقع ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ تمہارا سر تو لڑائیوں سے اس طرح بھرا پڑا ہے جس طرح انڈا زردی اور سفیدی سے اور یہ کھوپری تمہاری لڑائیوں میں پٹ پٹ کر گندے انڈے کی طرح پلپلی ہو رہی ہے تم نے اس لئے لڑائی مول لے لی کہ کسی نے گلی میں کھانس کر تمہارے کُتے کو جو دھوپ میں سو رہا تھا جگا دیا۔ تم ہی کہو تم اس درزی سے نہیں لڑ پڑے تھے جس نے ایسٹر سے پہلے ہی ایک نئی قمیص پہن لی تھی؟ اور اس دوسرے سے جس نے نئے جوتوں پر پرانے تسمے باندھ لئے تھے؟ اور ان سب کے باوجود تم ہی مجھے لڑائی سے بچنے کی ہدایت کرنے چلے ہو۔

بینوویلو۔ اگر میں تمہاری طرح لڑاکا ہوتا تو ہر شخص گھنٹے سوا گھنٹے کے اندر اندر میری زندگی کے سارے سوتے بند کرسکتا تھا۔

مرکوشیو۔ زندگی کے سوتے؟ بیوقوف کہیں کے!

(ٹیبولٹ اور دوسرے آتے ہیں)

بینوویلو۔ اپنے سر کی قسم وہ آگئے کاپولیٹ والے۔

مرکوشیو۔ اور میں اپنی جوتی کی نوک کے برابر بھی ان کی پرواہ نہیں کرتا۔

ٹیبولٹ۔ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ مجھے ان سے کچھ کہنا ہے۔ شب بخیر صاحبان
میں آپ میں سے کسی ایک کے ساتھ دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔
مرکوشیو۔ صرف دو باتیں! ارے صاحب اس کے ساتھ ہی کچھ اور ملا لیا ہوتا
باتوں کے ساتھ دو ایک ہاتھ بھی چل جائیں تو کیا ہرج ہے!
ٹیبولٹ۔ اگر آپ نے موقع دیا تو اس نیاز مند کو اس میں بھی پورا اترتا پایئے گا۔
مرکوشیو۔ ہم موقع دیں تب آپ کی بہادری سو کر اٹھے گی؟
ٹیبولٹ۔ مرکوشیو! آج کل تم رومیو سے خوب ہم نوا ———
مرکوشیو۔ ہم نوا ——— ؟ کیا بکتے ہو تم۔ ہیں کوئی میراثی یا بھاٹ سمجھ
رکھا ہے کہ گلا پھاڑ پھاڑ کر سُریں ملائیں گے۔ اچھا گویا ہم بھاٹ ہیں
تو ہمارے گانے تو بھائی صاحب بے سُرے ہی ہونگے۔ یہ رہی میری
بانسری (تلوار کا قبضہ پکڑ کر) یہ ہے جس کی گتوں پر ناچتے ہوئے تم
سیدھے جہنم کی راہ لوگے بدبخت! بھاٹ بناتا ہے ہمیں۔
بینوولیو۔ یہاں ہم عوام کی گزرگاہ پر ہیں یا تو کسی تخلیئے کے مقام پر چلے چلو
اور ٹھنڈے دل سے دل کا بخار نکال لو۔ نہیں تو یہ تلواریں چھوڑ دو
ساری دنیا ہماری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے۔
مرکوشیو۔ لوگوں کے منہ پر آنکھیں دیکھنے ہی کے لئے لگائی گئی ہیں دیکھنے
دو انھیں۔ میں کسی سے گھبرانے والا نہیں۔
(رومیو آتا ہے)
ٹیبولٹ۔ اہا! جیتیں تم کر چکیں۔ وہ آیا میرا آدمی،
مرکوشیو۔ اگر اس کے جسم پر تمھارے مکروہ خاندان کا کراہت انگیز لباس
ہو تو مجھے پھانسی دے دو۔ قسم مریم کی۔ میدان میں اترو اور یہ
تمھارا پیچھا کرے گا۔ اور اس طرح حضور پُر نور، مطلع انوار و
جلالتمآب اسے "اپنا آدمی" کہہ کر مخاطب فرما سکیں گے۔
ٹیبولٹ۔ رومیو! میری محبت کا تقاضا یہی ہے کہ میں تمھیں اس نام سے
یاد کروں ——— تم پرلے سرے کے بدمعاش ہو۔
رومیو۔ ٹیبولٹ! جس چیز کا مجھے ادب و لحاظ ہے اور جو جذبہ میرے دل کو
تم سے محبت کرنے پر مجبور کر رہا ہے وہ ایسا قوی ہے کہ اس نفرت
انگیز اشتعال سے پیدا ہونے والا غصہ بھلیج کردہ جاتا ہے۔ میں
بدمعاش نہیں ہوں اس لئے خدا حافظ۔ میری سمجھ میں آگیا ہے کہ
تم مجھے تمام عمر نہیں سمجھ سکتے۔
ٹیبولٹ۔ یہ نہ سمجھ لینا میری جان! کہ جو جو زخم تم نے میرے دل پر لگائے
ہیں وہ اس سے مندمل ہو جائیں گے اس لئے ذرا پلٹیے اور تلوار
نکال لیجئے ———

رومیو۔ مجھے اس سے انکار کرنے میں اصرار ہے۔ جس دل سے میں تمھیں
چاہتا ہوں تم اس وقت تک اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے جب
تک تمھیں اس کی اصلی وجہ سے آگاہ نہ کر دیا جائے اس لئے میرے
عزیز کاپولیٹ ——— وہ نام جس کو میں اپنے نام کی طرح عزیز جانتا ہوں
مطمئن رہو اور وقت کا انتظار کرو۔
مرکوشیو۔ صاف خاموش رہو۔ بےعزت ہو کر سر جھکا دینا ذلت ہے۔ ہوشیار
موت تم پر ٹپکا چاہتی ہے۔ اچھا دیکھے پکڑنے والے ٹیبولٹ!
سامنے آنے کی جرأت ہے تجھ میں؟
ٹیبولٹ۔ کیا ہوگئے مجھ سے؟
مرکوشیو۔ جی ہاں بلیوں کے اچھے بادشاہ! آپ کی نو جانوں میں سے
صرف ایک جان چاہتا ہوں میں اس ایک جان کو ختم کر دینے کی
اجازت چاہتا ہوں۔ اور اس کے بعد حضور کے طرز عمل کے مطابق
باقی ماندہ آٹھ جانوں کو سکھا سکھا کر اور لکڑی سے کوٹ کوٹ کر نکال
دیا جائے گا۔ کیا آپ اپنی اس نام نہاد تلوار کو کان سے پکڑ کر اس
گڑھے سے باہر نکالنے کی تکلیف فرما سکتے ہیں۔ ذرا جلدی کیجئے ایسا
نہ ہو کہ اتنے میں میری یہ زبانِ دراز حضور کے کانوں تک ڈوب جائے۔
(تلوار نکالتا ہے)
ٹیبولٹ۔ بندہ حاضر ہے۔
رومیو۔ مرکوشیو بھائی! اپنا ہاتھ روکو۔
مرکوشیو۔ آیئے صاحب آپ کی اس گھونپا گھاپی کو بھی دیکھ لیں۔
(لڑتے ہیں اور رومیو بالآخر مجبور ہو کر انھیں چھڑانے کی کوشش کرتا ہے)
رومیو۔ بینوولیو! اپنی تلوار نکالو! ور ان کے ہتھیار گرا دو۔ اے صاحبان
کچھ تو شرم کرو۔ اس دھینگا مشتی کو چھوڑو۔ ٹیبولٹ! اے
مرکوشیو۔ ارے بھئی بادشاہ سلامت نے ویرونہ کے بازاروں میں
اس قسم کے لڑائی جھگڑوں کی سختی سے ممانعت فرما رکھی ہے۔ ارے
ٹیبالٹ! ہاتھ روکو۔ اے مرکوشیو!
(ٹیبولٹ رومیو کے بازو کی آڑ لے کر مرکوشیو کے سینہ میں تلوار
بھونک دیتا ہے اور بھاگ جاتا ہے)
مرکوشیو۔ اُف! زخم لگ گیا مجھے۔ تمھارے ان دونوں خاندانوں پر خدا کی مار
ہو۔ میری زندگی ختم ہوگئی۔ بھاگ گیا ہے وہ اور بغیر کسی زخم کے۔
بینوولیو۔ کیا چوٹ آگئی؟
مرکوشیو۔ کھرونچ ہے کھرونچ لیکن جان لیوا ہے میرا نوکر کہاں ہے۔ جا بے!
جلدی جا کسی جراح کو بلا لا۔ (نوکر جاتا ہے)

رومیو۔ ہمت کرو جی! ایسی چوٹ بھی کہاں آئی ہوگی؟

مرکوشیو۔ نہیں نہیں! یہ نہ تو کنوئیں کی طرح گہری ہے اور نہ کلیسا کے پھاٹک کی طرح چوڑی۔ پھر بھی زندگی کو ختم کر دینے کے لئے بہت کافی ہے۔ کام کر جائے گی اپنا۔ کل میرے متعلق استفسار کرنا۔ مُردہ پاؤگے سچ کہتا ہوں تم سے اس دنیا سے تو رشتہ چھوٹا۔ تمہارے ان خاندانوں پر لعنت خدا کی۔ بدبخت کتا ہے۔ چوہا کہیں کا نیول۔ بلی کی اولاد میں سے ہے شاید کہ مردوں کو پنجوں سے جانیں لیتا پھر رہا ہے۔ آوارہ بچہ، بدمعاش، ٹٹی کی آڑ میں چھپ چھپ کر شکار کھیلنے والا کمینہ شکاری۔ آخر تجھے کس حکیم نے کہا تھا کہ تم ہم دونوں کے درمیان آجاؤ! یہ تمہارے بازو ہی کی بدولت مجھے زخم لگا ہے ورنہ شاید یہ حالت نہ ہوتی۔

رومیو۔ میں نے جو بہتر جانا وہی کیا۔

مرکوشیو۔ بینوولیو! کسی مکان میں لیچلو مجھے! اُف بیہوش ہوا جاتا ہوں تمہارے ان گھرانوں پر شیطان کی پھٹکار۔ مجھے تر نوالہ بنا رکھا تھا۔ میں نے نتیجہ بھگت لیا اور نتیجہ بُرا اچھا۔ تمہارے گھرانوں پر———

(بینوولیو مرکوشیو کو ایک طرف لے جاتا ہے)

رومیو۔ بادشاہ کے قریبی رشتہ دار——— اور میرے عزیز دوست نے محض میری وجہ سے اتنا قاتل زخم کھایا ہے۔ ٹیبولٹ کی بدزبانی نے میری عزت و حرمت پر ہزار ہا حملے کرکے اسے داغدار کر دیا ہے——— ٹیبولٹ جو ایک گھنٹہ ہوا میرا رشتہ دار قرار پایا ہے۔ آہ! پیاری جولیٹ! تیرے زہرہ گداز حسن نے مجھے موم کی ناک بنا دیا ہے اور میرے دل کی فولادی جرأت و ہمت میں نرمی داخل کر دی ہے۔

(بینوولیو دوبارہ آتا ہے)

بینوولیو۔ رومیو! رومیو! بہادر مرکوشیو مر گیا۔ اس بہادر روح نے جو قبل از وقت اس ذلیل مٹی سے نفرت کرنے لگی تھی ایک ہی جست میں بادلوں کے قافلے کو گردِ راہ بنا دیا۔

رومیو۔ آج کے دن کی سیاہ کاریاں اپنے تاریک اثرات سے دوسرے دنوں کو بھی بھیانک بنا رہی ہیں ابھی تو ابتدا ہوئی ہے انجام بھی دیکھنا ہے۔

(ٹیبولٹ آتا ہے)

بینوولیو۔ وہ وحشی ٹیبولٹ پھر آگیا۔

رومیو۔ ابھی زندہ ہے۔ اپنی فتح پر اترا رہا ہے اور مرکوشیو قتل ہو چکا شرافت اور رحمدلی ہٹ جا میرے سینے سے! اور اپنی جگہ جنت میں ڈھونڈ۔ آتش بار آنکھوں والے غیظ و غضب آ اور میرے طرزِ عمل کے سانچے میں ڈھل جا۔ ٹیبولٹ! تو نے ابھی ابھی مجھے کہا تھا۔ اب میں تجھے بدمعاش کہتا ہوں کیونکہ مرکوشیو کی روح سروں سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑی تیری روح کا انتظار کر رہی ہے کہ وہ آئے اور دونوں اکٹھے اپنے مستقر کی طرف پرواز کریں، یا تو یا میں یا ہم دونوں کو اس کے ساتھ جانا ہی ہوگا۔

ٹیبولٹ۔ تو کمینے۔ جو اس دنیا میں اس کا ہم نوالہ و ہم پیالہ تھا تو ہی اس کے ساتھ جائے گا۔

رومیو۔ اس کا فیصلہ تلوار کرے گی۔

(لڑتے ہیں۔ ٹیبولٹ چکرا کر گرتا ہے)

بینوولیو۔ رومیو! جاؤ بھاگ جاؤ۔ شہری آگئے اور ٹیبولٹ قتل ہو گیا اس طرح حیران و ششدر بت نہ بن جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ اگر بادشاہ سلامت نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو موت تمہارے لئے مقدر ہو جائیگی اس لئے بھاگ جاؤ۔ جاؤ چلے جاؤ۔

رومیو۔ اُف تقدیر نے مجھے اپنے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا لیا ہے۔

بینوولیو۔ کھڑے کیوں ہو یہاں؟

(رومیو جاتا ہے۔ شہری اور شہر کے سنتری آتے ہیں ایک غوغا برپا ہوتا ہے)

کپتان۔ مرکوشیو کا قاتل کس طرف کو بھاگا ہے! وہ قاتل ٹیبولٹ کس طرف گیا؟

بینوولیو۔ وہ پڑا ہے ٹیبولٹ۔

کپتان۔ (بینوولیو سے) چلئے جناب! میرے ساتھ میں آپ کو شاہ معظم کے نام پر گرفتار کرتا ہوں حکم کی تعمیل کی جائے۔

(بادشاہ اپنے حواریوں سمیت آتا ہے۔ مانٹیگ، کاپولیٹ اور ان کی بیویاں ساتھ ہیں)

بادشاہ۔ کہاں ہیں وہ بدمعاش جنھوں نے اس بارود کو آگ دکھائی؟

بینوولیو۔ شاہِ شوکت پناہ! غلام اس خونیں لڑائی کی حسرتناک تفصیل کی وضاحت کر سکتا ہے۔ وہ شخص جو رومیو کے ہاتھوں خاک و خون میں تڑپا رہی ہے جس نے حضور والا کے دودمان ذیشان کے ایک بہادر رکن مرکوشیو کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

بیگم کاپولیٹ۔ ہائے ٹیبولٹ میرے بچے! میرے بھائی کی آنکھ کے تارے! آہ شاہِ معظم میرے سرتاج! میرے جگر گوشہ کا خون بکھرا پڑا ہے۔ شاہ عالی حضور کی عدل گستری زبان زدِ خاص و عام ہے۔ جس طرح ہمارا خون بہایا گیا ہے اس طرح مانٹیگ والوں کے خون سے اس زمین کی پیاس بجھائی جائے۔ ہائے میرے بچے! میرے بھتیجے

بادشاہ ۔ بینوویو! بیان کرو یہ لڑائی کس سے شروع ہوئی؟

بینوویلو ۔ مقتول ٹیبالٹ کو رومیو کے ہاتھوں نے موت کے جبڑوں میں بھیج ڈالا ہے۔ رومیو نے اس کے ساتھ انتہائی ملائمت کی باتیں کیں اور اسے سمجھایا کہ لڑائی کی اصل بنیاد فاک بھی نہیں ہے اور اسے خاص طور پر زور دیکر یہ بات کہی کہ حضور پرنور اس قسم کے دنگا فساد کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ بڑی نرم آواز، بڑے پرسکون طرز عمل اور عاجزی سے گھٹنے ٹیک کر کہا گیا لیکن ٹیبولٹ کے جس نے امن و امان کے خلاف اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ اس نے بہادر مرکوشیو کے سینے پر تلوار کی نوک جھکا دی مرکوشیو اس وقت تک غصے سے آگ ببھوکا ہو رہے تھے انھوں نے بھی تلوار نکال لی وار پر وار چلنے لگے۔ بہادر مرکوشیو ایک پختہ کار شمشیر باز کی طرح اپنے ایک ہاتھ سے بروقت ان موت کے منہ پر طمانچے دے دے کر اسے پرے ہٹاتے رہے اور دوسرے ہاتھ سے تلوار کے وہ وہ وار کرتے رہے جن کی ہر سنسناہٹ موت کی آواز تھی لیکن ٹیبولٹ کی چابکدستی نے ان سب واروں کو خالی جانے دیا۔ رومیو آواز سے پکارا۔ "دوستو! تلواریں چھوڑ دو ـــ دوستو ہاتھ روکو" اور وہ ان کے درمیان کود پڑا۔ اس کے مضبوط آہنی بازو اس کی آواز سے زیادہ تیزی کے ساتھ ان خوفناک تلواروں کو گراتے رہے اسی اثنا میں ٹیبولٹ نے اس کے بازو کی آڑ لیکر مرکوشیو کی زندگی پر ایک کاری وار کیا اور دم دبا کر بھاگا لیکن کچھ ہی دیر بعد پھر پلٹا اور رومیو کے پاس آیا۔ رومیو اس وقت انتقام کے فوراً امیدہ جوش سے بھرا ہوا تھا۔ یہ دونوں بھی سرعت سے ایک دوسرے پر جھپٹے اور اس سے پہلے کہ میں ان دونوں میں بیچ بچاؤ کرنے کے لئے تلوار نکال سکوں ہیلین ٹیبولٹ زمین پر تڑپ رہا تھا وہ جونہی گرا رومیو نے راہ فرار اختیار کرلی۔ یہ ہے سچی بات اور اگر یہ جھوٹی ثابت ہوئی تو بینوویلو کی جان حاضر ہے۔

بادشاہ ۔ رومیو نے اسے قتل کیا اور اس نے مرکوشیو کے خون میں ہاتھ رنگے اب اس قیمتی جان کا خون کس کے سر ہے؟

مانٹیگ ۔ شاہ عالی! رومیو اس بات کے لئے مجرم نہیں ٹھہرایا جا سکتا اس نے وہی کیا جو قانون کو کرنا تھا۔ ٹیبولٹ کی جان لے لی۔

بادشاہ ۔ اور اس جرم کے بدلے ہم اسے اسی وقت سے شہر بدر کرتے ہیں تمھاری باہمی نفرت نے مجھے بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور ہمیں بھی اس سے تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ تمھارے اس نفرت انگیز فسادات کی بدولت ہمارے اپنے خاندان کا ایک فرد خون میں ڈوب گیا ہے۔ اس دفعہ تم پر سزا کا اتنا بھاری بوجھ لاد دیا جائیگا کہ تمھیں ہمارے نقصان پر بھی آنسو بہانا پڑیں گے۔ تمھارے آنسو اور تمھاری التجائیں ہمیں قانون کی گرفت کو ڈھیلا کر دینے پر مائل نہ کر سکیں گی اس لئے ان میں سے کسی کو ضائع کرنے کی کوشش نہ کرو۔ آج اور ابھی رومیو جتنی جلدی جا سکے ہماری مملکت کو چھوڑ دے اگر وہ آج کے بعد کہیں پھرتا پھراتا دیکھ لیا گیا تو اس کی موت یقینی ہے۔ یہ لاش یہاں سے اٹھاؤ اور ہمارے مزید احکامات کے منتظر رہو۔ رحم و کرم اور قاتل کے لئے عفو و معافی بہت سے قاتل پیدا کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔

دوسرا منظر

(کاپولیٹ کے گھر کا ایک کمرہ ۔ نصف اسٹیج ۔ جولیٹ بیتابی سے انتظار کر رہی ہے)

جیولیٹ ۔ نعل در آتش گھوڑو! فوبیس کے گھر کی طرف سرپٹ بھاگو کاش فیٹن جیسا گاڑیبان تمھیں کوڑے پر کوڑا مارتا مغرب کی طرف لے جائے اور ابر آلود رات جلد از جلد آجائے اے عشق پرور رات اپنے پردے تان دے تاکہ آوارگی پیشہ بدمعاشوں کی آنکھوں میں دھول پڑ جائے اور میرا رومیو کسی کی آنکھوں میں یا کسی کے منہ میں آئے بغیر اچھل کر میری گود میں آجائے۔ محبت کرنے والے دل اپنی عاشقانہ رسوم کی ادائیگی کے لئے اپنے حسن کی مشعل سے روشنی کر لیتے ہیں اور اگر عشق اندھا ہے تو رات ہی اس کے لئے مناسب ہے۔ متین رات۔ متانت کے لباس سے آراستہ بہن! سر سے پاؤں تک تاریکیوں میں لپٹے ہوئے جلیل اور مجھے جیتی ہوئی بازی کو ہرنے کا سبق دے۔ اپنے سیاہ لبادے میں میرے ناتجربہ کار خون کو چھپا لے جو میرے چہرے کو گلنار کیے دیتا ہے اور اس وقت تک چھپائے رکھ جب تک کہ یہ نامحرم محبوب ہمت کرکے میرے حجاب کو حقیقی محبت کا ایک پہلو نہ سمجھ لے۔ رات آ! رومیو آ! رات کے وقت طلوع ہونے والے میری قسمت کے روز روشن آ۔ تو رات کے پروں پر اس طرح محو استراحت ہوگا جس طرح برف پہاڑی کوے کے پروں پر بسیرا کرلے مہربان رات! آ۔ تاریک پیشانی والی محبوب رات! آ میرا رومیو مجھے

ہوئے ہوئے اور جب میری زندگی کی شام آئے تو اسے لیکر چھوٹے چھوٹے ستاروں میں بانٹ لیجیو۔ ان ستاروں سے آسمانوں کا چہرہ اتنا خوبصورت اور نظر فریب ہو جائیگا کہ ساری دنیا چمکتے ہوئے سورج کی پرستش چھوڑ کر مجھے دل دے بیٹھے گی۔ میں نے محبت کا ایک عظیم الشان محل نقد دل کے بدلے خریدا ہے لیکن وہ ابھی تک میرے قبضے میں نہیں آیا۔ میں نے اپنی ہستی کو محبت کے بدلے بیچ دیا ہے لیکن ابھی اس سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ جس طرح کسی میلے کے دن کی رات اُس بے صبر بچے کے لئے جس کے پاس نئے کپڑے ہوں لیکن وہ پہن نہ سکے اضطراب انگیز ہوتی ہے اسی طرح یہ دن میرے لئے سوہانِ روح بنا ہُوا ہے۔

(آیا جھولی میں رسیاں ڈالے ہاتھ ملتی ہوئی آتی ہے)

میری آیا کوئی خبر لے کر آئی ہے اور ہر وہ زبان جو رومیو کا نام لے سکتی ہے ملکوتی فصاحت کے دریا بہا سکتی ہے۔ یہ تمھاری جھولی میں کیا ہے وہ رسیاں جنھیں رومیو نے لے جانے کے لئے کہا تھا؟

آیا۔ ہائے! ہاں رسیاں ہیں! —— (پھینک دیتی ہے)

جیولیٹ۔ ہائے ہائے کیا خبر لائی ہو؟ یہ تم ہاتھ کیوں ملے جاتی ہو؟

آیا۔ ہائے قسمت! وہ مارا گیا۔ وہ مر گیا مر گیا۔ بی بی ہمارا بیڑا غرق ہو گیا ہمارا کچھ باقی نہیں رہا۔ ہائے یہ منحوس دن! وہ مر گیا، قتل ہو گیا مر گیا

جیولیٹ۔ کیا خدا بھی ایسا سنگدل ہو سکتا ہے؟

آیا۔ اگر خدا نہیں تو رومیو ہو سکتا ہے۔ ہائے رومیو! رومیو! کسے یہ امید ہو سکتی تھی؟ رومیو! کون مان سکتا تھا؟

جیولیٹ۔ شیطان کی طرح میرے دل پر کچوکے لگانے سے تمھیں کیا حاصل ہوگا۔ جہنم کی یہ بھیانک آوازیں جہنم ہی کے لئے وقف رہنے دو۔ کیا رومیو نے خودکشی کر لی۔ صرف ہاں کہہ دو۔ اور یہ ایک لفظ افعی کی موت میں بجھے ہوئے تیر برسانے والی آنکھوں سے کہیں زیادہ قاتل زہر میری نس نس میں سرایت کر دیگا۔ اگر تمھیں ہاں کہنے پر مجبور کر دینے والی بند آنکھیں واقعی بند ہو چکی ہیں اگر تم ہاں کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتیں تو مجھے مُردہ سمجھو۔ اگر وہ مارا گیا تو ہاں کہو اور اگر نہیں تو نہیں۔ ان دونوں لفظوں میں میری زندگی اور موت کا فیصلہ ہے۔

آیا۔ میں نے دیکھا وہ زخم! خود اپنی آنکھوں سے اس زخم کو دیکھا ہے، میں نے، ہائے چشمِ بد دور، اس چوڑے چکلے سینہ پر۔ ہائے وہ شیر کا لاشہ کتنا رلانے والا تھا۔ کتنا دردناک تھا، وہ شیر زرد پڑ گیا تھا، راکھ کے ڈھیر کی طرح زرد۔ اور خون، ہائے خون میں لوٹ رہا تھا خون کے لوتھڑے اُف! یہ دیکھ کر میں —— ہائے میں بیہوش ہو گئی تھی —— !

جیولیٹ۔ او بدنصیب دل پاش پاش ہو جا۔ پھٹ جا، ٹکڑے ٹکڑے ہو جا، دیوالیئے، قید و بند کے آہنیں دروازو بند ہو جاؤ، ہمیشہ کے لئے اور آنکھو! بدنصیب آنکھو! کھرچ ڈالو اپنے ذہن پر سے آزادی کی تمنا۔ مٹی کے کمزور، بدنصیب کھلونے مل جا مٹی میں اور ہمیشہ کے لئے گم ہو جا۔ جا اپنے رومیو کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسی کے کفن میں ہمیشہ کے لئے سو جا۔

آیا۔ ٹیبولٹ! او ٹیبولٹ میرے بہترین دوست ٹیبولٹ! کاش میں تمھاری لاش دیکھنے سے پہلے مر جاتی۔

جیولیٹ۔ کیا طوفان ہے۔ یہ جو ایک ہی وقت میں دو مخالف سمتوں سے بے زنجیر ہو گیا۔ کیا رومیو قتل کر دیا گیا۔ اور ٹیبولٹ مار ڈالا گیا میرا پیارا بھائی اور میری جان میرا سرتاج۔ تو پھر اسرافیل اپنا صور پھونک دے قیامت کو چونکا۔ کیونکہ ان دونوں کی موت کے بعد زندگی میں دھرا کیا ہے!

آیا۔ ٹیبولٹ مار ڈالا گیا اور رومیو کو شہر بدر کر دیا گیا۔ رومیو جس نے ٹیبولٹ کو مارا شہر بدر کر دیا گیا۔

جیولیٹ۔ اف! الٰہی توبہ! کیا رومیو کے ہاتھوں نے ٹیبولٹ کا خون بہایا!

آیا۔ ہاں ہاں اسی نے۔ اسی نے ہائے میرے مولا اُسی نے!

جیولیٹ۔ اف پھول جیسے چہرے والے زہریلے ناگ۔ کیا خونناک اژدھے کے لئے ایسا نظر فریب غار بھی کبھی دیکھا گیا ہے۔ حسین جلاد۔ فرشتہ صورت شیطان! راج ہنس کے بال و پر سے مزین پہاڑی کوّے۔ بھیڑ کی کھال میں چھپے ہوئے بھیڑیئے۔ ملکوتی غلاف میں لپٹی ہوئی بھیانک ذلت۔ اپنے ظاہر کے ٹھیک اُلٹ دوزخی ولی، باعزت بدمعاش، اُف فطرت، ایک شیطان کی قاتل روح کو ایک فانی جنت میں جگہ دیتے وقت تو جہنم میں کس کام سے گئی تھی۔ کیا کبھی کسی گندی کتاب کو ایسا حسین گردپوش ملا ہے؟ کیا آفت ہے کہ دھوکا ایسے حسین محل کا مالک قرار پائے

آیا۔ ان مردوں میں کوئی بھی قابلِ اعتبار نہیں۔ کسی پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ کسی کو ایماندار نہیں کہا جا سکتا۔ سب کے سب کمینے سب بے وفا۔ سب بے غیرت اور سب ڈھونگی ہیں۔ آہ! میرا نوکر کہاں ہے مجھے کچھ شراب وغیرہ دو۔ یہ رنج، یہ غم، یہ مصیبتیں میری جوانی کو

بڑھاپے میں بدل رہی ہیں۔ رومیو کو شرم چاہیئے۔

جیولیٹ ۔ ایسے الفاظ کہنے والے کی جلے زبان! اس پیشانی پر شرم کو اپنا اثر چھوڑتے ہوئے شرم آگئی۔ وہ پیشانی شرم کے لئے نہیں بنائی نہیں گئی بلکہ بنائی گئی تھی اس لئے کہ عظمت و سطوت کو اس سنگھاسن پر بٹھاکر دنیا کی بادشاہی کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا جائے افسوس کہ وہ ہوں میں بھی انھیں ایسے ایسے کلمے کہہ ڈالے۔

آیا ۔ کیا تم اسے دعا دوگی جس نے تمھارے چچازاد بھائی کو مار ڈالا؟

جیولیٹ ۔ اور کیا میں اسے بددعا دوں جو میرے سر کا تاج ہے۔ ہائے ہائے میں قربان میرے سرتاج! جب میں نے ہی جسے آپ کی لونڈی بنے ابھی تین گھنٹے گزرے ہیں اپنی ہی زبان سے آپ کو ایسا برا بھلا کہا ہے تو پھر اور کس کی زبان ہوگی جو اچھا چاہیگی لیکن میرے چچازاد بھائی کو قتل کیوں کیا تھا؟ آپ بڑے رذیل ہیں۔ لیکن اس بدمعاش چچازاد بھائی نے میرے خاوند کے دشمنوں پر ہاتھ کیوں اٹھایا؟ جاؤ جاؤ اے آنسو! جاؤ اپنے اصلی منبع میں کیونکہ تمھاری نمکینی رنج و غم سے سنواری گئی ہے اور غلطی سے رنج و غم کے اس فرض کو مسرت و شادمانی کی جوکھٹ پر چڑھایا جارہا ہے۔ میرا سرتاج زندہ ہے۔ بہت ممکن تھا کہ وہ ٹیبولٹ انھیں ہی قتل کردیتا اور وہ ٹیبولٹ جو ممکن ہے کہ میرے خاوند کو قتل کردیتا ہمیشہ کی نیند سو گیا ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔ تو پھر یہ آنسو بھری آنکھیں کیسی؟ ہاں وہ لفظ بھی تھے جو ٹیبولٹ کی موت سے کہیں زیادہ بھیانک تھے۔ انھوں نے میرے کلیجے میں زہر بجھے خنجر بھونک دیئے ہیں۔ انھیں بھول جانا چاہتی ہوں لیکن ہائے میرے اللہ وہ میرے ذہن پر خوفناک شعلوں کی طرح رقص کر رہے ہیں۔ جس طرح سیاہ کار گنہگاروں کے گناہ ان کے ضمیر پر ——— ٹیبولٹ مر گیا اور رومیو ——— شہر بدر کردیا گیا، شہر بدر، ہائے یہی ایک لفظ شہر بدر کردیا گیا دس ہزار ٹیبولٹ کی موت سے زیادہ ہولناک ہے۔ ٹیبولٹ کی موت خاصہ جگرخراش رنج تھا اگر یہ یہیں تک ختم ہوجاتا یا اگر یہ روح گداز غم ایک آدھ ساتھی کی صحبت چاہتے ہیں اور ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ساتھ آنسوؤں کی ایک قطار لائیں تو پھر جب اس نے کہا کہ ٹیبولٹ مر گیا ہے تو اس کے ساتھ یہ کیوں نہیں کہہ دیا "تمھارا باپ" یا "تمھاری ماں" نہیں بلکہ دونوں مر گئے ہیں اس سے میری آنکھیں کافی آنسو بہادیتیں۔ لیکن یہ کہنا کہ ٹیبولٹ مر گیا اور اس کے بعد ——— اس کے بعد رومیو شہر بدر کردیا گیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ باپ، ماں، ٹیبالٹ، رومیو، جیولیٹ سب کے سب قتل کردیئے گئے۔ مار ڈالے گئے۔ رومیو شہر بدر کردیا گیا! آہ اس لفظ میں وہ موت ہے جس کا انجام نہیں۔ جس کی حد نہیں، جس کا حساب نہیں، اس غم کی آواز کسی اور لفظ کر ظاہر نہیں کی جاسکتی۔ آیا! امی اور ابا جان کہاں ہیں؟

آیا ۔ ٹیبولٹ کے جنازے پر بیٹھے آہ و زاری کر رہے ہیں۔ چلوگی تم بھی چلو لے چلوں؟

جیولیٹ ۔ وہ اس کے زخموں کو اپنے آنسوؤں سے دھو رہے ہیں جب ان کے آنسو خشک ہوجائینگے تو رومیو کے اس طرح نکال دیئے جانے پر میرے آنسو خرچ ہونگے۔ بدنصیب رومیو انھیں بھی اور مجھے بھی۔ آہ! ہم دونوں کو دھوکہ دیا گیا۔ رومیو کو شہر سے نکال دیا گیا۔ اسی نے مجھ تک پہنچنے کے لئے تمھیں ذریعہ بنایا تھا۔ لیکن میں جیسی کنواری تھی ویسی کی ویسی ہی بیوگی کے جہنم میں جھونک دی گئی۔ آؤ میرے عزیز رومیو! ——— آیا آؤ! میں اپنی خوابگاہ میں جاتی ہوں۔

آیا ۔ ہاں ہاں تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں رومیو کو بلاتی ہوں کہ تمھیں تسلی تشفی دے۔ میں اس کا اتہ پتہ خوب جانتی ہوں۔ سنتی ہو تمھارا رومیو آج رات کو تمھارے پاس آئیگا۔ میں اسے کہہ آتی ہوں وہ فرایر لارنس کی کٹی میں چھپا ہوا ہے۔

جیولیٹ ۔ اسے ڈھونڈو جہاں بھی ہو اور میرے دل کے راجہ کو یہ انگوٹھی دے کر اسے کہنا آج آخری دفعہ خدا حافظ کہنے کے لئے چلے آؤ۔ (آیا دھیرے دھیرے باہر جاتی ہے)

تیسرا منظر

(فرایر لارنس کی کٹی۔ نصف اسٹیج۔ فرایر لارنس رومیو کو جو دوسرے کمرے میں ہے بلاتا ہے)

فرایر ۔ رومیو باہر آؤ۔ باہر آ خوف و دہشت کے پتلے! مصائب تیرے جسم کا ایک حصہ بن گئے ہیں اور تجھے رنج و افسوس کے ساتھ جکڑ دیا گیا ہے۔ (رومیو اندر سے آتا ہے)

رومیو ۔ فادر! کیا خبر لائے؟ شاہ عالی نے کیا حکم فرمایا ہے۔ کون سے آلام باقی ہیں جنھیں ابھی مجھ سے متعارف ہونا ہے۔

فرایر ۔ میرا عزیز بچہ اس قسم کی جگرخراش صحبتوں کا عادی ہوگیا ہے۔

میں شاہ عالی کے رحیمانہ احکام تم تک لایا ہوں۔

رومیو۔ کیا شاہ نے میری سزا کیلئے موت سے کچھ ہلکا لفظ استعمال فرمایا ہے؟

فرایر۔ بہت معمولی سی سزا اتفاقاً ان کے ہونٹوں سے نکل گئی۔ تمہارے جسم کو موت کے حوالے نہیں کیا جائیگا بلکہ اسے جلاوطن کردیا جائیگا۔

رومیو۔ آہ جلاوطنی! رحم رحم! موت کہئے، کیونکہ جلاوطنی کی آنکھیں موت سے کہیں زیادہ بھیانک اور دہشت افزا ہیں۔ یہ نہ کہئے کہ میں جلاوطن کردیا گیا ہوں۔

فرایر۔ تمہیں آج ویرونہ سے جانا ہوگا۔ صبر سے کام لو۔ دنیا تنگ نہیں ہے۔

رومیو۔ ویرونہ کی دیواروں سے باہر میری دنیا نہیں بلکہ آلام ہیں — مصایب ہیں بلکہ خود جہنم منہ پھاڑے کھڑا ہے۔ اس لئے جلاوطن ہو جانا دنیا سے نکال دیا جانا ہے اور دنیا سے دیس نکالا موت ہے۔ موت کی کراہتوں کو ایک خوبصورت لفظ میں چھپا دیا گیا ہے تو آپ جلاوطنی کا نام دیکر آپ مجھے سونے کے برچھے سے قتل کر رہے ہیں اور اس ہلاکت آفریں ضرب پر مسکراہٹ کے پھول برسا رہے ہیں جو مجھے موت کے کنوئیں میں دھکیل رہی ہے۔

فرایر۔ اف کتنا بھیانک گناہ! کس قدر افسوسناک کفران نعمت ہے۔ یہ قانون کی نظروں میں تمہارا جرم موت کا مستحق ہے لیکن رحمدل شاہ نے تمہاری طرفداری کرتے ہوئے قانون کو پس پشت ڈال دیا اور موت کے تاریک لفظ کو جلاوطنی میں بدل دیا۔ رحم و کرم کی کتنی نادر اور پیاری مثال ہے یہ! اور تم اس کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہو۔

رومیو۔ یہ ظلم ہے۔ رحم نہیں۔ جہاں جیولیٹ سانس لیتی ہے وہاں جنت آباد ہے اور ہر کتا۔ بلی۔ چوہا اور ہر ذلیل سے ذلیل چیز بھی اس کی معطر سانسوں سے مہکی ہوئی اس جنت میں رہ کر اس کے نظر افروز دیدار سے بہرہ یاب ہوسکتی ہے لیکن ایک رومیو ہے کہ اس سے محروم کردیا گیا ہے۔ بھنبھناتی ہوئی ذلیل گندی مکھیاں رومیو سے زیادہ باعزت، زیادہ وقیع اور قابل التفات ہیں یہ سب پیاری جولیٹ کے ہاتھوں کی حیرت افزا نفاست اور پاکیزگی پر قبضہ کرسکتی ہیں اور اس کے ان ہونٹوں سے جن کا طبعی حجاب باہم گر پیوست ہو جانے کو بھی گناہ سمجھ کر سیندور کی طرح اس کے چہرے پر کھنڈ جاتا ہے غیر فانی اور لامحدود مسرت چرا سکتی ہیں لیکن رومیو کے لئے یہ سب دروازے بند ہیں اور وہ جلاوطن کردیا گیا ہے۔ یہ مکھیاں اس جنت میں داخل ہوسکتی ہیں لیکن رومیو کو سر پر پیر رکھ کر بھاگنا ہوگا۔ انہیں آزادی کے پر و بال حاصل ہیں اور مجھے جلاوطنی کی قید میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ اور اس پر آپ کہتے ہیں جلاوطنی موت نہیں، کیا اس جلاوطنی کے سوا آپ کے پاس کوئی اور قاتل زہر نہیں تھا؟ کوئی تیز دھار والا خنجر نہیں تھا کوئی اور ایسا طریقہ نہیں تھا جس سے میری فوری موت ہوسکتی؟ جلاوطن ——— ! او فرایر! جہنم میں تڑپنے والے اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ نالہ و فریاد آہ و شیون میں لپٹا ہوا ہے آپ ایک مقدس انسان، میرے پیر و مرشد، گناہوں کو دور کرنے والے میرے سچے دوست، آپ کے دل نے یہ کس طرح برداشت کرلیا کہ ایسے گند خنجر ——— اس جلاوطنی کے گندآلے سے میرے قلب و جگر کو کاٹ کاٹ کر پھینک دیا جائے!۔

فرایر۔ ارے بیوقوف! دیوانے، میری بات تو سن!

رومیو۔ آپ جلاوطنی کے سوا اور کہہ ہی کیا سکتے ہیں؟

فرایر۔ میں تمہیں وہ سپر دیتا ہوں۔ جس سے اس لفظ کی تلخیاں تم پر حملہ نہ کرسکیں گی۔ میں تمہیں فلسفہ دیتا ہوں جو ایسی غذا ہے جس سے رنج و غم کی تلخیاں شیرینی میں بدل جاتی ہیں۔ باوجودیکہ تم جلاوطن کردیئے گئے ہو لیکن پھر بھی اس کی مدد سے تمہیں سکون ملیگا۔

رومیو۔ پھر وہی جلاوطن! لعنت بھیجئے اس فلسفے پر۔ جو فلسفہ ایک جیولیٹ کی تشکیل نہیں کرسکتا۔ جو فلسفہ اس شہر کو میرے ساتھ جلاوطن نہیں کرسکتا۔ جو ایک بادشاہ کے احکام بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا وہ بے معنی ہے۔ بیکار ہے، اس کا نام نہ لیجئے۔

فرایر۔ میں سمجھا، دیوانے بہرے بھی ہوتے ہیں۔

رومیو۔ ہونا ہی چاہیئے جب فرزانے آنکھوں سے محروم کردیئے گئے ہوں۔

فرایر۔ دیکھو! میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہاری اس وقت کیا کیفیت ہے؟

رومیو۔ آپ اس چیز کے متعلق کیا کہیں گے جسے آپ محسوس ہی نہیں کرسکتے۔ اگر آپ کی رگوں میں بھی میری طرح جوانی کا خون ہوتا آپ بھی جولیٹ کی شمع رخسار کے پروانے ہوتے اگر آپ کی شادی کو بھی صرف ایک گھنٹہ گزرا ہوتا۔ ٹیبولٹ قتل ہوگیا ہوتا۔ آپ بھی میری طرح چھپنے کے لئے بل ڈھونڈتے پھرتے اور جلاوطن کردیئے جاتے تب آپ میری طرح زبان کھول سکتے تھے۔ تب آپ اپنے بالوں کو نوچ نوچ کر میری طرح اس خاک پر تڑپتے۔

(رومیو زمین پر گر پڑتا ہے اور اسی وقت دروازے پر دستک ہوتی ہے)

فرایر۔ اٹھو اٹھو! دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے کوئی۔ اچھے رومیو! چھپ جاؤ۔

رومیو - ہرگز نہیں، اس وقت تک نہیں جب تک کہ میرے دکھی دل سے نکلنے والی کہر آسا آہیں مجھے اپنی کثافت میں لپیٹ کر پردہ پوش نہ کر دیں۔ (دوبارہ دستک)

فرایر - سنو! کس بُری طرح کھٹکھٹا رہے ہیں دروازہ! (آواز سے) کون ہے؟ (رومیو سے) اٹھو رومیو! پکڑ لئے جاؤ گے (دستک دوبارہ دی جاتی ہے) (آواز سے) ذرا ٹھہرو! (رومیو سے) اٹھو میرے پڑھنے کے کمرے میں جا کر چھپ جاؤ۔ (دستک دہرائی جاتی ہے) ذو پکارتا ہے) ابھی آیا (دستک)۔ (رومیو سے) خداوندا! یہ کیا حماقت ہے؟ (دستک جاری ہے) آیا بھئی آیا! یہ کون ہے جو دروازہ توڑے دیتا ہے؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟

آیا - (باہر سے) دروازہ کھولئے تو کچھ کہوں۔ میں بیگم جیولیٹ کے یہاں سے آئی ہوں۔

فرایر - (دروازہ کھولتے ہوئے) تو خوش آمدید! (آیا آتی ہے)

آیا - مقدس فرایر! جلدی بتایئے مقدس فرایر! میری بی بی کے مالک کہاں ہیں؟ رومیو کہاں ہے؟

فرایر - وہ دیکھو! اپنے آنسوؤں کی شراب سے بدمست زمین پر اوندھا پڑا ہے۔

آیا - یہی میری بی بی والی حالت! وہی حالت ہے اس کی بھی۔ ہائے کس قدر افسوسناک ہے یہ ہمدردی۔ وہ بھی اسی طرح پڑی ہیں، وہی حالت ہے ان کی بھی۔ انھیں دیکھ کر مجھے بڑا رحم آتا ہے۔ رو رو کر آنکھیں پھوڑے لیتی ہیں۔ کلّے اور آنکھیں ان کی یوں سوجی پڑی ہیں۔ اٹھو! اٹھو جی! تم تو مرد ہو۔ جیولیٹ کی خاطر اٹھو اسی کے لئے اٹھ کر ذرا کھڑے ہو جاؤ۔ آخر تم نے یہ ہائے وائے کیوں مچا رکھی ہے۔

رومیو - آیا ــــ!

آیا - جناب عالی! حضور! ہم سب کو ایک نہ ایک دن آخر مرنا ہی ہے۔

رومیو - تم نے جیولیٹ کے متعلق کچھ کہا تھا؟ وہ کیسی ہے؟ کیا وہ مجھے ایک کہنہ مشق قاتل نہیں سمجھتی۔ جس نے خود اسی کے خون سے اس کی اور اپنی نوزائیدہ مسرت کا ماتھا رنگ دیا۔ کہاں ہے وہ؟ کیسی ہے میری خفیہ بیوی؟ ہماری اس غروب ہوتی ہوئی محبت کے متعلق کیا کہتی ہے؟

آیا - وہ کچھ بھی تو نہیں کہتی۔ وہ تو صرف روتی ہے اور رو رو کے گھائل ہوئی جاتی ہے۔ اب بستر پر گری اور پھر تڑپ کر اٹھ بیٹھی اور ٹیبولٹ کا نام لے کر رونے لگی۔ پھر رومیو کا نام لیکر دہاڑیں مارنے لگی۔ پھر دھپ سے بستر پر گر پڑی۔

رومیو - گویا جس طرح اس نام والے کے لعنتی ہاتھوں نے اس کے ایک عزیز کو خاک و خون میں ملا دیا اسی طرح یہ نام بھی خوفناک بندوقچہ کی سینے کی طرف جھکی ہوئی نالی کی طرح اس کی زندگی کو چھین لینا چاہتا ہے۔ او فرایر! مجھے بتایئے۔ لِلّٰہ بتایئے کہ جسم کی اس کراہت انگیز قبرگاہ کا کون سا حصہ ہے جس میں یہ منحوس نام بسیرا کئے ہوئے ہے۔ مجھے بتایئے تاکہ میں اس نفرت انگیز جھونپڑے کی بنیادیں اکھاڑ دوں۔

(سینے میں خنجر بھونکنا چاہتا ہے۔ آیا خنجر چھین لیتی ہے)

فرایر - اپنے مایوس ہاتھوں کو عقل کی لگام دو۔ رومیو! کیا تم بھی مرد ہو؟ تمھاری شکل و صورت تو پکار پکار کر یہی کہہ رہی ہے لیکن تمھارے یہ آنسو عورتوں کو بھی شرمندہ کر رہے ہیں۔ تمھاری یہ وحشیانہ حرکتیں درندوں کے دیوانہ وار غیظ و غضب سے مشابہ ہیں مرد کی نقاب میں چھپی ہوئی ایک عورت، بلکہ ان دونوں کی نقاب میں چھپا ہوا ایک کراہت انگیز درندہ! میں تو حیران ہو گیا ہوں تمھیں دیکھ کر۔ کلیسائے مقدس کی قسم! میں سمجھتا تھا کہ تمھاری طبیعت عقل سے واقف ہے۔ کیا تمھیں ہو ٹیبولٹ کے قاتل؟ اور اب اپنے آپ کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے ہو؟ اور اپنی ذات پر یہ جہنمی عذاب نازل کر کے تم اپنی اس محبوبہ کو بھی ہمیشہ کی نیند سلا دینا چاہتے ہو جو تمھارے جینے سے زندہ ہے۔ اپنے خاندان اپنی اس جنت اور اپنی اس حسین مٹی پر دانت پکچپانے سے تمھیں کیا مل جائے گا۔ صورت۔ جنت اور اس مٹی کی سہ گانہ قوتیں بیک وقت تم میں مرکوز کر دی گئی ہیں اور تم ان تینوں کو دفعتہً کھو بیٹھو گے۔ تف! تف! تم اپنی صورت اور اپنی ذہنی قوتوں کی تذلیل کر رہے ہو۔ جو ایک سود خوار کی دولت کی طرح مقدار اور تعداد میں تو زیادہ ہے لیکن جس کا استعمال نہیں ہو رہا۔ ایسا جائز اور مستحسن استعمال، جو تمھاری صورت کو تمھاری محبت کو اور تمھاری ذہنی قوتوں کو چار چاند لگا دے۔ یہ متناسب اعضا جب مردانہ جراتوں سے محروم ہو جاتے ہیں تو یہ حسین جسم موم سے بنا ہوا ڈھانچہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس محبوبہ کا گلا گھونٹ دینا جسے تم نے تمام عمر گلے سے لگائے رکھنے کا عہد کیا تھا محبت کی ان بلند آہنگ قسموں کو محض ایک مجذوب کی بڑ ثابت کرتا ہے۔ ذہنی قوتیں، قلبی محبت اور جسمانی تناسب بھلا زیور ہیں۔ لیکن یہی چیزیں غلط طرز عمل سے بگڑ کر یہ تو

سپاہی کی مٹی میں بندھا ہوا بارود بن جاتی ہیں اور تمہارا وہ دفاعی حربہ تمہاری اپنی بیوقوفی سے آگ پکڑ کر تمہارے پرخچے اڑا دیتا ہے اٹھو! مرد بنو، تمہاری پیاری جیولیٹ جس کی محبت کے لئے تم ابھی ابھی موت کو پکار رہے تھے تمہارے لئے ابھی تک زندہ ہے۔ یہ تمہاری خوش نصیبی ہے۔ ٹیبولٹ تمہیں قتل کر دیتا لیکن تم نے اس خوفناک دشمن کو موت کی نیند سلا دیا۔ یہ تمہاری دوسری خوش نصیبی ہے کہ وہ قانون جس کے ذریعہ تمہاری موت کا حکم جاری کیا جاتا تھا تمہارا دوست بن گیا ہے اور تمہارے سنگین جرم کی سزا صرف جلاوطنی قرار پا چکی ہے۔ یہ بھی تمہاری خوش نصیبی ہے۔ قسمت — غصے سے چیں بہ جبیں وابرو کے کر توڑ جوڑ کی بجائے تم پر مسکراہٹوں کے پھول برسا رہی ہے۔ مسرتیں اپنی میٹھی موسیقی سے تمہیں اپنی طرف مائل کر رہی ہیں لیکن ایک بگڑی ہوئی ہٹیلی دوشیزہ کی طرح تم اپنی خوشیوں اور اپنی محبت پر ناک بھوں چڑھا رہے ہو۔ ہوشیار باش! خبردار! ایسے لوگوں کی موت انتہائی ہولناک ہوا کرتی ہے — جاؤ! اپنے اقرار کے مطابق اپنی محبوبہ کے کمرے میں جاؤ اور اسے تسلی دو لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ رات کا پہرہ بدلنے کے بعد نہ ٹھہرنا ورنہ مانچوا تک نہ پہنچ پاؤ گے اور اس وقت تک مانچوا ہی میں ٹھہرے رہو جب تک کہ ہم مناسب موقع دیکھ کر تمہاری شادی کا اعلان نہ کر دیں۔ تمہارے دوستوں کو راضی کر کے بادشاہ سے تمہارے لئے معافی کا پروانہ لیکر تمہیں واپس بلا لینگے اور اس وقت کی خوشی ان جدائی کی گھڑیوں سے لاکھ گنا زیادہ ہوگی۔ آیا تم آگے آگے جاؤ۔ اپنی بی بی کو میری طرف سے دعا دینا اور انھیں کہنا کہ ان کے گھرانے کے لوگ اپنے رنج کی وجہ سے بہت تھک چکے ہونگے اور آرام کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہونگے اس لئے انھیں جلد از جلد سونے پر راغب کر لیں رومیو آتا ہے

آیا — اللہ اللہ! واہ واہ ساری رات کھڑی ان باتوں کو سنتی رہوں تب بھی تکان قریب نہ آئے۔ کیا چیز ہے علم بھی — حضور والا میں بی بی سے کہدوں گی کہ آپ آ رہے ہیں۔

رومیو — ضرور کہنا اور میری پیاری سے کہنا کہ میری گوشمالی کرنے کی تیاری کر رکھے

(جانے کے لئے مڑتی ہے لیکن پھر پلٹتی ہے)

آیا — یہ انگوٹھی بی بی نے دی تھی اور کہا تھا کہ آپ کو دیدوں۔ (جاتی ہے)

رومیو — اس انگوٹھی نے میری مسرتوں میں نئی روح پھونک دی۔

فرایر — لو اب جاؤ۔ شب بخیر، تم سمجھ گئے ہونا — ساری بات پر دارومدار ہے یا تو تم رات کا پہرہ بدلنے سے پہلے پہلے چل دو اور یا پو پھٹتے وقت کپڑے بدل کر مانچوا کی طرف ہو لو۔ میں تمہارے ملازم کو ڈھونڈتا ہوں۔ وہ تمہیں یہاں کی تمام باتوں سے مطلع کرتا رہیگا۔ لاؤ ہاتھ لاؤ۔ کافی دیر ہو گئی۔ خدا حافظ، شب بخیر!

رومیو — آپ سے جدا ہونے کا رنج بہت ہی بیتاب پا ہے اور ایک خوشی سے ہزاروں خوشیاں پیدا ہوتی ہیں۔ خدا حافظ (جاتا ہے)

چوتھا منظر

(کاپولیٹ کے گھر کا ایک کمرہ نصف اسٹیج۔ کاپولیٹ، بیگم کاپولیٹ اور پیرس آتے ہیں)

کاپولیٹ — اے جناب! بدقسمتی سے حادثات کچھ ایسے پیش آئے کہ ہمیں اپنی بچی کا عندیہ معلوم کرنے کا وقت ہی نہ مل سکا۔ دیکھئے نا! اُسے اپنے بھائی ٹیبولٹ سے بیحد محبت تھی — مجھے بھی۔ سب کو لیک نہ ایک دن مرنا ہے۔ اب رات کافی گزر چکی ہے اور اس وقت وہ نیچے نہ آئیگی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ ہی کی وجہ تھی جو میں اس وقت یہاں ہوں ورنہ مجھے سوئے ایک گھنٹہ گذر گیا ہوتا۔

پیرس — ان غم آفریں دنوں میں کچھ موقع ہی نہیں ملا کہ میں اس کے دل میں اپنے لئے کچھ جگہ پیدا کر سکوں۔ شب بخیر! بیگم صاحبہ اپنی صاحبزادی سے میرا اسلام شوق کہئے گا۔

بیگم کاپولیٹ — ضرور، ضرور! اور میں آج صبح ہی صبح اس سے اس بارے میں پوچھونگی۔ آج تو وہ بیچاری غم سے ادھ موئی ہوئی پڑی ہے۔

کاپولیٹ — پیرس صاحب! میں اپنی بچی کے متعلق ایک بہت بڑی جرأت کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہر معاملے میں میری ہی رائے کی پابند رہے گی۔ نہیں مجھے اس میں ذرہ برابر شک نہیں۔ بیگم سونے سے پہلے تم اس کے کمرے میں جانا اور اسے عزیزی پیرس کی محبت سے مطلع کرنا اور اسے میری طرف سے کہنا۔ دیکھو غور سے سن لو — میری طرف سے کہنا کہ بدھ کے روز — لیکن ٹھہرو تو، آج کیا دن ہے؟

پیرس — آج پیر ہے۔

کاپولیٹ — پیر؟ او ہو بھئی پھر بدھ تو بہت ہی قریب ہے۔ اچھا تو پھر جمعرات کی بات پکی سمجھئے۔ تو اسے بتادو کہ جمعرات کے روز اس کی شادی اس شریف شہزادے سے کر دی جائیگی۔ آپ تیار ہو سکیں گے نا؟ ایسی جلدی آپ کو ناپسند تو نہ ہوگی؟ ہمیں کچھ ایسی دھوم دھام تو کرنی نہیں ہے۔ بس دو ایک دوست ہونگے۔ آپ جانیئے ٹیبولٹ کا قتل

بھی ابھی میلا نہیں ہوا اور تمھارے رشتہ دار قریبی۔ اگر ہم نے ٹھکے دکھائے گئے تو لوگ کہیں گے اس کی پروا نہ کی' اس لئے پانچ چھ دوست ہی آئیں گے اور بس' لیکن آپ کو منظور ہے یا نہ؟

پیرس۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جمعرات کل ہوتی۔

کپولیٹ۔ اچھا تو پھر تشریف لیجائیے۔ جمعرات کو ٹھہر گئی۔ تو بیگم سونے سے پہلے جیولیٹ کے کمرے میں چلی جانا اور اسے اس جمعرات کیلئے تیار کر لینا۔ خدا حافظ بندہ نواز! ارے ساد! ہمارے کمرے میں روشنی کرو۔ سچ کہتا ہوں بہت ہی دیر ہو گئی ہے۔ یو پھٹنے ہی کو ہے۔ شب بخیر! (سب جاتے ہیں)

پانچواں منظر

(جیولیٹ کا کمرہ' بالائی اسٹیج۔ رومیو اور جیولیٹ کھڑکی کے قریب کھڑے الوداع کہہ رہے ہیں)

جیولیٹ۔ اب تم چلے جاؤ گے؟ ابھی دن کے طلوع ہونے میں کافی دیر باقی ہے۔ یہ بلبل کی آواز تھی جس نے تمھاری سماعت میں نشتر بھونک دیئے تھے۔ لوا نہیں تھا۔ وہ ہر رات انار کے ان جھنڈوں میں گایا کرتی ہے۔ مانو بھی پیارے میں جانتی ہوں وہ بلبل ہی کی آواز تھی'

رومیو۔ یہ بلبل نہیں بلکہ صبح کا پیش رو لوا ہی تھا۔ دیکھو پیاری وہ ظالم شعاعیں مشرق کے ان سیدرد بادلوں پر روشنی کا حاشیہ ٹانک رہی ہیں رات کی شمعیں جل کر بجھ گئیں اور ہمارا تمسخر اڑانے والا دل کہر میں لپٹی ہوئی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پنجوں کے بل کھڑا ہے میرے جانے ہی میں میری جان کی خیر ہے اگر میں اور رکوں گا تو قتل کر دیا جاؤنگا۔

جیولیٹ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ روشنی دن کی روشنی نہیں بلکہ سورج شہاب اگل رہا ہے تاکہ آج کی رات تمھارے آگے آگے شمع بردار کے فرائض ادا کرے اور مانچوا تک تمہیں راستہ دکھاتا ہے اس لئے ابھی کچھ دیر ٹھہرو۔ ابھی جانے کی ضرورت نہیں!

رومیو۔ تو پھر مجھے گرفتار ہونے دو۔ قتل ہو جانے دو مجھے! اگر تمھیں یہی منظور ہے تو مجھے سر تسلیم خم کرنے میں کیوں عار ہو گی۔ میں کہونگا کہ افق پر کی وہ سفیدی ابھرتے ہوئے سورج کی آنکھ نہیں بلکہ چاند کی زرد پیشانی کا عکس ہے۔ نہیں وہ لوا نہیں تھا جس کے بلند آہنگ گیتوں نے آسمان کی بلند محراب میں گونج پیدا کر دی۔ مجھے یہاں ٹھہرنا جدا ہونے سے زیادہ پیارا ہے۔ موت! آ میں تیرا خیر مقدم کرتا ہوں میری جیولیٹ کا یہی حکم ہے۔ میری روح آؤ باتیں کریں۔ یہ دن نہیں۔

جیولیٹ۔ نہیں نہیں' یہ دن ہی ہے جلدی جاؤ۔ جاؤ۔ چھوڑ جاؤ مجھے یہ لوا ہی بے سرے پن سے گا رہا تھا۔ یہ وہی ہے جو گلا پھاڑ پھاڑ کر بے آہنگ نغمے اور تانیں اڑا رہا ہے۔ یہی گیت ہیں جدا کرتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ لوے اور مکروہ مینڈک نے آنکھیں بدل لی تھیں۔ آہ! کاش اس وقت وہ آواز بھی بدل لیتے لوے کی آواز شکاریوں کی بانگ صبحگاہی بن کر ہم دونوں کو ایک دوسرے کی آغوش سے جدا کئے دیتی ہے۔ جاؤ اب روشنی دم بدم بڑھتی جا رہی ہے

رومیو۔ اور بڑھتی ہوئی روشنی کے ہر قدم کے ساتھ ہمارے رنج و غم کی تیرگیوں میں اضافہ ہوا جاتا ہے۔ (آیا آتی ہے)

آیا۔ چھوٹی بی بی ——!

جیولیٹ۔ آیا ——!

آیا۔ آپ کی امی آپ کے کمرے کی طرف چلی آ رہی ہیں۔ پو پھٹ چکی ہے۔ ہوشیار ہو جائیے۔

جیولیٹ۔ تو پھر اے کھڑکی! سورج کی روشنی اپنی آغوش میں لے کر میری حیات کو نکل جانے دے۔

رومیو۔ خدا حافظ! خدا حافظ! ایک بوسہ پیاری' اور پھر میں نیچے اتر جاؤنگا۔ (کھڑکی میں سے گذرتا ہے)

جیولیٹ۔ تو پھر تم جا رہے ہو میرے محبوب! میرے سرتاج' میرے خاوند میرے دوست! ایک لمحے میں کئی دن ہیں اور ہر گھنٹے کے کئی دن —— مجھے تمھاری طرف سے اطلاع ملتی رہنا چاہیئے۔ اوہ! اس حساب سے تو جب میں دوبارہ اپنے رومیو سے ملونگی برسوں کی بوڑھی ہو چکی ہونگی۔

رومیو۔ خدا حافظ! میں تمھیں خبر پہنچانے کا کوئی موقع رائگاں نہ جانے دونگا۔

جیولیٹ۔ کیا تمھیں یقین ہے کہ ہم پھر بھی کبھی مل سکیں گے

رومیو۔ مجھے تو اس میں ذرہ برابر شک نہیں اور یہ سارے رنج و غم اس وقت کیسی کیسی میٹھی باتوں کا موضوع بن جائینگے۔ (رومیو نیچے اترتا ہے)

جیولیٹ۔ اُف میرے اللہ! کتنی بدشگون ہوں میں ابھی اتنی گہرائی میں اترتے ہوئے تم ایسے معلوم ہوتے ہو گویا کوئی قبر کی گہرائیوں میں پہنچ چکا ہو۔ شاید میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی ہیں یا شاید تمھارا چہرہ ہی زرد پڑ گیا ہے۔

رومیو۔ اور یقین مانو پیاری! میری آنکھوں میں تم بھی ایسی ہی نظر آ رہی ہو۔ غم کے یہ پیاسے عفریت ہمارا خون چوس رہے ہیں الوداع! الفراق! (جاتا ہے)

جیولیٹ ۔ اُف! قسمت تقدیر! سناہے کہ تو چلتی پھرتی چھایا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو تجھے اس شخص کو لپٹنے سے کیا حاصل جو اتنی مشہور ہے لیکن قسمت کی دیوی تو سچ مچ طوطا چشم بن جا۔ اس طرح مجھے اُمید بندھ جائیگی کہ تو اسے زیادہ دیر مجھ سے جدا نہ رکھے گی۔ مجھے واپس دے دیگی۔

بیگم کاپولیٹ ۔ (اندر سے) او ہو بیٹی! جاگ رہی ہو کیا؟

جیولیٹ ۔ (تنہا) کون بلا رہا ہے مجھے؟ یہ تو امی ہیں۔ شاید یہ ابھی تک سوئی ہی نہیں۔ یا صبح صبح اٹھ کر اس طرف چلی آئیں۔ کیا غیر متوقع وجہ ہے جس نے انہیں ادھر کا راستہ دکھا دیا۔

(بیگم کاپولیٹ آتی ہے)

بیگم ۔ کیا بات ہے جیولیٹ؟

جیولیٹ ۔ کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے امی!

بیگم ۔ چچا زاد بھائی کی موت پر اب تک روئے جا رہی ہو۔ کیا اُسے آنسوؤں میں بہا کر قبر سے باہر نکال لینے کا ارادہ ہے! اور اگر ایسا کر بھی لیا تم نے تب بھی اسے زندہ تو نہ کر سکوگی اس لئے اب صبر کرو۔ سنا افسوس محبت کی فراوانی کا پتہ دیتا ہے لیکن ہر وقت کا رونا دھونا بیوقوفی کی دلیل بن جاتا ہے۔

جیولیٹ ۔ اس کے باوجود مجھے اس متاع عظیم کے لٹ جانے کا افسوس رُلا رہا ہے،

بیگم ۔ اس سے تو تمہارے افسوس میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا اور وہ دوست جس کے لئے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے تب بھی واپس نہیں آئیگا۔

جیولیٹ ۔ یہی تو احساس ہے جو مجھے کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا اور مجھے رونے پر مجبور کر رہا ہے۔

بیگم ۔ میری بچی! میں جانتی ہوں تم اس کی موت کے لئے اتنا نہیں رو رہی ہو جتنا اس لئے کہ اس کا بدمعاش قاتل ابھی تک زندہ ہے۔

جیولیٹ ۔ کون بدمعاش؟

بیگم ۔ وہی بدمعاش رومیو۔

جیولیٹ ۔ (ایک طرف) بدمعاش اور اس کے درمیان بعد المشرقین ہے (ماں سے) میں نے اسے معاف کیا۔ خدا بھی اس کے گناہوں کو بخشے لیکن اس سے زیادہ دنیا کے اور کسی آدمی نے مجھے رنج نہیں پہنچایا۔

بیگم ۔ یہ اسی لئے ہے تاکہ وہ سازش پیشہ قاتل ابھی تک اس دنیا میں ہے۔

جیولیٹ ۔ ہاں امی! اور میری دسترس سے باہر ہے۔ کاش میں اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لے سکتی۔

بیگم ۔ گھبراؤ نہیں ہم اس کا بدلہ لیکر چھوڑیں گے۔ لو اب آنسو پونچھ ڈالو میں مانچوا میں جہاں یہ بدمعاش رہتا ہے کسی کو بھرے پر چڑھا کر اس بات پر تیار کر لونگی کہ وہ اسے کوئی ایسا زہر دیدے جس سے وہ جلد از جلد ٹیبولٹ کا ساتھی بن جائے۔ پھر مجھے امید ہے کہ تمہاری تسلی ہو جائے گی۔

جیولیٹ ۔ جب تک میں رومیو کو خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں مجھے اطمینان نہ ہوگا۔ اف میرا دل ایسے عزیز کی موت پر پھٹا پڑتا ہے۔ امی! اگر آپ کوئی ایسا آدمی تلاش کر لیں جو وہاں تک زہر پہنچا سکے تو میں اس میں ایسی چیز ملا دونگی کہ رومیو اسے کھاتے ہی آرام کی نیند سو جائیگا۔ اُف اس کا نام سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے کیونکہ میں اس تک نہیں پہنچ سکتی اور اپنے بھائی کی محبت کا انتقام اس کے جسم سے نہیں لے سکتی۔

بیگم ۔ تم کوئی طریقہ سوچ لو اور میں کسی نہ کسی کو تیار کر لونگی۔ ہاں تو آج میں تمہیں ایک خوشخبری سنانے آئی ہوں۔

جیولیٹ ۔ ایسے موقع پر ایسی ہی خبر کی ضرورت تھی۔ فرمایئے وہ کیا ہے؟

بیگم ۔ میری بچی تمہارے والد کو ہر وقت تمہارا ہی خیال رہتا ہے انہوں نے اس رنج و غم سے چھٹکارا دلانے کے لئے ایک ایسے دن کا انتظام کر دیا ہے جو جلد از جلد آجائیگا اور جس کی ہم دونوں میں سے کسی کو بھی امید نہ تھی۔

جیولیٹ ۔ بڑی اچھی بات ہے یہ تو امی! کیسا دن ہے وہ؟

بیگم ۔ جمعرات کے دن صبح ہی صبح پیٹر کے کلیسا میں وہ بہادر اور شریف النفس نواب پیرس تمہیں اپنی بیوی بنا کر تمہیں تمہاری مسرتوں کی معراج پر پہنچا دے گا۔

جیولیٹ ۔ اسے ہے ولی مقدس پیٹر اور ان کے کلیسا کی قسم کہ اس کی بیوی بنکر میں کبھی خوش نہیں ہو سکتی۔ مجھے اس عجلت پر تعجب ہے کہ میں شادی کر لوں اور ایک نامحرم معانقہ کئے بغیر ہی میرا شوہر بن جائے۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں ماں! آپ اباجان سے کہدیجئے گا کہ میں ابھی شادی نہیں کرونگی۔ اور اگر مجھے مجبور کیا گیا تو قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں پیرس پر رومیو کو ترجیح دونگی جس سے آپ جانتی ہی ہیں مجھے سخت نفرت ہے۔ کیا آپ یہی خبر لائی تھیں؟

بیگم ۔ وہ لو! تمہارے ابا بھی چلے آ رہے ہیں ان سے خود ہی کہدیکھو اور پھر دیکھو کہ وہ اس انکار پر تمہیں کیا کچھ نہیں کہتے۔

(کاپولیٹ اور دایا آتے ہیں)

کاپولیٹ ۔ جب سورج مغرب کے پردوں میں چھپ جاتا ہے تو ہوا

شبنم ٹپکاتی ہے۔ میرے بھائی کا جگر گوشہ موت کے پردوں میں چھپا ہے۔ تو موسلا دھار پانی برسایا جا رہا ہے۔ اوہ! یہ لڑکی ہے یا پانی کا نل؟ ابھی تک رو رہی ہو؟ ابھی تک جھڑی باندھ رکھی ہے تم نے؟ اس ایک چھوٹے سے جسم میں تم نے کشتی، سمندر اور طوفان سب کچھ جمع کر رکھا ہے۔ کیونکہ تمہاری آنکھیں جنھیں سمندر کہا جا سکتا ہے ابھی تک مدّوجزر کی شان دکھا رہی ہیں۔ کشتی تمہارا جسم ہے جو اس سیلاب نمک آلود میں تھپیڑے کھا رہا ہے۔ اگر کوئی فوری کوشش عمل میں نہ لایا گیا تو تمہاری آہیں جو تمہارے آنسوؤں کے ساتھ برسر پیکار ہیں تمہارے طوفان کی زد میں آئے ہوئے جسم کو الٹ دیں گی۔ تو بیگم تم نے ہمارا فیصلہ سنا دیا اسے؟

بیگم۔ جی ہاں! لیکن یہ تو کسی بات پر رضامند نہیں ہے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ کاش یہ احمق لڑکی موت کی بیوی بنتی۔

کاپولیٹ۔ دم تو لو ذرا، مجھے سمجھنے دو۔ مجھے سمجھنے دو بیگم! کیا کہا تم نے یہ رضامند نہیں ہے؟ یہ ہماری مہربانیوں کی شکر گذار بھی نہیں؟ اسے اس بات پر ناز نہیں ہے؟ یہ اپنی اس خوش نصیبی پر فخر نہیں کرتی؟ کہ اس ایسی نااہل اور بیکار لڑکی کو دولھا بنانے کے لئے ہم نے ایک انتہائی شریف اور ہر لحاظ سے قابل قدر انسان کو تجویز کیا ہے۔

جیولیٹ۔ مجھے اس بات پر فخر نہیں کہ یہ تجویز آپ کی طرف سے ہوئی ہے البتہ شکر گذار ضرور ہوں۔ مجھے اس چیز پر کبھی بھی ناز نہیں ہو سکتا جس سے مجھے نفرت ہے البتہ اس بات کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ نفرت انگیز چیز محبت کا تحفہ قرار پائی ہے۔

کاپولیٹ۔ کیا بک رہی ہو؟ کیسی اُلٹی منطق ہے یہ "ناز" اور "میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں" "اور میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کرتی" اور پھر بھی "ناز نہیں ہے"۔ کیا مطلب ہے تمہارا اس بڑے بگڑی ہوئی طبیعت ہے یہ؟ یہ شکریہ ادا کرنے اور فخر نہ کرنے کی بکواس چھینکے پر رکھو۔ اور جمعرات کے دن پیرس کے ساتھ دلی پیٹر کے کلیسا کو جانے کے لئے اپنے ان نازک نازک دست و پا کو بانہ ھو رکھو۔ ورنہ میں تمھیں قیدیوں کی گاڑی میں ٹھونس کر وہاں پہنچا دوں گا مردے کے ایسے زرد چہرے والی بے حیا لڑکی —— دُور ہو نالائق نااہل چھوکری ——!

بیگم۔ (خاوند سے) ہے ہے! کیا دماغ چل گیا ہے دشمنوں کا؟

جیولیٹ۔ اچھے ابا! میں گھٹنے ٹیک کر التجا کرتی ہوں۔ میری بات تحمّل سے دل سے سُنیئے:

کاپولیٹ۔ بھاڑ میں جا نجّی لڑکی! گستاخ چھوکری! سن لیا تم نے؟ جمعرات کے دن تمھیں کلیسا کو جانا ہے ورنہ مجھے اپنی یہ منحوس صورت نہ دکھانا۔ بکو مت، کچھ جواب مت دو، بند رکھ اپنی یہ لڑانے والی زبان! میرے ہاتھ میں کھجلی ہو رہی ہے! ہم کتنے خوش تھے بیگم! کہ خدا نے ہمیں یہ اکلوتا بچّہ دیا ہے لیکن دیکھا تم نے یہ اکیلی بھی کم نہیں خدا کی لعنت تھی جو ہمارے گھر پر اس کی صورت میں نازل ہوئی تھی۔ دور ہو جا! بدلگام!

آیا۔ اللہ رحم کرے! اللہ رحم کرے! آقا! چھوٹی بی بی کو اس طرح کوسنے میں آپ پر سخت الزام آتا ہے۔

کاپولیٹ۔ اے عقل و دانش کی دیوی! زبان بند رکھو اپنی۔ سمجھ بوجھ کی پتلی! جا باہر جا کر گپیں ہانک۔

آیا۔ میں کسی کی بدی بھلی تو نہیں کرتی؟

کاپولیٹ۔ اُف میرے اللہ!

آیا۔ تو کوئی بولے بھی نہ؟

کاپولیٹ۔ چپ رہ بڑبڑاتی ہوئی احمق! جا ان یاتونی عقل کے اندھوں میں جا کر یہ فلسفہ بگھار۔ یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے۔

بیگم۔ ایسا غصہ بھی کیا؟

کاپولیٹ۔ غضب خدا کا پاگل کر دیا مجھے رات دن، صبح شام، کام کرنے میں کھیلتے وقت، علیٰحدگی میں، کسی کے ساتھ، ہر وقت اور ہر گھڑی مجھے یہی خیال رہتا ہے کہ اس کے لئے کوئی اچھا سا بر ڈھونڈھوں اور اب جبکہ ایک اچھے خاندان کا آدمی مل گیا ہے جو صاحب جائداد بھی ہے، جوان ہے، نیک عادات و اطوار میں بھی فرد ہے۔ جس کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ باعزت خیالات کا مالک ہے، جس کی ہر چیز میں ایسا تناسب ہے جو ایک مرد میں ہو سکتا ہے تو یہ رونے بسورنے والی لڑکی اپنی قسمت کو مسکراتا ہوا دیکھ کر کہتی ہے: "جی میں شادی نہیں کروں گی" "میں تو اس سے محبت کر ہی نہیں سکتی" "جی بس تو ابھی دودھ پیتی بچی ہوں" اور "مہربانی کر کے مجھے تو معاف ہی رکھئے"! نہ کی تو نے شادی تو تجھے ایسا معاف کروں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ تو پھر جاؤ جہاں تیرا جی چاہے جا کر منہ مارتی پھر۔ میرے گھر میں تیرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یاد رکھنا اس بات کو میں مذاق کا عادی نہیں ہوں جمعرات دور نہیں دل پر ہاتھ رکھ کر غور کر اور سمجھ کہ

اگر تو میری ہے تو میں تیرا ہاتھ اپنے دوست ہی کے ہاتھ میں دونگا اور اگر تو میری ہو کر نہیں رہنا چاہتی تو پھر بھاڑ میں جا بھیک مانگ ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہو۔ گلیوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے۔ قسم اپنی روح کی میں کبھی بھی یہ نہیں کہونگا کہ تو میری بیٹی ہے اور جو چیز میری ہے وہ کبھی بھی تیرے لئے سودرساں ثابت نہ ہوگی۔ اس بات کا پورا پورا یقین رکھ۔ ٹھنڈے دل سے اس پر سوچ۔ اپنی خواہشوں کی یہ بے عزتی میں کبھی نہ ہونے دونگا۔ (جاتا ہے)

جیولیٹ۔ کیا آسمانوں پر کوئی ایسا رحیم نہیں جو میرے رنج وغم کی گہرائیوں میں ڈوب سکے۔ پیاری امی! اس طرح مجھے دھکا نہ دیجئے۔ اس شادی کو ایک مہینے کے لئے ---- صرف ایک ہفتے کے لئے روک لیجئے اور اگر آپ ایسا نہ کر سکیں تو میرا حجرۂ عروسی اسی تاریک کمرہ میں بنایئے گا جہاں ٹیبولٹ آخری نیند سو رہا ہے۔

بیگم۔ میرے ساتھ تو تم بات بھی مت کرو۔ میں ایک لفظ نہ کہونگی جو جی میں آئے کرو۔ میں تجھ سے گئی اور تو مجھ سے۔ (جاتی ہے)

جیولیٹ۔ آہ! خداوند خدا! آہ! آیا وہ کون سی سپر ہے جو اس مصیبت کو روک دے۔ میرا خاوند اس دنیا میں زندہ ہے اور میرا عہد آسمان والوں کے پاس محفوظ ہے۔ جب تک میرا خاوند اس دنیا کو چھوڑ کر آسمان پر نہ جائے اور اس عہد کو فسخ نہ کر دے تب تک یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہوسکے گا۔ مجھے کوئی مشورہ دو۔ مجھے تسلی دو۔ ہائے وہ خدا جو آسمانوں پر ہے مجھ جیسی کمزور مخلوق کو سازش کے ایسے الجھے ہوئے تار و پود میں جکڑ رہا ہے۔ تمھاری کیا رائے ہے۔ کیا تمھارے پاس تشفی کا ایک لفظ نہیں؟ ---- کیا آیا تم بھی مجھے تسلی نہ دوگی ----؟

آیا۔ تو پھر سنو! رومیو جلاوطن کر دیا گیا اور یہ دنیا کی سب سے ناممکن بات ہے کہ وہ لوٹ آئے اور تمھارا مطالبہ کرے۔ اگر بالفرض وہ لوٹ بھی آئے تب بھی چھپ چھپا کر ہی آئے گا۔ ایسی حالت میں میرے خیال میں تمھارا نواب صاحب سے شادی کر لینا ہی اچھا ہے۔ وہ تو بہت ہی خوب آدمی ہے۔ اجی رومیو تو اس کے سامنے خاک بھی نہیں۔ بی بی سچ کہتی ہوں کہ پیرس جیسی خوشرنگ تیز نظر اور آنکھ شاہین کی بھی نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ تم اس دوسری شادی سے بہت خوش ہوگی۔ وجہ یہ کہ یہ تمھاری پہلی شادی سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوگی اور اگر ایسا نہ بھی ہو تب بھی تمھارا پہلا خاوند تو مر چکا اور جو مرا نہیں تو مُردوں ہی کے برابر ہے کہ تم یہاں پڑی ہو اور وہ وہاں؟

جیولیٹ۔ اپنے دل سے کہہ رہی ہو یہ سب کچھ؟

آیا۔ میری تو روح بھی اس بات میں شامل ہے۔ نہیں تو ان دونوں پر خدا کی مار۔

جیولیٹ۔ آمین ----!

آیا۔ کیا کہا ----؟

جیولیٹ۔ میں نے کہا تم نے مجھ کو کمال تسلی دی ہے اب تم جاؤ اور امی سے کہو کہ میں اباجان کے سامنے گستاخی سے پیش آنے پر بہت شرمندہ ہوں اور اب اس کا اعتراف کرنے اور اس گناہ کو دھونے کیلئے لارنس کی کُٹی میں جا رہی ہوں۔

آیا۔ ضرور جاؤنگی۔ بڑی اچھی بات ہے یہ (آیا جاتی ہے اور جیولٹ اسے جاتا ہوا دیکھتی ہے)

جیولٹ۔ بڑھی قتالہ! کس قدر خباثت بھری ہے اس میں کیا مجھے دہ رہ کی ٹھوکریں کھاتا دیکھنے کا زیادہ گناہ ہے یا اسی زبان سے میرے خاوند کو برا بھلا کہنا جس سے کئی دفعہ نہیں ہزار دفعہ بے نظیر کہا گیا ہو۔ میری صلاح کار جا آج سے تو اور میں الگ الگ استا اختیار کرینگے۔ میں فرایر کے یہاں جاتی ہوں اور اس سے اس کا علاج پوچھتی ہوں اگر اور سب ناکام رہے تو میرے ہاتھوں میں اپنی زندگی ختم کر دینے کی طاقت ہے (جاتی ہے)

جُرعہ چہارم!

پہلا منظر

(فرایر لارنس کی کُٹی۔ فرایر اور پیرس باتیں کر رہے ہیں۔)

فرایر۔ جمعرات کہا آپ نے، بہت تھوڑا وقت ہے۔

پیرس۔ میرے خسر کاپولیٹ کا یہی منشا ہے اور میں بھی اس عجلت کو کم کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔

فرایر۔ آپ نے کہا نہ کہ آپ اس لڑکی کی مرضی نہیں پا سکے۔ بھئی یہ کچھ بے تکی سی بات ہے اور مجھے پسند نہیں۔

پیرس ۔ وہ ٹیبولٹ کی موت پر بہت ہی غیر معمولی طور پر مغموم ہیں۔اس لئے میں محبت کے بارے میں کوئی لفظ زبان پر نہ لاسکا۔آپ جانیئے محبت کی دیوی آنسوؤں پر تیرتے ہوئے گھر میں مسکرا نہیں سکتی ۔ لیکن اس کے والد کا خیال ہے کہ یہ غم اس کے لئے مہلک ثابت ہوگا اس لئے وہ ان آنسوؤں کی تخریبی قوت سے اپنی بیٹی کو بچانے کے لئے جلد از جلد اس کی شادی کردینا مناسب سمجھتے ہیں کیونکہ تنہائی سے غم بڑھ جاتا ہے اور اگر کوئی ہمدرد جلیس مل گیا تو یہ اثر زائل ہوجائے گا ۔ یہ ہے اس عجلت کا سبب ؟

فرایر ۔ (علیحدگی میں) کاش میں یہ نہ جانتا کہ اسے کیوں تاخیر میں ڈال دینا چاہیئے ۔ (پیرس سے) وہ دیکھئے لڑکی خود ہی میری کٹیا کی طرف چلی آرہی ہے ۔ (جیولیٹ آتی ہے)

پیرس ۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ ہم مل گئے میری بیوی!

جیولیٹ ۔ اس وقت دیکھا جائیگا جب یہ ہوجائیگا ۔

پیرس ۔ جمعرات کے دن میری پیاری یہ "دیکھا جائیگا" والی بات ہوکر رہے گی ۔

جیولیٹ ۔ جو ہونا ہوتا ہے وہ ہوہی جاتا ہے ۔

فرایر ۔ یہ تو سچی بات ہے ۔

پیرس ۔ فادر کی خدمت میں اعتراف کرنے آئی ہو؟

جیولیٹ ۔ اگر یہی بتادوں تو اعتراف آپ کے سامنے ہوگیا ۔

پیرس ۔ لیکن یہ بات نہ چھپانا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو ۔

جیولیٹ ۔ میں آپ کے سامنے اعتراف کرتی ہوں کہ میں ان سے محبت کرتی ہوں ۔

پیرس ۔ ایسا تو ہوہی گا ۔ مجھے یقین ہے تم مجھے دل سے چاہتی ہو ۔

جیولیٹ ۔ اگر میں ایسا کرگزروں تو اس کی وقعت زیادہ ہوگی کیونکہ یہ آپکے منہ پر کہنے کی بجائے آپ کی غیر حاضری میں کہا جائیگا ۔

پیرس ۔ اوہ ! تمہارے چہرے کو آنسوؤں نے کس قدر خراب کررکھا ہے ۔

جیولیٹ ۔ فتح کا یہ سہرا آنسوؤں ہی کے سر نہیں یہ چہرہ ان کے بغیر بھی ایسا ہی خراب تھا ۔

پیرس ۔ اس قسم کی باتیں کرکے تم اس پر آنسوؤں سے زیادہ ظلم ڈھا رہی ہو ۔

جیولیٹ ۔ سچی بات غیبت نہیں کہلاتی ۔ جو کچھ میں نے کہا ۔ اپنے منہ پر کہا ہے ۔

پیرس ۔ تمہارا چہرہ میری ملکیت ہے اور تم نے اس پر غلط الزام لگایا ہے ۔

جیولیٹ ۔ یہ ہوسکتا ہے کیونکہ یہ میرا اپنا نہیں ۔ مقدس باپ! آپ کو اب فرصت ہے یا میں شام کی نماز کے وقت حاضر ہوں ۔

فرایر ۔ فرصت ہی ہے ۔ قبلہ نواب صاحب! ہمیں اجازت ہے ؟

پیرس ۔ ایسے پاکیزہ اشغال میں میں کیوں حارج ہونے لگا ہم جیولیٹ! جمعرات کے دن میں تمہیں صبح ہی صبح آجگاؤنگا ۔ اس وقت تک الوداع ! اس پاکیزہ بوسے کی حفاظت کرنا ۔ (جاتا ہے)

جیولیٹ ۔ بند کردیجئے دروازہ اور اس کے بعد آکر میرے ساتھ آنسو بہائیے میرے ساتھ جس کی امیدیں فنا ہوگئیں ۔ جس کی آرزوئیں مٹ گئیں ۔ جس کی مدد کرنے والا دنیا میں کوئی نہیں ۔

فرایر ۔ جیولیٹ بیٹی ! مجھ سے تیری مصیبت چھپی ہوئی نہیں ہے ۔ میری عقل یہاں کچھ کام نہیں کرتی میں نے سنا ہے کہ جمعرات کے دن اس نواب سے تیری شادی ہوجائیگی اور دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو اسے روک سکے ۔

جیولیٹ ۔ جب تک آپ یہ نہ بتائیں کہ آپ اس کا علاج بھی جانتے ہیں اس وقت تک یہ نہ کہئے کہ آپ نے یہ سب کچھ سن رکھا ہے ۔ اگر آپ کی یہ پختہ کار عقل میری کوئی مدد نہیں کرسکتی تو آپ میرے ارادے کی داد دیجئے ۔ میں اس خنجر کی مدد سے ابھی ابھی اس کا فیصلہ کئے دیتی ہوں ۔ خدا نے میرے اور رومیو کے دل یکجا کئے تھے اور آپ نے ہم دونوں کے ہاتھوں کو ملایا تھا ۔ اس سے پہلے کہ یہ ہاتھ جو آپ کے بابرکت ہاتھوں سے رومیو کے ہاتھوں کے ساتھ ملے تھے کسی دوسری قرارداد پر مہر تصدیق ثبت کریں یا میرا یہ سچا دل بغاوت کرکے اپنے مرکز کو بھول بیٹھے ۔ میں اس سے ان دونوں کا خاتمہ کردونگی ۔ اس لئے اگر آپ کا طویل تجربہ میری مدد کرنے میں ناکام رہا تو دیکھئے یہ خنجر میرے ضمیر اور میری ان خوفناک مصیبتوں کی کشمکش مٹادیگا ۔ اور ایک ایسا باعزت سمجھوتہ ہوجائیگا جو آپ اس پختہ سالی اور تجربے کے باوجود کرانے میں ناکام رہے ۔ (جواب سننے کیلئے قدرے رک جاتی ہے)

جواب دینے میں ایسا تساہل نہ برتئے اگر آپ کی زبان اس کا علاج بتانے کی بجائے کچھ اور کہنا چاہتی ہے تو میری موت یقینی ہے ۔

فرایر ۔ صبر سے کام لو بیٹی ! مجھے امید کی ایک ایسی رمق نظر آرہی ہے جو اپنے عمل میں ویسی ہی ہولناک ہے جیسی وہ مصیبت جس سے تم بچنا چاہتی ہو ۔ اگر نواب پیرس سے شادی کرنے کی بجائے تم اپنے دل کو اپنے ہاتھ سے اپنے گلے پر خنجر پھیر دینے کی جرأت پاتی ہو تو یہ بھی ممکن ہے کہ تم بے حیائی کی اس لعنت کو جو خود اپنی ذلتوں سے بچنے کیلئے موت کے ساتھ دست و گریبان ہو رہی ہے دھتکار بتلانے کیلئے موت ہی جیسی ہولناک چیز اختیار کرسکو ۔ اگر تم میں ہمت ہے تو میں علاج بتاتا ہوں ۔

جیولیٹ ۔ پیرس سے شادی کرنے کی بجائے مجھے یہ کہئے کہ میں اس مینار کی چوٹی پر سے کود پڑوں۔ اس راستے پر ہوں جو چوروں اور ڈاکوؤں سے پٹا پڑا ہے کہہ دیجئے مجھے کہ میں اپنے آپ کو توڑ مروڑ کر سانپوں کی پٹاری میں بیٹھ جاؤں۔ مجھے گرجتے ہوئے شیروں کے ساتھ باندھ دیجئے اندھیری رات میں مجھے کسی مدفن میں بھیج دیجئے جس کا فرش مُردوں کی چٹختی ہوئی ہڈیوں سے پٹا پڑا ہو۔ جہاں قدم قدم پر انسانی جسم کے بدبودار اعضا ہوں۔ جہاں جگہ جگہ ڈراؤنی کھوپریاں آنکھوں کے خالی حلقوں سے دیکھ رہی ہوں۔ مجھے حکم دیجئے کہ میں کسی تازہ قبر میں گھس کر اپنے آپ کو مُردے کے کفن میں چھپا لوں۔ یہ سب چیزیں جن کا ذکر سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کسی خوف کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنے پیارے رومیو کی وفادار بیوی رہنے کے لئے برداشت کر لونگی۔

فرایر ۔ تو پھر سنو! خوش خوش گھر جاؤ اور پیرس سے شادی کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دو۔ کل جمعرات ہے۔ کل رات اپنے کمرے میں تنہا سو۔ آیا کو بھی کمرے میں نہ آنے دینا۔ سوتے وقت اس شیشی سے اس چمکدار سیال چیز کو پی لینا۔ اس کے حلق سے اترتے ہی تمہاری رگوں میں ایک برودت آمیز ایک نشہ سا دوڑنے لگے گا۔ نبضیں اپنی فطرت بھول کر ساقط ہو جائینگی۔ تمہارے جسم میں حرارت نام کو نہ رہیگی اور نہ ہی تمہاری سانس تمہاری زندگی کی گواہی دیگی۔ تمہارے جسم کا ہر حصہ اکڑ کر، ٹھنڈا ہو کر بےجان لکڑی کی طرح اینٹھ جائے گا اور ایسا معلوم ہونے لگے گا کہ تم پر موت کی نیند غالب آچکی ہے۔ تم بیالیس گھنٹے اس نقلی موت کے زیر اثر رہوگی اور اس کے بعد گویا میٹھی نیند سے بیدار ہو جاؤگی۔ متعینہ دن جب تمہارا دولھا تمہیں جگانے کے لئے تمہارے بستر کے قریب آئیگا تو تمہیں مردہ پائیگا اور ملکی رسوم کے مطابق تمہیں بہترین کپڑوں میں ملبوس کرکے تمہارے جنازے کو بڑی دھوم دھام سے اس پرانے گنبد میں پہنچا دیا جائیگا جہاں کاپولیٹ خاندان کے سارے افراد آخری نیند سو رہے ہیں اس اثنا میں رومیو میرے خط سے اس سارے معاملہ کو سمجھ جائے گا اور تمہارے سوتے میں یہاں پہنچ جائیگا۔ میں اور رومیو تمہاری نئی زندگی کا انتظار کرینگے۔ اسی رات تم رومیو کے ساتھ مانچوا چلی جانا۔ اس تجویز پر عمل کرنے میں کوئی فضول بہانہ یا عورتوں جیسی بزدلی تمہارا راستہ کھوٹا نہ کردے تو اس طریقے سے تم اس بےحیائی سے بچ سکتی ہو۔

جیولیٹ ۔ لائیے جلدی دیجئے۔ بزدلی یا خوف کا تو نام بھی نہ لیجئے۔

فرایر ۔ یہ لو اور اب جاؤ، دل کو مضبوط کر دو اور اس تجویز سے اپنی قسمت کی تاریکیاں دھو ڈالو۔ میں جلد از جلد تمہارے پیارے کے نام خط دیکر کسی راہب کو مانچوا کی طرف روانہ کرتا ہوں۔

جیولیٹ ۔ میرے پاس محبت کی قوتیں ہیں اور یہ قوتیں میری مدد کرینگی خدا حافظ فادر!

(جیولیٹ چلی جاتی ہے اور فرایر تنہا رہ جاتا ہے)

دوسرا منظر

(کاپولیٹ کے گھر کا ایک کمرہ۔ کاپولیٹ۔ بیگم کاپولیٹ۔ آیا، اور دو ملازم آتے ہیں)

کاپولیٹ ۔ (ملازم نمبر ا سے) جن جن کے نام یہاں لکھے ہیں انہیں دعوت نامے دے آؤ (ملازم نمبر ا بعجلت چلا جاتا ہے) (دوسرے ملازم سے) اور تم بھی جلدی سے چلے جاؤ اور بیس ہوشیار باورچی لے آؤ۔

ملازم ۔ سرکار ایک بھی نکما نہ ہوگا ان میں۔ میں سب سے انگلیاں چٹوا کے دیکھ لونگا۔

کاپولیٹ ۔ یہ عجیب امتحان ہے۔

ملازم ۔ اے حضور! وہ باورچی ہی کیا ہوا جو اپنی انگلیاں بھی نہ چاٹ سکے اس لئے جو انگلیاں نہ چاٹ سکے گا اسے میں جوتی مارنے کو بھی تیار نہیں۔

کاپولیٹ ۔ جاؤ بھاگ جاؤ۔ (ملازم جاتا ہے) ایسے تھوڑے عرصہ میں بھلا کیا انتظام ہو سکتا ہے۔ وہ بچی ہماری کیا فرایر لارنس کے یہاں گئی ہے؟

آیا ۔ جی ہاں ———!

کاپولیٹ ۔ بہت ممکن ہے کوئی اچھا اثر ہو جائے اس پر۔ کتنی ہٹ کی پکی احمق لڑکی ہے یہ!

آیا ۔ اے ہے دیکھئے تو اعتراف کرکے کیا خوشی خوشی بھاگی آتی ہے۔

(جیولیٹ سرور چشم و ابرو کے ساتھ آتی ہے)

کاپولیٹ ۔ کیوں پگلی لڑکی کہاں گئی تھی تو؟

جیولیٹ ۔ جہاں میں نے آپ کی مخالفت اور آپ کے ارشادات سے انحراف کرنے کی گستاخی پر تاسف ہونا سیکھا ہے۔ مجھے مقدس لارنس نے فرمایا ہے کہ میں آپ کے قدموں پر گر کر آپ سے معافی چاہوں۔ معاف کر دیجئے۔ (جیولیٹ دوزانو ہو جاتی ہے) آج کے دن سے میں آپ کے ہر حکم کو سر آنکھوں پر رکھوں گی۔

کاپولیٹ ۔ نواب صاحب کو بلاؤ، انھیں اطلاع کردو کہ کل صبح رسم کی گرہ ڈال دی جائیگی۔

جیولیٹ ۔ میں نوجوان نواب سے لارنس ہی کے وہاں ملی تھی اور شرم و حجاب کی حدود سے تجاوز کئے بغیر میں نے مناسب محبت کا اظہار کر دیا تھا۔

کاپولیٹ ۔ مجھے بہت خوشی ہوئی یہ سن کر! بہت اچھا کیا تم نے، لو اٹھو ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ میں خود نواب سے ملتا ہوں۔ ارے بھئی ہم کہتے ہیں جاکر انھیں ملا لاؤ۔ عجیب لوگ ہو تم بھی واللہ! یہ نیک دل راہب! ہمارا سارا شہر اس کا مرید ہو رہا ہے۔

جیولیٹ ۔ آیا! ہمارے ساتھ کمرے میں نہ چلوگی۔ کل سنگھار کیلئے کچھ ضروری زیورات چھانٹ لیں۔ تم اس معاملے میں زیادہ سمجھدار ہو۔

بیگم ۔ یہ سب جمعرات ہی کے لئے اٹھا رکھو۔ ابھی کافی وقت ہے۔

کاپولیٹ ۔ ارے جانے بھی دو۔ جاؤ آیا جاؤ ۔ اس کے ساتھ جمعرات کو کلیسا جانا ہے ہم سب نے۔ (آیا اور جیولیٹ جاتی ہیں)

بیگم ۔ چیزیں بہت تھوڑی ہونگی۔ رات تو آ گئی۔

کاپولیٹ ۔ ہشت! میرے باہر نکلنے کی دیر ہے۔ چٹکی بجاتے میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ تم جیولیٹ کے پاس جاؤ اور سنگھار کرنے میں اس کی مدد کرو۔ آج میں سو نہیں سکونگا۔ مجھے تنہا چھوڑ دو صرف آج کے دن کے لئے مجھے گھر کی مالکن کے فرائض ادا کرنے ہونگے لیکن ابھی تو مجھے بھاگا ہوا نواب پیرس کے یہاں جانا پڑیگا۔ آخر اُسے کل کیلئے تیار بھی کرنا ہے۔ میں تو خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ یہ سیانی صفت لڑکی ہتے پر سے اکھڑی جاتی تھی۔

تیسرا منظر

(جیولیٹ کا کمرہ۔ چارپائی پردے سے ڈھکی ہوئی ہے پوری اسٹیج۔ آیا اور جیولیٹ کپڑے چھانٹ رہی ہیں)

جیولیٹ ۔ ہاں ہاں! وہ لباس تو بس کمال ہے۔ لیکن دیکھو ابھی آیا آج کی رات تم مجھے اکیلا ہی چھوڑ دو۔ کیونکہ اس بے مہر آسمان کو جو تم جانتی ہو کس قدر بگڑا بیٹھا ہے اور کس طرح گناہوں سے لدا پڑا ہے۔ مہربان بنانے کے لئے آج مجھے ہزاروں دعائیں پڑھنا ہونگی۔ (بیگم کاپولیٹ آتی ہے)

بیگم ۔ کیا بہت ہی مصروف ہے؟ کچھ مدد درکار ہے تمہیں؟

جیولیٹ ۔ نہیں تو امی! کل جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ سب ہم نے نکال کر ایک طرف رکھ لی ہیں۔ تو اب مہربانی کرکے آپ مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔ اور ابھی امی! آج آیا کو بھی اپنے ہی کمرے میں سُلا لیجئے گا کیونکہ یہ کام ایسی جلدی آ پڑا ہے کہ آپکو بھی تنہا مصروفیت ہوگی۔

بیگم ۔ شب بخیر! لو اب لیٹ جاؤ اور آرام کرو اس کی ضرورت ہے تمہیں۔ (آیا اور بیگم کاپولیٹ جاتے ہیں)

جیولیٹ ۔ (تنہا) خدا حافظ! کون جانے ہم پھر کب ملیں، ایک غیر معلوم خنکی کا احساس آہستہ آہستہ میری رگوں میں رینگ رہا ہے اور میری زندگی کی ساری حرارت کو سلب کئے لیتا ہے۔ انھیں واپس بلاتی ہوں۔ کچھ تو تسلی دینگے۔ (بلاتی ہے) آیا ــــ لیکن وہ یہاں آکر کرے گی بھی کیا؟ یہ گھناؤنا کھیل مجھے تنہا ہی کھیلنا ہوگا ـــ یہ شیشی: اگر یہ دوا پھر اثر ہی نہ کرے تب کیا ہوگا۔ تو کیا صبح ہوتے ہی مجھے زبردستی اس شادی کے بھاڑ میں جھونک دیا جائیگا۔ نہیں ایسا نہ ہوسکے گا۔ یہ روکے گا اس مصیبت کو یہاں رہو تم۔ (خنجر رکھ لیتی ہے) یہ بھی تو ہوسکتا ہے کوئی قاتل زہر ہو۔ راہب نے جان بوجھ کر مجھے مرنے کے لئے دیا ہو تاکہ اس شادی سے اس کی پیشانیٔ عزت پر کلنک کا ٹیکہ نہ لگ جائے اسی نے تو چپکے چپکے میرا اور اس کا نکاح کر دیا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکتا لوگوں نے ہزار بار اُسے آزما دیکھا ہے اور وہ ہمیشہ اچھا آدمی ثابت ہوا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ رومیو مجھے اس خوفناک قبر سے نکالنے کے لئے آئے میں بیدار ہو گئی تب کیا ہوگا؟ یہ خطرے کی بات ہے۔ ایسی حالت میں کیا میں رومیو کے آنے سے پہلے ہی اس گنبد میں گھٹ کر نہ مر جاؤنگی جس کے غلیظ دہانے سے صحت بخش ہوا کا ایک جھونکا نہیں گذر سکتا اور اگر میں زندہ بھی رہی تو کیا یہ ممکن نہیں کہ تاریک موت اور سیاہ پوش رات کا یہ منظر اس جگہ کی دہشت افزا خاموشیوں سے مل کر ـــ اس گنبد اس پرانے مرقد میں جہاں میرے دفن شدہ آباؤ اجداد کی ہڈیاں صدیوں سے جمع کی جا رہی ہیں جہاں خون میں لتھڑا ہوا ٹیبولٹ جس کے جسم کو ابھی پھپھوندی ہی لگی ہوگی اپنے کفن میں گل رہا ہے۔ جہاں کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی رات کے بھوت اپنا ہولناک رقص کیا کرتے ہیں ـــ ہائے افسوس! کیا یہ ممکن نہیں کہ اس طرح جلدی بیدار ہو جانے کی وجہ سے اس نفرت انگیز بدبو اور زمین کا سینہ چیر کر فضا میں پھڑپھڑانے والی جنون زا چیخوں سے میں پاگل نہ ہو جاؤنگی۔ اگر میں نے خوف و دہشت سے

لڑی ہوئی اس فضا میں چلنے کی کوشش کی تو کیا میرا کلیجہ منہ کو نہ آنے لگے گا؟ کیا میں دیوانوں کی طرح اپنے بزرگوں کے اعضا سے نہ کھیلنے لگوں گی؟ کیا میں گلے سڑے ٹیبولٹ کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر اسے اس کے کفن سے نوچ لینے کی کوشش نہ کرونگی۔ اور کیا اس غم و غصہ کے زیر اثر میں اپنے کسی عظیم الجثہ بزرگ کی ہڈی کو لاٹھی کی طرح استعمال کر کے اپنے مایوس دماغ کو پاش پاش نہ کرونگی؟ دیکھو میرے بھائی کی روح اس رومیو کو تلاش کر رہی ہے جس نے اسے تلوار کی نوک سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا! ٹھہرو ٹیبولٹ دم لو ذرا! رومیو! میں آئی! میں یہ تمہارے لئے پیتی ہوں۔"

چوتھا منظر

(کاپولیٹ کے گھر کا ایک کمرہ۔ نصف اسٹیج کا منظر، جیولیٹ کا کمرہ چھپا ہوا ہے۔ بیگم کاپولیٹ اور آیا شادی کی دعوت کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ آیا ترکاریاں اٹھائے ہے۔)

بیگم کاپولیٹ۔ ٹھہرو آیا، یہ چابیاں لیجاؤ اور تھوڑا مصالحہ لے آؤ۔

آیا۔ باورچیخانے میں مصالحے کے لئے مرے جاتے ہیں وہ لوگ۔

(کاپولیٹ آتا ہے)

کاپولیٹ۔ جلدی کرو جلدی، مرغا بانگ دے رہا ہے اور گھڑیال بج چکا ہے۔ تین بج گئے ہونگے۔ دیکھو اچھی انجیلیکا گوشت ذرا مزیدار بن جائے۔ خرچ وغیرہ کی پروا نہ کرنا۔

آیا۔ اے ہے! یہ آپ کیا پریوں میں اندر سبنے پھر رہے ہیں جائیے آرام کیجئے۔ اس طرح راتوں کو جاگنے سے بیمار ہو جائیےگا۔

کاپولیٹ۔ نہیں نہیں، اس سے پہلے بھی میں راتوں کو جاگتا رہا ہوں اور وہ بھی معمولی معمولی باتوں کے لئے تم کو کبھی طبیعت خراب نہیں ہوئی

بیگم۔ جی ہی! آپ تو اپنے زمانے میں بڑے رنگین آدمی رہے ہیں۔ کئی راتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی ہیں لیکن اب یہ نہ کرنے دونگی میں! (بیگم کاپولیٹ اور آیا جاتی ہے)

کاپولیٹ۔ عورتیں بھی رشک کی پوٹ ہوتی ہیں۔ حسد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے ان میں۔

(دو چار ملازم لکڑیاں۔ سیخ پر چڑھا ہوا کباب اور ٹوکریاں اٹھائے ہوئے آتے ہیں)

کاپولیٹ۔ ارے بھئی! کیا ہے یہ سب؟

نوکر نمبر ۱۔ باورچیخانے ہی کے لئے ہے صاحب کچھ! معلوم نہیں کیا ہے۔

کاپولیٹ۔ بھاگو جلدی کرو (نوکر نمبر ۱ جاتا ہے) (مسخرے کو) ارے او! تم بھی کچھ سوکھی لکڑیاں لے آؤ۔ پیٹر کو بلا لو وہ تمہیں بتا دیگا۔

مسخرہ۔ میرے کندھوں پر بھی سر ہی ہے حضور۔ پیٹر کو تکلیف کیوں دوں

(جاتا ہے)

کاپولیٹ۔ کیا خوب واللہ! کیا عجیب حرامی آدمی ہے۔ افوہ! دن نکل آیا۔ نواب باجوں گاجوں کے ساتھ ابھی آئے گا۔ وہ کہہ جو رہا تھا۔ (باجوں کی آواز) ارے وہ تو آ گیا۔ آیا! اے آیا! اے بیگم! — (آیا آتی ہے) — جاؤ جولیٹ کو جگاؤ اسے ٹھیک ٹھاک کر دو۔ میں پیرس کو باتوں میں لگاتا ہوں۔ جلدی کرو۔ دولہا آ گیا بھئی! جلدی کرو تم سے کہہ رہا ہوں۔

(جاتے ہیں)

پانچواں منظر

(جیولیٹ کا کمرہ۔ پوری اسٹیج۔ آیا آتی ہے)

آیا۔ بی بی! چھوٹی بی بی! اے میں نے کہا جولیٹ! کیا گھوڑے بیچ کر سو رہی ہو۔ اری او مینی! بی بی! ارے واہ، ابھی کہیں کی! میں نے کہا چھوٹی بی بی۔ اٹھو میری جان! اے دلھن! اے اللہ اللہ کیا لمبی تان کر سوئی ہے! لیکن خواہ کچھ بھی ہو جگا کے چھوڑ دنگی تمہیں، بی بی! اے چھوٹی بی بی! ہئی ہئی، بولتے ہی نہیں۔ — (پردے ہٹاتی ہے) کیا کپڑے پہن لئے اور پھر لیٹ ہو گئی لیکن چھوڑوں گی تھوڑی۔ جگاؤنگی ضرور! بی بی! اے بی بی! ہائے ہائے! یہ کیا؟ ارے کوئی آؤ! ارے کوئی آؤ! بی بی مر گئی ہے ہے میں پیدا ہی کیوں ہوئی تھی؟ کچھ میرے منہ میں ڈالو، ہے ہے آقا! مالکن! (بیگم کاپولیٹ آتی ہے)

بیگم۔ کیا ہے؟ کیا ہوا؟

آیا۔ ہائے یہ منحوس دن۔

بیگم۔ لیکن کچھ کہو بھی بات کیا ہے؟

آیا۔ دیکھئے تو! ہائے ہائے یہ دن۔

بیگم۔ ہائے میری بچی! میری جان، ہائے اٹھو میری طرف دیکھو نہیں تو میں بھی تیرے ساتھ مر رہونگی۔ کوئی دوڑو۔ آؤ۔ پکارو کسی کو۔

(کاپولیٹ آتا ہے)

کاپولیٹ۔ کچھ شرم کرو، جیولیٹ کو لاؤ۔ اس کا خاوند مدت ہوئی آ چکا ہے۔

بیگم۔ وہ تو مر گئی، موت کھا گئی میری بچی کو۔ ہائے یہ دن! ہائے ہائے!

کاپولیٹ — اُف! دیکھوں تو! اُف! ٹھنڈی ہو چکی بیچاری۔ منجمد ہو گیا اس کا خون اور جسم اکڑ گیا۔ زندگی کو ان ہونٹوں سے جُدا ہوئے مدت ہو چکی۔ آہ موت! قبل از وقت کہر کی طرح باغ کے حسین ترین پھول میں پنجے گاڑے بیٹھی ہے۔

آیا — ہائے یہ تاریک دن!

بیگم — اوہ، یہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا وقت۔

کاپولیٹ — آہ! وہ موت جس نے اسے اچک کر مجھے آنسوؤں میں جھونک دیا میری زبان پر تالے ڈالے دیتی ہے۔ میں ایک لفظ نہیں کہہ سکتا،

(فرایر لارنس اور پیرس سازندوں کے ساتھ آتے ہیں)

فرایر — دُلہن کلیسا جانے کے لئے تیار ہے؟

کاپولیٹ — ہاں تیار ہے اس جگہ جانے کے لئے جہاں سے پھر کبھی واپس نہ آئیگی۔ میرے بچے! تمہاری شادی سے پہلے آنے والی رات کو موت نے تمہاری بیوی کے بستر پر قبضہ جما لیا۔ وہ جو پھول جیسی تھی موت کے پھولوں سے ڈھکی وہ پڑی ہے۔ اجل کا فرشتہ میرا داماد ہے۔ وہی میرا ولی عہد ہے اسی نے میری بچی کو اپنی دلہن بنایا ہے۔ مرنے کے بعد میرا سب کچھ اسی کا ہوگا۔ زندگی، زندگی کا ٹھاٹ باٹھ سب موت ہی کی ملکیت ہیں۔

پیرس — کیا میں نے آج کی اس صبح کے لئے انتظار کی زحمتیں اٹھائی تھیں اف! کیا میں اس منظر کو دیکھنے کے لئے بیتاب رہا تھا؟

بیگم — ہائے منحوس، یہ لعنتی، قابل نفرت دن، زمانے کے لامحدود سفر میں آنے والا ہولناک ترین لمحہ صرف ایک کم ور سی، ایک ننھی سی محبوب لڑکی، میرا ایک ہی کھلونا، میری خوشیوں کا ایک ہی مرکز۔ آہ موت! ظالم موت! تجھ سے یہ بھی برداشت نہ ہو سکا۔ تو نے اسے بھی میری آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔

آیا — ہائے ہائے یہ دن! یہ منحوس دن! یہ آفت! یہ قیامت! کاش اس سے پہلے میری آنکھیں بند ہو جاتیں، ایسا منحوس دن طلوع نہ ہوتا، یہ پہاڑ نہ ٹوٹتا۔ ایسا کالا دن طلوع ہونے سے پہلے غرق ہو جاتا ——

ہائے یہ دن —— یہ دن!

پیرس — مجھے دھوکا دیا گیا ہے، مجھے دھتکار دیا گیا ہے، میرے سر پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے گئے ہیں میرے مُنہ پر تھوکا گیا ہے، مجھے قتل کر دیا گیا ہے او موت کے کر یہہ دیوتا! تیرے ہاتھوں نے میرا تختہ پلٹ دیا۔ میری پیاری —— میری زندگی! نہیں نہیں، موت کی تاریکیوں میں ڈوبتی ہوئی میری واحد محبت۔

کاپولیٹ — مجھ سے نفرت ہو گئی تجھے، مجھے غم میں جھونک دیا تو نے مُنہ پھیر لیا، میری شہید، میری حسین مقتول، اوہ ظالم وقت! وقت! تیرے جس کا کوئی توڑ نہیں تھا ایسے ہی وقت میں کیوں چلایا تو نے؟ ہماری خوشیوں کا سینہ چھید دینے سے تجھے کیا مل گیا؟ میری بچی! میری روح! کیا تم سچ مچ مر گئی ہو؟ ہائے افسوس موت نے تجھے کھا لیا اور تیرے ساتھ میری ساری مسکراہٹیں ہمیشہ کے لئے اتھاہ گہرائیوں میں دفن ہو گئیں۔

فرایر — صبر کرو! للہ صبر کرو۔ ابتری کی دوا آہ و شیون میں نہیں ہوتی اس حسین پُتلی کی تشکیل میں خدا کا اور تمہارا ہاتھ تھا۔ خدا نے سب کچھ لے لیا اور اس دوشیزہ کے لئے یہی بہتر تھا، تم موت کے بڑھتے ہوئے پنجوں سے اپنے حصے کی حفاظت نہ کر سکے لیکن خدا جنت کی غیر فانی زندگی میں اپنا حصہ محفوظ رکھے ہوئے ہے تمہاری سب سے بڑی تمنا اس کی برتری اور اس کی بہتری تھی تمہاری جنت اسی میں تھی کہ اس کی دُنیوی حیثیت میں رفعت پیدا ہو! اور جب اسے بادلوں کے اس پار آسمان کی بلند ترین چوٹیوں سے سر ملانے کا موقع ملا تو تم آنسو بہا رہے ہو۔ اس محبت کے اندھے جوش میں تم اپنی پیاری بچی سے کتنی ناانصافی کر رہے ہو۔ اسے بڑھتا ہوا دیکھ کر پاگل ہوئے جاتے ہو۔ طویل متاہلانہ زندگی مسرور شادی پر دلالت نہیں کرتی، بہترین شادی وہی ہوتی ہے جسے جوانی کی موت اپنی لپیٹ میں لے لے۔ اپنے آنسو پونچھ ڈالو۔ روزمری کے پھول اس خوبصورت نعش پر نچھاور کرو۔ اور رسم کے مطابق اسے اس کے بہترین لباس میں کلیسائے مقدس تک پہنچا دو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے محبت بھرے دل ہم سب کو رونے پر مجبور کرتے ہیں لیکن یہ آنسو عقل کے لئے قہقہوں کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔

کاپولیٹ — ہر وہ چیز جسے ہم نے خوشی منانے کے لئے جمع کیا تھا اصلی مقصد کھو کر ہولناک جنازے میں بدل گئی ہے۔ ہماری مسرت کے شادیانے جنازے کے ساتھ بجنے والے گھنٹوں میں بدل گئے ہیں شادی کی یہ خوشیاں بَین بن کر چیخ اٹھی ہیں۔ ہمارے ترانے مرثیے بن گئے ہیں۔ یہ پھول جو سہرا بنانے کے لئے لائے گئے تھے مُردے کی چادر میں ٹانک دیئے گئے۔ ایسا انقلاب آیا کہ ہر چیز اُلٹ گئی! اُف! چلئے کی

فرایر — آپ اندر جائیے، اور بیگم آپ بھی، نواب پیرس آپ بھی تشریف لے چلئے۔ اس حسین لاش کو آخری منزل تک پہنچانے کے لئے سب لوگ تیار ہو جائیں۔ یہ سب تمہارے کسی گناہ کی یاد میں

اور چند کہ حذا وند خدا کی مرضی میں روڑے اٹکانے کی کوشش کرکے اسے زیادہ غضبناک بنانے کی تدبیر نہ کریں۔

(جولیٹ پر روزمری کے پھول برسا کر اور پردے کھینچ کر سب چلے جاتے ہیں۔ آیا اور سازندے رہ جاتے ہیں)

پہلا سازندہ۔ تو اب یہ ڈھول ڈھکے بغل میں داب کے لیے ہو لیں۔

آیا۔ کیا کیا جا سکتا ہے اور بھائی لوگو۔ دیکھتے نہیں کیا درگت ہوئی ہے (جاتی ہے)

پہلا سازندہ۔ لیکن ہاں قسم اگتیں تو ٹھیک کی جا سکتی ہیں۔ (پیٹر آتا ہے)

پیٹر۔ باجے والو! او باجے والو! "دل کی دنیا" اگر تمہیں میری زندگی کی ضرورت ہے تو بجاؤ "دل کی دنیا"۔

پہلا سازندہ۔ کیوں؟ "دل کی دنیا" کس لئے؟

پیٹر۔ آہ! کیونکہ میرا دل گا رہا ہے: "اجاڑ دی تو نے" کوئی اچھا سا غمناک گیت چھیڑو، کچھ تو تسلی ہو؟

پہلا سازندہ۔ جی نہیں! یہ غمناک گیت کا کون وقت ہے؟

پیٹر۔ کیا کہا؟ نہیں بجاؤ گے؟

پہلا سازندہ۔ بالکل نہیں۔

پیٹر۔ تو پھر تمہیں اچھی طرح سے دونگا۔

سازندہ۔ کیا دوگے تم؟

پیٹر۔ چاندی سونا نہیں تمہارے منہ پر گھونسے۔ تمہیں بھاٹ کا نام دونگا بھاٹ کا ——!

سازندہ۔ اور ہم تمہیں ذلیل نوکر کا نام دینگے۔

پیٹر۔ اور میں اس ذلیل نوکر کی چھڑی دونگا تمہاری کنپٹی پر۔ یہ بے سرا پن برداشت نہیں ہو سکتا۔ ہاں، وہ تم تا تم ہو گی تمہارے سر پر کہ مینڈک کی طرح ٹرانے لگو گے۔

سازندہ۔ اس تم تا تم کے جواب میں ڈھول کی طرح پیٹ دیا جائیگا تمہارا بھیجا۔

دوسرا سازندہ۔ او میاں! یہ کیا بے تکا پن ہے۔ سنبھال رکھو یہ خنجر! اور بھئی تم بھی منہ بند کرو۔

پیٹر۔ میرے منہ سے نکلتے ہوئے یہ تیر تمہیں کافی گھایل کر دینگے۔ خنجر تو میں سنبھال لیتا ہوں۔ آدمیوں کی طرح بات کرو۔

دل میں ڈوبے غم کا برچھا
ذہن کرے شعلوں کی برکھا
اس وقت! ہاں اس وقت،
سنگیت کی چاندی سی آواز۔

کیوں؟ چاندی سی آواز۔ آخر یہ سنگیت کی چاندی کی آواز؟ کیوں؟ سائمن کیٹلنگ تمہارا کیا خیال ہے؟

پہلا سازندہ۔ ارے بھئی چاندی کی آواز ذرا کانوں کو اچھی لگتی ہے اور کیا؟

پیٹر۔ شاباش! اچھا تو ربیک! تم کیا کہتے ہو اس بارے میں؟

دوسرا سازندہ۔ میرا خیال ہے کہ چاندی سی آواز اس لئے ہے کہ گانے بجانے والے چاندی ہی کے لئے یہ سب پاپڑ بیلتے ہیں۔

پیٹر۔ اوہ شاباش! اور جیمز ساؤنڈ پوسٹ تم کیا کہتے ہو اس مسئلے کے بیچ بیچ!

تیسرا سازندہ۔ میں نہیں جانتا کیا بکواس ہے یہ؟

پیٹر۔ اللہ تم پر رحم کرے۔ رحم کرے۔ اپنا مولیٰ کی ذات، اور اس پر بھی تم اینڈ کر کہتے ہو کہ جی ہم ہیں گویئے! لیکن خیر تمہاری جگہ میں جواب دیتا ہوں "سنگیت کی چاندی سی آواز" اس لئے کہی گئی ہے کیونکہ گانے بجانے والوں کے پاس بجانے کے لئے سونا تو ہوتا ہی نہیں (پیٹر باہر بھاگ جاتا ہے)

تو پھر —— سنگیت کی چاندی سی آواز
بھاگ کے رکھ دے پھاہا

پہلا سازندہ۔ کیا بکواس کر رہے ہو؟

دوسرا سازندہ۔ ارے بھاڑ میں جائے وہ! چلو اندر چل کر بیٹھیں۔ بیٹھو ماتم والے فارغ ہوں تو کچھ حلوے مانڈے کا بھی بندوبست ہو جائے (جاتے ہیں)

جرعہ پنجم!

پہلا منظر

(مانچوا کا ایک بازار۔ نصف اسٹیج، رومیو آپ ہی آپ سوچ سوچ کر کرار رہا ہے)

رومیو۔ اگر نیند کے غیر یقینی حقائق پر اعتبار کیا جا سکتا ہے تو میرے خواب کی یہی تعبیر ہو سکتی ہے کہ مجھے جلد از جلد ایک بہت بڑی خوشی حاصل ہونے والی ہے۔ میرے سینے کا مالک فرخندہ روئی سے اپنے تخت پر

[illegible] اور آج تمام دن ایک غیر معمولی مسرت کے احساس نے مجھے ایڑی زمین پر نہیں ٹکنے دی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میری بیوی، میری محبوب آئی ہے۔ خواب بھی کیسا عجیب ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد مرنے والے کو موت پر غور کرنے کا پورا موقع حاصل ہوتا ہے۔ اور اس نے اپنے بوسوں سے میرے ہونٹوں میں ایک ایسی زندگی ایک تازہ روح پھونک دی۔ اور میں پھر بیدار ہو گیا۔ مسرت و شادمانی کا تاج میرے سر پر رکھ دیا گیا ہے۔ اللہ اللہ! اگر محبت کا یہ محض دھندلا سا عکس مسرتوں کے اتنے لامحدود خزانے کا حامل ہو سکتا ہے تو خود وہ محبت جو حاصل ہو جائے کتنی نظر فریب اور دلنواز نہ ہوگی۔

(اس کا نوکر بلیشار جوتے پہنے ہوئے آتا ہے)

ویرونہ سے خبر آئی ہے آؤ بیلشار! فرایر کا کوئی خط نہیں لائے؟ میری بیوی کیسی ہے؟ والد ماجد تو اچھے ہیں نا؟ میری جیولیٹ کا کیا حال ہے؟ میں یہ سوال اس لئے دوبارہ کرتا ہوں کہ اگر جیولیٹ آرام سے ہے تو دنیا کی کوئی چیز مغموم نہیں ہو سکتی۔

بیلشار۔ تو پھر سن لیجئے کہ ان کے تمام روگ مٹ گئے۔ سارے دلدر دور ہو گئے۔ اب کہیں بھی برائی پیدا نہ ہوگی۔ ان کا فانی جسم کاپولیٹ والوں کے احاطے میں ہمیشہ کے لئے سو چکا ہے اور اس کا غیر فانی جزو فرشتوں کے ساتھ ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے انھیں چلتے مقبرے میں لیجاتے دیکھا اور اسی وقت تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔ آقائے محترم! معاف کیجئے۔ بری خبر لایا ہوں لیکن کیا کرتا حضور ہی نے میرے ذمہ یہ فرض عاید کر رکھا تھا۔

رومیو۔ اُف میرے اللہ کیا ہوا یہ؟ لعنت تم پر قسمت پر حکومت کرنے والے ستارو! تم میرا مکان جانتے ہو۔ بھاگتے ہوئے جاؤ کاغذ قلم دوات اٹھا لاؤ اور تیز رو گھوڑے بھی کرائے پر لے لو۔ میں آج ہی رات وہاں پہنچ جانا چاہتا ہوں۔

بیلشار۔ میری مانئے حضور! صبر سے کام لیجئے۔ آپ کے چہرے پر دہشت سی برستی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوئی خوفناک بات کیا چاہتے ہیں۔

رومیو۔ چپ رہو جی! تمہیں دھوکا ہوا ہے۔ مجھے تنہا چھوڑ دو اور جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔ فرایر کا کوئی خط نہیں لائے؟

بیلشار۔ نہیں تو حضور!

رومیو۔ کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔ اچھا اب تم جاؤ۔ گھوڑے لے کر سیدھے میری طرف آ جاؤ۔

کوئی بات نہیں جیولیٹ! میں آج رات ہی کو تمہارے پاس آ جاؤں گا۔ کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ —— آہ، بدی تو مایوس ذہن پر اپنا اثر کرنے میں کتنی عجلت پسند ہوتی ہے، وہ عطار مجھے یاد آ گیا جو یہیں کہیں رہتا ہے۔ میں نے کچھ ہی دن ہوئے اسے دیکھا تھا چیتھڑے لٹکتے، بڑی بڑی آگے کو جھکی ہوئی گھنی بھنویں تھیں اس کی، اور یونہی معمولی سی جڑی بوٹیاں اس کے پاس تھیں۔ اس کے چہرے پر اداسی کی مہریں ثبت تھیں۔ مصائب نے اس کے جسم کا گوشت چن چن کر نوچ لیا تھا اور اسے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا تھا اس کی اجاڑ دکان میں ایک کچھوا، ایک مگر اور چند عجیب قسم کی مچھلیوں کی کھالیں لٹک رہی تھیں۔ اس کی الماریوں پر چند بھوسے سبز رنگ کے مٹی کے کوزوں، پچکنوں، خوشبودار بیجوں، دھاگوں کی پوٹلیوں اور گلاب کی سوکھی ہوئی پنکھڑیوں کا چھوٹا سا ڈھیر تھا جسے وہ اپنا سرمایہ کہا کرتا تھا۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ غربت اور حاجتمندی اس سے زیادہ بھیانک اثرات نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر کسی کو زہر کی بھی ضرورت ہو جس کا بیچنا منٹوا کے قوانین کے مطابق ایسا جرم ہے جس کی سزا موت کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی تو وہ بھی یہاں سے مل جائے گا۔ آہ یہ خیال میری ضرورتوں کا پیش رو تھا اور یہی عطار تھا جس کی قسمت میں مجھے زہر دینا لکھا تھا۔ میرا خیال ہے یہی مکان ہوگا اس کا۔ آج چھٹی ہے اس بھک منگے کی دکان تو بند ہوگی۔ ارے، اے میاں عطار! (عطار آتا ہے)

عطار۔ کون پکار رہا ہے؟

رومیو۔ ادھر آؤ بھئی ادھر آؤ! میں جانتا ہوں تم غریب آدمی ہو۔ یہ چالیس ڈیوکٹ سنبھالو۔ مجھے رتی بھر زہر دیدو۔ لیکن یہ اپنے عمل میں ایسا تیز ہونا چاہئے کہ حلق سے اترتے ہی بجلی کی سرعت سے رگوں میں دوڑ جائے اور زندگی کے ہاتھوں ستایا ہوا، اس کا پینے والا موت کی نیند سو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ بارود کا گولہ چنگاری پکڑتے ہی جس شدت اور تیزی سے توپ کے ہولناک دہانے سے باہر نکل جاتا ہے اسی طرح اس کے پیتے ہی زندگی اس لعنتی جسم سے نکل جائے۔

عطار۔ ایسے قاتل زہر میرے پاس ہیں تو لیکن ان کا بیچنا موت ہے۔

رومیو۔ تم بھی جس کی ساری خوشیاں ایک ایک کر کے چھین لی گئی ہوں، اور جسے مایوسیوں کے سوا دنیا میں اور کچھ نظر نہ آئے موت کے سکرات کی لذتوں سے ڈرتے ہو؟ تمہارے گالوں پر فاقے کی حکومت ہے، حسرتیں اور بھوک تمہاری آنکھوں میں دم توڑ رہی ہیں۔ [illegible]

ہوئے ان چیتھڑوں میں بھوک اور نفرت آنکھیں پھاڑ سے گھور رہی ہے
دنیا تیری دوست نہیں اور نہ ہی دنیا کا کوئی قانون تیرا ہمدرد ہے
دنیا نے کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جس سے تیری ضرورتیں پوری ہوں
اور تیری عسرت امارت میں بدل جائے اس لئے کمزور نہ بن ایسے
بے درد قانون کی دھجیاں اڑا دے اور میرا کہا مان -

عطار - گو میرا دل اس بات پر رضامند نہیں ہوتا لیکن میری غریبی مجھے
مجبور کر رہی ہے -

رومیو - میں یہ سب کچھ تجھے نہیں بلکہ تیری غریبی ہی کو دے رہا ہوں -
(عطار جاتا ہے اور شیشی لیکر واپس آتا ہے)

عطار - اسے کسی سیال چیز میں گھول کر پی جاؤ - اگر تمہارے جسم میں بیس
آدمیوں کی طاقت بھی ہوگی تب بھی یہ اپنا اثر کریگی اور تمہیں جلد
از جلد اس دنیا سے فارغ کردیگی -

رومیو - یہ لو اپنا سونا ، جو انسانی روح کے لئے اس زہر سے کہیں زیادہ
قاتل زہر کا حکم رکھتا ہے اور جس نے اس قابل نفرت دنیا میں ایسے
ایسے قتل کئے ہیں جن کا عشر عشیر بھی تمہاری یہ کمزور دوائیں
جن پر قانون نے پابندیاں عاید کر رکھی ہیں نہیں کرسکتیں - میں
نے تمہیں زہر دیا ہے تم نے مجھے کچھ بھی نہیں دیا - خدا حافظ ! کھانے
پینے کی چیزیں خریدو اور اپنی ان ہڈیوں کو گوشت سے ڈھانپنے
کی کوشش کرو - (عطار اپنے گھر میں چلا جاتا ہے) آؤ میرے
عزیز دوست ! تم زہر نہیں دوست ہو ! آؤ جولیٹ کی قبر پر چلیں
وہاں تمہاری ضرورت ہوگی - (جاتا ہے)

دوسرا منظر

(فرایر لارنس کی کٹی - نصف اسٹیج - (فرایر اندرونی کمرے میں ہے ،
فرایر جان کٹی میں آتا ہے)

فرایر جان - مقدس راہب ! ارے بھائی راہب (فرایر لارنس آتا ہے)

فرایر - یہ تو راہب جان کی آواز معلوم ہوتی ہے - مانچوا سے آگئے بھائی
خوش آمدید ! کہو رومیو کیا کہتا ہے ؟ اگر اس نے اپنے دل کا راز
کاغذ کے سپرد کیا ہے تو خط مجھے دیدو -

فرایر جان - اپنے ہی ادارے کے ایک ننگے پاؤں والے بھائی کو جو اس
شہر میں بیماروں کی دیکھ بھال کے لئے آیا ہوا تھا ساتھ لیجانے کے
لئے مجھے چنانچہ ایسے گھروں میں جانا پڑا جو بیماری کی لعنت میں
گرفتار تھے - میرا ساتھی تو مل گیا لیکن جب ہم چلنے لگے تو شہر کی
دیکھ بھال کرنے والوں کو ہم پر بھی چھوت چھات کا گمان گذرا ،
اور انھوں نے دروازے پر مہریں کرکے ہماری آمد و رفت کے راستے
مسدود کردیئے اس لئے میں مانچوا تک نہ پہنچ سکا ،

فرایر لارنس - تو میرا خط پھر کون لے گیا رومیو تک -

فرایر جان - میں نہیں بھیج سکا اسے ـــ یہ رہا ـــ یہ لوگ چھوت
چھات سے کچھ ایسے ڈر گئے تھے کہ مجھے کوئی ایسا آدمی بھی نہ مل سکا
جس کے ہاتھ میں یہ خط اس تک پہنچا سکتا -

فرایر لارنس - اُف ! بدنصیبی ہے یہ - اس خط میں کوئی معمولی بات نہیں
لکھی ہوئی تھی بلکہ ایک بہت ہی ضروری خبر تھی - جس کا نہ پہنچنا
بڑے خطرناک نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوگا - فرایر جان ! ابھی جایئے
اور جتنی جلدی ممکن ہوسکے ایک آہنی بیلچہ لا دیجئے مجھے - سیدھے
میری ہی کٹی میں آیئے گا - (جاتا ہے)

تیسرا منظر

(کاپولیٹ گھرانے کا قبرستان - عقبی کمرے کے ساتھ پوری اسٹیج
ایک قبر جس میں جیولیٹ کا جسم نظر آرہا ہے دکھائی دیتی ہے
قبرستان کی طرف جانے والا دروازہ نظر آرہا ہے دوسری
قبریں دھندلی دھندلی نظر آتی ہیں - دروازے میں سے ایک
دھندلی روشنی کی شعاعیں نظر آرہی ہیں - قبرستان پر تاریکیاں
مسلط ہیں غالباً پو پھٹ رہی ہے - پیرس اور اس کا نوکر پھول
اور خوشبودار عرق اٹھائے آتے ہیں -)

پیرس - اے ! یہ شمع مجھے دیدے ! اور یہاں سے ہٹ کر علیحدہ کھڑا ہو جا
نہیں نہیں بجھا دے اسے - میں نظر نہیں آنا چاہتا اسے - اس
درخت کے نیچے سیدھے لیٹ جاؤ اور زمین سے کان لگائے رہو
تاکہ ہر وہ قدم جو لڑکھڑاتا ہوا قبرستان کی اس زمین پر پڑے
یا قبر کھودنے کی کوئی آواز جو اس کے بعید ترین کونوں میں پیدا
ہو تمہارے کانوں تک پہنچ جائے اسی وقت سیٹی بجا دو کسی کو
آتا سن کر یہ تمہارا اشارا ہوگا - جاؤ جو کچھ کہا گیا ہے اس کے مطابق
عمل کرو - یہ پھول مجھے دیدو -

نوکر - (علیحدگی میں) اے اللہ ! قبرستان میں اس طرح اکیلا کھڑا ہونے
سے تو میری جان نکلی جاتی ہے لیکن پھر بھی ہمت کرتا ہوں -
(جاتا ہے - پیرس قبر پر پھول ڈالتا ہے)

پیرس - میری زندگی کے حسین معطر پھول ! میں تیرے بستر عروسی پر پھول بکھیرتا

ہوں۔ آہ افسوس! تیرے سر پر تنا ہوا شامیانہ مٹی اور پتھروں کا ہے جس پر میں ہر رات خوشبودار عرق کی شبنم برسایا کرونگا اور اگر یہ نہ مل سکے گی تو گریہ وزاری سے کشید کئے ہوئے آنسو یہ فرض پورا کرینگے۔ سوگ جو میں تیرے لئے مناؤنگا یہی ہوگا کہ ہر رات میں تیری قبر پر پھول ڈالوں اور آنسوؤں کے موتی لٹاؤں۔ (نوکر سیٹی بجاتا ہے) کوئی آرہا ہے۔ وہ کون سا لعنتی قدم ہے جس نے آج کی رات ادہر بھٹک کر میرے رنج وغم اور میری حقیقی محبت کی کیف سامانیوں کو درہم برہم کردیا ہے؟ یہ کیا شمع بھی ہے ساتھ۔ رات چند لمحوں کے لئے مجھے اپنے پردوں میں چھپالے۔

(پیرس چھپ جاتا ہے۔ رومیو اور بیلتسار پھاوڑہ، شمع اور سابرا اٹھائے آتے ہیں)

رومیو۔ یہ سابرا اور پھاوڑہ مجھے دیدو۔ ٹھہرو! یہ خط لو۔ اور خیال رہے صبح تمہارا سب سے پہلا کام اس خط کو والد کرم کی خدمت میں پہنچانا ہے۔ یہ شمع مجھے دو۔ تمہارے لئے یہی حکم ہے کہ تم جو کچھ دیکھو، جو کچھ سنو دخل مت دو۔ ایک طرف کھڑے رہو، ورنہ جان سے مار دونگا۔ موت کی اس آماجگاہ میں آنے کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ اپنی بیوی کا منہ دیکھنا چاہتا ہوں لیکن سب سے بڑی وجہ جس نے کھینچ تان کر مجھے یہاں لاڈالا ہے یہ ہے کہ میں اس کی مردہ انگلیوں سے ایک انگوٹھی اتارنا چاہتا ہوں۔ اس کی مجھے سخت ضرورت ہے۔ لو اب بھاگ جاؤ یہاں سے۔ اور اگر تمہارے متجسس دماغ نے تمہیں مجبور کردیا اور تم اس بات کی کھوج نکالنے کی غرض سے یہاں آ پہنچے جو میں اب کرنا چاہتا ہوں تو قسم خدا کی میں تمہاری بوٹی بوٹی الگ کرکے اس بھوکے قبرستان کے جبڑوں میں بکھیر دونگا۔ یاد رہے کہ آدھی رات کا یہ وقت، قبرستان کی سرسراتی ہوئی فضا اور میرے ارادے بھوکے شیروں اور پھنکارتے ہوئے سمندروں سے کہیں زیادہ ہولناک اور قاتل ہیں ——!

بیلتسار۔ میں جاتا ہوں سرکار! بھلا آپ کو تکلیف کیوں دونگا؟

رومیو۔ یہ تمہاری مہربانی ہوگی۔ یہ لو (پیسے دیتا ہے) زندہ رہو اور خوش رہو۔ خدا حافظ میرے دوست!

بیلتسار۔ (علیحدگی میں) اس ڈرانے دھمکانے کے باوجود میری سرکار آپ کا یہ خادم باہر ہی کہیں چھپا رہے گا۔ مجھے خوف ہے کہ آپ اپنے ساتھ کچھ بری کیا چاہتے ہیں۔

رومیو۔ قابل نفرت مٹی کے ڈھیر! موت کے کریہہ پیٹ! تو نے دنیا کا بہترین نوالہ ہڑپ کرلیا۔ اس طرح تیرے ان مکروہ جبڑوں کو بھانچ کھولدونگا (قبر کو کھولتا ہے) اور انتہائی نفرت کے ساتھ ایک دوسرا لقمہ بھی تیرے منہ پر مارتا ہوں۔

پیرس۔ یہ وہی غضبناک مانٹیگ ہے جسے جلاوطن کردیا گیا تھا۔ وہی ہے جس نے میری حسین محبوبہ کے چچا زاد بھائی کو قتل کیا تھا جس کے غم میں یہ حسین ہستی گھل گھل کر مرگئی ہے۔ اب شاید مُردوں کے ساتھ بھی کوئی شرمناک گناہ کرنے آیا ہے۔ میں روکتا ہوں اسے (آگے آتا ہے) اپنی ان ناپاک کوششوں کو روک دو وحشی مانٹیگ کیا انتقام موت کے پردوں کو چیر کر بھی اپنا اثر کرسکتا ہے۔ بدبخت جہنمی۔ میں تجھے روک رہا ہوں۔ ٹھہر جا! اور میرے ساتھ چل تجھے مرنا ہی ہوگا۔

رومیو۔ ہاں واقعی مرنا ہوگا۔ اسی لئے تو میں یہاں آیا ہوں، جاؤ اچھے بھائی ایک مایوس آدمی کو مت چھیڑو۔ بھاگ جاؤ اور مجھے میری تنہائیوں میں غرق رہنے دو۔ ان موت کے آغوش میں لیٹے ہوؤں کو دیکھو اور عبرت پکڑو۔ مجھے اس طرح غصہ دلاکر میرے کندھوں پر ایک اور گناہ کا بوجھ نہ لادو۔ جاؤ بھاگ جاؤ۔ واللہ میں تمہیں اپنے سے زیادہ چاہتا ہوں کیونکہ میں یہاں اپنے خلاف خود ہی ہتھیار سج کر آیا ہوں۔ یہاں مت ٹھہرو۔ جاؤ جیتے رہو اور کہا کرنا کہ ایک دیوانے نے موج میں آکر تمہیں بھاگ جانے کا وقت دیا تھا

پیرس۔ میں تمہاری اس بکواس پر لعنت بھیجنا بھی اپنی ہتک سمجھتا ہوں اور تمہیں بزور شمشیر روکونگا۔

رومیو۔ تم میری اس آگ پر تیل چھڑک کر ہی رہو گے تو پھر لو (لڑتے ہیں)

ملازم۔ صاف خداوند خدا، یہ تو گتھ گئے آپس میں۔ میں سنتریوں کو بلا لاؤں جلدی سے۔ (جاتا ہے)

پیرس۔ اُف مارا گیا میں (گرتا ہے) اگر تمہارے دل میں کچھ تھوڑا سا رحم ہے تو یہ قبر کھول کر میری لاش جیولیٹ کے قریب رکھ دینا۔

رومیو۔ ضرور رکھونگا۔ دیکھوں تو یہ چہرہ! اُف مرکوشیو کا رشتہ دار شریف النفس پیرس! جب ہم آرہے تھے تو میرے نوکر نے کیا کہا تھا؟ اس وقت میری روح آفات کے اس گرداب میں تھپیڑے کھا رہی تھی اور اپنے آپ میں کچھ ایسا گم تھا کہ اس کا ایک لفظ نہ سن سکا۔ اس نے شاید یہی کہا تھا کہ جیولیٹ کو پیرس اپنی بیوی بنالیتا۔ یہی کہا تھا شاید یا شاید میں نے خواب دیکھا تھا یا کیا؟ میرا سر پھر گیا ہے کہ اس سے جیولیٹ کے متعلق کچھ سن کر میں نے یہ سب کچھ تصور کرلیا؟ آہ بھائی

بدقسمتی نے اپنی تاریک کتاب میں تمھارا نام بھی میرے نام کے ساتھ ہی لکھ دیا تھا۔ میں تمھیں اس شاندار مدفن میں دفن کروں گا۔ اوہ نہیں نہیں! مقتول نوجوان! ایک قندیل میں تیرا جسم رکھ دوں گا کیونکہ یہ قبر نہیں ہے۔ یہاں جیولیٹ محو استراحت ہے اور اس کے حسن کی نور پاش کرنیں اس تاریک کوٹھری کو تجلّی زار بنائے ہوئے ہیں تم جسے ایک مردے کے ہاتھوں نے آخری نیند سلا دیا یہاں لیٹ جاؤ۔ (جیولیٹ کی قبر میں پیرس کی لاش رکھ دیتا ہے) کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ مرنے سے پہلے آدمی ایک خاص قسم کی مسرت کا احساس کرتا ہے۔ اس کے تیماردار اس احساس مسرت کو بجلی کی چمک کہہ کر پکارا کرتے ہیں۔ آہ کیا میں اسے بھی بجلی کی چمک ہی کا نام دوں میرے دل کی رانی! میری پیاری بیوی! اوہ موت! جس نے اس نرم و نازک سانس کی ساری شیرینیاں چوس لی ہیں تیرے حسین چہرے پر قدرت پانے میں ناکام ہو گئی۔ تمھاری شکست ابھی تک نہیں ہوئی تمھارے ہونٹوں اور تمھارے ان پیارے گالوں میں حسن کے ابھرے پھریرے ابھی تک اڑ رہے ہیں اور موت کے زرد پرچم ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے۔ ٹیبولٹ تم بھی ابھی تک اس خون آلود کفن میں لپٹے پڑے ہو؟ اس سے زیادہ تمھاری کیا خاطر کر سکتا ہوں کہ اسی ہاتھ سے جس نے تمھاری جوانی کو دو نیم کرکے خاک و خون میں تڑپا دیا تھا۔ اس شخص کی جوانی تمھارے قدموں پر ڈال دیتا ہوں جو تمھارا دشمن تھا۔ معاف کر دو بھائی! پیاری جیولیٹ! آخر تم ابھی تک اتنی حسین کیوں ہو؟ کیا میں یہ باور کر لوں کہ یہ حقیر موت بھی عاشق مزاج ہے اور اس کراہت انگیز کبڑے شیطان نے تمھیں اس غار میں زبردستی بند کر رکھا ہے۔ اسی خوف سے میں اب ہمیشہ کے لئے تمھارے پاس ہی رہوں گا۔ اب میں کبھی بھی دھندلی رات کے اس محل سے باہر قدم نہ رکھوں گا۔ میں اس جگہ ان کیڑوں کے ساتھ رہوں گا جو تمھارے لونڈی غلام ہیں۔ میں اسی جگہ کو اپنے دائمی اطمینان کا مرکز بنا لوں گا اور دنیا سے اکتائے ہوئے گوشت و خون کے اس لوتھڑے کو منحوس ستاروں کے اثر سے آزاد کرا لوں گا۔ آنکھو! آخری دفعہ دیکھ لو اپنے حسین معبود کو۔ بازوؤ! آخری بار چھاتی سے لگا لو اس پیارے خزانے کو۔ اور ہونٹو! تم جو سانس کی آمد و شد کا دروازہ ہو سب کچھ خرید لینے والی موت کے ساتھ ایک غیر فانی عہد نامہ کر لو اور اس پر ایک سچے بوسے کی مہر ثبت کر دو۔ میرے راستے کے درشت خضر! اے تلخ پیل، مایوس ملاح! سمندر کے تھپیڑوں سے عاجز آئی ہوئی شکستہ کشتی کو خوفناک چٹانوں پر پٹک دے۔ یہ ہے میری محبوبہ کا جام صحت (پیتا ہے) عطار! کس قدر سچا تھا تو! تیری دوا تو فوری طور پر زود اثر ہے۔ ایک بوسہ! اور میری زندگی کا اختتام۔

(مر جاتا ہے)

(فرایر لارنس دروازے کے باہر لالٹین، بیلچہ اور پھاوڑہ کے ساتھ آتا دکھائی دیتا ہے)

فرایر۔ اللہ! میرے پاؤں میں چلنے کی ہمت دے۔ کتنی دفعہ میرے بوڑھے قدموں نے ان قبروں سے ٹھوکر کھائی ہے۔ کون ہے؟

بیلتشار۔ (دروازے سے باہر) آپ کا خیر خواہ اور خادم! جسے آپ کی نیاز مندی حاصل ہے۔

فرایر۔ تم پر برکتیں نازل ہوں۔ ارے بھئی ذرا یہ تو بتا کہ وہ شمع جو کیڑوں، پتنگوں اور آنکھوں سے محروم کھوپڑیوں کو روشنی دکھا رہی ہے کس لئے پڑی ہے وہاں؟ وہ تو شاید کاپولیٹ خاندان کے احاطے میں جل رہی ہے۔

بیلتشار۔ جی ہاں! وہاں میرے آقا بھی ہیں جنھیں آپ بہت چاہتے ہیں۔

فرایر۔ کون؟

بیلتشار۔ رومیو!

فرایر۔ کتنی دیر ہوئی انھیں آئے؟

بیلتشار۔ کم از کم آدھ گھنٹہ گذر گیا ہوگا۔

فرایر۔ چلو قبر پر چلیں!

بیلتشار۔ یہ تو نہ ہو سکے گا سرکار! آقا صرف یہی جانتے ہیں کہ میں یہاں سے چلا گیا ہوں انھوں نے مجھے سخت حکم دے رکھا ہے کہ میں ان کی کسی بات کو نہ دیکھوں۔ ورنہ وہ کہتے تھے کہ میں کچا ہی چبا جاؤں گا۔

فرایر۔ تو پھر تم ٹھہرو! میں اکیلا ہی جاتا ہوں! اُف خوف سے میرا رواں رواں کانپ رہا ہے مجھے ڈر ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔

بیلتشار۔ میں اس درخت کے نیچے سو رہا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا گویا میرے آقا کسی سے لڑ رہے ہیں اور جیسے انھوں نے اپنے حریف کو مار گرایا ہے۔

فرایر۔ (قبر کے دہانے پر پہنچ کر پکارتا ہے) رومیو!

(فرایر جھک کر خون اور ہتھیاروں کو دیکھتا ہے) یہ کس کا خون ہے جس نے اس قبر کے سنگلاخ دہانے کو لالہ زار بنا رکھا ہے؟ یہ کس نامعلوم شخص کی خوفناک تلوار ہے جو یہاں امن و

[illegible] وقت میں ہیجان ڈال دیا ہے (قبر میں دیکھ کر)
رومیو! اُف زرد ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ کون ہے؟ ارے رے!
پیرس بھی اور ڈوبا ہوا خون میں؟ وہ کون سا بے درد لمحہ تھا جو اس
افسوسناک حادثے کا باعث ہوا۔ (جیولیٹ قبر میں اُٹھ کر بیٹھ جاتی
ہے) وہ ہلی ——!

جیولیٹ۔ نیک دل راہب! آپ کتنے مہربان ہیں! میرا سرتاج کہاں
ہے؟ مجھے یاد ہے مجھے جہاں ہونا چاہیئے تھا وہیں پر ہوں۔ میرا
رومیو کہاں ہے؟ (آتے ہوئے لوگوں کی آواز آتی ہے)

فرایر۔ یہ شور کیسا ہے؟ لڑکی موت، بدبو اور غیر فطری نیند کے
اس جال سے باہر نکل آ! ہمارے ارادوں پر ایک ایسی زبردست
طاقت نے جس کا ہم مقابلہ نہیں کر سکتے ناکامیوں کی کاری ضرب
لگا دی ہے۔ جلدی نکل آ، باہر آجا! وہ دیکھ تیرا خاوند تیری گود میں
مُردہ پڑا ہے اور پیرس نے بھی ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں موند
لی ہیں! باہر آجا! میں تجھے راہبہ بنا لونگا۔ یہ بحث کرنے کا وقت
نہیں ہے۔ لوگ ہمیں پکڑنے کے لئے بھاگے آرہے ہیں۔ اچھی جیولیٹ
باہر آجاؤ۔ (شور سنائی دیتا ہے) مجھ میں اور زیادہ ٹھہرنے کی ہمت نہیں

جیولیٹ۔ جائیے! آپ چلے جائیے میں نہ آؤنگی۔ (فرایر جلدی سے
چلا جاتا ہے) یہ کیا ہے؟ میرے سچے محبوب کے ہاتھوں میں بھنچا ہوا
پیالہ۔ اس بے وقت کی موت کا باعث شاید زہر ہی ہے۔ جاؤ
جی تم بڑے وہ ہو، اس میں ایک قطرہ بھی نہیں چھوڑا جو میری
مدد کر سکے تو میں تمہارے ہونٹوں کا بوسہ لیتی ہوں۔ ممکن ہے
کہ ان ہونٹوں پر اب بھی کوئی قطرہ لرز رہا ہو جو مجھے اس زندگی
سے نجات دلا کر ایک غیر فانی زندگی دیدے (بوسہ لیتی ہے) ان
ہونٹوں میں ابھی حرارت ہے۔

سپہ سالار۔ (دروازے کے سامنے آتے ہوئے) اب آگے آگے چل بتا کہاں ہے؟

جیولیٹ۔ یہ شور! تو مجھے جلدی کرنا ہوگی! او مہربان خنجر (رومیو کا خنجر
نکال لیتی ہے) یہ ہے تیری میان! (سینے میں گھونپ لیتی ہے)
یہیں تم پر زنگ چڑھے گا اور میری موت! (رومیو کے جسم پر گر کر مر جاتی ہے)
(پہرے کے افسر پیرس کے ملازم کے ساتھ آتے ہیں)

نوکر۔ یہی ہے وہ جگہ! وہ جہاں مشعل جل رہی ہے۔

سپہ سالار۔ زمین پر خون بکھرا پڑا ہے۔ جاؤ سارے قبرستان میں ڈھونڈو
اور جو بھی تمہیں ملے پکڑ کر میرے سامنے لے آؤ (کچھ پہرے والے
جاتے ہیں) کس قدر افسوسناک منظر ہے۔ نواب پیرس قتل ہوا پڑا ہے

اور جیولیٹ جس کو مرے اور دفن ہوئے دو دن گزر گئے تھے
معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی ماری گئی ہے۔ جسم گرم ہے اور دیکھو
تو خون ابھی برس رہا ہے۔ جاؤ بادشاہ کو اطلاع دو۔ کاپولیٹ
کی طرف بھاگو۔ مانٹیگ کو بلاؤ۔ ارے کچھ اور لوگ چلے جاؤ نا!
(پہرے کے چند اور آدمی جاتے ہیں) وہ زمین جس پر یہ آسمان ٹوٹے
ہمیں نظر آرہی ہے۔ لیکن اس نزاع کی وجہ اس وقت تک
معلوم نہیں ہو سکتی جب تک حالات منطبق نہ ہو جائیں۔
(پہرے کے کچھ لوگ بلتشار کو لیکر آتے ہیں)

دوسرا پہرے والا۔ یہ رومیو کا نوکر ہے قبرستان کے دروازے پر ملا تھا ہیں۔

سالار۔ اسے اس وقت تک حراست میں رکھو جب تک شاہ معظم
کی سواری نہ آئے۔
(پہرے کے دوسرے آدمی فرایر لارنس کے ساتھ آتے ہیں)

تیسرا پہرے والا۔ یہ مقدس راہب ہے، جو تھر تھر کانپ رہا ہے، روتا ہے
آہیں بھرتا ہے قبرستان کی طرف سے آرہا تھا یہ ہم نے اس کا پھاوڑہ
اور ترسا لے لیا ہے۔

سالار۔ شک والا معاملہ ہے۔ راہب کو بھی حراست میں لے لو۔
(بادشاہ حواریوں کے ساتھ آتا ہے)

بادشاہ۔ کیا مصیبت ہے یہ؟ جس نے صبح ہی صبح بیدار ہو کر بادشاہ
کے صباحی آرام میں خلل ڈالدیا۔
(کاپولیٹ بیگم کاپولیٹ اور دوسرے آتے ہیں)

کاپولیٹ۔ یہ سب لوگ کیوں چلا رہے ہیں۔ کیا آفت ہے یہ؟

بیگم۔ شہر کے کچھ لوگ رومیو! کچھ جیولیٹ! کچھ پیرس پکارتے ہوئے
ہمارے ہی خاندانی قبرستان کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔

بادشاہ۔ کیا خوفناک بات ہے جس نے ہماری سماعت کو چونکا دیا ہے۔

سالار۔ عالم پناہ! یہاں نواب پیرس قتل ہوئے پڑے ہیں۔ رومیو
مرا پڑا ہے اور جیولیٹ جو پہلے ہی مر چکی تھی ابھی ابھی دوبارہ
ماردی گئی ہے۔

بادشاہ۔ ڈھونڈو، تلاش کرو اور معلوم کرو کہ یہ غیر انسانی قتل عام
کس طرح ظہور پذیر ہوا؟

سالار۔ راہب اور مقتول رومیو کا نوکر دونوں یہاں موجود ہیں۔ ان
لوگوں کے پاس ایسے اوزار پائے گئے تھے جو ان مردوں کی قبریں
کھودنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

کاپولیٹ۔ معاذ اللہ! بیگم دیکھو تو ہماری لخت جگر کس طرح خون میں نہا

سنائی ہوئی ہے۔ اُف! اُف! اس خنجر نے کتنی گھناؤنی غلطی کی ہے دیکھو تو اس کا اصلی مقام مانٹیگ کی پشت پر خالی لٹک رہا ہے غلطی سے میری بچی کے سینہ میں ڈوب گیا ہے۔

بیگم۔ ہائے میرے نصیب! موت کا یہ منظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پکار پکار کر مجھے موت کا راستہ دکھا رہا ہے۔

(مانٹیگ اور دوسرے لوگ آتے ہیں)

بادشاہ۔ آؤ مانٹیگ! تم آج جلدی اٹھ کر اپنے اکلوتے بچے اور ولیعہد کی فوری موت کا تماشہ دیکھنے آئے ہو۔

مانٹیگ۔ آقائے نامدار! آج ہی رات کو میری بیوی کا انتقال ہوا ہے بچے کی جلاوطنی نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اور اب کون سے مصایب ہیں جنھیں میری پیرانہ سالی کے خلاف سازش کر رہا ہے۔

بادشاہ۔ خود ہی دیکھ لو، سمجھ جاؤ گے۔

مانٹیگ۔ ارے ارے میرے نابکار بچے! قبر میں جانے کے لئے باپ سے سبقت کرنا کہاں کی سعادتمندی ہے۔

بادشاہ۔ مایوسی کی ان چیخوں کا منہ اس وقت تک بند رہنے دو جب تک ہم اس الجھن کی گتھیاں نہ سلجھا لیں اور یہ معلوم نہ کر لیں کہ اس کا آغاز کیونکر ہوا اور اس کی اصل وجہ کیا تھی؟ اس کے بعد ہم خود تمہاری آہ وزاری کی قیادت فرمائینگے اور بہت ممکن ہے کہ تمہیں رُلا رُلا کر موت کی حدود تک پہنچا دیں۔ صبر سے کام لو اور تھوڑے سے وقفے کے لئے اس قیامت کو تحمل سے برداشت کرو۔ مشکوک آدمیوں کو ہمارے سامنے لایا جائے۔

فرایر۔ مجھی پر سب سے زیادہ شک کیا جا رہا ہے۔ گو مجھ میں ہاتھ ہلانے کی پوری سکت باقی نہیں ہے۔ تاہم حالات اس ہولناک قتل کی ساری ذمہ داریاں مجھ پر عاید کر رہے ہیں۔ میں اپنے جرم کا اعتراف کرنے کے بعد اپنی معصومیت ثابت کرنے کے لئے خدمت عالی میں حاضر ہوں۔

بادشاہ۔ جو کچھ جانتے ہو جلدی کہو۔

فرایر۔ میں جو کچھ بھی کہونگا مختصر کہونگا۔ کیونکہ میری گنتی کی یہ چند سانسیں اس طویل اور غم آفریں کہانی کے بیان کے لئے بہت تھوڑی ہیں، مرحوم رومیو، جولیٹ کا خاوند تھا اور مرحومہ رومیو کی وفادار بیوی میں نے ان کا نکاح پڑھوایا تھا۔ جس دن ان کی شادی ہوئی تھی اسی روز ٹیبولٹ قتل کر دیا گیا تھا اور اس بے موقع موت نے نئے بیاہے ہوئے دولھا پر اس شہر کے دروازے بند کر دیئے۔ اُسے

جلاوطن کر دیا گیا۔ جولیٹ ٹیبولٹ کے لئے نہیں بلکہ اسی کے لئے مچھلی کی طرح تڑپا کرتی تھی۔ (کاپولیٹ سے مخاطب ہو کر) آپ نے رنج وغم کی اس بے پناہ یورش سے بچانے کے لئے بچی کی منگنی کر دی اور اسے بالجبر نواب پیرس سے بیاہ دینے کا ارادہ کر لیا۔ وہ میرے پاس آئی اور مایوسی کے غیظ وغضب سے کانپ کانپ کر اس نے مجھ سے کہا کہ میں اسے اس دوسری شادی سے بچانے کا کوئی طریقہ نکالوں ورنہ وہ میری ہی کٹی میں اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی پر موت کی مُہر لگا دیگی۔ میں نے اُسے ایک ایسی نوم آور دوا دی جس نے میری مرضی کے مطابق عمل کیا اور اس پر موت کی سی حالت طاری کر دی اسی اثنا میں میں نے رومیو کو خط لکھا اور اُسے کہلا بھیجا کہ وہ آج کی اس خوفناک رات کو جب اس دوا کے اثر کو زائل ہونا تھا آ جائے اور اسے اس کی قبر سے نکال لے۔ لیکن فرایر جان جسے میں نے اس کام کے لئے متعین کیا تھا اتفاقاً نہ جا سکا اور کل رات مجھے میرا خط واپس دے گیا اس لئے معینہ وقت پر مجھے تن تنہا اسے اس کے خاندانی قبرستان سے نکالنے کے لئے آنا پڑا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے اپنی کٹی میں اس وقت تک چھپائے رکھوں جب تک کہ رومیو کے پاس پہنچا دینے کا مناسب موقع نہ آئے۔ لیکن میں اس کے بیدار ہونے سے چند لمحے پہلے یہاں آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ شریف النفس پیرس اور رومیو بے وقت کی موت مرے پڑے ہیں۔ وہ بیدار ہوئی میں نے اس کی منت سماجت کی۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ وہ باہر نکل آئے اور قدرت کے اس کام کو صبر وتحمل سے برداشت کرے۔ اسی اثنا میں بڑھتے شور نے مجھے پرے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا لیکن جولیٹ جس کی مایوسیاں انتہائی عروج پر پہنچ چکی تھیں قبر سے باہر نہ نکلی اور جیسا کہ ظاہر ہے اس نے اپنی جان پر یہ تشدد کر لیا۔ یہی ہے جو کچھ کہ میں جانتا ہوں اور اس شادی کے متعلق اس کی آیا بھی اس کی رازدار تھی۔ اگر یہ حادثہ فاجعہ میری غلطی سے رونما ہوا ہے تو میری اس سالخوردہ زندگی کو قانون کے سخت ترین شکنجے میں کس کر چند گھنٹے پہلے قربان کر دیا جائے۔

بادشاہ۔ ہم جانتے ہیں کہ تم ہمیشہ پاکیزگی کی زندگی بسر کرتے رہے ہو۔ رومیو کا نوکر کہاں ہے وہ جو کچھ اس حادثے کے متعلق جانتا ہو، بیان کرے۔

نوکر۔ میں نے ہی اپنے آقا کو جولیٹ کی موت کی خبر دی تھی۔ یہ خبر

نکلتے ہی وہ کرائے کے گھوڑوں پر سوار ہوکر اسی جگہ اور اسی قبر پر آئے تھے اس سے پہلے انھوں نے مجھے یہ خط دیا تھا کہ میں اسے ان کے والد کی خدمت میں پہنچا دوں اور قبر میں اترتے وقت انھوں نے کہا تھا کہ اگر میں یہاں سے چلا نہ گیا اور انھیں تنہا نہ چھوڑ گیا تو وہ مجھے قتل ہی کر دینگے۔

بادشاہ۔ خط ہمیں دو ہم بنفس نفیس اس کا ملاحظہ فرمائینگے نواب کا ملازم کہاں ہے جس نے یہ سب اطلاع دی تھی۔

نوکر۔ میرے آقا اپنی بیوی کی قبر پر پھول چڑھانے اور عرق چھڑکنے گئے تھے۔ انھوں نے مجھے یہ حکم دیا تھا کہ میں علیحدہ کھڑا رہوں میں نے ایسا ہی کیا اتنے میں کوئی مشعل لئے قبر کھولنے کو آپہنچا۔ کچھ دیر بعد میرے آقا نے تلوار کھینچ لی اور میں پہرے والوں کو خبر کرنے کیلئے بھاگ کھڑا ہوا

بادشاہ۔ خط سے فرایر کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے اور ان کی محبت اور جولیٹ کی موت کا مفصل حال لکھا ہے اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے ایک کنگال عطار سے زہر خریدا تھا اور اسی قبر میں مرکر جولیٹ کے ساتھ رہنے کے لئے چلا آیا تھا۔ کہاں ہیں یہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کاپولیٹ اور مانٹیگ! دیکھو تمھاری نفرت پر کیسی مصیبت نازل ہوئی ہے کہ تمھاری مسرتوں کا گلا محبت ہی کے ہاتھوں ضائع کروا دیا ہے اور ہم بھی تمھاری اس خانہ جنگی سے چشم پوشی کرنے کی پاداش میں دو عزیزوں سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا مل گئی ہے۔

کاپولیٹ۔ مانٹیگ بھائی! آؤ ہاتھ ملائیں۔ یہ میری پیاری بچی کا جہیز ہے اس سے زیادہ میں اور کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرنا چاہتا۔

مانٹیگ۔ لیکن میں تمھیں کچھ اور بھی دے سکتا ہوں میں اس کا سونے کا ایک مجسمہ بناؤنگا اور جب تک ویرونہ کو اس نام سے یاد کیا جاتا ہے اس وقت تک عفادار اور وفاکیش جولیٹ کی مورتی جیسی قیمتی مورتی نصب نہیں کی جائیگی۔

کاپولیٹ۔ رومیو کا بھی ایسا ہی قیمتی بت اس کی محبوبہ کے پہلو میں نصب کیا جائے گا۔ آہ ہماری نفرتوں کے قابل رحم شکار۔

بادشاہ۔ آج کی صبح اپنے جلو میں ایک غمناک سکون لئے ہوئے آئی ہے غم کا مارا سورج اپنا چہرہ دکھانے سے گریز کر رہا ہے۔ جاؤ اور اس حادثے پر مزید خیال آرائی کرنے کے لئے سب جاؤ۔ جولیٹ اور اس کے رومیو کی کہانی سے زیادہ گریہ آور کہانی کبھی نہیں سنی گئی۔ (ڈراپ سین)

اعترافِ سپاس

تیری چارہ گری نے فرصتِ آہ و فغاں بخشی

از جناب عبدالرشید تبسم بی۔ اے

میری مجبوریوں کو طاقتِ شرحِ بیاں بخشی
تیرے فیضِ کرم نے بے زبانوں کو زباں بخشی

یہ تو قید اور اک بے خانماں کی پھر سرِ گلشن
برائے آشیاں اک شاخِ گل اے باغباں بخشی

ان آڑے ترچھے ٹانکوں سے دم آیا چاک سینے میں
تیری چارہ گری نے فرصتِ آہ و فغاں بخشی

مجھے دیتے تھے تارے شب کو طعنے نامرادی کے
ہوئے شرمندہ جب تم نے حیاتِ کامراں بخشی

نہیں شکوہ بجائے خلد کے اعراف کیوں بخشا
غنیمت ہے مجھے دوزخ کے شعلوں سے اماں بخشی

مجھ افتادہ کو میرِ کارواں ہمراہ کیوں لیتا
یہ کیا کم ہے میری آنکھوں کو گردِ کارواں بخشی!

ہدف تک تیر پہنچے یا نہ پہنچے یہ میری قسمت
کرم تیرا کہ مجھ محروم کو تو نے اماں بخشی

عجب کیا ہے قفس کے در سے گلشن تک پہنچ جاؤں
نشیمن کے تصور نے مجھے تاب و تواں بخشی

یہ اعجازِ مسیحائی ہے تیرے اک تبسم کا
میری دم توڑنے والی تمناؤں کو جاں بخشی

ہنسا کرتے تھے اہلِ انجمن میری خموشی پر
ترا احساں ہے مجھ بے زباں کو بھی زباں بخشی

مہ و پرویں سے آگے تک گزر میرا ہوا ممکن
ترے حرفِ تسلی نے فلک کی نردباں بخشی

وہ شاید ایک تازہ باب ہو تاریخِ عالم کا
زمانے کو تمہارے عشق نے جو داستاں بخشی

تبسم شکر ہے مجھ ناتوان و زار کو حق نے
زلطفِ خاص پامردی بوقتِ امتحاں بخشی

آپ نے کبھی دیکھا!

جب عورت شروع میں جوان ہوتی ہے

اور

جب وہ بچہ کو دُودھ پلانے پر مجبور ہو جاتی ہے

تو

عورت کا سینہ

عورت کی شروع جوانی میں ہی اگر اُس کا سینہ یعنی پستان ڈھیلے اور نرم ہو کر نیچے کو گرے ہوئے معلوم ہوں تو یہ بہت بدصورتی کہلاتی ہے۔ ایسی عورت میں شباب کی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ یہ خرابی عورت کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ ہر سال بچوں کو دُودھ پلانے پر مجبور ہو جائے۔ یا کسی بیماری یا بداحتیاطی کے باعث بھی عورت کا سینہ (یعنی پستان) ڈھیلے ہو کر بدنما معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور وہ عین جوانی میں ہی شباب کی کشش ختم کر بیٹھتی ہے۔

ایسی عورت پھر نوجوان لڑکی نظر آسکتی ہے

سائنس کی جدید کرشمہ سازی کی بدولت ایک ایسی بیش بہا دوا تیار ہوئی ہے۔ جس کے استعمال سے عورت کے ڈھیلے اور نرم اور نیچے کو گرے ہوئے پستان دوبارہ گول اور سخت ہو کر عورت کو از سر نوجوان لڑکی کے روپ میں پیش کرنے لگتے ہیں اور اس پر شباب کی رنگینیاں پھر اپنی بہار پھیلا دیتی ہیں۔ یہ لگانے کی دوا ہے۔ اور اس کا نام "برسٹین" ہے یہ ہی دوا ہے جس کی بدولت ابتک سینکڑوں عورتیں اپنے سینہ میں دوبارہ شباب کا رنگ بھر چکی ہیں۔ اور اب وہ کافی عمر کے باوجود نوخیز لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ اس دوا کا سب سے زبردست ثبوت یہ ہے کہ اس کے ہر روز کا استعمال عورت کو ثابت کرتا رہتا ہے کہ کتنی جلدی اس کے سینہ میں دوبارہ اُبھار اور سختی پیدا ہو رہی ہے۔ جن عورتوں کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۲۴ بی تالے دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر ایک شیشی "برسٹین" بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں۔ ایک شیشی ایک عورت کو پوری طرح جوان لڑکی بنادیگی اور اس کے سینہ کی یہ سب خرابیاں دُور ہو کر مستقل اُبھار اور سختی پیدا کردیگی۔ ایک شیشی "برسٹین" کی قیمت چار روپے پندرہ آنے ہے۔ پارسل پر صرف سات آنے محصول لگیگا۔

نوٹ:۔ اگر کوئی بچہ عورت کی گود میں ہے۔ تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ دوا بچہ کے دُودھ پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ اور بچہ نہایت اطمینان کے ساتھ دُودھ پیتا رہیگا۔ کیونکہ دوا کسی حال میں نقصان نہیں کرتی۔

جنوری ۱۹۳۴ء کی بات

جب میں باپ نہیں تھا

ایک ناسمجھ ہندوستانی کی سبق آموز آپ بیتی

میری شادی کو گیارہ سال ہو چکے ہیں، لیکن بہت عرصہ تک ...... میں یہ احساس نہیں کر سکا کہ شادی شدہ لوگ کیونکر خوش رہ سکتے ہیں۔ شادی کیوں ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ میرے دوست جب اپنی بیوی کے قصے مجھے سنایا کرتے تھے۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے میرے دل کو مسل کر سینے سے باہر نکال دیا ہے۔ اور اس کی جگہ انگیٹھی میں آگ بھر کر رکھ دی ہے۔ بہت دن کے بعد میرے ایک خاص دوست کو میری خفیہ بیماری کا پتہ چل گیا۔ اس نے پوچھا۔

کیا تمہیں جریان کی بیماری ہے۔ میں نے کہا نہیں لیکن پھر اس نے کہا۔ کیا پیشاب سے پہلے اور اس کے بعد کوئی رطوبت خارج ہوتی ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے خاص بات پوچھی میں کہا میں یہ بات جانتا تو ضرور ہوں کہ ایسا ہوتا ہے لیکن آج تک ....

میرا یہ جواب سنکر وہ چونک اٹھا اور تعجب سے کہا کہ تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔ اگر کسی زمانے میں بتا دیتے۔ جب تمہاری شادی ہوئی تھی کہ تم جریان کے مریض ہو۔ تو میں تمہیں صرف پندرہ دن میں تندرست کر دیتا۔ چنانچہ میرے دوست نے اسی وقت "زنانہ دواخانہ" کو خط لکھ کر "جوہر اعظم" دوا کی ایک شیشی تین روپے آٹھ آنے کو منگائی اور مجھے استعمال کیلئے دی۔ میں نے ترکیب کے مطابق اس دوا کا استعمال شروع کر دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ دوا شروع کرنے کے ساتویں یا شاید آٹھویں دن پیشاب کے وقت وہ رطوبت خارج ہوتی بند ہو گئی۔ اور مجھے اپنے اندر ایک خاص بات محسوس ہوئی دوا ابھی پوری ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک روز .... بیوی

جنوری ۱۹۳۶ء کی بات

اپنے دوست کی بدولت اب میں اس جوانی کی ہری بھری دنیا میں ایک ایسے خوش وخرم نوجوان کی طرح ہوں، جیسے کہ مجھ جیسی عمر کے انسان کو ہونا چاہیئے میری بیوی ایک بچے کی ماں ہے۔ اور وہ جب اپنے بچے کو کھلاتی ہے۔ اور بچہ ہمک ہمک کر ماں کی طرف دوڑتا ہے اور ماں کے سر کے بال نوچتا ہے تو مجھے یہ بات یاد آتی ہے کہ اس بچے کے باپ کا نام "جوہر اعظم" ہے کیونکہ "جوہر اعظم" دوا سے ہی میری جریان کی بیماری دور ہوئی اور میری خفیہ طاقت پھر مجھے مل گئی۔ کاش جریان کے تمام مریضوں کو معلوم ہو جائے کہ اس دنیا میں جریان کی اگر کوئی بہترین دوا ہو سکتی ہے تو وہ "جوہر اعظم" ہے۔ ایک شیشی کی قیمت صرف تین روپے آٹھ آنے ہے۔ اس دوا پر عام فائدہ کے خیال سے محصول ڈاک معاف ہے۔

پس ناظرین میں سے جو لوگ میری طرح جریان کی بیماری میں مبتلا ہوں۔ اور پیشاب سے پہلے یا بعد میں قوت مردمی پانی کی طرح بہہ جاتی ہو یا رات کو سوتے میں ناپاکی ہو جاتی ہو یا بعض وقت ...... شرمندگی ہوتی ہو تو انہیں چاہیئے کہ

مینیجر زنانہ دواخانہ اے بی ۳۴ دہلی

کو خط لکھ کر جوہر اعظم دوا کی شیشی بذریعہ وی پی پارسل منگالیں۔ صرف ایک ہی شیشی تندرست بنا دیگی۔

"جوہر اعظم" وہی مشہور دوا ہے جسے ۱۹۲۸ء میں آل انڈیا کا مریڈ سوسائٹی نے کافی تجربہ کر کے عام اعلان کے ذریعہ پبلک کو مطلع کیا تھا کہ "جوہر اعظم" دوا جریان کے مریض کو یقیناً تندرست کرتی ہے اور ملک سے پرزور اپیل کی تھی کہ جریان کے مریضوں کو اس دوا سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کیونکہ آل انڈیا کامریڈ سوسائٹی نے جوہر اعظم کا بہت کافی تجربہ کیا۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء سے آج تک انجمن مذکور کی ہدایت کے مطابق اس دوا پر محصول ڈاک معاف ہے۔ اور کسی خریدار سے محصول پارسل نہیں لیا جاتا۔ صرف دوا کی قیمت لیجاتی ہے۔

فسانہ عجائب کی بعض اہم خصوصیات

ادبی مقالہ

از جناب خواجہ مسعود علی ذوقی (علیگ)

(۱)

فسانہ عجائب اپنے رنگ کی ایک بے نظیر تصنیف ہے جو ادبی حیثیت سے اگر ایک طرف اپنے عہد کی انشا کا منہ بولتا نمونہ پیش کرتی ہے تو دوسری جانب اس لحاظ سے بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ ہمیں اس کے صفحات میں لکھنؤ کے طرز معاشرت کی غیر فانی تصویریں نظر آتی ہیں۔

یہ اس زمانے کے لکھنؤ کی تصویریں ہیں جب وہاں ایک سے ایک بڑھ کر اہل کمال ادیبوں، شاعروں، عالموں، صناعوں اور فن کار لوگوں کا مجمع تھا اور دلی کے زوال کے بعد یہ شہر بجا طور پر علم و فضل، زبان و ادب اور مشرقی تمدن کا مرکز سمجھا جانے لگا تھا۔ پھر چونکہ دہلی اور لکھنؤ میں نہ صرف شعر و شاعری اور نثر نگاری کے معاملے میں رقابت پیدا ہو چکی تھی بلکہ اس جذبہ کا اثر معاشرت کے دوسرے شعبوں میں بھی نفوذ کر چکا تھا اس لئے لکھنؤ والے اپنی زندگی کے ہر پہلو میں ایک مخصوص انفرادیت کی شان قائم کرنا چاہتے تھے بولی تو دور رہی، لکھنؤ کے آس پاس کے شہروں میں بھی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ گفتگو کی لطافت، لباس کی نفاست، نشست و برخاست کی شائستگی، شعر و سخن کا مذاق، شیریں بیانی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی ——— یہ خوبیاں لکھنؤ کی معاشرت کا لازمی جزو قرار پا چکی تھیں اور چونکہ یہ خصوصیتیں لکھنؤ والوں نے ایک مدت کی محنت اور جانفشانی کے بعد حاصل کی تھیں اس لئے انہیں بیحد عزیز تھیں اور وہ ان پر ایک حد تک بجا طور پر ناز کرتے تھے۔

سرور کا وطن خواہ لکھنؤ ہو یا نہ ہو لیکن یہ مسلم ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات کے لحاظ سے خالص لکھنوی تھے۔ اور اس لئے ہمیں فسانہ عجائب کے مطالعہ سے یہ دو باتیں خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہیں۔

(۱) اول تو یہ کہ اس کتاب کو ایسی زبان میں تحریر کیا گیا ہے جو اس زمانے کے شمالی ہندوستان میں عموماً اور اودھ اور اس کے اطراف و جوانب میں خصوصاً بہت مقبول تھی اور اپنی غیر فطری صنعت کاری و مصنوعی تزئین و آرائش کے باوجود اس عہد کی انشا کا طغرائے امتیاز تصور کی جاتی تھی۔

(۲) فسانہ عجائب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ سرور نے اس کے دیباچہ میں جو ادبی اور تاریخی دونوں حیثیتوں سے قابل قدر ہے۔ اپنے زمانے کے لکھنؤ کی بہت دلکش اور ایک بڑی حد تک اصلی تصویر کھینچی ہے۔ یہ تصویر اسی قدر واضح اور روشن ہے کہ ہماری چشم تصور کے سامنے اس زمانے کے لکھنؤ کا پورا پورا نقشہ آجاتا ہے۔

اس مقالے میں فسانہ عجائب کی انہی دو حیثیتوں میں علیحدہ علیحدہ لیکن ذرا تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فسانہ عجائب کی طرز تحریر موجودہ مذاق ادب کے لئے اپنے اندر کوئی دلکشی نہیں رکھتی۔ لیکن ہمیں یہ بات نہ بھولنا چاہئے کہ جس عہد میں یہ کتاب تصنیف کی گئی تھی اس زمانے میں لوگوں پر فارسی نثر کے اسلوب بیان کا اثر اس درجہ غالب تھا کہ جس تحریر کو مقفّیٰ اور مسجع عبارت میں ادا نہیں کیا جاتا تھا، اسے پڑھنے والوں کی نگاہوں میں کوئی ادبی حیثیت حاصل نہیں ہوتی تھی۔ سیدھی سادی اردو میں مطالب ادا کرنے کو کم علمی کی دلیل قرار دیا جاتا تھا اور ایسی کوئی تصنیف وقیع نہیں سمجھی جاتی تھی جس کی عبارت کو پُر تکلف مرصع کاری سے زینت نہ دی گئی ہو۔

لکھنؤ کی معاشرت اس عہد میں جس منزل سے گزر رہی تھی اسے دیکھتے ہوئے ادبی مذاق کا اس رنگ میں رنگ جانا کوئی تعجب کی بات بھی نہیں تھی۔ یہ وقت ایسا تھا کہ لکھنؤ والے یکسر خارجی قسم کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کی زندگی کے کسی پہلو میں داخلیت کا رنگ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ خارجیت کے اس غلبہ نے لوگوں کے جمالیاتی ذوق کو محض اشیاء کے ظاہری حسن تک محدود کر دیا تھا۔ نظریں صرف سطح پر تیرتی تھیں، تہ تک نہیں ڈوبتی تھیں۔ یا یوں کہئے کہ نگاہوں کو چیزوں کی ظاہری دلکشی سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ ان کی معنوی خوبصورتی کا جائزہ لے سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعر و ادب کو نمائشی سج دھج سے

آراستہ کرنے، اور زبان کی نوک پلک درست کرنے میں ادیبوں کو اس قدر غلو پیدا ہو گیا کہ اس کی فطری اور حقیقی خوبیوں کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لی گئیں۔ قافیہ آرائی، رعایت لفظی، ضلع جگت، بولی ٹھولی، تلازمہ اور صنائع بدائع اس عہد کی تحریروں کے امتیازاتِ خصوصی بن گئے۔ یہاں تک کہ جو عبارت جتنے زیادہ تکلف سے مرصع دھوں کی جاتی تھی اتنی ہی زیادہ مرغوب و مقبول ہوتی تھی۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ سرور اپنے عہد کے مذاق ادب سے کیوں سرتابی کر سکتے تھے۔ انہوں نے بھی اسی رنگ کو اپنی انشا کے لئے منتخب کیا جو اس زمانے کے عوام و خواص کی تقریر و تحریر کا رنگ تھا۔ آج ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ اس قسم کی ثقیل، دقیق اور غیر فطری زبان اس زمانے میں کیسے سمجھی اور پسند کی جاتی ہوگی۔ لیکن اس زمانے کے مذاق کے لحاظ سے ایسی اردو عین فصاحت و سلاست کی دلیل سمجھی جاتی تھی جس کا ثبوت فسانۂ عجائب کی تمہید پڑھنے سے بھی ملتا ہے جس میں سرور نے بیان کیا ہے کہ ایک بار وہ اپنے کئی بے تکلف احباب کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ صحبت کا ہر شخص اپنے اپنے افکار دنیوی کی وجہ سے دل گرفتہ تھا اور بزم احباب پر کچھ اداسی سی چھائی ہوئی تھی کہ اتنے میں ان کے ایک نہایت محبوب دوست نے فرمائش کی کہ

"اس وقت کوئی قصہ یا کہانی، بہ شیریں بیانی، ایسا بیان کرو کہ رفع کدورت و جمعیت پریشانی طبیعت ہو۔"

سرور نے تعمیل فرمائش میں زبانی فسانۂ عجائب کا قصہ بیان کیا تو دوست کو اس قدر پسند آیا کہ کتاب کی صورت میں لکھنے پر اصرار کیا۔

"یہ فسانہ انہیں بہت پسند آیا۔ کہا کہ اگر تو بدلجمعی تمام، اس قصۂ پراگندہ کو از آغاز تا انجام زبان اردو میں فراہم و تحریر کر لے تو نہایت منظور نظر، نور بصر ہو۔"

اس فرمائش کے ساتھ قصے کی زبان کے متعلق بھی یہ درخواست کی

"بشرطیکہ جو روزمرہ اور گفتگو ہماری تمہاری ہے یہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینی عبارت کے واسطے وقت طلبی اور نکتہ چینی کریں۔ ہم فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں۔"

اس عبارت کو پڑھنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہم لوگ جن کے مذاق کی نشو و نما عہد جدید میں ہوئی ہے، فسانۂ عجائب کی طرز انشا کو چاہے جتنا ناپسند کریں، لیکن وہ اس زمانے کی زبان کے اعتبار سے خصوصاً لکھنؤ والوں کی نگاہ میں عین "روزمرہ اور ہماری تمہاری گفتگو" کے رنگ میں لکھی گئی ہے۔

جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں تصنع کا رنگ لکھنؤ کی زبان میں اس حد تک رچ گیا تھا کہ لوگ روزمرہ کی صحبتوں میں اٹھتے بیٹھتے، بات بات میں اس قسم کے پر تکلف فقرے استعمال کرنے میں مشاق ہو گئے تھے۔ یہ طرز گفتگو کسی کی سماعت پر بار ہوتا تو ایک طرف، حسن کلام کی دلیل سمجھا جاتا تھا اور اس پر خوب واہ واہ ہوتی تھی۔ گویا دوسرے الفاظ میں تقریر و تحریر کا جو رنگ، دوسرے شہروں میں آورد اور تصنع کے نام سے پکارا جاتا تھا، یہاں روزمرہ میں داخل ہو گیا تھا۔ پڑھے لکھوں کا تو ذکر کیا، عوام تک اپنی گفتگو میں اس نام نہاد حسن کو ملحوظ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کے گلی کوچوں میں معمولی معمولی سودا بیچنے والے سودا بیچتے وقت ایسے ایسے مقفیٰ اور سجیلے فقروں میں ہانک لگاتے تھے کہ طبیعت پھڑک اٹھتی تھی، اس کا بیان خود سرور کی زبان میں سنئے:—

گرمیوں کے زمانے میں ہری ہری باریک ککڑیاں جو کھانے میں نہایت لطیف و مفرح ہوتی ہیں یہ کہہ کر بیچی جاتی تھیں۔

"لیلیٰ کی انگلیاں ہیں۔ مجنوں کی پسلیاں ہیں — کیا بانکی ککڑیاں ہیں۔"

تنبولی پکار پکار کر ان الفاظ میں اپنی گلوریوں کی تعریف کرتے تھے۔

"عبیر ہے منہ گلال ہے۔ کتھے چونے سے آدمی میں نکھرا لال ہے۔"

بھلا بھنے ہوئے چنوں کی کیا حقیقت ہے۔ لیکن چنے بیچنے والے کا یہ مزے دار اور چٹپٹا فقرہ سنئے۔

"کیا خوب بھنے بھر بھرے ہیں۔ چنے پر مل اور مرمرے ہیں۔"

خیر اب سودا بیچتے وقت یہ قافیہ بندی تو نہیں سننے میں آتی لیکن آج بھی لکھنؤ کے سودا بیچنے والے اور خوانچہ فروش جتنے میٹھے الفاظ اور شیریں لب و لہجے میں سودا بیچتے ہیں اس کی نظیر کسی دوسرے شہر میں نہیں ملتی۔

جس زمانہ میں فسانۂ عجائب کی تصنیف ہوئی اس وقت لکھنؤ کے باشندوں میں شاعرانہ مذاق اس قدر عام ہو گیا تھا کہ شاعروں میں پڑھے لکھے لوگوں کے دوش بدوش، جاہل ان پڑھ عوام بھی شریک بزم ہوتے تھے، شعرا کا کلام سمجھ کر اس کا لطف اٹھاتے تھے اور مناسب الفاظ میں داد دیتے تھے۔ اس زمانے میں کتنے ہی بے پڑھے شعر کہنے لگے جو باقاعدہ مصرع طرح لکھ کر شاعروں میں پڑھتے تھے۔

گلی گلی، ورکوچے کوچے میں شعر خوانی کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں جن میں چھوٹے طبقے کے کاروباری لوگ شریک ہو کر بقدر مراتب اپنی اپنی شاعری یا قافیہ پیمائی یا تُک بندی کی داد لیتے تھے۔

اس عہد کے بچے کچھے اثرات اب بھی کبھی کبھی ہمارے مشاہدے میں آجاتے ہیں۔ خود ہمارے زمانہ میں نتھو صاحب شفیق کی مثال لیجئے یہ صاحب جاہل مطلق ہیں۔ الف کے نام بے بھی نہیں جانتے لیکن بکثرت اشعار کہتے ہیں اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔ دوسری مثال نانک لکھنوی کی ہے جنہوں نے اردو کا ایک لفظ نہیں پڑھا ہے۔ حروف تک نہیں پہچانتے۔ لیکن نہایت عمدہ شعر کہتے ہیں۔ قصیدہ، سلام، مرثیہ، کسی صنف شاعری میں بند نہیں ہیں۔ مجھے خود بھی کئی شاعروں میں ان کا کلام سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ اردو کے رسم الخط سے آشنا نہ ہونے کی وجہ سے بیچارے گورمکھی حروف میں غزل لکھ کر لاتے ہیں۔ لیکن کمال یہ ہے کہ اس کے باوجود اپنے اشعار میں کثرت سے فارسی کی خوشنما ترکیبیں اور عربی کے مناسب الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں غالباً انٹرنس میں تعلیم پاتا تھا تو ہمارے محلے میں، اگلے وقتوں کی یادگار، ایک بیچارے کمزور بڈھے میاں کھیر کے پیالے بیچتے ہوئے آیا کرتے تھے جو اپنے گاہکوں کو اپنے تصنیف کئے ہوئے اشعار سنا سنا کر محظوظ کیا کرتے تھے۔ اشعار تو خیر پھسپھسے ہی سے ہوتے تھے لیکن انہیں ایک شکستہ حال ان پڑھ خوانچہ فروش کے منہ سے سن کر عجیب حیرت آمیز لطف حاصل ہوتا تھا۔

ایک اور واقعہ سنئے۔ غالباً ۱۹۲۶ء میں جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے، انجمن بہار ادب (یا معیار ادب؟) کی طرف سے رفاہ عام کی عمارت میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ شب کو ایک نشست ہو چکی تھی۔ دوسرے دن دس بجے صبح سے دوسری مجلس تھی گیارہ بجے دن کے قریب مشاعرے میں شرکت کی غرض سے میں رفاہ عام کے پھاٹک پر پہنچا تو دیکھا کہ راستہ چلنے والوں کا ایک مجمع کسی شخص کو گھیرے کھڑا ہے۔ قریب پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایک شخص روئی کی بٹی ہوئی مرزئی لئے، میلی کچیلی لنگی باندھے، سر پہ گرد آلود صافہ لپٹے اور ہاتھ میں کنی بسولی لئے، نہایت خوش الحانی کے ساتھ شین قاف سے درست لہجے میں، لہک لہک کر شاعروں کی طرح پر اشعار سنا رہا ہے۔

بات یہ تھی کہ ان دنوں رفاہ عام کی چار دیواری کی مرمت ہو رہی تھی۔ اور یہ بیچارے جو ایک غریب اور شکستہ حال کاریگر تھے وہاں معماری کے کام پر لگے ہوئے تھے۔ شعر شاعری سے پرانی دلچسپی تھی۔ جی بہلانے کے لئے کبھی کبھار کچھ شعر کہہ کر زبانی یاد کر لیا کرتے تھے۔ شام کو جب اپنا کام ختم کر کے گھر گئے اور رات کو کھانا کھا کر فراغت پائی تو یاد آیا کہ اس وقت رفاہ عام میں مشاعرہ ہو رہا ہے۔ دل نہ مانا۔ اوڑھ لپیٹ کے پہنچ گئے۔ لیکن اس ہیئت کذائی سے ان کو اندر کون داخل ہونے دیتا۔ غریب کئی گھنٹے دبکے دبکائے ایک دروازے میں کھڑے مشاعرہ کی غزلیں سنتے رہے۔ گھر واپس لوٹے تو طبیعت موزوں تھی۔ کھٹیا پر لیٹے لیٹے پوری غزل کہہ ڈالی۔ صبح کام کرنے آئے تو دیوار کی مرمت کرتے کرتے اپنے ہم پیشہ مزدوروں اور معماروں کو اشعار سنانے لگے۔ دو چار راہ گیر بھی ٹھٹھک کر سننے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ لکھنؤ سا شہر، جہاں ایک سے ایک بے فکرا پڑا ہوا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تماشائیوں کا اچھا خاصہ ہجوم ہو گیا۔

ان واقعات کے بیان سے میرا مقصد صرف یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ آج بھی جب مشرقی تمدن کی تمام خصوصیتیں تقریباً خواب پریشان ہو چکی ہیں، بعض لکھنؤ والوں کی موزونی طبع کا یہ حال ہے تو تصور کیجئے مرزا رجب علی بیگ کے زمانے میں کیا عالم ہوگا اور پھر اگر انہوں نے فسانہ عجائب کو سیدھی سادی زبان میں لکھنے کے بجائے اسے رنگین اور مقفیٰ عبارت میں تحریر کیا تو کون سی تعجب کی بات ہے۔

فسانہ عجائب کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس میں برملا معنی اور برمحل فقرے کے ساتھ ساتھ محض قافئے کا حسن پیدا کرنے کیلئے ایک (یا ایک سے زیادہ) بے جوڑ بے محل اور پرتکلف فقرے کا پیوند ٹانک دیا گیا ہے جس کی وجہ سے عبارت میں الجھاؤ اور پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ جا بجا فارسی کی وزنی ترکیبوں اور اضافتوں کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے خصوصاً ہر باب کی ابتدا میں جہاں سے قصّے کا کوئی نیا رخ شروع ہوتا ہے اس قدر لفاظی سے کام لیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو کوفت ہونے لگتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس زمانہ میں فسانہ عجائب کی تصنیف ہوئی تھی اس وقت تک فقروں کے درمیان چھوٹے اور بڑے وقفوں کے لئے علامات مقرر نہ کی گئی تھیں، نہ

مکالمے کو واوین میں لکھنے کا طریقہ رائج تھا۔ اس کی کمی نے فسانۂ عجائب کی عبارت کو اور زیادہ اُلجھا دیا ہے۔ وقفوں کی علامات غائب ہونے کے سبب سے جگہ جگہ عبارت بے ربط سی معلوم ہونے لگتی ہے اور کئی موقعوں پر فقروں کی ابتدا اور انتہا اچھی طرح سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے ذہن اُلجھنے لگتا ہے۔ لیکن اس میں سرور کی کوئی خطا نہیں ہے۔ انہوں نے سوائی مقامات کے جہاں کسی نئے باب کا آغاز کیا ہے کہیں بھی لمبے لمبے اور طویل طویل جملے نہیں استعمال کئے۔ اس کے برخلاف زیادہ تر عبارت ایسی ہے جس میں چھوٹے چھوٹے سبک الفاظ کی تعداد کے لحاظ سے متناسب فقرے استعمال کئے گئے ہیں۔ غور کرنے سے ہم صاف صاف اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر فسانۂ عجائب میں وقفوں کی علامات سے کام لیا گیا ہوتا اور اس کی عبارت کو جدید طرز پر پیراگراف کی شکل میں تقسیم کیا گیا ہوتا تو اُسے سمجھنے میں کوئی دُشواری حائل نہ ہوتی اور اس سے لُطف اُٹھانے کے امکانات پچاس فیصدی زیادہ ہو جاتے۔

فسانۂ عجائب میں بعض بعض مقامات پر تو عبارت اس قدر رواں دواں، شگفتہ و چُست ہے کہ سطروں پر سطریں پڑھتے چلے جائیے نہ کہیں ذہن کو اُلجھن محسوس ہوتی ہے، نہ طبیعت مکدر ہوتی ہے نہ کسی فقرے کی پیچیدگی بارِ خاطر ثابت ہوتی ہے۔ اس قسم کی عبارتوں میں (ہر چند کہ ان کی مثالیں صرف کہیں کہیں ملتی ہیں) اول تو قوافی کا التزام بہت کم ہے اور جہاں جہاں قافیہ آرائی بھی کی گئی ہے وہاں حسنِ تحریر کی وجہ سے اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

"بڑے بھائی نے کہا آج ہم تمہاری عقل کا امتحان کرتے ہیں۔ بتاؤ تو اس وقت ہمارے شہر کا ہم سے کتنا فاصلہ ہے اور سمت کون سی ہے۔ دُوسرے کباب کی لذت پانے کا مزہ آج بہت ملا۔ اس کا سبب کیا تھا؟ اُس نے جواب دیا۔ یہ باتیں بہت سہل ہیں شہر ہمارا یہاں سے نَو کوس ہے۔ اور دلیل یہ کہ بارہا تجربہ کیا ہے میرا گھوڑا تمام دن میں نو کوس اسی چال سے پہنچتا ہے اور سمت ستاروں سے ثابت ہے کہ شمال ہے۔"

مندرجہ بالا طرز کی سیدھی سادی عبارتیں پوری کتاب میں کہیں خال خال نظر آتی ہیں۔ لیکن ایسے مقامات بکثرت ملتے ہیں جہاں قافیہ بندی نے عبارت کو بھدا اور پیچیدہ کرنے کے بجائے اس میں ایک طرح کا دلکش ترنم پیدا کر دیا ہے جس سے حسنِ تحریر کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

جب شہزادہ جان عالم انجمن آرا کو اندھیرے مُنہ رُخصت کرا کے جلوس کی صورت میں روانہ ہوتا ہے اُس وقت کے منظر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

"نسیم سحر کا چلنا۔ شمع کا جھلملا جھلملا کے جلنا۔ شہنا میں بھیروں، بھیاس، للت، رام کلی کا پھونکنا۔ نقیب، اور چوبداروں کا کوئل کی طرح کوکنا۔ نوبت کی ٹکور۔ جھانجھ کا جھانجھ سے شور۔ جھٹپٹا وقت۔ نور کا تڑکا۔ کڑکیتوں کا تسویل کرکا۔ کچھ کچھ تاروں کی چمک۔ نقارے کی صدا۔ دھولسے کی ٹمک۔ چاند کے مُنہ پہ سفیدی۔ دُلہن والوں کی یاس و ناامیدی۔ عطر کی ہر سو لپک۔ پھولوں کی مہک۔ سب کو نیند کا خمار، کوئی پیادہ، کوئی سوار۔ فرش باسی ہار کے پھولوں سے رشکِ صحنِ چمن، کہیں جھول کہیں شکن۔ مجلس کے فراق میں شمع کی زاری۔ دولہا کے لوگوں کی خوش و بشاش تیاری۔ دُلہن کے گھر میں نالہ و زاری۔"

ایک مقام سے ذیل کی عبارت مُلاحظہ کیجیے جس میں فقروں کے دلکش تناسب اور الفاظ کی شیریں موسیقی کے علاوہ مُصنّف نے سردی کی شدت کو بیان کرنے میں جس دلچسپ شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا ہے وہ بھی صنعت کا ایک نادر نمونہ ہے:-

"چلے کے کڑاکے، غضب کی سردی تھی۔ گویا زمین سے آسمان تک یخ بھر دی تھی۔ چرند پرند اپنے اپنے آشیانوں اور کاشانوں میں چھپے ہوئے بیٹھے بھوک و پیاس کے صدمے اُٹھاتے تھے۔ دُھوپ کھانے باہر نہ آتے تھے۔ قصد سے تھرتھراتے تھے۔ سردی سے سب کا جی جلتا تھا۔ دم تقریر ہر شخص کے مُنہ سے دُھواں دھار دُھواں نکلتا تھا۔ آواز کسی کی کان تک کسی کے کم جاتی تھی۔ مُنہ سے بات باہر آئی اور جم جاتی تھی۔ مار سیاہ اوس چاٹنے باہر نہ آیا تھا۔ سردی کے باعث دُم دبا کر بانبی میں بھاگ جاتا تھا۔ زمانے کے کاروبار میں خلل تھا۔ ہر ایک دست در بغل تھا۔"

کتاب میں کثرت سے ایسے ٹکڑے بھی نظر آتے ہیں جو اپنی دلکش فارسیت، تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت اور اعلیٰ درجے کی رنگینی

[illegible] بیانی کی وجہ سے غالب اور ظہوری کی فارسی نثر کا لطف ہم پہنچا یا سرور کو اُردو اور فارسی زبانوں پر تو کامل قدرت حاصل تھی ہی لیکن فسانۂ عجائب کے مُطالعہ سے ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ اُن کی عربی قابلیت بھی اچھی خاصی رہی ہوگی اس لئے کہ جس روانی کے ساتھ وہ جگہ جگہ قرآن اور حدیث کے اقوال اپنی عبارت میں نقل کرتے چلے جاتے ہیں وہ کسی غیر عربی دان کے بس کی بات نہیں۔ اسی طرح جہاں بعض مقامات پر نجوم اور زائچہ وغیرہ کا ذکر آگیا ہے وہاں اس علم کی اصطلاحوں کو ایسی بے تکلفی سے استعمال کیا ہے کہ ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ علم نجوم سے بھی خاطر خواہ واقف رہے ہوں گے۔

ہندی زبان میں بھی سرور کی قابلیت اس پایہ کی تھی کہ اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یوں تو انھوں نے جگہ جگہ ہندی کے سینکڑوں چھوٹے بڑے الفاظ نہایت برمحل اور مناسب موقعوں پر استعمال کئے ہیں لیکن کتاب میں بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں پوری عبارت کی عبارت ٹھیٹھ ہندی کے الفاظ میں لکھتے چلے گئے ہیں۔

مثلاً شاہ فیروز بخت نے مُلک کے نامی گرامی پنڈتوں اور برہمنوں کو بلا کر ان سے شاہزادہ جانعالم کا زائچہ تیار کرایا ہے۔ پنڈت ذیل کے الفاظ میں بادشاہ کو شاہزادے کے مستقبل سے آگاہ کرتے ہیں:—

"ہماری پوتھی کہتی ہے، بھگوان کی دیا سے شاہزادے کا چندرماں بلی ہے۔ دھرم مورت یہ بالک ہے۔ جلد راج پر براجے۔ پرتھوی پتی دھوم مچے ایسی شادی رچے۔ مگر پندرھویں برس مشتری بارھویں میں آئے گا۔ سنیچر پاؤں پڑیگا۔ ایک پنکھیرو سوئے کے برن میں ہاتھ آئیگا۔ تریا کے گھٹ پٹ سے وہ بچن سنائے گا کہ راج پاٹ چھڑا دیس بدیس لیجائیگا۔ ڈگر میں شاہزادہ بیٹھے کوئی پاس نہ بیٹھے۔ ساتھی چھٹیں اپنے ڈیل سے ڈانواڈول ہو۔ پھر ایک منش، ٹھاکر کا سیوک کرپا کرے پار لگائے۔ کوئی کلنکن تو بھی ہو کشٹ دکھائے۔ وہاں سے جب چھٹے رانی ملے جہاں سنار سوہ چرن پر بلہاری وارے۔ پتا اس کا گیانی، گن کی کھتی رہے۔ [illegible] سے کئی ٹھ مارے۔ دکھ میں آڑے آئے۔ بگڑے

کاج بنائے۔ جب اس نگر پہنچے جس کے چِت میں گھر چھوڑے تو لاب بہت ہو اور ب لینے ہاتھ آئیں دُور سب کلیسی ہو جائیں۔"

یہ عبارت یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اسی سلسلے میں نجومی اور بھی بہت سی باتیں بتاتا ہے جو بیشتر ہندی زبان میں بیان کی گئی ہیں۔ ہر چند کہ یہ عبارت با محاورہ ہندی کا کوئی بہت اعلیٰ نمونہ نہیں ہے۔ ہندی زبان کا انشاپرداز اسی مطلب کو یقیناً اس سے بہت زیادہ بہتر زبان میں ادا کرتا۔ لیکن پھر بھی اس عبارت کی روانی اور سلاست سرور کی ہمہ گیر ادبیت پر دلالت کرتی ہے اور ہم اُن کے ذخیرۂ الفاظ کی وسعتوں پر حیران رہ جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سرور فطرتاً ایک اعلیٰ درجے کے صناع تھے۔ اُن کو اپنے وقت کی زبان اور انداز بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اُن کے پاس الفاظ کا خزانہ لا محدود تھا۔ انہیں اُردو کے محاوروں، کہاوتوں، ضرب الامثال اور روزمرہ پر حیرت انگیز قابو حاصل تھا۔ ان کی رنگین طبع شعریت کو نئے نئے استعارے اور نادر نادر تشبیہیں وضع کرنے میں کمال حاصل تھا اور یہ سرور کی شیوا بیانی کا ایک کھلا ہوا اعجاز ہے کہ فسانۂ عجائب ثقیل الفاظ کی بہتات، نامانوس فارسی ترکیبوں کی کثرت اور مقفیٰ اور مسجع فقروں کی گرانباریوں کے باوجود آج بھی اپنے عہد کی انشاپردازی کا بہترین نمونہ قرار دی جاتی ہے۔

(۲)

فسانۂ عجائب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ اس کا دیباچہ ہے جس کے آئینے میں ہمیں اس وقت کے لکھنؤ کی معاشرت، وہاں کی تفریحوں اور صحبتوں اور اہل لکھنؤ کی دلچسپیوں کا عکس صاف صاف نظر آتا ہے۔ کتاب کے اس حصے میں سرور نے نہایت تفصیل کے ساتھ اپنے عہد کے اہل کمال لوگوں کا نام بنام ذکر کیا ہے۔ مشہور مشہور بازاروں، تفریح گاہوں، عمارتوں اور رمنوں کا بیان قلمبند کیا ہے۔ خاص خاص دوکانداروں اور اُن کی مشہور دوکانوں کی عیوب و مرغوب اشیا کا نہایت ذوق شوق سے تذکرہ کیا ہے اور آخر میں اپنے ہمعصر ادیبوں، خوشنویسوں، موسیقی دانوں اور دوسرے ماہرین فن کا نام لے کر نہایت محبت سے انہیں یاد کیا ہے۔

اس دیباچے کے ایک ایک لفظ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ مصنف کو اپنے شہر سے نہایت گہری محبت تھی۔ وہ یہاں کے گلی کوچوں تک سے بے انتہا انس رکھتے تھے اور یہاں کے معمولی سے معمولی

چیز پر بھی جان دیتے تھے۔ جب انہیں ایک طویل مدت کے لئے لکھنؤ چھوڑ کر مجبوراً کانپور میں قیام کرنا پڑا تو انہیں اپنے محبوب شہر کی جدائی میں زندگی وبال جان ہو گئی۔ کانپور کے زمانہ قیام میں انہیں لکھنؤ کی دلچسپیاں اور تفریحیں، ہم جلیسوں کی بذلہ سنجیاں اور شیریں گفتاریاں اور باکمال دوستوں کی رنگین صحبتیں یاد آتی تھیں تو کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا تھا۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرور نے لکھنؤ کے متعلق اپنے بیان میں یقیناً مبالغہ سے کام لیا ہے۔ لیکن انہوں نے اس شہر کی تعریف میں جس دلچسپ تفصیل سے کام لیا ہے اس میں کہیں غلط بیانی کو دخل نہیں دیا ہے۔ ان واقعات کی اصلیت اور صداقت سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس عہد کے مذاق کی رعایت سے سرور نے اپنے بیان میں لفاظی اور مبالغہ آرائی سے کام لے کر لکھنؤ کی زندگی کے ہر پہلو کو اصل سے کئی گنا زیادہ دلکش رنگ میں پیش کیا ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں خطوط کے لحاظ سے تو تصویر بالکل اصل سے ملتی جلتی کھینچی گئی ہے، لیکن مصور نے ہلکے رنگوں سے کام لینے کے بجائے نقش کو زیادہ حسین اور جاذب نظر بنانے کے لئے گہرے اور شوخ رنگوں کا استعمال کیا ہے۔

مثال کے طور پر فسانہ عجائب کی وہ سطریں ملاحظہ کیجئے جن میں انہوں نے لکھنؤ کی برسات کا نقشہ کھینچا ہے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

"برسات کا اگر موسم ہے، شہر کا یہ عالم ہے۔ ادھر مینہ برسا پانی جا بجا بہہ گیا۔ گلی کوچہ صاف رہ گیا۔ ساون بھادوں میں زردوزی جوتا پہن کر پھرے۔ کیچڑ تو کیا مٹی نہ بھرے۔"

بظاہر سرور کا یہ بیان سراسر لغو اور غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہم سوچنے لگتے ہیں کہ آج بھی جب کہ زمانہ اس قدر ترقی کر چکا ہے اور میونسپلٹیوں کے حسن انتظام کی بدولت شہروں کے گلی کوچے پکے ہو گئے ہیں، بہت سے شہروں کا یہ حال ہے کہ برسات کے زمانے میں پیدل چلنے والوں کو راستے کی کیچڑ کی بدولت بڑی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آج سے کم و بیش دو سو سال پہلے کے لکھنؤ میں گلی کوچوں کا یہ عالم ہو کہ "زردوزی کا جوتا پہن کر پھرے۔ کیچڑ تو کیا مٹی نہ بھرے۔"

لیکن اگر سچ پوچھئے تو سرور نے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی ہے، انہیں لکھنؤ کے جن گلی کوچوں سے سابقہ پڑتا تھا ان کا حال بجنسہٖ بیان کر دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ سرور نے فسانہ عجائب جس زمانے میں لکھی تھی

جہاں انہیں ہر وقت اپنے شہر کی یاد ستایا کرتی تھی۔ اس لئے قدرتاً جب لکھنؤ کی تصویر کھینچنے بیٹھے تو ان کی چشم تصور کے سامنے وہاں کے دلکش پہلو اور جاذب نظر مناظر آ آ کر گھومتے رہے، اور وہاں کی زندگی کے بدنما پہلو حافظے سے غائب ہو گئے۔ لکھنؤ کے جن مناظر سے سرور کو برسوں سابقہ رہ چکا تھا انہیں کے نقوش کو ابھار ابھار کر انہوں نے الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ سرور نے فسانہ عجائب میں جس زمانے کا نقشہ کھینچا ہے اس زمانے میں عام طور پر شرفا اور امراء کے مکانات ایسے محلوں میں واقع ہوتے تھے جن کی گلیاں خام نہ ہوتی تھیں بلکہ ان کے فرش لکھوری اینٹوں یا پتھروں کے ہوتے تھے جن پر پانی جمع نہیں ہو سکتا تھا۔ بارش بند ہوتے ہی پانی ادھر ادھر بہہ جاتا تھا۔ اس قسم کی شاہی زمانے کی بعض پرانی گلیاں آج تک موجود ہیں جو سرور کے مندرجہ بالا بیان کی پوری پوری تصدیق کرتی ہیں۔

لکھنؤ چھوڑ کر جب سرور کو کانپور کا قیام اختیار کرنا پڑا تو معلوم ہوتا ہے ان کا مکان کسی ایسی سڑک یا گلی میں واقع تھا جہاں کیچڑ کی وجہ سے راہگیروں کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ سرور یوں بھی کانپور سے بہت نالاں تھے۔ وہاں کی برسات کا نقشہ دیکھ کر تو اس شہر کے نام سے بیزار ہو گئے۔

لکھنؤ کی برسات کی تفریحیں اور دلچسپیاں بیان کرتے کرتے لکھتے ہیں "دشت غربت میں یہ جلسہ جو یاد آ جاتا ہے دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔"

پھر اس کے بعد کانپور کی برسات کی جن الفاظ میں مذمت کی ہے وہ بھی دلچسپ مبالغے سے خالی نہیں :-

"نہ کانپور کی برسات۔ ہیہات ہیہات۔ دخل کیا در از لیے باہر قدم دھرے اور پھسل نہ پڑے۔ گلی میں پاؤں رکھا، کیچڑ کا چھپکا سر پر پہنچا۔ اس فصل میں باہم نہ دیکھے مگر چلنے کے پھنسے۔ اور جنہیں سواری کا مقدور نہیں، دخل کیا جو وہ جائیں کہیں۔ ان کے حق میں برسات حوالات، گھر جیل خانہ۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ اگر خواب میں کہیں نکل گئے تو چونک پڑے کہ پھسل گئے۔"

اس کے بعد کی عبارت میں طنز کی جو شیرینی حلاوت اور ظرافت کا جو مزے دار چٹخارہ ہے اسے بھی ملاحظہ کیجئے :-

"اور جو بازاری کاروباری ہیں، ان کا یہ نقشہ دیکھا۔

ہاتھ میں جوتیاں۔ پائنچا چڑھا۔ کیچڑ میں لت پت
یہاں گرے۔ وہاں گرے۔ خدا خدا کر کے جیتے گھر پہنچے
اس شہر کے سارے ننگے پاؤں نہ نکلے تو سہ

دیکھی ہے یہ رسم اس نگر میں
جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں"

سرور نے فسانۂ عجائب کے دیباچے میں انشا پردازی کا یہ کمال دکھایا ہے کہ تھوڑے سے صفحوں میں لکھنؤ کے متعلق اس قدر جزوی تفصیلات جمع کر دی ہیں کہ اگر انہیں پھیلا کر تحریر کیا جائے تو ایک پورا طول طویل باب تیار کیا جا سکتا ہے۔ اس تفصیل کا دلچسپ ترین حصہ وہ ہے جس میں وہ چوک کی مشہور مشہور دوکانوں کی ہمیں سیر کراتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہر دوکاندار کے سودے کی خصوصیت جتا کر اس کی تعریف کرتے جاتے ہیں۔ اس طرح گویا ہم ان کی انگلی پکڑے ہوئے ان کے ہمراہ "اکبری دروازے سے جلو خانے اور پھر پل تک کہ صراط مستقیم ہے" انواع و اقسام کی دوکانیں دیکھتے بھالتے چلے جاتے ہیں۔

جب ہم سرور کے ساتھ ساتھ چوک کی سیر کرنے نکلتے ہیں تو ہمیں کسی دوکان پر "شیرمال، کباب، نان نہاری" بکتی ہوئی نظر آتی ہے جس کی بو باس اس قدر خوشگوار ہے کہ "فرشتہ گذرے اور سونگھے تو کیسا ہی سیر ہو، ذرا نہ دیر ہو، دیکھے سے بھوک لگ آئے" ہم اس دوکان پر "سرخ سرخ پیاز سے نہاری کا بگھار" لگتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اس کی "سریلی جھنکار" سن کر ہماری طبیعت بے ساختہ اس کی طرف لپکنے لگتی ہے۔ وہیں ہمیں "شیرمال، شنگرف کے رنگ کی خستہ بھربھری" بھی دکھائی پڑتی ہے جو اس قدر خوش ذائقہ ہے کہ "اگر انسان ایک بار کھائے۔ نانِ نعمت کا مزہ پائے۔ تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے"۔ یہاں سے ہم آگے بڑھتے ہیں تو میاں حسینی کی دوکان ملتی ہے جن کے حلوا سوہن کا یہ عالم ہے کہ "اس کی شیرینی کی گفتگو میں لب بند" ہو جاتے ہیں۔ اسی دوکان پر انواع و اقسام کے "حلوے، حبشی، دودھیا" حلووں کے علاوہ پیڑی "دبیز بسی پستائی لذیذ" اس قدر خستہ فروخت ہوتی ہے کہ "ہونٹ سے کھائیے۔ دانت کا اس پر تمام عمر دانت رہے، دانت لگانے کی نوبت نہ آئے"۔

یہاں سے آگے بڑھ کر ہم بازار کے اس حصے میں پہنچتے ہیں جہاں میوں اور پھل پھلاری کی دوکانیں ہیں جن پر نازک اندام خوبصورت میوہ فروش عورتیں بیٹھی سودا بیچ رہی ہیں۔ "ہر کنجڑن کی وہ کیفی چوپن آدم صورت دیکھتا رہے، رعبِ حسن سے بات نہ کر سکے۔ سنگترے پریزاد، سرو قامت، رشکِ شمشاد۔ دوکانوں میں انواع و اقسام کے میوے قرینے سے چنے۔ روز مرے محاورے، محاورے ان کے دیکھے نہ سنے۔ کبھی کوئی پکار اٹھی، میاں ٹکے کو ڈھیر لگا دیا ہے، کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ سناتی ہے "مرزا انگور کا ہے کھٹ روا ہیں"۔ کسی طرف یہ صدا آتی ہے "گنڈیریاں ہیں پونڈے کی"۔

غرض اسی طرح قسم قسم کی دوکانیں دیکھتے، چہل قدمی کرتے ہم شیخ کوئی کی مٹھائی کی دوکان کے سامنے سے گذرتے ہیں جہاں کی بریانی اس قدر خوش ذائقہ ہے کہ "کسی اوشہ کار کا بدار اگر دیکھ پائے زندگی تلخ ہو۔ ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے"۔ یہاں سے مڑتے مڑتے ہم پراچیوں کی گلی کے نکڑ پر پہنچتے ہیں جہاں سے "کھجور، لذت ٹپکتی، ذائقہ میں چور۔ بہتر از انگور" مول لیتے ہوئے نورا بالائی والے کی دوکان پر آتے ہیں جس کی بالائی میں اس قدر شیرینی ہے کہ شکر ملانے کی ضرورت نہیں پڑتی اور اس قدر نفاست سے تھال میں جمائی گئی ہے کہ تری کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔ جسے کھانا ہوتی ہے "بے قند و شکر، نورِ اعلیٰ نور کہہ کر، چھری سے کاٹ کر" کھاتا ہے۔ یہاں سے آگے بڑھتے ہیں تو پیٹھا نا تمباکو والے کی دوکان پڑتی ہے جس کے کشیدنی تمباکو میں "مشک و عنبر کی خوشبو ہے۔ جس نے ایک دم کھینچا، اسی کا دم بھرنے لگا"۔ یہاں سے کچھ آگے چل کر عبد اللہ عطر فروش کی دوکان ہے جہاں سے ہم دو پیسے میں بیلے چنبیلی کا تیل، پھول پھیل، فتنہ برپا کرنے والا ایسا خریدتے ہیں کہ اس کے سامنے وہ سہاگ کا عطر گرد، جو نیور سے دل سرد ہوتا ہے۔

الغرض اسی طرح سرور ہم کو جگہ جگہ کی سیر کراتے پھرتے ہیں اور لکھنؤ کی خاص خاص اور مشہور مشہور چیزوں سے ہمیں روشناس کرتے ہوئے اس عہد کے اُن کاملینِ فن کے پاس لے چلتے ہیں جن کی ذات بابرکات سے لکھنؤ کا نام دور و نزدیک روشن ہے۔

وہ ہمارا التعارف حافظ ابراہیم خوشنویس سے کراتے ہیں جو فنِ خطاطی میں اُن کے اُستاد ہیں اور جن کی خوشنویسی اس پایہ کی ہے کہ اگر "میر علی یا آغا (مشہور خوشنویسوں کے نام ہیں) جیتے ہوتے اپنے لکھے کو روتے۔ اشکِ حسرت سے وصلیاں دھوتے"۔

یہاں سے ہم سرور کے ساتھ میر علی صاحب مرثیہ خواں کے

مکان پر پہنچتے ہیں جنہوں نے "علم موسیقی میں یہ کمال بہم پہنچایا ہے، اس طرح کا خیال دھرپد، ٹپہ گایا ہے کہ کبھی کسی نائک کے بھی وہم و خیال میں نہ آیا تھا۔"

ان لوگوں کے علاوہ وہ ہمارا التعارف میاں دلگیر مرثیہ گو، میرک جان صاحب پیراک۔ چھجو خاں، غلام رسول اور غوری کاملین موسیقی۔ بخشو اور سلاری طبلچی۔ مولوی محمد وکنکوا باز اور دیگر کاملین فن سے کراتے ہوئے اب شہر کے اس حصے میں لیجاتے ہیں جو آبادی سے الگ تھلگ ہے اور جہاں لکھنؤ کی خاک پاک میں بڑے بڑے فقرا اور مشائخ آسودہ خواب ہیں۔ یہاں "سالک و مجذوب شاہ نیا شاہ۔ پیر محمد شاہ خیر اللہ۔ ایک سے ایک سبحان اللہ" بزرگوں کے مزارات ہیں۔ یہ بزرگ رُوحانی بلندی کی اس منزل میں ہیں کہ "ظاہر میں مُردہ حقیقت میں جیتے ہیں، اشیا رلطیف کھاتے پیتے ہیں۔"

یہاں تک پہنچتے پہنچتے ہم لکھنؤ کی تقریباً ہر قابل دید و شنید چیز اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں اور مشہور مشہور لوگوں سے مل چکتے ہیں، اور یہاں مرزا رجب علی بیگ سرور رہنمائی اور تعارف کا پورا پورا حق ادا کرکے اور ہمیں لکھنؤ کی خاطر خواہ سیر کرا کے یہ کہتے ہوئے ہم سے رُخصت ہو جاتے ہیں کہ

"طبیعت لبسکہ معروف بہ اختصار ہے" ایک ایک فقرہ کہا ہے (اصل عبارت میں ایک ایک فقرہ لکھا ہے) ورنہ ان بزرگوں کی ۴

دو جرعے

از
جناب جنید احمد بی-ایس-سی-ال ال بی

(۱)

نہ جاؤ اُٹھ کے پہلو سے خدارا ۔ بہت گھبرا رہا ہے جی ہمارا
فلک سے ٹوٹ کر گرتے ہیں تارے ۔ یہ کس حسرت بھرے دل نے پکارا
چمن میں کل جو آندھی چل رہی تھی ۔ میں کیوں بتلاؤں تھا کس کا اشارا
یہ موجیں یہ تلاطم خیز موجیں ۔ یہی ہیں میری کشتی کا سہارا
بہت ہی باخبر تھی چشم ساقی ۔ نہ کیوں ہوتا غریبوں کا گزارا
سنوارا اپنے بخت نارسا کو ۔ جنید اُس زلف کو جس نے سنوارا

(۲)

وہ مستِ ناز ہے تصویرِ نور کیا کہنا ۔ نظر اُٹھی کہ گری برقِ طور کیا کہنا
نگاہِ شوق نے کیوں داستانِ غم کہدی ۔ وہ اور رہنے لگے دور دور کیا کہنا
کسی نے آج پلائی ہے دستِ نازک سے ۔ تمام عمر رہے گا سرور کیا کہنا
دلِ حزیں میں جو سرشاریاں سی ہیں یارب ۔ خطا معاف کرم کا ظہور کیا کہنا
تباہ ہو گئی صبر و سکون کی دنیا! ۔ مری نگاہ کا پہلا قصور کیا کہنا

جنید جب سے ہوا ہے بلند ذوقِ نظر،
جھکی ہوئی ہے بہت شاخ طور کیا کہنا

آپ کو خدا کی قسم ضرور فائدہ اُٹھائیے

ناظرین! میں آپ کو خدا کو حاضر و ناظر جان کر خدا کی قسم کھا کر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مندرجہ ذیل تعویذ و نقش میں نے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے اپنی ضرورت کے وقت حاصل کئے تھے۔ ان کی کامیابی دیکھ کر میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ آپ ان کو آزمائیے اور اپنی مراد پوری کیجئے جن بھائیوں کو میری گزارش پر بھی اعتبار نہ ہو ان کو میں کچھ کہنا نہیں چاہتا صرف خدا پر ایمان رکھنے والوں سے میری گزارش ہے کہ چند پیسوں یا روپوں کی خاطر اپنا ایمان نہیں برباد کروں گا جس کسی کا ضمیر مطمئن ہو وہ ضرور مندرجہ ذیل تعویذ و نقش کو آزمائے ہزاروں کی قسمت بدل دی ہے۔ تقدیر کا پاسہ پلٹ جاتا ہے رسول کے سینہ کے راز کو آج ظاہر کر رہا ہوں۔

قسمت کا موتی رات کو سوتے وقت اپنے سرہانے رکھنے سے خواب میں بشارت ہو جاتی ہے کہ اس کام میں کامیابی ہوگی یا نہیں اور یہ کہ اس کا طریقہ کیا ہے اور کیونکر کامیابی ہوگی۔ بالکل سچا جواب مل جاتا ہے۔ اسکے عامل نے سورج کے عکس میں رہ کر اس عمل کو پایا و کیا ہے۔ ہدیہ صرف ایک روپیہ دس آنے ہے۔ محصولڈاک علاوہ۔

دولت کی کنجی یہ ایک تعویذ ہے جس کو روپیہ پیسہ میں رکھ دینے سے اس قدر ترقی ہوتی ہے کہ خدا کی شان دکھائی دیتی ہے غریبی مفلسی دور ہونے کے سامان ہو جاتے ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر اتنی جلدی دولت مل گئی۔ نوکری کی صورت میں اسکو افسر کے سامنے جیب میں رکھ کر جائے تو وہ اس قدر مہربان ہو جاتا ہے کہ قدرت کا کرشمہ دکھائی دیتا ہے اور اس کے دل میں خود بخود اپنے ماتحت کی ترقی کا خیال دامنگیر ہوتا ہے۔ ہدیہ صرف ایک روپیہ چار آنے ہے (رجسٹر)۔

محبت کی ڈوری فقیر والے نے بڑی بڑی محنتیں کر کے ایسی چیزیں حاصل کی ہیں یہ بھی عامل شاہ صاحب کا عطیہ ہے جس کی محبت ہو یا کسی کو اپنے دام میں پھنسانا ہو اور بے دام غلام بنانا ہو اس سے شادی کی تمنا ہو تو محبت کی ڈوری کو اپنے بازو پر باندھ لیجئے۔ اور جس جگہ آپ کا مطلوب ہو وہاں سے گزر جائیے۔ اور وہاں تک رسائی نہ ہو سکے تو اس ڈوری کو اپنے محبوب کے در پر یا اس کے مقبول تک پہنچا دیجئے بس گھر بیٹھے اس کی تڑپ کا تماشہ دیکھئے۔ وہ ماہی بے آب کی طرح بیچین ہو کر آپ تک پہنچے گا۔ ہدیہ ڈھائی روپے ہے۔ مندرجہ بالا سب عملیات میں اگر ناکامی ہو تو مقررہ قیمت واپس دی جائے گی۔ تمام نقش و تعویذات لفافہ میں رجسٹری کر کے وی۔ پی کئے جاتے ہیں۔ محصولڈاک ہر ایک کا بذمہ خریدار۔

سید نواب علی شاہ صاحب عامل چھتہ حکیم آغا جان (ع۔ ل) دہلی

بیس ہزار روپیہ کا سونا (گولڈن گولڈ) مفت

آپ بھی حاصل کریں!

ہم اصل کیمیکل گولڈ کی شہرت کیلئے ہندوستان کے تمام ہاتھوں اور گھروں میں اپنے سونے کو پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ کمپنی نے فیصلہ کیا ہے کہ بیس ہزار روپیہ کا سونا مفت تجربہ کرنے کیلئے تقسیم کر دیا جائے۔ جو لوگ کیمیکل گولڈ کے خواہشمند ہوں ان کو چاہیئے کہ وہ فوراً آرڈر دیدیں ان کو مندرجہ سونا مفت اور چار عدد نہایت شاندار چوڑیاں اور ایک پانچ نگ کی انگوٹھی بھی بھیجی جاتی ہے۔ یہ تمام چیزیں آپ دیکھیں گے تو حیرت میں رہ جائیں گے کہ کیسی زبردست قربانی کی جا رہی ہے۔

گولڈ ٹریڈ ایجنسی نمبر ۴ دہلی

پیلا رس

افسانہ

از جناب رحمٰن مذنب

دوسرے سال نے قدم جمایا۔ ڈپٹی صاحب بڑی بیدردی سے بارہ مہینوں کی پنشن ہضم کر چکے تھے۔ ملازمت کے ایام میں لوگوں کو یہ گمان تھا کہ ڈپٹی صاحب کا پیٹ بہت بڑا ہے، اتنا بڑا کہ بھرنے نہیں پاتا۔ کھانے کے معاملے میں ان کی گرفت سے بچنا مشکل ہے۔ الا بلا کھاتے رہتے۔ شراب، رشوت اور خوشامد سے لیکر گالیاں تک زہر مار کر جاتے۔ بے گناہوں کو سزا دینے میں اتنے ہی بیباک تھے جتنے گناہگاروں کو صاف چھوڑ دینے میں۔ بیگناہوں کی گالیاں اور کوسنے ان کے پلے پڑتے۔ گالیاں کھانے کے خلاف کبھی اُگل بھی دیتے۔ جب اُن کا عتاب نازل ہوتا تو کچہری کے اہل کاروں کو تختۂ مشق بننا پڑتا جو عہدِ جدید میں میکانکی انصاف کے کل پُرزے ہیں۔ ڈپٹی صاحب سمیت ان سب کے ذمے ایک ہی کام تھا —— ناتواں کی ہڈی پسلی توڑنا اور قوی کی بھاری بھرکم جیب کو سبکبار کرنا۔ چنانچہ اسی میکانکی اصول کی برکت سے وہ سال میں دوبارہ ماسٹر بیوک خریدتے، پانسو ماہوار کا بل پابندی سے نیٹڈوز کو ادا کرتے، فلیس کے آلات نشر خریدتے اور بیکار کر کے پھینک دیتے، شراب پانی کے طور پر پیتے —— جب حرص کے حصے بخرے ہوتے ہونگے تو رب الارباب نے بڑا حصہ ڈپٹی صاحب کو تفویض کیا ہوگا۔ سرکاری خزانے کے ٹکے تو وہی تھے نو سو روپلی لیکن دوسرا مالِ غنیمت اس سے کہیں زیادہ تھا۔

اب حسبِ سابق برشکالِ زر تو نہیں رہا لیکن قلت کا دور بھی نہیں تھا۔ جس طرح پہلے حرام کی ہڈی حلق میں نہیں اٹکتی تھی اسی طرح اب بھی نگلی ہی جاتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے مردار وقت کے بغیر ملتے تھے اب ذرا وقت کے ساتھ۔ ان کا رسوخ اب بھی بہتوں کے لئے بابِ رحمت تھا۔ بہتیرے جانتے تھے کہ قانون کی گرفت سے اگر کوئی آزاد ہے تو وہ پیسہ ہے۔ پیسہ وہ لاٹھی ہے جس سے کہ جاری ہوتی ہے اور مطلب آسانی سے نکلتا ہے۔ ویسے بھی خرید و فروخت کا ذریعہ ہے۔ قانون کے فیصلے بڑی بڑی قیمت پر بک جاتے ہیں۔

ڈپٹی صاحب قدیم ابوالہول کی نسل سے تھے۔ آدھے آدمی اور آدھے جانور —— یعنی درندے۔ بلکہ آدمی کم اور درندے زیادہ تھے۔ ہاتھ پاؤں بالکل آدمی کے سے اور مزاج درندوں کا سا۔ اور اب ادھیڑ پن کی وجہ سے درندگی بڑھتی جا رہی تھی۔

ثریا کی زندگی گائے بیل سے کچھ ہی اچھی تھی۔ ڈپٹی صاحب کی زیادتیوں کے باعث بے جان ہو کر رہ گئی تھی۔ ڈپٹی صاحب پر جب نشے کا بھوت سوار ہوتا تو وہ اس بُری طرح مُنہ پھاڑ پھاڑ کر گالیاں اُگلتے کہ ناک اور کان سڑ جاتے۔ پھر کسی ناک اور کان کے ڈاکٹر سے بھی ممکن نہ ہوتا کہ علاج کر سکے۔ جس کمرے میں جاتے وہ شراب خانہ بن جاتا۔ ثریا کا سامنے آنا کبھی چھوٹی اور کبھی بڑی قیامت کا نقشہ جما دیتا۔

بیکاری ہو تو شیطان دماغ میں گھس جاتا ہے اور اسے اپنی کارگاہ بنا لیتا ہے۔

ثریا رسماً ڈپٹی صاحب کی شریکِ حیات تھی لیکن وہ ہر وقت تنہا تھی، تنہائی میں وقت کاٹتی اور تنہائی میں اپنا شریک بناتی۔ ڈپٹی صاحب ہمیشہ ثریا کے بغیر نیٹڈوز جاتے، رقص گاہ میں پہنچتے اور سب کچھ ثریا کے بغیر کرتے۔ ثریا کو خبر تک بھی نہ تھی کہ وہ کس انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب کے معمولات سے اسے سروکار نہ تھا۔ اس نے کبھی شراب نہیں پی، کبھی نیٹڈوز کے قریب ہو کر نہیں گزری اور رقص و سرود سے بھی محروم تھی۔ تاہم مجبوری کے طفیل وہ ڈپٹی صاحب کی شریکِ حیات تھی۔ وہ حسین تھی، نوجوان نہیں لیکن جوان تھی، چاند نہ تھی تو ستارہ ضرور تھی، مگر ڈپٹی صاحب کے نہ تھی۔ ڈپٹی صاحب نے اسے کبھی شریکِ حیات نہیں سمجھا۔ ان کی شریکِ حیات الماس تھی جو ثریا کی طرح لوٹنے پوٹنے نہیں ہاتھ لگ سکتی تھی بلکہ حسن کی منڈی میں سب سے زیادہ قیمت رکھتی تھی۔ ہر خریدار الماس کو نہیں خرید سکتا تھا۔ اسے خریدنے کا وہی اہل تھا جو آنکھیں بند کر لے اور گڑھے میں اوندھے مُنہ گرے۔

گھر میں جنس کی قیمت دھول مٹی ہے اور بازار میں ہی انمول ہے کیونکہ وہاں مقابلہ ہے۔

الماس جوں جوں ڈپٹی صاحب کے جسم اور ذہن سے قریب ہو رہی تھی ثریا توں توں دور ہو رہی تھی۔ موجودہ گھریلوپن کی جڑیں ہلا سکیں

کھو کھلی ہو چکی تھیں کہ ہلکا سا جھونکا انہیں اُکھاڑ پھینکنے کو کافی تھا۔

ثریا دل سے اپنے تئیں ایسی ناؤ سمجھتی جس کے سمندر میں بھنور ہی بھنور ہوں اور اب تو وہ بہت زیادہ ڈگمگا گئی تھی۔ کہنے کو عورت تھی لیکن حوصلے کے اعتبار سے اُس دہقان کے برابر تھی جو حوادث کے جاڑے سہتا اور جیٹھ کی گرمی ننگے بدن گزارتا ہے اور جیتا ہے مرتا نہیں۔ ثریا کے حوصلے نے ایسی عادت کی بنیاد ڈالی تھی جس کے باعث مصیبت کا ٹیڑھے سے بڑا پتھر اپنے مکرز وخیالات پر سہار لیتی۔ عام طور پر تیمم کرتے رہتے تھے۔

ماں باپ مخلص ضرور ہوتے ہیں لیکن اولاد خالی اخلاص جاننے سے پنپ نہیں سکتی۔

اسے میٹرک تک تعلیم دی گئی تھی لیکن صرف اس خیال سے کہ کوئی تعلیم یافتہ مرد اسے زوجیت کے معیار سے گرا ہوا نہ سمجھے اور وہ چکی چولھے کے پھیر میں جھونک نہ دی جائے کہ گھر میں کوئی چیز گل سڑ نہ جائے لیکن عورت بے نمک بے لطور ہو جائے۔ اعلیٰ زندگی سے عورت دور رہے۔ ماں باپ نے ثریا کو اسی ڈھب کا بنایا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی بے اعتنائی اور تشدد کا ثریا کے پاس کیا جواب تھا؟ کسی فلسفی کا عدم تشدد؟

حالانکہ بغیر عدم تشدد بے اثر ہے۔ عدم تشدد قوی کا ہتھیار ہے۔

ثریا نے مقدور بھر کوشش کی کہ کوئی ایسی وجہ پیدا نہ ہونے دے جس سے اس کی وفاکیشی پر حرف نہ آنے کا خدشہ ہو۔ مگر ڈپٹی صاحب کو ثریا دل ہی سے پسند نہ تھی۔ اب ثریا کچھ بھی ہو رہا ہو، بری ہو سب بیکار ہے۔

ثریا نے خود کو تلخی کا خوگر کر لیا تھا۔ کوٹھی میں احباب کا جشن رہتا جام متصادم ہوتے، صراحی رقص کرتی اور آتشِ سیال کے قلقلی دھارے گلے کی غٹ غٹ میں بہہ جاتے۔ چنگ و رباب کے نغمے سنگین دیواروں اور چھتوں کا کلیجہ چیر کر ثریا کے دل کی کروٹوں میں تڑپتے۔ ثریا نے دل کو پتھر لیا۔ اس پتھر سے ڈپٹی صاحب کا سر نہیں پھوٹ سکتا تھا۔ اس نے اپنے حواس پر ضبط کا خول چڑھا لیا۔ اب وہ بے حس تھی۔ غمزدگی جاتی رہی، غم اور مسرت اس کے لئے بے معنی تھے۔ اس کی زندگی طویل غشی کے بعد کی کیفیت تھی ـــــ مرنے اور جینے کے درمیان کوئی شے۔ سکوت اور ایک کامل سکوت تھا۔ دیوار اور اس میں صرف یہی ایک فرق تھا کہ وہ حرکت کرتی تھی اگرچہ اس کی حرکت زندگی کی حرکت نہ تھی۔ حالات اس کے سکون میں خلل ڈالنے کی صلاحیت کھو چکے تھے، انقلاب کی کوئی طاقت اسے متغیر نہ کر سکتی تھی۔ ایسے میں ڈپٹی صاحب نے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

ابھی تک تو ثریا کا سکوت سکوت تھا کیونکہ تمام آفات کے باوجود وہ بنیاد پر کھڑی تھی لیکن اب بنیاد اُکھڑنے کو تھی۔ پھر ثریا کیونکر کھڑی رہ سکتی تھی۔ درخت کی جڑیں کاٹ دو تو پھر اسے جہاں چاہو پھینک دو، چولھے تک میں جھونک دو۔ ثریا اور اس کا خاکہ دونوں آندھی کا رُخ بدلنے والے جھونکوں کی لپیٹ میں آنے کو تھے۔ ثریا کو اپنا فکر تو اتنا تھا کہ وہ کب مرتی ہے اور خاکہ کا اتنا تھا کہ وہ کب جینے کے لائق ہوتا ہے۔ شیطان کا کریل بازو زندگی کی طرح اٹھنے کو بیتاب تھا مگر زندگی ہیجان پرور طوفان کی نذر ہونے کو تھی۔ پنشن کا ایک سال ختم ہو چکا، دوسرا ختم ہو چکا اور تیسرا شروع ہوا۔

سال نو آفتاب مشرق کی ولایت سے تازہ دم ہو کر نکلا، پچھلا سال ہمیشگی کے اُس حصے میں چلا گیا جہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ڈپٹی صاحب کی کوٹھی میں زندگی نے کروٹ بدلی۔ نئی سج دھج تھی۔ نئی مسرت تھی۔ ڈپٹی صاحب کی ادھیڑ ہوتی جوانی میں پھر کھلبلی مچ رہی تھی۔ جو بلبلی گلو در قام سونگھے ہوئے مریض کا ساتھا اس میں امنگوں کی تڑپ تھی۔ آج ڈپٹی صاحب کے نام کے ساتھ الماس کا نام لیا جا رہا تھا۔ پہلے بھی ڈپٹی صاحب الماس کے ساتھ ساتھ تھے لیکن اب تھے تو رسمی طور پر۔ کبھی سے ان کے دل کا فریم اس قیامت کی تصویر سے جڑا ہوا تھا۔ وہ اسے سیم و زر کے بل بوتے پر لے آئے تھے۔ یہ ان کی شریک حیات تھی۔

شہر کی تمدنی فضا میں رقص و نغمہ کی تیتری آج آوارہ نہ تھی۔ آج وہ اپنے آبائی پیشے کو ٹھکرا کر گھر کی زندگی بسر کرنے آئی تھی۔ گھر کی شرافت عرصے تک اس کے دل و دماغ پر چھائی رہی اور اس نے شرافت کا بھرم رکھنے کے لئے آرٹ کی زندگی کا وہ ذلیل رُخ بدل لیا جسے سوقیانہ پن نے بدشکل کر دکھایا تھا۔ وہ نخوت سے بھرے ہوئے سر اور تجسس نگاہیں کالعدم تھیں جو الماس کے تھرکتے ہوئے قدموں پر ٹھوکریں کھانے کی عادی تھیں۔ آرٹ حسن کا جز ہے اور حسن آسمان کو جھکا سکتا ہے۔ وہ وحشی دل جو اس کے پتھریلے شباب پر سر پھوڑ پھوڑ کر رہ جاتے اب جانے کہاں تھے۔

دل اور نظر کی وسیع کائنات میں کھلے بندوں پھرنے والی نڈر رقاصہ آج مختصر سی مکانیت میں اسیر تھی

رقاصہ کی فطرت نیک ہو سکتی ہے اگرچہ بدی اس کا اوڑھنا بچھونا ہو۔ وہ اپنی طرف سے شریف بن گئی۔ اس نے سچے دل سے میلے دل کو اُجلا کرنے کی سعی کی اور اس کے دل سے برسوں کا میل اتر گیا۔

[redacted]

لیکن ڈپٹی صاحب کمزور نکلے۔ عمر کا تقاضا تھا، اس تقاضے نے انہیں دلوچ لیا اور الماس کے پاؤں تلے وہ کچلے گئے۔

موقعہ ہو تو حکومت کرنے کے لئے ادریس بھی جی چاہتا ہے۔ الماس کو ایک کمزور مہرہ ملا تھا۔ کمزور بھی وہ کمزور کہ دل کے ساتھ جس کا دماغ بھی کمزور تھا۔ ایسا ساتھی الماس کے لئے ہدایت کی لاٹھی نہ بن سکا۔

آہستہ آہستہ وہ بھیانک علامتیں نمودار ہونے لگیں جنہوں نے اس کی صورت کو اندر سے مسخ کر رکھا تھا اور جنہیں وہ شرافت کے لباس میں چھپا رہی تھی، لیکن پورے طور سے چھپا نہ سکی۔ ستھری ستھری شکل کے نیچے وہ گہرے گہرے داغ پھر ابھر آتے جن کی بجلی نے اس کی ضمیر کو مستقلاً تاریک کر دیا۔

رفتہ رفتہ آئی ہوئی شرافت چلی گئی۔ گھریلو زندگی کی وضعداری سے الماس کی اکتاہٹ بڑھتی گئی۔ یہ زندگی اسے بے کیف اور بے رنگ معلوم ہوتی اور ویسے بھی یہ زندگی ایسی ہی تھی جیسی الماس نے محسوس کی۔ عورت زندہ ہو جائے اگر اسے رگیدا نہ جائے اور سماج کی درخشاں سمت جانے دیا جائے، الماس رگیدی تو نہ گئی لیکن وہ درخشاں سمت بھی نہ گئی مطلق العنانی کے لئے تاریک و درخشاں دونوں راہیں ہیں۔

آئینے سے ایک بار زنگ اتار دیا گیا تھا تاکہ وہ صیقل رہے لیکن زنگ دوسری بار چڑھ گیا اور اب اترنے کا امکان نہ تھا۔ وہ آزادی جو ثریا کے لئے ممنوع تھی الماس کے لئے رواج پا گئی اور اس درجہ کہ ڈپٹی صاحب کو پابہ زنجیر ہونا پڑا۔ الماس اسیر ہو کر آئی لیکن اسے آزادی مل گئی اور اس کے ساتھ ایک کمزور شکار بھی مل گیا۔ الماس وہ بپھری ہوئی شیرنی تھی جس کے خوفناک پنجوں میں ڈپٹی صاحب گھگھیاتے گیدڑ بن کر رہ گئے۔ ان پر آمرانہ قسم کی حکومت مسلط ہو گئی تھی۔

وہ سال ثریا نے بھی دیکھا جس نے ایک گھر کا نظام یکسر تلپٹ کر دیا تھا لیکن کہاں؟ ایک بالکل نئی اور اجنبی جگہ۔ جب بالی عمر کا آفتاب مسکرا کر نکلا تو اس نے سمجھا کہ کسی نے جہنم سے قہر کا انگارہ اٹھا کر باہر رکھ دیا ہے تاکہ زمین اور آسمان کو جہنم بنا دے۔ نئے مکان کے بالاخانے میں مشرقی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا تھا اور ایک سکے پیچھے وہ کھڑی تھی۔ آفتاب فضا کے خنک ذرات کو جھلسا رہا تھا لیکن اس کی گرم شعاعیں اس کے دل کو حرارت پہنچانے سے قاصر تھیں جس پر مایوسی کی برف پڑ گئی تھی۔ شہر سے دور جہاں ویرانہ ہی ویرانہ تھا وہ اسٹیشن کے اس پار غیر آباد قصبے میں آ بسی تھی۔ یہ ویرانہ اس کے ویران دل کو سازگار تھا۔ مکان کی کٹی پھٹی دیواریں، شکستہ فرش اور ٹوٹی پھوٹی چھت کا نقشہ اس کے دل سے ملتا جلتا تھا۔ گریبان میں منہ ڈالتی تو ویرانی، دل میں جھانکتی تو ویرانی، آنکھوں کے کواڑ کھولتی تو ویرانی نظر آتی۔ خدا کی دنیا ویران ہی ویران تھی۔

اسٹیشن، ثریا کے نظر و سماعت کی حد میں تھا۔ کبھی کبھی کالے کلوٹے انجن چیخیں مار کر اس کی متفکرانہ کیفیت کو درہم برہم کر دیتے اور تھوڑے سے دیر کے لئے مغموم خیالات اس کے دماغ سے اپنی گرفت ہٹا لیتے۔ جب تک کالے کلوٹے انجن اور گاڑیاں اسٹیشن پر رکی رہتیں وہ اسٹیشن کا نظارہ کرتی۔ دور سے یہ منظر کسی حد تک پراسرار معلوم ہوتا۔ اجنبی چہرے جو صاف طور سے نظر نہیں آ سکتے تھے اس کی دلچسپی کا باعث بنتے۔ لیکن جب انجن اور گاڑیوں کے تیز تیز پہیے آہنی پٹڑیوں کے دراز بازوؤں پہ روانہ ہو جاتے تو اسٹیشن کی زندگی خاموشی اختیار کرنے لگ جاتی۔

اسٹیشن کی زندگی ثریا کی زندگی میں گھر کر گئی تھی۔ گاڑیوں کے اوقات سے وہ باخبر تھی۔ دن بھر وہ بیدار رہتی اور رات کو بھی نہ سوتی۔ ویسے بھی ذہنی اختلال نے اسے بے خوابی کے مرض میں مبتلا کر دیا تھا۔ سونا کم میسر آتا اور جاگنا اس کی عادت میں داخل ہو گیا۔ اگر رات کو اس کی آنکھ لگ جاتی تو انجن کی شدید چیخ اسے چونکا دیتی۔ اور اسے بالاخانے کی کھڑکی پر کھینچ لاتی جو ہر وقت آدھی کھلی رہتی۔

الماس ہر نوع سے بے فکر تھی اور ڈپٹی صاحب صرف ایک نوع سے بے فکر تھے۔ وہ ثریا اور خالد کو یاد کرنے سے عاجز ہو گئے۔ ثریا کا تو خیال بھی نہ آتا لیکن خالد کبھی کبھار یاد آ جاتا۔ اس لئے کہ وہ بیٹا تھا اور بیٹے بڑھاپے میں کام آ جاتے ہیں۔ تاہم یہ یاد بھول کے برابر تھی کیونکہ بے نتیجہ تھی۔ ثریا اور خالد کو اس مسموم ماحول کے قریب نہیں پھٹکنا تھا جس میں ناگوں کا ایک جوڑا پھنکارتا تھا۔ ان کے لئے سانس لینا بھی دشوار تھا۔ وہ فضا زہر ہلاہل پی گئی تھی جو پہلے زہریلی تو تھی لیکن اتنی نہیں۔ سانس لینے کے قابل تھی۔ آنکھوں سے اوجھل، خیال کے سامنے وہ کوٹھی تھی جس کے خشمگیں عفریت موٹے موٹے تھنوں سے آگ برسا برسا کر ثریا کو ڈراتے رہتے۔

خالد اس سب کی گہرائی تک رسائی رکھنے والا ذہن تو نہ رکھتا تھا تاہم سرسری طور سے اس نے یہ جان لیا کہ اس کی ماں تشدد کے ہاتھوں بری طرح پٹی ہے۔ سختی کی ضربوں نے اس کے دل و دماغ کی بیوننیں ادھیڑ دی ہیں۔ ثریا کی باتیں جگر سوز المیہ تھیں، اس کی تپلی اور دہری کمر کامیابی سے جور و ستم کی داستان کا حسرتناک عنوان تھی۔

پانچ سال ہو لئے، وقت کا لنگڑا سانپ ڈستا ڈستا ثریا کی چھاتی سے گزر گیا۔ ان پانچ برسوں میں وہ مر مر کر جیتی رہی۔ بے آسرا تھی اس لئے اسے حوصلہ مند ہونے کی ضرورت تھی، سو وہ ہوئی اور یہ حوصلہ اس کی ناتوانی کو انجکشن دیتا رہتا۔

تنہائی سب سے بڑا حوصلہ ہے۔ دوسروں کا آسرا نہ رہے تو آدمی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

خالد نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جس میں انسانیت کی تعمیر کے عناصر تھے۔ وہ حساس اور فکر مند تھا۔ اسے آغاز ہی سے یہ سمجھنے کا موقعہ ملا کہ زندگی انگارہ کی بھٹی ہے، آدمی کو جس کے لئے کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس وقت ماں اور بیٹے قحط کے سال میں تھے، وہ رہی سہی پونجی ٹھکانے لگ گئی جو آج تک دو جانوں کو زندہ رکھنے کے اسباب مہیا کرتی تھی لیکن اب نہیں۔ اب وہ قلاش تھے۔ سماج میں مفلس کے لئے جگہ نہیں۔ تاہم خالد کے دو مضبوط ہاتھ مصیبت کا گلا گھونٹنے کے لئے کافی تھے۔ اسٹیشن پر اس نے قلیوں کو حلال کے دو ٹکے کماتے دیکھا۔ وہ قلی بن گیا۔ قلی نیکدل انسان ہے جو دوسروں کے کام آتا ہے۔

قدرت نے انسان کو قلی بنا کر بھیجا تاکہ کائنات کا وہ بوجھ اٹھالے جو زمینوں اور آسمانوں سے نہیں اٹھا۔ مگر ہر انسان قلی نہ بنا۔

قلی اپنا بھی بوجھ اٹھاتا ہے اور دوسروں کا بھی۔ کتنی درخشاں زندگی ہے؟ بوجھ اٹھانا، اپنا اور دوسروں کا، پیغمبری ہے۔ انسانیت ہے اور سچی بشریت ہے۔

خالد کامیاب قلی بن گیا۔ وہ جفاکش تھا اور کوچبان کے گھوڑے کی طرح کام کرتا۔ گاڑیوں کے آنے اور جانے کے وقت پوری پابندی کے ساتھ حاضر رہتا۔ درمیانہ وقفوں میں گھر آجاتا، اپنے نصیب کے چند سکے لاکر اچھلتا کودتا ماں کے سامنے پھینکدیتا، متبسم آتا اور ثریا کا دل تک اس سے متبسم ہو جاتا۔

کبھی کبھی اسٹیشن کے پہلو میں چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھتا۔ منیجر بڑا بھلا آدمی تھا۔ وہ قلی کو اچھا سمجھتا تھا۔ اسے قلی سے نفرت نہیں تھی۔ خالد کا دل لگ گیا۔ وہ ریسٹورنٹ پر اس زیادتی سے آنے لگا کہ جیسے یہ اس کا مرغوب مشغلہ ہو۔ اندر آیا، کرسی لی اور ریڈیو کے پاس بیٹھ گیا۔ یہیں تک اس کے تعیش کی حد تھی۔

بعض اوقات وہ خود بھی ریڈیو بن جاتا۔ اسے اکیلے پن میں گنگنانے کی عادت تھی۔ موقعہ پاکر وہ گا بھی لیتا اور بہت سے قلی اشتیاق کے ساتھ اس کا گانا سنتے۔

اس کے تین ہی ٹھکانے تھے، گھر، اسٹیشن اور ریسٹورنٹ۔ ایک قلی کے لئے شاید یہ کافی ہیں۔ اسٹیشن کے اردگرد دو فرلانگ سے باہر کی دنیا ـــــ وسیع دنیا اس کے لئے پیدا نہیں کی گئی۔ ویسے اسٹیشن سے اوپر آسمان تک وہ نظر دوڑا سکتا تھا، یعنی چھ سمتوں میں سے ایک سمت۔ غنیمت ہے۔ اگر زندگی کا مقصد تسکین قلب ہے تو یہ اسٹیشن کی مختصر دنیا میں بھی میسر آسکتا ہے اور ویسے خواہ دنیا بھر میں نہ ہو۔

دن کٹتے گئے۔ جینا اچھا معلوم ہونے لگا۔ ثریا اور خالد کی زندگی خوشگوار اعتدال پر آگئی۔ ثریا کے زخموں پر پھاہے لگ گئے۔ اب سب کچھ ان کے موافق تھا۔ خدا تک ان پر مہربان تھا۔ ڈپٹی صاحب اور الماس کی وہ مشترکہ سازش رائگاں گئی جس نے ادھر تلخاب پلایا۔

ڈپٹی صاحب نہ اب ڈپٹی تھے نہ صاحب بلکہ تھوڑی سی ہڈیوں اور خشک چمڑے کے ڈھانچہ تھے جس سے انہیں خود نفرت تھی۔ ان کا وقار اور بھرم جا چکا تھے۔ ان کی حیثیت صفر سے کم تھی۔ آج وہ ہوس پرستی کا جنازہ بنے ہوئے تھے اور زندگی کا المناک تمسخر تھے۔ الماس کے آگے آتے تو مصور کا ایسا شاہکار بن جاتے جس کا عنوان عبرتناک تضاد تھا۔ ڈپٹی صاحب کی آواز الماس کے کرخت شور سے اس بُری طرح دب گئی کہ جیسے وہ آزاد ہی نہیں۔

تشدد غالب ہے۔ عدم تشدد کہاں سے آئے جب انسان آدمیت ـــــ اخلاق، قوت اور خوف کھو بیٹھے۔ جب انسان سراسر تشدد یا تشدد کا جواب بننے کی صلاحیت پیدا کرلے تو وہ عدم تشدد شعار کرے۔ شیر عدم تشدد اختیار کرے گیدڑ کیونکر کرسکتا ہے؟ ڈپٹی صاحب الماس کے اس غلبے کی روک تھام نہ کرسکے کیونکہ وہ غلبے کی طاقت زائل کر چکے تھے۔

الماس کے ساتھ اس کی لخت جگر نے پر نکالے جو الماس کی ڈگر پر قدم قدم پیچھے چلی آئی۔ جوانی میں الماس جو کچھ تھی زرتاب ہی کچھ اب تھی۔ زرتاب الماس کی جوانی تھی کہ اسے دیکھ دیکھ کر وہ زندگی پالیتی۔ زرتاب کی شکل سے ترشح ہوتا کہ جوانی کو اس سے بہتر اور کوئی نہ ملی جیسی وہ سینگ سماتی۔ ڈپٹی صاحب کی کوٹھی رقص گاہ تھی۔ زرتاب نے رقص و نغمہ میں بہیں مہارت پائی۔ اس کی آواز کبھی تو مختصر سی چار دیواری تک محدود رہی لیکن اب دنیا بھر کے کانوں تک پہنچ گئی۔ وہ اپنے نغمات

نشر ملو سے نشر کرتی رہتی اور بالعموم نشر گاہ آتی جاتی رہی۔ ریڈیو سننے والے اس کے نغموں اور نام سے ضرور آشنا تھے۔

آسمان پر صبح ہی سے بادل چھا گئے تھے۔ فضا کا دامن اودے سیاہ اور سفید پانی کے ہلکے پھلکے مشکیزوں سے لدا رہا تھا۔ متواتر تین گھنٹے سے بادل ٹپک رہے تھے۔ خالد نے بوچھاڑ سے پہلے ہی ہوٹل کے بعض کاموں میں منیجر کا ہاتھ بٹا دیا تھا۔ اس نے چھوٹے آنگن میں پھرتی ہوئی مرغیوں کو ڈربے میں قید کر دیا اور سڑک پر پھرتی ہوئی بطخوں کو ہانک کر اندر لے آیا۔ صحن یا غیچے میں ڈیڑھ فٹ کے قریب پانی بھر آیا اور بطخیں اس میں تیرنے لگ گئیں۔ غالباً خوش تھیں۔ خالد تیرتی ہوئی بطخوں کو، برآمدے میں پڑی ہوئی ٹوٹی پھوٹی کرسی پر بیٹھ کر دیکھنے لگ گیا۔ اس میں وہ اتنا منہمک ہو گیا کہ اس کے خیال نے بطخ کی شکل اختیار کر لی اور وہ دوسری بطخوں میں رل کر تیرنے لگا۔

ایک دم کمرے کی گھڑی ٹن ٹن ٹن ٹن نے تیرتی ہوئی بطخ پریشان خیال بنکر اس کے ذہن میں پرواز کر آئی۔ گاڑی آنے کو تھی۔ مینہ کا طوفان موقوف نہ ہوا۔ خالد اٹھا اور ہوٹل سے نکل آیا۔ چار قدم لئے اور چوراہے کو عبور کر کے اسٹیشن کے اندر آ گیا۔ ایک ٹیکسی آکر رکی۔ ایسے اس کا فرض متعلق تھا۔ وہ لپک کر آگے ہوا۔ ایک لڑکی باہر نکلی اور اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ اسٹیشن پر بہتیرے مسافروں کی نگاہیں ہوا اور دھرمی کا سہارا لے لیکر، نوجوان لڑکی کے آس پاس مچل رہی تھیں اور اس سے مس ہو ہو کر رہ جاتی تھیں۔ خالد بیچارہ قلی تھا اس نے لڑکی کی شکل دیکھنے سے زیادہ اس کا سوٹ کیس اور بیڈ نگ اٹھانے کی فکر کی جس کے لئے وہ اشارہ کر چکی تھی۔

پیٹ کا خیال ایسے تلخ فرض میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کی خاطر ذیدے پیتھر لانے کی حاجت ہے ——— خودکشی تک کی ضرورت رہتی ہے۔ پیٹ بھر جائے تو زندگی میسر آتی ہے۔ خالد کا پیٹ خالی تو نہ تھا لیکن پھر بھی اس پر فرض کا بھوت سوار ہو جاتا اور فی بنڈل ایک آنہ کے حساب سے اجرت کا تخمینہ کرنے لگتا۔ کبھی کبھی اکنیوں کے ڈھیر اسے پا افتادہ نظر آتے جنہیں وہ بوجھ لادے لادے روندتا چلا جاتا اور اکنیوں کے ڈھیر اسے بڑے بڑے بار کا احساس بھی نہ ہونے دیتے۔ جب کام ختم ہو چکتا تو اکنیوں کے ڈھیر پر لگا کر اڑ جاتے۔ تاہم اسکے ہاتھ میں چند اکنیاں ضرور رہ جاتیں جنہیں وہ اپنے تئیں کافی سمجھتا۔ ویسے خالد حساس تھا۔ اس کا دل پتھر کا ٹکڑا نہیں تھا بلکہ دھڑکنے کی خاصیت رکھتا تھا لیکن وقت نے اس کے جذبات کچل دیئے تھے۔ وہ بارود کا میگزین تھا جسے دیا سلائی دکھانے ہی آگ کا بہت بڑا سلسلہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس نے بہ جبر و اکراہ اس بارود کو سیلا کر دیا تھا۔ اس کا کام شعلۂ دل فروزاں کرنے سے زیادہ پیٹ کی دوزخ سرد کرنا تھا۔ یہی اس کی زندگی تھی اور یہی زندگی کا اطمینان۔ اس نے سوٹ کیس اور بیڈ نگ سنبھالے اور پلیٹ فارم کی جانب ہو لیا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ سفید چہرہ جب ہڈی پسلیوں پر چڑھ کر گداز پا جائے تو اس کا ابھار، گداز اور لچک زندگی میں طوفان بپا کر دیتے ہیں۔

زرتاب کو فرصت نہ تھی کہ ٹکٹ خریدنے اور گاڑی میں سوار ہو جانے کے علاوہ کسی اور خیال کو اپنے ذہن میں آنے دے۔ فرصت کے علاوہ ضرورت بھی نہ تھی۔ ورنہ ضرورت ہو تو زہر بھی تریاق بن جاتا ہے۔ یہ بات بعید از قیاس تھی کہ زرتاب سے جھوٹ کی بھی توقع رکھی جائے کہ وہ خود کو یہاں تک گرا دے گی کہ خالد میں دلچسپی لینے کی اہل ہو جائے۔ قلی کا افلاس اور سرمایہ داری کا وقار اس لائق ہے کہ دنیا کے دو حصے کر دیئے جائیں۔ بہترین حصہ ہر اعتبار سے سرمایہ داروں کے حوالے کیا جائے اور بدترین خطہ قلیوں اور مزدوروں کو دیدیا جائے۔

زرتاب زریں مقسوم لے کر آئی تھی اور اس کے تصور کی شاہراہیں سیم و زر سے ساختہ تھیں۔ وہ مغنیہ تھی اور رقاصہ کی بیٹی تھی نازبرداری کی مزدر طینتی نے اسے شیر کر دیا۔ اس کا حسن وہ قوت تھا جو دل کی کائنات پر لٹھ لئے رہتا۔ محبت اس کے لئے ایک اقتصادی فن تھا جس کے طفیل پیسہ کمانے میں ایک گونہ سہولت رہتی ہے۔

فراغت کے بعد خالد کو گمان ہوا کہ سوٹ کیس والی لڑکی دیکھی ہوئی صورت ہے لیکن اتنے پہلے کی کہ اگر یہ آج نظر نہ آتی تو اس کا گمان بھی ممکن نہ تھا۔ اس کا ایک مبہم سا خاکہ اس کے تحت الشعور میں محفوظ تھا۔ اس نے کسی حد تک دماغ پر زور ڈالا لیکن حافظے نے یاری نہ کی اور معلوم نہ ہوا کہ یہ شخصیت کون ہے۔ بالآخر وہ اپنا کام ٹھکانے لگا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پٹری کے پار ہو گیا اور گھر چل دیا۔

فی الاصل دونوں ایک دوسرے کو آج سے بہت پہلے دو چار مرتبہ دیکھ چکے تھے لیکن اس کا اثر کبھی کا زائل ہو چکا تھا۔ زرتاب نے زیادہ نہیں البتہ اتنا کیا کہ اپنی شان رکھتے ہوئے خالد کا شمہ بھر خیال کیا۔ وہ قلی تھا، زرتاب نے اسے قلی ہی سمجھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں، وہ بدشکل نہ تھا بلکہ خوب شکل تھا اور طبیعت کی رو سے

عام قلی اس کی گرد کو نہ پہنچتے تھے۔ اس میں شرافت کا برتاؤ پڑ رہا تھا۔ زرناب سیکنڈ کلاس میں تھی اس لئے تیسرے درجے کے آدمیوں کا خیال مناسب معلوم نہ ہوا۔ قلی کا خیال زیادہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ اس نے کچھ خیال کیا اور اس پر قدرے اثر ہوا۔ اس لئے کہ قلی کی شخصیت عالی ظرفانہ دکھائی دی سایسے میں اسے چند لمحوں کے لئے قابل اعتنا سمجھنے میں زرناب کے وقار پر حرف آنے کا خدشہ نہ تھا۔

بارش کے بعد نشریات کے لئے فضا ہموار ہو جاتی ہے چنانچہ رات کے وقت جب ہوٹل میں ریڈیو سنا گیا تو زرناب کا گانا بہت اچھی طرح سننے میں آیا۔ خالد مزے سے سنتا رہا لیکن یہ جانے بغیر کہ زرناب اسٹیشن والی لڑکی ہے۔

اس کے بعد زرناب اور خالد کی ملاقات کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ خالد زرناب کو اکثر سفر پر دیکھتا لیکن دونوں کو علم نہ ہوا کہ ایک خالد ہے اور ایک زرناب، اس لئے کہ ان کی ملاقات سطحی طور پر نظر و سماعت تک محدود تھی۔ دل کے پٹ ہنوز کھولے نہ گئے۔ زرناب کو خالد کی امداد سے اسٹیشن پر ہمیشہ آرام پہنچتا اور اس آرام کے عوض اس میں ہمدردی کا جذبہ پرورش پاتا گیا۔ دونوں کی راہ میں سماجی تمیز کی رکاوٹیں تھیں لیکن دل آخر دل ہے۔ رسمی تصنع سے بے نیاز ہے۔ جذبات کے آگے امتیازی تنفر کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ محبت کا تقاضا قلب و جگر کے بہتے سمندر کا وہ طوفانی ریلا ہے جو اپنے راستے کے ہر سنگِ گراں کو بہائے چلا جاتا ہے۔ زرناب نے متعدد بار کوشش کی کہ خالد کو قلی سے زیادہ اور کچھ نہ جانے لیکن اس کی ضمیر اندھی نہ تھی۔ وہ بتدریج دل کے سامنے ختم ہوتی گئی اور قائل ہو گئی کہ قلی ہونا کسی کے انسان ہونے کے خلاف سند نہیں۔ قلی کو ڈھوروں کی صف میں شریک کرنا نظریے کی غلطی ہے۔ قلی میں احساس ہے، درد ہے اور سب لطیف چیزیں ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد وہ وقت آیا جسے محبت کا ماحصل کہا جائے گا۔ زرناب اور خالد باہم ملے۔ اس اولین ملاقات کی شہادت کوئی نہیں دے سکتا۔ صرف بادل کے چند ٹکڑے، آسمان کے تارے اور چاند کو خبر ہے کہ دو دل ایک ہو گئے، دو لب ملے اور دو سانس ہم نفسی کا دم بھرنے لگے۔ ہوٹل کی پشت پر آم کے پیڑوں کا خنک سایہ ان پر پڑتا رہا۔

سماج کی بھیانک آنکھوں سے پسِ پردہ ان ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خالد سائے کے نیچے چٹان پر بیٹھ جاتا اور زرناب آسمانی حور بن کر گاتی اور ناچتی۔ یہ رومان بہشت میں ہو تو ہو ورنہ زمین پر نایاب ہے۔ ایک جانب ہوٹل اور اسٹیشن تھے اور باقی سب طرف آم کے پیڑ اور ویرانہ۔ معلوم ہوتا کہ یہاں حوروں کا مسکن ہے۔

محبت اب بیّن طور سے محسوس ہونے لگی۔ پہلا عمل جو محبت کی کارفرمائی سے ہوا وہ یہ تھا کہ زرناب اور خالد ایک سطح پر آ گئے۔ احساسِ کمتری کا جذبہ ہٹ گیا۔ اب وہ دونوں محبت کی ان دو موجوں کی طرح تھے جو باہم گتھم گتھا ہوتی رہتی ہیں اور الگ نہیں ہوتیں یا ہوتی ہیں تو پھر باہم مل جاتی ہیں۔

محبت کا تار رخسانہ نظروں سے اوجھل رہا۔ کسی کان کو ہوا نہ پہنچی کہ خالد اور زرناب یک جان دو قالب ہو چکے ہیں۔

ڈپٹی صاحب زندگی کے تنزل کی تمام منزلیں قطع کر کے اب آخری منزل پر پہنچ لئے تھے۔ یہاں حسرت و پشیمانی کی ارزانی ہوا کرتی ہے۔ اصل میں زندگی سے انہیں نسبت نہ تھی، وہ انہیں کبھی کی چھوڑ چکی تھی۔ موت دروازے پر آ بیٹھی تھی اور زنجیر در کھٹکھٹا رہی تھی۔ زندگی تبھی ختم ہو جاتی ہے جب دل بیٹھ جائے۔ زندگی امید ہے اور ناامیدی موت۔ موت تو ویسے بھی کمزوروں اور کم فہموں کے لئے موت ہے لیکن ناامیدی اگر موت بن جائے تو عذابِ الیم ہے۔ ڈپٹی صاحب کو ناامیدی کھا گئی تھی، گوشت پوست تو رہا نہیں تھا، فقط ہڈیاں رہ گئی تھیں، سو انہیں بھی چھوڑ رہی تھیں۔ وہ اپنی زندگی کا سوتا اس چشمے کی مانند بہا چکے تھے جسے ریگستان نے جذب کر لیا ہو جب انہیں جینے کی امید نہ رہی تو تمام کیف جاتا رہا، یہی جینے کا حاصل ہے اور ایسے ہی جینے سے زیادہ مرنے کے لئے سازگار ہے۔ انہیں تین موتوں سے پالا پڑا تھا۔ اقتصادی، اخلاقی اور جسمانی، اور ان تینوں کی مجموعی حالت وہ ذہنی پریشانی تھی جس میں مرنا بدترین موت ہے۔

الماس وہ زہر آلود تیر تھا جس نے کھٹک کھٹک کر ڈپٹی صاحب کے پہلو اتنے زخمی کر دیئے کہ موت کے سوا کوئی مرہم نہ رہا، چنانچہ وہ مر لئے۔ بہت کم آنکھیں نمناک ہوئیں، بہت کم آہیں بھری گئیں۔ بہت کم پہلو تڑپے اور بہت کم دامن تر ہوئے۔ الماس کے دل پر خراش بھی نہ آئی۔ اس کے لئے یہ موت ناگوار نہ ہوئی۔ کسی ایک کو اس نے مارا اور کسی ایک اس پر مر مٹے۔ مرنے والوں کی فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔ دکھاوے کی غرض سے اس نے سوگ منایا لیکن دلوں کا مالک جانتا ہے کہ اسے غم نہ ہوا تھا۔

ڈپٹی صاحب کی موت ایک ہوا کا جھونکا تھا جو سن سے گزر گیا، وہ نہ تو الماس کو کپکپا سکا نہ گھبرا سکا۔ لیکن جب ثریا کی جانب آیا تو وہ لرز گئی۔ دھوکے کی المناک داستان اور اس کا عبرتناک عنوان سامنے تھے۔ ثریا نے افسوس نہیں کیا بلکہ خود سراپا افسوس بن گئی۔

اس کی زندگی کا ناٹک ختم ہوگیا تھا اس میں مزید ایکٹ کی ضرورت نہ تھی ڈپٹی صاحب اس ناٹک کے ہیرو تھے اور انہی سے شورشِ حیات وابستہ تھی ہیرو کے بعد باقی کرداروں کی اہمیت جاتی رہتی ہے۔ ثریا کا ہونا نہ ہونا غیر اہم تھا۔ اب خالد رہ گیا تھا جو ماں کا آخری سہارا تھا! اس نے ماں کو بے غم کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ماں کا بارِ غم ہلکا ہو جاتا جب وہ خالد کو جوان دیکھتی۔ جوانوں کی فکر کرنا بیکار ہے کیونکہ جوان اپنے ارادے کا خود [illegible] ہے اور وہ سب کچھ کر گزرتا ہے۔ وہ دوسروں کے لئے زندگی کا سامان ہے۔

ڈپٹی صاحب تو مٹ ہی چکے لیکن الماس بھی زندہ نہ رہ سکی۔ وہ رباب جس کے شباب آفریں نغمے پیامِ عشرت تھے اس کے تار ٹوٹ رہے تھے۔ جو شمع پروانوں کو اندھا کر دیتی تھی اب یہ خود ٹمٹمانے لگی تھی۔ جوانی کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور عاجزی کا شکنجہ سخت سے سخت تر ہوا جا رہا تھا۔ اس ایسی خزاں دیدہ شاخ کو آری سے کاٹ دیا جائے تو اچھا ہے۔ سانپ اگر مردہ ہو تو بھی اسے لاٹھی مارنا واجب ہے اور زندہ ہو تو فرض ہے جس سانپ نے ہزاروں کو ڈسا ہو اب اسے زمانہ نہ ڈسے تو کیونکر انصاف ہو۔ اس کا آخری عصا زرناب تھی۔ وہ مرنے سے پہلے پہلے اپنی زندگی کا جوہر زرناب کی رگوں میں سرایت کر سکتی تھی۔ اب اتنی فرصت تھی کہ وہ زرناب کے حلق میں اپنا زہر اگل دے اور اسے ناگن بنا دے۔ یہ ایسی آرزو تھی کہ اس کے سامنے تمام آرزوئیں ہیچ تھیں۔ الماس اسی کی آرزومند ہوگئی اور پوری شدت سے اس نے چاہا کہ زرناب ناگنوں کی ملکہ بن جائے اور اس کا تنفس اس قدر مسموم ہو کہ بن چھوئے ڈس لے۔

الماس نے خوب نگرانی کی اور زرناب کے حواس و جذبات کی ہیئت بدل دی۔ پتھر اور کوئلہ الگ الگ سہی لیکن جوہر ایک ہے اور وہ غیر تبدل ہے طینت کا تغیر کسی کے بس میں نہیں۔ چنانچہ الماس نے طینت کے سوا اور سب کا نقشہ بدل دیا۔

خالد اور زرناب کی ملاقاتیں کم ہوگئیں پر کٹے کبوتر پھڑک کر رہ جاتے ہیں۔ دونوں پھڑک کر رہ گئے۔ ایک چنگاری تھی جو راکھ تلے دب گئی اور کریدے بغیر نہ نکل سکتی تھی۔ ہوا کا رُخ بدل گیا اور محبت کی ناؤ الٹی سمت چلنے لگی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ تھم گئی۔

زرناب اپنی ماں کی گرفت میں تھی۔ اس کے لرزنے، کپکپانے اور آہ بھرنے تک اس کی نظر رہتی۔ اسے رقاصہ بننا تھا، الماس نے اسے رقاصہ بنا دیا۔ نئی زندگی میں داخل کرنے کے لئے الماس نے اس معمار کا عمل کیا جو تراش خراش کر گرانیٹ پتھر اپنے مطلب کے بناتا ہے۔ زرناب کے اختیارات چھو گئے، اس کی ہر حرکت جبر بن گئی۔ اس کے رگ و پے میں الماس کا منشا کارفرما ہوگیا۔ الماس کی نگرانی قیدِ فرنگ سے زیادہ ہول انگیز تھی۔

زرناب نے رقص میں مہارت حاصل کر لی۔ اس کے جسم کا لوچ دیکھ کر خیال آتا کہ شاید اس کا گوشت پگھلا لیا گیا ہے اور ہڈی نکال دی گئی ہے۔ اس کی حرکت میں چیتے کی چستی تھی۔ کنول کا رقص کرتی تو پانی پر حسن متحرک ہو جاتا۔ اور وہ سیلِ نور بن جاتی۔

پہلے ہی سے سینہ بہ سینہ شہرت ہو چکی تھی کہ گل اندام، پری تمثال زرناب دلفریب انداز میں رقص کرتی ہے اور کسی روز عام نگاہوں کے سامنے جلوہ افروز ہوگی۔ آنکھیں منتظر تھیں، دل مضطرب اور حواس سربسر انہماک تھے۔ آخر وہ روز آ لیا۔ جل پری کا شہر میں رقص کا دن نزدیک تھا، کنول کا رقص تمناؤں کا سیلاب بن گیا۔ شہر کا ہر ذرہ بیدار، بلکہ بیتاب ہوگیا۔

الماس کی آرزو آج پہلا قدم اٹھانے کو تھی۔ گو اس میں سکت نہ رہی تھی تاہم اسے مرنے کی خواہش نہ تھی۔ عرصے سے اسے مارفیا کے ٹیکے لگوانے کی لت پڑ گئی تھی جس سے وہ روز بروز لاغر ہوتی گئی تھی۔ ادھ موئی تھی مگر ڈسنے کے لئے ادھ موئی ناگن بھی کم نہیں، وہ خوش تھی کہ زرناب نے اس کی جگہ لے لی ہے اور الماس کی جانشینی کر سکے گی۔ اب وہ ٹھیک شیطان کا تراشا ہوا مجسمہ تھی، اس کے سانس میں الماس کی حرارت تھی، اس کے کالبد میں الماس کی جان تھی اور اس کی رگوں میں الماس کا زہر تھا۔ الماس نے اصلی زرناب کو ہلاک کر کے نئی زرناب کا وجود پیدا کیا تھا۔ اس نئی زرناب کے گوشت پوست میں بدبو سرایت کر گئی تھی۔

فن اپنے درجۂ کمال پر الوہیت ہے لیکن ادنیٰ درجے پر اس میں ابلیسیت کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ الوہیت نوازی فکرِ رسا کی بلندی ہے اور ابلیسیت پرستی جذبات کی پستی ہے اور یہی سکہ رائج ہے۔

زرناب کا کمال ہوس زادوں کی تسکین کے لئے تھا اور وہ بھی فقط جذباتی تسکین کے لئے، مستقل تسکینِ جذبات کی قلمرو میں ناپید ہے۔ الماس دل شناس تھی۔ اس کا منشا یہ تھا کہ زرناب دل کا نشانہ کر سکے۔ پھر لوٹنا آسان ہو جاتا ہے۔ جب تک دل نشانہ نہ بنے آدمی قابو میں نہیں اور جب بن جائے تو وہ گیند ہے، ٹھوکریں مار مار کر دھجیاں بکھیر دو۔

الماس نے پہلے رقص کی تیاری مکمل کر لی تھی، تاہم اس نے آخری بار آزمائش کرنے کی غرض سے گھر کے مدوّر مرمریں حوض میں زرناب کو اُتار دیا۔ حوض رات کے وقت تہ میں چمکتے ہوئے رنگین قمقموں سے جلوہ افروز تھا۔ زرناب جل پری ہو گئی۔ اس کی سیماب حرکتیں پانی میں مختلف اللونی میں موجیں پیدا کر تی گئیں۔ ایک کائناتِ سحر تھی جو لرزہ براندام تھی، ایک لطیف زندگی تھی جو متحرک رہی تھی۔ جب اس کا لباس جو اُسے حسبِ ضرورت نیم عریاں کرتا تھا، پانی سے بھیگ گیا تو زرناب پانی میں تھی۔ اس میں ہوا بھر گئی اور پھول کر سطحِ آب پر کنول کا پتا لہر گیا۔ زرناب کا اوپر کا دھڑ اس پیالے میں تھا اور وہ کنول کی شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔ الماس نے فاتحانہ تبسم کے ساتھ تالی بجائی۔

یہی رقص تھا جس کے لئے جذبات کی دُنیا میں بے کلی تھی۔ الماس نے رقص گاہ کے لئے زرناب کے پہلے رقص کا عہدنامہ لکھ دیا۔ عنقریب ہی اس کے پہلے رقص کا اعلان کر دیا گیا اور یہ اعلان برقی سُرعت سے پھیل گیا۔ تمناؤں نے استقبال کیا۔

جب یہ خبر ہوا کے طوفان کی طرح ہر سمت پھیل گئی تو اسٹیشن کے غریب قلی تک بھی پہنچی۔ وہ اب بھی حسبِ سابق خوابوں کے اس جزیرے میں بستا تھا جہاں اکنیوں کے انبار لگے تھے۔ وہ بدستور بوجھ اُٹھاتا اور پوری تندہی سے بوجھ اُٹھاتا۔ ظاہر میں وہ قلی تھا لیکن باطن میں ایسا آتش فشاں پہاڑ تھا جس میں اُبلتے ہوئے لاوے کا ذخیرہ تھا اور جس کا آتشیں دھواں اس کے نتھنوں سے ہر وقت نکلتا رہتا تھا۔ رات کے وقت ہوٹل کی پُشت پر آم کے ان پیڑوں میں چلا جاتا جہاں کبھی زرناب کے دم سے آشیانہ نُور تھا۔ اس ویرانے کو تصور سے آباد کرتا اور زرناب کی ان مُلاقاتوں کو دُہراتا جو اس کے نزدیک اُمید کے اعتبار سے تو شاید دُہرانے میں آ جائیں لیکن ویسے ان کا امکان گمان کی حد سے باہر تھا۔

اگر دُنیا سے اُمید کا وجود اُٹھ جائے تو انسان عمل کے سوا اور کسی کمتر شے پر تکیہ نہ کرے، ایک دُنیا اُجڑ جائے لیکن عمل کی دُنیا طاقت پکڑ جائے۔

زرناب کے لئے حوض تعمیر کیا گیا۔ الماس کو اس حوض کا جائزہ لینا تھا۔ اس کی گہرائی اور گولائی انداز سے کم و بیش نہ ہونا چاہیئے۔ رقص کا دار و مدار اسی پر تھا۔ الماس کے فرمان پر شوفر نے گاڑی باہر نکالی اور وہ اس میں بیٹھ گئی۔ اس کی آرزو تھی کہ زرناب کا پہلا رقص ناکام نہ رہے۔ کامیاب ہوا تو روپیہ چھت پھاڑ کر برسنے لگے گا اور پھر زرناب کسی مرد کے ٹکڑوں پر پڑنے کی حاجت نہ ہو گی ایسے میں مرد اس کے پاؤں کا جوتا بنا رہے گا جسے وہ پاؤں سے دبا رکھے گی۔

شوفر نے واکس ہال چلائی اور رفتار آندھی سے کچھ ہی کم رکھی۔ الماس نے رفتار گھٹانے کی تاکید کی۔ اسے حادثے کا خدشہ رہنے لگ گیا تھا اور وہ ہمیشہ گاڑی کو سُست رفتاری سے چلاتی۔ مارثیا نے اس کا دل اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ ذرا سی دھمک سے شدید صدمہ پہنچ سکتا تھا۔ شوفر نے رفتار گھٹا دی، لیکن پھر رفتار بڑھ گئی۔ الماس نے دل پر ہاتھ رکھ کر شوفر کو ٹوکا اور جھڑکا۔ شوفر نے رفتار گھٹا دی۔ پھر یکایک بڑھا دی اور گاڑی کو ہوا کا تیر جھکڑ بنا دیا۔ الماس گھبرا سی گئی۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھ لیا، تھوڑے ہی فاصلے پر اسٹیشن کا چوک تھا۔ شوفر نے پھرتی سے موٹر گھمائی اور جھٹ روک دی۔ زور سے دھچکا لگا اور موٹر اُلٹتے اُلٹتے رہ گئی تاہم بجلی کے کھمبے سے جا کر لگی۔ الماس نے چیخ کے لئے مُنہ کھولا لیکن مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ الماس نے دل تھام رکھا تھا لیکن دل دھڑکنے سے باز تھا۔ یہ ڈپٹی صاحب کے کامیاب انتقام کی سازش تھی۔ شوفر نے وہ نوٹ جیب میں رکھ لئے جو ایک قلی اسے چُپکے سے پکڑا گیا۔

رقص مُلتوی ہوا لیکن ایک شب ہوٹل کی پُشت پر آم کے پیڑوں میں زرناب کا پہلا رقص ہوا۔ روشنی کا انتظام رقص گاہ سے کہیں بہتر تھا۔ ماہتاب نے نُور فراہم کیا تھا اور ہوس زادوں سے کہیں بہتر قدر شناس تماشائی کمالاتِ رقص کی داد دینے کے لئے تھا۔ خالد کہنیوں پر تھوڑی جمائے ٹیلے پر بیٹھا تھا اور زرناب رقص کئے جا رہی تھی۔ زرناب اپنی مُدت تک خالد سے جُدا رہنے کے بعد کنول بن گئی تھی۔ خالد نے اسے کنول بنتے دیکھا۔ وہ پہلے سے زیادہ دلفریب اور ذی رُوح تھی۔

لیکوریا کی بیمار عورت



جب عورت سیلان الرحم کے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس کے خفیہ جسم سے ہر وقت یا کبھی کبھی سفید پانی (لیسدار سفید رطوبت) خارج ہونے لگتی ہے یہ مرض عورت کی جوانی کے لئے زہر ہے اور اس کا فوراً علاج کرانا ضروری ہے۔ ورنہ رفتہ رفتہ عورت کی جوانی ختم ہو جاتی ہے وہ سفید پانی دراصل جوانی کا جوہر ہوتا ہے۔ پس اگر کسی عورت کے خفیہ جسم سے سفید رطوبت وقت بیوقت خارج ہوتی ہو اور وہ ہر وقت جسم میں ایک تکلیف اور بے چینی محسوس کرتی ہو تو اسے چاہیئے کہ سب کام چھوڑ کر اس کا فوراً علاج کرے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ

زنانہ دواخانہ ۔ ایس پی ۳۲۸ دہلی

غزل

از:- جناب کاظم اسرائیلی

اے باعثِ صد خوبی اے وجہِ شکیبائی
تو نورِ مجسم ہے میں حسن کا شیدائی

وہ سیرِ چمن میں ہیں عالم ہے تماشائی
گلشن کی بہاروں میں اک اور بہار آئی

ہاں دیکھ شبِ ہجراں میری نہ ہو رسوائی
ہو صبح بخیر اپنی اے مونسِ تنہائی

بیمار مر چکا ہے عالم ہے تماشائی
کام آئیگی پھر کس دن یہ تیری مسیحائی

جذبات کچھ ایسے ہیں اس حسن و محبت کے
توڑا جو گلِ رنگیں بلبل کی صدا آئی

بے پردہ کسی صورت وہ سامنے آجائیں
اک میں ہی نہیں کاظمؔ عالم ہے تمنائی

آج کل

از:- جناب سردار جمیل احمد خاں جمیلؔ شیرکوٹی

جوشِ جنوں میں چاک گریباں ہوں آجکل
حیراں مثالِ دیدۂ حیراں ہوں آج کل

پڑھ لے جو چاہتا ہو کہ بیٹھا ہوں رو برو
میں داستانِ عشق کا عنواں ہوں آج کل

خود اپنی مشکلوں سے کہاں ہے مجھے نجات
تیرے کرم سے اور پشیماں ہوں آج کل

اے گردشِ فلک ذرا مہلت تو کر عطا
میں زندگی سے دست و گریباں ہوں آج کل

ساقی بھی ہے شراب بھی ہے وہ بھی مہرباں
مجبوریاں ہیں مائلِ عصیاں ہوں آج کل

جدید ایرانی شاعری

مختصر تبصرہ

از جناب میرزا محمد بشیر ایم۔ اے

ایران میں آقا محمد خان قاچار (۱۷۹۷ء) کے زمانے سے عہد جدید کا آغاز ہوا اور اسی دَور سے فارسی زبان و ادب میں انقلاب کی ابتدا ہوئی۔ زبان تکلف و تصنع سے آزاد ہوئی۔ اور جذبات و احساسات سادہ، شستہ و عام فہم زبان میں ظاہر کئے جانے لگے۔ فارسی شاعری عرفی و صائب کے طرزِ بیان سے دامن کش ہو کر رودکی، فردوسی و رومی وغیرہم کے اسلوبِ سخن کا دم بھرنے لگی۔ اس ابتدائی جدید دور کے ممتاز شعرا نصیر الدین شاہ قاچار، نشاط، ابو القاسم، قاآنی، عندلیب، وغیرہم ہیں۔ اس اصلاحی دَور کی دو مشہور و معروف ہستیوں کا ذکر ہم یہاں کریں گے۔ قاآنی کا نام مرزا حبیب ہے۔ شیراز میں پیدا ہوا۔ علوم درسیہ کی تحصیل کے بعد شاعری اختیار کی۔ چند فرانسیسیوں کی صحبت میں فرانسیسی زبان پر بھی کافی عبور حاصل کیا۔ شاہانِ ایران نے ان کی بڑی قدر دانی کی۔ ناصر الدین قاچار نے ان کو "ملک الشعرا" کا خطاب عطا فرمایا۔ انتقال ۱۸۵۴ء میں ہوا۔

قاآنی جدید فارسی شاعری کا علمبردار ہے۔ اس نے شاعری کا دائرہ وسیع کیا۔ اور ہر قسم کے واقعات لکھے۔[1] فطری تشبیہات، متروک الفاظ کا بے تکلف استعمال اور واقعہ نگاری اس کا حصہ ہے۔ اس کے طرزِ بیان میں الفاظ کی بہتات اور مرادف الفاظ کا اجتماع ہی نہیں بلکہ صفائی، روانی اور سلاست قیامت کی ہے ؎

بحکمِ شرعِ احمدی رواست اجتناب او
وگرنہ بہرِ ستر رُخ چہ لازم اجتناب او
حیائے او حجابِ او عفاف او نقاب او
وگرنہ شرم او بدی حجابِ آفتاب او
شعاعِ نورِ طلعتش شگافتی جدار را

یکے بر لالہ پا کوبد کہ ہے بے رنگ مے دارد
یکے از گل بوجد آید کہ وہ وہ بوئے یار آید

---

[1] شعر العجم۔ پنجم۔ صفحہ ۲۲۲

الا یا ساقیا مے دہ بجانِ من بیا پے دہ
دمادم مے خوروں مے دہ کہ مے ترسم خمار آید

اسی عہد کا دوسرا مشہور شاعر عندلیب ہے۔ میر تقی عندلیب کی شہرت کا سبب ان کی غزلیں ہیں۔ جن میں اخلاقی اور عاشقانہ و فلسفیانہ خیالات سلیس و شُستہ زبان میں پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً

یک زلیخا بہ مصر اگر گشت اسیر ؛ یوسف ماست کہ یک شہر زلیخا دارد
ہر کہ از کوئے محبت بکنارفت زنست ؛ مرد آنست کہ گر سر بہ دہد پا دارد

یہ تو عہدِ جدید کا ذکر تھا جس میں جدید شاعری کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ اس کے صحیح خدوخال ۱۹۰۶ء سے ظاہر ہوئے۔ یہ وہ سال ہے کہ جب ایران میں وطن پرستوں نے استبدادی حکومت کے خلاف ایک انقلابِ عظیم برپا کیا۔ آخر کار استبداد کا خاتمہ ہوا۔ اور مشروطہ پارلیمنٹ کی ابتدا ہوئی۔ اس قومی جدوجہد کے زمانے سے وطنیت و حریت کے جذبات نظم کئے جانے لگے۔ جدید شاعری کی رُوحِ رواں وطن پرستی ہے۔ بہار مشہدی، پور داؤد، اشرف گیلانی، عارف قزوینی وغیرہم جیسے انقلابی شاعروں نے اپنے آتشیں کلام سے ملک و ملت میں وطن پرستی کی آگ لگا دی۔ ملک الشعرا بہار مشہدی استبداد کے خلاف زہر اگلتا ہے ؎

با شہ ایران ز آزادی سخن گفتن خطاست	کارِ ایران با خداست
مذہبِ شاہنشہِ ایران ز مذہبہا جداست	کارِ ایران با خداست
ہر دم از دریائے استبداد آید بر فراز	موجہائے جاں گداز
زیں تلاطم کشتیٔ ملت بگرداب بلاست	کارِ ایران با خداست

مشروطہ کی تعریف کرتے ہوئے شرف الدین اشرف گیلانی کہتا ہے ؎

مشروطہ نیست پر از میوہ و اثمار بہ عدلیہ و انصاف و مساوات در اظہار
قانون اساسی است درو ناظر ہر کار بہ فرقے بہ میان غنی و شاہ و گدا نیست

۱۹۰۹ء میں احمد شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر میرزا علی اکبر خاں

نے یہ مستزاد کہا تھا جس میں مشروطہ کے متعلق فرماتے ہیں ؎

اے شہنشاہ جواں اشیرین جنگ اور نگرد نگر عالمے دیگر نگر
ملت را راحت از مشروطہ سرتا سر نگر در نگر عالمے دیگر نگر
داد خواہی کن درین مشروطہ چوں نوشیروان جہاں رخش ہمت جہاں
وانش ما والا تبار از دارا و سکندر نگر در نگر عالمے دیگر نگر

جدید شعراء کے نقطۂ نظر سے حب وطن کا جوش عیاں ہوتا ہے
ان کے خیالات کا مرکز وطن ہے۔ پور داؤد کہتا ہے ؎

ما نہ ہمی سر ایدار محور وگر بند غلامان ۔ ہمیں مائیم وطن را نبود نظیر کار رم
از غیرت پور داؤد در سینۂ عشق ایران بد نماں وست شعلہ خیز دز ہمشعاء ابدا ارم

ان شاعروں نے اہل وطن کو وطن کی بربادی و خستہ حالی سے
آگاہ کیا۔ اور یہ کہہ کر غیرت دلائی۔ کہ وطن کی تباہی سے اسلام کی بدنامی
ہے۔ اشرف ایک مستزاد میں کہتا ہے ؎

تنہا نہ ہمیں گشت وطن ضائع و بدنام گمنام شد اسلام
پژمردہ شد ایں باغ و گل و سرو سمن وائے ایوائے وطن وائے

———(٭)———

اسلام رفت غیرت اسلامیاں چہ شد ۔ ناموس رفت ہمت اسلامیاں چہ شد
دست الغیاث رنگینی بستاں چہ شد ۔ اے تیرہ بخت دست زپیکر جدا وطن
بے کس وطن، غریب وطن، بے نوا وطن

جعفر تبریزی مصائب سے گھبرا کر ایک نعرہ لگاتا ہے۔ ؎

تا چند بخوابی بکشا چشم خود از ہم ۔ برخیز یکے صولت شیرانہ نشاں دہ
یا جان بستان یا کہ دریں معرکہ جاں دہ

پور داؤد قوم کو دعوت عمل دیتا ہے۔ وہ اپنے جمود آشنا معاشرہ
کو متحرک کرنا چاہتا ہے۔ یہ سادے سادے الفاظ ہیں۔ مگر سچے جوش
اور الفت صادق سے بھرے ہوئے۔ ؎

بہر وطن بجہان بکوشیم ۔ وز بزم بسان پیل بجوشیم
چوں شیر و زرم بہم بخروشیم ۔ گر دشمنے اژدر و پلنگ است
برخیز ز خواب، وقت تنگ است
بشتاب کہ روز رزم و جنگ است

یہی شاعر ایک دوسرے مقام پر نہایت پُر ترنم بحر میں کہتا ہے

از پے حیت چنیں بے چارہ شدیم ۔ کوتہ دست و غمخوار شدیم
خانہ خود آوارہ شدیم ۔ نادیدہ چو ماکس دربدری
ہیہات مدد ی مولا نظری

دورِ جدید میں فنائیہ شاعری بذات خود ایک صنف قرار دی گئی
ہے۔ بعض نظمیں گراموفون ریکارڈ میں بھی ضبط کی گئی ہیں۔ اور اسکول
کے طلبہ کو زبانی یاد کرائی جاتی ہیں۔ اس صنف شاعری میں بھی وطن
پرستی کے جذبات کارفرما ہیں۔ عبدالعظیم خان گرگانی کی مشہور نظم
"وطن" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے وطن اے منتخب تو آئین من ۔ دوستیت کیش من و دین من
دولت و اقبال تو پائندہ باد ۔ نام بلندت بجہاں زندہ باد

جدید شاعری کی ایک خصوصیت طنزیہ نظمیں بھی ہیں جو کافی مقبول
ہوئیں۔ اشرف الدین رشتی کی ایک مشہور نظم کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

اے فرنگی! ما مسلمانیم جنت مال ماست
در قناعت حور و غلماں، ناز و نعمت مال ماست
اے فرنگی! اتفاق و علم و صنعت مال تو
عدل و قانون و مساوات، عدالت مال تو
نقل و عالمگیری و جنگ و حلاوت مال تو
حرص و بخل و کینہ و بغض و عداوت مال ماست

اشرف گیلانی اپنے عہد کے طریقۂ تعلیم سے بیزار ہو کر کہتا
ہے ؎

روز ایں اطفال را چوں شب مکن ۔ نام زنداں خانہ را مکتب مکن

وہ اشیا جو یورپ سے ایران میں پہونچیں۔ ان پر بھی نظمیں
کہی گئیں۔ چنانچہ مرزا غلام رضا خان روحانی کی نظم دوچرخہ (بائیسکل)
کے یہ اشعار دیکھئے ؎

مرکبے دارم و ایں طرفہ کہ باشد خود رو ۔ نہ علف خواہد نہ یونجہ و نہ کاہ و نہ جو
چار شاخ است و دو زاد و بالا دو زیر ۔ تا با نہ بہانہ ہم دست نگردد پیرو

اس قسم کی بیانیہ نظموں میں واقفیت و حقیقت کا پہلو نمایاں
ہوتا ہے۔ سائیکل کی گھنٹی کے متعلق فرماتے ہیں ؎

خود زند بانگ چو انگشت بگوشش بزنم
خود کند بہر خبر دار چو سگ ہا عو عو

فارسی زبان ایک زمانے سے یورپ کی زبانوں سے متاثر
ہوتی رہی ہے۔ اور بالخصوص فرنچ کا اثر بہت زیادہ ہے بے شمار
یورپین الفاظ جزو زبان بن گئے ہیں۔ مثلاً:

بروجرام	Programme
ماژورتیہ	Majority
بانک	Bank
دکتر	Doctor

...صورت

... شاعری میں یہ مغربی زبانوں کے الفاظ بکثرت استعمال کئے جاتے ہیں ؎

روز و شب از شش جہت توپ مسلسل در نوا
چوں کبوتر صعف زدہ ایمرپلا نہا در ہوا

—(۰)—

گرزنی سے بیم از دریا بساحل تلگراف
گر کنی غلق طراما فون و سینماتوگراف

وہ اضافِ سخن جن کو جدید دور میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ حسب ذیل ہیں:۔

مسمط۔ ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد، غزل، ان کے علاوہ "سانیٹ" بھی کہے جاتے ہیں۔ اور اکثر یورپی بحروں میں بھی طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ جدید ایرانی شاعری کی وسعتیں اور رسائیاں مستقبل میں کیا ہوں گی؟ اس کا اندازہ ابھی نہیں لگایا جا سکتا۔

—(۰)—

شاہی دفینہ

حیرت انگیز تاریخی افسانہ

از شبلی - بی - کام

شاہ سعادت علی خاں تاجدار اودھ کے مقبرے کے اردگرد لکھنؤ میں ایک ڈھلوان سبزہ زار ہے جس میں چند فرنگی سپاہیوں کی ایک یادگار قائم کی گئی ہے۔ یہ سپاہی آج سے نوّے برس قبل ایک آتشگیر مادّے کو ضائع کرتے وقت لقمۂ اجل ہوگئے تھے۔ اس یادگار کے قریب ہی مقبرۂ تاجدار اودھ کے عقب میں باریک بیں نگاہوں کو دو نگین کتبے نظر آسکتے ہیں جن کے قریب صبح کے وقت سفید ساڑھی میں ملبوس ایک تپلی دُبلی سی عورت کھڑی ہوتی ہے جو ان قبروں پر چمپا کے نوشگفتہ پھول نچھاور کرکے ہاتھ اٹھا کر دعا کرتی ہے۔ پھر باوقار قدموں کے ساتھ خاموشی سے واپس چلی جاتی ہے۔ یہ عورت شاہان اودھ کی براہ راست اولاد میں سے غالباً آخری یادگار ہے۔

۱۷۹۶ء میں ایک شخص محمد علی بادشاہ نے اودھ کی گدی پر ناجائز قبضہ کرلیا۔ لیکن ابھی وہ چند ماہ ہی حکومت کرپایا تھا کہ اسے تاج و تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ کیونکہ اب حقیقی وارث نواب سعادت علی خاں کے لئے میدان صاف ہوچکا تھا۔ اور اس نے تھوڑی سی کوشش کے بعد غاصب کو شکست دیکر سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ نواب سعادت علی خاں چونکہ ابھی نوعمر تھا اس لئے حکمرانی کے اکثر فرائض شاہی خاندان کی ایک تجربہ کار بیگم کے سپرد تھے۔

نوجوان نواب نے اپنی زندگی کا آغاز شاہی خزانے کو دیوانوں کی طرح لٹانے سے کیا۔ تاہم بیگم نے ہوشیاری اور دوربینی سے کام لے کر دولت کا اکثر حصہ پس انداز کرلیا۔ اور نہایت رازداری سے اسے کہیں چھپا دیا۔ آہستہ آہستہ جب نواب کو اپنی وسیع ذمہ داریوں کا احساس ہوا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ شاہی خزانہ کے صندوق قریباً خالی ہوچکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اخراجات کی تقسیم میں اس نے بے پروائی سے کام لیا تھا لیکن شاہی خزانہ کی مقدار اتنی کم نہ تھی کہ اس کی فضول خرچیوں کی متحمل نہ ہوسکتی۔ اُسے شُبہ ہوا کہ بیگم نے اپنی ذاتی ضروریات کے لئے شاہی خزانہ پر ہاتھ صاف کرلیا ہے

یا جاسوسوں پر ضرورت سے زیادہ رقم صرف کردی گئی ہے کیونکہ یہ لوگ شاہی محل کے عیش وعشرت پر شہریوں کے ردّعمل کی اطلاع میں فراہم کیا کرتے تھے۔ اور انھیں اس مقصد کے لئے گرانقدر معاوضے دیئے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک روز نواب اس گتھی کو سلجھانے کے لئے بنفس نفیس بیگم کے کمرے میں گیا۔ بیگم نے اُسے دیکھتے ہی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اپنے گونگے حبشی خادم کو حکم دیا کہ وہ کمرے سے باہر ٹھہرا رہے تاکہ کوئی اور شخص ان کی باتیں نہ سُن سکے۔ اس کے بعد نواب سے مخاطب ہوکر بولی۔

"سنو میرے بچے! میں جانتی ہوں آج کل تم سوچ رہے ہو کہ شاہی خزانہ خالی کیوں نظر آرہا ہے۔ لیکن یہ خیال حقیقت سے کوسوں دور ہے تم جانتے ہو کہ جس تخت پر تم بیٹھے ہو وہ اتنا محفوظ اور نرم ونازک نہیں ہے جتنا نظر آسکتا ہے۔"

پھر اس نے اپنے بھتیجے کو تھپتھپا کر نواب کی طرف جھکتے ہوئے کہا "میں ہر ہفتے اور ہر مہینے شاہی خزانے میں سے ایک مٹھی بھر اشرفیاں اور جواہر نکال کر ایک ایسی جگہ چھپا کر رکھتی رہی ہوں جس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں ہے۔ دو چار روز کے بعد جب آسمان پر پورا چاند چمکیگا تم میرے ساتھ چلنا میں تمھیں وہ جگہ دکھاؤنگی اور ہم وہاں تھوڑا سا اور خزانہ محفوظ کر آئیں گے اگر بدقسمتی سے تم تاج وتخت کے مالک نہ رہو تو یہ خزانہ تمہاری عمر بھر کے لئے کافی ہوگا۔"

"یہ بڑا اچھا کیا تم نے خالہ!" نوجوان نواب نے خوش ہوکر کہا اور وہ دونوں اُٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

جب ان کے قدموں کی چاپ شاہی محل کے ہنگاموں میں گم ہوگئی تو ایک ننھے سے سَر نے تکیوں کے پیچھے سے ابھر کر اس صوفے پر نگاہ ڈالی جہاں نواب اور بیگم تھوڑی دیر پہلے ہی ایک رازدارانہ گفتگو میں مصروف تھے یہ سر ایک چھوٹی سی لڑکی کا تھا جو اسی کمرے کے ایک کونہ میں دبک کر پڑی سو رہی تھی اور بیگم کو اس کی موجودگی کا علم نہ تھا۔ جب لڑکی نے دونوں

کی بیٹی بیٹی تو اس کی آنکھ کھل گئی اور اب وہ ان کے جانے کے بعد اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

بچوں کے پیٹ میں بھلا کوئی بات کب ٹھہر سکتی ہے۔ روشن آرا بھاگی اپنے باپ کے پاس گئی جو نواب کا سوتیلا بھائی تھا اور بلا کم و کاست جو اس سے سنا تھا کہہ دیا۔

"ابا جی! ابا جی!" وہ بولی۔ "میں اس کمرے میں پڑی سو رہی تھی کہ نواب آگئے اور بیگم فاطمہ سے باتیں کرنے لگے۔ میری آنکھ کھل گئی تاہم میں چپکے سے پڑی رہی۔ اتنے میں بیگم صاحبہ نے کہا اگر تمھارا تاج و تخت چھن جائے تو فکر نہ کرنا۔ میں نے کافی سونا چاندی جمع کر رکھا ہے۔ دو چار روز کے بعد جب پورا چاند ہوگا تو میں تمھیں وہ پوشیدہ جگہ دکھاؤں گی جہاں خزانہ دفن کیا گیا ہے اور ہم وہاں کچھ اور خزانہ بھی رکھ کر آئینگے۔"

"سچ کہتی ہو بیٹی ؟"

"اچھا آپ دو چار روز ٹھہر جایئے۔ پورے چاند والے دن آپ کو میری بات پر خود بخود اعتبار آ جائے گا۔"

چنانچہ یہی ہوا جب ماہِ کامل اپنی تمام تر تجلیوں کے ساتھ روئے فلک پر طلوع ہوا تو دو سایہ نما صورتیں چھتر منزل محل سے نکل کر وسیع باغ کو عبور کرنے لگیں اور ان کے پیچھے پیچھے روشن آرا کا باپ بھی درختوں کی اوٹ میں چھپتے چھپاتے روانہ ہوا۔ انھوں نے قیصر باغ کے محلات کا رُخ کیا۔ صرف ایک مرتبہ اگلی دو صورتوں میں سے ایک نے تامل کیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے بعد دونوں آگے بڑھتے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک لکڑ ہارے کی جھونپڑی کے پاس پہنچے اور بغیر دروازہ کھٹکھٹائے اندر داخل ہو گئے۔ چند لمحوں کے بعد تیسرا آدمی بھی جھونپڑی میں جا پہنچا۔ پانچ منٹ تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد فضا میں ایک خوفناک چیخ گونجی اور اس کے ساتھ ہی پہلے دو آدمی قریب کی ایک دوسری جھونپڑی میں سے نکلتے دکھائی دیئے۔ وہ اپنے محل کی طرف واپس آ رہے تھے۔

اگلے دن سارے شہر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ بادشاہ کا سوتیلا بھائی راتوں رات کہیں غائب ہو گیا ہے۔ روشن آرا یہ اطلاع سنتے ہی لرز گئی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہی اپنے باپ کی موت کا باعث ہے تاہم اس نے اپنی زبان پر تالہ لگا لیا اور خاموش رہی۔

چند ماہ بعد روشن آرا کی شادی قرار پا گئی۔ لیکن وہ راز ابھی تک اس کے سینے میں محفوظ تھا۔ آخر بیگم اور نواب دونوں کلکتے سے اُڑانے کے بعد راہی عدم ہو گئے اور جہاں تک روشن آرا کا خیال تھا یہ راز بھی ان کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو گیا۔ روشن آرا خود بھی جوان ہو کر بوڑھی ہو گئی۔ اب اسے محسوس ہوا کہ یہ راز ایک ایسا بوجھ ہے جس کو کہیں نہ کہیں اُتارنا ہی پڑیگا۔ چنانچہ اس نے شاہی دفینے کے راز کو اپنی یادداشت کی کتاب میں درج کر دیا۔

جب وہ مر گئی تو اس کے بیٹے نظام الدین نے یہ واقعہ یادداشت کی کتاب میں پڑھا اور اپنی بیوی کو سنایا۔ نظام الدین کو خود تو شاہی خزانہ کی تلاش کا شوق نہ تھا۔ لیکن بیوی کے اصرار پر اسے یہ مہم اپنے ذمہ لینا پڑی۔ چنانچہ بدرِ کامل کی رات وہ دونوں اس جھونپڑی تک جا پہنچے جس کا تذکرہ روشن آرا نے اپنی کتاب میں کیا تھا لیکن جب وہ اندر داخل ہوئے تو صرف ایک چیخ بلند ہوئی اور اس کے بعد ہیبت ناک سکوت طاری ہو گیا۔

صبح کو شاہی محل میں ایک کہرام مچ گیا۔ کھوجیوں کو ہر طرف دوڑایا گیا لیکن بادشاہ اور بیگم کا کوئی پتہ نہ تھا۔

اس کے بعد کئی برس گزر گئے۔ نسلاً بعد نسلٍ شاہی دفینہ کا راز روشن آرا کی نوٹ بک کے ذریعہ سے اودھ کے بادشاہوں کو معلوم ہوتا رہا لیکن نظام الدین کے ہولناک انجام کے پیش نظر کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس خزانہ کی تلاش میں نکلے۔

تیس برس ہوئے حکومت نے فیصلہ کیا کہ جس جگہ لکڑ ہارے کی جھونپڑی واقع تھی وہاں سرکاری دفاتر تعمیر کئے جائیں۔ چنانچہ بنیادیں کھودنے کے لئے رفاہ عامہ کے محکمے نے انجن روانہ کئے۔ کھدائی کے دوران میں اچانک ایک روز ایک انجن بگڑ گیا اور مستریوں کی بہترین کوشش کے باوجود ٹھیک نہ ہوا۔ آخر اس کی جگہ ایک نیا انجن لایا گیا لیکن جن مزدوروں کو سارے قصہ کا علم تھا انھوں نے اس جگہ کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ انگریز انجینیر خود ہی اس جگہ کھدائی کرنے لگا۔ جب خندق کچھ گہری ہو گئی تو اچانک انجن جھوک کھا گیا اور انگریز کے منہ سے ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی۔

تاہم انگریز بچ گیا۔ اس نے اپنی سعی جاری رکھی تا آنکہ وہ مقررہ گہرائی تک خندق کھودنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد بیہوش ہو گیا اور جو لوگ اس کی مدد کو پہنچے انھوں نے دیکھا کہ اس کی آستین مشین میں پھنسی ہوئی ہے اور اس کے بازو پر شدید چوٹ آئی ہے چنانچہ اسے ہسپتال پہنچایا گیا اور چند دن کے علاج کے بعد وہ بالکل تندرست ہو گیا۔

اس اثنا میں کھدائی جاری رہی لیکن کسی شخص کو حادثہ کے مقام کے نزدیک جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر ایک نیا انجینیر آیا جس نے وہاں کا معاینہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس جگہ دھات اور لکڑی کا بنا ہوا ایک صندوق رکھا ہے۔ مزید کھدائی پر اس طرح کے دس اور صندوق برآمد ہوئے۔ ان صندوقوں کو حکومت کے ایک دفتر میں پہنچایا گیا تو وہ ہیرے جواہر اور سونا چاندی سے بھرپور نظر آئے۔ چنانچہ قانون کی رو سے اس خزانہ کو سرکاری جائداد قرار دیا گیا۔

مزید تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اس جگہ ایک سرنگ بھی موجود ہے جس کے دروازے پر ایک آہنی پھندا لگا ہوا ہے۔ اس پھندے میں دو ہڈیوں کے پنجر اب تک پھنسے ہوئے تھے چنانچہ ان کو نکالکر شاہی تزک واحتشام کے ساتھ نواب سعادت علی خاں کے مقبرے کے قریب دفن کیا گیا۔ یہ وہی دو قبریں ہیں جن کے سرہانے سفید ساڑھی میں ملبوس ایک عورت روزانہ آکر مہکتے ہوئے نوشگفتہ پھول چڑھایا کرتی ہے!

دولت آپ کا انتظار کر رہی ہے

مبلغ دس ہزار روپیہ انعام

10000/- ۱۰۰۰۰/-

داخلہ فی حل آٹھ آنے ۸/
سچائی اور انصاف سے کام ہوگا

لیجئے ایسا سنہری موقع پھر ہاتھ نہیں آئیگا!

آخری تاریخ داخلہ بند ۲۵ جنوری ۱۹۴۲ء
نتیجہ انعام:- ۳۱ جنوری ۱۹۴۲ء

دومنٹ کی محنت یقینی انعام۔ صحیح حل کا انعام آٹھ ہزار روپیہ۔ سب سے زیادہ حل بھیجنے کا انعام ایک ہزار روپیہ۔ سب سے پہلے صحیح حل بھیجنے والے کے لئے خاص انعام ایک ہزار روپیہ۔ اگر کوئی صاحب یہ ثابت کر دیں کہ حل درست ہونے پر انعام نہیں ملا تو کمپنی مبلغ پچاس روپیہ دینے کا وعدہ کرتی ہے۔ اس معمہ میں ضرور شامل ہو جائیے ممکن ہے کہ قسمت آپ ہی کا انتظار کر رہی ہو۔ صحیح حل وہ تصور ہوگا جو ہندسہ بہ ہندسہ خانہ بہ خانہ اُس حل سے ملے گا جو ایڈیٹر صاحب ”ایوننگ نیوز“ کے پاس محفوظ ہے۔ نقشہ ہذا کو اس طرح پُر کرنا ہے کہ جس طرف سے جمع کریں میزان ۴۸ آئے۔

۲۰		
	۱۶	
		۱۲

نقشہ میں خالی صفر۔ بٹہ نہیں ہے۔ درست حل کرنے والے صاحبان اور سب سے زیادہ حل کنندہ کو کم از کم مبلغ پچاس روپیہ کی گارنٹی دی جاتی ہے۔ داخلہ بڑھ جانے اور زیادہ حل درست ہونے پر انعامی رقوم برابر تقسیم ہونگی۔ غلطی والوں کے لئے بھی ایک ہزار روپیہ کا نقد انعام مقرر ہے۔ جو حل قواعد کے خلاف ہوگا وہ انعامی فہرست میں شامل نہ ہوگا نیز کسی حالت میں بھی واپس نہ ہوگی۔ مینیجر صاحب کا فیصلہ ناطق و قانونی طور پر قطعی و قابل تسلیم ہوگا۔ نتیجہ یا جواب کے لئے ۱ر کا ٹکٹ آنا ضروری ہے

مینیجر نیشنل کمپٹیشن، ریلوے روڈ لاہور

دوشیزاؤں کی سرائے

نوشتہ:۔ ڈینیل شوکے

ترجمہ جناب علی احمد بی اے

"یہ ہمارے سامنے کونسا مقام ہے" میں نے گاڑیبان سے دریافت کیا۔
"گران سیک کیپٹن!"

"گران سیک؟ کیا رات یہاں آرام سے بسر کی جاسکتی ہے؟"
"بہت اچھی طرح۔ یہ بہترین سرائے ہے اب آگے اس سے بہتر کوئی ٹھہرنے کا مقام نہ ملے گا۔"

یہ خبر میرے لئے نہایت خوش آیند تھی۔ اس لئے کہ میں چلتے چلتے بہت تھک گیا تھا۔ بیماری سے اٹھنے کے بعد ہی کئی سو میل کے سفر پر روانہ ہو جانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ میری فوج کا دستہ پرکینن میں ٹھہرا ہوا تھا اور میں نانسی سے ہو کر آ رہا تھا۔ سفر کافی طویل تھا اور ساتھ ہی ساتھ خطرناک بھی۔ ابھی کچھ دن ہوئے کیٹیکونیا سے گزرتے ہوئے میرے دستے کا ایک فرانسیسی فوجی موت کے گھاٹ اتر چکا تھا۔

ہم جلد ہی اس چھوٹے سے دلفریب مقام پر پہنچ گئے جو جنگل سے ڈھکے ہوئے پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ میرے نوکر تھامس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ سرائے کے مالک نے میرے سامان کے متعلق اپنے آدمیوں کو حکم دیا اور مجھے لے کر سرائے میں داخل ہوا۔ کمرہ صاف ستھرا اور سلیقہ سے سجا تھا اور اس کا گوشہ گوشہ خوبصورت چھوٹی اور بڑی لڑکیوں سے جاذب نگاہ بنا ہوا تھا۔ کچھ میزوں کے پاس کچھ میزوں کے نیچے بیٹھی تھیں بعض کھڑکیوں پر تھیں اور جو بہت چھوٹی تھیں وہ فرش پر کھیل رہی تھیں۔ سولہ سال کی ایک جوان لڑکی ایک سال بھر کے بچہ کو گود میں لئے تمام بچوں کے غول کے ساتھ ناچ رہی تھی! اسی کمرے کے ایک گوشہ میں ایک نوجوان شخص گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ لڑکیوں کے شور وغل اور ناچ سے بے خبر وہ کسی گہرے سوچ میں گم تھا۔

"چپ رہو" سرائے کا مالک کمرے میں داخل ہوتے ہوئے چلایا۔ "اینٹی! اس شور کرنے والی فوج کو یہاں سے لے جاؤ اور فینتی تم ہمارے اجنبی مہمان کے لئے ایک کمرے کا انتظام کرو یہ رات یہیں گزاریں گے۔"

اس حکم پر اینٹی جس کی عمر مشکل سے چودہ سال کی ہوگی تمام لڑکیوں کو لے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ فینتی جو بچوں کے ساتھ ناچ رہی تھی یکدم رک گئی اور پھر ایک انداز سے تعظیم کے لئے جھکی اور شرماتی ہوئی سرنگوں اس نوجوان کے پاس پہنچی اور کہا۔

"لیجئے کچھ دیر میری چھوٹی بہن سے دل بہلائیے اچھے فلسفی! مجھے امید ہے کہ آپ اپنا کام اچھی طرح انجام دیں گے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی گود کی بچی کو اس کی بانہوں میں زبردستی دیدیا۔ غائب دماغ پروفیسر کے لئے یہ کوئی اچھا مشغلہ نہ تھا لیکن اس سے انکار کرتے نہ بنی۔

"آپ بڑے خوش قسمت معلوم ہوتے ہیں میرے میزبان" میں نے چھوٹے بچوں کے غول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کیا یہ سب آپ کے ہیں؟"

"آپ کے ایسا کہنے سے مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے" سرائے کے مالک البرٹ نے جواب دیا۔ ان میں سے قریب قریب نصف میرے ہیں اور باقی ان کی سہیلیاں ہیں جو میری تیسری لڑکی کی سالگرہ منانے آئی ہیں۔"

"اور مسٹر البرٹ ان میں سے آپ کی کتنی ہیں؟"

"چھ لڑکیاں ——— بس"

"خدا بھلا کرے۔ سب کی سب لڑکیاں ——— چھ لڑکیاں؟"

"خدا کا شکر ہے کیپٹن! ایک باپ کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ اس کی تمام لڑکیاں خوبصورت ہوں ان کی خوبصورتی کا کچھ نہ کچھ عکس باپ کی زندگی پر ضرور پڑتا ہے ہر شخص اس سے ملتا ہے اس کی تعظیم کرتا ہے ——— صرف اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک لڑکیوں کو چاہتا ہے اس معاملہ میں فینتی میری خوش قسمتی کا باعث ہے اور جب وہ بڑی ہو جائے گی تو لوگ اینٹی کو چاہنے لگیں گے۔ اینٹی کے بعد سینی اس کی جگہ لے گی پھر ساسنائن پھر سینی اور اسی طرح . . . . ."

"لیکن البرٹ یہ بات آپ کو ماننی ہوگی کہ اس کا انجام خوشگوار نہیں ہے۔ اس لئے کہ یکے بعد دیگرے ہر ایک کو ان کے شوہروں کے حوالے کر دینا ہوگا ——— اور اس طرح آپ سب کو کھو دیں گے۔"

"نہیں میرا نقطۂ خیال یہ نہیں جو آپ کا ہے۔ جب میں اپنی لڑکی کو دیدوں گا تو گویا اصل میں سے سود حاصل کروں گا میں بہت جلد نانا بن جاؤں گا اور یہ میرے لئے ایک نئی مسرت ہوگی۔"

"تم خود کو تسلی دینا چاہتے ہو البرٹ۔ لڑکیوں کے بجائے چھ خوبصورت لڑکے یقیناً آپ کو زیادہ مغرور بنا دیتے۔"

"لڑکے! خدا بچائے! یہ وحشی مجھے وقت سے پہلے بڑھا کر دیتے۔ برعکس اس کے لڑکیوں میں میں دوبارہ جوان ہو گیا ہوں جب لڑکے بڑے ہوتے تو ان میں سے ایک تو سرائے کے حساب میں دخل دینے لگتا۔ دوسرا اپنے ملک کے لئے لڑتا ہو جاتا تیسرا مارا جاتا۔ چوتھا بحر و بر کا سفر کرتا۔ پانچواں عیش پسند اور فضول خرچ ہوتا۔ چھٹا اپنے باپ سے زیادہ چالاک ہوتا۔ اور وہ میری بات کا جواب تک نہ دیتا۔"

اس وقت نینٹی مٹکتی ہوئی اندر آئی اور نہایت ادب سے جھک کر کہا:۔

"آپ کا کمرہ آراستہ کر دیا گیا ہے صرف جائزہ لینا باقی ہے"۔ سرائے کے مالک کو کسی نے بلا لیا اور میں نے کمرے میں جانے کے لئے ٹوپی اٹھائی۔

"اگر آپ کی اجازت ہو تو" نینٹی نے کہا "تو میں خود چل کر کمرہ دکھا دوں" یہ کہتے ہوئے وہ پھر اس شخص کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی جسے اس نے بچی کو دیا تھا۔

"جناب فلسفی! آپ بچی کے ساتھ بہت نامہربان ہیں دیکھئے تو سہی آپ پر ہنس رہی ہے اس کا ہاتھ چومئے اور معافی مانگئے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بچی کے چھوٹے ہاتھوں کو اس کے لبوں سے ملا دیا۔

وہ سنجیدگی سے مسکرایا اور بمشکل نظریں اٹھا کر اوپر کو دیکھا۔

تب وہ دوڑتی ہوئی واپس آئی اور بولی "مجھے اجازت ہے نا؟" اور میرے سامنے زینوں پر تیزی سے چلنے لگی پھر اس نے ایک چھوٹے سے خوبصورت کمرے کا دروازہ کھولا لیکن میرے وہاں پہنچنے تک اسے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا مجھے ابھی بیماری سے پوری صحت نہیں ہوئی تھی جس کے آثار میرے چہرے سے ظاہر تھے۔

"آپ بہت جلد یہاں تندرست ہو جائیں گے" وہ بولی "کران سیک کے پانی کا غسل جادو کا اثر رکھتا ہے آپ تو جانتے ہوں گے نا؟"

"دلفریب نینٹی! میں نے اس کے متعلق کبھی کچھ نہیں سنا۔ تو یوں کہئے کہ آپ یہاں طبی غسل کا بھی استعمال کرتی ہیں"

"ہاں۔ دنیا میں سب سے زیادہ مشہور۔ یہاں لوگ بعد دراز مقامات لنڈن اور مانشسٹر سے آتے ہیں اور کوئی ایسا نہیں جو صحتیاب اور خوش ہو کر یہاں سے واپس نہ ہوتا ہو"

"لیکن حسین نینٹی! آپ کو چھوڑ کر بھلا کون خوش ہو سکتا ہے"

"اس کا نصفیہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے کپتان۔ میں جانتی ہوں لوگوں کو کس طرح وقت کرنا چاہیئے کہ وہ مجھ کو چھوڑ کر خوش ہوں"

"اوہ! میں التجا کرتا ہوں کیا یہ عورت مجھے نہیں بخشی جا سکتی"

"کیوں نہیں ضرور۔ اچھا اب مجھے بچی کو لینے کے لئے فلسفی کے پاس جانا ہے"

"کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ شخص کون ہے جسے آپ فلسفی کہتی ہیں"

"ایک نہایت ہر دل عزیز، ہوشیار، دلچسپ نوجوان جس کی صرف یہی خطا ہے کہ وہ ہنس نہیں سکتا۔ بہت ہی کم سخن لیکن جب وہ بات کرتا ہے تو وہ بہت شیریں ہوتی ہے اس کا نام ہرولن آرنی ہے۔ وہ طبی غسل کے لئے آیا ہے لیکن وہ اس سے نفرت بھی کرتا ہے کیونکہ گندھک کی بو اسے پسند نہیں" ان الفاظ کے ساتھ وہ تعظیماً جھکی اور غائب ہو گئی۔

مجھے اعتراف ہے کہ یہ لڑکی کسی شخص کو بھی ستانے کے لئے کافی دلفریب تھی۔ میں نے کارن سیک میں دوسرے دن بھی رہنے کا قصد اور طبی غسل کے امتحان کرنے کا ارادہ کر لیا اور حقیقت میں میری ایسی صحت اور ایسا آرام کہاں پا سکتا تھا مجھے کچھ آرام لینے کی ضرورت بھی تھی۔

لیکن کمرے کی تنہائی سے میں کچھ دیر میں گھبرا گیا۔ ٹہلتا ٹہلتا باہر نکلا کہ کم از کم خوبصورت نینٹی ہی کو دیکھ سکوں۔ وہ اِدھر اُدھر کسی کام سے پھر رہی تھی وہاں باتیں کرنے کے لئے آرنی کے سوا کوئی نہ تھا جو کھڑکی کے شیشوں کو انگلی سے بجاتا ہوا اونگھ رہا تھا۔ میں نے کران سیک کے طبی پانی کے متعلق دریافت کیا۔ وہ بولا:

"ان میں گندے انڈوں کی سی بدبو ہے"

میں نے کہا "میں یہاں صرف طبی غسل کی خاطر نہیں آیا"

"آپ کے لئے یہی بہتر ہے" اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا "گاؤں کی آبادی مجھے خوشگوار محسوس ہوتی ہے"

وہ بولا۔ "یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں لوگ تو بہر حال ناخوشگوار

ہیں

"پھر بھی فینی کی خوش خیالی ضرور برداشت کی جاسکتی ہیں" میں بولا "یوں سمجھئے کہ ایک شہد کی مکھی سر کے گرد بھنبھناتی رہتی ہے"۔

جونہی میں پلٹا۔ آرنی نے زور سے ایک چیخ ماری۔ میں چونک پڑا اور پھر دیکھا تو اس کے قریب فینی کھڑی مسکرا رہی تھی اس کے ہاتھ میں ایک سوئی تھی جس سے اس نے فلسفی کے شانے کو چھید دیا تھا "اب تو آپ کو معلوم ہوگیا صاحب! یہ شہد کی مکھیاں ڈنک بھی رکھتی ہیں؟ یہ میری چھوٹی سی شرارت ہے! اور میری سزا اس سے بہت زیادہ ہے"۔

"تو کیا اب تم ان کا دل بھی چھیدو گی؟" میں نے کہا۔

"اوہ! مسٹر ون آرنی کے دل کو چھیدنا آسان کام نہیں"۔ وہ بولی اور جلدی سے چلی گئی۔

نوجوان کچھ بڑبڑایا اور کمرے سے نکل گیا۔ میرے لئے عجیب منظر تھا۔ اس سے قبل میں نے ایسی عجیب فطرت کا نوجوان کبھی نہیں دیکھا تھا جو ایک چنچل دوشیزہ کے مذاق کو برداشت نہ کر سکے۔

میں تنہا نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس لئے کمرے سے باہر نکلا مکان کے مختلف حصوں کو غور سے دیکھتا رہا اور پھر اس سے ملے ہوئے چھوٹے باغیچہ میں داخل ہوا۔

فینی کی چھوٹی بہن انیٹی پھولوں کو پانی دے رہی تھی۔ اس کے کام کو میں غور سے دیکھتا رہا۔ اس کی معصومیت اور سادگی لڑکپن کی حدوں سے گزر کر شباب کی سرحد میں داخل ہو رہی تھی وہ ایک پھول سے دوسرے پھول تک جاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی نیم دوشیزگی کی کلی اب ہوا کے ایک ہی جھونکے سے کھل کر پھول بن جائے گی۔

"کون" میرے قدموں کی آواز سن کر اس نے بغیر مڑے ہوئے کہا۔

"ایک چور" میں بولا۔

"وہ کیا چرائے گا؟" اس نے بغیر آنکھیں ملائے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"انیٹی کے خوبصورت پھول"۔

اس نے اپنا برتن نیچے رکھ دیا اور کچھ ڈرتی ہوئی میرے قریب آئی اور پھر کہا۔

"تو میں خود اسے دیکھوں گی"۔

میں نے اپنی نظریں چاروں طرف پھیریں اور گلاب کے پھولوں کا ایک نیا کھلا ہوا گچھا دیکھا۔

"کیا میں اسے چرا لوں"؟ میں نے پوچھا۔

"چور پوچھا نہیں کرتا" اس نے جواب دیا اور اس کے کاٹنے کے لئے ایک چھوٹی قینچی بھی لیتی آئی۔

"میں اسے اپنے لئے نہیں چراتا" میں بولا۔

"پھر یہ گلاب کا پھول آپ کسے دینا چاہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کران سیک کی سب سے حسین لڑکی کو"

"اچھا جناب! تو اس کا انتخاب آپ ہی پر رہا لیکن کران سیک کی لڑکیوں کو آپ جانتے بھی ہیں؟ آپ کو یہاں آئے ایک گھنٹہ بھی زیادہ نہیں گزرا!"

"میں صرف اسی لڑکی کو جانتا ہوں جو سب سے زیادہ حسین ہو"

"آپ مجھے حیران کر رہے ہیں جناب کیا میں کچھ دیر آپ کے ساتھ رہ سکتی ہوں"۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ تھوڑی دیر اسی طرح خاموش کھڑی رہیں" میں نے جواب دیا اور جلدی سے گلاب کا پھول کاٹ کر اس کے بالوں کے ریشمی سوباف میں لگا دیا۔

"آپ غلطی پر ہیں۔ سچ آپ غلطی پر ہیں۔ میری بہن فینی سب سے زیادہ خوبصورت ہے"۔

"آپ میری پسند کی تردید کیسے کر سکتی ہیں۔ دلنواز انیٹی! کیا آپ کو خود انتخاب کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ اگر میں یہ کہوں کہ کران سیک کی سب سے زیادہ خوبصورت دوشیزہ آپ ہی ہیں تو اس سے آپ کیسے انکار کر سکتی ہیں"؟

"لیکن آپ کو یہ بتانا ہوگا کہ آپ کی رائے میں دوسری خوبصورت لڑکی کون ہے"۔

اسی طرح تکرار ہوتی رہی لیکن گلاب کا پھول مجبوراً اسے ہی رکھنا پڑا۔ اس نے مجھے باغ کی روش روش دکھائی جو پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ کچھ دیر میں ہم ایک دوسرے کے دوست ہوگئے شام ہوتے ہوتے سارا خاندان مجھ سے مانوس اور بے تکلف ہوگیا۔ البرٹ کی بیوی چھ لڑکیوں کی ماں ایک خوش اسلوب عورت تھی۔ وہ اپنے لڑکوں کی طرح زندہ دل، شوخ اور بہت باتونی تھی۔ سنجیدہ اور خشک مزاج آرنی ہمارے قہقہوں میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ کاران سیک میں ایک دن سے ایک ہفتہ ہوگیا۔ ہر رات پابندی کے ساتھ سفر

سے سامان باندھ لیا جاتا لیکن صبح ہوتے ہی کھول دیا جاتا۔ فینی اپنی بات پر قائم رہی اور فلسفی سے زیادہ جو چیز مجھے ستاتی رہی لیکن کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ اس نے مجھے بہت زیادہ تکلیف دی ہو یا میرے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آئی ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہر روز کتنی خوبصورت، نازک، دلکش اور خوش کن ادائیں میرے ستانے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے دماغ کے سکون کے لئے کتنی مہلک ہوتی جا رہی تھی اور میں ناحق اسے دفع کرنا چاہتا تھا وہ اپنی عمر کی سولہ بہاریں دیکھنے کے باوجود اس قسم کے احساسات سے بہت دور تھی۔ وہ کیوپڈ کے تیروں سے کھیلتی اور یہ نہ جانتی کہ وہ کتنے بھیانک تھے اس کی فطرت عصر عصر کی بابلی میں جادو کا اثر رکھتے ہوئے بھی معصوم بچوں کی طرح سادہ تھی وہ عورتوں کی طرح دل کی کمزور اور نازک تھی لیکن اس کی شرارت سنجیدہ سے سنجیدہ باتوں کو مذاق میں تبدیل کر دیتی۔

میں اکثر سوچتا کہ شاید اس کو بھی مجھ سے دلچسپی ہوتی جا رہی ہے۔ جب وہ خاموش رہتی۔ جب اس کی نگاہیں ایک خاص سکون کے ساتھ مجھ پر پڑتیں یا جب اس کی پرجوش مسکراہٹ آنکھوں سے جھانکتی ہوئی کہتی "مجھے سمجھو" ــــ لیکن اور کچھ نہیں۔ یہ صرف اس کی مہربانی تھی یا یہ ایک خاص صدق دلی تھی جو نفسانی جذبات سے پاک اور ضمیر کی نفاست کا آئینہ تھی میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا برتاؤ میرے ساتھ اتنا مخلصانہ نہ تھا جتنا دوسروں کے ساتھ تھا جنہیں وہ چاہتی تھی اس نے کبھی مجھے زیادہ خوش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ کبھی ایسا موقع دیا اس لئے کہ وہ ہر شخص کو خوش کرتی اور ہر ایک کا دل جیت لیتی۔ یہ اس کی فطرت تھی اور یہی وجہ تھی کہ جوانی کے لطیف جذبات اور روح کی مقدس دوشیزگی میں جو بچپن کی معصومیت کی ضد ہیں اس کی والہانہ حرکتوں سے ایک خاص ادا اور ایک خاص شان پیدا ہو گئی تھی۔

بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا کہ خشک مزاج آرتی کا اس پر بہت اثر ہے وہ ایک عجیب شخص تھا جس کی سنجیدہ خاموشی ایک انوکھی بات کی حامل تھی اس کی افسردگی میں بھی دلچسپی جھلکیاں لیتی تھی۔ وہ ہر کام بغیر سوچے سمجھے کرتا لیکن جو کچھ کرتا ٹھیک کرتا اگرچہ وہ ہمیشہ بڑبڑاتا رہتا پھر بھی وہ دنیا کا سب سے زیادہ نیک اور رحم دل انسان تھا۔ ایک دفعہ جب میں کمرے میں گیا تو فینی آرتی کے بکھرے ہوئے بالوں کو اس کی شکن آلود پیشانی سے ہٹا کر اپنے ہاتھوں سے سلجھا رہی تھی وہ کچھ

خیال میں غرق تھا اس نے اپنی نظریں تک اوپر نہ اٹھائیں مجھے اعتراف ہے کہ فینی کے اس بے تکلفانہ انداز نے میرے دل میں رشک کی آگ بھڑکا دی لیکن وہ اسے معیوب خیال نہ کرتی تھی کیونکہ اس کا باپ یا میں کبھی ایسے وقت کمرے میں آ جاتے تو وہ اپنی وضع تک تبدیل نہ کرتی اور اسی طرح اپنا کام جاری رکھتی یہاں تک کہ ہم ہنس پڑتے، جب اس کی روانگی کا ذکر چھڑتا تو وہ اپنے خاص انداز میں سادہ لڑکی سے کہتی "آپ کیپٹن کے ساتھ اسپین جائیے وہ خشک مزاج لوگوں کے لئے جنت ہے۔ آرتی آپ کو وہاں یقیناً اچھے لوگوں کی صحبت مل جائے گی۔"

اس کی بہن انیتی میں بھی وہی زندہ دلی۔ وہی شوخی اور وہی ذہنی لطافت تھی لیکن ابھی اس میں لڑکپن زیادہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی باتوں میں فینی سے زیادہ نرمی اور برتاؤ میں فینی سے زیادہ گرمجوشی تھی۔ اس کے بھولے پن میں ایک نیا انداز تھا اس کے اعضا موزوں اور متناسب تھے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ فینی سے زیادہ خوبصورت تھی لیکن اس کا فیصلہ مشکل تھا کہ ان دونوں میں سے زیادہ دلفریب کون ہے۔

ان دونوں دوشیزاؤں کے عجیب کرداروں کے اختلافات کو معلوم کرنے میں مجھے ایک قسم کی مسرت ہوتی۔ انیتی مجھ سے زیادہ مانوس تھی۔ اسے آرتی کی سنجیدگی سے زیادہ دلچسپی نہ تھی "وہ میرا ہم مذاق نہیں" وہ کہتی۔ "میں آسمان کو ہمیشہ نیلا اور بغیر بادلوں کے دیکھنا چاہتی ہوں"۔ وہ نادان معصوم بچوں کی طرح اپنے تمام راز مجھ سے کہتی اور جو کہتی اس کے متعلق میری رائے طلب کرتی۔ یہاں تک کہ اس کے لباس کے انتخاب میں بھی مجھے اپنی (؟) رائے دینی پڑتی۔

وہ مجھے بہت بھلی معلوم ہوتی اور آخر کار کران سیک میں قیام کے آٹھویں روز میں نے رخصت ہونے کا قطعی تصفیہ کر لیا لیکن انیتی اپنے حسن سے کام لینا جانتی تھی اس نے اپنے غیر معمولی سنگار سے ایسا سحر کیا کہ میں نے خود کو اس کے حوالے کر دیا اور اگرچہ آرتی میرے ساتھ پرکنن چلنے کے لئے مجھ سے زیادہ تیار تھا مگر مجھے دو روز کے لئے اور رک جانا پڑا۔

دوسرے دن کے آغاز پر آرتی غیر متوقع طور پر میرے پاس آیا اور مجھ سے کچھ دن اور ٹھہر جانے کی التجا کی "کیا انیتی نے آپ کو بہکا کر ایسا سمجھایا ہے؟" میں نے پوچھا "میں آپ کی سنجیدہ فطرت سے ایسی توقع نہیں رکھتا"

عورت ـــ ہر مہینہ ـــ روتی ہے

(کیونکہ)

عورت کو ہر مہینہ ماہواری کا درد ہوتا ہے

تیرہ چودہ سال کی نوجوان لڑکی سے لیکر چالیس سال عمر تک کی عورت کیلئے ہر مہینہ ماہواری ایام کا بغیر کسی درد اور تکلیف کے باقاعدہ آنا بہت ضروری ہے لیکن اگر کسی عورت کو ماہواری آنے میں تکلیف اور درد ہوتا ہے۔ یا ماہواری خون باقاعدہ نہیں آتا۔ یا مہینہ میں دوبار یا دو تین مہینے میں ایک بار آتا ہے یا زیادہ دن تک آتا رہتا ہے۔ یا ماہواری کے دنوں میں اس کی کمر اور ناف تلوں میں یا بدن میں سخت درد ہو جاتا ہے یا کسی عورت کو ماہواری رک رک کر آتی ہے۔ یا عرصے سے بند ہے یا ماہواری کی اور کوئی خرابی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی عورت بہت جلد کسی خطرناک مرض کا شکار ہو جائیگی۔ اور پھر اس کا علاج بیحد دشوار ہو جائیگا۔ لہٰذا ماہواری کی خرابی اور اس زمانہ کے درد وغیرہ کو ہرگز معمولی بات نہ سمجھئے۔ بلکہ جلد سے جلد ماہواری کی ان خرابیوں کا علاج کر لینا چاہیئے۔

ماہواری کو باقاعدہ کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ ایسی بیمار عورت جو مندرجہ بالا خرابیوں میں یا ماہواری کی کسی تکلیف میں مبتلا ہو اُس کو ایک شیشی دوا "کورس" استعمال کرا دیجئے۔ اس دوا کی صرف ایک شیشی استعمال کرنے کے بعد عورت کو ہر مہینہ بغیر درد اور بغیر کسی تکلیف کے ماہواری باقاعدہ ٹھیک وقت پر اور صحیح مقدار میں آنے لگتی ہے۔ اور اس سے ہر قسم کی ماہواری کی خرابی اور بے قاعدگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نہایت کارگر دوا ہے۔ اور تقریباً بارہ تیرہ سال سے ہندوستانی عورتوں میں مشہور ہے۔ اور ایک شیشی دوا "کورس" کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی نمبر ۲۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر ایک شیشی دوا "کورس" بذریعہ وی پی پارسل منگالیں۔ پارسل پر ساٹ آنے محصول لگیگا۔

ٹیلیفون نمبر ۶۲۶۸

تار کا پتہ "زنانہ دواخانہ" دہلی

"آہ" اس نے کہا اور اپنے ہاتھ کو چہرے پر پھیرا۔ گویا وہ اپنی کمزور خندہ لبی کو چھپانا چاہتا تھا۔ "میں اس بھولی لڑکی کی بات کو نہیں ٹال سکتا۔ میرے انکار سے وہ رونے لگتی ہے مجبوراً سکے الفاظ مجبوراً سننا ہی پڑے۔ وہ مجھے آٹھ دن اور روکنا چاہتی ہے اس سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس کے بعد ایک لفظ بھی نہ کہے گی۔

——— اب سوا اس کے چارہ ہی کیا تھا۔ میں نے منظور کر لیا اس نے خوشی سے اپنی باہیں میری گردن میں ڈال دیں! اور مجھے پیار کیا وہ اپنے آپے سے باہر تھی۔

"آہ!" میں بولا۔ "ایسی دولت کے لئے ہر شخص اپنا جانا ملتوی کر سکتا ہے اور اپنے ہمسفر ساتھی کو بھی چھوڑ سکتا ہے۔"

"یہ آپ کی مرضی پر ہے کیپٹن! آپ چاہیں تو جا سکتے ہیں مجھے اپنے وعدے کا لحاظ ہے پھر بھی پرکیپٹن کہ سفر میں آپ کا ساتھ رہتا تو میں بہت خوش ہوتا۔"

میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کی محبت اور اس کی دوستی یقیناً مجھے ایک ہفتہ اور ٹھہرا سکتی ہے۔ علاوہ اس کے یہ کہ میری مزید صحت کے لئے بھی بہت مفید ہوگا۔

کچھ دیر بعد انیٹی لچکتی ہوئی اپنی کامیابی پر مسرور آئی۔

"اچھا صاحب تو ہم دوشیزائیں آرتی جیسے نیم وحشی انسان کو بھی مطیع کر سکتی ہیں۔" وہ ہنستی ہوئی بولی۔

"میں اس پر بڑی آسانی سے یقین لا سکتا ہوں آپنے جس طرح حسن کے خطرناک اور طاقتور ہتھیاروں کی مدد سے اسے بے بس کر دیا ہے اسی طرح آپ ایک دن مجھے بھی جیت لیں گی۔ پھر بھی مجھے اس پر رشک آتا ہے جس کو گرویدہ کرنے کے لئے آپ نے ایسی دلفریب تدبیریں اختیار کیں۔"

وہ خاموش سنجیدگی کے ساتھ مسکرائی اس وقت اس کی دلکشی ناقابل بیان تھی۔ "بہرحال" میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر ناانصافی نہ ہو تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کی بے پناہ عنایت جو اس کے حال پر ہوئی تھی اس کا میں بھی امیدوار ہوں۔"

اس نے ایک چھبتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ وہ اچانک مڑی اور رقص کرتی ہوئی گنگناتی ہوئی چلی گئی۔ مجھے کوئی انعام نہ ملا۔ اب پہلی مرتبہ مجھے یہ شبہ ہوا۔ کہ انیٹی اور اس کی بہن فینیتی دونوں مجھے اپنی دلچسپی کا مرکز بنا رہی ہیں اور میں شاید بیوقوف بن رہا ہوں۔ میں پہروں اس پر غور کرتا رہا۔

آٹھ روز بہت جلد گزر گئے۔ ان دنوں میں اکثر کوان حیک اپنے قیام کو طول دینے پر ملامت کرتا رہا۔ اس جنس کے خاندان کا ہر فرد مجھ سے روز بروز قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ فینیتی کے حسن کے نقوش میرے دل پر بہت گہرے تھے اس کے ساتھ میری محبت بہت بڑھ گئی تھی لیکن یہ خیال مجھے ہمیشہ بے چین کر دیتا کہ اس کی محبت شباب کی امنگوں سے بے پرواہ تھی۔ وہ ایک رنگ پر قائم نہ تھی پہلے دن کی بات پھر اس میں باقی نہ رہی۔ وہ آرتی کی طرف زیادہ مائل تھی۔ اور اس کے ساتھ اس کا بے تکلف طرز عمل بحیثیت ایک نوجوان دوشیزہ کے نامناسب ہی نہیں بلکہ نازیبا بھی تھا لیکن حقیقت تو یہی تھی کہ آ. کی نہ تو مجھ سے زیادہ عمر تھا اور نہ میں اس سے زیادہ کمسن۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس وقت تک میں بغیر خود کو بہکے ان دونوں لڑکیوں سے دل چسپی لیتا رہا لیکن فینیتی میری پہلی آرزو تھی ——— مجھے خود پر قابو رکھنے کی ضرورت تھی تاکہ میرا مذاق نہ اڑایا جائے۔ آخر میرے رخصت ہونے کا وقت آ گیا اور میں کراؤن سیک کو چھوڑنے پر خوش تھا خواہ اس میں میرے دل پر جو کچھ گزرتی۔ البرٹ اور اس کی بیوی ٹولی نے جس تپاک سے خیر مقدم کیا تھا اسی پُرجوش طریقہ سے رخصت کی بھی اجازت دی۔ آرتی آج روز سے زیادہ سرد اور خاموش تھا شاید اسکو بھی سرائے چھوڑنے کا غم تھا۔ فینیتی جو آج سے پہلے کبھی اتنی خوبصورت دکھائی نہ دیتی تھی عجیب لباس میں آئی۔ اس نے ہم دونوں کو یکساں طور پر مبارکباد کہی۔ جدا ہونے کا افسوس اور گزشتہ دلچسپیوں کا ذکر کرتی رہی اس کے بے پناہ حسن کی نمائش ہم میں سے ہر ایک کے عزم سفر کو متزلزل کرنے کی کوشاں تھی۔

چھوٹی انیٹی زیادہ متاثر معلوم ہوتی تھی۔ وہ بہت افسردہ اور خاموش تھی کچھ دیر تک تو میرا ہاتھ تھامے رہی پھر اچانک تڑپ کر چلی گئی پھر واپس آئی اس کے ہاتھ میں ایک شگفتہ گلاب کا پھول تھا اس نے وہ مجھے دیدیا۔ دوسرے ہاتھ میں وہ مرجھایا ہوا گلاب تھا جسے پہلے دن میں نے اس کے بالوں میں لگایا تھا اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا البتہ افسردگی نے اس کا چہرہ کملا رہا تھا۔ جب خدا حافظ کہتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا تو اس نے اپنی دراز باہیں میری گردن میں ڈال دیں اور مجھے پیار کیا پھر سسکیاں لیتی ہوئی واپس لوٹ گئی۔

اس وقت پہلی مرتبہ میں نے فینیتی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہم گاڑی میں بیٹھ گئے اور وہ روانہ ہو گئی

ایک گھنٹہ تک تو ہم نے بہت بات چیت کی پھر آرتی گاڑی کے ایک

گوشے میں افسردہ بیٹھا رہا۔ میں خوش تھا اس لئے کہ اس کی موجودگی میں میں خود پر قابو رکھ سکتا تھا ورنہ ضرور تھا کہ میں بچوں کی طرح رونے لگتا۔ فینیسی اپنی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ گاڑی کے ہر گوشہ میں گویا چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔

دوسرے دن طبیعت مکدر نہ تھی۔ غم کے بادل کچھ کچھ چھٹ گئے تھے ہم ٹولوزا اور ویران کارکاسون میں ٹھہرے۔ میرا خاموش ہم سفر بدستور کبھی کبھی اپنے ہی میں بڑبڑا اٹھتا۔

"لوگ اپنی بداخلاقیوں اور غلط ارزوں سے صرف ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں" وہ بولا "محلوں اور جھونپڑیوں دونوں جگہ شاید میں دوسروں کے لئے باعث تکلیف ہوں لیکن یہ اسی لئے ہے کہ دوسرے میرے لئے باعث تکلیف ہیں"

"لیکن خوبصورت فینیسی تو آپ کے لئے باعث اذیت معلوم نہیں ہوتی" میں نے کہا "یا آپ کافی بے حس ہیں کہ دنیا کی اس معصوم ہستی کے ساتھ بھی ناانصافی کرتے ہیں"

"میں انکار نہیں کرتا" وہ بولا "بچے ہماری دنیا کے لئے فرشتوں کے مانند ہیں جو زندگی کے غم کو ہمارے دل سے نکال دیتے ہیں اور فینیسی نرالی بچی ہے۔ میں اس سے بھاگنا چاہتا ہوں اس لئے کہ اس نے مناسب تربیت نہیں پائی۔ میں کران سیک میں کچھ دن اور ٹھہرتا اس لئے کہ یہ مقام مجھے بہت پسند تھا علاوہ اس کے البرٹ کے خاندان کی عنایتیں اور دلچسپیاں بھی کچھ کم نہ تھیں لیکن میں نہیں ٹھہر سکا اس لئے کہ فینیسی وہاں تھی"

"کیسا تضاد ہے" میں بولا۔

"بالکل نہیں" اس نے جواب دیا "اس ساحرہ نے شاید یہ سوچ رکھا ہے کہ وہ میرے محسنوں سے حاصل کئے ہوئے غم اور خود مجھے دونوں کو تباہ کرکے رہے گی وہ مجھے بیوقوف بنا کر میرے غم کو دوچند کر دینا چاہتی ہے"

وہ یہ کہتا رہا پھر ٹھہر گیا۔ میں نے کوشش کی کہ وہ البرٹ کے خاندان سے متعلق کچھ اور کہے جہاں وہ تین مہینے گزار چکا تھا لیکن اس نے اور کچھ نہ کہا بجز اس کے کہ وہ گردن کو ہلاتا اور شانوں کو جھٹکتا رہا۔

اس کا ارادہ جیسا کہ اس نے اپنا خیال کران سیک میں ظاہر کیا تھا میرے ساتھ پرپگنن تک سفر کرنے کا تھا۔ اس کا کیا مقصد تھا مجھے معلوم نہ تھا۔ کران سیک کی دوسری منزل پر اس نے یورپ کا ایک نقشہ دیوار پر چسپاں پایا وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بہت دیر تک دیکھتا رہا پھر مجھ سے اپنی نوٹ بک میں لکھا میرے پاس آیا اور بولا "میں نے طے کر لیا میں مارسیلز جاؤں گا اور وہاں سے اٹلی"

لیکن پھر وہ گاڑی میں میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہم روانہ ہوئے اور آدھی رات تک چلتے رہے۔ چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا ہم اونچے کونگرے پہاڑوں کی شیبی دیواروں میں سے گزرنے میں ایک خاص کیفیت محسوس ہو رہا تھا۔ آرکی یکایک چونک کر اٹھ بیٹھا اور گاڑی کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔

"وہ دور پہاڑ پر کس کے کھنڈر ہیں" آرکی نے گاڑیبان سے پوچھا۔

"وہ لوریکی کا محل ہے" گاڑیبان بولا۔

"خوب" آرکی بولا "تو اس کے آگے سڑک سیگبین کو جاتی ہے"

"جی ہاں" گاڑیبان نے کہا "ایک مہینہ ہوتا ہے کہ ایک چاندنی رات کو مسافروں کی ایک گاڑی ڈاکوؤں نے یہیں لوٹ لی تھی۔ گاڑیبان سینتھو جو میرا عزیز تھا یہیں مار ڈالا گیا۔"

"کیا ہم بلاک سے آگے نکل چکے ہیں" آرکی نے ٹوکا۔

"صرف ایک فرلانگ" گاڑیبان نے جواب دیا۔

آرکی نے ٹیکا لگا لیا اور پھر خاموش ہو گیا۔ میں دور پہاڑوں پر محل کے برباد گنبدوں اور بھیانک کھنڈروں کو غور سے دیکھتا رہا۔ اس کی ہیبتناک خاموشی چاندنی رات میں عجیب دہشت آمیز منظر پیش کر رہی تھی۔ ایسا کھنڈر میں نے کہیں نہ دیکھا تھا جس کا منظر خود بخود دل کو دردانگیز جذبات سے معمور کر رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کھنڈر سے کوئی طویل داستان وابستہ ہے۔ اس کی شکستہ دیواریں اس میں رہنے والوں کے ہنسنے رونے، پیدا ہونے اور مر جانے کی دردناک کہانی دہرا رہی تھیں گویا محل میں بسنے والوں کی تباہی کے ساتھ خود محل بھی یاد رفتہ بن کر رہ گیا تھا۔

"لیکن ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ یہ محل بہت دنوں سے خالی پڑا رہا ہو" میں نے گاڑیبان سے پوچھا۔

"جہاں تک مجھے معلوم ہے تقریباً دس بارہ سال ہوئے کہ محل مع ان کے رہنے والوں کے جلا دیا گیا" اس نے جواب دیا۔

"کتنا بھیانک" اور ایسا واقعہ کیوں اور کیسے پیش آیا" میں نے پھر پوچھا۔

وہ بولا "کس طرح؟ گاؤں کے لوگوں نے مل کر بغاوت کر دی تھی۔ محل کی مالکہ کی بدمزاجی اور سختی کی وجہ سے لوگ نالاں تھے اس لئے

محل کو آگ لگا دی گئی۔ وہ ایک مالدار کی بیٹی تھی جس کا وہ محل تھا۔ وہ بھی اسی کے ساتھ جل کر مر گئی۔

"جھوٹ" اچانک آرتی میرے پہلو سے چلا اٹھا۔

"لیکن جناب" گاڑیبان نے کہا "میں نے یہ واقعہ معتبر لوگوں کی زبانی سنا ہے محل میں ایک نوجوان لڑکا بھی تھا جسے لوگ اس کا بیٹا کہتے تھے لیکن کوشش کر اس سے انکار رہا کہتے ہیں کہ وہ بھی اسی محل میں جل کر مر گیا"

"انھوں نے جھوٹ کہا ہے" آرتی پھر چلایا۔

"اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں ہے یا اگر آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں تو مجھ سے پوچھا ہی کیوں جاتا ہے" گاڑیبان غصہ میں بڑبڑایا اور گھوڑوں کی باگ پہاڑ کے ڈھلوان کی طرف موڑ کر ایک چابک لگائی۔

"تو آپ اس داستان سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں" میں آرتی سے مخاطب ہوا۔

"ہاں اچھی طرح" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ کیونکہ میں ہی وہ لڑکا ہوں جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بھی اسی محل میں جل کر مر گیا۔"

"کیا آپ خود اس محل میں رہنے والوں کی اولاد میں سے ہیں" میں نے تعجب سے پوچھا۔ اس داستان اور اس واقعہ نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔"

"میں کسی کا لڑکا نہیں ہوں" وہ بڑبڑایا۔

"لیکن آپ نے ابھی کہا تھا کہ آپ ——————"

"ہاں" اس نے جواب دیا "اس میں کوئی اختلاف نہیں۔"

وہ میری حیرانی کو محسوس کر رہا تھا۔ مجھے بھی ایک خاص قسم کی مسرت ہوئی —————— پھر اس نے بغیر کسی اصرار کے کہنا شروع کیا۔

پندرہ سال کی عمر تک اسی گاؤں کے پادری نے مجھے تعلیم دلائی جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں میں اسے اپنا باپ سمجھتا تھا لیکن میں غلطی پر تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے والدین کوئی اور تھے اور میں پادری کے پاس اس وقت لایا گیا جب میری عمر چار سال کی تھی میری پرورش و تربیت کے لئے اسے ایک مقررہ رقم ماہانہ ملتی اور اسے یہ تاکید تھی کہ وہ مجھے اچھی سے اچھی تعلیم دلائے۔

جب میں اپنے ماں باپ کے متعلق سوال کرتا تو وہ ہمیشہ یہی جواب دیتا میرے بچے تم آخر بار بار کیوں ایسا سوال کرتے ہو۔ تمہارے ماں باپ مدت ہوئی مر چکے ہیں میں بھی انہیں نہیں جانتا۔ تم میرے سپرد کر دیئے گئے۔ ایک مقررہ رقم تمہارے لئے مجھے دی جاتی ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ تم ایک بڑے سرمایہ دار ہو لیکن وہ کیا ہے اور کہاں ہے یہ تمہیں بڑے ہو جانے کے بعد معلوم ہوگا۔

مجھے ہمیشہ اس راز سے آگاہ ہونے کی جستجو رہتی۔ میرا جوان دل بے چین رہتا۔ یہ بات میرے لئے اچھی نہ تھی کہ میرے والدین نامعلوم رہیں۔ میں گاؤں کے لڑکوں کی خوش قسمتی پر رشک کرتا تھا اس لئے کہ والدین کی محبت ان کے شامل حال تھی۔

پادری نے مجھے بہت عمدہ تعلیم دلائی۔ اس نے ادب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنس سے بھی ناآشنا نہ رکھا۔ جب میں پندرہ برس کا ہو گیا تو وہ میری مزید ذہنی اور دماغی تربیت کے لئے مجھے پیرس لے گیا اور پھر لوٹ گیا۔ اس کے بعد پھر میں نے اسے نہیں دیکھا ایک بنک کے پاس سے مجھے مقررہ رقم مل جاتی تھی جس سے پادری نے مجھے ملا دیا تھا۔ میں ایک زمانے تک یہی سمجھتا رہا کہ میرے گمنام والدین کے پاس سے یہ رقم آتی ہے لیکن بنک سے معلوم ہوا کہ کبھی ایک شخص اور کبھی پیرس کے دوسرے شخص کے پاس سے یہ رقم میرے لئے آتی ہے۔

میں خوش تھا۔ اور اس عمر میں کون خوش نہ ہوتا۔ میرے جذبات اب کچھ کچھ ابھر رہے تھے۔ میرے خیالات رنگین تھے میں شاعر تھا بسیط دنیا کا ہر ذرہ مجھے سرسبز دکھائی دیتا۔ میرے چند دوست بھی تھے میں ان کے متعلق کچھ نہ جانتا لیکن ان سے دلی خلوص رکھتا۔ میرے پاس کافی روپیہ تھا۔ میں آرام سے خود بسر کرتا اور دوسروں کی بھی مدد کرتا۔ میری ایک محبوبہ بھی تھی جس سے میں بہت محبت کرتا تھا۔ وہ بھی مجھے چاہتی تھی۔ میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ محبت کی لذت سے آشنا ہوا تھا۔ دنیا کی تمام مسرتیں میرے سامنے تھیں۔

لیکن چند ہفتوں میں میری یہ جنت ویران ہو گئی۔ اور مجھے ہوش آیا میں اس وقت ۱۹ سال کا تھا۔ میری محبوبہ جس سے میں شاید اب بھی محبت کرتا ہوں ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور اپنی بیوہ ماں کے ساتھ عسرت میں زندگی بسر کرتی تھی۔ میں نے کہیں ملازمت کر لینے کا ارادہ کیا اور جلد ہی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا میں اس کی پوشیدہ طور پر مدد کرنے لگا اس طرح میری خوشی مکمل ہو گئی اور وہ اپنی ماں کے ساتھ بڑے اطمینان سے رہنے لگی۔ میں اپنی آمدنی کا زیادہ حصہ اس کے خوش رکھنے میں صرف کرتا اس مطلب کے لئے میں نے اپنے ایک رازدار دوست سے مدد لی وہ ان کی امداد ایسی تدبیر سے کرتا کہ میرا نام ظاہر ہونے نہ پاتا مجھے خوف تھا کہ اس راز کے فاش ہو جانے سے ہمارے نازک تعلقات ممکن ہے مجروح ہو جائیں۔

...ہوں کس سے بے خبر تھا کہ میرا دوست میرے روپے سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے اس نے لڑکی اور اس کی ماں دونوں پر اپنے احسانات جتا کر انہیں اپنا گرویدہ کر لیا۔ یہاں تک کہ لڑکی کو بھی مجھ سے چھین لیا بلکہ وہ مجھ سے محبت کرنے کے بہانے مجھے دھوکے دینے لگی ہیں بیوقوف بنتا رہا۔ یہ تمام باتیں مجھے غیر متوقع طور پر اچانک معلوم ہوئیں۔ ایک دن جب میں اسے سالگرہ کا تحفہ پیش کر رہا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ یک بارگی سارے نقش میرے رگ و پے میں فوراً گنگی اور ...ہیں منتقل ہو گئے اور جب میں ہوش میں آیا تو لوگوں نے مجھے ساری داستان سنائی۔ اس دن سے جوزف (دغاباز دوست کا نام) اور میں ایک دوسرے کے سخت دشمن ہو گئے۔ اس نے علانیہ طور پر میری توہین کی مجھے ذلیل کیا — پھر ہم لڑے۔ میری گولی اس کے بازو میں لگی۔ اور جبکہ خون بہہ رہا تھا اس نے مجھ سے بدلہ لینے کی قسم کھائی۔

اس کے بعد ہی مجھے ایک ضرورت سے ٹولوز جانا پڑا۔ وہاں ایک دن ایک مسافر آیا اور جب میں نے ثابت کر دیا کہ اسے جس شخص کی تلاش تھی وہ میں ہی ہوں تو اسے مجھ پر اعتبار ہو گیا۔

"ہیرون آرتی" وہ بولا "مجھے مقرر کیا گیا ہے کہ میں یہ مہر بند پیکٹ آپ تک پہنچا دوں براہ مہربانی اسے لے کر اس کی رسید مجھے دے دیجئے"

میں نے پیکٹ لے لیا اور رسید اس کے حوالے کر دی۔ تب اس نے کہا "بیرون آرتی! مناسب ہو گا کہ آپ خود فوراً کونٹس وان لور کے پاس جائیں اور اس سے اپنے حقوق منوائیں۔ کونٹس آپ کی ماں ہے ثبوت اس پیکٹ میں ہے جسے آپ کے والد نے اسکاٹ لینڈ میں مرتے ہوئے دیا تھا۔ یہ دستاویزات آپ کے لئے بڑی قیمتی ہیں اور جو رقم آپ کو اب تک ملا کرتی تھی وہ آئندہ سے نہ ملے گی۔ اب آپ کا مستقبل آپ کی ماں کے ہاتھ میں ہے"۔ یہ الفاظ تھے جو اس نے کہے۔

"میری ماں کہاں ہے؟ میں اسے کہاں پا سکتا ہوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ اس وقت میرے دل کی کیا حالت تھی میں بیان نہیں کر سکتا۔

"اجنبی شخص نے بتایا کہ وہ اٹھارہ برس سے پیرس ہی میں رہتی ہے اور اب ایک طویل مدت کے بعد وہ پھر لینگوڈوک اپنے محل بوکور میں آگئی ہے۔ جہاں اس کا قیام صرف چند ماہ رہے گا۔

میں مسافر سے اپنی ماں، باپ اور رشتہ داروں کے متعلق فضول سوالات کرتا رہا لیکن وہ ان کے متعلق اور کچھ نہ جانتا تھا۔ نہ کبھی ان سے براہ راست ملاقات کی تھی وہ صرف ایک ایجنٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔

...وہ فرانسیسی بھی نہیں بلکہ ایک انگریز تھا۔ وہ اپنا فرض ادا کر کے چلا گیا۔

لرزتے ہوئے ہاتھوں سے کھولتے ہوئے پیکٹ سے بھی میرے والدین کے متعلق کوئی مزید معلومات بہم نہیں پہنچائی۔ نہ ہی یہ بات سمجھ میں آئی کہ دستاویزات کے دینے میں اتنی تاخیر کیوں کی گئی۔ اس میں میرے باپ اور میری ماں کے لکھے ہوئے خطوط تھے جو مجھ سے متعلق تھے۔ کچھ میرے بچپن کے حالات — نرس جس نے چار برس میری پرورش کی — پھر کچھ پادری کا ذکر — اس کے ہاتھ کے صداقت نامے — اور چند دیگر کاغذات۔

میں ٹولوز کو چھوڑتے وقت بے حد مسرور تھا۔ دوست کی دغابازی اور عورت کی بے وفائی کا صدمہ ماں سے ملنے کی خوشی میں کھو گیا — مجھے اب خیال آیا کہ لڑکپن میں میں پادری کے منہ سے اکثر کونٹس اور بوکور کے محل کا ذکر سنا کرتا تھا۔ وہ یہی کہا کرتا تھا کہ کونٹس اتنی ہی حسین ہے جتنی کہ اس کی قسمت! اب مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی پریشانی کا باعث صرف میری ہی ذات ہے۔

میں پہنچا اور خوف زدہ ڈرتا ہوا اس کے محل تک گیا۔ اپنا کارڈ اس کے پاس بھیجا۔ راستہ تمام میں اپنا پارٹ دہرا رہا تھا جو مجھے اپنی کھوئی ہوئی ماں کے سامنے ادا کرنا تھا مجھے خوف تھا کہ فرط مسرت سے میری ماں کہیں اپنے ہوش نہ کھو بیٹھے۔

مجھے اس کے کمرے تک پہنچایا گیا۔ کونٹس داخل ہوئی یہ ایک وجیہہ اور باوقار عورت تھی جس کے چہرے کے خط و خال اب بھی اس کی جوانی کا دھندلا منظر پیش کر رہے تھے اسے دیکھ کر میرا دل درد سے بھر آیا اس کی عمر ابھی چالیس سال سے کم ہی تھی بلکہ وہ تیس سال کی معلوم ہوتی تھی۔

میں اس کی طرف بڑھا۔ میرا دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا میں اسے بس گھورتا رہنا چاہتا تھا لیکن خوشی کے آنسوؤں نے میری آنکھوں کو دھندلا کر دیا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن میری آواز بھرا گئی۔ میں نے بدقت تمام اپنا نام بتایا — میں نے بتایا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں میں نے پوچھا کہ کیا اس نے کبھی اپنے کھوئے ہوئے لڑکے کا ماتم نہیں کیا۔ پھر گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے میں نے اس کا نام لیا۔

"نوجوان" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا "آپ غلطی پر ہیں ... یہ لگتا ہے کہ جسے آپ تلاش کر رہے ہیں وہ کونٹس میں ہی ہوں لیکن نہ تو

میری کبھی شادی ہوئی اور نہ اب میں شادی شدہ ہوں۔ میں نے اپنے لڑکے کے متعلق کبھی کچھ نہیں سنا! اور نہ ہی میرا کوئی گمشدہ لڑکا تھا لیکن ہر بعض فتنہ پردازوں نے تمہیں اس طرح بیوقوف بنانے کی کوشش کی ہو یا تم کو مجھے پریشان اور بدنام کرنے کا ذریعہ بنایا ہو۔

میں کھڑا ہو گیا لیکن اس کے الفاظ مجھے بالکل سنا رہے تھے میں نے خود کو سنبھالا اور دیکھا کہ وہ بہت متفکر اور کسی قدر گھبری ہوئی ہے۔ میں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے لڑکے کو سینے سے لگا لینا چاہتی تھی لیکن اس کا خاندانی وقار اور عزت اس کے درمیان حائل تھی۔ جس نے بہر حال ایک غیر پسندیدہ اور اجنبیانہ برتاؤ کیا مجھے اس سے تکلیف ہوئی میرے جذبات کو ٹھیس لگی لیکن غلطی میری ہی تھی میری جلد بازی نے اسے برہم کر دیا میں نے فوراً اپنے کاغذات میں سے اس کے لکھے ہوئے خطوط بتائے مختلف خاندانی صداقت نامے۔ خود اس کی تحریر کہ میرے بڑے ہو جانے کے بعد وہ جائداد کا ایک بڑا حصہ میرے نام لکھ دیگی۔ پھر میں نے اس کی دستخط شدہ وہ دستاویز دکھائی جس میں میرے باپ کی مرضی کے مطابق اس نے دس سال تک سالانہ پانچ ہزار لیرا دینے کا وعدہ کیا تھا اور جو مجھے ملا کرتے تھے —— پھر کچھ کاغذات ایسے بتلائے جس سے میرا اس کا لڑکا ہونا ثابت ہوتا تھا۔ تب میں نے دریافت کیا کہ اب وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ پریشان سی ہو گئی اس کی بے چینی ناقابل بیان تھی۔

”نوجوان“ آخر وہ بولی۔ ”میری کبھی شادی نہیں ہوئی۔ میں تمہیں اپنا لڑکا نہیں کہہ سکتی اور آخری عمر میں بدنامی اور بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی میں چاہتی ہوں کہ تمہارے پاس جو کاغذات اور تحریریں ہیں ان کو پڑھ کر معاملات کو اچھی طرح سمجھوں —— اور تمہارے جو حقوق ثابت ہوں وہ تمہیں دیئے جائیں۔ لہذا کچھ دنوں کے لئے ان کاغذات کو میرے دیکھنے کے لئے چھوڑ جاؤ۔ میں پھر تمہیں محل میں طلب کر لوں گی۔“

جب وہ یہ کہہ چکی تو میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ وہ مجھ سے انکار نہیں کر سکتی میں اس کی زندگی پر ایک داغ تھا! وراس کے لئے یہ آخری چارہ کار تھا کہ وہ میرے دستاویزات کو اپنے قبضہ میں کر لے جو میرے قانونی ثبوت تھے۔

میں نے کاغذات اپنی جیب میں رکھ لئے اور حیرت ظاہر کی کہ اس کے دل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ کاغذات اسے نہیں بلکہ عدالت کے پیش کئے جائیں گے اُسے غور کرنے کے لئے صرف آٹھ روز دیئے جاتے ہیں اس وقت تک اس کا جواب سنگیتن میں میرے پاس پہنچانا چاہیے —— پھر بھی اگر اس کے مادرانہ جذبات اپنے لڑکے کے لئے بیدار نہ ہو سکیں تو وہ اس کی ذمہ دار ہے۔

وہ مبہوت کھڑی تھی اُسے اسی ادھیڑ بن میں چھوڑ کر میں پشاور سے چلا گیا لیکن محل سے باہر نہ جانے دو۔ مجھے بھلا کہنا شروع کیا اور چلانے لگی ”اس کو پکڑو“ محل سے باہر نہ جانے دو پیچھا کرو۔ اس کی محافظ عورتوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور دربان کو دروازہ بند کر دینے کا حکم دیا لیکن میرا گھوڑا بوڑھے دربان کو گراتا ہوا محل سے باہر نکل گیا میرے پیچھے ایک فائر بھی کیا گیا میں نے مڑ کر دیکھا پھاٹک پر نوکروں اور نگہبانوں کا ایک مجمع لگا تھا کونٹس میری طرف یہاں کھڑکی میں کھڑی تھی۔

سنگیتن میں انتظار کے آٹھ روز مجھے بے چینی سے گزارنے تھے تیسری رات یکایک ایک متوحش آواز سے میری آنکھ کھلی۔ روشنی کی ایک لہر میرے کمرے کی دیواروں پر چمکی۔ یہ روشنی ایک سیاہ قندیل سے آ رہی تھی میں بستر سے اچھل پڑا اور پاگلوں کی طرح تپائی لیکر کمرے کے چاروں طرف گھمانے لگا قندیل زمین پر آ رہی اور اس کے ساتھ وہ شخص بھی گرا جو قندیل لئے ہوئے تھا۔ دوسرے لمحہ ایک خوفناک چیخ کمرے میں دیر تک گونجتی رہی یہاں تک کہ بے دم ہو گیا اور سانس اکھڑنے لگی میں نے جلدی سے قندیل اٹھا کر اسے روشن کیا۔ زمین پر ایک اجنبی شخص پڑا ہوا تھا میں سمجھا وہ مر چکا ہے اور جلد جلد کپڑے پہننے لگا تاکہ باہر نکل کر دوسروں کو اس کی خبر کر دوں۔ اتنے میں اجنبی نے حرکت کی وہ مرا نہیں تھا میری طاقتور ضرب نے شاید اُسے کچھ دیر کے لئے بیدم کر دیا تھا میں اس پر حملہ آور ہوا اور اس کی تلاشی لی اس کی جیب سے ایک بھرا ہوا پستول اور ایک چاقو نکلا۔ میں نے اس کے ہاتھ اور پاؤں رسی سے باندھ دیئے تاکہ وہ بھاگ نہ سکے اس وقت تک وہ اچھی طرح ہوش میں آ چکا تھا۔ میں نے پستول ہاتھ میں لے کر اُسے ڈرایا اور وہاں آنے کا سبب پوچھا۔ وہ نہ روپے کے لئے آیا تھا اور نہ اُسے میری زندگی کی ضرورت تھی۔ وہ کونٹس کے حکم سے کاغذات و دستاویز چرانے کی نیت سے آیا تھا۔ وہ نیند میں مجھ پر حملہ کر کے مجھے دھمکانا چاہتے تھے۔ فرش پر دوسرا شخص مردہ پڑا تھا۔

کونٹس کے خیال سے میں نے اس کا چرچا نہیں کیا۔ وہ شخص بحیثیت قیدی کے میرے مکان میں رہا تھا۔ میں نے کونٹس کے پاس ایک قاصد بھیجا اور لکھا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر وہ بذات خود سنگیتن آ کر اپنے قیدی کو چھڑا لے جائے۔ وہ خود نہ آئی اس کا ایک نمایندہ آیا اور ایک صلحنامہ پیش کیا جس کی رو سے یہ ثابت تھا کہ مجھے پندرہ ہزار لیرے سالانہ ملیں گے لیکن اس کے عوض مجھے تمام کاغذات کونٹس کو دیدینے ہوں گے۔

اس طرح سمجھوتہ ہو گیا۔ اب میں دنیا میں اکیلا تھا۔ میرا کوئی نہ تھا۔ بچپن کا ایک دوست تھا وہ دغاباز نکلا۔ ایک عورت نے اس سے بیوفائی

(باقی بر صفحہ ۱۸۲)

ایک سنسنی خیز کہانی

ایک نوجوان موت کے پھندے سے کیسے بچا؟

کلیجہ تھام لو پہلے سنو پھر داستاں میری

صاحبان! میں نہ اشتہاری حکیم ہوں نہ ڈاکٹر بلکہ ایک معمولی آدمی ہوں۔ بدقسمتی سے مجھے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کا ستیاناس کرنے والی عادت پڑ گئی جس کے نتیجہ بد سے میں بالکل بے خبر تھا۔ اچانک چند ہی سال کے بعد مجھے نامردی کا نامبارک مرض لاحق ہو گیا۔ سرعت، جریان، احتلام وغیرہ کی بے انتہا شکایت ہو گئی کے سبب میرا چہرہ دن بدن لاغر اور زرد ہوتا جاتا تھا۔ دل ہر وقت دھڑکتا۔ سر چکراتا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آتا۔ گھبراہٹ، سستی اور اداسی چھائی رہتی تھی۔ دوست واحباب میری پژمردگی کا سبب پوچھتے تھے مگر میں کسی کو اپنی حالت سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا مگر در پردہ مشہور شہروں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور حکیموں سے جن کے لمبے چوڑے اشتہاروں کی کوئی حد نہ تھی ادویات منگوا کر استعمال کرتا رہا لیکن مجھے بالکل خاک فائدہ نہ ہوا بلکہ علاوہ خرچ کے کئی اور تکلیفوں کا سامنا کر کے بھی مایوس ہی رہنا پڑا۔ اسی مایوسی کی حالت میں زندہ درگور ہونے کو ترجیح دیتا تھا۔ اتفاقاً خوش قسمتی سے مجھے ملازمت کے ایک سلسلہ میں کشمیر جانا پڑا۔ جس جگہ میں جا کر ٹھہرا وہاں ایک فقیر خضر صورت جو کہ پہلے سے وہاں مقیم تھے۔ مجھے پوچھنے لگے کہ تم اداس اور تمہاری صورت مریضوں کی سی کیوں ہے؟ میں نے درد دل اس خضر صورت اور کامل سنیاسی سے اپنا سارا دکھ کہہ ڈالنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب میں زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس فقیر کامل نے ازراہ شفقت میرے حال زار پر رحم فرما کر ایک نسخہ کھانے کیلئے مقوی گولیوں کا، اور دوسرا نسخہ رگوں اور پٹھوں کی سستی دور کرنے کیلئے مالش کا بتایا۔ چنانچہ میں نے حسب ارشاد اس صاحب کمال کے لاتعداد اور جنگلی جڑی بوٹیاں اور کئی ادویات بازار سے خرید کر بمعہ جوہر کیمیا کو بدبر و اس صاحب کمال کے تیار کر کے استعمال کرنا شروع کیا۔

ناظرین! میں خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہتا ہوں کہ ساتویں روز ہی میری تمام شکایتیں رفع ہونی شروع ہو گئیں اور میں اپنے آپ کو قابل فخر مرد کہنے کا مستحق ہو گیا۔ اگرچہ مجھے چند ہی روز کے استعمال کرنے سے ضبط ہونا مشکل ہو گیا مگر بموجب ارشاد اپنے محسن خضر صورت کامل سنیاسی کے اکیس روز تک پرہیز اور علاج جاری رکھنا پڑا۔ میں ہر روز تین ساڑھے تین سیر دودھ باآسانی ہضم کر لیتا تھا۔ میرا چہرہ بارونق۔ بدن مضبوط۔ بینائی طاقتور ہو گئی۔ اب میں ایسا قابل فخر مرد ہو گیا ہوں جس کے بیان کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ واپس آ کر باقی ماندہ دوائی نامردی کے مایوس مریضوں پر تجربہ کیا تو ہر قسم کی نامردی، سستی، جریان، احتلام، سرعت وغیرہ کے لئے اکسیر سے بڑھ کر پایا پھر کئی ایک دور اندیش اصحاب کے اصرار اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اشتہار بغرض رفاہ عام دیا جاتا ہے۔ کہ جو صاحب اس شرمناک اور قبیح عادت کے شکار ہیں اور حظوظ انسانیت سے محروم ہو بیٹھے ہیں اور سینکڑوں روپیہ علاج معالجہ پر خرچ کر کے مایوس ہو چکے ہیں وہ اس قلیل القیمت اور سریع الاثر دوائی کو استعمال کر کے صحت یاب ہو جائیں اور خدا کے فضل کے گیت گائیں۔ قیمت صرف لاگت ادویات اور اشتہار پر بمشکل اکتفا کی ہے۔

ہزاروں خطوط اور سندات میں سے

چند تازہ آرا کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیے

ایک بکس اور بھیج دیجئے

ڈی ایل دتا سگر گڑھ سے تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے آپکے دواخانے سے طلا اور گولیاں منگائیں جو بہت زیادہ مفید ثابت ہوئیں۔ براہ کرم ایک بکس اور روانہ فرما دیجئے۔

آپکی دوا سے مجھے فائدہ ہوا

ڈاکٹر ایچ پی لڑ و یادھر میو رہ لاہور پارسل موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ دوا سے مجھے بے حد فائدہ ہوا۔ میرے ایک مریض کیلئے ایک بکس اور بھیج دیں۔

آپکی دوا فی الواقع بے مثال ہے

حکیم بی اے قریشی چندر نگر بنگال سے تحریر فرماتے ہیں۔ آپ کا بھیجا ہوا طلا اور گولیاں میں نے اپنے مریضوں کو استعمال کرائیں دوا فی الواقع بے مثال ہے۔

فائدہ بہت کم ملحوظ ہے۔ قیمت مقوی گولیاں فی شیشی جس میں ۲۱ روز کی ۴۲ خوراک موجود ہے۔ صرف دو روپیہ (عہ) قیمت روغن مالش طلا جو ۲۱ روز تک رگوں اور پٹھوں کے لئے کافی ہے۔ فی شیشی دو روپے آٹھ آنے (عہ) جریان کے لئے یہ گولیاں از حد مفید ہیں۔ مادرزاد نامردی کے سوائے خواہ کسی قسم کا نامردی کا مریض کیوں نہ ہو اکسیر ہے۔ روغن مالش طلا سے کسی قسم کی چھنسی یا آبلہ ہرگز نمودار نہ ہوگا۔ اس دوائی میں کشتہ وغیرہ کی آمیزش نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بچہ جوان اور بوڑھا بآسانی بغیر لحاظ موسم کے ان گولیوں کا استعمال کرسکتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس دوائی کے استعمال کے بعد دوبارہ کسی دوائی کی ضرورت نہ رہے گی۔ آخر میں یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اشتہار نکالنے سے میری کوئی ذاتی غرض نہیں اور نہ میرا مدعا جعلی اشتہار شائع کرکے پبلک سے روپیہ کمانے کا ہے بلکہ ہر خاص و عام کا فائدہ مدنظر رکھ کر احباب کے اصرار پر اشتہار شائع کیا جا رہا ہے۔ تندرست اور شوقین اصحاب بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے استعمال سے سست سے چست اور چست سے طاقتور بن جاتے ہیں۔ اگر بڑھاپے میں بھی لطف جوانی اٹھانا چاہتے ہیں تو ان گولیوں اور روغن مالش طلا کا استعمال کریں۔ الغرض جب تمام جسم ڈھیلا ہو گیا ہو تو ان کا استعمال کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ مختلی دکھوں کا تمام دنیا کی دواؤں سے عجیب و غریب علاج ہے۔

نیز عورتوں کی جوانی قائم رکھنے کے لئے:۔ جو عورتیں جریان الرحم یا اخراج رطوبت یعنی لیکوریا جیسی خطرناک امراض میں مبتلا ہوں ان کے لئے مقوی گولیاں از حد مفید ہیں ضرور تمند اصحاب تجربہ کریں۔ مکمل پرچہ ترکیب ہمراہ ہوگا۔ محصولڈاک آٹھ آنے علاوہ۔ تمام خط و کتابت پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔

خاص نوٹ:۔ وہ اصحاب جو ہم سے دوائی منگا کر استعمال کریں اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔ کیونکہ کئی اصحاب نے یہ پیشہ اختیار کر رکھا ہے کہ ہم سے دوائی منگا کر زیادہ قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں لیکن ایسا کرنا گناہ ہے۔ آرڈر دیتے وقت پتہ خوشخط لکھیں غیر ممالک قیمت پیشگی۔

شرطیہ علاج اور شرطیہ وعدہ:۔ ہندو کو دھرم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر میری دوائی کے استعمال سے حسب منشاء فائدہ نہ ہو تو حلفی تحریر بھیج کر قیمت واپس منگا لیں۔ عدم صحت کی صورت میں کسی کا پیسہ رکھنا گناہ سمجھتا ہوں۔ اگر کوئی صاحب اس دوائی سے فائدہ نہ اٹھائیں تو ان کی قسمت۔ ہزاروں تعریفی خطوط اور سرٹیفکیٹس موجود ہیں۔ جن کے لکھنے والے عام صاحبان کے علاوہ کئی ڈاکٹر حکیم اور وید ہیں۔ ڈاکٹروں حکیموں اور ویدوں کی رائے ہے کہ آپ کی مقوی گولیاں، روغن مالش طلا تیر بہدف ہیں

ضروری اطلاع:۔ یاد رہے کہ میری دوائی صرف نامردی۔ سستی۔ جریان۔ احتلام۔ سرعت۔ کمزوری۔ لاغری اور جریان الرحم و لیکوریا کے لئے مخصوص ہے۔ یہ امراض خواہ کسی سبب سے ہوں جلق یا کثرت مباشرت یا عادت بد سب اسباب کے لئے یکساں مفید ہے۔ سوزاک یا آتشک سے پیدا کی ہوئی کمزوری کے لئے اس کا استعمال کرنا طاقت کا بیمہ کرانا ہے۔ مادرزاد نامردی کے سوائے میری دوائی اکسیر ہے۔

آپ کی دوا کا اشتہار سچا ہے

سردار لکھا سنگھ صاحب کنجاہ ضلع گجرات سے لکھتے ہیں۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کے لئے آپ سے دوائی منگائی۔ بہت مؤثر ثابت ہوئی۔ آپ کی دوا کا اشتہار سچا ہے۔

جناب صوفی صاحب

تسلیم! ایک ماہ ہوا میں نے طلا اور گولیاں آپ سے منگوا بھیجی تھیں۔ معجزنما اثر ہوا۔ یقین مانئے کہ ایک ہفتہ میں ضائع شدہ طاقت بحال ہو گئی۔ میں آپ کو اس حیرت انگیز ایجاد پر مبارکباد دیتا ہوں۔

(خاکسار پروفیسر ایم آر چولہ ٹانڈہ اڑمڑ ضلع ہوشیارپور)

ان کے علاوہ دفتر میں ہزاروں خطوط اور سندات موجود ہیں جن کو دفتر میں تشریف لا کر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

صوفی ایم اے خاں (اے ایل) سباتھو شملہ

کی ماں نے مجھے ٹھکرا دیا۔

یہ سارا واقعہ بغاوت سے پہلے سال کا ہے۔ اس کے بعد سے میں دنیا کے ممالک کا سفر کرتا رہا اور جہاں گیا وہاں بدی دیکھی۔ پیرس میں مرتے مرتے بچا۔ جو اس میرا لڑکپن کا دوست جو اب دشمن ہو چکا تھا وہاں موجود تھا۔ وہ جمہوریت پسند جماعت کا لیڈر بن گیا تھا میں حکومت کی فوج کے ساتھ کانگریس کے خلاف لڑ رہا تھا اور ایک روز جب اپنے کیمپ کے قریب گھوم رہا تھا اچانک جو اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ مجھے پہچان گیا۔ "آخر میں نے تمہیں پا لیا" وہ غصہ میں چلایا اور ہم گتھم گتھا ہو گئے اور جب ہم لڑ رہے تھے تو میرے ساتھی ایک سپاہی نے اسے گولی کا نشانہ بنا کر مجھے رہائی دلائی۔

یہ تھی میری داستان ــــــــــ

اس قصہ کے ختم ہوتے ہوتے ہم ایک گاؤں کی سرائے تک پہنچ گئے۔ ہم چند گھنٹے آرام کر کے صبح سویرے سفر کرنے کے ارادہ سے یہاں اتر پڑے۔ اس کی دردبھری داستان سن کر مجھے غمگین آرکی سے اور بھی محبت ہو گئی۔

جب ہم ناشتہ کر رہے تھے اس نے دفعتاً کہا "میں نے تصفیہ کر لیا ہے پہلے میں مارسیلز جاؤں گا اور پھر اٹلی ــــ اب مجھے آپ سے الگ ہونا ہی پڑے گا۔"

اس سے جدا ہونے کا مجھے بڑا غم تھا لیکن میں اسے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

"ہروان آرکی" میں نے کہا۔ "مجھے آپ سے بڑی دلچسپی ہو گئی ہے اور ساتھ ہمدردی بھی۔ میری دلی آرزو تھی کہ میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا۔ لیکن افسوس بجز ایک نصیحت کے میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے جسے آپ کی نذر کروں۔"

"وہ کیا؟" اس نے افسردہ لہجہ میں پوچھا۔

"آپ غمگین ہیں بہت غمگین اس لئے کہ زندگی کی ابتدا ہی میں آپ کو ایسے واقعات پیش آئے اور ایسے ناگواروں سے دوچار ہونا پڑا کہ آپ کا دل بجھ گیا اور آپ کو انسانوں سے نفرت ہو گئی۔ یہ مانا کہ ایک شخص چند ہستیوں کی بدافعالیوں سے تنگ آ کر دنیا سے بیزار ہو گیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ محبت کرنے والے کتنے معصوم اور پاک دل آپ کی سرد مہری سے مجروح ہو رہے ہیں۔ مارسیلز اور اٹلی کا قصد چھوڑ دیجئے وہاں خوش نہ رہ سکیں گے۔ کراں سیک جائیے آپ کا مضطرب دل البرٹ ہی کے خاندان میں سکون پائے گا وہ آپ کی کمزوریوں کو درگزر اور آپ کی نیکیوں کی تعظیم

میں نے ایک مخلص دوست کی طرح یہ الفاظ کہے اس نے کوئی مخالفت نہ کی۔ کچھ لمحے میں بڑبڑایا کیا ــــ [illegible] گاڑی تک آیا۔ پرانے دوستوں کی طرح ہم ایک دوسرے سے لپٹ [illegible] وہ میرے الفاظ سے کچھ متاثر ضرور معلوم ہوتا تھا۔ آخری مرتبہ ملاقات کے وقت میں نے کہا "آپ کے درد کی دوا کراں سیک میں ہے" ہم رخصت ہو گئے۔

پرگین پہنچ کر معلوم ہوا کہ میرا فوجی دستہ چھ روز ہوئے بلجیم کو روانہ ہو چکا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری بھی سنی کہ مجھے ترقی دے کر میجر بنا دیا گیا ہے۔ میں جلد وہاں پہنچ گیا اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہو گیا۔

دو سال تک قلیل کامیابی کے ساتھ اسپینیوں سے جنگ ہوتی رہی۔ مقابلہ برابر کا تھا۔ کیونکہ اسپینی لوگ دشمنوں سے نہیں ڈرتے وہ لڑنا اور مرنا جانتے ہیں۔ روز ایک آدھ جھڑپ ہوتی رہی۔ وہاں کی آب و ہوا میرے موافق نہ تھی۔ خوشی کی وہ گھڑیاں جو میں نے وہاں گزاریں وہ میرے تنہائی کے لمحات تھے ــ وہ لمحات جن میں میں کراں سیک اور رنگینی کے رنگین خواب دیکھا کرتا تھا اور اس کا خیال میرے دل و دماغ پر اس قدر گہرا تھا کہ میں بیٹھے بیٹھے پنسل کی لکیروں سے اس کی شبیہہ بنا لیتا۔

علاوہ اس کے میں فوج کے ساتھ بھی اکثر تنہا اور خاموش رہتا۔ میرے ساتھی مجھے خشک مزاج کہتے۔ یہ اثر غالباً آرکی کی صحبت کا تھا لیکن مجھ میں اور اس میں فرق تھا۔ میں لوگوں سے اس لئے دور نہیں بھاگتا تھا کہ میری زندگی کے پچھلے دور ناکامیوں سے معمور تھے۔ بلکہ اس لئے کہ مجھے البرٹ کے خاندان سے دوبارہ ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔ میرے باپ کی موت اور فوج کی ملازمت نہ چھوڑنے کا خیال بھی میری اس موجودہ بے چینی کا باعث تھا۔ اگرچہ یہ باتیں میرے لئے ایک بڑی حد تک مجبوری تھی۔

دو سال تک میں یہ بے لذت زندگی گزارتا رہا اس میں شک نہیں کہ اس دور میں میں نے بہت سے فوجی کارنامے کئے لیکن ٹراگونا کی لڑائی میں مجھے شکست ہوئی جس نے میری شہرت کو داغدار بنا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں لفٹننٹ کرنل کے عہدے پر مامور ہو چکا تھا۔ لڑائی تیزی کے ساتھ جاری تھی۔ میں اپنے فوجی دستے کی سب سے پہلی صف میں تھا۔ اچانک ایک گولہ میرے پاؤں پر آ گرا اور میں زمین پر گر پڑا۔ لوگ مجھے خیمے میں لے آئے۔ میں کئی گھنٹے بے ہوش رہا۔ پھر مجھے بارسلونا

[illegible] یہ طے ہوا کہ میرے پاؤں کا زخمی حصہ کاٹ دیا جائے۔ مجھے یہ سن کر کوئی زیادہ صدمہ نہ ہوا۔ اگر یہ کہا جاتا کہ اب میرے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے تب بھی میرے لئے وہی بات تھی مجھے زندگی سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔

لیکن واقعات نے پلٹا کھایا۔ ایک نوجوان سرجن نے میرے پاؤں کا معاینہ کیا اور دوسرے ڈاکٹروں کے خلاف اپنی رائے قائم کی۔ صدر سرجن نے تو کہا تھا کہ یا تو مجھے پاؤں سے ہاتھ دھونا پڑیگا یا زندگی سے ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز مجھے قبول کرنی ہوگی۔ نوجوان سرجن اس کے خلاف تھا کہ وہ کہتا تھا۔ کہ دونوں چیزیں بچائی جاسکتی ہیں۔ صرف خرابی یہ ہوگی کہ میرا زخمی پاؤں پھر فوجی ملازمت کے قابل نہ ہوگا۔ میں نے نوجوان سرجن کی رائے سے اتفاق کیا اور خود کو اسے سونپ دیا۔ میرا فیصلہ کامیاب رہا اور بغیر پاؤں کھوئے ہوئے میں نے زندگی حاصل کر لی۔

اتنے عرصہ میں میری پنشن منظور ہو گئی اور میں بارسیلونا سے پہلے طبی غسل کے لئے لیگورس اور پھر بریگٹن آیا۔ میرا پاؤں ابھی بہت کمزور تھا بغیر لکڑی کے سہارے میں چل نہ سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرا پاؤں درست ہونے لگا۔ ڈاکٹروں نے مجھے طبی غسل جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ میری جائداد کے تمام کاروبار میرے ایک رشتہ دار کے زیر اہتمام چل رہے تھے اس لئے بجائے اپنے گھر جانے کے طبی غسل کے لئے کران سبیک جانا زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ میں ان لوگوں کے متعلق اکثر سوچا کرتا۔ پھر بھی چند متوحش خیالات مجھے وہاں جانے سے روک رہے تھے۔ یہی فینیئی کی شادی ضرور ہو گئی ہوگی البرٹ کا خاندان بھی زمانے کے امتداد کے ساتھ ساتھ بہت بدل گیا ہوگا۔ اور اگر فینیئی اب تک کنواری ہے تو بھی مجھے اس سے کیا توقع ہو سکتی ہے میں نے اس سے محبت کی لیکن اس نے محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا۔ وہ مجھے نہیں چاہتی ——— کبھی سوچتا کہ شاید میرا بے چین دل وہاں کچھ سکون پاسکے پھر خیال آتا کہ فینیئی زندہ بھی ہے یا نہیں اس تصور سے میرا دل کانپ اٹھتا۔ کبھی گمنامی میں زندگی کے بقیہ دن گزار دینا بہتر معلوم ہوتا۔ غرض میں اپنے ایک کمزور پاؤں کے ساتھ خوش تھا اس لئے کہ مجھے کامل آزادی حاصل ہو چکی تھی۔ دنیا میرے سامنے کھلی ہوئی تھی۔

میں کئی دن اسی کشمکش و پیچ میں رہا اور آخرکار اپنے استدلالات کے خلاف کران سبیک جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

برگٹن میں مجھے ایک گاڑی اور گھوڑا خریدنے کا موقع مل گیا میں اپنے وفادار نوکر تھامس کو لے کر کران سبیک روانہ ہو گیا۔ چند دن کے سفر کے بعد ایک بار پھر مجھے وہ دلفریب مقام نظر آیا۔ جو میرے تخیل کا ایک جزو بن گیا تھا۔ ایک غیر معمولی الجھن میرے دل و دماغ پر چھا گئی۔ میں نے اپنے جی میں کہا۔ کاش میں ابھی کچھ دور اور ہوتا! اور قریب تھا کہ میں گاڑیبان کو واپس لوٹنے کا حکم دیدوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا کوئی نامعلوم خوف وہاں میرا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں سڑکوں اور گلیوں سے کھڑکھڑاتے ہوئے گاڑی کران سبیک کی سرائے کے سامنے جا کر رک گئی۔

اتوار کا سہانا دن تھا۔ البرٹ کا سارا خاندان گرجا میں تھا بجز ——— کے۔ میں جونہی داخل ہوا وہ ملنے آئی میں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا ——— وہ فینیئی تھی ——— نہیں وہ فینیئی نہیں تھی۔ ——— شاید فینیئی کی ہم شبیہ کوئی دوسری دوشیزہ تھی۔ میں اپنے خیال میں ہمیشہ سوچا کرتا۔ کہ وہ اپنی زندگی کی اٹھارہ بہاریں دیکھ چکی ہوگی لیکن کیا چند سال کی مدت نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ وہ نرم گفتاری خوبصورتی اور ہر حیثیت سے ایک مکمل عورت تھی اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت تھی میں ٹھیک ٹھیک نہیں بیان کر سکتا اس نے ہاتھ ملا کر میں اس کے سامنے گونگے کی طرح خاموش کھڑا ہو گیا! اس نے دوستانہ طریقہ پر ایک لطیف تبسم کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا۔

"اف تم کتنی حسین ہو گئی ہو۔" آخر میں نے کہا "لیکن کیا تم مجھے نہیں پہچانتیں"؟

سچ تو یہ ہے کہ اس نے پہلی ہی نظر میں مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ ہنس پڑی اور خوشی کی ایک لہر اس کے رخسار پر دوڑ گئی۔

"کیا آپ ہمیں اتنا خود غرض اور مغرور سمجھتے ہیں"۔ وہ بولی "ابھی کل ہی رات کی بات ہے۔ کہ ہم لوگ آپ کو یاد کر رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ خدانخواستہ مر گئے ——— کم از کم ہم لوگوں کے لئے نہ جانے کس نامعلوم طاقت نے آپ کو دوبارہ یہاں آنے پر مجبور کیا؟"

"آپ یہ کیا کہتی ہیں" میں نے اس کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا۔ نامعلوم طاقت کیا ہو سکتی ہے۔ دنیا میں حسن سے بھی زیادہ کیا کسی چیز میں طاقت ہوتی ہے! اور پھر وہ بھی آپ کا ——— میں اسپین میں مر بھی جاتا تو آپ اپنے حسن کے جادو سے اسے یہاں کھینچ لاتیں"

"اگر یہ مجھ سے ممکن تھا" اس نے شرارت سے ہنستے ہوئے کہا "تو قبل اس کے کہ آپ اسپین پہنچتے میں آپ کو یہاں کھینچ لاتی"۔

"آہ"! میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ جہاں ہر چیز

اپنی ترتیب میں تھی جیسی کہ آج سے پانچ سال قبل۔ پلیز ڈاکٹر مجھ پر رحم کیجئے اور میری مدد کیجئے کہ میں اپنی جنت ہمیشہ کے لئے یہاں بنا سکوں کیونکہ جب سے میں نے آپ کو چھوڑا ہے سکون کی ایک سانس بھی نہیں لی"۔

"تو یوں کہئے کہ آپ اُن فرشتوں میں سے ایک ہیں جسے حرص و ہوس کی دنیا میں آسمان سے زمین پر پھینک دیا گیا ہے"۔ اس نے جواب دیا۔ لیکن یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آپ اس زمین سے جلد بیزار ہو کر پھر اسپین کے رنگین آسمان کی طرف اڑ جائیں گے؟

یہ تو میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا! البتہ اس بہشت کی ملکہ سب کچھ جانتی ہے اگر اس کی ہمدردی اور محبت میرے شامل حال رہی تو میں بھی اپنی وفاداری ثابت کر دکھاؤں گا"

اس نے اپنی انگلیوں کو ایک خاص انداز میں میری طرف نچاتے ہوئے کہا "تو یقیناً آپ آسمان سے پھینکے ہوئے کوئی فرشتے ہیں — اور ظاہر ہے کہ بہشت کو چھوڑنے والا زمین پر خوش نہیں رہ سکتا۔

"تو مہربانی فرما کر یہ بتلایئے کہ کیا میری واپسی یہاں پر میرے لئے بہتر ثابت نہ ہوگی۔ آپ جب تک زبردستی اس بہشت سے نہ نکالیں گی میں اسے دوبارہ ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ کہئے میرے حق میں آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"

وہ مسکرائی اور کچھ نہ بولی۔

کیا سچ مچ آپ مجھے یہاں سے نکالیں گی؟ میں نے پھر پوچھا اور جواب کے لئے آنکھیں اس کے چہرے پر جما دیں۔

اس نے پہلو بدلتے ہوئے جواب دیا "اس کا تصفیہ آپ کے طرز عمل کے مطابق ہوگا۔ ہم غور کریں گے لیکن مجھے خوف ہے کہ اسپین کی چنچل لڑکیوں نے آپ کو بہت چالاک بنا دیا ہوگا"۔

ہم اسی طرح باتوں میں مصروف تھے کہ دروازہ کھلا اور البرٹ اپنی بیوی اور متعدد چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ دونوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ مجھے مجبور کیا گیا کہ میں اپنی واپسی کی ساری داستان کہہ سناؤں۔ وہ سب میرے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں چھوٹی لڑکیاں بالکل میرے قریب آ گئیں۔ اور میری آنکھیں ان میں حسین اینی کو تلاش کرنے لگیں مجھ... اس کے متعلق پوچھنے کی ہمت نہ تھی کیونکہ میں کوئی غیر متوقع جواب سننا نہ چاہتا تھا۔ مجھے گمان ہوا کہ کہیں اس کی معصوم اور پاک روح اس لطیف دنیا کی طرف پرواز نہ کر گئی ہو پھر بھی میری نظریں اس کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹکتی رہیں۔ [illegible] ہو کرنل؟" البرٹ نے پوچھا۔

"ایک کی کمی ہے" میں نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" البرٹ کی بیوی چلائی "تم لینی جاؤ نینسی سے کہو کہ وہ جلد آئے کل جس دوست کے متعلق ہم باتیں کر رہے تھے وہ آ گئے ہیں"۔

جولیٹ یہ سن کر دوڑ گئی۔ "نینسی یہ سن کر کتنی خوش ہوگی" میرے البرٹ نے کہا۔ یہ الفاظ سن کر میں حیران سا رہ گیا۔ وہ اینی تھی جس کو میں اب تک نینسی سمجھتا رہا۔ میں دراصل غلطی پر تھا۔ ان چند برسوں کے عرصہ میں اینی ایک مکمل عورت بن گئی تھی۔ میرا چہرہ حیرت سے متغیر سا ہو گیا تھا! اور سب میری بے چینی غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ حقیقت میں اینی ہی تھی لیکن اس وقت وہ اتنی سنجیدہ اور زرد ہو گئی تھی کہ میں اُسے دیکھ کر گھبرا گیا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا" میں نے اس سے پوچھا اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کی ماں نے حیرت سے دیکھا اور اسے باہر ہوا میں جانے کے لئے کہا۔

"آپ نے اپنی اچانک آمد سے لڑکی کو چونکا دیا۔ البرٹ بولا۔ نینسی پر بھی شاید یہی اثر ہو۔ ہمیں اس کو پہلے سے مطلع کر دینا چاہئے کہیں اس کے دل پر گہرا اثر نہ ہو۔ وہ چند مہینوں میں ایک اور بچے کی ماں بننے والی ہے اور ہماری مسرت اس پوتے سے مل کر دو چند ہو جائیگی۔

"کیا نینسی کی شادی ہو گئی؟" میری آواز حلق میں اٹک گئی۔

"کیا ہم میں سے کسی نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ تین سال ہوئے اس کی شادی آرتی کے ساتھ ہو گئی"۔

"اس فلسفی کے ساتھ؟"

"ہاں" البرٹ نے جواب دیا "لیکن نینسی نے اس کی زندگی میں ایک نمایاں تغیر کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ دل چسپ شخص اب گران سیک میں کوئی نہیں۔ وہ اب بہت بدل گیا ہے کرنل! اس نے یہاں ایک شاندار محل بھی خرید لیا ہے اور یہیں اپنی مستقل سکونت بھی اختیار کر لی ہے کیونکہ میں اپنی کسی لڑکی کو گران سیک چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا — میری لڑکیاں یہ جانتی ہیں۔

"البرٹ" میں نے آہستہ سے کہا اور اس کو کھڑکی کی سمت لے گیا "مجھے ایک بات پوچھنی ہے کیا کوئی اور چھوٹا خوبصورت مکان گران سیک میں خریدا جا سکتا ہے؟"

وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے دیکھا پھر بولا "ابھی کچھ دن کی بات ہے کہ ہم اس باغ والے مکان کے متعلق ذکر

کر رہے تھے۔ وہ بڑی سڑک کے سامنے واقع ہے۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ فروخت کیا جانے والا ہے۔ لیکن اینی سے دریافت کیجئے وہ اس مکان کے متعلق مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔"

میں ابھی چھوٹی لڑکیوں سے متعارف ہو رہا تھا۔ کہ میرا پرانا دوست آرگی اور نینی کمرے میں داخل ہوئے۔ نینی کی گود میں ایک خوبصورت سال بھر کی بچی تھی۔ میں اسے اچھی طرح پہچان گیا۔ وہ نینی ہی تھی۔ بچھڑے ہوئے دوستوں کی طرح ہم ایک دوسرے سے بڑے خلوص کے ساتھ ملے "میں آپ کا بڑا احسان مند ہوں" ہروان آرگی نے مجھ سے کہا "مجھے امید ہے کہ آپ مجھے شکر گزار ہونے کا موقع دیں گے اور میری مہمانی قبول فرما کر مجھے خوش کریں گے۔ آپ نے رخصت ہوتے وقت مجھے جو نصیحت کی تھی۔ میں نے اس پر عمل کیا اور بہت کامیاب رہا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے کہا تھا کہ بجائے اٹلی کے مجھے کران سیک جانا چاہیئے اور وہیں میرے درد کی دوا ملے گی۔ میں اٹلی گیا لیکن کچھ نہ پایا۔ فلورنس میں آپ کے الفاظ مجھے یاد آتے رہے۔ میں کران سیک اور یہاں اپنے دل کا سکون پایا۔" یہ آخری جملہ اس نے اپنی خوبصورت نینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ان کی باتوں پر آپ یقین نہ کیجئے" نینی بولی "یہ اب بھی بعض وقت اپنی پرانی حالت پر آ جاتے ہیں اور دنیا والوں سے بیزاری ظاہر کرنے لگتے ہیں۔"

وہ ایک پرمسرت ازدواجی زندگی بسر کر رہے تھے۔ آرگی نے مجھے اپنے ساتھ کھانے پر مدعو کیا۔ البرٹ کا پورا خاندان حسب معمول ہر اتوار کو آرگی کے پاس جاتا تھا۔ آرگی نے مجھے بتایا کہ اب وہ اپنی ماں سے مل کر اسی مکان میں رہتی ہے۔ بغاوت کے اختتام پر اسے اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ کھو دینا پڑا۔ اسی زمانے میں آرگی کی شادی نینی کے ساتھ ہوئی اور نینی کے اصرار پر اس نے اپنی ماں سے کران سیک آکر رہنے کی درخواست کی۔ جسے اس نے قبول کر لیا۔ میری اس سے بہت جلد دوستی ہو گئی۔ وہ ایک قابل اور اچھی عورت تھی۔ زمانے کی گردشوں اور مصائب نے اسے بہت ہی نرم دل کر دیا تھا — وہ اب مذہب کی طرف زیادہ مائل دکھائی دیتی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد محفل جمی۔ آرگی اور نینی کا اصرار تھا کہ جب تک میں کران سیک میں رہوں انہیں کے مکان میں رہوں۔ البرٹ مسز البرٹ۔ جولیٹی۔ کیٹی۔ بسل۔ سائمن سب مصروف گفتگو تھے صرف [illegible] تھی جس کی گفتگو میں سننا چاہتا تھا۔ جس کے لفظوں پر میری

قسمت کا آخری فیصلہ تھا۔ وہ اینی تھی۔ میں نے مستفسرانہ نظروں سے اسے دیکھا جیسے میں اس کے کسی حکم کا منتظر تھا۔ مجھ سے اس کی کچھ یاد بہت رنج فرسا تھی لیکن چھوٹی فردن آرگی جب اسے دیکھ کر ضد کرنے لگی تو اینی نے اس کی طرف اپنی بانہوں کو دراز کرتے ہوئے کہا "ننھی فینی آخر تم کب تک میری ضرورت محسوس کرتی رہو گی — میں نہ رہی تو؟" اس کے یہ جملے میری رگ رگ میں پیوست ہو گئے اور دل کو ایک دھکا سا لگا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا گویا وہ یہ جملے میرے لئے کہہ رہی ہے کہ ان کے چھوڑنے کے بعد سے میں نے انہیں ایک خط بھی نہیں لکھا تھا۔ وہ لوگ سب اسی کا شکوہ کر رہے تھے شاید اینی کو سب سے زیادہ انتظار تھا تبھی تو اس نے میرا پارٹ ادا کرتے ہوئے طنز سے کہا "آدمی انہیں خط نہیں [لکھتا] جن سے وہ جدا نہ ہوا ہو"۔ میں نے اس کی تردید کرتے ہوئے یقین دلایا کہ "اینی! تب ان کی یاد ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ رہی۔ چنانچہ کاغذ اور پنسل منگوا کر چند منٹ میں لکیروں سے میں نے اینی کی ایک شبیہہ بنائی۔ اینی کچھ دیر تک تصویر کو غور سے دیکھتی رہی۔ پھر سر کو ایک خاص انداز سے جنبش دیتے ہوئے کہا "ان ہیل یہ تو نینی ہے" اس کے بعد دوسرے ہر ایک نے اسے دیکھا اور سب نے یہی کہا۔ یہ نینی ہے۔ میرے کمال کی داد دی جانے لگی۔ نینی نے آداب بجا لاتے ہوئے کہا "یہ میں ہوں"۔ آرگی نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "تمہیں خود کو مبارکباد کہتا ہوں کہ میں نے یہاں پہنچنے میں دیر نہیں کی۔"

میڈم البرٹ نے معاملہ کو سمجھاتے ہوئے موقع کو اور نازک بنا دیا "لیکن" وہ بولی "مجھے تو اس میں زیادہ مشابہت اینی کی معلوم ہوتی ہے۔ جب ہروان آرگی نے ہمیں چھوڑا تھا اس وقت اس کی عمر ۱۶ سال کی تھی۔ اور یہ شبیہہ اس کی موجودہ عمر سے بہت مناسبت رکھتی ہے یہ مانا کہ اس وقت اینی اس طرح بال نہیں سنوارا کرتی تھی۔ یہ طرز نینی کا تھا۔ مگر یہ بات قابل نظر انداز ہے۔"

"کچھ بھی ہو" سب نے مل کر کہا "اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نینی کا خیال زیادہ غالب تھا۔"

"نہیں" میں بولا "اس سے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دونوں کا خیال میرے دماغ پر مساوی طور سے مسلط تھا۔ اور اگر میں اپنا بیگ کھولوں تو آپ لوگ دیکھیں گے کہ وہ پھول جو مس اینی نے مجھے رخصت کرتے وقت دیا تھا۔ اب تک محفوظ ہے۔"

اینی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اور اس نے دہری نظریں مجھ پر ڈالیں۔ اس کی ماں نے کہا "آپ کی تصویر بھی ہمارے پاس اب تک ایک

خوبصورت فریم کی زینت بنی ہوئی ہے"۔

میرے لئے یہ باعث مسرت تھا۔ کہ ہر شخص میرے ساتھ اپنی محبت کی یاد تازہ کر رہا تھا! اس طرح میں نے ایک روح فرسا کشمکش سے نجات پائی۔

بات یہ تھی کہ انیتی کے معصوم حسن کے ساتھ میری محبت پاک اور بے لوث تھی لیکن میں فنیتی سے محبت کرتا تھا۔ میں ہمیشہ فنیتی ہی کو یاد کرتا اور اسی کی خاطر گران سیک آیا ۔۔۔ اور جب میں پہنچا تو انیتی کے بجائے میں نے فنیتی ہی کو دیکھا لیکن اس کے شباب کا جادو فنیتی کی جوانی سے کہیں زیادہ طاقتور تھا! اس وقت سے انیتی میری رگوں میں بسنے لگی۔

یہ ایک عجیب احساس تھا جس نے مجھے اپنی غلطی کے اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ فنیتی سے پہلے انیتی ہی نے مجھے اپنی طرف کھینچا تھا۔ فنیتی کے حسن کا جادو ٹوٹ چکا تھا اگر وہ اس وقت شادی شدہ نہ ہوتی تب بھی میں انیتی کو ٹھکرا نہ سکتا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میں صرف فنیتی ہی کے حسن کی پرستش کرتا تھا انیتی ایک فرشتہ تھی جو اس ناپاک دنیا کے لئے نہیں بنائی گئی تھی۔ وہ عام انسانوں سے بہت بلند تھی! وہاں تک نفسانی خواہشات میں بسی ہوئی کثیف روح کا پہنچنا مشکل نظر آتا تھا۔

فنیتی اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش تھی! اور وہ اس کے ساتھ فردوسی زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ محل جس میں وہ رہتے تھے ایک دلکش مقام پر واقع تھا۔ چاروں طرف باغ اور ہر قسم کی دلچسپی کی چیزیں موجود تھیں۔ آرتی نے اس میں کچھ اضافہ بھی کیا تھا میں وہاں روز جاتا اکثر طبی غسل کے بعد سہ پہر میں اس کی سایہ دار روشوں پر ٹہلا کرتا مجھے آرتی کی خوش قسمتی پر رشک آتا۔ جب میں دیکھتا کہ وہ باغ کے آخری حصہ میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے محبت کے گہواروں میں جھول رہے ہیں اور جب گاتی ہوئی ندی کے کنارے بیٹھ کر دو دلوں کی نہ ختم ہونے والی گفتگو شروع ہوتی تو میں بھی اپنی زندگی کے رنگین خواب دیکھنے لگتا اور انیتی کو اپنے ساتھ ٹہلتا ہوا پاتا ۔۔۔ لیکن روز بروز میری مایوسی بڑھتی جاتی۔ شاید انیتی مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی گران سیک میں میں چار ہفتہ ٹھہرا اگر میرے ساتھ اس کے برتاؤ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ میں چار ہفتہ اور ٹھہرا لیکن کبھی ایسا موقع نہ ملا کہ وہ تنہائی میں مجھے مل جاتی اور میں دل کھول کر اپنا درد بیان کر سکتا تین ہفتے گزر گئے۔ اور میں تنگ آ گیا۔ ایک ملازم لگا ہوا تھا جو مجھے گران سیک چھوڑنے نہ دیتا تھا۔

آج سے چار پانچ سال قبل فنیتی سے پہلی ملاقات کے بعد جیسی خاموشی رہی وہی حال انیتی کا تھا۔ پہلی کی طرح یہ دوسری بھی جانتی تھی کہ کسی کے سنجیدہ جذبات کے ساتھ کیسا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ میرا دل ٹوٹ گیا! اور خزاں کے شروع ہوتے ہوتے میری ساری امیدیں ویران ہو گئیں۔ میں نے خیال کیا کہ اس بے چینی میں دن کاٹنے سے گران سیک کو چھوڑ دینا بہتر ہے۔ میری زندگی کا سکون اجڑ چکا تھا۔

میں نے کہا کہ میرے عزیز اور رشتہ دار اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ میں وطن آ کر اپنی جائداد کی دیکھ بھال کروں ۔۔۔ اور تب میں نے اپنی روانگی کا تمام بندوبست کر لیا۔

سب کو میری روانگی کا ملال تھا! ان میں سے ایک شاید انیتی بھی تھی۔ وہ مجھ سے یہ وعدہ لینا چاہتے تھے۔ کہ موسم بہار کے شروع ہوتے ہوتے چند مہینوں کے لئے پھر آؤں! اس اصرار میں انیتی شریک نہ تھی میں سوچنے لگا کہ یا تو وہ مجھ سے محبت کرتی ہے یا مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔

جانے سے قبل ایک صبح کو میں انیتی اور فنیتی آرتی کے خانہ باغ میں ٹہل رہے تھے۔ میں چلتے چلتے ایک خزاں زدہ گلاب کی جھاڑی کے سامنے ٹھہر گیا اور انیتی سے مخاطب ہوا۔

گران سیک کو جب میں پہلی مرتبہ چھوڑ رہا تھا۔ آپ نے ایک گلاب کا پھول مجھے اپنی نشانی کے طور پر دیا تھا لیکن اس مرتبہ مجھے کچھ نہ ملے گا۔ کیونکہ پھولوں کی شہزادی تو چلی گئی اور اس نے اپنے پیچھے میرے لئے کانٹے چھوڑ دیئے صرف کانٹے۔

انیتی ہنس پڑی اور شرمندہ ہو کر نگاہیں زمین پر گاڑ دیں پھر گردن اٹھا کر ایک خاص لوچ اور مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اب کے میری چھوٹی بہن کی باری ہے"۔

فنیتی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ایک چھوٹی لڑکی آئی اور اسے بلا لے گئی۔ انیتی بھی اس کے ساتھ جانا چاہتی تھی لیکن فنیتی یہ کہتی ہوئی جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔ "صرف ایک منٹ کے لئے اس وقت تک آپ لوگ جلد اس تکرار کا فیصلہ کر لیں"۔

"تو اس مرتبہ آپ کی کسی نشانی کے بغیر مجھے چلا جانا ہو گا؟" میں نے کہا۔

"کیا آپ کو اس کی ضرورت ہے"۔ وہ بولی۔

"اس لئے نہیں کہ میں آپ کو یاد آیا کروں! افسوس! صرف اس لئے کہ — دور بہت دور وہاں کی ہر چیز مجھے آپ کی یاد دلائے گی۔ وقت بے نشانی میرے غم کو ہلکا کر سکے گی۔ اور شاید اسی طرح میرا مضطرب دل سکون پا سکے۔"

اس نے مجھے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کچھ لجا کر کہا۔ "لیکن اینی جس نے آپ کو گلاب کا پھول دیا تھا۔ اسپین میں لنیتی سے زیادہ آپ کے خیالات کی دنیا کو رنگین نہ بنا سکی جس نے آپ کو کچھ بھی نہ دیا تھا۔ اس لئے میں خود کو لنیتی سے تبدیل کر لینا چاہتی ہوں۔ شاید آپ میں کتنی خود غرض ہوں۔"

اور ساتھ ہی ساتھ شاید بے رحم بھی۔ آپ جانتی ہیں جسوس کرتی ہیں! اور ایسا کرنا بھی چاہیئے۔ میں نے آپ کو بہت صدمہ پہنچایا! اس لئے اب سوچتا ہوں کہ آئندہ کبھی کران ریک نہ آؤں گا۔ اس سفر نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ مجھے ہمیشہ کے لئے بے چین کر دیا اس لئے اب میں کبھی کران ریک نہ آؤں گا۔

"میرے دوست کرنل! آپ مجھے حیران کر رہے ہیں۔ آخر یہ ساری تہمت مجھ ہی پہ کیوں رکھی جائے۔"

"اس لئے کہ آپ مجھے اس مقام سے نکال رہی ہیں۔ جو مجھے دنیا میں سب سے پیارا ہے۔"

"اُف! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں میں آپ کو نکالنا چاہتی ہوں خدا بہتر جانتا ہے۔ ہمارا سارا خاندان آپ کے جانے پر اشک ریز ہے ان میں سے ایک گنہگار میں بھی ہوں۔"

"میرا ٹھہرنا اور جانا صرف آپ کے "ہاں" اور "نہیں" پر ہے لنیتی کی خاطر نہیں۔ آپ کے سارے خاندان کے لئے نہیں۔ صرف آپ کے لئے اینی میں ٹھہر سکتا ہوں۔ آپ کی ایک نظر اس کا تصفیہ کر سکتی ہے۔ آپ جانتی ہیں میں صرف آپ کے لئے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ یہ بسیط دنیا میرے لئے اب کوئی راحت پیدا نہیں کر سکتی۔ کہو اینی کیا میں ٹھہروں؟"

اینی کی پلکیں جھک گئیں۔ اور وہ سایہ دار درخت کی طرف بڑھنے لگی۔

"کیا میں ٹھہروں" میں نے جلدی سے پوچھا اور اس کی کلائی تھام لی۔ اس نے گہری اور سنجیدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا "کرنل! مجھے اور میرے ساتھ خود اپنے آپ کو دھوکا نہ دیجئے۔ اس سے فائدہ؟ پھر اچھی طرح سوچ لیجئے۔ اسپین میں آپ نے اینی کو بھلا دیا! اور صرف لنیتی کی پوجا کرتے رہے۔"

"نہیں میں اینی کو یاد کرتا رہا اور لنیتی کو کبھی نہیں بھولا۔ اینی کا گلاب مقدس خزانے کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ رہا! اور وہ میرے ساتھ قبر میں بھی جائے گا۔"

"لیکن کرنل! آپ جب اسپین سے واپس آئے تو مجھے لنیتی ہی سمجھا۔ اپنے ضمیر کو تو دھوکا نہ دیجئے۔"

"ہاں اینی میں نے پہلے آپ کو لنیتی ہی سمجھا لیکن میرا خیال تھا۔ آپ لنیتی سے زیادہ خوبصورت ہوں گی لنیتی سے زیادہ شوخ اور لنیتی سے زیادہ دلکش۔ میں یہ سوچ کر ہمیشہ خوشی محسوس کرتا۔ کہ آج سے چار یا پانچ سال قبل جو پھول میں نے آپ کو دیا تھا وہ آپ کی بہن کو نہیں دیا۔ شاید اسی لئے کہ صرف وہی اس کی اہل تھیں۔ میں اسپین میں آپ کی پرستش کرتا رہا۔ ایک جنسی ہستی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مقدس فرشتہ سمجھ کر جسے اس خاکی دنیا سے کوئی تعلق، کوئی نسبت نہیں — آہ اینی میں کسی طرح آپ کے قابل نہیں۔"

"یہ کس نے کہا" اس نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

اس سوال میں جو اس کے دل کی گہرائیوں کی آواز تھی اور ان آنسوؤں میں جو اُن کے نازک دل کا فیصلہ نہ تھے میں نے پڑھ لیا۔ "آپ کو ٹھہرنا ہی ہوگا۔"

لیکن میں نے چھیڑنے کے لئے پھر پوچھا: "اینی! تو کیا میں ٹھہر سکتا ہوں؟"

"پھر وہی سوال۔ آپ تو جانتے ہیں۔ کہ میری کمزور آواز میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں اس کا جواب دے سکوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا سر میرے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھ دیا۔

ابھی ہم اسی حالت میں تھے۔ کہ لنیتی کی باہوں نے ہم دونوں جکڑ لیا! اس نے پہلے اپنی بہن کو چوما پھر میری پیشانی پر ایک بوسہ دیا۔

"اینی" پھر وہ بولی۔ مجھے امید ہے کہ تمہارے مہربان دوست کا ہمشیرانہ بوسہ لینے پر تم مجھ سے ناراض نہ ہوگی۔"

لنیتی کی اس مداخلت نے ہمیں بہت جلد بیدار کر دیا اور ہم تینوں آرکی کے پاس پہنچے۔ آرکی نے کہا۔

کہ میری زندگی کی مسرت پوری ہو گئی۔"

پھر ان دونوں میں نہ جانے کس بات پر بحث ہونے لگی۔

میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ فروخت ہونے والے مکان کے بارے میں البرٹ کے توسط سے مالک مکان سے گفتگو ہو چکی تھی۔ جب میں پہنچا تو وہ مکان ہی پر تھا۔ میں نے قیمت کا تصفیہ کیا اور قیمت بھی ادا کر دی۔ تب میں واپس آیا۔

انیکی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میرے اچانک غائب ہو جانے پر وہ حیران تھی۔ مجھے دیکھا تو اپنی بانہوں کو میری طرف پھیلاتے ہوئے بولی۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے کرنل۔ میں تو ڈر گئی تھی۔"

"یہ ایک راز ہے۔" میں نے کان میں آہستہ سے کہا۔ "ایک مکان خریدنے گیا تھا۔ بہت خوبصورت ہے اس میں باغ ہے۔ پھول ہیں — اور سب کچھ ہے — آپ ہی کا تو ہے وہ۔"

وہ شرما کر میرے سینے میں دھنس گئی۔

آرتی اور ہم سب مل کر سرائے پہنچے۔ البرٹ اور اس کی بیوی سے میں نے گھر خریدنے کا ذکر کیا۔ البرٹ ایک لمحہ تک غور سے انیکی کو دیکھتا رہا۔ انیکی دوڑ کر اپنی ماں سے چمٹ گئی — ہمہ ہمہ

دو پیسے

دل گداز افسانہ

از جناب آسی رامنگری

"کیوں اداس ہو؟ کیا آج بھی پیسے نہیں ملے؟"

"ہاں رامی آج بھی پیسے نہیں ملے۔"

"تو مالک سے کہا کیوں نہیں۔ کچھ اناج ہی دے دیتے دیکھتے نہیں ہم سب دو دن سے بھوکے ہیں۔ ایک کھیل بھی اڑکر منہ میں نہیں گئی۔ للوا ادھر ادھر سے گھوم کر آتا ہے۔ اور رسوئی گھر کا کونہ کونہ ٹٹول کر روتا ہوا باہر نکل آتا ہے۔"

"کیا کروں رامی اپنا کوئی بس تو نہیں۔ ہاں ایک بات البتہ کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں۔"

رامی نے اپنی للچائی ہوئی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر پوچھا ——— "وہ کیا؟" رام داس نے پراشتیاق انداز میں کہا۔ "رامی میں نے سنا ہے شہروں میں پیسے برستے ہیں۔ کہو تو وہیں چل کر قسمت آزمائیں۔"

رامی نے ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے کہا ——— "رائے تو اچھی ہے۔ لیکن وہاں چل کر کریں گے کیا؟ اور جو یہاں کام کیا ہے کیا اس کے پیسے چھوڑ دو گے؟"

"ہاں کرنا تو یہی ہوگا۔"

شہر سے بہت دور رہنے والے رام داس اور رامی نے سن رکھا تھا۔ کہ شہروں میں سوا پہر سونا برسا کرتا ہے۔ وہاں کوئی غریب نہیں سبھی بابو بنے پھرتے ہیں۔ وہاں ایک سے ایک بڑھ کر دیالو بھگوان کے بھگت پڑے ہیں۔ یہ سوچ کر ایک روز پو پھٹتے پھٹتے بچے کو ایک چیتھڑے میں لپیٹ کر رام داس اور رامی شہر کی طرف چل پڑے۔

تینوں کسی کسی طرح مرتے جیتے شہر میں پہنچے۔ شہر کی رونق چہل پہل۔ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی بڑی بڑی عالیشان عمارتیں برقی روشنی سے بقعۂ نور بنی ہوئی وسیع سڑکیں۔ ٹرام۔ ریل۔ موٹر سائیکل اور تانگوں کی دوڑ۔ کوٹ پتلون پوش اور کھدر دھاری پتلون کو دیکھ کر رام داس اور رامی کھل اٹھے۔ رامی دبی آواز میں اپنے پتی سے بولی ——— "بیکار ہی ہم لوگ گاؤں میں پڑے سڑ رہے تھے۔ جیون کا سکھ آنند تو یہاں بھرا پڑا ہے۔ یہاں سبھی خوش ہیں۔ دیکھتے نہیں ہر طرف باجے بج رہے ہیں۔"

رام داس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا ——— "سچ کہتی ہو رامی۔ لیکن . . . . . ."

رامی بات کاٹ کر بیچ ہی میں بول اٹھی ——— "لیکن ویکن نہیں۔ للو کے بابو یہاں تو لکشمی جی آسن جما کر بیٹھی ہوئی ہیں دیکھتے نہیں یہاں کے سبھی استری پرش بھگوان کے پر جیسے سفید کپڑے پہنے پھر رہے ہیں۔ یہاں کی عورتیں اندر لوک کی پریوں کی طرح تھرک رہی ہیں۔ صاف ستھرے بچے مندر کے دیوتاؤں کی طرح مسکرا رہے ہیں۔ میں تو کہوں گی یہیں سورگ ہے۔"

رام داس اپنی بیوی کے ہر ہر جملے پر "ہاں" کہتا ہوا خیالات کی رو میں بہہ رہا تھا۔ ان تینوں کی بھوک پیاس جیسے گم ہو گئی تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ کوئی ان کی بات نہ پوچھتا۔ اور کسی کو غرض بھی کیا تھی؟ جو ان کی بات پوچھتا۔ دن ڈھلتے ڈھلتے رامی نے پوچھا ——— "تو ایسے کب تک پھرتے رہیں گے آخر کہیں رہنے سہنے کا بھی بندوبست ہوگا یا نہیں؟"

"چلو ہٹو یہاں جگہ نہیں ہے۔" "ارے بیہودے ہٹا یہاں سے اپنے چیتھڑے۔"

"ارے بیوقوف سڑک کی پٹری پر کیوں بیٹھا ہے؟" اس قسم کے فقرے سنتے سنتے گیارہ بج گئے۔ رفتہ رفتہ ہر طرف سکوت کا تسلط ہونے لگا۔ دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ رام داس اور رامی جہاں جاتے دھتکارے جاتے۔ کچھ ہی گھنٹوں میں رامی کو معلوم ہوا کہ یہ جیسے سورگ سمجھی ہوئی تھی۔ وہ نرگ سے بھی بڑھ کر ہے۔ گاؤں میں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ لیکن لیٹ رہنے

جوانی کی عمر میں ..... بیکار

جب جوانی کو زیادہ دن استعمال کیا جائے تو جوانی پر زوال آنا لازمی ہے، آجاتا ہے۔ پھر مرد ...... بیکار ہو جاتا ہے۔ ایسا مایوس اور گیا گذرا آدمی اگر دوبارہ جوان بننا چاہے تو اس کا

علاج مفت

جب کسی مرد کی مردانہ طاقت کمزور ہو جائے۔ جب ...... شرمندگی ہونے لگے۔ اور مرد اپنی شرمندگی کیوجہ سے خودکشی کا خیال کرنے لگے۔ جب کوئی مرد اپنی خاص کمزوری کی کمی کو پھر پورا کرنا چاہے۔ جب کوئی مرد .... کے سامنے ذلیل ہو جاتا ہو تو اس کا ایک ہی علاج ہے جس کے بعد پھر کایاپلٹ ہو جائیگی، پھر نوجوانی اپنا کام کرنے لگے گی۔ پھر وہی مایوس مرد اپنے بدن میں بجلی کی سی تڑپ اور اُمنگ محسوس کرنے لگیگا۔ پھر اس کا جی چاہیگا کہ کوئی اس سے محبت کرے، اس کی طرف دیکھے اور ......

یہ علاج ہے ہندوستان کی سب سے بڑی دوا "معجون کاشمیری" کا استعمال جس نے ہر مقوی دوا کے مقابلہ پر اپنا سکہ جمالیا ہے۔ اور جس کی ایک ایک خوراک مریض کے جسم میں جوانی اور شباب کا صحیح اور اصل جوش پیدا کرتی ہے۔ ہر خوراک سے مریض خود محسوس کرنے لگتا ہے۔ کہ وہ کیا تھا اور اب جوانی کتنی تیزی سے اس کے جسم میں واپس آرہی ہے۔ دوا "معجون کاشمیری" کی تیاری میں ایک پہاڑی بوٹی شامل ہے اور یہ تمام کرشمہ اسی کی بدولت ہے۔ ناکارہ مرد اور وقت پر شرمندہ ہو جانیوالے انسان کے لئے یہ دوا سب سے بڑی دولت ہے۔ اور کئی سال سے ہندوستانی مارکیٹ میں اپنا سکہ جما رہی ہے۔ اگرچہ ایک شیشی کی قیمت چار روپے سات آنے ہے لیکن اس کو ملک کے گوشہ گوشہ تک پہونچا دینے کیلئے ایک مختصر عرصہ تک صرف ایک روپیہ قیمت لی جارہی ہے۔ اور یہ قیمت قطعی مفت برابر ہے۔

لہٰذا اعلان کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی مرد مایوس ہو چکا ہو۔ کثرت کار یا بچپن کی بے احتیاطی یا کسی مرض کے باعث جوانی کی خاص طاقت کمزور پڑ گئی ہو یا وقت پر شرمندگی ہوتی ہو یا عمر کی زیادتی کے سبب کمزوری محسوس ہوتی ہو تو ایسے ہی لوگوں کے لئے دوا "معجون کاشمیری" بہترین علاج ہے۔ اُسے چاہیئے کہ وہ

منیجر زنانہ دواخانہ اے بی ۳۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر ایک شیشی دوا "معجون کاشمیری" بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالے۔ محصول پارسل سات آنے لگیگا۔ اس طرح ایک روپیہ سات آنے میں "معجون کاشمیری" کی پوری شیشی اُسے دیدی جائیگی۔ ایک مریض کو اس رعائتی قیمت میں صرف ایک ہی شیشی دی جائیگی۔ زیادہ نہیں۔ ہاں! اس کی اجازت ہے کہ کئی مریض مل کر ایک ہی پارسل میں کئی شیشیاں منگالیں۔ کیونکہ اس طرح محصول بھی کم خرچ ہوگا۔

تار کا پتہ۔ "زنانہ دواخانہ" دہلی — ٹیلیفون نمبر ۶۲۹۸

کے لئے جگہ تو مل جاتی تھی۔ اطمینان کی سانس تو لی جا سکتی تھی۔ کوئی قدم قدم پر دھتکارنے والا تو نہ تھا۔ وہ رونے لگی۔ رام داس نے اسے سمجھایا۔ گھبراؤ نہیں کسی طرح رات کاٹو۔ سویرا ہوتے ہی کوئی نہ کوئی بندوبست کروں گا۔"

یہ بدنصیب پھر شہر چھوڑ کر آبادی سے دور ایک ندی کے کنارے پہنچے۔ اب پاؤں نے چلنے سے جواب دے دیا۔ قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا۔ رامی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ——— "سوامی انتڑیاں سوکھ رہی ہیں۔ صرف پانی سے اس ابھاگے پیٹ کی آگ کیسے بجھے۔ پرسوں دو دانے کھا کر پانی پیا گیا تھا۔ آج وہ بھی میسر نہیں آیا۔ للوا بھی نڈھال ہو رہا ہے۔ وہ بار بار چھاتی میں منہ لگاتا ہے۔ لیکن وہاں دودھ کہاں ہے؟ دیکھو نہ آج اس کے چوسنے سے خون نکل آیا ہے۔ شہر میں تو بس چہل پہل دیکھنے میں آتی ہے۔ اگر کہیں سے دو پیسے مل جاتے تو اسی پانی سے ستو ہی گھول کر اپنی اور اپنے لال کی جان بچا لیتی۔"

رام داس نے سنا۔ "دو پیسے ———!" جیسے وہاں کا سارا ماحول اس سے "دو پیسے" مانگ رہا ہو ——— ! اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ——— "اف آج میرے لئے دو پیسے بھی محال ہو گئے۔ پربھو تیری کیسی لیلا ہے؟ آہ آج دو پیسے ہاں صرف دو پیسے ہمارے لئے سورگ کی نعمت بنے ہوئے ہیں۔ میں مزدور بنا۔ غلام بنا سب کچھ کیا۔ لیکن آج دو پیسے بھی میرے پاس نہیں۔ بدن پر کپڑے ہوتے بھی تو نہیں جنہیں بیچکر چار پیسے لاتا۔ پھر بھی ہمت ہارنا مرد کا کام نہیں کل میں ضرور دو چار پیسوں کا بندوبست کروں گا۔"

اسی ادھیڑبن میں بھوکے بچے کو چھاتی سے لگائے رامی اور رام داس نے رات کاٹ دی۔ فاقہ کے ماروں کی آنکھوں میں نیند کہاں؟

پو پھٹتے پھٹتے رام داس کتنی ہی امیدیں اور آرزوئیں لئے شہر کی طرف چل پڑا۔ شہر میں پہنچتے ہی اس نے دیکھا۔ ایک جگہ دو تین کھدر دھاری نوجوان بھارت کی بدحالی پر تبادلۂ خیالات کر رہے ہیں سامنے کے میز پر کرسی کے سامنے چائے کی پیالیاں۔ بسکٹ۔ ڈبل روٹی اور مکھن رکھا ہوا ہے۔ ان کے منہ سے "بھارت کی بدحالی" کا فقرہ سنکر رام داس کی بہت کچھ ڈھارس بندھی۔ اس نے سوچا یہ لوگ بڑے دیالو ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ غریب دکھیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ یہ ہمارا دکھڑا سنکر ضرور دو پیسے دے دیں گے۔ وہ ان کے پاس جا کر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک نے جھنجھلاتے ہوئے پوچھا ——— "کیوں بے یہاں کیا کھڑا ہے؟"

رام داس نے ایک سانس میں اپنا سارا دکھڑا کہہ ڈالا۔

دوسرے مہاشے اس کی سرگذشت سنکر برس پڑے۔ اور تیسرے ساتھی سے بولے ——— "پرساد جی! بھلا یہ سوراج ملنے کے لچھن ہیں؟ دیکھا آپ نے ابھی پوری صبح بھی نہیں ہونے پائی۔ کہ یہ پاکھنڈی اپنے ساتھ کلی وقت کے فاقے کا ڈھونگ لے کر آ دھمکے۔"

پرساد جی نے بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا ——— "جی ہاں اگر یورپ میں ایسا ہوتا۔ تو یہ فاقہ کشی کرنے والے ایکٹر بے کرایہ کے مکان میں چکی پیسنے کے لئے بھجوا دیئے جاتے۔"

شرما جی نے رام داس کو دھتکارتے ہوئے کہا ——— "جا یہاں سے" پھر پرساد جی بولے "بھائی سچی بات تو یہ ہے۔ کہ بھارت دیش کے لوگ کاہل اور کام چور ہو گئے ہیں۔ کہ کام کے نام پر تو ان کی نانی مر جاتی ہے۔ دیکھو مفت کھانے کو تیار ہے۔ سچ کہتا ہوں۔ ہندوستانی کبھی آزاد نہ ہوں گے؟"

رام داس مسکین آواز میں بول اٹھا ——— "نہیں بابو ایشور کی قسم سے۔ میں کام چور اور مفت خور نہیں ہوں۔ لیکن ......"

"اپنے ہٹ بھی ہیں سے۔ میں لیکن ویکن نہیں جاننا چاہتے ایشور کے یہاں۔ یہاں تیرے باپ کا کیا رکھا ہے۔ جو سر کھا رہا ہے؟"

رام داس مایوس ہو کر چل پڑا۔ ایک جگہ بڑی بھیڑ لگی تھی کئی موٹریں اور سائیکلیں کھڑی تھیں۔ بہت سے لوگ "دین بھارت" کی کاپیاں لئے چلا رہے تھے۔ "دین بھارت چار چار پیسے میں"۔ رام داس نے سوچا شاید یہاں دو چار پیسے مل جائیں۔ لیکن وہ کس سے مانگے؟ بہت دیر تک کھڑا رہا۔ آہستہ آہستہ بھیڑ کم ہو گئی۔ بھیڑ کم ہوتے دیکھ کر رام داس نے ڈرتے ڈرتے ایک آدمی سے پوچھا ——— "بھائی کوٹھی کا مالک کون ہے؟"

"یہ کوٹھی نہیں اخبار کا دفتر ہے۔"

"تو آخر اس کا کوئی مالک ہو گا؟"

"ہاں دین بھارت کے ایڈیٹر اور مالک ابھی تھوڑی دیر میں نکلیں گے"

رام داس چپ ہو گیا۔ اور مالک کا انتظار کرنے لگا۔ بڑی دیر کے بعد کھدر کا کرتہ زیب تن کئے ایک مہاشے نکلے۔ اور اسی موٹر میں بیٹھنے لگے رام داس ان کے سامنے غربت و افلاس کی مورتی بنا کھڑا ہو گیا۔

مہاشے کرخت آواز میں بولے ——— "کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں بابو صرف دو پیسے ......"

"کیا یہاں بینک ہے؟ چلو ہٹو یہاں سے۔"

موٹر چل پڑی۔ رام داس مایوس نگاہوں سے کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

رام داس نے سامنے کی دوکان میں دیکھا۔ روپوں کی تھیلیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اس نے سوچا اتنے روپے لیکر یہ سب کیا کریں گے؟ کیا وہ دو پیسے مجھے نہ دینگے؟ آہ، مٹھی بھر دانے کیلئے میرا پھول سا بچہ اور غریب بیوی دم توڑ رہے ہیں۔ مگر یہ سب ترس کھا کر مجھے صرف دو پیسے دے دینگے۔ تو کیا تھیلے سے پیسے گھٹنے میں کوئی کمی آ جائیگی؟

رام داس بڑی ہمت کر کے سیٹھ جی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر آنسو بہاتے ہوئے سسکیوں کی آواز میں بولا ——— "دھرما اوتار، ہم تین ابھاگے ہیں۔ جن میں ایک ننھا بچہ بھی ہے سرکار کی نگری میں کئی دن سے فاقہ کر رہے ہیں بچہ بس کوئی دم کا مہمان ہے۔ راجہ جی مجھے بس چار پیسے مل جائیں تو آپ کا مہا صدقہ ہوگا چار پیسوں میں تین ابھاگوں کی جان بچ جائیگی۔"

سیٹھ جی چپ رہے۔ رام داس نے بڑی امیدیں لئے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "سرکار کی گدی سلامت رہے بس چار پیسوں کیلئے حکم ہو جائے۔"

اس بار سیٹھ جی گرج کر بولے ... "تو تین جان مرتا ہے تو ہمارے کو کیا؟ میں نو تیرو ٹھیکہ تھوڑے ہی رکھو ہے۔ چل بھاگ یہاں سے۔ یہاں روکڑ ملنے جانے رہیو ہے۔ ایسی مفتی کا باپال رکھیو ہے اور چلیو ہے بھیک مانگنے"

رام داس بولا ——— "دیالو میں بھکاری نہیں ہوں۔ وقت نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ پورے تین روز کام کی تلاش میں مارا مارا پھر کر چوتھے دن راجہ جی کی ڈیوڑھی پر آیا ہوں۔ چار پیسوں کے بدلے سرکار کا جو کام ہو میں کرنے کو تیار ہوں لیکن دھرما اوتار مجھے صرف چار پیسے دلا دئے جائیں۔"

سیٹھ جی حقے کی نگالی پکڑتے ہوئے بولے ——— "چل چل سمجھا دیا۔ بک بک نہ کر۔ تیرے جیسے چوروں کو ہم خوب پہچانت ہیں دن کو بھیک رات کو چوری"

رام داس گڑگڑا کر بولا ——— "سرکار اگر میں چور ہوتا تو دھرما اوتار کی ڈیوڑھی پر چار پیسوں کیلئے ہاتھ نہ پھیلاتا وقت کی بات ہے جو چاہے کہہ لیجئے"

سیٹھ جی نے بگڑ کر کہا ——— "نہ ملنے کا چور کہیں کا۔ ابھی ابھی تو پنجابی شیر سنگھ بھگا تا تو اس سالے کو۔"

شیر سنگھ نے رام داس کی گردن پکڑ کر گالی دیتے ہوئے اس طرح جھٹکا دیا کہ بیچارہ کا غریب سڑک پر جا گرا۔ پاس ہی پڑے ہوئے پتھر کی نوک سر میں چبھ گئی۔ اس کا سارا بدن لہو لہان ہو گیا۔ اتنے پر بھی کسی کو ترس نہ آیا بلکہ سب کے سب یہ تماشہ دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

رام داس خون پونچھتا ہوا اچھل پڑا۔ اسے زخم کی تکلیف کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ وہ صرف چار پیسوں کے لئے پاگل ہو رہا تھا۔

ایک جگہ سینکڑوں آدمیوں کا مجمع تھا۔ بینڈ بج رہا تھا۔ دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ جن پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا تھا۔ —

"آج رات کو!

دین بھارت کا ایک لال!!

آج کا تماشہ ضرور دیکھئے!!

دل تڑپ جائے گا ——— !!

آنکھوں سے خون کے آنسو نکل پڑیں گے؟"

ابھی سینما شروع نہیں ہوا تھا۔ ٹکٹ گھر کی کھڑکی بھی نہیں کھلی تھی پھر بھی تماشائیوں کا ہجوم سیلاب کی طرح امنڈ رہا تھا۔ تل رکھنے کو جگہ نہ تھی، خوش پوش نوجوان، مطمئن سن رسیدہ اور ہنستے ہوئے بچے موٹروں سائیکلوں اور تانگوں سے اتر اتر کر شربت، پان اور مٹھائی کی دکانوں پر ہمہ پہلے پڑ رہے تھے۔

کوڑی کوڑی کو ترستا رام داس یہ سب تماشہ حیرت سے دیکھتا رہا۔ لیکن کسی سے کچھ مانگنے کے لئے اسکی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بہت دیر کے بعد اس نے اپنی ساری جرأت مجتمع کر کے دو چار خوش پوشوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے صرف چار پیسوں کے لئے گڑگڑایا منت سماجت کی۔ لیکن کسی کے کان پر جوں بھی رینگی۔ کسی کا دل نہ پسیجا کسی نے اسے جھڑکا کسی نے چٹکی لی۔ اس کی باتوں پر کتنے قہقہے لگا کر ہنسے۔ کوئی گرہ کاٹنے کی صلاح دیتا۔ کوئی کچھ کہتا۔ لیکن کسی نے اسے دو پیسے نہ دئے۔

آہ رامی! ہائے میرے کلیجے کے ٹکڑے۔ تمہارے لئے میں چار پیسے بھی نہ پا سکا۔

چوک کے گھنٹے نے ٹن ٹن کر کے گیارہ بجایا۔ رام داس جیسے نیند سے چونک پڑا۔ وہ اٹھا اور چل پڑا چلتے چلتے ایک دکان کے سامنے رک گیا۔ دوکاندار روپوں، ریزگیوں اور پیسوں کی گڈی لگائے روکڑ کا میلان کر رہا تھا۔ رام داس سوچنے لگا۔ اگر یہ اس ڈھیر میں سے مجھے صرف چار پیسے دے دیتا۔۔۔۔۔ " لیکن اب اسے کسی کی مہربانی۔ ترس اور ہمدردی کا بھروسہ نہ رہا تھا۔ وہ للچائی ہوئی نگاہوں سے پیسوں کے ڈھیر کو دیکھ رہا تھا۔ یکایک رام داس دیوانوں کی طرح پیسوں کے ڈھیر پر بھوکے شاہین کی طرح ٹوٹ پڑا۔ اور ایک مٹھی پیسے اٹھا کر اپنی پوری قوت سے بھاگ نکلا دوکاندار چیخ اٹھا ——— "دوڑو! دوڑو! ڈاکو۔۔۔ بھاگا جا رہا ہے۔۔۔ لوٹ لیا۔۔۔ بدمعاش نے۔۔۔ جلدی کرو۔ پولیس۔۔۔ پولیس!! ہائے میں لٹ گیا۔۔۔۔۔"

رام داس پکڑ لیا گیا۔ اسکی مشکیں باندھ دی گئیں۔ دوکان لوٹنے کے جرم میں سپاہی اسے تھانے کی طرف لے چلے۔ ادھر اس ندی کے کنارے اسکی

معمّہ نمبر ۵۸

بیس ہزار روپیہ نقد انعام

ترکیب حل سامنے نو خانے مربع ہیں انہیں ہندسوں سے اس طرح پُر کریں کہ ہر طرف ہر قطار کا مجموعہ **۹۳** آئے دیئے ہوئے ہندسوں کی جگہ تبدیل نہ ہوگی۔ نفی، تقسیم اور ضرب استعمال نہ ہوگی

		۳۲
	۳۱	
۳۰		

انعام درست حل والے کو کم از کم ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائیگا۔ ۱۵ دسمبر تک جس کے سب سے زیادہ حل دفتر میں موصول ہونگے ایک ہزار روپے کا خاص انعام دیا جائے گا۔ تمام انعامات گارنٹی شدہ ہیں جس کے کم از کم پانچ حل وصول ہونگے ایک عمدہ فاؤنٹین پن انعام دیا جائے گا۔

شرائط و قواعد کسی سادہ کاغذ پر کسی تعداد میں حل مع فیس داخلہ بحساب ایک روپیہ فی حل دفتر میں روانہ فرمائیں جتنی تعداد میں حل روانہ کریں اتنی ہی تعداد میں روپیہ روانہ کریں اور پانچ پیسے کا ٹکٹ ہمراہ روانہ کریں تاکہ نتیجہ آپ کو براہ راست روانہ کیا جاسکے۔ منی آڈر کی رسید حلوں کے ہمراہ روانہ کریں جن حلوں کے ہمراہ رسید نہ ہوگی وہ حل مقابلہ میں شامل نہ ہوں گے تاریخ مقررہ کے گزرنے کے بعد جو حل دفتر میں موصول ہوں گے مقابلہ میں شامل نہ کئے جائیں گے۔ تمام حل اور منی آڈر ۳۱ دسمبر تک دفتر میں موصول ہونے چاہئیں۔ درست حل اور قابل انعام حل وہی متصور ہوگا جو ہمارے سربمہر حل سے ہندسہ بہ ہندسہ اور خانہ بہ خانہ ملتا ہوگا۔ اس معمہ کی واضح شرط ہے کہ منیجر معمہ کا فیصلہ قطعی اور قانونی طور پر قابل قبول ہوگا۔

یکم جنوری کو سربمہر حل شرفاکی موجودگی میں کھولا جائیگا۔ ۲ جنوری کو انعامات روانہ ہوں گے

حل اور منی آڈر پتہ ذیل پر روانہ کریں

منیجر انڈو امریکن ہائیڈ کمپنی ۱۲ اکرم روڈ بیٹ نمبر ۵۵ لاہور

نتیجہ معمّہ نمبر ۵۷

درست حل وسب سے زیادہ ۶۰ عدد حل جناب محمد لطیف صاحب کوارٹر $\frac{۳۵۰}{۸}$ ریلوے کالونی، کوئٹہ انعام -/۲۰۰۰ - درست حل وسب سے پہلے درست حل جناب مسٹر اے۔ آر۔ آیت چاہ میراں روڈ لاہور انعام -/۲۰۰۰

دیگر انعام پانے والے سردار سرورتن سنگھ صاحب نمبردار ضلع جالندھر۔ چوہدری بشیر احمد صاحب سانده کلاں۔ سردار روتن سنگھ صاحب ہیڈ کانسٹبل نئی دہلی۔ سردار دھرم سنگھ صاحب لاہور چھاؤنی۔ مسٹر ایچ سنگھ ہوگا۔ مسٹر ایم۔ این۔ بی کیو کھر جوہڑ والا۔ مستری رحمت اللہ صاحب امرتسر مسٹر رام دیو گپتا مظفر گڑھ۔ وغیرہ وغیرہ

ملگجے پھول

از جناب اختر بریلوی بی۔ اے

یہ ہیں کس کام کے ان میں نہ خوشبو ہے نہ رنگت ہے
کلی دل کی اب ان کو سونگھنے سے کھل نہیں سکتی
پروئے گا انھیں اب بالیوں میں کون خوش ہو کر
اب ان کا ہار بھی زنہار گوندھا جا نہیں سکتا
کسی کی بارگاہِ ناز میں پائے نہ جائیں گے
کسی گلپوش کے سینے سے لگ کر سو نہیں سکتے
بلائیں لے نہیں سکتے کسی شاداب چہرے کی
نہ اب یہ گلرخوں کے ساتھ تبخانوں میں جائیں گے
مزاروں پر انھیں اب کون دیوانہ چڑھائے گا
زمانے کی نظر میں ان کی وقعت ہو نہیں سکتی

مجھے ان ملگجے پھولوں سے آخر کیوں محبت ہے
کسی کی سیج پر ان کو جگہ اب مل نہیں سکتی
لگا کر ان کو جوڑے میں کریگا کون زیبِ سر
کوئی خوشبو سے ان کی اپنا جی بہلا نہیں سکتا
کسی تقریب میں یہ پھول برسائے نہ جائیں گے
صراحی کے گلے کا ہار بھی اب ہو نہیں سکتے
انھیں گوندھا نہیں جائیگا اب لڑیوں میں سہرے کی
نہ ان سے پیر اپنی خانقاہوں کو سجائیں گے
تبرک کر کے ان کی پتیوں کو کون کھائے گا
بجز میرے کسی کو ان کی چاہت ہو نہیں سکتی

انھیں وہ مرتبہ حاصل ہے میری زندگانی میں
کہ ان کا تذکرہ آئے گا الفت کی کہانی میں

شکوہ

از جناب کاملؔ صدیقی سہسوانی

کسی صورت وہ یہ زحمت گوارا کر نہیں سکتے
دلِ بیمار کا میرے مداوا کر نہیں سکتے
زمانے کی نگاہوں سے تو چھپنا ان کا ممکن ہے
نگاہِ شوق سے لیکن وہ پردا کر نہیں سکتے
تصوّر بیقراری کا کسی کی روک دیتا ہے
قیامت ہے شبِ فرقت بھی نالہ کر نہیں سکتے
کئے جائینگے تیرے جور پر ہم شکر کے سجدے
تری بیداد کا شکوہ گوارا کر نہیں سکتے

رفتار زمانہ

عالمگیر واقعات پر ماہانہ تبصرہ

از شبلی بی کام

کیسپین سے نیل تک

روس و جرمنی ابھی تک آگ اور خون کی ہولی کھیلنے میں مصروف ہیں اور بحیرۂ منجمد شمالی کی سرد ہوائیں بھی ان کی جنگی سرگرمیوں میں کمی واقع نہیں کرسکیں۔ تاہم جرمنی زیادہ دیر تک عوامل قدرت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل نازیوں کے پیش نظر تین باتیں ہیں، اول موسم سرما کے لئے پناہ گاہوں کی تلاش۔ دوم ماسکو اور لینن گراڈ کا سقوط۔ سوم قفقاز کے روغنی وسائل پر قبضہ۔ موسم سرما کی صعوبتوں سے نازی فوجوں کو صرف اس صورت میں پناہ مل سکتی ہے کہ وہ ماسکو اور لینن گراڈ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرسکیں لیکن محاذ جنگ کی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شجاعت پیشہ روسی ان شہروں کی حفاظت و مدافعت کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا چکے ہیں اور نازی فوجیں اپنے انتہائی جوش و خروش اور تہلکہ انگیز بمباری کے باوجود ماسکو اور لینن گراڈ کے بیرونی استحکامات کو پھاندنے میں کامیاب نہیں ہوسکیں۔ اس لئے امید کی جاتی ہے کہ ابھی اس محاذ پر اشتراکی اقتدار کو ختم کرنا آسان نہیں ہے البتہ جنوب مشرق روس پر نازیوں کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ ہٹلر کی فوجیں بحیرۂ اسود کی بعض اہم بندرگاہوں پر قابض ہونے میں کامیاب ہوچکی ہیں، اور اب دریائے ڈون اور دریائے وولگا کے درمیانی علاقہ پر پر تول چکی ہیں ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ روستاف اور کریچ کے ذریعہ سے قفقاز میں پیش قدمی کی جائے اور باکو کے روغنی چشموں پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد شرق وسطیٰ اور مشرقی ایشیا کو اپنے استعمار کا نشانہ بنایا جائے لیکن یہاں نازیوں کے رستہ میں متعدد موانعات اور مشکلات کا ہجوم ہے اول اگر وہ خشکی کے ذریعے قفقاز کی طرف بڑھیں تو برطانیہ کے ہوائی جہاز ان کے ایک بازو کو سخت ضعف پہنچا سکتے ہیں۔ دوم اگر وہ بحری رستہ اختیار کریں تو بحیرۂ اسود کا روسی بیڑہ ان کا آگا روک سکتا ہے۔ سوم اگر وہ اپنی فوجی طاقت جنوبی روس کی جانب منتقل کرلیں تو شمال مشرق سے یورال کی پہاڑیوں میں جمع ہونے والی روسی فوجیں ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ سکتی ہیں چہارم اگر وہ یورال سے بحیرۂ بیرنگ تک کے علاقہ کی طرف متوجہ ہوں اور اپنی امداد کے لئے جاپان کو بھی جنگ پر آمادہ کرلیں تو ایک طرف انہیں شرق وسطیٰ کی اتحادی فوجوں کے عقبی حملے کا اندیشہ رہیگا دوسری طرف تیل کی کمی ان کے ٹینکوں اور مسلح لاریوں کو آگے بڑھنے سے روک دیگی۔ اس لئے یہ امر قرین قیاس نہیں کہ ہٹلر اپنی توجہ شمال مشرقی روس کی جانب مبذول کرنے کی جرأت کرے گا۔ البتہ یہ یقینی ہے کہ ہٹلر قفقاز کے روغنی وسائل کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے اس لئے موسم سرما اور موسم بہار میں عجب نہیں کہ وہ ڈون اور وولگا کو عبور کرتا ہوا کوہ قاف کی وادیوں میں آپہنچے۔ اس کے بعد ہندوستان، ایران اور افغانستان کو جو خطرات لاحق ہوسکتے ہیں وہ محتاج تصریح نہیں تاہم اتحادی بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں ہیں۔ وہ شرق وسطیٰ میں اپنی پوزیشن کافی مضبوط بنا چکے ہیں اور ہر خطرے کا ہمت و شجاعت کے ساتھ مقابلہ کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسٹر چرچل کا یہ قیاس درست نظر آتا ہے کہ آئندہ موسم بہار تک بحیرۂ کیسپین سے دریائے نیل تک ایک ایسی خوں فشاں جنگ ہوگی جس پر دنیا کے آئندہ امن و امان کا بہت حد تک دارومدار ہے۔

شمالی افریقہ

جن دنوں جرمنی یورپ کے مجبور و بیکس ممالک کو پامال کرتا ہوا پیرس کے دروازوں تک آپہنچا تھا اطالیہ بھی میدان جنگ میں کود پڑا، اور سلطنت روما کے دیرینہ خواب کی تعبیر شمالی افریقہ کے ریگزاروں میں ڈھونڈنے لگا لیکن ابھی وہ برطانوی سومالی لینڈ کو پامال کرتا ہوا لیبیا کے راستے مصر پر حملہ آور ہونے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ اسے جرمنی کی خاطر یونان سے الجھنا پڑا۔ یہ لڑائی اسے غیر متوقع طور پر مہنگی پڑی کیونکہ ایک طرف اس کے یورپی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا اور دوسری طرف برطانوی فوجوں نے اٹلی کے افریقی مقبوضات کا محاصرہ کرکے حبش اور سومالی لینڈ سے بھی فاشزم کا جنازہ نکال دیا تاہم لیبیا میں ابھی تک اطالویوں کی کمین گاہیں اور جرمنوں کی ایک چوکی موجود تھی۔ روس و جرمنی کی مصروفیات سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ نے اس ماہ لیبیا پر فوج کشی کی اور چند ہی دنوں میں ساحل سے پچاس میل اندر کی طرف بڑھنے میں کامیاب ہوگیا برطانیہ کا یہ اقدام دوراندیشی سے خالی نہیں کیونکہ اول تو لیبیا کے ذریعہ سے

اطالیہ کو اپنی بکھری ہوئی فوجوں کی شیرازہ بندی کا موقع مل رہا تھا۔ برطانیہ نے یہ حملہ کرکے ان کی سرگرمیوں کا قلع قمع کردیا ہے۔ دوسرے نازیوں کا یہ ہمیشہ سے منشا رہا ہے کہ لیبیا کو ڈاکر سے ملحق کرکے بحیرہ اوقیانوس کو بھی برطانیہ و امریکہ کے لئے مخدوش بنایا جائے چنانچہ اس غرض کے لئے آج کل وہ لیبیا سے ڈاکر تک ایک ریلوے لائن کی تعمیر میں مصروف تھے برطانیہ کی بروقت کارروائی سے ان کا خواب پریشان ہوکر رہ جائیگا۔ تیسرے اندیشہ تھا کہ روسی محاذ سے فراغت پاکر اگر جرمنی نے شرق وسطیٰ کی جانب بڑھنا چاہا تو وہ لازمی طور پر بحیرہ روم کے مشرقی اور مغربی دروازوں (سویز اور جبل الطارق) کو بند کرنے کی سعی کرے گا۔ جبل الطارق پر نازی اقتدار صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ ایک طرف وہ سپین سے ساز باز کرے اور دوسری طرف فرانسی مراکش اور لیبیا میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرے، لیکن برطانیہ نے لیبیا کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کرکے اس احتمال کا بھی خاتمہ کردیا ہے۔ الغرض شمالی افریقہ میں برطانی کارروائی آئندہ خطرات کا سدباب کرنے کے لئے اشد ضروری تھی یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کے موجودہ اقدام کو بے موقع و بے وقت قرار نہیں دیا سکتا۔

اسلامی ممالک

زیر تبصرہ مہینے میں اسلامی ممالک کا مستقبل خطرہ و تشویش سے باہر نہ رہا چنانچہ ایران پر فوجی اقتدار قائم کرنے کے بعد برطانیہ کی توجہ افغانستان کی جانب مبذول ہوئی لیکن محمد ظاہر شاہ کی حکومت نے سیاست و تدبر سے کام لیا اس لئے ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا برطانیہ کو شکایت تھی کہ افغانستان میں چند جرمن موجود ہیں جو کسی وقت ففتھ کالم کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتے ہیں اس لئے انھیں فی الفور ملک بدر کردیا جائے چنانچہ حکومت نے ان تمام نازیوں کو جو افغانستان کے مختلف اداروں میں کام کر رہے تھے جواب دیدیا اور برطانیہ نے ان کو صحت وسلامتی کے ساتھ وطن تک پہنچانے کا ذمہ لیا اس اقدام سے افغانستان نے عملی طور پر ثابت کردیا کہ وہ غیر جانبداری کے اصول پر نہایت سختی سے قائم ہے اور بلاوجہ برطانیہ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا البتہ وزیر خارجہ افغانستان کے ایک نشریہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی طاقت نے اس ملک کی طرف نظر بد سے دیکھا تو یہ افغانوں سے برداشت نہ ہوسکے گا اور وہ پوری قوت کے ساتھ حملہ آوروں کے مقابلہ میں صف آرا ہو جائینگے۔

ترکی ابھی تک غیر جانبداری کے اصول پر قائم ہے۔ وہ برطانیہ کا بھی خیر خواہ ہے اور جرمنی کا بھی دوست نظر آتا ہے دراصل ترکی چاہتا ہے کہ وہ حتی الوسع میدان جنگ میں کودنے سے گریز کرے اور متحاربین کے درمیان حد فاصل بن کر رہے لیکن اس کی ہردلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ ہر فریق اسے اپنا مخلص ترین دوست سمجھتا ہے۔ بایں ہمہ اس مہینے ترکی کے متعلق بعض عجیب و غریب اطلاعات پڑھنے میں آئیں۔ اگرچہ گزشتہ تجربات کے پیش نظر ان پر بہت زیادہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا تاہم اُن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی کا مستقبل خطرہ و تشویش سے خالی نہیں ہے مثلاً پہلے تو بتایا گیا کہ جرمنی و ترکی کے درمیان ایک معاہدہ ہوچکا ہے لیکن اس عہدو پیمان کی تفاصیل کا علم ابتک نہیں ہوسکا پھر خبر آئی کہ ترکوں کا ایک وفد جرمن مورچوں کا معاینہ کرنے جارہا ہے۔ اس کے بعد چند دن ہوئے یہ اطلاع شایع ہوئی تھی کہ ڈاکٹر رفیق سیدام (وزیراعظم ترکیہ) برلین پہنچ چکے ہیں اور غازی عصمت پاشا بھی ہٹلر سے ملاقات کرنے جارہے ہیں۔ معلوم نہیں ان خبروں میں کس حد تک صداقت ہے تاہم یہ ظاہر ہے کہ یا تو ترکی خود ہی جنگ کی طرف آرہا ہے یا اُسے مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ جنگ میں عملی حصہ لے۔ ان میں سے خواہ کوئی بات درست ہو حقیقت یہی ہے کہ اگر ترکی پر حملہ ہوا یا اس نے فریقین میں سے کسی کے ساتھ مل کر جارحانہ اقدام کیا تو شرق وسطیٰ میں جنگ ایک ایسے مرحلے پر آجائیگی جو بہت حد تک فیصلہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔

جاپان کے ارادے

جاپان ایک طرف اگر نازی خداؤں کے اشارے پر بحرالکاہل کے امریکی و برطانی مفاد کو دھمکی دے رہا ہے تو دوسری طرف حکومت فرانس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر فرانسی ہندچینی اور تھائی لینڈ پر ہاتھ صاف کرنے کے منصوبے باندھ رہا ہے چنانچہ جب سے مسٹر توجو برسر اقتدار آئے ہیں جاپان کا رویّہ جنگ جویانہ نظر آتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ اقتصادی ابتری کے پیش نظر جاپان ایک ایسا قدم اٹھائے گا جو اُس کی قومی و تجارتی زندگی کے لئے مہلک ثابت ہو۔ دراصل بات یہ ہے کہ برطانیہ و امریکہ کے تجارتی مقاطعہ نے جاپان کی صنعتی زندگی پر نزع کا عالم طاری کردیا ہے اور ہزاروں مزدور بیکاری اور بھوک کے مصایب میں گرفتار ہیں جن سے چھٹکارے کی صرف یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ جاپان کسی یورپی طاقت سے الجھ پڑے چنانچہ کبھی تو فرانسی ہندچینی کے گرد جنگی رقص دکھایا جاتا ہے، کبھی تھائی لینڈ کو دھمکی دی جاتی ہے۔ کبھی آسٹریلیا کو آنکھیں دکھائی جاتی ہیں اور کبھی فلپائن سے ولاڈی ووسٹک تک پراسرار نقل و حرکت کی جاتی ہے لیکن جہاں تک امریکہ و برطانیہ کا

حق ہے جاپان اُن سے اُلجھنے کی جُرات نہیں کر سکتا البتہ وہ اتحادیوں کی توجہ تقسیم کرنے کے لئے فرانسیسی ہند چینی کے رستے تھائی لینڈ کے امن و امان کو معرضِ خطر میں ضرور ڈالے گا۔ گزشتہ دنوں امریکہ نے مطالبہ کیا تھا کہ اگر جاپان اپنے چینی مقبوضات سے دستکش ہو جائے تو وہ اس کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھا سکتا ہے لیکن جاپان اس پر آمادہ نہ ہوا تاہم طرفین کی گفت و شنید جاری ہے بہرحال مشرقِ بعید میں جاپان کی نیت نیک نظر نہیں آتی اور ہمیں اس ساعت کا انتظار دیکھنا چاہئے جب ہندوستان کی مشرقی حد کے نزدیک اضطراب و تشویش کی گھٹائیں منڈلانے لگیں گی۔

سیاسیات ہند

نومبر کے شروع میں بتایا گیا تھا کہ مسلم لیگ پارٹی نے مرکزی اسمبلی سے مقاطعہ کا اعلان کر دیا ہے۔ اسمبلی کے بعد کونسل آف اسٹیٹ سے بھی واک آؤٹ کیا گیا اس اقدام کے اسباب پر گزشتہ اشاعت میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ کونسل آف اسٹیٹ میں سید حسین امام (لیڈر کونسل) نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مرکزی انتظامیہ کی توسیع کے باعث پرانے نظام میں کوئی خوشگوار اور قابلِ توجہ تبدیلی نہیں ہوئی کیونکہ وہی محکمے ہندوستانی ممبروں کے سپرد کئے گئے ہیں جو پہلے ہی ان کے ماتحت تھے اصل چیز مالیات اور دفاع ہے لیکن یہ دونوں محکمے یورپین ہاتھوں میں ہیں پس انتظامیہ کی توسیع کے باعث چونکہ ہندوستانی اختیارات میں اضافہ نہیں ہوا اس لئے مسلم لیگ پارٹی مقاطعہ پر مجبور تھی اس کے علاوہ اگر موجودہ جنگ جمہوریت و آزادی کے تحفظ کی خاطر کی جا رہی ہے تو ہندوستان کو اس نعمت سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے اور یہ اعلان کیوں نہیں کیا جاتا کہ جنگ کے بعد مسلمانوں کو پاکستان اور ہندوؤں کو ہندوستان دے دیا جائیگا۔ لیکن افسوس کہ قائد اعظم محمد علی جناح اور سید حسین امام کی آواز کامنز ہاؤس سے ٹکرانے کے باوجود برطانوی مدبرین پر خاطر خواہ اثر نہ ڈال سکی اور مسٹر ایمری نے حسبِ سابق اعلان کر دیا کہ جب تک ہندوستانیوں کی طرف سے کوئی متفقہ مطالبہ پیش نہ کیا جائے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ ملک کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کا یہ متفقہ فیصلہ بار بار فضا میں گونج رہا ہے کہ ہندوستان کو آزادی و حریت کی دولت سے مالا مال کیا جائے اور اسمبلی و کونسل سے کانگرس اور مسلم لیگ کی دست کشی نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستانی وزیر ہند کے رویئے سے مطمئن نہیں ہیں۔

مرکزی اسمبلی میں ایک اہم قرارداد یہ منظور کی گئی کہ ہندوستان کو بھی منشور اطلانتک کے حیطۂ عمل میں شامل کیا جائے لیکن مسٹر ایمری نے اس کے جواب میں وہی پرانا جواب دہرا دیا کہ یہ معاہدہ نازی مقبوضات کے لئے ہے نہ کہ ہندوستان کے لئے۔

کانگرس کا طرزِ عمل بہت عجیب و غریب صورت اختیار کر چکا ہے ایک طرف مسٹر گاندھی "ستیہ گرہ" اور "عدم تشدد" کے دائرہ سے باہر نکلنے پر آمادہ نظر نہیں آتے دوسری طرف مسٹر منشی جیسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو ہندوستان میں کھلے بندوں تشدد اور خلاف پاکستان کی تحریک کو ہوا دے رہے ہیں۔ تیسری طرف مسٹر ستیہ مورتی جیسے "وزارت پسند" میدانِ عمل میں آ چکے ہیں جو کانگرس کو دوبارہ عہدے قبول کر لینے کی تلقین کر رہے ہیں اس سلسلہ میں کانگرس کا طرزِ عمل بہت پیچیدہ ہے کیونکہ ایک طرف اس نے وزارتوں اور اسمبلیوں کا بائیکاٹ کر رکھا ہے دوسری طرف آسام کے کانگرسیوں کو "بعض خاص حالات" کی بنا پر مجلس آئین ساز کی کارروائیوں میں حصہ لینے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اس کے مقابلہ میں لالہ کیدار ناتھ کو پنجاب کے انتخاب میں شریک ہونے سے روک دیا گیا ہے۔ الغرض اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کانگرس کس طرف جانا چاہتی ہے؟

کونسل آف سٹیٹ میں حکومت کی طرف سے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا گیا کہ مسٹر سوبھاش چندر بوس جو کچھ عرصے سے غایب تھے برلین یا روم پہنچ چکے ہیں۔ وہ حکومت کی عقابی نگاہوں سے نظر بچا کر باہر جانے میں کس طرح کامیاب ہوئے؟ یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا البتہ قیاسات کے گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک عورت کا بھیس بدل کر سرحد کے رستے جرمنی جا پہنچے۔ بعض کا بیان ہے کہ وہ ایک جاپانی طیارے پر سوار ہو کر جاپان گئے وہاں سے جرمنی کی راہ لی۔ ایک اور افواہ یہ ہے کہ نازیوں کا ایک طیارہ ہندوستان آیا اور مسٹر بوس کو اس میں بٹھا کر لے اُڑا۔ بہرحال مسٹر سوبھاش چندر بوس جیسے جمہوریت پسند لیڈر کا آمرانہ ممالک میں چلے جانا ان [illegible] کی تبدیلی پر دلالت کرتا ہے اور حکومت کو غور کرنا چاہیئے کہ آخر یہ انقلاب کیوں واقع ہوا؟

پنجاب کے ایک نیم فرنگی اخبار میں یہ افواہ شایع ہوئی تھی کہ پنجاب اسمبلی کے بعض ارکان یونینسٹ پارٹی میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن جب تک اسمبلی میں مسلمانوں اور دیہاتیوں کی اکثریت ہے اس قسم کے افتراق کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

لاہور ——— ۲۷ نومبر ۱۹۴۲ء

تاثرات

لُٹا دی اک نظر میں سب متاعِ زندگی اپنی

از جناب محمود یار خاں اثر ایم۔ اے

اشاروں پر کسی کے چل رہی ہے زندگی اپنی
نہ اپنے بس میں غم اپنا نہ قابو میں خوشی اپنی

نہ ہم ساخانماں برباد ہوگا کوئی اُلفت میں
لُٹا دی اک نظر میں سب متاعِ زندگی اپنی

خیالِ چارہ جوئی تک نہیں احساس میں باقی
وفورِ درد نے اتنی بڑھا دی بے حسی اپنی

نہ ٹوٹا سلسلہ اپنی تمناؤں کا دُنیا میں
بنی ہر آرزوئے نو مُرادِ آخری اپنی

دلِ زاہد میں بھی پیدا ہوا جذبہ پرستش کا
دکھائی اُن بتوں نے وہ ادائے کافری اپنی

تھپیڑے کھا رہی ہے روز و شب طوفانِ ہستی میں
نہ جانے کس جگہ ڈوبے یہ کشتی عمر کی اپنی

چمک اُٹھا ضیائے عشق سے یوں دل کا آئینہ
ہر اک نے اس میں خاطر خواہ صورت دیکھ لی اپنی

اثرؔ جب شعلۂ احساس اپنا سرد ہو جائے
جمودِ زندگی کیوں بن نہ جائے بے حسی اپنی؟

منروا کا تاریخی شاہکار

سکندر

مسٹر سہراب مودی کا قابلِ فخر کارنامہ

منروا کا تاریخی شاہکار "سکندر" ہندوستان کے طول و عرض میں مقبول ہو چکا ہے۔ یہ فلم تاریخ ہند کے اس زرّیں دور کی جھلک پیش کرتی ہے جب پنجاب میں راجہ پورس کی حکومت تھی اور سکندر یونانی ایران کی وسیع شہنشاہی کا جھنڈا گاڑ کر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سکندر کا فاتحانہ سیلاب پنجاب و سرحد کی متاعِ آزادی کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائیگا۔ لیکن راجہ پورس ایک آہنیں دیوار کی طرح اس کے رستے میں حائل ہو گیا۔ اور فاتح اعظم کو ہندوستان سے مایوس و ناکام ہو کر اپنے وطن واپس جانا پڑا۔ یہ فلم نہ صرف ڈائریکٹر سہراب مودی کی صناعانہ قابلیت کا بہترین نمونہ ہے بلکہ موجودہ جنگ کے زمانہ میں سبق آموز بھی ہے کیونکہ سکندر میں آمرانہ پیش قدمی اور آزادانہ بادشاہی کا خوب مقابلہ دکھایا گیا ہے۔ "سکندر" کی کہانی پنڈت سدرشن کے مشاق قلم کی رہین منت ہے۔ روسی بینکر کے سینگر فلم کے حسن و جمال میں چار چاند لگا رہے ہیں



سکندر کا پارٹ پرتھوی راج نے ادا کیا ہے اور ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ پرتھوی راج کے سوا کوئی دوسرا شخص اس رول کو اتنی کامیابی اور ہنرمندی کے ساتھ ادا نہ کر سکتا تھا۔ مسٹر سہراب مودی "پورس" کے بھیس میں جلوہ گر ہیں۔ اسی خاص نمبر کے سرورق پر آپ کی سہ رنگی تصویر شایع ہو رہی ہے۔ قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ ایک ایک لحظ پورس نظر آتے ہیں۔ پرتھوی راج اور مسٹر سہراب مودی کے علاوہ۔ ونمالا۔ مینا۔ صادق علی۔ شیلا۔ ظہور راجہ۔ لالہ یعقوب۔ کے۔ این۔ سنگھ وغیرہ نے بھی اپنی اداکاری کے شاندار جوہر نمایاں کئے ہیں۔ یہ فلم۔ لاہور میں بیک وقت دو نمائش گاہوں میں دکھائی گئی لیکن رش کا یہ عالم رہا کہ پولیس کی امداد لینا پڑی۔ سکندر کی کامیاب پبلسٹی کا سہرا مسٹر گرد رسے اور مسٹر باقر کے سر ہے۔



"سکندر" دیکھ کر قدرتی طور پر اس کے ہدایت کار سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے یہاں مختصر طور پر مسٹر سہراب مودی کے حالات زندگی پیش کئے جاتے ہیں

مسٹر سہراب مودی کا پورا نام سہراب میروان جی سہراب مودی ہے۔ آپ بمبئی کے ایک پارسی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بمبئی میں حاصل کی۔ آپ کی عملی زندگی کا آغاز سترہ برس کی عمر میں دنیائے فلم سازی میں قدم رکھنے سے قبل آپ نے گیارہ برس تک اپنی سیودھ تھیٹریکل کمپنی کا کاروبار نہایت کامیابی کے ساتھ چلایا۔ شکسپیر کو سب سے پہلے ہندوستانی پردۂ سیمیں پر پیش کرنے کا فخر آپ ہی کو حاصل ہے۔ چنانچہ ہیملیٹ (خون کا خون) کا کھیل آپ ہی کی ساعی جمیلہ کے طفیل

[illegible]

منروا مودی ٹون کی داغ بیل مسٹر سہراب مودی نے ۱۹۳۶ء میں ڈالی۔ اگرچہ اس کمپنی کے قیام پر زیادہ عرصہ نہیں گذرا تاہم مخصوصات کی انجام دہی کے اعتبار سے یہ ہندوستانی صنعت فلم سازی میں امتیازی درجہ رکھتی ہے اور طلائی تمسکات کی طرح ہر لحاظ سے محفوظ اور نفع بخش ہے۔ منروا مودی ٹون کے مقاصد بہت بلند اور پاکیزہ ہیں۔ عالمگیر اخوت اور ثقافتی ارتقا اس کی اولین منازل ہیں۔ جلب منفعت ثانوی درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ مسٹر سہراب مودی ہمیشہ ایسی فلمیں تیار کرتے ہیں جو تفریح و تفنن کا موجب ہونے کے علاوہ فکر انگیز اور دماغ افروز بھی ہوں۔

مسٹر سہراب مودی صرف سکندر کی تخلیق پر قانع نہیں ہیں بلکہ آپ نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سال تین نئے فلم اپنی نگرانی میں تیار کرائیں گے۔ یعنی (۱) کرشن سداما۔ جو مہابھارت کا ایک دھارمک شاہکار ہے۔ (۲) فردوسی۔ جس میں ایران کے غیر فانی شاعر کے سوانح حیات پیش کئے جائیں گے۔ (۳) بھگوان بدھ جس کا روحانی پیغام جنگ آزما دنیا کو امن و روحانیت کا پیغام دے گا۔

سکندر کا افسانہ

جب سکندر ایران فتح کرنے کے بعد ایک ایرانی دوشیزہ سے مفتوح ہو کر رہ گیا۔ وہ اور اس کے بلند آہنگ ارادے شراب کی اس ندی میں بہہ گئے جو حسانہ کی مخمور آنکھوں سے بہتی تھی لیکن استاد ارسطو کی دانش نے سکندر کو ان بھول بھلیوں سے نکالا جسے عرف عام میں محبت یا عشق کہتے ہیں اور اسے پھر اس راستے پر کھڑا کر دیا جس پر چل کر وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتا تھا۔ اب اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ وہ جہاں گیا فتح نے اس کے پاؤں چومے اس طرح وہ ملک پر ملک فتح کرتا ہوا آخر جہلم کے کنارے پہنچا جہاں پنجاب کے جری و جانباز حکمراں مہاراجہ پورس نے اس کا راستہ روک لیا سکندر ہزار کوشش کرنے پر بھی دریائے جہلم پار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا سکندر اپنی ناکامی پر اکثر جھنجھلاتا اور بگڑتا آخر جب اس نے دیکھا کہ وہ کبھی اپنی بہادری سے پورس کو شکست نہیں دے سکتا تو اسے ایک چال سوجھی ایک رات جب طوفان زوروں پر تھا اور جہلم میں طغیانی آئی ہوئی تھی وہ اپنی نصف فوج کو بیس میل دور لے گیا۔ جہاں اس نے رات کی تاریکی میں دریا پار کیا اور پورس کی افواج پر اس وقت حملہ کر دیا جب وہ آنے والے خطرہ سے بالکل بے خبر تھے۔ ایک بھیانک جنگ ہوئی جس کا اختتام سکندر اور پورس کی اس تاریخی ملاقات سے ہوا جسے دنیا کے تاریخ دانوں نے سنہری حروف میں لکھا ہے۔ اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکندر کی فوجوں نے بغاوت کر دی "سکندر" کا تسخیر عالم کا خواب وہیں بکھر کر رہ گیا۔ وہ جن آرزوؤں کو لے کر ہندوستان آیا تھا وہ برباد ہو گئیں۔ دوسرے دن ہندوستان کی فتح کا خیال ترک کر کے واپس چلا گیا۔



فنون جمیلہ

فلمی اطلاعات

— م بین

اُجالا

ڈائریکٹر کے ایم - ملتانی "اُجالا" کی عکاسی میں مصروف ہیں۔ یہ فلم تاج محل پکچرز کے نگارخانے میں زیر تکمیل ہے۔ نسیم اور پرتھوی راج نے اس تصویر میں اپنی اداکاری کے جوہر خوب نمایاں کئے ہیں۔ مبارک جو ہندوستانی پردۂ سیمیں کا مشہور ولین ہے اُجالا میں اپنا پارٹ ادا کر رہا ہے۔ اسی طرح میز راشرف نے مزاحی رول اپنے ذمہ لیا ہے۔ ان سب کے علاوہ "یہودی کی لڑکی" والی رتنا بائی بھی اُجالا میں حصہ لے رہی ہے۔ اس فلم کا افسانہ اور مکالمہ مسٹر ایم۔ اے مغنی اور مسٹر کمال امروہی کے قلم کا رہین منت ہے امید کی جاتی ہے کہ یہ فلم ہر لحاظ سے کامیاب ثابت ہو گی۔

سکھو بائی

پربھات فلم کمپنی کی تازہ فلم "سکھو بائی" دہلی میں رشش لے رہی ہے۔ اور عنقریب لاہور میں ریلیز ہو جائیگی۔ یہ فلم مہاراشٹر کی ایک دیندار عورت کے سوانح پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ ہی سکھو بائی میں مہاراشٹر کی تہذیب و تمدن کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اداکاروں میں سے ہنسا۔ گوری۔ کلکرنی۔ اور سومترا کا پارٹ خاص طور پر جاذب توجہ ہے۔ یہ فلم تین ڈائرکٹروں کی زیر نگرانی تیار ہوا ہے۔ یعنی ڈاملے۔ فتح لال اور راجا مینی۔ مسٹر لالہ مینجر فیمس پکچرز لمیٹڈ دہلی اس فلم کی شاندار پبلسٹی میں مصروف ہیں۔

معصوم

قیدی کے ڈائریکٹر مسٹر حسنین ایک اور شاہکار کی تکمیل میں مصروف ہیں جس کا عنوان "معصوم" ہے۔ یہ ایک مسلم سوشل پکچر ہے جس میں رمولا۔ مہتاب۔ مظہر خاں اور اُنیس نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں "معصوم" قربانی اور ایثار کا ایک ہیجان خیز ڈرامہ ہے اور غالباً اسی ماہ دسمبر میں پربھات میں ریلیز ہو جائیگی۔ فضلی برادرز کا نام ہی اس فلم کی کامیابی کا ضامن ہے "معصوم" کے ... [illegible]

پردہ نشین

ہندوستان فلم کارپوریشن کا پہلا معاشرتی شاہکار "پردہ نشین" مسٹر حافظ جی کی نگرانی میں تیار ہو رہا ہے امید کی جاتی ہے کہ دسمبر کے پہلے ہفتہ تک اس کی شوٹنگ مکمل ہو جائے گی اور عید قربان کے موقع پر ناظرین اسے دیکھ سکیں گے۔ اس فلم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں سٹار پرستی کا مطلق خیال نہیں کیا گیا۔ بلکہ صرف ایسے اداکار منتخب کئے گئے ہیں جو پردہ نشین کی افسانوی ضروریات کے عین مطابق تھے۔

سرکس کوئین

پیراماؤنٹ فلم کمپنی کی "سرکس کوئین" لاہور میں مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ یہ فلم سرکس کی دنیا سے متعلق ہے اور اس کے اکثر مناظر ہیجان خیز اور سنسنی پیدا کرنے والے ہیں۔ مس موتی اور جال مرچنٹ کی بے خوف اداکاری خاص طور پر موثر ہے۔

ایک رات

شالامار پکچرز کی اولین پیشکش "ایک رات" ساؤنڈ سٹوڈیوز میں تیار ہو رہی ہے پروڈیوسر ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد آج کل اس کے اندرونی مناظر کی شوٹنگ میں مصروف ہیں اس فلم میں ایک نیا چہرہ پیش کیا گیا ہے جس کا نام نینا ہے علاوہ ازیں پرتھوی راج۔ گلاب۔ کے این سنگھ اور یوسف سلیمان وغیرہ اس فلم میں ممتاز حصہ لے رہے ہیں۔

ڈاکٹر

نیو تھیٹرز کا تازہ ترین فلم "ڈاکٹر" لاہور میں نمائش کے لئے پیش کر دیا گیا۔ یہ فلم اپنے مقاصد کے لحاظ سے اصلاحی اور تعلیمی ہے کیونکہ اس میں دیہات سدھار کے موضوع پر بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ دیہات کو بیماریوں سے کس طرح پاک کیا جا سکتا ہے۔ سبودھ مترا کی ڈائرکشن کامیاب ہے اداکاروں میں سے پنکج، بھارتی دیوی، ملک اور نمو کا پارٹ لائق تحسین ہے۔

ناظرین عالمگیر کے لئے لاجواب تحفہ

اپنے جیون کی پریم بٹی

ناظرین! میں ایک زمیندار کا لاڈلا لڑکا تھا۔ بُری صحبت کے باعث جوانی میں احتلام کے خطرناک امراض میں مبتلا ہوگیا۔ پہلے پہل ایک دو سال شرم و حیا ننگ و ناموس کی وجہ سے اپنا حال چھپائے رکھا۔ مگر کچھ عرصہ بعد بیماری خطرناک صورت اختیار کر لی۔ تب میری آنکھیں کھلیں اور میں نے علاج معالجہ شروع کیا۔ پیری فقیری اور اطبا تک سے رجوع کیا۔ بڑے بڑے وید، حکیموں اور ڈاکٹروں سے دوائیں منگوائیں۔ بقول شخصے مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اپنی زندگی سے بیزار ہو گیا اور خودکشی کے منصوبے باندھنے لگا۔ ہمارے گاؤں کے پاس ایک میل کے فاصلہ پر پنڈتوں کا ایک اونچا ٹیلا ہے۔ اس ٹیلے پر کبھی کبھی کوئی سادھو مہاتما آ نکلتے ہیں۔ اتفاق سے اس ٹیلے پر کاٹھیاواڑ کے ایک فقیر کامل آ نکلے اور ایک جھاڑی میں آسن لگا کر بیٹھ گئے۔ گاؤں کے لڑکوں نے جب ان کو دیکھا تو انہوں نے گاؤں میں شہرت پھیلا دی کہ ٹیلے پر ایک کامل بزرگ آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ شہرت سن کر لوگ جوق در جوق ان کے درشنوں کو آنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کی شہرت سارے علاقہ میں پھیل گئی۔ ان کی اس قدر شہرت سن کر میرے جیسا مایوس زندگی سے بیزار آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آخر چار و ناچار بادل ناخواستہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کی نورانی صورت دیکھ کر میں حیران سا رہ گیا اور دل ہی دل میں اپنی حماقت پر پچھتانے لگا۔ مگر جونہی میں نے ان کے نورانی چہرے کے جمال کو دیکھا دل باغ باغ ہو گیا۔ لیکن یہ حالت بہت دیر تک قائم نہ رہ سکی جب انہوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا تو مارے شرم کے زمین میں گڑنے لگا۔ گویا تمام پوشیدہ دلی جذبات بھانپ گئے۔ اور اس طرح گویا ہوئے۔ بیٹا تم بہت کمزور اور دکھی معلوم ہوتے ہو۔ طبیعت کیسی ہے؟ یہ الفاظ مجھ پر جادو کی طرح اثر کر گئے۔ یہ سنتے ہی میں بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ انہوں نے نہایت شفقت سے ایک نسخہ تجویز کر کے دیا جو میں نے بنا کر استعمال کیا اور اب بالکل تندرست و توانا ہوں۔

نسخہ :- ترپھلا کا چورن ۵ تولہ، ترکٹا چورن ۵ تولہ، اصل ستوج تاپی سلاجیت ۲ تولہ، اصلی بھنگ بھسم ۲ ماشے، اصلی ستوج چھاپ کیسر ۳ ماشے، اصلی تخم [illegible] ۲ ماشے، اصلی [illegible] کستوری ۹ رتی۔ ان سب ادویات کو کوٹ چھان کر کھرل میں ڈال کر اوپر سے شتیل چینی کا تیل ۳ بوند، بوڑ کا تیل ۳ بوند، صندل کا تیل ۳ بوند، الکتانہ ۲ بوند، عرق بید ۲ گھنٹہ کھرل کر کے گھوٹ کر مٹر جتنی گولیاں بنا کر سایہ میں سکھا لیں۔ بس دوائی تیار ہے۔ **ترکیب استعمال**:- ایک گولی صبح ایک گولی شام پاؤ بھر دودھ میں شکر یا چینی ڈال کر کھائیں۔ اس نسخہ کے استعمال سے میں بیس روز میں بالکل تندرست ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایک مدت گذر گئی ہے۔ پھر کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اور خدا کے فضل سے اب میرے تین بچے ہیں بالکل تندرست توانا ہیں۔ اس وقت میں یہی نسخہ بنا کر روزانہ کئی لوگوں کو دام کے دام پر دے رہا ہوں جن سینکڑوں ناامیدوں کی امیدیں بر آئیں اور کئی ناامید فیضیاب ہوئے۔ دیکھو دوستو! جن لوگوں کو اس دوا سے بے حد فائدہ ہوا۔ میری توجہ اس فرمان کی طرف مبذول کرائی جو اس کامل بزرگ سنیاسی نے نسخہ دیتے وقت میرے ذمہ لگایا تھا کہ اگر میں تندرست ہو گیا تو رفاہ عام کیلئے اسکو اخبارات میں مشتہر کر دوں گا۔ تاکہ ہر ایک آدمی اس سے فیضیاب ہو سکے۔ اسلئے میں اعلان کرتا ہوں کہ جو لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں، نسخہ اوپر درج کر دیا گیا ہے۔ ناظرین بنا کر فائدہ اٹھائیں۔ یہ دوا منی کے پتلا پن، جریان ہر قسم کے، احتلام، پیشاب کے ساتھ قطرے کی طرح دھات کا خارج ہونا، پاخانہ کے وقت دھات کا گرنا، خواب میں دھات کا چل جانا، سوزاک اور کمزوری، ذیابیطس، جوانی میں بڑھاپے کی سی حالت، اصلی طاقت کی کمی معلوم ہونا، سوچنے کی طاقت کا کم ہونا، غیر ناموری کو دور کر کے انتہائی طاقت پیدا کرتی ہے اور رگ رگ میں جوانی کا مزہ بجلی کی طرح پیدا کرتی ہے۔ اسلئے جو بھائی بنانا چاہیں نسخہ اوپر درج ہے۔ بنا کر فائدہ اٹھائیں۔ مگر جو کچھ دقت محسوس کریں یا عدم الفرصتی یا اصلی ادویات نہ ملنے کے باعث دقت محسوس کرتے ہوں وہ اسکے حیرت انگیز معجزے دیکھنا چاہیں تو ہم سے بنی بنائی منگوا کر اسکے معجزے دیکھیں۔ اور محنت کی داد دیں۔

قیمت :- چالیس گولی اٹھائی روپے (۲/۸) پوری خوراک کی ۸۰ گولی ساڑھے چار روپیہ (۴/۸) تین پیکٹ ۱۲۰ گولی چھ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

پتہ :- بابو شیام لال رئیس پریم بٹی آفس نمبر ۵۷ درشن کٹی کانپور!